تکملہ

تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

للإمام النواب محمد صدیق حسن خان القنوجی رحمہ اللہ

تالیف

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۲۶۲-۱۳۴۰ھ)

تصحیح وتنقیح ونظرثانی

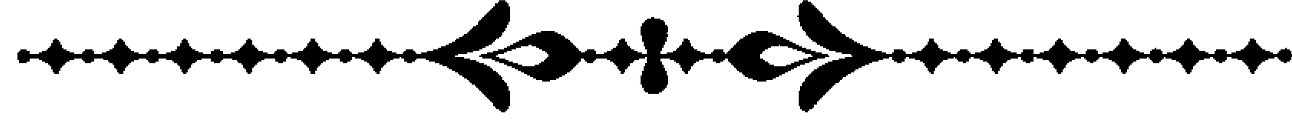
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ | حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ

تسہیل: محمد یحیٰ قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد ہفتم

دار ابی الطیب للبحث والتحقیق

مکتبہ قدوسیہ



نام کتاب: ـــــــــــــــــــ تکملہ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ـــــــــــــــــــ مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی

قیمت: ـــــــــــــــــــ

طبع اول: ـــــــــــــــــــ ستمبر 2023ء



ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

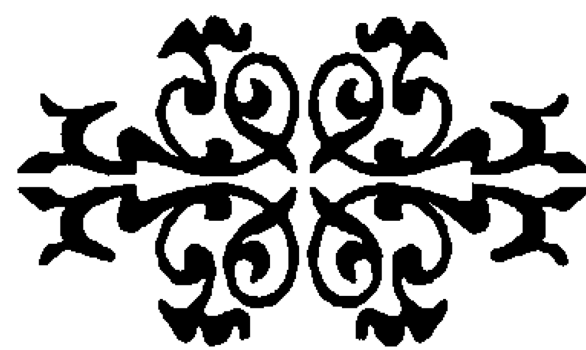
گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com darabitayyab1@gmail.com

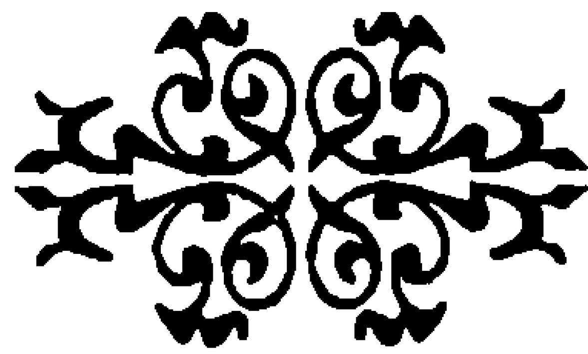
www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست



فہرست مضامین



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الْقَصَص

اس کا نام سورت موسیٰ بھی رکھا ہے۔ سورتوں کے نام توقیفی ہیں، اسی طرح ان کی ترتیب و آیاتِ کریمات کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ اس کی اٹھاسی (۸۸) آیتیں ہیں۔ امام حسن، عکرمہ اور عطاء رحمہم اللہ کے قول کے مطابق یہ ساری سورت مکی ہے۔ ابن ضریس، ابن نجار، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ نے دلائل میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ سورۃ القصص مکے میں نازل ہوئی۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مکے اور مدینے کے درمیان نازل ہوئی۔ ابن سلام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے دوران جحفہ میں نازل ہوئی۔ وہ اللہ عزوجل کا یہ قول ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدنی آیات میں سے ہے: ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ﴿52﴾ وَ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴿53﴾ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿54﴾ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ ﴾[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے، مگر آیت: ﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾ جحفہ میں نازل ہوئی ہے، اور اس کی ۸۷ یا ۸۸ آیتیں ہیں۔[3] انتہیٰ

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: مقاتل نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو غار سے نکلے اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرنے والے تھے، خوفِ طلب کی وجہ سے کسی دوسرے راستے پر تھے۔ پھر جب آپ صحیح راہ کی طرف لوٹے اور جحفہ میں اترے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کی طرف کا راستہ پہچانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف مشتاق ہوئے تو جبرائیل علیہ السلام نے آپ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾ یعنی مکے کی طرف اس پر غالب ہو کر۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ آیت جحفہ مقام میں اتری ہے، اس لیے یہ نہ مکی ہے نہ مدنی۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ اِلٰی مَعَادٍ ﴾ کی تفسیر میں "اِلَی الْمَوْتِ" روایت

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٣٨٩) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٤٧) [3] تفسير الجلالين (١/ ٥٠٦)

کیا ہے اور یہ امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

امام عکرمہ، زہری اور حسن رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ معنی یہ ہیں: "لَرَادُّكَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ" امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "بَيْنِي وَبَيْنَكَ الْمَعَادُ" یعنی میرے اور تیرے درمیان روزِ قیامت ہے، اس لیے کہ لوگ زندہ ہو کر اس میں عود کریں گے، یعنی لوٹیں گے۔ ﴿فَرَضَ﴾ کے معنی "أَنْزَلَ" ہیں۔[1] انتھی

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام احمد رحمہ اللہ نے معدی کرب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ہم عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو ہم نے ان سے اس بات کا سوال کیا کہ ہم پر ﴿طٰسٓمّٓ﴾ پڑھیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ میرے پاس نہیں ہے، لیکن تم اس شخص کو پکڑو جس نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے اَخذ کیا ہے، وہ شخص خباب بن ارت رضی اللہ عنہ ہیں۔ کہا: پھر ہم خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو اس نے اس کو ہم پر پڑھا۔ انتھی

فتح القدیر کے الفاظ یہ ہیں: "أَخْرَجَ أَحْمَدُ وَالطَّبْرَانِيُّ وَابْنُ مَرْدُوَيْهِ، قَالَ السُّيُوطِيُّ بِسَنَدٍ جَيِّدٍ عَنْ مَعْدِي كَرِبَ، قَالَ: أَتَيْنَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ فَسَأَلْنَاهُ أَنْ يَّقْرَأَ عَلَيْنَا طٰسٓمّٓ الْمِئِيْنَ، فَقَالَ: مَا هِيَ مَعِيَ، وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمَنْ أَخَذَهَا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ خَبَّابُ بْنُ الْأَرَتِّ، فَأَتَيْتُ خَبَّابًا فَقُلْتُ: كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ طٰسٓمّٓ أَوْ طٰسٓ؟ فَقَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. طٰسٓمّٓ، تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ... الخ.[2] انتهى.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمّٓ ﴿1﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿2﴾ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿3﴾ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿4﴾ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿5﴾ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿6﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٢١)

[2] مسند أحمد (١/ ٤١٩) المعجم الكبير (٤/ ٥٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٠٠) الدر المنثور (٦/ ٣٨٩) فتح القدير (٤/ ٢٠٨)

طٰسٓمٓ ① یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ② ہم آپ کو موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ③ بے شک فرعون نے زمین (مصر) میں سرکشی کی، اور اس نے اہلِ مصر کے کئی گروہ بنا دیے، ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو اس نے ضعیف جان کر دبا رکھا تھا، وہ ان کے بیٹے ذبح کرتا اور ان کی بیٹیاں زندہ رکھتا، بلاشبہ وہ فسادیوں میں سے تھا ④ اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں زمین میں ضعیف جان (کر دبا) لیا گیا تھا، اور انھیں پیشوا بنائیں اور انھیں (ملکِ مصر کے) وارث بنائیں ⑤ اور (یہ کہ) ہم انھیں زمین (شام و فلسطین) میں اقتدار بخشیں اور ہم فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو ان (کمزور لوگوں کے ہاتھوں) سے وہ چیز دکھائیں، جس سے وہ ڈرتے تھے ⑥

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حالات و واقعات کا بیان:

موسیٰ اور فرعون کے قصے میں مسلمان لوگ اپنا حال ظالموں کے مقابلے میں قیاس کر لیں۔ لڑکوں کو اس لیے ذبح کر دیتا تھا کہ یہ قوم یعنی بنی اسرائیل بڑھ نہ جائیں اور زور نہ پکڑیں۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا اور ظلم میں اس کا شریک تھا۔ انتھیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حروفِ مقطعہ پر کلام گزر چکا ہے۔ ﴿ تِلْكَ ﴾ بہ معنی "هٰذِهٖ" ہے۔ یعنی یہ آیتیں جو آیندہ مذکور ہوں گی، اس کتاب کی آیتیں ہیں جو واضح و جلی اور کھلی ہے اور امور کے حقائق اور ماضی اور آیندہ کے حالات بتانے والی ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ ﴾ [یوسف: ۳] ''ہم آپ کو ایک بہترین داستان سناتے ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ "نَتْلُوْ وَنَقُصُّ" بہ معنی "نَذْكُرُ" ہے، یعنی ہم تجھ سے موسیٰ اور فرعون کا قصہ ذکر کرتے ہیں، اس طور پر کہ وہ نفس الامر میں ہے، گویا تو اس کا مشاہدہ کر رہا ہے اور گویا تو اس وقت حاضر ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی فرعون نے ملک میں تکبر و تجبر اور سرکشی کی۔ ﴿ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا ﴾ اور اس نے وہاں کے لوگوں کو کئی قسموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اپنے امورِ مملکت میں جس کام کا ارادہ کرتا تھا، اس میں ہر قسم کے لوگوں کو لگا رکھا تھا۔

﴿ يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ ﴾ اس طائفہ سے مراد بنی اسرائیل ہیں، ان کو اس نے کمزور کر رکھا تھا، یہ لوگ اس وقت میں اپنے زمانے کے بہترین لوگ تھے۔ یہ تو ایسے بہتر اور برتر تھے اور حال یہ تھا کہ ان پر جابر اور سرکش بادشاہ مسلط کر دیا گیا، جس نے ان کو ذلیل سے ذلیل کاموں میں لگا رکھا تھا۔ رات دن اپنے اور اپنی رعیت

کے کاموں میں ان سے مشقت لیتا اور ان کو ایذا اور تکلیف میں ڈالتا اور اس کے باوجود اُن کے بیٹوں کو قتل کر دیتا اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا، اس سے غرض ان کو ذلیل اور حقیر کرنا تھا اور اسے یہ خوف تھا کہ ان میں سے وہ لڑکا پیدا ہو جس سے وہ اور اس کی مملکت والے ڈرتے تھے کہ ان میں سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہو گا جس کے ہاتھوں پر اس کی حکومت جاتی رہے گی اور وہ اس کے ہلاک ہونے کا سبب ہو گا، قبطیوں نے یہ بات بنی اسرائیل سے اَخذ کی تھی۔

بنی اسرائیل جس شے کا درس دیا کرتے تھے اس میں ابراہیم خلیل علیہ السلام کا یہ قول تھا، جب کہ وہ دیارِ مصریہ میں داخل ہوئے تھے، اس کے جابر حکمران کے ساتھ ان کو جو قصہ پیش آیا وہ پیش آیا جس وقت اس نے آپ کی بیوی سارہ کو پکڑا، تا کہ انھیں لونڈی بنائے۔ پھر اللہ نے ان کو اس سے محفوظ رکھا اور اپنی قدرت اور سلطان سے اس کو ان سے روکا تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہ بشارت دی کہ آیندہ اس کی پشت اور اولاد سے وہ شخص پیدا ہو گا جس کے ہاتھوں سے مصر کا ملک ہلاک ہو گا، پس قبطی لوگ فرعون کے پاس اس کا قصہ بیان کرتے تھے۔ چنانچہ فرعون نے اس سے بچنے کے لیے یہ حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو مار ڈالا جائے، حالاں کہ تقدیر سے بھاگنا ہرگز نفع نہیں دیتا، اس لیے کہ اللہ کی اجل جب آ جاتی ہے تو پھر بالکل تاخیر نہیں کی جاتی۔ ﴿ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴾ [الرعد: ۳۸]

اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴾ اللہ پاک نے جس کام کا ارادہ فرمایا تھا وہ بنی اسرائیل کے ساتھ کر دیا، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۳۷]

’’اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے مشرق اور مغرب کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور (اے نبی! اس طرح) بنی اسرائیل کے حق میں آپ کے رب کا اچھا وعدہ پورا ہوا، اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا تھا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ تباہ کر دیا جو (کارخانے) وہ بناتے اور جو (محلات کی عمارتیں) وہ اٹھاتے تھے۔‘‘

نیز فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ ۭ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [الشعراء: ۵۹] ’’اسی طرح ہوا، اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث بنایا۔‘‘ فرعون نے اپنی پوری قوت سے ارادہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے نجات پائے، مگر اس نے اس کو کوئی فائدہ نہ دیا، ملک عظیم کی قدرت کے ساتھ جس کے قدری حکم کا خلاف نہیں ہو سکتا ہے اور نہ وہ مغلوب ہوتا ہے، بلکہ اسی کا حکم نافذ ہوا اور پہلے سے اس کا قلم اس بات پر جاری ہو چکا تھا کہ فرعون کی ہلاکت اسی کے ہاتھوں ہو گی، بلکہ وہی لڑکا جس کے وجود سے تو نے بچنا چاہا اور اس کی وجہ سے ہزاروں بچے مار ڈالے، اس کی نشو ونما اور پرورش پانے

کی جگہ تیرے ہی بچھونے پر اور تیرے ہی گھر میں ہو گی اور اس کی غذا تیرے ہی کھانے سے ہو گی۔ تو ہی اس کی پرورش کرے گا اور تو ہی اس کی ناز برداری کرے گا اور اس پر فدا اور قربان ہو گا۔ تیری موت اور ہلاکت اور تیرے لشکروں کی ہلاکت اسی کے ہاتھوں پر ہو گی، تاکہ تو اس بات کو جان لے کہ رب سماوات ہی بلند و قاہر و غالب و عظیم وقوی وعزیز اور شدید المحال ہے کہ اسی نے جو کچھ چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔[1] ؎

چاہا ہم نے وے لے نہ چاہا تو نے تیرا چاہا ہوا ہمارا نہ ہوا

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت اور اتقان کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ طٰسٓمّٓ ﴾ سے اپنی مراد کو اللہ پاک ہی خوب جانتا ہے۔ ﴿ تِلْكَ ﴾ اسم اشارہ مبتدا ہے اور ما بعد خبر ہے۔ یا یہ خود خبر ہے مبتدائے محذوف کی اور ﴿ اٰیٰتُ ﴾ بدل ہے اسم اشارہ سے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ تِلْكَ ﴾ موضعِ نصب میں ہو ﴿ نَتْلُوْا ﴾ سے۔ ﴿ اَلْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴾ میں آیات کی طرف اضافت کتاب کے معنی میں ہے، یعنی یہ آیتیں کتابِ مبین سے ہیں، ایسی کتاب جو باطل کے مقابلے میں حق کے بیان پر مشتمل ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ اس کی خیر و برکت ظاہر ہے۔ یہ معنی تو اس بنا پر ہیں کہ مبین "أَبَانَ" لازم سے ماخوذ ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَبَنْتُهُ فَأَبَانَ" یعنی میں نے فلاں شے کو ظاہر کیا تو وہ ظاہر ہو گئی۔ "بَانَ" اور "أَبَانَ" کے ایک معنی ہیں اور "أَبَان" متعدی سے ماخوذ ہو گا تو یہ معنی ہوں گے کہ یہ کتاب باطل سے حق کو ظاہر کرنے والی ہے اور حلال کو حرام سے، جیسا کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] اور ظاہر کرنے والی ہے وعد اور وعید کو اور اخلاص و توحید کو۔ کتاب سے مراد یا تو لوحِ محفوظ ہے۔ مبین اس کو اس لیے کہا کہ اس میں ہر شے بیان کی گئی ہے۔ یا مراد قرآن شریف ہے، اس کو مبین اس لیے کہا ہے کہ اس میں حلال و حرام اور حدود و احکام کا بیان کیا گیا ہے۔

﴿ نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ ﴾. ﴿ نَتْلُوْا ﴾ کا مفعول محذوف ہے اور کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہے یا تبعیضیہ اور حق بہ معنی صدق ہے اور جار و مجرور حال ہے فاعل ﴿ نَتْلُوْا ﴾ سے، یا ﴿ نَبَاِ ﴾ سے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم تیری طرف جبرائیل علیہ السلام کے واسطے سے ایک شے کی وحی کرتے ہیں کہ وہ موسیٰ و فرعون کی خبر ہے، یا ان کی کچھ خبر ہے۔ درآں حالیکہ ہم صدق کے ساتھ متلبس ہیں، یا وہ خبر صدق اور راستی کے ساتھ متلبس ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہو، جیسا کہ امام اخفش رحمہ اللہ کی رائے ہے، اس کے مطابق تو ﴿ نَبَاِ ﴾ مفعول ہو گا ﴿ نَتْلُوْا ﴾ کا۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہو یا تبعیضیہ بنا بر تقدیرِ مفعول اور اس کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ کے اضافے کا حکم کیا جائے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٠٠_٥٠١) [2] معاني القرآن (٤/ ١٣١)

﴿ لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴾ یعنی ہم تجھ سے ان کا قصہ حق کے ساتھ اُن لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ مومنین کا خاص طور سے اس لیے ذکر کیا کہ تلاوت کا فائدہ صرف مومنین ہی کو ہوتا ہے۔ جملۂ ﴿ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ ﴾ اور اس کا ما بعد مستانفہ ہے۔ ﴿ نَبَاِ ﴾ کا ذکر جو مجمل کیا تھا، اس کے بیانِ کے واسطے لایا گیا ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ اور فرعون کا قصہ کیا ہے؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ فرعون نے اپنی بادشاہت اور غلبے کے سبب سے تکبر و تعظم و تجبر کیا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿ عَلَا ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ ''أرض'' سے مراد زمینِ مصر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَلَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس نے ربوبیت کا دعویٰ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے رب کی عبادت سے علو کیا، خود کو بڑا سمجھا۔

﴿ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس نے مصر کے لوگوں کو اپنی خدمت کے لیے کئی فرقے اور کئی قسم کر ڈالا، جو وہ چاہتا اس کو مان لیتے، اس کی متابعت کرتے اور اطاعت کرتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے درمیان میں تفریق ڈال دی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو تو غلام بناتا اور ایک فرقے کو چھوڑ دیتا اور ایک جتھے کو مار ڈالتا اور ایک گروہ کو جیتا رکھتا۔[1] یا یہ معنی ہیں کہ ان کے بہت سے فرقے کر دیے، ان کے آپس میں بغض اور عداوت ڈال دی، تاکہ ان کی بات متفق نہ ہونے پائے۔ یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کے قول کی تفصیل ہے۔ یا مختلف فرقے کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ایک گروہ کی عزت کرتا اور دوسرے کی توہین کرتا، یعنی قبطی کا اکرام کرتا اور اسرائیلی کی توہین کرتا۔

جملہ ﴿ يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ ﴾ مستانفہ ہے، جو اہل کے بیانِ حال کے لیے لایا گیا ہے، جن کو اس نے کئی فرقے اور کئی صنف کر ڈالا تھا۔ مثلاً کسی نے کہا ہے کہ ان کا کیا حال تھا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ وہ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ ﴿ جَعَلَ ﴾ کے فاعل سے حال ہو، یعنی اس کے اہل کو فرقے کر دیا اس طرح سے کہ ان میں سے ایک فرقے کو کمزور کرنے والا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ شِيَعًا ﴾ کی صفت ہو، یعنی ایسے فرقے کہ ان میں سے ایک کو ضعیف کرتا تھا۔ ﴿ طَآئِفَةً ﴾ سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ ضعیف کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ بنی اسرائیل جب مصر میں کثرت سے ہو گئے تو لوگوں پر زیادتی اور معاصی کے حامل ہو گئے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے قبطیوں کو ان پر مسلط کر دیا، چناں چہ انھوں نے ان کو کمزور کر ڈالا، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی۔

﴿ يُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ ﴾ یہ جملہ اگلے جملے سے بدل ہے، یا مستانفہ ہے، یا حال ہے، یا صفت ہے، جملہ اولیٰ کی طرح اس تقدیر پر کہ اس سے بدل نہ ہو۔ اس فعل کی وجہ یہ ہوئی کہ اس وقت میں منجموں نے

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥١٦۔ ٥١٧)

فرعون کو یہ خبر دی تھی کہ اس کا ملک بنی اسرائیل کے ایک مولود کے ہاتھ چلا جائے گا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون کی حماقت پر تعجب ہے، کیوں کہ جس کاہن نے اس کو یہ خبر دی تھی، اگر وہ اس کے نزدیک سچا ہے تو قتل کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اگر وہ جھوٹا ہے تو قتل کرنے کے کچھ معنی نہیں ہیں۔[1] کہا ہے کہ اس لعین نے ستر ہزار بچے قتل کیے تھے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لڑکوں کو قتل کرنے اور عورتوں کو زندہ رکھنے کا نام استضعاف رکھا گیا، اس لیے کہ بنی اسرائیل اس کے اس کام کو اپنے آپ سے دور کرنے سے عاجز اور ضعیف ہوئے تھے۔[2]

﴿ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ یعنی وہ ان لوگوں میں سے تھا جو معاصی اور جبر و تشدد اور تکبر کے ساتھ زمین میں فساد مچانے میں راسخ اور کامل تھے۔ اسی لیے اس نے ایسے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے کی جرأت کی کہ انبیاء علیہم السلام کی معصوم اولاد کو قتل کیا۔ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ قتل اہلِ فساد کے فعل سے ہے۔

﴿ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ یہ جملہ معطوف ہے جملہ ﴿ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ ﴾ پر اور اس کے ساتھ ﴿ نَبَاِ ﴾ کی تفسیر کے حکم میں داخل ہے۔ صیغۂ مضارع حالتِ ماضیہ کی حکایت کے لیے ہے اور اس کی صورت کو حاضر کرنے کے واسطے ہے۔ رہی یہ بات کہ معطوف علیہ جملہ اسمیہ ہے اور یہ فعلیہ؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں میں اس لحاظ سے ایک تناسب ہے کہ ان میں سے ہر ایک ﴿ نَبَاِ ﴾ کی تفسیر اور بیان کے لیے ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ ﴿ يَسْتَضْعِفُ ﴾ کے فاعل سے حال ہے ہو بتقدیرِ مبتدا۔ "أَيْ: وَنَحْنُ نُرِيْدُ" معنی یہ ہیں کہ وہ تو کمزور کرتا ہے اور حال یہ ہے کہ ہم ارادہ کرتے ہیں اس بات کا کہ ان پر فضل اور مہربانی کریں، اس طریقے سے کہ اس کی سزا اور عذاب سے ان کو نجات دیں، ان کے کمزور کرنے کے بعد، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور مستضعفین سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ امام نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ہمارے لیے مسئلہ اصلح پر دلیل ہے۔[3] انتھیٰ

﴿ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً ﴾ یعنی اور ہم چاہتے ہیں کہ ان کو خیر میں پیشوا اور امام بنا دیں جو خیر کی طرف دعوت دینے والے ہوں کہ ان کی پیروی کی جائے اور لوگوں پر والی اور حاکم بنا دیں اور ان میں بادشاہ بنا دیں، اس کے بعد کہ وہ تابع، مسخر اور ذلیل تھے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مراد یوسف علیہ السلام اور ان کی اولاد ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل ہیں اور ائمہ سے مراد والیانِ امر ہیں۔

﴿ وَنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴾ یعنی ہم ان کو وہ لوگ کر دیں جو فرعون اور اس کی قوم کے بعد زمین کے وارث ہو جائیں۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔[4] غرض یہ ہے کہ وراثت سے وہ وراثت مراد نہیں ہے جو ہماری شریعت میں ہے۔

---

[1] معاني القرآن (٤/ ١٣٢)
[2] تفسير الخازن (٥/ ١٦١۔ ١٦٢)
[3] تفسير النسفي (٣/ ٢٢٦)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٤١)

مطلب یہ ہے کہ ہم ان کو فرعون کے ملک اور قبط کے مساکن اور جائیداد کا وارث بنا دیں، اس طرح کہ فرعون کی سی بادشاہت ان میں ہو اور اس کی قوم کے مکانات میں رہیں اور بسیں اور فرعون اور اس کی قوم کے املاک سے نفع اٹھائیں۔

﴿ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ ﴾ یعنی اور اُن کی زمین پر قدرت رکھنے والے اور اس کے لوگوں پر اور اُن کو اس پر مسلط کر دیں کہ جس طرح چاہیں کریں اور اس میں تصرف کریں۔ تمکین کی اصل یہ ہے کہ کوئی مکان کسی شے کے لیے ٹھہرایا جائے کہ وہ شے اس میں متمکن ہو اور جم کر رہے۔ محاورۂ عرب میں "مَكَّنَ لَهُ" اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی کے لیے ایک مکان مقرر کر دے کہ وہ اس میں بیٹھے اور اس میں متمکن ہو، یا اس پر سوئے۔ یہ تو تمکین کی اصل ہے، پھر تسلط و اطلاق امر کے لیے استعارہ کیا گیا ہے۔ "أرض" سے مراد مصر و شام کی زمین ہے، یعنی ہم ان کو مصر و شام پر مسلط کر دیں کہ جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ جمہور نے ﴿ نُمَكِّنَ ﴾ بغیر لام اور امام اعمش رحمہ اللہ نے "لِنُمَكِّنَ" بلامِ علت پڑھا ہے۔

جمہور نے ﴿ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا ﴾ کو بہ نونِ مضموم و کسرِ راء پڑھا ہے، اس بنا پر کہ فاعل اللہ سبحانہ ہے اور امام اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ نے "يَرَى" بہ فتحِ یائے تحتیہ و فتحِ رائے مہملہ پڑھا ہے، اس لیے کہ فاعل فرعون ہے۔ پہلی قراءت سیاق سے زیادہ تر مناسبت رکھتی ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے ﴿ نُرِيدُ ﴾ اور ﴿ نُمَكِّنَ ﴾ دونوں صیغے نون کے ساتھ ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے "وَيُرِي فِرْعَوْنُ" جائز رکھا ہے، یعنی "وَيُرِيَ اللّٰهُ فِرْعَوْنَ" بہ ضمِ یائے تحتیہ و کسرِ راء۔[1] ﴿ مِنْهُمْ ﴾ کی ضمیر "مُسْتَضْعِفِيْنَ" کی طرف راجع ہے۔

﴿ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ﴾ مفعول ثانی ہے پہلی قراءت پر، اور اول مفعول ہے دوسری کی بنا پر اور رویت بصری ہے اور "حذر" ضرر سے بچنے کو کہتے ہیں، معنی یہ ہیں اور دکھائیں ہم فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو۔ یا دیکھیں یہ سب بنی اسرائیل سے جن کو انھوں نے کمزور کر رکھا تھا، وہ شے جس سے ڈرتے تھے اور جس کے دفع کرنے میں کوشش کرتے تھے کہ ان کے ملک کا جانا اور اُن کی ہلاکت بنی اسرائیل کے ایک مولود کے ہاتھ پر ہوگی، وہ بنی اسرائیل جن کو کمزور کر رکھا تھا۔

رہی یہ بات کہ "جنود" کی اضافت فرعون اور ہامان کی طرف کی تو یا تو تغلیب کے واسطے ہے، یا ہامان کے کئی لشکر ہوں جو اس کے ساتھ مخصوص ہوں، گو وہ وزیر تھا، یا اس لیے کہ بادشاہ کا لشکر وزیر کا لشکر ہوتا ہے۔ یہاں یہ اشکال ہے کہ فرعون والوں کا ملک جانا اور ان کا ہلاک ہونا اس قبیل سے نہیں ہے کہ انھوں نے اس کو دیکھا ہو، پھر ان کو اس کا دکھانا یا خود ان کا دیکھنا کیسے درست ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ حق کے نزدیک ابصار، یعنی دیکھنا زندگی پر موقوف نہیں ہے اور اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اہلِ قلیب کے بارے میں یوں فرمایا: «مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ مِنْهُمْ»[2] یعنی

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢١٠)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٤)

تم اُن سے بڑھ کر سننے والے نہیں ہو، مطلب یہ کہ وہ اس بات کو خوب سنتے ہیں جو میں ان سے کہہ رہا ہوں۔ (اہلِ قلیب سے مراد وہ کفار ہیں جو بدر کی لڑائی میں مارے گئے اور بدر کے کنوئیں میں ڈال دیے گئے، آپ ﷺ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا: کیا جو تمھارے رب نے تم کو وعدہ دیا تھا، تم نے اس کو حق پایا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ آپ مُردوں سے باتیں کرتے ہیں؟[1] اس پر آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی)، باوجود اس کے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد طلائع، اسباب، آثارِ ذہابِ ملک اور ہلاکت کو دیکھ لینا ہو اور یہ اس وقت ہو کہ ان کو غرق نے آلیا۔[2]

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِــِٕيْنَ ۝ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ تو اسے دودھ پلا، پھر جب تو اس کے بارے میں ڈرے تو اسے دریا میں ڈال دینا اور نہ ڈرنا اور نہ غم کھانا، بے شک ہم اسے تیری طرف لوٹانے والے ہیں اور اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں⑦ چناں چہ فرعون کے گھر والوں نے اسے (دریا سے) اُٹھا لیا، تاکہ وہ ان کے لیے دشمن اور باعثِ غم بنے، بلاشبہ فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکر خطا کار تھے⑧ اور فرعون کی بیوی نے کہا: (یہ تو) میرے لیے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، شاید یہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں، اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے⑨

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو تدبیرِ الٰہی اختیار کرنے کا حکم:

موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو وحی کی، یعنی اس کے دل میں پڑ گیا یا خواب دیکھا، فرعون نے ایسے پیادے ہر گزر پر مقرر کر رکھے تھے جو نئے پیدا ہونے والے بیٹے کو ڈھونڈھ لاتے اور مار دیتے تھے۔ ان کو ایک لکڑی کے صندوق میں ڈال کر ان کو بہا دیا، وہ صندوق نہر میں بہتا چلا گیا، فرعون کے محل میں اس کی عورت نے ان کو اٹھا لیا پالنے کے لیے۔ ان

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٤) [2] فتح البيان (١٠/ ٨٧۔ ٨٩)

کو شعور نہیں تھا، یعنی خبر نہیں تھی کہ بڑا ہو کر کیا کرے گا، لیکن جان لیا کہ یہ بنی اسرائیل کا بچہ ہے، کسی نے ڈر کے مارے دریا میں ڈال دیا ہے۔ ایک لڑکا اگر نہ مارا تو کیا ہوا۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب فرعون نے بنی اسرائیل کے بہت زیادہ لڑکے مار ڈالے تو قبطی اس بات سے ڈرے کہ بنی اسرائیل فنا ہو جائیں گے تو جو مشقت و محنت کے وہ کام جو وہ کیا کرتے تھے، خود اُن کو کرنا پڑیں گے۔ اس پر فرعون سے کہا کہ اگر یہ حال جاری رہا تو بنی اسرائیل کے بوڑھے تو مر جائیں گے اور اُن کے لڑکے مار دیے جاتے ہیں، ان کی عورتوں سے ممکن نہیں ہے کہ جو کام اُن کے مرد کر سکتے ہیں، وہ ان سے بنیں تو ان کاموں کے کرنے کی نوبت ہم تک پہنچے گی، اس پر فرعون نے حکم دیا کہ ایک سال میں لڑکے مار دیے جائیں اور ایک سال ان کو چھوڑ دیں۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس میں لڑکوں کو چھوڑ دیتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال میں لڑکے مارے جاتے تھے۔ فرعون کے کچھ لوگ اس کام پر مقرر تھے اور دائیاں عورتوں پر گشت کیا کرتی تھیں۔ پھر جس عورت کو دیکھتیں کہ وہ حاملہ ہوگئی ہے اس کا نام یاد رکھتیں۔

پھر جب اس کے جننے کا وقت آتا تو قبطیوں کی عورتیں ہی اس کو جناتیں، پھر آ کر دیکھتیں کہ اس عورت نے لڑکی جنی تو اس کو چھوڑ دیتیں چلی جاتیں اور اگر اس نے لڑکا جنا تو وہی ذباح (ذبح کرنے والے) لوگ ہاتھ میں تیز چھریاں لیے ہوئے اندر آتے اور اس لڑکے کو مار ڈالتے اور چل دیتے۔ قَبَّحَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اُن کا حمل ہوا تو ان پر حمل کے آثار ظاہر نہ ہوئے اور عورتوں کی طرح اور نہ ہی دائیوں کو اس کا علم ہوا، لیکن جب انھوں نے ان کو نر جنا تو ان سے دل میں تنگ ہوئیں اور ان پر سخت ڈریں اور اُن کو بہت زیادہ محبوب رکھا اور موسیٰ علیہ السلام کو جو بھی دیکھتا وہ ان کو محبوب رکھتا۔ نیک بخت وہ شخص ہے جو ان سے طبعی اور شرعی محبت رکھے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ﴾ [طٰہٰ: ٣٩] ''اور میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی۔''
پھر جب ان کی والدہ ان سے دل میں تنگ ہوئیں تو ان کے سِرّ میں الہام کیا گیا اور اُن کے دل میں ڈالا گیا اور ان کے قلب میں پھونکا گیا، یعنی وہ امر جس کی اللہ پاک نے خبر دی ہے۔ (روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''أُلْهِمَتْ فِيْ سِرِّهَا وَأُلْقِيَ فِيْ خَلَدِهَا وَنُفِثَ فِيْ رُوْعِهَا'')

﴿ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ قصہ یہ ہے کہ ان کا گھر نیل کے کنارے پر تھا۔ انھوں نے ایک صندوق بنایا اور اس میں نرم بچھونا بچھایا، اپنے بچے کو دودھ پلانے لگیں، پھر جب ان پر کوئی شخص داخل ہوتا جس سے وہ ڈرتی تھیں تو جا کر ان کو اس صندوق میں رکھ دیتیں اور اس کو دریا میں چھوڑ دیتیں اور اس کو ایک رسی سے باندھ دیتیں جو ان کے پاس تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ان پر وہ شخص داخل ہوا جس سے وہ ڈرتی تھیں تو جا کر ان کو اس

صندوق میں رکھا اور اس کو دریا میں چھوڑ دیا اور اس کو باندھنا بھول گئیں تو وہ پانی کے ساتھ چلا، پانی نے اس کو اٹھا لیا، یہاں تک کہ اس کو فرعون کے محل میں لے گزرا اور لونڈیوں نے اس کو اٹھا لیا۔ پھر اس کو لا کر فرعون کی بیوی کے پاس لے چلیں اور وہ جانتی نہ تھیں کہ اس صندوق میں کیا ہے اور وہ اس صندوق کو فرعون کی بیوی سے پہلے کھولنے سے ڈریں۔ پھر جب اس کو کھولا تو اچانک دیکھا کہ وہ ایک بہت ہی خوبصورت لڑکا ہے، جو ساری خلق سے حسین وجمیل، نہایت خوبصورت اور بارونق ہے۔

اللہ پاک نے ان کی محبت اس کے دل میں ڈال دی جب اس نے ان کی طرف نظر کی، اور یہ بات اس کی نیک بختی کے لیے تھی اور اس شے کے لیے تھی جس کا اللہ پاک نے ارادہ کیا، یعنی اس کی کرامت اور اس کے خاوند کی بدبختی کا اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ﴾ محمد بن اسحاق وغیرہ نے کہا ہے کہ اس جگہ حرفِ لام لامِ عاقبت ہے، لامِ تعلیل نہیں ہے، اس لیے کہ انھوں نے اُن کے اٹھانے سے عداوت اور حزن کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ بے شک ظاہر الفاظ کا یہی تقاضا ہے جو انھوں نے کہی ہے، لیکن جس وقت سیاق کی طرف نظر کی جاتی ہے تو لام تعلیل ہی کے لیے باقی رہتا ہے، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان کو موسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لینے کے لیے مقرر کیا، تا کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کا دشمن بنائے اور ان کے لیے حزن کا باعث۔ چنانچہ یہ معنی موسیٰ علیہ السلام سے ان کے ڈر کو باطل کرنے کے لیے زیادہ موثر ہیں اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ﴾

امیر المومنین عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرقہ قدریہ کی ایک قوم کی طرف خط لکھا، اس بارے میں کہ وہ کتاب اللہ کی تکذیب کرتے ہیں اور اس کی اقدار کو جھٹلاتے ہیں جو اس کے علمِ سابق میں نافذ ہو چکی ہیں۔ وہ خط یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے علمِ سابق میں واقعی فرعون کے عدو و حزن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ﴾ [القصص: ٦] ''اور ہم فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو ان (کمزور لوگوں کے ہاتھوں) سے وہ چیز دکھائیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔''

''وَقُلْتُمْ اَنْتُمْ: لَوْ شَاءَ فِرْعَوْنُ اَنْ يَّكُوْنَ لِمُوْسٰى وَلِيًّا وَنَاصِرًا'' (یعنی تمھارے عقائد کی بنا پر یہ کہنا لازم آتا ہے، کیوں کہ قدریہ کے نزدیک کوئی بات کسی کے لیے قطعاً ثابت نہیں ہو چکی، بلکہ بندہ مختار ہے کہ اپنے فعل کو جس طرح چاہے واقع کرے، پس اس بنا پر فرعون مختار تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر فعلِ عداوت نہ واقع کرتا، بلکہ فعل ولایت و نصرت کو واقع کرتا اور یہ اس خبرِ قرآنی کے صریحاً خلاف ہے، چنانچہ لازمی طور پر یہ عقیدہ غلط ہے) اور اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ﴿لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ﴾ یعنی فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو

ان کے قتل کا ارادہ کیا، اس بات کے خوف کی وجہ سے کہ وہ بنی اسرائیل سے ہوں۔ اس کی بی بی آسیہ بنت مزاحم نے شروع کیا کہ ان کی طرف سے جھگڑتی تھی اور ان کو فرعون کی طرف محبوب کرتی تھی تو یوں بولی کہ ﴿ قُرَّتُ عَیْنٍ لِّیْ وَلَكَ ﴾ اس پر فرعون بولا کہ تیرے لیے جو ہے تو ہاں، اور میرے واسطے جو ہے تو نہیں۔ چنانچہ اسی طرح ہوا اور ان کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کو ہدایت دی اور ان کے ہاتھوں پر اس کو ہلاک کیا۔ سورت طٰہٰ[1] میں حدیث الفتون کے اندر یہ قصہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے مرفوعاً تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے نسائی وغیرہ کے نزدیک۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ ﴾ یہ بات بے شک فرعون کی بیوی کو حاصل ہوئی، ان کے سبب سے اللہ پاک نے اس کو ہدایت کی اور ان کے سبب سے اس کو جنت میں بسایا۔ اس نے جو یہ کہا ﴿ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ﴾ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نے چاہا کہ ان کو بیٹا بنائے اور متبنیٰ کرے، اس لیے کہ فرعون سے اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ ﴿ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی وہ اللہ پاک کی عظیم حکمت اور قطعی حجت کو جس کا اس نے ارادہ کیا تھا نہیں جانتے تھے، یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لینے کے سبب میں جو عظیم حکمت اور حجت تھی، اس کا وہ شعور نہیں رکھتے تھے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا پکا اور مضبوط بیان یہ ہے کہ ﴿ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اس کو اس بات کا الہام کیا جو اس نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کی۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے،[3] یعنی اس جگہ وحی کے معنی الہام ہیں، یہ وہ وحی نہیں ہے جو رسولوں کی طرف کی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک خواب تھا جو عالمِ رؤیا میں ان کی ماں کو دکھایا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے ایک فرشتے کو ان کی طرف بھیجا تھا کہ ان کو اس بات کا اعلام کر دے، یعنی خبر دے دے، تو اس قول کی بنا پر یہ وحی اعلام کی تھی نہ کہ الہام کی۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ نبی نہ تھیں اور جو شخص ان کی طرف فرشتے کے بھیجنے کا قائل ہے تو اس کے نزدیک یہ بھیجنا ایسا ہے جیسا کہ فرشتے کا کلام کرنا ہے اقرع، ابرص اور اعمیٰ سے (''أَقْرع'' گنجے کو کہتے ہیں اور ''أَبْرص'' وہ ہے جس کے بدن میں سفید داغ ہوں اور ''أَعْمٰی'' وہ ہے جو اندھا ہو۔ اُن کے پاس اللہ پاک نے فرشتہ بھیجا تھا، اس کا قصہ صحیح بخاری میں ہے۔) جس طرح کہ اس حدیث شریف میں مروی ہے جو صحیحین وغیرہما میں ثابت ہو چکی ہے۔[4] صرف فرشتے کے بات کرنے سے نبوت حاصل نہیں ہوتی۔ دیکھو عمران بن حصین رضی اللہ عنہما پر فرشتوں نے سلام کیا، چنانچہ یہ حدیث بھی صحیح میں ثابت ہے،[5] تو وہ اس سلام کرنے سے کچھ نبی نہیں بن گئے۔

---

[1] رقم الآية (٤٠)   [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٠١۔ ٥٠٢)   [3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٤١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٤)   [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٢٦)

بالجملہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ شریفہ کا نام نامی و اسم سامی یوحانذ تھا۔ کسی نے کہا: لوخا بنت ہاند بن لاوی بن یعقوب۔ اس قول کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے ثعلبی سے نقل کیا ہے۔[1] کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ ﴿ اَنْ اَرْضِعِيْهِ ﴾ میں مفسرہ ہے، اس لیے کہ وحی میں قول کے معنی ہیں، صریح قول نہیں ہے۔ ﴿ اَنْ ﴾ مفسرہ کی جو شرط ہے وہ یہاں موجود ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اَنْ ﴾ مصدریہ ہو۔ "أَيْ: بِأَنْ أَرْضِعِيْهِ" یعنی ہم نے اس کو الہام کیا اس کے دودھ پلانے کا اور یہ الہام ولادت سے پہلے تھا۔ کسی نے کہا: ولادت کے بعد۔ ان کی والدہ کو جو دودھ پلانے کا حکم دیا باوجود اس کے کہ وہ تو ان کو طبعاً پلاتیں، کیوں کہ ماں بالطبع اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے۔

اس سے غرض یہ ہے کہ وہ ان کے دودھ سے مالوف ہو جائیں اور فرعون کے ہاتھ میں چلے جانے کے بعد کسی غیر ماں کے پستان کو قبول نہ کریں۔ چنانچہ وہ ان کو دودھ پلاتیں اور وہ نہ روتے اور نہ اُن کی گود میں حرکت کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو آٹھ ماہ تک دودھ پلایا۔ کسی نے کہا: چار ماہ۔ کسی نے کہا: تین ماہ۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے "أنِ" کو بکسرِ نون اور "ارْضِعِيْهِ" کو بوصلِ ہمزہ پڑھا ہے، چنانچہ کسرہ تو التقائے ساکنین کے لیے ہے اور ہمزۂ وصل کا حذف علی غیر قیاس ہے۔[2]

﴿ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ ﴾ پھر جب تو اس پر اس طور سے ڈرے کہ فرعون کو اس کی خبر پہنچ جائے تو وہ اس کو ذبح کر ڈالے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں فرمایا ہے کہ جب تو اُس بات سے ڈرے کہ تیرے پڑوسی اس کی آواز سن لیں۔[3] ﴿ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ ﴾ تو تو اس کو دریا میں ڈال دے۔ "یَمّ" سے مراد نیل ہے۔ اس میں ڈالنے کی کیفیت کا بیان سورت طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔[4] ﴿ وَلَا تَخَافِيْ ﴾ اور اس کے ڈوبنے اور ضائع ہونے کا وہم اور خوف نہ کر۔ ﴿ وَلَا تَحْزَنِيْ ﴾ اور اس کی جدائی کا غم نہ کر۔ خوف وہ غم ہے جو انسان کو کسی ایسے امر کی وجہ سے پہنچتا ہے جس کی وہ توقع رکھتا ہے مستقبل میں۔ حزن وہ غم ہے جو اس کو کسی المیے کے سبب سے پہنچتا ہے جو زمانۂ ماضی میں واقع ہو چکا ہے۔ اب یہ بات کہنے کی گنجایش نہ رہی کہ دونوں میں کیا فرق ہے، یہاں تک کہ ایک کا دوسرے پر عطف کیا ہے۔

پھر خوف اور حزن سے منع کرنے کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ ﴿ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ یعنی تو خوف اور حزن مت کر، اس لیے کہ ہم تو عن قریب اس کو تیری طرف پھیر لانے والے ہیں، ایسے طریقے سے کہ اس سے اس کو نجات ہو گی اور تو اس پر بے خوف ہو جائے گی اور ہم اس کو ان لوگوں میں سے کرنے والے ہیں جن کو ہم بندوں کی طرف بھیجا کرتے ہیں۔ یہ آیتِ کریمہ عجیب و غریب ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ بہت مختصر ہے، یہ دو احکام پر مشتمل ہے: ﴿ اَرْضِعِيْهِ ﴾ اور ﴿ اَلْقِيْهِ ﴾ اور دو نواہی پر مشتمل ہے: ﴿ لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ﴾ اور اس میں دو خبریں

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٥٠)
[2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٥٠) فتح القدير (٤/ ٢١٠)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٤٢)
[4] رقم الآية (٣٩)

ہیں: ﴿ إِنَّا رَآدُّوهُ ﴾ ﴿ وَجَاعِلُوهُ ﴾ اور ان دو خبروں میں دو بشارتیں شامل ہیں: وہ "رَدَّ" اور "جَعَلَ" مذکور ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ ﴾ میں حرفِ فاء فصیحہ ہے، جملۂ محذوف کا اظہار کرتی ہے، وہ جملہ یہ ہے: "فَأَلْقَتْهُ فِي الْيَمِّ بَعْدَ مَا جَعَلَتْهُ فِي التَّابُوتِ، فَالْتَقَطَهُ مَنْ وَّجَدَهُ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ، أَيْ: أَعْوَانِهِ" التقاط بغیر طلب کیے کسی چیز کے پالینے کو کہتے ہیں، اس کا ترجمہ فارسی میں گرفتن چیزے از زمین ہے۔ آلِ فرعون سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے دریا سے اس صندوق کو لیا جس میں موسیٰ علیہ السلام تھے، معنی یہ ہیں: پس ان کو دریا میں ڈال دیا، اس کے بعد کہ ان کو صندوق میں رکھا۔ پھر آلِ فرعون میں سے اس کو ان لوگوں نے اٹھالیا جنھوں نے اس کو پایا۔ یعنی آلِ فرعون کے ساتھیوں اور مددگاروں نے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "كَانَ فِرْعَوْنُ مِنْ أَهْلِ فَارِسٍ مِنْ إِصْطَخْرَ" یعنی فرعون فارس کے شہر اصطخر سے تھا۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دریائے نیل میں ان کو رات کو ڈالا،[2] پھر اسی رات کی صبح کو ان کو اٹھایا۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ پیر کا دن تھا۔

﴿ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ﴾ یہ لام لامِ عاقبت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے تو اس کو اس لیے لیا تھا کہ اُن کے لیے فرزند ہو اور آنکھ کی ٹھنڈک، نہ اس لیے کہ وہ دشمن ہو۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ وہ ان کا دشمن اور انھیں تکلیف اور غم دینے والا ہو گیا۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے لیے انجام کار میں دشمن ہو کہ اُن کے مردوں کو قتل کرے اور حزن کہ ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائے۔[3] صاحبِ کشاف نے کہا ہے کہ یہ لام لامِ کَیْ ہے، جس کے معنی تعلیل ہیں، لیکن یہ معنی طریقِ مجاز پر وارد ہیں،[4] اس لیے کہ جب یہ عداوت اُن کے فعل کا نتیجہ اور ثمرہ ہوئی تو اس کی تشبیہ داعی و باعث سے دی گئی کہ جس کے لیے فاعل فعل کرتا ہے، اسی باب سے شاعر کا قول ہے: ع

لِدُوا لِلْمَوْتِ وَابْنُوا لِلْخَرَابِ

چوں کہ ولادت کا انجام موت ہے اور مکان بنانے کی عاقبت اور انجام اجاڑ ہے تو گویا جننا موت کے واسطے اور مکان بنانا اُجاڑنے کے لیے ہوا۔ کسی اور نے کہا ہے: ؎

وَلِلْمَنَايَا تُرَبِّيْ كُلُّ مُرْضِعَةٍ وَدُوْرُنَا لِخَرَابِ الدَّهْرِ نَبْنِيْهَا

یعنی ہر دودھ پلانے والی عورت موت کے لیے پالتی پوستی ہے، پرورش کرتی ہے اور ہم گھر بناتے ہیں زمانے کے اُجاڑنے کے لیے۔

جمہور نے ﴿ حَزَنًا ﴾ کو بہ فتح حائے مہملہ و زائے معجمہ پڑھا ہے اور امام اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ نے بہ ضمِ حاء و سکونِ زاء۔ پہلی قراءت کو امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے، یہ دونوں دو لغت

[1] تفسير النسفي (٣/ ٢٢٧) [2] تفسير الجلالين (١/ ٥٠٧)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٥٠٧) [4] الكشاف (٣/ ٣٩٨)

ہیں، جیسے: "عَدَمٌ وعُدُمٌ ورَشَدٌ ورُشُدٌ وسَقَمٌ وسُقُمٌ"۔ [1] جملہ ﴿ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهٰمٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ﴾ تعلیل ہے ما قبل کی، یا معطوف کے درمیان جملۂ معترضہ ہے، یعنی ﴿ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ ﴾ اور معطوف علیہ کے درمیان، یعنی ﴿ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ ﴾۔ اس سے غرض تاکید ہے۔ ﴿ خٰطِـِٕيْنَ ﴾ کے معنی "عَاصِیْنَ، آثِمِیْنَ" ہیں جو "خَطِیْئَةٌ" بہ معنی گناہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی تاکہ ان کے لیے عدو اور حزن ہو، اس لیے کہ فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر اپنے تمام افعال واقوال میں گناہ گار اور نافرمانی کرنے والے تھے۔

چنانچہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں پر عذاب کیے گئے، باوجود اس کے کہ آلِ فرعون کے ہاتھوں پر انھوں نے پرورش پائی۔ چنانچہ یہ بات ان کے ذلیل کرنے میں زیادہ موثر ہے۔ یا ﴿ خٰطِـِٕيْنَ ﴾ خطا سے ماخوذ ہے جو صواب کا مقابل ہے، اس لیے کہ ان کو اس بات کا شعور نہ ہوا کہ یہ وہی ہے جو اُن کے ملک کو کھو دے گا۔ کسی نے "خَاطِیْنَ" بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ احتمال ہے کہ اس قراءت کے معنی وہی ہوں جو جمہور کی قراءت کے ہیں، لیکن ہمزہ کو حذف کرکے اس کی تخفیف کر دی گئی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ "خَطَا یَخْطُوْ" سے ماخوذ ہو، اس کے معنی صحیح سے آگے بڑھنے کے ہیں، یعنی وہ لوگ صحیح سے آگے بڑھنے والے تھے۔

﴿ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ ﴾ اس کا نام آسیہ بنت مزاحم ہے۔ رضي الله عنها۔ یہ بی بی نیک بیبیوں سے اور نبیوں کی بیٹیوں سے تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی پھوپھی تھی، اس کو امام سہیلی رحمہ اللہ نے بیان کیا۔ غرضیکہ فرعون کی بیوی نے فرعون سے کہا، حالاں کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کے قتل کا ارادہ کر چکا تھا۔ ﴿ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ یہ قول امام کسائی رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے، یعنی یہ آنکھ کی ٹھنڈک ہے میرے لیے اور تیرے لیے۔ کسی نے کہا: یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ﴿ لَا تَقْتُلُوْهُ ﴾ ہے۔ یہ امام زجاج رحمہ اللہ کا قول ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

یہ بات اس نے ان کو دیکھنے کے وقت کہی، جبکہ وہ اس کے پاس پہنچے اور ان کو صندوق سے نکالا۔ فرعون سے اور اس کے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا: اس کو مت قتل کرو، یا اکیلے فرعون سے، جمع کے صیغے سے کہا اس کی تعظیم کی خاطر۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح پڑھا ہے: "قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ: لَا تَقْتُلُوْهُ قُرَّةَ عَیْنٍ لِّيْ وَلَكَ"۔ یہ بھی جائز ہے کہ "قُرَّةَ عَیْنٍ" اشتغال کی بنا پر ﴿ لَا تَقْتُلُوْهُ ﴾ سے منصوب ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ فرعون کی عورت نے یوں کہا تھا کہ یہ لڑکا اس عمر سے بڑا ہے جس عمر کے بچوں کو تو ذبح کرتا ہے، لہٰذا تو اس کو چھوڑ دے کہ میرے پاس رہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یوں کہا تھا کہ اس کو قتل مت کرو، اس کو تو اللہ کسی دور کی زمین سے لے کر آیا ہے، یہ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے عن سدی عن کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ ﴿ لَا تَقْتُلُوْهُ ﴾ فرعون

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٥٢۔ ٢٥٣)

کے کلام سے ہے اور اس پر ایسے کلام سے اعتراض کیا ہے جو لفظ کی طرف رجوع کرتا ہے، اس کے رد کرنے میں اس کے اسناد کا ضعف ہی کافی ہے۔ ① غرضیکہ پھر اپنے قول کی وجہ یہ بیان کی کہ اس سے ان کو نفع کے حصول کی اُمید ہے۔ چنانچہ کہا: ﴿ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ ﴾ یعنی شاید ہمارے کام آئے تو ہم اس سے خیر کو پہنچیں، کیوں کہ اس میں اپنے گھر والوں کے لیے برکت کے آثار اور فائدے کے دلائل ہیں۔ ﴿ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ﴾ یا اس کو ہم بیٹا بنا لیں۔ یہ اس لیے کہا کہ اس کی اولاد نہیں ہوتی تھی، چنانچہ فرعون سے اس نے کہا کہ وہ اسے ہبہ کر دے تو اس نے موسیٰ علیہ السلام کو اسے ہبہ کر دیا۔

جملہ: ﴿ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴾ حالیہ ہے، ﴿ اٰلُ فِرْعَوْنَ ﴾ سے حال ہے، یعنی اس کو آلِ فرعون نے اٹھا لیا، حالاں کہ ان کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اس کو اٹھا کر وہ غلطی کر رہے ہیں اور اُن کی ہلاکت اس کے ہاتھ پر ہے۔ یہ جملہ اللہ پاک کے کلام سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرعون کی بیوی کے کلام سے ہے، یعنی بنی اسرائیل اس بات کو نہیں جانتے کہ ہم نے اس کو اٹھا لیا ہے ﴿ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴾۔ اس کے قائل امام کلبی رحمہ اللہ ہیں، یہ قول نہایت بعید ہے۔

امام سمین رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ آسیہ نے جب دیکھا کہ فرعون کی جماعت نے اس کے قتل کا مشورہ دیا ہے تو فرعون سے اس نے یہ کہا: یعنی تو وہ بات کر جو میں کہتی ہوں اور تیری قوم کو خبر نہ ہو۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴾ حال ہے اور ﴿ اٰلُ فِرْعَوْنَ ﴾ ذو الحال ہے۔ کلام کی تقدیر یہ ہے: "فَالْتَقَطَهٗ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا، وَقَالَتِ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ كَذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ، إِنَّهُمْ عَلٰى خَطَأٍ عَظِيْمٍ فِي الْتِقَاطِهٖ وَرَجَاءِ النَّفْعِ مِنْهُ وَتَبَنِّيْهِ، وَقَوْلُهٗ: إِنَّ فِرْعَوْنَ... الآية جُمْلَةٌ اِعْتِرَاضِيَّةٌ وَاقِعَةٌ بَيْنَ الْمَعْطُوْفِ وَالْمَعْطُوْفِ عَلَيْهِ مُؤَكِّدَةٌ لِمَعْنٰى خَطَئِهِمْ، وَمَا أَحْسَنَ نَظْمَ هٰذَا الْكَلَامِ عِنْدَ أَصْحَابِ الْمَعَانِيْ وَالْبَيَانِ" ②

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ
لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰﴾
وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّیْهِ ؗ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا
یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَحَرَّمْنَا عَلَیْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ
اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾
فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ
اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور موسیٰ کی ماں کا دل (صبر و قرار سے) خالی ہو گیا، بے شک قریب تھا کہ وہ اسے ظاہر کر

① فتح القدير (٤/ ٢١١) ② تفسير النسفي (٣/ ٢٢٨) فتح البيان (١٠/ ٩٠۔ ٩٢)

دیتی، اگر ہم نے اس کا دل مضبوط نہ کر دیا ہوتا، تا کہ وہ (ہمارے وعدے پر) یقین کرنے والوں میں سے ہو ⑩ اور موسیٰ کی ماں نے اس کی بہن سے کہا: تو اس کے پیچھے پیچھے جا، پھر وہ (گئی تو) اسے دور سے دیکھتی رہی، جبکہ وہ (فرعونی) بے خبر تھے ⑪ اور ہم نے موسیٰ پر دائیوں (کے دودھ) کو پہلے ہی سے حرام کر دیا تھا، پھر موسیٰ کی بہن نے کہا: کیا میں تمھیں ایک گھر والوں کا بتاؤں جو تمھارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ بھی ہوں؟ ⑫ چناں چہ ہم نے اسے اس کی ماں کے پاس لوٹا دیا، تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کھائے اور تا کہ وہ جان لے کہ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ⑬

والدۂ موسیٰ کی شدید پریشانی اور بچے کی واپسی کا بیان:

یہ جو کہا کہ اس بچے کے خیر خواہ؛ تو یہ اس طرح کہ فرعون کی عورت بنی اسرائیل میں سے تھی، موسیٰ علیہ السلام کے چچا کی بیٹی، ان الفاظ سے وہ پہچان گئی کہ لڑکا ان کا ہے اور جب اُن کو لے کر پالنے لگیں تو اسے دودھ پلوانے کے لیے دائیاں ڈھونڈیں، انھوں نے کسی کا دودھ نہ پیا، آخر لاچار ہو گئے تو اُن کی ماں کو بلایا، اس کا دودھ پینے لگے، اس کے حوالے کیا، پالنے کے لیے ایک دینار روز کی اُجرت کر دی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، بیچ میں بڑے بڑے پھیر پڑ جاتے ہیں، اس میں بہت سے لوگ بے یقین ہونے لگتے ہیں۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کی کیفیت کی خبر دیتا ہے، جب کہ ان کا بیٹا دریا میں چلا گیا کہ ”إِنَّهُ أَصْبَحَ فَارِغًا“ یعنی ان کا دل امورِ دنیا کی ہر شے سے فارغ ہو گیا سوائے موسیٰ علیہ السلام کے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو عبیدہ، ضحاک، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ساری باتیں دل سے جاتی رہیں، صرف موسیٰ علیہ السلام ہی کا خیال رہا۔

﴿ إِنْ كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ ﴾ یعنی اپنے سخت وجد، غم اور افسوس کی وجہ سے قریب تھا کہ وہ یہ ظاہر کر دے کہ اس کا بیٹا جاتا رہا ہے اور لوگوں کو اپنے حال کی خبر دے، مگر اللہ نے اس کو ثابت رکھا اور صبر دیا۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَوْلَا أَنْ رَبَطْنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ ﴾ یعنی اپنی بیٹی کو امر کیا، وہی بڑی بیٹی تھی اور جو کچھ اس سے کہا جائے اسے یاد رکھتی تھی۔ اس کو کہہ دیا کہ تو اس کے پیچھے چلی جا، اس کی خبر رکھ اور شہر کے اطراف سے اس کا حال تلاش کر۔ چنانچہ وہ اس کام کے لیے نکلی۔ ﴿ فَبَصُرَتْ بِهِ عَنْ جُنُبٍ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”عَنْ جَانِبٍ“۔

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٤٦)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ”عَنْ بَعِيْدٍ“ یعنی پھر وہ دیکھتی رہی اس کو ایک کنارے سے، یا دور سے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی طرف نظر کرنے لگی، گویا ارادہ اس کا نہیں کرتی ہے۔[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ اجنبی ہو کر دیکھتی رہی۔

قصہ یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے گھر میں قرار پکڑا اور بادشاہ کی بیوی نے ان کو محبوب رکھا۔ اس سے ان کو رہا کیا تو ان پر وہ دائیاں، جو اُن کے گھر میں تھیں، پیش کیں۔ انھوں نے ان میں سے کسی کا دودھ نہ پیا، پھر ان کو لے کر بازار کی طرف نکلے کہ شاید اُن کو دودھ پلانے کے لیے کوئی ایسی عورت مل جائے جو صالح اور اس لائق ہو۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے ان کو لوگوں کے ہاتھوں میں دیکھا تو ان کو پہچان لیا، مگر کسی سے اس کا اظہار نہ کیا اور نہ ہی لوگوں کو اس کا شعور ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ ﴾ یعنی ہم نے اس کے لیے تحریمِ قدری سے دائیاں پہلے سے حرام کر دی تھیں۔ یہ حرام کرنا موسیٰ علیہ السلام کی عزت اور تعظیم کے لیے تھا اللہ پاک کے نزدیک، اور اس لیے کہ اپنی ماں کے سوا کسی اور کا دودھ پینے سے ان کو محفوظ رکھے اور اس لیے کہ اس کو اللہ پاک نے اپنی ماں کی طرف لوٹنے کا سبب بنایا تھا، تاکہ وہ اپنے خوف سے بے خوف ہو کر ان کو دودھ پلائیں۔

پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے لوگوں کو دودھ پلانے والیوں کے سلسلے میں پریشان دیکھا تو بولیں: ﴿ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پھر جب انھوں نے یہ بات کہی تو فرعون والوں نے ان کو پکڑا اور اُن کے بارے میں شک کیا اور ان سے کہا: ”وَمَا يُدْرِيْكِ بِنُصْحِهِمْ وَشَفَقَتِهِمْ عَلَيْهِ“ یعنی تجھے کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ گھر والے اس کے خیر خواہ اور اس کے حال پر شفیق ہیں؟ تو اس نے کہا کہ ان کی ان کے لیے خیر خواہی اور شفقت اس لیے ہے کہ وہ بادشاہ کے صہر میں ہونے کی رغبت کرتے ہیں اور انھیں اس سے فائدے کی اُمید ہے۔ (یعنی جو گھر والے بادشاہ کے لے پالک کو دودھ پلائیں گے تو ان کا بادشاہ کے ساتھ سسرال کا رشتہ ہوگا، جب ان کو اس کے سبب سے اتنا بڑا مرتبہ ملے گا تو پھر ضرور ہی اس کے خیر خواہ ہوں گے اور اس کے حال پر شفقت کریں گے۔) اس پر اُن کو چھوڑ دیا۔[3] (اس سے معلوم ہوا کہ ظالم و کافر کے ہاتھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے بات کی تاویل کرنا جائز ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں بھی اس پر دلیل ہے)

پھر جب ان سے یہ بات کہی اور ان کی ایذا دہی سے رہائی پائی تو وہ لوگ ان کے ہمراہ اہلِ بیت کی طرف چلے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ کے پاس لے گئے، انھوں نے اپنا دودھ اُن کے منہ میں ڈالا تو انھوں نے لے لیا، اس سے بہت زیادہ خوش ہوئیں اور خوش خبری دینے والا بادشاہ کی بی بی کی طرف گیا اور جا کر یہ خوش خبری دی۔ پھر اس نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بلایا اور اُن پر احسان کیا اور انھیں بہت سی چیزیں عطا کیں، حالاں کہ وہ یہ بات نہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٨٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٥٣٢ـ ٥٣٣) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٥٠)

جانتی تھیں کہ وہ درحقیقت موسیٰ علیہ السلام کی ماں ہیں، لیکن یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ ان کا دودھ موسیٰ علیہ السلام کے موافق ہو گیا اور انھوں نے اس سے دودھ پیا۔

پھر آسیہ نے ان سے درخواست کی کہ اس کے پاس رہیں اور ان کو دودھ پلاتی رہیں۔ انھوں نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ میرا خاوند ہے اور اولاد ہے، مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تیرے پاس قیام کروں، لیکن اگر آپ کو یہ پسند ہو کہ میں اسے اپنے گھر میں رکھ کر دودھ پلاؤں تو یہ مجھے منظور ہے، چنانچہ فرعون کی عورت نے ان کی یہ بات مان لی۔ ان کی تنخواہ مقرر کر دی اور ان کے لیے بہت کچھ عطا اور لباس جاری کر دیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی ماں اپنے بیٹے کو لے کر خوش خوش لوٹ آئیں۔ اللہ پاک نے ان کے خوف کے بعد ان کو امن اور بے خوفی عطا کی۔ وہ عزت اور جاہ اور بہت سا رزق ساتھ لے کر اپنے بیٹے کو لے کر آ گئیں۔

اسی لیے حدیث شریف میں مروی ہے: «مَثَلُ الَّذِي يَعْمَلُ وَيَحْتَسِبُ فِي صَنْعَتِهِ الْخَيْرَ كَمَثَلِ أُمِّ مُوسٰى تُرْضِعُ وَلَدَهَا وَتَأْخُذُ أَجْرَهَا»[1] یعنی اس شخص کی مثال جو کام کرتا ہے اور اپنے اچھے کام میں ثواب کی نیت رکھتا ہے، وہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرح ہے کہ اپنے بچے کو دودھ پلائیں اور اس کے لیے اپنی مزدوری لیں۔ ان کی شدت، یعنی سختی اور آسانی کے درمیان بہت تھوڑا زمانہ تھا، یعنی ایک دن رات یا اس کے قریب قریب کا وقت تھا۔ واللہ أعلم.

پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں سارے کام ہیں جو چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ وہی ہے جو اس شخص کے لیے، جو اس سے ڈرتا ہے، ہر غم کے بعد سہولت اور ہر تنگی کے بعد کوئی راستہ بنا دیتا ہے۔ اور اسی لیے فرمایا ہے: ﴿ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ﴾ یعنی پھر ہم اس کو اس کی ماں کی طرف پھیر لائے، تاکہ اس سے اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ اس پر غم نہ کھائے۔ ﴿ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ اور تاکہ اس بات کو جان لے کہ اللہ پاک کا وعدہ سچ ہے اس بات میں جس کا اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کو اس کی طرف پھیر لائیں گے اور اسے رسولوں میں سے کریں گے۔

پھر جب اللہ پاک اس کو اسی کی طرف پھیر لایا تو اب اس نے یقین کر لیا کہ وہ اللہ کی طرف سے اس کے رسولوں میں سے ایک رسول ہونے والا ہے تو اس کی تربیت اور پرورش میں اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو طبعاً اور شرعاً اس کے لائق اور قابل تھا۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ لیکن بہت سے لوگ اللہ کی حکمتوں کو اس کے افعال میں نہیں جانتے۔ اس کے افعال کے انجام محمودہ ہیں، جن پر وہ دنیا اور آخرت میں محمود ہے، یعنی تعریف کیا گیا۔ بعض اوقات کوئی کام نفوس کو برا لگتا ہے اور اس کا انجام نفس الامر میں قابلِ تعریف ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ ﴾ [البقرة: ٢١٦] ”ممکن

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔" اور فرمایا: ﴿ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ [النساء: ١٩] "پھر اگر تم ان کو ناپسند کرو تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بہتری کر دے۔"[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ اَصْبَحَ ﴾ بہ معنی "صَارَ" ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿ فٰرِغًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان کا دل سوائے موسیٰ علیہ السلام کے امر کے ہر شے سے فارغ ہو گیا، گویا موسیٰ علیہ السلام کے سوا اُن کو کسی شے کا خیال نہ رہا۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر اس شخص سے جو دنیا میں ہے، مگر موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے خالی ہو گیا۔ امام حسن، ابن اسحاق اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس شے سے فارغ ہو گیا جس کی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی تھی، وہ یہ ہے: ﴿ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ﴾ [القصص: ٧] "اور نہ ڈرنا اور نہ غم کھانا۔" اس کی وجہ یہ ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام کے غرق اور ہلاک ہو جانے کی شیطان نے ان کے لیے تسویل کی تھی، یعنی شیطان نے آ کر ان سے جھوٹ کہہ دیا کہ وہ تو ڈوب گئے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا دل خوف و غم سے فارغ ہو گیا، کیوں کہ ان کو اس کا علم تھا کہ وہ نہیں ڈوبے، اس لیے کہ ان کی طرف پہلے وحی آ چکی تھی۔ اسی کے مثل ابو عبیدہ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: بہ معنی "نَاسِيًا ذَاهِلًا" ہے۔ کسی نے کہا: "صِفْرًا مِنَ الْعَقْلِ" یعنی وہ عقل سے خالی ہو گیا۔ علاء بن زیاد رحمہ اللہ نے کہا: "نَافِرًا"۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: "وَالِهًا" یعنی وہ مجنون ہو گیا۔ قریب ہو گئی تھیں کہ "وَا اِبْنَاهُ" گھبراہٹ کی شدت کے مارے کہہ دیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قریب تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شفقت میں اس کے غرق ہونے کے وہم سے چیخ ماریں۔ کسی نے کہا ہے کہ جب انھوں نے یہ سنا کہ ان کا بیٹا فرعون کے ہاتھ میں جا پڑا ہے تو خوف اور دہشت کی وجہ سے ان کے ہوش اڑ گئے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سب قولوں میں سب سے صحیح قول پہلا ہے، جو لوگ اس کے قائل ہیں وہ کتاب اللہ کے زیادہ سمجھنے والے ہیں۔ پھر جب وہ موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے علاوہ ہر شے سے فارغ ہوئی تو وہ وحی سے فارغ ہوئی، اور جس شخص نے یہ کہا ہے کہ وہ غم سے فارغ ہو گئی تو یہ قول غلط اور قبیح ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یہ ہے: ﴿ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

فضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ اور محمد بن سمیفع، ابو العالیہ اور ابن محیصن رحمہم اللہ نے "فَزِعًا" پڑھا ہے بہ حرف فا و

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٠٢۔ ٥٠٣)

زائے معجمہ وعینِ مہملہ فزع سے ماخوذ، یعنی "خَائِفًا وَجِلًا"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "قَرِعًا" بہ فتحِ قاف و رائے مہملہ مکسور وعینِ مہملہ ماخوذ "قَرِعَ رَأْسُهُ" سے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کے سر کے بال کھل جائیں اور دور ہو جائیں۔[1]

﴿ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ ﴾ کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے، اسم اس کا ضمیرِ شان محذوف ہے۔ "أَيْ: أَنَّهَا كَادَتْ" "بَدَا يَبْدُوْ" بہ معنی "ظَهَرَ" ہے اور "أَبْدَى يُبْدِيْ" بہ معنی "أَظْهَرَ" یعنی بے شک حالت یہ ہے کہ قریب تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے حال کو ظاہر کر دے اور اس بات کو کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ یہ اس دہشت اور خوف کی وجہ سے جس نے اس کو آ دبایا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر وحی کی طرف راجع ہے، جو اس کی طرف کی گئی تھی، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ قریب تھا کہ اپنا سینہ تنگ ہونے کے مارے اس کا نام ظاہر کر دے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کہہ دے: "يَا ابْنَاهُ"۔[3] "إِبْدَاءٌ" متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے، لیکن چونکہ یہاں "تُبْدِيْ" میں تصرح (تصریح کرنا) کے معنی شامل ہیں، اس لیے اس کو حرفِ با سے متعدی کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تاکید کے لیے مفعول میں زائد ہے۔ معنی "لَتُبْدِيْهِ" ہیں، جس طرح کہ "أَخَذْتُ الْحَبْلَ وَبِالْحَبْلِ" بولتے ہیں۔ کسی نے کہا: زائد نہیں ہے، سببیت کے واسطے ہے اور مفعول محذوف ہے۔ معنی یہ ہیں: "لَتُبْدِيْ الْقَوْلَ بِسَبَبِ مُوْسٰى أَوْ بِسَبَبِ الْوَحْيِ"۔ پس ضمیر کا موسیٰ علیہ السلام کی طرف یا وحی کی طرف راجع ہونا جائز ہے۔

﴿ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا ﴾ ﴿ لَوْ لَاۤ ﴾ کا جواب محذوف ہے: "أَيْ: لَأَبْدَتْ"، یعنی اگر ہم اس کے دل پر عصمت اور صبر اور اس کو ثابت رکھنے کے لیے گرہ نہ لگا دیتے تو وہ البتہ موسیٰ علیہ السلام کے حال کو ظاہر کر دیتی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دل پر گرہ دینے کے معنی یہ ہیں کہ صبر کا الہام کیا اور دل کو قوت دی۔[4] ﴿ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ رَبَطْنَا ﴾ سے متعلق ہے، یعنی ہم نے اس کے دل پر گرہ لگا دی، تاکہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جائے جو اللہ کے وعدے کو سچا جانتے ہیں اور وہ وعدہ یہی ہے: ﴿ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ ﴾

یوسف بن حسین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دو چیزوں کا امر کیا گیا اور دو شے کی ممانعت کی گئی اور دو چیزوں کی ان کو بشارت دی گئی، چنانچہ اس سب نے ان کو فائدہ نہ دیا، یہاں تک کہ اللہ پاک ان کی نگہبانی اور حفاظت کا متولی ہوا، پھر ان کے دل پر گرہ دے دی۔[5] ﴿ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ﴾ موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام مریم ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نام کاتمہ تھا۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلثوم۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے اس کو ذکر

---

(1) تفسير القرطبي (١٣/ ٢٥٥) فتح القدير (٤/ ٢١٢) (2) تفسير القرطبي (١٣/ ٢٥٦)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٤٧) (4) معاني القرآن (٤/ ١٣٤) (5) تفسير النسفي (٣/ ٢٢٨ـ ٢٢٩)

کیا ہے۔[1] "قَصَّ وَقَصَصَ" کہتے ہیں: "بر پے کسے رفتن" یعنی جب تو کسی کے نقشِ قدم پر چلے اس کا حال دریافت کرتا ہوا تو اس وقت یوں کہے گا: "قَصَصْتُ الشَّيْءَ" یعنی میں نے اس کا کھوج لگایا۔ معنی یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی بہن سے کہا کہ تو اس کے پیچھے چلی جا، اس کا پتا تلاش کر، اس کی خبر لگا اور دیکھ کہ وہ کہاں جا پڑا، کس کی طرف منتقل ہوا۔

﴿ فَبَصُرَتْ بِهٖ ﴾ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "أَبْصَرْتُهُ وَبَصُرْتُ بِهِ" کے ایک ہی معنی ہیں۔ جمہور نے بہ فتح باء وضم صاد پڑھا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بہ فتح صاد، اور عیسیٰ بن عمر نے بکسرِ صاد۔ ﴿ عَنْ جُنُبٍ ﴾ جمہور نے بضمتین، امام قتادہ اور حسن، اعرج اور زید بن علی رحمہ اللہ نے بہ فتح جیم اور سکونِ نون پڑھا ہے اور امام قتادہ رحمہ اللہ سے بفتحتین اور حسن رحمہ اللہ سے بضمِ جیم وسکونِ نون بھی مروی ہے۔[2] ﴿ عَنْ جُنُبٍ ﴾ کے معنی "عَنْ بُعْدٍ" ہیں۔ اصل اس کی "عَنْ مَّكَانٍ جُنُبٍ" ہے۔ اسی باب سے اجنبی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد "عَنْ جَانِبٍ" ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ "أَبْصَرَتْ إِلَيْهِ مُتَجَانِفَةً مُخَاتِلَةً"

نعمان بن سالم کی قراءت "عَنْ جَانِبٍ" اس کی مؤید ہے۔ یعنی اس کی طرف دیکھا مائل اور فریفتہ ہو کر۔ ﴿ عَنْ جُنُبٍ ﴾ کا محل نصب ہے بنا بر حال ضمیر "بَصُرَتْ" سے "أَيْ: بَصُرَتْ بِهِ مُسْتَخْفِيَةً كَائِنَةً عَنْ جُنُبٍ" یا حال ہے ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر مجرور سے: "أَيْ بَعِيدًا مِنْهَا" معنی یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے ان کو اس حال میں دیکھا کہ وہ چھپنے والے تھے، دور کھڑے تھے، یا اُن کو اس حال میں دیکھا کہ وہ بہن سے دور تھے۔ ابو عمرو بن العلاء رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ عَنْ جُنُبٍ ﴾ کے معنی "عَنْ شَوْقٍ" ہیں۔ کہا: یہ جذام کی لغت ہے، وہ بولتے ہیں: "جَنَبْتُ إِلَيْكَ أَيْ: اِشْتَقْتُ إِلَيْكَ"[3] یعنی ان کو شوق سے دیکھا۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا کہ حرف ﴿ عَنْ ﴾ بہ معنی "مِن" ہے اور ﴿ جُنُبٍ ﴾ بہ معنی "مَكَانٍ بَعِيدٍ"۔[4] یعنی ان کو دور جگہ سے چھپ کر دیکھا۔

﴿ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی حال یہ ہے کہ فرعون والے نہیں جانتے تھے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن ہے اور ان کو تلاش کر رہی ہے اور ان کو تاک رہی ہے۔ امام طبرانی اور ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: کیا تو نے نہ جانا کہ اللہ نے میرا نکاح مریم بنت عمران اور موسیٰ علیہ السلام کی بہن کلثوم اور فرعون کی بی بی سے کر دیا ہے؟ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو مبارک ہو۔[5] (وأخرجه ابن عساكر عن ابن أبي روّاد مرفوعا بأطول من هذا وفي آخره إنها قالت: بالرِّفاء والبنين)

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٥٦) [2] فتح القدير (٤/ ٢١٣) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٥٧) [4] تفسير الجلالين (١/ ٥٠٧)

[5] المعجم الكبير (٨/ ٥٨) تاريخ دمشق (٧٠/ ١١٨) اس میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بجائے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ذکر ہے، نیز سند میں ایک سے زیادہ سخت ضعیف راوی ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٧٠٥٣)

("رفاء" بہ معنی التیام واتفاق وبرکت ونماء کے ہے، ماخوذ ہے: "رفأت الثوب" سے۔عرب لوگ نکاح کی مبارک بادی میں یہ کلمہ کہا کرتے تھے۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے اس کو بدل دیا، اس کے عوض یہ کلمہ مقرر فرمایا: «بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا عَلىٰ خَيْرٍ»[1] كذا في مجمع البحار.

پھر اللہ پاک نے ان کو ماں کی طرف پھیرنے کا سبب بیان کرنا شروع کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ﴾. "مَرَاضِعَ" جمع ہے "مُرْضِعٌ" کی۔حرفِ تا اس لیے حذف کیا ہے کہ یہ عورتوں کے ساتھ خاص ہے، یا بہ معنی شخص مرضع کے ہے۔کسی نے کہا ہے کہ جمع ہے "مَرْضَعٌ" بہ فتحِ میم وضاد کی۔"مَرْضَعٌ" مصدر میمی بہ معنی "رَضَاعٌ" یا ظرف ہے بہ معنی موضع رضاع کے، موضع رضاع ہوا پستان اور ﴿حَرَّمْنَا﴾ بہ معنی "مَنَعْنَا" ہے۔مجازاً یا بطور استعارے کے یا بطریق مجاز مرسل کے، کیوں کہ جس شخص پر کوئی شے حرام کی گئی تو یقیناً وہ اس سے منع کیا گیا۔مجاز و استعارہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بچہ مکلفین کے زمرے سے نہیں ہے کہ اس پر کوئی شے حرام کی جائے، اس لیے تحریم بہ معنی منع لے لیے گئے۔معنی یہ ہیں کہ اس کو اس بات سے روک رکھا کہ وہ دودھ پلانے والیوں سے دودھ پیے، یا دودھ پینے سے، یا پستانوں سے ہم نے اس کو باز رکھا۔

﴿مِنْ قَبْلُ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پہلے اس سے کہ ہم اس کو اس کی ماں کی طرف پھیر لائیں، یا پہلے اس کے کہ اس کی ماں اس کے پاس آئے، یا اس کی بہن کے تلاش کر لینے سے پہلے۔سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ نہیں لائی جاتی تھی کوئی دودھ پلانے کہ اس کو قبول کریں۔[2] مطلب یہ ہے کہ جو دودھ پلانے والی آتی اس کے پستان کو قبول نہ کرتے تھے۔فرعون کی عورت نے ان کے لیے بہت سی دائیاں طلب کیں، تاکہ ان کو دودھ پلائیں، مگر انھوں نے ان میں سے کسی کا دودھ نہ پیا۔

ان کی بہن نے جب ان کا دودھ پینے سے باز رہنا دیکھا اور ان پر فرعون والوں کی شفقت اور مہربانی ملاحظہ کی تو بولیں: ﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ﴾ یعنی میں تم کو ایک گھر والے بتاؤں کہ وہ اس کو پال دیں تمھارے لیے، یعنی تمھارے لیے اس کی خدمت و تیمار داری اور دودھ پلانے کے ضامن ہوں اور وہ ایک عورت ہے کہ اس کا بچہ قتل کیا گیا ہے اور اس کو یہ بات سب سے زیادہ محبوب ہے کہ کسی کے بچے کو پائے اور اسے دودھ پلائے۔ (یہ قول امام خازن کے علاوہ اور کسی نے ذکر نہیں کیا)۔[3] ﴿وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ﴾ یعنی اور وہ گھر والے اس پر مہربان ہوں، اس کے دودھ پلانے میں اور اس کی پرورش کرنے اور پالنے میں کوتاہی نہ کریں۔

"نَصَحَ" عمل کے خالص کرنے کو کہتے ہیں، کسی قسم کی خرابی سے پاک۔ یہاں عبارت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: پس فرعون والوں نے کہا ہے کہ وہ گھر والے کون ہیں؟ تو اُن کی بہن نے کہا کہ میری ماں ہے۔ پھر

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٣٤٨) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٥٣٣) [3] تفسير الخازن (٥/ ١٦٦)

پوچھا کہ اس کے دودھ ہے؟ کہا: ہاں، میرے بھائی ہارون علیہ السلام کا دودھ ہے، ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس میں بچوں کا قتل نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے فرعون والوں کو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے متعلق بتا دیا تو موسیٰ علیہ السلام کو انھیں دے دیا، انھوں نے ان کا پستان قبول کیا اور اس سے دودھ پیا۔ کہتے ہیں کہ ایک دینار ہر روز ان کو دیتی تھی۔ رہی یہ بات کہ اس کا لینا ان کو کیوں حلال ہوا؟ تو اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ حربی کا مال تھا نہ یہ کہ اپنے بچے کے دودھ پلانے پر اجرت تھی۔

﴿ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ یعنی پھر ہم اس کو اس کی ماں کی طرف پھیر لائے، تاکہ اپنے بچے کے ملنے سے اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور اس کی جدائی پر رنج نہ کرے اور تاکہ اس بات کو جان لے کہ اللہ کے سارے وعدے سچے ہیں، ان میں کسی طرح کا خلاف نہیں ہے۔ وہ ضرور پورے ہونے والے ہیں۔ ان میں سے یہ ہے جس کا ان کی ماں سے ان الفاظ سے وعدہ کیا تھا: ﴿ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ ﴾

﴿ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی لیکن آلِ فرعون کے اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے، بلکہ وہ تو قدر سے اور سرِّ قضا سے غفلت میں تھے۔ یا یہ معنی ہیں کہ اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے، یا اس بات کو نہیں جانتے کہ اللہ پاک نے ان کی ماں سے یہ وعدہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کی طرف پھیر لائے گا اور یہ عورت ان کی بہن ہے اور یہ ان کی ماں ہے۔[1]

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝۱۴ وَ دَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰى حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَى الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَیْهِ ۫ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ۝۱۵ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝۱۶ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ۝۱۷

اور جب وہ (موسیٰ) اپنی جوانی کو پہنچا اور (عقل وشعور میں کامل اور) پورا طاقتور ہوگیا تو ہم نے اسے قوتِ فیصلہ اور علم دیا، اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ⑭ اور وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جبکہ اہلِ شہر غفلت میں تھے، پھر اس نے شہر میں دو آدمیوں کو باہم لڑتے پایا، یہ (ایک تو) اس کے اپنے گروہ میں سے تھا اور یہ (دوسرا) اس کے دشمنوں میں سے

[1] فتح البیان (۱۰/ ۹۳۔ ۹۶)

تھا، پھر جو اس کے اپنے گروہ میں سے تھا اس نے موسیٰ سے اس شخص کے خلاف مدد مانگی جو اس کے دشمنوں میں سے تھا، چناں چہ موسیٰ نے اسے گھونسا مارا تو اس کا کام تمام کر دیا (پھر) کہا: یہ (قتل) شیطان کے عمل سے ہے، بلاشبہ وہ گمراہ کرنے والا کھلم کھلا دشمن ہے ⑮ موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے، لہٰذا تو میری مغفرت فرما، چناں چہ اللہ نے اسے بخش دیا، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ⑯ موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھ پر انعام کیا ہے، لہٰذا میں مجرموں کا مددگار ہرگز نہیں بنوں گا ⑰

قصہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل کا:

جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو فرعون کی قوم سے ان کے کفر کی وجہ سے بے زار رہتے اور بنی اسرائیل ان کے ساتھ لگے رہتے۔ انھوں نے وہی دو شخص لڑتے ہوئے دیکھے۔ فرعونی ظالم تھا، اس کو ادب سکھانے کے لیے مارا، اس کی اجل آ گئی اور وہ مر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام پچھتائے کہ بے ارادہ خون ہو گیا۔ ان کی ماں کا گھر اس شہر سے باہر تھا، جہاں سب بنی اسرائیل رہتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کبھی وہاں جاتے اور کبھی فرعون کے گھر آتے۔ فرعون کی قوم ان کی دشمن تھی کہ یہ غیر قوم کا شخص ہے، ایسا نہ ہو کہ زور پکڑ جائے۔ جو کہا کہ اب ہرگز میں کسی گناہ گار کا مددگار نہ بنوں گا تو شاید اس فریادی کا بھی کچھ قصور ہو اور اللہ تعالیٰ کا بخشنا انھوں نے الہام کے ذریعے جانا اور پیغمبر لوگ نبوت سے پہلے ولی تو ہوتے ہیں۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائے امر کا ذکر کیا تو یہ بات ذکر فرمائی کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی جوانی کو پہنچ گئے اور پورے توانا ہو گئے تو اللہ پاک نے ان کو حکم دیا اور سمجھ عطا فرمائی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نبوت ہے۔[1] پھر اللہ پاک نے ان کے نبوت اور تکلیم (اللہ سے ہم کلام ہونا) کی طرف پہنچنے کا سبب بیان کیا، جو اللہ پاک ان کے لیے مقدر فرما چکا تھا۔ وہ سبب اس قبطی کے قتل کا واقعہ ہے، جو ان کے دیارِ مصریہ سے نکل کر بلدِ مدین کی طرف جانے کا سبب ہوا۔ چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا ﴾ امام ابن جریج نے عن عطاء خراسانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ وہ وقت مغرب اور عشاء کے درمیان ہے۔ نیز ابن جریج نے عن ابن المنکدر عن عطاء بن یسار عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ اسی طرح امام عکرمہ، سدی، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] ﴿ يَقْتَتِلٰنِ ﴾ سے مراد "يَتَضَارَبَانِ وَيَتَنَازَعَانِ" ہے، یعنی وہ دونوں باہم ایک دوسرے کو مار رہے تھے اور کھینچا تانی کر رہے تھے۔

﴿ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ ﴾ سے مراد اسرائیلی ہے اور ﴿ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ﴾ سے مراد قبطی ہے۔ یہ قول سیدنا

---

① تفسیر الطبري (۱۹/ ۵۳۶) ② تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۵۳)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، سدی اور محمد بن اسحاق رحمہم اللہ کا ہے۔[1] اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام سے فریاد رسی چاہی اور انھوں نے فرصت پائی اور وہ لوگوں کی غفلت کا وقت تھا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کی طرف قصد کیا، اس کو مکا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ”وَكَزَهُ، أَيْ: طَعَنَهُ بِجَمْعِ كَفِّهِ“، یعنی اپنی ہتھیلی کو جمع کر کے اس کو مارا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ”وَكَزَهُ بِعَصًا كَانَتْ مَعَهُ“[2] یعنی جو عصا اُن کے پاس تھا اس سے اس کو مارا۔

﴿ فَقَضٰى عَلَيْهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس میں اس کی موت تھی، چنانچہ وہ مر گیا۔ ﴿ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴾ یعنی جو جاہ وعظمت تو نے مجھے عطا کی ہے اس کے سبب سے میں پھر کبھی ان لوگوں کا معاون اور مددگار نہیں بنوں گا جو تیرے کافر اور منکر ہیں اور تیرے حکم کے مخالف ہیں۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا مضبوط بیان یہ ہے کہ ”أَشُدَّ“ کے معنی ہیں نہایت قوت اور پوری عقل۔ یہ شدت کی جمع ہے، جیسے نعمت کی جمع انعم ہے سیبویہ کے نزدیک۔ امام ربیعہ اور مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”أَشُدّ“ سے مراد ”حُلُم“ ہے،[4] اس لیے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴾ [النساء: ٦]

”یہاں تک کہ وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم انھیں سمجھ دار پاؤ تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو، اور تم ان کے مال حد سے بڑھ کر اور جلدی کرتے ہوئے اس خیال سے نہ کھاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (اور اپنا حق مانگیں گے)۔ اور جو (سرپرست) مال دار ہو، وہ (یتیم کا مال کھانے سے) بچے، اور جو غریب ہو وہ جائز طریقے سے (اس کا مال) کھا سکتا ہے، پھر جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرو تو ان پر کسی کو گواہ ٹھہرا لو، اور اللہ حساب لینے والا کافی ہے۔“

اس کا اخیر سی و چہار (۳۴) سال ہے، جیسا کہ امام مجاہد اور سفیان ثوری رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ اٹھارہ اور تیس برس کے درمیان ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سہ وسی سال (۳۳) ہے۔[6] سورۃ الانعام میں ”أَشُدّ“ کا بیان گزر چکا ہے۔[7] استوا کے معنی اعتدال اور تمام استحکام کے ہیں۔ یہ تیس سال سے چالیس سال تک ہوتا ہے۔ پھر جب چالیس سال سے زیادہ ہوتا ہے تو نقصان، یعنی کمی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[8] کسی نے کہا ہے کہ استواء چالیس برس کو پہنچنا ہے۔ مروی ہے کہ کوئی نبی مبعوث

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۵٤) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۵۵) [3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٥٠٤)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۵۱) [5] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۵۱) فتح القدیر (٤/ ۲۱۵)
[6] الدر المنثور (٦/ ۳۹۷) [7] رقم الآیة (۱۵۲) [8] الدر المنثور (٦/ ۳۹۷)

نہ ہوا مگر چالیس برس کے سر پر۔ کسی نے کہا ہے کہ استواء کمال خلقت کی طرف اشارہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أشد" اور "استواء" کے معنی ایک ہی ہیں۔ یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ عطف مغایرت کا پتا دیتا ہے۔ حکم سے مراد حکمت علی العموم ہے۔ کسی نے کہا: نبوت۔ کسی نے کہا: دین میں سمجھ اور علم وفہم ہے۔ یہ قول سدی رحمہ اللہ کا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ سمجھ مراد ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے اور اپنے آباء واجداد کے دین کا علم مراد ہے۔[1] کسی نے کہا کہ یہ نبوت سے پہلے تھا، اس کے معنی کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جیسی جزا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو دی، جب وہ اللہ کے حکم کی مطیع اور فرماں بردار ہوگئی اور اپنے بچے کو دریا میں ڈال دیا اور اللہ کے وعدے کو سچا جانا، اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو ان کی نیکی پر جزا دیتے ہیں، اس سے مراد علی العموم ہے۔ "مدینة" سے مراد مدینۂ مصر کبریٰ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کوئی اور شہر مصر کے شہروں میں سے۔ یہ منف تھا اعمالِ مصر سے۔ کسی نے کہا ہے کہ مصر سے دو کوس کے فاصلے پر ام خنان یا حابین۔ کسی نے کہا ہے کہ مدینۂ عین شمس۔

جملہ ﴿ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا ﴾ منصوب ہے بنا بر حال فاعلِ "دَخَلَ" سے، یعنی اس شہر میں داخل ہوئے درآنحالیکہ اس کے لوگوں سے چھپنے والے تھے۔ کہتے ہیں: اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے دین میں جس حق پر وہ تھے اس کو جانا پہچانا تو فرعون کی قوم جس حال پر تھی اس کو انھوں نے برا جانا، اس کا عیب بیان کیا اور ان سے یہ بات مشہور ہوگئی تو فرعون والوں نے ان کو ڈرایا تو وہ ان سے ڈرے، اس لیے شہر کے اندر چھپ چھپ کر آتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ﴿ حِيْنِ غَفْلَةٍ ﴾ کی تفسیر میں دو قول ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ وہ دن ان کی عید کا دن تھا، وہ لوگ اپنے لہو ولعب میں مشغول تھے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات طلب کی کہ شہر میں ایسے وقت میں داخل ہوں جبکہ اہلِ شہر غفلت میں ہوں، چنانچہ وہ اس وقت داخل ہوئے جس کو ان سے جان لیا تھا۔[3]

پھر ان سے وہ بات ہوگئی جس کی حکایت اللہ پاک نے اپنے اس قول میں فرمائی ہے: ﴿ فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ﴾ یعنی اس میں دو آدمیوں کو پایا کہ وہ جھگڑ رہے تھے۔ ﴿ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ ﴾ یعنی یہ ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے ان کی مشایعت ومتابعت (پیروی) کی تھی ان کے دین پر، یہ لوگ بنی اسرائیل تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اسرائیلی تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ سامری۔ ﴿ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ﴾ یعنی یہ ان لوگوں میں سے تھا جو ان کی عداوت کرنے والے تھے اُن کے دین کی وجہ سے۔ یہ لوگ فرعون کی قوم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شخص قبطی تھا جو فرعون کا باورچی تھا، اس کا نام فاتون یا فلیثون تھا اور بالاتفاق کافر تھا۔ رہا اسرائیلی تو کسی نے کہا ہے کہ مومن تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ کافر تھا۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۵۲) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۲٦۰)

﴿ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ﴾ استغاثہ بہ معنی طلبِ غوث ہے، یعنی فریاد رسی چاہنا۔ مطلب یہ ہے کہ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ چاہا کہ اس کے دشمن پر اس کی معاونت اور مدد کریں تو انھوں نے قبطی پر اس کی فریاد رسی کی، اس لیے کہ مظلوم کی مدد کرنا سب ملتوں میں واجب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قبطی نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اسرائیلی کو بیگار میں پکڑے، تاکہ فرعون کے باورچی خانے کے لیے لکڑیاں لاد کر لے چلے، مگر اس نے انکار کیا اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد رسی چاہی۔

﴿ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰی ﴾ "وَکَزَ" مارنے کو کہتے ہیں اور ہتھیلی کو جمع کر کے اس کے ساتھ کسی کو دور کرنے کو کہتے ہیں۔ (اصل کے الفاظ "بِجُمْعِ الْکَفِّ" ہے۔ جمع بہ ضمِ جیم وسکونِ میم اضافت صفت کی ہے طرف موصوف کے۔ "أي بكفه مجموعة" مطلب یہ ہے کہ ہتھیلی کو انگلیوں سے جمع کر کے مارا۔ آیندہ جہاں یہ لفظ ہیں، اس کے یہی معنی ہیں۔) مراد مکا مارنا ہے۔ اسی طرح "لَکَزَ وَلَھَزَ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "لَکَزَ" جبڑوں پر مارنا ہے اور "وَکَزَ" دل پر مارنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "لَکَزَ" انگلیوں کے اطراف سے مارنا اور "وَکَزَ" ہتھیلی کو جمع کر کے مارنا ہے۔ کسی نے اس کے برعکس کہا ہے اور "نَکَزَ" بہ مثل "لَکَزَ" کے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے اس کو اپنے عصا سے مارا تھا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "فَلَکَزَهٗ" پڑھا ہے اور امام ثعلبی رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف شریف میں "فَنَکَزَهٗ" بہ نون ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نَکَزَهٗ" بہ نون کے معنی "ضَرَبَهٗ وَدَفَعَهٗ" ہیں۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "لَکَزَ" سینے پر مارنا ہے۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے جسم میں مارنا، یعنی اس کو "لَکَزَ" کہتے ہیں۔ "لَھَزَ" دونوں ہاتھوں کو جمع کر کے سینے پر مارنا ہے۔ اسی کی مثل ابو عبیدہ سے مروی ہے۔[1]

﴿ فَقَضٰی عَلَیْهِ ﴾ ضمیر مرفوع اللہ پاک کی طرف راجع ہے، یا "وَکَزَ" کی طرف، یا موسیٰ علیہ السلام کی طرف۔ ظاہر یہی ہے، یعنی اس کو قتل کر ڈالا۔ اور ضمیر مجرور راجع ہے قبطی کی طرف، یعنی موت کو اس پر واقع کر دیا۔ ہر شے جس پر تو آیا اور اس سے فارغ ہو گیا تو یقیناً تو نے اس پر قضاء کی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا کام تمام کر دیا۔ کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کے قتل کا ارادہ نہیں کیا تھا، ان کا ارادہ تو صرف اس کو دور کرنا تھا، مگر یہ اس کے نفس پر چوک کر آ گیا، چنانچہ وہ نادم ہوئے اور اس کو ریت میں دفن کر دیا۔ "وَکَزَهٗ" غالباً قتل کرتا نہیں ہے، لیکن وہ اس کی اجل کے مطابق آ پڑا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ﴾

یہ بات جو انھوں نے کہی باوجود اس کے کہ وہ کافر لائقِ قتل تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان کو کافروں کے قتل کا حکم نہیں ہوا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ حالتِ قتال سے باز رہنے کی حالت تھی، کیونکہ وہ ان کے نزدیک

---

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢٦٠۔ ٢٦١)

مامون تھے، چنانچہ ان کے لیے یہ بات صحیح نہیں تھی کہ ان کو دھوکے سے ماریں، اس لیے یہ کام ان پر گراں گزرا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ هٰذَا ﴾ کا اشارہ نفسِ مقتول کی طرف ہے، یعنی وہ شیطان کے لشکر اور جتھے سے تھا۔ پھر شیطان کا یہ بیان کیا کہ ﴿ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی بے شک شیطان انسان کا دشمن ہے، وہ اس کے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ظاہر العداوت والاضلال ہے، یعنی اس کی عداوت اور دشمنی کھلی ہوئی ہے اور وہ ظاہر طور پر بہکانے کو پھرتا ہے۔

پھر اللہ پاک سے اس بات کی دعا کی کہ جو کچھ ان سے ہو گیا ہے اسے بخش دے۔ لہٰذا یوں عرض کی: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ﴾ یعنی اے میرے پروردگار! میں نے قبطی کو مار کر اپنی جان کے لیے برا کیا ہے لہٰذا تو مجھے بخش دے، پس اللہ پاک نے ان کی یہ خطا بخش دی اور انھیں الہام یا غیر الہام سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اللہ نے ان کو بخش دیا، اس سے ان کی اس وقت میں نبوت ثابت نہیں ہوتی۔ ﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ ﴾ "بِإِقَالَةِ الزَّلَلِ" ﴿ الرَّحِيْمُ ﴾ "بِإِزَالَةِ الْخَلَلِ الْمُتَّصِفِ بِهِمَا فِي الْأَبَدِ وَالْأَزَلِ" یعنی بے شک اللہ پاک بڑا بخشنے والا ہے لغزشوں کو، درگزر کرنے اور ان دونوں صفتوں کے ساتھ ابد و ازل میں خلل کو دور کرنے کے لیے متصف ہے۔

استغفار کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات نبی کے لائق نہیں کہ وہ قتل کرے، یہاں تک کہ اسے حکم ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے اولیٰ اور افضل کو ترک کیا اس سے مغفرت طلب کی، جیسا کہ رسولوں کا طریقہ ہے۔ یا ان کی مراد یہ ہے کہ میں نے اس کافر کو مار کر اپنی جان پر ظلم کیا، اس لیے کہ اگر فرعون اس بات کو جان لے گا تو اس کے بدلے میں مجھے قتل کر ڈالے گا۔ کسی نے کہا: ﴿ فَاغْفِرْ لِيْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ مجھ پر اس کا ستر کر کہ فرعون کو اس کا پتا نہ چلے، یہ قول ظاہر کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام ہمیشہ اس بات پر نادم رہے اور اس کی سزا سے ڈرتے رہے، یہاں تک کہ قیامت کے دن جس وقت لوگ ان سے شفاعت کے طالب ہوں گے تو کہیں گے کہ میں نے تو ایک ایسی جان کو قتل کیا ہے جس کا مجھے حکم نہیں ہوا تھا، چنانچہ یہ شفاعت کی حدیث صحیح میں ثابت ہو چکی ہے۔[1]

کسی نے کہا ہے کہ یہ فعل تو نبوت سے پہلے ہوا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ان کے سنِ تکلیف میں پہنچنے سے پہلے ہوا، یعنی ایسی عمر میں جب اس قسم کے فعل پر مواخذہ نہیں ہوتا ہے، اس وقت وہ بارھویں سال میں تھے۔ یہ سب بعید تاویلیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی عصمت کی حفاظت کے لیے کی جاتی ہیں جس کا ثبوت ہو چکا کہ بلا شک وہ سب کبیرہ گناہوں سے معصوم ہیں اور وہ قتل جو موسیٰ علیہ السلام سے ہوا وہ کچھ ارادے سے نہیں ہوا، اس لیے کہ غالباً "وَكَزَهٗ"، قتل نہیں کرتا۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ وہ دفع صائل، یعنی حملہ آور کو دور کرنے کے قبیل سے تھا اور اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے جو اس کی فریاد رسی کی تو وہ اس لیے کہ

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٣٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٤)

ساری ملتوں میں مظلوم کی مدد کرنا دین کا حصہ ہے اور تمام شریعتوں میں فرض ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ان کا یہ قول تواضع اور انکساری کے طور پر ہے اللہ پاک کے لیے اور اپنی تقصیر کے اعتراف اور اقرار کے طور پر ہے، تاکہ حقوقِ الٰہی قائم ہوسکیں، اگرچہ وہاں کوئی گناہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہ "حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ" کے باب سے ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے ان کا سوال قبول کرلیا اور جس بات کی اس سے بخشش طلب کی تھی وہ ان کو بخش دی تو یہ عرض کی: ﴿ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴾ حرفِ باء قسم کے واسطے ہے اور کلمۂ ما موصولہ ہے یا مصدریہ اور قسم کا جواب محذوف ہے، یعنی اے میرے رب! میں تیرے انعام کی قسم کھاتا ہوں جو تو نے مغفرت کر کے مجھ پر کیا ہے، البتہ میں توبہ کرتا ہوں۔ یہ قول امام زمخشری، مہدوی اور ماوردی رحمہم اللہ کا ہے اور جملہ ﴿ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴾ مثل تفسیر کے ہے جوابِ محذوف کے لیے۔ گویا یوں کہا ہے کہ میں اس شے کی قسم کھاتا ہوں جس کا تو نے مجھ پر انعام کیا ہے کہ میں مدد نہ کروں گا کسی مجرم کی۔

کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ ﴾ سے مراد وہ حکم و معرفت اور علم و توحید ہے جو اللہ پاک نے ان کو عطا کی تھی۔ یہ قول امام قرطبی رحمہ اللہ کا ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انعام کیا تو نے مجھ پر ساتھ مغفرت کے، پس تو نے مجھ پر عتاب نہیں کیا۔[2] یہ بھی جائز ہے کہ حرفِ باء سببیہ ہو، محذوف سے متعلق ٹھہرے: "أَيْ أَعْصِمْنِي" یعنی اے میرے رب! بچا مجھ کو بہ سبب اس شے کے جس کا تو نے مجھ پر انعام کیا ہے اور ﴿ فَلَنْ اَكُوْنَ ﴾ اس پر مترتب ہوگا اور اس میں استعطاف ہوگا واسطے اللہ تعالیٰ کے اور توصل ہوگا اس کے انعام کی طرف اس کے انعام کے ساتھ۔ غرض یہ ہے کہ اللہ پاک سے عطف اور مہر طلب کرتے ہیں اور ایک انعام کو دوسرے انعام کا وسیلہ ٹھہراتے ہیں۔ الٰہی! جو کچھ تو نے مجھ پر انعام کیا ہے اس کے سبب سے اب مجھ پر یہ انعام کر کہ مجھ کو اس بات سے بچا اور محفوظ کر، تاکہ میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں۔

مجرمین کی مظاہرت سے مراد یا تو فرعون کی صحبت ہے اور ظاہری طور پر اس کے جملے میں منتظم ہونا ہے، یا مراد اس کی اس شے پر مظاہرت ہے جس میں گناہ ہے، یا مراد اس کی جماعت کو بڑھانا ہے۔ امام کسائی اور فراء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴾ میں خبر نہیں ہے، بلکہ دعا ہے، یعنی اے میرے رب! تو مجھ کو ان کا مددگار مت کر۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: "فَلَا تَجْعَلْنِيْ يَا رَبِّ ظَهِيْرًا لِلْمُجْرِمِيْنَ" امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: "اَللّٰهُمَّ فَلَنْ أَكُوْنَ... إلخ" امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو خبر کے باب میں ٹھہرانا نسقِ کلام کے زیادہ مشابہ اور وافی ہے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٦٠) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٦٢) [3] فتح القدير (٤/ ٢١٦۔ ٢١٧)

اس میں اس بات پر دلیل ہے جس اسرائیلی کی موسیٰ علیہ السلام نے معاونت کی تھی، وہ کافر تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ میں نے اس قتل میں برائی کا ارتکاب کیا، جس کا مجھے حکم نہیں ہوا تھا، لہٰذا میں مجرموں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کرنا نہیں چھوڑوں گا، چنانچہ اس بنا پر اسرائیلی مومن ٹھہرے گا اور مومنین کی مدد کرنا سب دینوں میں واجب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے ان شاء اللہ نہیں کہا تھا، اس لیے دوسرے دن مبتلا ہو گئے، یعنی یوں نہیں کہا: "فَلَنْ أَكُونَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ"[1]

فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآىِٕفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۸ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖۗ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝۱۹ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ؗ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۰ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآىِٕفًا يَّتَرَقَّبُ ؗ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۱

پھر موسیٰ نے شہر میں ڈرتے ڈرتے (ہر طرف سے خطرے کے) انتظار میں صبح کی، تو اچانک (دیکھا کہ) وہ شخص جس نے کل اس سے مدد مانگی تھی، اسے مدد کے لیے پکار رہا ہے، موسیٰ نے اس سے کہا: بلاشبہ تو تو کھلا گمراہ شخص ہے (18) پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ اس شخص کو پکڑے جو ان دونوں کا دشمن تھا تو وہ (اسرائیلی) بول اُٹھا: اے موسیٰ! کیا تو مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے جیسے تو نے کل ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، تو یہی چاہتا ہے کہ زمین میں بڑا متکبر و سرکش ہو اور تو نہیں چاہتا کہ تو اصلاح کرنے والوں میں سے ہو (19) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا آیا (اور) اس نے کہا: اے موسیٰ! بلاشبہ سردار تیرے خلاف مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر ڈالیں، لہٰذا تو نکل جا، بے شک میں تیرے خیر خواہوں میں سے ہوں (20) تو موسیٰ اس شہر

[1] فتح البیان (۱۰/ ۹۷۔۱۰۱)

سے ڈرتا سہمتا، (پکڑے جانے کے) انتظار میں نکلا، (اور) اس نے کہا: اے میرے رب! تو مجھے ظالم قوم سے نجات دے ﴿21﴾

موسیٰ علیہ السلام کے راز کا افشاء ہونا:

خبریں لینے کے لیے کہ خون والے فرعون کے پاس فریاد لے گئے ہیں، دیکھیے کس پر جرم ثابت ہو اور مجھ سے کیا سلوک کریں۔ صریح بے راہ اس طرح ہے کہ ہر روز ظالموں سے اُلجھتا ہے اور مجھ کو لڑواتا ہے۔ ہاتھ تو اس ظالم پر ڈالنا چاہا، مگر بول اُٹھا مظلوم، وہ سمجھا کہ زبان سے مجھ پر غصہ کیا ہاتھ بھی مجھ پر چلائیں گے۔ وہ کل کا خون چھپا رہا تھا کہ کس نے کیا، آج اس کی زبان سے ظاہر ہو گیا۔ یہ ہمارے رسول ﷺ کو سنایا کہ وہ بھی جان کے خوف سے شہر سے نکل جائیں۔ کافر سب اکٹھے ہوئے تھے کہ سب مل کر ان پر حملہ کریں۔ رات آئی تو آپ ہجرت کر کے نکل پڑے۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ جب وہ اس قبطی کو قتل کر چکے تو صبح کو اُٹھے شہر میں اس کام سے، جو کر بیٹھے تھے، ڈرتے ہوئے آئے۔ ﴿يَتَرَقَّبُ﴾ کے معنی ہیں: ادھر ادھر دیکھتے اور توقع کرتے تھے، اس کام کی جو آیندہ ہو گا۔ پھر کسی راہ پر گزرے تو اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد چاہی تھی اس قبطی پر، ایک اور آدمی سے لڑ رہا ہے، پھر جب موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس سے گزرے تو اس نے ان سے فریاد چاہی، اس پر انھوں نے اس سے کہا کہ تو تو بڑا کھلا ہوا بے راہ ہے، بڑا شریر ہے۔

پھر انھوں نے اس قبطی پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا تو اس اسرائیلی نے اپنی خواری، ضعف اور ذلت کے باعث یہ خیال کیا کہ موسیٰ علیہ السلام اس کو مارنے کا ارادہ کرتے ہیں، جب اس نے یہ سنا کہ انھوں نے اسے "غَوِيٌّ مُّبِينٌ" کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے ان کا زبانی غصہ سنا تو سمجھا کہ وہ مجھے ہی ماریں گے، حالاں کہ ان کا اسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، انھوں نے قبطی کو مارنے کا ارادہ کیا تھا، چنانچہ اس نے آپ کو اپنی جان سے دور کرنے کے لیے یہ کہہ دیا کہ تو چاہتا ہے کہ جیسے کل ایک جان کو مار چکا ہے، کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے مار ڈالے۔

یہ اس لیے کہا کہ کل کا قصہ سوائے اس کے اور موسیٰ علیہ السلام کے کسی کو معلوم نہ تھا۔ جب اس قبطی نے یہ بات سنی تو وہ فرعون کے دروازے کی طرف چلا اور فرعون والوں کو یہ بات بتا دی۔ اب فرعون کو اس کا علم ہوا تو اس کا غصہ سخت ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا، پھر ان کو طلب کیا اور اُن کے پیچھے لوگ بھیجے تا کہ ان کو قتل کے لیے حاضر کریں۔

موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لیے فرعون کی مشاورت:

﴿وَجَآءَ رَجُلٌ﴾ اس شخص کا وصف رجولیت، یعنی آدمی ہونے کے ساتھ اس لیے کیا کہ اس نے راہ کی مخالفت کی اور اس راہ پر چلا جو دوسرے ان لوگوں کی راہ سے زیادہ قریب تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے بھیجے گئے تھے۔

چنانچہ وہ شخص ان سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ گیا۔ پھر ان سے کہا کہ دربار والے تمھارے بارے میں مشورہ کرتے ہیں کہ تمھیں مار ڈالیں، لہٰذا تم شہر سے نکل جاؤ، میں تمھارا خیر خواہ ہوں۔ غرضیکہ یہ شخص بڑا دانش مند ہوشیار اور پختہ کار تھا کہ دوسرے راستے سے آ کر ان سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو خبر کر دی، اسی لیے اس کو ﴿ رَجُلٌ ﴾ فرمایا۔ پھر جس بات کا فرعون اور اس کے ارکانِ دولت نے ان کے حق میں مشورہ کیا تھا اس شخص نے آ کر اُن کو اس کی خبر کر دی تو وہ تنہا مصر سے نکل آئے۔ اس سے پہلے کہیں آنے جانے اور چلنے پھرنے کا ان کو اتفاق نہ ہوا تھا اور نہ ہی انھیں اس قسم کے کام کی عادت تھی، بلکہ وہ تو زندگی عیش و آرام، نعمتوں اور حکومت کی آسایشوں میں بسر کرتے تھے۔ پھر وہ ڈرتے ہوئے وہاں سے نکلے، ادھر ادھر دیکھتے تھے، کہا: اے رب! تو مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے، یعنی فرعون سے اور اس کے سرداروں سے۔ ذکر کیا ہے کہ اللہ پاک نے ان کے پاس گھوڑے پر ایک فرشتہ بھیجا، اس نے ان کو راہ بتائی۔[1] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا پختہ بیان یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام صبح کے وقت اس شہر میں داخل ہوئے، جس میں اس قبطی کو قتل کیا تھا ڈرتے ہوئے۔ ﴿ خَآئِفًا ﴾ خبر ہے "أَصْبَحَ" کی۔ یہ بھی جائز ہے کہ حال ہو اور خبر ﴿ فِی الْمَدِیْنَةِ ﴾ ٹھہرے۔ اور ﴿ یَتَرَقَّبُ ﴾ میں تین احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ "أَصْبَحَ" کی دوسری خبر ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ حالِ ثانی ہو۔ تیسرا یہ ہے کہ ﴿ خَآئِفًا ﴾ سے بدل ہو اور ﴿ یَتَرَقَّبُ ﴾ کا مفعول محذوف ہے، معنی یہ ہیں کہ ناپسندیدہ بات کا انتظار کرتے تھے کہ اس کے سبب سے کب پکڑے جائیں، یا کشادگی کا یا خبر کا کہ آیا فرعون کو پہنچ گئی یا نہیں۔ امام نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور سے خوف کرنے میں کچھ ڈر (حرج) نہیں اس کے خلاف کہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ پاک کے سوا کسی سے خوف کرنا جائز نہیں۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ خوف معرفت باللہ کے منافی نہیں، نہ اس پر توکل کرنے کے خلاف ہے۔[3]

کلمۂ ﴿ اِذَا ﴾ فجائیہ بہ معنی ناگاہ ہے اور ﴿ اَلَّذِیْ ﴾ موصول مبتدا ہے اور اس کی خبر ﴿ یَسْتَصْرِخُهٗ ﴾ ہے۔ "اِسْتِصْرَاخٌ" بہ معنی استغاثہ، یعنی فریاد رسی چاہنا، "صُرَاخٌ" سے ماخوذ ہے۔ "صُرَاخٌ" چیخنے چلانے کو کہتے ہیں، چونکہ فریاد رسی چاہنے والا آواز کرتا ہے، اپنی فریاد میں چلاتا ہے، اس لیے "اِسْتِصْرَاخٌ" کے معنی استغاثہ کے ہوئے۔ معنی یہ ہیں کہ اچانک وہی شخص جس نے موسیٰ علیہ السلام سے کل فریاد رسی چاہی تھی، ایک اور قبطی سے لڑ رہا ہے۔ قبطی نے چاہا تھا کہ اس کو بیگار میں پکڑ لے، اس پر ظلم کرے، جیسا کہ اس قبطی نے چاہا تھا جس کو موسیٰ علیہ السلام نے کل مار ڈالا تھا، وہی ان سے فریاد رسی چاہتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٥٠٤۔ ٥٠٥) [2] تفسیر النسفي (۳/ ۲۳۰) [3] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۲٦٤)

﴿ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ ﴿ لَهٗ ﴾ کی ضمیر اسرائیلی کی طرف راجع ہے، یہ قول امام خازن اور محلی رحمہ اللہ کا ہے، یا قبطی کی طرف راجع ہے، یہ امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] پہلے کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس اسرائیلی سے کہا تو تو بڑی کھلی گمراہی والا ہے، اس لیے کہ تو اس شخص سے لڑتا ہے جس کے مقابلے کی تو طاقت نہیں رکھتا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس بات کے کہنے کی یہ وجہ ہے کہ کل وہ ایک شخص کے قتل کا سبب بنا تھا اور آج چاہتا ہے کہ دوسرے کے قتل کا سبب ہو۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ اس قبطی پر ہاتھ ڈالیں جو اُن کا اور اسرئیلی کا دشمن تھا، اس جہت سے کہ اُن کے دین پر نہ تھا تو اسرائیلی بول اٹھا کہ اے موسیٰ! کیا تو چاہتا ہے کہ جیسے تو نے کل ایک شخص کو مار دیا تھا، مجھے بھی مار ڈالے۔

یہ بات اسرائیلی نے اس لیے کہی کہ جب اس نے موسیٰ علیہ السلام کو ﴿ اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ کہتے ہوئے سنا اور ان کو دیکھا کہ قبطی پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس نے گمان کیا کہ وہ اسی پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں، لہٰذا جب قبطی نے یہ بات سنی تو اس کو ظاہر کیا۔ فرعون کے ساتھیوں میں سے کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ جس شخص نے کل قبطی کو مار ڈالا ہے، وہ موسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، یہاں تک کہ اس اسرائیلی نے اس کو ظاہر کیا۔ جمہور مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ﴾ کا قائل قبطی ہے، اسرائیلی کی طرف سے اس کو اس کی خبر پہنچ گئی تھی۔ ظاہر یہی قول ہے اس سے پہلے بلا فصل قبطی کا ذکر گزر چکا ہے، کیوں کہ ﴿ عَدُوٌّ لَّهُمَا ﴾ سے وہی مراد ہے اور ظاہر کی مخالفت کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے، اس وقت تک جب کہ اس سے یہ بات لازم آئے کہ جو شخص موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے ہوئے تھا اور پہلی بار اور دوسری بار اُن سے فریاد رسی چاہی تھی، اسی نے ان پر افشاء کیا۔ نیز یہ قول اس لائق نہیں ہے کہ ایسی بات صادر ہو مگر کافر سے۔

﴿ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ ﴾ حاصل یہ ٹھہرا کہ ظاہر یہی ہے کہ ان دونوں قول کا قائل قبطی ہے اسرائیلی نہیں ہے۔ کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ ہے بہ معنی "مَا"۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغت میں جبار وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور امرِ الٰہی کے لیے تواضع اور فروتنی نہیں کرتا اور بغیر حق کے قتل کرنے والا جبار ہے۔[2] کسی نے کہا کہ جبار وہ ہے جو کر ڈالتا ہے جس کام کا ارادہ کرتا ہے، یعنی ضرب اور قتل کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے انجام اور عواقب پر نظر نہیں کرتا اور نہ ہی اس ارادے کو کسی اچھی خصلت سے بدل ڈالتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرد اس وقت تک جبار نہیں ہوتا جب تک کہ دو جانوں کو قتل نہ کر دے۔[3] یہ قول بعید ہے اس کی کوئی دلیل آیت میں نہیں ہے۔ پہلا قول ہی راجح ہے اور لغت کے مطابق ہے۔

﴿ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ﴾ یہ قول بھی اسی قبطی کا ہے، یعنی تو نہیں چاہتا کہ تو ان

---

[1] تفسير الخازن (٥/ ١٦٨) تفسير الجلالين (١/ ٥٠٩) تفسير القرطبي (١٣/ ٢٦٥)

[2] معاني القرآن (٤/ ١٣٧) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٥٨)

لوگوں میں سے ہو جو لوگوں کے درمیان اصلاح کرا دیتے ہیں، تو تو جھگڑنے کو اس خصلت کے ساتھ بدل دے جو بہتر اور خوب تر ہے۔ ﴿ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ﴾ کسی نے کہا ہے کہ اس شخص سے مراد حزقیل ہیں اور یہی آلِ فرعون کے مومن ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے چچا زاد بھائی تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا نام شمعون ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ طالوت۔ کسی نے کہا ہے کہ سمعان۔

﴿ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ ﴾ سے مراد شہر کی آخری حد اور بہت دور کی جگہ ہے۔ ﴿ يَسْعٰى ﴾ یا تو محلِ رفع میں ہے، صفت ہے ﴿ رَجُلٌ ﴾ کی۔ یا محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ اگرچہ ﴿ رَجُلٌ ﴾ نکرہ ہے، لیکن ﴿ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ ﴾ سے اس کی تخصیص ہوگئی، معنی یہ ہیں کہ شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص اپنی چال میں دوڑتا ہوا آیا اور قریب والی راہ لی، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سبقت کی اور جو بات سنی وہ ان کو بتا دی اور ان کو ڈرایا کہ اے موسیٰ: ﴿ اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ ﴾ یعنی قومِ فرعون کے اشراف تیرے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو امر کر رہے ہیں۔

تیرے سبب سے مشورہ کرنے کا نام ائتمار اس لیے رکھا ہے کہ دو مشورہ کرنے والوں میں سے ہر ایک دوسرے کو امر کرتا ہے اور دوسرا اس کی فرماں برداری کرتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض ان کا بعض کو تیرے قتل کا امر کرتا ہے۔ یہ معنی لفظ اور معنی کے لحاظ سے قریب تر ہیں۔ (قاله الحفناوي) امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يَتَشَاوَرُوْنَ فِيْكَ"۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِئْتَمَرَ الْقَوْمُ وَتَاَمَّرُوْا" کے یہ معنی ہیں کہ ان کے بعض نے بعض کو امر کیا۔ اس کی نظیر یہ قول ہے: ﴿ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ﴾[1] [الطلاق: ٦] "اور (یہ) آپس میں دستور کے مطابق مشورے سے (طے) کرو۔"

﴿ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴾ یعنی پس تو شہر سے نکل جا، بے شک میں تیرا بھلا چاہنے والوں سے ہوں، تمھیں نکلنے کا حکم دینے میں۔ ﴿ لَكَ ﴾ میں حرفِ لام بیان کے لیے ہے، اس لیے کہ مجرور کا معمول مجرور پر مقدم نہیں ہوتا۔ ﴿ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ﴾ پھر اس شہر سے اس حال میں نکلے کہ ظالموں کا سامنا ہونے کی توقع کرتے تھے اور ڈرتے تھے۔ یا یہ معنی ہیں: "رَاجِيًا غَوْثَ اللّٰهِ إِيَّاهُ" یعنی اس بات کی اُمید رکھتے تھے کہ اللہ پاک ان کی فریاد رسی کرے گا۔ مفسروں کے یہ دو قول ہیں۔

پھر اپنے رب سے نجات کی دعا کی اور یوں کہا: ﴿ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی اے میرے رب! مجھ کو ظالم قوم سے نجات دے۔ مراد فرعون کی قوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے اس قوم سے خلاصی دے اور اُن کو مجھ سے دفع کر اور ان کے اور میرے درمیان حائل ہو جا اور ان کے لحوق (مل جانے) سے مجھ کو محفوظ رکھ۔[2]

[1] فتح القدير (٤/ ٢١٨)
[2] فتح البيان (١٠/ ١٠١۔ ١٠٣)

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاۗءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ
سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿٢٢﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَاۗءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ
النَّاسِ يَسْقُوْنَ ڭ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ
مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَاۗءُ ٽ وَاَبُوْنَا
شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿٢٣﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ
اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿٢٤﴾

اور جب اس نے مدین کا رخ کیا تو کہا: امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھی راہ کی ہدایت دے گا ﴿22﴾
اور جب وہ مدین کے پانی (کنویں) پر پہنچا تو اس پر اس نے لوگوں کا ایک گروہ پایا، وہ (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہے تھے، اور ان کے علاوہ دو عورتوں کو دیکھا جو (اپنے جانور) روک رہی ہیں، موسیٰ نے کہا: تمھارا کیا معاملہ ہے؟ ان دونوں نے کہا: ہم پانی نہیں پلاتیں، حتی کہ چرواہے (پانی پلا کر اپنے مویشی) واپس لے جائیں، جبکہ ہمارا باپ بڑی عمر کا بوڑھا ہے ﴿23﴾
چناں چہ اس نے ان دونوں کی خاطر پانی پلایا، پھر وہ (پیچھے) سائے کی طرف ہٹ آیا، اور کہا: اے میرے رب! بے شک تو میری طرف جو بھی خیر نازل کرے، میں اس کا محتاج ہوں ﴿24﴾

موسیٰ علیہ السلام مدین میں:

راستے سے واقف نہ تھے اللہ نے راہ پر ڈال دیا۔ مصر سے دس دن کی راہ ہے، وہاں پہنچے تو بھوکے پیاسے تھے۔ دیکھا کہ لوگ اپنی بکریوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ دو عورتیں شرم کی وجہ سے بکریوں کو لے کر ایک طرف کھڑی تھیں، ان میں اتنی قوت نہیں تھی کہ بھاری ڈول کنویں سے نکالتیں، دوسروں کا بچا ہوا پانی پلاتیں۔ عورتوں نے پہچانا کہ سائے میں جا بیٹھا ہے، مسافر ہے، دور سے آیا ہوا تھکا اور بھوکا لگتا ہے۔ جا کر اپنے باپ سے کہا: ان کو ایک ایسے ہی مرد کی تلاش تھی جو نیک بخت ہو، ان کی بکریوں کو سنبھالے اور اس سے اپنی بیٹی کو بیاہ دیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ایسا راستہ لیا جو چلتا تھا تو اس سے خوش ہوئے۔ کہا: ﴿عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ﴾ "أي: الطَّرِيقَ الأَقْوَمَ"، یعنی امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھی راہ پر لے جائے، چنانچہ اللہ پاک نے ان کے ساتھ یہی کیا، دنیا اور آخرت میں ان کو سیدھی راہ بتائی اور انھیں ہادی اور مہدی بنایا۔ ﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَاۗءَ مَدْيَنَ﴾ اور جب مدین کی طرف پہنچے اور اس کے پانی پر وارد ہوئے، وہاں ایک

کنواں تھا، جس پر بکریوں کے چرواہے وارد ہوتے تھے۔ ﴿ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ﴾ وہاں ایک جماعت کو پایا جو پانی پلا رہی تھی۔

﴿ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدَانِ ﴾ اور پائیں ان کے سوا دو عورتیں جو اپنی بکریوں کو اور لوگوں کی بکریوں میں شامل ہونے سے روک رہی تھیں، تاکہ ان کو کوئی ایذا نہ پہنچائے۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو اُن کے لیے نرمی کی اور ان پر رحم کیا، یعنی ان کو ان پر ترس آیا کہ اپنی بکریوں کو لے کر الگ کھڑی ہیں۔ بولے: ﴿ مَا خَطْبُكُمَا ﴾ یعنی تمھاری کیا خبر ہے، یا تمھارا کیا حال ہے، تم ان لوگوں کے ہمراہ پانی پر وارد نہیں ہوتیں؟ ﴿ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ﴾ یعنی وہ بولیں ہمیں پانی پلانے کا موقع ان لوگوں کے جانے کے بعد ہی ملتا ہے۔ ﴿ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴾ یعنی یہ وہ حال ہے جو ہم کو اس حالت پر مجبور کر رہا ہے جس کو تو دیکھ رہا ہے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَسَقٰى لَهُمَا ﴾ یعنی پھر اس نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ ابوبکر بن ابی شیبہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جس وقت مدین کے پانی پر وارد ہوئے تو وہاں پر لوگوں کی ایک جماعت کو پایا کہ وہ پانی پلا رہے تھے۔ کہا: پھر جب وہ فارغ ہو گئے تو وہی پتھر اس کنویں پر رکھ دیا جس کو دس آدمی ہی اٹھا سکتے تھے۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ دو عورتیں اپنی بکریاں روک کر کھڑی ہیں۔ ان سے کہا: تمھارا کیا حال ہے؟ تو انھوں نے اپنا حال ان سے بیان کیا، چنانچہ وہ اس پتھر کے پاس آئے، پھر اس کو اٹھا دیا۔ پھر انھوں نے ایک ہی ڈول بھرا، یہاں تک کہ بکریاں سیراب ہو گئیں۔[1] اس کی اسناد صحیح ہے۔

﴿ ثُمَّ تَوَلّٰى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین کی طرف چلے کہ اُن کے پاس کوئی کھانا نہ تھا سوائے ترکاری اور درختوں کے پتوں کے اور ننگے پاؤں تھے۔ چنانچہ آپ مدین کی طرف اس حالت میں پہنچے کہ آپ کی دونوں پاؤں کی جوتیاں ساقط ہو گئی تھیں۔ آپ سائے میں بیٹھے، حالاں کہ آپ اللہ کے برگزیدہ تھے اس کی مخلوق میں سے اور بھوک کے مارے ان کا پیٹ پیٹھ سے چپکا ہوا تھا اور اُن کے پیٹ میں درختوں کے پتوں کی سبزی دکھائی دیتی تھی اور وہ آدھی کھجور کے محتاج تھے۔[2]

﴿ اِلَى الظِّلِّ ﴾ کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں ایک اونٹ پر دو رات تک تیز چلا، یہاں تک کہ صبح کو مدین میں پہنچا (اصل روایت میں اسی طرح ہے، یہ معلوم نہیں کہ سفر کی ابتداء کس جگہ سے کی تھی) پھر میں نے اس درخت کے بارے میں پوچھا جس کے نیچے موسیٰ علیہ السلام نے ٹھکانا پکڑا

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٣٣٤)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٦١۔ ٢٩٦٣) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٠٥)

تھا تو وہ ایک سبز درخت تھا، جو ہل رہا تھا۔ میرا اونٹ اس کی طرف جھکا اور وہ بھوکا تھا تو اس کو پکڑا، پھر گھڑی بھر اس کو چباتا رہا، پھر اس کو پھینک دیا۔ پھر میں نے اللہ سے موسیٰ علیہ السلام کے لیے دعا کی، پھر میں لوٹ آیا۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یوں مروی ہے کہ وہ اس درخت کی طرف گئے جس میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔ چنانچہ آیندہ اس کا ذکر آئے گا۔ إن شاء الله تعالىٰ، فالله أعلم۔ سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ درخت ببول کے درختوں میں سے تھا: عطاء بن سائب نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ﴿ رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴾ کہا تو اس عورت کو سنایا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ تَوَجَّهَ ﴾ کے معنی ہیں "إقبال علی الشيء" یعنی کسی شے پر متوجہ ہونا، "أَيْ: قَصَدَ بِوَجْهِهِ" اور ﴿ تِلْقَآءَ ﴾ بہ معنی نحو و جہت ہے، یعنی جب مدین کی طرف منہ کیا اور وہاں جانے کا ارادہ کیا، درانحالیکہ اس کی طرف جانے والے تھے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی چلے اس راہ میں جس میں مدین کو پہنچے۔[3] انتھیٰ۔ محاورے میں بولتے ہیں: "دَارُہُ تِلْقَاءَ دَارِ فُلَانٍ" یعنی اس کا گھر فلاں کے گھر کی طرف ہے۔ ﴿ تِلْقَآءَ ﴾ کی اصل "لقاء" (لقاء بہ کسر و بمد: دیدار کردن) سے ہے۔ ﴿ مَدْیَنَ ﴾ سے مراد شعیب علیہ السلام کی بستی ہے، اس کے اور مصر کے درمیان آٹھ رات کی مسافت ہے۔ اس کا نام مدین بن ابراہیم کے نام پر رکھا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مدین قبیلے کا نام ہے، بستی کا نام نہیں ہے، بہرحال یہ کلمہ غیر منصرف ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ بستی فرعون کے زیرِ حکومت نہ تھی۔ اسی لیے اس کی طرف نکلے اور اس کا راستہ جانتے نہ تھے۔ کہا: ﴿ عَسٰی رَبِّیْۤ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴾ ﴿ سَوَآءَ ﴾ کی اضافت سبیل کی طرف صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے، یعنی امید ہے کہ میرا رب میری راہنمائی سیدھی اور برابر راہ کی طرف کرے، جو مدین کی طرف جاتی ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: اس کی تین راہیں تھیں، موسیٰ علیہ السلام نے بیچ والی راہ لی اور آپ کو پکڑنے والے لوگ آپ کے پیچھے آئے اور وہ دوسرے دو راستوں میں چلے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ مدین کی طرف اس لیے چلے کہ اُن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان کے اور مدین والے لوگوں کے درمیان قرابت ہے، کیوں کہ اہلِ مدین ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور وہ بھی ان کی اولاد سے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ نکلے ڈرتے ہوئے اور راہ دیکھتے ہوئے، بغیر کسی سواری اور زادِ راہ کے اور بغیر کسی ساتھی کے اور اُن کے پاس کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، سوائے درختوں کے پتوں کے اور زمین کے سبزے کے، یہاں تک کہ ان کی سبزی باطن میں ایسی تھی جو باہر سے نظر آتی تھی اور آپ مدین میں

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٥٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٥٥٦۔ ٥٥٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٠٥۔ ٥٠٦)
[3] معاني القرآن (٤/ ١٣٨) [4] تفسير أبي السعود (٧/ ٨)

جب پہنچے تو آپ کے دونوں پاؤں کے جوتے گھس گھس کر اُن کے تلے گر پڑے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کی پہلی آزمایش تھی۔ امام خازن رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔[1]

﴿ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ ﴾ لفظ ﴿ وَرَدَ ﴾ کبھی تو داخل ہونے پر بولا جاتا ہے "مَوْرُوْد" میں۔ (تفسیر قرطبی میں "مَوْرُوْد" ہے اور فتح القدیر وغیرہ میں "مَوْرِدُ" ہے۔[2] "ورود" بہ معنی آمدن و بآب آمدن آتا ہے۔) اور کبھی اس کا اطلاق مورود کی طرف پہنچنے پر کیا جاتا ہے اور اس پر مطلع ہونے پر، گو اس میں داخل نہ ہو۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ "ورود" کے معنی کی تحقیق زیرِ تفسیر ﴿ وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ﴾ [مریم: ۷۱] "تم میں سے ہر ایک وہاں ضرور وارد ہونے والا ہے۔" گزر چکی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے آبِ مدین پر وارد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی طرف ان کا بلوغ و وصول (پہنچنا اور واصل ہونا) ہوا۔ ﴿ مَآءَ ﴾ سے مراد وہ پانی ہے جس سے لوگ بھر رہے تھے۔ امام خازن اور محلی رحمہما اللہ نے تصریح کی ہے کہ اس جگہ ﴿ مَآءَ ﴾ سے مراد وہ کنواں ہے جو مدین میں تھا۔[3] ذکرِ حال و ارادۂ محل کے باب سے ہے۔ پانی کا ذکر کیا اور کنواں مراد لیا، اس قسم کا مجاز محاورۂ عرب میں کثرت سے ہوتا ہے۔ اُمت سے مراد کثیر لوگوں کی جماعت ہے، اس لیے کہ تنوین تکثیر کے واسطے ہے۔ "ناس" سے مراد اناسِ مختلفین ہیں جیسا کہ امام نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ (اسی طرح بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[4] لوگوں کا مختلف ہونا لامِ تعریف سے نکلتا ہے، کیوں کہ یہ الف و لام استغراق کے لیے تو ہے نہیں، نہ جنسی ہے، بلکہ عہدی ہے۔ عام طور پر یہ بات معلوم ہے کہ جو جماعت پانی بھرنے کے لیے جمع ہوتی ہے وہ مختلف لوگ ہوتے ہیں۔ قاله زاده) معنی یہ ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام مدین کے کنویں کی طرف پہنچے تو کنویں کی جانب مختلف لوگوں کی بہت سی جماعت پائی جو اپنے مویشیوں کو پلا رہے تھے۔

﴿ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ﴾ "دُوْنَ" بہ معنی سوا ہے، یعنی ان لوگوں کے سوا پایا جو پانی پلا رہے تھے، جو پانی اُن کے اور اس جہت کے درمیان واقع تھا جس سے موسیٰ علیہ السلام آئے تھے۔ اسی طرح امام خازن رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ "دُوْنَ" بہ معنی سواء ہے۔ ایک یہ قول نقل کیا ہے کہ ان سے دور ایک جگہ میں پایا۔[5] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: موضع اسفل میں پایا ان سے۔ امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[6] "ذود" کے معنی ہیں حبس و منع کے، یعنی وہ اپنی بکریوں کو پانی سے روک رہی تھیں، یہاں تک کہ لوگ فارغ ہو جائیں

---

[1] تفسیر البغوي (٦/ ١٩٩) تفسیر الخازن (٥/ ١٦٩) [2] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢٦٧) فتح القدیر (٤/ ٢١٨)

[3] تفسیر الخازن (٥/ ١٦٩) تفسیر الجلالین (١/ ٥١٠) [4] تفسیر النسفي (٣/ ٢٣٢) تفسیر البیضاوي (٤/ ٢٨٨)

[5] تفسیر الخازن (٥/ ١٦٩) [6] تفسیر أبي السعود (٧/ ٨) تفسیر البیضاوي (٤/ ٢٨٨) تفسیر النسفي (٣/ ٢٣٢)

اور جگہ خالی کر دیں۔ اسی کے لگ بھگ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ”تَحْبِسَانِ غَنَمَهُمَا حَتّٰى يَنْزِعَ النَّاسُ وَتَخْلُو لَهُمَا الْبِئْرُ“

”ذَوْدٌ“ بہ معنی ”طَرَدَ“ بھی آیا ہے۔ (یعنی راندن و دور کردن)۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ بکریوں کو اس بات سے روک رہی تھیں کہ لوگوں کی بکریوں کے ساتھ مل جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے روک رہی تھیں کہ بدک جائیں اور چلی جائیں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کے سوال کا جو جواب انھوں نے دیا وہ قولِ اول کی تائید کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿مَا خَطْبُكُمَا﴾ یعنی تمھارا کیا حال ہے کہ تم اپنی بکریوں کو اور لوگوں کے ہمراہ پانی نہیں پلاتی ہو؟ ”خطب“ کہتے ہیں شان اور حال کو۔ کسی نے کہا ہے کہ ”مَا خَطْبُكَ“ صرف مصاب ومضطہد کے لیے کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کسی مصیبت زدہ، آفت رسیدہ یا مقہور اور مجبور کا حال پوچھتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں: ”مَا خَطْبُكَ“ یا اس شخص سے کہتے ہیں جو کوئی منکر بات لاتا ہے اور برا کام کرتا ہے۔ ﴿قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ﴾ یعنی انھوں نے جواب دیا کہ ہماری عادت تاخیر کرنا ہے، ہم اس وقت تک نہیں پلاتے جب تک چرواہے اپنے جانوروں کو پانی سے پھیر کر نہ لے جائیں اور لوٹ جائیں، اس سے غرض یہ ہے کہ ان کے ساتھ ملنے سے پرہیز کی جائے، یا ان کے ساتھ پلانے سے عاجزی کا اظہار کیا ہے۔ جمہور نے ﴿يُصْدِرَ﴾ پڑھا ہے بہ ضمِ یائے تحتیہ و کسرِ دالِ مہملہ، مضارع ”أَصْدَرَ“ کا، متعدی بہ ہمزہ۔ امام ابن عامر، ابو عمرو اور ابو جعفر رحمہ اللہ نے بہ فتحِ یاء وضمِ دال ”صَدَرَ يَصْدُرُ“ لازم سے پڑھا ہے۔ پہلی قراءت میں مفعول محذوف ہے، یعنی ”يُرْجِعُوْنَ مَوَاشِيَهُمْ“.

”رِعَاءُ“ جمع ہے ”رَاعٍ“ کی (یہ جمع خلافِ قیاس ہے، اس لیے کہ فاعل وصفی معتل اللام کی جمع قیاسی ”فُعَلَةٌ“ ہے، جیسے: ”قَاضِيُ“ کی جمع ”قُضَاةٌ“، ”رَامِيُ“ کی جمع ”رُمَاةٌ“۔ بہ خلاف امام زمخشری رحمہ اللہ کے کہ ان کے نزدیک فاعل کی جمع ”فِعَالٌ“ قیاسی ہے، جیسے ”صیام“ و ”قیام“۔ (ذکرہ الکرخي)) جمہور نے بہ کسرِ راء پڑھا ہے اور ابو عمرو نے ایک روایت میں بہ فتحِ راء پڑھا ہے۔ امام ابو الفضل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”رَعَاء“ بہ فتحِ راء مصدر ہے، قائم مقام صفت کے کیا گیا ہے۔ اسی لیے واحد و جمع اس میں برابر ہے۔ کسی نے بہ ضمِ راء پڑھا ہے اس بنا پر کہ اسم جمع ہے۔ طلحہ بن مصرف نے ”نُسْقِيُ“ بہ ضمِ نون پڑھا ہے ”أَسْقَى“ سے۔[1] پھر ان عورتوں نے اپنے پانی پلانے کا یہ عذر ظاہر کیا۔

﴿وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ﴾ یعنی ہمارا باپ بوڑھا بڑی عمر کا ہے، وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اپنے مویشیوں کو پانی پلائے بڑھاپے کے سبب۔ گویا یوں کہا ہے کہ ہم دو کمزور پردہ دار عورتیں ہیں، مردوں کی مزاحمت پر قادر نہیں ہیں اور نہ ہمارے ہاں کوئی مرد ہے کہ وہ یہ کام کر دے اور ہمارا باپ بوڑھا ہے، بڑھاپے نے اس کو کمزور کر دیا ہے،

[1] فتح القدير (٤/ ٢١٩)

اس لیے ہمیں ضروری ہوا کہ ہم پلانے میں دیر کریں، یہاں تک کہ لوگ پانی سے اپنی حاجت پوری کر لیں۔ کہا ہے کہ ﴿ اَبُوْنَا ﴾ سے مراد شعیب علیہ السلام ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یثرون نام جو اُن کے بھتیجے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان لوگوں میں سے ایک شخص ہے جو شعیب علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

رہی یہ بات کہ شعیب علیہ السلام نے اپنی صاحب زادیوں کے لیے بکریوں کو پانی پلانا پسند فرمایا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ کام فی نفسہٖ کچھ ممنوع نہیں ہے اور نہ ہی دین اس کا انکار کرتا ہے۔ رہی مروت تو لوگوں کی عادتیں اس بارے میں مختلف ہیں اور عرب کے احوال اس بارے میں عجم کے احوال سے مختلف ہیں اور اس سلسلے میں گاؤں والوں کا مذہب شہر والوں کے خلاف ہے، خاص کر جب ضرورت کی حالت ہو۔ غرضیکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بات سنی تو ان کو ان کے حال پر ترس آیا۔ ﴿ فَسَقٰى لَهُمَا ﴾ پھر ان کے لیے ان کی بکریوں کو پانی پلایا، نیک کام میں رغبت کی وجہ سے اور مظلوم کی فریاد رسی کی خاطر۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: اس کنویں کے قریب ہی ایک اور کنواں تھا، اس سے پانی پلایا، اس سے ایک ایسا پتھر اٹھایا جس کو دس آدمی اٹھا سکتے تھے۔[1] انتھیٰ

پھر جب ان کے پلائی پلانے سے فارغ ہوئے تو ﴿ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ ﴾ سائے کی طرف چلے گئے اور گرمی کی شدت کی وجہ سے اس میں بیٹھ گئے اور حال یہ تھا کہ بھوکے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہاں ایک درخت تھا ببول کا، یہ سایہ اس کا تھا۔ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: "ظِلُّ سَمُرَةٍ هُنَالِكَ وَهِيَ شَجَرَةٌ مِنْ شَجَرِ الطَّلْحِ") اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا میں استراحت جائز ہے بہ خلاف اس کے جو بعض متقشفہ کہتے ہیں۔

پھر چوں کہ پیدل چلتے چلتے ان کو تکلیف پہنچی تھی اور تھک گئے تھے تو اپنے رب کو اس طرح پکارا: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴾ یعنی اے میرے رب! بے شک میں اس خیر کی طرف محتاج ہوں جو تو مجھ پر نازل کرے، وہ کوئی بھی خیر ہو۔ حرفِ لام بہ معنی "إِلٰى" ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: محاورے میں "فَقِيْرٌ لَهُ وَإِلَيْهِ" بولتے ہیں۔[2] مطلب یہ ہے کہ فقر کے صلہ میں لام اور "إِلٰى" دونوں آتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ البتہ یقیناً موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴾ حالاں کہ وہ اللہ کی خلق میں سے زیادہ باعزت تھے اللہ کے نزدیک اور البتہ وہ واقعی آدھی کھجور تک کے حاجت مند تھے اور البتہ ان کا پیٹ ان کی پشت کے ساتھ بھوک کی شدت سے چپک گیا تھا۔

ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ انھوں نے صرف کھانے کا سوال کیا۔ تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ روٹی کے ایک ٹکڑے کا سوال کیا، تا کہ اس سے اپنی پیٹھ کو بھوک سے مضبوط کریں۔[3] انتھیٰ۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ میں بہ سبب اس شے کے جو تو نے میری طرف خیرِ دین میں سے نازل کی دنیا میں فقیر ہوں۔ وہ خیر ظالموں سے

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٥١٠) [2] فتح القدير (٤/ ٢١٩) [3] الدر المنثور (٦/ ٤٠٦) فتح القدير (٤/ ٢٢١)

نجات ہے، کیوں کہ وہ فرعون کے پاس تو بڑے عیش وعشرت اور ملک اور دولت میں تھے۔ ”قَالَ ذٰلِكَ رِضًا بِالْبَدَلِ السَّنِيِّ، وَفَرَحًا بِالْعِوَضِ الْهَنِيِّ، وَشُكْرًا لِلّٰهِ الْغَنِيِّ“ [موسیٰ علیہ السلام نے اس نعم البدل پر راضی ہوتے ہوئے، اس عمدہ عوض پر خوش ہوتے ہوئے اور اللہ غنی کا شکر ادا کرتے ہوئے یہ کہا] ابن عطاء نے کیا خوب کہا ہے: ”نَظَرَ مِنَ الْعُبُوْدِيَّةِ إِلَى الرُّبُوْبِيَّةِ، وَتَكَلَّمَ بِلِسَانِ الْإِفْتِقَارِ لِمَا وَرَدَ عَلٰى سِرِّهٖ مِنَ الْأَنْوَارِ“.[1] [انھوں نے عبودیت سے ربوبیت کی طرف نظر کی اور اپنے دل کے روشن ہونے کی بنا پر عاجزی سے بات کی]

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾

پھر ان دونوں میں سے ایک (لڑکی) شرم وحیا سے چلتی اس کے پاس آئی، اس نے کہا: بے شک میرے والد تجھے بلاتے ہیں، تاکہ وہ تجھے اس کی مزدوری دیں جو تو نے ہماری خاطر پانی پلایا ہے، پھر جب موسیٰ اس کے پاس آیا اور اسے سارا قصہ سنایا تو اس نے کہا: تو مت ڈر، تو نے ظالم قوم سے نجات پالی ہے (25) ان دونوں میں سے ایک (لڑکی) نے کہا: اے ابا جان! اسے نوکر رکھ لیجیے، بلاشبہ بہترین شخص، جسے آپ ملازم رکھیں، وہی ہوسکتا ہے جو طاقتور ہو، امانت دار ہو (26) اس نے (موسیٰ سے) کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے اس شرط پر کر دوں کہ تو آٹھ سال میری نوکری کرے، پھر اگر تو دس سال پورے کرے تو تیری طرف سے ہوگا، اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر مشقت ڈالوں، ان شاء اللہ یقیناً تو مجھے نیک لوگوں میں سے پائے گا (27) موسیٰ نے کہا: یہ میرے اور آپ کے درمیان (معاہدہ)

[1] تفسیر النسفی (۳/ ۲۳۲۔ ۲۳۳) فتح البیان (۱۰/ ۱۰۳۔ ۱۰۶)

ہے، میں دو مدتوں میں سے جو بھی پوری کرلوں تو (اس کے بعد) مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو، اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ونگہبان ہے ﴿28﴾

موسیٰ علیہ السلام کی ان دو عورتوں کے والد کے پاس حاضری:

یہ جو کہا ہے کہ مضبوط اور امانت دار ہے تو یہ اس لیے کہا ہے کہ ڈول نکالتے وقت اس کا زور دیکھا اور بے طمع ہونے سے اس کی امانت داری ظاہر ہوئی۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی وطن سے نکلے اور آٹھ برس بعد آ کر مکہ فتح کیا، اگر چاہتے تو اسی وقت کافروں سے شہر خالی کرواتے، لیکن اپنی خوشی سے دس برس بعد شہر کو کافروں سے پاک کیا۔ ان بزرگ کا نام نہیں بتایا قرآن میں، اور تورات میں نام کچھ اور ہے اور مشہور ہے کہ شعیب علیہ السلام پیغمبر تھے۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب وہ دونوں عورتیں بکریاں لے کر جلد اپنے باپ کے پاس لوٹ آئیں تو اس نے ان کے جلد آ جانے کو عجیب سمجھا، پھر اس نے ان سے قصہ پوچھا تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا وہ بیان کیا۔ پھر اس نے ان میں سے ایک کو ان کی طرف بھیجا، تاکہ انھیں اپنے باپ کے پاس بلا لائے۔ فرمایا اللہ پاک نے ﴿ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ﴾ یعنی پھر اُن میں سے ایک آزاد عورتوں کی چال چلتی ہوئی آئی، جیسا کہ امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا کہ اپنے کرتے کی آستین سے پردہ کرتی ہوئی آئی۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: "تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ قَائِلَةً بِثَوْبِهَا عَلَى وَجْهِهَا لَيْسَتْ بِسَلْفَعٍ خَرَّاجَةً وَلَّاجَةً"[1] (هذا إسناد صحيح) (ادلاج کہتے ہیں اول شب میں چلنے کو اور ادّلاج آخر شب کے چلنے کو، گویا یہ بیان ہے: "سَلْفَعٌ" کا، یعنی وہ اپنے منہ پر کپڑا ڈالے ہوئے آئی اور وہ اول اور آخر شب میں بہت چلنے والی نہ تھی اور نہ بہت گھس پیٹھ کرنے والی اور نہ بہت آمد و رفت کرنے والی، جس طرح کہ دلیر اور بے باک عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ واللہ أعلم) امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مردوں میں سے سلفع جسور کو کہتے ہیں اور عورتوں میں سے جریئہ سلیطہ کو اور اونٹنیوں میں سے شدیدہ کو،[2] یعنی مردِ دلیر وزنِ دراز زبان و بے باک اور ناقۂ استوار۔

﴿ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ﴾ عادت میں یہ ایک ادب کی بات ہے کہ ان کو صرف بلانا نہ بلایا، تاکہ شک کا وہم نہ ہو، بلکہ یوں کہا کہ میرا باپ تجھے بلاتا ہے، تاکہ تجھے بدلہ دے اور اس بات پر تیرا پورا اجر دے کہ تو نے ہماری بکریوں کو پانی پلایا۔ ﴿ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ﴾ یعنی پھر جب موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے اور اس سے اپنا ماجرا بیان کیا جس طرح سے اپنے شہر سے نکلے تھے تو اس نے کہا: ﴿ لَا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٦٤ـ ٢٩٦٥)
[2] الصحاح للجوهري (٤/ ٣٦٦)

﴿ تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ مفسرین نے اس شخص کے بارے میں کئی قول پر اختلاف کیا ہے کہ وہ کون ہے۔ ایک یہ ہے کہ وہ شعیب نبی علیہ السلام ہیں جو اہلِ مدین کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ بہت سے علماء کے نزدیک یہی قول مشہور ہے۔ امام حسن بصری اور غیر واحد رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی اس کو مالک بن انس سے روایت کیا ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ شعیب علیہ السلام ہی ہیں جن سے موسیٰ علیہ السلام نے قصہ بیان کیا۔[1] طبرانی نے سلمہ بن سعد عنزی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ ایلچی ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَرْحَبًا بِقَوْمِ شُعَيْبٍ وَأَخْتَانِ مُوسٰى هُدِيَتْ"[2] یعنی مرحبا ہے شعیب علیہ السلام کی قوم کو اور موسیٰ کے سسرال والوں کو تو ہدایت کیا گیا۔ دوسروں نے کہا: بلکہ وہ شعیب علیہ السلام کا بھتیجا تھا۔ کسی نے کہا: ایک مومن مرد تھا شعیب علیہ السلام کی قوم سے۔ اَور لوگوں نے کہا کہ شعیب علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے ایک طویل مدت پہلے تھے، اس لیے کہ شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے یوں کہا تھا: ﴿ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴾ [هود: ٨٩] ''اور لوط کی قوم (کا علاقہ بھی) تم سے کچھ دور نہیں۔''

اور لوط علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت نصِ قرآنی کے تحت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی ہے اور یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ خلیل اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان چار سو سال سے زیادہ کی مدت ہے، چنانچہ بہت سے لوگوں نے یہ بات ذکر کی ہے اور کسی نے جو یہ کہا ہے کہ شعیب علیہ السلام ایک مدتِ دراز زندہ رہے، یہ۔ واللہ أعلم۔ اس اشکال سے بچنے کے لیے کہی ہے اور جو دلائل اس بات کو تقویت دیتے ہیں کہ ﴿ اَبُوْنَا ﴾ سے شعیب علیہ السلام مراد نہیں، ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اگر وہ شعیب علیہ السلام ہوتے تو قرآن شریف میں اس جگہ ان کے نام کی تصریح ضرور کی جاتی اور بعض احادیث میں موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے ذیل میں ان کے نام کی جو تصریح آئی ہے تو ان کی اسناد صحیح نہیں۔ چناں چہ۔ إن شاء اللہ۔ ہم عن قریب ان کا ذکر کریں گے۔ پھر بنی اسرائیل کی کتابوں میں جو بات موجود ہے وہ یہ ہے کہ اس شخص کا نام یثرون ہے۔ واللہ أعلم۔ ابوعبیدہ بن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یثربی شعیب علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ ابوحمزہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے موسیٰ علیہ السلام کو نوکر رکھا، وہ یثربی ہے۔[3] (رواہ ابن جریر) پھر کہا ہے: صحیح بات یہ ہے کہ اس امر کا ادراک نہیں کیا جاتا مگر خبر سے اور اس باب میں ایسی خبر نہیں ہے جس کے ساتھ حجت واجب ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ﴾ یعنی اس شخص کی دو بیٹیوں میں سے ایک نے کہا۔ کسی نے کہا کہ یہ وہی بیٹی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چلی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے کہا: ﴿ يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ﴾ یعنی اے باپ!

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٦٢) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٦٦)

[2] المعجم الكبير (٧/ ٥٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٢٢٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٩/ ٥٦١)

تو اس کو بکریاں چرانے کے لیے نوکر رکھ لے۔ سیدنا عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، شریح قاضی، ابو مالک، قتادہ، محمد بن اسحاق اور غیر واحد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جب اس نے کہا: ﴿ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴾ تو اس کے باپ نے اس سے کہا: "وَمَا عِلْمُكِ بِذٰلِكِ؟" یعنی تجھے ان دو باتوں کا کہاں سے علم ہوا؟ وہ بولی کہ اس نے وہ پتھر اُٹھا لیا جس کو دس آدمی اٹھا سکتے ہیں اور میں جس وقت اس کے ساتھ آئی تو اس کے آگے بڑھی، اس نے مجھ سے کہا کہ تو میرے پیچھے ہو، پھر جب راستہ مجھ پر مختلف ہو تو تُو میرے لیے ایک کنکر پھینک دینا جس سے میں راستہ معلوم کر لوں اور اس کی طرف چل پڑوں۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن ابی اسحاق عن ابی عبیدہ عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (پہلے ابو عبیدہ بن عبد اللہ گزر چکا ہے اور یہاں عن ہے، اصل میں اسی طرح ہے، واللہ اعلم کہ ان میں صحیح کیا ہے) فرمایا: "أَفْرَسُ النَّاسِ ثَلَاثَةٌ: أَبُوْ بَكْرٍ حِيْنَ تَفَرَّسَ فِيْ عُمَرَ وَصَاحِبُ يُوْسُفَ حِيْنَ قَالَ: ﴿ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ ﴾ [يوسف: ٢١] وَصَاحِبَةُ مُوْسٰى حِيْنَ قَالَتْ: ﴿ يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴾"[1] یعنی تین آدمیوں کی فراست سب لوگوں سے بڑھ کر ہے: ایک تو ابو بکر رضی اللہ عنہ جبکہ عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں انھوں نے فراست کی۔ دوسرا زلیخا کا خاوند جب کہ اس نے اپنی بیوی کو یوسف علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کا حکم کیا۔ تیسری یہ عورت موسیٰ علیہ السلام والی، جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اس کو نوکر رکھ لے...الخ۔

﴿ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ ﴾ یعنی اس بڑے بوڑھے شخص نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ بات چاہی کہ اس کی بکریاں چرائیں اور وہ ان دو بیٹیوں میں سے ایک کو اُن سے بیاہ دے گا۔ شعیب جبائی نے کہا ہے کہ وہ دونوں صفورا اور لیّا ہیں۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صفورا، شرفا اور لیّا بھی کہتے ہیں۔[2] امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اس صورت میں بیع صحیح ہے، جب کہ بائع (بیچنے والا) یہ کہے کہ میں نے ان دو غلاموں میں سے ایک سو کے عوض تجھے بیچ دیا، پھر مشتری کہے کہ میں نے خرید لیا تو یہ بیع صحیح ہے۔ واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ﴾ یعنی اس شرط پر کہ تو میری بکریوں کو آٹھ برس تک چرائے، پھر اگر تو تبرع کرے (خوشی سے کرے) دو برس زیادہ کا تو یہ تیری طرف سے ہے، ورنہ آٹھ برس کافی ہیں۔ ﴿ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ یعنی میں تجھے مشقت میں نہ ڈالوں گا، نہ تجھے ایذا دوں گا، نہ تجھ سے جھگڑوں گا۔ لوگوں نے اس آیتِ کریمہ سے اوزاعی رحمہ اللہ کے مذہب کی دلیل لی ہے، اس صورت میں کہ جب بیچنے والا یوں کہے کہ یہ شے میں نے تجھ کو بعوض دس نقد کے یا بعوض بیس ادھار کے بیچ دی تو یہ بیع صحیح ہے اور خریدنے والا جونسی قیمت چاہے اختیار کرے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٦٦۔ ٢٩٦٨) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٥٦١)

سنن ابو داود میں جو یہ حدیث مروی ہے: «مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ فَلَهُ أَوْكَسُهُمَا أَوِ الرِّبَا»[1] سو اس کو اس مذہب پر محمول کیا ہے۔ اس مذہب پر جو اس آیت سے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے اس میں نظر ہے، یہ جگہ اس کی طوالت کی وجہ سے اس کے بیان کی نہیں ہے۔ واللہ أعلم۔ امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب نے اوزان کے اتباع نے اس آیتِ کریمہ سے اس مسئلے پر استدلال کیا ہے کہ طعام اور کسوت (لباس) کے عوض کسی کو ملازم رکھ لینا صحیح ہے۔ یعنی روٹی کپڑے پر کسی کو نوکر رکھ لے تو درست ہے۔

اس بارے میں اس حدیث سے استیناس کیا ہے جس کو ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے، جہاں یوں کہا ہے: "بَابُ اسْتِئْجَارِ الْأَجِيرِ عَلَى طَعَامِ بَطْنِهِ" پھر بہ سندِ خود علی بن رباح سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سنا عتبہ بن ندر سلمی رضی اللہ عنہ کو، وہ کہتے تھے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا: ﴿طٰسٓمّٓ﴾ یہاں تک کہ جب آپ موسیٰ علیہ السلام کے قصے پر پہنچے تو فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جان کو آٹھ برس یا دس برس مزدور کیا اپنی شرم گاہ کی عفت پر اور اپنے شکم کے طعام پر۔[2] مطلب یہ ہے کہ اپنی شرم گاہ کو بچانے اور پیٹ بھر کھانے کے لیے خود کو اتنی مدت مزدور بنایا۔ یہ حدیث شریف ضعیف ہے، اس لیے کہ "مسلمہ بن علی راوی خشنی دمشقی بلاطی" ضعیف الروایت ہے ائمہ کے نزدیک، لیکن ایک اور وجہ سے مروی ہے اور اس میں بھی نظر ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے علی بن رباح لخمی سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سنا عتبہ بن ندر سلمی رضی اللہ عنہ صحابیِ رسول کو، وہ حدیث بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جان کو اپنی شرم گاہ کی عفت اور اپنے بطن کے طعام کی خاطر مزدور کیا۔[3] یعنی اپنی شرم گاہ کو بچانے اور اپنے پیٹ کے کھانے کی خاطر اپنے آپ کو مزدور بنایا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ۭ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ﴾ اللہ پاک موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اپنے خسر سے کہا کہ بات اس پر مکمل ہو چکی جو آپ نے کہا کہ آپ نے مجھے نوکر رکھا آٹھ برس کے لیے، پھر اگر میں دس برس پورے کروں تو میری طرف سے ہے۔ پھر جب میں دونوں میں سے تھوڑی والی مدت کو پورا کر دوں تو یقیناً میں ذمے سے بَری ہو گیا اور شرط سے نکل گیا، اسی لیے یوں کہا ہے: ﴿اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۭ﴾ یعنی میں کوئی سی مدت پوری کر دوں تو مجھ پر کسی طرح کا حرج نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ کامل اگرچہ مباح ہے، لیکن وہ فاضل ہے اور دلیل خارج کی جہت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١١٦)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٤٤) اس کی سند میں "مسلمہ بن علی" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ٢٠١٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٦٨) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

سے ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ [البقرۃ: ۲۰۳] ''پھر جس نے دو دِنوں (منیٰ سے مکے کی طرف واپسی) میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے (ایک دن کی) تاخیر کی تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ سے فرمایا، یہ صحابی روزے بہت رکھا کرتے تھے، انھوں نے آپ سے سفر میں روزہ رکھنے کے متعلق پوچھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تو چاہے تو روزہ رکھ اور اگر تو چاہے تو افطار کر۔[1] یعنی روزہ مت رکھ، باوجود اس کے کہ اَور دلیل سے روزہ رکھنا راجح ہے۔

یہ تو سن چکے اب اور سنو، دلیل اس بات پر دال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے وہی مدت پوری کی جو دونوں میں سے کامل تر اور تمام تر تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ مجھ سے ایک یہودی نے پوچھا، یہ شخص حیرہ والوں میں سے تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کونسی مدت پوری کی تھی؟ تو میں نے کہا کہ میں نہیں جانتا ہوں، یہاں تک کہ حبرِ عرب کے پاس جاؤں اور اُن سے پوچھوں، پھر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور ان سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ دونوں میں سے اکثر و اطیب مدت کو پورا کیا: ''إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ إِذَا قَالَ فَعَلَ''[2] یعنی بے شک اللہ کا رسول جب کہتا ہے تو کرتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو اسی طرح روایت کیا ہے اور اسی طرح حکیم بن جبیر وغیرہ نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے۔ حدیثِ فتون میں بروایتِ قاسم بن ابی ایوب عن سعید بن جبیر یوں واقع ہوا ہے کہ جس شخص نے ان سے سوال کیا وہ اہلِ نصرانیت سے تھا، پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ واللہ أعلم.

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: «أَيَّ الْأَجَلَيْنِ قَضَى مُوْسىٰ؟ قَالَ: أَتَمَّهُمَا وَأَكْمَلَهُمَا» یعنی موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میں سے کون سی مدت پوری کی؟ کہا: ان میں سے تمام تر اور کامل تر۔[3] (ورواه ابن أبي حاتم عن أبيه عن الحميدي عن سفيان وهو ابن عيينة حدثني إبراهيم بن يحيىٰ بن أبي يعقوب وكان من أسناني أو أصغر مني فذكره. وفي إسناده قلب، وإبراهيم هذا ليس بمعروف. ورواه البزار عن أحمد بن أبان القرشي عن سفيان بن عيينة عن إبراهيم بن أعين عن الحكم بن أبان عن عكرمة عن ابن عباس عن النبي ﷺ فذكره ثم قال: لا نعرفه مرفوعاً عن ابن عباس رضي الله عنهما إلا من هذا الوجه)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یوسف بن سرج رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کون سی مدت پوری کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: « لَا عِلْمَ لِيْ » یعنی مجھے کچھ علم نہیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا: « لَا عِلْمَ لِيْ » پھر جبرائیل علیہ السلام نے ایک فرشتے سے پوچھا جو اُن

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۸۴۱) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۵۳۸)

[3] تفسير الطبري (۱۹/ ۵۶۹) تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۷۰) كشف الأستار عن زوائد البزار (۳/ ۶۳) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۸۸۰)

سے فوق (اوپر) تھا تو اس نے کہا: « لَا عِلْمَ لِيْ » پھر اس فرشتے نے اپنے رب عز و جل سے پوچھا اس بات کے متعلق جو اس سے جبرائیل علیہ السلام نے پوچھی تھی اور ان سے محمد ﷺ نے پوچھی تھی تو اللہ عز و جل نے فرمایا: « قَضٰی أَبَرَّهُمَا وَأَبْقَاهُمَا » یا فرمایا: « أَزْكَاهُمَا » [1] یہ حدیث شریف مرسل ہے اور ایک اور وجہ سے مرسل آئی ہے۔

سُنَید نے کہا ہم کو حدیث کی حجاج نے ابن جریج سے، کہا: امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: « أَيُّ الْأَجَلَيْنِ قَضٰی مُوْسٰی؟ » تو کہا: « سَوْفَ أَسْأَلُ إِسْرَافِيْلَ » پھر انھوں نے اسرافیل سے پوچھا تو کہا: « سَوْفَ أَسْأَلُ الرَّبَّ عَزَّ وَجَلَّ » پھر اللہ عز و جل سے پوچھا تو فرمایا: « أَبَرَّهُمَا وَأَوْفَاهُمَا » ایک اور طریق بھی مرسل ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: "أَيَّ الْأَجَلَيْنِ قَضٰی مُوْسٰی؟" فرمایا: « أَوْفَاهُمَا وَأَتَمَّهُمَا » [2] (فهذه طرق متعاضدة ثم قد روي هذا مرفوعاً من رواية أبي ذر رضی اللہ عنہ)

حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کسی نے پوچھا: "أَيَّ أَجَلَيْنِ قَضٰی مُوْسٰی؟" قال: « أَوْفَاهُمَا وَأَبَرَّهُمَا » اور اگر کوئی تجھ سے پوچھے کہ کون سی عورت سے نکاح کیا تو کہنا کہ ان میں سے چھوٹی سے۔ [3] (ثم قال البزار: لا نعلم يروى عن أبي ذر إلا بهذا الإسناد و قد رواه ابن أبي حاتم من حديث عويد بن أبي عمران، وهو ضعيف، ثم قد روي أيضا نحوه من حديث عتبة بن الندر بزيادة غريبة جداً)

پس ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے علی بن رباح لخمی سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عتبہ بن ندر کو سنا، وہ کہتے تھے رسول اللہ ﷺ سے کسی نے پوچھا: "أَيَّ الْأَجَلَيْنِ قَضٰی مُوْسٰی؟، قَالَ: « أَبَرَّهُمَا وَأَوْفَاهُمَا » پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب ارادہ کیا شعیب علیہ السلام سے بچھڑنے کا تو اپنی بیوی سے کہا کہ اپنے باپ سے سوال کرے کہ وہ اپنی بکریوں میں سے ان کو اس قدر دے دیں جس سے وہ گزران کریں۔

پھر شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کو وہ بکریاں دیں جو اُن کی بکریاں اس سال میں بچے جنیں اپنی ماؤں کے رنگ کے خلاف، کہا پس نہیں گزری کوئی بکری مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس کے پہلو کو اپنے عصا سے مارا تو سب بکریوں نے اپنی ماؤں کے رنگ کے خلاف بچے جنے اور ہر بکری نے دو اور تین بچے جنے ان میں سے کوئی فشوش نہ تھی نہ کوئی ضبوب نہ کمشہ کہ ہتھیلی کو فوت کرے اور نہ ثعول اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت تم شام کو فتح کرو گے تو بے شک تم عن قریب ان میں سے بقایا کو وہاں پاؤ گے اور وہ سامریہ ہیں۔ [4] (هكذا أورده البزار) نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ روایت کیا ہے، جسے طوالت کے ڈر سے حذف کیا جا رہا ہے۔ [5]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۷۰) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۱۹/ ۵۶۹۔ ۵۷۰) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔

[3] مسند البزار (۹/ ۳۸۱) تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۶٦) اس کی سند میں ''عوبد بن ابی عمران جونی'' ضعیف راوی ہے۔

[4] كشف الأستار عن زوائد البزار (۳/ ٦۳) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۷۰۔ ۲۹۷۱) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۰٦۔ ۵۰۱)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا پختہ بیان یہ ہے کہ ﴿ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ﴾ یہاں عبارت محذوف ہے سیاقِ کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: پھر وہ دونوں عورتیں اپنے باپ کے پاس جلدی لوٹ آئیں، حالاں کہ اُن کی عادت پانی پلانے میں دیر کرنے کی تھی۔ پھر جس آدمی نے ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا تھا اس کا ماجرا اپنے باپ سے بیان کیا تو اُس نے اُن میں سے اپنی بڑی بیٹی کو حکم دیا کہ اس شخص کو اس کے پاس بلا لائے۔[1] اس بیٹی کا نام صفوراء تھا۔ کسی نے کہا: صفراء تھا۔ کسی نے کہا کہ چھوٹی بیٹی کو حکم دیا، اس کا نام لیّا تھا۔ کسی نے کہا کہ صفیراء تھا۔ اکثر مفسر اس طرف گئے ہیں کہ یہ دونوں عورتیں شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں تھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی بھتیجیاں تھیں اور شعیب علیہ السلام کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن پہلا قول راجح تر ہے اور قرآن شریف کا ظاہر بھی وہی ہے۔

جملہ ﴿ تَمْشِیْ ﴾ کا محل نصب میں ہے بنا بر حال "جَاءَتْهُ" کے فاعل سے اور ﴿ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ﴾ دوسرا حال ہے، یعنی پھر آئی اس کے پاس ان میں سے ایک شرم کی حالت میں چلتی ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ آنے اور چلنے دونوں حال میں شرم کرنے والی تھی، یہ نہیں کہ صرف آنے کے وقت شرم کرنے والی تھی۔ یہ اس کے کمالِ ایمان اور شرفِ عنصر کی دلیل ہے، اس لیے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی دعوت کی طرف بلاتی تھی اور اس کو پتا نہیں تھا کہ وہ اس کی دعوت کو قبول کریں گے یا نہیں، اس لیے ان کے پاس شرماتی ہوئی آئی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اپنے کرتے کی آستین کو اپنے منہ پر حیا کے مارے ڈالے ہوئے پردہ کرتے ہوئے آئی۔[2] (یہ الفاظ تفسیر کے ہیں قول میں داخل نہیں۔)

امام جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَمْشِیْ ﴾ حال ہے "جَاءَتْهُ" کے فاعل سے اور ﴿ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ﴾ حال ہے ﴿ تَمْشِیْ ﴾ کی ضمیر سے اور ﴿ عَلٰی ﴾ بہ معنی "مَعَ" ہے یعنی "مَعَ اسْتِحْیَاءٍ"۔ مصباح میں کہا ہے کہ "استحیاء" و "حیا" مد کے ساتھ انقباض وانزواء (یعنی سکڑنے سمٹنے اور بھنچنے) کو کہتے ہیں۔ "اِسْتَحْیَیْتُ" کو ایک یا اور دو یا کے ساتھ بولتے ہیں۔ بہ نفسہٖ اور بہ حرف دونوں طرح متعدی ہوتا ہے۔ "اِسْتَحْیَیْتُهٗ وَاسْتَحْیَیْتُ مِنْهُ" دونوں طرح کہتے ہیں۔[3]

جملہ ﴿ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ ﴾ مستانفہ ہے جواب ہے سوالِ مقدر کا۔ گویا کسی نے کہا کہ جب وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی تو اس نے کیا کہا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ اس نے یہ کہا کہ میرا باپ تجھے بلاتا ہے۔ ﴿ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ﴾ کلمہ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہے، یعنی تاکہ تجھے ہماری بکریوں کو پانی پلانے کا بدلہ دے۔ ﴿ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ "قَصَصٌ" مصدر بہ معنی مقصوص

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٢٢)   [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٦٤)   [3] المصباح المنير (١/ ٨٦)

ہے، یعنی پھر جب موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام کے پاس آئے اور قبطی کے قتل سے لے کر مدین کے پانی پر وارد ہونے تک جو ماجرا گزرا تھا وہ سارا شعیب علیہ السلام سے بیان کیا تو وہ بولے: مت ڈر، تو نے ظالموں کی قوم سے نجات پائی، یعنی فرعون اور اس کے ساتھیوں سے۔ اس لیے کہ مدین پر فرعون کا کچھ تسلط نہیں ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مالک بن انس رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ "إِنَّ شُعَيْبًا هُوَ الَّذِيْ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ"[1] یعنی جس شخص سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنا قصہ بیان کیا وہ شعیب علیہ السلام ہی ہیں۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ خبرِ واحد کے ساتھ عمل کرنا جائز ہے، اگرچہ وہ غلام ہو یا عورت ہو اور اسی طرح اجنبی عورت کے ہمراہ چلنا بھی درست ہے، اس احتیاط اور پرہیز گاری کے ساتھ جو موسیٰ علیہ السلام نے کی۔

اب رہی یہ بات کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کی دعوت کس طرح قبول کی، باوجود اس کے کہ اس نے یہ واضح کر دیا تھا کہ میرا باپ پانی پلانے کی مزدوری دینے کے لیے بلاتا ہے، حالاں کہ انھوں نے مزدوری طلب کرنے کی خاطر پانی نہیں پلایا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے اس عورت کی اور اس کے باپ کی دعوت قبول کی درآنحالیکہ وہ اپنے دل میں اس بات کا انکار کرنے والے تھے کہ ان کا پانی پلانا اُجرت طلب کرنے کے لیے ہو۔ وہ تو لوجہ اللہ تعالیٰ تھا، بلکہ ان کا دعوت قبول کرنا اس کے باپ کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لیے تھا، کیوں کہ وہ پہلے سن چکے تھے کہ وہ ایک بوڑھا بڑی عمر کا آدمی ہے اور اسی لیے اس کے کھانے سے انکار کیا، یہاں تک کہ اس نے کہا کہ وہ اُجرت کے لیے نہیں ہے، جس طرح کہ ابو حازم سے مروی ہے، کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام پر داخل ہوئے تو اس وقت وہ شام کا کھانا کھا رہے تھے۔

شعیب علیہ السلام نے ان سے کہا: کھاؤ، موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ"، شعیب علیہ السلام نے کہا: کیوں، کیا تو بھوکا نہیں ہے؟ کہا: ہاں، بھوکا تو ہوں، لیکن میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ یہ ان کے جانوروں کو پانی پلانے کا عوض ہو، حالاں کہ میں اس خاندان میں سے ہوں کہ ہم کسی شے کو آخرت کے عمل کے بدلے میں نہیں بیچتے، اگرچہ وہ زمین بھر کر سونا ہی ہو۔ شعیب علیہ السلام نے فرمایا: "لَا وَاللّٰهِ"، لیکن یہ تو میری اور میرے باپ دادا کی عادت ہے کہ ہم مہمان کی مہمانی کیا کرتے ہیں اور کھانا کھلاتے ہیں، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے، پھر کھانا کھایا۔[2]

فتح القدیر اور فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ امام رازی رحمہ اللہ کے نہایت بارد اشکال ہیں۔ وہ ایسے نہیں ہیں کہ کلام اللہ عزوجل کی تفسیر میں ذکر کیے جائیں، ان کا جواب تو ایک مقصر (کوتاہ کار) کو ظاہر ہو جاتا ہے، کامل کا کیا ذکر ہے! انتہا درجے کی جو بات انھوں نے ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ جو دعوت پانی پلانے کی جزا کے ساتھ معلل تھی، موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کیوں قبول کیا؟ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انھوں نے انبیاء میں سے ایک نبی کی دعوت کو قبول کرنے میں سنتِ الٰہی کا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٦٦) [2] تاريخ دمشق (٢٣/ ٧٨_ ٧٩)

اتباع کیا۔ یہ قبول کرنا اس عمل کی اُجرت لینے کے لیے نہ تھا، اسی لیے وارد ہوا ہے کہ جب ان کے رو برو کھانا لایا گیا تو انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا، اس کا قصہ پہلے گزر چکا ہے۔[1]

تفسیر کشاف میں ہے کہ فاقے کی شدت کی وجہ سے اُجرت طلب کرنا کچھ بری بات نہیں،[2] اس کے صحیح ہونے پر یہ آیتِ کریمہ شاہد ہے: ﴿ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴾ [الكهف: ۷۷] ''اگر تو چاہتا تو اس پر ضرور اُجرت لے لیتا۔'' غرضیکہ پھر جو عورت اُن کے پاس آئی تھی اس نے اپنے باپ سے کہا: ﴿ يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ﴾ یعنی اے ابا جان! آپ اس کو نوکر رکھ لیں، تا کہ ہماری بکریاں چرائے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اجارہ (اجرت پر کسی کو رکھنا) ان کے نزدیک مشروع تھا۔ اس کے جواز اور مشروعیت پر جمیع علمائے اسلام نے اتفاق کیا ہے، مگر ایک اصم، چنانچہ وہ اس کے دلائل سننے سے اصم ہیں، (یعنی وہ بہرے ہیں اور اجارے کا انکار کرتے ہیں)۔ غرضیکہ اس نے اپنے باپ کو موسیٰ علیہ السلام کے نوکر رکھ لینے کا مشورہ دیا، پھر اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ﴿ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴾ یعنی وہ اس کے لائق ہے کہ تو اسے نوکر رکھ لے، کیوں کہ اس میں قوت اور امانت دونوں خوبیاں جمع ہیں، مطلب یہ کہ نوکر میں یہ دو خصلتیں کام کی ہوتی ہیں، چنانچہ وہ اس میں موجود ہیں۔

رہی یہ بات کہ ''تَسْتَاْجِرُهُ'' نہ کہا، حالاں کہ یہی ظاہر ہے اور ﴿ اِسْتَاْجَرْتَ ﴾ کہا تو نکتہ اس کا یہ ہے کہ بہ سبب تحقیق اور تجربے کے اس کو ماضی کے قائم مقام ٹھہرایا، گویا یہ امر پہلے سے معلوم ہو چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس نے جو اپنے باپ سے موسیٰ علیہ السلام کی قوت اور امانت کی صفت بیان کی تو اس کے باپ نے اس کے متعلق اس سے پوچھا تو وہ بولی کہ اس کی قوت تو اس کے ایک ایسے پتھر کو اٹھانے سے ظاہر ہوئی جس کو دس مرد اُٹھا سکتے ہیں، رہی اس کی امانت تو وہ اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ تو میرے پیچھے چل اور مجھے راستہ بتاتی جا، کیوں کہ میں اس بات کو برا جانتا ہوں کہ تیرے کپڑوں کو ہوا لگے جس سے مجھ پر تیرے جسم کا کوئی حصہ ظاہر ہو۔ چنانچہ اس بات نے اس کے باپ کی رغبت کو موسیٰ علیہ السلام کے حق میں اور زیادہ کیا۔

اس کا باپ بولا: ﴿ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ ﴾ یعنی میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں میں سے ایک بیٹی تجھ سے بیاہ دوں بڑی یا چھوٹی۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ عورت کے ولی کا عورت کو مرد پر پیش کرنا مشروع ہے۔ یہ سنت اسلام میں ثابت ہے۔ چناں چہ ثابت ہو چکا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی حفصہ رضی اللہ عنہا کو سیدنا ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنہما پر پیش کیا تھا۔ یہ قصہ حدیث کی کتابوں میں مشہور و معروف ہے۔ اس کے سوا اور قصے ہیں جو ایامِ نبوت اور ایامِ صحابہ میں واقع ہو چکے ہیں۔[3] اسی طرح وہ واقعہ ہے کہ ایک عورت نے خود اپنی جان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کی تھی۔[4] زہے سعادت و خہے برکت، واہ رے بی بی کیا خوب سوجھی۔

---

(1) فتح القدير (٤/ ٢٢٢) فتح البيان (١٠/ ١٠٧)
(2) الكشاف (٣/ ٤٠٧)
(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٨٣)
(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٨٦)

بالجملہ کسی نے کہا ہے کہ اپنی بڑی بیٹی بیاہ دی۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ ان میں سے چھوٹی بیٹی کا ان سے نکاح کیا، اس کا نام صفوراء تھا اور یہی موسیٰ علیہ السلام کو بلانے کے لیے گئی تھیں۔ ﴿ هٰتَيْنِ ﴾ کا کلمہ اس بات پر دال ہے کہ ان دو کے سوا ان کی اور بیٹیاں بھی تھیں۔ امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی سات بیٹیاں تھیں، جس طرح کہ تورات شریف میں ہے۔ ﴿ اُنْكِحَكَ ﴾ کا کلمہ ان کے باپ کی طرف سے مواعدت (پیش کش) ہے عقدِ نکاح نہیں ہے، اگر یہ عقد ہوتا تو ''قَدْ أَنْكَحْتُكَ'' کہتے۔

پھر نکاح کی یہ شرط ذکر کی: ﴿ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ﴾ ﴿ حِجَجٍ ﴾ جمع ''حِجَّةٌ'' ہے بہ معنی سال، یعنی اس شرط پر کہ تو آٹھ برس تک میرا مزدور ہو۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اس شرط پر کہ ٹھہرائے تو ثواب میرا، یعنی اجر میرا کہ آٹھ برس تو میری بکریاں چرائے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: ''أَجَرْتُ دَارِيْ وَمَمْلُوْكِيْ'' کو ممدود وغیر ممدود دونوں طرح بولتے ہیں اور غیر ممدود زیادہ استعمال ہوتا ہے۔[1] ﴿ اَنْ تَاْجُرَنِيْ ﴾ کا محل نصب ہے بنا برحال (یعنی فاعل سے یا مفعول سے، معنی یہ ہیں کہ نکاح کروں میں تیرا درآنحالیکہ شرط کی جائے مجھ پر یا تجھ پر اس بات کی کہ تو آٹھ برس میری مزدوری کرے۔ اس کی بحث امام سمین رحمہ اللہ نے خوب لکھی ہے) اور ''تَأْجُرُ'' مضارع ہے ''أَجَرْتُهُ'' کا اور مفعولِ ثانی اس کا محذوف ہے اور ﴿ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ﴾ ظرف ہے، یعنی تو اپنے نفس کو میرا مزدور بنا دے آٹھ برس کی مدت کے لیے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''اَلتَّزَوُّجُ عَلَى رَعْيِ الْغَنَمِ جَائِزٌ بِالْإِجْمَاعِ لِأَنَّهُ مِنْ بَابِ الْقِيَامِ بِأَمْرِ الزَّوْجِيَّةِ فَلَا مُنَاقَضَةَ بِخِلَافِ التَّزَوُّجِ عَلَى الْخِدْمَةِ''[2] یعنی بکریاں چرانے پر نکاح کرنا بالاجماع جائز ہے۔ اس لیے کہ یہ چرانا اس باب سے ہے کہ زوجیت کے کام کاج کے ساتھ قیام کرے، چنانچہ اب کچھ مناقضہ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے کہ خدمت پر بیاہ کرے۔

﴿ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ﴾ یعنی پھر جس چرانے پر میں نے تجھ کو مزدور کیا ہے، اگر تو اس کو دس برس پورا کرے تو یہ تیری طرف سے از راہِ تفضّل و تبرع کے ہے، یعنی نیکی اور عطا ہو گی نہ کہ اس انداز سے کہ میں اس کو تیرے لیے لازم کرتا ہوں، یہ تجھ پر واجب نہیں ہے۔ جو مدت آٹھ برس سے زیادہ ہے اس کو انھوں مفوض بہ مروت کیا، یعنی وہ تیری طرف سے ایک قسم کا احسان ہے، میری طرف سے وہ تیرے لیے لازمی نہیں ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ گفتگو پہلی مدت کے ساتھ عقد کی درخواست ہے ہماری شریعت کی نظر میں اور ممکن ہے کہ ان کے نزدیک وہ صحیح عقد ہو۔ ﴿ فَمِنْ عِنْدِكَ ﴾ کا محل رفع ہے بر تقدیر مبتدا کے۔ ''أَيْ: فَهِيَ مِنْ عِنْدِكَ''، یعنی وہ مدت، جو آٹھ برس سے زیادہ ہے، وہ تیری طرف سے ثابت ہے۔

﴿ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ﴾ یعنی میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر دس برس کو پورا کرنا لازم کر کے اور وقتوں کی

[1] فتح القدير (٤/ ٢٢٣) [2] تفسير النسفي (٣/ ٢٣٤)

پابندی اور کام کے پوری طرح سے لینے میں تجھ سے جھگڑا کر کے تجھے مشقت میں ڈالوں۔ اشتقاق مشقت کا ''شق'' سے ہے۔ ''شق'' نصف کو کہتے ہیں تو گویا جو شخص مشقت میں پڑتا ہے تو وہ اپنے ظن اور گمان کے دو ٹکڑے کرتا ہے: کبھی تو کہتا ہے کہ میں اس کام کی طاقت رکھتا ہوں، کبھی کہتا ہے نہیں۔ اس کا گمان انہی دوشقوں میں گھومتا رہتا ہے۔

پھر شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے اجارہ قبول کرنے کی رغبت دلاتے ہوئے یوں کہا: ﴿ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ یعنی عن قریب تو مجھے حسنِ صحبت اور لطفِ معاملہ میں اور نرمی اور ایفائے عہد میں اللہ چاہے تو صالحوں میں پائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ صلاح علی العموم مراد ہے۔ رہی معاملے کی درستی اس اجارے میں تو وہ اس آیت کے تحت میں بہ درجۂ اولیٰ داخل ہو گی۔ صلاح کو مشیتِ الٰہی کے ساتھ مشروط کیا، اس لیے کہ اپنی بات کو اللہ پاک کی توفیق اور معاونت کے سپرد کیا، دوسرے تبرک کے لیے۔ اس لیے نہیں ہے کہ اپنی صلاح کو مشیتِ الٰہی کے ساتھ معلق کیا ہو۔

پھر جب شعیب علیہ السلام اپنی بات سے فارغ ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کی تقریر کی اور اس کو پختہ کیا اور یوں کہا: ﴿ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ﴾ متبدا وخبر ہیں، یعنی یہ بات جس پر میں نے اور آپ نے عقد کیا ہے، میرے اور آپ کے درمیان ثابت ہو چکی۔ جملہ ﴿ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ ﴾ شرطیہ ہے اس کا جواب ﴿ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ﴾ ہے۔ ''أَجَلَيْنِ'' سے مراد آٹھ برس اور دس برس کی مدت ہے۔ ﴿ قَضَيْتُ ﴾ کے معنی ''وَفَيْتُ بِهٖ وَأَتْمَمْتُهٗ وَ فَرَغْتُ مِنْهُ'' ہیں۔ ﴿ الْاَجَلَيْنِ ﴾ مجرور ہے اس لیے کہ ''أَيٌّ'' اس کی طرف مضاف ہے اور کلمۂ ''مَا'' زاید ہے یا کلمۂ ''مَا'' محلِ جر میں ہے، اس وجہ سے کہ ''أَيٌّ'' اس کی طرف مضاف ہے اور ''أَجَلَيْنِ'' اس سے بدل ہے۔ یہ قول ابن کیسان رحمہ اللہ کا ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے ''أَيْمَا'' بہ سکونِ تحتیہ پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''أَيَّ الْأَجَلَيْنِ مَا قَضَيْتُ'' پڑھا ہے۔[1] (کلمۂ ''مَا'' زائد ہے تاکیدِ فعل کے لیے ''أَيْ: أَيُّ الْأَجَلَيْنِ جَرَّدْتُّ عَزْمِيْ لِقَضَائِهٖ''[2] كذا قال القاضي۔ معنی یہ ہیں کہ میں جون سی مدت کو پورا کروں اور اس سے فارغ ہو جاؤں تو مجھ پر کسی طرح کا ظلم نہ ہو اس مدت پر زیادتی طلب کرنے کی صورت میں جس کو میں پورا کر چکوں دونوں مدتوں میں سے، یعنی جیسے مجھ سے آٹھ برس سے زیادہ کا مطالبہ نہ کیا جائے ویسے ہی دس برس سے کم کا مطالبہ نہ ہو۔

کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جیسا مجھ سے دس برس سے زیادہ کا مطالبہ نہ کیا جائے، ویسا ہی آٹھ برس سے زیادہ کا مجھ سے مطالبہ نہ ہو۔ یہ معنی ظاہر تر ہیں۔ ﴿ عُدْوَانَ ﴾ کی اصل غیر واجب میں حد سے بڑھنا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جان چکے تھے کہ دونوں میں سے جو مدت تمام تر ہے اس میں ان پر عدوان نہیں ہے، لیکن انھوں نے دونوں کو جمع کیا، تاکہ قلیل مدت کو مکمل مدت کی طرح ٹھہرائیں اس کے پورا کرنے میں۔ جمہور نے

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٢٣) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٩٠)

﴿ عُدْوَانَ ﴾ بہ ضمِ عین پڑھا اور ابو حیوہ رحمہ اللہ نے بکسرِ عین پڑھا ہے۔[1]

غرضیکہ پھر اللہ پاک کو اپنے معاملے کا گواہ ٹھہرایا، یوں کہا: ﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴾ یعنی یہ شرطیں جو ہمارے درمیان طے ہوئیں، جن کو ہم کہہ رہے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ شاہد اور نگہبان ہے، چنانچہ ہم میں سے کسی کو اس طرف کوئی راہ نہیں ہے کہ اُن میں سے کسی شے سے باہر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کلام من جملہ قولِ موسیٰ علیہ السلام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ من جملہ قولِ شعیب علیہ السلام ہے۔ قولِ اول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کے جملے میں واقع ہوا ہے۔ بہر حال اس کلام سے عقد مکمل ہو گیا، شاید یہ اُن کی شریعت میں تھا۔ ورنہ ہمارے نزدیک عقدِ نکاح کے لیے اتنا کلام کافی نہیں ہے، کیوں کہ جو بات شعیب علیہ السلام سے واقع ہوئی، وہ صرف نکاح کر دینے کا وعدہ ہے اور جو بات موسیٰ علیہ السلام سے واقع ہوئی اس میں نہ تو تزویج کا مادہ ہے اور نہ انکاح کا اور مہر بھی منکوحہ کی طرف راجع نہیں ہے، بلکہ اس کے باپ کی طرف ہے۔ یہ قول تو جلال محلی رحمہ اللہ کا ہے کہ اس سے عقد تمام ہو گیا،[2] یعنی شعیب اور موسیٰ علیہما السلام سے جو باتیں صادر ہوئیں اُن سے عقدِ نکاح اور اجارہ پورا ہو گیا۔ امام محلی رحمہ اللہ کے سوا اور لوگوں نے یوں کہا ہے کہ انھوں نے کسی اور صورت کے ساتھ عقد کیا اس صورت کے سوا جس کا اس جگہ ان کی طرف سے ذکر کیا گیا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے محلی رحمہ اللہ کے قول پر یہ اعتراض کیا ہے کہ شعیب علیہ السلام نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ ﴿ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ ﴾ پس یہ وعدہ ہے اور نیز منکوحہ کا تعیین نہیں کیا، یعنی پھر عقد کیسے تمام ہو گیا؟! امام حفناوی رحمہ اللہ نے اس کا یوں جواب دیا کہ منکوحہ کا تعین وعدے کا وقت پورا ہونے پر ہوا۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں جو بات دونوں سے نقل کی گئی ہے وہ تمام ماجرا نہیں جو اُن کے درمیان واقعہ ہوا انشائے عقدِ نکاح اور عقدِ اجارہ میں اور اُن کے واقع کرنے میں، بلکہ یہ تو اس چیز کا بیان ہے جس پر دونوں نے عزم کیا اور اس کے عمل پر اتفاق فرمایا۔ یہ حسبِ ضرورت ہے، جس پر قصے کا اجمالاً بیان کیا جانا موقوف ہے، اس شریعت میں جو امورِ نکاح اور اُجرت پر رکھنے کے لیے ضروری ہیں، ان کا تفصیلی بیان نہیں کیا۔[3] غرض ان کی یہ ہے کہ اس جگہ عقدِ نکاح کے تمام ہونے کی بحث کرنا فضول ہے۔[4]

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ
الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ
مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا

[1] فتح القدير (٤/ ٢٢٣) [2] تفسير الجلالين (١/ ٥١١)

[3] تفسير أبي السعود (٧/ ١١) [4] فتح البيان (١٠/ ١٠٦۔ ١١١)

نُودِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ
الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ
عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ
یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ
یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ؗ وَّاضْمُمْ
اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰی
فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾

پھر جب موسیٰ نے وہ مدت پوری کر لی اور اپنے گھر والوں کو لے کر چلا تو اس نے کوہِ طور کی ایک جانب سے آگ دیکھی، اس نے اپنے گھر والوں سے کہا: تم (یہیں) ٹھہرو، بے شک میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے تمھارے پاس کوئی خبر یا آگ کا انگارا لے آؤں، تاکہ تم تاپ سکو (29) پھر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اسے وادی کے دائیں کنارے ایک مبارک جگہ میں ایک درخت سے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! یقیناً میں ہی اللہ، سب جہانوں کا رب ہوں (30) اور یہ (بھی کہا گیا:) کہ تو اپنا عصا ڈال دے، پھر جب موسیٰ نے عصا کو دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہا ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر پلٹا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا، (اللہ نے فرمایا:) اے موسیٰ! تو آگے بڑھ اور نہ ڈر، بلاشبہ تو امن والوں میں سے ہے (31) اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، (پھر نکال تو) وہ (سفید) چمکتا ہوا بے عیب نکلے گا اور خوف سے (بچنے کے لیے) اپنا بازو اپنی طرف ملا لے، چناں چہ تیرے رب کی طرف سے یہ دونوں معجزے فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف (بھیجنے کے لیے) ہیں، بلاشبہ وہ نافرمان لوگ ہیں (32)

موسیٰ علیہ السلام کا مصر واپس آنا اور نبوت کا تاج پہنایا جانا:

خوف سے بازو ملا، تاکہ سانپ کا ڈر جاتا رہے۔ انتھیٰ. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پہلی آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے وہی مدت پوری کی جو اتم و اوفیٰ اور ابر و اکمل و اتقیٰ تھی۔ اس آیتِ کریمہ سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ ﴾ یعنی وہی مدت

پوری کی جو ان دونوں میں سے اکمل تھی۔ واللہ أعلم. امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ دس برس کی مدت پوری کی اور اس کے بعد دس برس اور۔ میں نے یہ قول سوائے مجاہد رحمہ اللہ کے اور کسی کا نہیں دیکھا۔ (تفسیر جمل میں یوں کہا ہے: ''وعن مجاهد وغيره أنه أقام عند شعيب عشرة أخرى قال ابن عطية: وهو ضعيف'') امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مجاہد سے اس کو حکایت کیا ہے۔[1] فالله أعلم.

﴿ وَسَارَ بِأَهْلِهِ ﴾ کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے شہر کے اور اپنے گھر والوں کے مشتاق ہوئے تو ارادہ کیا کہ فرعون اور قومِ فرعون سے خفیہ طور پر اُن سے ملاقات کریں، پھر اپنے گھر والوں کو اور جو بکریاں اُن کے خسر کی ہبہ کی ہوئی تھیں، ان سب کو لے کر کوچ کیا۔ چنانچہ ان کو اندھیری سرد بارش کی رات میں لے کر چلے، پھر ایک منزل میں اترے تو چقماق (سخت پتھر جس کو رگڑنے سے آگ نکلتی ہے) چھڑانے لگے، جب بھی اپنی چقماق سے آگ نکالتے تو وہ کچھ بھی روشنی نہ دیتی، چنانچہ اس پر متعجب ہوئے، اسی حال میں تھے کہ ﴿ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ﴾ طور کی جانب سے ایک آگ دیکھی کہ اس کے لیے روشن ہو رہی ہے۔

﴿ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا ﴾ یعنی پھر اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو، یہاں تک کہ میں اس آگ کی طرف جاؤں۔ ﴿ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ ﴾ یعنی میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید تمھارے پاس وہاں کی کچھ خبر لے آؤں۔ یہ اس لیے کہا کہ راستہ بھول گئے تھے۔ ﴿ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ ﴾ یا اس آگ میں سے ایک ٹکڑا لے آؤں۔ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴾ شاید تم اس کے ذریعے سے گرمی حاصل کرو سردی سے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ ﴾ یعنی پھر جب اس کے پاس پہنچا تو اس کو وادی کے اس طرف سے، جو پہاڑ کے ساتھ تھی، اس کے مغربی کنارے کے داہنی طرف، آواز دی گئی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ ﴾ [القصص: ٤٤] ''اور (اے نبی!) جب ہم نے موسیٰ پر امرِ (خاص) کی وحی کی تو آپ (طور کی) مغربی جانب نہیں تھے۔'' یہ آیت من جملہ ان دلیلوں کے ہے جو یہ بات بتاتی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے قبلے کی سمت آگ کا قصد کیا تھا اور جبلِ غربی ان کی داہنی جانب تھا اور آگ کو پایا کہ ایک سبز درخت میں شعلہ مار رہی ہے۔ ''فِي لَحْفِ الْجَبَلِ مِمَّا يَلِي الْوَادِيْ'' (هكذا في الأصل بالحاء المهملة، والله أعلم ما معناه، وأما اللجف بالجيم وبالتحريك میانۂ وادی و مغاکے برکرانۂ چاہ واللخاف بالخاء المعجمة سنگہائے سپید تنک۔ كذا في الصراح)

موسیٰ علیہ السلام اسی حالت میں حیرت کرتے ہوئے ٹھہرے رہے، پھر اُن کے رب نے ان کو آواز دی وادیِ ایمن کے کنارے سے ایک درخت سے بقعۂ مبارکہ میں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٧٠) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٧١)

ہے، کہا: میں نے اس درخت کو دیکھا جس سے موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی گئی تھی، وہ ایک سمرہ خضراء ہے کہ ہل رہا ہے۔[1]
"إسناده مقارب" ("سَمُرَةٌ" بالفتح وضم میم درخت طلح و طلح و طلاح باکسر درختان بزرگ در ریگستان۔ کذا في الصراح۔ مجمع البحار میں کہا ہے: "سَمُرَةٌ ضَرْبٌ مِنْ شَجَرِ الطَّلْحِ"[2] مادہ طلح میں یوں کہا ہے: "طَلْحٌ مَنْضُودٌ هُوَ شَجَرَةُ الْمَوْزِ عِنْدَ الْعَرَبِ"۔ پھر کہا ہے کہ "طَلْحَةٌ لُغَةٌ وَّاحِدَةٌ اَلطَّلْحُ شَجَرٌ عِظَامٌ مِنْ شَجَرِ الْعِضَاهِ.[3] انتهى" یہ سب کچھ ہوا، لیکن استادوں سے "سمرہ" کے معنی یہ سنے ہیں کہ ببول کا درخت ہے یا کیکر کا۔ واللہ أعلم) محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے "عَنْ بَعْضِ مَنْ لَّا يُتَّهَمُ عَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ" روایت کیا ہے، کہا: "شَجَرَةٌ مِنَ الْعُلَيْقِ وَبَعْضُ أَهْلِ الْكِتَابِ يَقُوْلُ: إِنَّهَا مِنَ الْعَوْسَجِ وَعَصَاهُ مِنَ الْعَوْسَجِ"[4] (علیق: مثال قبیط گیاہی کہ درآویزد بر درخت (كذا في الصراح) وعوسج: نوعی از خار عوسجہ یکی وعضاہ: درختان بلند باخار كذا في الصراح)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی جو تجھ سے خطاب و کلام کرتا ہے وہ رب ہے جہان کا۔ بڑا کرنے والا ہے اس شے کا جس کو وہ چاہتا ہے، نہیں ہے کوئی معبود سوا اس کے اور نہ کوئی رب ہے اس کے سوا۔ اپنی ذات و صفات اور اپنے اقوال و افعال میں مخلوقات کی مماثلت سے برتر و پاک ہے، سبحانہ وتعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ﴾ اور یہ کہ اپنی لاٹھی کو جو تیرے ہاتھ میں ہے، ڈال دے۔ یہ ویسی تقریر ہے، جیسی اس آیت میں فرمائی ہے: ﴿ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۷۔ ۱۸] "اور اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں، اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں، اور اس میں میرے لیے اور بھی مقاصد ہیں۔"

معنی یہ ہیں کہ یہ تو تیری وہ لاٹھی ہے جس کو تو خوب جانتا پہچانتا ہے اس کو ڈال دے۔ چنانچہ اس کو ڈال دیا، اسی وقت وہ ایک سانپ بن گیا کہ دوڑ رہا ہے، لہٰذا پہچان لیا اور خوب یقین کر لیا کہ اس سے جو کلام اور خطاب کر رہا ہے، وہی ہے جو کسی شے سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے، جس طرح کہ اس کا بیان سورت طٰہٰ میں گزر چکا ہے۔

اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ ﴾ یعنی پھر جب دیکھا اس کو اضطراب کرتے ہوئے، جیسے سانپ ہے اپنی تیز حرکت میں، باوجود اس کے کہ اس کی خلقت بہت بڑی ہے اور اس کے پاؤں ہیں اور اس کا منہ بہت وسیع ہے اور اس کے دانت اور ڈاڑھیں اس طرح سے کٹکٹاتے ہیں کہ جس پتھر پر سے گزرتا ہے اسے نگل لیتا ہے،

---

[1] تفسير الطبري (۱۹/ ۵۷۳)
[2] مجمع بحار الأنوار (۳/ ۱۱۵)
[3] مجمع بحار الأنوار (۳/ ۴۵۲)
[4] تفسير الطبري (۱۹/ ۵۷۳) تفسير ابن كثير (۳/ ۵۱۱)

اس میں اترتا جاتا ہے، کھڑکھڑاتا ہے، گویا وہ کسی وادی سے اتر رہا ہے، چنانچہ اس وقت ﴿ وَلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ﴾ یعنی اُلٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ پیچھے مڑا اور دیکھا اور التفات نہ کیا، اس لیے کہ انسانی طبیعت اس سے نفرت کرتی ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے ان سے فرمایا: ﴿ يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴾ تو لوٹے، پھر اپنے پہلے مقام میں ٹھہرے۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ یعنی جس وقت تو اپنا ہاتھ گھسائے گا اپنے کرتے کی جیب میں، پھر تو اسے نکالے گا تو وہ چمکتا دمکتا ہوا نکلے گا، گویا چاند کا ٹکڑا ہے، بجلی کی طرح چمکتا ہے اور اسی لیے ﴿ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ فرمایا ہے، یعنی بغیر برص کے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ﴾ یعنی اور ملا اپنی طرف اپنا بازو رہب سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: فزع سے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رعب سے۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم و ابن جریر رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس خوف سے جو تجھ کو سانپ سے حاصل ہوا ہے۔[1] ظاہر یہ ہے کہ اس سے عام معنی مراد ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا اس بات کا کہ جب وہ کسی شے سے ڈریں تو خوف سے اپنی طرف اپنے جناح کو ملا لیں۔ جناح سے مراد ان کا ہاتھ ہے، چنانچہ جب ایسا کریں گے تو جو خوف وہ محسوس کرتے ہیں وہ ان سے جاتا رہے گا۔ بسا اوقات جب کوئی شخص اقتداء کے طور پر اس کا استعمال کرے، اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھے تو بے شک جو شے وہ پاتا ہے وہ اس سے دور ہو جائے گی یا ہلکی ہو جائے گی۔ إن شاء اللہ تعالیٰ و به الثقة.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دل فرعون کے رُعب سے بھر گیا تھا۔ پس جس وقت وہ اس کو دیکھتے تو کہتے: "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَدْرَأُ بِكَ فِيْ نَحْرِهِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِ" پھر جو خوف موسیٰ علیہ السلام کے دل میں تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو فارغ کر دیا اور اسے فرعون کے دل میں رکھ دیا، چنانچہ جس وقت وہ موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتا تو مُوت دیتا تھا، جس طرح گدھا موتتا ہے۔[2]

﴿ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ یعنی عصا کا ڈال دینا اور اس کا دوڑتا ہوا سانپ کر دینا اور اپنا ہاتھ جیب میں ڈالنا، پھر اس کا بغیر کسی نقص کے چمکتا دمکتا نکلنا۔ یہ دو دلیلیں اللہ کی قدرت پر قطعی اور واضح ہیں جو فاعل مختار ہے، اور اس شخص کی صحتِ نبوت پر جس کے ہاتھوں پر یہ خارقِ عادت امر (معجزہ) جاری ہوا، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ﴾ یعنی فرعون کی طرف اور اس کی قوم کے رؤساء، کبراء، اتباع اور فرماں برداروں کی طرف۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ یعنی بے شک وہ اللہ کی اطاعت سے نکلنے والے اور اس کے امر اور دین کی مخالفت کرنے والے لوگ تھے۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٧٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٧٨) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٠_ ٥١٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع توضیحِ تبیان یہ ہے کہ ﴿ فَلَمَّا ﴾ میں حرفِ ''فا'' فصیحہ ہے، جملۂ محذوفہ کا اظہار کرتا ہے ''أَجَل'' سے مراد دونوں میں سے اکمل اور اوفیٰ مدت ہے، یعنی دس برس۔ سعید بن منصور رحمہ اللہ نے اور امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے مصنف میں اور عبد بن حمید، بخاری، ابن منذر اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے چند طریق کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میں سے کونسی مدت پوری کی؟ تو فرمایا کہ اُن میں سے جو زیادہ اور اطیب تھی وہ پوری کی، بے شک اللہ کا رسول جب کہتا ہے تو کرتا ہے۔ اسی کے مثل امام بزار، ابو یعلیٰ، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے بھی ان سے روایت کیا ہے اور حاکم رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔[1] صاحبِ فتح القدیر وغیرہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول کہ اللہ کا رسول جب کہتا ہے تو کرتا ہے، اس میں نظر ہے، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یوں نہیں کہا ہے کہ ''إِنَّهُ سَيَقْضِيْ أَكْثَرَ الْأَجَلَيْنِ'' بلکہ انھوں نے تو یہ کہا: ﴿ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ﴾[2]

کاتب حروف ۔عفا اللہ عنہ۔ کہتا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں نظر نہیں ہے، بلکہ صاحبِ فتح القدیر کے قول میں نظر ہے، اس لیے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ﴿ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ ﴾ فرمایا تو اس کے ضمن میں ''أَكْثَرَ الْأَجَلَيْنِ'' بھی آ گئی۔ گفتگو آٹھ اور دس برس کی مدت پوری کرنے میں تھی، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان میں سے جون سی مدت پوری کر دوں تو پھر مجھ پر زیادتی نہ ہو، اس عبارت سے جس طرح آٹھ برس کا پورا کرنا نکلتا ہے، ویسا ہی دس برس کا پورا کرنا معلوم ہوتا ہے۔ انتھیٰ.

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چند طریق سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میں سے تمام تر مدت پوری کی۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جس وقت تجھ سے پوچھا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میں سے کون سی مدت پوری کی؟ تو تو کہہ کہ « خَيْرَهُمَا وَأَبَرَّهُمَا » یعنی وہی مدت پوری کی جو دونوں میں سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ نیک تھی اور اگر تجھ سے پوچھا جائے کہ دونوں میں سے کون سی عورت سے بیاہ کیا تھا؟ تو تو کہہ کہ ان میں سے چھوٹی سے۔ اور یہ وہی ہے، جو آئی اور پھر کہا: ﴿ يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ﴾۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے مجھ سے کہا: اے محمد! اگر یہود آپ سے سوال کریں کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میں سے کون سی مدت پوری کی؟ تو آپ کہیں کہ ان میں سے وافی تر اور اگر وہ تجھ سے سوال کریں کہ ان میں سے کس عورت سے بیاہ کیا؟ تو آپ کہیں کہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٨) الدر المنثور (٦/ ٤٠٩)
[2] فتح القدير (٤/ ٢٢٦)

ان میں سے چھوٹی سے۔[1] (وأخرج البزار وابن أبي حاتم والطبراني في الأوسط وابن مردويه قال السيوطي بسند ضعيف عن أبي ذر رضي الله عنه أن النبي ﷺ سئل: أي الأجلين قضى موسىٰ عليه السلام قال: أبرهما و أوفاهما، قال: و إن سئلت أي المرأتين تزوج، فقل: الصغرىٰ منهما، قال البزار: لا نعلم يروى عن أبي ذر إلا بهذا الإسناد، و قد رواه ابن أبي حاتم من حديث عويد بن أبي عمران، وهو ضعيف، و أما روايات أنه قضى أتم الأجلين فلها طرق يقوي بعضها بعضاً)

غرضیکہ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کامل تر مدت پوری کر چکے اور مدین سے اپنے اہل کو لے کر مصر کی طرف چلے تو ایک آگ دیکھی، اس سمت سے جو طور پہاڑ کے متصل تھی۔ اہل سے مراد ان کی بی بی ہیں، اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ مرد جہاں چاہے اپنی بیوی کو لے جائے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے سسر کی اجازت سے لے گئے۔[2] مصر کی طرف جانے کی یہ وجہ تھی کہ مقصد صلہ رحمی اور ماں اور بھائی کی زیارت کرنا تھا۔ آگ دیکھنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جنگل میں تھے، اندھیری رات تھی، سخت سردی پڑ رہی تھی، ان کی بیوی کو دردِ زہ نے آ پکڑا تھا، یہ سب امور اس بات کے مقتضی تھے کہ اللہ کا نور آگ کی شکل میں ظاہر ہو۔ امام ابن عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے (شاید یہ وہی ابن عطاء اللہ اسکندری صوفی صاحبِ حکم ہیں، واللہ اعلم) جبکہ محنت کی مدت پوری ہوئی اور زلفہ کے ایام نزدیک آئے اور نبوت کے انوار ظاہر ہوئے تو اپنے اہل کو لے کر چلے تاکہ وہ ان کے ساتھ رب کی عجیب کاریگری کے مشاہدے میں اُن کے ساتھ شریک ہوں۔[3] انتهىٰ. (ذكره النسفي)

﴿قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوٓا إِنِّيٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بطریقِ سدی اسی آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام وہ مدت پوری کر چکے تو اپنے اہل کو لے کر چلے، پس راستہ بھول گئے اور سردی کے موسم میں تھے تو ایک آگ ان کے لیے نمودار کی گئی، پھر جب اس کو دیکھا تو خیال کیا کہ وہ آگ ہے، حالاں کہ وہ اللہ کے نور میں سے تھی۔ چنانچہ اپنے اہل سے کہا کہ تم ٹھہرو، بے شک میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں اس سے تمھارے پاس کوئی خبر لے آؤں۔ پھر اگر کوئی خبر نہ پاؤں تو تمھارے لیے ﴿بِشِهَابٍ قَبَسٍ﴾ [النمل: ۷] یعنی ایک انگارا سلگا کر لے آؤں گا، شاید تم سردی سے بچنے کے لیے اسے تاپو۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے ان سے دوسرے الفاظ اس طرح مروی ہیں کہ شاید میں ایسے شخص کو پاؤں جو مجھے صحیح راستے سے آگاہ کرے اور وہ راستہ بھول گئے تھے۔ امام ابن ابی حاتم اور ابن منذر رحمہما اللہ کے الفاظ ان سے ﴿جَذْوَةٍ﴾ کی تفسیر میں شہاب ہیں۔[4] اس سب کی تفسیر سورت طٰہٰ میں اور سورة النمل میں پورے طور پر گزر چکی

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٠١) [2] تفسير الجلالين (١/ ٥١١)
[3] تفسير النسفي (٣/ ٢٣٥) [4] الدر المنثور (٦/ ٤١١)

ہے۔ ﴿ اِمْكُثُوْٓا ﴾ کا خطاب یا تو بطور تعظیم ہے، یا اُن کی مراد اُن کی بیوی اور اُن کا بیٹا ہے اور خادم ہے۔ جمہور نے "جِذْوَةٍ" بکسرِ جیم پڑھا ہے، یہ تینوں لغت اس لکڑی کے ہیں جس کے سرے میں آگ لگی ہو۔ مشہور قول یہی ہے۔

بعض نے یہ قید لگائی ہے کہ آگ ہو بدوں لہب کے، حالانکہ وہ شے وارد ہوئی ہے، جو اس کی مقتضی ہے کہ اس میں لہب کا وجود ہو۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "جِذْوَةٌ وَجُذْوَةٌ وجَذْوَةٌ" جمرہ ہے، یعنی ان تینوں کے معنی انگارے کے ہیں۔ ان کی جمع "جِذًى و جُذًى و جَذًى" آتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمیع عرب کی لغت میں جذوہ ایک قطعہ ہے جمر سے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جذوہ لکڑی کا وہ سخت ٹکڑا ہے، جس کے کنارے میں آگ ہو یا نہ ہو۔ یہ بات کہ جذوہ انگارے کو کہتے ہیں، سلمٰی کا شعر اس کی تائید کرتا ہے۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ جذوہ سے مراد وہ لکڑی ہے جس کے کنارے میں آگ ہو۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ جذوہ عود غلیظ ہے، اس کے سرے میں آگ ہو یا نہ ہو برابر ہے۔[2] اسی لیے اس کا بیان ﴿ مِنَ النَّارِ ﴾ سے کیا ہے۔ اصطلاء بروزن افتعال ہے۔ ("صلی بالنار" بکسر اللام وفتحہا "كَرَضِيَ وَرَمَى"۔) حرفِ طاء بدل ہے حرفِ تاء سے، اس کے معنی استدفاء ہیں، استدفاء گرمی طلب کرنے کو کہتے ہیں۔

﴿ فَلَمَّآ اَتٰىهَا ﴾ یعنی پھر جب اس آگ کے پاس آیا جس کو دیکھا تھا۔ کسی نے کہا: اس درخت کے پاس۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ درخت کا پہلے ذکر نہیں ہوا ہے۔ ﴿ نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ ﴾ حرفِ من ابتدائے غایت کا ہے اور ﴿ اَلْاَيْمَنِ ﴾ صفت ہے ﴿ شَاطِئِ ﴾ کی، یا وادی کی اور یمن بمعنی برکت سے ماخوذ ہے، یا یمین سے ماخوذ ہے جو یسار (بائیں طرف) کے مقابل ہے۔ "شاطئ الوادي" وادی کے کنارے کو کہتے ہیں، اسی طرح حافتہ و شط و سیف و ساحل ہے، ان سب کے ایک معنی ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ "شَاطِئٌ" کی جمع "أَشْطَاء" ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "شَاطِئُ الْأَوْدِيَةِ" بولتے ہیں، اس کی جمع نہیں کی جاتی۔

﴿ فِي الْبُقْعَةِ ﴾ ﴿ نُوْدِيَ ﴾ سے متعلق ہے، یا محذوف سے متعلق ہے، اس بنا پر کہ ﴿ شَاطِئِ ﴾ سے حال ہے۔ ("بقعة" بہ معنی جگہ "وَالْبُقْعَةُ: اَلْقِطْعَةُ مِنَ الْأَرْضِ تُخَالِفُ الَّتِي بِجَنْبِهَا"[3] كذا في مجمع البحار) جمہور نے "بُقْعَةٌ" کو بہ ضم باء پڑھا ہے اور ابو سلمہ اور اشہب عقیلی رحمہ اللہ نے بہ فتح "باء"۔ یہ بھی ایک لغت ہے، ابو زید رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے۔[4] ﴿ اَلْمُبٰرَكَةِ ﴾ صفت ہے ﴿ اَلْبُقْعَةِ ﴾ کی۔ مبارک اس کو اس لیے کہا ہے کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے وہاں کلام کیا اور اُن کو نبی بنا کر بھیجا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد بقعۂ مقدسہ ہے۔ ﴿ مِنَ الشَّجَرَةِ ﴾ بدلِ اشتمال ہے ﴿ شَاطِئِ الْوَادِ ﴾ سے، اس لیے کہ وہ درخت اس وادی کے کنارے پر اگا ہوا تھا۔ اس

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٢٤)
[2] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٩١)
[3] تفسير الخازن (٥/ ١٧٢)
[4] مجمع بحار الأنوار (١/ ٣٠٢)

درخت میں چار قول ہیں: ایک تو سمرہ خضراء، اس کا ذکر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہو چکا ہے۔[1] دوسرا یہ ہے کہ عوسجہ تھا، تیسرا یہ ہے کہ علیق کا تھا۔ چوتھا یہ ہے کہ عناب کا تھا۔ امام خازن رحمہ اللہ نے اس کی نسبت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف کی ہے۔[2]

معنی یہ ہیں کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے یا اس درخت کے پاس آئے تو ان کو وادی مبارک کے کنارے سے آواز دی گئی، یا کنارۂ وادی کے اس طرف سے جو اُن کی داہنی جانب کے متصل تھی اس درخت سے مبارک جگہ کے پاس۔ ''نِدا'' کا بیان یہ ہے: ﴿ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ مفسرہ یا مخففہ ہے ثقیلہ سے، ضمیرِ شان اس کا اسم ہے اور جملۂ ندا اس کا مفسر ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، دوسرے قول کو امام سمین رحمہ اللہ نے بعید ٹھہرایا ہے۔ جمہور نے ﴿ اِنِّيْٓ ﴾ کو بالکسر پڑھا ہے بنا بر اضمارِ قول، یا اس بنا پر کہ ندا کو قول کے معنی میں شامل قرار دیا ہے۔ اور بہ فتحِ ہمزہ قراءت ضعیف ہے۔ اس میں ایک اشکال ہے، امام سمین رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ﴿ اِنِّيْٓ ﴾ کو فعلِ مقدر کا معمول قرار دیا جائے۔ یہ توجیہ بے کھٹکے ہے، یعنی ''أَنْ يَّا مُوْسٰى إِعْلَمْ أَنِّيْ... الخ''۔

امام جعفر رحمہ اللہ نے کیا منور تفسیر بیان فرمائی ہے: ''أَبْصَرَ نَارًا دَلَّتْهُ عَلَى الْأَنْوَارِ لِأَنَّهُ رَأَى النُّوْرَ فِيْ هَيْئَةِ النَّارِ فَلَمَّا دَنَا مِنْهَا شَمَلَتْهُ أَنْوَارُ الْقُدُسِ وَأَحَاطَتْ بِهِ جَلَابِيْبُ الْأُنْسِ فَخُوْطِبَ بِأَلْطَفِ خِطَابٍ وَّاسْتُدْعِيَ مِنْهُ أَحْسَنَ جَوَابٍ وَصَارَ بِذٰلِكَ مُكَلَّمًا شَرِيْفًا أُعْطِيَ مَا سَأَلَ وَآمَنَ مِمَّا خَافَ. انتهٰى''[3] (ذكره النسفي)۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے ایک ایسی نفیس آگ دیکھی کہ اس نے ان کو انوار پر آگاہی بخشی، اس لیے کہ انھوں نے نار کی صورت میں نور دیکھا، پھر جب اس سے قریب ہوئے تو انوارِ قدس نے ان کو ڈھانک لیا اور اُنس کی چادروں نے ان کو گھیر لیا، پھر لطیف تر خطاب سے ان کو خطاب ہوا اور بہترین جواب کی اُن سے درخواست کی گئی، پس اس سبب سے ایسے شریف و بزرگ مخاطب ہو گئے کہ جو مانگا، وہ ملا اور جس شے کا خوف تھا، اس سے بے خوف ہوئے، ہر قسم کا امن و چین نصیب ہوا۔ سبحان اللطيف بعباده المتفضل عليهم بأعم نواله وأخص جوده المنعم عليهم بلطائف فضله و طرائف حبه و شرائف وده.

کسی نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ہرے بھرے درخت میں آگ دیکھی تو جان گئے کہ اللہ پاک کے سوا کوئی اس بات پر قادر نہیں کہ آگ اور درخت کی سبزی کو ایک جگہ اکٹھا کرے۔ لہٰذا اس سے سمجھ گئے کہ کلام کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ سبحانہ نے اُن کے دل میں اس بات کا علم پیدا کر دیا تھا کہ کلام کرنے والا اللہ

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٢٤) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير النسفي (٣/ ٢٣٥)

ہی ہے اور یہ کلام اللہ ہی کا ہے۔ متکلمین کی ایک جماعت، جس سے امام غزالی رحمہ اللہ بھی ہیں، اس طرف گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک کا کلام ازلی نفسی سنا، جو بغیر آواز اور حرف کے ہے، جس طرح کہ اس کی ذاتِ مقدس آخرت میں دکھائی دے گی بلا کم و بلا کیف۔ شاید اُن لوگوں نے ﴿ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ ﴾ کو ضمیرِ موسیٰ علیہ السلام سے حال ٹھہرایا، جو ﴿ نُوْدِيَ ﴾ میں ہے۔ یعنی ندا کیے گئے اس حال میں کہ کنارۂ وادی سے قریب تھے، یا اس میں کائن تھے، اس بنا پر کہ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ بہ معنی ﴿ فِي ﴾ ہے، جس طرح کہ ﴿ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ ﴾ [الأحقاف: ٤] ''مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے زمین میں سے کیا چیز پیدا کی ہے۔'' میں کہا ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ بہ معنی ﴿ فِي ﴾ ہے۔ (قاله الكرخي)

فتح البیان میں ہے کہ اس قول پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں جن کے ذکر میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ ندا سماۓ دنیا سے تھی۔[1] فتح القدیر وغیرہ میں کہا ہے: ''ظَاهِرُ الْقُرْآنِ يُخَالِفُ مَا قَالَهُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ''[2] یعنی ظاہر قرآن اُن کے قول کے مخالف ہے، اس لیے کہ قرآن شریف کا ظاہر یہ ہے کہ کنارۂ وادی کی جہت سے ندا ہوئی اور اُن کا قول یہ ہے کہ سماۓ دنیا سے ہوئی۔ حقیقت میں دیکھو تو کسی طرح کی مخالفت نہیں ہے، کیوں کہ یہ تو خالق کی ندا ہے، مخلوق کی ندا نہیں ہے۔ خالق کی ندا میں کچھ استبعاد نہیں ہے، یہ ندا سماۓ دنیا سے بھی ہو اور اسی گھڑی کنارۂ وادی سے بھی ہو۔

نکتہ:

سورت طٰہٰ (آیت: ۱۲) میں ﴿ اِنِّيْۤ اَنَا رَبُّكَ ﴾ ''بے شک میں تیرا رب ہوں۔'' فرمایا اور سورۃ النمل (آیت: ۸) میں ﴿ نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ ''مبارک ہے وہ جو اس آگ (نور) میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے۔'' یہ دونوں اس کے مخالف ہیں جو یہاں ارشاد ہوا ہے۔ یہ مخالفت صرف لفظی ہے، مقصد کے لحاظ سے سب ایک دوسرے کے موافق ہیں، مقصد یہی استنباء کا دروازہ کھولنا اور روانیِ کلام ہے، ایسے طور پر کہ اس کی طرف مؤدّی ہوا۔ امام نے فرمایا: ان چیزوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے کل کا ذکر فرمایا ہے، مگر جس شے پر وہ ندا مشتمل ہے، ہر سورت میں اس کا کچھ حصہ حکایت کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ﴾ معطوف ہے ﴿ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى ﴾ پر، اس کی اور اس کے ما بعد کی تفسیر سورت طٰہٰ اور نمل میں گزر چکی ہے، یہاں عبارت محذوف ہے، تقدیر یہ ہے: چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی، تو وہ اژدھا ہوگئی، پھر وہ حرکت کرنے لگی۔ ﴿ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ﴾ ﴿ جَآنٌّ ﴾ کہتے ہیں: چھوٹے سانپ کو۔ ﴿ مُدْبِرًا ﴾ حال ہے ﴿ وَلّٰى ﴾ کی ضمیر سے، معنی اس کے ہارب و منہزم ہیں، یعنی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٧٤) [2] فتح القدير (٤/ ٢٢٧)

بھاگنے والا۔ ﴿ وَلَمْ يُعَقِّبْ ﴾ بھی محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ اس کے معنی "لَمْ يَرْجِعْ" ہیں، یعنی پھر جب اس کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا، گویا وہ حرکت کی تیزی اور جسم کی عظمت کے ساتھ ایک سانپ کی طرح ہے، تو اُلٹے پھرے منہ موڑ کر بھاگتے ہوئے اور واپس نہ لوٹے۔ پھر اُن کو یہ ندا کی گئی: ﴿ يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴾ یعنی اے موسیٰ! آگے آ اور مت ڈر تو تو امن والوں سے ہے، یعنی تو بے خوف ہے اس بات سے کہ تجھے سانپ سے کوئی تکلیف پہنچے۔

﴿ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ ﴾ "سَلْكٌ" بالفتح اور "سُلُوْكٌ" دونوں مصدر ہیں "سَلَكَ الشَّيْءَ فِي الشَّيْءِ" کے۔ جب کوئی شخص ایک شے کو دوسری شے میں داخل کرتا ہے تو اس وقت "سَلَكَ الشَّيْءَ فِي الشَّيْءِ" بولتے ہیں۔ جس طرح تاگے کو سوئی کے ناکے میں ڈالتے ہیں۔ یا موتیوں کو تاگے میں پروتے ہیں، یہ دونوں مصدر "قَعَدَ" اور "نَصَرَ" کے باب سے ہیں۔ ﴿ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ یعنی داخل کر تو اپنا ہاتھ اپنی جیب میں وہ سفید ہو کر بغیر کسی برائی اور عیب کے نکلے گا۔ انھوں نے اس کو داخل کیا تو وہ اس طرح ہو کر نکلا کہ سورج کی روشنی کی طرح اس کی شعاعیں تھیں بغیر برص کے۔

﴿ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ﴾ آدمی کا جناح اس کا بازو ہے اور سارے ہاتھ کو بھی "جناح" کہتے ہیں، یعنی تو اپنے دونوں کھلے ہوئے ہاتھوں کو اپنی طرف ملا، تاکہ تو ان کے ذریعے سانپ سے بچے۔ مطلب یہ ہے کہ بچنے کے لیے اپنے اور سانپ کے درمیان حائل کر جس طرح ڈرنے والا خوف کے مارے کرتا ہے۔ اللہ پاک نے اس مضمون کو تین عبارتوں میں ادا فرمایا ہے: ایک تو اس سورت میں ہے: ﴿ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ ﴾۔ دوسرے سورت طٰہٰ میں ہے: ﴿ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ ﴾ [طٰہٰ: ۲۲] "اور تو اپنا ہاتھ اپنی بغل سے ملا، وہ بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا سفید نکلے گا۔" تیسرے سورۃ النمل میں: ﴿ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ ﴾ [النمل: ۱۲] "اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کر۔" "جَيْبٌ" سے مراد مدرعہ ہے، مدرعہ صوف کا ایک کپڑا ہے جو قمیص کے بدلے پہنا جاتا ہے، اس کے آستین نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کی آستین صرف کہنیوں تک ہوتی ہے، اس مدرعہ کو "زرمانقہ" (صوف کا جبہ) بولتے ہیں، کسی نے کہا ہے کہ "جیب" بہ معنی قمیص ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ضمِ جناح کے کیا معنی ہیں، چنانچہ یا تو یہ معنی ہیں کہ داہنے ہاتھ کو بائیں بازو کے نیچے اور بائیں ہاتھ کو داہنے بازو کے نیچے گھسائے۔ یا یہ مراد ہے کہ دونوں ہاتھوں کو جیب میں داخل کرے، چنانچہ اپنے دونوں ہاتھوں کا اپنے نفس کے ساتھ ملانا اور اُن کو جیب میں داخل کرنا، یہ دونوں معنی باہم عبارت و معنی کے لحاظ سے مختلف ہیں، اور جب ضمِ یدین کی تفسیر ہاتھوں کو جیب میں داخل کرنے کے ساتھ کی جائے تو اب معنی میں اختلاف نہیں رہے

گا، صرف عبارت میں رہے گا۔ ایک معنی میں فعل کو بار بار بیان کرنا اختلافِ غرض کے وقت جائز ہے، اس لیے کہ جب ایک فعل کو بار بار اس لیے بیان کیا جائے کہ ہر فعل سے ایک اور غرض کا بھی تعلق ہو تو وہ ایسا ہو گیا، گویا اس جگہ دو فعل ہیں باعتبار دو غرضوں کے، جس طرح اس آیت میں ہے، کیوں کہ ﴿ اُسْلُكْ يَدَكَ فِیْ جَيْبِكَ ﴾ میں غرض ہاتھ کا سفید ہو کر نکلنا ہے اور ایک دوسرے معجزے کا ظاہر ہونا ہے۔ اور ﴿ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ ﴾ میں غرض خوف کا چھپانا ہے اور دشمن کے روبرو ذلت اور نقصان سے بچنا ہے، اس لیے کہ جس وقت اللہ پاک نے عصا کو سانپ کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام ڈرے اور اپنے ہاتھ سے اس کو بچایا، یعنی اپنے ہاتھ کو اس کے اور اپنے درمیان آڑ بنایا۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس کے بعد کہ اُن کو اپنا ہاتھ جیب میں داخل کرنے کا حکم دیا تو یہ فرمایا: ﴿ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ ﴾

تو گویا یوں ارشاد کیا کہ جس وقت تو دشمن کے سامنے عصا کو معجزہ ظاہر کرنے کے لیے ڈالے، پھر وہ ہولناک اور خوفناک سانپ بن جائے تو تُو اپنے ہاتھوں سے مت بچانا، کیوں کہ یہ بات دشمن کے نزدیک ذلت اور نقصان ہے، بلکہ جس وقت تو اس کو ڈالے، پھر وہ سانپ بن جائے تو تُو اپنا ہاتھ اپنی جیب میں داخل کر لینا، تاکہ اس سے دو باتیں حاصل ہو جائیں: ایک تو جرأت کا مظاہرہ کرنا اور جو بات تیرے لیے ذلت اور نقصان کا باعث ہے اس سے بچ جانا۔ دوسرے ایک اور معجزہ ظاہر کرنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمِ جناح سے مراد چستی اور قوت اور ثابت قدمی کا اظہار کرنا ہو، جب کہ عصا سانپ بن جائے۔ یہ معنی استعارے کے طور پر ہیں پرندے کی طرح، کیوں کہ طائر کی یہ عادت ہے کہ جس وقت وہ ڈرتا ہے تو اپنے بازو پھیلا دیتا ہے اور جب بے خوف اور مطمئن ہوتا ہے تو اپنے بازو اپنی طرف ملا لیتا ہے، چنانچہ انسان کو تشبیہ دی اس کی حالتِ ثبات اور ضبطِ نفس میں بے خوف پرندے سے، پھر جو بات مشبہ بہ کے لوازم سے تھی، یعنی ضمِ جناح اس کو مشبہ کے واسطے ثابت کیا، تاکہ یہ استعارہ مکنیہ کے لیے تخییل ہو جائے۔

﴿ مِنَ الرَّهْبِ ﴾ کا ﴿ مِنْ ﴾ تعلیل کا ہے، "أَيْ: مِنْ أَجْلِ الرَّهْبِ" یعنی جب تجھ کو سانپ کو دیکھنے کے وقت خوف لاحق ہو تو تو اپنے بازو اپنی طرف ملا لینا، اس خوف کے وقت اپنی قوت اور ضبطِ نفس کے اظہار کے طور پر۔ مطلب یہ ہے کہ سانپ کو دیکھتے وقت انھیں جو خوف ہوتا تھا، اس کو ضمِ جناح کا حکم دینے کا سبب ٹھہرایا۔ یعنی ضمِ جناح کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اس کے کرنے سے تیرا خوف جاتا رہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہر وہ شخص جو ڈرے، پھر وہ اپنا بازو اپنی طرف ملا لے تو وہ خوف اس سے جاتا رہے گا[1] اور یہ آیت پڑھی، یہ قاضی وزادہ کا حاصل ہے مع بعض تصرف کے۔

نکتہ:

"جناح" بہ معنی "ید"، کو ایک جگہ میں تو مضموم ٹھہرایا ہے اور دوسری جگہ مضموم الیہ۔ یہاں تو ﴿ وَاضْمُمْ

[1] تفسير البغوي (٦/ ٢٠٧)

﴿ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ ﴾ فرمایا ہے اور سورت طٰہٰ میں ﴿ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ ﴾ ان میں توفیق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جناحِ مضموم سے مراد دستِ راست ہے اور جناحِ مضموم الیہ سے دستِ چپ (بایاں ہاتھ) اور ہر ایک دائیں بائیں ہاتھوں سے جناح ہے۔ یہ امام زمخشری رحمہ اللہ کے قول کا حاصل ہے۔[1] جمہور نے "رَهَبٌ" کو بہ فتحِ "را" و "ہاء" پڑھا ہے۔ امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے۔ امام حفص، سلمی، عیسی ابن عمر اور ابن ابی اسحق رحمہم اللہ نے بہ فتحِ "راء" و اسکانِ "ہاء" اور ابن عامر اور کوفیوں نے سوائے حفص کے بہ ضمِ "راء" و اسکانِ ہاء پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "جناح" سے مراد موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے۔

بعض اہلِ معانی نے کہا ہے کہ "رھب" بہ معنی آستین ہے حُمیر و بنی حنیفہ کی لغت میں۔ امام اصمعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک اعرابی کو سنا کہ دوسرے سے کہتا تھا: "أَعْطِنِيْ مَا فِيْ رَهْبِكَ" پھر میں نے اس سے "رھب" کے متعلق پوچھا تو کہا: کُم، یعنی آستین۔[2] چنانچہ اس بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ تو اپنی طرف اپنا ہاتھ ملا اور اس کو آستین سے نکال۔ ﴿ فَذٰنِكَ ﴾ عصا اور یدِ بیضاء کی طرف اشارہ ہے۔ (دونوں مؤنث ہیں، لیکن خبر کے مذکر ہونے کی وجہ سے اسمِ اشارہ مذکر کا ذکر کیا ہے)

﴿ بُرْهٰنَانِ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ متعلق ہے محذوف سے، "أَيْ: كَائِنَانِ مِنْهُ"، یعنی یہ دونوں دونیر اور روشن حجتیں اور واضح اور ظاہر دلیلیں اور کھلی آیتیں کائن ہیں تیرے رب کی طرف سے۔ جمہور نے ﴿ فَذٰنِكَ ﴾ کو بہ تخفیفِ نون پڑھا ہے اور امام ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے بہ تشدیدِ نون۔ کسی نے کہا ہے کہ تشدید قریش کی لغت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام عیسی بن عمرو شبل اور ابو نوفل رحمہم اللہ نے بیائے تحتیہ۔ نون مکسورہ کے بعد حرف یا بدل ہے ایک نون سے، یہ ہذیل کی لغت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تمیم کی لغت ہے۔[3] حجت کا نام برہان رکھا اس کی روشنی کے سبب سے۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ گوری چٹی عورت کو "بَرَهْرَهَةٌ" بولتے ہیں۔ ﴿ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ ﴾ محذوف سے متعلق ہے۔ "أَيْ: مُرْسَلَانِ أَوْ وَاصِلَانِ"، یعنی دو نشانیاں بھیجی گئی ہیں، یا فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف پہنچنے والی ہیں۔ جملہ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی، یعنی اس لیے کہ وہ حد سے بڑھنے والے ہیں ظلم میں اور اطاعت سے پوری طرح نکلنے والے ہیں۔ بالجملہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک کا قول سنا تو اس سے یہ بات طلب کی کہ ان کے دل کو قوی کر دے اور یوں عرض کی:[4]

---

[1] الكشاف (٣/ ٤١٣)
[2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٨٤_ ٢٨٥)
[3] فتح القدير (٤/ ٢٢٥)
[4] فتح البيان (١٠/ ١١١_ ١١٦)

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾
وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً
يُّصَدِّقُنِيْٓ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ
عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ
بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! بے شک میں نے ان میں سے ایک شخص قتل کر دیا تھا، لہٰذا میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے (33) اور میرا بھائی ہارون زبان کے لحاظ سے مجھ سے زیادہ فصیح ہے، لہٰذا تو اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دے کہ وہ میری تصدیق کرے، بلاشبہ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے (34) اللہ نے فرمایا: ہم تیرے بھائی کے ذریعے سے تیرا بازو مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کو غلبہ عطا کریں گے، پھر وہ تم دونوں تک نہیں پہنچ سکیں گے، ہماری نشانیوں کے ساتھ (جاؤ)، تم دونوں اور جنھوں نے تمھاری پیروی کی، غالب رہیں گے (35)

موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے پاس جانے کا ڈر اور بھائی ہارون علیہ السلام کی نبوت کا سوال:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا، کون سا فرعون جس سے بھاگ کر اور جس کے دباؤ سے ڈر کر مصر کے شہر سے نکلے تھے، تو عرض کی: اے رب! میں نے ان میں سے ایک جان کا خون کیا ہے، اس سے مراد وہی قبطی ہے جس کو انھوں نے مار ڈالا تھا، لہٰذا میں ڈرتا ہوں کہ مجھے مار ڈالیں گے، یعنی جس وقت مجھے دیکھ لیں گے اسی وقت مار دیں گے اور میرا بھائی اس کی زبان مجھ سے زیادہ چلتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں "لُثْغَة" تھا۔ ("لثغة"، بضم زبان کی شکستگی کو کہتے ہیں، یعنی حرفِ راء اور لام کو یاء کہنا اور غین وسین کو ثاء کہنا۔ كذا في الصراح)

اس وجہ سے کہ انھوں نے وہ انگارا لے لیا تھا جب کہ ان کو انگارے اور کھجور کے ایک دانے یا موتی کے درمیان اختیار دیا گیا تھا، انھوں نے انگارا لے لیا تھا اور اس کو اپنی زبان پر رکھ لیا تھا، اس وجہ سے ان کی زبان میں شدت بالتعبیر ہوگئی تھی، یعنی اپنا مطلب صاف طور پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ (27) يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ (28) وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (29) هٰرُوْنَ اَخِي (30) اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ (31) وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴾ [طٰه: ۲۷۔ ۳۲] "اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ (تاکہ) وہ میری بات سمجھ سکیں۔ اور میرے لیے میرے

کنبے میں سے ایک وزیر بنا دے۔ (یعنی) میرے بھائی ہارون کو۔ اس کے ساتھ میری کمر مضبوط کر دے۔ اور اسے میرے کام (نبوت) میں شریک کر دے۔'' یعنی مجھے انس دے اس مقامِ عظیم میں، جس کا تو نے مجھے حکم دیا ہے، اس سے مراد نبوت اور رسالت کی چادر اور بوجھ، یعنی ذمے داری پر قائم ہونا ہے اور اس متکبر اور جابر اور سرکش بادشاہ کی طرف رسالت کو پہنچانا ہے۔

اسی لیے یوں کہا کہ میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی میرے ساتھ بھیج، یعنی اسے بھی رسالت عطا فرما، کیوں کہ اس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے، اسے میرا وزیر اور مددگار اور قوت دینے والا بنا دے، تاکہ میرے کام میں مجھے تقویت دے اور اُن باتوں میں میری تصدیق کرے جو میں کہوں اور جس کی میں اللہ عزوجل کی طرف سے خبر دوں، اس لیے کہ دو آدمیوں کا خبر دینا زیادہ متاثر کن ہوتا ہے ایک آدمی کی خبر سے۔ اسی لیے یوں کہا ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ میری طرف سے اُن سے وہ بات بیان کرے جو میں اُن سے کہوں، کیوں کہ وہ مجھ سے اس بات کو سمجھتا ہے جسے وہ نہیں سمجھتے ہیں۔[1] پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کا سوال کیا تو اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ ﴾ یعنی ہم قوی کر دیں گے تیرے کام کو اور عزت دیں گے تیری جانب کو، یعنی تیرے بازو کو تیرے بھائی سے قوت دیں گے جس کے لیے تو نے سوال کیا ہے کہ وہ تیرے ساتھ نبی ہو، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴾ [طٰہٰ: ٣٦] ''اس (اللہ) نے فرمایا: اے موسیٰ! جو کچھ تو نے مانگا تجھے دیا جاتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴾ [مريم: ٥٣] ''اور اسے اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی بخشا۔''

اسی لیے بعض سلف نے کہا ہے: ازروئے احسان کوئی اپنے بھائی پر اتنا احسان کرنے والا نہیں ہے، جتنا موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام پر ہیں، کیوں کہ انھوں نے ان کے بارے میں سفارش کی، یہاں تک کہ اللہ پاک نے ان کو نبی اور رسول بنا کر اُن کے ساتھ کر دیا اور فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ اسی لیے اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کے حق میں یہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴾ [الأحزاب: ٦٩] ''اور وہ اللہ کے نزدیک بڑے رتبے والا تھا۔'' یعنی موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نزدیک بڑی وجاہت والے تھے کہ اُن کی شفاعت سے اُن کے بھائی کو نبوت و رسالت کا منصبِ عالی عطا ہوا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ﴾ یعنی ہم کر دیں گے تمھارے لیے ایک زبردست حجت، پھر وہ تم تک ہماری آیتوں کے سبب سے نہ پہنچ سکیں گے، یعنی ان کو تمھیں ایذا پہنچانے کا کوئی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٧٧)

راستہ نہیں ملے گا اور تم اللہ کی آیتوں کو پہنچاتے رہو گے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدة: ٦٧] ''اے رسول! جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجیے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی اور آپ کو اللہ تعالیٰ لوگوں سے بچا لے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴾ [الأحزاب: ٣٩] ''وہ (انبیاء) جو اللہ کے پیغام پہنچاتے تھے اور اس سے ڈرتے تھے اور وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے، اور اللہ حساب لینے والا کافی ہے۔'' یعنی اللہ پاک کی نصرت و اعانت و تائید کافی وافی ہے، اسی لیے ان دونوں کو اس بات کی خبر دی کہ انجام نیک انہی کے واسطے ہے اور اُن کی پیروی کرنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴾ جس طرح اور جگہ ارشاد کیا ہے: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [المجادلة: ٢١] ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ قوی، بڑا زبردست ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [المؤمن: ٥١] ''بلاشبہ ہم اپنے رسول کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ توجیہ کی ہے کہ ﴿ اِلَيْكُمَا ﴾ پر آیت ختم ہوگئی، پھر ﴿ بِاٰيٰتِنَاۤ ﴾ سے دوسرا جملہ شروع ہوا۔ تقدیر یہ ہے: "أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُوْنَ بِآيَاتِنَا"[1] یعنی تم اور تمھاری پیروی کرنے والے ہماری آیتوں کے سبب سے غالب ہونے والے ہیں۔ بے شک یہ معنی صحیح ہیں اور یہی اول توجیہ سے بھی حاصل ہیں تو اس کی طرف کچھ حاجت نہیں ہے۔[2] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو ہارون علیہ السلام کو خود ﴿ اَفْصَحُ ﴾ کہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زبان پر انگارا رکھ لینے کے سبب سے، ان کی زبان میں حُبْسَہ تھا، یعنی ایک قسم کی بستگی ہوگئی تھی، اس کی وجہ سے صاف تقریر نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ فصاحت لغت میں خلوص کو کہتے ہیں۔ دودھ جب کفک و سرشیر سے خالص اور صاف ہوتا ہے تو اس وقت بولتے ہیں: "فَصَحَ اللَّبَنُ وَأَفْصَحَ فَهُوَ فَصِيْحٌ أَيْ: خَلُصَ" اسی باب سے "فَصَحَ الرَّجُلُ" ہے، یعنی اس شخص کی بولی خالص، صاف اور عمدہ ہوگئی اور ﴿ اَفْصَحُ ﴾ کے ایک یہ معنی ہیں کہ اس نے عربی زبان میں کلام کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ فصیح وہ ہے جو بولتا ہے اور اعجم وہ ہے جو بولتا

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٥٧٩)
[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥١٢۔ ٥١٣)

نہیں ہے اور اہلِ بیان کی اصطلاح میں کلمے کی فصاحت اس کا تنافرِ حروف، غرابت اور مخالفتِ قیاس سے خالص ہونا ہے اور کلام کی فصاحت اس کا تالیف کے ضعف اور تعقید سے خالص ہونا ہے۔

﴿ رِدْاً ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے اس کے معنی عون اور مدد کے ہیں۔ اس محاورے سے ماخوذ ہے: "أَرْدَأْتُهُ" یعنی میں نے اس کی اعانت کی۔ جب کوئی شخص کسی شخص کی نصرت کرتا ہے اور اس کی پشت کو مضبوط کرتا ہے تو بولتے ہیں: "فُلَانٌ رِدْءُ فُلَانٍ" یعنی فلاں فلاں کا ناصر اور مددگار ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَرْدَى عَلَى الْمِائَةِ" سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں کہ سو پر زیادہ کرے۔ گویا معنی یہ ہیں کہ تو اس کو میرے ساتھ بھیج، تاکہ میری تصدیق زیادہ ہو سکے۔

امام عاصم اور حمزہ رحمہ اللہ نے ﴿ يُصَدِّقُنِيٓ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے،[1] اس بنا پر کہ جملۂ مستانفہ ہے، یا صفت ہے "رِدْءٌ" کی، یا حال ہے ﴿ اَرْسِلْهُ ﴾ کے مفعول سے۔ باقی قراء کی قراءت جزم کے ساتھ ہے بنا بر جوابِ امر۔ سیدنا ابی اور زید بن علی رضی اللہ عنہما نے "يُصَدِّقُونِي" بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے، یعنی فرعون اور اس کے سردار میری تصدیق کریں۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بطریقِ علی بن ابی طلحہ مروی ہے کہ ﴿ يُصَدِّقُنِيٓ ﴾[3] یعنی تاکہ ہارون علیہ السلام میری تصدیق کریں۔ ہارون علیہ السلام کے تصدیق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ مظانِ جدال (جھگڑے کی جگہوں میں) بیان کی زیادتی کر کے موسیٰ علیہ السلام کی اعانت کریں اور حجت کو ثابت فرمائیں، اس طریقے سے کہ حجت کو واضح کریں اپنی زبان سے اور شبہات کو کھوٹا ثابت کریں اور دلائل کو بیان کریں اور اپنے بیان سے کفار کے شبہوں کا جواب دیں، تاکہ ان کا دعویٰ ثابت ہو جائے۔

صرف یہ مراد نہیں ہے کہ ان سے کہہ دیں کہ تو نے سچ کہا۔ کیا تو دیکھتا نہیں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ﴿ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ ﴾ کہا ہے۔ فصاحت کی ضرورت تو صرف تقریرِ برہان کے لیے ہوتی ہے نہ اس لیے کہ صرف "صَدَقْتَ" کہہ کر خاموش ہوا جائے، کیوں کہ اس میں تو سحبان اور باقل دونوں برابر ہیں۔ (سحبان تو بڑا فصیح و بلیغ آدمی مشہور ہے اور باقل اس کی ضد ہے۔ شروح حریری میں خوب تفصیل کے ساتھ اس کا بیان ہے) شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی تصدیق کا طریق یہی ہے کہ اپنی زبان سے حق کو بیان کریں اور اپنے بیان سے کفار کا مقابلہ فرمائیں، یہ بات تصدیق کے قائم مقام ہے، جس طرح کہ برہان سے قول کی تصدیق کی جاتی ہے۔

﴿ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھوٹا کریں، جبکہ ہارون علیہ السلام میرے ساتھ نہ ہوں، کیوں کہ جھگڑنے اور بحث میں میری زبان نہیں چلتی۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ ﴾ یعنی ہم تجھ کو اس سے قوت دیں گے۔ ہارون علیہ السلام اس وقت مصر میں تھے۔ شدِ عضد کنایہ ہے تقویت سے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٨٧) [2] روح المعاني (٢٠/ ٧٠) [3] تفسير الطبري (١٩/ ٥٧٧)

دعائے خیر میں بولتے ہیں: ''شَدَّ اللّٰهُ عَضُدَكَ'' یعنی اللہ تیرے بازو کو قوی کر دے اور بد دعا میں کہتے ہیں: ''فَتَّ اللّٰهُ فِي عَضُدِكَ'' یعنی اللہ تیرے بازو کو ریزہ ریزہ کر دے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی ''سَنُقَوِّيْكَ بِهِ'' ہیں، اس لیے کہ کسی شخص کی قوت اس کے زورِ بازو کی شدت سے ہوتی ہے مزاولتِ امور پر، یعنی کاموں کے ارادے اور اُن پر ہمیشگی کرنے کے لیے۔ اسی لیے شخص کی تعبیر ید (ہاتھ) سے کی جاتی ہے اور شدتِ ید کی تعبیر شدتِ عضد سے کی جاتی ہے۔[1] شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ مجاز مرسل ہے بطریقِ اطلاقِ سبب وارادۂ مسبب بدو مرتبہ، کیوں کہ شدتِ عضد سے شدتِ ید لازم آتی ہے اور شدتِ ید قوتِ شخص کے لیے مستلزم ہے تو دوسرے مرتبے میں شدتِ عضد قوتِ شخص کا سبب ہوئی۔

چنانچہ یہ بات درست ہوئی کہ شدتِ عضد بولا جائے اور اس سے مراد قوتِ شخص کی لی جائے بطریقِ مجازِ مرسل۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: ''شد'' بہ معنی تقویت ہے۔ چنانچہ یا تو یہ کنایہ تلویحیہ ہے تقویتِ موسیٰ علیہ السلام سے، اس لیے کہ ہاتھ کو قوی کیا جاتا ہے بازو قوی کرنے کے ساتھ اور پورے شخص کو قوی کیا جاتا ہے ہاتھ کو قوی کرنے کے ساتھ اور حقیقت سے کوئی مانع نہیں ہے، جیسا کہ وہم کیا ہے، یا استعارۂ تمثیلیہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے حال کی تشبیہ دی کہ ان کو اُن کے بھائی کے ساتھ قوی کریں گے، اس کے ہاتھ کو قوی کر کے حال سے اس کے قوی کرنے میں ساتھ بازو کے۔[2] جمہور نے ''عَضُدُ'' کو بہ فتحِ عین اور امام حسن اور زید بن علی رحمہما اللہ نے بہ ضمِ عین پڑھا ہے اور امام حسن رحمہ اللہ سے بہ ضمِ عین وسکونِ ضاد بھی مروی ہے۔ امام عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے بہ فتحِ ہر دو پڑھا ہے۔

﴿ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم تمھارے لیے حجت اور برہان یا تسلط وغلبہ کر دیں گے اور دشمنوں کے دلوں میں ہیبت ڈال دیں گے۔ ﴿ فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ﴾ یعنی پھر وہ نہ پہنچیں گے تم تک ایذا اور برائی کے ساتھ اور حجت کے ساتھ تم پر غلبہ پانے کی قدرت نہ رکھیں گے۔ ﴿ بِاٰيٰتِنَآ ﴾ محذوف سے متعلق ہے۔ ''أَيْ: تُمْنَعَانِ مِنْهُمْ بِاٰيٰتِنَا'' یعنی تم ان سے منع کیے جاؤ گے، ہماری آیتوں کے سبب سے، مطلب یہ ہے کہ ہماری آیتوں کے سبب سے وہ لوگ تمھارا کچھ نہ کر سکیں گے۔ یا یہ معنی ہیں: ''اِذْهَبَا بِاٰيٰتِنَا'' یعنی تم جاؤ ہماری آیتیں لے کر۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ باقسم کے لیے ہے اور اس کا جواب ﴿ فَلَا يَصِلُوْنَ ﴾ ہے، یہ قول انتہائی ضعیف ہے۔ امام اخفش اور ابن جریر رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔[3] یعنی ''أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ بِاٰيَاتِنَا'' یہ قول پہلے گزر چکا ہے، ان سب میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اور جملہ ﴿ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴾ میں ان کو خوش خبری دینا اور ان کے دلوں کو مضبوط کرنا ہے، مطلب یہ ہے کہ تم مطمئن رہو، غالب تم ہی رہو گے۔[4]

---

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٩٢) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ٧٣)
[3] فتح القدير (٤/ ٢٢٨) [4] فتح البيان (١٠/ ١١٦۔ ١١٨)

فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مُّوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًی وَّمَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ مُوۡسٰی رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی مِنۡ عِنۡدِهٖ وَمَنۡ تَكُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۳۷﴾

پھر جب موسیٰ ہماری کھلی نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس پہنچا تو وہ بولے: یہ تو بس گھڑا ہوا جادو ہے اور ہم نے اپنے آباء واجداد میں تو یہ (باتیں کبھی) نہیں سنیں ﴿36﴾ اور موسیٰ نے کہا: میرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا اور جس کا آخرت کا انجام بہتر ہوگا، بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے ﴿37﴾

موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں:

اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بھائی فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس آئے اور جو ظاہر اور واضح معجزے اور ان کی سچائی کی زبردست دلیلیں ان کو اللہ پاک نے عطا کی تھیں، توحید اور احکامِ الٰہی کی اتباع کے لیے جن دلائل وغیرہ کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے ہیں، ان سب کو فرعون وغیرہ پر پیش کیا۔ پھر جب فرعون اور اس کے سرداروں نے ان کا مشاہدہ اور معائنہ کیا اور خوب جان لیا کہ وہ یقیناً اللہ پاک کی طرف سے ہیں تو اپنے کفر اور سرکشی کی وجہ سے عناد اور مباہتہ (فخر وغرور) کی طرف مائل ہوئے۔ اور یہ میلان حق کی پیروی کرنے سے اُن کی سرکشی اور طغیان کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ وہ بولے کہ یہ محض ایک سحرِ مفتعل ومصنوع ہے، یعنی ایک بنایا ہوا جادو ہے اور اس کے مقابلے کا ارادہ کیا حیلے اور جاہ کے ساتھ۔ "فَمَا صَعِدَ مَعَهُمْ ذٰلِكَ"، یعنی اس حیلے اور تدبیر نے انھیں کچھ فائدہ نہ دیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ﴾ "هٰذَا" سے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت مراد ہے، یعنی ہم نے اپنے باپ دادا میں سے کسی کو اس دینِ توحید پر نہیں دیکھا اور ہم نے لوگوں کو شرک کرتے ہی دیکھا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس کا یہ جواب دیا کہ ﴿ رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡهُدٰی مِنۡ عِنۡدِهٖ ﴾ یعنی میرا رب خوب جانتا ہے، جو کوئی ہدایت کی بات اس کے پاس سے لایا ہے، یعنی مجھے اور تم کو جانتا ہے اور وہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر دے گا اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ وَمَنۡ تَكُوۡنُ لَهٗ عٰقِبَةُ الدَّارِ ﴾ یعنی اور وہ جانتا ہے کہ کس کو پچھلا گھر ملے گا نصر وکامیابی اور تائید کے ساتھ۔ ﴿ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴾ بے شک جو لوگ اللہ عزوجل

کے ساتھ شرک کرنے والے ہیں، ان کا بھلا نہ ہو گا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ ﴾ سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن کی دلالت واضح اور ظاہر ہے۔ رہی یہ بات کہ آیات جمع ہے، عصا اور ید پر اس کا اطلاق کیوں ہوا؟ تو اس کی وجہ سورت طٰہٰ میں گزر چکی ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر آیت میں کئی نشانیاں ہیں۔ ﴿ مُفْتَرًى ﴾ کے معنی ہیں: "مُخْتَلَقٌ وَّمَكْذُوْبٌ"، یعنی نہیں ہے یہ مگر ایک جادو ہے جھوٹ بنایا ہوا، تو نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے، پھر اس کو اللہ پر باندھ دیا ہے۔ یا ایک جادو موصوف بافتراء ہے، سحر کی دوسری قسموں کی طرح ہے، اللہ کے پاس سے معجزہ نہیں ہے۔ یا ایک ایسا جادو ہے کہ اس وقت سے پہلے اس جیسا جادو نہیں کیا گیا۔

﴿ وَمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے نہیں سنا کہ یہ دعوائے نبوت جس کو تو لے کر آیا ہے، یا یہ جادو کہ یہ ہمارے اگلے باپ دادا کے وقت میں واقع ہوا ہو۔ ﴿ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى ﴾ سے مراد خود موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اس عبارت میں صرف اس لیے ادا کیا تاکہ ان کے واسطے حجت واضح کرنے سے پہلے اپنی مراد کی صراحت نہ کریں۔ واللہ أعلم۔ غرض یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں اجمال کیا، یعنی خوبصورت انداز میں جواب دیا، تاکہ ان کے خطاب میں نرمی ہو اور اُن کے ساتھ بحث میں بہترین وجوہ اختیار کی جائیں، معنی یہ ہیں کہ جو شے میں لے کر آیا ہوں، وہ حق ہے اور ہدایت ہے، جادو نہیں ہے اور میرا رب اس کو جانتا ہے اور تم باطل پر ہو۔

جمہور نے ﴿ وَقَالَ مُوْسٰى ﴾ بہ حرفِ واؤ پڑھا ہے اور ابن کثیر اور ابن محیصن رحمہما اللہ نے بغیر واو کے پڑھا ہے اور اسی طرح اہلِ مکہ کے مصاحف میں ہے۔[2] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: ہر ایک نے اپنے مصحف کی موافقت کی ہے، کیوں کہ سوائے مصحفِ مکہ کے اور مصاحف میں واؤ ثابت ہے۔ واؤ کا اثبات اور حذف دونوں واضح ہیں۔ انتہٰی۔ بغیر واؤ کے قراءت کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا جملہ سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کیا جواب دیا؟ تو یہ جملۂ مستأنفہ اس سوال کا جواب ہے اور واؤ کی قراءت کی یہ وجہ ہے کہ مراد دونوں قولوں کو بیان کرنا ہے، تاکہ ناظر دونوں میں موازنہ کرے اور ایک کا فساد اور دوسرے کی صحت پہچان لے، اس لیے کہ سننے والے کے ذہن میں واؤ دو قولوں کو جمع کرنے کے لیے ہے، تاکہ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرے، کیوں کہ ہر شے کی پہچان اس کی ضد سے ہوتی ہے۔

﴿ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ﴾ کو کوفیوں نے سوائے عاصم کے بیائے تحتیہ پڑھا ہے اس بنا پر کہ

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٣) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٨٨)

﴿ عٰقِبَةُ الدَّارِ ﴾ اسم ہے "یَکُوْنُ" کا۔ رہا اس کا مذکر ہونا تو اس لیے کہ فصل واقع ہوگئی ہے اور اس لیے کہ ﴿ عٰقِبَةُ ﴾ مجازی طور پر مؤنث ہے۔ باقی قراء کی قراءت بتائے فوقانی ہے، یہ واضح تر ہے پہلی سے۔ اس جگہ "دار" سے مراد دنیا ہے اور عاقبت اس کی دارِ آخرت ہے، معنی یہ ہیں اور جس کے واسطے ہوگی عاقبتِ محمودہ، یعنی انجامِ نیک۔ یا عاقبت بہ معنی جنت ہے اور اضافت بہ معنی "في" ہے اور "دار" سے مراد دارِ آخرت ہے، جو کہ جنت و نار میں سے ہر ایک پر صادق ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دار دنیا ہے اور اس کی عاقبتِ محمودہ جنت ہے۔ جنت دنیا کی عاقبت اسی لیے ہوئی کہ دنیا تو ایک گزرگاہ اور جنت کی طرف ایک راہ پیدا کی گئی ہے۔[1]

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی وضاحت یہ ہے کہ "دار" سے مراد دنیا ہے اور اس کی اصلی عاقبت جنت ہے، اس لیے کہ دنیا تو آخرت کی طرف ایک گزرگاہ بنائی گئی ہے۔ یہ بیان اس وجہ کا ہے کہ عام سے مراد خاص ہے، کیوں کہ دار کا کلمہ تو عام ہے جنت اور دوزخ دونوں کے لیے، اور ہو سکتا ہے کہ خاص کو کلمۂ "له" سے سمجھ لیں، کیوں کہ عاقبتِ غیر محمودہ کے لیے "علیه" کا لفظ استعمال ہوتا ہے "له" کا نہیں۔ اور آخرت سے مقصود بالذات ثواب ہے، مطیعین اور عابدین کے لیے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاریات: ٥٦] "اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔"

پس عاقبتِ اصلی ثواب ہی ہوتا ہے تو مطلق اسی کی طرف پھرے گا۔ رہا عقاب تو وہ بالعرض والتبعیت مقصود ہوتا ہے تو عاقبتِ سوء کا کچھ اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ یہ تو من جملہ نتائج اعمالِ فجار ہے۔ ﴿ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ میں ضمیر شان ہے۔ یعنی شان یہ ہے کہ ظالم لوگ فائز بہ مطلبِ خیر نہ ہوں گے، یعنی کامیاب نہ ہوں گے۔[2]

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ
فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ
اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٣٨ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ
وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝٣٩
فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝٤٠ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ
وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝٤١ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ

[1] تفسیر البیضاوي (٤/ ٢٩٣) [2] فتح البیان (١٠/ ١١٨)

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿٤٢﴾

اور فرعون نے کہا: اے سردارو! میں تو اپنے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں جانتا، لہٰذا اے ہامان! تو میرے لیے گارے (کی اینٹوں) کو آگ دے، پھر میرے لیے ایک محل بنا، تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں، اور بلاشبہ میں اسے جھوٹوں میں سے سمجھتا ہوں ﴿38﴾ اور اس (فرعون) نے اور اس کے لشکروں نے زمین (مصر) میں ناحق تکبر کیا، اور انھوں نے سمجھ رکھا تھا کہ بے شک انھیں ہماری طرف لوٹایا نہیں جائے گا ﴿39﴾ چناں چہ ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا، اور ہم نے انھیں سمندر میں پھینک دیا، تو دیکھو ان ظالموں کا انجام کیسا ہوا! ﴿40﴾ اور ہم نے انھیں (لوگوں کو) آگ کی طرف بلانے والے سرغنے بنا دیا اور یومِ قیامت ان کی (کوئی) مدد نہیں کی جائے گی ﴿41﴾ اور ہم نے اس دنیا میں لعنت ان کے پیچھے لگا دی اور یومِ قیامت وہ دور کیے گئے بدحالوں میں سے ہوں گے ﴿42﴾

فرعون کا غرور وتکبر اور اس کا انجام بد:

مٹی کو آگ سے پکوا، یعنی پکی اینٹ بنا۔ کہتے ہیں کہ پکی اینٹ پہلے پہل اس نے نکالی کہ عمارت اونچی بنائے تو پتھر کے بوجھ سے گر نہ پڑے۔ انتہیٰ. اللہ پاک اس آیت میں فرعون کے کفر، طغیان، سرکشی اور افتراء کی خبر دیتا ہے کہ اس نے اپنے نفسِ قبیح کے لیے الٰہیت کا دعویٰ کیا۔ لَعَنَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٥٤] ''تب اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا (اور اس کی عقل مار دی) تو انھوں نے اس کی اطاعت کی۔ بلاشبہہ وہی لوگ فاسق تھے۔'' یہ اسی لیے فرمایا کہ اس نے اپنی قوم کو اس طرف بلایا کہ اس کے لیے الٰہیت کا اقرار کریں، چنانچہ انھوں نے کم عقلی اور کند ذہنی کی وجہ سے اس کی دعوت قبول کر لی اور اس کی الٰہیت کے قائل اور اس کا اقرار کرنے والے ہو گئے۔

اسی لیے اس نے یوں کہا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ اور اللہ نے اس کی طرف سے یہ خبر دی: ﴿ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿23﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿24﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿25﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴾ [النازعات: ٢٣۔ ٢٦] ''پھر سب کو جمع کر کے اعلان کیا۔ تو کہا: میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔ تب اللہ نے اسے پکڑ لیا آخرت اور دنیا کے عذاب میں۔ بے شک اس میں اس کے لیے عبرت ہے جو ڈرتا ہے۔'' یعنی اس نے اپنی قوم جمع کی اور ان میں بآوازِ بلند قولِ مذکور کی تصریح کر کے ندا کی۔ چنانچہ انھوں نے اس

کی بات سنی اور مانی، اسی لیے اللہ پاک نے اس سے انتقام لیا، پھر اس کو دنیا اور آخرت میں دوسرے لوگوں کے لیے عبرت ٹھہرایا۔ اس نے تو اپنے الٰہ ہونے کی یہاں تک تصریح کی کہ خود موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ سے دو بدو اس کا ذکر کیا اور اس کی مخالفت پر ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے یوں کہا: ﴿ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢٩] ''اس نے کہا: البتہ اگر تو نے میرے سوا کوئی اور معبود پکڑا تو میں ضرور تجھے قیدیوں میں سے کر دوں گا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس نے اپنے وزیر اور مدبرِ رعیت ومشیرِ دولت ہامان کو اس بات کا حکم کیا کہ اس کے لیے محل بنانے کے لیے پختہ اینٹیں تیار کرے۔ ''صرح'' کہتے ہیں بلند اور اونچے محل کو، جیسا کہ دوسری آیت میں کہا ہے: ﴿ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴾ [المؤمن: ٣٦۔ ٣٧] ''اور فرعون نے کہا: اے ہامان! تو میرے لیے ایک بلند عمارت بنا، تاکہ میں راستوں تک پہنچوں۔ یعنی آسمانوں کے راستوں تک، پھر میں موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں، اور بے شک میں تو اسے جھوٹا خیال کرتا ہوں اور اسی طرح فرعون کے لیے اس کا برا عمل پرکشش بنا دیا گیا اور اسے (سیدھے) راستے سے روک دیا گیا اور فرعون کی چال تو بس تباہ و برباد ہو کر رہی۔''

اس محل کو ''صرح'' اس لیے کہا ہے کہ فرعون نے یہ محل ایسا بلند بنایا تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ بلند کوئی عمارت نہیں دیکھی گئی، اس سے اس کا ارادہ یہی تھا کہ اپنی رعیت کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب ظاہر کر دے اس دعوے میں کہ فرعون کے سوا اور معبود ہے جس کا انھوں نے زعم کیا ہے اور اسی لیے اس نے یوں کہا: ﴿ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ یعنی میں تو اس کو اس کی اس بات میں جھوٹا خیال کرتا ہوں کہ وہاں میرے سوا کوئی اور رب ہے۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی اس بات میں تکذیب کی کہ ان کو اللہ نے بھیجا ہے، کیوں کہ وہ تو اللہ عزوجل کے وجود کا انکاری تھا، اس لیے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا: ﴿ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢٣] ''رب العالمین کیا (چیز) ہے۔'' اور کہا: ﴿ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢٩] ''اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں ڈال دوں گا۔'' اور کہا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٥٨٠)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ انھوں نے طغیان، تکبر اور سرکشی کی اور زمین میں بہت کچھ فساد کیا اور اس بات کا اعتقاد رکھا کہ نہ قیامت ہے نہ معاد۔ ﴿ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴾ [الفجر: ١٣۔ ١٤] ''تب آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ بے شک آپ کا رب (مجرموں کی) گھات میں ہے۔'' اسی لیے اللہ پاک نے اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ﴾ یعنی ہم نے ان کو ایک صبح کو دریا میں ڈبو دیا پھر ان میں سے کوئی بھی نہ بچا۔

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ یعنی ہم نے ان کو اس شخص کے لیے پیشوا کر دیا جو اُن کے پیچھے چلے اور اُن کی راہ لے رسولوں کو جھٹلانے میں اور اللہ عزوجل کے معطل کرنے میں۔ ﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ پھر ان پر دنیا کی رسوائی اور آخرت کی ذلت جمع ہوگئی، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴾ [محمد: ١٣] ''ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پھر کوئی بھی اُن کی مدد کرنے والا نہ تھا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ﴾ یعنی اللہ پاک نے ان کی لعنت اور ان کے بادشاہ کی لعنت مشروع کر دی اپنے مومن بندوں کی زبانوں پر، جنھوں نے اس کے رسولوں کا اتباع کیا ہے اور جس طرح وہ انبیاء کی زبانوں پر دنیا میں ملعون ہیں اور اُن کے متبعین بھی انھیں لعنت کرتے ہیں، اسی طرح قیامت کے دن بھی ان پر برائی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴾[1] [هود: ٩٩] ''اور اس (دنیا) میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی، اور برا ہے وہ انعام جو دیا جائے گا۔''[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا پکا بیان یہ ہے کہ فرعون لعین نے جو یہ کہا: اے دربار والو! مجھ کو تمھارا کوئی حاکم میرے سوا معلوم نہیں تو اس نے صرف باطل دعویٰ کے ساتھ تمسک کیا اپنی قوم کو مغالطہ دینے کے لیے، حالاں کہ وہ یہ جانتا تھا کہ اس کا رب اللہ عزوجل ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اپنے نفس کی الٰہیت سے اس کی مراد یہ نہیں ہے کہ آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اس کا خالق ہے، کیوں کہ اس بات کے ناممکن ہونے کا علم ایسا ہے کہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے، چنانچہ اس میں شک کرنا مکمل طور پر عقل نہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ مخذول ملعون اس بات کا خیال کرتا تھا کہ افلاک اور ستارے جو اس عالم سفلی میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتے ہیں وہ کافی ہیں اور ان کو پیدا کرنے اور ظاہر کرنے

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٨٣)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٣۔ ٥١٤)

والے کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے یوں کہا: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ ﴾

اور کہا کرتا تھا کہ لوگوں پر صرف اپنے بادشاہ کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ الہیت کے دعویٰ کرنے سے اس کی یہی مراد ہے، ویسا نہیں جیسا کوئی گمان کرتا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کے خالق ہونے کا دعویٰ کرتا تھا، مگر ہاں اتنی بات ہے کہ یہ قول جو اس نے کہا، اس میں ایک طرح کا مناقضہ (مخالفت) تھا اس کے ساتھیوں کے قول سے، جو انھوں نے موسیٰ کے حق میں کہا تھا: ﴿ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ﴾ [الأعراف: ١٢٧] ''اور وہ (موسیٰ) تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے؟'' کیوں کہ جس شخص کا یہ زعم ہے کہ وہ متفرد بہ اُلوہیت ہے، یعنی وہی اکیلا الٰہ ہے، اس کے لیے اور معبود کیوں کر ہوں گے۔ تو گویا یہ بات اس نے خاص اپنے سرداروں اور اشرافِ قوم سے کہی، اس لیے کہ اس نے اتباع اور سفلوں، یعنی کم درجے کے لوگوں کے لیے کئی بت بنا دیے تھے کہ وہ ان کو پوجا کریں اور سرداروں کے لیے خود اپنی پوجا مقرر کی تھی، کیوں کہ جب اتباع کو اپنی عبادت کے لائق نہ دیکھا تو ان کے لیے بتوں کی عبادت مقرر کر دی۔

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے یہ بات قاضی کے قول کو بیان کرنے کے بعد لکھی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ فرعون نے اپنے علم کی نفی کی کہ وہ اپنے سوا اور کوئی معبود نہیں جانتا۔ معبود کے وجود کی نفی نہیں کی، اس لیے کہ اس کے پاس وہ شے نہیں تھی جو اس بات کو ظاہر کرے کہ یقینی طور پر کوئی اور معبود نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے محل بنانے کا حکم دیا تاکہ اس پر چڑھے اور حال معلوم کرے۔ انتہیٰ.

قاضی کا یہ قول امام زمخشری رحمہ اللہ پر رد ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ علمِ الٰہ کی نفی سے مقصود آلہ کے وجود کی نفی ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کی طرف سے یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ یوں کہیں کہ وجود کی دو قسمیں ہیں: ایک وجودِ ذہنی اور دوسرا وجودِ خارجی۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کے کلام میں وجودِ ذہنی مراد ہے۔ بے شک جس وقت کسی آدمی کے علم میں کوئی شے موجود نہ ہوگی تو اس کے ذہن میں اس شے کا وجود ہی نہ رہے گا۔ لیکن بسا اوقات امام زمخشری رحمہ اللہ کی مراد یہ بات نہ ہوگی، کیوں کہ اس کے کلام سے اسی وجود کا اظہار ہوتا ہے جو اہلِ لغت کے نزدیک مشہور ہے، یعنی وجودِ خارجی۔

امام سراج الدین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صاحبِ کشاف کی غرض یہ ہے کہ وجود کا نہ ہونا فی الجملہ وجود کا علم نہ ہونا ہے اور بے شک یہ بات اسی طرح ہے کہ مسبب بولے اور سبب مراد لیا۔ یہ غرض نہیں ہے کہ دونوں میں قاعدہ کلیہ ہے کہ جہاں کسی شے کے وجود کا علم نہ ہو تو حقیقت میں اس کا وجود ہی نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ جب وجود کا نہ ہونا اس بات کی بڑی وجہ ہے کہ اس کا علم نہیں ہے، اس لیے کہ مطرد یہی ہے تو جائز ہے کہ علم بولا جائے اور اس سے مراد وجود لیا جائے، کیوں کہ اس فن کے علماء کے نزدیک لزومِ عقلی شرط نہیں ہے، بلکہ لزومِ عادی وعرفی بھی

کافی ہے۔ کبھی کوئی ہم میں سے یوں کہتا ہے کہ میں اس شے کو نہیں جانتا، یعنی اگر وہ موجود ہوتی تو میں اس کو جانتا، جبکہ کوئی قرینہ قائم ہو۔

عرب وعجم کے عرف میں عامہ وخاصہ کے نزدیک یہ استعمال مشہور ہے، کیسے نہ ہو وہ ملعون تو الٰہیت کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ظاہر یہ ہے کہ نفیِ علم سے نفیِ وجود مراد لینا کنایہ سے ہے، مجاز سے نہیں ہے اور مصنف نے جو ذکر کیا ہے تو وہ معلومیت انتفائے علم کی ہے واسطے انتفائے وجود کے، تاکہ اس بات کو بیان کرے کہ انتفائے علم روادف انتفائے وجود سے ہے۔ انتھیٰ.

امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہی بات میرے دل میں گزری تھی کہ جواب یہی ہے لیکن کئی اشکال اس خیال کے آڑے آئے۔ یہ مقام اُن کو ذکر کرنے کی گنجایش نہیں رکھتا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس اشکال کے جواب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یوں کہا ہے کہ یہ علومِ فعلیہ کی خاصیتوں سے ہے، کیوں کہ وہ اپنی معلومات کی تحقیق کے لیے لازمی ہیں تو اُن کے انتفاء سے ان کی معلومات کا انتفاء لازم آئے گا اور علومِ انفعالیہ ایسے نہیں ہیں۔[1] انتھیٰ. اور اس پر قاضی کی موافقت کی۔

اس سے دو جواب ظاہر ہوئے: اول یہ ہے کہ علم کی نفی کا ذکر کیا اور مراد اس شے کے وجود کی نفی لی، بطریقِ کنایہ، اس وجہ پر جس کا سراج نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ علم کی تخصیص فعلی کے ساتھ کی، نہ کہ انفعالی کے ساتھ، جیسا کہ امام ابو السعود اور بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ وجود سے مراد اس شخص کے ذہن میں وجود مراد لیا ہے جو اس کلمے کو ادا کرنے والا ہے۔ ان جوابوں میں سے ہر جواب میں کلام ہے، جو عالمِ فن سے پوشیدہ نہیں ہوتا ہے۔ امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہرحال قاضی کا کلام ضعف سے خالی نہیں ہے اور جس بات نے اس میں ان کو دھوکا دیا وہ صاحبِ انتصاف کا کلام ہے۔[2] (قال أحمد يعني صاحب الانتصاف لشدة ما بلغ منه لم يتأمل كيف سقوط السهم وإنما أتي من حيث أن الله تعالىٰ عبر كثيرا عن نفي المعلوم بنفي العلم في مثل قوله تعالىٰ: ﴿قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ﴾ [يونس: ١٨] أم تنبئونه بما لا يعلم في الأرض فلما أطرد ذلك عنده توهم أن هذا التعبير عن نفي المعلوم بنفي العلم يشمل كل علم ولو لم يتعلق بالمعلوم على ما هو به وليس هو كذلك بل هذا التعبير لا يسوغ إلا في علم الله تعالى لأمر يخص العلم القديم و هو عموم تعلقه حتى لا يعزب عنه أمر فما لم يتعلق العلم بوجوده يلزم أن لا يكون موجوداً إذ لو كان موجودا لتعلق به بخلاف علم الخلق فلا تلازم بين نفي الشيء و نفي العلم الحادث بوجوده ولا كذلك العلم

[1] تفسير أبي السعود (٧/ ١٤)
[2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ٧٤)

القديم فإن بين نفي معلومه و نفي تعلقه بوجوده تلازما يسوغ التعبير المذكور ولكن المعلوم أن فرعون كان يدعي الإلٰهية ويعامل علمه معاملة علم الله تعالىٰ في أنه لا يعزب عنه شيء فمن ثم طغى و تكبر و عبر بنفي علمه عن نفي المعلوم تدليسا على ملائه و تلبيسا على عقولهم السخيفة. الخ والله أعلم)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب فرعون نے کہا: ﴿ يَاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ تو جبریل علیہ السلام نے عرض کی: اے رب! تیرا بندہ سرکش ہوگیا ہے لہٰذا تو مجھے اجازت دے، میں اس کو ہلاک کر دوں۔ فرمایا: اے جبریل! بلکہ وہ میرا بندہ ہے اور مجھ سے اس کی ایک اَجل ہرگز سبقت نہ کرے گی۔ وہ اجل آئے گی۔ پھر جب اس نے کہا: ﴿ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ [النازعات: ٢٤] ''تو کہا: میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! تیری دعا میرے بندے میں سبقت کر گئی اور بے شک اب اس کو ہلاک کرنے کا وقت آ گیا۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دو کلمے ہیں جن کو فرعون نے کہا: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾، نیز کہا: ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾۔ فرمایا کہ ان دونوں کلموں کے درمیان چالیس برس تھے۔ ﴿ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴾[1] [النازعات: ٢٥] ''تب اللہ نے اسے پکڑ لیا آخرت اور دنیا کے عذاب میں۔''

پھر وہ اپنے تکبر اور تجبر کی طرف رجوع ہوا اور اپنی قوم کو اس وہم میں ڈالا کہ وہ کامل اقتدار رکھتا ہے۔ چنانچہ یوں کہا: ﴿ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ ﴾ پس اے ہامان! میرے واسطے گارے کو آگ دے۔ یعنی پہلے گارے کی کچی اینٹ بنا، پھر اس کو آگ میں پکا، یہاں تک کہ وہ پکی ہو جائے۔ پکی اینٹ بنانے کو اس عبارت میں اس لیے ادا کیا ہے کہ وہ اس کو بنانے کا طریقہ سکھاتا ہے، چنانچہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ پہلے پہل جس نے پکی اینٹ پکائی اور اس سے عمارت تعمیر کی، وہ فرعون ہے۔ اسی کے مثل امام ابن جریج رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[2] غرض یہ ہے کہ بجائے ''اِطْبَخْ لِيَ الْآجُرَّ وَاتَّخِذْهُ'' کے جو یہ عبارت کہی تو ایک وجہ تو یہی ہے کہ پہلے پہل اسی نے پکی اینٹ ایجاد کی ہے، اس لیے اس کا بنانا سکھاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ عبارت قرآن شریف کی فصاحت کے عین مطابق ہے اور اس کے بلند مرتبہ کے مطابق ہے۔ تیسرے یہ کہ جابروں کے کلام کے زیادہ مشابہ ہے۔ چوتھے یہ ہے کہ خود ہامان کو گارے پر آگ دینے کا حکم کرنا، حالاں کہ وہ اس کا وزیر اور ساتھی ہے اور کلام کے درمیان میں حرفِ یاء لانا اور اس کا نام لے کر پکارنا، اس کی تعظیم اور تجبر کی دلیل ہے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٧٩) الدر المنثور (٦/ ٤١٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٧٩) الدر المنثور (٦/ ٤١٥)

﴿ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا ﴾ یعنی پھر جب وہ گارا جس پر تو آگ دے گا، پکی اینٹ بن جائے گا تو اس سے میرے لیے ایک بلند محل بنا۔ کسی نے کہا ہے کہ مینارہ بنا۔ ﴿ لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ﴾ یعنی شاید میں موسیٰ کے معبود کی طرف چڑھوں اور اس کو دیکھ آؤں اور اس کے حال کی واقفیت حاصل کروں۔ "اطلاع" "صعود" کو کہتے ہیں۔ طلوع و اطلاع کے ایک معنی ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "طَلَعَ الْجَبلَ وَأَطْلَعَ أَيْ: صَعِدَ" یعنی پہاڑ پر چڑھا، گویا اس ملعون نے یہ وہم کیا ہے کہ اگر وہاں کوئی معبود ہے تو آسمان میں اس کا کوئی جسم ہوگا، جس کی طرف چڑھنا ممکن ہے۔ یہی وہم اس کے محل بنانے کا باعث بنا۔

﴿ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ یعنی میں تو البتہ موسیٰ کو جھوٹا خیال کرتا ہوں اس کے اس دعوے میں کہ زمین اور خلق کا ایک معبود ہے اس کے سوا اور اس معبود نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اہلِ سیرت نے کہا ہے کہ جب فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو محل بنانے کا حکم دیا تو اس نے کاریگروں کو جمع کیا، یہاں تک کہ اس کے پاس پچاس ہزار معمار جمع ہوئے، یہ ان کے مددگاروں اور مزدوروں کے علاوہ تھے اور اینٹ اور چونا پکایا اور لکڑیوں کو گاڑا اور میخیں جڑیں اور عمارت بنانے کا حکم دیا تو اس عمارت کو بنایا اس کو بلند، مضبوط اور پختہ کیا، یہاں تک کہ وہ محل اتنا بلند ہوا کہ خلق میں سے کسی کی عمارت اتنی بلندی تک نہ پہنچی۔

اللہ پاک نے ارادہ فرمایا کہ ان کو اس فتنے میں مبتلا کرے۔ چنانچہ جس وقت وہ اس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو فرعون اس کے اوپر چڑھا اور ایک تیر کا حکم دیا تو آسمان کی طرف پھینکا گیا، پھر وہ اس کی طرف واپس لایا گیا، اس طرح کہ وہ خون آلودہ تھا، بولا کہ میں نے موسیٰ کے معبود کو مار ڈالا۔ فرعون براذین پر سوار ہو کر اس پر چڑھا کرتا تھا۔ (براذین: جمع برذون بالکسر و فتحِ ذال ستور و نوعی از اسپاں۔ كذا في الصراح.)

پھر اللہ پاک نے سورج کے غروب ہونے کے وقت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا تو انھوں نے اس کو اپنے پر سے مارا اور اس کے تین ٹکڑے کر ڈالے، ایک ٹکڑا تو اس کے لشکر پر گرا، اس نے ان میں سے دس لاکھ آدمیوں کو قتل کیا اور ایک ٹکڑا اس کا دریا میں جا گرا اور ایک ٹکڑا مغرب میں، چنانچہ جس شخص نے اس کی تعمیر میں کچھ بھی کام کیا تھا، وہ نہ بچا اور ہلاک ہو گیا۔[1] (كذا في الخازن)

﴿ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ استکبار کہتے ہیں بغیر استحقاق کے خود کو بڑا جاننا، بلکہ کھلے ہوئے ظلم کے ساتھ۔ "أَرْض" سے مراد مصر ہے، یعنی اس نے اور اس کے لشکروں نے زمینِ مصر میں اپنے آپ کو بڑا سمجھا، حالاں کہ اس کا انھیں کوئی حق نہیں تھا۔ وہ ظلم و ستم کرتا تھا، کیوں کہ اس کے پاس اس چیز کو رد کرنے

---

[1] تفسیر الخازن (٥/ ١٧٤)

کے لیے جسے موسیٰ علیہ السلام لائے تھے، کوئی حجت نہ تھی، نہ ہی کوئی شبہ تھا جس کو ان معجزوں کے مقابلے میں قائم کرتا جو انھوں نے ظاہر کیے تھے۔

﴿ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴾ رجوع سے مراد دوبارہ زندہ ہونا اور اللہ کی طرف لوٹنا ہے، یعنی فرعون اور اس کے لشکر والوں نے خیال کیا کہ وہ پھر زندہ ہوکر ہماری طرف نہ آئیں گے۔ امام نافع، شیبہ، ابن محیصن، حمید، یعقوب، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے فتح تحتیہ و کسرِ جیم بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ضم تحتیہ و فتح جیم بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ پہلی قراءت کو امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور دوسری کو ابو عبید رحمہ اللہ نے۔[1]

﴿ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ ﴾ پھر ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پکڑا، جب کہ وہ حد سے بڑھ گئے اور انھوں نے سرکشی کی۔ ﴿ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ﴾ پھر ہم نے ان کو کھارے دریا، یعنی بحیرۂ قلزم میں پھینک دیا۔ اس ادا میں پکڑنے کی عظمت اور بڑائی ہے اور جن کو پکڑا گیا ان کی حقارت ہے، گویا ان کی کثرت کے باوجود ان کو مٹھی میں پکڑا اور دریا میں پھینک دیا۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ پس اے نبی! تو دیکھ کہ ان ظالموں کا انجام کیسا ہوا جب وہ ہلاکت کی طرف جا پہنچے۔

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ یعنی ہم نے ان کو کافروں کا رئیس، سردار اور متبوع بنا دیا، گویا وہ کفر پر جمے رہنے کی وجہ سے اور اس میں سرکشی کی وجہ سے اور ان کے شرک کی طرف بلانے کے سبب سے اپنے پیروکاروں کو آگ کی طرف بلاتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے ان کا اقتدا کیا ہے اور تقلید کر کے ان کی راہ پر چلے ہیں۔ اس میں دلیل ہے لوگوں کے افعال کے خلق پر۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو کوئی ان کے بعد آئے گا وہ ان کی پیروی کرے گا، یعنی ان سے عبرت لے گا اور جو عذاب ان کو پہنچا اس سے نصیحت پذیر ہوگا۔ قولِ اول زیادہ صحیح ہے۔
﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ یعنی نہ کوئی ان کی مدد کرے گا اور نہ کوئی ان کو اللہ کے عذاب سے بچا سکے گا۔

﴿ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ﴾ اور پیچھے رکھی ہم نے ان پر اس دنیا میں لعنت، یعنی دوری۔ یا ہم نے بندوں کو ان کی لعنت کا حکم کیا۔ چنانچہ جو کوئی ان کا ذکر کرتا ہے تو ان پر لعنت بھیجتا ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے اور مومنین خلفاً عن سلفٍ ہمیشہ ان کو لعنت کرتے رہتے ہیں۔ ﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴾ مقبوح کہتے ہیں مطرود و مبعد کو۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا: "قَبَحَ اللّٰهُ فُلَانًا قَبْحًا وَقُبُوْحًا"، یعنی اللہ فلاں کو ہر خیر سے دور کرے۔ امام ابو عبیدہ اور ابن کیسان رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں "مُهْلَكِيْنَ مَمْقُوْتِيْنَ"۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا: "قَبَحْتُ وَجْهَهُ"، بہ معنی "قَبَّحْتُ"، بالتشدید کے ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ "مَقْبُوْحٌ"، مشوہ الخلقۃ کو کہتے ہیں، یعنی قیامت کے دن وہ اُن لوگوں میں سے ہوں گے

---
[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٨٩)
[2] فتح القدير (٤/ ٢٢٩)

جو بری نشانی کے ساتھ نشان کیے گئے ہوں گے، جیسے: آنکھوں کا سبز ہونا اور چہروں کا سیاہ ہونا۔

عامل کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ میں محذوف ہے، جس کی تفسیر ﴿ اَلْمَقْبُوْحِيْنَ ﴾ کر رہا ہے، یعنی "وَقُبِحُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ" یا ﴿ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا ﴾ کے موضع پر معطوف ہے، یعنی "وَأَتْبَعْنَاهُمْ لَعْنَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ" یا معطوف ہے ﴿ لَعْنَةً ﴾ پر برحذف مضاف، یعنی "وَلَعْنَةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" یا متعلق ہے ﴿ اَلْمَقْبُوْحِيْنَ ﴾ سے۔ امام نسفی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وجہ اول زیادہ ظاہر ہے۔[2]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴۳

اور بلاشبہ ہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو ایسی کتاب دی جو کہ لوگوں کے لیے بصیرت افروز دلائل اور ہدایت اور رحمت تھی، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں (43)

موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات دیے جانے اور دیگر انعامات کا بیان:

تورات کے بعد ایسے غارت کے عذاب کم آئے کہ عالم میں کچھ لوگ شریعت کے حکم پر قائم رہے۔ انتہی۔
اللہ پاک اس انعام کی خبر دیتا ہے جو اس نے اپنے بندے اور رسول موسیٰ کلیم علیہ السلام پر کیا۔ "عليه من ربه أفضل الصلوات والتسليم" کہ ان پر تورات شریف نازل کی، اس کے بعد کہ فرعون اور اس کے سرداروں کو ہلاک کیا۔
﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى ﴾ سے یہ مراد ہے کہ تورات کو نازل کرنے کے بعد کوئی اُمت عام عذاب کے ساتھ عذاب نہیں کی گئی، بلکہ مومنوں کو اس بات کا حکم فرمایا کہ مشرک لوگ جو اللہ پاک کے دشمن ہیں ان سے لڑیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝۹ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴾ [الحاقة: ۹۔ ۱۰] "اور فرعون اور جو اس سے پہلے تھے اور الٹائی گئی بستیوں والے گناہ کرتے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو اس (رب) نے انھیں نہایت سخت گرفت میں لے لیا۔"

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کے نازل کرنے کے بعد کسی قوم کو آسمان اور زمین سے عذاب نہیں کیا، سوائے اس بستی کے جو مسخ کر کے بندر بنا دیے گئے موسیٰ علیہ السلام کے بعد۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى ﴾
(ورواه ابن أبي حاتم من حديث عوف بن أبي حبيبة الأعرابي بنحوه،[3] وهكذا رواه أبو بكر البزار في مسنده عن

[1] تفسير النسفي (۳/ ۲۳۸)	[2] فتح البيان (۱۰/ ۱۱۹۔ ۱۲۳)	[3] تفسير الطبري (۱۹/ ۵۸۴) تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۸۱)

عمرو بن علي الفلاس عن يحيىٰ القطان عن عوف عن أبي نضرة عن أبي سعيد موقوفاً، ثم رواه عن نصر بن علي عن عبد الأعلى عن عوف عن أبي نضرة عن أبي سعيد رفعه إلى النبيﷺ قال: «ما أهلك الله قوماً من السماء والأرض بعذاب بعد موسىٰ، ثم قرأ: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى ﴾[1] » الآية۔ (مصحح مصر نے حاشیہ ابن کثیر پر یہ لکھا ہے: قوله: ما أهلك الله... الخ هكذا في نسخة و في أخرى: ما أهلك الله قوما بعذاب من السماء و لا من الأرض إلا قبل موسى... الخ و حرر انتهىٰ غرض محشی کی یہ ہے کہ ایک روایت میں « بعد موسى » ہے اور دوسری میں « قبل موسى » تو دونوں میں اختلاف ہوا اس کی توفیق چاہیے۔ وجۂ توفیق یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں اتحاد ہے۔ اس لیے کہ « بعد موسى » والی روایت کے یہ معنی ہیں کہ بعد موسیٰ علیہ السلام کے، یعنی بعد نزولِ تورات شریف کے کوئی اُمت آسمان و زمین کے عذاب سے ہلاک نہیں ہوئی سوائے ایک بستی کے، اور « قبل موسى » کی روایت کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک نے کسی قوم کو آسمان و زمین کے عذاب سے ہلاک نہیں کیا، مگر قبل موسیٰ علیہ السلام کے۔ اس کے معنی بھی یہی ہوئے کہ اس قسم کی ہلاکت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نہیں ہوئی، بلکہ ان سے پہلے ہوئی، پس دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، صرف عبارت کا فرق ہے۔ چنانچہ غور کرو)

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی وہ کتاب سمجھانے والی ہے اندھے پن سے، گمراہی سے حق کی طرف ہدایت کرنے والی ہے اور عملِ صالح کی طرف راہ بتانے والی ہے، شاید لوگ اس سے نصیحت لیں اور اس کے سبب سے راہ پائیں۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا پختہ بیان یہ ہے کہ کتاب سے مراد تورات شریف ہے اور قرونِ اولیٰ سے مراد نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد اور ثمود وغیرہم ہیں، یعنی اُن سب کے ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے تورات عطا کی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد کہ ہم نے فرعون کو اور اس کی قوم کو ہلاک کیا اور قارون کو زمین میں دھنسا دیا۔ رہی یہ بات کہ تورات دینے کے لیے یہ کیوں ذکر کیا کہ گذشتہ اُمتوں کو ہلاک کرنے کے بعد دی تو اس سے غرض اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ تورات کو نازل کرنے کی طرف حاجت داعی تھی۔ اور یہ آگاہ کرنا اس بیانِ حاجت کی تمہید کے لیے ہے جو رسول اللہ ﷺ پر قرآن شریف کے نزول کا باعث بنی، جس کا ذکر اس کے بعد آتا ہے، اس لیے کہ بستیوں کو ہلاک کرنا شریعتوں کی علامات اور اُن کے نشانوں کے مٹنے کا موجب ہوتا ہے اور ان کے احکام کے بوسیدہ ہونے کا سبب ہو جاتا ہے اور یہ تمام امور نظامِ عالم میں خلل پیدا کرتے ہیں۔ پھر یہ چاہتے ہیں کہ شرعی احکام کی اس طریقے سے تجدید کی جائے کہ جو اصول اور قواعد زمانے کے گزرنے کے ساتھ باقی رہ گئے ہیں، ان کو نئے سرے سے مقرر اور ثابت و پختہ کیا جائے اور جو فروع زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدل چکے ہیں، ان کی ترتیب کی جائے اور گذشتہ اُمتوں

---

[1] كشف الأستار عن زوائد مسند البزار (٣/ ٦٤۔ ٦٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٥٨)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٤۔ ٥١٥)

کے حالات جو عبرت اور نصیحت کا موجب ہیں، وہ یاد دلائے جائیں۔ گویا یوں کہا گیا: البتہ یقیناً ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات اس وقت دی جس وقت اس کی حاجت تھی۔

﴿ بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ ﴾ مفعول لہ ہے یا حال ہے، یعنی اس لیے کہ لوگ اس سے بینا ہو جائیں، یا اس حال میں کہ وہ بصیرت اور بینائی ہے ان کے لیے کہ اس سے حق کو دیکھیں۔ ﴿ بَصَآئِرَ ﴾ بصیرت کی جمع ہے۔ بصیرت کہتے ہیں دل کے نور کو، جس طرح کہ بصر آنکھ کے نور کو بولتے ہیں۔ یعنی وہ تورات لوگوں کے دلوں کے لیے انوار (روشنیاں) ہیں کہ ان سے حقائق کو دیکھیں اور حق و باطل کے درمیان تمیز کریں، اس کے بعد کہ فہم و ادراک سے بالکل اندھے ہو رہے تھے۔

﴿ وَهُدًى ﴾ اور یہ راہ بتاتی ہے کہ اس کی طرف راہ پائیں اور اس سے راہ پا کر اپنی جانوں کو بے راہی سے چھڑائیں۔ ﴿ وَرَحْمَةً ﴾ اور اللہ پاک کی طرف سے ایک مہربانی ہے کہ اس کے سبب سے ان پر مہربانی کی ہے۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴾ شاید وہ ان نعمتوں کو یاد کریں تو اللہ پاک کا شکر بجا لائیں اور اس پر ایمان لائیں اور اس کے بلانے والے کا کہنا مانیں، جو ایسی شے کی طرف بلا رہا ہے جس میں ان کی خیر اور بھلائی ہے اور جو کچھ ان میں وعظ اور نصیحتیں ہیں، ان سے نصیحت پکڑیں۔[1]

وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٤٤﴾ وَلَٰكِنَّا أَنشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴿٤٥﴾ وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِن رَّحْمَةً مِّن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٤٦﴾ وَلَوْلَا أَن تُصِيبَهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾

اور (اے نبی!) جب ہم نے موسیٰ پر امر (خاص) کی وحی کی تو آپ (طور کی) مغربی جانب نہیں تھے، اور نہ آپ (اس واقعے کے) حاضرین میں تھے ﴿44﴾ اور لیکن ہم نے کئی امتیں پیدا کیں، پھر ان پر (مدتِ) حیات لمبی ہو گئی، اور آپ اہلِ مدین میں نہیں رہتے تھے کہ ان پر

[1] فتح البیان (۱۰/ ۱۲۳۔ ۱۲۴)

ہماری آیات تلاوت کرتے، اور لیکن ہم ہی رسول بھیجنے والے تھے ﴿45﴾ اور آپ طور کی جانب نہیں تھے جب ہم نے (موسیٰ کو) پکارا تھا، لیکن یہ (وحی تو) آپ کے رب کی طرف سے رحمت ہے، تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس اس سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿46﴾ اور اگر (یہ) نہ ہوتا کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اس کی وجہ سے انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے: اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا، پھر ہم تیری آیات کی اتباع کرتے اور ہم مومنوں میں سے ہو جاتے (تو ہم رسول نہ بھیجتے) ﴿47﴾

نبی مکرم ﷺ کی نبوت کی دلیل:

اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی نبوت کی دلیل سے اس انداز سے آگاہ کرتا ہے کہ آپ نے پہلی غیب کی باتوں کی ایسے خبر دی کہ گویا ان کو سننے والا، اس شے کے پاس حاضر ہے، جو گزر چکی ہے۔ حالاں کہ آپ ایک امی شخص ہیں کہ پہلی کتابوں سے کچھ بھی پڑھ نہیں سکتے اور آپ نے ایسی قوم میں پرورش پائی جو اِن باتوں میں سے کچھ بھی جانتی پہچانتی نہیں ہے۔ اللہ پاک نے جو اس جگہ ارشاد فرمایا ہے تو یہ ویسا ارشاد ہے جیسا کہ مریم علیہا السلام کے قصے میں فرمایا، جب کہ آپ ﷺ کو مریم علیہا السلام اور ان کے ماجرے کی خبر دی تو یوں فرمایا: ﴿ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ٤٤] ”آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا سرپرست ہو اور نہ آپ اس وقت ان کے پاس تھے، جب وہ باہم جھگڑ رہے تھے۔“ یعنی تو اس وقت حاضر نہ تھا، لیکن اللہ نے تیری طرف اس کی وحی کی۔

اسی طرح جب اللہ پاک نے آپ ﷺ کو نوح علیہ السلام کی اور اُن کی قوم کی خبر دی اور اس قصے کی خبر دی جو اُن کے درمیان واقع ہوا کہ اللہ پاک نے ان کو نجات دی اور ان کی قوم کو ڈبو دیا، پھر یوں فرمایا: ﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [هود: ٤٩] ”(اے نبی!) یہ کچھ غیب کی خبریں ہیں، ہم انھیں آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ انھیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، اس لیے آپ صبر کریں، بے شک (بہترین) انجام متقین ہی کے لیے ہے۔“ اور سورت کے آخر میں یہ فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ ﴾ [هود: ١٠٠] ”(اے نبی!) یہ کچھ خبریں ان (تباہ شدہ) بستیوں کی ہیں جو ہم آپ کو سناتے ہیں۔“

اور یوسف علیہ السلام کے قصے کے ذکر کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۲] ''یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، یہ ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اور آپ ان (برادرانِ یوسف) کے پاس نہیں تھے جب انھوں نے اپنی ایک بات پر اتفاق کیا تھا اور وہ مکر کر رہے تھے۔'' اور سورت طٰہٰ میں یہ ارشاد کیا ہے: ﴿ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ﴾ [طٰہٰ: ۹۹] ''اسی طرح ہم آپ کو وہ احوال سناتے ہیں جو (پہلے) گزر چکے۔''

اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو اول سے آخر تک بیان کرنے اور وحی کی ابتدا کی کیفیت اور کلام کرنے کی کیفیت بیان کرنے کے بعد یہ فرمایا: ﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ ﴾ یعنی اے پیغمبر! تو پہاڑ کی غربی جانب نہیں تھا جس میں اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں اس درخت میں سے جو کہ وادی کے شرقی کنارے پر ہے اور نہ ہی تو اس وقت حاضر تھا، لیکن اللہ پاک نے تیری طرف اس کی وحی کی، تاکہ یہ ان بستیوں پر حجت اور برہان ہو جائے جن کا زمانہ دراز ہو گیا اور اللہ پاک کی وہ حجتیں جو اُن پر تھیں اور جن باتوں کی اللہ پاک نے پہلے انبیا پر وحی کی تھی، ان سب کو بھول گئے تھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ﴾ یعنی اور تو اہلِ مدین میں رہنے بسنے والا نہ تھا کہ تو اُن پر ہماری آیتیں پڑھے، جبکہ تو نے مدین کے نبی شعیب علیہ السلام کی طرف سے خبر کر دی اور اس بات کی خبر دی جو اس نے اپنی قوم سے کہی اور جو جواب قوم نے اس کو دیا۔ ﴿ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴾ یعنی لیکن ہم نے ان باتوں کی وحی کی تیری طرف اور ہم نے تجھ کو لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا ﴾ یعنی تو طور کی جانب نہ تھا جب کہ ہم نے ندا کی۔ ابو عبدالرحمٰن نسائی نے اپنی سنن کی کتاب التفسیر میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ندا کی گئی: اے امتِ محمد! عطا کیا میں نے تم کو اس سے پہلے کہ تم مجھ سے مانگو اور جواب دیا میں نے تم کو اس کے قبل کہ تم مجھے پکارو۔[1] (وهكذا رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم من حديث جماعة عن حمزة و هو ابن حبيب الزيات عن الأعمش و رواه ابن جرير من حديث وكيع و يحيىٰ بن عيسى عن الأعمش عن علي بن مدركة عن أبي زرعة و هو ابن عمرو بن جرير أنه قال: ذلك من كلامه، والله أعلم)

امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے، جبکہ ندا کی ہم نے تیری اُمت کو ان کے آبا کی پشتوں میں کہ تجھ پر ایمان لائیں جب کہ تو مبعوث ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جبکہ ندا کی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو۔[2] یہ قول۔ واللہ أعلم۔ زیادہ مشابہ ہے اس آیتِ کریمہ کے: ﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ ﴾

---

(1) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٤) تفسير الطبري (١٩/ ٥٨٦۔ ٥٨٥) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٨٣۔ ٢٩٨٤)

پھر اس جگہ ایک اور صفت کا ذکر کیا، جو اس سے خاص تر ہے، یعنی ندا، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى ﴾ [الشعراء: ١٠] ''اور (یاد کریں) جب آپ کے رب نے موسیٰ کو پکارا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴾ [النازعات: ١٦] ''جب اس کے رب نے مقدس وادیِ طویٰ میں اسے پکارا تھا۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴾ [مریم: ٥٢] ''اور ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے پکارا اور ہم نے اسے راز و نیاز کرتے ہوئے قریب کیا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ یعنی امورِ مذکورہ سے تو کسی امر کا بھی مشاہدہ کرنے والا نہ تھا، لیکن اللہ پاک نے تیری طرف اُن کی وحی کی اور تجھ کو اُن کی خبر دی، یہ تجھ پر اور بندوں پر تیرے بھیجنے کے سبب سے ایک رحمت اور مہربانی تھی، تاکہ تو اُن لوگوں کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی شاید وہ اس شے کے سبب سے راہ یاب ہوں جو تو اُن کے پاس اللہ عزوجل سے لے کر آیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْلَاۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے تجھ کو ان کی طرف بھیجا، تاکہ تو ان پر حجت قائم کرے اور تاکہ ان کا کوئی عذر نہ رہے اور جس وقت ان پر اُن کے کفر کی وجہ سے اللہ پاک کی طرف سے عذاب آئے تو وہ یہ دلیل نہ پیش کر سکیں کہ ان کے پاس کوئی رسول آیا نہ کوئی ڈرانے والا، جس طرح کہ اللہ پاک نے پہلے اپنی مبارک کتاب قرآن شریف کے نازل کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد یہ فرمایا ہے: ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ﴾ [الأنعام: ١٥٦۔ ١٥٧] ''تاکہ تم یہ نہ کہو کہ صرف ہم سے پہلے دو گروہوں (یہود و نصاریٰ) پر کتاب نازل کی گئی تھی اور بے شک ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے۔ یا تم (یہ نہ) کہو کہ اگر بے شک ہم پر کتاب نازل کی جاتی تو ہم ضرور ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، چنانچہ یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح کتاب اور ہدایت اور رحمت آ گئی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ [النساء: ١٦٥] ''اور خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھیجے، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کو الزام دینے کی کوئی گنجایش نہ رہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [المائدة: ١٩] ''اے اہلِ کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے، جو رسولوں کے وقفے کے بعد تمھارے لیے باتیں کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس تو کوئی خوش خبری

دینے والا اور کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ پس یقیناً تمھارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا ہے، اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔" اس بارے میں بہت سی آیتیں ہیں۔[1] کذا في ابن کثیر.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا پختہ بیان یہ ہے کہ یہ اس امر کے بیان کی ابتدا ہے کہ قرآن شریف کا نازل کرنا اس زمانے میں واقع ہوا ہے کہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ ﴿ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ ﴾ کی اصل "بِجَانِبِ الْجَبَلِ الْغَرْبِيِّ" ہے۔ مراد وہ جگہ ہے جو غرب کی شق (کنارے) میں واقع ہے۔ موصوف کو حذف کیا اور صفت کو اس کے قائم مقام کر دیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے: "بِجَانِبِ الْوَادِيْ الْغَرْبِيِّ"[2] یعنی وہ جگہ جہاں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے مناجات کی۔ معنی یہ ہیں کہ تو اس جگہ نہ تھا، جبکہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے عہد کیا اور اس سے باتیں کیں اور فرعون اور قوم فرعون کی طرف بھیجنے کے کام کو اس کے ساتھ ہم نے محکم و مضبوط کیا اور نہ تو اس قصے کے حاضر ہونے والوں میں سے تھا یہاں تک کہ تو اس کی حقیقت کو جانتا اور اپنی طرف سے اس کو بیان کرتا۔

کسی نے کہا: ﴿ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ ﴾ کے یہ معنی ہیں: جبکہ ہم نے اس کو اس کام کا مکلف ٹھہرایا اور ہم نے اس پر یہ کام لازم کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ ہم نے اس کو اس بات کی خبر دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بہترین اُمت ہے۔ رہی یہ بات کہ جب غربی جانب میں ہونے کی نفی کی تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ شاہد نہ تھے، کیوں کہ شاہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ حاضر ہو۔ پھر ﴿ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ کے ذکر میں کیا فائدہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جانبِ غربی میں ہونے کی نفی سے شاہدین میں ہونے کی نفی لازم نہیں آتی، کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ حاضر ہوں اور مشاہدہ نہ کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ شاہدین سے مراد وہ ستر آدمی ہیں جن کو موسیٰ علیہ السلام نے میقات کے لیے پسند کیا تھا۔ غرضیکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان حالات کی تفصیل پر واقف ہونا ممکن نہیں ہے، مگر جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اُن کے پاس حاضر ہوں اور اُن کا مشاہدہ کریں، یا جو شخص اُن سے واقف ہے آپ اس سے سیکھیں، لہٰذا جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ آپ نہ وہاں حاضر تھے نہ مشاہدہ کیا اور یہ بات بھی صحیح دلیلوں سے معلوم ہو گئی کہ آپ نے یہ قصے کسی بشر سے نہیں سیکھے، نہ ہی ان کے کسی معلم نے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائے۔ چنانچہ اس کی تقریر پہلے گزر چکی ہے تو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ان قصوں کا علم اللہ پاک کی طرف سے ہے، اس نے اپنے رسول کی طرف اس کی وحی کی ہے فرشتے کے واسطے سے، جو اُس کو لے کر نازل ہوا ہے۔

﴿ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ﴾ یعنی اے پیغمبر! لیکن ہم نے تیرے زمانے اور موسیٰ علیہ السلام

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥١٥۔ ٥١٦) [2] فتح القدیر (٤/ ٢٣١)

کے زمانے کے درمیان اُمتیں پیدا کیں، پھر ان پر مہلت طویل ہوگئی اور مدت ان پر دراز ہوگئی اور نبوت تھم گئی اور قریب تھا کہ پہلے قصے اور خبریں مخفی ہو جائیں، شریعتیں اور احکام بدل دیے گئے اور دین بھلا دیے گئے اور علوم مندرس (پرانے اور گھسے ہوئے) پڑ گئے اور اُن میں سے بہت سوں میں تحریف واقع ہوگئی تو اللہ پاک کے احکام کو چھوڑ دیا گیا اور اس کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو بھول گئے، اس لیے حکمت کا تقاضا ہوا کہ شریعت کی تجدید کی جائے، چنانچہ ہم تجھ کو رسول بنا کر لائے اور تیری طرف موسیٰ علیہ السلام کے حالات کی وحی کی۔ علیهم الصلاة و السلام۔ تا کہ یہ تیرے لیے معجزہ ہو اور تیری قوم کے لیے تذکیر ہو، یعنی نصیحت۔ اسی طرح کی یہ آیت ہے: ﴿ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ﴾ [الحدید: ١٦] ”پھر ان پر مدت لمبی ہوگئی تو ان کے دل سخت ہوگئے۔“

حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تو نے نہ تو موسیٰ علیہ السلام کا مشاہدہ کیا ہے اور نہ ہی اس کیفیت کو دیکھا ہے جو اُن پر گزری ہے، لیکن ہم نے اس کی وحی تیری طرف کی ہے، اس لیے کہ ہم نے امتیں پیدا کیں۔ مطلب یہ ہے کہ درازیِ فترت سبب ہے وحی کرنے کا، چنانچہ اس کو تو ذکر کیا اور اس نے وحی پر دلالت کی جو مسبب ہے، اس کا ذکر نہ کیا۔ اللہ پاک کی عادت ہے کہ قرآن شریف میں اس قسم کا اختصار فرمایا کرتا ہے۔ کسی نے اس کلام سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اللہ پاک نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اور اُن پر ایمان لانے میں موسیٰ علیہ السلام سے عہد کیے۔ پھر جب ان لوگوں پر عمریں دراز ہوئیں اور زمانے گزرتے گئے تو اُن عہدوں کو بھول گئے اور اُن کو پورا کرنے کو چھوڑ دیا۔

﴿ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ﴾ یعنی تو مدین والوں میں اقامت پذیر نہیں تھا جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام ان میں رہے بسے۔ ”ثواء“ اقامت کرنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”ثَوَى يَثْوِيُ ثَوَاءً وَثُوِيًّا فَهُوَ ثَاوٍ“ ﴿ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ﴾ میں ضمیر اہلِ مدین کی طرف راجع ہے۔ اکثر مفسرین اسی طرف گئے ہیں اور یہ جملہ ﴿ كُنْتَ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے، یا ﴿ كُنْتَ ﴾ کی خبرِ ثانی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ خبر ہو اور ﴿ ثَاوِيًا ﴾ حال۔ معنی یہ ہیں کہ نہیں تھا تو مدین میں رہنے بسنے والوں میں اس طرح کہ ان پر ہماری آیتیں پڑھتا ہو اور ان سے سیکھتا ہو، یا اُن کو وعد اور وعید کی نصیحت و وعظ کرتا ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ ضمیر اہلِ مکہ کی طرف پھرتی ہے، یعنی تو مدین والوں میں رہنے بسنے والا نہیں تھا، اس وقت جب مکے والوں پر اُن کی خبریں اور قصہ بیان کرتا ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کے ساتھ گزرا ہے، تا کہ تو ان کو معائنہ اور مشافہہ کے طریق پر اس قصے کو نقل کرے۔ یہ قصہ تو تیرے پاس وحیِ الٰہی کے ذریعے سے آیا ہے۔ چنانچہ تو جو مکے والوں کو اس کی خبر دیتا ہے تو یہ وحی سے ہے نہ کہ اس طرح سے ہے کہ جس قصے کی تو خبر دیتا ہے اس کا تو نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ اس بنا پر معنی واضح ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس جملے کو مستانفہ ٹھہرایا ہے، گویا یوں کہا گیا ہے:

"وَهَا أَنْتَ تَتْلُوْ عَلٰى أُمَّتِكَ" یعنی لے تو پڑھتا ہے اپنی امت پر۔

﴿ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے تجھ کو مکے والوں کی طرف بھیجا ہے اور یہ خبریں ہم نے تجھ پر نازل کی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تو ان کو نہ جانتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ انبیا کے قصوں کا تو نے مشاہدہ نہیں کیا ہے، نہ وہ تجھ پر پڑھے گئے ہیں، لیکن ہم نے ان کی وحی کی ہے تیری طرف اور تجھ پر ان کا قصہ بیان کیا ہے۔[1]

﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا ﴾ یعنی اے پیغمبر! تو اس پہاڑ کی جانب نہ تھا جس کا نام طور ہے، جبکہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا جس وقت وہ ستر آدمیوں کے ہمراہ میقات کی طرف آیا کہ "خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ" یعنی تو کتاب کو مضبوطی کے ساتھ لے لے۔ یہ قول امام محلی رحمہ اللہ کا ہے۔[2] اس آیت کو تورات دینے کے ساتھ متعلق کیا ہے اور ﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ ﴾ کو اصل رسالت عطا فرمانے کے ساتھ لگایا ہے۔ رسالت عطا کرنے اور توریت دینے کے درمیان تیس سال کے قریب مدت ہے۔ تفسیر قرطبی میں ہے: یعنی جس طرح تو حاضر نہیں تھا مکانِ غربی کی جانب، جبکہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا، اسی طرح تو حاضر نہیں تھا جانبِ طور میں، جبکہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ندا کی جس وقت وہ ستر آدمیوں کے ہمراہ میقات میں تورات لینے کے لیے آیا۔[3] بعض نے اس ترتیب کا اُلٹ کیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت کو تورات کے قصے میں ٹھہرایا ہے اور دوسری کو رسالت عطا کرنے کے قصے میں۔ انتہیٰ۔

کسی نے کہا ہے کہ جس کو ندا کی گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے۔ امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا قصہ یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور اُن کی اُمت کا ذکر کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے رب! تو مجھے اُن کو دکھا دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو ان کو ہرگز نہ پائے گا اور اگر تو چاہے تو میں ان کو پکاروں، پھر تجھے اُن کی آواز سنا دوں۔ کہا: ہاں یا رب! پھر اللہ تعالیٰ نے کہا: اے امتِ محمد! تو انھوں نے جواب دیا اپنے آباء کی پشتوں سے۔[4] اس بنا پر یہ معنی ہوں گے کہ اے پیغمبر! تو نہ تھا جانبِ طور میں، جبکہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا، پھر ہم نے تیری اُمت کو پکارا۔ اس معنی کو تقویت دینے والی اور ترجیح دینے والی یہ حدیثیں ہیں:

1 سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا: "نُوْدُوْا: يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ أَعْطَيْتُكُمْ قَبْلَ أَنْ تَسْأَلُوْنِيْ وَاسْتَجَبْتُ لَكُمْ قَبْلَ أَنْ تَدْعُوْنِيْ"[5] "پکارا گیا: اے امتِ محمد! میں نے تمھارے مانگنے سے پہلے تمھیں عطا کیا اور تمھارے دعا کرنے سے پہلے تمھاری دعاؤں کو قبول کیا۔" (أخرجه الفريابي و النسائي و ابن جرير و ابن أبي حاتم و الحاكم و صححه و ابن مردويه و أبو نعيم و البيهقي معاً في الدلائل عنه و أخرجه ابن مردويه من وجه آخر عنه مرفوعاً و أخرجه عبد بن حميد و ابن المنذر و ابن عساكر عنه من وجه آخر بنحوه)

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٣٢) [2] تفسير الجلالين (١/ ٥١٤) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٢٩٢)

[4] فتح القدير (٤/ ٢٣٢) [5] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

2 سیدنا عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا ﴾ کے بارے میں پوچھا کہ کیا تھی ندا اور کیا تھی رحمت؟ فرمایا: اس کو اللہ نے اپنی خلق کو پیدا کرنے سے دو ہزار برس پہلے لکھا، پھر اس کو اپنے عرش پر رکھا، پھر ندا کی: اے امتِ محمد! میری رحمت نے میرے غضب پر سبقت حاصل کی، میں نے تم کو دیا اس سے پہلے کہ تم مجھ سے مانگو، اور میں نے تم کو بخش دیا اس سے پہلے کہ تم مجھ سے مغفرت مانگو، چنانچہ جو شخص تم میں سے مجھے ملے اس حالت میں کہ وہ گواہی دے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ، اور اس بات کی گواہی دے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرا بندہ اور میرا رسول ہے اور وہ اپنی گواہی میں سچا ہے تو میں اس کو جنت میں داخل کروں گا۔ (أخرجه ابن مردويه وأبو نعيم في الدلائل وأبو النصر السجزي في الإبانة والديلمي عنه)

3 سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہا: "نُوْدُوْا: يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ مَا دَعَوْتُمُوْنَا إِلَّا اسْتَجَبْنَا لَكُمْ وَلَا سَأَلْتُمُوْنَا إِلَّا أَعْطَيْنَاكُمْ" (أخرجه ابن مردويه و أبو نعيم عنه) یعنی پکارے گئے کہ اے امتِ محمد! نہیں پکارا تم نے ہم کو، جبکہ قبول کیا ہم نے واسطے تمھارے اور نہ مانگا تم نے ہم سے، مگر دیا ہم نے تم کو۔

4 امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے: "إِنَّ اللّٰهَ نَادَى يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ! أَجِيْبُوْا رَبَّكُمْ قَالَ: فَأَجَابُوْا وَهُمْ فِيْ أَصْلَابِ آبَائِهِمْ وَأَرْحَامِ أُمَّهَاتِهِمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَقَالُوْا: لَبَّيْكَ أَنْتَ رَبُّنَا حَقًّا وَنَحْنُ عَبِيْدُكَ حَقًّا. قَالَ: صَدَقْتُمْ أَنَا رَبُّكُمْ وَأَنْتُمْ عَبِيْدِيْ حَقًّا قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ قَبْلَ أَنْ تَدْعُوْنِيْ وَأَعْطَيْتُكُمْ قَبْلَ أَنْ تَسْأَلُوْنِيْ فَمَنْ لَقِيَنِيْ مِنْكُمْ بِشَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" [1] یعنی بے شک ندا کی اللہ نے: اے اُمتِ محمد! جواب دو اپنے رب کو، کہا: جواب دیا اور وہ اپنے باپوں کی پشتوں میں اور اپنی ماؤں کے رحموں میں تھے قیامت کے دن تک، چنانچہ کہا: ہم حاضر ہیں تو ہمارا سچا رب ہے اور ہم تیرے سچے بندے ہیں۔ فرمایا: تم نے سچ کہا کہ میں تمھارا رب ہوں اور تم میرے بندے ہو سچے۔ بے شک میں نے تم کو تمھارے پکارنے سے پہلے ہی معاف کیا اور میں نے تم کو دیا اس سے قبل کہ تم مجھ سے مانگو۔ لہٰذا جو شخص تم میں سے مجھے ملے، اس بات کی گواہی لے کر کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ، تو وہ داخل ہوگا جنت میں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ یعنی لیکن ہم نے یہ اپنی طرف سے تمھارے لیے رحمت کے واسطے کیا۔ کسی نے کہا: ہم نے قرآن تمھارے لیے رحمت کے ساتھ بھیجا۔ کسی نے کہا: "عَلَّمْنَاكَ"۔ کسی نے کہا: "عَرَّفْنَاكَ"۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: منصوب ہے بنا پر مفعول مطلق، یعنی "وَلٰكِنْ رَحِمْنَاكَ رَحْمَةً"۔ امام زجاج رحمہ اللہ

[1] الدر المنثور (٦/ ٤١٨۔ ٤١٩)

نے کہا: مفعول لہ ہے، یعنی کیا ہم نے یہ تیرے ساتھ رحمت کے لیے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: تو حاضر نہیں ہوا انبیاء کے قصوں میں اور نہ وہ تجھ پر پڑھے گئے، لیکن ہم نے تجھ کو بھیجا اور اُن کی وحی کی تیری طرف رحمت کے لیے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ رَحْمَةً ﴾ "كَانَ" مقدر کی خبر ہے۔ "أَيْ: وَلٰكِنْ كَانَ ذٰلِكَ رَحْمَةً" یعنی لیکن تھی یہ رحمت۔ امام عیسیٰ بن عمر اور ابو حیوہ رحمہما اللہ نے برفع پڑھا ہے بہ تقدیر: "وَلٰكِنْ أَنْتَ رَحْمَةٌ" امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع اس بنا پر ہے کہ اسم ہے "كَانَ" مقدر کا۔ یہ قول بعید ہے، مگر اس بنا پر کہ "كَانَ" تامہ ہو۔[1]

﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ میں حرفِ لام متعلق ہے فعل مقدر سے اس اختلاف کی بنا پر جو اس کی تقدیر میں ہے۔ قوم سے مراد اہلِ مکہ ہیں۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا جو اُن کو زمانۂ فترت میں ڈرائے، جو آپ ﷺ کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہے۔ یہ زمانہ پانچ سو برس کا ہے، یا آپ کے اور اسماعیل علیہ السلام کے درمیان ہے، اس بنا پر کہ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت خاص بنی اسرائیل کے لیے ٹھہری۔ جملہ ﴿ مَآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ قوم کی صفت ہے۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی شاید وہ تیرے ڈرانے سے نصیحت پکڑیں۔

نکتہ:

یہ بات معلوم ہے کہ مدین کا واقعہ طور کے دونوں واقعوں سے پہلے تھا، چنانچہ واقعاتی ترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں واقعوں سے پہلے ذکر کیا جائے۔ دونوں کے درمیان میں جو لایا گیا ہے تو اس سے غرض اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ دونوں واقعوں میں سے ہر ایک اس بات کی مستقل دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ان قصوں کی خبر دینا اللہ کی وحی کے ذریعے سے ہے اور اگر واقعاتی ترتیب کو مدِنظر رکھا جاتا تو بسا اوقات اس بات کا وہم ہوتا کہ سب پر جو ذکر کیا گیا کل ایک دلیل ہے۔[2] (كذا ذكره أبو السعود)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا ﴾ کلمۂ ﴿ لَوْلَآ ﴾ امتناعیہ ہے اور کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ اور جو اس کے تحت میں ہے موضع رفع میں ہے بنا بر ابتدا "أَيْ: وَلَوْلَا أَصَابَتْهُ الْمُصِيْبَةُ لَهُمْ" اور جواب اس کا محذوف ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر جواب کی یہ ہے: "مَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا" یعنی ان کی طرف رسول بھیجنے کا حامل و باعث ان کی علتوں اور بہانوں کا دور کرنا ہے۔ چنانچہ یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ [النساء: ١٦٥] "تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کو الزام دینے کی کوئی گنجایش نہ رہے۔"

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٣٢۔ ٢٣٣)
[2] تفسير أبي السعود (٧/ ١٦۔ ١٧)

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے جواب کی تقدیر یہ کی ہے کہ "لَعَاجَلْنَاهُمْ بِالْعُقُوبَةِ"۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے اس تقدیر پر امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے۔ یوں کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: اگر نہ ہوتی یہ بات کہ وہ حجت پکڑیں گے اس امر کے ساتھ کہ ان کی طرف رسول نہیں بھیجے تو البتہ ہم ان کے کفر کی وجہ سے ان پر سزا اور عذاب کی جلدی کرتے۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ ﴿فَيَقُوْلُوْا﴾ معطوف ہے ﴿تُصِيْبَهُمْ﴾ پر اور من جملہ اس شے کے ہے جو ﴿لَوْلَآ﴾ کی خبر میں ہے اور دوسرا ﴿لَوْلَآ﴾ تحضیض کا ہے، اس کا جواب ﴿فَنَتَّبِعَ﴾ ہے، اسی لیے باضمارِ "أَنْ" منصوب ہوا ہے۔ "آیات" سے مراد آیاتِ تنزیلیہ ظاہرہ واضحہ ہیں۔

معنی یہ ہیں اگر انھیں ان گناہوں کے سبب سے جن کو اُن کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں، مصیبت کا پہنچنا نہ ہوتا، پھر اس مصیبت کے پہنچنے کی وجہ سے ان کا یہ کہنا نہ ہوتا کہ اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف اپنا کوئی رسول کیوں نہ بھیجا، تاکہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور ان آیتوں پر ایمان والے ہوتے تو ہم تجھ کو نہ بھیجتے۔ لیکن چوں کہ ان کا یہ کہنا مصیبت کے پہنچنے کے وقت محقق تھا، اس سے کوئی مفر نہ تھا، اس لیے ہم نے تجھ کو بھیجا، تاکہ ان کے عذر بالکل دور کر دیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم ان کو ان کے گناہوں کے سبب سے عذاب کرتے تو وہ یوں کہتے کہ رسولوں کو زمانہ دراز گزرا اور ہماری طرف اللہ نے کوئی رسول نہ بھیجا اور خیال کرتے کہ یہ اُن کے لیے عذر ہو جائے گا، حالاں کہ یہ کوئی عذر نہیں ہے اس کے بعد کہ رسولوں کی خبریں ان کو پہنچ چکیں، لیکن ہم نے حجت کو کامل کیا اور علت اور بہانے کو زائل کر دیا اور اے محمد! تجھ کو ان کی طرف بھیج کر بیان کو پورا کر دیا ہے۔ امام ابن مردویہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "زمانہ فترت میں ہلاک ہونے والا کہے گا: اے رب! نہ آئی میرے پاس کوئی کتاب اور نہ کوئی رسول۔" پھر یہ آیت پڑھی۔[2]

امام زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر تو کہے کہ یہ معنی کیوں کر ٹھیک ہوں گے، حالاں کہ سبب تو عقوبت ٹھہرائی گئی ہے، قول سبب نہیں ٹھہرایا گیا، کیوں کہ ﴿لَوْلَآ﴾ حرفِ امتناع عقوبت پر داخل ہوا ہے قول پر نہیں آیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ ارسال کے واسطے سبب ہونے کے ساتھ مقصود قول ہی ہے، لیکن قول کی وجہ چوں کہ سزا تھی اور قول کا وجود عقوبت کے وجود کے سبب سے تھا، اس لیے عقوبت ایسی قرار دی گئی، گویا وہی سبب ہے ارسال کا بواسطہ قول کے تو ﴿لَوْلَآ﴾ اس پر داخل ہوا اور حرفِ فا جو سببیت کے معنی ظاہر کرتا تھا، اس کے ساتھ اس پر قول کا عطف کر دیا گیا، معنی اس کے اس عبارت کی طرف راجع ہوتے ہیں۔

اگر ان کا یہ قول نہ ہوتا، جبکہ ان کو مصیبت پہنچتی تو البتہ ہم تجھ کو نہ بھیجتے، لیکن یہ طریقہ ایک نکتے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ مثلاً اگر وہ عذاب نہ کیے جاتے اپنے کفر پر اور اس شے کا معائنہ کر لیتے جس کی وجہ سے

---

(1) فتح القدير (٤/ ٢٣٣) (2) الدر المنثور (٦/ ٤١٩)

یقینی علم کی طرف مضطر کیے جاتے تو وہ ﴿ لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا ﴾ نہ کہتے۔ اس قول کے کہنے کا سبب جو شے ہے تو وہ عتاب ہی ہے، اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ خالق کے ساتھ ایمان لانا جو اُن سے فوت ہوا، اس پر افسوس کرتے ہوں۔[1] امام شہاب خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں ایک اشکال وارد کیا ہے، وہ یہ ہے کہ آیت اس بات کو مقتضی ہے کہ ان کو مصیبت پہنچی اور انھوں نے قولِ مذکور کہا اور واقع میں یہ ہے کہ نہ اُن کو مصیبت پہنچی اور نہ ہی قولِ مذکور کہا تو اب یہ ترکیب اس لحاظ سے مشکل ہوگی کہ ﴿ لَوْلَآ ﴾ وجود کے لیے حرفِ امتناع ہے، چنانچہ معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے تجھ کو ان کی طرف بھیجا، ان پر مصیبت کے نازل ہونے کے واسطے اور ان کے قولِ مذکور کے وجود کے واسطے، حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے؟

بعض نے بہ تکلف یہ جواب دیا ہے کہ کلام میں حذفِ مضاف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَلَوْلَا كَرَاهَةُ أَنْ تُصِيْبَهُمْ إلخ" چنانچہ جو شے محقق و موجود ہے تو وہ اُن کی مصیبت کی کراہت ہے جس پر ان کا قولِ مذکور ترتیب دیا گیا ہے، لہٰذا معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے تجھ کو اُن کی طرف اس بات کی کراہت کے واسطے بھیجا کہ ان کو مصیبت پہنچے تو وہ قولِ مذکور کہیں۔ صاحبِ انتصاف نے کہا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ ﴿ لَوْلَآ ﴾ جس بات پر دلالت کرتا ہے، وہ یہی ہے کہ اس کا مابعد اس کے جواب سے مانع ہے اور مانع کبھی موجود ہوتا ہے اور کبھی مفروض، اس جگہ جو مانع ہے وہ مفروض ہے، اب اس میں کسی طرح کا اشکال نہیں ہے۔ گو مضاف مقدر نہ کیا جائے۔[2] انتهى بنوع تصرف، كذا ذكره الجمل.

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ
مُوْسٰى ۭ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ
تَظٰهَرَا ۣ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿48﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿49﴾
فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ
مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿50﴾ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿51﴾

لہٰذا جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق (قرآن) آ گیا تو وہ کہنے لگے: اسے ویسے معجزے کیوں نہیں دیے گئے جیسے موسیٰ کو دیے گئے تھے؟ کیا وہ (ان معجزات کا) انکار نہیں کر چکے جو

[1] الكشاف (٣/ ٤٢٢۔ ٤٢٣) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ٧٦) فتح البيان (١٠/ ١٢٤۔ ١٢٨)

اس سے پہلے موسیٰ کو دیے گئے تھے؟ انھوں نے کہا: (یہ) دونوں (تورات اور قرآن) جادو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اور انھوں نے کہا: بلاشبہ ہم ہر ایک کے منکر ہیں ﴿48﴾ کہہ دیجیے: اگر تم سچے ہو تو اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو (ان) دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو، تاکہ میں بھی اس کی اتباع کروں ﴿49﴾ پھر اگر وہ آپ کی بات قبول نہ کریں تو جان لیجیے کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوسکتا ہے جو اللہ کی طرف سے ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔ بلاشبہ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿50﴾ اور بلاشبہ ہم انھیں لگاتار اپنی (ہدایت و نصیحت کی) باتیں پہنچاتے رہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿51﴾

کفار کی ہٹ دھرمی کا ذکر اور ان کے جواب کا بیان:

مکے کے کافر موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سن کر کہنے لگے کہ ویسا معجزہ اس کے پاس ہوتا تو ہم مانتے، جب یہود سے پوچھا اور تورات کے حکم سنے، جو اس رسول کے موافق تھے اور اپنی مرضی کے خلاف، یعنی یہ کہ بت پرستی کفر ہے اور آخرت کا جینا برحق ہے اور اللہ کے نام پر ذبح نہ ہو تو مردار ہے اور بہت سی باتیں سنیں، تب دونوں کو جواب دینے لگے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک اس قوم کی خبر دیتا ہے کہ اگر ان کو قیامِ حجت سے پہلے عذاب کرے تو وہ یہ حجت پیش کریں کہ اُن کے پاس کوئی رسول نہیں آیا۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ پھر جب اُن کے پاس اس کی طرف سے اور محمد ﷺ کی زبان مبارک پر حق آیا تو وہ عیب جوئی، سرکشی، عناد، کفر، جہالت اور الحاد کے طور پر کہنے لگے کہ کیوں نہ ملا اس کو جیسا موسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا۔

واللہ أعلم، اس سے ان کی مراد وہ بہت سی نشانیاں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھیں، جیسے: ''عصا، ید بیضا، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، دم، تنقیص زروع اور ثمار'' جو ان نشانیوں میں سے تھیں جو اللہ کے دشمنوں پر تنگی کرتی ہیں اور دوسری نشانیاں، جیسے: دریا کا پھاڑنا، بادل کا سایہ کرنا، من وسلویٰ نازل کرنا اور ان کے سوا اَور نشانیاں جنھیں اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں پر جاری کیا تھا کہ ان کے لیے حجت اور برہان ہو جائیں فرعون اور اس کے سرداروں پر اور بنی اسرائیل پر اور اس کے باوجود فرعون اور اس کے سرداروں پر کچھ اثر نہ ہوا، بلکہ وہ موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون علیہما السلام کے منکر ہوئے، چنانچہ ان سے یوں کہا: ﴿ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [یونس: ۷۸] ''انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے پاس آیا ہے

کہ ہمیں اس (طریقے) سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور تم دونوں کے لیے زمین میں اقتدار ہو؟ جب کہ ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَكَذَّبُوهُمَا فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ ﴾ [المؤمنون: ٤٨] ''پھر انھوں نے ان دونوں کو جھٹلایا تو وہ ہلاک شدگان میں سے ہوگئے۔'' اور اسی لیے یہاں ارشاد فرمایا: ﴿ أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ﴾ یعنی کیا نہیں انکار کیا بشر نے ان بڑی بڑی نشانیوں کا جو موسیٰ علیہ السلام کو ملیں؟ ﴿ قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا ﴾ یعنی بولے: یہ دو جادوگر ہیں، ایک نے دوسرے کی مدد کی ہے۔ ﴿ وَقَالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كَافِرُونَ ﴾ یعنی ہم ان میں سے ہر ایک کے منکر ہیں۔ ان دونوں کی آپس میں مصاحبت اور مقاربت کی شدت کے سبب سے، یعنی موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی وجہ سے، ایک کا ذکر دوسرے پر دال ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: ؎

فَمَا أَدْرِي إِذَا يَمَّمْتُ أَرْضًا أُرِيدُ الْخَيْرَ أَيُّهُمَا يَلِينِي

یعنی جس وقت میں کسی زمین کا ارادہ کرتا ہوں تو بھلائی کو چاہتا ہوں، مگر میں نہیں جانتا کہ مجھے ان میں سے کون سی شے ملے، بھلائی یا برائی۔

غرض یہ ہے کہ خیر و شر میں چونکہ شدتِ ملازمت و مقاربت ہے، اس لیے صرف خیر کا ذکر کیا اور ''أَيُّهُمَا'' میں دونوں کی طرف ضمیر راجع کر دی شر کے ذکر کے بغیر، کیوں کہ شدتِ ملازمت کے سبب سے وہ بھی مذکور ہی کے حکم میں ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود نے قریش کو امر کیا کہ یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کہیں، چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ''أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ قَالُوا سَاحِرَانِ تَظَاهَرَا''، امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہیں۔ ﴿ تَظَاهَرَا ﴾ یعنی دونوں نے باہم معاونت و مناصرت کی ہے اور ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی تصدیق کی ہے۔ امام سعید بن جبیر اور ابو رزین رحمہما اللہ بھی ''سَاحِرَانِ'' کی تفسیر میں اسی کے قائل ہیں کہ ''سَاحِرَانِ'' سے ان کی مراد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہیں۔ یہ قول جید اور قوی ہے۔ واللہ أعلم۔ امام مسلم بن یسار رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ''سَاحِرَانِ'' سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ حسن بصری رحمہ اللہ کی روایت ہے اور امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس قول میں بعد ہے، اس لیے کہ اس جگہ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں ہوا۔ واللہ أعلم.

رہے وہ لوگ جنھوں نے ﴿ سِحْرَانِ تَظَاهَرَا ﴾ پڑھا ہے۔ پس علی بن ابی طلحہ اور عوفی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کی مراد تورات و قرآن ہیں۔ اسی طرح سے عاصم جندی، سدی اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی

تصدیق کی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد تورات اور انجیل ہیں۔ امام ابو زرعہ رحمہ اللہ سے بھی یہ ایک روایت ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ انجیل و قرآن ہیں۔[1] واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم بالصواب۔ قراءت ﴿ سِحْرَانِ تَظٰهَرَا ﴾ کی بنا پر ظاہر یہ ہے کہ مراد تورات اور قرآن ہیں۔

اس لیے کہ اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ ﴾ اللہ تعالیٰ تورات اور قرآن کے درمیان بہت قِران فرماتا ہے، یعنی ان کو ساتھ ساتھ رکھتا ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [الأنعام: ۹۱] ''کہہ دیجیے: پھر وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جسے موسیٰ لائے تھے، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی۔'' یہاں تک کہ فرمایا: ﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ ﴾ [الأنعام: ۹۲] ''اور یہ کتاب (قرآنِ مجید)، ہم نے اسے نازل کیا ہے، یہ برکت والی ہے۔'' اور آخر سورت میں فرمایا: ﴿ ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْۤ اَحْسَنَ ﴾ [الأنعام: ۱۵٤] ''پھر ہم نے موسیٰ کو اس لیے کتاب دی کہ جو شخص اچھے کام کرے اس پر ہماری نعمتیں پوری ہوں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۱۵۵] ''اور یہ (قرآن) ایک عظیم کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا ہے، (یہ) برکت والی ہے، پھر تم اس کی پیروی کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اور جنوں نے کہا: ﴿ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ [الأحقاف: ۳۰] ''بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، وہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں۔'' اور ورقہ بن نوفل نے کہا: ''هٰذَا النَّامُوسُ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى مُوسٰى'' ''یہ تو وہی ناموس ہے جسے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا گیا تھا۔''

اربابِ دانش و بینش کو یہ بات لازمی طور پر اور واضح طور پر معلوم ہے کہ اللہ پاک نے جو متعدد کتابیں اپنے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائی ہیں، ان میں کوئی ایسی کتاب آسمان سے نازل نہیں کی جو اس کتاب سے زیادہ مکمل، اشمل فصیح، عظیم اور باعزت ہو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، یعنی قرآن شریف، اور اس کے بعد شرف اور عظمت میں وہ کتاب ہے جو موسیٰ بن عمران علیہ السلام پر نازل فرمائی، یہ وہی کتاب ہے جس کے حق میں اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ﴾ [المائدۃ: ٤٤] ''بے شک ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے ذریعے سے فیصلے کرتے تھے انبیاء جو اللہ کی اطاعت کرنے والے تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی تھے اور اللہ والے اور علماء فیصلے کرتے تھے، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے نگران بنائے گئے تھے اور وہ اس پر گواہ تھے۔''

---

[1] تفسیر الطبري (۱۹/ ۵۸۸۔ ۵۹۰) تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۲۹۸٤۔۲۹۸٦)

اور انجیل جو نازل کی گئی وہ تورات کو تمام کرنے والی اور ان بعض اشیاء کو حلال کرنے والی تھی جو بنی اسرائیل پر حرام کی گئی تھیں، اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی اگر تم اس باطل میں سچے ہو جس کے ساتھ تم حق کا مقابلہ کرتے ہو اور اس کی مدافعت کرتے ہو تو کوئی ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت والی ہے میں اس کی پیروی کروں گا۔

اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ ﴾ یعنی پھر اگر وہ جواب نہ دیں تم کو اس بات کا جو تو نے ان سے کہی ہے اور حق کا اتباع نہ کریں۔ ﴿ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ تو تو جان لے کہ وہ اپنی خواہشوں کی بغیر کسی دلیل اور حجت کے پیروی کرتے ہیں۔ ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ یعنی اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اپنی خواہش کی بغیر حجت کے پیروی کرے، ایسی حجت جو اللہ کی کتاب سے ماخوذ ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ”فَصَّلْنَا“ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ”بَيَّنَّا لَهُمُ الْقَوْلَ“ یعنی تفصیل کی ہم نے، یا بیان کی ہم نے ان کے واسطے بات۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تو ان کو خبر دے کہ اس نے اگلے لوگوں کے ساتھ کیسا کیا اور کیسا کرنے والا ہے۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَصَّلْنَا لَهُمُ ﴾ کی ضمیر سے مراد قریش ہیں۔ ظاہر قول یہی ہے۔ لیکن حماد بن سلمہ نے عن عمرو بن دینار عن یحییٰ بن جعدہ عن رفاعہ روایت کیا ہے، یہ رفاعہ ابن قرظہ القرظی ہے۔ امام ابن مندہ رحمہ اللہ نے اس کو رفاعہ بن شموال قرار دیا ہے۔ صفیہ بنت حیی کا ماموں، یہ وہ شخص ہے، جس نے تمیمہ بنت وہب کو طلاق دی، جس سے اس کے بعد عبد الرحمن بن زبیر بن باطا نے بیاہ کیا۔ امام ابن اثیر رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ غرضیکہ رفاعہ نے کہا: ﴿ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ ﴾ دس آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان میں سے ایک میں ہوں۔[1] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم من حديثه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ پھر جب مکے والوں کے پاس اللہ کے پاس سے حق آیا، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن شریف جو آپ پر نازل ہوا تو عیب جوئی اور سرکشی اور باطل کے ساتھ جھگڑنے کے لیے بولے کہ یہ رسول ان نشانیوں کی طرح کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئیں، جیسے: عصا اور یدِ بیضا وغیرہ، یا تورات شریف جو ایک ہی دفعہ میں پوری نازل ہوئی؟ اللہ پاک نے اس کا یہ جواب ارشاد فرمایا: کیا انھوں نے اس شے کا انکار نہیں کیا جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی اس قول سے قبل، یا محمد رسول اللہ ﷺ کے ظہور سے قبل۔

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٥٩٣_ ٥٩٤) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٨٧_ ٢٩٨٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٦_ ٥١٨)

معنی یہ ہیں کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی نشانیوں کا بھی انکار کیا، جیسے محمد ﷺ کی آیتوں کا انکار کیا، اس لیے انھوں نے یوں کہا: "سَاحِرَانِ تَظَاهَرَا" یہ جملہ مستانفہ ہے ان کے کفر اور عناد کی تقریر کے لیے لایا گیا۔ "سَاحِرَانِ" سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ ہیں۔ "تَظَاهَرَا" بہ معنی تعاون ہے، یعنی سحر پر باہم ایک نے دوسرے کی مدد کی ہے۔ ﴿ اَوَ لَمْ يَكْفُرُوْا ﴾ میں ضمیر قریش کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہود کی طرف۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ یہود موسیٰ علیہ السلام کو سحر کے ساتھ موصوف نہیں کرتے ہیں، اس کے ساتھ کفارِ قریش اور ان جیسے اور لوگ ہی موصوف کرتے ہیں، مگر ہاں وہ لوگ جو موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، جیسے: فرعون اور اس کی قوم، کیوں کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو سحر کے ساتھ موصوف کیا ہے، لیکن یہ لوگ یہود میں سے نہیں ہیں۔

ممکن ہے کہ ضمیر ان لوگوں کی طرف راجع ہو جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور جو نبی اکرم ﷺ کے منکر ہوئے، کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام کے منکرین نے ان کو سحر کے ساتھ موصوف کیا ہے اور اسی طرح نبی کریم ﷺ کے منکروں نے آپ ﷺ کو سحر کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: کیا نہیں انکار کیا ان یہودیوں نے جو نبی اکرم ﷺ کے وقت میں تھے عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کی بشارت کا، جو موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی آپ سے پہلے؟ جمہور نے "سَاحِرَانِ" پڑھا ہے اور کوفیوں نے ﴿ سِحْرَانِ ﴾۔ مراد تورات اور قرآن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انجیل اور قرآن۔ پہلا قول امام فراء رحمہ اللہ کا ہے اور دوسرا ابو زید رحمہ اللہ کا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَوَ لَمْ يَكْفُرُوْا ﴾ کی ضمیر یہود کی طرف راجع ہے۔ "سَاحِرَانِ" سے ان کی مراد عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ اہلِ کتاب ہیں۔[2]

﴿ وَ قَالُوْۤا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی بولے کہ ہم تو ہر ایک کے منکر ہیں، موسیٰ علیہ السلام اور محمد مصطفیٰ ﷺ کے۔ یا موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے۔ یا موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے۔ یا عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے۔ یہ مختلف اقوال کی بنا پر ہے۔ یہ جمہور کی قراءت پر ہے۔ رہی دوسری قراءت تو اس کی بنا پر تورات اور قرآن مراد ہے، یا انجیل اور قرآن۔ پہلے جملے میں جو دو نبیوں یا دو کتابوں کو "سحر" کے ساتھ موصوف کیا ہے تو اس جملے میں اس کی تقریر اور تاکید ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے نبی کریم کو امر کیا کہ ان سے ایک ایسی بات کہہ دیں جس سے ان کی عاجزی ظاہر ہو جائے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ ﴾ یعنی اے محمد! تو ان سے کہہ دے کہ جبکہ تم ان دو کتابوں پر ایمان نہ لائے اور اُن کے بارے میں تم نے کہا جو کچھ کہا تو اب تم کوئی کتاب اللہ کے پاس سے لاؤ، جو خلق کی ہدایت کے لیے تورات اور قرآن سے زیادہ واضح اور ظاہر ہو، میں اس کی اتباع کروں گا۔ ﴿ اَتَّبِعْهُ ﴾ امر کا جواب ہے، جمہور قراء نے اسی بنا پر اس کو جزم دیا ہے۔ امام زید بن علی رحمہ اللہ نے برفع

[1] فتح القدير (٤/ ٢٣٤)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٨٦)

پڑھا ہے استیناف کی بنا پر، یعنی پھر اگر تم اس کو لاؤ گے تو میں اس کا اتباع کروں گا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قراءت کی بنا پر وہ کتاب کی صفت ہے۔[1] اس کلام میں ان کے ساتھ استہزاء اور مذاق ہے۔ نیز اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ کوفیوں کی قراءت قوی تر ہے جمہور کی قراءت سے، کیوں کہ کلام کتابوں کی طرف رجوع ہوا ہے نہ کہ رسولوں کی طرف۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی اگر تم اس بات میں سچے ہو جس کے ساتھ تم نے رسولوں کا یا کتابوں کا وصف کیا۔

﴿ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ ﴾ یعنی پھر اگر وہ اس بات کو نہ کریں جس کی ان کو تکلیف دی ہے کہ کوئی ایسی کتاب لاؤ جو ہدایت میں دونوں کتابوں سے بڑھ کر ہو۔ یہ اس آیت کے مثل ہے: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا ﴾ [البقرة: ٢٤] ''چناں چہ اگر تم (یہ کام) نہ کر سکو۔'' کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ پھر اگر وہ تیرا کہا نہ مانیں، اس طرح سے کہ جو شے تو لے کر آیا ہے، اس پر ایمان لائیں۔ شرط کا جواب ﴿ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ ہے، یعنی تو تو جان لے کہ وہ جو پیروی کرتے ہیں تو اپنے آرائے زائغہ کی جو حق سے مائل ہیں اور اپنے استحساناتِ زائفہ کی بغیر حجت اور دلیل کے۔ مطلب یہ ہے کہ جن امور کو اپنے ذہن میں اچھا سمجھ رکھا ہے اور نفس الامر میں وہ ناسرہ اور کھوٹے بے کار ہیں، انہیں کے پیرو ہوتے ہیں۔ کلمۂ ﴿ اَنَّمَا ﴾ آلۂ حصر ہے، اس لیے یہ معنی ہوئے کہ اس باب میں اُن کے لیے کوئی سند اور دستاویز نہیں ہے کہ اس سے تمسک کریں، صرف اُن کے لیے محض ان کی فاسد خواہش ہے۔

﴿ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ ﴾ کا مفعول محذوف ہے: "أَيْ: دُعَاءَكَ إِلَى الْإِتْيَانِ بِالْكِتَابِ الْأَهْدٰى"۔ حذف کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ معلوم ہے، کیوں کہ "اِسْتَجَابَ" بہ معنی "أَجَابَ" ہے اور یہ ضرور دعا کا متقضی ہوتا ہے اور اس کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہاں نبی کریم ﷺ کی طرف سے دعا کہاں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ان کو یہ حکم کرنا کہ ﴿ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ یہی دعا ہے، کیوں کہ امر کرنا گویا فعل پر آمادہ کرنا ہے اور اس کی طرف بلانا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فعل "استجابة" خود دعا کی طرف متعدی ہوتا ہے تو یوں بولتے ہیں: "اِسْتَجَابَ دُعَاءَهُ" اور لام کے حرف کے ساتھ داعی کی طرف متعدی ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں: "اِسْتَجَابَ لَهُ"، پھر جب داعی کی طرف متعدی ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے تو دعا غالباً محذوف ہوتی ہے۔ "اِسْتَجَابَ لَهُ دُعَاءَهُ"، نہیں بولتے مگر شاذ و نادر۔ چنانچہ آیت میں بھی عرفِ غالب کے اتباع میں دعا حذف کر دی گئی ہے۔ یعنی پھر اگر وہ جواب نہ دیں تجھ کو تیرے بلانے کا اس بات میں جس کی طرف تو ان کو بلاتا ہے اور تورات، انجیل اور فرقان کے مثل نہ لائیں تو تو جان لے کہ وہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور جس کفر کا انھوں نے ارتکاب کیا ہے، اس میں ان کے لیے کوئی حجت اور برہان نہیں ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٣٤)

اب جو انھوں نے اپنی خواہش کو اختیار کیا اور ہدایت کو چھوڑ دیا تو اللہ پاک نے اس پر ان کی مذمت فرمائی اور یہ ارشاد کیا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ استفہام انکاری بہ معنی نفی ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں ہے، جو اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے، بلکہ وہی شخص گمراہی میں کامل ہے۔ ﴿ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ موضع حال میں ہے تاکید کے واسطے، کیوں کہ نفسانی خواہش اللہ کی ہدایت کے بغیر ہوتی ہے۔ یا تقیید کے واسطے ہے، اس لیے کہ نفسانی خواہش کبھی حق کے موافق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قید سے اس خواہش کو خارج کر دیا جو حق کے مخالف ہو۔ بالجملہ شیخ زادہ رحمہ اللہ آیتِ کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ”وَهٰذَا مِنْ أَعْظَمِ الدَّلَائِلِ عَلٰى فَسَادِ التَّقْلِيْدِ وَأَنَّهُ لَا بُدَّ مِنَ الْحُجَّةِ وَالِاسْتِدْلَالِ“

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی جو لوگ نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں، اس طریقے سے کہ اللہ کے نبیوں کو جھٹلاتے ہیں اور اللہ پاک کی آیتوں سے منہ موڑتے ہیں، بے شک اللہ پاک ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ ﴿ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ ﴾ جمہور نے بہ تشدیدِ صاد اور حسن نے بہ تخفیف پڑھا ہے، معنی یہ ہیں کہ ”أَتْبَعْنَا بَعْضَهُ بَعْضًا“ یعنی ہم بعض قول کو بعض کے پیچھے لائے ہیں اور ایک رسول کو بعد رسول کے مبعوث کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ پند و نصیحت کو اور رسولوں کو یکے بعد دیگرے لاتے رہے ہیں۔ امام ابو عبیدہ اور اخفش رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَصَّلْنَا ﴾ بہ معنی ”أَتْمَمْنَا“ ہے۔ امام ابن عیینہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا: بہ معنی ”بَيَّنَّا“۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے ان کے لیے دنیا کی خیر آخرت کی خیر کے ساتھ ملائی، یہاں تک کہ گویا انھوں نے دنیا ہی میں آخرت کا معائنہ کر لیا۔[1] پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

جمہور کی قراءت یا تو ماخوذ ہے وصلِ حبال سے کہ بعض رسّی بعض کے ساتھ ملائی جاتی ہے، تاکہ پکی اور مضبوط ہو جائے۔ یا یہ معنی ہیں کہ کیا ہم نے قول کو اَوصال، یعنی معانی کی کئی قسمیں۔ یہ امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو متنوع کیا، یعنی کئی قسمیں، اس میں وعدے ہیں، وعید و قصے ہیں، عبرتیں، وعظ اور نصیحتیں ہیں۔[2] قاضی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے اس کے بعض کو بعض کے تابع کیا نازل کرنے میں، تاکہ تذکیر، یعنی نصیحت متصل ہو جائے یا نظم میں، تاکہ دعوت حجت کے ساتھ ثابت ہو جائے اور مواعظ مواعید کے ساتھ اور نصیحتیں عبرتوں کے ساتھ متصل ہو جائیں۔[3] انتھیٰ۔ ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر قریش کی طرف راجع ہے، یا یہود کی طرف، یا سب کی طرف۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی یہ سب اس لیے کیا کہ شاید وہ غور کریں اور یہ غور کرنا ان کے ایمان کا سبب ہو جائے، اس خوف سے کہ جو عذاب پہلی قوموں پر نازل ہوا، وہی ان پر نازل ہو۔[4]

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٢٩٥)
[2] تفسیر أبي السعود (٧/ ١٨)
[3] تفسیر البیضاوي (٤/ ٢٩٧)
[4] فتح البیان (١٠/ ١٢٨۔ ١٣١)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾
وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا
مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ
بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾
وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ
اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾

وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں (52) اور جب ان پر (قرآن) تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بلاشبہ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے (53) ان لوگوں کو ان کا دو بار اجر دیا جائے گا، کیوں کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (54) اور جب وہ بے ہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں، تمھیں سلام ہو، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے (55)

اہلِ کتاب کے مومنوں کا ذکر:

یہ حبشہ کے نصاریٰ تھے نجاشی کے ساتھی، اس قرآن کو سن کر ایمان لائے۔ جس جاہل سے توقع نہ ہو کہ وہ سمجھانے سے سمجھ جائے گا تو اس سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ انتہٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے اہلِ کتاب کے علماء اور اولیاء کے بارے میں کہ وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۱۲۱] ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۹] ''اور بے شک اہلِ کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا، اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ

يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿107﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۷۔ ۱۰۸] ''کہہ دیجیے: اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، بلاشبہ جنھیں اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿82﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ [المائدة: ۸۲۔ ۸۳] ''(اے نبی!) یقیناً آپ لوگوں میں اہلِ ایمان سے عداوت رکھنے میں سخت ترین یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے، اور اہلِ ایمان سے دوستی رکھنے میں ضرور قریب ترین ان لوگوں کو پائیں گے جنھوں نے کہا: بے شک ہم نصاریٰ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بے شک ان میں کچھ عالم ہیں، کچھ دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے ہیں اور یہ کہ وہ غرور نہیں کرتے۔ اور جب وہ رسول پر نازل کیا گیا کلام سنتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، لہٰذا تو ہمارے نام (حق کی) گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔''

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قسیسین کے ستر آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ نجاشی نے ان کو بھیجا تھا، پھر جس وقت وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے ﴿ يٰسٓ ﴿1﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴾ [يٰسٓ: ۱۔ ۲] ''یٰس۔ قسم ہے قرآنِ حکیم کی۔'' ان پر پڑھا، یہاں تک کہ اس کو ختم فرمایا، چنانچہ وہ لوگ رونے لگے اور مسلمان ہوئے اور انہی کے حق میں یہ دوسری آیت نازل ہوئی: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿52﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴾[1] یعنی ہم اس قرآن سے قبل توحید کرنے والے اور اللہ کے لیے اخلاص کرنے والے تھے اور اس کا کہنا ماننے والے تھے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ ﴾ یعنی یہ لوگ جو اس صفت کے مالک ہیں، جو پہلی کتاب پر ایمان لائے، پھر دوسری کتاب پر اور اسی لیے فرمایا: ﴿ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ یعنی اپنا دوہرا اجر پائیں گے اس سبب سے کہ انھوں نے حق کی پیروی کرنے پر صبر کیا، اس لیے کہ ایسے امر کی مشقت اُٹھانا، جانوں کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تین شخص ہیں جو اپنا اجر دوہرا دیے جائیں گے: ایک وہ شخص اہلِ کتاب میں سے جو اپنے نبی پر ایمان لایا، پھر مجھ پر ایمان لایا۔ دوسرے وہ غلام مملوک

[1] تفسير ابن كثير (۳/ ۵۱۸)

جس نے اللہ کا حق ادا کیا اور اپنے موالی کا حق ادا کیا اور تیسرا وہ شخص جس کی ایک لونڈی تھی، اس نے اس کو ادب سکھایا، پھر اس کی اچھی طرح تادیب کی، پھر اس کو آزاد کیا، پھر اس سے نکاح کر لیا۔[1] (رواه في الصحيح من حديث عامر الشعبي عن أبي بردة عنه)

امام احمد رحمہ اللہ نے قاسم بن ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بے شک میں فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کے نیچے تھا، پس آپ نے ایک بہت ہی اچھا اور حسین قول فرمایا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں یہ فرمایا ہے کہ جو شخص اہلِ کتابین میں سے اسلام لائے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور اس کے لیے وہ ہے جو ہمارے لیے ہے اور اس پر وہ ذمے داری ہے جو ہم پر ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ ﴾ یعنی برائی کا مقابلہ اس جیسی برائی کے ساتھ نہیں کرتے، بلکہ معاف کرتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جو حلال رزق ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اللہ کی خلق پر اور نفقاتِ واجبہ پر، یعنی وہ خرچ جو واجب ہیں، اپنے اہل وعیال اور قریبی رشتے داروں کے لیے اور فرض اور مستحب زکات پر اور من جملہ تطوعات وصدقات، نفل و قربات، یعنی نفلی صدقات اور قربانیوں پر خرچ کرتے ہیں۔

﴿ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ ﴾ یعنی نکمی اور لغو بات والوں سے ملتے جلتے نہیں ہیں، نہ ان سے خلط ملط رکھتے ہیں، بلکہ ان کا حال ایسا ہے جیسا اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ [الفرقان: ٧٢] ''اور جب کسی لغو اور بیہودہ کام سے ان کا گزر ہو تو وہ عزت و وقار سے گزر جاتے ہیں۔'' نیز کہتے ہیں: ﴿ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ یعنی جس وقت کوئی کم عقل اور احمق ان پر سفاہت (بے وقوفی کی بات) کرتا ہے اور ناحق اُن سے اُلجھتا ہے اور ان سے ایسی باتیں کرتا ہے جن کا جواب دینا اُن کے شایانِ شان نہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور اس جیسی بری بات سے اس کا مقابلہ نہیں کرتے۔

ان سے صرف صاف ستھری بات ہی صادر ہوتی ہے، اسی لیے اللہ پاک نے ان کی طرف سے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں: ﴿ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ یعنی ہم جاہلوں کا طریقہ نہیں چاہتے ہیں نہ ہی اس کو پسند کرتے ہیں۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حبشہ سے بیس یا اس کے قریب تعداد میں نصاریٰ آئے، جب ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکے میں تھے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں پایا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے، پھر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٤)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٥٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٤)

آپ ﷺ سے باتیں کیں اور سوال کیے اور قریش کے کچھ لوگ کعبہ کے گرد اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔

نصرانیوں نے رسول اللہ ﷺ سے جو پوچھنا تھا پوچھ چکے تو آپ ﷺ نے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ان پر قرآن شریف پڑھا، جب انھوں نے قرآن شریف سنا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر انھوں نے اللہ کا کہا مانا اور اس پر ایمان لے آئے اور اس کی تصدیق کی اور اس کا حال جو اُن کی کتاب میں ان کے لیے بیان کیا جاتا تھا، اس کو اس سے پہچان لیا، پھر جب وہ آپ ﷺ کے پاس سے کھڑے ہوئے تو ابو جہل بن ہشام قریش کی ایک جماعت میں سے اُٹھ کر اُن کے پاس آیا اور اُن سے کہا: ”خَيَّبَكُمُ اللّٰهُ مِنْ رَكْبٍ، بَعَثَكُمْ مَنْ وَّرَاءَكُمْ مِنْ أَهْلِ دِيْنِكُمْ تَرْتَادُوْنَ لَهُمْ لِتَأْتُوْهُمْ بِخَبَرِ الرَّجُلِ فَلَمْ تَطْمَئِنَّ مَجَالِسُكُمْ عِنْدَهُ حَتّٰى فَارَقْتُمْ دِيْنَكُمْ وَصَدَّقْتُمُوْهُ فِيْمَا قَالَ، مَا نَعْلَمُ رَكْبًا أَحْمَقَ مِنْكُمْ أَوْ كَمَا قَالُوْا لَهُمْ، فَقَالُوْا لَهُمْ: سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نُجَاهِلُكُمْ، لَنَا مَا نَحْنُ عَلَيْهِ وَلَكُمْ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ لَمْ نَأْلُ أَنْفُسَنَا خَيْرًا“

یعنی نا امید کرے اللہ تمھارے قافلے کو، تمھارے اہلِ دین جو تمھارے پیچھے ہیں، انھوں نے تو تم کو بھیجا کہ تم ان کے لیے جستجو کرو، تاکہ اس شخص کی خبر اُن کے پاس لے جاؤ، پس ابھی تمھاری مجلسوں نے اس کے پاس جماؤ نہیں پکڑا، ابھی جم کر نہیں بیٹھے، یہاں تک کہ تم نے اپنے دین سے مفارقت کی، اس کو چھوڑ ہی بیٹھے اور اس کی اس بات میں تصدیق ہی کر لی، جو اُس نے کہہ دی، ہم نہیں جانتے کہ کوئی قافلہ تم سے بڑھ کر بے وقوف ہو، یہ الفاظ ہیں یا جیسا انھوں نے ان سے کہا ہو، پس نصرانیوں نے قریش سے کہا: تم کو سلام ہے ہم تمھارے ساتھ ہلکا پن نہیں کرتے، ہم جس حال پر ہیں وہ ہمارے واسطے ہے اور تم جس حال پر ہو وہ تمھارے واسطے ہے، ہم نے تو اپنی جانوں کی خیر اور بھلائی میں کسی طرح کا قصور اور کمی نہیں کی۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا یہ گروہ نجران والوں میں سے تھا، اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کون سا تھا، یعنی حبشہ کا تھا یا نجران کا تھا۔ واللہ أعلم۔ کہ انہیں کے حق میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿52﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿53﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿54﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ کہا: میں نے امام زہری رحمہ اللہ سے ان آیتوں کے بارے میں پوچھا کہ کن لوگوں کے بارے میں اتری ہیں؟ تو کہا کہ میں ہمیشہ اپنے علماء سے سنتا رہا ہوں کہ نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی ہیں اور وہ آیتیں جو سورۃ المائدہ میں ہیں: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿82﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾[1] [المائدة: ٨٢۔ ٨٣]

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢/ ٢٣٦۔ ٢٣٧) تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٨۔ ٥١٩)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا پختہ بیان یہ ہے کہ ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور موصول مبتدا ہے اس کی خبر ﴿ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ ہے۔ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک طائفہ قرآن پر ایمان لایا، جیسے: عبداللہ بن سلام اور اہلِ کتاب میں باقی لوگ جو مسلمان ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ کی ضمیر محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور ﴿ هُمْ بِهٖ ﴾ کی ضمیر پہلے قول کی بنا پر قرآن کی طرف راجع ہے اور دوسرے قول کی بنا پر نبی کریم ﷺ کی طرح راجع ہے۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں، جو اہلِ کتاب میں سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے۔[1] امام خازن رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت اسّی (۸۰) آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان میں سے چالیس نجران کے تھے اور بتیس حبشہ کے اور آٹھ شام کے۔[2] واللہ أعلم.

﴿ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ ﴾ یعنی جس وقت قرآن شریف ان پر پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے اس کی تصدیق کی۔ جملہ ﴿ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ ﴾ مستأنفہ ہے، جو شے ان کے ایمان کا موجب ہوئی اس کے بیان کے لیے لایا گیا ہے، یعنی بے شک قرآن وہ حق ہے جس کو ہم پہچانتے ہیں، یہ ہمارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ جملہ ﴿ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴾ دوسرا استیناف ہے، اس سے غرض یہ بتانا ہے کہ قرآن پر ان کا ایمان اس قسم سے نہیں ہے کہ اس وقت انھوں نے اس کا احداث کیا، وہ تو ایک قدیم امر ہے، اس لیے کہ انھوں نے اس کا ذکر اگلی کتابوں میں دیکھا ہے اور اس کا ذکر کہ وہ دینِ اسلام پر ہیں، قرآن کے نازل ہونے یا قرآن کی تلاوت سے بھی پہلے، اس لیے کہ وہ اس کے صحیح ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔[3] (كذا ذكر القاضي)

فتح القدیر اور فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم توحید کو اللہ کے لیے خالص کرنے والے تھے، یا نبی اکرم ﷺ پر اور جس شے کو وہ لائے اس پر ایمان لانے والے تھے۔ اس لیے کہ ہم اُن کے ذکر کو جانتے ہیں، تورات اور انجیل میں ان کی خوش خبری دی گئی ہے اور وہ آخر زمانے میں مبعوث ہوں گے اور ان پر قرآن نازل ہوگا۔[4]

﴿ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ ﴿ مَّرَّتَيْنِ ﴾ منصوب ہے بنا بر مصدر اور حرفِ با مصدریہ ہے اور حرفِ با ﴿ يُؤْتَوْنَ ﴾ سے متعلق ہے یا نفسِ اجر سے۔ (كذا ذكره السمين) فتح القدیر اور فتح البیان میں کہا ہے کہ سببیہ ہے، یعنی یہ لوگ جو اِن صفتوں کے ساتھ موصوف ہیں اپنا اجر دوہرا دیے جائیں گے، ان کے ایمان پر صبر اور ثابت قدم رہنے پر پہلی کتاب کے ساتھ اور دوسری کتاب کے ساتھ اور پہلے نبی پر ایمان لانے اور پھر

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٢٣) [2] تفسير الخازن (٥/ ١٧٧)

[3] تفسير البيضاوي (٤/ ٢٩٧) [4] فتح القدير (٤/ ٢٣٥) فتح البيان (١٠/ ١٣٢)

دوسرے نبی پر ایمان لانے کی وجہ سے۔ یا اس لیے کہ دونوں کتابوں پر عمل کیا، یا اس لیے کہ قرآن شریف کے ساتھ ایمان لانے پر جمے رہے، اس کے نزول سے پہلے اور بعد، یا اس لیے کہ انھوں نے مشرکوں اور اہلِ کتاب اور اُن لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر کیا جنھوں نے ان کے اہلِ دین میں سے ان کو ایذا پہنچائی۔

﴿ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ ﴾ ''درء'' دفع کرنے کو کہتے ہیں، یعنی برداشت کر کے اور اچھی بات کر کے اس ایذا کو دفع کرتے ہیں جو اُن کو پہنچتی ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ طاعت کے ساتھ معصیت کو، یا توبہ و استغفار کے ساتھ گناہوں کو، یا لا الہ الا اللہ کی شہادت کے ساتھ شرک کو دفع کرتے ہیں۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ یعنی جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس مال میں سے طاعات میں اور اس شے میں خرچ کرتے ہیں جس کا شارع نے امر کیا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کی یہ تعریف کی کہ لغو باتوں سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ ﴾ یعنی جب لغو سنتے ہیں تو تکرم و تنزہ کر کے شرعی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے متادب ہو کر اس سے منہ موڑتے ہیں، اس جگہ لغو سے مراد یہ ہے کہ مشرک لوگ جو ان کو اور ان کے دین کو گالیاں دیتے ہیں اور ان سے مسخرا پن کرتے ہیں، تو اس سب کو سن کر درگزر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ﴿ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ﴾ یعنی تمھارے کفر کے ضرر سے نہ ہم کو کچھ پہنچتا ہے اور نہ ہمارے ایمان کے نفع سے تم کو کچھ پہنچتا ہے۔

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ﴾ اس سلام سے مراد سلامِ تحیت نہیں ہے، اس سے مراد سلامِ متارکت ہے اور منہ پھیرنے اور الگ ہونے کا سلام ہے، معنی یہ ہیں کہ ہماری طرف سے تم کو امن و سلامتی ہے، ہم نہ تم کو جواب دیتے ہیں اور نہ جس حال میں تم ہو اس میں تم سے لڑتے ہیں اور نہ تمھارے لغو کا لغو سے مقابلہ کرتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قتال کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی ہے۔[1] ﴿ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم جاہلوں کی صحبت طلب نہیں کرتے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ہم نہیں چاہتے کہ ہم جہالت اور کم عقلی والوں سے ہوں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم تمھارے دین کو دوست نہیں رکھتے، جس پر تم ہو۔[2]

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۵۶ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۵۷

(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت

[1] معاني القرآن (٤/ ١٤٩)
[2] فتح القدير (٤/ ٢٣٥) فتح البيان (١٠/ ١٣١_ ١٣٣)

دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے⑤⑥ وہ (مشرکینِ مکہ) کہتے ہیں: اگر ہم نے تیرے ساتھ ہدایت کی پیروی کی تو ہمیں ہماری زمین سے اُچک لیا جائے گا، کیا ہم نے انھیں پر امن حرم میں جگہ نہیں دی، جس کی طرف ہر قسم کے پھل ہماری طرف سے بطور رزق کھینچ کر لائے جاتے ہیں؟ لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے⑤⑦

اللہ تعالیٰ جسے چاہے اسے ہدایت دے:

نبی اکرم ﷺ نے اپنے چچا کے لیے سعی کی کہ وہ مرتے وقت ہی کلمہ پڑھ لے، اس نے قبول نہیں کیا، اس پر یہ آیت اتری۔ یہ مکے کے لوگ کہنے لگے کہ اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو سارے عرب دشمن بن جائیں۔ اللہ نے فرمایا: اب ان کی دشمنی سے کس کی پناہ میں بیٹھے ہو، یہی حرم کا ادب ہے، وہی اللہ تب بھی پناہ دینے والا ہے۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک اپنے رسول ﷺ سے فرماتا ہے: تو ہدایت نہیں دے سکتا جس کو چاہے، یعنی راہ پر لانا تیری طرف نہیں ہے، تجھ پر تو پہنچا دینے کی ذمے داری ہے۔ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے حکمتِ بالغہ اور حجتِ قاطعہ اسی کے لیے ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرة: ۲۷۲] ''(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمے داری نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔'' اور یہ آیت ان سب سے زیادہ خاص ہے، کیوں کہ اللہ پاک یوں فرماتا ہے: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک ہی خوب جانتا ہے اس شخص کو جو ہدایت کا مستحق ہے اس کی نسبت جو گمراہی کا مستحق ہے۔

صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ ابو طالب آپ کو گھیرے رکھتے، حفاظت کیا کرتے، آپ کی مدد کرتے اور آپ کے حق میں دشمنوں سے لڑنے کو کھڑے ہو جاتے اور آپ ﷺ کے ساتھ طبعی طور پر محبت کرتے تھے، شرعی محبت کی وجہ سے دوست نہیں رکھتے تھے۔ پھر جب ان کی وفات کا وقت آیا اور ان کی اجل آ پہنچی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو ایمان کی طرف بلایا اور دعوت دی کہ اسلام میں داخل ہوں، پس تقدیر نے ان کے حق میں سبقت کی اور آپ ﷺ کے ہاتھ سے ان کو اُچک لیا تو اسی کفر پر قائم رہے جس پر وہ تھے، حکمتِ تامہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: مجھے حدیث بیان کی سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے، یعنی مسیب بن حزن مخزومی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس وقت ابو طالب کی موت حاضر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے تو اُن کے نزدیک

ابوجہل بن ہشام اور عبداللہ بن ابی اُمیہ بن مغیرہ کو پایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَا عَمِّ قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ »یعنی اے چچا! تو لا اِلٰہ اِلا اللہ کا کلمہ کہہ دے کہ میں اس کے سبب سے اللہ کے نزدیک حجت پیش کروں۔ اس پر ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ نے کہا: اے ابو طالب! کیا تو عبدالمطلب کی ملت سے پھرتا ہے؟ پھر رسول اللہ ﷺ اس پر اس کلمے کو پیش کرتے رہے اور وہ دونوں بھی اس سے وہی بات دھراتے رہے۔ یہاں تک کہ آخری بات جو اس نے کہی، وہ یہ تھی کہ "هُوَ عَلٰى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ" اور لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کیا۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: واللہ البتہ میں تیرے لیے مغفرت مانگتا رہوں گا، جب تک کہ منع نہ کیا جاؤں گا تجھ سے۔ پھر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى ﴾ [التوبة: ١١٣] ''پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ رشتے دار ہوں۔'' اور ابو طالب کے حق میں یہ آیت اتاری: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [1] (أخرجاه من حديث الزهري و هكذا رواه مسلم في صحيحه والترمذي من حديث يزيد بن كيسان عن أبي حازم عن أبي هريرة ﷺ) کہا: جب ابو طالب کو وفات حاضر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لائے۔ پھر فرمایا: «يَا عَمَّاهُ قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ أَشْهَدُ لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ » یعنی اے چچا! تو لا الہ الا اللہ کہہ دے میں تیرے واسطے قیامت کے دن اس کی گواہی دوں گا تو ابو طالب نے کہا: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قریش مجھ کو اس بات کے ساتھ عار دلائیں گے اور کہیں گے کہ اس کو اس بات پر صرف موت کی گھبراہٹ نے آمادہ کیا تو میں اس سے ضرور تیری آنکھ ٹھنڈی کرتا۔

اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [2] "وقال الترمذي: حسن غريب لا نعرفه إلا من حديث يزيد بن كيسان، ورواه الإمام أحمد عن يحيىٰ بن سعيد القطان عن يزيد بن كيسان حدثني أبو حازم عن أبي هريرة فذكر بنحوه" نیز اسی طرح ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، شعبی اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر یہ بات پیش فرمائی کہ لا الہ الا اللہ کہے، مگر اس نے آپ ﷺ پر اس کا انکار کیا اور کہا: اے میرے بھتیجے! ملتِ اشیاخ کے اوپر ہی ہوں۔ اور آخری بات جو کہی وہ یہ ہے: "هُوَ عَلٰى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ" [3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٨٨) مسند أحمد (٢/ ٤٣٤)

[3] تفسير الطبري (١٩/ ٥٩٩_ ٦٠٠) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٩٤)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن ابی راشد سے روایت کیا ہے، کہا کہ قیصر کا قاصد میری طرف آیا، کہا کہ میرے پاس ایک خط ہے جو قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لکھا ہے، چنانچہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، پھر میں نے وہ خط دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی گود میں رکھا۔ پھر فرمایا: «مِمَّنِ الرَّجُلُ» یعنی تو کس قبیلے کا ہے؟ میں نے کہا: تیرح کا۔ فرمایا: ''هَلْ لَكَ فِي دِيْنِ أَبِيْكَ إِبْرَاهِيْمَ الْحَنِيْفِيَّةِ'' یعنی کیا تجھ کو اپنے باپ ابراہیم کے دین سے رغبت ہے جو ملتِ حنیفیہ ہے؟ میں نے کہا: میں تو ایک قوم کا قاصد ہوں اور اُن کے دین پر ہوں، یہاں تک کہ ان کی طرف لوٹ کر جاؤں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور اپنے اصحاب کی طرف نظر فرمائی اور فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا ﴾ یعنی جو ہدایت تو لے کر آیا ہے اگر ہم اس کی پیروی کریں اور قبائلِ عرب مشرکین جو ہمارے آس پاس ہیں ان کے مخالف ہوں تو ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ایذا دینے اور ہم سے لڑنے کے لیے قصد کریں گے اور ہم کو اُچک لیں گے جہاں کہیں ہم ہوں، اللہ پاک نے ان کو اس کا یہ جواب دیا: ﴿ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا ﴾ یعنی یہ عذر جو انھوں نے پیش کیا ہے جھوٹ اور باطل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو امن والے شہر اور عظمت والے اور امن دینے والے حرم میں رکھا ہے۔ جب سے وہ مقرر کیے گئے ہیں، انھیں صفتوں کے ساتھ موصوف ہیں۔ پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ حرم ان کے کفر اور شرک کی حالت میں تو اُن کے لیے امن دینے والا ہو اور ان کے لیے اس حالت میں امن دینے والا نہ رہے جب وہ اسلام لے آئیں اور حق کا اتباع کریں۔

﴿ يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ یعنی اس کی طرف کھینچ لائے جاتے ہیں ہر چیز کے میوے، یعنی اس کے آس پاس سے سب میوے، مراد طائف وغیرہ ہے اور اسی طرح متاجر و اَمتعہ، مطلب یہ ہے کہ جس طرح میوہ ہر طرف سے کھینچ کر وہاں لایا جاتا ہے، اسی طرح تجارت کا اسباب و سامان بھی ہر طرف سے لاتے ہیں۔ ﴿ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا ﴾ ''أَيْ: مِنْ عِنْدِنَا'' یعنی روزی ہے ہمارے پاس سے۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ لیکن ان میں سے بہت لوگ نہیں جانتے، اسی لیے کہا جو کچھ کہا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حارث بن نوفل وہ شخص ہے جس نے کہا ہے کہ ﴿ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ﴾[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ تو اس کو ہدایت نہیں دیتا جس کو تو چاہے لوگوں میں سے اور یہ بات تیری

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٩٤) اس کی سند میں ''سعید بن ابی راشد'' مجہول راوی ہے۔

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٥١٩۔ ٥٢٠)

طرف نہیں ہے، لیکن اللہ جس کو ہدایت دینا چاہے اس کو ہدایت دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو ہدایت پانے کے قابل اور لائق اور مستعد ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: مفسروں نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ یہ آیت ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[1] اصول میں یہ بات طے پا چکی ہے کہ عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ چنانچہ ابو طالب بدخولِ اولیٰ اس میں داخل ہے۔ آیت معتزلہ پر حجت ہے، اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہدایت صرف بیان ہے۔ اللہ پاک نے سارے لوگوں کو ہدایت کی، لیکن وہ اپنے سوئے اختیار کی وجہ سے ہدایت یاب نہ ہوئے۔ چنانچہ آیت اس بات پر دال ہے کہ بیان کے بعد ایک اور شے ہے جس کا نام ہدایت رکھا جاتا ہے اور وہ اہتدا کا پیدا کرنا اور توفیق اور قدرت عطا کرنا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى ... الآية﴾ یعنی قریش کے مشرکوں اور اُن کے تابعین نے کہا: اے محمد! اگر ہم تیرے دین میں داخل ہوں اور اس پر عمل کریں تو عرب لوگ ہم کو مکے سے اُچک لیں اور ہم تیزی سے اس سے اُکھاڑ دیے جائیں اور ہم کو ان کے مقابلے کی کسی طرح طاقت نہیں ہے۔ ان کے باطل عذر اور بے کار قسم کے بہانے بہت ہیں، یہ عذر بھی انہیں میں سے ہے۔ "تَخَطُّف" اصل میں تیزی سے اُکھیڑ دینے یا کھینچ لینے کو کہتے ہیں۔ جمہور نے ﴿نُتَخَطَّفْ﴾ کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ شرط کا جواب ہے۔ منقری نے برفع پڑھا ہے بنا بر استیناف۔[2]

پھر اللہ پاک نے ان پر رد کیا اور اس کو ڈانٹ ڈپٹ کے استفہام سے شروع فرمایا ہے اور اُن کے منہ میں پتھر کا لقمہ دیا۔ چنانچہ ارشاد کیا: ﴿اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا﴾ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿نُمَكِّنْ﴾ کو متعدی بہ نفسہٖ اس لیے کہا ہے کہ "نَجْعَلُ" کے معنی میں ہے، چناں چہ اس آیت میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا﴾[3] [العنكبوت: ٦٧] "کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو با امن بنا دیا ہے۔" اور "مکن" بہ نفسہٖ متعدی ہوتا ہے اس کے بغیر کہ "جعل" کے معنی اس میں شامل سمجھے جائیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ﴾ [الأحقاف: ٢٦] "اور یقیناً ہم نے قومِ عاد کو اس چیز کی قدرت دی تھی جس کی تمھیں قدرت نہیں دی۔"

"اٰمن" بہ معنی "مومن" ہے، یعنی جو کوئی اس میں داخل ہوتا ہے، اس کو امن دیا جاتا ہے۔ یا فاعل بہ معنی نسب ہے: "أَيْ: ذَا أَمْنٍ"۔ یا قبیلِ مجاز سے ہے اسناد میں۔ "أَيْ: آمِنًا أَهْلُهُ" امن کا اسناد اہلِ حرم کی طرف حقیقت ہے اور حرم کی طرف مجاز عقلی۔ یہ بات مشہور ہے کہ حرم میں ہرن بھیڑیوں سے بے خوف ہوتے ہیں اور کبوتر چیل سے۔ یعنی کیا نہیں کر دیا ہم نے ان کے مکان کو امن والا کہ اس میں مامون اور محفوظ رہتے ہیں قتل و غارت

[1] معاني القرآن (٤/ ١٤٩) [2] فتح القدير (٤/ ٢٣٦) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٢٣)

سے، حرم کے اردگرد کی جگہوں کے خلاف کہ وہاں بعض عرب بعض کو لوٹتے مارتے ہیں۔ پھر اگر یہ وہم ہو کہ مانا حرم میں امن تو ہے، لوٹ مار سے بے خوفی حاصل ہے، لیکن اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو عرب لوگ دشمنی کی وجہ سے غلہ نہ لائیں گے تو ہم بھوکے مریں گے۔

اللہ پاک نے اس وہم کو دور کرنے کے لیے حرم شریف کی ایک اور صفت بیان فرمائی کہ ﴿ يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ یعنی ایسا امن والا حرم کہ مختلف جگہوں اور زمینوں سے مختلف قسم کے میوے اس کی طرف جمع کیے جاتے ہیں۔ شام، مصر، عراق اور یمن سے اس کی طرف کھینچ کر لاتے ہیں۔ یہاں ﴿ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ سے مراد کثرت ہے بطور مجاز کے، جس طرح کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النمل: ۲۳] ”اور اسے (ضرورت کی) ہر چیز عطا کی گئی ہے۔“ یعنی سلطنت کے لیے جن چیزوں کی حاجت ہوتی ہے وہ بہ کثرت اس کو دی گئی تھیں، یہ مطلب نہیں کہ سارے جہان کی چیزیں اس کو ملی تھیں۔

جمہور نے ﴿ يُجْبٰٓى ﴾ بیائے تحتانی پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ کی تذکیر کا اعتبار کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فعل اور ثمرات کے درمیان حائل موجود ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ثمرات مونث حقیقی نہیں ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے مذکورہ وجوہ کی بنا پر اس قراءت کو اختیار کیا ہے اور نافع نے ثمرات کا اعتبار کر کے بتائے فوقیہ پڑھا ہے، نیز جمہور کی قراءت ﴿ ثَمَرٰتُ ﴾ بہ فتحتین ہے۔ ابان نے بہ ضمتین پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ”ثُمُر“ بہ ضمتین کی جمع ہے اور کسی نے بہ فتحِ ثائے مثلثہ وسکونِ میم پڑھا ہے۔[1]

﴿ رِزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا ﴾ منصوب ہے مفعول مطلق کی بنا پر، اس لیے کہ ﴿ يُجْبٰٓى ﴾ کے معنی ”نَرْزُقُهُمْ“ ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول لہ ہو فعل محذوف کا ”أَيْ: نَسُوْقُهُ إِلَيْهِمْ رِزْقًا“ یا حال ہے ”أَيْ: رَازِقِيْنَ“ یعنی دیتے ہیں ہم ان کو رزق دینا، یا ہم اس کو ان کی طرف کھینچ کر لاتے ہیں رزق کے لیے، یا دراں حالیکہ ہم رزق دینے والے ہیں اپنے پاس سے۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں ان کے اکثر اس کو نہیں جانتے، اپنی زیادہ جہالت اور مزید غفلت کے مارے اور غور وفکر نہ کرنے کی وجہ سے اپنے دوبارہ زندہ ہونے اور ہدایت کی باتوں میں، کیوں کہ وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جن کے دلوں پر اللہ پاک نے مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔[2]

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ

[1] فتح القدير (٤/ ٢٣٦)
[2] فتح البيان (١٠/ ١٣٤۔ ١٣٥)

الْوٰرِثِيْنَ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ۝

اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جو گزرانِ زندگی (اپنے سامانِ زیست) پر اِتراتی تھیں، چناں چہ ان کے یہ گھر (اُجڑے پڑے) ہیں، ان کے بعد بہت تھوڑے ہی آباد ہوئے، اور ہم ہی (ان سب کے) وارث ہوئے (58) اور آپ کا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں، حتی کہ وہ ان کی کسی بڑی بستی میں کوئی رسول بھیجتا ہے، وہ ان پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے، اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر (اسی وقت) جب کہ ان کے باشندے ظالم ہوں (59)

بستیوں کی ہلاکت حجت قائم کرنے کے بعد ہی ہوتی ہے:

اللہ پاک اس قول میں اہلِ مکہ کو تعریض فرماتا ہے، یعنی اشارہ کرتا ہے کہ ہم نے بہت سی بستیاں ہلاک کر دیں، جنھوں نے سرکشی کی اور اترائیں اور جو روزی اور رزق اللہ پاک نے ان کو عطا کیا تھا، اس میں اللہ پاک کی نعمتوں کی ناشکری کی، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١١٢﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ [النحل: ١١٢۔ ١١٣]

”اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو امن و اطمینان سے (آباد) تھی، اس کا رزق اسے ہر جگہ سے وافر (میسر) آتا تھا، پر اس (کے باشندوں) نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے انھیں ان کے کرتوتوں کی وجہ سے بھوک چکھائی اور خوف کا لباس (پہنایا)۔ اور یقیناً ان کے پاس ایک رسول انھی میں سے آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی، تب انھیں عذاب نے آ پکڑا اور وہ ہی ظالم تھے۔“ اسی لیے اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ یعنی عذاب نے ان کو آ پکڑا تو ان کے گھر خالی ہو گئے۔ اب صرف ان کے گھر دکھائی دیتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴾ یعنی وہ گھر آباد ہونے کے بعد اُجاڑ ہو گئے، خالی ویران پڑے ہیں، ان میں کوئی بسنے والا نہیں رہا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ ذکر کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کعب احبار رحمہ اللہ سے سنا، وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہہ رہے تھے کہ سلیمان علیہ السلام نے اُلّو کی مادہ سے کہا: تجھے کیا ہے کہ تو کھیتی کو نہیں کھاتی ہے؟ وہ بولی: اس لیے کہ اس کی وجہ سے آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے۔ فرمایا: پھر تجھے کیا ہے کہ تو پانی

نہیں پٹتی ہے؟ کہا: اس لیے کہ قوم نوح کو اس سے ڈبویا گیا۔ فرمایا: پھر تجھے کیا ہے کہ تو ٹھکانا نہیں پکڑتی ہے مگر اجاڑ کی طرف؟ کہا: اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی میراث ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴾[1]

پردہ داری مے کند بر قصرِ قیصر عنکبوت بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

''مکڑی قیصر کے محل پر دربانی (راز داری) کرتی ہے اور اُلّو افراسیاب کے گنبد پر نقارہ بجاتا ہے۔''

پھر اللہ پاک نے اپنے عدل کی اور اس بات کی خبر دی کہ وہ کسی پر ظلم کر کے اس کو ہلاک نہیں کرتا۔ وہ تو جن کو ہلاک کرتا ہے انھیں قیامِ حجت کے بعد ہلاک کرتا ہے۔ اسی لیے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ﴾ ام القری سے مراد مکہ مکرمہ ہے، اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ نبی اُمی، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ ام القریٰ سے مبعوث ہوئے اور عرب و عجم کی ساری بستیوں کی طرف رسول کر کے بھیجے گئے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ [الأنعام: ٩٢] ''تا کہ آپ ام القریٰ (مکہ) اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرائیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ''کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩] ''تا کہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ١٧] ''اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔'' جامع دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٨] ''اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم یومِ قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں، یا اسے شدید عذاب نہ دیں، یہ کتاب (لوحِ محفوظ) میں لکھا ہوا ہے۔''

اللہ پاک نے خبر دی کہ وہ قیامت سے پہلے ہر بستی کو ہلاک کر دے گا، حالاں کہ وہ فرما چکا ہے: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥] ''اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔'' پس اس نے نبی اُمی کی بعثت کو ساری بستیوں کے لیے شامل ٹھہرایا، اس لیے کہ وہ اُم القریٰ کی طرف مبعوث ہیں اور اس کے اہل کی طرف، جس کی طرف ساری بستیاں رجوع ہوتی ہیں۔ صحیحین میں ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: «بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ»[2] ''مجھے ہر سرخ و سیاہ کی طرف بھیجا گیا ہے۔'' اور اسی لیے آپ ﷺ پر نبوت اور رسالت ختم کی گئی، لہٰذا اب آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی نبی ہے نہ رسول ہے، بلکہ آپ کی شریعت شریف باقی ہے، جس طرح قیامت تک شب و روز باقی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ حَتّٰى يَبْعَثَ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٩٦) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢١)

﴿ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا ﴾ سے مراد اصل قریٰ اور عظیم قریٰ ہے مثل امہاتِ رساتیق و اقالیم کے۔ (''رساتیق'': جمع ہے ''رستاق'' کی، معرب ہے ''روستا'' کا، یعنی سواد اور گاؤں کھیڑے۔ غرض یہ ہے کہ ام القریٰ سے مراد بڑا گاؤں، بڑی بستی، بڑی اقلیم ہے۔ واللّٰہ أعلم) اس قول کو امام زمخشری اور ابن جوزی رحمہما اللہ وغیرہما نے بیان کیا ہے اور کچھ بعید نہیں۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا فاتح بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ قَرْيَةٍ ﴾ سے مراد اہلِ قریہ ہیں، یعنی بہت سی بستیوں والے راحت، آرام، ارزانی اور خوش گزران میں تھے۔ اچھی طرح عیش و عشرت میں خوب کھاتے پیتے مزے اڑاتے تھے۔ کفار نے جو پہلے کہا تھا کہ ﴿ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى ... ﴾ چنانچہ یہ آیت اس کا رد ہے۔ اللہ پاک نے بیان فرمایا ہے کہ معاملہ بالعکس ہے اور وہ اس کے مستحق ہیں کہ اللہ کے عذاب سے ڈریں اور ان کو جو امن اور بے خوفی حاصل ہے اس سے مغرور نہ ہوں، کیوں کہ بہت سی بستی والوں کا حال امن، ارزانی اور عیش و عشرت میں انہیں جیسا حال تھا۔ پھر انھوں نے تکبر، شرارت، سرکشی اور تمرد کیا، یعنی ان سے یہ امور واقع ہوئے تو وہ ہلاک کر دیے گئے۔

﴿ مَعِيْشَتَهَا ﴾ کا نصب ظرفیت کی بنا پر بہ حذفِ مضاف ''أَيْ: بَطِرَتْ فِيْ زَمَنِ مَعِيْشَتِهَا'' یعنی اپنی زندگی کے زمانے میں اِترا گئے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: ''كَفَرَتْ نِعْمَةَ مَعِيْشَتِهَا''۔ مضاف حذف کیا گیا اور معیشت بنا بر ظرف منصوب ہوا، یعنی اپنے ایامِ حیات کی نعمت کی ناشکری کی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ بنا بر اسقاطِ ''فِيْ'' منصوب ہو ''أَيْ: بَطِرَتْ فِيْ مَعِيْشَتِهَا'' پھر جب ''في'' محذوف ہوا تو فعل متعدی ہو گیا، جس طرح کہ ﴿ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ ﴾ [الأعراف: ۱۵۵] میں ہے: ''أَيْ: مِنْ قَوْمِهِ''۔ یہ قول امام زجاج اور مازنی رحمہما اللہ کا ہے،[2] یعنی اپنی معیشت میں اترا گئے۔ معیشت کہتے ہیں اس شے کو جس کے ساتھ گزران کی جاتی ہے نبات و حیوان وغیرہ سے۔

مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو کھا پی کر پہن کر آدمی زندگی بسر کرتا ہے اس کو معیشت بولتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ منصوب ہے بنا بر تمیز۔ اس کی نظیر ﴿ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ﴾[3] [البقرة: ۱۳۰] ''سوائے اس کے جس نے اپنے نفس کو احمق بنا لیا۔'' ہے، لیکن معرفوں کا نصب بنا بر تمیز بصریوں کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ تمیز کے معنی یہ ہیں کہ نکرہ دال ہو جنس پر۔ کسی نے کہا کہ ﴿ بَطِرَتْ ﴾ سے اس بنا پر منصوب ہے کہ ﴿ بَطِرَتْ ﴾ ''جَهِلَتْ'' یا ''خَسِرَتْ'' کے معنی کو متضمن ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ''بَطَرٌ'' نعمت کے وقت طغیان اور سرکشی کو کہتے ہیں۔ قاموس میں ہے: ''اَلْبَطَرُ، مُحَرَّكَةً: النَّشَاطُ، وَالْأَشَرُ، وَقِلَّةُ احْتِمَالِ النِّعْمَةِ، وَالدَّهَشُ، وَالْحَيْرَةُ،

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۲۱) [2] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳۰۰۔ ۳۰۱) [3] فتح القدیر (٤/ ۲۳۸)

وَالطُّغْيَانُ بِالنِّعْمَةِ، وَكَرَاهِيَةُ الشَّيْءِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّسْتَحِقَّ الْكَرَاهَةَ، وَفِعْلُ الْكُلِّ: كَفَرِحَ. وَبَطَرُ الْحَقِّ أَيْ: يَتَكَبَّرُ عِنْدَهُ فَلَا يَقْبَلُهُ"[1] انتهٰی. امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: "عَاشُوْا فِي الْبَطَرِ فَأَكَلُوْا رِزْقَ اللّٰهِ وَعَبَدُوْا الْأَصْنَامَ"[2] یعنی طغیان اور سرکشی میں گزران کی، اس طرح سے کہ روزی تو اللہ پاک کی دی ہوئی کھائی اور پوجا بتوں کو۔

﴿ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ یعنی بہت سی بستیوں والوں نے طغیان اور سرکشی کی، اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ پاک نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ لہٰذا یہ ان کے مساکن اور منازل کے آثار باقی ہیں، سفروں میں لوگ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں، جیسے: بلادِ ثمود اور قومِ شعیب علیہ السلام وغیرہم جو اُن کے ظلم کی وجہ سے ویران اور برباد پڑے ہیں، ان کے بعد اُن میں کوئی نہ بسا مگر تھوڑا زمانہ، جیسے: وہ شخص جو مسافر ہو کر وہاں سے گزرتا ہے تو دن بھر یا دن سے کم وقت کے لیے اُن میں ٹھہرتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ لوگ باقی نہیں رہے جو ان میں بسیں مگر تھوڑے دن، گناہوں کی اس بدبختی اور نحوست کے سبب سے جو ان میں واقع ہوئے ہیں۔ یا استثناء راجع ہے مساکن کی طرف، یعنی وہ گھر اپنے لوگوں کے ہلاک ہونے کے بعد نہیں بسے مگر تھوڑے گھر اور اکثر ویران اور برباد ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ یہ قول ضعیف ہے۔[3] جملہ ﴿ لَمْ تُسْكَنْ ﴾ کا محل رفع ہے اس بنا پر کہ ﴿ تِلْكَ ﴾ کی خبرِ ثانی ہے۔ یا محلِ نصب میں ہے بنا برحال۔ ﴿ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴾ یعنی اور ہم ہی اُن کے وارث ہوئے ان سے، کیوں کہ انھوں نے کوئی وارث نہیں چھوڑا کہ ان کے گھروں اور اموال کا وارث ہو اور نہ کوئی ان کا خلیفہ ہوا کہ ان کے دیار وغیرہ میں ان کی طرح تصرف کرے۔

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ﴾ عادتِ ربانی کا بیان ہے، یعنی اللہ پاک کے حکمِ ماضی وقضائے سابق میں یہ بات صحیح اور ثابت نہیں ہے کہ وہ ایسی بستیوں کو جن کے لوگ کافر ہوں ان کے انذار سے پہلے، یعنی ان کو ڈر سنانے سے پہلے ہلاک کرنے والا ہو، یہاں تک کہ ان کی بڑی بستیوں میں رسول کو بھیجے جو ان کو ڈرائے اور اُن پر ہماری آیتیں پڑھے، جو اس شے کو بیان کرتی ہیں جو اللہ نے ان پر واجب کی ہے اور ثواب اور عذاب کو بیان کرتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں برداروں اور نافرمانوں کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ اور اس بات کی خبر دی کہ اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو ان پر عذاب نازل ہوگا۔ رسول بھیجنے کے لیے بڑی بستی کو اس لیے مخصوص کیا کہ اس میں قوم کے شرفاء اور فہم اور رائے والے لوگ اور بادشاہ اور اکابر ہوتے ہیں، تو اس اعتبار سے وہ بڑی بستی مثل اُم کے ہوئی آس پاس کی بستیوں کے لیے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ام القریٰ اولِ قریٰ ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ ام القریٰ سے مراد مکہ مکرمہ

[1] القاموس المحيط (١/ ٤٤٩)
[2] تفسير البغوي (٦/ ٢١٦)
[3] فتح القدير (٤/ ٢٣٨)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٩٩٧)

ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۹٦] ’’بے شک (اللہ کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ تمام دنیا کے لیے بڑی برکت اور ہدایت والا ہے۔‘‘ جس شے کو یہ آیت شامل کرتی ہے اس کا بیان آخر سورت یوسف میں گزر چکا ہے۔

جملہ ﴿ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴾ معطوف ہے جملہ ما قبل پر۔ غائب سے نونِ عظمت کی طرف اس لیے التفات کیا ہے کہ ہیبت اور خوف پیدا ہو اور استثناء مفرغ ہے اعم احوال سے، یعنی نہیں ہیں ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے اس کے بعد کہ بڑی بستی کی طرف رسول بھیجیں جو ان کو حق کی طرف بلائے کسی بھی حالت میں، سوائے اس حال میں کہ وہ ظالم ہیں اور ہلاکت کے مستحق ہو چکے ہیں کفر پر جم جانے کے سبب سے، ان پر ہر قسم کے عذر کو دور کرنے کے بعد اور حجت پوری کرنے کے بعد، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴾ [هود: ۱۱۷] ’’اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کرے، جب کہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔‘‘[1]

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ
خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا
فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝

اور تمھیں جو چیز بھی دی گئی ہے وہ دنیاوی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہت بہتر اور زیادہ دیرپا ہے، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟ (60) بھلا وہ شخص جسے ہم نے اچھا وعدہ دیا، پھر وہ اس (وعدے) کو پانے والا ہے، کیا اس شخص جیسا ہے جسے ہم نے دنیاوی زندگی کا بہت فائدہ دیا، پھر وہ قیامت کے دن (عذاب میں) حاضر کیے جانے والوں میں سے ہوگا؟ (61)

دنیا کے طلب گار اور آخرت کے خریدار برابر نہیں ہیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک دنیا کی حقارت و ذلت اور اس میں جو حقیری سی زینت اور فنا ہونے والی تازگی ہے، اس عظیم اور قائم رہنے والی نعمت کے مقابلے میں جس کو اللہ پاک نے اپنے صالح بندوں کے لیے دارِ آخرت میں تیار کر رکھا ہے اس کی خبر دیتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾ [النحل: ۹٦] ’’جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ (ہمیشہ) باقی رہنے

[1] فتح البیان (۱۰/ ۱۳۵۔ ۱۳۸)

والا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴾ [الرعد: ٢٦] ''حالاں کہ دنیا کی زندگی آخرت کی نسبت (حقیر) متاع ہی تو ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [الأعلیٰ: ١٦۔ ١٧] ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالاں کہ آخرت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔'' نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''واللہ! نہیں دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر جیسے تم میں سے ایک اپنی انگلی کو دریا میں ڈبوتا ہے، چنانچہ وہ دیکھے کہ اس کی طرف کیا شے رجوع کرتی ہے۔''[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی پھر کیا عقل نہیں کرتا وہ شخص جو مقدم کرتا ہے دنیا کو آخرت پر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ ﴾ پھر کیا وہ شخص جو مومن ہے اور اس ثواب کی تصدیق کرتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے صالح اعمال پر وعدہ فرمایا ہے، جس ثواب کی طرف وہ ضرور جانے والا ہے، اس شخص کی طرح ہے جو کافر ہے اور اللہ کے ساتھ ملاقات اور وعدے اور وعید کا منکر ہے۔ وہ دنیا کی زندگی میں تھوڑے دن برتوایا گیا ہے، پھر وہ قیامت کے دن محضرین میں سے ہوگا۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: محضرین بہ معنی معذبین ہے، پھر کہا گیا ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ اور ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سیدنا حمزہ، علی رضی اللہ عنہما اور ابوجہل کے بارے میں اتری ہے، یہ دونوں قول امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔[2]

ظاہر یہ ہے کہ یہ عام ہے اور اس آیت کی طرح ہے جس کی خبر اللہ پاک نے اس مومن سے دی ہے جو اپنے ساتھی کے حال پر مطلع ہوا کہ وہ تو درجات میں تھا اور وہ درکات (جہنم کے طبقات) میں تھا تو اس نے کہا: ﴿ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴾ [الصافات: ٥٧] ''اور اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں ضرور حاضر کیے ہوؤں (مجرموں) میں سے ہوتا۔'' نیز اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴾ [الصافات: ١٥٨] ''حالاں کہ بلاشبہ خود جنوں نے جان لیا کہ وہ (اللہ کے سامنے) ضرور حاضر کیے جائیں گے۔''[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ ﴾ کا خطاب مکے والوں کو ہے، یعنی اے مکے والو! جو کچھ تمھیں ملا ہے وہ کوئی سی شے ہو، وہ برتنا ہے دنیا کی زندگانی کا کہ تم اپنی زندگی کی مدت میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہو یا اپنی زندگی کی بعض مدت میں، پھر تم اس سے زائل ہو جاؤ گے، یا وہ تم سے زائل ہو جائے گی اور اس کی زینت ہے کہ تم اس سے زینت کرتے ہو اپنی زندگی کے ایام میں، اس سے بنتے سنورتے ہو، پھر وہ فنا ہو جائے گی، بہرحال اس کا انجام فنا ہونا اور ختم ہو جانا ہے اور اللہ کے پاس جو ثواب اور بدلہ ہے اس زائل اور فانی سے بہتر ہے، کیوں کہ وہ کدورت کے میل جول، یعنی ملاوٹ سے پاک خالص لذت ہے اور بہت باقی رہنے والی ہے، اس لیے کہ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٥٨) [2] تفسیر الطبري (١٩/ ٦٠٤۔ ٦٠٥) [3] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٢١۔ ٥٢٢)

وہ ہمیشہ دائم و قائم رہے گی اور دنیا کی شے بہت جلد ختم ہو جائے گی، پھر کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں کہ باقی رہنے والی چیز فنا ہو جانے والی سے افضل ہے اور وہ چیز بہتر ہے جس میں خالص صاف پاک لذت ہے بہ نسبت ان لذتوں کے جن میں کدورت اور بدن اور دل کی بیماریاں ملی ہوئی ہیں۔ کہا ہے کہ جو شخص آخرت کو دنیا پر ترجیح نہ دے تو وہ عقل مند نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے ایک تہائی مال کی سب سے زیادہ عقل مند کے لیے وصیت کرے تو وہ ایسی وصیت ہو گی جو اُن لوگوں کی طرف پھرے گی جو طاعتِ الٰہی میں مشغول ہیں۔[1]

امام مسلم اور بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''اللہ عز و جل فرمائے گا: اے ابن آدم! میں بیمارا ہوا تو نے میری عیادت نہ کی۔[2] (الحدیث بطوله) عبد اللہ بن احمد رحمہ اللہ نے زوائد زہد میں عبد بن عبید بن عمیر سے روایت کیا ہے، کہا: ''يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَجْوَعَ مَا كَانُوا وَأَعْطَشَ مَا كَانُوا وَأَعْرَى مَا كَانُوا''[3] یعنی حشر کیے جائیں گے لوگ قیامت کے دن سب وقتوں سے زیادہ تر بھوکے اور پیاسے اور ننگے، پس جس شخص نے اللہ عز و جل کے واسطے کھانا کھلایا تو وہ اس کو کھلائے گا اور جس نے اللہ عز و جل کے واسطے پلایا تو وہ اس کو پلائے گا اور جس نے اللہ عز و جل کے واسطے پہنایا تو وہ اس کو پہنائے گا اور جو شخص ہو گا اللہ کی رضا میں تو اللہ ہو گا اس کی رضا میں۔ کسی نے ''متاع'' کو بہ نصب پڑھا ہے اس بنا پر کہ مفعول مطلق ہے۔ ''أَيْ: فَيُمَتَّعُونَ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا'' ابو عمرو نے ''يَعْقِلُوْنَ'' بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ باقی قراء کی قراءت بتائے فوقیہ ہے بنا بر خطاب۔ یہ راجح تر ہے بہ سبب ﴿ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ ﴾ کے۔

﴿ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ ﴾ یعنی کیا پھر وہ شخص جس کو ہم نے جنت اور اس کے اندر بے شمار نعمتوں کا اچھا وعدہ دیا ہے، پس وہ اس وعدے کو ضرور ہی پانے والا ہے، کیوں کہ اللہ پاک وعدہ خلافی نہیں کرتا ہے، اسی لیے جملہ اسمیہ لایا گیا ہے جو وعدے کے تحقق کو مفید ہے اور فائے سببیہ کے ساتھ اس کا عطف کیا ہے۔ رہا پہلا حرفِ فاء تو وہ مرتب کرنے انکارِ تساوی کے ہے اہلِ دنیا اور اہلِ آخرت کے درمیان اس کے ماقبل پر۔ ماقبل یہی ہے کہ متاعِ دنیا اور اس شے کے درمیان جو اللہ عز و جل کے پاس ہے ظاہری طور پر فرق ہے۔

﴿ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ یعنی کیا شخصِ مذکور اس شخص کی مثل ہے جس کو برتوایا ہم نے دنیا کی زندگی کا برتنا، جو کدورتوں سے ملا ہوا ہے اور اس کے منقطع ہونے پر حسرت اور افسوس کرنا اس کی دُم کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ چنانچہ اس میں سے اس کو بعض مراد ملی باوجود جلد ختم ہونے کے اور عن قریب منغص ہونے کے، یعنی گدلا یا دھندلا ہونے کے۔ ﴿ ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ مَتَّعْنٰهُ ﴾ پر، داخل ہے اس کے ساتھ حیزِ صلہ میں انکارِ تشابہ کا موکد و مقرر ہے، یعنی پھر یہ شخص جس کو ہم نے دنیا کی متاع دی، قیامت کے دن ان

[1] تفسير الرازي (٢٥/ ٦) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٩) شعب الإيمان (٦/ ٥٣٤) [3] الدر المنثور (٦/ ٤٣٢)

لوگوں میں سے ہوگا جو دوزخ میں حاضر ہوں گے۔ ﴿ اَلْمُحْضَرِيْنَ ﴾ سے وہ لوگ مراد لینا جو عذاب میں حاضر کیے جائیں گے اس تخصیص کا مقام تقاضا کرتا ہے اور اس میں جو تہویل یعنی خوف ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔ اور استفہام انکاری ہے، یعنی ان دو آدمیوں کا حال برابر نہیں ہے، اس لیے کہ جس کو جنت کا وعدہ ملا ہے، وہ ضرور اس کو پائے گا، باوجود اس کے کہ دنیا میں اس کا جو حصہ ہے وہ بھی اس سے فوت نہ ہوگا۔ یہ حال تو مومن کا ہے۔

رہا کافر تو اس کے پاس نہیں ہے مگر صرف کچھ دنیا کا برتنا، جس میں وہ اور مومن دونوں برابر ہیں اور اس میں سے ہر ایک اپنا حصہ پائے گا اور باوجود اس کے وہ آگ میں جانے والا ہے، پس کیا دونوں برابر ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ جمہور نے ﴿ ثُمَّ هُوَ ﴾ بہ ضمِ ہاء پڑھا ہے اور کسائی و قالون نے بہ سکونِ ہاء۔ انھوں نے ﴿ ثُمَّ ﴾ کو قائم مقام واو اور فاء کے ٹھہرایا ہے۔[1] کلمہ ﴿ ثُمَّ ﴾ زمانے یا رتبے کی تراخی کے واسطے ہے۔ شانِ نزول کے دو قول پہلے گزر چکے ہیں اور دو یہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مومن و کافر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کسی نے کہا کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[2]

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝۶۲ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۫ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ۝۶۳ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ۝۶۴ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶۵ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَىِٕذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۶۶ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ۝۶۷

اور جس دن اللہ انھیں پکارے گا، پھر وہ کہے گا: میرے وہ شریک کہاں ہیں جنھیں تم میرا شریک سمجھتے تھے؟ (62) وہ لوگ جن پر حکم (عذاب) ثابت ہو چکا، کہیں گے: اے ہمارے رب! یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے گمراہ کیا، ہم نے انھیں ایسے گمراہ کیا جیسے ہم (خود) گمراہ ہوئے تھے، ہم تیرے سامنے اظہارِ براءت کرتے ہیں کہ وہ ہماری عبادت کیا ہی نہیں کرتے تھے (63) اور (ان سے)

[1] فتح القدير (٤/ ٢٣٩) [2] فتح البيان (١٠/ ١٣٨۔ ١٣٩)

کہا جائے گا: تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، چناں چہ وہ انھیں پکاریں گے تو وہ انھیں جواب نہیں دیں گے، اور وہ (سب) عذاب دیکھ لیں گے، کاش! وہ ہدایت پر چلتے ہوتے (64) اور جس دن اللہ انھیں پکارے گا، تو وہ کہے گا: تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟ (65) پھر اس دن ان پر خبریں پیچیدہ ہو جائیں گی اور وہ ایک دوسرے سے سوال تک نہ کر سکیں گے (66) البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے، تو اُمید ہے کہ وہ فلاح پانے والوں میں سے ہو گا (67)

روزِ قیامت مشرکین اور ان کے شرکاء کا ایک دوسرے سے اعلانِ براءت:

اللہ پاک اس سوال کی خبر دیتا ہے جس سے قیامت کے دن کفار اور مشرکین کو زجر و توبیخ کرے گا، جب ان کو پکارے گا تو کہے گا: کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے، یعنی کہاں ہیں وہ معبود جن کو تم پوجا کرتے تھے دنیا میں اور وہ بت اور شریک کہاں ہیں؟ کیا وہ تمھاری مدد کریں گے یا وہ بدلہ لیں گے؟ یہ سوال ان کو ڈرانے دھمکانے کے لیے ہو گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٩٤] ''اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جس طرح کہ ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا، اور ہم نے تمھیں جو کچھ عطا کیا تھا وہ تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور اب ہمیں تمھارے ساتھ تمھارے وہ سفارشی نظر نہیں آتے، جن کے بارے میں تم دعویٰ کرتے تھے کہ بے شک وہ (تمھاری بندگی میں) اللہ کے شریک ہیں۔ ان سے تمھارا تعلق یقیناً ٹوٹ گیا ہے اور وہ تم سے کھو گئے ہیں، جنھیں تم (اپنے معبود) خیال کرتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ ﴾ سے مراد شیطان و مَردہ ہیں اور کفر کی طرف بلانے والے۔ ﴿ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴾ ان پر اس بات کی گواہی دی کہ انھوں نے ان کو بہکایا تو انھوں نے ان کی پیروی کی، پھر ان کی عبادت سے بے زار ہوئے، چنانچہ کئی جگہ اللہ پاک نے اس مضمون کو ذکر فرمایا ہے۔ ایک یہ ہے: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿81﴾ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مریم: ٨١۔ ٨٢] ''اور انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لیے ہیں، تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں۔ ہرگز نہیں! عنقریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔'' دوسری آیت یہ ہے: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿5﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ٥۔٦]

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں۔ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔''

خلیل جلیل علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ۲۵] ''اور ابراہیم نے کہا: تم نے اللہ کے سوا جن بتوں کو معبود ٹھہرا لیا ہے، تو یہ محض تمھاری آپس کی دنیا کی دوستی کی وجہ سے ہے، پھر روزِ قیامت تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور تم میں سے ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے، اور تمھارے لیے کوئی مدد کرنے والے نہ ہوں گے۔'' نیز اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۗ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۗ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ [البقرۃ: ۱۶۶۔ ۱۶۷] ''جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بے زار ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی تھی اور وہ عذاب دیکھیں گے اور ان کے تمام تعلقات کٹ جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے پیروی کی تھی، وہ کہیں گے: کاش کہ ہمارے لیے ایک بار (دنیا میں) واپسی ہو تو ہم بھی ان لوگوں سے اسی طرح بے زار ہو جائیں جس طرح وہ ہم سے بے زار ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو ناکام خواہش بنا کر ان کے سامنے دکھائے گا اور وہ آگ کے عذاب سے نکلنے والے نہیں ہوں گے۔''

اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ﴾ یعنی تم پکارو اپنے شریکوں کو تاکہ تم کو اس بلا سے چھڑائیں جس میں تم ہو جیسے تم دنیا میں ان سے امید رکھتے تھے۔ ﴿ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا ﴾ یعنی پھر وہ ان کو پکاریں گے تو وہ اُن کو جواب نہ دیں گے۔ ﴿ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ ﴾ یعنی اور وہ یقین کر لیں گے اس بات کا کہ وہ ضرور آگ کی طرف جانے والے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴾ یعنی جبکہ وہ عذاب کو دیکھ لیں گے تو یہ چاہیں گے کہ کاش وہ دنیا میں ہدایت پانے والوں میں سے ہوتے۔ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴾ [الکہف: ۵۲۔ ۵۳] ''اور جس دن وہ (اللہ) کہے گا: پکارو میرے ان شریکوں کو جنھیں تم (میرا شریک) سمجھتے تھے، پھر وہ انھیں پکاریں گے، مگر وہ انھیں کوئی جواب نہ دیں گے، اور ہم ان کے درمیان ہلاکت گاہ

بنا دیں گے۔ اور مجرم آگ کو دیکھیں گے تو یقین کریں گے کہ بے شک وہ اس میں گرنے والے ہیں، اور وہ اس سے پھرنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَآ أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴾ اول نداء تو توحید کا سوال تھا اور اس نداء میں نبوتوں کا اثبات ہے کہ ان لوگوں کو جو تمھاری طرف بھیجے گئے تھے، تمھارا کیا جواب تھا اور اُن کے ساتھ تمھارا کیسا حال یعنی برتاؤ تھا؟ یہ ویسا سوال ہے جیسا بندے سے اس کی قبر میں پوچھا جائے گا کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا نبی کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ پس مومن تو اس بات کی گواہی دے گا کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ رہا کافر تو وہ کہے گا: ''هَاهَ هَاهَ لَا أَدْرِيْ'' اور اسی لیے قیامت کے دن اسے کوئی جواب نہ آئے گا سوائے سکوت کے، اس لیے کہ جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے تو وہ آخرت میں اندھا ہے اور راہ سے بہت بھٹکا ہوا۔ اسی لیے اللہ پاک نے یہاں یہ فرمایا ہے: ﴿ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُونَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: پھر اندھی ہو گئیں اُن پر حجتیں، پس وہ آپس میں انساب کے ساتھ سوال نہیں کرتے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴾ یعنی جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور دنیا میں نیکی کی، پس امید ہے کہ قیامت کے دن وہ چھوٹنے والوں سے ہو۔ ''عسیٰ'' کا کلمہ اللہ پاک کی طرف سے موجبہ ہے، کیوں کہ اللہ پاک کے فضل اور احسان سے یہ ضرور واقع ہونے والا ہے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ يَوْمَ ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ ﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ پر معطوف ہے، یا ''اُذْكُرْ'' محذوف کا معمول ہے۔ اس نداء کا مقصد ان کو ڈانٹنا، دھمکانا اور زجر و توبیخ کرنا ہے اس بات پر کہ ان کے معبود اس وقت اُن کو کچھ نفع نہ دیں گے، یعنی وہ دن یاد کرو کہ جب اللہ پاک ان مشرکوں کو پکارے گا، جنھوں نے اللہ پاک کو چھوڑ کر غیر اللہ کو پوجا ہے تو ان سے فرمائے گا: کہاں ہیں میرے شریک جن کو تم نے میرے سوا پوجا ہے اور میری عبادت کے استحقاق میں اُن کی شرکت ثابت کی ہے اور تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمھاری مدد کریں گے اور تمھارے سفارشی ہوں گے۔

دلالتِ کلام کے سبب سے ﴿ تَزْعُمُونَ ﴾ کے دونوں مفعول محذوف ہیں۔ ''أَيْ: تَزْعُمُوْنَهُمْ شُرَكَائِيْ''۔ جن پر آگ میں داخل ہونے کا کلمۂ عذاب ثابت ہو چکا ہے وہ کہیں گے: یہ لوگ گمراہی کے سردار ہیں جن کو انھوں نے اللہ کے سوا رب ٹھہرایا تھا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: شیاطین ہیں۔[3] اے ہمارے رب!

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٦٠٧) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٢٢۔ ٥٢٣) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٠٣)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہی کی طرف بلایا۔ مراد کفر میں اُن کے تابع فرمان اور پیروکار ہیں۔ ہم نے ان کو گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے اور انھوں نے کفر کو اختیار کیا ایمان کے بجائے جس طرح ہم نے اس کو اختیار کیا، اور ہم ان کے کفر کا سبب ہوئے، چنانچہ انھوں نے اس کو ہم سے قبول کیا، اب ہماری گمراہی اور ان کی گمراہی کے درمیان کچھ فرق نہیں ہے۔ اگرچہ ہمارا زینت دینا ان کو کفر کی طرف بلانے کا سبب ہوا، پس اس کے مقابلے میں اللہ پاک کا ان کو ایمان کی طرف بلانا تھا، اس طریقے سے کہ اس بلانے میں عقلی دلیلیں رکھیں اور ان کی طرف رسول بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کیں جو وعدوں، وعیدوں، نصیحتوں اور ڈراووں سے بھری ہوئی تھیں، یہ سب باتیں کفر سے پھیرنے اور ایمان کی طرف بلانے کے لیے کافی تھیں۔ ہم تیرے آگے ان لوگوں سے منکر ہوئے جنھوں نے ہماری اطاعت کی۔ یہ جملہ ماقبل کا مقرر ہے، اسی لیے اس کا عطف نہیں کیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض بعض سے بے زار اور بَری ہوئے اور دشمن ہو گئے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾[1] [الزخرف: ٦٧] ”اس دن متقین کے سوا تمام (جگری) دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰۤؤُلَآءِ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَاۚ ﴾ اس کی صفت ہے اور عائد محذوف ”أي: أَغْوَيْنَاهُم“ اور ﴿ اَغْوَیْنٰهُمْ ﴾ خبر ہے اور ﴿ كَمَا غَوَیْنَا ﴾ صفت ہے مصدر محذوف کی۔ کسی نے کہا کہ ﴿ هٰۤؤُلَآءِ ﴾ کی خبر ﴿ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَاۚ ﴾ ہے۔ رہا ﴿ اَغْوَیْنٰهُمْ ﴾ تو کلامِ مستانف ہے، ماقبل کی تقریر اور تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ امام ابوعلی رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور وجہِ اول پر اعتراض کیا ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس اعتراض کو رد کر دیا ہے۔[2] ﴿ مَا كَانُوْۤا اِیَّانَا یَعْبُدُوْنَ ﴾ میں حرفِ ما نافیہ ہے، یعنی وہ ہم کو نہیں پوجتے تھے، وہ تو اپنی خواہشوں کی پوجا کرتے تھے۔ کسی نے کہا: ”ما“ مصدر یہ ہے، یعنی ہم بری ہوئے طرف تیرے ہم کو اُن کے پوجنے سے۔ قولِ اول زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ وَقِیْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ﴾ یعنی بنی آدم کے کفار سے کہا جائے گا، ان سے مذاق کرنے اور ان کو عاجز کرنے کے لیے کہ تم اپنے شریکوں کو پکارو، یعنی دنیا میں تم اللہ کے سوا جن معبودوں کو پوجا کرتے تھے ان سے استغاثہ کرو اور فریاد رسی چاہو، تاکہ وہ تمھاری مدد کریں اور تم سے عذاب کو دور کریں، چنانچہ اس وقت وہ ان کو پکاریں گے تو وہ نہ اُن کو جواب دیں گے اور نہ ہی ان کو کسی طرح کا نفع پہنچائیں گے۔

﴿ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ﴾ یعنی یہ اتباع کرنے والے اور جن کی اتباع کی گئی تھی وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ اس نے ان سب کو ڈھانک لیا ہوگا۔ ﴿ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا یَهْتَدُوْنَ ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَوْ ﴾ کا جواب محذوف ہے، یعنی اگر وہ راہ پائے ہوئے ہوتے تو یہ راہ پانا ان کو عذاب سے نجات دیتا اور وہ عذاب کو نہ دیکھتے۔[3] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کو نہ پکارتے۔ کسی نے کہا: اگر وہ دنیا میں راہ پائے ہوئے ہوتے تو جان لیتے کہ عذاب حق

[1] معاني القرآن (٤/ ١٥١) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٢٤) [3] معاني القرآن (٤/ ١٥١)

ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر وہ حیلوں تدبیروں سے کسی حیلے کی طرف راہ پاتے تو اُس سے عذاب کو دور کرتے۔ کسی نے کہا: ''قَدُ آنَ لَهُمُ أَنُ يَّهُتَدُوا لَوُ كَانُوا يَهُتَدُونَ'' ان کے سوا اور قول بھی ہیں۔ قولِ اول زیادہ صحیح ہے۔

﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ ﴾ معطوف ہے ما قبل پر۔ ﴿ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ اول تو اُن سے اُن کے شرک کرنے کا سوال کیا تھا اور یہ سوال اُن کے رسولوں کو جواب سے ہے، جنھوں نے ان کو شرک سے منع کیا۔ یعنی کیا جواب تھا تمھارا ان نبیوں کو جو تمھاری طرف بھیجے گئے تھے، جبکہ انھوں نے میری رسالت پہنچائی؟ ﴿ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَىِٕذٍ ﴾ یعنی پھر مخفی ہو گئیں ان پر حجتیں، یہاں تک کہ اندھوں کی طرح ہو گئے جو راہ نہیں پاتے۔ اصل کلام ''فَعَمُوا عَنِ الْأَنُبَاءِ'' ہے، یعنی وہ انباء سے اندھے ہو گئے، لیکن مبالغے کے لیے کلام کو الٹ کر دیا۔ ''أنباء'' اخبار کو کہتے ہیں۔ ان کی حجتوں کا نام اخبار اس لیے رکھا کہ وہ حجت کے کسی قطار اور شمار میں نہیں ہیں وہ تو صرف قصے کہانیاں ہیں۔ تفسیر ابو السعود میں اس طرح کہا ہے کہ ہو گئیں انباء مثل اندھوں کے، ان سے راہ نہیں پاتی ہیں انباء ان کی طرف۔ اصل اس کی ''فَعَمُوا عَنِ الْأَنُبَاءِ'' ہے۔[1] پس قلب کیا گیا اور قلب من جملہ محسناتِ کلام ہے۔ امام خفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''عَمِيَتُ'' کو کلمۂ ''علیٰ'' کے ساتھ اس لیے متعدی کیا ہے کہ اس میں خفا کے معنی شامل ہیں۔ جمہور نے ﴿ فَعَمِيَتْ ﴾ بہ فتحِ عین وتخفیفِ میم پڑھا ہے اور اعمش و جناح بن حبیش نے بہ ضمِ عین و تشدیدِ میم پڑھا ہے۔[2]

﴿ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ چنانچہ ان کا بعض بعض سے نہیں پوچھتا اور نہ ہی کوئی حجت بولتے ہیں اور نہ جانتے ہیں کہ کس شے کے ساتھ جواب دیں، اس لیے کہ اللہ پاک نے دنیا میں ہی ان کا عذر دور کر دیا، چنانچہ قیامت کے دن ان کے لیے کوئی عذر ہو گا نہ کوئی حجت۔ تفسیر ابو السعود میں ہے کہ بعض ان کا بعض سے جواب نافع نہیں پوچھتا ہے اور نا پوچھنا دہشت کی وجہ سے ہے، یا اس لیے کہ ان کو اس بات کا علم ہے کہ جہالت کے لحاظ سے وہ سب برابر ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ان کا بعض بعض سے انساب کے بارے میں سوال نہیں کرتا۔ یہ امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4] اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔

﴿ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴾ یعنی جس شخص نے توبہ کی شرک سے اور ایمان لایا اور توحیدِ الٰہی کی تصدیق کی اور جو کچھ رسول لے کر آئے اس کو مانا اور فرائض ادا کیے اور گناہوں سے بچا تو اُمید ہے کہ وہ مفلحین سے ہو گا، یعنی ان لوگوں میں سے ہو گا جو وعدۂ الٰہی کے مطابق نجات پانے والے ہیں اور سعادت دارین کی شکل میں اپنے مطالب حاصل کرنے والے ہیں۔ کلمۂ ''عسیٰ'' اگرچہ ''رَجَا'' یعنی اُمید کے لیے آتا ہے، لیکن وہ اللہ کی طرف سے آئے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عادتِ کرام کی بنا پر واجب کے

[1] تفسير أبي السعود (٧/ ٢٢) [2] فتح القدير (٤/ ٢٤٠) [3] تفسير أبي السعود (٧/ ٢٢) [4] تفسير الطبري (١٩/ ٦٠٧)

معنی میں ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ امید تائبِ مذکور کی طرف سے ہے، اللہ پاک کی طرف سے نہیں ہے۔ یعنی پس چاہیے کہ وہ فلاح کی توقع رکھے۔[1]

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧٠﴾

اور آپ کا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے۔ ان (لوگوں) کے لیے کوئی اختیار نہیں، اللہ پاک ہے اور ان سے کہیں اعلیٰ ہے جنھیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں (68) اور آپ کا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں (69) اور وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، دنیا اور آخرت میں تمام حمد اسی کے لیے ہے، اور حاکمیت وفرمانروائی بھی اسی کی ہے، اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے (70)

اختیارات وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے:

اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ پیدا کرنے اور ہر قسم کا اختیار رکھنے میں وہ منفرد ہے اور اس سلسلے میں اس کا کوئی مقابل اور اسے پیچھے ڈالنے والا کوئی نہیں۔ یعنی پیدا کرنے میں اور پسند کرنے میں اس سے کوئی جھگڑنے والا اور اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا کوئی نہیں ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ تیرا رب جو چاہے اور پسند کرے وہ پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے جو چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ سارے اچھے اور برے کام اسی کے ہاتھ میں ہیں، ان کا مرجع اسی کی طرف ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ اس میں دو قول ہیں۔ صحیح تر قول یہ ہے کہ کلمۂ ''ما'' نافیہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ [الأحزاب: ٣٦] ''اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اپنے معاملے میں ان کا کوئی اختیار (باقی) رہے۔'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ اختیار کیا ہے کہ اس جگہ کلمۂ ''ما'' بہ معنی ''اَلَّذِي'' ہے۔[2] تقدیر یہ ہے: ''وَيَخْتَارُ الَّذِي لَهُمْ فِيهِ خِيَرَةٌ''، یعنی اس شے کو پسند کرتا ہے جس میں ان کے لیے خیر ہے۔

---

[1] فتح البيان (١٠/ ١٤١۔ ١٤٢) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٦٠٨)

طائفۂ معتزلہ نے اس مسلک سے اس بات پر حجت پکڑی ہے کہ اصلح کی مراعاۃ واجب ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ کلمۂ ''مَا'' نافیہ ہے جس طرح کہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بھی اس کو نقل کیا ہے، کیوں کہ اس مقام میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ پاک پیدا کرنے اور تقدیر اور اختیار میں منفرد ہے اور اس بارے میں اس کا کوئی نظیر اور شبیہ نہیں ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی مشرک لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بتوں اور انداد کو شریک کرتے ہیں جو نہ کچھ پیدا کرتے ہیں اور نہ کچھ پسند کرتے ہیں اس سے اللہ پاک منزہ اور پاک اور بہت بلند ہے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک جانتا ہے اس شے کو جس کو ضمائر چھپاتے ہیں اور جس پر تمام راز مشتمل ہوتے ہیں، جس طرح کہ وہ اس شے کو جانتا ہے جو تمام مخلوق کی ظاہر چیزوں کو ظاہر کرنے والے ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴾ [الرعد: ١٠] ''(اللہ کے نزدیک) مساوی ہے تم میں سے جو کوئی آہستہ بات کہے یا بلند آواز سے کہے، اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپنے والا ہو یا دن (کی روشنی) میں چلنے والا ہو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی اللہ ہی الٰہیت کے ساتھ منفرد ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوا اس کے جس طرح کہ نہیں ہے کوئی رب کہ پیدا کرے اور اختیار کرے سوائے اس کے۔ ﴿ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی جو کچھ وہ کرتا ہے اس سب میں وہی تعریف کے لائق ہے اپنے عدل اور حکمت کے ساتھ، یعنی اس کے عدل اور حکمت کے سبب سے ہر فعل پر اس کی تعریف کی گئی ہے۔ ﴿ وَلَهُ الْحُكْمُ ﴾ یعنی حکم اسی کا ہے یعنی اس کے قہر، غلبہ، حکمت اور رحمت کے سبب سے اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا کوئی نہیں ہے۔ ﴿ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی قیامت کے دن تم سب اسی کی طرف رجوع کیے جاؤ گے، پھر وہ ہر عمل کرنے والے کو اس کے اچھے اور برے عمل کا بدلہ دے گا اور ان کے سارے اعمال میں سے کوئی مخفی شے بھی اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ﴾ یعنی تیرا رب اس شے کو پیدا کرتا ہے جس کو پیدا کرنا چاہتا ہے، اس میں خلقِ افعال پر دلالت ہے، اور پسند کرتا ہے اس چیز کو جس کو پسند کرنا چاہتا ہے۔ ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٣] ''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٢٣)

نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی۔'' یہ آیت شرکاء کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، جن کو کفار نے پوجا ہے اور ان کو پسند کیا ہے، یعنی پسند کرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے: ﴿ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴾ ان کے لیے پسند کرنا نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت کفار کے اس قول کا جواب ہے: ﴿ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [الزخرف: ۳۱] ''یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟'' یعنی ولید بن مغیرہ یا عروہ بن مسعود ثقفی۔

اللہ پاک نے خبر دی کہ رسولوں کو ان کے پسند کرنے سے نہیں بھیجتا، کیوں کہ مالک مطلق وہی ہے اور یہ حق اسی کا ہے کہ جس کو چاہے جس چیز کے ساتھ خاص کرے، اس پر کسی طرح کا اعتراض نہیں ہے، ان کو اختیار نہیں ہے اور نہ ان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اللہ پر اختیار کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت یہود کے قول کا جواب ہے کہ اگر محمد رسول اللہ ﷺ پر جبرائیل علیہ السلام کے سوا کوئی اور رسول نازل ہوتا تو ہم ان پر ایمان لاتے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: معنی یہ ہیں کہ تیرا رب اپنی خلق میں جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ان میں سے جس کو چاہتا ہے اپنی اطاعت کے لیے پسند کرتا ہے۔

یحییٰ بن سلام نے کہا ہے کہ تیرا رب اپنی خلق میں جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی نبوت کے لیے پسند کرتا ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے کہ معنی یہ ہیں: تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، یعنی محمد ﷺ کو اور پسند کرتا ہے اپنے دین کے لیے انصار (مددگاروں) کو۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتاب بزار میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً صحیح روایت ہے کہ اللہ نے میرے اصحاب کو دنیا کے لوگوں پر، سوائے نبیوں اور رسولوں کے، اختیار کیا ہے اور میرے لیے میرے اصحاب میں سے چار کو پسند کیا، یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم، پس ان کو میرا اصحاب کیا اور میرے سارے اصحاب میں خیر ہے اور میری امت کو اختیار کیا باقی اُمتوں پر اور میری اُمت میں سے چار قرنوں کو میرے لیے پسند کیا۔[1]

سفیان بن عیینہ نے عن عمرو بن دینار عن وہب بن منبہ عن ابیہ اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اختیار کیا چوپایوں میں سے ضأن، یعنی بھیڑ کو اور پرندوں سے حمام کو، یعنی کبوتر کو۔[2] فتح‌البیان (فتح القدیر اور فتح البیان) میں کہا ہے کہ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے، عموم اولیٰ ہے۔[3] تفسیر بیضاوی میں ہے کہ ظاہر اس کا نفی ہے ان سے اختیار کی بالکل، اور بات اسی طرح ہے، کیوں کہ بندوں کا اختیار مخلوق ہے جو اللہ کے اختیار کے ساتھ وابستہ ہے اور متعلق ہے ایسے ایسے حادثات اور بواعث کے کہ جن میں ان کا کچھ اختیار نہیں ہے۔[4] انتھی.

---

[1] کشف الأستار عن زوائد البزار (۳/ ۲۸۸) اس کی سند میں ''عبداللہ بن صالح'' متکلم فیہ راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۶۱۲۳)

[2] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳۰۵) [3] فتح البیان (۱۰/ ۱۴۲) [4] تفسیر البیضاوي (٤/ ۳۰۱)

﴿ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴾ کے کلمہ "ما" میں تین وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ نافیہ ہے، پس ﴿ يَخْتَارُ ﴾ پر وقف ہوگا۔ چنانچہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بنا پر ﴿ يَخْتَارُ ﴾ پر وقف تام ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ معنی "اَلَّذِيْ" ہے، موضعِ نصب میں ﴿ يَخْتَارُ ﴾ کا مفعول ہے اور عائد محذوف ہے، "أَيْ: وَيَخْتَارُ الَّذِي كَانَ لَهُمْ فِيْهِ الْخِيَرَةُ" یعنی اختیار کرتا ہے اس شے کو جس میں ان کے لیے خیرہ ہے (یعنی خیر اور فلاح ہے)۔ صحیح وجہ اول ہے، اس لیے کہ وقف پر اجماع ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مصدریہ ہے: "أَيْ: وَيَخْتَارُ اخْتِيَارَهُمْ" اور مصدر واقع ہے موقع مفعول بہ میں "أَيْ: مُخْتَارُهُمْ"۔ گویا یہ قول ابن جریر کے قول کی تفسیر ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں: تقدیر آیت کی یہ ہے: "وَيَخْتَارُ لِوِلَايَتِهِ الْخِيَرَةَ مِنْ خَلْقِهِ" یعنی اپنی ولایت کے لیے پسندیدہ اور برگزیدہ کو اپنی خلق میں سے پسند کرتا ہے۔ یہ قول انتہائی ضعیف ہے۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے جائز رکھا کہ ﴿ كَانَ ﴾ تامہ ہو اور ﴿ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴾ جملہ مستانفہ ٹھہرے۔ یہ قول بھی نہایت بعید ہے۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴾ بیان ہے ﴿ يَخْتَارُ ﴾ کا، اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہیں: پسند کرتا ہے جو چاہتا ہے، اسی لیے اس پر حرفِ عاطف داخل نہیں ہوا۔ معنی یہ ہیں کہ "خیرۃ" اللہ کے واسطے ہے اپنے افعال میں اور وہ ان میں حکمت کی وجوہ کو خوب جانتا ہے۔ اس کی خلق میں سے کسی کے لیے نہیں ہے کہ اس پر اختیار کرے۔[2] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: لوگ ہمیشہ کہتے آئے ہیں کہ ﴿ يَخْتَارُ ﴾ پر وقف ہے اور کلام کی ابتداء کلمہ "مَا" سے ہے، اس بنا پر کہ نافیہ ہے۔ یہ اہلِ سنت کا مذہب ہے اور ایک جماعت سے منقول ہے، جیسے ابوجعفر وغیرہ اور ﴿ يَخْتَارُ ﴾ سے اس کا موصولہ اور متصل ہونا معتزلہ کا مذہب ہے۔

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴾ کلامِ مستانف ہے، یعنی خلق اللہ سے کسی کو نہیں پہنچتا کہ کسی شے کو حقیقی طور پر اختیار کرے، اس طریقے سے کہ اس کو جاری کرنے پر اقدام کرے، بغیر اللہ پاک کے اختیار کے۔ ان سب تفسیروں میں سے تفسیرِ اول راجح ہے۔ "خیرۃ" بہ معنی تخیر ہے اور تخیر و اختیار بہ معنی برگزیدن ہے، جس طرح کہ "طیرہ" بہ معنی تطیُّر ہے۔ "خیرۃ" و "طیرۃ" دونوں اسم ہیں اور مصدر کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ مصباح میں ہے کہ "خیرۃ" بہ فتحِ تحتیہ بہ معنی خیار ہے اور خیار بہ معنی اختیار ہے۔ اور بہ سکونِ یاء اسم ہے اختیار سے، جیسے: فدیہ اسم ہے افتداء سے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ "خیرۃ" بہ فتحِ یاء "تخیرت" سے اسم ہے، جیسے طیرت" سے "طیرۃ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں دو لغت ہیں ایک معنی میں۔[3] انتہٰی. اور "خیرۃ" بہ فتحِ یاء بہ معنی متخیر بھی آیا ہے، یعنی گزیدہ جس طرح بولتے ہیں: "مُحَمَّدٌ ﷺ خِيَرَةُ اللهِ مِنْ خَلْقِهِ"

[1] فتح القدير (٤/ ٢٤١). [2] الكشاف (٣/ ٤٣٢) [3] المصباح المنير (١/ ٩٨)

صراح میں کہا ہے کہ بہ سکون وتحریکِ یاء، یعنی نبی ﷺ اللہ کے برگزیدہ ومنتخب اور چنے ہوئے ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے فرمایا: لائق نہیں ہے کسی کو کہ دنیا کے امور میں سے کسی امر پر اقدام کرے، مگر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے اس میں خیرہ کا سوال کرے اس طریقے سے کہ دو رکعت نمازِ استخارہ ادا کرے۔ پہلی رکعت میں ﴿ قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ پڑھے اور دوسری میں ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھے۔ بعض مشائخ نے یہ اختیار کیا ہے کہ پہلی رکعت میں ﴿ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴾ اور دوسری میں ﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ﴾ [الأحزاب: ٣٦] ''اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اپنے معاملے میں ان کا کوئی اختیار (باقی) رہے۔'' ان دونوں میں سے ہر ایک خوب ہے۔ پھر سلام کے بعد وہ دعا پڑھے جس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[1] (إلی آخر الحدیث)

پھر اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس کی تنزیہ فرمائی، چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے ایسا پاک جو صرف اسی کا خاصا ہے، اس کے بغیر کہ کوئی جھگڑا کرنے والا اس سے جھگڑے، یا کوئی اس کا باہم شریک ہو، یا کوئی مزاحمت کرنے والا اس کے اختیار میں مزاحمت کرے اور وہ ان لوگوں سے برتر و بلند ہے جن کو اس کے واسطے شریک ٹھہراتے ہیں۔ ﴿ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ ﴾ اور تیرا رب وہ شے جانتا ہے جس کو ان کے دل چھپاتے ہیں، یعنی شرک وعداوت، یا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حسد، یا حق کے مخالف وہ سب چیزیں جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں۔ جمہور نے ﴿ تُكِنُّ ﴾ بہ ضمِ تائے فوقیہ وکسرِ کاف اور ابن محیصن اور حمید نے بہ فتحِ فوقیہ و ضمِ کاف پڑھا ہے۔[2] ﴿ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾ یعنی اور وہ شے جس کا اپنی زبانوں سے اعلان واظہار کرتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نفسِ مقدس کی مدح وحدانیت کے ساتھ کی اور اس بات کے ساتھ کہ حمد کا حق صرف اسی اکیلے کے لیے ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا: ﴿ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ وہی اللہ ہے، یعنی الٰہیت کے ساتھ وہی متاثر ہے جو اس کی ذات پاک کے ساتھ مختص ہے۔ ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ اس مضمون کا مقرر وموکد ہے۔ ﴿ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی اسی کے واسطے دنیا اور آخرت میں حمد اور تعریف ہے۔ اس لیے کہ عاجل وآجل ساری نعمتوں کا مولیٰ وہی ہے۔ مومنین آخرت میں اس کی حمد کریں گے جس طرح کہ دنیا میں اس کی حمد کی، لیکن آخرت میں حمد بطور لذت کے ہوگی نہ کہ بطریق تکلیف کے۔ وہاں کی حمد یہ ہوگی: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴾ [الفاطر: ٣٤] ''اور وہ کہیں گے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ ﴾ [الزمر: ٧٤] ''اور وہ کہیں گے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٠٩) تفسير القرطبي (١٣/ ٣٠٦۔ ٣٠٧) [2] فتح القدير (٤/ ٢٤١)

سب تعریف اس اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہم سے (کیا ہوا) اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔" نیز فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [یونس: ۱۰] "تمام تعریفیں اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہیں۔"

﴿ وَلَهُ الْحُكْمُ ﴾ یعنی ہر شے میں قضائے نافذ اسی کے لیے ہے، چنانچہ اپنے بندوں کے درمیان جو چاہے گا فیصلہ کرے گا بغیر کسی کی شرکت کے۔ ﴿ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی اسی کی طرف رجوع کیے جاؤ گے نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ اس طریقے سے کہ تمھیں اٹھایا جائے گا اور زندہ کیا جائے گا، تم قبروں سے نکلو گے، پھر نیک کو اس کی نیکی کا اور بد کو اس کی بدی کا بدلہ دیا جائے گا۔[1]

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝۷۱ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۷۲ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۳

(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو تو! اگر اللہ تم پر قیامت تک ہمیشہ کے لیے رات ہی (طاری) کر دے تو اللہ کے سوا کون الٰہ ہے جو تمھیں روشنی (دن) لا دے؟ کیا پھر تم سنتے نہیں؟ (71) کہہ دیجیے: بتلاؤ! اگر اللہ تم پر قیامت تک ہمیشہ کے لیے دن ہی (طاری) کر دے تو اللہ کے سوا کون الٰہ ہے جو تمھیں رات لا دے کہ تم اس میں آرام کر سکو؟ کیا پھر تم دیکھتے نہیں؟ (72) اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم اس (رات) میں آرام کرو اور تاکہ تم (دن میں) اس کا فضل تلاش کرو، اور شاید کہ تم شکر کرو (73)

دن اور رات اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی واحدانیت کی دلیل ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس بات کا احسان رکھتا ہے کہ اس نے ان کے لیے رات اور دن کو مسخر کیا، جن کے بغیر ان کے لیے کسی طرح کا قوام اور نظام ممکن نہیں ہے۔ اور بیان فرمایا کہ اگر ان پر قیامت کے دن تک رات ہی ہمیشہ کے لیے رکھ دی جائے تو یہ بات ان کو تکلیف دے گی اور نفوس اس سے رنج و ملال میں ہوں گے اور تنگ ہو

---

[1] فتح البیان (۱۰/ ۱۴۲۔ ۱۴۴)

جائیں گے، اسی لیے یہ فرمایا کہ اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھیں روشنی لا کر دے کہ تم اس سے دیکھو اور اس کے سبب سے اُنس پکڑو، پھر تم سنتے نہیں ہو۔

پھر یہ خبر دی کہ اگر وہ قیامت تک ہمیشہ کے لیے دن ہی رکھے، یعنی ہمیشہ دن ہی رہے رات نہ ہو تو یہ بات ان کو تکلیف پہنچائے اور ان کے جسم حرکات و مصروفیت کی کثرت کی وجہ سے تھک جائیں، اسی لیے فرمایا کہ اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے لیے رات لائے جس میں تم چین پکڑو، یعنی اپنی حرکات اور اشغال سے راحت اور آرام لو، کیا پھر تم دیکھتے نہیں ہو۔ ﴿ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ یعنی تم پر اس کی رحمت سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن کو پیدا کر دیا، تاکہ رات میں تم چین پکڑو اور دن میں تم اس کا فضل تلاش کرو، اس طرح کہ سفر کرو، کوچ کرو، چلو پھرو، کام کاج کرو۔ یہ آیت لف و نشر (لپیٹنے اور پھیلانے) کے باب سے ہے۔

﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ یعنی شاید تم اللہ کا شکر کرو اس طریقے سے کہ طرح طرح کی قسم قسم کی عبادتیں رات اور دن میں بجا لاؤ اور جس کسی کو رات میں کوئی شے فوت ہو جائے تو دن میں اس کا تدارک کرے اور دن میں فوت ہو جائے تو رات میں اس کا تدارک کرے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٦٢] ''اور وہی (اللہ) ہے جس نے ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے رات اور دن بنائے، اس شخص (کی نصیحت) کے لیے جو نصیحت پکڑنا چاہے یا شکر کرنا چاہے۔'' اس بارے میں آیتیں بہت ہیں۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے: تو کہہ دے مکہ والوں سے: تم مجھے خبر دو کہ اگر اللہ تم پر روزِ قیامت تک مستقل رات کر دے، اس طرح سے کہ سورج کو زمین کے نیچے ساکن کر دے، یا اس کو کسی دوسرے اُفق کے گرد حرکت دے۔ اللہ پاک نے ان کو یہ بات فرمائی، کیوں کہ اس نے ان کے لیے معیشت کے اسباب مہیا کر دیے ہیں، تاکہ نعمت کا شکر بجا لائیں، کیوں کہ جس زمانے میں وہ اپنی گزر بسر کرتے ہیں، اگر وہ قیامت تک کے لیے مستقل رات ہو جاتا تو وہ اس میں چلنے پھرنے، کھانے پینے اور پہننے کے ضروری امور کی قدرت نہ رکھتے، جن پر زندگی بسر کرنے کا دار و مدار ہے۔

پھر ان پر احسان رکھا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ﴾ یعنی کیا تمھارا کوئی ایسا معبود ہے ان معبودوں میں سے جنھیں تم پوجتے ہو کہ وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہو کہ تم سے اندھیرے کو دور کر دے

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٢٤)

روشنی لاکر، جس میں معیشت اور دوسری ضروری چیزیں تلاش کرو۔ اس میں تم دیکھو، تمھارے میوے پکیں اور تمھاری کھیتیاں بڑھیں اور تمھارے جانور اس میں گزران کریں۔ پھر کیا تم اس بات کو سنتے نہیں ہو اچھی طرح۔ سوچنے سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے یہ ان کو نہایت موثر طریقے سے تنبیہ کی ہے۔ ﴿ اِلٰهٌ ﴾ کی ایک صفت تو غیر اللہ ہے اور دوسری صفت جملۂ ﴿ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ﴾ ہے۔ سرزنش و الزام اسی پر چکر کھاتا ہے۔

پھر جب اللہ پاک دن کے وجود کا اُن پر احسان رکھ چکا تو اُن پر رات کے وجود کی منت رکھی۔ لہٰذا ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی قیامت کے دن تک دن ہی رہے کہ اس کے ساتھ رات نہ ہو، اس طریقے سے کہ آسمان کے درمیان سورج کو ساکن کر دے یا اس اُفق کے اوپر مدار پر حرکت دے تو تمھارے زعم میں کون سا معبود ہے اللہ کے سوا جو تمھارے لیے رات لے آئے جس میں تم قرار پکڑو رنج، محنت اور تھکاوٹ سے۔ تاکہ معاش اور کمائی کی طلب میں جو تم محنت اٹھاتے ہو، اس سے آرام پاؤ۔ کیا تم اس عظیم فائدے کو ایک عقل مند، بیدار اور ہوشیار شخص کی طرح نہیں دیکھتے ہو، یہاں تک کہ غیر اللہ کی جو پرستش کرتے ہو اس سے باز آجاؤ۔

پھر جب وہ اس بات کا اقرار کر لیں کہ اس پر سوائے اللہ عزوجل کے اور کوئی بھی قادر نہیں ہے تو اُن پر حجت قائم ہوگئی اور وہ ناقص اور بے کار شبہے، جن کو وہ اپنے دل میں بٹھائے بیٹھے ہیں، وہ باطل ہوگئے۔ "سَرْمَد" بہ معنی دائم و مستمر ہے، جو "سرد" سے ماخوذ ہے۔ "سرد" متابعت اور اطراد کو کہتے ہیں، پس میم زائد ہے جس طرح کہ "دلامص" میں ہے "دلاص" سے اور وزن اس کا "فعمل" ہے۔ ("دلامص": بضمِ دال مہلہ و کسرِ میم بہ معنی براق ہے، اسی معنے سے زرہ کو "دلاص" کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "دلامص" درع براق ہے۔ "يُقَالُ: دِرْعٌ دَلَاصٌ وَأَدْرُعٌ دَلَاصٌ، اَلْوَاحِدُ وَالْجَمْعُ عَلٰى لَفْظٍ وَّاحِدٍ"[1] قاله الجوهري۔) کسی نے کہا ہے کہ سرمد کی میم اصلی ہے اور وزن "فعلل" ہے "فعمل" نہیں ہے۔ ظاہر یہی بات ہے۔

نکتہ:

﴿ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ﴾ حق اس کا یہ تھا کہ "هَلْ إِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ" ہوتا، اس لیے کہ "ہل" تصدیق کا سوال کرنے کے لیے ہے اور بہ حسبِ ظاہر مناسب مقام یہی ہے، کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ نہیں ہے، جو تعیین طلب کرنے کے لیے ہوتا ہے اور اصل وجود کا مقتضی ہے، لیکن کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ ان کے زعم کی بنا پر ذکر فرمایا کہ ان کے آلہہ موجود ہیں۔ اس سے غرض سرزنش اور تضلیل ہے، چنانچہ اس میں زیادہ مبالغہ ہے۔ (قال زاده: و الظاهر أن يقال: هل إله

[1] الصحاح للجوهري (٤/ ١٧٧)

لأن المقام مقام إنكار إله يقدر على ذلك غير الله تعالى لا مقام تعيين الله يقدر عليه غيره إلا أنه ذكر من بناء على زعمهم تعدد الآلهة فقيل في الرد عليهم لمن الألوهية تقتضي القدرة على كل شيء فأي شيء مما تزعمون أنه إله من دون الله يقدر على ما ذكرنا)۔ یہ حاصل ہے شہاب کا۔[1]

نکتہ:

"لَیل" کا وصف ذکر فرمایا ﴿ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ﴾، پس اس کے مقابلے میں مناسب تھا کہ ضیاء کا وصف بھی "تَتَصَرَّفُوْنَ فِيْهِ" ذکر ہوتا، لیکن ضیا کا وصف بالکل ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصد اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ ضیاء فی ذاتہ مقصود بہ نفسہ ایک نعمت ہے، اگر اس کی صفت ذکر کی جاتی تو معلوم ہوتا کہ ضیاء اسی صفت کی وجہ سے مقصود ہے اور خود مقصود نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اس کا وصف "لَیل" کے وصف کے مقابلے میں ذکر کیا جاتا تو سمجھا جاتا کہ اس کا فائدہ صرف اسی صفت کی وجہ سے ہے، حالاں کہ اس پر منحصر نہیں ہے، بلکہ اس کے تو بہت سے فائدے ہیں، اس لیے اس کو صرف نام لے کر چھوڑ دیا اور اس کا کوئی وصف ذکر نہیں کیا۔ پھر چوں کہ "ضیاء" کے منافع "لَیل" کے منافع سے زیادہ ہیں، اس لیے "ضیاء" کے ساتھ ﴿ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴾ کہا ہے اور "لَیل" کے ساتھ ﴿ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ فرمایا ہے، کیوں کہ سمع کا فائدہ بصر کے فائدے سے بڑھ کر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل بصر سے صرف دیکھی گئی چیزوں کی صورتوں کے بارے میں معلوم کرتی ہے اور سمع ہر قسم کی محسوس ہونے والی چیزوں کا ادراک کرتی ہے، بلکہ معقولاتِ صرفہ کا، جبکہ ان سے ایسی عبارت کے ساتھ تعبیر کی جائے جو اُن پر دال ہو۔ کسی نے یوں کہا ہے کہ اللہ پاک نے "ضیاء" کے ساتھ ﴿ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴾ کو اس لیے رکھا ہے کہ "ضیاء" کے درک منافع اور وصف فوائد سے سمع اس شے کا ادراک کرتا ہے جس کا ادراک بصر نہیں کرتی اور "لَیل" کے ساتھ ﴿ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ کو اس لیے رکھا ہے کہ "لَیل" سے بصر اس شے کا ادراک کرتی ہے جس کا سمع ادراک نہیں کرتا۔ کسی نے یہ کہا ہے: اس لیے کہ غیر تیرا دیکھتا ہے تاریکی کی منفعت سے اس شے کو جس کو تو دیکھتا ہے، یعنی سکون وغیرہ۔

﴿ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک کی رحمت سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم رات میں چین پکڑو اور دن میں اس کے فضل کو تلاش کرو، اس طرح سے کہ کمائیوں کے لیے سعی وکوشش کرو۔ اس میں طلبِ رزق میں کوشش کرنے کی تعریف ہے اور وہ توکل کے منافی نہیں ہے۔ اور شاید تم شکر کرو اللہ کی نعمت کا جو تم پر ہو۔ یہ بات جان رکھو کہ دن میں سکون حاصل کرنا اور رات میں طلبِ رزق کرنا، اگرچہ ممکن ہے جب کہ چاند زمین پر

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ٨٣)

طلوع کرے یا جس چیز میں روشنی ہے، یعنی چراغ وغیرہ اس کی روشنی میں کام کر سکتا ہے، لیکن یہ بات بہت تھوڑی اور نادر ہے اور اللہ کے بندے جس کے ساتھ مالوف ہو رہے ہیں اس کے خلاف ہے، اس لیے اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اللہ پاک کی نعمت سے ہے، اس نے رات اور دن کو ایسا بنایا ہے کہ ایک دوسرے کے پیچھے چلا آتا ہے۔ اس لیے کہ آدمی حالِ دنیا اور حالِ تکلیف میں محنت و مشقت کی طرف رکھا گیا ہے، تاکہ وہ جس شے کا حاجت مند ہے اس کو حاصل کرے اور یہ بات صرف راحت و سکون میں پوری ہوتی ہے، اس لیے رات اور دن دونوں کا دنیا میں ہونا ضروری ہے۔

رہی جنت تو اس میں نہ تھکاوٹ ہے نہ رنج اور محنت، بلکہ چین ہی چین ہے، اس لیے وہاں ان کو رات کی حاجت نہیں ہے اور اسی لیے اُن کے لیے ہمیشہ روشنی رہے گی۔ چنانچہ اللہ پاک نے بیان فرمایا کہ اس پر وہی قادر ہے نہ کہ اس کا غیر۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اللہ پاک نے اس آیت سے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ رات اور دن کے اس طرح پیدا کرنے میں کہ ایک دوسرے کے پیچھے لگے آتے ہیں، حکمت تین چیزیں ہیں: ان میں سے دو تو اُن کی پیدایش میں ترتیب دی گئی ہیں لف و نشر کے طریق سے، یعنی ایک میں پوشیدگی ہے اور دوسرے میں اظہار ہے اور تیسری چیز ان دونوں کی خلق پر ترتیب دی گئی ہے، پس اس میں لف و نشر کا اعتبار نہیں ہے۔[1]

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٧٥﴾

اور جس دن اللہ انھیں پکارے گا، پھر وہ کہے گا: کہاں ہیں میرے وہ شریک جنھیں تم (میرا شریک) سمجھتے تھے؟ (74) اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکالیں گے، پھر ہم کہیں گے: تم (میرے ساتھ شرک کرنے پر) اپنی دلیل لاؤ، پھر وہ جان لیں گے کہ بے شک سچی بات اللہ ہی کی ہے اور ان سے گم ہو جائے گا جو کچھ وہ جھوٹ گھڑتے تھے (75)

مشرکین کو ڈانٹ ڈپٹ:

ہر اُمت کا گواہ، یعنی پیغمبر یا ان کے نائب یا جو نیک بخت تھے۔ انتہٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بھی ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کے لیے اُن لوگوں کو دوسری نداء ہے جنھوں نے اللہ کے سوا کوئی اور معبود پوجا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام گواہوں کے روبرو اُن کو پکارے گا اور فرمائے گا کہ میرے شریک کہاں ہیں جن کا تم دنیا میں دعویٰ کیا

[1] فتح البیان (١٠/ ١٤٤۔ ١٤٦)

کرتے تھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ شَهِيدًا ﴾ یعنی گواہ سے مراد رسول ہے۔[1] پھر ہم کہیں گے کہ اپنی اس بات کی صحت پر، جس کا تم نے دعویٰ کیا تھا کہ اللہ کے واسطے شریک ہیں، اپنی سند لاؤ، تب وہ یہ جان لیں گے کہ سچی بات اللہ کی ہے، یعنی اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر وہ نہ بولیں گے نہ ہی کچھ جواب دیں گے۔ ﴿ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا يَفْتَرُوْنَ ﴾ "أَيْ: ذَهَبُوْا فَلَمْ يَنْفَعُوْهُمْ" یعنی جن کو معبود بنایا تھا، وہ جاتے رہے، پس ان کو کچھ نفع نہ پہنچایا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے نداء کو دوبارہ ذکر فرمایا دونوں حالتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے، اس لیے کہ ایک دفعہ اُن کو نداء کی جائے گی تو وہ بتوں کو پکاریں گے اور دوسری بار اُن کو نداء کی جائے گی تو وہ خاموش رہیں گے۔ نداء کے اس دوبارہ کرنے میں بھی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد پھر ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ ہے اور ان کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اللہ پاک کے غضب کو کھینچنے والی اس کے ساتھ شرک کرنے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ جس طرح کہ اس کی رضا مندی میں داخل کرنے والی اس کی توحید سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ یا پہلی نداء ان کے خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہے اور دوسری نداء یہ بات بیان کرنے کے لیے کہ ان کا شرک کرنا کسی سند اور دلیل سے نہیں ہے وہ تو محض ان کی خواہش نفس ہے۔

قولہ: ﴿ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ﴾ معطوف ہے "يُنَادِيْ" پر۔ ماضی کا صیغہ اس لیے ذکر کیا ہے کہ تحقق پر دلالت کرے۔ یعنی ہم تمام اُمتوں میں سے ہر اُمت سے ایک گواہ نکالیں گے جو ان کی اس بات پر گواہی دے گا جو وہ کہیں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "شہید" سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ہر اُمت کے عدول، یعنی نیک لوگ۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ٤١] "پھر ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس امت پر گواہ بنائیں گے؟"

پھر جو بات اللہ تعالیٰ ہر اُمت سے فرمائے گا وہ اس قول سے بیان کی: ﴿ فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ﴾ یعنی پھر ہم ان سے کہیں گے کہ اس بات پر اپنی حجت اور دلیل لاؤ کہ میرے ساتھ شریک ہیں۔ پھر اس وقت وہ اقرار کر لیں گے اور برہان قائم کرنے سے گونگے ہو جائیں گے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ ﴾ یعنی پھر جان لیں گے کہ حق اللہ پاک کے لیے ہے الہیت و معبودیت میں اور وہ وحدہ لا شریک لہ ہے۔ ﴿ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ یعنی دنیا میں جو جھوٹ جوڑا کرتے تھے کہ اللہ کے واسطے شریک ہیں، جو عبادت کے مستحق ہیں، پس یہ

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٦١٤) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٢٤) [3] تفسير الطبري (١٩/ ٦١٤)

بات ان سے ایسے غائب ہو جائے گی جیسے گم ہوئی چیز غائب ہو جاتی ہے اور وہ جاتی رہے گی اور باطل ہو جائے گی۔ پھر اہلِ ضلال کے قصے کے بعد قارون کا قصہ ذکر فرمایا، اس لیے کہ اس میں عجیب وغریب قدرت اور کاری گری کا بیان ہے۔[1]

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝۷۶ وَابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۷۷ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۷۸

بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا، پھر اس نے ان پر ظلم کیا، اور ہم نے اسے اس قدر خزانے دیے تھے کہ بلاشبہ اس کی چابیاں ایک طاقتور (مردوں کی) جماعت پر بھاری ہوتی تھیں، (یاد کرو) جب اس کی قوم نے اس سے کہا: تو اِترا مت، بے شک اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا (76) اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے، تو اس سے آخرت کا گھر تلاش کر، اور تو دنیا میں بھی اپنا حصہ مت بھول، اور تو (لوگوں سے) ایسے احسان کر جیسے اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے، اور تو زمین میں فساد نہ کر، بے شک اللہ فسادیوں کو پسند نہیں کرتا (77) قارون نے کہا: مجھے تو یہ (مال) محض اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو میرے پاس ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ بے شک اللہ نے اس سے پہلے ایسے بہت سے لوگ ہلاک کر دیے تھے جو قوت میں اس سے زیادہ تھے اور لاؤ لشکر میں بڑھ کر تھے، اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا (78)

قارون کو اس کی قوم کی نصیحت:

قارون موسیٰ علیہ السلام کے جد کی اولاد میں سے تھا، فرعون کی سرکار میں پیش ہو گیا تھا، بنی اسرائیل پر کار بیگار یہی پہنچاتا

[1] فتح البیان (۱۰/ ۱۴۶)

تھا اور مزدوری اسی کے ہاتھ سے ملتی تھی، اس کام میں بہت مال کمایا، جب بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے تابع ہو گئے اور فرعون غرق ہو گیا تو اس کی روزی ختم ہو گئی اور سرداری نہ رہی، دل میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ضد رکھتا تھا، منافق بن کر ان کی عدمِ موجودگی میں عیب دیتا اور تہمتیں لگاتا۔ ایک دن ایک عورت کو تہمت کی بات سکھا کر سامنے لایا، اس عورت نے اللہ سے ڈر کر سچ کہہ دیا کہ اس نے مجھ کو سکھایا تھا، موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے زمین میں غرق ہوا اور اس کا گھر اور خزانہ بھی غرق ہوا۔ فساد نہ کر، یعنی موسیٰ علیہ السلام سے ضد نہ کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول، یعنی حصے کے مطابق کھا پی اور پہن اور باقی مال سے آخرت کما۔ اس نے کہا کہ دنیا کمانے کا سلیقہ مجھے ایک منتر سے ملا ہے۔ گناہ گاروں سے باز پرس نہیں کی جاتی، یعنی گناہ گاروں کی سمجھ درست ہو تو گناہ کیوں کریں، جب سمجھ اُلٹی پڑی تو الزام دینے کا کیا فائدہ کہ یہ برا کام کیوں کرتا ہے، اس کی برائی نہیں سمجھتا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام اعمش رحمہ اللہ نے عن المنہال بن عمرو عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا، فرمایا کہ ان کا چچا زاد بھائی تھا، اسی طرح امام ابراہیم نخعی، عبداللہ بن حارث بن نوفل، سماک بن حرب، قتادہ، مالک بن دینار اور ابن جریر رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے چچا کا بیٹا تھا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ قارون بن یصہر بن قاہث ہے اور موسیٰ بن عمران بن قاہث ہیں۔ امام محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ کا زعم یہ ہے کہ قارون موسیٰ بن عمران علیہ السلام کا چچا تھا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا اور اکثر اہلِ علم اس پر ہیں کہ وہ اُن کے چچا کا بیٹا تھا۔ واللہ أعلم۔ امام قتادہ بن دعامہ نے کہا ہے کہ ہم اس بات کی حدیث بیان کیے جاتے تھے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا چچا تھا اور اس کا نام منور رکھا جاتا تھا، اس لیے کہ تورات کو اچھی آواز سے پڑھتا تھا، لیکن اللہ کا دشمن منافق ہو گیا جس طرح کہ سامری منافق ہو گیا تھا، پس بغی یعنی سرکشی نے اس کو ہلاک کر دیا، جو مال کی کثرت کے سبب سے اس کو ہو گئی تھی۔ امام شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نے اپنی قوم پر تکبر اور بڑائی کے لیے اپنے کپڑوں میں بالشت بھر لمبائی زیادہ کی تھی۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کو اتنا زیادہ مال دیا تھا کہ البتہ اس کی کنجیوں کی کثرت کی وجہ سے ان کا اُٹھانا لوگوں کی جماعتوں پر بھاری ہوتا تھا۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے خیثمہ سے روایت کیا ہے کہ قارون کے خزانوں کی کنجیاں چمڑوں کی تھیں۔ ہر کنجی انگلی کے برابر تھی۔ ہر کنجی علاحدہ ایک خزانے کی تھی، پھر جس وقت وہ سوار ہوتا تو ساٹھ پنچ کلیان خچروں پر لادی جاتی تھیں،[2] اس کے سوا اور قول بھی ہیں۔ واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر الطبري (١٩/ ٦١٥۔ ٦١٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٠٥) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٠٧)

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ ﴾ یعنی اس کی قوم کے صالح اور نیک لوگوں نے اس کو اس حالت کے بارے میں وعظ ونصیحت کی جس میں وہ تھا، اس کی خیر خواہی اور نصیحت اور ہدایت کے لیے اور کہا: ﴿ لَا تَفْرَحْ ﴾ یعنی جس حال میں تو ہے اس سے خوش مت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس مال ومنال میں تو ہے اس کے سبب سے اِترا مت، فخر نہ کر۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی ''اَلْمَرِحِیْنَ'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''اَلْأَشِرِیْنَ الْبَطِرِیْنَ'' یعنی اللہ اِترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا، جو اللہ کا اس شے پر شکر نہیں کرتے جو اس نے ان کو عطا کی ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ﴾ یعنی یہ مالِ کثیر اور نعمتِ طائلہ، (یعنی طویل اور بے شمار نعمت) جو اللہ پاک نے تجھ کو بخشی ہے، اس کا اپنے رب کی اطاعت میں استعمال کر اور انواع واقسام کی قربتوں، عبادتوں سے اس کا تقرب ڈھونڈ کہ جن کے سبب سے دنیا وآخرت میں تجھ کو ثواب حاصل ہو اور دنیا سے اپنے حصے کو مت بھول، یعنی اللہ پاک نے جو کھانا پینا پہننا، رہنا بسنا، گھر بار، جورو بیاہ شادی اس میں جائز کیا ہے، اس سے اپنا حصہ لے، کیوں کہ تیرے رب کا تجھ پر ایک حق ہے اور تیری جان کا تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے اور تیرے ملاقاتی کا تجھ پر حق ہے، لہٰذا ہر حق والے کو اس کا حق دے اور احسان کر جیسا اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔ یعنی اس کی خلق سے بھلائی کر جیسے اس نے تجھ سے بھلائی کی ہے اور ملک میں خرابی پیدا کرنا نہ چاہ، یعنی جس عیش وآرام میں تو ہے اس کے سبب سے تیرا یہ ارادہ نہ ہو کہ تو اس زمین میں خرابی پیدا کرے اور اللہ کی مخلوق سے برائی کرے۔ اللہ بگاڑ ڈالنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ﴾ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ قارون نے اپنی قوم کو کیا جواب دیا، جبکہ انھوں نے اس کو نصیحت کی اور خیر کی طرف دعوت دی۔ وہ بولا کہ جو بات تم کہتے ہو میں اس کا محتاج نہیں ہوں، کیوں کہ اللہ نے جو مال مجھے عطا کیا ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کا مستحق ہوں اور اللہ کو مجھ سے محبت ہے۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے: ''إِنَّمَا أُعْطِيتُهُ لِعِلْمِ اللّٰهِ فِيَّ أَنِّي أَهْلٌ لَهُ'' یعنی میں جو یہ مال دیا گیا ہوں تو بہ سبب علم اللہ کے میرے حق میں اس بات کا کہ میں اس کا اہل ہوں۔

یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ ﴾ [الزمر: ٤٩] ''پھر جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے اور جب ہم اپنی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٠٩۔ ٣٠١٠)

طرف سے اسے کوئی نعمت عطا کر دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے: بس مجھے تو یہ (میرے) علم کی بدولت دی گئی ہے۔'' ''أَيْ: عَلٰى عِلْمٍ مِّنَ اللّٰهِ بِيْ'' نیز جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ﴾ [حم السجدة: ٥٠] ''اور جو تکلیف اسے پہنچی ہے، اس کے بعد اگر ہم اسے اپنی رحمت (کا مزہ) چکھائیں تو وہ یقیناً کہتا ہے: یہ تو میرے ہی لیے ہے۔'' یعنی میں اس کا مستحق ہوں۔ بعض سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قارون علمِ کیمیا کی محنت و مشقت اٹھایا کرتا تھا، غرض یہ کہ اس جگہ علم سے مراد علمِ کیمیا ہے، گویا کیمیا کے ذریعے سے اس نے مال جمع کیا تھا۔ یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ علمِ کیمیا فی نفسہٖ ایک علمِ باطل ہے، کیوں کہ اعیان کے قلب کرنے پر سوائے اللہ عزوجل کے کوئی قادر نہیں ہے۔ اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ﴾ [الحج: ٧٣] ''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، لہٰذا تم اسے غور سے سنو، بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی ہرگز نہیں پیدا کر سکتے، اگرچہ وہ (سارے بھی) اس کے لیے جمع ہو جائیں۔''

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور کون بڑھ کر ظالم ہے اس شخص سے جو چلا پیدا کرنے میری خلق کی طرح، لہٰذا چاہیے کہ ایک ذرہ پیدا کریں یا ایک جو ہی بنائیں۔[1] یہ بات تو مصوروں کے حق میں وارد ہوئی ہے جو اللہ کی مخلوق کے مشابہ کرتے ہیں صرف ظاہری صورت میں یا شکل میں۔ پھر اس کا حال کیسا ہوگا جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس ذات کی ماہیت کو دوسری ذات کی ماہیت کی طرف منتقل کرتا ہے۔ یہ امر جھوٹ و محال و جہالت و گمراہی ہے اور ان کو جو قدرت ہوتی ہے تو صرف ظاہر صورت میں رنگنے کی قدرت رکھتے ہیں حالاں کہ وہ جھوٹ اور ملمع کاری ہے اور اس بات کا رواج دینا ہے کہ وہ واقعی صحیح ہے، حالاں کہ بالکل ایسا نہیں ہے اور نہ ہی شرعی طریقے سے ثابت ہوا ہے کہ کیمیا اس طریقے سے صحیح ہوا ہو، جس کے لیے یہ فاسق اور جھوٹے لوگ محنت و مشقت اٹھاتے ہیں۔ رہی خرقِ عادت جو اللہ پاک بعض اولیاء کے ہاتھ پر جاری کرتا ہے اور بعض اعیان کا قلب کر کے چاندی یا سونا یا اس کی مثل کر دیتا ہے تو یہ ایک ایسا امر ہے کہ نہ کوئی مسلمان اس کا انکار کرتا ہے نہ کوئی مومن اس کو رد کرتا ہے، لیکن یہ کاریگری کی قبیل سے نہیں ہے۔ یہ تو آسمانوں اور زمین کے رب کی مشیت سے ہے اور اس کے اختیار اور فعل سے ہے۔

حکایت:

چنانچہ حیوہ بن شریح مصری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ کسی سائل نے ان سے سوال کیا تو ان کے پاس کوئی چیز نہ تھی

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٧١٢٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢١١١)

کہ اس کو دیں اور اس کی ضرورت دیکھی تو ایک کنکر زمین سے لیا، پھر اس کو اپنی ہتھیلی میں پھرایا، پھر اس کو سائل کی طرف ڈال دیا تو اچانک وہ سرخ سونا تھا (اللہ پاک کا فضل ہمیشہ جاری رہتا ہے، چنانچہ شیخ غلام محمد نو مسلم خیر آبادی نے اپنے پیر عبداللہ شاہ پنجابی کی بعینہٖ یہی کیفیت خاکسار سے بیان کی کہ بارہا ان کو ایسا اتفاق ہوا۔ ان عبداللہ شاہ کا انتقال اوجین میں ہوا۔ رحمہ اللہ۔ یہ قصہ خاکسار نے شیخ غلام محمد سے ۶/ شعبان ۱۳۱۲ھ میں سنا)۔ احادیث و آثار اس بارے میں بہت ہیں، ان کے ذکر میں طول ہوتا ہے۔

بعض نے کہا کہ قارون اسمِ اعظم جانتا تھا، لہٰذا اس نے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اس کے سبب سے مال دار ہو گیا۔ صحیح معنی اول ہیں، اسی لیے اس نے جو یہ دعویٰ کیا تھا کہ اللہ نے جو مال اس کو عطا کیا ہے اس میں اللہ کو اس کی پروا ہے اور اس کے نزدیک اس کی عزت و حرمت ہے۔

چنانچہ اللہ پاک نے اس دعوے کو یوں ردّ فرمایا: ﴿اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا﴾ یعنی قارون سے پہلی اُمتیں قوت اور مال میں اس سے بڑھ کر تھیں، باوجود اس کے اُن کے کفر اور ناشکری کے سبب سے اللہ پاک نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ ان کے مقابلے میں قارون کی کیا ہستی ہے؟! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قارون کو مال ملا، کچھ اس لحاظ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس سے محبت ہے، اس کے نزدیک اس کی آؤ بھگت ہے۔ چوں کہ اگلوں کو کفر اور شکر نہ کرنے کے سبب سے ہلاک کیا، اسی لیے یہ فرمایا: ﴿وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ یعنی مجرموں سے ان کے گناہوں کا سوال نہ ہوگا ان کے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ، عَلٰى خَيْرٍ عِنْدِيْ" یعنی یہ تو مجھے ایک خیر کی وجہ سے ملا ہے، جو میرے پاس ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "عَلٰى عِلْمٍ إِنِّيْ أَهْلٌ لِذٰلِكَ" یعنی یہ تو مجھ کو ملا ہے اللہ کو جاننے سے اور اس کا میں مستحق ہوں۔ امام عبدالرحمن بن زید بن اسلم نے اس آیت بہت خوب تفسیر بیان کی ہے، کیوں کہ انھوں نے یوں کہا ہے کہ اگر نہ ہوتی اللہ کی رضا مجھ سے اور اس کی میری فضیلت کو پہچاننا نہ ہوتا تو وہ یہ مال مجھے عطا نہ کرتا اور یہ آیت پڑھی: ﴿اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا﴾[1] یعنی اللہ مجھ سے خوش ہے اور میرے فضل اور رُتبے کو جانتا ہے، جبھی تو یہ مالِ جزیل مجھے عطا کیا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ قارون عجمی نام ہے، علمیت و عُجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے، اس کا وزن فاعول ہے۔ عربی "قَرَنْتُ" سے مشتق نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر قارون "قَرَنْتُ الشَّيْءَ" سے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۱۲)
[2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۲۴۔ ۵۲۶)

ہوتا تو منصرف ہوتا۔ اس میں تین قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے چچا کا بیٹا تھا۔ یہ قول امام نخعی اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما کا ہے۔ نسب اس کا یہ ہے: قارون بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام بن عمران بن قاہث ہیں۔ چنانچہ قارون کا باپ یصہر اور موسیٰ علیہ السلام کے والد عمران دونوں بھائی ہیں؛ قاہث کے بیٹے۔ دوسرا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا چچا تھا۔ یہ قول امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کا ہے۔ انھوں نے قارون کو عمران کا بھائی ٹھہرایا۔ عمران و قارون قاہث کے بیٹے ہیں۔[1] تیسرا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی خالہ کا بیٹا تھا، اگلے دو قول پہلے گزر چکے ہیں۔

قارون کی خوبصورتی کی وجہ سے اس کو منور کہتے تھے۔ امام رازی نے کہا ہے کہ قارون ان ستر آدمیوں میں سے تھا جن کو موسیٰ علیہ السلام نے مناجات کے لیے پسند کیا تھا، چنانچہ اس نے اللہ کا کلام سنا۔[2] انتہی۔ بنی اسرائیل میں اس سے بڑھ کر تورات کا پڑھنے والا کوئی نہ تھا، پھر وہ منافق ہو گیا، جس طرح کہ سامری منافق ہوا اور موسیٰ علیہ السلام کی طاعت سے نکل گیا۔ یہی معنی ہیں: ﴿ فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ﴾ کے، یعنی پھر حد سے بڑھ گیا تجبر و تکبر میں اور قوم پر فضیلت طلب کی اور چاہا کہ وہ اس کے زیرِ حکم ہوں اور موسیٰ علیہ السلام کا حسد کیا اُن کی رسالت پر اور ہارون علیہ السلام کا ان کی اطاعت پر اور اللہ پاک کا منکر ہوا اس کے بعد کہ دونوں پر ایمان لا چکا تھا، یہ سب کچھ اپنے مال کی کثرت کی وجہ سے کیا۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی بنی اسرائیل پر بغی اور سرکشی یہ تھی کہ اپنے مال اور اولاد کی کثرت کے مارے ان کو سبک، یعنی کم تر سمجھتا تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی بغاوت یہ تھی کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کو اپنے طرف منسوب کیا اور اسے اپنے علم وفن کا نتیجہ قرار دیا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل پر عامل مقرر تھا، چنانچہ ان پر زیادتی اور ظلم کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی بغی اس کے سوا اور کسی امر کے ساتھ تھی، یہ امر اس قبیل سے ہے کہ آیت کے معنی سے مناسبت نہیں رکھتا۔ "کُنُوْزٌ" جمع ہے "کَنْزٌ" کی۔ "کَنْزٌ" ذخیرہ کیے ہوئے مال کو کہتے ہیں۔ اس کے اموال کا نام "کُنُوْزٌ" اس لیے رکھا کہ وہ زکات کے ادا کرنے سے باز رہنے والا تھا۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے خزانوں میں سے ایک خزانہ اس کو مل گیا تھا۔[4] کسی نے کہا ہے کہ کیمیا بنایا کرتا تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مَآ ﴾ موصولہ ہے، اس کا صلہ ﴿ اِنَّ ﴾ ہے اور جو کچھ اس کے تحت میں ہے، اور اسی لیے کلمۂ ﴿ اِنَّ ﴾ مکسور ہوا ہے۔ امام اخفش صغیر رحمہ اللہ نے کوفیوں سے نقل کیا ہے کہ وہ اس بات کو منع کرتے ہیں کہ "اِنَّ" کو مع اسم وخبر کے "اَلَّذِيْ" کا صلہ ٹھہرایا جائے اور ان کی اس بات کو قبیح سمجھا ہے، اس لیے کہ وہ کتابِ عزیز میں اس جگہ وارد ہوا ہے۔

"مَفَاتِحُ" جمع ہے "مِفْتَحٌ" بالکسر کی۔ "مِفْتَحٌ" وہ شے ہے جس سے کھولا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳۱۰) [2] تفسیر الرازي (۲۵/ ۱۳)

[3] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳۱۰) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۰۷)

''مَفَاتِحُ'' سے مراد خزائن ہیں، اس بنا پر اس کا واحد ''مَفْتَحٌ'' بہ فتح میم ہوگا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر مفسرین کے قول میں ''مَفَاتِحُ'' خزائن ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔'' کہا: یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے۔ کہا: تفسیر میں اشبہ، یعنی زیادہ مشابہ ہے کہ ﴿ مَفَاتِحَهٗ ﴾ سے مراد اس کے مال کے خزانے ہیں۔ اور لوگوں نے کہا ہے کہ ''مَفَاتِحُ'' ''مِفْتَاحٌ'' کی جمع ہے۔ ''مِفْتَاحٌ'' وہ شے ہے جس سے دروازہ کھولا جاتا ہے، چنانچہ یہ قول امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ کا ہے۔[1]

امام خیثمہ سے مروی ہے کہ قارون کے خزانے کی کنجیاں اُونٹ کے چمڑے کی تھیں۔ ہر کنجی انگلی کی طرح تھی، ہر کنجی ایک علاحدہ خزانے کی تھی، پھر جب وہ سوار ہوتا تو وہ کنجیاں ستر پنج کلیان خچروں پر لادی جاتی تھیں۔ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ دوسرا قول خیثمہ سے یہ مروی ہے، کہا کہ میں نے انجیل میں پایا ہے کہ ''إِنَّ بِغَالَ مَفَاتِيحِ خَزَائِنِ قَارُوْنَ غُرٌّ مُحَجَّلَةٌ''، یعنی قارون کے خزانوں کی کنجیوں کے خچر پنج کلیان تھے، ان میں سے ہر کنجی انگلی سے بڑی نہ تھی۔ ہر کنجی کے لیے ایک خزانہ تھا۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ خیثمہ نے یہ جو ذکر کیا ہے میں نے اس کو انجیل میں نہیں پایا۔[2]

﴿ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ﴾ یہ جملہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہے اور ﴿ اِنَّ ﴾ مع اپنے اسم وخبر کے صلہ ہے مائے موصولہ کا اور مائے موصولہ مع صلہ محلِ نصب میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اٰتَيْنٰهُ ﴾ کا مفعولِ ثانی ہے۔ ﴿ لَتَنُوْٓاُ ﴾ ماخوذ ہے نوء سے۔ نوء کہتے ہیں: بگرانی بر خاستن و افتادن کو۔ یہ جملہ من جملہ لغاتِ اضداد ہے، یعنی گرانی کے ساتھ اُٹھنا اور گر پڑنا، جب کوئی شخص کسی شے کو لے کر بھاری ہو کر اُٹھے تو اس وقت عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: ''نَاءَ بِالْحِمْلِ'' اور جب بوجھ اس کو بھاری بوجھل کر دے تو کہتے ہیں: ''نَاءَ بِهِ الْحِمْلُ'' اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ حرفِ با تعدیت کے واسطے ہے، مثل ہمزہ کے اور کلام میں قلب نہیں ہے، یعنی البتہ بوجھل کرتی تھیں کنجیاں جماعتِ قوی کو، مطلب یہ ہے کہ ان کو کنجیوں کا اُٹھانا بھاری لگتا تھا تو وہ اُن کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی کثرت کے سبب سے، وہ ان کو ضبط کرنے کی، یعنی شمار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔[3] انتھٰی.

دوسری وجہ یہ ہے کہ کلام میں قلب ہے، اصل میں یوں ہے: ''لَتَنُوْءُ الْعُصْبَةُ بِالْمَفَاتِحِ''، یعنی البتہ بھاری ہو کر اُٹھتی تھی وہ جماعتِ زور آور کنجیوں سے۔ یہ قول امام ابو عبید رحمہ اللہ کا ہے۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا: ''نَاوَتُ بِالْحِمْلِ إِذَا نَهَضْتَ بِهِ''، یعنی جب تو بوجھ لے کر اُٹھے تو اس وقت کہے گا: ''نَاوَتُ بِالْحِمْلِ''۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ البتہ مائل کرتی اور جھکاتی تھیں کنجیاں زور آور جماعت کو اپنے بوجھ سے۔ غرض یہ ہے کہ حرفِ باء تعدیت کا ہے ہمزہ کی طرح۔ جس طرح کہ محاورے میں بولتے ہیں: ''يَذْهَبُ بِالْبُؤْسِ، وَيُذْهِبُ الْبُؤْسُ، وَذَهَبَتُ

[1] فتح القدير (٤/ ٢٤٤) [2] فتح القدير (٤/ ٢٤٩) [3] تفسير الرازي (٢٥/ ١٤)

بِهِ، وَأَذْهَبْتُهُ، وَجِئْتُ بِهِ، وَأَجَأْتُهُ نَوَّتُ بِهِ، وَأَنَأْتُهُ" ("أَنَأْتُهُ" اصل میں اسی طرح ہے)۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور اسی کے قائل بہت سے سلف ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "نائ" سے ماخوذ ہے، نائ بہ معنی بعد ہے، یہ قول بعید ہے۔ بدیل بن میسرہ نے "لَيَنُوْءُ" بیائے تحتانی پڑھا ہے، اس بنا پر معنی یہ ہیں: "لَيَنُوْءُ الْوَاحِدُ مِنْهَا أَوِ الْمَذْكُوْرُ" پس معنی پر حمل کیا ہے،[1] یا تذکیر اس لیے ہے کہ مضاف محذوف کی رعایت کی ہے، کیوں کہ تقدیر یہ ہے: "حِمْلُهَا أَوْ ثِقْلُهَا"۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿مَفَاتِحَهٗ﴾ کی ضمیر قارون کی طرف راجع ہے، پس مضاف نے مضاف الیہ سے تذکیر حاصل کر لی، جس طرح کہ "ذَهَبَتْ أَهْلُ الْيَمَامَةِ" میں مضاف نے مضاف الیہ سے تانیث حاصل کی ہے۔[2] (كذا قاله الزمخشري)

"عصبة" سے مراد وہ جماعت ہے جو بعض واسطے بعض کے تعصب کرتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "عصبة" تین سے دس تک ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دس سے پندرہ تک۔ کسی نے کہا ہے کہ مابین دس کے بیس تک۔ کسی نے کہا ہے کہ پانچ سے دس تک۔ کسی نے کہا ہے کہ چالیس۔ کسی نے کہا ہے کہ ستر۔ اس کے سوا اور قول بھی ہیں۔ امام ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے "تَنُوْءُ" کی تفسیر میں "تَثْقُلُ" ہے۔[3] امام ابن منذر رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں: "لَا يَرْفَعُهَا الْعُصْبَةُ مِنَ الرِّجَالِ أُولِي الْقُوَّةِ"[4] یعنی قوی مردوں میں سے ایک جماعت ان کو نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ ان سے یہ ہیں کہ عصبہ چالیس مرد ہیں۔[5]

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ﴾ کلمہ ﴿اِذْ﴾ کا ناصب ﴿لَتَنُوْٓاُ﴾ ہے یا ﴿اٰتَيْنٰهُ﴾ یا ﴿فَبَغٰى﴾۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے ان دو کو اس طرح رد کیا ہے کہ "إيتاء وبغى" اس وقت میں نہ تھی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ "اُذْكُرْ" محذوف سے متعلق ہے۔ اس جگہ ﴿قَوْمُهٗ﴾ سے مراد بنی اسرائیل کے مومن لوگ ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، اس جمع سے مراد ایک ہے، غرضیکہ قارون کو وعظ و نصیحت کے لیے قوم نے پانچ جملے کہے: پہلا جملہ یہ ہے کہ ﴿لَا تَفْرَحْ﴾ اس کے معنی ہیں: "لَا تَبْطَرْ وَلَا تَأْشَرْ وَلَا تَمْرَحْ بِكَثْرَةِ الْمَالِ" یعنی تو مال کی کثرت سے مت اِترا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ﴾ "أَيْ: اَلْبَطِرِيْنَ الْأَشِرِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يَشْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَلٰى مَا أَعْطَاهُمْ" یعنی اللہ اِترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا، جو اللہ کا اس شے پر شکر نہیں کرتے جو اس نے ان کو عطا کی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ مال سے خوش مت ہو، اس لیے کہ مال سے خوش ہونے والا اس کا حق ادا نہیں کرتا۔ کسی نے کہا ہے کہ فساد مت کر۔ عرب کے اشعار میں فرح فساد کے معنی میں آیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣١٢) فتح القدير (٤/ ٢٤٤۔ ٢٤٥) [2] الكشاف (٣/ ٤٣٤)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٠٨) [4] الدر المنثور (٦/ ٤٣٨) [5] تفسير الطبري (١٩/ ١٨

کہا ہے کہ "فَرِحِيْنَ وَفَارِحِيْنَ" دونوں برابر ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے فرق کیا ہے کہ "فَرِحِيْنَ" وہ لوگ ہیں جو حال فرح میں ہیں اور "فَارِحِيْنَ" وہ ہیں جو زمانۂ مستقبل میں خوش ہوں گے۔

امام مجاہد نے کہا کہ ﴿لَا تَفْرَحْ﴾ کے معنی "لَا تَبْغِ" ہیں اور "فَرِحِيْنَ" بہ معنی "بَاغِيْنَ" ہے۔[1] کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ بخل مت کر، اللہ بخل کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "فَرِحِيْنَ" بہ معنی "مَرِحِيْنَ" ہے،[2] یعنی اترانے والے۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا سے خوش نہیں ہوتا مگر وہی جو اس سے راضی ہوتا ہے اور چین پکڑتا ہے، اور وہ شخص جس کا دل آخرت کی طرف لگا ہے اور جانتا ہے کہ عن قریب اس کو چھوڑ جائے گا تو وہ اس سے خوش نہیں ہوتا۔

وعظ کا دوسرا جملہ یہ ہے: ﴿وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ﴾ یعنی جو مال وغنا وثروت وآسودگی اللہ نے تجھے دی ہے، اس میں جنت طلب کر اور اپنا مال ومتاع اس شے میں خرچ کر جس کو اللہ پاک پسند فرماتا ہے، جیسے: صدقہ وخیرات کرنا، صلہ رحمی، یعنی خویش واقارب سے حسنِ سلوک سے پیش آنا، بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑے پہنانا، مفلس پر خرچ کرنا اور اپنا مال تجبر وتکبر اور سرکشی اور شرارت میں مت صَرف کر۔ کسی نے "وَاتَّبِعْ" پڑھا ہے۔ عاقل وہی ہے جو دنیا کو اللہ کی اطاعت میں خرچ کرتا ہے اور نہ اس کے آنے سے خوش ہوتا ہے اور نہ اس کے جانے سے رنج کرتا ہے، کیوں کہ اس کا یہی آنا جانا لگا رہتا ہے، اس کی طبیعت میں قیام ودوام نہیں ہے، متنبّی نے خوب کہا ہے:

أَشَدُّ الْغَمِّ عِنْدِيْ فِيْ سُرُوْرٍ   تَيَقَّنَ عَنْهُ صَاحِبُهُ انْتِقَالَا

یعنی میرے نزدیک اس سرور میں بہت زیادہ غم ہے، جس میں سرور والا یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ منتقل ہونے والا ہے۔ تیسرا جملہ یہ ہے: ﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ نصیب یہ ہے کہ اپنی دنیا میں آخرت کے لیے عمل کرے اور انسان کا حصہ اس کی عمر اور عملِ صالح ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس بات کو مت بھول کہ تو اپنی آخرت کے لیے عمل کرے، اس لیے کہ دنیا میں سے انسان کے حصے کی حقیقت وہی شے ہے جو وہ اپنی آخرت کے لیے کرتا ہے۔[3] امام حسن رحمہ اللہ اور امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: معنی یہ ہیں کہ اپنا حصہ دنیا سے، یعنی حلال سے فائدہ اٹھا اور اسے طلب کر۔[4] نظمِ قرآنی کے معنی سے یہ قول خوب مطابقت رکھتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مت بھول اس بات کو کہ دنیا میں اپنی آخرت کے لیے عمل کرے۔[5] بعض نے "نصیب" کی تفسیر کفن سے کی ہے۔ اسی بنا پر کسی شاعر کا قول ہے:

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٤٥) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٦٢٢) [3] معاني القرآن (٤/ ١٥٥)
[4] تفسير ابن ابي حاتم (٩/ ٣٠١١) [5] تفسير الطبري (١٩/ ٦٢٤)

نَصِيبُكَ مِمَّا تَجْمَعُ الدَّهرَ كُلَّهُ رِدَاآنِ تُدْرَجُ فِيهِمَا وَحَنُوطٌ

یعنی جو کچھ تو ساری عمر میں جمع کرتا ہے اس میں سے تیرا حصہ دو چادریں ہیں جن میں تو لپیٹا جائے گا اور حنوط ہے، یعنی وہ خوشبو جو مردے کو اور اس کے کفن کو لگاتے ہیں۔

قاضی بیضاوی نے "نصیب" کی تفسیر اس شے سے کی ہے جو دنیا سے حاجت رکھنے والے آدمی کی ہے۔[1]
حدیثِ مرسل میں مروی ہے کہ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جان: «شَبَابَكَ قَبلَ هَرمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبلَ سُقمِكَ، وَغِنَاكَ قَبلَ فَقرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبلَ شُغلِكَ، وَحَيَاتَكَ قَبلَ مَوتِكَ»[2] یعنی غنیمت جان اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے اور صحت کو بیماری سے پہلے اور غنا کو فقر سے پہلے اور فراغت کو مشغولیت سے پہلے اور حیات کو موت سے قبل۔

یہ قول تو امام مجاہد اور ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔ کہا: اس لیے کہ دنیا میں سے انسان کے نصیب کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی عمر میں آخرت کے لیے عمل کرے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ دنیا میں تو جس شے کا محتاج ہے اسے لے لے اور باقی کو نکال دے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "أُمِرَ أَنْ يُّقَدِّمَ الْفَضلَ وَيُمْسِكَ مَا يُغْنِيهِ"[3]۔ یعنی جو شے حاجت سے زیادہ ہے وہ دوسرے حاجت مند کو دے دے اور جس شے کی خود کو حاجت ہے اس کو رکھ چھوڑے۔

چوتھا جملہ یہ ہے: ﴿وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾ حرفِ کاف تشبیہ کا ہے، یعنی تو بندوں سے دنیا کی نعمتوں کے ساتھ احسان کر، جن کا اللہ نے تجھ پر انعام کیا، جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ احسان سے مراد خالص اللہ پاک کی اطاعت اور عبادت ہے، یعنی تو اللہ پاک کی اطاعت کر اور اس کی عبادت کر جیسا کہ اس نے تجھ پر احسان کیا ہے۔ اس معنی کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اللہ کو اس طرح پوجے گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔[4] (أخرجه في الصحيحين وغيرهما) امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبکہ اس کو مال کے ساتھ احسان کا امر کیا تو دوسری دفعہ صرف احسان کا حکم دیا۔ اس میں یہ سب امور داخل ہیں کہ مال و جاہ سے دوسرے کی مدد کرے، خندہ پیشانی سے ملے، اچھی طرح سے ملاقات کرے۔

پانچواں جملہ یہ ہے: ﴿وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ یعنی اللہ پاک کی نافرمانیوں کا ارتکاب کر کے زمین میں فساد مت کر، بے شک اللہ زمین میں فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ پاک کی زمین کو کفر و شرک اور گناہوں اور فسق و فجور سے آلودہ کرتے ہیں، اللہ پاک ان

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٣٠٣) [2] مستدرك الحاكم (٤/ ٣٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠٧٧)
[3] تفسير البغوي (٦/ ٢٢١) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩)

کو عذاب کرے گا۔ بالجملہ جن لوگوں نے قارون کو یہ وعظ کیا، جس کا ذکر ہو چکا ہے تو وہ اس کو رد کرتے ہوئے بولا:
﴿ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ﴾ یعنی مجھ کو جو کچھ مال ملا ہے تو وہ میرے علم کے سبب سے ملا۔

﴿ عَلٰى عِلْمٍ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنابرحال اور ﴿ عِنْدِيْ ﴾ یا تو ﴿ اُوْتِيْتُهٗ ﴾ کا ظرف ہے یا صلہ ہے ﴿ عِلْمٍ ﴾ کا۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عِلْمٍ ﴾ کی صفت ہے، یعنی میں دیا گیا ہوں اس مال کو درآں حالیکہ میں علم کے ساتھ متصف ہوں، ایسا علم جو میرے پاس ہے۔ وعظ کرنے والوں کی غرض یہ تھی کہ تیرے پاس جو کچھ مال ہے یہ اللہ پاک کی طرف سے تفضّل ہے۔ لہٰذا تو اس کا شکر کر کے اس میں سے خرچ کر، تاکہ وہ باقی رہے۔ گویا اس نے اس قول کا رد کیا کہ تفضّل نہیں ہے، بلکہ میں خود اس کا مستحق ہوں۔ یہ علم جس کو اس نے دنیا پانے کا سبب ٹھہرایا اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا علم تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ تورات کا علم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کمائی کرنے کے طریقے اور زراعت اور مختلف تجارتوں کا علم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کنوز اور دفینوں کا جاننا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ علمِ کیمیا ہے۔

امام رازی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کیمیا جانتے تھے، چنانچہ اس علم کا ایک تہائی تو قارون کو سکھایا اور ایک تہائی یوشع کو اور ایک تہائی کالب کو، پھر قارون نے ان دونوں کو ایسے دھوکا دیا کہ ان کا علم اپنے علم سے ملا لیا۔ چنانچہ رانگ سے لیتا تو اس کو چاندی کر دیتا اور تانبے کو لیتا تو اس کو سونا کر ڈالتا، اس کے مال کی کثرت کا یہ سبب ہوا۔[1] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "إِنَّ اللّٰهَ أَتَانِيْ هٰذِهِ الْكُنُوْزَ عَلٰى عِلْمٍ مِنْهُ بِاسْتِحْقَاقِيْ إِيَّاهَا لِفَضْلِ عِلْمِهِ مِنِّيْ" یعنی اللہ نے مجھ کو یہ خزانے اس بنا پر دیے ہیں کہ اللہ جانتا ہے کہ میں ایک فضیلت کی وجہ سے ان کا مستحق ہوں، جس فضیلت کو اللہ جان چکا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور اس کے علاوہ دوسرے اقوال کا انکار کیا ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے اس کے قول کا یوں رد فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ﴾ ہمزہ انکار کا ہے مقدر پر داخل ہے۔ "أَيْ: أَعَلِمَ مَا ادَّعَاهُ وَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ... الخ" ﴿ اَهْلَكَ ﴾ صیغۂ ماضی ہے، اس میں ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے اور ﴿ مَنْ هُوَ اَشَدُّ ﴾ کا ﴿ مَنْ ﴾ موصولہ ہے، ﴿ اَهْلَكَ ﴾ کا مفعول ہے اور ﴿ هُوَ اَشَدُّ ﴾ اس کا صلہ ہے اور ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ متعلق ہے ﴿ اَهْلَكَ ﴾ سے اور ﴿ مِنَ الْقُرُوْنِ ﴾ حال ہے ﴿ مَنْ هُوَ اَشَدُّ ﴾ سے اور اس پر مقدم ہے۔ ﴿ اَلْقُرُوْنِ ﴾ قرون سے مراد گزشتہ امتیں ہیں اور ﴿ جَمْعًا ﴾ سے مراد جمعِ مال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ قُوَّةً ﴾ سے مراد آلات ہیں اور ﴿ جَمْعًا ﴾ سے مراد اعوان، معنی یہ ہیں: کیا جانا قارون نے اس بات کو جس کا اس نے دعویٰ کیا اور نہ جانا اس بات کو کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے اس شخص کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے قوت کے لحاظ سے زیادہ سخت تھا اور مال جمع کرنے سے زیادہ تھا۔ یا آلات و اوزار و اسباب جمع کرنے میں زیادہ سخت تھا اور اس کے اعوان

[1] تفسير الرازي (٢٥/ ١٥) [2] معاني القرآن (٤/ ١٥٦)

اور مددگار بھی زیادہ تھے، اگر مال اور قوت ہی فضیلت کی دلیل ہوتی تو پہلی اُمتوں میں سے وہ شخص جس کا ذکر ہوا اپنی جان کو ہلاکت سے بچا لیتا اور اگر مال وقوت فضیلت پر دال ہوتی تو اللہ اس کو ہلاک نہ کرتا، یعنی اس کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے، وہ جانتا ہے کہ اللہ پاک بڑی بڑی زور آور اور مال دار اُمتوں کو ان کے کفر اور گناہوں کے سبب سے ہلاک کر چکا ہے۔ یہ تقریر قارون کو ملامت کرنے، سرزنش کرنے اور اس کی تعجیب کے لیے ہے، کیوں کہ اس نے تورات پڑھی ہے اور پہلی اُمتوں کا حال اسے معلوم ہے، یا تاریخ کی حفاظت کرنے والوں سے اس کو سنا ہے۔ بڑی تعجب کی بات ہے کہ باوجود علم کے ایسا خیال کرتا ہے۔ غرضیکہ جب قارون کو یہ بات ذکر کر کے ڈانٹا دھمکایا کہ اللہ پاک اس سے پہلے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت اور آسودگی میں اس سے کہیں بڑھ کر تھے، تو اس تقریر کی تاکید اس آیت سے فرمائی: ﴿ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ یعنی یہ بیان فرمایا کہ پہلے لوگوں کو ہلاک کرنا کچھ انہیں کے ساتھ خاص نہ تھا، بلکہ اللہ پاک سارے مجرموں کے گناہوں پر مطلع ہے، ضرور اُن کے گناہوں پر ان کو عذاب کرے گا۔ مجرموں سے ان کے گناہوں کا سوال نہ ہوگا کہ ان سے گناہوں کا علم حاصل کیا جائے، اس لیے کہ اللہ پاک کو ان کا خوب علم ہے، وہ بغیر سوال جواب کے آگ میں ڈال دیے جائیں گے۔ امام حسن رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ علم حاصل کرنے کا سوال ان سے نہ ہوگا اور جو سوال ہوگا وہ ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے ہوگا، یہ ایک قول ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان سے حساب لیا جائے گا اور ان پر سختی کی جائے گی، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ فَوَ رَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [الحجر: ٩٢] ''چنانچہ آپ کے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے مجرموں سے سوال نہ کریں گے، اس لیے کہ وہ اپنی علامت سے پہچانے جائیں گے، کیوں کہ وہ جب اٹھائے جائیں گے تو اُن کے چہرے سیاہ اور آنکھیں نیلی ہوں گی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجرم اپنے گناہوں کی کثرت اور ظاہری صورت کے سبب اپنے گناہوں کے متعلق سوال نہ کیے جائیں گے، بلکہ بغیر سوال وحساب کے آگ میں داخل کیے جائیں گے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کی کیفیت اور کمیت کا ان سے سوال نہ کرے گا، جبکہ انھیں عذاب کرنے کا ارادہ کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس اُمت کے مجرم اگلی اُمتوں کے گناہوں کے بارے میں پوچھے نہ جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ خود اپنے گناہوں کا بغیر سوال کے ہی اقرار کرلیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے استعتاب کا سوال نہ ہوگا۔

''استعتاب'' ''استرضا'' کو کہتے ہیں، یعنی ان سے رضا طلب نہ کی جائے گی کہ تم ہم کو راضی کرو، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴾ [النحل: ٨٤] ''اور نہ ان سے توبہ ہی کا مطالبہ کیا جائے گا۔''

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٣١٦)

نیز فرمایا: ﴿ فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴾ [حم السجدة: ٢٤] ''تو وہ معاف کیے گئے (لوگوں) میں سے نہ ہوں گے۔''
نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴾ [المرسلت: ٣٥۔ ٣٦] ''یہ (وہ) دن ہے کہ (لوگ) بول نہیں سکیں گے۔ اور نہ انھیں اذن ملے گا کہ وہ معذرت کر سکیں۔'' اسی کا لحاظ کر کے ابن عادل نے کہا ہے کہ سب وجہوں سے زیادہ اس آیت کے لائق استعتاب ہے۔[1]

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝٧٩
وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ
اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝٨٠ فَخَسَفْنَا بِهٖ
وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝٨١ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ
تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا
لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝٨٢

پھر وہ اپنے پورے کرّ وفر کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا (تو) جو لوگ دنیاوی زندگی چاہتے تھے، کہنے لگے: کاش! ہمارے لیے بھی اس کے مثل ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے، بلاشبہ وہ بڑے نصیبے والا ہے (79) اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا، انھوں نے کہا: افسوس تم پر! اس شخص کے لیے اللہ کا ثواب بہتر ہے جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے اور یہ بات صبر کرنے والوں ہی کو سکھائی جاتی ہے (80) چناں چہ ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پھر اس کے لیے (اس کے حامیوں کی) کوئی ایسی جماعت نہ تھی جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ بدلہ لینے والوں میں تھا (81) اور جنھوں نے کل اس کے مقام و مرتبہ کی تمنا کی تھی، وہ (اصبح اُٹھ کر) کہنے لگے: ہائے شامت! اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے رزق

---

[1] فتح البیان (١٠/ ١٤٧۔ ١٥٢)

کشادہ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہے) تنگ کرتا ہے، اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو یقیناً وہ ہمیں بھی دھنسا دیتا، ہائے شامت! کافر فلاح نہیں پاتے (82)

قارون کا پورے کر وفر کے ساتھ نکلنا اور دنیا کے طلب گاروں کا اس جیسا ہونے کی خواہش کرنا:

یعنی دنیا سے آخرت کو بہتر وہی جانتے ہیں جن سے محنت سہی جاتی ہے اور بے صبر لوگ حرص کے مارے دنیا کی آروز پر گرتے ہیں، نادان آدمی دنیا دار کی آسودگی کو جانتا ہے، اس کی بڑی قسمت ہے، اس کی فکر کو اور آخرت کی ذلت کو اور سو جگہ خوشامد کرنے کو نہیں دیکھتا۔ اور یہ نہیں دیکھتا کہ دنیا میں آرام ہے تو زندگی دس بیس برس کی ہوتی ہے اور مرنے کے بعد ہزاروں برس کاٹنے ہیں۔ انتھیٰ.

اللہ پاک قارون کے حال کی خبر دیتا ہے کہ ایک دن وہ اپنی قوم کے سامنے اس طرح سے نکلا کہ اس نے بڑی زینت اختیار کی اور ظاہری بناؤ سنگھار میں بڑے ساز و سامان اور ٹھاٹھ باٹھ سے عمدہ سواریوں پر سوار اور بہتر سے بہتر لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کے نوکر و خادم اس کے ساتھ تھے، جب اس کو ان لوگوں نے دیکھا جو دنیا کے طلب گار ہیں اور دنیا کی زینت اور بناؤ سنگھار کی طرف مائل ہیں تو یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش ان کے لیے بھی وہ کچھ ہوتا جو اسے ملا ہے، وہ بڑی قسمت والا ہے، دنیا سے اس کو ایک بھرپور حصہ ملا ہے۔ پھر جب علم نافع والوں نے ان کی یہ بات سنی تو ان سے کہا: ﴿ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَٰلِحًا ﴾ یعنی اے خرابی تمھاری! اللہ کا بدلہ جو اپنے مومن صالح بندوں کے واسطے آخرت میں ہے، اس ٹھاٹھ سے بہتر ہے جس کو تم دیکھ رہے ہو اور اس کی تمنا کر رہے ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴾ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ”وَلَا يُلَقَّى الْجَنَّةَ إِلَّا الصَّابِرُوْنَ“[1] یعنی جنت پر واقف نہیں کیے جاتے اور اس کے عمل کی توفیق نہیں دیے جاتے مگر صبر کرنے والے۔ گویا امام سدی رحمہ اللہ نے اس قول کو ﴿ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ کے تتمۂ کلام سے ٹھہرایا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: ”وَلَا يُلَقَّى هَذِهِ الْكَلِمَةَ إِلَّا الصَّابِرُوْنَ“[2] یعنی یہ کلمہ سکھایا نہیں جاتا مگر انہیں لوگوں کو جو اپنے نفوس کو دنیا کی محبت سے روکنے والے اور آخرت کے گھر میں داخل کرنے والے ہیں۔ گویا ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اُن لوگوں کے کلام سے علاحدہ ٹھہرایا اور اللہ عزوجل کے کلام و اخبار سے قرار دیا۔ كذا في ابن كثير.

قارون کا اپنے گھر سمیت زمین میں دھنسایا جانا:

جبکہ اللہ پاک نے یہ بات ذکر فرمائی کہ قارون اپنی زینت اور تیاری میں فخر اور ناز کے ساتھ نکلا اور اپنی قوم پر فخر اور سرکشی کی تو اس کے بعد ذکر فرمایا کہ اس نے قارون اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، جیسا کہ صحیح حدیث

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠١٦)
[2] تفسير الطبري (١٩/ ٦٢٩)

میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اس درمیان میں کہ ایک شخص اپنی تہد کو کھینچ رہا ہے کہ وہ زمین میں دھنسا دیا گیا، چنانچہ وہ زمین کے اندر گھسا جاتا ہے قیامت کے دن تک۔[1] (أخرجه البخاري من حديث الزهري عن سالم أن أباه حدثه... الخ، ثم رواه من حديث جرير بن زيد عن سالم عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي ﷺ نحوه)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس دوران کہ ان لوگوں میں سے جو تم سے پہلے تھے، ایک شخص نکلا دو سبز چادروں میں، اس حال میں کہ ان میں تکبر اور ناز سے چلتا تھا، اللہ نے زمین کو حکم دیا تو اس نے اس کو پکڑ لیا، پس بے شک وہ البتہ گھستا چلا جاتا ہے اس میں قیامت کے دن تک۔[2] (تفرد به أحمد و إسناده حسن)

حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں میں سے جو تم سے پہلے تھے ایک شخص نکلا اس دوران میں کہ اس نے دو سبز چادریں لی ہوئی تھیں، پھر اس نے ان میں تبختر (نخرہ) و ناز کیا تو اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو اس نے اس کو پکڑ لیا، چنانچہ وہ اس میں قیامت کے دن تک گھستا چلا جاتا ہے۔[3] نوفل بن مساحق کہتے ہیں کہ میں نے نجران کی مسجد میں ایک جوان کو دیکھا تو میں اس کی طرف دیکھنے لگا اور اس کے طول اور اس کی مکمل شخصیت اور خوبصورتی سے تعجب کرنے لگا تو وہ بولا کہ تجھے کیا ہے کہ تو میری طرف دیکھتا ہے؟ میں نے کہا کہ میں تیرے جمال اور کمال سے تعجب کرتا ہوں۔

پس وہ بولا: "إِنَّ اللّٰهَ لَيَعْجَبُ مِنِّي"، یعنی مجھ سے تو اللہ تعجب کرتا ہے، کہا: پھر وہ گھٹتا رہا، گھٹتا رہا، یہاں تک کہ ایک بالشت کے برابر ہو گیا، پھر اس کو اس کے کسی قریبی رشتے دار نے اپنی آستین میں رکھ لیا اور اس کو لے گیا۔[4] (ذكره الحافظ محمد بن المنذر في كتابه العجائب الغريبة بسنده عن نوفل) ذکر کیا ہے کہ قارون کی ہلاکت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ہوئی ہے۔ اس کے سبب میں اختلاف ہے، پس سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام سدی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ قارون نے ایک رنڈی کو مال دیا اس وعدے پر کہ موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی جماعت کے سامنے تہمت لگائے، اس حال میں کہ وہ ان میں کھڑے ہو کر اُن پر اللہ کی کتاب پڑھ رہے ہوں تو وہ یوں کہے کہ اے موسیٰ! بے شک تو نے میرے ساتھ ایسا ایسا کیا۔

پھر جب اس نے جماعت میں موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا تو وہ خوف کے مارے کانپ اُٹھے اور دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد اس پر متوجہ ہوئے اور پھر فرمایا: میں تجھے اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے دریا اور پہاڑ بنائے اور تم کو فرعون

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٩٧) [2] مسند أحمد (٣/ ٤٠) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٦٨)

[3] مسند أبي يعلىٰ (٧/ ٢٧٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه زياد بن عبدالله النميري وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٥/ ٢٢٠)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٢٧)

سے نجات دی اور ایسا ایسا کیا کہ البتہ تو مجھ کو وہ بات بتا جس نے تجھ کو وہ بات کہنے پر آمادہ کیا جو تو نے کہی تو وہ بولی: اب جبکہ تو نے مجھ کو قسم دی تو میں بتاتی ہوں کہ قارون نے مجھ کو اتنا اتنا مال دیا ہے، تاکہ میں تجھ سے یہ کہوں اور میں اللہ سے استغفار کرتی ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتی ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام اس وقت اللہ عزوجل کے لیے سجدے میں گر پڑے اور قارون کے بارے میں اللہ سے سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ میں نے زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کے بارے میں تیری اطاعت کرے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیا کہ اس کو اور اس کے گھر کو نگل لے، چنانچہ یہ ہو گیا۔

کسی نے کہا ہے کہ جس وقت قارون اپنی قوم پر اپنی اس زینت میں نکلا اس حالت میں کہ سبز خچروں پر سوار تھا اور اس پر اور اس کے خادموں پر سرخ رنگ کے کپڑے تھے تو وہ اپنے اس لشکر کے ساتھ موسیٰ نبی اللہ علیہ السلام کی مجلس پر گزرا اور وہ ان کو ایام اللہ کا وعظ کر رہے تھے۔ پھر جب لوگوں نے قارون کو دیکھا تو ان کے منہ اس کی طرف پھر گئے، اس کے ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھنے لگے، پس موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بلایا اور فرمایا کہ یہ جو تم نے کیا ہے، کون سی چیز اس کا باعث ہوئی ہے؟ وہ بولا: اے موسیٰ! خبردار! البتہ اگر تو نبوت کے ساتھ مجھ پر فضیلت دیا گیا ہے تو البتہ مقرر میں دنیا کے ساتھ تجھ پر فضیلت دیا گیا ہوں، پھر موسیٰ علیہ السلام نکلے اور قارون اپنی قوم میں نکلا۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو دعا کرتا ہے یا میں دعا کروں؟ تو وہ بولا: بلکہ میں دعا کرتا ہوں، پھر قارون نے دعا کی تو اس کے لیے قبول نہ ہوئی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں دعا کروں؟ کہا: ہاں۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے اللہ! تو زمین کو حکم دے کہ آج وہ میری اطاعت کرے۔ اللہ پاک نے ان کو وحی کی کہ میں کر چکا ہوں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے زمین! پکڑ لے ان کو، تو اُس نے ان کو قدموں تک پکڑ لیا، پھر فرمایا: پکڑ لے تو ان کو، تو ان کو گھٹنوں تک پکڑ لیا، پھر مونڈھوں تک۔ پھر فرمایا کہ ان کے خزانے سامنے لے آ اور اُن کے مال بھی لے آ۔ فرمایا: پھر وہ ان کو لے آئی، یہاں تک کہ انھوں نے ان کی طرف دیکھا، پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پھر فرمایا: چلے جاؤ اے بنی لاوی! پس زمین ان پر برابر ہوگئی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ساتویں زمین تک دھنسا دیے گئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ہر دن ایک قد کے برابر دھنسائے جاتے ہیں، پس وہ اس میں قیامت کے دن تک گھستے جاتے ہیں۔[2] اس جگہ اسرائیلی قصے ذکر کیے ہیں، ہم نے ان سے درصرفِ نظر کی۔

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش　　با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

''اے لومڑی کے بچے! تو اپنے مقام پر کیوں نہ بیٹھا رہا۔ تو نے شیر سے مقابلہ کیا اور اپنی سزا دیکھ لی۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک کے انتقام و عذاب اور سزا کو اس سے نہ اس کے مال نے دور کیا اور نہ اس شے نے جس کو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠١٧۔ ٣٠١٨)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٢٠)

اس نے جمع کیا تھا۔ نہ اس کے خادموں اور نوکروں چاکروں نے اور نہ وہ خود اپنی جان کا بدلہ لینے والا ہوا۔ چنانچہ نہ کوئی اس کا ناصر اور مددگار ہوا اپنے نفس سے نہ غیر سے۔

﴿ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ﴾ یعنی جن لوگوں نے اس کے مرتبے کی کل تمنا کی تھی، جبکہ اس کو اپنی زینت میں دیکھا تھا تو کہا تھا: اے کاش! ہمارے لیے ہوتا اس کے مثل جو قارون کو دیا گیا، وہ تو البتہ بڑے حصے والا ہے۔ پھر جب وہ زمین میں دھنسا دیا گیا تو دوسری صبح کو وہی لوگ کہنے لگے: ارے خرابی! اللہ فراخ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور تنگی کرتا ہے۔ یعنی مال، کچھ اس پر دلیل نہیں ہے کہ اللہ مال والے سے راضی ہے، کیوں کہ اللہ تو دیتا ہے اور روکتا ہے اور تنگی اور فراخی کرتا ہے اور نیچا اور اونچا کرتا ہے۔ حکمتِ تامہ اور حجتِ بالغہ اسی کے لیے ہے، یعنی ان سب کاموں کے بھید وہی جانتا ہے اسی کی حجت ہے بندوں پر۔ بندوں کو اس پر کسی طرح کا اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا، بندے کو بندگی کرنا چاہیے، مولیٰ جو چاہے کرے۔ ؎

چہ دانی تو اے بندہ کار خدائی

یہ بات ویسی ہے جو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں وارد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے درمیان تمھارے اخلاق کو بانٹا ہے جس طرح کہ تمھارے رزق کو بانٹا ہے، اور اللہ مال دیتا ہے جس کو دوست رکھتا ہے اور اس کو جس کو دوست نہیں رکھتا اور ایمان صرف اس کو دیتا ہے جس کو دوست رکھتا ہے۔[1]

﴿ لَوْلَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ﴾ یعنی اگر اللہ کا لطف و احسان ہم پر نہ ہوتا تو البتہ ہم کو دھنسا دیتا، جیسا اس کو دھنسا دیا، کیوں کہ ہم نے اس بات کو چاہا کہ ہم اس کے مثل ہوں۔ ﴿ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ ان کی مراد یہ ہے کہ قارون کافر تھا اور کافر فلاح نہیں پاتے اللہ کے پاس، نہ تو دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ اس جگہ جو "وَيْكَأَنَّ" فرمایا ہے، اس میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں: "وَيْلَكَ اِعْلَمْ أَنَّ" لیکن اس کی تخفیف کی گئی تو "وَيْكَ" کہا گیا، "أَنَّ" کا فتحہ "اِعْلَمْ" کے حذف پر دال ہے، اس قول کو ابن جریر رحمہ اللہ نے ضعیف کہا ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ وہ قوی ہے، اس پر کوئی اشکال نہیں آتا مگر یہ کہ مصاحف میں اس کو "ويكأن" متصل لکھا ہے اور کتابت ایک امر وضعی اصطلاحی ہے اور مرجع لفظ عربی کی طرف ہے۔ واللہ أعلم۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی "أَلَم تَرَ أَنَّ" ہیں۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی "وَيْ كَأَنَّ" ہیں۔ "وَيْ" کو "كَأَنَّ" سے

[1] مسند أحمد (۱/ ۳۸۷) مستدرك الحاكم (۱/ ۸۸) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۷۱۴)

جدا کیا اور حرفِ "وي" کو تعجب یا تنبیہ کے واسطے ٹھہرایا اور "كَأَنَّ" کو بہ معنی "أَظُنُّ وَأَحْتَسِبُ" قرار دیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: اس بارے میں قتادہ کا قول سب اقوال سے قوی تر ہے کہ اس کے معنی "أَلَمْ تَرَ أَنَّ" ہیں اور اس پر شاعر کے قول سے استشہاد کیا ہے۔

سَأَلَتَانِي أَنْ رَآتَانِي قَلَّ مَالِي قَدْ جِئْتُمَانِي بِنُكْرٍ
وَيْكَأَنَّ مَنْ يَكُنْ لَهُ نَشَبٌ يُحْبَبْ وَمَنْ يَّفْتَقِرْ يَعِشْ عَيْشَ ضُرٍّ[1]

یعنی ان دو عورتوں نے مجھ سے جدائی کا سوال کیا، اس لیے کہ انھوں نے دیکھا کہ میرا مال قلیل ہے۔ پھر خطاب کر کے کہتا ہے کہ یقیناً تم میرے پاس ایک اوپری بات لائیں، کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس کے واسطے مال ہے تو وہ محبوب ہوتا ہے، لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور جو شخص محتاج ہے تو وہ گزران کرتا ہے، گزران بدحالی کی۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿فَخَرَجَ﴾ بہ حرفِ "فاء" ﴿قَالَ﴾ پر معطوف ہے اور مابین ان کا جملہ معترضہ ہے اور ﴿فِيْ زِيْنَتِهٖ﴾ متعلق ہے "خَرَجَ" سے یا محذوف سے، جو حال ہے فاعلِ خرج سے، یعنی قارون نکلا اپنی قوم پر اپنی زینت میں اپنے بہت سے اتباع کے ساتھ جو زری اور ریشم کے لباس پہنے اور زیور پہنے ہوئے گھوڑوں اور خچروں پر سوار تھے۔ یہ معنی تو محلی رحمہ اللہ کے قول کا حاصل ہے۔[3] جمل نے نہر سے اس کی تفصیل یہ ذکر کی ہے کہ اس کا نکلنا شنبہ کے روز تھا، اس کے اتباع چار ہزار تھے، اسی کی طرح وضع قطع اور لباس پہنے ہوئے۔ اس کے سیدھی طرف تین سو غلام تھے اور بائیں طرف تین سو لونڈیاں سفید رنگ کی تھیں، ان پر زیور اور ریشمی لباس تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے اتباع نوے ہزار تھے، ان پر کسوم کا رنگا ہوا لباس تھا، یہ پہلا دن ہے جس میں کسوم کا رنگا ہوا لباس دیکھا گیا۔ ان کے گھوڑے اور خچر سرخ دیباج (ریشمی کپڑا) سے آراستہ تھے، قارون کا خچر شہباء تھا، یعنی اس کی سفیدی سیاہی سے زیادہ تھی، اس کی زین سونے کی تھی اور اس کا زین ارجوان تھا۔ ارجوان بہ ضمِ ہمزہ وجیم قطیفہ حمراء (یعنی سرخ رنگ کا کپڑا) کو کہتے ہیں۔ انتہٰی۔ شاید اس سے مراد چارجامۂ سرخ ہے جو زین پر زینت کے لیے ڈالتے ہیں۔

اوس بن اوس ثقفی رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قارون اپنی قوم پر چار ہزار خچروں کے ساتھ نکلا۔ اس کو امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے،[4] جس زینت سے قارون اپنی قوم پر نکلا تھا، اس بارے میں تابعین کی ایک جماعت سے مختلف اقوال مروی ہیں، ان میں سے مرفوعاً کوئی صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ اہلِ کتاب

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٦٣٤۔ ٦٣٦)
[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٢٦۔ ٥٢٨)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٥١٨)
[4] الدر المنثور (٦/ ٤٤١)

ہی کی خبروں میں سے ہیں، چنانچہ یہ بات ہم بہت دفعہ بتا چکے ہیں۔ یہ حدیث جس کو امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے مرفوع روایت کیا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس کی اسناد کیسی ہے، جس کسی کو ان کی کتاب ملے تو ضرور اس میں دیکھ لے۔ مفسرین نے اس زینتِ مذکورہ میں مختلف روایتیں ذکر کی ہیں۔

مراد یہی ہے کہ وہ ایسی زینت اور ٹھاٹھ باٹھ سے نکلا کہ جس نے اس کو دیکھا، وہ حیران رہ گیا، اسی لیے اس کی طرف دیکھنے والوں نے یہ تمنا کی کہ ان کے لیے بھی اس جیسی زینت ہو، چناں چہ اللہ پاک نے ان سے نقل فرمایا ہے: ﴿ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ یہ کلمۂ یاء واسطے تنبیہ کے ہے۔ ﴿ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ سے مراد نصیب بخت اور دولتِ وافرہ ہے دنیا کی۔ جن لوگوں نے یہ بات کہی ان میں اختلاف ہے کہ وہ کون تھے۔ چنانچہ کسی نے تو کہا ہے کہ وہ لوگ اس وقت کے مومنوں میں سے تھے۔ دنیا کی تمنا اس لیے کی کہ اس سے اللہ پاک کا تقرب حاصل کریں اور اس کو راہِ خیر میں خرچ کریں، اس لیے انھوں نے اس کے مثل کی تمنا کی نہ کہ بعینہٖ اس کی، یہ کام حسد سے بچنے کے لیے کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ کافروں کی قوم میں سے تھے۔

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴾ یہ لوگ بنی اسرائیل کے احبار اور علماء ہیں۔ انھوں نے تمنا کرنے والوں سے کہا تھا: تمھارا برا ہو آخرت میں اللہ کا ثواب جنت کی شکل میں اس کے لیے بہتر ہے جو ایمان لایا اور نیکی کی اس شے سے جو دنیا میں قارون دیا گیا ہے، کیوں کہ ثواب کے فائدے بڑے ہیں اور ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ کسی قسم کی مضرت اور تکالیف سے خالص ہیں اور یہ نعمتیں اس کی ضد پر ہیں ان صفتوں میں۔ چنانچہ تم دنیا کے ساز و سامان، زینت اور طمطراق کی تمنا مت کرو، یہ جلد زائل اور فنا ہونے والا ہے، اس کو کسی طرح کا دوام اور بقا نہیں ہے، یہ بیان ہے مفصل علیہ کا۔ ﴿ وَيْلَكُمْ ﴾ کلمۂ زجر ہے مقدر سے منصوب ہے۔ ''أَيْ: أَلْزَمَكُمُ اللّٰهُ وَيْلَكُمْ'' یعنی لازم کرے اللہ تم پر تمھاری خرابی کو۔ یہ قول امام زمخشری رحمہ اللہ کا ہے، اسی کے مثل تبیان میں ہے۔[1] ''وَيْلَكَ'' کی اصل ہلاکت کی بددعا ہے، پھر ڈانٹ ڈپٹ اور ردع (کسی چیز سے ہٹانا) اور غیر پسندیدہ بات کو ترک کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اس کا استعمال کیا گیا۔

﴿ وَلَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴾ میں ضمیر اس کلمے کی طرف راجع ہے جو احبار نے کہا، یا اعمالِ صالحہ کی طرف، یا جنت کی طرف، یعنی نہیں سمجھائے جاتے اس کلمے کو اور نہیں وقوف دیے جاتے اس پر، یا نہیں توفیق دیے جاتے اعمالِ صالحہ کی، یا جنت کے واسطے عمل کرنے کی، مگر وہی لوگ جو اللہ کی اطاعت پر صابر ہیں اور خواہشات سے اپنی جانوں کو زبردستی روکنے والے ہیں اور جو تکالیف اور فائدے اللہ پاک نے ان کی قسمت میں لکھ دیے ہیں، اس سب میں اس کی قضا سے راضی اور خوش ہیں۔

---

[1] الكشاف (٣/ ٤٣٧) التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٢٦)

﴿ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ ﴾ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "خَسَفَ الْمَكَانُ يَخْسِفُ خُسُوْفًا، ذَهَبَ فِي الْأَرْضِ" یعنی "خَسَفَ" کے معنی ہیں زمین میں جانے کے، مثلاً: مکان زمین میں چلا گیا اور "خَسَفَ اللّٰهُ بِهِ الْأَرْضَ خَسْفًا" کے یہ معنی ہیں کہ غائب کر دیا اس مکان کو زمین میں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں غائب کر دیا۔

﴿ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴾ یعنی اللہ کے سوا اس کے لیے کوئی ایسی جماعت نہ تھی جو اس سے اس دھنسائے جانے کو روک سکتی اور نہ ہی وہ خود فی نفسہٖ منتصرین میں سے تھا، یعنی ان لوگوں میں سے جو موسیٰ علیہ السلام سے انتقام لے سکیں، یا اس عذاب سے بچ سکیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "نَصَرَهُ مِنْ عَدُوِّهٖ فَانْتَصَرَ" یعنی فلاں نے فلاں کو اس کے دشمن سے روکا تو وہ رک گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کے چچا کا بیٹا تھا اور علم کے پیچھے جایا کرتا تھا، یہاں تک کہ اس نے علم جمع کیا، پھر وہ ہمیشہ اپنے اس حال میں رہا، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام پر بغاوت کی اور ان سے حسد کیا۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا: اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں زکات لوں تو اس نے انکار کیا، پھر کہا کہ موسیٰ چاہتا ہے کہ تمھارے مال کھا لے۔ تمھارے پاس نماز اور کئی اور چیزیں لایا تو تم نے ان کو برداشت کر لیا، اب تم اس بات کو برداشت کرتے ہو کہ اس کو اپنے مال دو؟ تو وہ بولے کہ ہم برداشت نہیں کرتے، پھر اس بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ اس نے ان سے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی رنڈیوں میں سے ایک رنڈی کے پاس میں ایک آدمی بھیجوں، پھر ہم اس رنڈی کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف بھیجیں اور وہ اس کو تہمت لگائے، اس بات کی کہ اس نے اس کے نفس کے ساتھ بدفعلی کرنا چاہا۔

چنانچہ اس کی طرف آدمی بھیجا اور اس سے کہا کہ ہم تجھے تیری مزدوری دیں گے، اس بات پر کہ تو موسیٰ علیہ السلام پر گواہی دے کہ اس نے تیرے ساتھ فجور کیا، وہ بولی: اچھا۔ پھر قارون موسیٰ علیہ السلام کی طرف آیا اور کہا کہ اے موسیٰ! تو بنی اسرائیل کو جمع کر اور انھیں اس بات کی خبر دے جس کا تجھے تیرے رب نے حکم دیا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے ان کو جمع کیا تو اُن لوگوں نے ان سے کہا کہ تجھے تیرے رب نے کیا حکم دیا ہے؟ کہا: مجھے یہ امر کیا ہے کہ تم اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کرو اور یہ کہ تم صلہ رحمی کرو اور ایسا ایسا۔ اور مجھے یہ امر کیا ہے کہ جس وقت کوئی محصن زنا کرے تو اسے رجم کیا جائے، وہ بولے کہ اگرچہ تو ہی ہو؟ کہا: ہاں۔ وہ بولے کہ تو نے تو زنا کیا ہے، فرمایا: میں نے؟ پھر انھوں نے اس عورت کی طرف آدمی بھیجا تو وہ آئی، پھر کہا: کیا تو موسیٰ علیہ السلام پر گواہی دیتی ہے؟

موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تو صرف سچ بات کہہ، وہ بولی: اب جب تو نے مجھے اللہ کی قسم دی ہے تو بے شک مجھے انھوں نے بلایا اور میرے لیے اس بات کی مزدوری ٹھہرائی کہ میں تجھے اپنے

نفس کے ساتھ تہمت لگاؤں اور میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ تو بری اور بے شک اللہ کا رسول ہے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام روتے ہوئے سجدے میں گرے اور کہتے تھے کہ اے رب! اگر میں تیرا رسول ہوں تو تو میرے لیے غصہ کر، چنانچہ اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ تجھے کیا چیز رُلاتی ہے، ہم نے تو تجھے زمین پر مسلط کر دیا ہے تو اس کو جو حکم دے گا وہ تیری اطاعت کرے گی۔ انھوں نے اپنا سر اٹھایا اور کہا: پکڑ لے ان کو، تو اس نے ان کو ایڑیوں تک پکڑ لیا۔ پس وہ کہنے لگے: یا موسیٰ! یا موسیٰ! پھر فرمایا کہ پکڑ لے اُن کو، تو اس نے ان کو گھٹنوں تک پکڑ لیا۔ پھر وہ کہنے لگے: یا موسیٰ! یا موسیٰ! پھر فرمایا: ان کو پکڑ لے، تو اس نے ان کو گردنوں تک پکڑ لیا۔ پھر وہ کہنے لگے: یا موسیٰ! یا موسیٰ! پھر فرمایا: پکڑ لے اُن کو، تو اس نے ان کو پکڑ لیا، پھر ان کو ڈھانک لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اور کہا: اے موسیٰ! میرے بندوں نے تجھ سے سوال کیا اور تیری طرف آہ و زاری کی، مگر تو نے ان کو جواب نہ دیا، یعنی ان کا سوال پورا نہ کیا۔ مجھے قسم ہے اپنی عزت کی! اگر وہ مجھے پکارتے تو میں ان کو جواب دیتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ یہ قول ہے اللہ تعالیٰ کا: ﴿ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ ﴾ دھنسا دیا ان کو ساتویں زمین تک۔ (أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف وابن المنذر وابن أبي حاتم والحاكم وصححه وابن مردويه عنه) اس کو امام خازن اور قرطبی وغیرہما نے کئی الفاظ سے ذکر کیا ہے۔[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے نیا کپڑا پہنا، پھر اس میں اختیال کیا، یعنی ناز ونخرے سے چلا تو وہ کنارۂ جہنم سے دھنسا دیا جائے گا، چنانچہ وہ اس میں گھستا جائے گا اور اس کی تہہ کو نہ پہنچے گا، اس لیے کہ قارون نے ایک جبہ پہنا، پھر اس میں اختیال کیا تو اللہ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا۔ (رواه الحارث ابن إسحاق من حديث ابن عباس رضی اللہ عنہما و أبي هريرة رضی اللہ عنہ بسند ضعيف جدا) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں فرمایا ہے: اس حدیث شریف کا مقتضا یہ ہے کہ زمین اس کے جسم کو نہ کھائے گی، پس ممکن ہے کہ چیستان بنائی جائے اور ہم سے کہا جائے کہ ایک کافر ہے کہ اس کا جسم موت کے بعد بوسیدہ نہ ہوگا اور وہ قارون ہے۔[2] اس کو ابن لقیمہ نے ذکر کیا ہے۔ حدیث شریف میں لفظ « يَتَجَلْجَلُ » وارد ہوا ہے، "تجلجل" زمین میں دھنسنے کو کہتے ہیں اور "تحرك و تضعضع" کو اور "جلجلة" بہ معنی تحریک ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس وقت قارون زمینِ ہفتم کی تہہ تک پہنچے گا تو اسرافیل علیہ السلام صور میں پھونک دیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ اَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا ﴾ یہ ﴿ اَصْبَحَ ﴾ بہ معنی صار ہے۔ ﴿ مَكَانَهٗ ﴾ سے مراد دنیا میں قارون کی منزلت اور مرتبہ ہے۔ "أَمْس" سے مراد زمانۂ قریب کی ابتدا ہے، خاص آج کے دن کا روزِ گذشتہ، یعنی کل کا دن مراد نہیں۔ ﴿ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ ﴾ یعنی جو تمنا ان سے اتفاقاً واقع ہوگئی، اس پر اُن میں سے ہر ایک نادم

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠١٨) الدر المنثور (٦/ ٤٣٦۔ ٤٣٧) تفسير الخازن (٥/ ١٨٣) [2] فتح الباري (١٠/ ٢٦٠۔ ٢٦١)

ہو کر کہنے گا۔ اس کے معنی میں جو کچھ کہا گیا اس سب سے بہتر امام خلیل، سیبویہ، یونس اور کسائی رحمہم اللہ کا قول ہے کہ قوم متنبہ ہوئی تو "وَيْ" کہا۔ عرب میں سے جو شخص نادم ہوتا ہے تو اپنی ندامت کے درمیان میں "وَيْ" کا کلمہ کہتا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وَيْ" کلمۂ تعجب ہے اور "وَيْكَ" بھی بولتے ہیں اور کبھی "وَيْ" کا کلمہ "كَأَنَّ" مخفف و مشدد پر داخل ہوتا ہے۔ امام خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وَيْ كَأَنَّ" مفصول ہے۔ تو وے کہے، پھر ابتدا کرے تو کہے "كَأَنَّ"۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقریر کا کلمہ ہے، جس طرح تو یوں کہتا ہے: "أَمَا تَرَى صُنْعَ اللّٰهِ وَإِحْسَانَهُ" یعنی کیا نہیں دیکھتا تو اللہ کے صنع و احسان کو۔ کسی نے کہا ہے کہ تنبیہ کا کلمہ ہے بہ منزلہ کلمۂ "أَلَا"، یعنی خبردار، ہشدار، ہوشیار باش۔ قطرب نے کہا ہے کہ یہ "وَيْلَكَ" ہے، پھر اس کا لام گرا دیا گیا تو "وَيْكَ" ہو گیا، یعنی ہر ایک ان میں سے کہنے لگا: خرابی ہو تیری۔ امام ابن اعرابی اور اخفش رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "وَيْكَ" کے معنی "اِعْلَمْ" ہیں۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حمیر کی لغت میں اس کے معنی "رَحْمَةٌ لَّكَ" ہیں، یعنی تجھ پر رحمت ہو۔ کسی نے کہا: بہ معنی "أَلَمْ تَرَ" ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ کلمہ تفجع و تحزن کا ہے،[1] یعنی اس کلمے سے دردمندی اور رنجیدگی ظاہر کی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی "أَظُنُّ وَ أُقَدِّرُ"، یعنی میں گمان و خیال و تخمین کرتا ہوں، اس بات کا کہ اللہ وسعت کرتا ہے رزق کی اپنے بندوں میں سے جس کے واسطے چاہتا ہے اور تنگی کرتا ہے، جس کے واسطے چاہتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بات ویسی نہیں ہے جیسی ہم نے خیال کی تھی کہ رزق کا وسیع ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ اس کی کرامت اور بزرگی ہے اور تنگ ہونا ذلت و خواری کو ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ رزق کی فراخی اور تنگی محض مشیت الٰہی کے تقاضے کے تحت ہے، اس کے بھید کو وہی خوب جانتا ہے، اس میں عزت اور ذلت کا کچھ لحاظ نہیں ہے۔ ﴿ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ﴾ یعنی اگر اللہ تعالیٰ ہم پر احسان نہ کرتا اپنی رحمت اور مہر سے اس طریقے سے کہ جس شے کی ہم نے تمنا کی وہ ہم کو نہ دی اور جس فخر و غرور اور بغاوت کرنے پر قارون قائم و دائم تھا، اگر ہم کو ویسی بات سے نہ بچاتا تو ہم کو دھنسا دیتا۔ جملۂ ﴿ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ ماقبل کی تاکید ہے، یعنی ارے خرابی! یہ تو کافر لوگ اپنے مطلبوں میں سے کسی مطلب کو حاصل نہیں کر سکتے۔[2]

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۸۳ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۸۴

وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد، اور (اچھا)

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳۱۸۔ ۳۱۹)　[2] فتح البیان (۱۰/ ۱۵۲۔ ۱۵۶)

انجام تو پرہیز گاروں ہی کے لیے ہے (83) جو کوئی نیکی لائے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر (بدلہ) ہوگا، اور جو کوئی برائی لائے گا تو برے عمل کرنے والوں کو وہی بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے (84)

آخرت کی دائمی نعمتیں اللہ کے مومن بندوں کے لیے ہیں:

نادانوں نے قارون کی دولت کو اس کی بڑی خوش قسمتی سمجھا۔ بڑی قسمت یہ نہیں ہے، بلکہ آخرت کا ملنا بڑی قسمت ہے، پس وہ اُن کے لیے ہے جو دنیا کا عروج نہیں چاہتے۔ نیکی پر نیکی کا وعدہ دیا، وہ اس کا مقرر ملنا ہے۔ برائی پر برائی کا وعدہ نہیں فرمایا کہ شاید معاف ہو۔ مگر یہ کہا کہ اپنے کیے سے زیادہ سزا نہیں ملتی۔ انتہیٰ.

اللہ پاک دارِ آخرت کی اور اس کی قائم رہنے والی نعمتوں کی خبر دیتا ہے، وہ نعمتیں جو زائل نہ ہوں گی، ان کو اپنے مومن بندوں کے لیے رکھا ہے، جو تواضع اور فروتنی کرنے والے ہیں اور زمین میں علو نہیں چاہتے، یعنی اللہ کی مخلوق پر بلندی اور عظمت اور جبر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور نہ ان میں بگاڑ ڈالنا چاہتے ہیں، جیسا کہ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علو تجبر ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علو بغی ہے، یعنی سرکشی ہے۔ امام سفیان بن سعید ثوری رحمہ اللہ نے عن منصور عن مسلم البطین روایت کیا ہے کہ ﴿عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ﴾ تکبر بغیر حق ہے اور فساد لوگوں کا مال بغیر حق کے لینا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "علو" سے مراد تعظیم و تجبر ہے اور فساد سے مراد گناہوں کا ارتکاب کرنا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا کہ مرد کو اپنے شراکِ نعل سے یہ بات تعجب میں ڈالتی ہے کہ وہ شراکِ نعل (شراک بالکسر بندِ نعل از دوال۔ کذا في الصراح) میں اپنے ساتھی سے زیادہ اجود (سخاوت کرنے والا) اور زیادہ بہتر ہو تو وہ اس قول میں داخل ہوتا ہے: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾[1]۔ یہ قول اس پر محمول ہے کہ جب وہ اپنے غیر پر اس عمل سے فخر چاہے اور اگر وہ اسے صرف خوبصورتی اور زینت کے لیے چاہے تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میری چادر اچھی ہو اور میری جوتی اچھی ہو تو کیا یہ کبر ہے؟ فرمایا: نہیں، « إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ » یعنی اللہ پاک بڑے جمال والا ہے، جمال کو پسند کرتا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ﴾ یعنی جو کوئی قیامت کے دن نیکی لائے گا تو اللہ کا ثواب بندے کی نیکی سے بہتر ہے۔ اول تو خود ثواب نیکی سے بہتر اور برتر ہے، پھر اس کی بہتری کا کیا کہنا اس حال میں کہ اللہ پاک اس کو

---

(1) تفسیر الطبري (١٩/ ٦٣٧۔ ٦٣٨) (2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)

کئی گنا تک بڑھا دے گا، یہ فضل کا مقام ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ﴿ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [النمل: ۹۰] ''اور جو شخص برائی لائے گا تو ان کے منہ آگ میں اوندھے کر دیے جائیں گے (اور کہا جائے گا:) تم بس اسی کا بدلہ پاؤ گے جو تم عمل کرتے تھے۔'' یہ مقام فضل اور عدل کا ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ دارِ آخرت سے مراد جنت ہے۔ ﴿ تِلْكَ ﴾ سے اس کی طرف اشارہ کیا، اس کی تعظیم اور بڑائی کے ارادے سے۔ گویا یوں کہا ہے کہ وہ جنت جس کی تو نے خبر سنی ہے اور اس کی شان اور کیفیت تجھ کو معلوم ہوئی ہے، ہم وہ ان کو دیں گے جو زمین میں علو کا ارادہ نہیں رکھتے، یعنی بلندی اور تکبر کا مومنوں پر۔ کسی نے کہا: ظلم کا۔ کسی نے کہا ہے کہ لوگوں پر ظلم و زیادتی کر کے ان کو ذلیل و خوار کرنے اور تکبر اور زیادتی کا ارادہ نہیں رکھتے۔ فساد سے مراد اللہ پاک کے معاصی پر عمل کرنا ہے، جیسے: کسی جان کو ناحق مار ڈالنا، زنا کرنا، چوری کرنا، شراب پینا وغیرہ یا غیر اللہ کی عبادت کی طرف لوگوں کو بلانا۔ یہ سب امور فساد میں داخل ہیں۔

اللہ پاک نے ان لوگوں کے لیے جنت کا وعدہ فرمایا ہے جو علو اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یوں نہیں فرمایا کہ علو و فساد کو ترک کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سے غرض علو و فساد کی نفی میں مبالغہ کرنا ہے۔ ''يَتْرُكُوْنَ'' کی نسبت ﴿ لَا يُرِيْدُوْنَ ﴾ میں زیادہ مبالغہ ہے۔ یعنی علو و فساد کا کرنا اور چھوڑنا کیسا، وہ تو اس کا ارادہ تک نہیں کرتے، نہ اس کی طرف میل یعنی رجحان کرتے ہیں، جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ [هود: ۱۱۳] ''اور تم ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا۔'' غرض یہ ہے کہ ظلم کرنے اور ظالموں سے ملنے جلنے کا کیا ذکر ہے، اس کی طرف میلِ خاطر بھی مت کرو۔

فضیل رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرمایا: ''ذَهَبَتِ الْأَمَانِيُّ هٰهُنَا''[2] شاید اس سے غرض یہ ہو کہ جب اللہ پاک نے جنت ملنے کا دار و مدار اس پر رکھا کہ علو اور فساد کا ارادہ تک نہ ہو تو اس سے کون خالی رہ سکتا ہے، پس جنت ملنے کی آرزوئیں اور تمنائیں اس جگہ سے جاتی رہیں۔ یہ کلام مقامِ خوف سے صادر ہوا ہے۔ حقیقت میں جنت اللہ پاک کا ایک گراں بہا سودا ہے۔ اعمال کی کیا ہستی ہے کہ اس کے ہم پلہ ہوں، اس کا ملنا محض اللہ سبحانہ کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔ اللهم ارزقنا الجنة بفضلك العام، وكرمك الخاص، ورحمتك الوسيع، يا سيدنا

---

[1] تفسير ابن كثير (۳/ ۵۲۸۔ ۵۲۹)
[2] روح المعاني (۲۰/ ۱۲۶)

ومولانا، وما ذلك عليك بعزيز، يا أرحم الراحمين، وصل وسلم وبارك علىٰ رحمة للعالمين، وعلى آله وصحبه إلى يوم الدين، آمين.

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ اس آیتِ کریمہ کو بار بار پڑھتے تھے، یہاں تک کہ جان بہ حق تسلیم کی۔[1] رحمه الله تعالىٰ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس آیت کی حقیقت فرعون اور قارون کی متابعت سے نفرت دلانا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ ﴾ [القصص: ٤] ''بے شک فرعون نے زمین (مصر) میں سرکشی کی۔'' اور اس قول سے: ﴿ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ﴾ [القصص: ٧٧] ''اور تو زمین میں فساد نہ کر۔'' علو اور فساد کو منکر کے تحت میں ذکر فرمایا، چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں ان چیزوں میں شامل ہیں جن پر یہ اطلاق کیا جاتا ہے کہ وہ علو اور فساد ہیں، کسی خاص قسم کا ذکر کیے بغیر۔ تو ظاہر ہے کہ اس میں سے کوئی چیز جائز نہیں ہے کچھ بھی ہو۔

رہا "علو" تو اس سے ممنوع وہی ہے جو غیر پر تکبر کے طور پر ہو اور لوگوں پر سرکشی اور زیادتی کے طور پر ہو اور طلبِ علوِ حق میں اور ریاست فی الدین میں، یعنی حق کی سربلندی اور دین کی ریاست قائم کرنے میں اور اچھے لباس، اچھی سواری اور اچھے مکان کی محبت اس علو سے نہیں ہے جس کی ممانعت ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تجبر زمین میں ہے اور کسی چیز کو بغیر استحقاق کے لینا۔

(أخرجه المحاملي والديلمي و روى مثله عن مسلم البطين و ابن جرير و عكرمة)

امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ اپنے صاحبِ سلطنت کے نزدیک شرف وعلو ہے۔[2] فتح القدیر اور فتح البیان میں کہا ہے کہ اگر یہ علو اس لیے ہے کہ اس سے حق پر قوی اور مضبوط ہو جائے تو یہ خصالِ خیر سے ہے نہ کہ خصالِ شر سے۔[3] سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ان والیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو اہلِ عدل اور اہلِ تواضع ہیں اور باقی اہلِ قدرت کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: «لَمَّا دَخَلَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ أَلْقٰى إِلَيْهِ وِسَادَةً فَجَلَسَ عَلَى الْأَرْضِ فَقَالَ: أَشْهَدُ إِنَّكَ لَا تَبْغِي عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا، فَأَسْلَمَ»[4] (أخرجه ابن مردويه)

(ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب عدی رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ان کے واسطے وسادہ ڈالا، عدی اس پر نہ بیٹھے، زمین پر بیٹھ گئے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تو زمین میں علو اور فساد نہیں چاہتا، پس وہ اسلام لے آئے۔ واللّٰه أعلم)

---

[1] روح المعاني (٢٠/ ١٢٦) [2] تفسير الطبري (١٩/ ٦٣٧) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٢٢۔ ٣٠٢٣) الدر المنثور (٦/ ٤٤٣)

[3] فتح القدير (٤/ ٢٥٠) فتح البيان (١٠/ ١٥٧) [4] الدر المنثور (٦/ ٤٤٤۔ ٤٤٥)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالْعٰقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ یعنی عاقبتِ محمودہ متقیوں کے لیے ہے۔ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ پاک کے عتاب سے ڈرتے ہیں، اس طریقے سے کہ اس کے احکامات پر عمل کرتے ہیں اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ متقین کی عاقبت جنت ہے۔ بالجملہ جب اللہ پاک نے یہ حکم صادر فرمایا کہ نیک انجام متقیوں کے لیے ہے تو اس مضمون کی یوں تاکید فرمائی کہ نیکوں کو وعدہ دیا اور بدوں کو وعید سنائی۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ﴾ یعنی جو قیامت کے دن آئے گا نیکی کے ساتھ متصف ہو کر اور وہ مومن ہو گا تو اس کے لیے بہتر ہے اس کی نیکی سے، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک اس کو دس گنا سے سات سو گنا تک جزا دے گا۔ حسنہ وہ ہے جس کے کرنے والے کی تعریف کی جاتی ہے۔ شرعی لحاظ سے حسنہ کا نام اس لیے حسنہ رکھا ہے کہ نیکی والے کا چہرہ جب وہ اس کو قیامت کے دن دیکھے گا تو حسین اور خوبصورت ہو جائے گا۔ حسنہ سے مراد وہ حسنہ ہے جو اس بندے کے عمل سے قبول ہوئی ہے، یا جو اس کے حکم میں ہے، جیسے اگر کسی اور نے اس کی طرف سے صدقہ دیا۔ وہ حسنہ نہیں جو بندوں کے ظلم کے بدلے میں لی گئی، اگر زید نے عمرو کو ایک ضرب لگائی اور زید کے حسنات موجود تھے تو اُن میں سے لیا جائے گا اور عمرو کو دیا جائے گا، پس یہ حسنہ عمرو کی طرف منسوب نہ ہو گا نہ حقیقتاً اور نہ حکماً، یعنی اس کے فعل کی طرف منسوب نہ ہو گا، پس اس حسنہ کا اجر وثواب عمرو کے لیے دوگنا یا زیادہ نہ کیا جائے گا، یہ اس لیے کہ اس حسنہ کا کرنے والا حقیقت میں زید ہے اور اس کا سبب عمرو کے پلڑے میں آنے کا یہ ہے کہ زید نے اس کو مارا۔ چنانچہ عمرو نے وہ نیکی اپنے عمل سے نہیں کمائی، وہ حسنہ معمولہ کی قید سے نکل گیا کہ اگر اس نے کسی حسنہ کا قصد کیا ہو، پھر اس کو کسی رکاوٹ کی وجہ سے عمل میں نہ لایا تو یہ اس کے لیے ایک ہی حسنہ لکھا جائے گا اور اس پر بغیر اس کی تضعیف کے (یعنی اس کو کئی گنا بڑھائے بغیر) جزا دیا جائے گا، حسنات کی تضعیف اس امت کے ساتھ خاص ہے۔

رہیں اس امت کے سوا دوسری امتیں تو اُن کے لیے تضعیف نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مضاعفت (اجر کا کئی گنا ہونا) گناہ گاروں کے حسنات میں داخل ہو، اگر ان کے حسنات درجۂ قبولیت کو پہنچ گئے ہیں، اس طرح سے کہ ان کو ایسے کیا ہے کہ جس میں نہ ریاکاری ہے نہ سُمعہ۔ اور صحیح یہ ہے کہ کافروں کے اعمال پر بھی مضاعفت داخل نہیں ہوتی، اس لیے کہ کفر کے ساتھ کوئی طاعتِ مقبول جمع نہیں ہوتی ہے، اگر وہ اسلام نہ لایا۔ اور اگر وہ اسلام لے آیا تو وہ اعمال اسلام میں اعمالِ مقبولہ کی طرح ہوں گے۔ اور جو نیکیاں بہ سبب تضعیف کے حاصل ہوئی ہیں، ان کی تضعیف نہ کی جائے گی۔

﴿ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو بدی لائے تو وہ جزا نہ دیے جائیں گے، مگر اس بدی کے مثل جو وہ کرتے تھے، پس معنی تمام ہو گئے۔ لیکن ﴿ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ﴾ کو بجائے ضمیر کے اس لیے رکھا ہے کہ عملِ سیئہ کو ان کی طرف دوبارہ منسوب کرنے میں مقصد اُن کے حال کو زیادہ عیب ناک کرنا ہے اور سیئہ کے لیے سامعین کے دلوں میں زیادہ غضب اور نفرت پیدا کرنا ہے کہ سیئہ وہ

ہے جس کے کرنے والے کی مذمت کی جاتی ہے شرعی لحاظ سے، صغیرہ ہو یا کبیرہ۔ نام سیئہ اس لیے رکھا ہے کہ اس کے کرنے والے کو وہ اس وقت بری لگے گی جب اسے اس کی جزا دی جائے گی۔ ﴿ مَا كَانُوْا ﴾ اصل میں "مِثْلَ مَا كَانُوْا" ہے۔ لفظ "مِثْلَ" کو حذف کیا اور ﴿ مَا كَانُوْا ﴾ کو اس کی جگہ میں رکھا، اس سے غرض مماثلت میں مبالغہ کرنا ہے۔ یعنی بدی کی جزا ایسی پوری ملے گی، گویا بعینہٖ وہی بدی ہے۔ یہ اللہ پاک کا فضلِ عظیم ہے کہ وہ بدی کی جزا صرف اسی بدی کی مثل دیتا ہے اور نیکی کی جزا دس گنی اور سات سوگنی عطا فرماتا ہے، اس آیت کے معنی سورۃ النمل میں گزر چکے ہیں۔[1]

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ
اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۸۵ وَ مَا كُنْتَ
تَرْجُوْۤا اَنْ یُّلْقٰۤی اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ
فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ ۝۸۶ وَ لَا یَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰیٰتِ
اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَیْكَ وَ ادْعُ اِلٰی رَبِّكَ وَ لَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۸۷ وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ
تُرْجَعُوْنَ ۝۸۸

بلاشبہ وہ (اللہ) جس نے آپ پر قرآن نازل کیا، یقیناً وہ آپ کو (اچھے) انجام تک پہنچانے والا ہے، کہہ دیجیے: میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت کے ساتھ آیا اور کون کھلی گمراہی میں ہے (85) اور آپ اُمید نہیں رکھتے تھے کہ آپ کی طرف (یہ) کتاب وحی کی جائے گی مگر یہ آپ کے رب کی رحمت ہی سے (وحی کی گئی) ہے، لہٰذا آپ کافروں کے مددگار ہرگز نہ ہوں (86) اور وہ (کافر) آپ کو اللہ کی آیات (کی تبلیغ) سے نہ روک دیں، اس کے بعد کہ وہ آپ کی طرف اُتاری گئیں اور آپ (انھیں) اپنے رب کی طرف بلائیں، اور مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہوں (87) اور آپ اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو مت پکاریں، اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، سوائے اس کے چہرے کے، اسی کی حاکمیت و فرمانروائی ہے اور تم (سب) اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے (88)

---

[1] فتح البیان (۱۰/ ۱۵۶ ـ ۱۵۸)

رسول اللہ ﷺ کو توحید کی دعوت دینے کا حکم:

یہ آیت ہجرت کے وقت اُتری، یہ تسلی فرمائی کہ پھر مکے میں آؤ گے۔ پس ان کا آنا خوب ہوا غالب ہو کر۔ یہ جو فرمایا کہ کافروں کا مددگار نہ ہو، یعنی قوم کو اپنا نہ سمجھ، جنھوں نے تیرے ساتھ یہ بدی کی، اب جو تیرا ساتھ دے وہ ہی اپنا ہے۔ شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو، یعنی اپنی قوم کی خاطر نہ کر دیں۔ اپنے آپ کو ان میں شمار نہ کر، گو وہ اپنے قرابت دار ہوں۔ ہر چیز فنا ہونے والی ہے مگر اسی کا منہ، یعنی وہ آپ یعنی اللہ تعالیٰ۔ انتہی[1].

اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ رسالت پہنچائیں اور قرآن شریف لوگوں پر تلاوت کریں اور خبر دیتا ہے کہ وہ ان کو معاد کی طرف پھیر لائے گا۔ ﴿مَعَادٍ﴾ سے مراد قیامت کا دن ہے، پھر جو نبوت کے اعباء و اثقال (چادر اور بوجھ یعنی ذمے داریاں) کا ان کو راعی و حافظ اور نگہبان بنایا ہے، اس کے بارے میں ان سے سوال کرے گا۔ اسی لیے یہ ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ﴾ یعنی جس ذات پاک نے تجھ پر قرآن کو لوگوں کی طرف پہنچانا فرض کیا ہے، وہ البتہ تجھ کو روزِ قیامت کی طرف پھیر لانے والا ہے، پھر تجھ سے اس بارے میں سوال کرے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ [الأعراف: ٦] ”چناں چہ ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم رسولوں سے بھی ضرور سوال کریں گے۔“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ﴾ [المائدة: ١٠٩] ”اس دن (کو یاد کرو) جب اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر (ان سے) کہے گا کہ تمھیں کیا جواب دیا گیا تھا؟“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ﴾ [الزمر: ٦٩] ”اور انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے۔“

ایک قول تو یہ ہوا کہ ﴿مَعَادٍ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سدی نے عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ البتہ پھیرنے والا ہے تجھ کو جنت کی طرف، پھر تجھ سے قرآن کے بارے میں سوال کرنے والا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو سعید رضی اللہ عنہ نے بھی اس کے مثل کہا ہے۔ حکم بن ابان نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان الفاظ میں روایت کی ہے: ﴿اِلٰی مَعَادٍ﴾ فرمایا: "إِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ" (ورواه مالك عن الزهري) امام ثوری رحمہ اللہ کے الفاظ عن الاعمش عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں: ﴿اِلٰی مَعَادٍ﴾ یعنی "إِلَی الْمَوْتِ"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے کئی طریق ہیں، بعض طرق میں "لَرَادُّكَ إِلٰی مَعْدِنِكَ مِنَ الْجَنَّةِ" ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "یُحْیِیكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ" یعنی وہ قیامت میں تجھے زندہ کرے گا اور اسی طرح امام عکرمہ، عطاء، سعید بن جبیر، ابو قزعہ، ابو مالک اور ابو صالح رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: "أَيْ:

وَاللّٰهِ! أَنَّ لَهُ لَمَعَادًا فَيَبْعَثُهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ" یعنی ہاں قسم ہے اللہ کی! بے شک آپ ﷺ کے واسطے معاد ہے، پھر اللہ آپ ﷺ کو قیامت کے دن معبوث کرے گا، پھر آپ کو جنت میں داخل کرے گا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے سوا اور قول بھی مروی ہیں، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کی کتاب تفسیر عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا: "إِلٰى مَكَّةَ" یعنی اللہ تجھ کو مکہ کی طرف پھیرنے والا ہے۔[2] (وهكذا رواه النسائي في تفسير سننه و ابن جرير من حديث يعلىٰ و هو ابن عبيد الطنافسي به) اور اسی طرح عوفی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ البتہ پھیرنے والا ہے تجھ کو مکے کی طرف، جیسا کہ تجھ کو اس سے نکالا ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کے الفاظ مجاہد سے یہ ہیں: "إِلٰى مَوْلِدِكَ بِمَكَّةَ" یعنی تجھ کو پھیر لانے والا ہے تیری جائے ولادت کی طرف جو مکے میں ہے۔[3] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام یحییٰ بن خراز، سعید بن جبیر، عطیہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔

پھر کہا ہے: "وَحَدَّثَنَا أَبِيْ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِيْ عُمَرَ قَالَ: قَالَ سُفْيَانُ: فَسَمِعْنَاهُ مِنْ مُقَاتِلٍ مُنْذُ سَبْعِيْنَ سَنَةً عَنِ الضَّحَّاكِ" کہا: جبکہ نبی کریم ﷺ مکے سے نکلے، پھر جحفہ کو پہنچے تو آپ مکے کی طرف مشتاق ہوئے، اس پر اللہ پاک نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ﴾ "إِلٰى مَكَّةَ" کلامِ ضحاک میں سے یہ بات اس بات کی مقتضی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے، اگرچہ ساری سورت مکی ہے۔ والله أعلم. وقد قال عبد الرزاق: حدثنا معمر عن قتادة في قوله تعالىٰ: ﴿لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ﴾ قَالَ: هٰذِهِ مِمَّا كَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَكْتُمُهَا. "عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسے مخفی رکھتے تھے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود نعیم قاری سے روایت کیا ہے کہ ﴿اِلٰى مَعَادٍ﴾ کی تفسیر میں کہا: "إِلٰى بَيْتِ الْمَقْدِسِ"[4] یہ قول۔ والله أعلم۔ اس شخص کے قول کی طرف رجوع ہوتا ہے جس نے اس کی تفسیر روزِ قیامت سے کی ہے، اس لیے کہ بیت المقدس زمینِ محشر اور منشر ہے۔ والله الموفق للصواب۔ ان اقوال کے جمع کی وجہ یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کبھی تو اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ معاد سے مراد آپ کا مکے کی طرف رجوع ہونا ہے اور یہ رجوع وہی فتح مکہ ہے جو ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی وفات کے قریب ہونے کی علامت ہے۔ چنانچہ سورت ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ... إلى آخر السورة﴾ کی انھوں نے یہ تفسیر کی ہے کہ مراد رسول اللہ ﷺ کی اجل ہے، جس کی آپ کو خبر دی گئی اور یہ بات سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے روبرو ہوئی تھی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٢٥_ ٣٠٢٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٥) تفسير ابن كثير (١٩/ ٦٤١)

[3] تفسير الطبري (١٩/ ٦٤١) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٢٦_ ٣٠٢٧)

پر ان کی موافقت کی اور فرمایا: میں اس کے بارے میں اس کے سوانہیں جانتا جو تو جانتا ہے۔

اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ اِلٰى مَعَادٍ ﴾ کی تفسیر کبھی موت سے کی ہے اور کبھی روزِ قیامت سے جو موت کے بعد ہے اور کبھی جنت سے جو آپ ﷺ کی جزا اور ٹھکانا ہے ثقلین کی طرف، یعنی انسانوں اور جنوں کی طرف رسالتِ الٰہی کی ادا اور ابلاغ پر۔ اور اس لیے کہ آپ ساری خلق اللہ سے زیادہ کامل، زیادہ فصیح اور زیادہ شریف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی اے نبی! تیری قوم کے مشرکوں اور ان کی پیروی کرنے والوں میں سے جو کوئی تیری مخالفت کرے اور تجھے جھٹلائے تو اس سے کہہ دے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ مجھ سے اور تم میں سے کون ہدایت پانے والا ہے اور تم جان لو گے کہ آخرت کا گھر اور دنیا و آخرت کی نصرت اور نیک انجام کس کے لیے ہوگا۔ پھر اللہ پاک اپنے نبی کریم ﷺ کو اپنی عظیم نعمت یاد دلاتا ہے جو ان پر اور بندوں پر ہے، جبکہ ان کو بندوں کی طرف بھیجا۔

﴿ وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ يُّلْقٰۤى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ ﴾ یعنی وحی کے نازل ہونے سے پہلے تو گمان نہیں کرتا تھا کہ وحی تجھ پر نازل ہوگی۔ ﴿ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ مگر جو وحی تجھ پر تیرے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے، یہ تجھ پر رحمت کے سبب سے ہے اور تیرے سبب سے بندوں پر رحمت کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا جب اس نے عظیم نعمت تجھ کو عطا فرمائی تو ﴿ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ تو کافروں کا معین اور مددگار نہ ہو۔ لیکن تو ان سے مفارقت کر، ان سے علاحدہ ہو جا، ان کا مخالف ہو۔ ﴿ وَ لَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ ﴾ یعنی وہ جو تیری مخالفت کرتے ہیں اور تیرے طریق سے لوگوں کو روکتے ہیں، پس تو اس سے اثر نہ لے اور اس کی طرف مائل مت ہو اور اس کی کچھ پروا نہ کر، اس لیے کہ اللہ تو تیرا بول بالا کرنے والا ہے اور تیرے دین کا موید و ناصر ہے اور جو شے تجھ کو دے کر بھیجا ہے اس کو ظاہر اور غالب کرنے والا ہے سارے دینوں پر اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ﴾ یعنی تو اپنے رب کی عبادت کی طرف بلا، جو وحدہ لاشریک لہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی عبادت لائق نہیں ہے مگر اسی کے لیے اور الٰہیت لائق نہیں ہے مگر اسی کی عظمت کے لیے۔ ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ یہ آیت اس بات کی خبر دیتی ہے کہ ہمیشہ باقی رہنے والا، زندہ اور قائم رہنے والا اور قائم رکھنے والا وہی ہے جو نہ مرے گا اور ساری مخلوق مر جائے گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴾ [الرحمن: ۲۶۔ ۲۷] ''ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے۔ اور آپ کے رب ذوالجلال والاکرام کا چہرہ باقی رہے گا۔'' چنانچہ ذات کی تعبیر وجہ سے کی ہے، اسی طرح یہاں بھی فرمایا ہے: ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ یعنی ہر شے ہلاک ہونے والی ہے مگر وہ خود۔ صحیح میں بطریقِ ابوسلمہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا ہے کہ سب سے صحیح کلمہ جو کسی شاعر نے کہا وہ لبید کا کلمہ ہے: "أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ"[1] یعنی اللہ عزوجل کے سوا ہر شے فانی ہے۔ امام مجاہد اور ثوری رحمہما اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: "أَيْ: إِلَّا مَا أُرِيْدَ بِهِ وَجْهُهُ"[2] یعنی ہر شے فنا ہونے والی ہے مگر وہ شے جس سے اس کی ذات کا ارادہ کیا گیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اس قول کو بیان کیا ہے: "كَالْمُقَرِّرِ لَهُ"[3] یعنی گویا اس کی تقریر و تثبیت کی ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے یہ قول کہا ہے، وہ شاعر کے قول سے استشہاد کرتا ہے ؎

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ذَنْبًا لَسْتُ مُحْصِيَهِ   رَبَّ الْعِبَادِ إِلَيْهِ الْوَجْهُ وَالْعَمَلُ[4]

یہ قول اول قول کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ اس قول میں یہ خبر دی ہے کہ کل اعمال باطل ہیں، مگر وہ عمل جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا ارادہ کیا گیا، اعمالِ صالح میں سے جو شریعت کے مطابق ہیں۔ اور پہلے قول کا مقصد یہ ہے کہ تمام ذاتیں فانی اور زائل ہونے والی ہیں، سوائے اللہ تعالیٰ و تقدس کی ذات کے، کیوں کہ اول و آخر وہی ہے، جو ہر شے سے پہلے ہے اور ہر شے کے بعد ہے۔ ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی الدنیا نے "كتاب التفكر والاعتبار" میں بہ سندِ خود ابو الولید سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی عادت تھی کہ جب اپنے دل کی خبر گیری کا ارادہ کرتے تو اُجاڑ جگہ میں آتے، پھر اس کے دروازے پر کھڑے رہتے، پھر غمزدہ آواز کے ساتھ نداء کرتے، پھر کہتے: کہاں ہیں تیرے گھر والے۔ پھر اپنے نفس کی طرف رجوع کرتے تو کہتے: ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهُ الْحُكْمُ ﴾ یعنی ملک اور غلبہ اسی کے لیے ہے، کوئی اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا نہیں ہے۔ ﴿ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی تم اپنے روزِ معاد میں اسی کی طرف رجوع کیے جاؤ گے، پھر وہ تم کو تمھارے اعمال کی جزا دے گا، خیر ہے تو خیر اور شر ہے تو شر۔[5] (آخر تفسير سورة القصص ولله الحمد و المنة كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿ فَرَضَ ﴾ بہ معنی "أَنْزَلَ" ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے تجھ پر عمل فرض کیا، اس شے کے ساتھ جس کو قرآن واجب کرتا ہے۔[6] کلام کی تقریر یہ ہے کہ جس نے تجھ پر قرآن کے فرائض و احکام فرض کیے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس نے تجھ پر قرآن کی تلاوت اور تبلیغ واجب کی اور اس شے پر عمل واجب کیا جو اس میں ہے، وہ البتہ تجھ کو معاد کی طرف پھیر لانے والا ہے۔ علی بن حسین بن واقد سے مروی ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ پر جحفہ میں نازل ہوئی، جبکہ آپ ہجرت کر کے مدینے کی

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥٦) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٢٨)
(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤/ ١٧٨٧) (4) تفسير الطبري (١٩/ ٦٤٣)
(5) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٢٩-٥٣١) (6) معاني القرآن (٤/ ١٥٧)

طرف نکلے۔ چنانچہ یہ آیت نہ مکی ہے نہ مدنی۔[1] چنانچہ یہ بات سورت کے شروع میں بیان ہو چکی ہے۔ جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ معاد سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ یہ اقرب التفاسیر ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے اس کو روایت کیا ہے اور اتنے الفاظ زیادہ کہے ہیں: "كَمَا أَخْرَجَكَ مِنْهَا"[2] امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمی کا معاد اس کا شہر ہوتا ہے، کیوں کہ وہ لوٹ کر اپنے شہر کی طرف واپس آتا ہے۔[3] امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد روزِ قیامت ہے۔[4] امام زجاج رحمہ اللہ کا مختار یہی قول ہے۔[5] محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "بَيْنِي وَبَيْنَكَ الْمَعَادُ" یعنی میرے اور تیرے درمیان معاد ہے۔ مراد روزِ قیامت ہے، اس لیے کہ لوگ اس میں زندہ ہو کر عود کریں گے۔ امام ابو صالح اور ابو مالک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ معاد سے مراد جنت ہے۔ اس کے قائل سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بھی ہیں اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[6] کسی نے کہا کہ مراد موت ہے۔ یہ سب اقوال پہلے تفصیل کے ساتھ گزر چکے ہیں۔

﴿ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ ﴾ کفارِ مکہ کو جواب ہے، جبکہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ تو گمراہی میں ہے۔ اور ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى ﴾ سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے کہ ہدایت لانے والے آپ ہی ہیں اور ﴿ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ سے مراد مشرکین ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آیت عام ہے اللہ تعالیٰ ان دو گروہوں میں سے ہر گروہ کا حال خوب جانتا ہے، جس خیر و شر کا وہ مستحق ہے اس کو اس کا بدلہ دے گا۔

﴿ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تیری طرف رسالت آنے سے پہلے تو اس بات کی اُمید اور آرزو نہیں رکھتا تھا کہ ہم تجھے بندوں کی طرف رسول بنا کر بھیجیں اور اس بات کی کہ تیری طرف کتاب نازل کی جائے۔ چنانچہ اس کا تجھ پر نازل کرنا کسی وعدے کی بنا نہیں، نہ ہی تمھارے کسی پہلے مطالبے کی بنا پر ہے جو تجھ سے صادر ہوا ہو۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو اُمید نہیں رکھتا تھا اس بات کی کہ تیری طرف کتاب القا کی جائے گی اور اس میں تیرے معاد کی طرف پھیر لانے کا ذکر ہو گا۔ اس آیت میں اللہ پاک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نعمتیں یاد دلاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ استثنائے منقطع ہے، یعنی لیکن کتاب کا القا تیرے رب کی طرف سے تجھ پر رحمت ہے۔ دوسرے معنوں پر محمول کر کے استثنائے متصل بھی ہو سکتا ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ نہیں ڈالی گئی کتاب تیری طرف مگر تیرے رب کی طرف سے رحمت کے واسطے۔ پہلا قول اولیٰ ہے۔ اور امام کسائی اور فراء رحمہما اللہ نے اسی پر جزم کیا ہے۔[7]

پھر اللہ پاک نے پانچ چیزوں کا امر و نہی فرمایا ہے۔ پہلی یہ ہے ﴿ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٤٥)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٥) الدر المنثور (٦/ ٤٤٥)
[3] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٢١)
[4] تفسير الطبري (١٩/ ٦٣٩)
[5] معاني القرآن (٤/ ١٥٨)
[6] تفسير الطبري (١٩/ ٦٣٩)
[7] فتح القدير (٤/ ٢٤٨)

جب اللہ پاک نے تجھ پر یہ انعام کیا کہ بغیر امید کے اور بغیر طلب کرنے کے تجھے منصبِ رسالت و نبوت عطا فرمایا اور کتاب نازل کی تو تو کافروں کا مددگار مت ہو۔ ظاہر میں نہی آپ کو ہے، مگر در پردہ یہ حکم اُمت کے لیے ہے۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ ان کی مدارات کر کے ان کا مددگار مت ہو۔ دوسری نہی یہ ہے: ﴿ وَلَا یَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَیْكَ ﴾ یعنی اے نبی! تجھ کو کافر لوگ اور ان کے اقوال اور جھوٹ اور اُن کا ایذا دینا تجھے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرنے، ان پر عمل کرنے سے نہ روکے، ان کے تم پر نازل ہونے کے بعد اور فرض کیے جانے کے بعد۔ جمہور نے بہ فتحِ یاء و ضمِ صاد پڑھا ہے۔ ''صَدَّہٗ''، ''یَصُدُّہٗ'' سے اور عاصم نے بہ ضمِ یاء و کسرِ صاد ''أَصَدَّہٗ'' بہ معنی ''صَدَّہٗ'' سے۔[1]

تیسرا امر یہ ہے: ﴿ وَادْعُ اِلٰی رَبِّكَ ﴾ یعنی لوگوں کو اللہ کی طرف اس کی توحید کی طرف، اس کے فرائض پر عمل کرنے اور اس کے معاصی سے بچنے کی طرف بلا۔ چوتھی نہی یہ ہے: ﴿ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ یعنی تو مشرک لوگوں کی اعانت کر کے ان میں سے مت ہو۔ اس میں بھی آپ کے علاوہ دوسروں کو حکم کا اشارہ ہے، کیوں کہ آپ تو کسی حال میں بھی ان میں سے نہیں ہو سکتے، جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسی طرح یہ پانچویں نہی: ﴿ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ بھی آپ کے علاوہ دوسروں کو اشارہ ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس کی توحید بیان کی اور اس کا وصف دوام اور بقاء کے ساتھ کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ ﴿ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ یعنی اشیاء میں سے کوئی شے ہو، وہ ہلاک ہونے والی ہے اپنی ذات ہی میں، اس لیے کہ اس کا وجود ذاتی نہیں ہے، بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ واجب الوجود کی طرف مستند ہے، چنانچہ وہ بالقوۃ و بالذات کالعدم ہے۔ حال میں کالعدم سے مراد وہ ہے جس کے لیے اس کا وجود ذاتی نہیں ہے، کیوں کہ اس کا وجود لا وجود کی طرح ہے۔ رہا ہلاک ہونے کو آیندہ زمانے پر محمول کرنا، یعنی آیندہ زمانے میں ہر شے فانی ہو گی تو یہ ایک ظاہری کلام ہے۔[2] (قاله الشهاب) مگر اللہ پاک کی ذات۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استثناء کی بنا پر ﴿ وَجْهَهٗ ﴾ منصوب ہے۔[3]

اگر یہ قرآن شریف کے بجائے کسی اور میں ہوتا تو مرفوع ہوتا، اس معنی سے کہ ﴿ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾۔ استثناء کا قضیہ یہ ہے کہ شے کا اطلاق اللہ پاک پر ہو اور یہ صحیح ہے، اس لیے کہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ میں داخل ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ﴿ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ جو آیا ہے تو یہ عادتِ عرب کی بنا پر ہے، اس بات میں کہ وہ جملہ کی تعبیر اشرف اعضاء کے ساتھ کیا کرتے ہیں اور جو شخص شے کا اطلاق اللہ پاک پر نہیں کرتا تو وہ بھی مستثنیٰ کو متصل ٹھہرایا ہے اور ''وجہ'' کو یوں قرار دیتا ہے کہ ''وجہ'' سے مراد وہ شے ہے جو خاص اللہ پاک کے واسطے کی جاتی ہے، اس لیے کہ ثواب اس کا باقی ہے۔ (قاله الكرخي)۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے

[1] فتح القدير (٤/ ٢٤٨)	[2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ٨٩)	[3] معاني القرآن (٤/ ١٥٨)

کہ ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴾ [الرحمن: ٢٦] ''ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے۔'' جب نازل ہوئی تو فرشتوں نے کہا ہے کہ زمین والے ہلاک ہوئے۔ پھر جب ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ [آل عمران: ١٨٥] ''ہر کوئی موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔'' نازل ہوئی تو فرشتوں نے کہا ہے کہ ہر نفس ہلاک ہوا، پھر جب ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ﴾ نازل ہوئی تو فرشتوں نے کہا ہے کہ آسمان وزمین والے ہلاک ہوئے۔ ان سے دوسرا قول یہ مروی ہے کہ "إِلَّا مَا أُرِيدَ بِهِ وَجْهُهُ"[1] یعنی ﴿ وَجْهَهُ ﴾ سے مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ ارادہ کی گئی۔ ہلاک اور فنا ہونے سے آٹھ چیزیں مستثنیٰ ہیں۔ حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے ان کو نظم فرمایا ہے:

ثَمَانِيَةٌ حُكْمُ الْبَقَاءِ يَعُمُّهَا ... مِنَ الْخَلْقِ وَالْبَاقُوْنَ فِيْ حَيِّزِ الْعَدَمِ
هِيَ الْعَرْشُ وَالْكُرْسِيُّ وَنَارٌ وَّجَنَّةٌ ... وَعَجَبٌ وَّأَرْوَاحٌ كَذَا اللَّوْحُ وَالْقَلَمُ

''وہ آٹھ چیزیں یہ ہیں: عرش، کرسی، دوزخ، بہشت، عجب الذنب (ریڑھ کی ہڈی)، ارواح، لوح وقلم۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهُ الْحُكْمُ ﴾ یعنی قضائے نافذ اللہ پاک ہی کے لیے ہے، وہ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ﴿ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی اس کی جزا کی طرف یا اسی وحدہ لاشریک لہ کی طرف، دنیا میں اپنے سارے احوال میں اور دوبارہ جی اٹھنے کے وقت، رجوع کیے جاؤ گے، تاکہ وہ نیک کو اس کی نیکی کا اور بد کو اس کی بدی کا بدلہ دے۔ غرض یہ ہے کہ سب حال میں اللہ پاک ہی کی طرف رجوع ہے نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔[2]

الحمد لله و المنته کہ اس سورت مبارکہ کی تفسیر ۱۹؍ رمضان المبارک بروز چہار شنبہ ۱۳۱۱ ہجری کو محلہ امیر گنج میں بعد نمازِ مغرب قبیل عشاء تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور باقی کے لکھنے کی توفیق عطا کرے۔ وأنا العبد الراجي رحمة ربه القوي ذوالفقار أحمد نقوي غفر الله له ولوالديه وإليهما وإليه وصلى الله وسلم وبارك على سيدنا ومولانا شفيع المذنبين وعلىٰ آله وصحبه أجمعين آمين، والحمد لله أولا وآخرا وظاهرا وباطنا.

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٥١)
[2] فتح البيان (١٠/ ١٥٨۔ ١٦٠)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ

اس سورت کی ننانوے آیتیں ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی، یا کچھ حصہ مکی اور کچھ مدنی ہے، یہ تین قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ ساری سورت مکی ہے، اس کو ابن ضریس، نحاس، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے۔[1] امام حسن، امام عکرمہ، عطاء اور جابر بن زید رحمہ اللہ بھی اس کے قائل ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ساری سورت مدنی ہے۔ قرطبی نے کہا ہے کہ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور یہ قول ہے یحییٰ بن سلام کا۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں اسی طرح ہے، لیکن جمل نے قرطبی سے اس طرح نقل کیا ہے: "وَمَدَنِيَّةٌ كُلُّهَا فِيْ أَحَدِ قَوْلَيِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَتَادَةَ وَالْقَوْلُ الْآخَرُ لَهُمَا وَهُوَ قَوْلُ يَحْيىٰ بْنِ سَلَّامٍ أَنَّهَا مَكِّيَّةٌ إِلَّا عَشْرُ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِهَا فَإِنَّهَا نَزَلَتْ بِالْمَدِيْنَةِ فِيْ شَأْنِ مَنْ كَانَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَكَّةَ. قَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِيْ طَالِبٍ رضی اللہ عنہ نَزَلَتْ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ"[2] انتہیٰ

غرض یہ ہے کہ قرطبی سے اس سورت کے بارے میں چار قول معلوم ہوتے ہیں: اس تفصیل کے ساتھ کہ ساری سورت کا مکی ہونا امام حسن، امام عکرمہ، عطاء اور جابر رحمہ اللہ کے قول میں ہے۔ یہ ایک قول ہوا اور پوری سورت کا مدنی ہونا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ کا ایک قول ہے، یہ دوسرا قول ہوا۔ دوسرا قول ان دونوں کا اور یحییٰ بن سلام کا ہے کہ پہلی دس آیتیں مدنی ہیں، باقی سورت مکی ہے، یہ تیسرا قول ہوا کہ بعض مکی ہے اور بعض مدنی ہے۔ چوتھا قول: سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان نازل ہوئی، یعنی نہ مکی ہے نہ مدنی۔ دارقطنی نے سنن میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورج اور چاند کے گہن میں چار رکوع اور چار سجدے پڑھتے، پہلی رکعت میں سورۃ العنکبوت یا سورۃ الروم اور دوسری رکعت میں سورت یٰسین۔[3]

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٤٩)

[2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٢٣) فتح القدير (٤/ ٢٥٢) فتح البيان (١٠/ ١٦١)

[3] سنن الدارقطني (٢/ ٦٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے

الٓمّٓ ① کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا② اور البتہ تحقیق ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے تھے، چناں چہ اللہ ان لوگوں کو ضرور ظاہر کرے گا جنھوں نے سچ بولا، اور وہ ضرور ظاہر کرے گا ان کو جو جھوٹے ہیں③ کیا جو لوگ برے عمل کرتے ہیں انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہم سے بچ کر نکل جائیں گے۔ بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں④

مومنوں کی آزمایش اور اس کی غرض کا بیان:

پہلی دو آیتیں تو ان مسلمانوں سے کہیں جو کافروں کی ایذا دہی میں گرفتار تھے اور اس سے اگلی آیت میں کافروں کو خطاب کیا جو مسلمانوں کو ستاتے تھے، انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرہ کے شروع میں حروفِ مقطعات پر کلام گزر چکا ہے۔ ہمزہ استفہامِ انکاری کا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک ضرور اپنے مومن بندوں کو آزمائے گا اس ایمان کے مطابق جو اُن کے پاس ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ آزمایش کی رو سے سب لوگوں سے زیادہ سخت انبیاء ہیں۔ پھر صالح نیک لوگ پھر "اَلْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ يُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلٰى حَسَبِ دِيْنِهٖ"[1] یعنی آدمی اپنے دین کے موافق آزمایا جاتا ہے، پھر اگر اس کے دین میں مضبوطی ہے تو اس کے لیے آزمایش میں زیادتی کی جاتی ہے۔

یہ آیتِ کریمہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۴۲] ''کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالاں کہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۳۹۸) صحيح الترغيب والترهيب (۳/ ۱۷۹)

والے ہیں۔'' نیز اسی کے مثل سورت براءت میں اور سورۃ البقرہ میں فرمایا ہے: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ [البقرة: ٢١٤] ''(پھر) کیا تمھارا خیال ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالاں کہ ابھی تک تمھیں ان لوگوں کے مانند (مشکلیں) پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلے گزرے، ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا ڈالے گئے، یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، کہنے لگے: اللہ کی مدد کب (آئے گی؟) آگاہ رہو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔'' اور اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ یعنی البتہ اللہ معلوم کرے گا جو اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں اور اس شخص کو جو اپنے قول اور دعوے میں جھوٹا ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس شے کو جانتا ہے جو زمانہ ماضی میں ہو چکی اور اس کو جو آیندہ ہو گی اور اس کو جو نہیں ہوئی، وہ اگر ہوتی تو کیسے ہوتی۔ اہلِ سنت و جماعت کے ائمہ کے نزدیک یہ بات مجمع علیہ ہے اور اسی کے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ قائل ہیں، اس جیسی آیت میں ''إِلَّا لِنَعْلَمَ''، ''إِلَّا لِنَرَى'' یہ اس لیے ہے کہ رویت جو متعلق ہوتی ہے موجود سے اور علم عام تر ہے رویت سے، کیوں کہ علم تو موجود اور معدوم دونوں سے متعلق ہوتا ہے۔

برے لوگ اللہ تعالیٰ سے چھوٹنے کے نہیں ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ ایمان میں داخل نہیں ہوئے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ اس فتنے اور امتحان سے چھوٹ جائیں گے، کیوں کہ ان کے ورے تو عذاب و سزا اور وبال میں سے ایسی چیز ہے جو اس سے نہایت سخت اور بڑی ہوئی ہے اور اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ﴾ یعنی کیا یہ ان لوگوں نے خیال کیا ہے جو برائیاں کرتے ہیں کہ ہم سے فوت ہو جائیں گے اور ہم ان کو پا نہ سکیں گے۔ ﴿ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ یعنی بری ہے وہ شے جو وہ خیال کرتے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ استفہام دھمکانے اور زجر و توبیخ کے لیے ہے یا تقریر کے لیے۔ ''حسبان'' کہتے ہیں ''أحد النقیضین'' کی قوت کو دوسری پر مثلِ ظن کے بہ خلاف شک کے کہ یہ وقوف ہے درمیان نقیضین کے، اور علم قطع و یقین ہے، دونوں میں سے ایک پر حسبان و ظن کا معلق کرنا، معانی مفردات کے ساتھ

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٣٢)

صحیح نہیں ہے، لیکن جملوں کے مضامین کے ساتھ درست ہے، پس اگر تم یوں کہو کہ "حَسِبْتُ زَيْدًا وَّظَنَنْتُ الْفَرَسَ" تو یہ کچھ چیز نہیں ہے، ایک لغو بات ہے، یہاں تک کہ یوں کہو: "حَسِبْتُ زَيْدًا عَالِمًا وَظَنَنْتُ الْفَرَسَ جَوَادًا"[1] یعنی میں نے زید کو عالم خیال کیا اور گھوڑے کو راہوار تیز رو گمان کیا تو البتہ یہ ایک معقول بات ہوئی، کیوں کہ تمھارا یہ کہنا کہ "زَيْدٌ عَالِمٌ وَالْفَرَسُ جَوَادٌ" ایسا کلام ہے جو ایک مضمون پر دال ہے، پھر جب تم اس مضمون کی خبر دینا چاہو گے جو تمھارے نزدیک بطور گمان کے ثابت ہے نہ بطریقِ یقین کے تو یوں کرو گے کہ گمان کا فعل جملے کے دونوں ٹکڑوں پر لاؤ گے، تا کہ جو تمھاری غرض ہے وہ پوری ہو جائے۔

اب یہاں جو کلام کہ دال ہے اس مضمون پر جس کا حسبان مقتضی ہے، وہ ﴿ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴾ ہے، یہ اس لیے ہے کہ تقدیرِ کلام یہ ہے: "أَحَسِبُوْا تَرْكَهُمْ غَيْرَ مَفْتُوْنِيْنَ لِقَوْلِهِمْ آمَنَّا" یعنی کیا انھوں نے خیال کیا ان کے چھوڑ رکھنے کو بے جانچے ہوئے، بہ سبب ان کے کہنے کے کہ ہم ایمان لائے۔ پس لفظِ ترک "حَسِبَ" کے دو مفعول سے پہلا مفعول ہے اور "لِقَوْلِهِمْ آمَنَّا" خبر (یعنی "حَسِبَ" کا مفعولِ ثانی ہے) ہے۔ رہا "غَيْرَ مَفْتُوْنِيْنَ" تو یہ ترک کا تتمہ ہے، کیوں کہ یہ ترک اس ترک کے قبیل سے ہے جو بہ معنی تصییر ہے، کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ فعل حسبان لانے سے پہلے تم قادر تھے اس پر کہ یوں کہو: "تَرْكُهُمْ غَيْرَ مَفْتُوْنِيْنَ لِقَوْلِهِمْ آمَنَّا" بر تقدیر حاصل و مستقر کے لام سے پہلے۔ یہ بیان تو علامہ نسفی کا حاصل ہے۔[2]

تو گویا یہ ترکیب اس قول کے مثل ہے۔ "ضَرْبُهُ لِلتَّادِيْبِ" لیکن یہ ترکیب اس کی مقتضی ہے کہ جائے وقوع انکارِ علت ہو، حالاں کہ بات یوں نہیں ہے، اس لیے عمدہ توجیہ یہ ہے کہ ﴿ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا ﴾ "حَسِبَ" کے دو مفعول کے قائم مقام ہے جمہور کے نزدیک، اس میں اور ﴿ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ﴾ میں امام سیبویہ رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے اور ﴿ اَنْ يَّقُوْلُوْۤا ﴾ حسبان کی علت ٹھہرائی جائے۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں ہے کہ ﴿ اَنْ يَّقُوْلُوْۤا ﴾ موضعِ نصب میں ہے بہ تقدیر "لِأَنْ يَّقُوْلُوْا" یا "بِأَنْ يَّقُوْلُوْا" یا "عَلٰى أَنْ يَّقُوْلُوْا"[2]۔ کسی نے کہا: ﴿ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا ﴾ سے بدل ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں: کیا خیال کیا لوگوں نے اس بات کا کہ چھوڑ دیے جائیں گے اس واسطے یا بسبب اس کے، یا اس بات پر کہ کہیں ﴿ اٰمَنَّا ﴾، یعنی کلمہ شہادت کے ساتھ نطق کیا اور وہ جانچے نہ جائیں، یعنی بغیر اختبار و ابتلاء اور جانچنے کے چھوڑ دیے جائیں، حالاں کہ بات ویسی نہیں ہے جیسی انھوں نے خیال کی، بلکہ ضرور ہم ان کو آزمائیں گے، جانچیں گے، یہاں تک کہ مخلص منافق سے ظاہر ہو جائے اور صادق کاذب سے اور جو دین میں ثابت و محکم ہے، وہ اس سے ظاہر ہو جائے جو دین میں مضطرب ہے۔

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٢٥٠) [2] فتح القدير (٤/ ٢٥٣) فتح البيان (١٠/ ١٦٣)

چنانچہ یہ آیت اس خیال کے انکار و استبعاد کے لیے لائی گئی ہے اور یہ بات بیان کرنے کو کہ مختلف قسم کی تکالیف وغیرہ کے ساتھ امتحان ضرور ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: کیا خیال کیا انھوں نے اس بات کا کہ ہم ان سے قناعت کریں کہ وہ فقط یہ کہہ دیں کہ ہم مومن ہیں اور اس شے کے ساتھ جانچے نہ جائیں جس سے ان کے ایمان کی حقیقت کھل جائے،[1] بلکہ آزمائے جائیں گے، تاکہ جو شخص دین میں پکا اور مضبوط ہے وہ اپنے غیر سے متمیز ہو جائے۔ امام سدی، قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جانچے نہ جائیں، اپنے مالوں اور جانوں میں قتل اور تکلیف کے ساتھ۔[2] آگے ان آیتوں کے سببِ نزول کے بیان میں وہ بات آتی ہے جو اس شے کے معنی واضح کر دے گی جو ہم ذکر کر آئے ہیں۔ ظاہر آیت اہلِ ایمان میں سے سب لوگوں کو شامل ہے، گو اس کا سببِ نزول خاص ہے، اس لیے کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہوتا ہے، چناں چہ ہم اس بات کو بارہا بیان کر چکے ہیں۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگرچہ آیت کے نزول کا خاص سبب ہے، لیکن وہ نبی کریم ﷺ کی اُمت میں باقی ہے، اس کا حکم باقی زمانے میں موجود ہے، یہ اس لیے ہے کہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلا کیا جانا اور امتحان لیا جانا باقی ہے۔ یہ فتنہ اور امتحان مسلمانوں کے سرحدوں میں قید کرنے میں اور دشمنوں کا ان کو زخمی کرنے میں اور دوسرے تکلیف اور ایذا دہی کے امور میں ہے۔[3] فتنے سے مراد تکالیف کی شدت کے ساتھ جانچنا ہے، جیسے: گھربار، اہل وعیال، دوست احباب کو چھوڑنا اور دشمنوں سے لڑنا بھڑنا اور باقی تکلیف دہ اطاعات کا بجا لانا اور خواہشات کا ترک کرنا اور فقر وقحط اور جانوں اور مالوں میں طرح طرح کی مصیبتوں اور دشمنوں اور کفار کی ایذا دہی اور ان کے مکر وفریب پر صبر کرنا ہے، تاکہ ان مشقتوں پر صبر کر کے بڑے بڑے درجے پائیں، کیوں کہ صرف ایمان لے آنا، اگرچہ خلوص کے ساتھ ہو، وہ صرف اس بات کا مقتضی ہے کہ عذاب میں ہمیشہ رہنے کی بچت اور اس سے خلاصی ہو۔

امام عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن جریر رحمہم اللہ وغیرہم نے روایت کیا ہے کہ یہ ان لوگوں کے حق میں نازل کی گئی ہے جو مکے میں تھے اور انھوں نے اسلام کا اقرار کیا تھا، پھر رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے مدینے سے ان کی طرف لکھا، جب کہ ہجرت کی آیت اتاری گئی کہ تم سے اس وقت تک تمھارا اقرار اور اسلام قبول نہ کیا جائے گا، یہاں تک کہ تم ہجرت کرو۔ کہا: پھر وہ ہجرت کے ارادے سے مدینہ جانے کے لیے نکلے تو مشرک ان کے پیچھے لگے اور ان کو پھیر کر لے گئے۔ اس پر ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر ان کی طرف لکھا کہ تمھارے بارے میں ایسا ایسا نازل کیا گیا ہے تو وہ بولے کہ ہم نکلیں گے، پھر اگر کوئی ہمارا پیچھا کرے گا تو ہم اس کو قتل کریں گے۔ پھر وہ نکلے تو مشرکوں نے ان کا پیچھا کیا تو وہ ان سے لڑے تو اُن میں سے بعض مارے گئے اور بعض نے نجات پائی۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا

[1] معاني القرآن (٤/ ١٥٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٣٢) فتح القدير (٤/ ٢٥٣) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٢٤)

فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [النحل: ١١٠] ''پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے آزمایش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمایشوں) کے بعد (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے، لیکن اس سے مختصر۔ کسی نے کہا ہے کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جبکہ وہ اللہ کی راہ میں عذاب کیے جاتے تھے۔[1] (أخرجه ابن سعد و ابن جرير و ابن أبي حاتم و ابن عساكر عن عبد الله بن عبيد الله بن عمير)

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ نے پہلے جس کا اسلام ظاہر کیا وہ سات آدمی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر، سمیہ والدۂ عمار، عمار، صہیب، بلال اور مقداد رضی اللہ عنہم۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ نے ان کے چچا ابو طالب کے سبب سے بچایا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ نے ان کی قوم کے سبب سے بچایا۔ رہے باقی لوگ تو ان کو مشرکوں نے پکڑا، پھر ان کو لوہے کی زرہیں پہنائیں اور ان کو دھوپ میں پگھلایا، چنانچہ ان میں سے کوئی نہیں تھا، مگر حال یہ ہے کہ اس نے مشرکوں کی اس بات پر موافقت کی جو انھوں نے چاہی سوائے بلال رضی اللہ عنہ کے۔ چنانچہ ان کا نفس تو ان پر ذلیل و سہل ہو گیا اللہ کی راہ میں اور ذلیل ہو گئے اپنی قوم پر، پھر ان کو پکڑا اور لڑکوں کو دے دیا تو وہ ان کو مکے کے گلی کوچوں میں پھرانے لگے اور وہ کہتے تھے: ''أَحَدٌ أَحَدٌ''[2] (أخرجه ابن ماجه و ابن مردويه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ یہ اللہ پاک کا ایک قدیم طریقہ ہے جو ساری اُمتوں میں جاری ہے۔ وہ اس اُمت کے مومنوں کو جانچے گا جس طرح کہ اس سے پہلے اگلی اُمتوں کو جانچا ہے، چنانچہ قرآن شریف میں انبیاء علیہم السلام کے قصوں کے ذیل میں اس کا ذکر آیا ہے اور ان کو اپنی قوم سے کیسی محنتیں مشقتیں اور ایذائیں پہنچیں اور اللہ پاک نے ان کے اتباع کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو کیسے کیسے جانچا ہے، پھر ان میں سے کسی کو آرے سے چیرا، کسی کو قتل کر ڈالا، کسی کو آگ میں ڈال دیا، یا کسی کا لوہے کی کنگھیوں سے گوشت اتارا، یہ سب معاملہ کیا جاتا تھا، مگر کیا مجال ہے کہ ان میں سے کوئی شے کسی کو اس کے دین سے پھیر دے۔ بنی اسرائیل کو فرعون سے جانچا، وہ ان کو طرح طرح کی ایذا دیتا تھا۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ ان کو اس بات سے آگاہ کرے کہ وہ اپنے اس خیال میں خطا پر ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ کیا انھوں نے یہ خیال کیا، حالاں کہ وہ جان چکے ہیں کہ یہ سنتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ ﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ [الأحزاب: ٦٢] یعنی اللہ پاک کا طریقہ برابر جاری ہے تو ہرگز نہ پائے گا اللہ کے طریقے کا بدلنا۔

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٩۔ ٨) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٣١۔ ٣٠٣٢)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٠) مستدرك الحاكم (٣/ ٣٢٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ یعنی پھر اللہ البتہ مشاہدہ کرے گا ان لوگوں کا جو اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں اور البتہ جان لے گا ان میں سے ان لوگوں کو جو اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ یعنی البتہ اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے گا ان لوگوں کو جو اپنے قول میں سچے اور جھوٹے ہیں اور ان کے درمیان تمیز فرما دے گا۔ جمہور نے دونوں جگہ بہ فتح یاء و لام پڑھا ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے دونوں جگہ بہ ضم یاء و کسرِ لام پڑھا ہے،[1] معنی یہ ہیں کہ دونوں گروہوں کو آخرت میں ان کی منازل معلوم کرا دے گا، یا لوگوں کو اس کی سچائی معلوم کرا دے گا جو سچا ہے اور جھوٹوں کو ان کے جھوٹ کے سبب ذلیل کر دے گا، یا ہر گروہ کے لیے ایک نشانی رکھ دے گا جس سے وہ مشہور اور متمیز ہو جائے گا اپنے غیر سے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کا علم ایک ایسی صفت ہے کہ اس میں ہر وہ شے ظاہر ہوتی ہے جو واقع ہوتی ہے اور جو واقع ہونے والی ہے، مگر اتنی بات ہے کہ مکلّف کرنے سے پہلے وہ جانتا ہے کہ مثلاً زید اطاعت کرے گا اور عمرو نافرمانی کرے گا۔ پھر ان کو مکلّف کرنے کے بعد یہ جانتا ہے کہ زید مطیع ہے اور عمرو عاصی ہے، اس کا علم کسی حال میں متغیر نہیں ہوتا ہے۔ متغیر جو ہے سو وہ معلوم ہے۔

نکتہ:

﴿ صَدَقُوْا ﴾ میں تو ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا اور ''کاذبین'' میں اسم فاعل کا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسم فاعل اس پر دال ہے کہ فاعل میں مصدر کا ثبوت و رسوخ ہے اور فعل ماضی اس پر دال نہیں ہے، کیوں کہ آیت کے نازل ہونے کے وقت اس قوم کی حکایت تھی جو اسلام کے عہد کے قریب تھی اور اس قوم کی جو کفر پر جمی ہوئی تھی، اس لیے پہلے لوگوں کے حق میں فعل کے ساتھ تعبیر کی اور دوسروں کے ساتھ اس صیغے کے ساتھ جو ثبات پر دال ہے۔ (قاله زاده رزقه الله حسنىٰ وزيادة)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ﴾ کا مطلب یہ ہے: بلکہ ان لوگوں نے جو شرک اور معاصی کرتے ہیں اس بات کا خیال کیا کہ وہ ہم سے فوت ہو جائیں گے تو ہم ان سے انتقام نہ لیں گے اور وہ ہم کو عاجز کر دیں گے، اس سے پہلے کہ ہم ان سے ان کے اعمال کا مؤاخذہ کریں، یعنی جزا ان کو ضرور ملے گی۔ ﴿ اَنْ ﴾ کے صلہ کا مسند و مسند الیہ پر مشتمل ہونا دو مفعول کے قائم مقام ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ ﴾ [البقرة: ٢١٤] ''(پھر) کیا تمھارا خیال ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟'' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ حَسِبَ ﴾ میں قدر کے معنی شامل ہوں اور ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ ہے۔ اس میں اضراب (پہلے معنی سے پھرنا) کے معنی یہ ہیں کہ یہ حسبان پہلے حسبان سے زیادہ تر باطل ہے، کیوں کہ وہ تو یہ مقدر کرتا ہے کہ اپنے ایمان کے سبب سے آزمایا نہ جائے اور یہ اس بات کا گمان کرتا ہے کہ اپنے گناہوں کا بدلہ نہ دیا جائے اور کہا

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٢٦)

ہے کہ پہلا مومنوں کے حق میں ہے اور یہ کافروں اور مشرکوں کے بارے میں ہے۔[1] (كذا قال النسفي)

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ أَمْ ﴾ منقطعہ ہے تو بل اور ہمزہ استفہام کے ساتھ مقدر کیا جائے گا۔ امام جمل نے کہا ہے کہ ﴿ أَمْ ﴾ کے ضمن میں جو "بَلْ" ہے، وہ اضرابِ انتقال کے واسطے ہے، ایک قصے سے دوسرے قصے کی طرف پھرنے کے لیے اور اس کے ضمن میں جو ہمزہ ہے تو وہ استفہام توبیخی کے لیے ہے، لہٰذا کلام ایک توبیخ سے دوسری توبیخ کی طرف پھرتا ہے۔ پس پہلی توبیخ تو اس پر ہے کہ انھوں نے بغیر مشقتوں کے درجات حاصل کرنے کا صرف ایمان لانے پر خیال کیا۔ پھر اس سے زیادہ سخت توبیخ کی طرف پھرا۔ وہ یہ کہ ان کا خیال ہے کہ اللہ کے عذاب سے فوت ہوں اور اس سے بھاگ جائیں۔ انتھٰی.

﴿ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ کلمہ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے۔ "أَيْ: بِئْسَ الَّذِيْ يَحْكُمُوْنَهُ حُكْمُهُمْ هٰذَا"، یعنی بُری ہے وہ شے جس کا وہ حکم کرتے ہیں حکم کرنا ان کا یہ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَا ﴾ موضعِ نصب میں ہے، اس معنی میں کہ "سَاءَ شَيْئًا أَوْ حُكْمًا يَحْكُمُوْنَ"، یعنی بُری ہے وہ شے یا وہ حکم جس کا وہ حکم کرتے ہیں۔ کہا: یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مَا ﴾ موضعِ رفع میں ہو، اس معنی میں "سَاءَ الشَّيْءُ أَوِ الْحُكْمُ حُكْمُهُمْ"۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے اس کو مصدریہ پڑھا ہے، یعنی "سَاءَ حُكْمُهُمْ"[2]

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۷

جو شخص اللہ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے تو (وہ جان لے کہ) بلاشبہہ اللہ کا وعدہ ضرور آنے والا ہے، اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ⑤ اور جو شخص جہاد کرے تو بس وہ اپنے ہی فائدے کے لیے جہاد کرتا ہے، بے شک اللہ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے ⑥ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم ان سے ان کی برائیاں ضرور مٹا دیں گے اور جو عمل وہ کرتے رہے، ہم انھیں ضرور ان کی بہترین جزا دیں گے ⑦

ایمان والوں کی امید برآری کا بیان:

یعنی ایمان کی برکت سے نیکیاں ملیں گی اور برائیاں معاف ہوں گی۔ انتھٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ

[1] تفسير النسفي (٣/ ٢٥٠۔ ٢٥١) [2] فتح القدير (٤/ ٢٥٣) فتح البيان (١٠/ ١٦٣۔ ١٦٦)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کوئی اللہ کی ملاقات کی توقع رکھے، یعنی دارِ آخرت میں اللہ کے سامنے پیش ہونے کی اور اچھے کام کرے اور ثوابِ جزیل کی اُمید رکھے جو اللہ کے پاس ہے تو بے شک اللہ اس کے لیے اس کی اُمید کو سچا کر دکھائے گا اور اس کو اس کے عمل کا کامل اور بھرپور اجر دے گا، بلاشبہہ یہ ضرور ہونے والا ہے، کیوں کہ وہ دعا کو سننے والا ہے اور ساری کائنات کا دیکھنے والا ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿وَمَنْ جٰهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۚ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ﴾ [حم السجدۃ: ٤٦] ''جس نے نیک عمل کیا تو اس کے اپنے ہی لیے ہے۔'' کیوں کہ اللہ پاک بندوں کے اعمال سے بے نیاز ہے، اگر اُن میں سے سب کے سب ایسے ہو جائیں، جیسا کہ سب سے زیادہ متقی شخص ہے تو وہ اس کے ملک میں کچھ بھی اضافہ نہ کر سکیں گے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ جٰهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بے شک آدمی البتہ جہاد کرتا ہے، حالاں کہ اس نے ایک دن بھی تلوار کے ساتھ کسی کو نہیں مارا، یا اس نے ایک دن بھی تلوار نہیں اٹھائی۔[1] غرض یہ ہے کہ یہاں مجاہدہ سے مراد طاعات اور عبادات میں مشقت اٹھانا ہے۔ پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ وہ اپنی بے نیازی کے باوجود ساری خلائق پر اپنی نیکی اور احسان کر کے ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیکیاں کی ہیں، ان کو بہتر سے بہتر جزا دے گا اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے جو برے کام کیے ہیں ان کو مٹا دے گا اور جو بہتر کام وہ کرتے تھے، ان کی جزا ان کو دے گا۔ چنانچہ ان کی نیکیوں میں سے چھوٹی سے چھوٹی چیز کو قبول کرے گا اور اس پر ایک کے بدلے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ثواب دے گا اور برائی کا بدلہ صرف اس برائی کے برابر دے گا یا اسے معاف کر دے گا اور درگزر فرمائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ٤٠] ''بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے۔'' اور اس جگہ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾[2] [العنکبوت: ٧] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم ان سے ان کی برائیاں ضرور مٹا دیں گے اور جو عمل وہ کرتے رہے، ہم انھیں ضرور ان کی بہترین جزا دیں گے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ یہاں ''رَجَا'' بہ معنی ''طَمَعَ'' ہے۔ یہ قول امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٣٤) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٣٢)

ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ "رَجَا" بہ معنی خوف ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین نے اس پر اجماع کیا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ جو کوئی موت سے ڈرتا ہو۔ اسی معنی کے مطابق ہذلی کا یہ قول ہے: "إِذَا لَسَعَتْهُ الدَّبْرُ لَمْ يَرْجُ لَسْعَهَا" "جب بھڑوں کے جھنڈ نے اسے ڈسا تو اب اسے ان کے ڈسنے کا ڈر نہ رہا۔" کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ جو شخص بعث وحساب سے ڈرتا ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو کوئی اُمید رکھتا ہو ﴿ لِقَآءَ اللّٰهِ ﴾ کے ثواب کی، یعنی اس کی طرف پھر جانے کے ثواب کی۔ چنانچہ اس بنیاد پر "رَجَا" کے معنی "اَمَل" کے ہیں، یعنی آرزو اور اُمید۔

کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ موصول ہے یا شرطیہ اور جزا ﴿ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ﴾ ہے۔ راجح قول یہ ہے کہ یہ جزا نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ کی اجل تو کسی شرط کی قید کے بغیر ضرور ہی آنے والی ہے۔ کیوں کہ اگر یہ جزا ہو تو یہ بات لازم آئے گی کہ جو شخص ﴿ لِقَآءَ اللّٰهِ ﴾ کی امید نہیں رکھتا تو اس کے لیے اللہ کی اجل آنے والی نہ ہو۔ بلکہ جواب محذوف ہے، وہ یہ ہے: ﴿ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صٰلِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ١١٠] "تو وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائے۔" یعنی جو کوئی اللہ کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو چاہیے کہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اس لیے کہ اجل جو بعث وثواب اور عتاب کے لیے مقرر کی گئی ہے، وہ تو ضرور ہی آنے والی ہے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد "يوم القيامة" ہے۔[1] معنی یہ ہیں: چاہیے کہ اس دن کے واسطے عمل کرے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صٰلِحًا ﴾ [الكهف: ١١٠] اس آیت میں جو وعد و وعید اور ترغیب وترہیب ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ ﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ یعنی وہ اپنے بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے اور اس شے کو جاننے والا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں۔

﴿ وَمَنْ جٰهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ﴾ یعنی جو کوئی جہاد کرے کفار سے جنگ کر کے، یا اپنے نفس سے جہاد کرے طاعات پر صبر کر کے، یا شیطان سے جہاد کرے اس کے وسوسے کو دور کر کے تو اس کا ثواب اسی کے لیے ہے نہ کہ اس کے غیر کے لیے اور اس کے نفع میں سے کوئی شے اللہ کو نہ پہنچے گی۔ یہ بات بہ حکمِ وعدہ ہے نہ کہ بہ حکمِ استحقاق، کیوں کہ کریم جب وعدہ کرتا ہے تو اس کو پورا فرماتا ہے۔ چنانچہ یہ حصر اضافی ہے، اب وہ اعتراض وارد نہ ہو گا کہ یہ حصر کیوں کر ٹھیک ہو سکتا ہے، باوجود اس کے کہ آدمی کے جہاد سے کبھی دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے جس طرح کہ اولاد کی اصلاح سے باپ کو فائدہ ہوتا ہے اور جو کوئی شخص کوئی نیک طریقہ نکال جاتا ہے تو اسے فائدہ پہنچتا رہتا ہے اس کے فعل سے جو اس پر چلتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو کوئی اپنے دشمن سے اپنے نفس کے لیے جہاد کرے اور اس سے اس کا ارادہ اللہ پاک کی رضا نہ ہو تو اللہ کو اس کے جہاد کی کچھ حاجت نہیں ہے، لیکن قولِ اول اولیٰ ہے۔

[1] فتح القدير (٤/ ٢٥٣۔ ٢٥٤)

اس آیتِ کریمہ میں بھی بشارت ہے اور خوف دلایا گیا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک انس و جن سے غنی ہے اور فرشتوں سے بھی غنی ہے، چنانچہ وہ ان کی طاعتوں کا نیاز مند نہیں ہے، نہ اس کو ان کا کچھ فائدہ ہے، جس طرح کہ ان کے گناہوں کا اسے کچھ نقصان نہیں، اس نے تو بندوں کو ان کی رحمت کے لیے بعض باتوں کا حکم کیا ہے اور بعض سے منع کیا ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور نیکیاں کیں تو البتہ ہم ڈھانک دیں گے، چھپا دیں گے ان سے ان کی برائیاں ان نیکیوں کے سبب سے جو انھوں نے کیں، یا البتہ ہم ان کو مٹا دیں گے، یہاں تک کہ وہ ایسے ہو جائیں گے جیسے کی ہی نہیں تھیں۔ تکفیر سے مراد حسنہ کے سبب سے سیئہ کا لے جانا ہے۔ سیئہ سے مراد شرک اور معاصی ہیں اور اس کی تکفیر ایمان لانا اور توبہ کرنا ہے۔ آیت سیئات کے وجود کو چاہتی ہے، تاکہ ان کی تکفیر کی جائے، وجہ اس میں یہ ہے کہ کوئی سیئہ کا مکلّف ہو، اس کے واسطے ہونا ضروری ہے، غیر انبیاء میں تو ظاہر ہے۔ رہے انبیاء علیہم السلام تو ان سے کسی افضل چیز کو ترک کر دینا ایسا ہے، جیسا ان کے علاوہ دوسروں سے سیئہ کرنا۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ﴾ [التوبة: ٤٣] ''(اے نبی!) اللہ نے آپ کو معاف کر دیا، آپ نے ان (منافقین) کو اجازت کیوں دی؟''

﴿ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی البتہ ہم جزا دیں گے ان کو ان کے اعمال کی بہترین جزا کے ساتھ۔ کسی نے کہا: ''بِجَزَاءِ أَحْسَنِ أَعْمَالِهِمْ'' یعنی ان کے بہترین اعمال کی جزا کے ساتھ۔ یا ''أحسن'' سے مراد محض وصفِ حسن مراد ہے، فضیلت مراد نہیں ہے، تاکہ حسن کے ساتھ ان کو جزا دینا ایسا نہ ہو کہ اس پر خاموش رہا جائے۔ یہ قول کچھ خیر نہیں، اس لیے کہ یہ تو بابِ اولیٰ سے ہے، کیوں کہ جب ان کو احسن کے ساتھ جزا دی تو اس سے کم کے ساتھ بطریقِ اولیٰ جزا دی۔ (مگر یہ جب ہے کہ ما صدق احسن ثواب اعمال ہو اور اگر ماصدق احسن نفس اعمال ہوں تو پھر تعلیل ٹھیک ہے اور بابِ اولیٰ سے نہ ہو گا۔ کما هو ظاهر۔ از مصحح سلمه الله تعالیٰ) چنانچہ یہ اس قبیل سے ہے کہ اعلیٰ کے ساتھ ادنیٰ پر آگاہ کرنا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم ان کو دیں گے، اکثر اس سے جو انھوں نے عمل کیا ہے اور بہتر اس سے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ [الأنعام: ١٦٠] ''جو شخص (وہاں) ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے دس گنا (ثواب) ہو گا۔''[1]

---

[1] فتح البیان (١٠/ ١٦٦۔ ١٦٨)

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ
بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ
فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ﴿٩﴾

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے کی وصیت کی، اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں تو ان دونوں کی اطاعت نہ کرنا، میری ہی طرف تمھیں لوٹ کر آنا ہے، پھر میں تمھیں بتاؤں گا جو کچھ تم عمل کرتے تھے ⑧ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم انھیں نیک لوگوں میں ضرور داخل کریں گے ⑨

والدین سے حسنِ سلوک کرنے اور شرک میں ان کی اطاعت نہ کرنے کا حکم:

دنیا میں ماں باپ سے زیادہ حق کسی کا نہیں، پھر اللہ کا حق ان سے زیادہ ہے، ان کی خاطر دین نہ چھوڑے۔ انتہٰی.

اول اللہ پاک نے اپنی توحید کے ساتھ تمسک کرنے پر ترغیب دلائی، پھر اپنے بندوں کو ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا، اس لیے کہ والدین انسان کے وجود میں آنے کا سبب ہیں اور ان کا اس پر انتہا درجے کا احسان ہے، پس والد تو انفاق کا اور والدہ اشفاق کا، یعنی باپ کا اولاد پر احسان یہ ہے کہ اس کی پرورش میں روپیہ وغیرہ خرچ کرتا ہے اور ماں اس پر شفقت کرتی ہے، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿23﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣۔ ٢٤] ''اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین سے اچھا سلوک کرو، اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تیرے ہاں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تُو ان سے ''اُف'' تک نہ کہہ اور انھیں مت جھڑک، اور ان سے نرم (لہجے میں ادب و احترام سے) بات کر۔ اور ان کے لیے رحم دلی سے عاجزی کے ساتھ اپنا بازو (پہلو) جھکائے رکھ اور کہہ: میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جیسے انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔''

اور باوجود اس وصیت کے کہ ان کے گزرے ہوئے احسانات کے مقابلے میں ان سے نرمی اور رحمت اور

احسان کرو، یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ جٰهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾ یعنی اگر وہ تجھ پر اس بات کی حرص کریں کہ تو ان کی متابعت کرے ان کے دین پر، جبکہ وہ مشرک ہوں تو تُو اس کے بارے میں ان کا کہا مت مان، کیوں کہ قیامت کے دن تمھارا رجوع میری طرف ہے، پھر جو اُن سے احسان کرے گا اور اپنے دین پر جما رہے گا، تو میں تجھ کو اس کی جزا دوں گا اور تیرا حشر صالحین کے ساتھ کروں گا نہ کہ تیرے والدین کے زمرے میں، اگرچہ تو دنیا میں سب لوگوں سے بڑھ کر اُن کے قریب ہے، کیوں کہ آدمی قیامت کے دن اسی کے ساتھ محشور ہوگا جس کو وہ دوست رکھے گا، یعنی دینی دوست رکھنا اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ ﴾ مصعب بن سعد اپنے باپ سے حدیث بیان کرتے ہیں، کہا: میرے بارے میں چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، پھر ایک قصہ بیان کیا اور کہا کہ ام سعد نے کہا: کیا اللہ نے تجھ کو نیکی کرنے اور احسان کا حکم نہیں کیا ہے؟ اللہ کی قسم! میں نہ کوئی کھانا کھاؤں گی اور نہ کچھ پیوں گی، یہاں تک کہ میں مروں یا تو کافر ہو۔ کہا: پھر جب وہ اس کو کھلانے کا ارادہ کرتے تو اس کا منہ پھاڑتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿ وَوَصَّیْنَا الْاِنْسٰنَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جٰهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾[1] (أخرجه الترمذي عند تفسير هذه الآية، وقال: حسن صحيح و رواه الإمام أحمد و مسلم و أبو داود و النسائي أيضا كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ حُسْنًا ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے بطور مبالغہ کے، یعنی "إِیْصَاءً حُسْنًا"۔ یا مضاف مقدر ہے، یعنی "ذَا حُسْنٍ" یہ بصریوں کا مذہب ہے۔ یا فعل مقدر کا مفعول ہے، یعنی "وَصَّیْنَا الْإِنْسَانَ أَنْ یَّفْعَلَ حُسْنًا"۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "وَوَصَّیْنَا الْإِنْسَانَ أَنْ یَّفْعَلَ بِوَالِدَیْهِ مَا یَحْسُنُ"[2] یعنی ہم نے انسان کو وصیت کی کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہ شے کرے جو اچھی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ موصوف محذوف کی صفت ہے، یعنی "وَصَّیْنَا أَمْرًا ذَا حُسْنٍ"۔ کسی نے کہا ہے کہ مفعول بہ ہے ﴿ وَصَّیْنَا ﴾ کا اس بنا پر کہ اس میں "أَلْزَمْنَا" کے معنی شامل ہیں، یعنی "أَلْزَمْنَاهُ حُسْنًا"۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ نزع خافض منصوب ہے، یعنی "وَصَّیْنَا بِحُسْنٍ"۔ کسی نے کہا ہے کہ فعل محذوف سے منصوب ہے، یعنی "یَحْسُنُ حُسْنًا"۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ انسان کو اس کی وصیت کی ہے کہ ماں اور باپ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٤٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٩) مسند أحمد (١/ ١٨١) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٣٣)

[2] معاني القرآن (٤/ ١٦١)

سے احسان کرے اور ان پر مہربان ہو اور وجوہِ احسان سے جو اس کو ممکن ہو اس سب کے ساتھ ان سے احسان کرے، چنانچہ اس میں یہ سب امور داخل ہیں کہ مال و جان سے خدمت کرنا، نرم زبان سے بولنا ان کی مخالفت نہ کرنا، اس کے سوا اور امور۔ جمہور نے بہ ضمِ حاء وسکونِ سین پڑھا اور امام ابو رجاء، ابو العالیہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے بفتحِ ہر دو اور جحدری نے "إِحْسَانًا"۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں بھی اسی طرح ہے۔[1]

﴿ وَاِنْ جٰهَدٰكَ ..... الآية ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تجھ سے مطالبہ کریں اور اس بات کو تیرے لیے لازم کر دیں کہ تو میرے ساتھ کسی معبود کو شریک کرو، جس کے معبود ہونے کا تجھ کو کچھ علم نہیں ہے، تو تُو شرک کرنے میں ان کی اطاعت مت کر۔ سورت لقمان میں اس طرح فرمایا ہے: ﴿ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ ﴾ [لقمان: ١٥] "اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ جو یہاں ہے وہ لفظی طور پر ماقبل کے موافق ہے، یعنی ﴿ وَمَنْ جٰهَدَ فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ﴾ اور وہاں جو ہے وہ معنی پر محمول ہے، کیوں کہ اس کی تقدیر یہ ہے: "وَإِنْ حَمَلَاكَ أَنْ تُشْرِكَ بِيْ" (قاله الكرماني)

نفی آلہ کی تعبیر نفیِ علم کے ساتھ کی، اس لیے کہ جس شے کی صحت معلوم نہیں ہے تو اس کا اتباع جائز نہیں ہے، پھر جس شے کا باطل ہونا معلوم ہے اس کا اتباع کیوں کر جائز ہوسکتا ہے، اور جب اس بارے میں والدین کی اطاعت جائز نہیں ہوئی، باوجود ان کے زور اور زبردستی کرنے کے تو صرف محض مطالبے پر جس میں زور اور زبردستی نہ ہو اس کا جائز نہ ہونا بطریقِ اولیٰ ہو گا۔ اور معاصی سوائے شرک کے شرک کے مطالبے کے ساتھ ملحق ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک کی معصیت میں، وہ کوئی سی معصیت ہو، ماں باپ کی اطاعت نہیں ہے، چنانچہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہے۔ پھر شانِ نزول میں وہی اُم سعد کا قصہ ذکر کیا ہے۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: چنانچہ سعد نے اس کا کہا نہ مانا اور اس سے کہا: واللہ! اگر تیری سو جان ہوں، پھر ایک ایک جان نکلے تو بھی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر نہ کروں گا، تو چاہے کھا اور چاہے مت کھا۔ پھر اس نے جب یہ دیکھا تو کھا لیا۔[3] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اور جو سورت لقمان اور احقاف میں ہے، وہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ میں تم کو تمھارے صالح و طالح اعمال کی خبر دوں گا، پھر تم میں سے ہر ایک کو وہ جزا دوں گا جس کا وہ مستحق ہے۔ مرجع اور وعید کا جو ذکر فرمایا ہے تو اس میں شرک پر ماں باپ کی تابعداری کرنے سے ڈرایا گیا ہے اور استقامتِ دین پر آمادہ کرنا اور رغبت دلانا ہے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دینا ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٢٩) [2] ان سب کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٢٨)

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، البتہ ہم ان کو ان لوگوں کے زمرے میں داخل کریں گے جو صلاح و نیکی میں راسخ اور مضبوط ہیں۔ صلاح کی صفت مومنین کی صفات میں سے سب سے زیادہ موثر ہے، یہ ایسی عمدہ صفت ہے کہ انبیا علیہم السلام نے اس کی تمنا کی ہے۔ دیکھو سلیمان علیہ السلام نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [النمل: ١٩] ''مجھے اپنی رحمت سے نیک بندوں میں شامل کر لے۔'' نیز یوسف علیہ السلام نے فرمایا ہے: ﴿ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [یوسف: ١٠١] ''تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔''

موصول محلِ رفع میں ہے بنا بر ابتدا اور اس کی خبر ﴿ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴾ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موضعِ نصب میں ہو اشتغال کی بنا پر۔ یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہوں: "لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِيْ مَدْخَلِ الصَّالِحِيْنَ"، یعنی ہم ان کو صالحین کے داخل ہونے کی جگہ میں داخل کریں گے، مراد جنت ہے۔ (کذا قیل)۔ لیکن قولِ اول اولیٰ ہے۔ کسی نے کہا: صالحین میں داخل کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان کے جملے میں شمار کیے جائیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کی صفت کے ساتھ متصف ہوں، یعنی ہم ان کا حشر صالحین کے ساتھ کریں گے۔[1] اللهم اجعلنا من عبادك الصالحين، وارزقنا لسان صدق في الآخرين، واجعلنا من ورثة جنة النعيم، وأجرنا من عذاب الجحيم، و أعذنا من وساوس الشيطان الرجيم، وارزقنا أحسن الخواتيم. آمين يا رب العلمين. و يا مجيب السائلين، و يا أرحم الراحمين. و أقول كما قال بعض الصالحين:

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَىِٕنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱

اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، پھر جب اللہ کی راہ میں انھیں ایذا دی جاتی ہے تو وہ لوگوں کے ستانے کو اللہ کے عذاب کے برابر ٹھہراتے ہیں اور اگر آپ کے رب کی طرف سے مدد آجائے تو وہ ضرور کہیں گے: بے شک ہم تمھارے ساتھ تھے،

[1] فتح البيان (١٠/ ١٦٨۔ ١٦٩)

کیا جو کچھ جہان والوں کے سینوں میں ہے اللہ اُسے خوب جاننے والا نہیں ⑩ اور اللہ انھیں ضرور ظاہر کرے گا جو ایمان لائے اور وہ منافقوں کو بھی ضرور ظاہر کرے گا ⑪

منافقوں کی بدخصلتوں کا ذکر:

جو لوگ اپنی زبانوں سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں ایمان جما نہیں ہے، اللہ پاک ان میں سے ایک جھٹلانے والی قوم کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت دنیا میں کوئی تکلیف اور فتنہ ان کو پہنچتا ہے تو وہ اعتقاد کرتے ہیں کہ وہ اللہ پاک کی طرف سے ان پر سزا اور عذاب ہے، پھر اسلام سے پھر جاتے ہیں۔ اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ فتنہ سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ کی راہ میں ایذا دیا جاتا ہے تو اپنے دین سے پھر جاتا ہے۔[1] اسی طرح ان کے سوا اور علمائے سلف نے کہا ہے۔ یہ آیتِ شریف اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ [الحج: ١١۔ ١٢] ”اور لوگوں میں سے کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے (شک) پر، پھر اگر اسے بھلائی مل گئی تو اس پر مطمئن ہوگیا، اور اگر اسے کوئی آزمایش آپڑی تو اپنے چہرے کے بل پلٹ جاتا ہے، اس نے دنیا اور آخرت میں خسارہ اُٹھایا، یہی کھلا خسارہ ہے۔ وہ اللہ کے سوا اسے پکارتا ہے جو اسے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ اسے نفع دے سکتا ہے۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔“

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی اے نبی! اور اگر آپہنچی مدد قریب تیرے رب کی طرف سے اور فتح اور غنیمتیں تو یہ لوگ تم سے کہنے لگیں گے کہ ہم تو تمھارے ساتھ تھے، یعنی دین میں ہم تمھارے بھائی ہیں، جیسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النساء: ١٤١] ”وہ لوگ تمھارے انجام کا انتظار کرتے رہتے ہیں، پھر اگر تمھیں اللہ کی طرف سے فتح حاصل ہو تو وہ کہتے ہیں: کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ غلبہ ملے تو ان سے کہتے ہیں: کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور (کیا) ہم نے تمھیں مومنوں سے نہیں بچایا؟“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٣)

اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴾ [المائدة: ٥٢] ''پھر قریب ہے کہ اللہ (تمھیں) فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے، تو یہ لوگ (اپنی منافقت پر) پچھتائیں گے، جسے وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔'' نیز اللہ پاک نے اس جگہ ان کی طرف سے یہ خبر دی ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ﴾ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی کیا ایسا نہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے اور جس کو ان کے ضمائر پوشیدہ رکھتے ہیں گو وہ تم سے موافقت ظاہر کریں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ یعنی البتہ اللہ لوگوں کو جانچے گا ضراء اور سراء سے، یعنی تکلیف اور راحت سے، تاکہ یہ لوگ ان لوگوں سے متمیز ہو جائیں، یعنی کون اللہ کی اطاعت کرتا ہے تکلیف میں اور آرام میں اور کون اس کی اطاعت محض اپنے نفس کی لذت کے لیے کرتا ہے، جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَا۠ اَخْبَارَكُمْ ﴾ [محمد: ٣١] ''اور ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے، حتی کہ تم میں سے مجاہدین کو اور صبر کرنے والوں کو جان لیں، اور ہم تمھارے حالات جانچ لیں۔'' اللہ پاک نے واقعۂ احد کے بعد جس میں مومنین کی آزمایش ہوئی اور ان کا امتحان ہوا، جو کچھ ہوا اس کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ١٧٩] ''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علاحدہ کر دے اور نہ اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے، لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر، اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ فِي اللّٰهِ ﴾ سے مراد ''فِيْ شَانِ اللّٰهِ وَسَبِيْلِهٖ وَأَجْلِهٖ'' ہے، یعنی لوگوں میں سے وہ ہے جو کہتا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، پھر جب اس کو لوگوں کی طرف سے کوئی بلا پہنچی، یا کفار کی طرف سے کوئی ایذا پہنچی، جو اللہ کی شان میں کسی گستاخی کی صورت میں ہو اور اس کی راہ میں یا اس کے لیے کوئی تکلیف پہنچی، جس طرح کہ کافر لوگ ایمان والوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں اور اہلِ معاصی اہلِ طاعات کے ساتھ کرتے ہیں اور بدعتی لوگ اہلِ سنت کے ساتھ کرتے ہیں اور تقلیدِ جامد والے خالص اللہ کی اتباع کرنے والوں کے

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٣٣۔ ٥٣٤)

ساتھ کرتے ہیں، بلکہ ہر باطل والا ہر حق والے کو طرح طرح اور قسم قسم کی تکالیف پہنچاتا ہے، اس لیے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے اور کتاب وسنت پر عمل کرنے والے ہیں جس کا اللہ پاک نے حکم فرمایا ہے تو لوگوں کے فتنے کو، یعنی جو ایذا وہ اسے پہنچاتے ہیں، اسے اللہ کے عذاب کے برابر ٹھہرائے اور ان کی ایذا سے گھبرائے اور اس پر صبر نہ کرے اور اس ایذا کی شدت اور سختی میں اسے اللہ کے عذاب کی مثل ٹھہرائے تو لوگوں کی اطاعت کرے، جس طرح اللہ کی اطاعت کرتا ہے، یا جس طرح کوئی اللہ کے عذاب اور سزا سے ڈرتا ہے، اس طرح بندوں کی ایذا دہی سے ڈرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شخص منافق ہے، جس وقت اسے اللہ کی راہ میں تکلیف دی جاتی ہے تو دین سے پھر جاتا ہے، پھر کافر ہو جاتا ہے، حالاں کہ اس کے لیے ممکن تھا کہ اس ایذا پر حدِ اِکراہ، یعنی سخت تکلیف کی حد تک صبر کرتا اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہوتا۔

پس منافقوں نے لوگوں کے فتنے کو ایمان سے پھیرنے والا ٹھہرایا، جس طرح کہ اللہ کا عذاب مومنوں کو کفر سے پھیرنے والا ہوتا ہے، چنانچہ لوگوں کے عذاب کو دور کرنے کے لیے تو کچھ ہے اور اللہ کے عذاب کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ لوگوں کے عذاب (ایذاؤں) پر تو بہت بڑا ثواب حاصل ہوتا ہے اور اللہ کے عذاب کے بعد تو دردناک سزا اور عتاب ہے۔ اور ایسی مشقت و ایذا جو راحتِ عظیم کے آنے کا سبب ہو تو نفس اس سے خوش ہوتا ہے اور اس کو عذاب شمار نہیں کرتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومن کو چاہیے کہ جو ایذا اللہ کی راہ میں ہو، اس پر صبر کرے۔[1] نبی کریم ﷺ کو کفار سے کیا کیا ایذا پہنچی، آپ ﷺ نے اس پر صبر فرمایا، چناں چہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ البتہ میں یقینی طور پر اللہ کی راہ میں اتنی ایذا دیا گیا جتنی ایذا کسی اور کو نہ دی گئی اور میں اللہ کی راہ میں اتنا خوف میں مبتلا کیا گیا جتنا کوئی اور نہیں کیا گیا اور مجھ پر مسلسل تین رات تک فاقے کی کیفیت رہی اور تیسری رات کو حالت یہ تھی کہ میرے اور بلال کے لیے کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا، مگر وہ تھوڑا سا کھانا جس کو بلال نے اپنی بغل میں چھپایا تھا۔[2] (أخرجه الإمام أحمد والترمذي وصححه وابن ماجه وأبو يعلىٰ وابن حبان والبيهقي وغيرهم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَىِٕنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر مومنوں کو اللہ کی طرف سے کوئی فتح نصیب ہو اور دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو اور مالِ غنیمت جو ان سے حاصل ہو تو منافق کہیں کہ ہم تو تمھارے دین میں تمھارے ساتھ تھے، اور دشمنوں پر تمھارے مددگار تھے، سو تم ہم کو غنیمت میں شریک کرو۔ اس جگہ

[1] معاني القرآن (٤٠/ ١٦١)

[2] مسند أحمد (٣/ ١٢٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٧٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥١) مسند أبي يعلىٰ (٦/ ١٤٥) صحيح ابن حبان (١٤/ ٥١٥) شعب الإيمان (٢/ ٢٣٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٢٥)

ساتھ ہونے سے مراد ایمان میں ساتھ ہونا ہے، جنگ میں ساتھ ہونا مراد نہیں، کیوں کہ وہ تو واقع نہیں ہوئی، یعنی لڑائی میں تو وہ ان کے ساتھ نہیں تھے۔[1] (كذا قال الشهاب)

﴿ لَيَقُوْلُنَّ ﴾ کو بہ ضم لام پڑھا ہے، اس لیے کہ ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی پر محمول کیا ہے، اس کے بعد کہ ﴿ يَقُوْلُ ﴾ اور ﴿ أُوْذِيَ ﴾ اور "جَعَلَ" میں لفظ ﴿ مَنْ ﴾ پر محمول کیا۔ ابو معاذ نحوی نے نقل کیا ہے کہ بہ فتح لام بھی پڑھا ہے، اس لیے کہ یہاں بھی لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کی رعایت کی ہے، لیکن عامہ کی قراءت بہتر ہے بہ لحاظ ﴿ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ﴾ کے۔[2] غرضیکہ اللہ پاک نے ان کے قول کی تکذیب کی اور یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی کیا یوں نہیں کہ اللہ پاک خوب جانتا ہے جو کچھ ایمان و نفاق و خیر و شر جہان والوں کے دلوں میں ہے، پھر کیوں اس قسم کے جھوٹے دعوے کرتے ہیں؟! کہا ہے کہ یہ لوگ ان میں سے ہیں جن کے ایمان میں ضعف تھا، جب ان کو کفار سے ایذا پہنچتی تو اُن کے موافق ہو جاتے اور جس وقت اسلام کی قوت ظاہر ہوتی اور اللہ پاک کسی لڑائی میں مومنوں کو فتح دیتا تو کہتے کہ ہم تو تمھارے ساتھ تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت سے اور اس سے پہلی آیت سے مراد منافق ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو اپنی زبانوں سے ایمان لاتے تھے۔ پھر جب ان کو اللہ کی طرف سے کوئی آزمایش پہنچتی یا ان کی جانوں کو کوئی مصیبت پہنچتی تو فتنے میں پڑ جاتے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکہ کے کچھ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، وہ ایمان لاتے تھے، پھر جب ایذا دیے جاتے تو شرک کی طرف پھر جاتے تھے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جن کو مشرکوں نے اپنے ساتھ بدر کی طرف نکالا تھا۔

ظاہر یہ ہے کہ نظم کے لحاظ سے یہ آیت: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ ﴾ سے لے کر ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ تک منافقوں کے بارے میں اتری ہے، اس کی دو وجہ ہیں: ایک تو سیاق سے ظاہر ہے، دوسرے اس لیے کہ آگے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ کیوں کہ یہ قول ما قبل کی تقریر و تاکید کے واسطے ہے، یعنی البتہ جان لے گا اللہ ان لوگوں کو جو اپنے دلوں سے ایمان لائے ہیں اور ایمان میں سچے پکے ہیں کہ آزمایش کے وقت اسلام پر جمے رہے اور البتہ جان لے گا منافقوں کو، جنھوں نے آزمایش کے وقت ایمان چھوڑ دیا۔ دونوں فعلوں میں حرفِ لام قسم کا ہے، یعنی واللہ! البتہ اللہ تمیز کر دے گا دونوں گروہوں کے درمیان اور مخلصوں کے اخلاص کو اور منافقوں کے نفاق کو ظاہر فرما دے گا۔ پھر دونوں فریق کو جزا دے گا۔ پس مخلص تو وہ ہے جو اس ایذا کی وجہ سے جو اسے پہنچتی ہے متزلزل نہیں ہوتا ہے بہ سبب ایذا کے جو اسے پہنچتی ہے اور اللہ کی راہ میں صبر کرتا ہے جیسا کہ

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ٩٣) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٥/ ٣٢٢)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٣٨) تفسير القرطبي (١٣/ ٣٣٠)

صبر کرنے کا حق ہے اور لوگوں کے فتنے کو عذاب اللہ کے مثل نہیں ٹھہراتا ہے اور منافق وہ ہے جو ادھر ادھر جھکتا ہے۔ پھر اگر کافروں سے اسے ایذا پہنچے تو اُن کی موافقت کر کے ان کا تابع ہو گیا اور اللہ عزوجل کا انکار کر بیٹھا اور اگر اسلام کی ہوا چلی اور اس کو نصرت اور مدد پہنچی اور اس کی فتح ظاہر ہو گئی تو اسلام کی طرف پھر آیا اور دعویٰ کرنے لگا کہ وہ تو مسلمین کے زمرے میں سے ہے۔ اس جگہ جو عبارت کا اسلوب بدلا، یعنی پہلے میں فعل کے ساتھ تعبیر کی اور دوسری میں اسم فاعل کے ساتھ تو یہ فاصلہ کی رعایت سے تفنن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دس آیتیں شروع سورت سے یہاں تک مدنی ہیں اور باقی سورت مکی ہے۔ (1) (قاله يحيىٰ بن سلام) جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اس قول کو امام خازن نے بھی ذکر کیا ہے۔ (2)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿12﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿13﴾

اور جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے ایمان والوں سے کہا: تم ہمارے راستے کی پیروی کرو، اور ہم تمھارے گناہ اُٹھا لیں گے، حالاں کہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی نہیں اُٹھائیں گے، بے شک وہ جھوٹے ہیں (12) اور یقیناً وہ اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ ضرور اُٹھائیں گے، اور جو کچھ وہ جھوٹ گھڑتے رہے، روزِ قیامت ان کے متعلق ان سے ضرور پوچھا جائے گا (13)

روزِ قیامت کوئی کسی کے بوجھ نہ اٹھائے گا، کفار کا اس سلسلے میں رد:

کوئی چاہے کہ رفاقت کر کے کسی کے گناہ اپنے اوپر لے لے ایسا نہیں ہو سکتا، مگر جس کو گمراہ کیا اور اس کے بہکانے سے اس نے گناہ کیا، وہ گناہ ہے اِس پر بھی اور اُس پر بھی۔ انتہیٰ۔ حافظ ابن کثیر ؒ کہتے ہیں: اللہ پاک قریش کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ جو لوگ ان میں سے ایمان لائے تھے اور ہدایت کی پیروی کی تھی، ان سے کہا کہ تم اپنے دین سے پھر جاؤ ہمارے دین کی طرف اور ہماری راہ کی پیروی کرو اور چاہیے کہ ہم تمھارے گناہ اُٹھا لیں، یعنی اس میں جو تمھارے گناہ ہوں گے، وہ ہم پر ہیں اور ہماری گردنوں پر ہیں، جس طرح کوئی کہنے والا یہ کہتا ہے کہ تو یہ کام کر، اور تیرا گناہ میری گردن پر ہے۔

اللہ پاک نے ان کی تکذیب کے لیے فرمایا ہے کہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہیں، بے شک وہ البتہ جھوٹے ہیں، یعنی اس بات میں جھوٹے ہیں جو انھوں نے کہا ہے کہ وہ ان لوگوں سے ان کے

(1) تفسير القرطبي (١٣/ ٣٢٣) (2) تفسير الخازن (٥/ ١٨٩) فتح البيان (١٠/ ١٧٠۔ ١٧٢)

گناہ اُٹھالیں گے، کیوں کہ کوئی بھی کسی دوسرے کا گناہ نہ اٹھائے گا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ﴾ [الفاطر: ۱۸] ''اور اگر کوئی بوجھ لدا شخص اپنا بوجھ اُٹھانے کو بلائے گا تو اس (کے بوجھ میں) سے کچھ بھی اُٹھایا نہ جائے گا، اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہو۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ﴾ [المعارج: ۱۰۔ ۱۱] ''اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کو نہ پوچھے گا۔ حالاں کہ وہ انھیں دکھلا بھی دیے جائیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ یہ ان لوگوں کے بارے میں خبر دی، جو کفر وگمراہی کی طرف بلاتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن اٹھائیں گے، اپنے گناہ اور دوسرے گناہ اس سبب سے کہ انھوں نے لوگوں کو بہکایا، یہ اس طرح ہوگا کہ ان کے گناہوں میں سے کچھ کم نہ ہوگا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴾ [النحل: ۲۵] ''تاکہ یومِ قیامت وہ اپنے کامل بوجھ اُٹھائیں اور کچھ ان کے بوجھ بھی، جنھیں وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، جان لو! برا بوجھ ہے جو وہ اُٹھاتے ہیں۔'' صحیح میں مروی ہے کہ جو کوئی ہدایت کی طرف بلائے تو اس کے لیے ان لوگوں کے اجر کے مثل ہوگا جو قیامت تک اس کی پیروی کریں گے، اس کے بغیر کہ ان کے اجروں میں سے کچھ کم ہو۔ اور جو کوئی گمراہی کی طرف بلائے تو اس پر ان لوگوں کے گناہوں کے مثل ہوگا جو قیامت کے دن تک اس کی پیروی کریں گے، اس کے بغیر کہ اس سے ان کے گناہوں میں سے کچھ کم ہو جائے۔[1] صحیح میں ہے کہ کوئی بھی جان جو ظلم سے ماری جائے گی تو اس کے خون کا ایک حصہ، یعنی گناہ آدم کے پہلے بیٹے پر ہوگا، کیونکہ سب سے پہلے قتل کا طریقہ اسی نے نکالا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ یعنی البتہ وہ پوچھے جائیں گے، قیامت کے دن اس شے کے بارے میں جو وہ جھوٹ بولتے اور بہتان باندھتے تھے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک حدیث بروایتِ ابو امامہ رضی اللہ عنہ ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ شے پہنچا دی، جس کے ساتھ آپ بھیجے گئے تھے، پھر کہا کہ تم ظلم سے بچو، بے شک اللہ عزم کرے گا، یعنی قیامت کے دن قسم کھائے گا اور کہے گا: میری عزت اور جلال کی قسم! مجھے آج کے دن ظلم جائز نہیں ہے، پھر ایک پکارنے والا پکارے گا اور کہے گا کہ فلاں بن فلاں کہاں ہے، چنانچہ وہ آئے گا اس حال میں کہ اس کے پیچھے نیکیوں کے پہاڑ ہوں گے، لوگ اُن کی طرف اپنی آنکھیں بلند کریں گے، یہاں تک کہ وہ اللہ عزوجل کے روبرو کھڑا ہوگا۔

پھر اللہ پاک ندا کرنے والے کو حکم دے گا تو وہ ندا کرے گا کہ فلاں ابن فلاں کے خلاف ظلم کے سلسلے میں کسی کو کوئی شکایت ہو تو آئے؟ چنانچہ وہ آئیں گے، یہاں تک کہ رحمان کے روبرو سب جمع ہو جائیں گے اور کھڑے ہوں

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۶۷۴) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۱۵۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۷۷)

گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے بندے کی طرف سے انھیں ان کا حق ادا کرو تو فرشتے کہیں گے: ہم کس طرح اس کی طرف سے ادا کریں؟ تو فرمائے گا کہ ان کے لیے اس کی نیکیوں میں سے لو، پھر وہ ان نیکیوں میں سے لیتے رہیں گے، یہاں تک کہ ان میں سے ایک بھی نیکی باقی نہ رہے گی اور ظلم کی شکایت والے ابھی باقی ہوں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ادا کرو میرے بندے کی طرف سے۔ وہ کہیں گے کہ اس کی کوئی نیکی باقی نہیں رہی۔ چنانچہ فرمائے گا کہ ان کی بدیاں لے کر اس پر لاد دو۔ ثُمَّ فَزِعَ النَّبِيُّ ﷺ بِهٰذِهِ الآيَةِ الكَرِيمَةِ: ﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾[1] (اصل میں اسی طرح ہے، شاید "قرأ" ہو لیکن "بهٰذِهِ الآيَةِ" اس سے ابا یعنی انکار کرتا ہے، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ "نَزَعَ" ہو، یعنی نبی ﷺ یہ آیت لائے، غرضیکہ جو کچھ ہو، حاصل یہی آیت کا پڑھنا ہے۔ والله أعلم) وهذا الحديث له شاهد في الصحيح من غير هذا الوجه.[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: «يَا مُعَاذُ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ يُسْأَلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَنْ جَمِيعِ سَعْيِهِ حَتّٰى عَنْ كُحْلِ عَيْنَيْهِ وَعَنْ فَتَاتِ الطِّينَةِ بِإِصْبَعَيْهِ فَلَا أُلْفِيَنَّكَ تَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَحَدٌ أَسْعَدُ بِمَا آتَاكَ اللّٰهُ مِنْكَ»[3] یعنی اے معاذ! بے شک قیامت کے دن مومن پوچھا جائے گا اپنے سارے کاروبار کے متعلق، یہاں تک کہ اپنی دونوں آنکھوں کے سرمے اور مٹی کے ان ذرات کے بارے میں بھی جو اس کی دونوں انگلیوں میں ہیں۔ میں ہرگز قیامت کے دن تجھے اس حال میں نہ پاؤں کہ کوئی اس شے کا تجھ سے زیادہ حق دار ہو، جو اللہ نے تجھ کو دی ہے۔ مطلب یہ ہے، واللہ اعلم، کہ خلق کے ظلم اپنے ذمے نہ لینا کہ قیامت کے دن ان کے عوض میں تیری نیکیاں لے لی جائیں، جن کا اللہ نے تجھ پر انعام کیا ہے۔ مظالم والے تو تیری نیکیاں لے کر بختاور ہو جائیں اور تو بے نصیب رہ جائے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں لام تبلیغ کا ہے، اس کا بیان کئی جگہ گزر چکا ہے، یعنی ابوسفیان اور اس کے اتباع جیسے کافروں نے مومنین سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم ہمارے طریقے پر چلو اور ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ اور اگر ہماری راہ کی پیروی کرنا گناہ ہے کہ جس کے سبب سے تم پکڑے جاؤ گے، اس وقت جب تم مرنے کے بعد زندہ ہو گے، جیسا کہ تم کہتے ہو تو چاہیے کہ ہم تمھارے گناہ اُٹھائیں، پس اس کا مؤاخذہ ہم سے ہو گا نہ کہ تم سے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ان کی مراد یہ ہے کہ ہم ہر اس عذاب کے کفیل اور ضامن ہیں جو تم

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۳۹۔ ۳۰۴۰) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۸۱)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۴۰) [4] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۳۴۔ ۵۳۵)

کو اللہ کی طرف سے پہنچے گا۔[1] ﴿ وَلْنَحْمِلْ ﴾ میں حرفِ لام امر کا لام ہے، گویا انھوں نے اپنی جانوں کو گناہ اٹھا لینے کا حکم کیا۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شرط و جزا کی تاویل میں امر ہے،[2] یعنی اگر تم ہماری راہ کی پیروی کرو گے تو ہم تمھاری خطائیں اٹھا لیں گے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امر بہ معنی خبر ہے۔ ﴿ وَلْنَحْمِلْ ﴾ کو بہ سکونِ لام پڑھا ہے، کیوں کہ لام امر کا ہے۔ کسی نے بکسرِ لام پڑھا ہے، یہ لغت اہلِ حجاز کی ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کے قول کا اس طرح رد کیا: ﴿ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ اول حرفِ مِن بیانیہ ہے اور دوسرا استغراق کے لیے زاید ہے، یعنی وہ نہیں ہیں اٹھانے والے ان کے گناہوں میں سے کسی شے کو جن کے اٹھانے کو انھوں نے لازم قرار دیا ہے اور ان کے ضامن وکفیل و ذمے دار ہوئے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اس اٹھانے میں ان کو کِذب کے ساتھ موصوف فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ یعنی ان کے گناہ اٹھانے کے وہ جو ضامن ہوئے ہیں تو وہ بے شک اس میں البتہ جھوٹے ہیں۔ امام مہدوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ عزوجل کی طرف سے ان کی جو یہ تکذیب ہوئی تو یہ معنی پر محمول ہے، اس لیے کہ معنی یہ ہیں کہ اگر تم ہماری پیروی کرو گے تو ہم تمھارے گناہ اُٹھا لیں گے، پھر چوں کہ امر معنی میں خبر کی طرف راجع ہوتا تھا، اس لیے اس پر تکذیب واقع کی گئی، جس طرح کہ خبر پر واقع کی جاتی ہے۔[3]

﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ ﴾ اثقال سے مراد ان کے گناہ ہیں جو انھوں نے کیے ہیں۔ گناہوں کی تعبیر اثقال سے کی، اس لیے کہ ان کو اس بات سے آگاہ کرنا منظور ہے کہ ان کے گناہ بڑے بھاری بوجھل ہیں۔ ﴿ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ اس سے مراد اُن لوگوں کے گناہ ہیں جن کو انھوں نے بہکایا ہے اور ہدایت سے گمراہی کی طرف نکالا ہے۔ ﴿ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ یعنی باطل اور جھوٹی باتیں جو وہ بنایا کرتے تھے اور دنیا میں ان کو پیش کیا کرتے تھے، ان کے بارے میں قیامت کے دن ان سے سوال ہوگا بطور تقریع و توبیخ، یعنی ڈانٹ ڈپٹ کے لیے۔ انھی جھوٹی باتوں میں سے ان کا یہ وعدہ ہے کہ ہم تمھارے گناہ اٹھا لیں گے، حالاں کہ یہ ایک فضول بات ہے، ہرگز کوئی رفاقت کر کے کسی کا گناہ اٹھا نہ سکے گا۔[4]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿14﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿15﴾

اور بلاشبہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، چناں چہ وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار

[1] فتح القدير (٤/ ٢٥٦) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٣٠) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٣١) [4] فتح البيان (١٠/ ١٧٢۔ ١٧٣)

سال رہا، پھر انھیں طوفان نے اس حال میں پکڑ لیا کہ وہ ظالم تھے ⑭ پھر ہم نے اسے اور کشتی والوں کو نجات دی، اور ہم نے اس (کشتی) کو دنیا والوں کے لیے عظیم نشانی بنا دیا ⑮

نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ:

کہتے ہیں طوفان سے پہلے اتنا رہے اور بعد میں بھی ایک مدت رہے، ساری عمر چودہ سو برس ہوئی۔ جس وقت یہ سورت اتری تو نبی اکرم ﷺ کے بہت سے ساتھی، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کافروں کی ایذا سے بچنے کے لیے جہاز پر بیٹھ کر حبشہ کے ملک چلے گئے، جب نبی اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینے میں آ گئے تو وہ بھی سلامتی کے ساتھ آ ملے۔ جہاز کو لوگوں کے لیے نشان بنایا، یعنی دنیا میں کشتی سے بڑے کام چلتے ہیں اور اللہ کی قدرتیں نظر آتی ہیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ کے لیے تسلی ہے اور ان کو نوح علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ وہ اپنی قوم میں اتنی مدت رہے۔ رات دن ظاہری طور پر اور پوشیدہ طور پر آہستہ سے اور پکار کر ان کو اللہ پاک کی طرف بلاتے رہے اور باوجود اس کے ان کی دعوت نے ان کے جھٹلانے اور ایمان نہ لانے میں ہی اضافہ کیا اور اُن میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴾ یعنی اس مدتِ دراز کی تبلیغ اور ڈرانے نے ان پر کچھ اثر نہ کیا، پس اے نبی! تو ان لوگوں پر افسوس نہ کر جنھوں نے تیری قوم میں سے تیرا انکار کیا اور ان پر رنج مت کر، کیوں کہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، کام اسی کے ہاتھ میں ہے اور سارے امور اسی کی طرف رجوع ہوں گے۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴾ [یونس: ٩٦۔ ٩٧] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔'' اور تو جان رکھ کہ اللہ تعالیٰ تجھے غالب کرے گا اور تیری نصرت اور تائید فرمائے گا اور تیرے دشمنوں کو ذلیل وخوار کرے گا اور ان کو سب نیچوں سے نیچے کرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نوح علیہ السلام چالیس برس کی عمر میں مبعوث ہوئے اور پچاس کم ہزار برس ان میں رہے اور طوفان کے بعد ساٹھ برس زندہ رہے، ''حَتّٰی كَثُرَ النَّاسُ وَفَشَوْا'' یعنی یہاں تک کہ لوگ بہت ہو گئے۔ (قاله حماد بن سلمة عن علي بن زيد عن يوسف بن ماهك عنه)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ ان کی ساری عمر پچاس برس کم ہزار برس کی ہوئی، دعوت سے پہلے تین سو

برس ان میں رہے اور تین سو برس ان کو دعوت دی اور طوفان کے بعد تین سو پچاس برس رہے۔[1] یہ قول غریب ہے۔ آیت کے سیاق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی قوم میں پچاس کم ہزار برس رہے اور اللہ کی طرف ان کو بلاتے رہے۔ عون بن ابی شداد (ابن کثیر میں ان کا نام نون کے ساتھ ہے ''عون'' اور فتحین میں عوف ہے ''فاء'' کے ساتھ)[2] نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کو اُن کی قوم کی طرف اس حال میں بھیجا کہ ان کی عمر تین سو پچاس برس کی تھی، پھر پچاس کم ہزار برس ان کو دعوت دی، پھر اس کے بعد تین سو پچاس برس زندہ رہے یہ قول بھی غریب ہے۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم و ابن جریر) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول قریب تر ہے۔ واللہ أعلم۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام اپنی قوم میں کتنے رہے؟ میں نے کہا: پچاس کم ہزار برس۔ کہا کہ پھر لوگ تیرے اس دن تک ہمیشہ اپنی عمروں اور عقلوں اور اخلاق میں کم ہوتے گئے۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ ﴾ یعنی پھر ہم نے نوح علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو اس پر ایمان لائے نجات دی۔ سورت ھود میں اس کا مفصل ذکر گزر چکا ہے اور اسی طرح اس کی تفسیر بھی گزر چکی ہے، اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے اس کشتی کو جہان والوں کے لیے رکھا، یعنی اس کو باقی رکھا۔ یا تو اس کشتی کو بعینہٖ رکھا، جیسا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اول اسلام تک وہ جودی پہاڑ پر باقی رہی۔ یا اس کی نوع کو باقی رکھا، یعنی اس کی قسم کو مخلوق پر اپنی نعمتوں کی نشانی ٹھہرایا کہ طوفان کے زمانے میں ان کو کس طرح نجات دی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴾ [یٰس: ۴۱۔ ۴۴] ''اور ان کے لیے ایک نشانی (یہ) ہے کہ بے شک ہم نے ان کی نسل کو (نوح کی) بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اور ہم نے ان کے لیے ویسی ہی (اور چیزیں) پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو انھیں غرق کر دیں، پھر نہ تو کوئی ان کی فریاد سننے والا ہوگا اور نہ وہ چھڑائے ہی جا سکیں گے۔ مگر (ان کی نجات) ہماری رحمت ہی سے ہے اور ایک مدت تک فائدہ (اُٹھانے کے لیے) ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ۱۱۔ ۱۲] ''بے شک جب پانی میں طغیانی آئی تو ہم نے تمھیں بہتی ناؤ میں سوار کیا۔ تاکہ ہم تمھارے لیے اس (فعل) کو نصیحت بنا دیں اور (تاکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔'' اور اس جگہ یوں فرمایا:

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۴۱)
[2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۳۵) فتح البیان (۱۰/ ۱۷٤)
[3] تفسیر الطبري (۲۰/ ۱۷) تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰٤۲)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰٤۱)

﴿ فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴾ یہ قول اس باب سے ہے کہ شخص سے جنس کی طرف تدریج کی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ﴾ [الملك: ٥] ''اور البتہ یقیناً ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی ہے اور انھیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے، اور ہم نے ان کے لیے بھڑکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' یعنی ٹھہرایا ہم نے کواکب کی نوع کو شیطانوں کے واسطے مارنے کا ذریعہ، کیونکہ جو ستارے پھینکے جاتے ہیں وہ آسمان کی زینت نہیں ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴾ [المؤمنون: ١٢۔ ١٣] ''اور بلاشبہہ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ مقر رگاہ (رحمِ مادر) میں نطفہ بنا کر رکھا۔'' کیوں کہ جو انسان مٹی کے خلاصے سے بنایا گیا بعینہٖ اس کو نطفہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کی نوع کو کیا ہے۔ اس کی مثالیں بہت ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر یوں کہا جائے کہ ﴿ وَجَعَلْنٰهَاۤ ﴾ میں ضمیر عقوبت کی طرف راجع ہے تو البتہ یہ ایک وجہ ہے۔[1]

تفسیر ابن کثیر کے بعض نسخوں میں اتنی عبارت اول آیت کی تفسیر میں زیادہ ہے کہ اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کی آزمایش کا ذکر فرمایا، اپنی قوم کے ساتھ پچاس کم ہزار برس تک اور ان کی قوم کی آزمایش کا ذکر کیا ان کی اطاعت کے ساتھ۔ پس قوم نے ان کی تکذیب کی تو اللہ پاک نے غرق کرنے کے ساتھ قوم کا ابتلاء کیا، پھر اس کے بعد حرق کے ساتھ، یعنی جلانے کے ساتھ۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کے ابتلاء کا ذکر فرمایا، ان کی قوم کے ساتھ اور جو کچھ قوم نے ان پر رد کیا اور قوم کو مبتلا کیا ان کی اطاعت اور تابعداری کے ساتھ۔ پھر لوط علیہ السلام کے ابتلاء کا ان کی قوم کے ساتھ ذکر فرمایا اور ان کی قوم کے ابتلاء کا ان کے ساتھ اور اُن کا اور ان کی قوم کا جو کچھ انجام ہوا اس کا ذکر فرمایا۔ پھر شعیب علیہ السلام کے ابتلاء کا ذکر فرمایا، ان کی قوم کے ساتھ اور قوم کا ابتلاء ان کے ساتھ اور جو اُن کا اور ان کی قوم کا انجام ہوا اس کا ذکر کیا۔ پھر اس شے کا ذکر کیا جس کے ساتھ عاد و ثمود و قارون و فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کا ابتلاء کیا، یعنی اللہ پاک پر ایمان لائیں اور اسی وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کریں۔ پھر اس کا ذکر کیا کہ ان قوموں کو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ مبتلا فرمایا۔ پھر اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جو سب رسولوں سے زیادہ بزرگ ہیں کہ ان کا ابتلاء انواعِ اقسام کے کافروں مشرکوں اور منافقوں کے ساتھ کیا اور ان کو حکم دیا کہ اہلِ کتاب کے ساتھ صرف اس خصلت کے ساتھ مجادلہ کریں جو خوب تر ہے۔ انتہٰی.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو شروع سورت میں یہ فرمایا تھا: ﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٨) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٣٥۔ ٥٣٦)

﴿ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ [العنکبوت: ۳] پس اس کی تصدیق کے لیے نوح علیہ السلام کا قصہ اجمالاً ذکر کیا۔ ان کی عمر رسالت کے وقت چالیس برس تھی یا زیادہ۔ ان کے اور آدم علیہ السلام کے درمیان ہزار برس کا زمانہ تھا۔ پھر وہ اپنی قوم میں پچاس کم ہزار برس رہے، ان کو سمجھاتے بجھاتے رہے، مگر اس وعظ و نصیحت نے ان پر کچھ اثر نہ کیا۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تثبیت، یعنی حوصلہ ہے کہ گویا یوں کہا گیا کہ نوح علیہ السلام اتنی دراز مدت اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے، حالاں کہ ان میں سے صرف تھوڑے سے لوگ ایمان لائے تو انھوں نے صبر کیا اور ملول نہ ہوئے۔

جب نوح علیہ السلام کی یہ حالت ہوئی تو تو صبر کے ساتھ اولیٰ تر ہے، اس لیے کہ تیرے رہنے کی مدت قلیل اور تیری اُمت کی تعداد کثیر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآنی نظم میں ﴿ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ﴾ واقع ہوا ہے اور یوں نہ کہا کہ نو سو پچاس برس، اس لیے کہ استثنا میں عدد کی تحقیق ہے بہ خلاف ثانی کے کہ اس کا اطلاق کبھی اس عدد پر بھی ہوتا ہے جو اس کے قریب ہوتا ہے اور الف یعنی ہزار کے عدد کا ذکر غرض کی طرف زیادہ پہنچانے والا ہے۔ رہی یہ بات کہ ﴿ اَلْفَ ﴾ کے لیے ﴿ سَنَةٍ ﴾ کا ذکر فرمایا اور ﴿ خَمْسِيْنَ ﴾ کے لیے ﴿ عَامًا ﴾ کا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کی بلاغت کے لیے ضروری ہے کہ ایک ہی لفظ کو دہرانے سے اجتناب کیا جائے۔ پھر یہ بات کہ ﴿ عَامًا ﴾ کے لفظ کو ﴿ خَمْسِيْنَ ﴾ کے ساتھ مخصوص کیا، پس اس سے غرض یہ بتانا ہے کہ نوح علیہ السلام نبی اللہ نے جبکہ قوم سے راحت پائی تو اچھے وقت میں باقی رہے۔ عرب لوگ خِصب و ارزانی کی تعبیر "عَامٌ" سے کرتے ہیں اور جدب و گرانی کی تعبیر "سَنَةٌ" سے کرتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کی عمر کی مقدار میں اختلاف ہے کہ کتنی تھی۔

آیت میں جو ہے وہ یہی ہے کہ وہ اتنی مدت قوم میں رہے، آیت اس پر دال نہیں ہے کہ وہ مدت ان کی ساری عمر ہے، کیوں کہ اپنی قوم میں رہنے سے قبل غیر قوم میں رہے اور ان کے طوفان سے ہلاک ہونے کے بعد زمین میں رہے۔ پس سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کل عمر ایک ہزار پچاس برس کی ہوئی۔[1] چناں چہ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کی عمر اس سے پہلے کہ اپنی قوم میں مبعوث ہوں اور بعد اس کے کہ مبعوث ہوئے ایک ہزار سات سو برس کی ہوئی۔[2] عوف بن ابی شداد کا قول یہ ہے کہ ساڑھے سولہ سو برس کی ہوئی۔[3] یہ قول بھی پہلے گزر چکا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طوفان کے بعد دو سو پچاس برس زندہ رہے۔ پس ان کی عمر ایک ہزار دو سو چالیس برس کی ہوئی۔[4]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ملک الموت نوح علیہ السلام کی طرف آئے تو کہا: "يَا أَطْوَلَ النَّبِيِّيْنَ عُمُرًا"، یعنی اے سب نبیوں سے بڑھ کر عمر والے! تو نے دنیا کو کیسا پایا اور اس کی لذت کو؟ کہا: اس شخص کی طرح جو

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۴۱) (2) الدر المنثور (٦/ ٤٥٦)

(3) ان سب کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ (4) تفسیر أبي السعود (۳/ ۳۵)

ایک گھر میں داخل ہوا جس کے دو دروازے ہیں تو اس گھر کے وسط میں اس نے ذرا دیر قیلولہ کیا، پھر دوسرے دروازے سے نکل گیا۔[1] ﴿فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ﴾ میں حرفِ فاء تعقیب کے لیے ہے، یعنی مذکورہ مدت کے پورا ہوتے ہی ان کو طوفان نے پکڑا۔ طوفان سے مراد بہت زیادہ پانی ہے، جس نے ان کو گھیر لیا اور اُن پر چڑھ گیا تھا۔ پھر وہ سب ڈوب گئے اور اونچے سے اونچے پہاڑ پر چالیس گز بلند پانی ہو گیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ پندرہ گز، یہاں تک کہ ہر شے غرق ہو گئی، سوائے ان لوگوں کے جو کشتی میں تھے۔ طوفان اس کثیر شے کو کہتے ہیں، جو ہر طرف سے گھیر لے، ہر قسم کے اجتماع کو گھیر لے، وہ پانی کی شکل میں ہو یا قتل کی صورت میں یا موت کی شکل میں۔ یہ امام نحاس رحمہ اللہ کا قول ہے۔[2] امام سعید بن جبیر، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ طوفان بارش ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غرق ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ موت ہے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: لیکن وہ پانی میں غالب کیا گیا ہے، چنانچہ اس جگہ یہی مراد ہے۔[4] جملہ ﴿وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا برحال، یعنی ان کو طوفان نے اس حال میں پکڑا کہ وہ ظلم اور شرک پر جمے ہوئے تھے۔ اس مدتِ دراز میں نوح علیہ السلام نے ان کو جو وعظ و نصیحت کی اس نے ان پر کچھ اثر نہ کیا۔

﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ﴾ یعنی پھر ہم نے نوح علیہ السلام کو نجات دی اور اُن لوگوں کو جو اس کی اولاد اور اس کے متبعین میں سے اس کے ساتھ تھے۔ ان کی تعداد میں اختلاف ہے، اس بارے میں بہت سے اقوال ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اٹھہتر آدمی تھے، آدھے مرد اور آدھی عورتیں، انہیں میں سے نوح علیہ السلام کی اولاد سام و حام و یافث اور اُن کی بیویاں تھیں۔ ﴿وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ یعنی ہم نے اس کشتی کو بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے ایک بڑی عبرت کر دیا کہ اگر وہ اپنے رسولوں کی نافرمانی کریں گے تو ان کو بھی عذاب آئے گا۔ کشتی کے نشانی ہونے کی کئی وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ ایک مدتِ مدید تک باقی رہی جودی پہاڑ پر۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[5] دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس کو ریاحِ مزعجہ، یعنی آندھیوں اور حوادث سے صحیح سالم رکھا۔ تیسری یہ ہے کہ زاد، یعنی کھانے پینے کا سامان ختم ہونے سے پہلے پانی خشک کیا گیا۔ یہ وجہ کشتی کے وصف میں سے نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿جَعَلْنٰهَآ﴾ کی ضمیر واقعے کی طرف یا حادثے یا قصے کی طرف راجع ہے، یا نجات پانے یا غرق کے عذاب کی طرف راجع ہے۔[6]

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿16﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ

---

(1) ذم الدنيا لابن أبي الدنيا (١/ ١١٠)
(2) تفسير القرطبي (١٣/ ٣٣٤)
(3) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٤٢) تفسير الطبري (٢٠/ ١٧)
(4) حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ٩٤)
(5) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٤٣)
(6) فتح البيان (١٠/ ١٧٣ـ ١٧٥)

اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ
وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ
اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾

اور (ہم نے) ابراہیم کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا: تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو، اگر تم جانتے ہو تو یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے ⑯ تم تو اللہ کے سوا بتوں ہی کی عبادت کرتے ہو اور تم جھوٹ گھڑتے ہو، بلاشبہ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو، وہ تمھارے لیے رزق کا اختیار نہیں رکھتے، لہٰذا تم اللہ کے ہاں رزق تلاش کرو، اور تم اسی کی عبادت کرو اور تم اسی کا شکر کرو، تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ⑰ اور اگر تم جھٹلاؤ تو تم سے پہلے کئی اُمتوں نے جھٹلایا ہے اور رسول کا کام تو صرف کھلا کھلا پہنچا دینا ہے ⑱

ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم کو دعوتِ توحید:

رزق جو فرمایا تو اس لیے کہ اکثر لوگ روزی کے پیچھے ایمان لاتے ہیں، پس جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی روزی نہیں دیتا، وہی دیتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق دیتا ہے۔ انتھٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے بندے اور رسول خلیلِ جلیل ابراہیم علیہ السلام امام الحنفاء کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو اس طرف بلایا کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرو اور خالص اسی کا تقویٰ اختیار کرو اور اسی وحدہ لاشریک لہ سے روزی طلب کرو اور اسی کی توحید اختیار کرو اور اسی کا شکر ادا کرو، کیوں کہ نعمتوں پر مشکور وہی ہے، ان کا عطا کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

چنانچہ اپنی قوم سے کہا: ﴿ اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ﴾ یعنی اس کے لیے عبادت اور خوف کو خالص کرو۔ ﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی جس وقت تم یہ کرو گے تو دنیا و آخرت میں تم کو خیر حاصل ہوگی اور دنیا اور آخرت میں شر تم سے دور ہو جائے گا۔ پھر یہ خبر دی کہ جن بتوں کو اور بتوں کے آستانوں کو تم پوجتے ہو تو نہ وہ نقصان پہنچاتے ہیں نہ نفع، ان کے نام تو خود تمھیں نے بنا لیے ہیں، پھر ان کا نام معبود رکھ لیا ہے، حالاں کہ وہ تو تمھاری طرح مخلوق ہیں۔ اسی طرح عوفی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام والبی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ”وَتَصْنَعُوْنَ إِفْكًا أَيْ: تَنْحِتُوْنَهَا أَصْنَامًا“[1]

(وبه قال مجاهد في رواية و عكرمة و الحسن و قتادة و غيرهم و اختاره ابن جرير)

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٩۔ ٢٠)

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا ﴾ یعنی وہ کیوں کر معبود ہو سکتے ہیں تم خود تو اپنے ہاتھوں سے گھڑ کر ان کو بت بناتے ہو اور وہ تمھارے لیے کسی روزی کے مالک نہیں ہیں۔ چنانچہ اللہ کے پاس روزی ڈھونڈو۔ یہ بات حصر کرنے میں زیادہ موثر ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ [الفاتحة: ٥] ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔'' اور یہ فرمان: ﴿ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ ﴾ [التحریم: ١١] ''(اے) میرے رب! میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا۔''

اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَابْتَغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ ﴾ یعنی پس طلب کرو اللہ کے نزدیک روزی، یعنی نہ اس کے غیر کے نزدیک، کیوں کہ اس کا غیر کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ ﴿ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ ﴾ یعنی اس کی روزی سے کھاؤ اور اسی اکیلے کو پوجو اور اُسی کا شکر کرو اس نعمت پر جو اس نے تم پر کی ہے۔ ﴿ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾ یعنی قیامت کے دن اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے، پھر وہ ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔

﴿ وَإِن تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ﴾ یعنی اگر تم جھٹلاؤ گے تو بہت سے فرقے پہلے جھٹلا چکے ہیں، چنانچہ رسولوں کی مخالفت کرنے میں جو عذاب اور سزا اور وبال ان پر نازل ہوا اس کی خبر تم کو پہنچ چکی ہے۔ ﴿ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ یعنی رسول پر تو یہی ذمے داری ہے کہ جس رسالت کا اللہ پاک نے اس کو حکم دیا ہے وہ تم کو پہنچا دے، اس کے علاوہ سب کچھ ہیچ ہے اور اللہ بہکا دے جس کو چاہے اور ہدایت دے جس کو چاہے، پس تم اپنی جانوں کے لیے یہ حرص کرو کہ سعید اور نیک بخت لوگوں میں سے ہو جاؤ۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿ وَإِن تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ۖ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ پاک اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی و تشفی فرماتا ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ کا یہ قول اس بات کا مقتضی ہے کہ اگلا کلام منقطع ہو گیا اور ﴿ إِن تُكَذِّبُوا ﴾ سے لے کر ﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ ﴾ تک جملہ معترضہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اس پر نص کی ہے[2] اور سیاق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب ابراہیم علیہ السلام کے کلام سے ہے اور وہ اپنی قوم پر قیامت کے واقع ہونے کے لیے حجت قائم کرتے ہیں، اس لیے کہ اس سب کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ ﴾[3] والله أعلم بمزايا كلامه العزيز.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِبْرَاهِيمَ ﴾ منصوب ہے اس بنا پر کہ معطوف ہے ﴿ نُوحًا ﴾ پر، یعنی ''وأَرْسَلْنَا إِبْرَاهِيمَ''۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ جَعَلْنَاهَا ﴾ کی ضمیر منصوب پر معطوف ہے۔ کسی نے

① تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٤٥) ② تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٠) ③ تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٣٦۔ ٥٣٧)

کہا ہے کہ ''اُذْکُرْ''، مقدر کا مفعول ہے۔ امام ابراہیم نخعی اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ''وَإِبْرٰهِيْمُ'' برفع پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ معنی یہ ہیں: ''وَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ إِبْرَاهِيْمُ''[1] یعنی رسولوں کے زمرے سے ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

﴿ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ﴾ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ منصوب ہے بنا بر ظرفیت، یعنی اور بھیجا ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کے کہنے کے وقت، یا ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کیا نشانی اس کے کہنے کے وقت، یا تو یاد کر ابراہیم علیہ السلام کو اس کے کہنے کے وقت، اس بنا پر کہ ظرف بدلِ اشتمال ہے ابراہیم علیہ السلام سے، یعنی یاد کرو ابراہیم علیہ السلام کے کہنے کے وقت کو، جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اکیلے اسی کو پوجو اور اسی کو عبادت کے ساتھ خاص کرو اور اس کی توحید کرو۔ اس میں اثباتِ معبود کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس بات سے ڈرو کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرو، اس میں اللہ کے سوا غیر کی نفی کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ جو کوئی بادشاہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے اس کی حکومت میں تو یقیناً اس نے سب سے بڑا جرم کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اُعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾ ادائے واجبات کی طرف اشارہ ہے اور ﴿ وَاتَّقُوْهُ ﴾ محرمات سے باز رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ پھر پہلے جملے میں اللہ پاک کا اقرار کرنا داخل ہے اور دوسرے میں شرک سے باز رہنا شامل ہے۔

﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ یعنی اللہ پاک کا پوجنا اور اس سے ڈرنا تمھارے شرک سے بہتر ہے۔ شرک میں کبھی کوئی خیر نہیں ہے، لیکن ان کے اعتقاد کے اعتبار سے ان کو یہ خطاب کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کی عبادت کرنا اور اس کا ڈر رکھنا ہر شے سے بہتر ہے، کیوں کہ مفضل علیہ کو حذف کرنا عموم کا مقتضی ہوتا ہے، باوجود اس کے کہ اس کو تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ ہر شے سے مراد وہ ہر شے ہے جس میں خیریت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ لفظ ﴿ خَيْرٌ ﴾ اس جگہ صفت ہو اسم تفضیل نہ ہو۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اگر تم جانتے ہو کسی شے کو علم سے۔ یا اس کو اس طرح سے جانتے کہ تم خیر اور شر کے درمیان تمیز کرلو، لیکن تم تو کچھ جانتے بوجھتے نہیں ہو۔

پھر خلیل جلیل علیہ السلام نے ان کے مذہب کا جھوٹا ہونا بہت ہی موثر طریقے سے ذکر کیا۔ چنانچہ یوں فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی تم جن کو اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تو بت ہیں جو نہ نفع پہنچائیں اور نہ نقصان اور نہ سن سکیں اور نہ دیکھیں۔ اوثان کہتے ہیں اصنام کو۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: صنم وہ ہے جو سونے یا چاندی یا تانبے سے بنایا جاتا ہے اور وثن وہ ہے جو چونے سے یا پتھروں سے بنایا جاتا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وثن صنم ہے، اس کی جمع اوثان ہے۔[2]

﴿ وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ﴾ ''أَيْ: وَتَكْذِبُوْنَ كَذِبًا'' اس بنا پر کہ ﴿ تَخْلُقُوْنَ ﴾ کے معنی ''تَكْذِبُوْنَ'' ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کے معنی ''تَعْمَلُوْنَ وَتَنْحِتُوْنَ'' ہوں۔ یعنی تم ان کو بناتے ہو اور گھڑتے ہو واسطے اِفک کے۔

[1] فتح القدير (٤/ ٢٥٩) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٣٥)

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿ تَخْلُقُوْنَ ﴾ کے معنی "تَنۡحِتُوۡنَ" ہیں، یعنی تم جو پوجتے ہو تو یہ بت ہیں جن کو تم خود بناتے ہو۔ یہ معنی جمہور کی قراءت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے ﴿ تَخْلُقُوْنَ ﴾ پڑھا ہے بفتحِ تائے فوقیہ وسکونِ خائے معجمہ و ضمِ لام، مضارع خلق کا اور ﴿ اِفْکًا ﴾ بکسرِ ہمزہ وسکونِ فاء۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور امام زید بن علی، سلمی اور قتادہ رحمہم اللہ نے بہ فتحِ خاء ولامِ مشددہ پڑھا ہے۔ اصل اس کی "تَتَخَلَّقُوۡنَ" ہے اور زید بن علی رحمہ اللہ سے بہ ضمِ تا وتشدیدِ لامِ مکسورہ بھی مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور فضیل بن ورقان نے "أَفِكًا" پڑھا ہے بہ فتحِ ہمزہ وکسرِ فاء۔ یہ مصدر ہے مثل کذب کے یا صفت ہے مصدر محذوف کی۔ "أَيْ: خَلْقًا أَفِكًا"[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ اس پر قادر نہیں کہ تم کو کچھ روزی دیں، چنانچہ تم اپنی روزی اور رزق کے بارے میں اپنی رغبت کو مصروف کرو اللہ پاک کی طرف، کیوں کہ سارا رزق اسی کے پاس ہے، لہٰذا تم اسی سے رزق مانگو اور اسی کے فضل سے طلب کرو اور اسی کو پوجو نہ کہ اس کے غیر کو اور اس کی توحید کرو اور اس کی نعمتوں پر اس کا شکر کرو۔ عبادت وشکر کا ذکر رزق طلب کرنے کے بعد اس لیے کیا کہ عبادت تو رزق کے ملنے کا سبب ہے اور شکر اس رزق کے باقی رہنے کا موجب ہے اور مزید رزق کا سبب ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ﴾ [إبراهيم: ٧] "اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً میں تمھیں مزید دوں گا اور اگر تم کفر کرو گے تو بلاشبہہ میرا عذاب بہت شدید ہے۔"

محاورے میں بولتے ہیں: "شَكَرْتُهُ وَشَكَرْتُ لَهُ" یعنی یہ نفسہٖ بھی متعدی ہوتا ہے اور بہ حرفِ لام بھی۔ ﴿ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی تم اللہ پاک کے محلِ جزا کی طرف رجوع کیے جاؤ گے موت کے ساتھ اور جی اُٹھنے کے بعد، نہ کہ اس کے غیر کی طرف رجوع ہو گے۔ تم اس کی عبادت کر کے اور اس کی نعمتوں پر شکر بجا لا کے اس کے ملنے کی لیاقت حاصل کرو۔

پھر جب اللہ پاک توحید کے بیان سے فارغ ہوا تو اس کے بعد تہدید ذکر کی، یعنی خوف دلایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ﴾ یعنی اگر تم محمد ﷺ کی تکذیب کرو گے تو یہ تو کفار کی عادت ہے۔ جیسے قومِ شعیب، قومِ ادریس اور قومِ نوح علیہم السلام وغیرہم تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ ایک رسم قدیم ہے۔ اس معنی کی بنیاد پر یہ آیت اللہ پاک کے قول سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے قول سے ہے، یعنی اگر تم مجھے جھٹلاؤ گے تو یہ جھٹلانا میرے علاوہ بھی، یعنی میرے غیر کے لیے بھی واقع ہو چکا ہے ان لوگوں میں سے جو تم

[1] فتح القدير (٤/ ٢٥٩)

سے پہلے گزر چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملۂ معترضہ ہے جو قولہ اللہ تعالیٰ: ﴿ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ تک متصل ہے، اہلِ مکہ کی تذکیر اور ڈرانے کے لیے واقع ہوا ہے۔

﴿ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴾ یعنی رسول کے ذمے نہیں ہے مگر یہی کہ اللہ کے احکام کو کھول کر بیان کر دینا اپنی قوم کو جس کی طرف وہ بھیجا گیا ہے۔ ان کو ہدایت دینا اس کے ذمے نہیں ہے، نہ ہی یہ اس کے بس میں ہے۔ غرضیکہ جب اللہ پاک نے پہلی اصل چیز بیان کی، یعنی توحید اور دوسری اصل چیز کی طرف اشارہ کیا ﴿ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴾ سے، یعنی رسالت۔ پھر تیسری اصل چیز کا بیان شروع کیا، یعنی حشر و نشر۔ یہ تین اصول ایسے ہیں کہ ذکرِ الٰہی میں ایک دوسرے سے منفک، یعنی علاحدہ نہیں ہوتے، اللہ پاک کے بیان میں ان کا ذکر متصل آیا کرتا ہے، لہٰذا ارشاد فرمایا:[1]

اَوَلَمْ یَرَوْا كَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝۱۹ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۲۰ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاۗءُ وَیَرْحَمُ مَنْ یَّشَاۗءُ ۚ وَاِلَیْهِ تُقْلَبُوْنَ ۝۲۱ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاۗءِ ۡ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ۝۲۲ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَلِقَاۗىِٕهٖۤ اُولٰۗىِٕكَ یَىِٕسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۲۳

کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ مخلوق کو پہلی بار کیسے پیدا کرتا ہے، پھر وہ اسے لوٹائے گا، بلاشبہہ یہ اللہ پر بہت آسان ہے⑲ کہہ دیجیے: تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو اس نے مخلوق پہلی بار کیسے پیدا کی، پھر اللہ ہی (اسے) دوسری بار پیدا کرے گا، بلاشبہہ اللہ ہر شے پر خوب قادر ہے⑳ وہ جسے چاہے عذاب دے گا اور جس پر چاہے رحم کرے گا اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے㉑ اور تم (اللہ کو) نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو اور نہ آسمان میں اور تمھارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار㉒ اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، وہی لوگ میری رحمت سے نا اُمید ہو چکے ہیں، اور انھی کے لیے دردناک عذاب ہے㉓

---

[1] فتح البیان (۱۰/ ۱۷۵۔ ۱۷۷)

حیات بعد الممات کے دلائل کا بیان:

یعنی مخلوق کا پہلی دفعہ پیدا کرنا تو تم دیکھتے ہو دوہرانا اسی سے سمجھ لو۔ انتہی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے نبی خلیل جلیل علیہ السلام کے متعلق خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو قیامت کے برحق ہونے کی راہ بتائی جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ اس شے سے جس کا وہ خود مشاہدہ کر رہے ہیں اپنی جانوں میں کہ اللہ پاک نے ان کو پیدا کیا اور انھیں وجود عطا فرمایا، اس کے بعد کہ وہ کوئی ایسی شے نہ تھے جو ذکر کے قابل ہو، پھر وہ وجود میں آئے، سننے اور دیکھنے والے انسان بن گئے، لہٰذا جس ذات پاک نے اس انسان کی ابتدا کی وہی اس کو دہرانے پر، یعنی دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے، کیوں کہ دہرانا اس کے لیے بہت زیادہ آسان ہے۔

پھر ان کو اس کی طرف توجہ دلائی کہ آفاق میں جن نشانیوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں ان سے عبرت لیں اور ان کو سوچیں اور سمجھیں کہ اللہ پاک نے کیسی کیسی اشیاء پیدا کی ہیں۔ یہ اونچے اونچے صاف شفاف آسمان اور ان میں چمکتے اور دمکتے ستارے، پھر اُن میں سے بعض تو ثوابت ہیں اپنی اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں اور بعض سیارات ہیں اپنے اپنے مدار میں چکر مارتے ہیں اور یہ زمینیں بعض تو ان میں نرم ہیں بچھونے کی طرح اور بعض سخت پتھریلی ہیں اور کیسے بلند پہاڑ ہیں جو زمین پر جمے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ پہاڑوں کے درمیان وادیاں ہیں صاف اور برابر میدان ہیں، ان میں پانی کا بہاؤ ہے، کہیں جنگل بیابان چٹیل میدان ہے، نہ درخت ہیں نہ گھاس، کہیں چھوٹے چھوٹے کہیں بڑے بڑے درخت ہیں، کہیں باغ و بستان ہیں، سبزہ زار ہے، نہریں جاری ہیں انواع و اقسام کے میوے لگے ہیں، کہیں بڑے بڑے عمیق گہرے دریا ہیں، غرضیکہ روئے زمین پر قسم قسم کی مخلوق اللہ پاک کی پیدا کی ہوئی موجود ہے، لوگ شب و روز اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

یہ سب چیزیں فی نفسہ اپنے ختم ہو جانے پر دلالت کرتی ہیں اور اپنے بنانے والے کے وجود پر دلالت کرتی ہیں، جو مختار ہے اور کسی شے سے صرف یہ فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتی ہے، اسی لیے یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ [الروم: ۲۷] ''اور وہی (اللہ) ہے جو مخلوق پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی اسے لوٹائے گا، اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔''

پھر فرمایا: ﴿ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ یہ مقام اس آیتِ کریمہ کے مشابہ ہے: ﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ [حم السجدة: ۵۳] ''جلد ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق (دنیا) میں بھی اور خود اُن کی

ذات میں بھی دکھائیں گے، حتی کہ ان کے لیے واضح ہو جائے گا کہ بے شک یہ (قرآن) حق ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴾[الطور: ٣٥۔ ٣٦] ''کیا وہ بغیر کسی شے کے پیدا کیے گئے ہیں، یا وہی (خود اپنے) خالق ہیں؟ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی حاکم متصرف اللہ پاک ہی ہے، کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم کرتا ہے جو ارادہ فرماتا ہے، اس کے حکم کا پیچھے ڈالنے والا کوئی نہیں ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے اس کا اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور بندوں سے پوچھ ہوگی۔ چنانچہ خلق وامر اسی کا ہے، جب کبھی کوئی فعل کرتا ہے تو عدل فرماتا ہے، کیوں کہ وہ تو ایسا مالک ہے کہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے، جس طرح کہ حدیث شریف میں مروی ہے جس کو اہلِ سنن نے روایت کیا ہے کہ اگر اللہ اپنے آسمان والوں اور اپنے زمین والوں کو عذاب کرے تو ان کو عذاب کرے گا اور وہ ان پر ظالم نہ ہوگا[1] اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴾ یعنی قیامت کے دن تم اسی کی طرف رجوع کیے جاؤ گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ یعنی اس کے آسمان اور زمین والوں سے کوئی اس کو عاجز کرنے والا نہیں ہے، بلکہ اپنے بندوں کے اوپر وہی قاہر ہے، ہر شے اسی سے ترساں ولرزاں اور اس کی طرف محتاج اور نیاز مند ہے اور وہ اپنے ماسوا سے غنی اور بے نیاز ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی جن لوگوں نے اللہ پاک کی آیتوں کا جحد وانکار کیا اور معاد کے منکر ہوئے تو ان لوگوں کے واسطے اس کی رحمت میں کسی طرح کا حصہ نہیں ہے اور انہیں کے لیے دنیا اور آخرت میں سخت اور دردناک عذاب ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جمہور نے ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا ﴾ بیائے تحتیہ پڑھا ہے بنا بر خبر۔ ابو عبید وابو حاتم نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا: گویا یوں فرمایا: "أَوَلَمْ يَرَ الْأُمَمُ" یعنی کیا نہیں دیکھا اُمتوں نے۔ امام ابوبکر، اعمش، ابن وثاب، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو خطاب کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے قریش کو خطاب ہے۔ جمہور نے ﴿ كَيْفَ يُبْدِئُ ﴾ پڑھا ہے بضم یائے تحتیہ "أَبْدَأَ يُبْدِئُ" سے اور امام زبیری، عیسیٰ بن عمر اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے بہ فتح تحتیہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٤٤)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٣٧۔ ٥٣٨)

"بَدَأَ يَبْدَأُ" سے[1] اور امام زہری رحمہ اللہ نے "كَيْفَ بَدَءَ" معنی یہ کیے ہیں کہ کیا نہیں انھوں نے دیکھا کہ اللہ ان کو کس طرح پیدا کرتا ہے؛ پہلے نطفہ، پھر علقہ، یعنی جما ہوا خون، پھر مضغہ، یعنی گوشت کا ٹکڑا، پھر ان میں روح پھونکتا ہے، پھر ان کو دنیا کی طرف نکالتا ہے، پھر اس کے بعد ان کو وفات دیتا ہے، پھر وہی ان کو دوبارہ زندہ کرے گا، جس طرح کہ ان کی ابتداء کی تھی اور ایسا ہی باقی حیوانوں کا حال ہے اور سارے نباتات کا۔ پھر جب تم ابتدائے پیدائش پر اور ایجاد کرنے پر اللہ کی قدرت دیکھ چکے تو وہی اعادے پر قادر ہے۔ ہمزہ عدمِ رویت کے انکار کے لیے ہے اور حرفِ واو مقدر پر عطف کے لیے ہے، یعنی کیا انھوں نے اعادے کا انکار کیا اور ابتدائے خلق کو نہیں دیکھا۔

مطلب یہ ہے کہ اعادے کا انکار ان کو نہیں پہنچتا ہے، وہ تو ابتدائے خلق کو دیکھ چکے ہیں، چنانچہ جو ذات پاک ابتداء پر قادر ہے وہی اعادے پر قادر ہے، بلکہ اعادہ تو ابتداء کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ اب انکار کی وجہ سوائے ہٹ دھرمی اور بے شرمی کے اور کوئی نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ انھوں نے ابتدائے خلق کہاں دیکھی ہے کہ ان سے یوں کہا جاتا ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا ﴾؟ تو اس کا یہ جواب ہے کہ رویت سے مراد واضح علم ہے جو رویت کی طرح ہے اور عقل مند جانتا ہے کہ ابتداء اللہ پاک سے ہے، کیوں کہ پہلی پیدایش کسی مخلوق کے ذریعے نہیں ہوتی، اگر مخلوق کے ذریعے سے ہوتو وہ خلقِ اول نہ ہوگی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ اللہ پاک سے ہے۔ ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ یعنی بے شک یہ پہلی دفعہ اور دوسری دفعہ پیدا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے، کیوں کہ وہ تو جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ پھر خلقِ ثانی کا کیوں کر انکار کرتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کو امر فرمایا کہ اپنی قوم کو یہ حکم دیں کہ زمین میں چلیں پھریں، تاکہ غور وفکر کریں اور عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ﴾ یعنی اے ابراہیم! تو بعث کا انکار کرنے والوں سے کہہ دے کہ ملک میں پھرو اور دیکھو کہ اللہ نے کیسے پیدایش شروع کی ہے، اس کے باوجود کہ بہت زیادہ مخلوق ہے اور ان کے رنگوں اور طبیعتوں اور زبانوں میں اختلاف ہے اور پہلی اُمتوں کے مساکن اور مکانات کو اور ان کے نشانات کو دیکھو، تاکہ اس سے تمھیں اللہ پاک کی کمال قدرت معلوم ہو سکے، کیوں کہ جو اللہ پاک ان کو پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہوا ہے، وہی ان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ قُلْ ﴾ کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے۔

﴿ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ اللہ جس نے پہلی دفعہ کی اٹھان کو شروع کیا ہے اور اس کو پیدا فرمایا ہے، اس کیفیت پر بعث کے وقت جب دوسری دفعہ اٹھان کرے گا تو وہی اس کو اٹھائے گا، یعنی جس

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٣٦) فتح القدير (٤/ ٢٦٠)

طرح ان کا ابتدائے حال میں ایجاد کرنا تھا اور اس میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آئی، اسی طرح موت کے بعد ان کا دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کوئی مشکل نہ ہوگا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نشاۃِ اولیٰ اور نشاۃِ آخرہ دونشاۃ ہیں اور ان میں سے ہر ایک انشاء ہے، یعنی ابتداء و اختراع ہے اور عدم سے وجود میں لانا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نشاۃ آخرہ انشاء ہے بعد ایک انشاء کے جو اس کے مثل ہے اور نشاۃِ اولیٰ ایسی نہیں ہے۔

جملہ ﴿ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ﴾ معطوف ہے جملہ ﴿ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ پر اور اس کے ساتھ قول کے تحت میں داخل ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نشاۃِ آخرۃ موت کے بعد حیات ہے اور وہ نشور ہے۔[1] جمہور نے "اَلنَّشْأَةَ" بہ قصر وسکونِ شین پڑھا ہے اور حافظ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے بہ مد و فتحِ شین۔ یہ دونوں دو لغت ہیں، جیسے "رَأْفَةٌ" اور "رَآفَةٌ"۔[2] نصب اس کا بنا بر مصدریت ہے بہ حذفِ زوائد۔ اصل میں "الإنشاءة" ہے، یا اس بنیاد پر کہ عامل محذوف ہے، یعنی "يُنْشِئُ فَيَنْشَئُوْنَ النَّشْأَةَ"، غرضیکہ پھر اللہ پاک نے ماقبل کی یہ علت بیان فرمائی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ یعنی پھر اللہ اٹھائے گا پچھلا اٹھان اس لیے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے، اس میں سے پہلی دفعہ پیدا کرنا اور دوبارہ پیدا کرنا ہے۔

﴿ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی دوسری دفعہ پیدا کرنے کے بعد جس کو عذاب کرنا چاہے گا اس کو عذاب کرے گا، یہ لوگ کفار اور گناہ گار ہیں اور رحم کرے گا اس شخص پر جس کو رحم کرنا چاہے گا، یہ لوگ اس پر ایمان لانے والے، اس کے رسولوں کی تصدیق کرنے والے، اس کے احکامات کو بجا لانے والے اور اس کے نواہی سے بچنے والے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عذاب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے خذلان کے ساتھ، یعنی اس کو بے ہدایت چھوڑ دیتا ہے اور رحم کرتا ہے جس کو چاہتا ہے ساتھ ہدایت کے، یا حرص وقناعت کے ساتھ، یا سوئے خلق و حسنِ خلق کے ساتھ، یا اللہ سے منہ موڑنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے ساتھ، یا بدعتوں کے پیچھے لگنے اور سنت کو لازم پکڑنے کے ساتھ۔[3] انتہٰی۔ عذاب کا ذکر رحمت کے ذکر سے پہلے کیا اس کے باوجود کہ اللہ پاک کی رحمت اس کے غضب سے سبقت کر چکی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کفار کا ذکر پہلے ہوا ہے اس لیے عذاب کا ذکر پہلے فرمایا، اس لیے کہ عذاب کے مستحقین کا ذکر پہلے ہے۔ ﴿ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴾ اور تم اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے، نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔

﴿ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴾ یعنی نہیں ہو تم عاجز کرنے والے اپنے رب کو اپنے پانے سے زمین میں جو وسیع ہے اور نہ آسمان میں جو اس سے بھی زیادہ وسیع ہے، بالفرض اگر اس میں تم ہو۔ یہ خطاب ہے بنی آدم کو اور یہ لوگ زمین والے ہیں، ان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ آسمان میں بھاگ جائیں۔ چنانچہ اس سے

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢١) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٣٧) [3] تفسير النسفي (٣/ ٢٥٥)

غرض یہ ہے کہ وہ کسی حال میں بھی ہرگز اللہ پاک سے فوت نہ ہوں گے۔ بالفرض آسمان ہی پر کیوں نہ چلے جائیں، تب بھی اس سے چھپ نہ سکیں گے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کو زمین میں عاجز کرنے والے نہیں ہو اور نہ ہی وہ لوگ جو آسمان میں ہیں اللہ کو آسمان میں عاجز کرنے والے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہاں کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ کی تقدیر ایسی ہے، جیسے سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے:

فَمَنْ يَّهْجُوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْكُمْ وَيَمْدَحُهُ وَيَنْصُرُهُ سواءٌ

"أَيْ: وَمَنْ يَّمْدَحُهُ وَيَنْصُرُهُ سَوَاءٌ" یعنی پس وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتا ہے تم میں سے اور وہ شخص جو آپ کی مدح اور مدد کرتا ہے برابر ہیں۔ (یعنی وہ تمھاری ہجو و مدح و نصرت سے بے نیاز ہیں)۔ اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ [الصافات: ١٦٤] "(فرشتوں کا قول ہے کہ) ہم میں سے تو ہر ایک کی ایک جگہ مقرر ہے۔" یعنی "إِلَّا مَنْ لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ" معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک کو عاجز نہ کریں گے زمین والے زمین میں اور آسمان والے آسمان میں اگر وہ اس کی نافرمانی کریں۔ قطرب نے کہا: یہ معنی ہیں کہ "وَلَا فِي السَّمَاءِ لَوْ كُنْتُمْ فِيْهَا" یعنی اور نہ آسمان میں اگر تم اس میں ہو، چناں چہ یہی معنی پہلے گزر چکے ہیں، اس کی نظیر یہ محاورہ ہے: "لَا يَفُوْتُنِيْ فُلَانٌ هٰهُنَا وَلَا بِالْبَصْرَةِ" یعنی فلاں مجھ سے فوت نہ ہوگا (دور یا غائب نہ ہوگا) اس جگہ اور نہ بصرہ میں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ بصرے کی طرف چلا جائے گا تو بھی مجھ سے بچ نہ سکے گا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "وَلَا مَنْ فِي السَّمَاءِ" اس بنا پر کہ "من" موصولہ نہیں ہے بلکہ نکرہ ہے اور "فِي السَّمَاءِ" اس کی صفت ہے۔ پھر صفت بجائے موصوف قائم کی گئی ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے اس کو رد کیا ہے اور کہا: یہ جائز نہیں ہے اور قطرب کے قول کو ترجیح دی ہے۔[1] آیت کا مقصد امتناعِ فوات کا بیان کرنا ہے ساری تقدیروں پر، ممکن ہوں خواہ مستحیل (ناممکن) یہ اس وقت ہے جب ارض و سماء کو ان کے مشہور معنوں پر محمول کیا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ ارض سے نیچے کی طرف مراد لی جائے اور سما سے بلندی کی سمت مراد لی جائے۔

نکتہ:

یہاں تو ﴿ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴾ فرمایا ہے اور سورۃ الشوریٰ میں ﴿ فِي الْاَرْضِ ﴾ پر اکتفا کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس قوم کو خطاب ہے جس میں نمرود ہے، جس نے آسمان کی طرف چڑھنے کا قصد کیا تھا۔ سورۃ الزمر میں صرف ﴿ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴾ [الزمر: ٥١] "اور وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے۔" فرمایا ہے۔ اختصار کی خاطر ارض و سما دونوں کو حذف کر دیا ہے۔ ﴿ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زیادہ کیا گیا ہے تاکید کے واسطے، یعنی نہیں ہے تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست کہ تم سے دوستی کرے اور نہ کوئی

[1] تفسیر القرطبي (١٣/ ٣٣٧) فتح القدير (٤/ ٢٦٠۔ ٢٦١)

مددگار کہ تمھاری مدد کرے اور اللہ کے عذاب کو تم سے دور کرے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآىِٕهٖٓ اُولٰٓىِٕكَ يَىِٕسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیتوں کے منکر ہوئے۔ آیات سے مراد ہیں آیاتِ تکوینی یا تنزیلی یا دونوں۔ اور اس کی ملاقات کے، یعنی بعث کے اور اس کے بعد جو کچھ ہے، اس کے منکر ہوئے اور اس شے پر عمل نہ کیا جس کی ان کو اللہ کے رسولوں نے خبر دی۔ وہی لوگ میری رحمت سے نا امید ہوئے، یعنی آیات کے اور اللہ کے ساتھ ملاقات کے منکرین دنیا میں اللہ پاک کی رحمت سے نا امید ہونے والے ہیں۔

اللہ پاک کی کتابیں جو نازل ہوئیں انھوں نے ان میں اثر نہ کیا اور نہ اس شے نے جس کی اس کے رسولوں نے ان کو خبر دی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ قیامت کے دن اللہ کی رحمت، یعنی جنت سے نا امید ہوں گے۔ ماضی کا صیغہ اس لیے ذکر کیا ہے کہ اس کے واقع ہونے کا حقیقت ہونا۔ اللہ پاک کو معلوم ہے۔ اللہ پاک نے رحمت کی اضافت اپنی ذات مقدس کی طرف فرمائی اور عذاب کی اضافت نہ کی؟ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے چکی ہے۔ دوسری یہ ہے کہ بندوں کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ رحمت ان سب کے لیے ہے۔ ﴿ وَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ اسم اشارہ کو دوبارہ تاکید کے لیے ذکر کیا۔ ﴿ عَذَابٌ ﴾ کو ﴿ اَلِيْمٌ ﴾ کے ساتھ اس لیے موصوف کیا ہے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ انتہائی طور پر سخت ہے۔ یہ آیت اہلِ مکہ کو سمجھانے کے لیے آخری آیت ہے۔[1]

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ
فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ۝۲۴ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ
بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ
بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ؗ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا
لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۵ۙ

پھر ابراہیم کی قوم کا جواب بس یہی تھا کہ انھوں نے کہا: اسے قتل کر دو یا اسے جلا دو، پھر اللہ نے اسے آگ سے نجات دی، بے شک اس میں ایمان لانے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں (24) اور ابراہیم نے کہا: تم نے اللہ کے سوا جن بتوں کو معبود ٹھہرا لیا ہے، تو یہ محض تمھاری آپس کی دنیا

---

[1] فتح [illegible] (۱۰/ ۱۱۰، ۱۱۱ [illegible] ۱۸۳)

کی دوستی کی وجہ سے ہے، پھر روزِ قیامت تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور تم میں سے ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے، اور تمھارے لیے کوئی مدد کرنے والے نہ ہوں گے ﴿25﴾

قوم ابراہیم کا جواب:

اوپر سے ابراہیم علیہ السلام کا کلام چلا آ رہا تھا، اسی کے موافق درمیان میں اللہ تعالیٰ نے کئی باتیں فرمائیں، پھر اس قوم کا جواب ذکر کیا۔ نہ جلنے میں یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی تاثیر اللہ ہی کے حکم سے ہے، جب اس کا حکم نہ ہو تو آگ کسی چیز کو نہ جلا سکے۔ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، یعنی وہ شیطان جن کے نام کے آستانے ہیں، اللہ کے روبرو منکر ہوں گے کہ ہم نے نہیں کہا تھا کہ ہم کو پوجو، تب یہ پوجنے والے ان کو پھٹکار کریں گے ہماری نذر و نیاز لے کر وقت پر پھر گئے؟ انتہیٰ.

اللہ پاک ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ کفر وعناد اور تکبر اور باطل کے ساتھ حق کو دور کرنے میں ان کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو کے بعد، جو ہدایت اور بیان پر مشتمل تھی، ان کا صرف یہی جواب تھا کہ اس کو مار ڈالو یا جلا دو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قوم پر دلیل اور حجت قائم ہوگئی تو اس طرف ان کا میلان ہوا کہ ملک میں اپنی قوت اور شان کا مظاہرہ کریں۔ چنانچہ بولے: ﴿ ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿97﴾ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴾ [الصافات: ۹۷۔ ۹۸] ''اس کے لیے ایک مکان بناؤ (اس میں آگ جلاؤ) اور اسے دہکتی آگ میں ڈال دو۔ پھر انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنے کا ارادہ کیا تو ہم نے انھیں ہی نیچا دکھا دیا۔''

قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک مدت دراز تک بڑی بڑی لکڑیاں جمع کیں اور ان کے آس پاس دیوار بنائی، پھر ان میں آگ جلائی، اس کا شعلہ آسمان تک بلند ہوتا تھا، اس سے بڑھ کر کبھی کوئی آگ جلائی نہیں گئی، پھر خلیل علیہ السلام کی طرف قصد کیا تو ان کی مشکیں باندھیں اور ان کو پلۂ منجنیق میں ڈالا، پھر آگ میں پھینک دیا۔ مگر اللہ پاک نے اس کو ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی کر دیا اور وہ اس سے صحیح سالم نکلے اس کے بعد کہ اس میں کئی دن تک رہے۔ اسی وجہ سے اور اس جیسی اور وجوہ سے اللہ پاک نے ان کو لوگوں کے لیے پیشوا اور امام بنا دیا، کیوں کہ انھوں نے اپنی جان رحمان کے واسطے پیش کی اور اپنا جسم آگ کے لیے پیش کیا اور اپنے بیٹے کی قربانی اللہ کی راہ میں پیش کی اور اپنا مال مہمانوں کے لیے قرار دیا۔ اس لیے تمام ادیان کے لوگ ان کے ساتھ محبت کرنے میں متفق ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک نے آگ سے ان کو صحیح سالم رکھا، اس طرح سے کہ اس کو ان پر برد و سلام (ٹھنڈی اور سلامتی والی) کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ قوم نے جو بتوں کے پوجنے میں بری کارروائی کی تو خلیل جلیل علیہ السلام اس پر ان کو زجر و توبیخ کرتے اور ڈرا دھمکا کر فرماتے ہیں کہ تم نے جو یہ بتوں کے تھان ٹھہرا لیے ہیں اللہ کے سوا تو اس لیے کہ تم دنیا میں ان کے پوجنے میں مجتمع ہو اپنی دوستی اور الفت کی بنا پر کہ دنیا کی زندگی میں بعض کو بعض سے اُلفت اور دوستی ہو۔ یہ معنی اس شخص کی قراءت پر مبنی ہیں جس نے ﴿ مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ ﴾ کو بنا بر مفعول لہ کے منصوب پڑھا ہے۔ رہی قراءت رفع کی تو اس کی بنیاد پر یہ معنی ہیں کہ تمھارا جو یہ ٹھہرانا ہے تو فقط دنیا میں تمھارے واسطے دوستی حاصل کرے گا۔ پھر قیامت میں یہ حالت الٹی ہو جائے گی، چنانچہ یہ دوستی اور الفت بغض اور عداوت اور فرقت میں بدل جائے گی۔

﴿ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ يَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ یعنی جو دوستی دنیا میں تمھارے درمیان تھی قیامت کے دن ہر ایک اس سے انکار کرے گا اور تابعداری کرنے والے متبوعوں کو اور متبوع تابعداری کرنے والوں پر لعنت کریں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ﴾ [الأعراف: ٣٨] ''جب بھی ایک امت آگ میں داخل ہوگی تو وہ اپنی بہن (اپنے جیسی دوسری امت) پر لعنت کرے گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٦٧] ''اس دن متقین کے سوا تمام (جگری) دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔'' اور اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ يَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ یعنی عرصاتِ قیامت کے بعد تمھارا چلنا اور لوٹنے کی جگہ آگ کی طرف ہے اور تمھارے لیے کوئی مددگار نہیں ہے کہ تمھاری مدد کرے اور کوئی اللہ کے عذاب سے تم کو چھڑانے والا نہیں ہے یہ تو کافروں کا حال ہے، رہے مومن تو ان کی حالت اس کے برعکس ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اُم ہانی رضی اللہ عنہا علی رضی اللہ عنہ کی بہن سے روایت کیا ہے، کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: میں تجھے خبر دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک زمین میں سب اگلوں پچھلوں کو جمع کرے گا۔ پس کون جانتا ہے کہ دونوں کنارے کہاں ہیں؟ ام ہانی نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، پھر ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا عرش کے نیچے سے: اے اہلِ توحید! ''فَيَشْرَئِبُّوْنَ قَالَ أَبُوْ عَاصِمٍ: يَرْفَعُوْنَ رُؤُوْسَهُمْ'' یعنی توحید والے سر اٹھائیں گے، پھر ندا کرے گا: اے توحید والو! پھر تیسری بار ندا کرے گا: اے اہلِ توحید! بے شک اللہ نے تم کو بخش دیا، یعنی معاف کر دیا۔ پھر لوگ کھڑے ہوں گے، بعض بعض سے چمٹے گا دنیا کے ظلمات میں، مراد مظالم ہیں۔ پھر ندا کرے گا: اے اہلِ توحید چاہیے کہ معاف کرے تمھارا بعض دوسرے کو، یعنی تم آپس میں ایک دوسرے پر کیے ہوئے ظلم اور زیادتیوں کو معاف کر دو اور اللہ پر ثواب ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

[1] المعجم الأوسط (٢/ ٨٧) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٤٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٣٨۔ ٥٣٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه أبو عاصم الربيع بن إسماعيل منكر الحديث'' (مجمع الزوائد: ١٠/ ٦٤٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ میں دو قول تھے: ایک یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے تو اس بنیاد پر ﴿ سِيْرُوْا ﴾ جملہ معترضہ ہوا اس کے بعد ﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ ﴾ خطابِ ابراہیم علیہ السلام کی طرف رجوع ہے۔ دوسرا قول یہ تھا: ﴿ قُلْ سِيْرُوْا ﴾ کا خطاب ابراہیم علیہ السلام کو ہے، چنانچہ اس بنا پر اس سے پہلا اور اس سے ملا ہوا کلام اپنے سیاق میں ہے۔ یعنی جب قوم نے باہم مشورہ کیا تو بعض نے بعض سے کہا کہ ابراہیم کی تین دلیلیں جو اصول پر دال ہیں، یعنی توحید، نبوت اور حشر، پس تم ان کا جواب مت دو اور دو کاموں میں سے ایک اس کے ساتھ کرو۔ ایک یہ ہے کہ تلوار وغیرہ سے اس کو مار ڈالو تو جلد اس سے راحت حاصل کر لو گے، یا اس کو آگ سے جلا ڈالو، پھر یا تو وہ تمھارے دین کی طرف لوٹ آئے گا، جبکہ آگ سے اس کو تکلیف پہنچے گی، یا اس میں مر جائے گا اگر وہ اپنے قول اور دین پر جما رہے گا۔ یہ جواب انھوں نے اسی لیے دیا کہ صحیح جواب دینے کی ان کو توفیق نہ ہوئی۔ پھر سب نے ان کے جلانے پر اتفاق کیا، چنانچہ ان کو آگ میں پھینک دیا۔ اللہ پاک نے آگ سے ان کو نجات دی، اس طرح سے کہ اس کو اُن پر ٹھنڈا اور سلامتی والا کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس دن آگ سے کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا، یہ اس لیے کہ اس کی گرمی جاتی رہی تھی۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی بے شک اللہ کے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالے جانے کے بعد نجات دینے میں البتہ واضح دلیلیں اور ظاہر علامتیں ہیں، جو اللہ پاک کی عظیم قدرت اور کاریگری کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی توحید اور قدرت کی اس لحاظ سے تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے تو وہ بڑی آگ جلائی اور خلیل جلیل علیہ السلام کو اس میں ڈالا اور اس نے ان کو نہ جلایا، نہ ہی ان پر کچھ اثر کیا، بلکہ گرمی اور جلا دینا جو اس کی خاصیت تھی وہ اس کی برعکس حالت پر ہوگئی۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیات سے مراد آگ کا ان پر اثر نہ کرنا ہے اور اس کو بجھا دینا اور تھوڑے سے وقت میں اس کی جگہ پر باغ کا پیدا کر دینا ہے۔[1] انتھٰی

زمانۂ قلیل سے مراد "طرفة العين" یعنی آنکھ کا جھپکنا ہے، اس طرح سے کہ آگ نے ان کو ذرا تکلیف نہ دی، لیکن اس نے ان کا بندھن جلا دیا، تاکہ کھل جائے۔ مومنوں کا خاص کر ذکر اس لیے کیا کہ اللہ پاک کی نشانیوں سے وہی عبرت لیتے ہیں اور وہی نفع یاب ہوتے ہیں۔ رہے اور لوگ ان کے سوا تو وہ اس سے غافل اور بے خبر ہیں۔ جمہور نے ﴿ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ کی خبر ہے اور اس کا مابعد اسم ہے۔ امام سالم افطس، عمرو بن دینار اور حسن رحمہم اللہ نے برفع پڑھا ہے اس بنیاد پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ کا اسم ہے اور مابعد محلِ نصب میں ہے بنا بر خبر۔[2]

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٥٢٣) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٣٨) فتح القدير (٤/ ٢٦١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے آگ سے نجات پانے کے بعد اپنی قوم سے کہا اور انھیں ان سے کچھ رُعب اور خوف اور ہیبت حاصل نہ ہوئی کہ تم نے اللہ کے سوا جو بتوں کے آستانے بنا رکھے ہیں تو اس لیے کہ تمھاری آپس میں دوستی اور محبت اور اتحاد و میل جول ہو، ان کی عبادت پر جمع ہونے کے لیے اور اس خوف سے کہ اگر تم ان کی پوجا چھوڑ دو تو تمھاری آپس کی دوستی اور محبت جاتی رہے گی۔ یہ دوستی تو صرف دنیا کی زندگی میں ہے، یعنی دنیا کی زندگی کے بعد منقطع ہو جائے گی اور آخرت میں کچھ فائدہ نہ دے گی۔

پھر قیامت کے دن یہ آستانوں کو مقرر کرنے والے لوگ اور ان کے پوجنے والے ان میں سے بعض لوگ دوسروں کے منکر ہوں گے، پس پیشوا بے زار ہوں گے پیروی کرنے والوں سے اور پیروی کرنے والے پیشواؤں سے بے زار ہوں گے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ بتوں کے پوجنے والے بتوں سے بے زار ہوں گے اور بت بے زار ہوں گے پوجنے والوں سے۔ کہیں گے کہ ہم تم کو جانتے پہچانتے نہیں ہیں اور ہر فریق دوسرے فریق کو لعنت کرے گا بنا بر ہر دو تفسیر مذکور۔ ﴿ وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ ﴾ یعنی سارے کفار کا ماوا اور مسکن آگ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اوثان بھی اس میں داخل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آگ تمھاری وہ منزل ہے، جس کی طرف تم ٹھکانا پکڑو گے۔

﴿ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ یعنی نہیں ہیں تمھاری کوئی مدد کرنے والے کہ تمھاری مدد کرکے تم کو اس سے چھڑائیں۔ امام ابن کثیر، ابو عمر اور کسائی رحمہم اللہ نے "مَوَدَّةُ" کو برفع پڑھا ہے بغیر تنوین کے اور ﴿ بَيْنِكُمْ ﴾ کی طرف اس کی اضافت کی ہے۔ امام اعمش اور ابن وثاب رحمہما اللہ نے برفع مع تنوین پڑھا ہے۔ امام نافع، ابن عامر اور ابوبکر رحمہم اللہ نے بہ نصبِ "مَوَدَّةً"، مع تنوین اور نصبِ "بَيْنَكُمْ"، بنا بر ظرفیت پڑھا ہے۔ امام حمزہ اور حفص رحمہما اللہ نے بہ نصبِ ﴿ مَوَدَّةَ ﴾ مع اضافت بہ سوئے ﴿ بَيْنِكُمْ ﴾ پڑھا ہے۔ یہ چار قراءتیں ہوئیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے رفع کی قراءت کی دو وجہیں ذکر کی ہیں: اول یہ ہے کہ "مودة"، مرفوع ہے، اس بنا پر کہ "إِنَّ"، کی خبر ہے جو ﴿ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ ﴾ میں ہے اور کلمۂ "ما"، کو موصولہ ٹھہرایا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إِنَّ الَّذِيْ اتَّخَذْتُمُوْهُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ"۔ دوسری یہ ہے کہ "مَوَدَّةٌ" خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ "أَيْ: هِيَ مَوَدَّةٌ أَوْ تِلْكَ مَوَدَّةٌ"[1] معنی یہ ہیں کہ مودت وہ مودت ہے جس نے تم کو اوثان کے پوجنے پر جمع کیا ہے اور ان کو معبود ٹھہرانے پر۔ کسی نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ "مَوَدَّةٌ"، مرفوع ہو بنا بر ابتدا اور خبر اس کی ﴿ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ ہو۔ اور جس نے "مَوَدَّةٌ"، کو برفع پڑھا ہے مع تنوین کے تو اس کی توجیہ بھی اول قراءت کی طرح ہے اور "بَيْنَكُمْ"، کا نصب بنا بر ظرفیت۔ اور جس نے ﴿ مَوَدَّةَ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے بغیر تنوین کے تو اس کو ﴿ اتَّخَذْتُمْ ﴾

[1] فتح القدير (٤/ ٢٦٠)

کا مفعول ٹھہرایا ہے اور ﴿ إِنَّمَا ﴾ کو ایک حرف قرار دیا ہے حصر کے واسطے اور اسی طرح جس نے اس کو منصوب اور منون پڑھا ہے یہ بھی جائز ہے کہ ان دونوں قراءتوں میں نصب اس بنا پر ہو کہ ﴿ مَوَدَّةَ ﴾ علت ہے تو یہ مفعول لہ ہوگا اور رفع کی قراءت پر دوسرا مفعول ﴿ اتَّخَذْتُمْ ﴾ کا محذوف ہوگا، یعنی "أَوْثَانًا آلِهَةً" اور اس تقدیر پر کہ کلمۂ "مَا" "اتَّخَذْتُمْ" میں موصولہ ہو تو مفعول اول اس کی ضمیر ہوگا، یعنی "اتَّخَذْتُمُوْهُ" اور دوسرا مفعول "أَوْثَانًا"۔ [1]

فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٦﴾ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٢٧﴾

پھر ابراہیم پر لوط ایمان لایا، اور ابراہیم نے کہا: بے شک میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں، بلاشبہہ وہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے (26) اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب دیے اور اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی، اور ہم نے اسے اس کا اجر دنیا میں بھی دیا اور بلاشبہہ وہ آخرت میں صالح لوگوں میں سے ہوگا (27)

لوط علیہ السلام کے ایمان وہجرت کا بیان:

لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، اس قوم میں سے کسی نے نہ مانا ان کے سوا۔ ان کا شہر بابل تھا۔ پھر اللہ کے توکل پر نکلے تو اللہ نے ان کو ملکِ شام میں پہنچا کر بسایا۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد اور عزت اور ہمیشہ کے لیے نیک نام دیا اور ملکِ شام ہمیشہ ان کی اولاد کو دیا۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے ان کو مانا۔ کہتے ہیں کہ لوط علیہ السلام ان کے بھائی کے بیٹے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوط بن ہاران بن آزر ہیں۔ یعنی ان کی قوم میں سے ان پر کوئی ایمان نہ لایا سوائے لوط علیہ السلام کے اور خلیل علیہ السلام کی بیوی سارہ علیہا السلام کے۔ لیکن کہتے ہیں کہ اس آیۂ کریمہ اور اس حدیث شریف میں جو صحیح میں وارد ہے جمع کیسے ہوگی؟ حدیث یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس وقت اس جبار پر گزرے تو اس نے ان سے بی بی سارہ کے بارے میں ان سے پوچھا کہ ان کا ان سے کیا رشتہ ہے؟ تو فرمایا کہ میری بہن ہے، پھر بی بی سارہ کے پاس آئے تو ان سے کہا کہ میں اس سے کہہ چکا ہوں کہ تو میری بہن ہے، لہٰذا تو مجھے جھوٹا مت کرنا، کیوں کہ روئے زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن نہیں ہے، چنانچہ تو دین میں میری بہن ہے۔ [2] واللہ أعلم.

---

[1] فتح البيان (١٠/ ١٨٢۔ ١٨٣) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧١)

گویا اس سے مراد یہ ہے کہ روئے زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی میاں بیوی دونوں اسلام پر نہیں ہیں، کیوں کہ لوط علیہ السلام تو اُن پر ایمان لا چکے تھے ان کی قوم میں سے اور ان کے ساتھ بلادِ شام کی طرف ہجرت کی تھی۔ پھر لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں اہلِ سدوم اور اس کی اقلیم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اور سدوم والوں کا جو حال ہوا، وہ پہلے گزر چکا ہے اور آیندہ آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ﴾ احتمال ہے کہ قال کی ضمیر لوط علیہ السلام کی طرف راجع ہو، کیوں کہ ان کا سب سے قریب ہی ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ضمیر خلیل علیہ السلام کی طرف راجع ہو۔[1] (قاله ابن عباس و الضحاك) اور ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ﴾ میں انہیں سے کنایہ کیا گیا ہے، یعنی اُن کی قوم میں سے لوط علیہ السلام نے ان کو مانا، پھر ان کی طرف سے یہ خبر دی کہ انھوں نے قوم کے درمیان سے ہجرت اختیار کی دین کا غلبہ طلب کرنے کے لیے کہ دین کو ظاہر کریں اور اس کے ظاہر کرنے کی قدرت پائیں۔

اسی لیے یوں کہا: ﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی عزت اللہ اور اس کے رسول کے واسطے ہے اور ان لوگوں کے واسطے ہے جو اس پر ایمان لانے والے ہیں۔ حکیم ہے اپنے اقوال و افعال اور احکامِ قدری و شرعی میں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں نے اکٹھے کوثی سے شام کی طرف ہجرت کی۔ کوثی سوادِ کوفہ سے ہے۔[2] کہا اور ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے: « إِنَّمَا سَتَكُونُ هِجْرَةٌ بَعْدَ هِجْرَةٍ، يَنْحَازُ أَهْلُ الْأَرْضِ إِلٰى مُهَاجَرِ إِبْرَاهِيمَ، وَيَبْقَى فِي الْأَرْضِ شِرَارُ أَهْلِهَا حَتّٰى تَلْفِظُهُمْ أَرْضُهُمْ، وَتَقْذِرُهُمْ رُوحُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَتَحْشُرُهُمُ النَّارُ مَعَ الْقِرَدَةِ وَالْخَنَازِيرِ، تَبِيتُ مَعَهُمْ إِذَا بَاتُوا، وَتَقِيلُ مَعَهُمْ إِذَا قَالُوا، وَتَأْكُلُ مَا سَقَطَ مِنْهُمْ »[3] یعنی عن قریب ایک ہجرت بعد ہجرت کے ہوگی، زمین والے ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت گاہ کی طرف سمٹ جائیں گے اور زمین پر اس کے بدترین لوگ رہ جائیں گے، یہاں تک کہ ان کو ان کی زمین پھینک دے گی اور اللہ عزوجل کی روح ان سے گھن کرے گی، یعنی اللہ تعالیٰ شام کی طرف ان کے نکلنے کو مکروہ رکھے گا، اس کی ان کو توفیق نہ دے گا اور ان کو آگ بندروں اور سؤروں کے ساتھ گھیر لے گی، رات بسر کرے گی ان کے ساتھ جس وقت وہ رات بسر کریں گے اور دوپہر کو آرام لے گی ان کے ساتھ جب وہ دوپہر کو آرام لیں گے۔ اور اس شے کو کھا لے گی جو اُن سے گر پڑے گی۔ (وقد أسند الإمام أحمد هذا الحديث فرواه مطولا من حديث عبد الله بن عمرو بن العاص، قال: حدثنا عبد الرزاق أخبرنا معمر عن قتادة عن شهر بن حوشب)

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦)

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٥٠ـ ٣٠٥١)

شہر کہتے ہیں کہ جب یزید بن معاویہ کی بیعت ہمارے پاس آئی تو میں شام میں آیا، پھر مجھے ایک مقام کی خبر دی گئی جس میں نوف بکالی قیام کرتے ہیں تو میں اُن کے پاس آیا کہ ایک شخص آیا، لوگوں نے اس پر حمصیہ ڈالا (یعنی شاید ان پر سایہ کرنے کے لیے کملی یا چادر ڈال دی)۔ ناگاہ وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما تھے۔ پھر جب نوف نے ان کو دیکھا تو بات چیت کرنے سے رک گئے۔ پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ فرماتے تھے: عن قریب ہوگی ہجرت بعد ہجرت کے تو لوگ ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت گاہ کی طرف سمٹ جائیں گے، زمین میں صرف اس کے بدترین لوگ ہی باقی رہ جائیں گے۔ ان کو زمین پھینک دے گی۔ ان سے رحمان کا نفس کراہت کرے گا ان کو آگ بندروں اور سوّروں کے ہمراہ گھیر لائے گی۔ رات بسر کرے گی ان کے ساتھ جب وہ رات بسر کریں گے اور قیلولہ کرے گی ان کے ساتھ جب وہ قیلولہ کریں گے اور کھالے گی اس شخص کو جو اُن کے پیچھے رہے گا اور سنا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ فرماتے تھے: قریب ہے کہ کچھ لوگ میری امت میں سے مشرق کی جانب سے نکلیں گے جو قرآن کو پڑھیں گے، وہ ان کے ہانسوں، یعنی گلے سے نیچے نہ اترے گا، ہر وقت ان میں سے کوئی قرن نکلے گا (قرن سے مراد بدعتی لوگوں کی جماعت ہے) تو قطع کیا جائے گا۔ ہر وقت کہ نکلے گا ان میں سے کوئی قرن تو قطع کیا جائے گا، یہاں تک کہ ان کو بیس بار سے زیادہ گنا، ہر وقت کہ نکلے گا ان میں سے کوئی قرن تو قطع کیا جائے گا، یہاں تک کہ ان کے باقی ماندہ میں دجال نکلے گا۔[1] (ورواه أحمد عن أبي داود و عبد الصمد و كلاهما عن هشام الدستوائي عن قتادة به، وقد رواه أبو داود في سننه فقال في كتاب الجهاد: باب ما جاء في سكنى الشام، حدثنا عبيد الله بن عمر حدثنا معاذ بن هشام حدثني عن قتادة عن شهر بن حوشب عن عبد الله بن عمرو قال: سمعت النبي ﷺ يقول: «ستكون هجرة بعد هجرة و ينحاز أهل الأرض إلى مهاجر إبراهيم و يبقى في الأرض شرار أهلها تلفظهم أرضهم وتقذرهم نفس الرحمن و تحشرهم النار مع القردة و الخنازير»)

امام احمد نے شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے کہ میں نے سنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو، کہتے تھے کہ البتہ مقرر دیکھا میں نے ہم کو اور حال یہ تھا کہ دینار و درہم والا زیادہ تر حق دار نہ تھا اپنے مسلمان بھائی سے، پھر البتہ مقرر دیکھا میں نے ہم کو آخر میں اب اور حال یہ ہے کہ دینار و درہم زیادہ تر محبوب ہے ہم میں سے ایک کو اپنے مسلمان بھائی سے اور البتہ مقرر سنا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ فرماتے تھے: البتہ اگر تم پیروی کرو گے بیلوں کی دموں کی اور معاملہ کرو گے عینہ کا (هو أن يبيع من رجل سلعة بثمن معلوم إلى أجل مسمى ثم يشتريها منه بأقل من الثمن الأول.[2] مجمع. أقول اخترعه أكلة الربا) اور چھوڑ دو گے اللہ کی راہ میں جہاد کو تو البتہ لازم کرے

---

① مسند أحمد (٢/ ١٩٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٠٣)

② مجمع بحار الأنوار (٣/ ٧١٩)

گا تم کو مذلت تمھاری گردنوں میں، نہ کھینچی جائے گی وہ تم سے یہاں تک کہ رجوع کرو تم اس شے کی طرف جس پر تم تھے اور رجوع کرو تم اللہ تعالیٰ کی طرف۔

نیز سنا میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہ فرماتے تھے: البتہ ہوگی ہجرت بعد ہجرت کے تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت گاہ کی طرف، یہاں تک کہ زمین میں اس کے بدترین لوگ رہ جائیں گے اور ان کو ان کی زمینیں پھینک دیں گی اور ان کو رحمان کی روح مکروہ رکھے گی اور آگ ان کو بندروں اور سوروں کے ہمراہ گھیر لائے گی، قیلولہ کرے گی ان کے ساتھ جہاں وہ قیلولہ کریں گے اور رات بسر کرے گی ان کے ساتھ جہاں وہ رات بسر کریں گے اور جو شے ان سے گر پڑے گی وہ اس کے واسطے ہے۔ اور البتہ مقرر سنا میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہ فرماتے تھے: نکلے گی ایک قوم میری امت سے، برے اعمال کریں گے، وہ قرآن پڑھیں گے جو اُن کے گلوں سے نیچے نہ اترے گا۔ یزید نے کہا: نہیں جانتا ہوں اس کو میں، مگر کہا کہ تمھارا ایک اپنے علم کو ان کے علم کے مقابلے میں حقیر جانے گا، وہ اہلِ اسلام کو قتل کریں گے، چنانچہ جس وقت وہ نکلیں تو ان کو قتل کرو، پھر جس وقت وہ نکلیں تو ان کو قتل کرو، پھر جس وقت وہ نکلیں تو ان کو قتل کرو، بشارت ہے اس شخص کے لیے جو اُن کو قتل کرے اور بشارت ہے اس کے لیے جسے وہ قتل کریں اور ہر وقت کہ طلوع کرے ان میں کوئی قرن تو اللہ اس کو قطع کرے۔ اس کو رسول اللہ ﷺ نے دہرایا بیس بار یا اس سے زیادہ اور میں سنتا تھا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ﴾ یہ اس آیتِ کریمہ کے مثل ہے: ﴿ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴾ [مریم: ٤٩] ''پھر جب اس نے کنارہ کیا ان سے اور جنھیں وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے تو ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب بخشے، اور ہم نے ہر ایک کو نبی بنایا۔'' یعنی خلیل علیہ السلام نے جب کہ اپنی قوم سے علاحدگی اختیار کی تو اللہ پاک نے فرزند صالح نبی کے وجود سے ان کی آنکھ کو ٹھنڈا کیا اور اس فرزند کا ایک بیٹا صالح نبی اپنے دادا کی زندگی سے پیدا ہوا اور اسی طرح اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ﴾ [الأنبياء: ٧٢] ''اور ہم نے اسے اسحاق بخشا، اور یعقوب مزید (دیا)۔'' یعنی زیادہ، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴾ [هود: ٧١] ''پھر ہم نے اس کو اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب (پوتے) کی۔'' یعنی تمھاری زندگی میں اس فرزند کے ایک فرزند پیدا ہوگا جس سے تمھاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ یہ بات کہ حضرت یعقوب فرزند ہیں حضرت اسحاق علیہ السلام کے، قرآن شریف نے اس پر نص کی ہے اور سنتِ نبویہ میں ثابت ہوئی ہے۔

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٨٤) اس کی سند میں ''ابو جناب یحییٰ بن ابی حیۃ'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ [البقرة: ۱۳۳] ''کیا جب یعقوب کو موت آئی اس وقت تم موجود تھے؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا: میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا: ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک معبود ہے اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔'' صحیحین میں ہے: «إِنَّ الْكَرِيمَ ابْنَ الْكَرِيمِ ابْنِ الْكَرِيمِ ابْنِ الْكَرِيمِ يُوسُفَ بْنَ يَعْقُوبَ بْنِ إِسْحَاقَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ»[1] عليهم الصلاة والتسليم.

رہی وہ روایت جو عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ﴾ کی تفسیر میں روایت کی ہے کہ یہ دونوں ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ہیں،[2] پس اس کے معنی یہ ہیں کہ بیٹے کا بیٹا بیٹے کی طرح ہوتا ہے، کیوں کہ یہ ایسا امر ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کم درجے والے پر بھی مخفی نہیں ہے تو ان پر کس طرح مخفی ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ﴾ یہ ایک خلعت سنیہ، شریفہ اور عظیمہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی، اس کے ساتھ کہ ان کو اپنا خلیل بنایا اور ان کو لوگوں کا امام اور پیشوا کیا، پھر ان کے بعد جو کوئی نبی آیا وہ انہی کی اولاد سے آیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے سارے نبی یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی نسل سے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے آخری نبی عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہوئے۔ چنانچہ اُن کی جماعت میں کھڑے ہوئے بشارت دینے والے نبی عربی، قرشی، ہاشمی کی جو علی الاطلاق خاتم رسل وسید اولاد آدم علیہ السلام ہیں دنیا اور آخرت میں، جن کو اللہ تعالیٰ نے خالص عرب عربا سے برگزیدہ کیا اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے۔ سوائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی نبی نہیں ہوا۔ علیه أفضل الصلاة و السلام.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ﴾ یعنی اللہ پاک نے خلیل علیہ السلام کے واسطے دنیا کی سعادت جمع کی جو آخرت کی سعادت سے ملی ہوئی ہے۔ چنانچہ پس دنیا میں اُن کے لیے ہوا رزقِ واسع، خوش گوار، منزلِ وسیع و فراخ، موردِ عذب و شیریں اور بی بی صالح خوبصورت اور ثنائے جمیل و ذکرِ حسن اور ہر ایک ان سے محبت اور دوستی رکھتا ہے، جس طرح کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے،[3] باوجود اس کے کہ من جمیع الوجوہ طاعتِ الٰہی کے ساتھ قیام کیا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴾ [النجم: ۳۷] ''اور ابراہیم

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۲۰۲) صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

[2] تفسير الطبري (۲۰/ ۲۷) [3] تفسير الطبري (۲۰/ ۲۷۔ ۲۸)

جس نے (صحیفوں میں جو باتیں تھیں، انھیں) ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا؟'' یعنی اللہ پاک نے جس شے کا ان کو امر کیا تھا اس سب کے ساتھ قائم رہے اور اپنے رب کی مکمل اطاعت کی، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ﴾ اور جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٠۔ ١٢٢] ''بلاشبہ ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا، اس (اللہ) نے اسے چن لیا اور اس کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دی۔ اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام جو کچھ لے کر آئے لوط علیہ السلام نے اس سب میں ان کی تصدیق کی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کی رسالت کی تصدیق کی۔[2] کسی نے کہا کہ لوط علیہ السلام ان پر ایمان نہ لائے، مگر جب آگ کو دیکھا کہ ان کو جلاتی نہیں ہے۔ لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ہاران کے بیٹے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ان کی بہن کے فرزند ہیں، پہلا قول اولیٰ ہے۔ امام نخعی اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ﴾ کہنے والے ابراہیم علیہ السلام ہیں۔[3]

کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سب سے پہلے وہ شخص ہیں جس نے اللہ کی طرف ہجرت کی اور اپنا شہر چھوڑا اور اس طرف چلے جس طرف جانے کا اللہ نے ان کو حکم دیا۔ کسی نے کہا کہ ہجرت کے وقت ان کی عمر پچھتر برس کی تھی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوثیٰ سے حران کی طرف ہجرت کی۔ کوثیٰ سوادِ کوفہ میں سے ایک گاؤں ہے۔[4] پھر حران سے فلسطین کی طرف گئے، یہ بریۂ شام ہے۔ پھر شام کی طرف اور اُن کے ساتھ اُن کے بھتیجے لوط علیہ السلام اور ان کی بی بی سارہ تھی، ان سے نکاح کر چکے تھے۔ اسی جگہ سے کہا ہے کہ ہر نبی کے لیے ایک ہجرت ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے لیے دو ہجرتیں۔ معنی یہ ہیں کہ میں اپنی قوم کے گھر سے اس جگہ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں جہاں میں اپنے رب کی عبادت کروں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مسلمانوں میں سے سب سے پہلے جس نے اپنے گھر والوں کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں، پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «صَحِبَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى» یعنی اللہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٣٩۔ ٥٤١)
[2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٦)
[3] تفسیر القرطبي (١٣/ ٣٣٩)
[4] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٦)

تمھارے اور تمھاری بی بی کے ساتھ ہو۔ بے شک سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ البتہ پہلا وہ شخص ہے جس نے لوط علیہ السلام کے بعد اپنی بیوی کے ہمراہ اللہ کی طرف ہجرت کی۔[1] (أخرجه أبو يعلىٰ وابن مردويه)

سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے بعد بے شک وہ پہلا شخص ہے جس نے ہجرت کی۔[2] (أخرجه ابن منده و ابن عساكر) سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عثمان اور رقیہ رضی اللہ عنہما کے اور لوط علیہ السلام کے درمیان کوئی مہاجر نہیں ہے۔[3] (أخرجه الطبراني والحاكم في الكنىٰ وابن عساكر) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی ہے، جیسے کہ لوط علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہجرت کی۔[4] (أخرجه ابن عساكر)۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ ﴾ کہنے والے لوط علیہ السلام ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ﴾ میں اور ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ﴾ میں سب ضمیریں ابراہیم علیہ السلام کی طرف بغیر کسی اختلاف کے راجع ہیں۔ یعنی اللہ پاک نے ان پر یہ احسان کیا ہے کہ ان کو اولاد عطا کی، پھر اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کے چودہ برس بعد دوسرا بیٹا اسحاق علیہ السلام عطا فرمایا۔ پھر یعقوب علیہ السلام فرزند کا فرزند دیا، یہ فرزند ہیں اسحاق علیہ السلام کے اور یہ احسان کیا کہ ان کی اولاد میں نبوت رکھی، ان کے بعد اللہ پاک نے جو نبی مبعوث کیا وہ انہیں کی پشت اور نسل سے ہوا اور ان کی اولاد میں کتاب رکھی۔

لفظِ کتاب کو واحد فرمایا، اس لیے کہ اس میں الف لام جنس کا ہے جو تمام کتابوں کو شامل ہے۔ کتاب سے مراد تورات، انجیل، زبور اور فرقان ہیں۔ دنیا میں اجر دینے کے یہ معنی ہیں کہ غیر وقت میں ان کو اولاد ملی اور اللہ پاک نے ان کو یہ خبر دی کہ نبوت ان کی اولاد میں ہمیشہ رہے گی۔ یہ امر اس قبیل سے ہے کہ اس سے ان کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور ان کا سرور بڑھے۔ کسی نے کہا کہ دنیا میں ان کا اجر یہ ہے کہ ساری ملتوں والے انہیں کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ان میں سے ہیں اور ان کی ثنائے حسن کرتے ہیں اور اہلِ اسلام ہر تشہد کے آخر میں ان کا ذکر کرتے ہیں اور آخر زمانے تک کرتے رہیں گے۔ کسی نے کہا کہ اللہ پاک نے دنیا میں عملِ صالح اور نیک انجام عطا کیا، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ کبھی دنیا میں بھی اجر دیا جاتا ہے۔

---

[1] المعجم الكبير (١/ ٩٠) الدر المنثور (٦/ ٤٥٩) اس کی سند میں ''بشار بن موسیٰ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣١٨١)

[2] الدر المنثور (٦/ ٤٥٩)

[3] المعجم الكبير (٥/ ١٣٩) اس کی سند میں ''عثمان بن خالد عثمانی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٤٦٤)

[4] الدر المنثور (٦/ ٤٥٩)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین والوں کو ان کے دین کی وصیت فرمائی، مگر تمام دین والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو ابراہیم علیہ السلام کا قائل نہ ہو اور ان سے خوش نہ ہو۔ اور فرمایا کہ دنیا کا اجر ذکرِ حسن ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ ولدِ صالح اور ثنا۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ یعنی بے شک وہ آخرت میں البتہ ان لوگوں میں سے ہیں جو صلاح میں کامل ہیں اور مستحق ہیں پورے پورے اجر کے اور کثرتِ عطا کے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلند درجات کے ملنے کے۔[2]

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ٘ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۸ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ١ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ١ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۲۹ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۳۰

اور (ہم نے بھیجا) لوط کو جب اس نے اپنی قوم سے کہا: بے شک تم ایسی فحاشی (بدکاری) پر اُتر آئے ہو، جو تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے بھی نہیں کی (28) کیا تم لوگ مردوں کے پاس (جنسی تسکین کے لیے) آتے ہو، اور تم راستے کاٹتے ہو، اور تم اپنی مجلسوں میں برے کام (بے حیائی) کرتے ہو؟ پھر ان کی قوم کا جواب بس یہی تھا کہ انھوں نے کہا: اگر تو سچوں میں سے ہے تو اللہ کا عذاب لے آ (29) لوط نے کہا: اے میرے رب! فسادی لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما (30)

لوط علیہ السلام کا اپنی قوم کو وعظ:

راہ مارنا بھی ان کا دستور تھا۔ یا اسی بدکاری سے مسافروں کی راہ مارتے تھے کہ اس طرف ہو کر نہ نکلیں اور مجلسوں میں بے حیائی کے کام، شاید یہی بدکاری لوگوں میں کرتے ہوں گے، اس بات کی شرم بھی نہ رہی تھی، یا کچھ اور ٹھٹھے اور چھیڑ خانی کرتے ہوں گے۔ انتہیٰ.

اللہ پاک لوط علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ ان کی قوم کیا بدفعلی کیا کرتی تھی۔ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں پر دوڑتے تھے۔ یہ برا کام ان سے پہلے بنی آدم میں سے کسی نے نہیں کیا۔ انھوں نے، یعنی لوط علیہ السلام نے ان کو اس کام

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٧۔ ٢٨) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٥٢) [2] فتح البيان (١٠/ ١٨٣۔ ١٨٥)

سے روکا اور وہ باوجود اس کے اللہ کا انکار کرتے اور اس کے رسول کی تکذیب اور مخالفت کیا کرتے تھے اور راہ مارتے، یعنی لوگوں کے راستے میں بیٹھ جاتے، ان کو قتل کرتے اور ان کا مال لوٹ لیتے تھے اور اپنی مجلسوں اور محفلوں میں جہاں وہ جمع ہوتے تو اُن میں ناجائز باتیں بکتے، برے برے کام کرتے، ان میں سے کوئی کسی بات کا ایک دوسرے پر انکار نہ کرتا۔ مجلس میں برا کام کرنے کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا کام تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ بعض بعض سے مجمع میں بدفعلی کرتے، یہ قول مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔

کسی نے کہا کہ "كَانُوا يَتَضَارَطُونَ وَيَتَضَاحَكُونَ"، یعنی باہم بہ تکلف پادتے اور ایک دوسرے پر ہنستے تھے۔ یہ قول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے اور قاسم کا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "يُنَاطِحُونَ بَيْنَ الْكِبَاشِ وَيُنَاقِرُونَ بَيْنَ الدُّيُوكِ"، یعنی دنبوں کو اور مرغوں کو باہم لڑاتے تھے۔ یہ سب کام ان سے صادر ہوتے تھے اور وہ اس سے بدتر تھے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ ﴾ کا پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَحْذِفُونَ أَهْلَ الطَّرِيقِ وَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ، وَذٰلِكَ الْمُنْكَرُ الَّذِي كَانُوا يَأْتُونَهُ » (حذف بجائے مہملہ رمی وضرب کو کہتے ہیں اور بجائے معجمہ انگلیوں سے رمی کرنے کو بولتے ہیں۔) یعنی راستے والوں کو کنکریاں مارتے اور ان سے ہنستے تھے، یہ وہ برا کام ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔[2] (رواه الترمذي وابن جرير و ابن أبي حاتم من حديث أبي أسامة حماد بن أسامة أبي يونس القشيري عن حاتم بن أبي صغيرة به، ثم قال الترمذي: هذا حديث حسن لا نعرفه إلا من حديث حاتم بن أبي صغيرة عن سماك)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: "اَلصَّفِيرُ، وَلَعِبُ الْحَمَامِ، وَالْجُلَاهِقُ ("اَلْجُلَاهِقُ"، بضم الجيم وخفة اللام وكسر الهاء۔ قوس البندقة۔ كذا في مجمع البحار)، وَالسُّؤَالُ (اصل میں اسی طرح باللام ہے، مگر مدارک میں "السواك بين الناس" ہے۔ صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ لوگوں میں اور مجلس میں مسواک کیا کرتے تھے۔ یہ کام خلافِ تہذیب ہے۔ لیکن مجمع البحار میں اس جگہ خوب بحث ہے) فِي الْمَجْلِسِ، وَحَلُّ أَزْرَارِ الْقُبَاءِ"[3] (اور تفاسیر میں بجائے اس کے "حل الإزار" ہے) یعنی سیٹی بجانا، کبوتر بازی، غلیل بازی، مجلس میں مسواک کرنا، قبا کی گھنڈیاں کھول دینا۔ قولہ تعالیٰ ﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ ﴾ یہ جواب ان کے کفر و استہزاء اور عناد کی وجہ سے ہے، اسی لیے اللہ کے نبی لوط علیہ السلام نے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٥٤۔ ٣٠٥٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٩٠) مسند أحمد (٦/ ٣٤١) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٠) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٥٤) اس کی سند میں "ابو صالح باذام" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٥٥)

اللہ پاک پر مدد طلب کی تو کہا: اے رب! مفسد قوم پر میری مدد کر۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ وَ لُوْطًا ﴾ منصوب ہے اس بنا پر کہ ﴿ نُوْحًا ﴾ پر یا ﴿ اِبْرٰهِیْمَ ﴾ پر معطوف ہے، یا بتقدیر "اُذْكُرْ" کے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "اور نجات دی ہم نے لوط کو" یا "بھیجا ہم نے لوط کو"۔ ﴿ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ ﴾ ظرف ہے اس فعل کا جو ﴿ لُوْطًا ﴾ میں عامل ہے۔ امام ابو عمرو، حمزہ، کسائی اور ابو بکر رحمہم اللہ نے ﴿ اَئِنَّكُمْ ﴾ بہ ہمزۂ استفہام پڑھا ہے۔[2] باقی قراء نے بغیر استفہام۔ ﴿ اَلْفٰحِشَةَ ﴾ سے مراد وہ خصلت ہے جو قباحت اور برائی میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، یہاں اس سے مراد لواطت ہے۔

جملہ ﴿ سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ اس خصلتِ قبیح کے کمال کا مقرر اور موکد ہے، یعنی یہ خصلت نہایت درجہ قبیح ہے اور یہ لوگ اس کے ساتھ منفرد ہیں، باوجود آدمیوں کے مختلف جنس ہونے کے، پہلے کسی نے بھی اس قسم کا کام نہیں کیا کہ قومِ لوط سے پہلے کوئی نر کسی نر پر چڑھا ہو، اس لیے کہ یہ ایک ایسا کام ہے جس سے طبیعتیں نفرت کرتی ہیں اور نفوس اس سے متنفر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اس خبیث قوم نے اپنی خصلت کی خباثت کی وجہ سے اس پر پیش قدمی کی۔ یہ آیتِ کریمہ اس بات پر دال ہے کہ لواطت پر حد واجب ہے، کیونکہ فاحشہ ہونے میں زنا کے ساتھ شریک ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِیْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٣٢] "اور تم زنا کے قریب مت جاؤ، یقیناً وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔" حد کا واجب ہونا اگرچہ بطور قیاس کے ہے، مگر جامع آیت سے اس کا یہی مطلب نکلتا ہے۔[3] (قاله الرازي)

پھر اللہ پاک نے اس فاحشہ کا بیان فرمایا: ﴿ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ ﴾ یعنی کیا تم لواطت کرتے ہو مردوں سے۔ ﴿ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ﴾ اور قطع کرتے ہو راہ۔ کہا ہے کہ وہ لوگ فاحشہ کیا کرتے تھے مسافروں سے جو اُن پر گزرتے تھے، پھر انھوں نے یہ بدفعلی کی تو لوگوں نے ان پر سے گزرنا چھوڑ دیا۔ چنانچہ اس وجہ سے انھوں نے راستہ کاٹ دیا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ راستوں میں لوگوں سے اپنے خبیث عمل کے ساتھ پیش آتے تھے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ گزرنے والوں پر ان کو قتل کر کے اور لوٹ کر راستہ قطع کرتے تھے۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ ایسے کام کرتے تھے جو راستہ کاٹنے کا سبب بنتے تھے، بغیر کسی خاص سبب کے ساتھ مخصوص کرنے کے۔ کسی نے کہا ہے کہ راستہ قطع کرنے کے معنی نسل کو قطع کرنا ہے، اس طرح سے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے مشغول ہوتے تھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ﴾ "نَادِيْ وَنَدِيٌّ وَمُنْتَدىٰ" وہ جگہ ہے جہاں لوگ

---

(1) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٤١۔ ٥٤٢) (2) فتح القدير (٤/ ٢٦٤) (3) تفسير الرازي (٢٥/ ٥٢) (4) فتح القدير (٤/ ٢٦٤)

بیٹھتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں۔ مجلس کو نادی نہیں بولتے، مگر جب تک کہ اس کے لوگ اس میں ہوں۔ اس منکر میں اختلاف ہے۔ بعض اقوال تو پہلے گزر چکے ہیں، ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جدید اقوال یہ ہیں: امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خذف سے منع فرمایا ہے اور وہ اللہ کا یہ قول ہے: ﴿ وَتَاْتُوْنَ فِىْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ﴾

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا: وہ خذف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[1] خذف انگلیوں کے درمیان میں کنکریاں رکھ کر پھینکنے کو کہتے ہیں، کہا ہے کہ وہ لوگ اپنی مجلسوں میں بیٹھتے اور ان میں سے ہر شخص کے پاس ایک قصعہ یعنی تانبے کا بڑا پیالہ ہوتا، اس میں کنکریاں ہوتی، پھر جب کوئی گزرنے والا ان کے پاس سے گزرتا تو اس کو مارتے، پھر ان میں سے جس کی کنکری اس کو لگتی تو کہتا کہ میں اس کا زیادہ مستحق ہوں اور کہا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہوتا، وہ لے لیتا اور اس سے بدفعلی کرتا اور تین درہم اس کو چٹی دیتا۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک دوسرے پر تھوکتے تھے اور نرد وشطرنج کھیلتے، رنگین لباس پہنتے اور ان کی عادات میں سے یہ تھا کہ مصطگی چباتے، انگلیوں کی پور مہندی سے رنگتے، ازار کھولتے، سیٹی بجاتے۔ اس سے کوئی مانع نہیں ہے کہ وہ سب منکرات کرتے تھے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات کی اطلاع ہے کہ یہ بات مناسب نہیں کہ لوگ منکر پر زندگی گزاریں اور سخریہ (مذاق) اور ممنوعہ باتوں پر جمع ہوں۔[2] غرضیکہ جب لوط علیہ السلام نے ان کی بدفعالیوں سے ان کو منع کیا تو انھوں نے وہ جواب دیا جو اللہ پاک نے ان کی طرف سے نقل فرمایا ہے: ﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ ﴾ یعنی پھر انھوں نے صرف یہی جواب دیا کہ اگر تو سچا ہے تو اللہ کا عذاب لے آ۔ جب ان سے جواب نہ بنا تو تکذیب اور جھگڑے اور عناد کی طرف رخ کیا۔ اس آیت پر پہلے کلام گزر چکا ہے۔

نکتہ:

سورۃ النمل میں یوں گزر چکا ہے: ﴿ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴾ [النمل: ٥٦] ''پھر اس کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ انھوں نے کہا: آلِ لوط کو اپنی بستی سے نکال دو، کیوں کہ یہ لوگ تو بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔'' اور سورۃ الاعراف میں یہ گزرا: ﴿ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ﴾ [الأعراف: ٨٢] ''اور اس کی قوم کا جواب بس یہی تھا کہ انھوں نے کہا: انھیں اپنی بستی سے نکال دو۔''

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٦١)　[2] معاني القرآن (٤/ ١٦٨)

ان تین آیات میں یوں جمع کی گئی ہے کہ لوط علیہ السلام ارشاد و ہدایت پر ثابت قدم و قائم تھے، بار بار ان کو منع کرتے اور وعید سناتے تھے، اول تو قوم نے ان سے یہ کہا: ﴿ ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ ﴾ جس طرح کہ اس آیت میں ہے۔ پھر جب لوط علیہ السلام کی طرف سے بار بار منع کیا گیا اور وہ خاموش نہ ہوئے تو قوم نے کہا: ﴿ اَخْرِجُوْهُمْ ﴾ جس طرح کہ سورۃ الاعراف اور سورۃ النمل میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پہلے قوم نے کہا: ﴿ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ﴾ پھر دوبارہ کہا: ﴿ ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ ﴾ پھر جب لوط علیہ السلام ان سے ناامید ہو گئے تو اللہ پاک سے ان پر مدد طلب کی اور کہا: ﴿ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ یعنی اے میرے رب! تو مفسد قوم پر میری مدد کر اس طرح سے کہ ان پر عذاب نازل کر اور میں نے جو کہا ہے کہ عذاب نازل ہونے والا ہے تو میری بات کو ثابت کر دے۔ ان کا فساد کرنا وہی ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے کہ مردوں سے بدفعلی کرتے تھے اور اپنی مجلس میں برے کام کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کی دعا قبول کر لی اور ان کی قوم کو عذاب کرنے کے لیے فرشتے بھیجے اور فرشتوں کو حکم دیا کہ عذاب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو خوش خبری دیں، اسی لیے یہ ارشاد فرمایا:[1]

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڶ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڭ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۣ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور جب ہمارے قاصد (فرشتے) ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے تو انھوں نے کہا: بے شک ہم اس بستی (سدوم) والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، بلاشبہ اس بستی والے ظالم ہیں (31) ابراہیم نے کہا: بے شک اس میں تو لوط بھی ہے، انھوں نے کہا: ہم خوب جانتے ہیں جو کوئی اس میں ہے، یقیناً ہم اسے اور اس کے گھر والوں کو بچا لیں گے سوائے اس کی بیوی کے، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی (32) اور جب ہمارے قاصد لوط کے پاس آئے تو وہ ان

[1] فتح البیان (۱۰/ ۱۸۵۔ ۱۸۷)

(کے آنے) کی وجہ سے غم زدہ ہوا، اور ان کی وجہ سے (اس کا) سینہ تنگ ہوا، اور فرشتوں نے کہا: تو مت ڈر اور مت غم کھا، بلاشبہہ ہم تجھے اور تیرے گھر والوں کو نجات دینے والے ہیں، سوائے تیری بیوی کے، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے 33 بے شک ہم اس بستی والوں پر ان کے فسق کی وجہ سے، آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں 34 اور بلاشبہہ ہم نے اس بستی کو ان لوگوں کے لیے (بطور) کھلی نشانی چھوڑ رکھا ہے جو عقل رکھتے ہیں 35

ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے ہاں فرشتوں کی آمد:

لوط علیہ السلام غمگین ہوئے اس خیال سے کہ ان مہمانوں کو اپنی قوم کی بدی سے کیسے بچاؤں گا۔ اس بستی کو عبرت کی نشانی بنا دیا، یعنی وہ شہر الٹی راہ پر نظر آتے ہیں۔ انتہی[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب لوط علیہ السلام نے اپنی قوم پر مدد طلب کی تو اللہ پاک نے ان کی مدد کے لیے فرشتے بھیجے تو وہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس بحیثیتِ مہمان گزرے، چنانچہ جو کچھ مہمان کے لیے چاہیے وہ ان کے پاس لائے، پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ کھانے کی طرف بالکل راغب نہیں ہیں تو اُن کو اوپرا سمجھا اور اپنے دل میں ان سے ڈرے تو وہ ان کو انس اور خوش خبری دینے لگے ایک نیک بیٹے کے وجود کی جو اُن کی بیوی سارہ علیہا السلام سے پیدا ہوگا اور وہ حاضر تھیں تو انھوں نے اس پر تعجب کیا۔ چنانچہ اس کا بیان سورت ہود اور حجر میں گزر چکا ہے۔ پھر جب ابراہیم علیہ السلام کو خوشی ہوئی اور فرشتوں نے ان کو بتایا کہ وہ تو قومِ لوط علیہ السلام کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں تو ابراہیم علیہ السلام ان کو عذاب کے دور کرنے کے متعلق کہنے لگے کہ شاید ان کو مہلت ملے اور شاید اللہ پاک ان کو ہدایت دے دے۔

تب فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو اس بستی والوں کو ہلاک کرنا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اس میں تو لوط علیہ السلام ہے۔ وہ بولے: ہم کو خوب معلوم ہے جو کوئی بھی اس میں ہے۔ البتہ ہم اس کو اور اس کے گھر والوں کو بچا لیں گے، مگر اس کی عورت غابرین میں سے ہے، یعنی ہلاک ہونے والوں میں سے، کیوں کہ وہ قوم کے کفر اور سرکشی اور دبر (پرستی) میں ان کے ساتھ موافقت کرتی تھی۔ پھر فرشتے ان کے پاس سے چلے تو لوط علیہ السلام کے پاس خوبصورت جوانوں کی صورت میں داخل ہوئے۔

پھر جب ان کو اس صورت میں دیکھا تو ناخوش ہوئے اور دل میں خفا ہوئے، یعنی ان کے حال سے غمگین ہوئے کہ اگر ان کو مہمان رکھیں تو اپنی قوم کا ڈر ہے اور اگر مہمان نہ رکھیں تو بھی قوم کا خوف ہے اور ابھی تک ان کو ان کے بارے میں معلوم نہیں ہوا تھا۔ فرشتے بولے کہ تو مت ڈر اور نہ ہی رنج کر، ہم تجھ کو اور تیرے گھر والوں کو بچا لیں گے سوائے تیری عورت کے، کیوں کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ ہم کو اس بستی والوں پر آسمان سے ایک

آفت اتارنی ہے، اس وجہ سے کہ یہ بے حکم ہو رہے ہیں۔ یہ اس طرح ہوا کہ جبرائیل علیہ السلام نے ان کی بستیوں کو زمین کی تہ سے اُکھاڑا، پھر ان کو آسمان کے بادلوں تک اٹھایا، پھر ان کو الٹا کر کے دے مارا اور اللہ پاک نے ان پر پتھر برسائے: ﴿ مِنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿82﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴾ [هود: ۸۲۔ ۸۳] ''ان پر کھنگر کے پتھر تہ بہ تہ برسائے۔ جو تمھارے رب کے ہاں سے نشان زدہ تھے۔ اور وہ (پتھر یا سزا یا بستی) ان ظالموں (قریشِ مکہ) سے دور نہیں۔'' اور ان کی جگہ میں ایک بحیرہ خبیثہ بدبودار کر دیا اور یوم التناد تک ان کو عبرت ٹھہرایا اور قیامت کے دن یہ لوگ سب لوگوں سے زیادہ سخت عذاب میں ہوں گے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَاۤ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی البتہ یقیناً چھوڑ رکھی ہم نے اس سے ایک واضح نشانی عقل مند لوگوں کے لیے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿137﴾ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ [الصافات: ۱۳۷۔ ۱۳۸] ''اور بلاشبہ تم صبح کو ان (کی تباہ شدہ بستیوں) پر سے گزرتے ہو۔ اور رات کو بھی، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ''بُشْرٰی'' بہ معنی بشارت ہے، مراد خوش خبری دینا ہے فرزند کی اور فرزند کے فرزند کی، یعنی اسحاق علیہ السلام کی اور پھر اُن کے بیٹے یعقوب علیہ السلام کی۔ ﴿ الْقَرْيَةِ ﴾ سے مراد سدوم ہے، جس میں قومِ لوط رہتی بستی تھی، ابراہیم علیہ السلام کی جگہ سے ایک دن اور رات کے فاصلے پر تھی۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴾ تعلیل ہے ان کو ہلاک کرنے کی۔ یعنی فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو اس بستی کو ہلاک کرنا ہے اس سبب سے کہ وہ لوگ ظالم ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جس بستی کو تم ہلاک کرنے والے ہو اس میں تو لوط علیہ السلام ہیں اور لوط علیہ السلام ظالم نہیں ہیں، پھر تم اس بستی کو کیسے ہلاک کرو گے؟ فرشتے بولے: ہم خوب جانتے ہیں جو کوئی اس میں نیکوں اور بدوں میں سے ہے، ہم لوط کے مکان کو دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں۔ البتہ ہم اس کو اور اس کے گھر والوں کو عذاب سے نجات دیں گے۔ امام اعمش، حمزہ، یعقوب اور کسائی رحمہم اللہ نے ﴿ لَنُنَجِّيَنَّهٗ ﴾ کو بہ تخفیف پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے بہ تشدید پڑھا ہے۔[2] یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔

﴿ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴾ مگر اس کی عورت اللہ کے علم اور اس کے ازلی حکم میں ان لوگوں میں سے ہے جو عذاب میں مبتلا ہونے والے اور ڈوبنے والے ہیں، جن کو اس سے خلاصی نہ ہوگی، اس لیے کہ جو کوئی شر پر دال ہے، اس کے لیے شر کو کرنے والے کی مثل ایک حصہ ہے، جس طرح کہ دالِ خیر پر فاعلِ خیر کے مثل اجر ہوتا ہے۔ یہ عورت لوط علیہ السلام کے مہمان کے بارے میں قوم کو بتا دیا کرتی تھی، اس لیے وہ بھی اس دلالت کی وجہ سے ان میں سے ہی ایک ہوگئی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ اس بستی میں باقی رہنے والوں سے ہے جس پر عذاب نازل ہو

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۴۲۔ ۵۴۳)
[2] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳۴۳)

گا۔ چنانچہ وہ بھی ان سب کے ساتھ عذاب دی جائے گی اور نجات پانے والوں کے ساتھ نجات نہ پائے گی۔ ''غَابِرٌ''، ایک لفظِ مشترک ہے ماضی اور باقی کے درمیان، اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

﴿ وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ ﴾ کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ زائدہ ہے تاکید کے لیے اور اس کی زیادت مطرد ہے، یعنی جب فرشتے ابراہیم علیہ السلام سے رخصت ہو کر لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو ان کے پاس وہ شے آئی جس نے ان کو ناخوش کیا اور ڈرایا، کیوں کہ لوط علیہ السلام نے ان کو بشر میں سے خیال کیا، اس لیے ان پر اپنی قوم سے ڈرے، اس لیے کہ وہ بشری صورتوں میں بہت خوبصورت تھے۔ ﴿ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا ﴾ یعنی ان کی تدبیر سے عاجز ہوئے اور غمگین ہوئے اور ان کا سینہ تنگ ہوا۔ ضیقِ ذراع کنایہ ہے عاجزی اور طاقت کے فقدان سے جس طرح کہ فقر سے کنایہ کرنے میں بولتے ہیں: ''ضَاقَتْ یَدُهُ''، یعنی اس کا ہاتھ تنگ ہوا اور اس کے مقابل میں کہتے ہیں: ''رَحُبَ ذَرْعُهُ بِكَذَا''، یعنی فلاں کا ہاتھ فلاں کام کے ساتھ وسیع و فراخ ہوا۔ جبکہ وہ اس کام کی طاقت رکھتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شے کو دراز دست پہنچتا ہے، کوتاہ دست اس کو نہیں پہنچتا۔

سورت ہود میں اس کی تفسیر پورے طور پر گزر چکی ہے، غرضیکہ جو رنج و غم اور گھبراہٹ لوط علیہ السلام پر طاری ہوئی تھی، جب فرشتوں نے اس کو دیکھا تو ان سے کہا کہ تو ہم پر اپنی قوم سے خوف مت کر اور نہ غم کھا، کیوں کہ وہ ہم پر قادر نہ ہوں گے۔ اللہ نے ان پر جس عذاب کے نازل کرنے کا ہم کو حکم دیا ہے، ہم اس سے تجھ کو اور تیرے گھر والوں کو بچا لیں گے، مگر تیری عورت عذاب میں باقی رہنے والوں میں سے ہے۔ امام حمزہ، کسائی، یعقوب اور اعمش رحمہم اللہ نے ﴿ مُنَجُّوْكَ ﴾ کو بہ تخفیف پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ تشدید پڑھا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُنَجُّوْكَ ﴾ میں کاف مجرور ہے اور عطف ظاہر کا مضمر مجرور پر جائز نہیں ہے، اس لیے ثانی کا معنی پر حمل کیا گیا اور تقدیر یہ ہوگئی: ''وَنُنَجِّيْ أَهْلَكَ''[1]

جملہ ﴿ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ مستانفہ ہے۔ نجات دینے کی تخصیص جو لوط علیہ السلام اور اُن کے گھر والوں کے ساتھ کی تو اس سے اُن کی قوم کی ہلاکت سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس ہلاکت کے بیان کرنے کو یہ جملہ لایا گیا ہے۔ ''رجز'' عذاب کو کہتے ہیں۔ عذاب کا نام رجز اس لیے رکھا گیا ہے کہ عذاب قلق اور اضطراب میں ڈالتا ہے معذب کو۔ یہ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: ''اِرْتَجَزَ إِذَا ارْتَجَسَ'' یعنی جب کوئی مضطرب و بے قرار و بے چین ہوتا ہے تو اس وقت بولتے ہیں: ''اِرْتَجَزَ''، یعنی وہ بے چین ہوا۔ اس جگہ آسمانی عذاب سے مراد پتھروں کے ساتھ مارنا ہے۔ کسی نے کہا: ان کا آگ سے جلانا جو آسمان سے نازل ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ خسف و حصب ہے، یعنی زمین میں دھنسا دینا اور پتھروں سے مارنا، جس طرح کہ اور جگہ فرمایا۔ خسف کا آسمان سے ہونا اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کا حکم آسمان سے نازل ہوا۔ امام ابن عامر رحمہ اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما

[1] فتح القدير (٤/ ٢٦٦)

نے "مُنَزِّلُوْنَ" بہ تشدید پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ تخفیف پڑھا ہے۔ ﴿ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ میں حرفِ باء سببیہ ہے، یعنی آسمان سے ان پر ان کے فسق کے سبب سے عذاب نازل ہوا۔

﴿ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی اس بستی سے ہم نے ایک کھلی علامت و دلالت ونشانی اس قوم کے لیے باقی رکھی، جو آیات اور نشانیوں کو سوچتے اور سمجھتے بوجھتے ہیں عقل والوں کی طرح۔ آیت سے مراد آثار اور نشان ہیں، اس بستی میں ان پتھروں کے جن کے ساتھ وہ مارے گئے اور اجڑے ہوئے گھر اور ان کے اجاڑ گھروں کے آثار، یہاں تک کہ اس اُمت کے شروع میں لوگوں نے اُن کو پایا اور دیکھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے روئے زمین پر سیاہ پانی باقی ہے۔ اس سے کوئی مانع نہیں کہ تمام چیزیں جن کا ذکر کیا گیا، ان پر آیت یعنی نشانی کا اطلاق کیا جائے۔[1] ﴿ لِقَوْمٍ ﴾ کا حرفِ لام ﴿ تَرَكْنَا ﴾ سے متعلق ہے یا ﴿ اٰيَةً ﴾ سے یا ﴿ بَيِّنَةً ﴾ سے۔ یہ قول بہت ظاہر ہے۔ ذوی العقول کا خاص کر اس لیے ذکر کیا کہ یہی لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یہ آثارِ عبرت ہیں، دیکھنے والا ان سے عبرت لیتا ہے۔[2]

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝

اور (ہم نے) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا تو اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اور یومِ آخرت کی اُمید رکھو، اور تم زمین میں فساد کرتے نہ پھرو (36) پھر انھوں نے اسے جھٹلایا تو انھیں زلزلے نے آن پکڑا، پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (37)

شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم کا ذکر:

ان میں لین دین میں دغا بازی کی عادت تھی، شاید راہ میں لوگوں کو لوٹتے بھی تھے۔ انتہیٰ. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے بندے اور رسول شعیب علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم مدین والوں کو ڈرایا، چنانچہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کا حکم دیا اور اس بات کا کہ قیامت کے دن اللہ کے بأس (خوف) اور انتقام اور سطوت (پکڑ) سے ڈریں، چنانچہ یوں کہا: ﴿ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں: اور تم پچھلے دن سے ڈرو۔[3] یہ اس آیت کی طرح ہے ﴿ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ﴾ [الأحزاب: ۲۱] "اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے۔"

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳٤۳) [2] فتح البیان (۱۰/ ۱۸۸۔ ۱۹۰) [3] تفسیر الطبري (۲۰/ ۳٤)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ "عَثی" اور "عَيْث فِي الْأَرْضِ" زمین میں دوڑنے کو کہتے ہیں اور اہلِ زمین پر سرکشی اور ظلم کرنے کو۔ سیدنا شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو زمین میں خرابی مچاتے پھرنے سے منع کیا، اس لیے کہ وہ ناپ تول میں کمی کیا کرتے تھے اور لوگوں کے لیے راستہ قطع کرتے تھے۔ یہ سب کام کرتے اور اس کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے منکر تھے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کو ایک بڑے بھونچال سے ہلاک کر دیا اور ان کے شہر کانپ اُٹھے اور ایک چنگھاڑ جس نے دلوں کو اُن کے حناجر حلقوم سے نکال دیا اور ان پر یوم الظلہ کا عذاب بھیجا، جس نے روحوں کو اپنی قرار گاہ سے نکالا، بے شک وہ عذاب بڑے دن کا عذاب تھا۔ سورۃ الاعراف، ھود اور شعراء میں ان کا قصہ تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ جٰثِمِيْنَ ﴾ بہ معنی "مَيِّتِيْنَ" ہے[1] اور ان کے علاوہ نے کہا ہے کہ بعض بعض پر ڈال دیے گئے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ مدین ایک شخص کا نام ہے۔ کسی نے کہا: شہر کا نام ہے۔ چنانچہ پہلے قول کی بنا پر معنی یہ ہیں: اور بھیجا ہم نے مدین اور اس کی اولاد کی طرف اور دوسرے کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ بھیجا ہم نے مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو۔ ان کا ذکر اور ان کے نسب اور قوم کا ذکر سورۃ الاعراف اور ھود میں گزر چکا ہے۔ یہاں شعیب علیہ السلام کی اضافت قوم کی طرف کی، بخلاف قصۂ نوح، ابراہیم اور لوط علیہم السلام کے کہ ان قصوں میں قوم کا ذکر موخر کیا اور ہر ایک کی ضمیر کی طرف قوم کی اضافت کی ہے، کیوں کہ ساری جگہوں میں اصل یہ ہے کہ قوم کا ذکر کیا جائے، پھر ان کے رسول کا، اس لیے کہ اللہ پاک کسی رسول کو کسی غیر معین قوم کی طرف نہیں بھیجتا، مگر قومِ نوح، ابراہیم اور لوط علیہم السلام کا کوئی اسم خاص نہ تھا، نہ کوئی مخصوص نسبت تھی، جس کے ساتھ ان کی تعریف کی جائے، اس لیے ان کے نبیوں کی اضافت کر کے ان کی تعریف کی گئی۔ لہٰذا یوں کہا گیا کہ قومِ نوح، قومِ ابراہیم اور قومِ لوط علیہم السلام۔ رہے شعیب، ھود اور صالح علیہم السلام کی قوم تو ان کا ایک نسب معلوم تھا، جس کے ساتھ وہ لوگوں کے نزدیک مشہور و معروف تھے۔ اس لیے کلام اپنی اصل پر جاری ہوا۔ چنانچہ یوں کہا گیا: ﴿ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ﴾، ﴿ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ﴾.[3] (ذكره الرازي)

﴿ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾ یعنی اے میری قوم! تنہا اللہ کی عبادت کرو اور اس کو عبادت کے ساتھ خاص کرو۔

نکتہ:

لوط علیہ السلام سے یہ مذکور نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی قوم کو عبادت اور توحید کا حکم کیا اور ان کے سوا اور نبیوں سے اس کا ذکر ہوا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں تھے، وہ عبادت اور توحید کا ذکر پہلے کر چکے

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٤) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٤٣) [3] تفسير الرازي (٢٥/ ٥٧)

تھے، یہاں تک کہ خلق کے نزدیک امر بتوحید بہت مشہور ہو چکا تھا۔ فاحشہ سے منع کرنا جو اُن کے ساتھ خاص تھا، ان کی طرف سے اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ رہے ان کے سوا اور نبی تو وہ ایسے زمانے میں آئے جس میں توحید کی شہرت نہ تھی، اس لیے انھوں نے اپنی قوموں کو توحید کا امر کیا۔

﴿ وَ ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ﴾ یعنی توقع رکھو پچھلے دن کی اور آج وہ اعمال کرو جو اس کے عذاب کو تم سے دور کریں۔ یونس نحوی نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ آخرت سے ڈرو جس میں اعمال کی جزا ملے گی اور اس کا خوف رکھو۔[1] ﴿ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ یہ حال اپنے عامل کی تاکید کرنے والا ہے۔ "عَثْوٌ وَعُثِيٌّ" شدید فساد کو کہتے ہیں۔ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ ﴿ فَكَذَّبُوْهُ ﴾ میں تکذیب ضمنی خبروں کی طرف راجع ہے۔ گویا یہ خبریں دیں کہ اللہ ایک ہے اس کو پوجو اور حشر ہونے والا ہے اس کی توقع رکھو اور فساد حرام ہے، اس کے پاس مت جاؤ۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حکم کرنے والے اور منع کرنے والے کی تکذیب نہیں کی جاتی۔ تکذیب تو خبر دینے والے کی ہوتی ہے۔

﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ﴾ "رَجْفَةٌ" سے مراد شدید زلزلہ ہے۔ سورۃ الاعراف میں بھی اسی طرح ہے اور سورت ھود میں صیحہ ہے اور قصہ ایک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: صیحہ سے مراد جبریل علیہ السلام کی چنگھاڑ ہے۔[2] زلزلے کا سبب یہی چنگھاڑ ہوئی۔ چنانچہ اس کی چنگھاڑ کے مارے زمین کانپ اٹھی اور اس کے سبب سے دل کانپ اٹھے، لرز اٹھے۔ سبب کی طرف اضافت منافی نہیں ہوتی ہے اضافت کو طرف سببِ سبب کے۔ ﴿ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ دار سے مراد ان کا شہر اور زمین ہے، یا ان کے منازل، یعنی پھر صبح کو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل مردہ ہو کر بیٹھنے والے ہو گئے۔[3]

وَعَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۟ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۟ۙ﴿۳۸﴾ وَ قَارُوْنَ
وَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۟ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا
فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۟ۚۖ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ
مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ
مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور عاد اور ثمود (کو بھی ہم نے ہلاک کیا) اور یہ بات تمھارے لیے ان کے (تباہ شدہ) گھروں

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳۴۳) [2] الدر المنثور (۳/ ۵۰۱۔ ۵۰۲) [3] فتح البیان (۱۰/ ۱۹۰۔ ۱۹۱)

سے واضح ہو چکی ہے، اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے مزین کر دیے تھے، پھر اس نے انھیں سیدھی راہ سے روک دیا، حالاں کہ وہ سمجھ بوجھ والے تھے (38) اور قارون اور فرعون اور ہامان کو (بھی ہلاک کر دیا) اور بلاشبہ ان کے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آئے، پھر بھی انھوں نے زمین میں تکبر کیا، اور وہ (عذاب سے بچ کر) نکل جانے والے نہ تھے (39) پھر ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ پر پکڑا، چناں چہ ان میں سے کوئی تو وہ تھے جن پر ہم نے پتھروں بھری آندھی بھیجی، اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں چنگھاڑ نے آن پکڑا، اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں ہم نے غرق کر دیا، اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا، بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے (40)

رسولوں کو جھٹلانے والی کچھ دیگر قوموں کا ذکر:

یعنی دنیا کے کام میں ہوشیار تھے اور اپنے نزدیک عقل مند تھے، پر شیطان کے بہکانے سے نہ بچ سکے۔ انتہی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک ان اُمتوں کے بارے میں خبر دیتا ہے جو اپنے پیغمبروں کو جھٹلانے والی تھیں کہ ان کو کس طرح ہلاک کیا اور ان کو عذاب دینے میں اور پکڑنے میں اور ان سے انتقام لینے میں طرح طرح کی تعذیب فرمائی۔ ہود علیہ السلام کی قومِ عاد، جو احقاف میں رہتے تھے۔ احقاف بلادِ یمن میں حضر موت کے قریب ہے اور صالح علیہ السلام کی قومِ ثمود وادی القریٰ کے قریب حجر میں سکونت پذیر تھے۔ عرب کے لوگ ان کے رہنے بسنے والے مکانوں کو خوب جانتے ہیں اور ان کے پاس سے بہت گزرتے رہتے ہیں۔ اور قارون جو بڑے مال اور خزانوں والا جن کی بھاری کنجیاں تھیں اور فرعون جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر کا بادشاہ تھا اور ہامان جو اس کا وزیر تھا، یہ دونوں قبطی تھے اور کافر تھے، اللہ اور اس کے رسول کے منکر تھے۔

﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ﴾ یعنی ہر ایک کو اس چیز کے ساتھ عذاب ہوا جو اس کے مناسبِ حال تھی۔

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا﴾ یہ لوگ عاد ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہم سے زیادہ سخت اور قوت والا کون ہے؟ پس ان پر انتہائی سرد اور تیز ہوا، یعنی بادِ صرصر آئی، بہت سخت چلنے والی اور زمین سے کنکر اٹھاتی تھی اور ان کو اُن پر ڈالتی تھی اور ان کو زمین سے اُکھاڑتی تھی اور ان کے لوگوں کو زمین سے آسمان کے بادلوں تک اٹھاتی تھی، پھر اس کو کھوپڑی کے بل اوندھا کر کے زمین پر پٹخ دیتی تھی، پھر اس کے سر کو کچل ڈالتی تو وہ بغیر سر کے ایک دھڑ رہ جاتا۔

﴿ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴾ [القمر: ٢٠] ''جیسے وہ جڑ سے اُکھڑے کھجور کے تنے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ﴾ یہ لوگ ثمود ہیں۔ ان پر حجت قائم ہو گئی اور اُن کے واسطے دلالت ظاہر ہو گئی اس اونٹنی سے جس سے پتھر پھٹ گیا تھا، جیسا کہ انھوں نے سوال کیا تھا بالکل اسی طرح سے، اس

کے باوجود وہ ایمان نہ لائے، بلکہ اپنے طغیان، سرکشی اور کفر پر جمے رہے۔ اور اللہ کے نبی صالح علیہ السلام کو ڈرایا اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے اور ان کو یہ وعید سنائی کہ ان کو نکال دیں گے اور پتھروں سے ماریں گے۔ چنانچہ ان پر ایک چنگھاڑ آئی جس نے ان کی آوازوں اور حرکتوں کو ساکن کر دیا۔ ﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ﴾ یہ قارون ہے جو سرکش، باغی، حد سے بڑھنے والا اور ربِ اعلیٰ عز وجل کا عاصی ہوا اور زمین پر اترا کر چلا اور خوش ہوا۔ اپنے نفس سے فخر کیا اور سمجھ بیٹھا کہ وہ دوسروں سے بہتر ہے اور اپنی چال میں اکڑا اکڑا، چنانچہ اللہ پاک نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پس وہ اس میں قیامت کے دن تک گھستا جاتا ہے۔

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ﴾ یہ فرعون اور اس کا وزیر ہامان ہے اور ان کے سارے لشکر۔ یہ سب کے سب ایک صبح میں غرق کر دیے گئے، پھر ان میں سے کوئی خبر دینے والا نہ بچا۔ ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ یعنی اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے اس کام میں جو ان کے ساتھ کیا، پر وہ خود اپنا آپ ہی برا کرتے تھے، یعنی یہ جو ان کے ساتھ ہوا یہ اس کا پورا پورا بدلہ ہے جو اُن کے ہاتھوں نے کمایا۔ ع

ای پسر خود کردہ خود کردہ را درمان چیست

''اے بیٹا! اپنے ہی پاؤں پر ماری ہوئی کلہاڑی کا کیا علاج ہے!''

یہ جو ہم نے ذکر کیا یہ ظاہر سیاق آیتِ کریمہ ہے اور لف ونشر کے باب سے ہے، یعنی اللہ پاک نے جھٹلانے والی اُمتوں کا ذکر کیا، پھر فرمایا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ﴾ یعنی انہیں لوگوں میں سے جن کا ذکر ہوا۔ اس بات پر میں نے جو تنبیہ کی تو اس غرض سے کہ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ﴾ کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ قومِ لوط علیہ السلام کے بارے میں ہے۔[1]

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ﴾ کے بارے میں کہا ہے کہ قومِ نوح ہے۔ یہ روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقطع ہے، کیوں کہ ابن جریج رحمہ اللہ نے ان کو نہیں پایا۔ پھر یہ بات ہے کہ اللہ پاک نے اس سورت میں قومِ نوح علیہ السلام کو طوفان سے ہلاک کرنے اور قومِ لوط علیہ السلام کو ﴿ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ کے اتارنے سے ہلاک کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس کے اور اس سیاق کے درمیان اسی سیاق اور فصل کو طول دیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ﴾ قومِ لوط علیہ السلام ہے۔ ﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ﴾ قومِ شعیب علیہ السلام ہے۔[2] یہ قول بھی بعید ہے، اس کی وجہ سے جو پہلے بیان ہوا۔[3] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ ﴾ بہ معنی حی تو منصرف ہیں اور بہ معنی قبیلہ غیر منصرف۔

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ٣٦) [2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٣٦) [3] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٤٣_ ٥٤٤)

امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: بعض نے کہا ہے کہ یہ اول سورت کی طرح راجع ہے۔ "أَيْ: وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَفَتَنَّا عَادًا وَّثَمُوْدًا" یعنی البتہ یقیناً جانچا ہم نے ان لوگوں کو جو اُن سے پہلے تھے اور جانچا ہم نے عاد کو اور ثمود کو۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: مجھے یہ زیادہ تر محبوب ہے کہ ﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ﴾ پر معطوف ہو۔ یعنی پھر پکڑا ان کو زلزلے نے اور پکڑا اس نے عاد اور ثمود کو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "وَأَهْلَكْنَا عَادًا وَّثَمُوْدًا"[1] یعنی ہلاک کیا ہم نے عاد کو اور ثمود کو۔ کسی نے کہا کہ اس کا عامل "اُذْكُرْ" محذوف ہے، یعنی یاد کر عاد و ثمود کو، جبکہ ہم نے ان کی طرف ھود اور صالح علیہما السلام کو بھیجا۔

﴿ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ﴾ کا فاعل محذوف ہے۔ "أَيْ: آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ"، یعنی اے گروہِ کفار اور اے اہلِ مکہ! ظاہر ہوگئیں تمھارے لیے ان کی سکونت گاہیں، منزلیں اور مکانات جو حجر و احقاف و یمن میں ہیں کھلی کھلی نشانیاں، جن سے تم نصیحت پذیر ہوؤ اور ان میں تم غور و فکر کرو۔ یہ اس لیے فرمایا کہ مکے والے اپنے سفروں میں ان پر سے گزرتے اور ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔

﴿ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ﴾ اعمال سے مراد کفر و معاصی ہیں اللہ کے جن کو وہ کیا کرتے تھے، یعنی شیطان نے ان کو ان کے عمل اچھے کر دکھائے، چنانچہ اس اچھا کر دکھانے سے ان کو کھلے راستے سے روک دیا جو حق کی طرف پہنچانے والا تھا۔ ﴿ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴾ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا: یہ بیان ہے اس ماجرے کے سبب کا جو ان پر گزرا۔ چنانچہ ان کے اعمال ان کا غیر اللہ کو پوجنا ہے، اور سبیل سے مراد اللہ کی عبادت ہے اور تھے ﴿ مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴾ بواسطہ رسل کے، یعنی اس باب میں ان کے لیے کوئی عذر نہیں ہے، کیوں کہ رسولوں نے راہ واضح کر دی۔[2] انتھی.

کسی نے کہا ہے کہ اہلِ بصائر تھے، ان بصیرتوں سے حق کو پہچاننے کی قدرت رکھتے تھے استدلال کے ساتھ، لیکن انھوں نے نہیں کیا۔ یا اس بات کو خوب پہچانتے تھے کہ ان کو عذاب لاحق ہونے والا ہے، کیوں کہ رسولوں نے ان کو خبر دے دی تھی، لیکن انھوں نے لجاج کیا، یعنی جھگڑا کیا اور خصومت کی، یہاں تک کہ ہلاک ہوئے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے عقل مند اور دانش مند لوگ دنیاوی معاملات میں صاحبِ بصیرت تھے۔ چنانچہ ان کی بصیرت نے ان کو نفع نہ دیا۔[3] کسی نے کہا کہ گمراہی میں ﴿ مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴾ تھے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ اپنے کفر اور گمراہی میں بصیرت والے تھے اور اس پر فخر اور ناز کرتے تھے۔ خیال کرتے تھے کہ وہ حق پر ہیں اور ہدایت یافتہ ہیں، چنانچہ اس بنا پر ان کی صفت استبصار کے ساتھ کی اس بات کے لحاظ سے جو اُن کے نزدیک تھی۔

---

① تفسير القرطبي (١٣/ ٣٤٣۔ ٣٤٤) ② تفسير الرازي (٢٥/ ٥٩) ③ تفسير القرطبي (١٣/ ٣٤٤)

④ تفسير الطبري (٢٠/ ٣٥) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٠) یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بجائے امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ملا ہے۔

﴿ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهٰمٰنَ ﴾ یا تو اس کا عطف ﴿ عَادًا ﴾ پر ہو گا۔ "وَكَانَ فِيهِ مَا فِيهِ" اور یا ﴿ فَصَدَّهُمْ ﴾ پر، یعنی ان کو شیطان نے راہِ حق سے روکا اور قارون، فرعون اور ہامان کو بھی روکا۔ یہ قول امام کسائی رحمہ اللہ کا ہے۔[1] کسی نے کہا: تقدیر یہ ہے: "وَأَهْلَكْنَا هٰؤُلَاءِ"، یعنی ہم نے ان لوگوں کو ہلاک کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس رسول آئے۔ قارون کا نام فرعون سے پہلے رکھا، اس کے نسب کے شرف کی وجہ سے، جو اسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قرابت کی وجہ سے حاصل تھا، کیوں کہ وہ ان کے چچا کا بیٹا تھا اور ہامان فرعون کا وزیر ہے۔

﴿ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴾ یعنی البتہ آیا ان کے پاس موسیٰ ظاہر ظاہر حجتیں اور واضح واضح دلیلیں اور کھلی کھلی نشانیاں لے کر، چنانچہ انھوں نے زمین میں اللہ کی عبادت سے تکبر کیا اور نہ تھے وہ ہمارے عذاب کو دور کرنے والے اور اس سے بھاگنے والے۔ جب کوئی شخص اپنے طالب سے فوت ہو جاتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "سَبَقَ طَالِبَهُ" کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ کفر میں سبقت کرنے والے نہیں تھے، بلکہ اس کی طرف بہت سے قرون سبقت کر چکے ہیں۔

﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے ان مذکورین میں سے ہر ایک کو پکڑا اس کے گناہ کے سبب سے اور اس کے کفر اور تکذیب کی وجہ سے اسے عذاب کیا۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "فَأَخَذْنَا كُلًّا بِذَنْبِهِ".[2] اس میں اس شخص کی تردید ہے جو بغیر گناہ کے سزا کو جائز رکھتا ہے۔ ان میں سے وہ ہے جس پر ہم نے حاصب کو بھیجا، یعنی وہ ہوا جو چھوٹی کنکریاں لے کر آتی تھی، پھر ان سے ان کو مارتے تھے، یہ قومِ لوط علیہ السلام ہے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق۔ اور ان میں سے وہ ہے جس کو چنگھاڑ نے پکڑا یہ لوگ ثمود اور اہلِ مدین ہیں بقول عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے۔ اور ان میں سے وہ ہے جس کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق قارون اور اس کے ساتھی ہیں۔ اور ان میں سے وہ ہیں کہ ہم نے ان کو ڈبو دیا، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ قومِ نوح علیہ السلام اور فرعون ہیں۔[3]

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ اللہ ایسا نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ظلم کرے، جیسا کہ ان کے ساتھ کیا، یعنی ان کو بغیر گناہ کے عذاب کرے، کیوں کہ وہ ان کی طرف اپنے رسول بھیج چکا تھا اور اپنی کتابیں نازل کر چکا تھا، لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، اس طریقے سے کہ کفر پر جمے رہے اور انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا، اللہ کی نافرمانیاں کرتے رہے اور گناہوں کا ارتکاب کیا۔[4]

---

(1) تفسير القرطبي (١٣/ ٣٤٤)
(2) تفسير القرطبي (١٣/ ٣٤٤)
(3) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٦۔ ٣٧)
(4) فتح البيان (١٠/ ١٩١۔ ١٩٣)

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚۖ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾

ان لوگوں کی مثال، جنھوں نے اللہ کے سوا کارساز بنائے، مکڑی کی سی ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا، اور بے شک گھروں میں سب سے کمزور مکڑی کا گھر ہے، کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿41﴾ بلاشبہ اللہ جانتا ہے ان چیزوں کو جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں اور وہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے ﴿42﴾ اور یہ مثالیں ہم لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں ﴿43﴾ اللہ نے زمین اور آسمان حق کے ساتھ پیدا کیے ہیں، بلاشبہ اس میں مومنوں کے لیے عظیم نشانی ہے ﴿44﴾

معبودانِ باطلہ کی مکڑی کے گھر سے مثال:

گھر اس واسطے ہے کہ جان مال کا بچاؤ ہو نہ مکڑی کا جالا کہ دامن کے جھٹکے سے ٹوٹ جائے، وہ شخص بھی ایسا ہی ہے جو اللہ کے سوائے کسی کو اپنا بچاؤ سمجھے۔ یعنی کبھی سننے والا تعجب کرے کہ سب کو ایک لکڑی سے ہانک دیا، بعض لوگ بت پوجتے ہیں، بعض آگ پانی کو، بعض اولیاء انبیاء کو یا فرشتوں کو، چنانچہ اللہ نے فرما دیا کہ اللہ کو سب معلوم ہیں، اگر کوئی کچھ کر سکتا تو اللہ سب کو یک قلم موقوف نہ کرتا اور اللہ کو کسی کی رفاقت نہیں چاہیے، زبردست ہے، اور مشورہ نہیں چاہیے، سب حکمتیں اسی کی ہیں۔ یعنی جب آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں کوئی شامل نہ تھا تو چھوٹے کاموں میں کسی کو شریک کرنے کی کیا ضرورت۔ انتھٰی۔

مشرکوں نے جو اللہ پاک کو چھوڑ کر اَور معبود ٹھہرائے ہیں اور ان سے نصرت و مدد اور رزق اور روزی کی امید رکھتے ہیں، سختیوں میں ان سے چمٹے رہتے ہیں اور ان کی حمایت چاہتے ہیں تو اللہ پاک نے اس بارے میں ان کے لیے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ اس کام میں ایسے ہیں جیسے مکڑی کا گھر، یہ تشبیہ اس کی کمزوری اور جلد زوال پذیر ہونے کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ ان مشرکوں کے لیے ان کے معبودوں کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو مکڑی کے جالے

کو پکڑتا ہے، جو اس سے کوئی چیز بھی دور نہیں کر سکتا، نہ ہی اسے کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے، پس اگر وہ اس حال کو جانتے تو ہرگز اللہ کو چھوڑ کر اَور حمایتی نہ پکڑتے، یہ حال اس مسلمان کے حال کے خلاف ہے جس کا دل اللہ پاک کو مانے ہوئے ہے اور وہ اس پر پورا پورا ایمان اور یقین رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شریعت کی اتباع میں اچھا عمل بھی کیے جاتا ہے تو وہ بے شک ایک مضبوط کڑے کو پکڑے ہوئے ہے، جس کی قوت اور ثابت رہنے کی وجہ سے وہ کڑا کبھی بھی نہیں ٹوٹتا۔

پھر جو شخص غیر اللہ کو پوجتا اور غیر کو اس کے ساتھ شریک کرتا ہے اللہ پاک نے اس کو یہ وعید سنائی ہے کہ وہ جن اعمال پر جمے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ انداد کو شریک کرتے ہیں، وہ ان کو خوب جانتا ہے، ان کو ان کے وصف کا بدلہ دے گا، کیوں کہ وہ بڑا حکمت والا اور بڑا جاننے والا ہے۔ ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان مثالوں کو سمجھتے بوجھتے نہیں ہیں، مگر وہی لوگ جو علم میں راسخ اور ثابت قدم ہیں اور علم سے سیر و سیراب ہو رہے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: "عَقَلْتُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَلْفَ مَثَلٍ"[1] یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ سے ہزار مثلیں سمجھ رکھیں ہیں۔ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے واسطے یہ ایک بڑا درجہ ہے، اس لیے کہ اللہ پاک یوں ارشاد فرماتا ہے: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عمرو بن مرہ سے روایت کیا ہے کہ میں کتاب اللہ میں کسی آیت پہ نہیں گزرا کہ میں اس کو نہیں جانتا ہوں مگر اس نے مجھے غمگین کیا، اس لیے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو سنا، وہ یوں فرماتا ہے:

﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اَور اولیاء پکڑے ہیں جن کو وہ دوست رکھتے ہیں اور اپنی حاجات میں ان پر بھروسا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا تو برابر ہے کہ وہ جمادات سے ہوں یا حیوانات سے، زندوں سے ہوں یا مردوں سے، ان کی مثال مکڑی کی طرح ہے کہ اس نے اپنے لیے ایک گھر بنایا، جس کی طرف وہ ٹھکانا پکڑتی ہے اور اس کا گھر انتہائی درجے کا ضعیف اور کمزور ہے، وہ اس سے نہ گرمی کو دور کرتا ہے نہ سردی کو، نہ بارش کو، اسی طرح وہ شخص ہے جس کو اللہ کو چھوڑ کر مشرکوں نے اپنا حمایتی پکڑا ہے، وہ کسی بھی وجہ سے ان کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا، نہ ہی کسی شے کو ان سے دور کرتا ہے۔

جس شخص نے بتوں اور آستانوں اور احبار اور رہبان کو حمایتی پکڑا ہے اور ان کے نفع، شفاعت اور سفارش کی اُمید کر کے ان کو پوجا ہے اور ان پر بھروسا کیا ہے، ان کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی ہے کہ جس نے ایک گھر بنایا جو

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٠٣) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٤) نفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٤٤)

نہ بارش میں اس سے کچھ دور کر سکتا ہے نہ گرمی میں اور نہ سردی میں، نہ کوئی تکلیف اس سے دور کر سکتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے بیان کیا ہے جس نے اس کو چھوڑ کر اَور معبود ٹھہرائے ہیں، جو نہ اس کو کوئی نفع پہنچاتے ہیں نہ نقصان، جیسے: مکڑی کا گھر کہ وہ نہ گرمی سے بچاتا ہے نہ سردی سے۔ کہا کہ لفظ ﴿ اَلْعَنْكَبُوْتِ ﴾ پر وقف اچھا نہیں ہے، کیوں کہ جب اس کی تشبیہ سے اس گھر کا قصد کیا گیا، جو اس کا کچھ بچاؤ نہیں کرتا تو اس گھر سے تشبیہ دی گئی معبودوں کی جو نہ نفع دیتے ہیں نہ نقصان۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے ﴿ اَلْعَنْكَبُوْتِ ﴾ پر وقف جائز رکھا ہے۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے اخفش رحمہ اللہ کی تغلیط کی ہے، کہا: اس لیے کہ ﴿ اِتَّخَذَتْ ﴾ صلہ ہے ﴿ اَلْعَنْكَبُوْتِ ﴾ کا، لفظ واحد، جمع، مذکر اور مونث سب پر واقع ہوتا ہے۔[1] نون اس کا اصلی ہے اور واو اور تاء زیادہ ہیں اس دلیل سے کہ جمع میں "عناکیب" اور تصغیر میں "عنیکیب" کہتے ہیں اور اس کا استعمال مذکر و مونث دونوں طرح ہوتا ہے۔ اسمائے اجناس میں یہ امر مطرد ہے۔ (كذا في السمين)

تفسیر بیضاوی میں ہے کہ اس کے استعمال میں تانیث غالب ہے اور حرفِ تاء اس میں مثل تائے طاغوت ہے، اس کی جمع ان وزنوں پر آتی ہے: "عَنَاكِيْبُ وَعِنَاكِبُ وَعِكَابٌ وَعَكَبَةٌ وَأَعْكُبٌ"[2] انتہیٰ. عنکبوت ایک چھوٹا سا دابہ ہے۔ باریک تانا تنتا ہے، کبھی اس کو "عَنْكَبَاتٌ" بھی کہتے ہیں۔ زمین کے کیڑے مکوڑے جو گھر بناتے ہیں، ان میں سے مکڑی کے گھر سے بڑھ کر بودا کوئی گھر نہیں ہے اور نہ ہی ضعف و کمزوری میں اس کے مشابہ ہے، کیوں کہ جس وقت اس پر ہوا چلتی ہے یا کوئی چھونے والا اسے چھو لیتا ہے تو اس کا کچھ اَتا پتا نہیں رہتا۔ لہٰذا جس طرح کہ سب گھروں سے بڑھ کر اس کا گھر بودا ہے، اسی طرح سب دینوں سے بڑھ کر بودا دین بت پوجنے والوں کا ہے اور اس شخص کا دین ہے جو غیر اللہ کو پوجتا ہے، یا اس کو حمایتی پکڑتا ہے، یا اللہ کے سوا اَور رب ٹھہراتا ہے، جیسے کہ احبار و رہبان کے مقتدی اور ان کے مقلد۔

﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اگر وہ اس بات کو جانتے کہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو حمایتی پکڑنا ایسا ہے جیسے مکڑی کا گھر بنانا ہے اور ان کا دینی معاملہ ضعف میں اس انتہا کو پہنچا ہے تو وہ ان کو نہ پوجتے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ کچھ بھی جانتے تو اس بات کو معلوم کر لیتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ ایک مثال ہے جس کو اللہ نے اس کے لیے بیان فرمایا ہے جس نے اس کے غیر کو پوجا ہے کہ اس کی مثال عنکبوت، یعنی مکڑی کے گھر کی مانند ہے۔[3]

یزید بن مرثد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنکبوت شیطان ہے۔ اللہ نے اس کو مسخ کیا ہے، چنانچہ جو شخص اس کو پائے تو چاہیے کہ اسے قتل کرے۔[4] (أخرجه أبو داود في مراسيله) یزید بن میسرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٦٨) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٣١٧)
[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٨) [4] الدر المنثور (٦/ ٤٦٣) یہ روایت مرسل ہے۔

کہ عنکبوت شیطان ہے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم) سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: داخل ہوا میں اور ابوبکر غار میں، پس مکڑیاں جمع ہوئیں تو دروازے پر جالا تن دیا، پس تم ان کو قتل مت کرو۔[2] (أخرجه الخطيب) امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: پاک کرو اپنے گھروں کو مکڑی کے جالے سے، پس اس کو گھروں میں چھوڑ رکھنا فقر کو پیدا کرتا ہے۔[3] امام عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مکڑی نے دو بار جالا تنا: ایک بار داود علیہ السلام پر اور ایک بار نبی کریم ﷺ پر۔[4] (أخرجه ابن أبي حاتم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ﴾ حرفِ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے یا نافیہ یا موصولہ اور حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ تبیین کے واسطے ہے، یا زیادہ ہے تاکید کے واسطے۔ کسی نے کہا: یہ جملہ بنا بر اضمارِ قول ہے، یعنی تو کفار سے کہہ دے کہ اللہ جانتا ہے اس کے سوا انس، جن، فرشتہ، حبر اور راہب میں سے جون سی چیز کو تم پکارتے ہو۔ امام ابوعلی فارسی رحمہ اللہ نے اس پر جزم کیا ہے کہ حرفِ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے، تقدیرِ نفی پر معنی یہ ہیں، گویا یوں کہا گیا ہے کہ اللہ جانتا ہے اس بات کو کہ تم نہیں پکارتے ہو اس کے سوا کوئی چیز، یعنی جس شے کو تم پکارتے ہو وہ کچھ شے نہیں ہے۔ یہ تاکید ہے مثل کی اور اس پر اضافہ ہے۔ اور اس تقدیر پر کہ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ جانتا ہے ان لوگوں کو جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا۔ یہ سب وجوہ سے زیادہ ظاہر ہے۔ جیسا کہ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ یہ بھی جائز ہے ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہو اور ﴿ مِنْ شَيْءٍ ﴾ عبارت ہو مصدر سے، یعنی اللہ جانتا ہے تمھارے پکارنے کو، وہ کوئی پکارنا ہو۔ امام عاصم، ابوبکر اور یعقوب رحمہم اللہ نے ﴿ يَدْعُوْنَ ﴾ بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ ابوعبید رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے امم کا ذکر ہے۔ ان کی طرف اس میں ضمیر راجع ہے۔ باقی قراء نے بہ فوقیہ پڑھا ہے بنا بر خطاب۔[5]

﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی وہ غالب ہے، صادر کرنے والا ہے اپنے افعال کو غایتِ احکام، اتقان، پختگی اور کامل طور پر۔ ہر شے کو نہیں کرتا مگر تدبیر و حکمت کے ساتھ۔ اس میں مشرکوں کو جاہل بنایا ہے، کیوں کہ انھوں نے جماد اور حیوان کو پوجا، جس کو نہ کچھ علم ہے نہ کسی طرح کی قدرت، اور جو ذات پاک ہر شے پر قادر اور قاہر ہے، اس کے پوجنے کو چھوڑ دیا۔

﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ﴾ یعنی یہ مثال اور اس کے سوا اَور مثالیں جو قرآن پاک میں ہیں ان کو ہم لوگوں کے لیے اس غرض سے بیان کرتے ہیں کہ ان کو آگاہ اور ہوشیار کر دیں اور جو شے ان کی سمجھ سے دور ہے اس کو قریب کر دیں۔ ﴿ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ یعنی اس کی صحت، سچائی، حسن اور فائدے کو نہیں سمجھتے اور جس

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٣) [2] الدر المنثور (٦/ ٤٦٤) [3] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٤٦)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٣) [5] فتح القدير (٤/ ٢٦٨_ ٢٦٩)

مقصد کے لیے ہم نے ان کو بیان کیا اس کو بوجھتے نہیں ہیں مگر وہی لوگ جو اللہ کو اور اس کے اسماء اور صفات کو جانتے ہیں اور علم میں راسخ اور پختہ کار ہیں اور جو کچھ اُن پر پڑھا جاتا ہے اور جو کچھ وہ دیکھتے ہیں اس میں خوب غور وفکر کرتے ہیں، کیوں کہ مثالیں اور تشبیہیں جو ہیں وہ پوشیدہ معانی کی طرف راہیں ہیں۔ یہاں تک کہ یہ مثالیں اور تشبیہات ان چھپے ہوئے معانی کو افہام کے لیے ظاہر کر دیتی ہیں اور اُن کی صورت بنا دیتی ہیں، جس طرح کہ اس تشبیہ نے مشرک و موحد کے حال کی تصویر کھینچ دی، یعنی مشرک اور موحد کے حال کے درمیان فرق کی صورت بتا دی۔

آیتِ کریمہ اس بات پر دال ہے کہ علم کو عقل پر فضیلت ہے۔

﴿ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ﴾ حرفِ باء ملابست کے لیے ہے اور جار و مجرور حال ہے، یعنی اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اس حال میں پیدا کیا کہ عدل و قسط کے ساتھ متلبس تھا۔ ان کے پیدا کرنے میں اپنے بندوں کے مصالح کا خیال رکھنے والا تھا، اس سے کسی باطل کا ارادہ نہیں تھا، کیوں کہ ان کے پیدا کرنے کا اصل مقصد بھلائی کا پہنچانا ہے اور اپنی ذات اور صفات سے آگاہ کرنا ہے، جس طرح کہ اشارہ فرمایا ہے اس کی طرف اپنے اس قول میں: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی ان کے پیدا کرنے میں البتہ اللہ کی قدرت اور اسی کے اکیلے الہ ہونے پر ایک عظیم دلالت اور ظاہر علامت ہے جو ایمان والوں کے لیے ہے۔

مومنوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ اس سے فائدہ صرف انہیں کو ہوتا ہے اور کافر اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مومنوں کے لیے تسلی ہے، اس کے بعد کہ ساری خلق کو ایمان کا حکم دیا، پس کفار ایمان نہ لائے جس کا ان کو حکم دیا تھا اور اس سے ناامیدی حاصل ہوگئی، اس لیے فرمایا کہ اللہ پاک تو ایسی عظیم الشان قدرت والا ہے جس نے آسمان و زمین بنائے، مومنوں کے لیے اس میں اللہ پاک کی عظیم قدرت اور وحدانیت کے نشان ہیں۔ پھر اگر کافر ایمان نہ لائے تو اس سے تمھارے ایمان اور یقین میں کوئی نقصان نہیں ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنی عظیم قدرت کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ اس نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ بنایا نہ کہ بے فائدہ کھیل تماشے کے لیے: ﴿ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۵] ''تاکہ ہر شخص کو وہ بدلہ دیا جائے جو اس نے کوشش کی ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴾ [النجم: ۳۱] ''تاکہ اللہ تعالیٰ برے عمل کرنے والوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے اور نیک کام کرنے والوں کو اچھا بدلہ عنایت فرمائے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی آسمان و زمین کی پیدائش میں البتہ واضح دلالت ہے، اس پر کہ اللہ پاک پیدا کرنے میں اور تدبیر کرنے میں اور الٰہیت میں اکیلا ہی ہے۔[2]

---

[1] تفسیر الرازي (۲۵/ ۶۲) فتح البیان (۱۰/ ۱۹۳۔ ۱۹۶)
[2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۴۵)

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

(اے نبی!) اس کتاب کی تلاوت کیجیے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کیجیے، یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے، اور بلاشبہہ اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو (45)

تلاوت ونماز کا حکم اور نماز کی افادیت کا بیان:

جتنی دیر نماز میں لگے اتنے تو ہر گناہ سے بچے، امید ہے کہ آگے بھی بچتا رہے اور اللہ کی یاد کا اس سے زیادہ اثر ہے، یعنی گناہ سے بچے اور اعلیٰ درجوں پر چڑھے۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو اور مومنین کو قرآن شریف کی تلاوت کا امر فرمایا۔ تلاوت سے مراد اس کا پڑھنا اور لوگوں کو پہنچانا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ نماز دو چیزوں پر مشتمل ہے، فاحشہ کاموں اور منکرات کو ترک کرنے پر، یعنی نماز کی باقاعدگی ان برائیوں کو چھوڑنے کا باعث ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں سیدنا عمران اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی روایت سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس شخص کو اس کی نماز فحشاء ومنکر سے منع نہ کرے تو وہ زیادہ نہ کرے گی اللہ سے مگر دوری۔ اس بارے میں وارد ہونے والے آثار کا ذکر:

1 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ تو فرمایا کہ جس شخص کو اس کی نماز فحشاء اور منکر سے منع نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہے۔[1]

2 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «مَنْ لَّمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ لَمْ يَزْدَدْ بِهَا مِنَ اللّٰهِ إِلَّا بُعْدًا»[2] (و رواه الطبراني من حديث أبي معاوية)

3 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا: پس جو شخص کہ اس کو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٥۔ ٣٠٦٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں ''عمر بن ابی عثمان'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٩٨٥)

[2] المعجم الكبير (١١/ ٥٤) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢)

اس کی نماز معروف کا حکم نہ کرے اور منکر سے اس کو منع نہ کرے تو وہ اپنی نماز کے سبب سے اللہ سے اور زیادہ دور ہو جائے گا۔[1] یہ روایت موقوف ہے۔

4 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے نماز کی اطاعت نہ کی۔ نماز کی اطاعت یہ ہے کہ اس کو فحشاء اور منکر سے منع کرے۔ (قال و قال سفیان: ﴿ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ ﴾ قال: فقال سفيان: أي والله تأمره وتنهاه)[2]

5 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: یہ تو مرفوع ہے اور ایک بار ابو خالد نے عبداللہ سے روایت کیا: «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يُطِعِ الصَّلَاةَ، وَطَاعَةُ الصَّلَاةِ تَنْهَاهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ»[3] (ابو خالد ابن ابی حاتم کے استاذ الاستاذ ہیں اور راوی ہیں: "عن جويبر عن الضحاك عن عبد الله") یہ روایت موقوف صحیح تر ہے، جس طرح کہ امام اعمش رحمہ اللہ نے عن مالک بن الحارث عن عبد الرحمٰن بن یزید اس کو روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص نماز کو دراز کرتا ہے۔ فرمایا: بے شک نماز صرف اس شخص کو فائدہ دیتی ہے جس نے اس کی اطاعت کی۔[4]

6 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کوئی نماز پڑھی اور اس نے اس کو فحشاء اور منکر سے باز نہ رکھا تو وہ اس نماز کے سبب سے صرف اللہ تعالیٰ سے دوری حاصل کرے گا۔[5] اس بارے میں صحیح تر وہ روایتیں ہیں جو سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام حسن، قتادہ اور اعمش رحمہم اللہ وغیرہم سے موقوف ہیں۔ واللہ أعلم.

7 حافظ ابوبکر بزار نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: (حدثنا يوسف بن موسى، أنبانا جرير يعني ابن عبدالحميد عن الأعمش عن أبي صالح قال: أراه عن جابر شك الأعمش) کہا کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ فلاں شخص رات کو نماز پڑھتا ہے، پھر جب صبح کرتا ہے تو چوری کرتا ہے: فرمایا: «سَيَنْهَاهُ مَا تَقُوْلُ»[6] یعنی قریب ہے کہ روکے گا اس کو جو تو کہتا ہے۔ "وحدثنا محمد بن موسى الجرشي، أخبرنا زياد بن عبد الله عن الأعمش عن أبي صالح عن جابر رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم بنحوه ولم يشك، ثم قال: وهذا الحديث قد رواه عن الأعمش غير واحد

---

(1) تفسير الطبري (٢٠/ ٤١)
(2) تفسير الطبري (٢٠/ ٤١) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہے۔
(3) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے، نیز سند میں "جویبر" سخت ضعیف راوی ہے۔
(4) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٦)
(5) تفسير الطبري (٢٠/ ٤١) یہ روایت مرسل ہے۔
(6) مسند البزار (١٦/ ١٣٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٨٢)

واختلفوا في إسناده فرواه غير واحد عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة أو غيره وقال قيس عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي سفيان عن جابر قال جرير و زياد عن عبد الله عن الأعمش عن أبي صالح عن جابر"

8 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ فُلَانًا يُصَلِّي بِاللَّيْلِ فَإِذَا أَصْبَحَ سَرَقَ فَقَالَ: «إِنَّهُ سَيَنْهَاهُ مَا تَقُولُ»[1]

اور نماز اللہ تعالیٰ کے ذکر پر بھی مشتمل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر مطلوبِ اکبر ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ یعنی اول سے زیادہ بزرگ ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾ یعنی اللہ تمھارے سارے اعمال و اقوال کو جانتا ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ نماز میں تین خصلتیں ہیں، پس جس نماز میں ان خصلتوں میں سے کوئی چیز نہ ہو تو وہ نماز نہیں ہے، وہ تین خصلتیں یہ ہیں: اخلاص، خشیت اور ذکر اللہ۔ چنانچہ اخلاص تو اس کو نیک کام کا حکم کرے گا اور خشیت اس کو برے کام سے روکے گی اور ذکر اللہ قرآن ہے جو اس کو امر و نہی کرے گا۔ امام ابن عون انصاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبکہ تو نماز میں ہوگا تو تُو معروف میں ہے اور مقرر اس نے تجھ کو فحشاء اور منکر سے روکا اور وہ ذکر اللہ جس میں تو ہے وہ اکبر ہے۔ حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ نے کہا: بے شک نماز فحشاء و منکر سے روکتی ہے، یعنی تو جب تک اس میں ہے۔[2] علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ کی تفسیر میں البتہ یاد کرنا اللہ کا اپنے بندوں کو اکبر ہے، جبکہ وہ اللہ کو یاد کریں ان کے یاد کرنے سے اس کو۔ اسی طرح غیر واحد نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور یہی مجاہد وغیرہ کا قول ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن رجل عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ کا ذکر تیرے کھانے کے وقت اور تیرے سونے کے وقت۔ وہ شخص جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہے اس نے کہا ہے کہ میں نے کہا کہ گھر میں میرا ایک یار ہے، جو وہ کہتا ہے وہ اس کے سوا ہے جو آپ فرماتے ہیں۔ فرمایا: وہ کیا کہتا ہے؟ میں نے کہا: وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ یوں فرماتا ہے: "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ، فَلَذِكْرُ اللّٰهِ إِيَّانَا أَكْبَرُ مِنْ ذِكْرِنَا إِيَّاهُ" یعنی تم یاد کرو مجھ کو، میں یاد کروں تم کو، پس البتہ یاد کرنا اللہ کا ہم کو اکبر ہے ہمارے اس کو یاد کرنے سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس نے سچ کہا۔ اور امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عكرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما، اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ اس کی دو وجہیں ہیں: "ذِكْرُ اللّٰهِ عِنْدَ مَا حَرَّمَهُ" یعنی اللہ کو کسی امر کے پیش

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٤٤٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٨٢)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٦_٣٠٦٧)

آنے پر یاد کرنا اور اللہ کا تم کو یاد کرنا اس سے بہت بڑا ہے جو تم اس کو یاد کرتے ہو۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن ربیعہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ سے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کیا ہے: ﴿ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾؟ میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: پس وہ کیا ہے؟ میں نے کہا: تسبیح، تحمید اور تکبیر نماز میں اور قرآن شریف کی قراءت اور اس جیسی اور چیزیں۔ فرمایا: البتہ مقرر تو نے ایک عجیب بات کہی، وہ ایسی نہیں، لیکن اللہ تو یوں فرماتا ہے کہ اللہ کا تم کو یاد کرنا اس بات کے وقت جس کا اس نے امر فرمایا، یا اس سے منع فرمایا، جب کہ تم اس کو یاد کرو اکبر ہے تمھارے اس کو یاد کرنے سے۔ اسی کے مثل کئی طریق سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود، ابو الدرداء اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم وغیرہم سے بھی مروی ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

﴿ اُتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾ کتاب سے مراد قرآن شریف ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں قرآنِ مجید کی تلاوت کا حکم ہے اور اس کی قراءت پر اللہ کے تقرب کے لیے محافظت کرنے کا حکم ہے اس کے ساتھ کہ اس کی آیتوں میں سوچ کیا جائے، اس کے معانی میں غور و فکر کیا جائے اور جو اس میں اوامر و نواہی دیے گئے ہیں ان کو سوچے سمجھے۔ غرض یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت سے اللہ پاک کا قرب طلب کرے اور اس کی پیچیدگیوں میں جو معانی ہیں ان کو یاد رکھے اور اس کے اندر جو احکام اور محاسنِ آداب اور مکارمِ اخلاق ہیں، ان پر عمل کرنے کے لیے لوگوں کو آمادہ کرے۔

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ اقامت سے مراد مداومت ہے، یعنی اس کے قائم کرنے میں ہمیشگی کرے۔ چوں کہ ﴿ اَلصَّلٰوةَ ﴾ میں فرض نمازیں شامل تھیں جو باجماعت ادا کی جاتی ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے قائم رکھنے کا امر اُمت کے لیے بھی تھا، اس لیے اس کی یہ تعلیل ذکر فرمائی کہ ﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾، گویا یوں فرمایا گیا کہ تو لوگوں کو نماز پڑھا، اس لیے کہ نماز ان کو فحشاء اور منکر سے باز رکھے گی۔ ''فحشاء'' وہ ہے جو عمل کے لحاظ سے قبیح ہے، مثلاً: جیسے زنا۔ اور ''منکر'' وہ ہے جو شریعت میں معروف نہیں ہے، یعنی نماز پڑھنے والے کو اللہ کی نافرمانیوں سے روکے گی اور اُن سے دور رکھے گی۔

نماز کا فحشاء اور منکر سے منع کرنا، اس کے یہ معنی ہیں کہ نماز کا فعل ان باتوں سے باز رہنے کا سبب ہوگا، اس لیے کہ نماز اللہ پاک کے لیے مناجات ہے۔ تو ضروری ہے کہ اس کی اطاعت کے لیے مکمل طور پر آمادگی اور اس کے معاصی سے مکمل طور پر منہ پھیرنے کی نیت اور ارادے سے ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ''فِي الصَّلَاةِ منتهى وَمُزْدَجَرٌ عَنْ مَعَاصِي اللّٰهِ''[3] یعنی نماز میں بڑا باز رہنا اور مزدجر ہونا ہے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٧۔ ٣٠٦٨) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٤٢۔ ٤٦) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٤٥۔ ٥٤٦)

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٤١)

اللہ پاک کے معاصی سے، پھر جس شخص کو اس کی نماز معروف کا حکم نہ کرے اور منکر سے نہ روکے تو وہ اپنی نماز کے سبب سے اللہ سے زیادہ دور ہوگا۔ امام حسن وقتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اس کی نماز فحشاء اور منکر سے باز نہ رکھے گی تو اس کے لیے وہ نماز وبال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نماز کی شان یہ ہے کہ فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہے، جب تک کہ آدمی اپنی نماز میں ہوتا ہے۔

اسی بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: «إِنَّ فِي الصَّلَاةِ لَشُغْلًا»[1] یعنی بے شک نماز میں البتہ شغل ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ مطلقاً سب اوقات میں باز رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص نماز پر مداومت کرے گا، یعنی پابندی رکھے گا تو یہ بات اسے معاصی اور برائیوں کے چھوڑنے کی طرف لے جائے گی۔ چناں چہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انصار کا ایک جوان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھا کرتا تھا، پھر اس نے فواحش سے کوئی شے نہ چھوڑی، مگر اس پر سوار ہوا، رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اس کی نماز عن قریب کسی دن اس کو منع کرے گی۔ پھر جلد ہی اس نے توبہ کر لی اور اس کا حال اچھا ہو گیا۔[2]

اس کا بیان یہ ہے کہ نماز مصلی، یعنی نماز پڑھنے والے کے سارے بدن کو مشغول کر لیتی ہے، چنانچہ جس وقت وہ محراب میں، یعنی نماز گاہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ خشوع اور فروتنی کرتا ہے، اپنے رب کے لیے دبتا ہے اور یاد کرتا ہے کہ اپنے مولیٰ اور مالک کے سامنے کھڑا ہونے والا ہے اور وہ اس کی پوری اطلاع رکھتا ہے، اسے دیکھ رہا ہے، چنانچہ اس کا نفس اس اللہ کے لیے صالح و لائق و فرماں بردار ہو جاتا ہے اور اللہ پاک کا رقیب اور نگہبان ہونا، اس میں خوب گھل مل جاتا ہے اور اس کے جوارح اور اعضاء پر اس کے دل کی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے، اگرچہ نماز سے خارج ہونے کے بعد، یعنی نماز سے خارج اور فارغ ہونے کے بعد بھی اس پر وہی کیفیت طاری رہتی ہے اور وہ اس کیفیت سے باہر نکلتا نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ دوسری نماز کا وقت آ جاتا ہے تو پھر اپنے نفس کو لے کر اپنی بہترین حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے یہ معنی ہیں، کیوں کہ مومن کی نماز خاص کر اسی طرح ہونی چاہیے اور اگر اپنے نفس کو اس بات سے آگاہ کرے کہ یہ نماز کہیں اس کا آخری عمل ہو تو یہ آگاہ کرنا مقصد میں اور بھی زیادہ مبالغہ کرنے والا ہوگا اور مراد کو پورا کرنے والا ہوگا، کیوں کہ موت کے واسطے نہ تو کوئی سال مقرر ہے اور نہ ہی زمانہ مخصوص ہے اور نہ کوئی پھر جانا معلوم ہے۔ اس بات میں کسی طرح کا خلاف نہیں ہے۔

بعض سلف سے مروی ہے کہ جس وقت وہ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کانپ جاتے اور ان کا رنگ زرد پڑ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٢٣)

[2] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "تفسير القرطبي" (١٣/ ٣٤٧۔ ٣٤٨) میں ان الفاظ کو ذکر کیا ہے۔ نیز اس کے ہم معنی روایت زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

جاتا تھا۔ کسی نے اس بارے میں اُن سے پوچھا تو کہا کہ میں تو اللہ کے رو برو کھڑا ہوتا ہوں اور مجھے دنیا کے بادشاہوں کے ساتھ ایسا کرنا لائق ہے تو پھر بادشاہوں کے بادشاہ کے ساتھ ایسا کیوں نہ ہو! یہ وہ نماز ہے جو فحشاء اور منکر سے ضرور ہی باز رکھتی ہے اور جس کی نماز اجزا پر قاصر ہو، یعنی صرف ایسی نماز کہ مکلّف سے طلب کو ساقط کر دے اور اس میں نہ کسی طرح کا خشوع ہو نہ کچھ تذکر، تنبہ اور فضائل، جیسے: ہماری نماز تو یہ نماز اپنے نمازی کو اس کی منزلت و مرتبے سے گرا دیتی ہے، وہ کہیں بھی ہو۔ پھر اگر وہ معاصی کا مرتکب ہے تو وہ بہ سبب ان کے اللہ پاک سے تو دور ہی ہو چکا ہے، چنانچہ ایسی نماز اسے چھوڑ رکھے گی کہ اپنی دوری میں بڑھتا چلا جائے۔ کسی نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ بے شک فلاں بہت نماز پڑھنے والا ہے تو فرمایا کہ وہ تو اسی کو نفع دے گی جس نے اس کی اطاعت کی۔[1] (ذكره القرطبي) کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلصَّلٰوةَ ﴾ سے مراد قرآن شریف ہے۔ اس قول میں ضعف ہے، اس لیے کہ قرآن کا ذکر تو پہلے ہو چکا، لہٰذا قولِ اول اولیٰ ہے۔ بہرحال پھر جو شخص کہ نماز کا پاس و لحاظ رکھنے والا ہے، ضروری ہے کہ وہ فحشاء اور منکر سے زیادہ دور ہوگا، اس شخص سے جو اس کا لحاظ نہیں رکھتا۔

﴿ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ یعنی البتہ اللہ کا ذکر اپنی ساری تحمید و تہلیل و تسبیح وغیرہ کے ساتھ ہر شے سے اکبر ہے، یعنی وہ ان تمام عبادات سے افضل ہے جو بغیر ذکر کے ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابن زید اور قتادہ رحمہما اللہ سے یہ تقیید نقل کی ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: میرے نزدیک یہ معنی ہیں: البتہ اللہ کا ذکر علی الاطلاق اکبر ہے، یعنی وہ ذکر ہی ہے جو فحشاء اور منکر سے باز رکھتا ہے، چنانچہ نماز میں جو حصہ ذکر کا ہے وہ یہ کام کرتا ہے اور اسی طرح اس کا وہ جز جو نماز میں نہیں ہے وہ بھی یہی کام کرتا ہے، کیوں کہ فحشاء و منکر سے وہی شخص باز رہ سکتا ہے جو اللہ پاک کا مراقبہ کر کے اور اس کا پاس اور لحاظ کر کے اس کا ذکر کرتا ہے۔[2] کسی نے کہا: اللہ کا ذکر نماز سے اکبر ہے فحشاء اور منکر سے باز رکھنے میں ذکر پر مداومت کے ساتھ۔ امام فراء اور ابن قتیبہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ذکر سے مراد نماز ہے اور نماز باقی عبادتوں سے اکبر ہے، یہ اس وجہ سے کہ ذکر کے پیرائے میں نماز کو ادا کیا ہے، جس طرح کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [الجمعة: ٩] ''تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔''

چنانچہ اس سے غرض یہ بات بتانا ہے کہ نماز میں جو ذکر ہے وہی نماز کو باقی طاعات پر فضیلت دینے کے لیے اور سیئات سے باز رکھنے کے لیے عمدہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نماز کی تعبیر ذکر کے ساتھ اس لیے کی ہے کہ ذکر مستقل بہ تعلیل ہو جائے۔ گویا یوں کہا کہ نماز اکبر ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کا ذکر ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ البتہ اللہ کا تم کو یاد کرنا اور تمھارے حمد کرنے پر تمھیں ثواب دینا اکبر ہے تمھارے اس کو اپنی عبادت اور نمازوں میں یاد کرنے سے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، اس کی تائید اس حدیثِ قدسی سے ہوتی ہے کہ جو شخص مجھ کو اپنے جی

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٤٨) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٤٩)

میں یاد کرے تو میں اس کو اپنے جی میں یاد کروں اور جو کوئی مجھ کو مجمع میں یاد کرے تو میں اس کو اس مجمع میں یاد کروں جو اس سے بہتر ہے۔[1] کاتب الحروف عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ علمائے عظام جو تفسیر اور حدیث شریف کا درس دیتے ہیں اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو یہ سب لوگ اس حدیث شریف کے تحت میں داخل ہیں۔ انتہیٰ.

فضیلتِ ذکر:

1 سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے ایسا کوئی عمل ذکر اللہ سے بڑھ کر نہیں کیا جو اس کو اللہ کے عذاب سے زیادہ نجات دینے والا ہو۔ لوگوں نے کہا: اور اللہ کی راہ میں جہاد بھی نہیں؟ کہا: نہ ہی جہاد، مگر ایسا جہاد جس میں دشمنوں کو مارتے مارتے اس کی تلوار ٹوٹ جائے۔ اس لیے کہ اللہ اپنی کتاب میں یوں فرماتا ہے: ﴿ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾۔[2] (أخرجه أحمد في الزهد و ابن المنذر)

2 عنترہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: "ذِكْرُ اللّٰهِ"[3] (أخرجه سعيد بن منصور و ابن أبي شيبة و ابن المنذر و الحاكم في الكنىٰ و البيهقي في الشعب)

3 سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: کیا میں تمھیں تمھارے بہترین اور پاک تر عمل کی جو تمھارے رب کے نزدیک ہے اس کی خبر نہ دوں اور درجوں کے لحاظ سے تمھارے بلند تر اعمال کی، جو تمھارے لیے سونے اور چاندی کے دینے سے بہتر ہے اور اس سے بھی بہتر ہے کہ تم اپنے دشمنوں سے ملو، ایسی حالت میں کہ تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمھاری گردنیں ماریں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ہاں، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ذکر۔[4] (أخرجه الترمذي)

4 سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک درجات کے لحاظ سے کون سے بندے افضل ہیں؟ فرمایا کہ اللہ کا بہت ذکر کرنے والے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے سے بھی؟ تو فرمایا کہ اگر وہ اپنی تلوار سے کفار اور مشرکین کو مارے، یہاں تک کہ وہ ٹوٹ جائے اور خون میں رنگین ہو جائے تو بھی اللہ کو بہت یاد کرنے والے اس سے ایک درجہ افضل ہیں۔[5] (أخرجه الترمذي)

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥) فتح القدير (٤/ ٢٦٩)

(2) الزهد لابن حنبل (١/ ١٨٤) الدر المنثور (٦/ ٤٦٧)

(3) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ١٥٦) شعب الإيمان (١/ ٤٤٨)

(4) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٧) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٩٦)

(5) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٦) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ٢٢٦)

5 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سبقت کر گئے مفردون۔'' صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ''مفردون'' کیا ہیں؟ فرمایا: اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔[1] (أخرجه مسلم)

6 سیدنا ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ پر اس بات کی گواہی دی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی قوم اللہ کا ذکر کرنے کے لیے بیٹھتی ہے تو ان کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان کو رحمت ڈھانک لیتی ہے اور ان پر سکینت اترتی ہے اور اللہ ان کا ذکر اُن لوگوں میں کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔[2] (أخرجه البخاري)

7 مروی ہے کہ ایک اعرابی نے عرض کی: یا رسول اللہ! اعمال میں سے کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا تو دنیا سے اس حال میں رخصت ہو کہ تیری زبان پر اللہ کا ذکر ہو۔[3]

اس بارے میں حدیثیں بہت سی ہیں، یہاں ان کا ذکر کرنے میں طول دینا ہے، اسی قدر کافی ہیں۔ امام ابن عطاء رحمہ اللہ نے کہا: اکبر سے یہ مراد ہے کہ ہرگز اس کے ساتھ کوئی معصیت باقی نہیں رہتی ہے۔[4] کسی نے کہا: اللہ کا تم کو اپنی رحمت کے ساتھ یاد کرنا، تمھارے اس کو اطاعت کے ساتھ یاد کرنے سے اکبر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اکبر اس لیے ہے کہ اس کا ذکر کرنا بلا علت ہے اور تمھارا ذکر علتوں اور آرزؤں سے ملا ہوا ہے اور اس لیے کہ اس کا ذکر فنا نہیں ہوتا اور تمھارا ذکر باقی نہیں رہتا ہے۔ یا اللہ کا ذکر اس سے اکبر ہے کہ تمھارے فہم اور عقلیں اس کا احاطہ کر سکیں۔ نفع دینے والا ذکر یہی ہے کہ علم کے ساتھ ہو اور حضورِ قلب کے ساتھ اور دل کو اللہ کے سوا سب چیزوں سے فارغ کرنے کے ساتھ ہو۔ رہا وہ ذکر جو زبان سے نیچے نہیں اترتا تو وہ اور رتبے میں ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴾ یعنی تم جو اللہ پاک کا ذکر کرتے ہو اور باقی طاعات اور عبادات بجا لاتے ہو، اس میں سے کوئی مخفی شے اللہ پر پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تم کو نیکی کا نیک اور بدی کا بد بدلہ دینے والا ہے۔ پہلے اللہ پاک نے اہلِ شرک کا بیان کیا، اس کے بعد اہلِ کتاب کا بیان شروع کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۴۶

اور تم اہلِ کتاب سے احسن انداز ہی سے بحث و تکرار کرو، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٠) صحیح بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

[3] حلية الأولياء (٦/ ١١١ـ ١١٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٣٦)

[4] تفسير البغوي (٦/ ٢٤٧) تفسير الخازن (٥/ ١٩٥ـ ١٩٦)

ظالم ہیں، اور تم (ان سے) کہو: ہم اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی اور (جو) تمھاری طرف نازل کی گئی، اور ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿46﴾

اہلِ کتاب سے احسن انداز میں بحث وتکرار کا حکم:

یعنی مشرکوں کا دین جڑ سے غلط ہے اور اہلِ کتاب کا دین اصل میں سچا تھا تو اُن سے اس طرح نہ جھگڑو کہ ان کی بات کو جڑ سے کاٹو۔ نرمی سے واجبی بات سمجھاؤ، مگر ان میں جو بے انصافی پر اتر آئے اس کو سزا دینی ہے۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام قتادہ اور غیر واحد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے آیتِ سیف سے، ان کے ساتھ کوئی جھگڑا باقی نہیں رہا اور اب جو ہے تو اسلام ہے یا جزیہ یا تلوار۔[1] دوسروں نے کہا: بلکہ آیت باقی اور محکم ہے، اس شخص کے لیے جو اُن سے دین پر استبصار کا ارادہ کرے، پس اس طریقے پر جھگڑے جو بہتر ہو تا کہ یہ اس میں زیادہ موثر ہو، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٥] ’’(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے اور ان سے احسن طریقے سے بحث کیجیے۔ بے شک آپ کا رب ہی اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔‘‘ یہ اللہ پاک نے جب موسیٰ علیہ السلام کو اور ہارون علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو اُن سے فرمایا کہ اس سے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت پذیر ہو یا ڈرے۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور ابن زید رحمہ اللہ سے اس کو بیان کیا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ﴾ یعنی مگر وہ لوگ جو وجہِ حق سے مائل ہوئے اور کھلی راہ سے اندھے ہو گئے اور عناد و مکابرہ کیا، چنانچہ اس وقت جدال سے جلاد کی طرف انتقال کیا جائے۔ (جدال زبانی مناظرہ اور جلاد لڑائی کرنا ہے)۔ اور ان سے لڑیں ایسی شے کے سات جو ان کو باز رکھے اور سزا دے۔ اللہ عز و جل نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [الحديد: ٢٥] ’’یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تا کہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت ہیبت وقوت ہے اور لوگوں کے لیے اور بھی (بہت سے) فائدے

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٤٧۔ ٤٨) تفسير ابن أبي حاتم (٣٠٦٨) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٤٧۔ ٤٨)

ہیں اور اس لیے بھی کہ اللہ جان لے کہ اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد بے دیکھے کون کرتا ہے، بیشک اللہ قوت والا اور زبردست ہے۔'' سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم کو حکم ہے کہ جو کوئی کتاب اللہ کی مخالفت کرے تو ہم اس کو تلوار سے ماریں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ﴾ سے مراد اہلِ حرب ہیں اور جو ان میں سے ادائے جزیہ سے انکاری ہوں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ ﴾ یعنی جب اہلِ کتاب ایسی بات کی خبر دیں جس کی سچائی اور جھوٹ معلوم نہیں تو اس کی تکذیب نہ کرے، کیوں کہ کبھی وہ حق ہوتی ہے، اور نہ اس کی تصدیق کرے شاید وہ باطل ہو۔ لیکن اس پر مجمل طور پر اس شرط پر ایمان لائے کہ وہ منزل من اللہ ہو تبدیل کی ہوئی یا تاویل کی ہوئی نہ ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ اہلِ کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور اہلِ اسلام کے لیے عربی میں اس کی تفسیر کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب اور اس طرح کہو کہ ہم ایمان لائے اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور جو اُتارا گیا تمھاری طرف اور ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہے اور ہم اس کے حکم بردار ہیں۔[2] اس حدیث کو صرف امام بخاری رحمہ اللہ نے ہی روایت کیا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے ابن ابی نملہ سے روایت کیا ہے کہ ابو نملہ نے اپنے بیٹے کو خبر دی کہ وہ ایک وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہود کا ایک شخص آیا اور کہا: یا محمد! کیا یہ جنازہ کلام کرتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ زیادہ جانتا ہے۔ یہودی بولا: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ بولتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت اہلِ کتاب تم سے کچھ بیان کریں تو تم نہ اُن کی تصدیق کرو نہ تکذیب اور اس طرح کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، پھر اگر ان کی بات سچی ہے تو تم نے ان کی تکذیب نہیں کی اور اگر وہ باطل ہے تو تم نے ان کی تصدیق نہ کی۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ابونملہ وہ عمارہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عمار۔ کسی نے کہا ہے کہ عمرو بن معاذ بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ۔ پھر یہ بات جاننی چاہیے کہ اکثر باتیں جو اہلِ کتاب بیان کرتے ہیں ان کا زیادہ حصہ جھوٹ اور بہتان ہے، کیوں کہ ان میں تحریف داخل ہو چکی ہے اور ان میں تبدیلی اور تغییر اور تاویل ہو چکی ہے۔ صدق اور سچائی ان میں بہت کم ہے۔ پھر اگر وہ صحیح ہوں تو اُن میں سے بہت سی باتوں میں فائدہ انتہائی کم ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہلِ کتاب سے کسی شے کا سوال مت کرو،

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٦٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢١٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤٤) مسند أحمد (٤/ ١٣٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٠٠)

بے شک وہ ہرگز تمھیں ہدایت نہ کریں گے، حالاں کہ وہ خود گمراہ ہو چکے ہیں۔ یا تو تم حق کی تکذیب کرو گے یا کسی باطل کی تصدیق، کیوں کہ اہلِ کتاب میں سے ہر ایک کے دل میں ایک تالیہ ہے، جو اس کو اپنے دین کی طرف بلا رہی ہے تالیۂ مال کی طرح۔[1] (تالیہ ۔واللہ أعلم۔کیا شے ہے، مگر تلیہ بہ معنی باقی ماندۂ دام کو کہتے ہیں، شاید یہ معنی ہوں کہ اس کے دل میں اپنے دین کا ایک بقیہ باقی رہ جاتا ہے۔ واللہ أعلم)

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم اہلِ کتاب سے کسی شے کا کیوں سوال کرتے ہو، حالاں کہ تمھاری کتاب جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے، وہ احدث ہے، یعنی زیادہ تر جدید اور نئی ہے۔ ”تَقْرَؤُوْنَهٗ مَحْضًا لَمْ يُشَبْ“ یعنی جس کو پڑھتے ہو خالص، اس میں ملاوٹ نہیں کی گئی اور اس نے تم سے یہ بات بیان کر دی کہ اہلِ کتاب نے تغیر وتبدل کیا اور اپنے ہاتھوں سے کتاب کو لکھا اور کہا کہ وہ اللہ کے پاس سے ہے، تاکہ اس سے تھوڑا مول حاصل کریں۔ کیا تم کو وہ علم جو تمھارے پاس آیا ہے، اس بات سے منع نہیں کرتا کہ تم ان سے سوال کرو۔ لا واللہ! ہم نے ان میں سے کسی شخص کو نہیں دیکھا کہ وہ تم سے اس شے کے بارے میں سوال کرے جو تم پر اتاری گئی۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابوالیمان نے کہا کہ ہم کو شعیب نے زہری سے خبر دی، کہا خبر دی مجھ کو حمید بن عبدالرحمن نے اس بات کی کہ حمید نے معاویہ کو سنا کہ وہ مدینے میں قریش کے ایک گروہ کو حدیث بیان کر رہے تھے اور ذکر کیا کعب احبار رحمہ اللہ کا تو کہا کہ بے شک وہ ہی ان حدیث کرنے والوں سے سب سے سچی حدیث بیان کرنے والے ہیں جو اہلِ کتاب سے حدیث بیان کرتے ہیں اور بے شک اس کے باوجود ہم اس پر البتہ کذب کو آزماتے تھے۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کعب احبار رحمہ اللہ سے لغوی کذب واقع ہو جاتا تھا بغیر قصد کے، کیوں کہ وہ ان صحیفوں سے حدیث کرتے تھے جن کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے تھے، حالاں کہ ان میں گھڑی ہوئی اور جھوٹی باتیں تھیں، اس لیے کہ ان کی ملت میں متقن حفاظ نہ تھے، جیسے اس امتِ عظیم میں ہیں اور باوجود اس حفظ و اتقان کے اور عہدِ نبوت کے قریب ہونے کے اس امت میں بہت سی حدیثیں وضع کر دی گئیں کہ ان کو اللہ عز وجل جانتا ہے یا وہ شخص جانتا ہے جس کو اللہ پاک نے اس کا علم عطا فرمایا ہے۔ ہر ایک کو اپنی لیاقت کے مطابق علم ہے۔[4]

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے ساتھ مت جھگڑو، مگر اس خصلت سے جو ثواب کے لیے بہت

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٤٩)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٢٩)
[3] صحيح البخاري (٦/ ٢٦٧٩)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٤٧۔ ٥٤٨)

اچھی ہے۔ وہ جھگڑا اس طریقے سے ہے کہ ان کو اللہ عزوجل کی طرف بلائے اس کے دلائل اور براہین سے ان کو آگاہ کرے، اس امید سے کہ وہ اسلام کی دعوت کو قبول کریں نہ کہ سختی اور درشتی کے طریقے سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ سے مراد "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے۔[1] ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ﴾ یعنی مگر وہ لوگ جنھوں نے ان میں سے ظلم کیا اس طرح سے کہ مجادلے میں افراط اور زیادتی کی اور مسلمانوں کے ساتھ باادب نہ رہے تو اُن پر سختی کرنے اور مجادلے میں ان سے درشتی برتنے کا کوئی خوف نہیں ہے۔

اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے کہ اہلِ کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ کسی نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ کتاب میں سے جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان کے سوا اَور لوگ، جو اُن میں سے ایمان لائے، اُن سے مت جھگڑو، مگر اس بات میں موافقت کے ساتھ جس کی وہ تم کو حدیث بیان کریں اہلِ کتاب کی روایات میں سے اس قول کی بنا پر ﴿ اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو اپنے کفر پر باقی رہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت محکم ہے چنانچہ جائز ہے ان کا مجادلہ اس کے ذریعے۔ کسی نے کہا: آیتِ قتال سے منسوخ ہے، اسی کے امام قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ بھی قائل ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص اس کو منسوخ کہتا ہے، اس نے اس بات سے حجت پکڑی ہے کہ سورت مکی ہے اور اس وقت نہ کوئی قتال فرض تھا نہ ہی جزیہ لینا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول بہتر ہے اس لیے کہ اللہ عزوجل کے احکام میں اس طرح نہیں کہا جاتا کہ وہ منسوخ ہیں، مگر ایسی خبر کے ساتھ جو عذر کو ختم کرنے والی یا معقول حجت ہو۔ اسی قول کو امام ابن العربی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔

امام سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے لیے قتال قائم کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دی۔ چنانچہ ان کے ساتھ تلوار کے ساتھ جنگ ہے، جب تک اسلام نہ لائیں یا جزیہ نہ دیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اللہ کی اولاد اور شریک ثابت کیا، چنانچہ اس میں اہلِ شرک اور بتوں اور اوثان کے پوجنے والے شامل ہیں۔ آیتِ کریمہ اس بات پر دال ہے کہ کفار کے ساتھ مناظرہ جائز ہے دین میں اور علمِ کلام کا سیکھنا جائز ہے، جس سے "جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ" پر صحیح طور پر عمل ہو سکے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استثناء متصل ہے اور اس میں دو معنی ہیں: ایک یہ ہیں مگر ظالم لوگ، چنانچہ ان سے بالکل جھگڑا مت کرو، بلکہ ان سے جدال کرو تلوار کے ساتھ۔ دوسرے معنی ہیں کہ ان سے جدال کرو "اَلَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ" کے بغیر، یعنی ان سے سختی اور درشتی کرو، جیسی انھوں نے تم پر سختی اور درشتی کی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "إِلَّا" بہ حرفِ تنبیہ پڑھا ہے، یعنی چنانچہ ان سے جدال کرو۔[3]

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٦٩) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٥٠۔ ٣٥١) فتح القدير (٤/ ٢٧٠)

[3] اللباب في علوم الكتاب (١٥/ ٣٦٢)

﴿ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ ﴾ یہ ان سے مجادلہ کرنے کا بیان ہے ﴿ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ کے ساتھ۔ یعنی کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اس قرآن پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو تمھاری طرف نازل کیا گیا، مراد تورات اور انجیل ہیں، یعنی اس بات پر کہ وہ دونوں اللہ کے پاس سے نازل کی گئی ہیں اور شریعتِ اسلامیہ کے قیام اور محمد ﷺ کی بعثت تک شریعتِ ثابتہ ہیں اور اس میں وہ باتیں داخل نہیں ہیں جس کی انھوں نے تحریف اور تبدیلی کر ڈالی ہے۔ امام بیہقی، دیلمی اور ابو نصر سجزی رحمہ اللہ نے "الإبانة" میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم اہلِ کتاب سے کسی شے کا سوال مت کرو، بے شک وہ ہرگز تم کو ہدایت نہ کریں گے اور حال یہ ہے کہ مقرر وہ گمراہ ہو چکے ہیں۔ یا یہ کہ تم کسی باطل کی تصدیق کرو گے یا کسی حق کی تکذیب کرو گے۔ واللہ! اگر موسیٰ علیہ السلام تمھارے درمیان زندہ ہوتے تو انھیں حلال نہ ہوتا، مگر یہی کہ میری پیروی کریں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: مت سوال کرو تم اہلِ کتاب سے اور جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی مثل ذکر کیا، پھر کہا کہ اگر لامحالہ تمھیں ان سے سوال کرنا پڑ جائے تو پھر جو شے کتاب اللہ کے مطابق ہو تو اس کو لے لو اور جو شے کتاب اللہ کے مخالف ہو تو اس کو چھوڑ دو۔[2] (أخرجه عبد الرزاق و ابن جرير) یہ بات آیتِ "مجادلہ بالأحسن" کی جنس سے ہے۔

﴿ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا تمھارا معبود ایک ہے، اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ کوئی ند و مثل، نہ کوئی ضد و مخالف۔ ﴿ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ یعنی ہم اُمتِ محمد ﷺ کے گروہ خاصتاً اس کے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ ہم نے نہیں کہا ہے کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور مسیح علیہ السلام اللہ کے فرزند ہیں اور نہ ہم نے اللہ کو چھوڑ کر احبار و رُہبان کو ارباب ٹھہرایا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مراد لی جائے کہ ہم سب اس کے فرماں بردار مطیع ہیں۔ مسلمانوں کی مکمل فرماں برداری اہلِ کتاب کی فرماں برداری سے اور ان کی اطاعت کا اہلِ کتاب کی اطاعت سے زیادہ بہتر ہونا، اس وجہ سے قدح نہیں کرتا، یعنی کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔[3]

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ
بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿47﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ
كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿48﴾ بَلْ هُوَ

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (٢/ ١٠) الدر المنثور (٦/ ٤٦٩۔ ٤٧٠) [2] مصنف عبدالرزاق (٦/ ١١١) تفسير الطبري (٢٠/ ٤٩)
[3] فتح البيان (١٠/ ٢٠١۔ ٢٠٣)

اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور (اے نبی! جیسے پہلے نبیوں پر کتابیں نازل کیں) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف (یہ) کتاب نازل کی ہے، تو اس (قرآن) پر وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنھیں ہم نے (اس سے پہلے) کتاب دی، اور ان (اہلِ مکہ) میں سے بھی بعض اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہماری آیات کا انکار تو کافر ہی کرتے ہیں ﴿47﴾ اور آپ اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے لکھتے تھے، (اگر ایسا ہوتا) تب تو باطل پرست یقیناً شک کر سکتے تھے ﴿48﴾ بلکہ یہ قرآن تو واضح آیات ہیں، ان لوگوں کے سینوں میں (محفوظ) ہیں، جنھیں علم دیا گیا، اور ظالم لوگ ہی ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں ﴿49﴾

قرآنِ مجید کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل و برہان کا بیان:

ان لوگوں میں یعنی مشرکوں میں اور جن کتاب والوں نے اپنی کتاب ٹھیک سمجھی، وہ اس کو بھی مانیں گے، یعنی شبہہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اگلی کتاب پڑھ کر یہ باتیں معلوم کیں۔ محمد ﷺ تو نہ کبھی استاد کے پاس بیٹھے نہ ہاتھ میں قلم پکڑا۔ یعنی پیغمبر نے کسی سے لکھا پڑھا نہیں، بلکہ ان پر تو یہ وحی آئی جو بغیر لکھے ہمیشہ کے لیے جاری رہے گی، سینہ بہ سینہ چلتی رہے گی۔ دوسری کتابیں حفظ نہ ہوتی تھیں، یہ کتاب حفظ ہی سے باقی ہے۔ لکھنا اس سے زیادہ ہے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! جیسے ہم نے تجھ سے پہلے کے رسولوں پر کتابیں نازل کیں، ویسے ہی ہم نے یہ کتاب تیری طرف نازل کی۔[1] یہ بات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی خوب ہے اور ایک مناسبت اور عمدہ ارتباط ہے۔ ﴿ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ﴾ یعنی وہ لوگ جنھوں نے کتاب لی، پھر اس کی تلاوت کی، جیسا اس کی تلاوت کا حق ہے، ان کے احبار، علماء، اذکیاء میں سے، جیسے: عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور ان جیسے اور لوگ وہ اس کو مانتے ہیں۔ ﴿ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ﴾ مراد قریش وغیرھم میں سے عرب لوگ ہیں۔ ﴿ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی ہماری آیتوں کو صرف وہی لوگ جھٹلاتے ہیں اور ان کے حق کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو حق کو باطل سے چھپاتے ہیں اور سورج کی روشنی کو کپڑوں سے روکتے ہیں، حالاں کہ یہ بات انتہائی بعید ہے۔

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٥٠)

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ ﴾ یعنی اے محمد! تو اپنی قوم میں اس قرآن کے لانے سے پہلے ایک عمر دراز رہا اور بسا، نہ تو کوئی کتاب پڑھتا تھا نہ لکھنا جانتا تھا، بلکہ تیری قوم میں ہر ایک جانتا ہے کہ تو ایک امی آدمی ہے، نہ پڑھتا ہے نہ لکھتا ہے اور اسی طرح آپ ﷺ کی صفت اگلی کتابوں میں ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٧] ''(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، چناں چہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ ہمیشہ یوم دین تک رہے نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے ایک سطر اور نہ ایک حرف لکھ سکتے تھے، بلکہ آپ کے کاتب لوگ تھے، وہ آپ ﷺ کے رو برو وحی اور خطوط لکھا کرتے تھے اقالیم کی طرف۔ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''وَهٰكَذَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دَائِمًا إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ'' اور اس جگہ ظاہر یوم وفات ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم) متاخرینِ فقہاء میں سے جیسے قاضی ابو الولید باجی اور ان کے اتباع جس نے یہ گمان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن یہ لکھا: ''هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ'' تو اس کو اس بات پر اس روایت نے آمادہ کیا جو صحیح بخاری میں ہے: « ثُمَّ أَخَذَ فَكَتَبَ » حالاں کہ یہ روایت دوسری روایت پر محمول ہے، جس میں « ثُمَّ أَمَرَ فَكُتِبَ » اور اسی لیے فقہائے مشرق و مغرب کی طرف سے اس شخص پر سخت انکار ہوا ہے جو باجی کے قول کا قائل ہوا ہے اور اس قول سے بے زاری اور علاحدگی اختیار کی ہے اور اس بارے میں اشعار اور اقوال پڑھے ہیں۔ اور اپنی محفلوں میں اس بارے میں خطبے سنائے ہیں۔ جو بات باجی کے قول سے ظاہر ہوتی ہے، اس میں باجی کی مراد یہی ہے کہ آپ نے بطور معجزے کے وہ لفظ لکھا نہ یہ معنی ہیں کہ آپ اچھی طرح لکھنا جانتے تھے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے دجال کے بارے میں خبر دی ہے کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوگا[1] اور ایک روایت میں ہے کہ ک ف ر۔ اور اس کو ہر مومن پڑھ لے گا۔[2] غرضیکہ یہ پڑھنا بطورِ خرقِ عادت ہوگا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧١٢) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٣٣)

اور وہ حدیث جو بعض نے وارد کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وفات نہ پائی، یہاں تک کہ آپ نے کتابت سیکھ لی۔[1] چنانچہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا ﴾ أي: تقرأ ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ ﴾ نفی کی تاکید کے لیے ہے۔

﴿ وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ ﴾ یہ بھی تاکید ہے اور مخرج غالب میں خارج ہوئی ہے۔ مثل قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ ﴾ [الأنعام: ٣٨] ''اور اپنے دونوں پروں سے اُڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمھاری طرح (الگ) امت نہ ہو۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ یعنی اگر تو اچھی طرح سے لکھ سکتا تو لوگوں میں سے بعض جاہل شک کرتے تو کہتے کہ اس نے تو یہ اگلی کتابوں سے سیکھ لیا ہے۔ جو انبیاء سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں، باوجود اس کے انھوں نے یہ بات اپنے علم کے ساتھ کہی کہ وہ امی ہیں، لکھنا نہیں جانتے ہیں اور کہا: ﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ [الفرقان: ٥] ''اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں (جو) اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں اور وہ صبح و شام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔'' اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ٦] ''کہہ دیجیے: اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے، بلاشبہ وہ غفور (اور) رحیم ہے۔''

نیز یہاں فرمایا: ﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ یعنی یہ قرآن پاک کھلی آیتیں ہیں حق پر دلالت کرنے میں واضح و ظاہر ہیں۔ ان میں امر و نہی اور خبر ہیں، علماء اس کو حفظ کرتے ہیں۔ حفظ و تلاوت و تفسیر کی راہ سے اللہ پاک نے اس کو ان پر سہل اور آسان کر دیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ [القمر: ١٧] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے، پھر کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے؟'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نہیں دیا گیا کوئی نبی، مگر حال یہ ہے کہ دیا گیا وہ شے جس کے مثل پر بشر ایمان لائے اور وہ شے جو میں دیا گیا تو وہ وحی ہے کہ اللہ نے میری طرف اس کی وحی کی۔ چنانچہ میں امید رکھتا ہوں کہ میرے متبعین کی تعداد دوسرے نبیوں کے متبعین کی تعداد سے بہت زیادہ ہو گی۔[2]

سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ اللہ فرماتا: بے شک میں جانچنے والا ہوں تجھ کو اور آزمائش کرنے والا ہوں تیرے ساتھ اور تجھ پر ایک ایسی کتاب اتارنے والا ہوں جس کو پانی نہ دھوئے گا، تو اس کو سوتے اور جاگتے ہوئے پڑھے گا۔[3] یعنی جس محل میں وہ کتاب لکھی ہوئی ہے، اگر اس کو پانی دھو ڈالے تو البتہ اس محل کی حاجت

---

[1] فتح الباري (٧/ ٥٠٣۔ ٥٠٤) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٢) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥)

نہ رہے۔ اس لیے کہ دوسری حدیث میں آ چکا ہے کہ اگر ہو قرآن کسی چمڑے میں تو نہ جلا سکے اس کو آگ۔[1] اس لیے کہ وہ سینوں میں محفوظ ہے۔ وہ کتاب زبانوں پر آسان کی گئی ہے اور دلوں میں امانت رکھی گئی ہے۔ لفظ اور معنی کے لحاظ سے معجزہ ہے، اسی لیے اگلی کتابوں میں اس امت کی صفت میں آیا ہے کہ انجیلیں ان کی ان کے سینوں میں ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے کہ ﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ کے یہ معنی ہیں، بلکہ اس بات کو سب جانتے ہیں کہ اس کتاب سے پہلے تو کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا اور نہ تو اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا، یہ کھلی آیتیں ہیں سینوں میں اُن لوگوں کے جو اہلِ کتاب میں سے علم دیے گئے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو قتادہ اور ابن جریج رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے اور قولِ اول کو صرف سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسی کو عوفی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ضحاک بھی اسی کے قائل ہیں اور وہی ظاہر تر ہے۔[2] واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴾ یعنی نہیں جھٹلاتے ہماری آیتوں کو اور نہیں کم کرتے ان کے حق کو اور نہیں رد کرتے ہیں ان کو، مگر وہی لوگ جو حد سے بڑھنے والے ہیں اور تکبر کرنے والے ہیں جو حق کو جانتے ہیں اور اس سے منہ موڑتے ہیں۔ جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ۹۶۔ ۹۷] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔''[3]

فتح البیان کا بیان

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ﴾ کا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور مصدرِ فعل کی طرف اشارہ ہے جس طرح کہ بہت جگہ ہم بیان کر آئے ہیں، اور کتاب سے مراد قرآن شریف ہے، یعنی ہم نے تیری طرف کتاب اس انزالِ بدیع کے طور پر نازل کی، یعنی ایک نئے انداز سے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جس طرح ہم نے ان پر کتاب نازل کی تھی، اسی طرح تجھ پر قرآن نازل کیا۔

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ ﴾ سے مراد مومنینِ اہلِ کتاب ہیں، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ کتاب دینے کے ساتھ ان کو اس لیے خاص کیا کہ وہ اس پر عمل کرنے والے ہیں، اور ان کے علاوہ جو لوگ ہیں گویا ان کو کتاب ہی نہیں دی گئی، اس لیے کہ جو کچھ کتاب میں ہے انھوں نے اس پر عمل نہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کی صفات جو

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٥١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٥٦٢)

[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٥١۔ ٥٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٤٩)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٤٨۔ ٥٤٩)

اس میں مذکور ہیں ان کا انکار کیا۔ چوں کہ ان کا اسلام مدینے میں ہوا اور یہ سورت مکی ہے، اس لیے یہ آیت اخبار بالغیب کے قبیل سے ہوئی۔ اللہ پاک نے ان کے حال کی خبر اس کے واقع ہونے سے پہلے آپ ﷺ کو دے دی۔

﴿ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ ﴾ کا اشارہ اہلِ مکہ کی طرف ہے، یعنی مکے کے لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اسلام لے آئے، وہ قرآن کو مانتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ تمام عربوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ﴿ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ آیات سے مراد قرآن شریف ہے۔ قرآن کو پیرایۂ آیات میں اس لیے ادا کیا کہ منظور اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ آیات کی دلالت اپنے معانی پر ظاہر ہے اور اس بات پر کہ وہ اللہ کے پاس سے ہیں۔ آیات کی اضافت نونِ عظمت کی طرف دو وجہ سے کی: ایک تو ان کی مزید بڑائی کے لیے اور دوسرے اس شخص کی انتہائی برائی ظاہر کرنے کے لیے جو ان کا جان بوجھ کر انکار کرتا ہے۔ جحود وہی انکار ہے جو پہچان لینے کے بعد ہوتا ہے، یعنی ہماری آیتوں کا انکار صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے کفر پر جمے ہوئے ہیں اور اس میں آگے بڑھنے والے ہیں مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے، جیسے: کعب بن اشرف اور اس کے ہمسر اَور لوگ، کیوں کہ جو شے ان کو آیات کی معرفت اور ان کی حقانیت کی طرف پہنچائے اس میں غور کرنے سے یہی انکار ان کو روکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا ..... الآية ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اے محمد! تو قرآن سے پہلے کسی کتاب کو نہیں پڑھتا تھا اور نہ تو اس پر قادر تھا، کیونکہ تو تو امی ہے، نہ لکھتا ہے نہ پڑھتا ہے، اور نہ تو اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا، کیوں کہ تو لکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ ﴿ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ﴾ سے مراد وہی ہے اور ﴿ مِنْ كِتٰبٍ ﴾ کا کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے۔ یمین کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ غالب کتابت دائیں ہاتھ سے ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو کاتب نہ تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب اپنی کتابوں میں یہ بات پاتے تھے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نہ لکھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آپ ﷺ کی نبوت پر دلیل ہے، اس لیے کہ نہ آپ لکھتے تھے نہ اہلِ کتاب سے میل جول رکھتے تھے اور نہ مکے میں اہلِ کتاب تھے، چنانچہ ان کے پاس انبیاء اور امتوں کی خبریں لائے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پڑھتے نہ تھے اور نہ لکھتے تھے، آپ امی تھے۔[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تخریج احادیث رافعی'' میں کہا ہے کہ بغوی نے تہذیب میں کہا ہے کہ آیا نبی کریم ﷺ اچھی طرح خط لکھ سکتے تھے اور لکھتے نہ تھے اور اچھی طرح شعر کہہ سکتے تھے اور کہتے نہ تھے یا نہیں؟ صحیح تر یہ ہے کہ آپ دونوں کام اچھی طرح نہیں

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٥١) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٥١) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٥٠)

کر سکتے تھے۔ لیکن ردی اور عمدہ شعر میں فرق کرتے تھے، یہ بات شہاب رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔[1]

غرضیکہ آیتِ مذکور اس دلیل کی ابتدا ہے جو قرآن شریف کے معجز ہونے پر دال ہے۔ ﴿ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر تو ان لوگوں میں سے ہوتا جو پڑھنے اور لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں تو البتہ وہ کہتے کہ شاید جو کچھ وہ ہم پر پڑھتا ہے، اس کو اللہ پاک کی پہلی کتابوں میں سے پایا، ان کتابوں میں سے جن میں پہلی امتوں کی خبریں جمع کی گئی ہیں۔ پھر جب کہ تو امی تھا، نہ پڑھ سکتا تھا نہ لکھ سکتا تھا تو اب وہاں شک کی کوئی جگہ نہیں ہے، نہ ہی شک کا کبھی کچھ مقام ہے، بلکہ اس شخص کا انکار جس نے انکار کیا اور اس شخص کا کفر جس نے کفر کیا، بے شک محض دشمنی اور انکار ہے۔ ان کا نام مبطل اس لیے رکھا کہ ان کا اس بارے میں شک کرنا اور یہ اظہار کرنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں ان کی طرف سے ظلم ہے، جو آپ کی پاکیزگی ظاہر ہونے اور آپ کے معجزات کے اظہار پر کیا گیا ہے۔

﴿ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ ﴾ یعنی بلکہ قرآن جس کو تو لے کر آیا ہے، کھلی آیتیں ہیں۔ امام قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هُوَ ﴾ کی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔ معنی یہ ہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آیات ہیں، یعنی صاحبِ آیات ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پڑھا ہے: "بَلْ هِيَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ"۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اس قراءت کے معنی یہ ہیں: بلکہ آیاتِ قرآن آیاتِ بینات ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ کے قول کو اختیار کیا ہے۔ ان دونوں کے قول کے واسطے ابن سمیفع کی قراءت سے استدلال کیا ہے، وہ یہ ہے: "بَلْ هٰذَا آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ"[2] حالاں کہ اس قراءت میں اس پر کچھ دلیل نہیں ہے، کیوں کہ "هٰذَا" کا اشارہ جائز ہے کہ قرآن کی طرف ہو جس طرح یہ جائز ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو، بلکہ اس کا رجوع قرآن کی طرف زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ یہ تاویل اور تقدیر کی طرف حاجت مند نہیں ہے اور یہ ان کے ریب اور شک سے اضراب، یعنی منہ پھیرنا ہے، یعنی قرآن اس قبیل سے نہیں کہ اس میں شک کیا جائے، کیوں کہ وہ تو سینے میں محفوظ ہے اور ان لوگوں کے سینوں میں ہے جو علم دیے گئے، یعنی علمائے مومنین، جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن شریف حفظ کیا۔ اس کو زبانی پڑھتے ہیں، لکھے ہوئے قرآن کو دیکھنے کی کچھ حاجت نہیں۔

یہ زبانی پڑھنا قرآن شریف کی خصوصیات میں سے ہے، بخلاف دوسری کتابوں کے۔ کیوں کہ وہ معجزات نہیں تھیں اور انھیں صرف مصاحف ہی سے پڑھا جاتا تھا، اسی لیے اس امت کے وصف میں یہ آیا ہے: "صُدُوْرُهُمْ أَنَاجِيْلُهُمْ"، اسی لیے اس کی تحریف اور تغییر پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا۔ مراد یہ ہے کہ مومنین اس کو یاد کرتے ہیں تجھ سے لے کر اور سیکھ کر اور بعض بعض سے اَخذ کرتے ہیں۔ تو نے اس کو جبریل علیہ السلام سے لیا ہے اور جبریل علیہ السلام نے لوحِ محفوظ

---

[1] التلخيص الحبير (٣/ ٢٧٠) التهذيب للبغوي (٥/ ٢١٧) حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٠٤)

[2] فتح القدير (٤/ ٢٧٣)

سے، چنانچہ تو نے اس کو کسی کتاب سے اس کے یاد کرنے کی صورت میں نہیں لیا ہے۔ ﴿ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴾ یعنی ہماری آیتوں کا یعنی قرآن کریم کا وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو حد سے بڑھنے والے اور ظلم میں توغل کرنے والے ہیں۔[1]

وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

انھوں نے کہا: اس پر اس کے رب کی طرف سے معجزے کیوں نہیں اُتارے گئے؟ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: بس معجزے تو اللہ کے پاس ہیں، اور میں تو محض ایک کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں (50) کیا انھیں (یہ نشانی) کافی نہیں کہ بے شک ہم نے آپ پر (یہ) کتاب نازل کی جو اُن پر پڑھی جاتی ہے۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان لاتے ہیں (51) آپ کہہ دیجیے: میرے اور تمھارے درمیان اللہ بطور گواہ کافی ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ اسے جانتا ہے اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور انھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا، وہی خسارہ پانے والے ہیں (52)

مشرکوں کے معجزے طلب کرنے اور ان کی اس پر سرزنش کا بیان:

اللہ کی گواہی ہے کہ سچوں کو دن بدن ترقی دی، بڑھایا اور جھوٹوں کو مٹایا۔ انتہی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرکوں کی عیب جوئی اور سرکشی اور ان کے نشانیوں کو طلب کرنے کے بارے میں خبر دیتا ہے۔ نشانیوں سے ان کی مراد وہ نشانیاں ہیں جو ان کو یہ بتائیں کہ نبی اکرم ﷺ اللہ کے رسول ہیں، جس طرح صالح علیہ السلام اپنی اونٹنی لائے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ یعنی اے محمد! تو ان سے کہہ دے کہ نشانیوں کا کام تو اللہ کی طرف ہے، پس اگر وہ اس بات کو جانتا کہ تم سیدھے راستے پر آ جاؤ گے تو وہ تمھارا سوال قبول کرتا، اس لیے کہ

---

[1] فتح البیان (۱۰/ ۲۰۳۔ ۲۰۵)

وہ اس کے لیے آسان ہے، لیکن وہ تو تمھارے بارے میں جانتا ہے کہ تم نے تو صرف عیب جوئی، سرکشی اور امتحان کا ارادہ کیا ہے، اس لیے وہ تمھارا مطالبہ تسلیم نہیں کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ''اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی، پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی میں تو صرف اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تمھیں اللہ کے احکام کھول کر بیان کروں اور ڈراؤں۔ چنانچہ میری ذمے داری تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسالت تم کو پہنچا دوں، اور جس کسی کو اللہ راہ بتائے وہ راہ پر آنے والا ہے اور جس کو وہ بہکائے تو اس کے لیے تو ہرگز کوئی راہ بتانے والا نہ پائے گا۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ﴾ [البقرة: ٢٧٢] ''(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمے داری نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

پھر اللہ پاک نے ان کی بہت زیادہ جہالت اور کم عقلی بیان فرمائی، اس لحاظ سے کہ انھوں نے ایسی نشانیاں طلب کیں جو نبی کریم ﷺ کے صدق اور سچائی اس بات میں ظاہر کریں جس کو وہ اُن کے پاس لے کر آئے، حالانکہ وہ تو اُن کے پاس وہ کتابِ عزیز لے کر آئے، جس کے پاس باطل نہ آگے سے آ سکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے، جو ہر قسم کے معجزے سے بڑھ کر ہے، کیوں کہ اس کے مقابلے سے تو ان کے بڑے بڑے فصیح اور بلیغ کلام والے عاجز ہو گئے، بلکہ اس جیسی دس سورتوں، بلکہ ایک سورت کے پیش کرنے سے عاجز نکلے۔

چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی کیا انھیں یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ عظیم کتاب نازل کی، جس میں ان کے ماقبل اور مابعد کی خبر ہے اور ان کے مابین کی چکوتی ہے، حالاں کہ تو ایک ایسا مرد ہے جو اُمی ہے، نہ پڑھ سکتا ہے نہ لکھ سکتا ہے اور نہ ہی تو نے کسی اہلِ کتاب سے میل جول رکھا ہے، چنانچہ تو ان کے پاس اس شے کی خبر لایا جو پہلے صحیفوں میں ہے اور ان کو صحیح بیان کیا، یعنی جن باتوں میں انھیں اختلاف تھا، اس میں سے صحیح بیان کو واضح طور پر بیان کر دیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰۗؤُا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴾ [الشعراء: ١٩٧] ''کیا ان کے لیے یہ ایک نشانی (کافی) نہیں کہ بنی اسرائیل کے علما بھی اس (قرآن یا صاحبِ قرآن) کو جانتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴾ [طٰہٰ: ١٣٣] ''انھوں نے کہا کہ یہ نبی ہمارے پاس اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لایا؟ کیا ان کے پاس اگلی کتابوں کی واضح دلیل نہیں پہنچی؟''

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «مَا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا قَدْ أُعْطِيَ مِنَ الآيَاتِ مَا مِثْلُهُ آمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوتِيتُهُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللَّهُ إِلَيَّ فَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1] (أخرجاه من حديث الليث) اس حدیث کے مثل پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴾ یعنی بے شک اس قرآن میں البتہ رحمت ہے، یعنی حق کا بیان ہے اور باطل کو دور کرنا ہے اور سمجھانا ہے اس شے کا جس میں سزا اور عذاب کا جھٹلانے والوں اور گنہگاروں پر نزول اور حلول ہوا ہے، تاکہ ایمان دار لوگ نصیحت حاصل کریں۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ شَهِیْدًا﴾ یعنی اللہ تمھارے جھٹلانے کو خوب جانتا ہے اور اس بات کو بھی جانتا ہے جو میں تم سے کہتا ہوں۔ یعنی اس کی طرف سے میرا یہ خبر دینا کہ اس نے مجھ کو بھیجا ہے۔ چنانچہ اگر میں اس پر جھوٹ بولنے والا ہوتا تو البتہ وہ مجھ سے انتقام لیتا، جیسا کہ اس نے فرمایا ہے: ﴿وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ﴾ [الحاقة: ٤٤۔ ٤٧] ''اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ تو یقیناً ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر البتہ ہم اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی ایک بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔'' اور میں اس بات میں بالکل سچ بولنے والا ہوں کہ میں نے تم کو خبر کر دی اور اسی لیے اس نے معجزات واضحات اور قطعی دلیلوں سے میری مدد فرمائی۔

﴿یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ یعنی وہ سب کچھ جانتا ہے، کوئی مخفی شے اس سے پوشیدہ نہیں۔ ﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ یعنی جو کچھ انھوں نے کیا ہے قیامت کے دن اس پر ان کو بدلہ دے گا، اور جو کاریگری انھوں نے حق کو جھٹلانے اور باطل کی پیروی کرنے میں کی ہے، اس پر ان کا مقابلہ کرے گا۔ اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا، باوجود اس کے کہ ان کی سچائی پر دلیلیں قائم ہوئیں اور وہ طاغوتوں اور آستانوں پر بغیر کسی دلیل کے ایمان لے آئے، چنانچہ اس پر ان کو جزا دے گا۔ ''إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ''[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿لَوْلَآ﴾ بہ معنی ''هَلَّا'' تحضیضیہ ہے، معنی یہ ہیں: مشرکوں نے کہا: کیوں نہ نازل کی گئیں اس کے رب کی طرف سے اس پر کچھ نشانیاں انبیاء کی نشانیوں کی طرح جیسے موسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں، صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور مسیح علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا۔ پھر اللہ پاک نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اس کا ان کو جواب دیں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٢) مسند أحمد (٢/ ٣٤١)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٥٠)

کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے ان کو نازل کرتا ہے، اس پر کسی کو کچھ قدرت نہیں ہے اور میں تو صرف اس شے کے ساتھ کھول کر ڈرانے والا ہوں جس کا مجھے حکم ہے۔

تم کو ڈراتا ہوں اور جیسا مجھ سے ہو سکتا ہے صاف صاف اس کو تم سے بیان کرتا ہوں، اس کے سوا میری قدرت اور اختیار میں اور کچھ نہیں ہے۔ امام ابن کثیر، ابوبکر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے ''آیَۃٌ'' واحد پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ جمع۔ امام ابوعبید رحمہ اللہ نے ﴿ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ ﴾ کے سبب سے قراءتِ جمع کو اختیار کیا ہے۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوَ لَمْ یَكْفِهِمْ ..... الآیۃ ﴾ جملہ مستانفہ ہے۔ غرض اس سے ان کی فرمایش کا رد کرنا ہے اور اس کے بطلان کا بیان ہے، یعنی کیا بس نہیں ہے مشرکوں کو نشانیوں سے جن کی انھوں نے فرمایش کی ہے یہ کتابِ معجز جس کے ساتھ تو نے ان کے ساتھ یہ بحث اور مقابلہ کیا ہے کہ وہ اس جیسی کتاب یا اس جیسی ایک ہی سورت لے آئیں، پس وہ اس سے عاجز نکلے اور اگر تو اُن کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں لاتا یا اس کے سوا اور انبیاء کی نشانیوں کی طرح لاتا تو وہ کہتے کہ یہ جادو ہے اور ہم جادو کو نہیں مانتے اور کلام ان کی قدرت میں ہے، وہ فصیح و بلیغ قصیدے اور شعر کہہ سکتے ہیں، اس کی خوبی کو خوب جانتے پہچانتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس کلام کے مقابلے سے عاجز ہو گئے اور ایمان نہ لاتے، جیسے قرآن پر ایمان نہ لائے، جو اُن پر ہر زمانے اور ہر جگہ میں پڑھا جاتا ہے۔ پس وہ ہمیشہ ان کے ساتھ ایک نشانی کی طرح ثابت رہتا ہے زائل نہیں ہوتا، جس طرح کہ ہر نشانی آنے کے بعد زائل ہو جاتی ہے، یا کسی جگہ میں ہوتی ہے اور کسی میں نہیں ہوتی۔

غرض یہ ہے کہ قرآن پاک ایک ایسا عظیم الشان اور باہر البرہان معجزہ ہے کہ پہلے انبیاء کے معجزوں سے زیادہ مکمل اور بڑا ہے اور سارے آیات و معجزات سے بے نیاز کرنے والا ہے، کیونکہ قرآن پاک کا معجزہ زمانوں کے گزرنے کے باوجود دائم اور ثابت رہتا ہے، اس کے سوا اور نشانیاں جس طرح مضمحل ہو جاتی ہے، وہ ہرگز اضمحلال پذیر نہیں ہوتا ہے، نہ اس میں کسی طرح کی کہنگی اور بوسیدگی ہوتی ہے، وہ کیسے ہو، اس کے عجائب و غرائب اور ظاہری اور باطنی خوبیاں تو اتنی ہیں کہ ان کی انتہا ہی نہیں ہے۔ نہ کسی بشر کی قدرت ان کو پوری طرح پا سکتی ہے۔ ہر مومن اور دین دار اپنی اپنی لیاقت اور فہم کے مطابق اس کو سمجھتا بوجھتا ہے، اس سے لذت لیتا ہے اور اپنی عاجزی کا قائل ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا حسن اور خوبی بشر کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

بہار عالم حُسنش دل و جان تازہ میدارد   برنگ اصحابِ صورت را بو اربابِ معنی را
مخدرات سرا پردہ ہائے قرآنے   چہ دلبرند کہ دل مے برند پنہانی

[1] تفسیر القرطبي (۱۳/ ۳۵۵)

’’اس کے حسن کی کیفیت کی بہار دل اور جان کو ہمیشہ تازہ رکھتی ہے ظاہر پرستوں کو رنگ سے اور اہلِ باطن کو خوشبو سے۔ قرآنی تقویٰ کے شامیانے روح کو اس انداز سے قابو کرتے ہیں کہ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔‘‘

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی یہ کتاب جو ہر زمان اور مکان میں موجود اور باوصافِ مذکور موصوف ہے۔ یہ دنیا اور آخرت میں ایک عظیم رحمت ہے اور دنیا میں ایک نصیحت ہے کہ اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور یہ ان لوگوں کو حق کی طرف راستہ بتاتی ہے جو اس شے کی تصدیق کرتے ہیں جس کو تو اللہ کے پاس سے لایا ہے، کیوں کہ اس سے یہی لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ یحییٰ بن جعدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ کتابیں لائے، انھوں نے ان کو لکھا تھا، ان میں بعض میں وہ شے تھی جس کو انھوں نے یہود سے سنا تھا تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ قوم کی حماقت اور گمراہی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جو شے ان کی طرف ان کا نبی لایا ہے، اس سے منہ موڑ کر وہ اس شے کی طرف راغب ہوں جس کو ان کا غیرِ نبی ان کے غیر کی طرف لایا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] (أخرجه الدارمي و أبو داود في مراسيله وغيرهما يعني الفريابي و ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و أخرجه الإسماعيلي في معجمه و ابن مردويه من طريق يحيىٰ بن جعدة عن أبي هريرة فذكره بمعناه)

امام زہری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک کتاب لائیں یوسف علیہ السلام کے قصے کے بارے میں، جو بکری کے شانے کی ہڈی پر لکھا ہوا تھا، پھر وہ اسے پڑھنے لگیں اور نبی اکرم ﷺ کا چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنے لگا۔ چنانچہ فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر یوسف علیہ السلام آئے تمھارے پاس اور میں تمھارے درمیان میں ہوں، پھر تم اس کی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تو البتہ تم گمراہ ہو جاؤ۔[2] (أخرجه عبدالرزاق في المصنف والبيهقي في الشعب)

عبد اللہ بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ پر داخل ہوئے ایک کتاب لے کر، جس میں تورات کے کئی مواضع یعنی جگہیں یا باتیں تھیں۔ پھر عرض کی کہ میں نے ان کو اہلِ کتاب کے ایک آدمی کے پاس پایا ہے، کیا میں ان کو آپ پر پیش کروں؟ رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک نہایت سخت متغیر ہوا کہ میں نے ویسا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا تو رسول اللہ ﷺ کے چہرے کو نہیں دیکھتا؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا“ پھر رسول اللہ ﷺ سے

---

[1] سنن الدارمي (١/ ١٣٤) تفسير الطبري (٢٠/ ٥٣) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٧٢۔ ٣٠٧٣) الدر المنثور (٦/ ٤٧١) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] مصنف عبدالرزاق (٦/ ١١٣) شعب الإيمان (٤/ ٣٠٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ کا سماع سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔

وہ کیفیت دور ہوگئی اور فرمایا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام نازل ہوتا پھر تم اس کی پیروی کرتے اور مجھے چھوڑ دیتے تو البتہ تم گمراہ ہو جاتے۔ میں نبیوں میں سے تمھارا حظ ہوں اور میں تمھارا حظ ہوں اُمتوں میں سے۔ (حظ بہ معنی جد و بخت و بہرہ ونصیب ہے)۔[1] (أخرجه عبد الرزاق و ابن سعد و ابن الضريس و الحاكم في الكنٰى والبيهقي في الشعب) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے تورات کے سیکھنے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو اس کو مت سیکھ اور اس پر ایمان لا اور سیکھ اس شے کو جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور اس پر ایمان لاؤ۔[2] (أخرجه البيهقي وضعفه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ﴾ یعنی تو جھٹلانے والوں سے کہہ دے کہ اللہ اس شے پر گواہ کافی ہے جو میرے اور تمھارے درمیان واقع ہوئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ گواہی دیتا ہے میرے لیے اس بات کی کہ میں اس کا رسول ہوں اور قرآن اس کی کتاب ہے اور گواہی دیتا ہے تمھاری تکذیب کی۔ اللہ کی شہادت، ان پر کتاب نازل کرنے کے ساتھ آپ کے لیے معجزے کا اثبات ہے۔ اور قرآن شریف تنہا ہی کافی وافی ہے، اس کے ساتھ اور کسی کتاب کی حاجت نہیں ہے، اس شخص کے لیے جو اس پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے۔

﴿ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی مخفی شے اس پر مخفی نہیں ہے، من جملہ اس کے وہ بات چیت ہے جو تمھارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صادر ہوئی۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ ﴾ باطل سے مراد وہ شے ہے جس کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: باطل سے مراد غیر اللہ ہے۔ کسی نے کہا: شیطان کی عبادت۔ کسی نے کہا: اللہ کے سوا کی عبادت۔[3] یہ سب معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

پھر اللہ پاک نے باطل کے بعد کفر کا ذکر کیا، اول کی قباحت کو بیان کرنے کے لیے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ (اگر کوئی کہے کہ جو شخص باطل پر ایمان لایا تو یقیناً وہ اللہ کا منکر ہوا، پس آیا کوئی فائدہ ہے ﴿ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ﴾ کے عطف کا سوائے تاکید کے تو میں کہوں گا: ہاں فائدہ اس کا یہ ہے کہ ثانی کو اس لیے ذکر کیا ہے کہ اول کی قباحت بیان کرے، جس طرح کہ کہنے والے کا یہ قول ہے: "أَتَقُوْلُ الْبَاطِلَ وَتَتْرُكُ الْحَقَّ" اس بات کو بیان کرنے کے لیے کہ باطل قبیح ہے۔[4] كذا في الخازن) یعنی جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ کے اور اس کی آیتوں کے منکر ہوئے، وہی لوگ دنیا اور آخرت میں خسارہ پانے والے ہیں، یعنی یہ لوگ اپنے صفقۂ بیع، یعنی خرید و فروخت اور سودے بازی میں نقصان میں رہے، اس لحاظ سے کہ انھوں نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا۔[5]

---

① شعب الإيمان (٤/ ٣٠٧) الدر المنثور (٦/ ٤٧٢) ② شعب الإيمان (٤/ ٣٠٨) الدر المنثور (٦/ ٤٧٢)

③ تفسير البغوي (٦/ ٢٥٠) تفسير الخازن (٥/ ١٩٧) ④ تفسير الخازن (٥/ ١٩٧) ⑤ فتح البيان (١٠/ ٢٠٥۔ ٢٠٧)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ
وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ
وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ
فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

اور یہ لوگ آپ سے جلد عذاب مانگ رہے ہیں اور اگر (عذاب کا) وقت مقرر نہ ہوتا تو انھیں عذاب ضرور آلیتا اور یقیناً وہ انھیں اچانک ہی آلے گا اور انھیں خبر تک نہ ہو گی (53) یہ لوگ آپ سے جلد عذاب مانگ رہے ہیں اور بلاشبہ جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے (54) اس دن، ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے، عذاب انھیں ڈھانپ لے گا اور اللہ فرمائے گا: جو کچھ تم کرتے تھے اس کا مزہ چکھو (55)

مشرکوں کے جلدی عذاب طلب کرنے کا بیان:

اس امت کا عذاب یہ تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہونا، پکڑے جانا۔ سو فتح مکہ کے وقت مکے کے لوگ بے خبر رہے کہ نبی اکرم ﷺ کا لشکر سر پر آ کھڑا ہوا۔ یہ عذاب کی جلدی مچا رہے ہیں، یعنی آخرت کا عذاب تو یونہی مانگ رہے ہیں ابھی تو دنیا میں قتل کے عذاب میں پڑے ہیں۔ کفر اور برے کاموں کا عذاب جو آخرت میں ہو گا تو وہ مرنے پر قیامت کے دن نظر آئے گا کہ دوزخ کی آگ کیسے جلاتی ہے۔ اپنے بد اعمال کا مزہ چکھو، یہ اللہ کہے گا یا وہ عذاب ہی بولے گا، جیسے: زکات نہ دینے والے کا مال سانپ بن کر گلے میں میں پڑے گا جبڑے چیرے گا اور کہے گا: میں تیرا مال ہوں، تیرا خزانہ ہوں۔ انتہٰی.

اللہ پاک مشرکوں کی جہالت اور نادانی کی خبر دیتا ہے اس بارے میں کہ اللہ کے عذاب کو جلدی مانگتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ''اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔'' اور اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ..... الآیة ﴾ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ پاک نے روزِ قیامت تک کے لیے عذاب کو موخر فرما دیا ہے تو البتہ عن قریب ان پر جلد تر عذاب آ جاتا ہے، جس طرح کہ انھوں نے اس کو جلد طلب کیا۔

پھر فرمایا کہ البتہ وہ ان کو اچانک آئے گا اور ان کو خبر نہ ہو گی۔ ﴿ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ... الآیة ﴾ یعنی

تجھ سے عذاب جلد مانگتے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ ان پر ضرور واقع ہونے والا ہے۔ شعبہ نے عن سماك عن عكرمة ﴿ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ بحر ہے، یعنی دریا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن مجاهد عن الشعبي روایت کیا ہے کہ شعبی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سنا کہ وہ آیتِ مذکور کی تفسیر میں فرماتے تھے کہ جہنم یہ وہی بحرِ اخضر ہے، تارے اس میں گر پڑیں گے اور سورج اور چاند بے نور کر کے اس میں ڈال دیے جائیں گے (ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں: ”تكور فيه الشمس و القمر“ اور فتح القدیر میں ”وتكون فيه“ ہے۔[1] والله أعلم) پھر وہ دھکایا جائے گا، پس وہ جہنم ہو جائے گا۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ نے صفوان بن یعلیٰ عن ابیہ روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”اَلْبَحْرُ هُوَ جَهَنَّمُ“ یعنی دریا ہی جہنم ہے۔ یعلیٰ سے لوگوں نے کہا تو یعلیٰ نے کہا: کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ﴾ [الكهف: ٢٩] ”ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتوں نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔“ کہا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں یعلیٰ کی جان ہے! میں اس میں داخل نہ ہوں گا کبھی، یہاں تک کہ اللہ پر پیش کیا جاؤں گا، اور نہ پہنچے گا مجھ کو اس سے ایک قطرہ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ پر پیش کیا جاؤں گا۔[3] (هذا تفسير غريب و حديث غريب جداً. والله أعلم)

پھر اللہ عز وجل نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ ...الآية ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ﴾ [الأعراف: ٤١] ”ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا ہوگا۔“ نیز فرمایا: ﴿ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ﴾ [الزمر: ١٦] ”ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے (بھی آگ کے) سائبان ہوں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٣٩] ”کاش! کافر اس وقت کو جان لیں جب وہ اپنے چہروں سے آگ نہیں ہٹا سکیں گے اور نہ اپنی پشتوں سے، اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی۔“ چنانچہ آگ ان کی سب اطراف سے ان کو ڈھانک لے گی، عذابِ حسی میں یہ طرز انتہا درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یہ ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ ہے۔ یہ نفوس پر عذاب معنوی ہے، یعنی ایک تو انتہا درجے کا جسمانی عذاب۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ ان کو ڈانٹنے دھمکانے اور جھڑکنے کے لیے

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٥١) فتح القدير (٤/ ٢٧٥) فتح البيان (١٠/ ٢٠٩)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٧٥) اس کی سند میں ”عمر بن اسماعیل“ سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] مسند أحمد (٤/ ٢٢٣) اس کی سند میں ”محمد بن حیی“ ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٠٢٣)

کہے گا کہ چکھو جو کچھ تم کرتے تھے۔ ﴿ذُوْقُوْا﴾ کا لفظ انتہائی خوب واقع ہوا ہے۔ اس لیے کہ ظاہر اور پوشیدہ گناہ ظاہری اور پوشیدہ لذت لینے کے لیے کیے جاتے ہیں، چنانچہ ان کے مقابلے میں توبیخاً فرمایا کہ جس طرح معاصی کا مزہ دنیا میں چکھا، اب ان کی جزا کا مزہ چکھو۔ ورنہ عذاب میں ایذا کے سوا اور کیا مزہ ہے۔ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ [القمر: ٤٨۔ ٤٩] ”جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے (کہا جائے گا:) تم جہنم (کے عذاب) کا چھونا چکھو۔ بلاشبہہ ہم نے ہر چیز ایک مقرر اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ اَفَسِحْرٌ هٰذَا اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الطور: ١٣۔ ١٦] ”جس دن انھیں نہایت سختی سے دھکے دے دے کر جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا۔ (کہا جائے گا:) یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ کیا پھر یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں؟ تم اس (دوزخ) میں داخل ہو جاؤ، اب تم صبر کرو یا صبر نہ کرو تمھارے لیے برابر ہے، تمھیں بس اسی کی سزا دی جائے گی، جو تم عمل کیا کرتے تھے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ تم سے عذاب جلدی مانگتے ہیں، یہ مانگنا استہزا اور تکذیب کے انداز سے ہے، جیسا کہ انھوں نے کہا تھا: ﴿فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الأنفال: ٣٢] ”تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔“ اور اگر نہ ہوتا ایک وعدہ جس کو اللہ پاک نے ان کے عذاب کے لیے مقرر اور معین فرمایا ہے، یعنی قیامت تو البتہ آ جاتا ان کو جلدی سے وہ عذاب جس کے وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مستحق ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: اجل سے مراد ان کی عمروں کی مدت ہے، کیوں کہ جس وقت وہ مریں گے تو عذاب کی طرف چلے جائیں گے۔ کسی نے کہا کہ ﴿اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ سے مراد نفخۂ اولیٰ ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ وقت ہے جس کو اللہ پاک نے ان کے عذاب کے لیے دنیا میں مقدر فرمایا ہے، ان کے روزِ بدر کو قتل اور قید ہونے کی صورت میں۔

حاصل یہ ہے کہ ہر عذاب کے لیے ایک مدت مقرر ہے نہ اس سے آگے ہو نہ پیچھے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ﴾ [الأنعام: ٦٧] ”ہر ایک خبر کا وقت مقرر ہے۔“ جملہ ﴿وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً﴾ مستانفہ ہے، عذاب کے آنے کو بیان کرتا ہے جس کا ذکر ماقبل میں ہو چکا ہے اور ﴿بَغْتَةً﴾ بہ معنی ”فُجَأَةً“، یعنی ناگہاں۔ اور جملہ ﴿وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ محلِ نصب میں ہے، بنا بر حال، یعنی وہ عذاب ان کو اچانک آئے گا، اس طرح کہ اس کے آنے کا ان کو علم نہ ہوگا، چنانچہ اس بات کی شاہد عدل سیرت کی کتابیں ہیں۔ پھر اللہ پاک نے ذکر

کیا کہ ان کے عذاب کے وعدے کی جگہ نار ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ یعنی وہ لوگ تجھ سے دنیا میں اپنے عذاب کو جلدی طلب کرتے ہیں۔

یہ بات تعجب کے طور پر فرمائی ہے، اس لیے کہ کسی شخص کو ایسے امر کی وعید سنائی جاتی ہے جس میں ذرا سا ضرر ہے، جیسے طمانچہ یا مکّہ، تو کبھی وہ اپنے نفس کی قوت کا خیال کرتا ہے اور کہتا ہے: بسم اللہ لاؤ۔ رہا وہ شخص جس کو غرق کرنے کی وعید سنائی جائے یا جلانے کی، اور وہ اس بات کا یقین کرے کہ وعید سنانے والا اس پر قادر ہے اور وہ وعدے کے خلاف نہ کرے گا تو اس کے دل میں یہ خیال نہ آئے گا کہ وہ کہے: لا وہ شے جس کی تو نے مجھے وعید سنائی ہے۔ چنانچہ پہلا ﴿ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ تو اُن کی طرف سے اخبار، یعنی خبر دینا ہے اور دوسرا ﴿ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ ان سے تعجب ہے، یعنی بڑے تعجب کی بات ہے کہ قادر اور قوی کی وعید کو جلد طلب کرتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ دہرانا تاکید کے لیے ہے۔

﴿ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾ جملہ حالیہ ہے، یعنی وہ اپنے عذاب کی تجھ سے تعجیل طلب کرتے ہیں، حالاں کہ عذاب کا مکان ان کو گھیرنے والا ہے، یعنی عن قریب ان کو گھیرے گا، کیوں کہ جو شے آنے والی ہے وہ قریب ہے۔ پس زمانۂ مستقبل کو حال کے پیرائے میں ادا کیا، تاکہ اس سے اس عذاب کا حق ہونا اور اس کا مبالغہ ظاہر ہو۔ یا جہنم سے مراد اس کے اسباب ہیں جو اس کی طرف پہنچانے والے ہیں۔ اب "مُحِيْطَةٌ" میں کوئی تاویل نہ ہوگی، لیکن پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ کافرین سے مراد جنسِ کفار ہے، چنانچہ یہ عذاب کو جلدی چاہنے والے بدخولِ اولیٰ اس میں داخل ہوں گے، معنی یہ ہیں کہ جہنم ان کو جمع کرنے والا ہے۔ ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ اس میں داخل ہوگا۔ پھر وہی قول بن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر کیا ہے کہ جہنم یہی بحرِ اخضر ہے۔[1] پھر کہا کہ اس میں شدید نکارت ہے، کیوں کہ بہت سی صحیح حدیثیں اس پر ناطق ہیں کہ جہنم اب موجود اور مخلوق ہے، ان صفتوں پر جو کتاب و سنت میں وارد ہوئی ہیں۔

پھر اللہ پاک نے عذاب کے گھیر لینے کی کیفیت بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ یعنی عذاب ان کو تمام اطراف سے گھیر لے گا، اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ﴾ [الزمر: ١٦] پس جب عذاب انھیں اس طرح ڈھانک لے گا تو گویا جہنم نے ان کو گھیر لیا۔ کسی نے کہا ہے کہ خاص دو طرفوں کا ذکر کیا، یعنی نیچے اوپر، دائیں بائیں اور آگے پیچھے کا ذکر نہ فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصد اس شے کا ذکر کرنا ہے جس سے جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے متمیز ہو جائے۔ دنیا کی آگ تو چار اطراف کا احاطہ کرتی ہے، کیوں کہ جو کوئی اس میں داخل ہوتا ہے تو شعلہ اس کے آگے اور

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

پیچھے اور دائیں بائیں ہوتا ہے۔ رہی آگ اوپر سے تو وہ نازل نہیں ہوتی، وہ تو اپنی خصلت کے مطابق نیچے سے اوپر کو چڑھتی ہے اور جو شعلہ قدم کے نیچے ہے وہ قدموں کے نیچے باقی نہیں رہتا، بلکہ قدم رکھ کر اس پر روندنے سے بجھ جاتا ہے۔[1] (ذكره الرازي)

﴿ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یہ کہنے والا اللہ پاک ہے، یا بعض فرشتے اللہ کے حکم سے اس دن یہ بات کہیں گے کہ اس کفر اور معاصی کی جزا چکھو جو تم کیا کرتے تھے، تم ہم سے بچ نہ سکو گے۔ اہلِ مدینہ اور کوفہ نے "نَقُوْلُ" بنون پڑھا ہے۔ باقی قراء نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ امام ابوعبید رحمہ اللہ نے ﴿ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ ﴾ کے لحاظ سے اس قراءت کو اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے "وَيُقَالُ: ذُوْقُوْا"[2] پڑھا ہے، جبکہ اللہ پاک نے اہلِ کتاب اور مشرکین کے کفار کا حال بیان کیا اور ان کو ڈرانے اور خوف دلانے میں جمع کیا اور ان کو اہلِ نار میں سے ٹھہرایا تو ان کا عناد اور سخت ہوا اور فساد بڑھا اور مسلمانوں کی ایذا رسانی میں ہر طرح سے سعی وکوشش کی، اس لیے اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا:[3]

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝٥٦ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝٥٧ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝٥٨ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝٥٩ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَاۗبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٦٠

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! بلاشبہ میری زمین وسیع ہے، تو تم میری ہی عبادت کرو (56) ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے (57) اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم انھیں جنت کے بالا خانوں میں ضرور جگہ دیں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، (نیک) عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے (58) جن لوگوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں (59) اور کتنے ہی (زمین پر) چلنے پھرنے والے ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے، اللہ انھیں اور تمھیں بھی رزق دیتا ہے اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (60)

---

[1] تفسير الرازي (٢٥/ ٧٢) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٥٧) فتح القدير (٤/ ٢٧٤_ ٢٧٥) [3] فتح البيان (١٠/ ٢٠٨_ ٢٠٩)

مومنوں کو ہجرت کا حکم:

جب کافروں نے مکے میں بہت زور کیا تو ہجرت کا حکم ہوا۔ اسّی تراسی گھر حبشہ کے ملک کی طرف ہجرت کر گئے۔ فرمایا کہ چند دن کی دنیا کی زندگی جہاں بنے وہاں کاٹ دو، پھر ہمارے پاس اکٹھے ہو جاؤ گے۔ یا یہ کہ وطن کو چھوڑنے اور نبی کریم ﷺ سے جدا ہونا مشکل نہ لگے۔ جو لوگ صبر کرتے ہیں اور اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں، انھیں اس وطن کے بدلے وہ وطن ملے گا۔ یہ جو فرمایا کہ بہت سے جانور اپنی روزی اٹھائے نہیں پھرتے تو یہ روزی کی طرف سے بے فکر کر دیا کہ اکثر جانوروں کے گھر میں کل کے لیے روزی نہیں ہوتی، نیا دن آتا ہے تو روزی بھی نئی ہوتی ہے۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے اپنے مومن بندوں کو ہجرت کرنے کا حکم ہے کہ اس شہر سے جس میں دین قائم کرنے پر قدرت نہ ہو، وہاں سے اس زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ، جہاں پر دین کو قائم کرنا اس طرح سے ممکن ہو کہ اس کی توحید کریں اور جس طرح اللہ نے ان کو حکم دیا ہے اس طرح اس کو پوجیں۔ اللہ کی زمین کشادہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴾ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ شہر اللہ کے شہر ہیں اور بندے اللہ کے بندے ہیں، پس جہاں کہیں تو خیر پائے تو اقامت کر۔[1] اور اسی لیے جس وقت مکے میں مستضعفین (کمزور لوگ) پر وہاں کا رہنا تنگ ہوا تو ہجرت کر کے حبشہ کے ملک کی طرف نکل گئے، تاکہ وہاں پر ان کو اپنے دین پر امن و سکون ملے۔

چنانچہ وہاں پر حبشہ کے بادشاہ اصحمہ کو "خیر منزلین"، یعنی اچھا مہمان نواز پایا۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ۔ لہٰذا اس نے ان کو جگہ دی اور اپنی نصرت و مدد سے ان کی تائید کی اور ان کو اپنے بلاد میں سیوم ٹھہرایا۔ سیوم بالضم بہ معنی آمنین کلمۂ حبشی ہے۔ بہ فتحِ سین بھی مروی ہے۔ یعنی اپنے شہروں میں ان کو بے خوف کر دیا۔ کسی نے کہا: جمع سائم ہے، یعنی چرنے والی بکریوں کی طرح اس کے شہر میں چریں، کوئی ان سے تعرض نہ کرے، پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور باقی صحابہ نے ہجرت کی مدینۂ نبویہ اور یثربِ مطہرہ کی طرف۔

موت سے کسی بھی صورت میں مفر نہیں ہے:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو موت تم کو پالے گی، لہٰذا تم اللہ کی اطاعت میں رہو اور جس جگہ کا اس نے تم کو حکم فرمایا ہے، وہ تمھارے لیے بہتر ہے، کیوں کہ موت تو ضرور ہی آنے والی ہے، اس سے کسی طرح سے بچت نہیں ہے۔ پھر مرجع و مآب اللہ کی طرف ہے۔

---

[1] مسند أحمد (۱/ ۱٦٦) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہے۔

مومنوں سے عمدہ بدلے کا وعدہ:

چنانچہ جو کوئی اس کا مطیع ہوگا تو وہ اس کو بہترین جزا دے گا اور اس کو بھرپور ثواب عطا فرمائے گا اور اسی لیے یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ... الآية ﴾ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، البتہ ہم ان کو جنت میں بسائیں گے، بلند بلند مکانوں میں جن کے نیچے قسم قسم کی نہریں بہہ رہی ہوں گی، کوئی پانی کی، کوئی شرابِ طہور کی اور کوئی دودھ کی۔ ان میں ہر قسم کا تصرف کریں گے جہاں چاہیں گے ان کو لیے پھریں گے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان جنتوں میں رہیں گے، وہاں سے منتقل نہ ہونا چاہیں گے۔ کام کرنے والوں کے لیے کیا اچھا بدلہ ہے اور یہ بالا خانے دے کر ان مومنوں کو اپنے دین پر صبر کرنے کے بدلے کیسا اچھا بدلہ دیا ہے، اور اللہ پاک کے دشمنوں سے کنارہ کرکے اور اپنے اہل و اقارب کی جدائی برداشت کرکے اللہ کی طرف ہجرت کرنے کے بدلے، جو اس کی رضا کی خاطر اور اس کے پاس ملنے والے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اور قیامت کے دن کی امید رکھتے ہوئے کی تھی۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو مالک سے یہ حدیث بیان فرمائی کہ جنت میں بالا خانے ہیں کہ ان کا ظاہر اُن کے باطن سے دکھائی دیتا ہے اور ان کا باطن ان کے ظاہر سے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے تیار کر رکھا ہے جنھوں نے کھانا کھلایا اور اچھی بات کی اور نماز پر ہمیشگی کی اور روزے رکھے اور رات کو قیام کیا، اس حال میں کہ لوگ سوتے ہیں۔[1] اور اپنے دین و دنیا کے سارے حالات میں اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ رزق کسی جگہ کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا رزق اس کی مخلوق کے لیے عام ہے، وہ جس جگہ ہوں اور جہاں کہیں ہوں، بلکہ مہاجرین کے رزق جہاں پر انھوں نے ہجرت کی بہت زیادہ، وسیع اور پاکیزہ ہوئے۔ کیوں کہ وہ تو تھوڑی مدت کے بعد زمین کی ہر طرف اور ہر کنارے میں حکمران ہو گئے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ﴾ یعنی کتنے جانور ہیں کہ روزی کو حاصل کرنے اور اسے جمع کرنے کی طاقت نہ رکھتے اور نہ کل کے لیے کچھ رکھ چھوڑتے ہیں۔

﴿ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ﴾ یعنی باجود ان کے ضعف کے اللہ ان کے لیے روزی مقدر کرتا ہے اور اس کو حاصل کرنا، ان کے لیے آسان کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہر مخلوق کی طرف وہی روزی بھیجتا ہے جو اس کے لائق ہے، یہاں تک کہ چیونٹیوں کو زمین کی تہہ میں اور پرندوں کو ہوا میں اور مچھلیوں کو پانی میں رزق عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [هود: ٦] ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے، اور وہ جانتا ہے اس کی قرار گاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے۔''

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٧٧) مسند أحمد (٥/ ٣٤٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٢٣)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکلا، یہاں تک کہ آپ مدینے کے کسی باغ میں داخل ہوئے تو آپ کھجوریں اٹھانے اور کھانے لگے، پھر مجھ سے فرمایا: اے ابن عمر! تجھے کیا ہے کہ تو نہیں کھاتا؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ''لَا أَشْتَهِيهِ'' یعنی میرا جی نہیں چاہتا۔ فرمایا: «لٰكِنِّي أَشْتَهِيهِ» لیکن میرا جی تو اس کو کھانے کو چاہتا ہے اور یہ چوتھی رات کی صبح ہے، جب سے میں نے کچھ کھانا چکھا ہے اور نہ پایا ہے اور اگر میں چاہتا تو البتہ میں اپنے رب سے دعا کرتا تو وہ مجھے کسریٰ اور قیصر کے ملک کی مثل عطا فرماتا۔ پھر اے ابن عمر! تیرا کیسا حال ہوگا جب کہ تو ایسی قوم میں باقی رہ جائے گا جو اپنے سال بھر کا رزق رکھ چھوڑیں گے اور ایمان کمزور ہو جائے گا؟ کہا: قسم ہے اللہ کی! ہم نہ ٹلے اور نہ ٹھہرے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ عزوجل نے مجھے دنیا کے خزانے رکھنے کا اور خواہشوں کی پیروی کرنے کا حکم نہیں کیا، چنانچہ جو شخص اپنی دنیا کو خزانہ رکھے، اس سے باقی زندگی گزارنے کا ارادہ کرے، زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ خبردار اور بے شک میں دینار اور درہم کو جمع نہیں رکھتا ہوں اور نہ ہی کوئی رزق کل کے لیے رکھ چھوڑتا ہوں۔[1] یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابو العطوف جزری جو زہری سے راوی ہے، ضعیف ہے۔ (ابن کثیر میں جزری اور فتح القدیر و فتح البیان میں جوزی ہے۔ واللہ أعلم. آخر میں یہ لکھا ہے: ''وهذه الحديث فيه نكارة شديدة لمخالفته ما كان عليه النبي ﷺ فقد كان يعطي نساءه قوت العام كما ثبت ذلك في كتب الحديث المعتبرة''[2])

ذکر کیا ہے کہ کوا جس وقت اپنے چوزوں سے انڈے توڑتا ہے تو وہ سفید نکلتے ہیں، پھر جب ان کا باپ ان کو ایسا دیکھتا ہے تو کئی دن ان سے نفرت کرتا ہے، یہاں تک کہ ان کے پَر سیاہ ہوں، کوے کا چوزہ دن بھر اپنا منہ کھولے رکھتا ہے، اپنے ماں باپ کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ پھر اللہ پاک زرد پرندے مثل پشہ کے مقرر فرما دیتا ہے تو وہ اس کو آ کر ڈھانک لیتے ہیں، چنانچہ ان دنوں میں ان پرندوں سے اپنی گزارے کی روزی حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پَر سیاہ ہو جائیں اور ماں باپ ہر وقت اس کی خبر گیری کیا کرتے ہیں۔ جب تک اس کو سفید پروں والا دیکھتے ہیں تو اس سے نفرت کرتے ہیں۔ پھر جب اس کو دیکھتے ہیں کہ اس کے پَر سیاہ ہو گئے ہیں تب اس کی پرورش کرنے اور اس کو دانہ دینے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے شاعر نے کہا ہے: ؎

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٧٨ـ ٣٠٧٩) اس کی سند میں ''جراح بن منہال جزری'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٥٣) فتح القدير (٤/ ٢٨٠) فتح البيان (١٠/ ٢١٤)

يَا رَازِقَ النَّعَّابِ فِيْ عُشِّهِ وَجَابِرَ الْعَظْمِ الْكَسِيْرِ الْمَهِيْضِ

(یہ شعر ابو القاسم حریری کا ہے۔ "مهیض" بہ معنی شکستن استخوان بعد از گرفتگی و درستی ہے اور مہیض بروزن مبیع۔ شرح مقامات مسہل المقامات نام میں لکھا ہے کہ "المهيض الذي انكسر بعد الجبر" اور "یا رازق النعاب" حضرت داود علیہ السلام کی دعا ہے۔) نعب کوے کے آواز کرنے کو کہتے ہیں اور نعیب اس کی آواز، اور نعاب کوا آواز کرنے والا۔ یہاں کوے کا چوزہ مراد ہے جو بغیر دانے کے چلاتا ہے۔ "مهیض" ٹوٹی ہڈی ہے۔ یعنی اے کوے کو اپنے گھونسلے میں روزی دینے والے اور اے ٹوٹی ہڈی کو جوڑنے والے۔ (مجمع البحار میں کہا ہے کہ نعاب بہ معنی غراب ہے۔ کہتے ہیں کہ کوے کا چوزہ جب اپنے انڈے سے نکلتا ہے تو چربی کی طرح سفید ہوتا ہے، اس کا باپ اسے اوپرا سمجھتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے، اس کو دانہ نہیں کھلاتا۔ پھر اللہ پاک پشوں کو ان کی طرف کھینچ لاتا ہے تو وہ اس کی بساہند کے سبب سے اس پر گر پڑتے ہیں، وہ ان کو اٹھاتا ہے اور قوت بسری کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پر اُگیں اور سیاہ ہو جائیں، پھر اس کے ماں باپ اس کی طرف لوٹ آتے ہیں۔[1])

امام شافعی رحمہ اللہ نے اوامر کے بارے میں کلام کیا ہے۔ اس میں یوں کہا ہے کہ مثل قول النبی ﷺ کے: «سَافِرُوْا تَصِحُّوْا وَتُرْزَقُوْا» یعنی سفر کرو تندرست رہو اور روزی دیے جاؤ۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «سَافِرُوْا تَصِحُّوْا وَتَغْنِمُوْا»[2] (قال: ورويناه عن ابن عباس) امام احمد رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «سَافِرُوْا تَرْبَحُوْا وَصُوْمُوْا تَصِحُّوْا، وَاغْزُوْا تَغْنِمُوْا»[3] یعنی سفر کرو نفع پاؤ، روزے رکھو تندرست رہو، غزوہ کرو غنیمت لو۔ (قد ورد مثل حديث ابن عمر رضی اللہ عنہما عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً و عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مرفوعاً و في لفظ: سافروا مع أهل الجدود والميسرة، قال: ورويناه عن ابن عباس رضی اللہ عنہما) یعنی آسودہ حال لوگوں کے ساتھ سفر کرو، غرض یہ ہے کہ غنی لوگوں کے ساتھ سفر کرنے میں نفع ہوگا، سفر کی تکلیفیں اٹھانی نہیں پڑیں گی، ہر قسم کا اطمینان رہے گا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے بندوں کے اقوال خوب سنتا ہے اور ان کے حرکات و سکنات کو خوب جانتا ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ اللہ پاک نے مومنین کو پہلے تو حرفِ یاء کے ساتھ مخاطب کیا، اس کے بعد اپنی ذات پاک کی طرف ان کو مضاف فرمایا، اس سے غرض ان کی عزت و تکریم ہے اور موصول صفتِ موضحہ ہے یا ممیزہ۔ ﴿اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ﴾ یعنی اگر تم مکے میں اپنے ایمان کا اظہار کرنے سے تنگ

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٧٣٣)
[2] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١٠٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٥٢)
[3] مسند أحمد (٢/ ٣٨٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٥٢)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٥١۔ ٥٥٣)

ہوتے ہو اور کفار سے تکلیف اٹھاتے ہو تو مکے سے نکل جاؤ، تاکہ تمھارے لیے صرف مجھ اکیلے کو پوجنا سہل و آسان ہو جائے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ان کو اس جگہ سے ہجرت کرنے کا حکم ہوا جہاں اللہ کی عبادت ممکن نہیں ہے اور اسی طرح اس شخص پر واجب ہے جو کسی شہر میں ہو، جس میں معاصی کیے جاتے ہیں اور اس کے لیے ان کو متغیر کرنا، یعنی بدلنا ممکن نہیں ہے تو وہ وہاں سے ہجرت کر جائے، جہاں اس کو اللہ پاک کا پوجنا میسر ہو، جیسا کہ اس کے پوجنے کا حق ہے۔[1] مطرف بن شخیر رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میری رحمت واسع ہے اور میرا رزق تمھارے لیے فراخ ہے، لہٰذا تم اس کو زمین میں تلاش کرو۔[2] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میری زمین یعنی جنت کی زمین واسع ہے، لہٰذا تم مجھ ہی کو پوجو، تاکہ میں تم کو اس کا وارث کروں۔

﴿ اِيَّايَ ﴾ کا نصب فعل مضمر سے ہے "أَيْ: فَاعْبُدُوْا إِيَّايَ"۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ مکہ کے ضعفائے مسلمین کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ کسی نے کہا: اس قوم کے بارے میں جو ہجرت سے پیچھے رہے اور کہا کہ ہم ڈرتے ہیں بھوک اور زندگی کے تنگ ہونے سے اگر ہم ہجرت کریں، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کو ہجرت نہ کرنے پر معذور نہ رکھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ہجرت کے بارے میں شہر اور جگہیں مختلف ہیں۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آج کے دن بحمد اللہ ہم نے مکہ مکرمہ سے زیادہ قہرِ نفس پر قابو پانے والا اور دل کو زیادہ جمع کرنے والا اور قناعت پر زیادہ رغبت دلانے والا اور شیطان کو زیادہ تر دور لے جانے والا اور فتنوں سے زیادہ دور کرنے والا اور امورِ دینی میں زیادہ ربط وضبط کرنے والا اور ظاہر کرنے والا کوئی اور شہر نہیں پایا۔ حَرَسَهَا اللّٰهُ تَعَالٰی.

سیدنا سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ جب کسی زمین میں گناہ اور بدعتیں ظاہر ہوں تو اس سے نکل کر اللہ کے فرماں بردار لوگوں کے علاقے کی طرف نکل جاؤ۔[3] مرفوعاً مروی ہے کہ جو شخص اپنے دین کو لے کر بھاگے ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف، اگرچہ وہ زمین میں ایک بالشت کے برابر ہو تو وہ جنت کا مستوجب ہوگا۔[4] اس کی سند وتخریج میں ضرور نظر کی جائے۔ بالجملہ اول اللہ پاک نے مومنوں کو ہجرت کا حکم دیا، پھر ان کو موت سے ڈرایا، تاکہ ہجرت کا معاملہ ان کے لیے آسان ہو جائے اور مہاجرین کو شجاعت دلائی، تاکہ موت کے خوف سے شرک والی جگہ ہی پر اقامت پذیر نہ رہیں۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ﴾ یعنی نفوس میں سے ہر نفس موت کی کڑواہٹ، تلخی، تکلیف، شدت اور مشقت کو ضرور پانے والا ہے اور اس کو ایسا چکھے گا جیسا کوئی چکھنے والا کسی شے کو چکھتا ہے اور اس کا مزا پاتا ہے۔ چنانچہ اپنے وطنوں کو چھوڑنا اور بھائیوں اور دوستوں کی جدائی تم پر دشوار نہ ہو، بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ اگر یہ تکلیف اللہ پاک کی راہ میں ہو تو وہ اس پر تم کو جزا دے گا، لہٰذا تم سفر کی دوری اور اس کی تکلیف اور مشقت سے مت ڈرو۔

---

[1] معاني القرآن (٤/ ١٧٢) [2] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٥٨)

[3] روح المعاني (٢١/ ١٦) [4] الكشف والبيان للثعلبي (٧/ ٢٨٨) یہ روایت مرسل ہے۔

﴿ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی پھر تم موت اور بعث کے سبب سے ہماری ہی طرف لوٹ کر آؤ گے نہ کہ کسی اور کی طرف جاؤ گے۔ چنانچہ ہر زندہ شخص درحقیقت سفر ہی میں ہوتا ہے اور وہ دارِ قرار کی طرف جا رہا ہے، اگرچہ اس دار یعنی دنیا میں اس کا ٹھہرنا کافی لمبی مدت کے لیے ہو۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ [الزمر: ۳۰] ''(اے نبی!) بلاشبہ آپ بھی مرنے والے ہیں اور وہ بھی یقیناً مرنے والے ہیں۔'' تو میں نے کہا: یا رب! کیا ساری خلائق مر جائے گی اور انبیاء باقی رہیں گے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴾[1] (أخرجه ابن مردويه)

فتح البیان میں کہا ہے: نظر کی جائے کہ اس حدیث کی صحت کیسی ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پاک کا قول ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ [الزمر: ۳۰] سننے اور جان لینے کے بعد کہ وہ میت ہیں اور آپ جان چکے ہیں کہ آپ سے پہلے کے نبی مر چکے ہیں اور آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ پھر جو بات سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی ہے کہ ساری خلائق مر جائے گی اور انبیاء باقی رہیں گے، وہ اس آیت سے کیسے پیدا ہوتی ہے، پس شاید یہ روایت نہ مرفوعاً صحیح ہو نہ موقوفاً۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ میں ہجرت کی ترغیب ہے اور جو شخص ہجرت کرے اس کی جزا یہ ہے کہ وہ جنت کے غرفوں (بالا خانوں) میں ہوگا، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا ﴾ یعنی البتہ ہم اتاریں گے ان کو جنت کے غرفوں میں۔ ''نبوئن'' ماخوذ ہے ''مباءة'' سے۔ ''مباءة'' بہ معنی انزال ہے۔ ''غرف'' جمع ہے ''غرفة'' بالضم کی۔ غرف بہ معنی علالی ہے۔ علالی جمع ہے ''عُلِّيَّه'' کی، ''عُلِّيَّه'' بہ معنی بروارہ ہے۔ بروارہ کہتے ہیں بالاخانہ وحجرہ و بالائے حجرہ کو۔ ﴿ غُرَفًا ﴾ کا نصب یا تو اس بنا پر ہے کہ مفعولِ ثانی ہے ''لنبوئن'' کا بنا بر تضمین معنی ''ننزلن'' یا بنا بر ظرفیت ہے مع عدم تضمین، کیوں کہ ''لنبوئن'' ایک ہی مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یا منصوب بہ نزعِ خافض ہے بطور اتساع کے۔ اصل میں ''فِيْ غُرَفِ الْجَنَّةِ'' ہے۔

ابو عمرو، یعقوب، جحدری، ابن ابی اسحاق، ابن محیصن، اعمش، حمزہ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ نے ''يَا عِبَادِيْ'' بہ سکونِ یاء پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ فتحِ یاء۔ ابن عامر نے ''أَرْضِيْ'' بہ فتحِ یاء اور باقی نے بہ سکونِ یاء پڑھا ہے۔ سلمی و ابوبکر نے عن عاصم ''يُرْجَعُوْنَ'' بیائے تحتیہ اور باقی نے بہ فوقیہ پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی نے ''لَنُثْوِيَنَّهُمْ'' بثائے مثلثہ پڑھا ہے، بجائے بائے موحدہ کے۔ باقی نے بائے موحدہ پڑھا ہے۔ معنی اس کے یہ ہیں: البتہ عطا کریں گے ہم ان کو غرفے، جن میں وہ اقامت کریں۔ یہ قراءت ماخوذ ہے ''ثَوَى'' بہ معنی اقامت سے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: کوئی شخص اقامت کرتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: ''ثَوَى الرَّجُلُ'' اور جب تو کسی شخص کو کسی منزل میں نازل کرے کہ وہ اس میں مقیم ہو تو یوں کہے گا: ''أَثْوَيْتُهُ''.

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٧٤۔ ٤٧٥) [2] فتح القدير (٤/ ٢٧٩۔ ٢٨٠) فتح البيان (١٠/ ٢١١)

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: یہ قراءت مجھے پسند نہیں ہے، اس لیے کہ تو "أَثْوَيْتُهُ الدَّارَ" نہیں بولتا، بلکہ "فِيْ الدَّارِ" کہتا ہے۔ اور حال یہ ہے کہ مفعولِ ثانی میں کوئی حرفِ جر نہیں ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا ہے کہ یہ بنا بر ارادہ حرفِ جر ہے، پھر اس کو حذف کر دیا ہے، جس طرح کہ تو کہتا ہے: "أَمَرْتُكَ الْخَيْرَ" "يَعْنِيْ بِالْخَيْرِ".[1] غرضیکہ پھر اللہ پاک نے ان غرفوں کا یہ وصف ذکر فرمایا: ﴿ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ یعنی ہم ان کو ایسے بالا خانوں میں اتاریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ یعنی اس حال میں کہ ان کے لیے ان غرفوں میں ہمیشہ رہنا مقدر کر دیا گیا ہے، وہ کبھی نہ مریں گے۔ کسی نے کہا: جنت میں۔ پہلا قول اولیٰ ہے۔

﴿ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴾ میں مخصوص بالمدح محذوف ہے: "أَيْ: نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِيْنَ أَجْرُهُمْ" یعنی اعمالِ صالح کرنے والوں کا اجر اچھا ہے۔ اللہ پاک نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ مومنوں کے لیے جنات ہیں، یہ اس کے مقابلے میں ہے کہ کافروں کے لیے نیران ہیں، یعنی آگ۔ اور فرمایا کہ جنت میں غرفے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ اس کے مقابلے میں ہے کہ کافروں کے نیچے آگ ہے اور ﴿ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴾ میں فرمایا کہ یہ ان کے عمل کا اجر ہے یہ اس کے مقابلے میں ہے، جو کفار کے واسطے گزر چکا ہے۔

﴿ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ اور جو شے مومنین کے مافوق ہے، یعنی ان سے بھی اوپر ہے، اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ وہ تو اعلیٰ علیین میں ہیں۔ چنانچہ ان کے اوپر کسی شے کا ذکر نہیں کیا، اس سے غرض ان کے علوِ مرتبت اور بلند مقام کی طرف اشارہ ہے۔ پانی کو ان کے قدموں کے نیچے نہیں کیا، بلکہ ان کے غرفوں کے نیچے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی ملتذ بہ ہوتا ہے، یعنی اس سے لذت لی جاتی ہے، کسی طرف ہو اور کتنی ہی دوری پر ہو جس وقت کہ وہ غرفے کے نیچے ہو۔[2] (ذکره الرازي)

پھر اللہ پاک نے ان عاملین کا یہ وصف ذکر فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٢] "وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔" یعنی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے تکالیف کی مشقتوں پر اور مشرکوں کی اذیت پر اور دین کو ظاہر کرنے کی خاطر ہجرت کرنے پر اور طاعت پر اور معاصی سے باز رہنے پر اور جو سختی اور تکلیف انھیں پہنچی، اس کی وجہ سے انھوں نے اپنا دین نہ چھوڑا اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں، یعنی اپنے سارے کام اس کے سپرد کرتے ہیں، ہر پیش قدمی کرنے میں اور رک جانے پر اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ پھر جو شے صبر و توکل پر معین اور مددگار ہوتی ہے اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا، یعنی جانوروں کے حال میں غور و فکر کرنا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ﴾ پہلے ﴿ كَاَيِّنْ ﴾

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٥٨۔ ٣٥٩) فتح القدير (٤/ ٢٧٧) [2] تفسير الرازي (٢٥/ ٧٥)

پر کلام گزر چکا ہے۔ ﴿ كَاَيِّنْ ﴾ اصل میں "أَيٍّ" ہے، اس پر کاف تشبیہ کا داخل ہوا ہے اور اس میں کم کے معنی ہو گئے ہیں۔ چنانچہ امام خلیل اور سیبویہ رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ ان کے نزدیک تقدیر اس کی یہ ہے: "كَشَيْءٍ كَثِيْرٍ مِنَ الْعَدَدِ مِنْ دَآبَّةٍ" کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں: "وَكَمْ مِنْ دَآبَّةٍ ذَاتِ حَاجَةٍ إِلَى الْغِذَاءِ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا" یعنی کتنے جانور غذا کی حاجت رکھنے والے ہیں کہ اپنی روزی کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے بسبب اپنے ضعف کے اور نہ کل کے واسطے اس کا ذخیرہ کرتے ہیں اور نہ اس کو اپنے ساتھ اٹھاتے ہیں مثل بہائم اور طیور کے، اللہ ہی ان کو روزی دیتا ہے اپنے فضل سے اور تم کو بھی روزی دیتا ہے، پھر تم اللہ پر توکل کیوں نہیں کرتے ہو، باوجود اس کے کہ اسبابِ معیشت پر تمھیں قدرت اور قوت ہے، جس طرح کہ وہ اللہ پر اپنی عاجزی اور ضعف کی وجہ سے توکل کرتے ہیں۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ چار پائے اپنے وقت پر کھاتے ہیں، کسی شے کا ذخیرہ نہیں کرتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی بہائم و طیور اپنے منہ سے کھاتے ہیں اور کسی شے کو اٹھاتے نہیں ہیں۔[1] سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر تم اللہ پر اس طرح توکل کرو جس طرح توکل کرنے کا حق ہے تو البتہ وہ تمھیں اس طرح رزق دے جس طرح پرندوں کو رزق دیتا ہے، وہ صبح خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو جب آتے ہیں تو اُن کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔[2] (أخرجه الترمذي، وقال: حديث حسن)

یعنی وہ دن کے شروع میں جاتے ہیں بھوکے اور دبلے پیٹ اور دن کے آخر میں اپنے گھونسلوں کی طرف واپس آتے ہیں، سیر ہو کر پیٹ بھرے ہوئے اور وہ کسی شے کا ذخیرہ نہیں کرتے۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا: نہیں ہے کوئی شے اللہ کی مخلوق سے کہ رکھ چھوڑے یا ذخیرہ کرے، مگر انسان اور چوہا اور چیونٹی۔[3] اللہ پاک نے اس آیت میں حریص اور متوکل کے رزق کے درمیان برابری فرمائی ہے اور راغب اور قناعت کرنے والے کے درمیان اور قوی اور عاجز کے درمیان، یعنی یہ تصور نہ کرے کہ وہ اپنی قوت کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور عاجز یہ تصور نہ کرے کہ وہ اپنی عاجزی کی وجہ سے رزق سے ممنوع یا روکا گیا ہے۔

﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ اللہ پاک بڑا سننے والا ہے۔ ہر مسموع کو سنتا ہے، ہر معلوم کو خوب جانتا ہے، پھر وہی حدیث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی ذکر کی ہے، اس کے مخرج عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، بیہقی اور ابن عساکر ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے یہ سندِ ضعیف کہا ہے۔[4] پھر اللہ پاک نے اہلِ مکہ وغیرہم کے مشرکوں کا حال ذکر کیا اور سننے والے کو اس بات سے تعجب دلایا کہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ان کا خالق و رازق ہے، حالاں کہ نہ اس کی توحید کرتے ہیں اور نہ اس کے غیر کی عبادت کو چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[5]

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٦٠) [2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٤٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٥٤)
[3] تفسير البغوي (٦/ ٢٥٣) [4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [5] فتح البيان (١٠/ ٢١٠۔ ٢١٤)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿61﴾ اَللّٰهُ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿62﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿63﴾

اور بلاشبہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیے اور (کس نے) سورج
اور چاند خدمت پر لگائے تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے! پھر وہ کہاں بہکائے جاتے ہیں (61) اللہ
اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور کسی کے لیے تنگ کر دیتا
ہے، بلاشبہ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (62) اور البتہ تحقیق اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے
آسمان سے پانی نازل کیا، پھر کس نے زمین کی موت (ویرانی) کے بعد اس پانی سے اسے زندہ
(تروتازہ) کیا تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے! تو آپ کہہ دیجیے: ''الحمد للہ'' لیکن ان کے اکثر
عقل سے کام نہیں لیتے (63)

توحید کا بیان:

یعنی رزق کے اسباب اسی نے بنائے، سب جانتے ہیں پھر اس پر بھروسا نہیں کرتے کہ وہی پہنچا بھی دے گا، مگر جتنا کہ وہ چاہے نہ کہ جتنا تم چاہو یہ آگے سمجھا دیا۔ فراخ اور تنگ روزی کا یہ مطلب ہے کہ روزی ماپ کر دیتا ہے، یہ نہیں کہ نہ دے۔ مینہ بھی ہر کسی پر برابر نہیں برستا اور اسی طرح حال بدلتے دیر نہیں لگتی مفلس سے دولت مند کر دے۔ انتھیٰ۔

اللہ پاک یہ ثابت فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے کہ مشرک لوگ جو اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجتے ہیں اس بات کا اقرار اور اعتراف کرتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے میں وہ منفرد اور مستقل ہے اور وہی سورج اور چاند کو پیدا کرتا ہے اور رات اور دن کو مسخر کرتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا خالق اور رازق ہے اور وہ ان کی مختلف اجلوں کا اندازہ کرنے والا ہے اور ان کو رزق دینے میں مختلف معیار مقرر کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے ان میں فرق رکھا ہے، کوئی غنی ہے اور کوئی فقیر ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے لیے جو مناسب ہے وہی اس کو خوب جانتا ہے اور اسے پتا ہے کہ غنا کا مستحق کون ہے اور فقر کا مستحق کون ہے۔ غرضیکہ یہ بات ذکر فرمائی کہ ساری اشیاء کو پیدا

کرنے کے ساتھ وہی مستقل ہے اور ان کی تدبیر کرنے کے ساتھ وہی منفرد ہے۔ پھر جب بات یوں ٹھہری تو اس کے غیر کو تو کیوں پوجتا ہے اور اس کے غیر پر کیوں توکل کرتا ہے؟! چنانچہ جیسا وہ اپنی بادشاہت میں یکتا ہے ویسا ہی چاہیے کہ اپنی عبادت میں بھی یکتا ہو۔ اللہ پاک کی عادت جاری ہے کہ اکثر مقام میں توحیدِ الوہیت کو توحیدِ ربوبیت کے اعتراف کے ساتھ ثابت فرماتا ہے۔ مشرکین توحیدِ ربوبیت کا اقرار کیا کرتے تھے، چنانچہ اپنے تلبیہ میں یوں کہا کرتے تھے: "لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ"[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے دو شے ذکر فرمائی ہیں: ایک شے تو ذوات سے متعلق ہے، وہ پیدا کرنا ہے آسمان و زمین کا۔ دوسری صفات سے متعلق ہے، وہ تسخیر ہے شمس و قمر کی، یعنی جب ان سے پوچھو کہ آسمان و زمین کس نے بنائے، سورج چاند کو کس نے کام میں لگایا؟ تو کہیں: اللہ نے، یعنی اللہ ہی نے ان کو بنایا ہے اور اسی نے سورج چاند کو کام میں لگایا ہے، اس کے انکار پر قادر نہیں ہیں۔ جب انکار نہیں کر سکتے تو پھر کیوں اس بات کا اقرار کرنے سے پھر جاتے ہیں کہ الوہیت کے ساتھ وہی متفرد ہے اور وہی وحدہ لا شریک لہ ہے۔ استفہام انکار اور استبعاد کے لیے ہے۔

رہی یہ بات کہ آسمانوں اور زمین میں خلق یعنی پیدا کرنے کا ذکر کیا اور سورج اور چاند میں مسخر کرنے کا ذکر کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف پیدا کر دینا ہی سورج اور چاند کی حکمت نہیں ہے، کیوں کہ سورج اگر اس طرح سے مخلوق ہوتا کہ ایک ہی جگہ میں رہتا حرکت نہ کرتا تو نہ رات اور دن حاصل ہوتا اور نہ گرمی اور سردی۔ چنانچہ اب حکمت جو ہے وہ ان کے حرکت کرنے اور مسخر ہونے میں ہے۔ پھر جب مشرکوں نے بعض مومنوں سے کہا کہ اگر تم حق پر ہوتے تو فقیر نہ ہوتے تو اللہ پاک نے اس بات کو یوں دور فرما دیا کہ ﴿ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ﴾ یعنی روزی میں فراخی کرنا اور اس کی تنگی کرنا اللہ پاک کی طرف سے ہے جو فراخی کرنے والا اور تنگی کرنے والا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے فراخی کرتا ہے اور جس پر چاہتا ہے تنگی کرتا ہے، اپنی حکمتِ بالغہ کے تقاضے کے مطابق اور اپنے بندوں کے حال کے مطابق۔ جس کے مناسبِ حال تنگی کرنا ہے اس پر تنگی کرتا ہے، جس کے مناسبِ حال فراخی کرنا ہے اس کے لیے فراخی کرتا ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک ہر اس شے کو خوب جانتا ہے جس میں اس کے بندوں کی بہتری اور خرابی ہے، من جملہ اس کے فراخی اور تنگی بھی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ کا حاصل یہ ہے کہ مشرک لوگ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ہی نے آسمان سے خشک سالی کے بعد پانی نازل کیا اور اس پانی سے زمین کو زندہ کیا، اس کے انکار کے لیے ان کو کوئی راستہ نہیں ملتا، پھر اس اقرار اور اعتراف کے بعد اللہ پاک

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٥٣)

کے ساتھ غیر اللہ کو کیوں شریک کرتے ہیں۔ پھر جب انھوں نے یہ اقرار کیا، جو ان آیتوں میں مذکور ہے اور یہ اقرار اس بات کا متقضی ہے کہ جس شرک پر اور اللہ پاک اکیلے کی عبادت نہ کرنے پر جمے ہوئے ہیں، وہ باطل ہے تو اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو امر فرمایا کہ مشرکوں نے جو اس امر کا اقرار کیا اور انکار نہ کیا، اس کے باوجود کہ عناد اور دشمنی میں سخت ہیں اور جو توحید رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، اس سب کے رد کرنے میں بڑے درشت ہیں، لہٰذا اس پر اللہ کی حمد کریں۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ یعنی تو اللہ کی حمد کر اس بات پر کہ اس نے حق کو تیرے ساتھ کیا اور تیری حجت ان پر غالب کی۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کی حمد کر اس بات پر کہ اس نے پانی کو نازل کیا اور روئیدگی سے زمین کو زندہ کیا، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ پھر اللہ پاک نے مشرکوں کی مذمت کی تو فرمایا: ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی جن اشیاء کو عقل مند لوگ سمجھتے بوجھتے ہیں، ان کو ان مشرکوں کے اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ اسی لیے اس شے کے تقاضے کے مطابق عمل نہیں کرتے، جس کا انھوں نے اقرار کیا ہے اور وہ اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ جس حال پر جمے ہوئے ہیں، وہ ہر عقل مند کے نزدیک باطل ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ دنیا بالکل حقیر اور صغیر ہے اور لہو ولعب کی جنس سے ہے اور اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہے۔ اور دار حقیقت میں دارِ آخرت ہی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ڔ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۼ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ۝

اور یہ دنیا کی زندگی ایک کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور بلاشبہہ دارِ آخرت (کی زندگی) ہی (اصل) زندگی ہے، کاش! لوگ جانتے ہوتے (64) پھر جب وہ (مشرکین) کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اطاعت وفرماں برداری کو اسی (اللہ) کے لیے خاص کرتے ہوئے اللہ کو پکارتے ہیں،

---

[1] فتح البیان (۱۰/ ۲۱۴۔ ۲۱۵)

پھر جب وہ انھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو فوراً وہ شرک کرنے لگتے ہیں 65 تا کہ وہ اس (نعمت) کی ناشکری کریں جو ہم نے انھیں دی اور تا کہ وہ فائدہ اُٹھائیں، پھر جلد وہ (اس کا انجام) جان لیں گے 66 کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے حرم (مکہ) کو پُرامن بنایا ہے، جبکہ لوگ اس کے اِردگرد سے اُچک لیے جاتے ہیں۔ کیا پھر وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں 67

دنیا کا ساز وسامان اور مال و دولت زوال پذیر ہے:

مکے کے لوگ اللہ کے گھر کے طفیل دشمنوں سے پناہ میں تھے اور باقی عرب ملک میں فساد تھا۔ بتوں کے جھوٹے احسان مانتے ہیں یہ اللہ کا سچا احسان نہیں مانتے۔ انتھی[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک دنیا کی حقارت اور زوال اور ختم ہو جانے کی خبر دیتا ہے اور اس بات کی کہ اس کے لیے کسی طرح کا دوام نہیں ہے اور جو کچھ اس میں ہے، اس کی انتہا لہو ولعب ہے، اور دارِ آخرت البتہ ہمیشہ کی زندگی ہے اور حق ہے جس کو نہ کسی طرح کا زوال ہے اور نہ ختم ہونا، وہ ابد الآباد مستمر رہے گی۔ ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ دنیا کے زوال کو اور آخرت کے بقائے دائمی کو جانتے تو البتہ وہ باقی رہ جانے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر اختیار کرتے۔

پھر اللہ پاک نے مشرکوں کی طرف سے یہ خبر دی کہ اضطرار کے وقت یعنی مجبوری کے وقت اسی وحدہ لاشریک لہٗ ہی کو پکارتے ہیں، پھر ان کی یہ حالت ہمیشہ کیوں نہیں رہتی، پھر جب کشتی میں سوار ہوئے تو اللہ کو نرمی کے ساتھ پکارنے لگے اور اسی کے ساتھ پکار کی نیت خالص کر کے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ''اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم جاتے ہیں، پھر جب وہ (اللہ) تمھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔'' اور اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ﴾

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو عکرمہ رضی اللہ عنہ آپ سے بھاگتا چلا گیا، پھر جب دریا میں سوار ہوا، تا کہ حبشہ کی طرف جائے تو کشتی اپنے لوگوں کو لے کر مضطرب ہوئی، چنانچہ کشتی والوں نے کہا: اے قوم! اپنے رب سے خالص دعا کرو، کیوں کہ یہاں تو صرف وہی نجات دے گا۔ عکرمہ رضی اللہ عنہ بولے: واللہ! اگر اللہ کے سوا کوئی دریا میں نجات نہیں دے سکتا تو بے شک خشکی میں بھی اللہ کا غیر

نجات نہ دے گا، اے اللہ! میرا تجھ سے عہد ہے کہ اگر میں اس مصیبت سے بچ کر نکلا تو میں البتہ جاؤں گا اور اپنا ہاتھ محمد ﷺ کے ہاتھ میں رکھ دوں گا، پھر البتہ میں اس کو رؤف و رحیم پاؤں گا۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ بہت سے اہلِ عربیت وتفسیر اور علمائے اصول اس لام کو لامِ عاقبت کہتے ہیں، اس لیے کہ کفار نے اس کا قصد نہیں کیا تھا۔ بلاشک یہ لام بہ نسبت کفار کے ایسا ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ اللہ پاک نے جو ان پر مقدر کیا تھا اور ان کو اس کے لیے مقرر ومعین فرمایا تھا تو اس کی نسبت کر کے لام تعلیل کا ہے۔ ﴿ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ﴾ [القصص: ٨] کی تفسیر میں ہم اس کی تقریر پہلے کر آئے ہیں۔

حرم مقامِ امن:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ﴾ اللہ پاک قریش پر اس بات کا احسان رکھتا ہے کہ اس نے ان کو اپنے حرم محترم میں اتارا اور بسایا۔ وہ حرم جس کو اس نے لوگوں کے لیے ایسا ٹھہرایا کہ اس میں عاکف، قیام پذیر اور مسافر دونوں برابر ہیں اور جو کوئی اس میں داخل ہو تو امن میں ہو جائے۔ چنانچہ وہ لوگ بڑے امن میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کے آس پاس بعض بدو بعض کو لوٹتے اور مارتے ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴾ [القریش: ١۔ ٤] ''قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے۔ (یعنی) ان کے سردی اور گرمی کے سفر سے مانوس ہونے کی وجہ سے۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور اُنھیں خوف سے امن دیا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کیا پھر اس نعمتِ عظیم پر ان کا شکریہ ہوا کہ انھوں نے اللہ پاک کے ساتھ شرک کیا اور اس کے ساتھ بتوں اور شریکوں اور غیر اللہ کو پوجا اور اللہ کی نعمت کو کفر سے بدلا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتارا، اللہ کے نبی اور بندہ اور رسول کا انکار کیا۔ ان کو تو یہ لائق تھا کہ خالص اللہ کے لیے عبادت کرتے اور اس کے ساتھ شرک نہ کرتے اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور تعظیم اور عزت کرتے، چنانچہ جو کام کرنے چاہیے تھے وہ تو نہ کیے، بلکہ اس کے رسول مکرم ومعظم کو اپنے درمیان سے نکال دیا، اس لیے اللہ پاک نے ان پر جو انعام کیا تھا وہ ان سے سلب کر لیا اور جنگِ بدر میں ان میں سے جو لوگ مارے گئے وہ مارے گئے، پھر اللہ پاک کے لیے اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے غلبہ ہو گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو اپنے رسول ﷺ پر فتح کر دیا اور ان کی ناکوں کو خاک میں آلودہ کر دیا اور ان کی گردنوں کو ذلیل کیا۔[1] فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ.

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٥٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ دنیا کی یہ زندگی اس شے کی جنس سے ہے جس کے ساتھ بچے لہو ولعب کرتے ہیں۔ رہیں قربتیں (عبادتیں) جیسے نماز، روزہ، حج، استغفار اور تسبیح وغیرہ تو یہ امورِ آخرت سے ہیں، کیوں کہ ان کا ثمرہ اسی میں ظاہر ہوگا۔ لہو: دنیا کی لذتوں سے نفع لینے کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس شے میں مشغول رہنا ہے جو فائدہ نہ دے، یعنی ''مَا لَا يَعْنِيهِ وَمَا لَا يُهِمُّهُ'' اور لعب بہ معنی عبث ہے، یعنی بے فائدہ کام۔ کسی نے کہا ہے کہ لہو حق سے بالکل اعراض کرنا، یعنی منہ موڑنا ہے اور لعب باطل کی طرف متوجہ ہونا ہے۔[1] (قاله الرازي)

اس آیتِ کریمہ میں دنیا کا صغیر اور حقیر ظاہر کرنا اور اس کو ذلیل کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا اپنے اہل سے جلد زائل ہو جانا اور ان کا اس میں لوٹ پوٹ ہونا اور اس سے ان کا مر جانا ایسا ہے، جیسا کہ بچے گھڑی بھر کے لیے کھیلتے ہیں، پھر چلے جاتے ہیں اور دارِ آخرت البتہ وہی زندگی دائم و قائم و خالد ہے کہ جس میں موت نہیں ہے۔ امام ابوعبیدہ اور ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''حیوان'' بہ معنی حیات ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول ہے سارے مفسروں کا، وہ سارے اس طرف گئے ہیں کہ اس جگہ ''حیوان'' کے معنی حیات ہیں اور وہ مصدر ہے بہ منزلہ حیات کے، پس مثل نزوان وغلیان (جوش مارنا) کے ہوگا۔[2] حیوان کا واو مقلوب ہے یاء سے سیبویہ اور اس کے اتباع کے نزدیک، اور کہا ہے کہ وہ شذوذاً بدلا گیا ہے اور اسی طرح حیات میں بصورتِ علم۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: تاکہ تثنیہ سے ملتبس نہ ہو، یعنی اگر ''حییان'' کہا جائے اور الف سے نہ بدلا گیا، اس کے ماقبل کے تحرک و انفتاح کے سبب سے تاکہ دو الفوں میں سے ایک الف حذف نہ کیا جائے۔[3] اور غیر سیبویہ نے اس کو اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے، چنانچہ اس کے نزدیک لام ''حیاۃ'' کا واو ہے، حالاں کہ سیبویہ کے لیے ''حیی'' میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس لیے کہ جب واو کا ماقبل مکسور ہو گیا تو وہ یاء سے بدلا گیا، جیسے: ''رعی و عری و رضی''۔ غرضیکہ جب حیوان مصدر ٹھہرا تو تقدیر یہ ہوگی کہ ''لَهِيَ دَارُ الْحَيَوَانِ'' یا ''ذَاتُ الْحَيَوَانِ'' یعنی دارِ آخرت البتہ دار ہے حیات کا، یا دار ہے صاحبِ حیات باقیہ کا جو نہ زائل ہوگی نہ اسے موت و مرض منغص کرے گا اور نہ ہم و غم۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ دار کے اول مضاف مقدر ہے: ''أَيْ: حَيَاةُ الدَّارِ الْآخِرَةِ لَهِيَ الْحَيَوَانُ''[4] یعنی زندگی دارِ آخرت کی البتہ وہی زندگی باقی ہے۔ یہ تقدیر اس لیے کی ہے کہ مبتدا و خبر باہم مطابق ہو جائیں اور مبالغہ احسن ہے۔ یعنی خود دارِ آخرت حیاتِ باقی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حیوان سے مراد باقی ہے۔[5] ابو جعفر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا عَجَبًا كُلَّ الْعَجَبِ مِنْ مُصَدِّقٍ بِدَارِ الْحَيَوَانِ وَهُوَ يَسْعَى

---

[1] تفسير الرازي (٢٥/ ٨٠) [2] فتح القدير (٤/ ٢٧٨) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٣٥)

[4] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٣٥) [5] تفسير الطبري (٢٠/ ٦٠)

لِدَارِ الْغُرُوْرِ﴾[1] (أخرجه ابن أبي الدنيا و البيهقي في الشعب و هو مرسل)۔ یعنی بڑا تعجب ہے اس شخص سے جو تصدیق کرنے والا ہے دارِ حیوان کی، حال یہ ہے کہ وہ سعی کر رہا ہے دارِ غرور کے لیے۔

﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اگر وہ اس بات کو جانتے کہ حیاتِ آخرت ہی حیات ہے، یا جانتے کسی شے کو علم سے تو البتہ وہ پچھلے گھر کو چھوڑ کر فانی اور منغص گھر کو اختیار نہ کرتے۔ پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ ان کو ایمان لانے سے کوئی مانع نہیں ہے، مگر صرف ان کا حیاتِ فانی کو اختیار کرنا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی جس وقت ان کی امید زندگی سے منقطع ہو جاتی ہے اور ڈوبنے سے ڈرتے ہیں تو فطرت کی طرف رجوع کرتے ہیں، اکیلے اللہ کو اس طرح پکارتے ہیں کہ اپنی نیتوں کے صدق کے ساتھ اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس وقت بتوں کو پکارنا اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ یہ جو بڑی شدت اور سختی ان پر آ پڑی ہے، اس کو اللہ پاک کے سوا کوئی دور نہ کرے گا۔

''رُكُوْبٌ'' بہ معنی ''اِسْتِعْلَاء'' ہے یہ خود متعدی ہوتا ہے، یہاں جو اس کو کلمۂ ''في'' کے ساتھ متعدی کیا ہے تو یہ بات بتانے کے لیے کہ مرکوب فی نفسہٖ قبیل امکنہ سے ہے۔ غرضیکہ پھر جب اللہ پاک ان کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے اور وہ امن میں ہو جاتے ہیں تو ناگاہ شرک کی طرف لوٹتے ہیں اور غیر اللہ کو پکارنے لگتے ہیں اور جس عزا اور دشمنی پر وہ جمے ہوئے تھے، اسی کی طرف پھر لوٹ جاتے ہیں۔ کسی نے کہا: جاہلیت والے جس وقت دریا پر سوار ہوتے تو بتوں کو اٹھا لے جاتے، پھر جب ہوا سخت چلتی تو ان کو دریا میں ڈال دیتے اور کہنے لگتے: یا رب! یا رب!

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اسی وقت شریک کرنے لگیں اللہ کے ساتھ تاکہ بچا لانے کی نعمت کی ناشکری کریں اور اس کا انکار کریں اور تاکہ نفع لیں اور اللہ کی نعمت کو برتیں۔ چنانچہ حرفِ لام دونوں فعلوں میں لام ''کَيْ'' کے لیے ہے۔ اس قول میں کچھ نقص ہے، اس لیے کہ شرک کرنے پر قصدِ کفر ان کو باعث نہیں ہوا ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ لام عاقبت و مآل کا لام ہے، مطلب یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے کفر کا قصد نہیں کیا، مگر نجات کی نعمت کا انجام یہ ہوا کہ نجات کے بعد شکر کرنے کے بجائے کفر اور شرک کرنے لگے، چنانچہ شہاب نے اس کے معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ دونوں لامِ امر ہیں ڈرانے اور دھمکانے کے لیے، یعنی ناشکری کرو اس نعمت کی، جو ہم نے تم کو عطا کی اور نفع لو اس سے، اس معنی پر سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت دال ہے۔

[1] ذم الدنیا لابن أبي الدنیا (١/ ١٩) شعب الإیمان (٧/ ٣٤٨) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''ابو جعفر عبداللہ بن مسور ہاشمی'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ١٠٧٨)

"وتمتعوا" یہ دو امر کا احتمال رکھتا ہے کہ لام بہ معنی "کَي" ہے، یا لامِ امر ہے۔ امام ابو عمرو، ابن عامر، عاصم اور ورش رحمہ اللہ کی قراءت پر ہے۔ انھوں نے دونوں فعلوں کو بکسرِ لام پڑھا ہے۔ رہی جمہور کی قراءت جو بہ سکونِ لام ہے، تو اس کی بنا پر بغیر اختلاف کے لام امر کا ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے، اچانک وہ شرک کی طرف لوٹ جاتے ہیں، تا کہ اس نعمت کا کفر کریں جو ہم نے ان کو دی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ لام "کَيْ" ہے اور اسی طرح ﴿ وَلِيَتَمَتَّعُوا ﴾ میں اس شخص کے قول میں جس نے بکسرِ لام پڑھا ہے۔ "أَيْ: لِيَكْفُرُوا وَكَيْ يَتَمَتَّعُوا" معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرک کی طرف لوٹ جاتے ہیں، تا کہ اپنے شرک کی طرف عود کرنے کے سبب سے ناشکری کرنے والے بن جائیں نجات کی نعمت پر اور اس نعمت سے فائدہ حاصل کرنے کا قصد کرنے والے اور اس سے لذت حاصل کرنے والے ہو جائیں۔ یہ مومنین کی عادت کے خلاف ہے، جو واقعی مخلص ہیں، کیوں کہ وہ اللہ کی اس نعمت کا جب وہ ان کو نجات دیتا ہے شکر کرتے ہیں۔ اور نجات کی نعمت کو زیادہ اطاعت کرنے کا ذریعہ ٹھہراتے ہیں نہ کہ اس کو صرف لذت اور فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ اس بنیاد پر ﴿ يُشْرِكُوْنَ ﴾ پر وقف نہیں ہے۔ اور جس شخص نے امام ابن کثیر، حمزہ اور علی رحمہ اللہ کی قراءت "وَلْيَتَمَتَّعُوا" بہ سکون لام سے تمسک کر کے اس کو لامِ امر قرار دیا ہے بر طریق تہدید کے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل: ﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ [الكهف: ٢٩] "پھر جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔" تو وہ ﴿ يُشْرِكُوْنَ ﴾ پر وقف کرتا ہے۔ اس کی تحقیق اصولِ فقہ میں ہے۔[3]

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: تا کہ انکار کریں اللہ کی نعمت کا اس بات میں کہ اس نے ان کی دعا قبول کی۔ اس کے معنی تہدید و وعید ہیں۔ ﴿ وَلِيَتَمَتَّعُوا ﴾ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے واسطے کوئی فائدہ نہیں ہے شرک کرنے میں مگر اس شے کے ساتھ فائدہ لینا جس شے سے فائدہ لیتے ہیں عاجلہ میں، یعنی دنیا میں۔ ان کے واسطے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔[4] قولہ تعالیٰ ﴿ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی عن قریب جان لیں گے اس کے انجام کار کو اور جو وبال اس میں ان پر ہوگا اس میں ان کے لیے ایک تہدیدِ عظیم ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا ..... الآية ﴾ کا یہ مطلب ہے کیا نہیں دیکھا کفارِ قریش نے کہ ہم نے ان کے اس حرم کو، یعنی شہرِ مکہ کو ایک حرم اور امن دینے والا کر دیا ہے جس میں اس کا رہنے بسنے والا قتل و غارت گری اور قید سے بے خوف رہتا ہے۔ ان کے سوا اور عرب لوگ جس بلا میں مبتلا ہیں اس سے یہ لوگ سلامتی اور عافیت میں ہو گئے ہیں، کیونکہ ان کی تو ہر وقت یہ حالت ہے کہ رات کو ان پر لوٹیں پڑتی ہیں۔ غازی لوگ ان کے مالوں کو ستیاناس کرتے ہیں، لشکر آ کر ان کے خون بہاتے ہیں، عرب کے شریر و بدمعاش لوگ آ کر ان کی عورتوں کو اور مالوں کو مباح کر لیتے ہیں۔

[1] فتح القدير (٤/ ٢٧٨۔ ٢٧٩) [2] تفسير النسفي (٣/ ٢٦٥)
[3] تفسير النسفي (٣/ ٢٦٥) [4] تفسير الخازن (٥/ ٢٠٠)

جملہ ﴿ وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ﴾ حالیہ ہے۔ "خطف" سرعت سے لینے کو کہتے ہیں، اس کے معنی کی تحقیق سورۃ القصص میں گزر چکی ہے۔[1] یعنی حال یہ ہے کہ ان کے گرداگرد کے لوگ قتل و غارت گری اور قید سے اُچک لیے جاتے ہیں اور یہ لوگ کیسے عافیت سے بے خوف زندگی بسر کر رہے ہیں، اللہ پاک کا یہ کتنا بڑا انعام اور فضل ہے۔ ﴿ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴾ یعنی پھر کیا شرک اور بتوں اور شیطان پر ایمان لاتے ہیں، اس کے بعد کہ اللہ کی حجت ان پر غالب ہوگئی اور جو شے توحید کی موجب ہے اس کا اقرار کر چکے اور اللہ کا احسان نہیں مانتے، یعنی نبی اکرم ﷺ کو اور اسلام کو نہیں مانتے اور اس نعمت کا شکر کرنے کے بجائے اس کی ناشکری کرتے ہیں۔ اس استفہام میں جو ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی ہے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔[2] پھر اللہ پاک نے فرمایا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝۶۸ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۶۹

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا، یا جب حق اس کے پاس آیا تو اس نے اسے جھٹلا دیا؟ کیا (ایسے) کافروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے؟ (68) اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں، ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھاتے ہیں اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے (69)

اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے اور اس کی سزا کا بیان:

اپنی راہیں دکھا دیں گے، یعنی اللہ کے قرب کی اور رضا کی راہیں، جو کہ بہشت ہے۔ انتہیٰ۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ سخت عذاب میں اور کوئی نہیں ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور یوں کہے کہ اللہ نے میری طرف وحی کی، حالاں کہ اس کی طرف کوئی شے وحی نہیں کی گئی اور وہ شخص جو کہے کہ میں نازل کروں گا اس کے مثل جو اللہ نے اتارا، اور اسی طرح اس شخص سے زیادہ سخت سزا میں کوئی نہیں ہے جو سچی بات کو جھٹلائے جب وہ اس کے پاس آئے۔ چنانچہ پہلا تو مفتری ہے اور دوسرا جھٹلانے والا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾

معرفتِ الٰہی کی جستجو کرنے والوں کی راہنمائی کا بیان:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا ﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم اور

[1] رقم الآیة (۵۷) [2] فتح البیان (۱۰/ ۲۱۶۔ ۲۱۸)

روزِ قیامت تک آنے والے ان کے متبعین۔ ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ "أي: لَنُبْصِرَنَّهُمْ طُرُقَنَا" یعنی البتہ ہم ان کو دنیا اور آخرت میں اپنی راہیں سمجھا دیں گے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا: حدیث کی ہم کو میرے باپ نے، کہا: حدیث کی ہم کو احمد بن ابی الحواری نے، کہا: خبر دی ہم کو عباس ہمدانی ابو احمد نے، جو اہلِ عکا سے تھا، قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ کی تفسیر میں کہا: "اَلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَا يَعْلَمُوْنَ يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ" یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو عمل کرتے ہیں اس پر جس کو جانتے ہیں، یعنی عالم با عمل ہیں، اللہ ان کو وہ شے بتا دیتا ہے جو وہ نہیں جانتے۔ غرض یہ ہے کہ علم پر عمل کرنے کا ایک ثمرہ یہ ہے کہ جو بات معلوم نہیں ہوتی اللہ وہ بتا دیتا ہے۔

احمد بن ابو الحواری فرماتے ہیں: میں نے یہ بات ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ سے بیان کی تو ان کو پسند آئی اور فرمایا کہ جس شخص کو کوئی خیر کی شے الہام کی جائے تو اسے لائق نہیں ہے کہ اس پر عمل کرے، یہاں تک کہ اس کو اثر میں سنے، پھر جب اس کو اثر میں سن لے تو اس پر عمل کرے اور اللہ کی حمد کرے، یہاں تک کہ وہ اس شے کے موافق ہوا جو اس کے دل میں آئی ہے۔[1] انتھیٰ.

یہاں سے اولیائے کرام کی احتیاط کو دیکھنا چاہیے کہ کس قدر اتباعِ سنت کا لحاظ اور پاس ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار کا خیال ہے کہ باوجود خیالات کے پاک صاف ہونے اور دلوں کے منور ہونے کے اگر نیک بات کا الہام ہو، پھر بھی اس پر عمل نہ کریں، یہاں تک کہ اس کو آثارِ صحابہ کے میزان میں تول نہ لیں۔ سبحان اللّٰہ۔ اللہ پاک کے دوست ایسے ہی ہوتے ہیں۔ رحمهم الله أجمعين.

قولہ تعالیٰ: ﴿وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا ہے: احسان تو یہی ہے کہ تو اس شخص پر احسان کرے جس نے تجھ سے برائی کی ہے، احسان یہ نہیں ہے کہ تو اس شخص سے احسان کرے جس نے تجھ سے بھلائی کی ہے۔[2] والله أعلم. آخر تفسير سورة العنكبوت و لله الحمد والمنة.

اگر مردی أَحْسِنْ إِلٰى مَنْ أَسَاءَ

"اگر تو مرد ہے تو جس نے تیرے ساتھ برائی کی ہے تو اس کے ساتھ اچھائی کر۔" حقیقت میں یہ کام کسی ایسے ویسے کا نہیں ہے، یہ بڑے تیس مار خان کا کام ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اس شخص سے بڑا کوئی اور ظالم نہیں ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔ یہ وہ شخص

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٨٤)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٨٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٥٤۔ ٥٥٥)

ہے جو یہ زعم کرتا ہے کہ اللہ پاک کا کوئی شریک ہے، یا حق کو جھٹلائے جب اس کے پاس آئے، یعنی اس رسول کی تکذیب کرے جو اس کے پاس بھیجا گیا ہے، یا اس کتاب کی جس کو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: حق سے مراد توحید ہے۔[1] ظاہر شمول حق کا اس شے کو ہے جس پر یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ حق ہے۔

پھر اللہ پاک نے مکذبین کو تہدید کی اور یہ وعید سنائی: ﴿ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَٰفِرِينَ ﴾ اس سے مراد قرار پکڑنے والی جگہ ہے۔ اور ہمزہ انکار کا ہے، معنی یہ ہیں کہ کیا کافر جہنم میں قرار پذیر ہونے کے مستحق نہیں ہیں، حالاں کہ کیا جو کچھ کیا۔ یا یہ معنی ہیں کہ کیا صحیح نہیں ہوئی ان کے نزدیک یہ بات کہ جہنم ان کی قرار گاہ ہے، جبکہ انھوں نے ایسی جرأت کی، یعنی بے شک کافروں کے لیے جہنم میں استقرار کی جگہ ہے۔ یا ان کے نزدیک یہ بات ثابت ہو چکی کہ جہنم ان کی قرار گاہ ہے۔ اس معنی کی بنا اس پر ہے کہ جب ہمزۂ انکار نفی پر داخل ہوتا ہے تو وہ اثبات کی نفی ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ اثبات معنی تقریر کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے مشرکوں کے حال کا ذکر کیا جو توحید کے منکر اور اللہ کی نعمتوں کا کفر کرنے والے ہیں تو اس کے بعد اپنے صالح بندوں کا ذکر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِينَ جَٰهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ مفاعلہ کا صیغہ مبالغہ پر دال ہے، یعنی جن لوگوں نے واقعی اپنی پوری قوت کے ساتھ جہاد کیا اور اللہ پاک کی شان میں اس کی رضا کے طلب کرنے کے لیے پوری کوشش اور سعی کی اور اس خیر کی جو اس کے پاس ہے امید رکھی۔ اور اپنی جدوجہد کو خالص کیا اسی ذات پاک کے لیے اس کا لحاظ اور مراقبہ (خاص اس کی ذات میں مگن رہتے ہوئے) اور اطاعت کے تمام لوازمات کو بجا لاتے ہوئے، یعنی جس چیز کے ساتھ کافروں کے ساتھ جہاد کرنا ضروری ہے، یعنی زبان اور عمل کے ساتھ اس کو اللہ کے لیے خاص کرتے ہوئے اس کے راستے میں سختیوں اور تکالیف کو برداشت کیا اور فتنوں کے اور تکالیف کے زور کرنے کے وقت اپنی خواہشات پر قابو رکھا اور ہر وقت اللہ پاک کی بزرگی اور عظمت کو اپنے سامنے رکھا تو ان سب کا ثمرہ یعنی پھل یہی ہے کہ اللہ ان کو اپنی راہیں بتائے گا، یعنی چلنے کی ایسی راہیں جو اس کی طرف پہنچا دیں گی۔

"سبل" سے مراد سیدھا راستہ ہے اور سیدھا راستہ وہ ہے جو اللہ عزوجل کی رضا کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ البتہ ہم ان کو خیر کی راہوں کی طرف ہدایت زیادہ کریں گے اور ان کو توفیق زیادہ دیں گے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور جہاد عرفی کے فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ یہ تو اللہ کے دین میں ایک عام جہاد ہے اور اس کی رضا کو طلب کرنے کے لیے جدوجہد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت عبّاد

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٦٤)

کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ (یہ قول حسن بن ابی الحسن رحمہ اللہ کا ہے۔) امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اختلاف کریں تو تم اس شے پر نظر کرو جس پر اہلِ ثغور ہیں، یعنی سرحد کے لوگ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جنھوں نے ہماری اطاعت میں مجاہدہ کیا تو ہم ان کو اپنے ثواب کی راہیں بتائیں گے۔ (یہی قول سہل بن عبداللہ سے بھی مروی ہے۔) کسی نے کہا ہے کہ مجاہدۂ طاعات پر صبر کرنا، یعنی ثابت قدم رہنا ہے اور خواہشات کی مخالفت کرتے رہنا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: جہادِ مخالفت ہے۔ سفیان بن عیینہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ سنت کی مثال دنیا میں عقبیٰ میں جنت کی مثال ہے، جو شخص آخرت میں جنت میں داخل ہوا تو وہ سلامت رہا۔ اسی طرح جس نے دنیا میں سنت کو لازم پکڑا تو وہ سالم رہا۔ امام ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ آیت ان لوگوں کے حق میں ہے جو اس شے پر عمل کرتے ہیں جس کا علم رکھتے ہیں۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، جو شخص اس شے پر عمل کرے جس کو وہ جانتا ہے تو اللہ اس کو وہ شے سکھائے گا جو وہ نہیں جانتا۔

امام عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم کو جو بعض چیزوں کا علم نہیں ہے تو وہ اس لیے کہ جن چیزوں کا ہمیں علم ہے ہم نے ان پر عمل کرنے میں کمی کی ہے، اور جو ہم نے جانا ہے اگر ہم اس کے بعض پر عمل کرتے تو یہ عمل کرنا ہم کو ایسے علم کا وارث کرتا جس کے ساتھ ہمارے بدن قیام نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ﴾ [البقرة: ٢٨٢] ''اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تمھیں (یہ احکام) سکھاتا ہے۔'' فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت زیرِ باب کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے علم کو طلب کرنے میں مجاہدہ کیا تو البتہ ہم بتا دیں گے ان کو علم کی راہیں اور ان پر عمل کرنے کی راہیں۔[1] ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں: جنھوں نے مجاہدہ کیا اس شے میں جس کو جانا تو البتہ ہم ہدایت کریں گے اس شے کی طرف جس کو انھوں نے نہ جانا۔ امام جنید رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جنھوں نے مجاہدہ کیا توبہ میں تو البتہ ہم ان کو اخلاص کی راہیں بتائیں گے، یا جنھوں نے ہماری خدمت میں مجاہدہ کیا تو ہم ان کے لیے ہمارے ساتھ مناجات اور انس کی راہیں کھولیں گے۔ امام ابن عطاء رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جنھوں نے مجاہدہ کیا ہماری رضا میں تو البتہ ہم انھیں محلِ رضوان میں پہنچنے کی راہ بتائیں گے۔[2]

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جنھوں نے سنت کو قائم کرنے اور بدعت کو ختم کرنے کے لیے مجاہدہ کیا تو ہم ان کو جنت کی راہیں بتائیں گے۔[3] امام دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں جہاد صرف کافروں کے ساتھ جنگ کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ وہ دین کی مدد کرنا ہے، اور مبطلین کا رد کرنا اور ظالموں کا قلع قمع کرنا ہے۔ ان سب جہادوں

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٦٤۔ ٣٦٥) تفسير البغوي (٦/ ٢٥٦) [2] تفسير النسفي (٣/ ٢٦٦) [3] تفسير البغوي (٦/ ٢٥٦)

سے بڑا جہاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، اور اسی سے اللہ پاک کی اطاعت میں نفوس کا مجاہدہ ہے۔[1] غرضیکہ آیتِ کریمہ کا ظاہر عام ہے، اس کے تحت یہ سب اقوال داخل ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجاہدہ کو مطلق ذکر کیا، کسی مفعول سے اس کو مقید نہیں فرمایا، تا کہ وہ ہر شے کو شامل ہو جائے جس کا مجاہدہ واجب ہے، یعنی نفس و شیطان اور دین کے دشمن۔[2]

﴿ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی بے شک البتہ اللہ نیکوں کے ساتھ ہے، اس طرح سے کہ دنیا میں تو ان کی مدد کرتا ہے اور آخرت میں ان کی مغفرت فرمائے گا، اور آخرت میں ان کا ثواب جنت ہے، اور جس شخص کے ساتھ اللہ ہو تو وہ کبھی ذلیل وخوار نہیں ہوگا۔ یہ جگہ ضمیر کی تھی، "لَمَعَهُمْ" کہنا کافی تھا، لیکن احسان کے وصف کے ساتھ اس کا شرف ظاہر کرنے کے لیے اسم ظاہر کو مضمر کی جگہ قائم کیا۔ کلمۂ "مَعَ" میں دو قول ہیں: کسی نے کہا ہے کہ اسم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرف ہے، چنانچہ قولِ اول کی بنا پر اس پر لام کا داخل ہونا ظاہر ہے، لامِ تاکید صرف اسم پر داخل ہوتا ہے۔ قولِ ثانی کی بنیاد پر بھی اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ اس میں استقرار کے معنی ہیں جس طرح "إِنَّ زَيْدًا لَفِيْ الدَّارِ" میں ہے۔ "مَعَ" کا حرفِ عین جب ساکن ہو تو وہ حرف ہے فقط، اور جب مفتوح ہو تو اسم و حرف ہونا دونوں جائز ہے۔ اکثر یہ ہے کہ "مَعَ" حرف ہے، معنی کے واسطے آیا ہے۔[3] (كذا في القرطبي) اس کی بحث علمِ نحو میں بیان کی گئی ہے۔[4] والله سبحانه أعلم.

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہ یہ تفسیر مبارک روز پنج شنبہ وقت ظہر بستم ماہ شوال ۱۳۱۱ ہجری کو محلّہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ الٰہی سیدی مولای تیرے فضل اور توفیق سے دین و دنیا کے سارے کام انجام کو پہنچتے ہیں۔ جیسے تو نے اپنے فضل و کرم سے یہ پوری کر دی، ویسے ہی باقی کے لکھنے کی توفیق دے اور اس کو قبول فرما اور اپنی ذات پاک کے واسطے ٹھہرا اور مجھ کو اور سب کو اس سے نفع پہنچا اور دل کے وسوسوں اور شتاتِ امر سے بچا اور اپنے ذکر و فکر کی توفیق عطا فرما اور اعمالِ صالح کو ملکۂ ذاتی کر اور ہر کام کا انجام نیک کر۔ الهم اغفرلنا وتب علينا يا أرحم الراحمين ويا خير المسئولين، وصلى الله علىٰ سيدنا ومولانا شفيع المذنبين، وآله وصحبه وأتباعه إلى يوم الدين، آمين آمين يا رب العالمين!

---

[1] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٦٤۔ ٣٦٥)
[2] تفسير النسفي (٣/ ٢٦٦)
[3] تفسير القرطبي (١٣/ ٣٦٥)
[4] فتح البيان (١٠/ ٢١٨۔ ٢٢٠)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الرُّوْمِ

اس سورت کی ساٹھ (٦٠) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ساری سورت بغیر اختلاف کے مکی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ سورۃ الروم مکے میں نازل ہوئی ہے۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل من طرق عنه)۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔[2]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: مگر قولہ تعالیٰ: ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴾[3] جب کہ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ایک شخص سے، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہے، مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صبح کی نماز پڑھائی تو اس میں سورۃ الروم پڑھی۔[4] (أخرجه عبد الرزاق وأحمد قال السيوطي بسند حسن) امام بزار رحمہ اللہ نے اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔[5] عبدالملک بن عمیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روزِ فجر کی نماز میں سورۃ الروم پڑھی۔[6] (أخرجه عبد الرزاق عن معمر عنه وأخرج ابن أبي شيبة في المصنف وأحمد وابن قانع من طريق عبد الملك بن عمير مثل حديث الرجل الذي من الصحابة وزاد فتردد فيها فلما انصرف، قال: إنما يلبس علينا في صلاتنا قوم يحضرون الصلاة بغير طهور، من شهد الصلاة فليحسن الطهور.)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ڛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا

[1] تفسير القرطبي (١٤/١) [2] الدر المنثور (٦/ ٤٧٨) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٣٢٦)

[4] مصنف عبد الرزاق (٢/ ١١٦) مسند أحمد (٣/ ٤٧١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ١/ ٥٥٠)

[5] كشف الأستار عن زوائد البزار (١/ ٢٣٤) [6] مصنف عبدالرزاق (٢/ ١١٧) مصنف ابن أبي شيبة (١/ ١٤)

يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَعْلَمُوْنَ ۝۶ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ
عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۷

الٓمّٓ ① رومی مغلوب ہو گئے ② قریب ترین سرزمین (شام و فلسطین) میں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد جلد غالب ہوں گے ③ چند برسوں میں، اقتدار و اختیار اللہ ہی کے لیے ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی، اور (غلبے والے) دن مومن بھی (اپنی فتح پر) خوش ہوں گے ④ اللہ کی مدد سے، وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے اور وہ نہایت غالب، بہت رحم کرنے والا ہے ⑤ (یہ) اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ⑥ وہ دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں، اور وہ آخرت سے تو بالکل ہی غافل ہیں ⑦

رومیوں کے غلبے کی پیش گوئی:

روم اور فارس کے بادشاہ عرب کی سرحد پر آپس میں لڑتے تھے عراق کی زمین کے بارے میں۔ مکے کے کافر چاہتے تھے کہ فارس جیتیں، مسلمان چاہتے کہ روم جیتیں۔ اہلِ کتاب کے لیے جھوٹی خبریں اڑتی تھیں۔ حق تعالیٰ نے نازل فرمایا کہ اب تو روم دب گئے پر کئی برس میں وہ غالب ہوں گے۔ دس برس سے کم مدت میں اسی طرح واقع ہوا۔ کئی برس بعد دونوں میں پھر مقابلہ ہوا تو روم غالب ہوئے اور یہ خبر عرب میں اس دن پہنچی، جس دن مسلمانوں کو جنگِ بدر میں فتح ہوئی اور اس کی خوشی تھی۔ اکثر لوگ نہیں جانتے، یعنی ظاہری اسباب کے بغیر اللہ پر بھروسا نہیں رکھتے۔ صرف دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں، یعنی ظاہری طور پر جس کا غلبہ دیکھیں کہیں کہ اللہ اسی سے خوش ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیتیں جب نازل ہوئیں اس وقت نیسابور فارس کا بادشاہ بلادِ شام پر غالب ہوا اور جو بلاد اور جزیرے اس سے متصل ہیں اور بلادِ روم کے آخری شہروں پر بھی غالب ہوا، اس نے ہرقل بادشاہِ روم کو مضطر کیا، یہاں تک کہ اس کو قسطنطنیہ کی طرف دھکیل دیا اور اس کو ایک مدت دراز تک اس میں محصور کر دیا۔ پھر ہرقل کو دوبارہ غلبہ حاصل ہوا، اس کا قصہ آگے آتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے بروایتِ سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ الٓمّٓ ۝۱ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝۲ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ ﴾ کی تفسیر میں کہا کہ "غُلِبَتْ" اور "غَلَبَتْ" ہے۔ فرمایا کہ مشرکین اس بات کو پسند کرتے تھے کہ فارس روم پر غالب ہوں، کیونکہ فارس بتوں والے تھے اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ فارس پر روم غالب ہوں، اس لیے کہ روم کتاب والے ہیں۔

پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس کا ذکر کیا گیا، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنتے ہو، بے شک وہ عن قریب غالب ہوں گے۔ پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر مشرکوں سے کیا تو وہ بولے کہ اپنے اور ہمارے درمیان ایک مدت مقرر کرو، پھر اگر ہم غالب ہوں تو ہمارے واسطے اتنا اتنا ہو اور اگر تم غالب ہو تو تمھارے لیے اتنا اتنا ہو۔ چنانچہ پانچ برس کی مدت مقرر کی تو وہ غالب نہ ہوئے۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے کیوں نہ کیا اس کو، راوی کہتا ہے، میں گمان کرتا ہوں کہ کہا: دس برس۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِضْعِ ﴾ دس سے کم کو کہتے۔ پھر اس کے بعد روم غالب ہو گئے۔ کہا: وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾[1] (هكذا رواه الترمذي و النسائي جميعا عن الحسين بن حريث عن معاوية بن عمرو عن أبي إسحاق الفزاري عن سفيان عن حبيب ورواه ابن أبي حاتم عن محمد بن إسحاق الصنعاني عن معاوية بن عمرو به ورواه ابن جرير حدثنا محمد بن المثنى حدثنا محمد بن سعيد أو سعيد الثعلبي الذي يقال له أبو سعد من أهل طرطوس، حدثنا أبو إسحاق الفزاري فذكره وعندهم قال سفيان: فبلغني أنهم غلبوا بعد يوم بدر)

حدیثِ دیگر:

سلیمان بن مہران اعمش نے عن مسلم عن مسروق روایت کیا ہے، کہا کہ عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: پانچ چیزیں گزر چکیں: دخان ولزام وبطشہ وقمر و روم۔[2] (أخرجاه) امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ فارس روم پر غالب تھے اور مشرکین دوست رکھتے تھے کہ فارس روم پر غالب ہوں اور مسلمان اس بات کو دوست رکھتے تھے کہ روم فارس پر غالب ہوں، اس لیے کہ وہ اہلِ کتاب ہیں اور ان کے دین کے قریب تر ہیں، پھر جب ﴿ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ ... الآية ﴾ نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا کہ تیرا صاحب کہتا ہے کہ روم فارس پر غالب ہوں گے کئی برسوں کے بعد۔ پھر انھوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مبایعت کی چار اونٹنیوں پر (اصل کا لفظ قلائص ہے، یہ قلوص کی جمع ہے۔ قلوص جوان اونٹنی کو کہتے ہیں) سات برس تک۔

پھر سات برس گزر گئے اور کچھ نہ ہوا تو مشرکین اس سے خوش ہوئے تو مسلمانوں پر یہ بات شاق گزری۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ بِضْعِ سِنِيْنَ ﴾ تمھارے نزدیک کیا ہیں؟ انھوں نے کہا کہ دس سے کم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو جا پھر ان سے باہم زیادہ کا معاملہ کر اور مدت میں دو برس بڑھا۔ کہا: پھر دو

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٩٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٦) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٨٦) تفسير الطبري (٢٠/ ٦٨) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٤٥) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٨)

برس نہیں گزرے، یہاں تک کہ رکبان (شتر سواروں کا قافلہ) فارس پر روم کے غلبے کی خبر لے کر آئے۔ پس مومنین اس سے خوش ہوئے اور اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ الٓمٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ③ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ④ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ⑤ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ﴾[1]

حدیثِ دیگر:

امام ابن ابی حاتم نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: جب ﴿ الٓمٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ ... الآیۃ ﴾ نازل ہوئی تو مشرکوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا تو اس شے کی طرف نہیں دیکھتا جو تیرا صاحب کہتا ہے، وہ زعم کرتا ہے کہ روم فارس پر غالب ہوں گے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میرے صاحب نے سچ کہا۔ وہ بولے: کیا تجھے حاجت ہے کہ ہم تجھ سے مخاطرہ کریں، یعنی باہم شرط لگائیں؟ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اور ان کے درمیان ایک مدت ٹھہرائی، پھر وہ مدت پوری ہوگئی اس سے قبل کہ روم فارس پر غالب ہوں۔ پھر یہ خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بری لگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مکروہ سمجھا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: « مَا دَعَاكَ إِلٰى هٰذَا؟ » یعنی یہ کام کرنے پر تجھے کون سی شے باعث ہوئی؟ عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے کے لیے۔ فرمایا: « تَعَرَّضْ لَهُمْ، وَأَعْظِمِ الْخَطَرَ، وَاجْعَلْهُ إِلٰى بِضْعِ سِنِيْنَ » یعنی تو ان سے تعرض کر اور شرط کو بڑھا اور ﴿ بِضْعِ سِنِيْنَ ﴾ تک ٹھہرا۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے تو ان سے کہا کہ کیا تم شرط کو دہرانے کے لیے تیار ہو، کیوں کہ عود احمد ہوتا ہے، یعنی رجوع کرنا ایک اچھا کام ہے؟ وہ بولے: ہاں، پھر دس برس نہیں گزرے تھے کہ روم فارس پر غالب ہو گئے اور اپنے گھوڑے مداین میں باندھ دیے اور رومیہ کی بنیاد رکھی۔ پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس شرط کو لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: "هٰذَا السُّحْتُ" یعنی یہ شرط ہے جو میں نے ان سے کی تھی اور میں غالب ہوا، فرمایا اس کو خیرات کر دے۔[2]

حدیثِ دیگر:

ابوعیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا نیار بن مکرم اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: جب ﴿ الٓمٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ ... الآیۃ ﴾ نازل ہوئی تو اس آیت کے نزول کے وقت فارس روم پر قاہر اور غالب تھے اور مسلمان چاہتے تھے کہ فارس پر روم کو غلبہ حاصل ہو، اس لیے کہ یہ اور وہ اہلِ کتاب ہیں۔ اور اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ④ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾ اور

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٧٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٨٦)

قریش چاہتے تھے کہ فارس کا غلبہ ہو، کیوں کہ یہ اور وہ نہ اہلِ کتاب ہیں اور نہ قیامت پر ایمان لانے والے ہیں۔

پھر جب اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ چلاتے ہوئے نکلے اور مکہ کے ارد گرد کے علاقے میں گئے، وہ آیت یہ ہے: ﴿ الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ... الآية ﴾ قریش کے کچھ لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ بات ہمارے اور تمھارے درمیان ہے، تیرے صاحب نے یہ زعم کیا ہے کہ روم عن قریب غالب ہوں گے فارس پر ﴿ بِضْعِ سِنِيْنَ ﴾ میں۔ کیا ہم تجھ سے اس پر مراہنہ کریں، یعنی شرط لگائیں؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ یہ قصہ رہان کے حرام ہونے سے پہلے کا ہے۔ رہان یہ ہے کہ دو آدمی آپس میں کسی بات پر شرط کریں اور کوئی شے دونوں اپنے پاس رہن رکھ لیں اور کہیں کہ اگر میں غالب ہوا تو تیری رہن رکھی ہوئی چیز میں لے لوں گا اور اگر تو غالب ہوا تو میری رہن رکھی ہوئی چیز تو لے لینا۔ واللّٰہ أعلم۔

چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور مشرکوں نے ارتھان کیا اور رہان رکھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا تو کتنی مدت ٹھہراتا ہے، تین برس سے نو برس تک؟ چنانچہ تو اس کے وسط کی مدت رکھ لے جو انتہائی ہو، پھر باہم انھوں نے چھے برس مقرر کیے۔ راوی نے کہا: پھر چھے برس گزر گئے اس سے پہلے کہ روم غالب ہوں تو مشرکوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رہن رکھی ہوئی چیز لے لی۔ پھر جب ساتویں برس میں داخل ہوئے تو روم فارس پر غالب ہو گئے۔ راوی نے کہا: پس مسلمانوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اس بات کا عیب لگایا کہ انھوں نے چھے برس کی مدت رکھی۔ کہا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: ﴿ بِضْعِ سِنِيْنَ ﴾ کہا: پھر اس وقت بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔[1] (هكذا ساقه الترمذي ثم قال: هذا حديث حسن صحيح لا نعرفه إلا من حديث عبد الرحمن بن أبي الزناد وقد روي نحو هذا مرسلا عن جماعة من التابعين مثل عكرمة و الشعبي و مجاهد و قتادة و السدي و الزهري وغيرهم)

ان سب سیاقات سے زیادہ غریب سیاق وہ ہے جس کو امام سنید بن داود نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ کہا: مجھ کو حدیث کی حجاج نے ابوبکر بن عبد اللہ سے، ابوبکر نے عکرمہ سے، عکرمہ نے کہا: فارس میں ایک عورت تھی، وہ نہیں جنتی تھی، مگر ملوکِ ابطال، یعنی بڑے بڑے بہادر بادشاہ جنتی تھی۔ چنانچہ کسریٰ نے اس کو بلایا، پھر کہا: میں چاہتا ہوں کہ روم کی طرف ایک لشکر بھیجوں اور اس پر تیرے بیٹوں میں سے ایک کو عامل و حاکم کر دوں۔ لہٰذا تو مجھے مشورہ دے کہ ان میں سے کس کو عامل کروں؟ تو وہ بولی کہ یہ جو ہے یہ روباہ (لومڑی) سے زیادہ تیز اور مکار ہے اور حذر و احتیاط میں صقر سے زیادہ ہے، اور یہ فرخان، یہ شخص بھالے کی بھال سے زیادہ نفوذ کرنے والا ہے، اور یہ شہر براز ہے

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٩٤) تفسیر الطبري (٢٠/ ٦٩۔ ٧٢)

اور یہ زیادہ حلیم اور دانش مند ہے۔ ''کذا'' سے اس کی مراد ان لوگوں میں سے اس کے تین بیٹے تھے۔ (ابن کثیر میں ''کذا'' بذالِ معجمہ ہے اور کامل میں ''أَحْلَمُ مِنْ كَدَى'' بدالِ مہملہ ہے۔ کدیہ سخت زمین کو کہتے ہیں، شاید یہ غرض ہو کہ یہ حلم میں پہاڑ سے بڑھا ہوا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: کوہِ حلم۔ واللہ أعلم) ۔ چنانچہ تو ان میں سے جس کو چاہے عامل بنا۔ کسریٰ بولا کہ میں نے تو حلیم کو عامل بنایا، چنانچہ شہر براز کو عامل بنایا۔ پھر وہ فارس والوں کو لے کر روم کی طرف چلا تو وہ ان پر غالب ہوا، پھر ان کو قتل کیا، ان کے شہروں کو اجاڑا، ان کے زیتون کو کاٹا۔ ابوبکر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے عطا خراسانی رحمہ اللہ سے یہ حدیث بیان کی تو وہ بولے: کیا تو نے بلادِ شام نہیں دیکھے؟ میں نے کہا: نہیں، کہا: خبردار بے شک اگر تو ان کو دیکھتا تو مدائن کو دیکھتا جو اُجڑا پڑا ہے (مدائن فارسیوں کا بڑا شہر ہے) اور زیتون کو جو کٹے پڑے ہیں۔ پھر میں اس کے بعد شام میں آیا تو میں نے اسے دیکھا۔

امام عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یحییٰ بن یعمر نے مجھے حدیث کی کہ قیصر نے ایک شخص کو بھیجا۔ چنانچہ اس کو ایک رومی لشکر کا سپہ سالار کرکے فارسیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا اور کسریٰ نے شہر براز کو بھیجا تو وہ دونوں اذرعات و بصریٰ میں ملے۔ یہ دونوں شہر تمھاری طرف شام کے ملک کے زیادہ قریب ہیں۔ چنانچہ فارس نے روم سے مقابلہ کیا تو فارس روم پر غالب ہوئے۔ کفارِ قریش تو اس سے خوش ہوئے اور مسلمانوں نے اس کو مکروہ سمجھا۔ امام عکرمہ نے کہا ہے کہ مشرکین نبی اکرم ﷺ کے اصحاب سے ملے اور کہا کہ تم اہلِ کتاب ہو اور نصاریٰ اہلِ کتاب ہیں اور ہم امی ہیں اور اہلِ فارس کے ہمارے بھائی تمھارے اہلِ کتاب بھائیوں پر غالب ہوئے اور بے شک تم اگر ہم سے لڑو گے تو البتہ ہم تم پر غالب ہوں گے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ ﴾ چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کفار کی طرف نکلے اور کہا: کیا تم اس بات پر خوش ہو رہے ہو کہ تمھارے بھائی ہمارے بھائیوں پر غالب ہوئے؟ تم خوش مت ہو، اللہ تمھاری آنکھوں کو ٹھنڈا نہیں کرے گا۔ اللہ کی قسم ہے! اہلِ روم فارس پر غالب ہوں گے، ہم کو ہمارے نبی اکرم ﷺ نے اس کی خبر دی ہے۔ ابی بن خلف ان کی طرف کھڑا ہوا تو کہا: اے ابوفضیل! تو نے جھوٹ کہا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: اے اللہ کے دشمن! تو بڑا جھوٹا ہے، تو وہ بولا: میں تجھ سے شرط کرتا ہوں دس اونٹنیاں تیری طرف سے اور دس میری طرف سے، پھر اگر روم فارس پر غالب ہو گئے تو مجھ پر تاوان اور اگر فارس غالب ہوئے تو تجھ پر تاوان تین برس تک۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ کو اس کی خبر دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے ایسا ذکر نہیں کیا تھا۔ ﴿ بِضْعِ ﴾ تو تین اور نو کے درمیان ہے، لہٰذا تو شرط میں سے زیادہ کر اور

مدت بھی اس سے بڑھوا۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نکلے تو اُبی سے ملے، وہ بولا: شاید تو نادم ہوا؟ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں آ شرط میں تجھ سے باہم زیادہ کروں اور مدت میں تجھ سے بڑھواؤں، چنانچہ تو اس کی سو اونٹنیاں کر دے اور مدت نو برس تک رکھ۔ اس نے کہا: میں نے کیں۔ پھر اس مدت سے پہلے روم فارس پر غالب ہو گئے۔ چنانچہ مسلمان مشرکوں پر غالب ہوئے۔

عکرمہ نے کہا: جب فارس روم پر غالب ہو گئے تو فرخان بیٹھا شراب پی رہا تھا، یہ شہر براز کا بھائی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے اصحاب سے کہا: البتہ مقرر میں نے دیکھا ہے، یعنی خواب میں دیکھا ہے، گویا میں کسریٰ کے تخت پر بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ خبر کسریٰ کو پہنچی تو اس نے شہر براز کو لکھا کہ جس وقت میرا خط تیرے پاس پہنچے تو تو فرخان کا سر میرے پاس بھیج۔ شہر براز نے اس کو جواب لکھا کہ مثل فرخان کا تو بے شک ہرگز نہ پائے گا۔ ''لَهُ نِكَايَةٌ وَصَوْتٌ فِي الْعَدُوِّ'' (کامل وغیرہ میں ''صولة'' ہے یعنی دبدبہ وحملہ)۔ یعنی اس کی تو دشمنوں میں بڑی زخم رسانی اور آواز ہے۔ غرض یہ ہے کہ بڑا بہادر آدمی ہے۔ دشمنوں کو خوب مارتا پیٹتا ہے، ڈانٹتا دھمکاتا ہے، چنانچہ ایسا کام مت کر۔

پھر کسریٰ نے لکھا کہ فارس کے مردوں میں جو اس جیسا ہے تو تو جلد اس کا سر میرے پاس بھیج دے۔ پھر شہر براز نے کسریٰ سے تکرار کی تو کسریٰ خفا ہو گیا، اس کو کچھ جواب نہ دیا اور اہلِ فارس کی طرف یہ کہہ کر قاصد بھیجا کہ شہر براز کو میں نے تم سے علاحدہ کیا اور فرخان کو تم پر عامل بنایا، پھر اس قاصد کی طرف ایک چھوٹا سا صحیفۂ لطیف روانہ کیا (یعنی ذرا سے پرچے پر یہ لکھ دیا کہ شہر براز کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دے) اور کہا کہ جس وقت فرخان ملک کا حاکم ہو جائے اور اس کا بھائی اس کا فرمانبردار اور مطیع ہو جائے تو اس کو یہ خط دے دینا۔

پھر جب شہر براز نے وہ خط پڑھا تو کہا کہ ''سَمْعًا وَّطَاعَةً''، یعنی میں نے بادشاہ کے حکم کو سنا اور مانا اور اپنے تختِ حکومت سے اتر پڑا اور فرخان اس پر بیٹھا اور وہ صحیفۂ لطیف جس میں شہر براز کے قتل کا لکھا تھا اس کو دیا۔ پھر جب اس کو پڑھا تو کہا کہ شہر براز کو میرے پاس حاضر کرو، غرضیکہ وہ حاضر ہوا اور اس کو آگے بڑھایا، تاکہ اس کی گردن ماری جائے تو شہر براز بولا: جلدی مت کر، یہاں تک کہ میں اپنی وصیت لکھ دوں۔ فرخان نے کہا: اچھا۔ پھر شہر براز نے جامہ دان منگایا اور فرخان کو وہ خطوط دیے اور کہا کہ یہ سب تیرے بارے میں میں نے کسریٰ سے تکرار کی اور تو نے ارادہ کیا کہ ایک خط کے سبب سے مجھے قتل کر دے، اس پر فرخان نے ملک اپنے بھائی شہر براز کو واپس کر دیا اور شہر براز نے قیصر بادشاہ روم کو یہ خط لکھا کہ مجھے تجھ سے ایک ایسی حاجت ہے کہ نہ اس کو قاصد اٹھا سکتے ہیں نہ خطوط۔ غرض یہ کہ ایک بات نہایت راز کی ہے، نہ قاصد کی زبانی کہنے کی ہے نہ خط میں لکھنے کے قابل ہے، لہٰذا تو مجھ سے مل اور مجھ سے پچاس رومیوں کے ساتھ مل، کیوں کہ میں بھی پچاس فارسیوں کے ساتھ تجھ سے ملوں گا۔

چنانچہ قیصر پانچ لاکھ رومیوں میں متوجہ ہوا اور اپنے آگے راہ میں جاسوس رکھنے لگا اور اس بات سے ڈرا کہ کہیں

اس کے ساتھ مکر یا فریب کیا گیا ہو، یہاں تک کہ اس کے جاسوس اس کے پاس یہ خبر لائے کہ شہر براز کے ساتھ صرف پچاس آدمی ہیں۔ پھر دونوں کے لیے فرش بچھایا گیا اور دیباج کا ایک خیمہ نصب کیا گیا، اس میں دونوں ملے، ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک چھری تھی، پھر اپنے درمیان میں ایک ترجمان کو بلایا۔ شہر براز نے کہا کہ وہ لوگ جنھوں نے تیرے مدائن کو خراب و ویران کیا (یعنی تیری مملکت کے ایک شہر کو، اس سے کسریٰ کا دارالسلطنت مراد نہیں) وہ میں اور میرا بھائی ہیں۔ ہمارے کید اور شجاعت سے یہ کام ہوا اور کسریٰ نے ہم پر حسد کیا اور چاہا کہ میں اپنے بھائی کو قتل کر ڈالوں، مگر میں نے اس سے انکار کیا، پھر میرے بھائی کو حکم دیا کہ مجھے مار ڈالے۔

"فَقَدْ حَلَقْنَا جَمِيْعًا" (اصل میں اسی طرح ہے حلق کے معنی مونڈنے کے ہیں اور حلق پر مارنے کے۔ یا "حَلَفْنَا" ہے، یعنی ہم دونوں نے قسم کھائی۔ یا "حَنِقْنَا" ہے۔ "حنق" کہتے ہیں خشم کو، یعنی ہم دونوں خفا ہوئے ہیں۔ یہ معنی زیادہ ترچسپاں ہیں۔ واللہ أعلم۔ تاریخ کامل میں "فَخَلَعْنَا" یعنی ہم نے اس کو معزول کر دیا۔ اسی طرح تفسیر خازن وغیرہ میں بھی ہے۔[1] صحیح یہی معلوم ہوتا ہے، یعنی ہم نے کسریٰ کو چھوڑ دیا اور اس کی اطاعت سے نکل گئے)۔ چنانچہ ہم تیرے ہمراہ اس سے لڑیں گے۔ قیصر نے کہا: "قَدْ أَصَبْتُمَا" یعنی یقیناً تم دونوں نے صحیح کہا۔ تمھاری رائے درست ہے۔ پھر ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا کہ بھید دو کے درمیان ہے، جب دو سے زیادہ لوگوں میں چلا جاتا ہے تو پھیل جاتا ہے۔ قیصر نے کہا: سچ ہے۔ پھر دونوں نے مل کر چھریوں سے اپنے ترجمان کو مار ڈالا۔ پھر اللہ پاک نے کسریٰ کو ہلاک کر دیا اور حدیبیہ کے دن رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ہمراہی مسلمان خوش ہوئے۔[2] یہ روایت ایک سیاقِ غریب اور بنائے عجیب ہے۔

اب چاہیے کہ ہم ان آیاتِ کریمات کے کلمات پر کلام کریں۔ چنانچہ قولہ تعالیٰ: ﴿ الٓمّٓ ۞ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴾ اوائلِ سور کے حروفِ مقطعات پر سورۃ البقرہ کے شروع میں کلام گزر چکا ہے۔ رہے روم، پس وہ عیص بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ یہ لوگ بنی اسرائیل کے برادرِ عم زاد ہیں۔ ان کو بنو الاصفر کہتے ہیں، یہ لوگ یونان کے دین پر تھے اور یونان یافث بن نوح کی نسل سے ہیں۔ ترک کے برادرِ عم زاد یہ لوگ سبعۂ سیارہ کو پوجا کرتے تھے اور ان کو متحیرہ کہتے ہیں اور قطب شمالی کی طرف نماز پڑھتے تھے اور انہیں لوگوں نے دمشق کی بنیاد رکھی اور اس کا معبد بنایا ہے، اس میں شمال کی سمت میں محرابیں ہیں۔ چنانچہ رومِ مسیح علیہ السلام کی بعثت کے تین سو برس بعد تک اپنے دین پر تھے اور جو شخص ان میں سے مع جزیرے کے شام کا مالک ہوتا تو اس کو قیصر کہتے تھے۔ جو شخص ملوکِ روم میں سے پہلے پہل دینِ نصاریٰ میں داخل ہوا، وہ قسطنطین بن قسطنطین ہے اور اس کی ماں مریم زمین حران سے ہیلانیہ غندقانیہ ہے۔ وہ اس سے پہلے نصرانی ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو اپنے دین کی طرف دعوت دی، اس سے پہلے وہ فیلسوف تھا، پھر اپنی ماں کا پیرو ہوا۔

---

[1] تفسير الخازن (٥/ ٢٠٣) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٦٩۔ ٧١)

"يُقَالُ: تَقِيَّةٌ"، یعنی کہتے ہیں کہ یہ پیروی بطور تقیہ تھی۔ قسطنطین کے پاس نصاریٰ جمع ہوئے اور اس کے وقت میں عبد اللہ بن اریوس کے ساتھ مناظرہ کیا اور اتنا زیادہ اختلاف منتشر کیا اور پھیلایا کہ وہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا تھا، مگر ان کی جماعت سے تین سو اٹھارہ اسقف (پادری) متفق ہوئے۔ پھر قسطنطین کے لیے عقیدہ تیار کیا، اس کا نام امانتِ کبیرہ رکھتے ہیں، حالانکہ وہ خیانتِ حقیرہ ہے اور اس کے لیے قوانین بنائے۔ ان کے قوانین سے مراد احکام کی کتابیں ہیں۔ حرام اور حلال وغیرہ جن کی طرف ان کو حاجت ہوتی ہے اور مسیح علیہ السلام کے دین کو بدل ڈالا۔ اس میں کچھ اضافہ کیا اور کچھ کم کیا۔ پھر مشرق کی طرف نماز پڑھی اور شنبہ کے بجائے یک شنبہ مقرر کیا اور صلیب کو پوجا اور سور کو حلال کیا اور عیدیں مقرر کیں، ان کو اپنی طرف سے نکالا، جیسے: عیدِ صلیب و قداس و عطاس وغیرہ بواعیث و شعانین اور اس کے واسطے باب ٹھہرایا، یہ شخص ان کا بڑا ہے۔ پھر تبارکہ، پھر مطارفہ، پھر اساقفہ و قساقسہ، پھر شمامسہ اور رہبانیت نکالی، بادشاہ نے ان کے لیے کنیسے اور عبادت گاہیں بنائیں اور شہر کی بنیاد رکھی، جو اس کی طرف منسوب ہے، یعنی قسطنطنیہ۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے وقت میں بارہ ہزار کنیسے بنائے اور تین محراب والا بیتِ لحم بنایا اور اس کی ماں نے قمامہ بنایا۔ لوگ ملکیہ ہیں، یعنی وہ لوگ جو بادشاہ کے دین پر ہیں، پھر ان کے بعد یعقوبیہ نکلے، یعقوب اسکاف کے پیروکار۔

پھر نسطوریہ، نسطور کے اصحاب۔ یہ لوگ بہت سے فرقے اور گروہ ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔[1] غرضیکہ روم نصرانیت پر جمے رہے، جب کبھی قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد دوسرا اس کا خلیفہ ہوا، یہاں تک کہ آخر ان کا ہرقل ہوا، یہ شخص لوگوں میں سب سے زیادہ عقل مند تھا اور سب بادشاہوں سے زیادہ محتاط اور دور اندیش اور سب سے زیادہ تیز اور کاردان اور سب سے زیادہ غور و فکر میں دور بین اور سب سے اچھی رائے رکھنے والا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ریاستِ عظیم اور ابہتِ کثیر میں ان پر بادشاہی کی۔

پھر فارس کے بادشاہ کسریٰ نے اس سے دشمنی کی اور بہت سے شہروں کا مالک ہو گیا جیسے عراق و خراسان و رے اور سارے بلادِ عجم۔ اس کا نام سابور ذوالاکتاف تھا۔ اس کی مملکت قیصر کی مملکت سے زیادہ وسیع تھی۔ اس کے لیے ریاست عجم کی اور حماقت فرس کی تھی۔ فارسی مجوس تھے، آگ کی پوجا کیا کرتے تھے۔ پہلے امام عکرمہ رحمہ اللہ کی روایت سے یہ گزر چکا ہے کہ کسریٰ نے اپنے نائب اور لشکر قیصر کی طرف بھیجے تھے تو وہ اس سے لڑے اور مشہور یہ ہے کہ خود کسریٰ نے اس کے بلاد میں اس پر چڑھائی کی تھی، پھر اس کو مقصور و مقہور و مکسور کیا، یعنی دھکیلا یہاں تک کہ سوائے قسطنطنیہ شہر کے اس کے پاس اور کچھ باقی نہ رہا۔ پھر اس کو ایک مدتِ دراز تک اس میں محصور کیا، یہاں تک کہ وہ اس پر تنگ ہو گیا اور نصاریٰ اس کی انتہائی تعظیم کرتے تھے اور کسریٰ شہر کو فتح نہ کر سکا اور نہ اس کو اس کی مضبوطی کی

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٩٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠٨٣)

وجہ سے فتح ممکن ہوئی، کیوں کہ اس شہر کا آدھا حصہ تو خشکی کی طرف ہے اور دوسرا نصف سمندر کے کنارے پر ہے۔ غلہ اور مدد ان کے پاس وہاں سے آتی تھی۔ پھر جب معاملہ طول پکڑتا گیا تو قیصر نے ایک منصوبہ بنایا اور اپنے دل میں ایک مکر سوچا۔ چنانچہ کسریٰ سے یہ مطالبہ کیا، وہ اس کے بلاد سے رک جائے اور جتنا مال چاہے وہ لے لے اور اس پر شرط کر لے۔

کسریٰ نے یہ بات مان لی اور قیصر سے اتنا زیادہ مال طلب کیا کہ دنیا کے بادشاہوں میں سے کوئی بھی اتنا مال دینے پر قادر نہیں ہوتا۔ اتنا سونا اور جواہر و اقمشہ و جواری و خدام اور مختلف قسموں کا مال۔ چنانچہ قیصر نے اس پر کسریٰ کی فرماں برداری کی اور اس کے وہم میں یہ بات ڈال دی کہ اس کی ساری مطلوبہ چیزیں اس کے پاس ہیں اور اس کی عقل کو کم سمجھا، جب کہ اس نے وہ چیزیں طلب کیں جو کچھ طلب کیں۔ اتنی چیزیں طلب کیں کہ اگر قیصر و کسریٰ دونوں جمع ہو کر مطلوبہ اشیاء اکٹھا کرنا شروع کریں تو بھی اس کا دسواں حصہ جمع کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ کسریٰ سے یہ درخواست کی کہ اسے بلادِ شام کی طرف نکلنے کی قدرت دے، تاکہ وہ اپنے اقالیم مملکت کی طرف جائے اور وہاں کے ذخائر اور خزانوں اور دفینوں سے وہ چیزیں حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

”فَأَطْلَقَ سَرَاحَهُ“ یعنی کسریٰ جو شہر میں اس کو محصور کیے ہوئے تھا اس نے قیصر کی راہ کھول دی۔ پھر جب قیصر نے قسطنطنیہ کے شہر سے نکلنے کا عزم کر لیا تو اپنے اہلِ ملت کو جمع کیا اور کہا کہ میں ایک کام میں نکلنے والا ہوں، جس کو میں پختہ کر چکا ہوں۔ میں اپنے لشکر میں سے منتخب لوگوں کا لشکر لے کر نکلوں گا، اگر میں سال سے پہلے تمھاری طرف واپس آ جاؤں تو میں تمھارا بادشاہ ہوں اور اگر اس سے پہلے تمھارے پاس لوٹ کر نہ آؤں تو تم کو اختیار حاصل ہے تم چاہو میری بیعت پر قائم رہو، چاہے کسی اور کو اپنا حاکم بنا لو۔ رومیوں نے اس کو یہ جواب دیا کہ تو تو ہمارا بادشاہ ہے جب تک تو زندہ رہے، اگرچہ تو دس برس تک غائب رہے، پھر جب قیصر قسطنطنیہ سے نکلا تو جریدہ نکلا ایک درمیانے درجے کے لشکر کے ساتھ۔ یہ تو قیصر کا قصہ ہوا۔

رہا کسریٰ تو وہ قسطنطنیہ پر خیمے قائم کیے رہا، قیصر کا انتظار کرتا رہا، تاکہ وہ لوٹ کر آئے۔ پھر قیصر سوار ہوا فی الفور اور جلدی کرتا ہوا چلا، یہاں تک کہ بلادِ فارس کی طرف پہنچا، پھر ان کے بلاد میں فساد مچاتا ان کے مردوں کو قتل کرتا اور جو لوگ لڑنے والے تھے، ان کو مارتا ہوا آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ مدائن کی طرف پہنچا، یہ شہر کسریٰ کی مملکت کا دارالسلطنت تھا۔ پھر جو لوگ اس میں تھے ان کو قتل کیا اور کسریٰ کے سارے حواصل اور اموال کو لے لیا۔ اس کی عورتوں اور حرم والیوں کو قید کر لیا، اس کی بیٹی کا سر مونڈ دیا اور گدھے پر سوار کیا، اس کی قوم کے اساورہ (کنگن) سے اس کے ساتھ انتہائی ذلت اور خواری کے ساتھ بھیجا اور کسریٰ کو لکھا کہ یہ وہ شے ہے جو تو نے طلب کی تھی، لہٰذا اس کو لے لے۔ پھر جب کسریٰ کو یہ خبر پہنچی تو اس کو اتنا غم ہوا جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔ اس کو قسطنطنیہ شہر پر غصہ سخت ہوا تو اس کے حصار میں ہر ممکن کوشش کی، مگر اس پر قادر نہ ہوا۔ پھر جب عاجز آ گیا تو سوار ہوا، تاکہ

جیحون کے مخاضہ سے راستہ پکڑے کہ قیصر کے لیے اس کے سوا قسطنطنیہ کی طرف آنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ (مخاضہ وہ پانی ہے جس سے پیدل اور سوار لوگ گزر سکیں)

جب قیصر کو اس کا علم ہوا تو اس نے ایک بڑا حیلہ کیا جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا، وہ حیلہ اور تدبیر یہ ہے کہ اس نے اپنا لشکر اور اپنے حواصل جو اس کے ساتھ تھے، ان سب کو مخاضہ کے منہ کے نزدیک تاک میں بٹھا دیا اور خود لشکر میں سوار ہوا اور حکم دیا تو گھاس اور گوبر اور مینگنیوں کے گٹھے اس کے ہمراہ لاد دیے گئے اور ایک دن کے قریب پانی میں اترتا ہوا چلا (اصل کے الفاظ "سَارَ إِلٰى قَرِيْبٍ مِنْ يَّوْمٍ فِي الْمَاءِ مُصْعِدًا" ہے۔ "إصعاد" بہ معنی برآمدن ہے۔ "أَصْعَدَ فِي الْأَرْضِ" بہ معنی "مَضَى وَسَارَ" ہے۔ "وَمَضَى فِي الْوَادِيْ" بہ معنی "اِنْحَدَرَ" ہے) پھر ان گٹھوں کو نہر میں ڈالنے کا حکم دیا۔ پھر جب ان گٹھوں نے کسریٰ اور اس کے لشکر پر گزر کیا تو اس نے خیال کیا کہ قیصر کے لوگ اس جگہ سے پانی میں گھسے ہیں پس کسریٰ اور اس کے لشکر والے قیصر والوں کو ڈھونڈنے اور پکڑنے کے لیے سوار ہوئے۔

لہٰذا مخاضہ فارسیوں سے خالی ہو گیا اور قیصر اپنے لوگوں کے پاس آیا اور ان کو اٹھنے اور پانی میں گھسنے کا حکم دیا، پس وہ گھس پڑے اور جلدی جلدی چلے تو کسریٰ سے اور اس کے لشکروں سے بچ گئے اور قسطنطنیہ میں داخل ہوئے اور کسریٰ اور اس کے لشکر حیرت سے دیکھتے رہ گئے، جانتے نہ تھے کہ کیا کریں۔ بلادِ قیصر کو تو حاصل نہ کیا اور ان کے بلاد کو روم نے خراب کر ڈالا اور ان کے حواصل کو لے لیا اور ان کے بچوں عورتوں کو قیدی بنا لیا، چنانچہ یہ فارس پر روم کا غالب ہونا ہے۔ (اصل کے الفاظ: "فعرفت المخاضة عن الفرس" بظاہر اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے، شاید یہ لفظ "ففرجت" ہو، اس بنا پر اس کے مطابق ترجمہ کیا۔ والله أعلم۔ اگر واقع میں یہ نہ ہو، اور کوئی لفظ ہو تو ناظر اس کے مطابق ترجمہ کر لے)۔

یہ قصہ فارس کے روم پر غالب ہونے کے نو برس بعد ہوا۔ جو واقعہ فارس و روم کے درمیان ہوا جبکہ روم مغلوب ہوئے تو وہ اذرعات اور بصریٰ کے درمیان ہوا تھا، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہما نے فرمایا ہے۔ یہ دونوں جگہ بلادِ شام کے کنارے ہیں جو بلادِ حجاز سے متصل ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ جزیرہ میں ہوا اور یہ جزیرہ بلادِ روم سے فارس کی نسبت زیادہ قریب ہے۔[1] والله أعلم۔ پھر فارس پر روم کا غلبہ ہوا بعد "بضع سنين" کے۔ ﴿ بِضْعِ سِنِيْنَ ﴾ سے مراد نو برس ہیں، کیوں کہ کلامِ عرب میں "بضع" کا لفظ تین سے دس تک کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اسی طرح اس حدیث شریف میں آیا ہے جس کو امام ترمذی اور ابن جریر رحمہما اللہ وغیرہما نے از حدیث "عبد الله بن عبد الرحمن الجمحي عن الزهري عن عبيد الله بن عبد الله

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٦/ ٢٧٣)

عن ابن عباس“ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مناحبہ (شرط لگانا) (مناحبہ و مراہنہ بیک معنی ہے، یعنی شرط باندھنا) ﴿ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴾ کے بارے میں فرمایا: اے ابوبکر! تو نے کیوں نہیں احتیاط کی، کیونکہ ﴿ بِضْعِ ﴾ تو تین اور دس کے درمیان ہے؟ پھر ترمذی نے کہا:[1] ”هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه، وروى ابن جرير عن عبد الله بن عمرو، وأنه قال ذلك والله أعلم“

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ﴾ ”أَيْ: مِنْ قَبْلِ ذٰلِكَ وَمِنْ بَعْدِهٖ“ غرض یہ ہے کہ قبل و بعد مبنی علی الضم ہیں، اس لیے کہ مضاف الیہ محذوف و منوی ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ﴾ یعنی اس دن ایمان والے اس بات پر خوش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے شام کے بادشاہ قیصر اور اس کے رومی ساتھیوں کی کسریٰ کے ساتھیوں پر مدد کی۔ یہ لوگ مجوس آتش پرست تھے۔ فارس پر روم کی مدد واقعۂ بدر کے دن ہوئی۔ یہ قول علماء میں سے ایک بہت بڑی تعداد کا ہے، جیسے: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ثوری اور سدی رحمہ اللہ وغیرہم۔ اور اس حدیث شریف میں وارد ہوا ہے جس کو امام ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بزار نے من حديث الأعمش عن عطية عن أبي سعيد الخدري سے روایت کیا ہے۔ کہا: جب بدر کا دن ہوا تو روم فارس پر غالب ہوئے، چنانچہ یہ مومنوں کو بات اچھی لگی تو وہ اس سے خوش ہوئے اور اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾[2]۔ اور لوگوں نے کہا: بلکہ روم کی فارس پر نصرت اور فتح سالِ حدیبیہ میں ہوئی۔ یہ قول امام عکرمہ، زہری، قتادہ رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے۔[3]

بعض نے اِس قول کی یہ توجیہ کی ہے کہ قیصر نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ اس کو کسریٰ پر فتح مند کرے گا تو وہ حمص سے ایلیا، یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے بیت المقدس تک پا پیادہ جائے گا۔ چنانچہ اس نے ایسا کیا۔ لہٰذا جس وقت وہ بیت المقدس میں پہنچا تو اس سے نہ نکلا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا خط مبارک اس کے پاس پہنچا۔ آپ ﷺ نے یہ خط دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھیجا تھا، چنانچہ دحیہ نے عظیم بصریٰ کو دیا، پھر عظیمِ بصریٰ نے قیصر کو دیا۔ جب وہ خط اس کے پاس پہنچا تو حجاز کے عرب لوگ جو شام میں تھے، ان کے بارے میں قیصر نے پوچھا تو ابوسفیان صخر بن حرب اموی قریش کے کبار کی ایک جماعت کے ہمراہ بڑی عزت کے ساتھ اس کے پاس حاضر کیے گئے، پھر وہ اس کے پاس لائے گئے تو اس کے رو برو بیٹھے۔ پھر اس نے کہا کہ تم میں کون نسب کے لحاظ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۱۹۱) تفسير الطبري (۲۰/ ۶۸) اس کی سند میں ”عبداللہ بن عبدالرحمن جمحی“ ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۳۳۵٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۱۹۲) تفسير الطبري (۲۰/ ۷۳) تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۸۷)

[3] تفسير الطبري (۲۰/ ۷۰۔ ۷۲) تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۸۷)

سے اس شخص کے زیادہ قریب ہے جو یہ زعم کرتا ہے کہ وہ نبی ہے؟ ابوسفیان بولے: میں ہوں۔ پھر ابوسفیان کے ساتھیوں کو ابوسفیان کے پیچھے بٹھایا اور کہا کہ میں اس سے اس شخص کے بارے میں پوچھنے والا ہوں، اگر یہ جھوٹ کہے تو تم اس کو جھٹلانا۔ ابوسفیان نے کہا: ''فَوَ اللّٰهِ لَوْ لَا أَنْ يَّأْثِرُوْا عَلَيَّ الْكَذِبَ لَكَذَبْتُ،، یعنی اللہ کی قسم! اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ مجھ پر کذب نقل کریں تو البتہ میں جھوٹ بولتا۔

پھر ہرقل نے ابوسفیان سے آپ کے نسب اور صفات کے بارے میں پوچھا۔ پھر جن باتوں کا ہرقل نے ابوسفیان سے سوال کیا، ان میں ایک یہ بات تھی کہ ہرقل نے کہا: کیا وہ غدر یعنی بدعہدی کرتا ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں: میں نے کہا: نہیں، اور ہم نے اس کے ساتھ ایک مدت کا معاہدہ کیا ہوا ہے ہم نہیں جانتے کہ وہ اس میں کیا کرنے والا ہے۔ اس سے مراد وہ صلح ہے جو رسول اللہ ﷺ اور کفار کے درمیان سالِ حدیبیہ میں واقع ہوئی تھی، اس بات پر کہ دس سال تک باہم جنگ موقوف کی جائے۔ چنانچہ اس قصے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ روم کو فارس پر سالِ حدیبیہ میں فتح ہوئی تھی، کیوں کہ قیصر نے جو اپنی نذر پوری کی تو حدیبیہ کے بعد کی۔ واللّٰه أعلم.

پہلے قول والے اس کا یہ جواب دے سکتے ہیں کہ قیصر کے بلاد برباد و پریشان ہو چکے تھے، اس لیے اس نے اپنی نذر پوری کرنے کی قدرت نہ پائی، یہاں تک کہ جس شے کی درستی کرنا ممکن تھا اس کی درستی کی اور اپنے بلاد کی خبر لی۔ پھر جب اپنے فتح یاب ہونے کے بعد چار سال ہو گئے تو اپنی نذر پوری کی۔ واللّٰه أعلم۔ اس بارے میں جو بات سہل اور قریب شے ہے، وہ یہ ہے کہ جب فارس روم پر فتح مند ہوئے تو یہ بات مومنوں کو بری لگی تھی، پھر جب روم نے فارس پر کامیابی حاصل کی تو مومنین کو اس سے خوشی ہوئی، کیوں کہ روم اہلِ کتاب میں سے ہیں تو وہ مجوس کی نسبت مومنین کے زیادہ قریب ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿82﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ [المائدة: ٨٢۔ ٨٣] ''(اے نبی!) یقیناً آپ لوگوں میں اہلِ ایمان سے عداوت رکھنے میں سخت ترین یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے، اور اہلِ ایمان سے دوستی رکھنے میں ضرور قریب ترین ان لوگوں کو پائیں گے جنھوں نے کہا: بے شک ہم نصاریٰ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بے شک ان میں کچھ عالم ہیں، کچھ دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے ہیں اور یہ کہ وہ غرور نہیں کرتے۔ اور جب وہ رسول پر نازل کیا گیا کلام سنتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، لہٰذا تو ہمارے نام (حق کی)

گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔'' اور اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۚ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے زبیر کلائی سے روایت کیا ہے۔ کہا: میں نے فارس کا روم پر غلبہ دیکھا، پھر روم کا غلبہ فارس پر دیکھا، پھر مسلمانوں کا فارس اور روم پر غلبہ دیکھا، یہ سب پندرہ برس میں ہو گیا۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے انتصار اور انتقام میں اپنے دشمنوں پر غالب ہے اور اپنے مومن بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَعْدَ اللّٰهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اے محمد! یہ بات جس کی ہم نے تجھ کو خبر دی ہے کہ ہم عن قریب روم کی فارس پر مدد کریں گے، ایک سچا وعدہ ہے اللہ کی طرف سے اور ایک سچی خبر ہے جو غلط نہ ہوگی اور اس کا وجود اور واقع ہونا ضروری ہے، کیوں کہ اللہ پاک کا طریقہ یوں جاری ہوا ہے کہ دو لڑنے والے گروہوں میں سے جو گروہ حق کے زیادہ قریب ہوتا ہے، اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور نیک انجام اسی کے لیے ٹھہرتا ہے۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک کی حکمتیں جو اس کے ہونے میں اور اس کے افعال میں جو محکم اور پختہ ہیں اور عدل کی موافقت کرنے پر جاری ہیں، اکثر لوگ ان کو نہیں جانتے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ یعنی اکثر لوگوں کو کچھ علم نہیں ہے مگر یہی دنیا کا اور اس کے حرفوں کمائیوں کا اور اس کی حالتوں کا اور اس شے کا جو اس میں ہے۔ چنانچہ وہ اس کے حاصل کرنے میں اور اس کے پیشوں کے طریقوں میں بڑے حاذق اور ماہر و زیرک و ہوشیار اور تیز ذہن و پختہ کار ہیں اور دین کے کاموں میں اور جو شے ان کو آخرت میں نفع دے اس میں غافل اور بے خبر ہیں۔ گویا ان کا ایک منفعل مدہوش اور بے ہوش و بے حواس ہے، نہ اس کا کچھ ذہن کام کرتا ہے، نہ کسی طرح کا غور و فکر کرتا ہے، بالکل بے خبر پڑا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "وَاللّٰهِ لَبَلَغَ أَحَدُهُمْ بِدُنْيَاهُ أَنَّهُ يُقَلِّبُ الدِّرْهَمَ عَلٰى ظُفُرِهِ فَيُخْبِرُكَ بِوَزْنِهِ وَمَا يُحْسِنُ يُصَلِّي"[2] یعنی قسم ہے اللہ کی! البتہ ان میں کا ایک اپنی دنیا کی ہوشیاری میں یہاں تک پہنچا ہے کہ اپنے ناخن پر روپیہ کو لوٹتا پوٹتا ہے تو تجھے اس کے وزن کی خبر دیتا ہے، حالاں کہ نماز اچھی طرح سے نہیں پڑھ سکتا۔ (فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں: "إن أحدهم لينقر الدرهم بطرف ظفره فيذكر وزنه لا يخطئ وهو لا يحسن يصلي"[3]) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "يَعْنِي الْكُفَّارَ يَعْرِفُوْنَ عُمْرَانَ الدُّنْيَا وَهُمْ فِي أَمْرِ الدِّيْنِ جُهَّالٌ"[4] غرض یہ ہے کہ کافر لوگ دنیا کی آبادی کو خوب جانتے پہچانتے ہیں اور دین کے کام میں جاہل اور نادان ہیں۔[5]

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٨٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٨٨) [3] فتح البيان (١٠/ ٢٢٨)
[4] تفسير الطبري (٢٠/ ٧٦) [5] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٥٥_ ٥٦١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ اس سورت کے شروع کے حروف مقطعات پر کلام سورت بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اللہ پاک ہی اس سے اپنی مراد کو خوب جانتا ہے۔ جمہور نے "غُلِبَتْ" بہ ضمِ غینِ معجمہ وکسرِ لام بصیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ سیدنا علی اور ابو سعید خدری، ابن عمر رضی اللہ عنہم، معاویہ بن قرہ رحمہ اللہ اور اہلِ شام نے بہ فتحِ غین و لام بصیغۂ معروف پڑھا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر لوگوں کی قراءت بہ ضمِ غین وکسرِ لام ہے۔[1] اہلِ تفسیر نے کہا ہے کہ فارس روم پر غالب ہو گئے تو کفارِ مکہ اس سے خوش ہوئے اور بولے کہ جن لوگوں کے پاس کتاب نہیں ہے وہ ان لوگوں پر غالب ہوئے جن کے پاس کتاب ہے اور مسلمانوں پر فخر کیا تو کہا کہ ہم بھی تم پر غالب ہوں گے جیسے فارس روم پر غالب ہوئے اور مسلمان چاہتے تھے کہ روم فارس پر غالب ہوں، کیوں کہ وہ اہلِ کتاب ہیں، یعنی نصاریٰ، چنانچہ وہ اسلام کے زیادہ قریب ہیں اور فارس مجوس ہیں تو وہ کفارِ قریش کے زیادہ قریب ہیں۔ فارس ایک عجمی نام ہے اس قبیلے پر، علم ہے بہ سببِ علمیت و تانیث کے اور بوجہ عجمہ کے غیر منصرف ہے۔ روم ایک قبیلے کا نام ہے، اپنے دادا کے نام پر نام رکھا گیا ہے۔ اصل نسب یہ ہے: روم بن عیصو بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔ امام ابن جزی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کو کہا ہے۔[2] عیصو کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عیصو یعقوب علیہ السلام کے ساتھ تھے ایک بطن میں، دونوں نے اپنے نکلتے وقت ایک دوسرے کی مزاحمت کی۔ ہر ایک نے چاہا کہ دوسرے سے پہلے نکلے تو عیصو نے یعقوب سے کہا: اگر میں تجھ سے پہلے نکل آیا فبہا، ورنہ میں اس کے پہلو سے نکلوں گا۔ چنانچہ یعقوب علیہ السلام براہِ شفقت پیچھے رہ گئے، اس لیے وہ تو انبیاء کے باپ ہوئے اور عیصو جباروں کا باپ ہوا۔ كذا قال الحفناوي. والله أعلم.

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: جب بدر کا دن ہوا تو روم فارس پر غالب ہوئے، چنانچہ یہ بات مومنوں کو اچھی لگی۔ اس پر ﴿ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴾ نازل ہوئی، اور اس کو بصیغۂ معروف پڑھا، چنانچہ مسلمان خوش ہوئے اس بات پر کہ روم فارس پر غالب ہو گئے۔[3] سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: عن قریب قومیں آئیں گی جو "الٓمّٓ ۝ غَلَبَتِ الرُّوْمُ" پڑھیں گی، یعنی بہ فتحِ غین، حالانکہ وہ تو ﴿ غُلِبَتِ ﴾ ہے، یعنی بضمِ غین۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ ﴾ متعلق ہے ﴿ غُلِبَتِ ﴾ سے، اس کے معنی یہ ہیں کہ عرب کی زمین سے قریب کی زمین میں، یا ان سے عرب کی سب سے قریب زمین میں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ زمین، زمینِ جزیرہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اذرعات۔ کسی نے کہا ہے کہ کسکر۔ کسی نے کہا ہے کہ اردن۔ کسی نے کہا کہ فلسطین، یہ جگہیں دوسرے علاقوں کی نسبت بلادِ عرب کے بہت قریب ہیں۔ رہی یہ بات کہ ارض کو ارضِ عرب پر محمول کیا گیا تو اس کی یہ

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٤) فتح القدير (٤/ ٢٨١۔ ٢٨٢) [2] التسهيل لعلوم التنزيل لابن جزي (٢/ ١٣٠)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [4] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٤٤)

وجہ ہے کہ ان کی زبان میں وہی معہود و معروف ہے کہ جس وقت وہ صرف ارض بولتے ہیں تو ان کی مراد اس سے جزیرۂ عرب ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ اَلْاَرْضِ ﴾ میں الف لام مضاف الیہ کا عوض ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فِي أَدْنَى أَرْضِهِمْ" ضمیر روم کی طرف راجع ہو گی اور معنی یہ ہوں گے: "فِي أَقْرَبِ أَرْضِ الرُّوْمِ مِنَ الْعَرَبِ إِلٰى فَارِس" یعنی عرب سے قریب تر زمین روم میں فارس کی طرف۔

جزیرے سے مراد وہ جگہ ہے جو دجلہ اور فرات کے درمیان ہے اور اس سے تنہا جزیرۂ عرب مراد نہیں ہے، اس قول کی بنا پر جو اصمعی سے مروی ہے کہ جزیرۂ عرب اقصائے عدن سے ہے ریفِ عراق (ریف بالکسر زمین باکشت) تک طول میں اور عرض میں جدہ اور اس کے متصل جگہوں سے اطرافِ شام تک۔ اس کا نام جزیرہ اس لیے رکھا ہے کہ سمندروں اور عظیم نہروں نے اس کو گھیرا ہوا ہے، جیسے: بحرِ حبشہ و بحرِ فارس و دجلہ و فرات۔ امام ابن جزی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ جزیرہ شام اور عراق کے درمیان ہے اور وہ فارس کی طرف روم کا پہلا حصہ ہے۔[1] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر وہ واقعہ اذرعات میں ہوا ہے تو وہ ﴿ اَدْنَى الْاَرْضِ ﴾ سے ہے ساتھ قیاس کرنے کے مکے کی طرف، اور اگر جزیرہ میں ہوا ہے تو وہ ﴿ اَدْنَى الْاَرْضِ ﴾ ہے زمین کسریٰ کی طرف قیاس کرنے سے، اور اگر وہ اردن میں ہوا ہے تو روم کی زمین کی طرف قریب تر ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ﴾۔ "غَلَبَ وَغَلَبَهُ" دونوں دو لغت ہیں اور مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے جمہور کی قراءت کی بنا پر، یعنی روم زمینِ عرب سے بہت قریبی زمین میں مغلوب ہوئے اور وہ فارس کے ان کو مغلوب کرنے کے بعد عن قریب ہی کئی سال کے بعد فارس پر غالب ہوں گے۔ اور غیر جمہور کی قراءت کی بنا پر مصدر مضاف ہے فاعل کی طرف اور "سَيُغْلَبُوْنَ" بضم یاء صیغۂ مجہول ہے، معنی یہ ہیں کہ روم غالب ہوئے ریفِ شام پر اور وہ ان کے غالب ہونے کے بعد مغلوب ہوں گے، یعنی مسلمان ان پر غالب ہوں گے۔ اس کے نزول سے نویں سال ہجری میں مسلمانوں نے روم پر چڑھائی کی اور ان کے بعض شہر فتح کر لیے۔ جمہور کی قراءت پر ﴿ سَيَغْلِبُوْنَ ﴾ بصیغۂ معروف ہے۔ ابو حیوہ شامی اور ابن سمیفع نے "غَلْبِهِمْ" بسکونِ لام پڑھا ہے۔[3] ﴿ سَيَغْلِبُوْنَ ﴾ پر وقف نہیں ہے۔ اس لیے کہ ﴿ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ﴾ اس سے متعلق ہے۔ ﴿ بِضْعِ ﴾ کی تفسیر و اشتقاق سورت یوسف میں گزر چکا ہے۔[4] اس جگہ اس سے مراد تین سے دس تک کے درمیان ہے۔ کسی نے کہا: نو تک۔ کسی نے کہا: سات تک۔ کسی نے کہا: دس سے کم۔ رہی یہ بات کہ ﴿ بِضْعِ ﴾ کو مبہم رکھا، اس کو بیان نہ کیا، حالانکہ نبی اکرم ﷺ کو معلوم تھا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ ان پر ہر وقت میں رعب اور خوف کو داخل

[1] التسهيل لعلوم التنزيل (٢/ ١٣٠)
[2] فتح القدير (٤/ ٢٨٢)
[3] تفسير القرطبي (١٤/ ٦)
[4] رقم الآية (٤٢)

کرنا منظور ہے۔ چنانچہ یہ نکتہ تفسیر رازی سے اَخذ کیا جاتا ہے۔[1]

فتح البیان میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی وہ روایت ذکر کی ہے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے شرط لگانے کے بارے میں ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس کے آخر میں یہ ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شرط جیتے تو شرط کا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لا دے ہوئے لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سحت ہے، اس کو خیرات کر دو۔[2] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی اس قصے کا ذکر کیا ہے، لیکن الفاظ کا فرق ہے۔ اس کے آخر میں "تَصَدَّقْ بِهِ" ہے۔ پھر یہ کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے صحیح ہونے کی اور اس بات کی یہ ایک کھلی نشانی ہے کہ قرآن شریف اللہ کے پاس سے ہے، کیوں کہ یہ خبر دینا، علمِ غیب سے ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق یہ قصہ قمار (شرط لگانا، جوا کھیلنا) حرام ہونے سے پہلے تھا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے مذہب سے یہ ہے کہ دارِ حرب میں مسلمین اور کفار کے درمیان عقودِ فاسد، مثلاً: عقدِ ربا وغیرہ جائز ہیں اور اس کے صحیح ہونے پر اس قصے سے حجت پکڑی ہے۔[3] انتھٰی.

فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ قصہ ان پر حجت ہے، ان کے واسطے حجت نہیں ہے، کیوں کہ قمار کے حرام ہونے سے پہلے واقع ہوا ہے اور حال یہ ہے کہ اس میں "هٰذَا السُّحْتُ تَصَدَّقْ بِهِ" کے الفاظ ہیں۔[4] انتھٰی. تفسیر بیضاوی میں ہے کہ حنفیہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ دارِ حرب میں عقودِ فاسدہ جائز ہیں، اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ قصہ قمار کے حرام ہونے سے پہلے تھا۔[5] انتھٰی. شیخ زادہ حنفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ شرط لگانا قمار کے حرام ہونے سے پہلے تھا اور یہی ظاہر ہے، کیوں کہ سورت مکی ہے اور خمر اور میسر کی حرمت نازل ہونے کے لحاظ سے آخری آیات سے ہے۔ انتھٰی.

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ قدرت اور احکام جاری کرنے کے ساتھ اللہ پاک ہی متفرد ہے، مراد مغلوب ہونے اور غالب ہونے کا وقت ہے۔ ﴿ مِنْ قَبْلُ ﴾ مغلوبیت سے لگا اور ﴿ مِنْ بَعْدُ ﴾ غالبیت سے بطور لف ونشر مرتب کے۔ غرض یہ ہے کہ پہلے مغلوب ہونا پھر غالب ہونا اس کی قدرت سے اور حکم کے نفاذ سے ہوا۔ ابو السعود کا حاصل بھی یہی ہے۔[6] اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ [آل عمران: ١٤٠] "ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔" اللہ پاک کبھی کسی کو مغلوب کرتا ہے کبھی غالب، سب کچھ اسی کے حکم اور قضا سے ہوتا ہے، اس کی حکمت کو وہی خوب جانتا ہے۔ سید آزاد بلگرامی رحمہ اللہ نے اس مضمون کو خوب نظم کیا ہے:

---

[1] تفسير الرازي (٢٥/ ٨٥)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] تفسير النسفي (٣/ ٢٦٧)
[4] فتح البيان (١٠/ ٢٢٥)
[5] تفسير البيضاوي (٤/ ٣٢٧)
[6] تفسير أبي السعود (٧/ ٥٠)

وَرَأَيْتُ مَعَالِمَ دَارِسَةً رَسَمَتْهُ مُدَاوَلَةُ السَّيْلِ
فَسَأَلْتُ رُسُوْمَ الْأَرْبَعِ مَا فَعَلَتْ بِكَ سَابِقَةُ الْأَزَلِ
فَأَجَابَتْ قَالَ اللّٰهُ لَنَا وَسُؤَالُكَ مِنْ جِهَةِ الْغَفْلِ
تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا لَا مُكْثَ لَهُنَّ عَلٰى رِجْلٍ

اس کا حاصل یہ ہے کہ میں نے احباب کے منازل و دیار کو دیکھا کہ اجڑے پڑے ہیں، جہاں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی، دوست آشنا ملتے جلتے تھے، لطائف وظرائف ہوتے تھے، وہاں اب کوئی بھی نہیں ہے۔ ہواؤں کی مارا مار، پانی کی بوچھاڑ اور سیلاب کی آو جاؤ سے گر گرا گئے، کھنڈر ہو گئے، کچھ نشان باقی رہ گئے تو میں نے ان نشانوں سے پوچھا کہ سابقہ ازل نے تمھارے ساتھ کیا کیا؟ تمھارے رہنے بسنے والے کہاں گئے؟ وہ آبادی و رونق وہ تازگی کدھر گئی؟ تو وہ بہ زبانِ حال یہ بولے کہ تیرا پوچھنا غفلت کی جہت سے ہے، ہم سے تو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ ہم تو ایامِ دنیا کو گردش دیتے رہتے ہیں، کبھی اس کو آباد کرتے ہیں کبھی ویران، کبھی اس کو غالب کرتے ہیں کبھی اس کو۔ دنیا کے کاروبار اسی طرح جاری رہتے ہیں، ایک حال پر کسی کے لیے ہمیشگی نہیں ہے

کیا شوخیاں ہیں ابلقِ لیل و نہار کی جمتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

جمہور نے "قَبْلُ وَبَعْدُ" کو بہ ضم پڑھا ہے، اس لیے کہ دونوں اضافت سے علاحدہ کیے گئے ہیں اور مضاف الیہ نیت میں مراد ہے۔ تقدیر یہ ہے: "مِنْ قَبْلِ الْغَلَبِ وَمِنْ بَعْدِهٖ أَوْ مِنْ قَبْلِ كُلِّ أَمْرٍ وَّمِنْ بَعْدِهٖ" یعنی اللہ ہی کے واسطے امر وحکم ہے غلبے سے پہلے اور غلبے کے بعد، یا ہر امر سے پہلے اور ہر امر کے بعد۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ بکسرِ اول منون اور بضمِ ثانی بدوں تنوین حکایت کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے بکسرِ ہر دو بغیر تنوین حکایت کیا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کی تغلیط کی ہے اور کہا ہے کہ جائز جو ہے تو وہ مکسور منون ہی ہے۔ امام شہاب الدین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بکسرِ ہر دو مع تنوین پڑھا گیا ہے۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: اس کی توجیہ یہ ہے کہ اضافت نیت میں مراد نہیں رکھی گئی، اس لیے دونوں کو معرب کر دیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں: "مِنْ مُتَقَدِّمٍ وَّمِنْ مُتَأَخِّرٍ"[2] شاید اس معنی سے زجاج کی غرض مکسور منون کی ہے، یعنی مضاف الیہ نہ تو لفظ میں موجود ہے نہ نیت میں مراد ہے، بلکہ "قَبْلُ وَبَعْدُ" کے معنی متقدم ومتاخر کے ہیں۔ واللّٰہ أعلم۔ بعض نے امام فراء رحمہ اللہ کی حکایت کو اس بات پر تخریج کیا ہے کہ مضاف الیہ موجود فرض کیا، اس لیے مضاف کو اپنے حال پر چھوڑ رکھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس دن روم فارس پر بضع سنین میں غالب ہوں گے اور اللہ پاک نے جو ان کے غلبے کا وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہوگا تو اس دن مومنین روم کو

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٨٢) اللباب في علوم الكتاب (١٥/ ٣٨٥) [2] معاني القرآن (٤/ ١٧٦)

فارس پر اللہ کے نصرت دینے سے خوش ہوں گے، اس لیے کہ رومی اہلِ کتاب ہیں، جیسے کہ مومنین اہلِ کتاب ہیں، بہ خلاف فارسیوں کے کہ ان کے پاس کتاب نہیں ہے اور اسی لیے مشرکین ان کے روم پر غالب آنے سے خوش ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ "نصر الله" سے مراد اس خبر میں مومنوں کی سچائی کا ظاہر کرنا ہے، جو انھوں نے مشرکوں کو دی کہ روم فارس پر غالب ہوں گے، لیکن پہلا قول اولیٰ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جو اس بات پر دال ہیں کہ قرآن پاک اللہ کے پاس سے ہے، کیوں کہ اس نے اس بات کی خبر دی جو آیندہ زمانے میں واقع ہوگی اور اس کو اللہ پاک کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔[1]

نکتہ:

﴿ مِنۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ ﴾ کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے، کیوں کہ ﴿ سَيَغۡلِبُونَ ﴾ بعد ﴿ غُلِبَتِ الرُّومُ ﴾ کے نہیں ہوگا مگر بعد غلبہ کے، یعنی مغلوب ہونے کے؟ تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ پاک کی قدرت کا ظاہر کرنا ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ یہ غلبہ اللہ کے امر سے ہے، کیوں کہ جو شخص اپنے مغلوب ہونے کے بعد غالب ہوگا، وہ نہ ہوگا مگر ضعیف، پس اگر روم کا غلبہ ان کی شوکت کے سبب سے ہوتا تو واجب تھا کہ وہ مغلوب ہونے سے پہلے غالب ہوتے۔ پھر جب وہ مغلوب ہونے کے بعد غالب ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ غلبہ اللہ پاک کے حکم سے ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ مِنۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ ﴾ تاکہ اپنے ضعف پر غور وفکر کریں اور سوچیں کہ وہ غلبہ کچھ ان کی قوت سے نہیں ہوا، وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيٓ أَدۡنَى ٱلۡأَرۡضِ ﴾ رومیوں کے شدتِ ضعف کو بیان کرنے کے لیے ہے، یعنی ان کے ضعف کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ ان کا دشمن ان کے بلاد کے کنارے تک پہنچ گیا اور ان کو توڑ پھوڑ ڈالا، حالانکہ وہ اپنے بلاد میں موجود ہیں۔ پھر وہ غالب ہو گئے، یہاں تک کہ فارسیوں کے دارالسلطنت مدائن کی طرف پہنچے اور وہاں رومیہ کی بنیاد رکھی اور تعمیر کیا۔ اس سے غرض یہ بات بیان کرنا ہے کہ اس ضعفِ عظیم کے بعد یہ غلبۂ عظیم اللہ پاک کے اذن سے ہوا تھا، جیسا کہ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا۔

﴿ يَنصُرُ مَن يَشَآءُۖ وَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ﴾ یعنی وہ نصرت دیتا ہے جس کو نصرت دینا چاہتا ہے اور وہ غالب وقاہر ہے اور کثیر الرحمت ہے، اپنے مومن بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ کسی نے کہا: اس جگہ رحمت سے مراد دنیوی رحمت ہے اور وہ مسلم اور کافر دونوں کو شامل ہے۔

﴿ وَعۡدَ ٱللَّهِۖ لَا يُخۡلِفُ ٱللَّهُ وَعۡدَهُۥ ﴾ یعنی اللہ نے پکا وعدہ کیا ہے، وہ اس کا خلاف نہیں کرے گا۔ وہ وعدہ

[1] معاني القرآن (٤/ ١٧٥)

یہی ہے کہ روم فارس پر غالب ہوں گے۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی لیکن اکثر لوگ اپنی جہالت اورغور وفکر نہ کرنے کی وجہ سے یہ بات نہیں جانتے کہ اللہ پاک اپنے وعدے کا خلاف نہ کرے گا۔ ﴿ اَكْثَرَ النَّاسِ ﴾ سے مراد کفار ہیں۔کسی نے کہا کہ خاص کفارِ مکہ۔ وہ علم جو آخرت کے لیے نفع دینے والا ہے، اس کی تو اللہ پاک نے ان سے نفی کی اور احوالِ دنیا کا علم ان کے لیے ثابت کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ يَعْلَمُوْنَ ظٰهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾

﴿ يَعْلَمُوْنَ ﴾ کی ضمیر راجع ہے ﴿ اَكْثَرَ النَّاسِ ﴾ کی طرف اور اسی طرح مابعد کی ضمیریں۔ ﴿ يَعْلَمُوْنَ ﴾ بدل ہے "لَا يَعْلَمُوْنَ" سے۔ اس بدل میں نکتہ یہ ہے کہ ﴿ يَعْلَمُوْنَ ﴾ کو "لَا يَعْلَمُوْنَ" کے قائم مقام کیا، تا کہ تم کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ عدمِ علم جو جہل ہے اور وجودِ علم جو دنیا سے تجاوز نہیں کرتا ہے، ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔غرضیکہ اس جملے کا بدل ڈالنا بہتر ہے۔ امام حوفی رحمہ اللہ کے قول سے یہ جملہ من حیث المعنی مستانفہ ہے، اس کے حسن وخوبی میں کچھ کلام نہیں، مگر اتنی بات ہے کہ صناعتِ نحو بدل کی مساعد نہیں ہے، اس لیے کہ فعل مثبت کا فعل منفی سے بدل ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ كما ذكره الكرخي.

معنی یہ ہیں کہ دنیا کی زینتیں اور اس کی لذتیں اور اس کے مزے اور اپنا امرِ معاش اور فوائدِ دنیوی کے حاصل کرنے کے اسباب جن کا وہ مشاہدہ کر رہے ہیں، ان سب کے ظاہر کو جانتے ہیں۔کسی نے کہا ہے کہ ظاہر سے مراد وہ امورِ دنیا ہیں جن کا شیاطین ان کی طرف القا کرتے ہیں استراقِ سمع (چوری چھپے سننا) کے وقت۔کسی نے کہا ہے کہ ظاہر سے مراد باطل ہے۔کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اپنے معایش کو جانتے ہیں کہ کس طرح کمائی کریں، کس طرح تجارت کریں، کب درخت لگائیں، کب ہل جوتیں، کب بوویں اور کب کاٹیں۔کسی نے کہا ہے کہ دنیا کے وجود ظاہر کو جانتے ہیں اور اس کے فنا ہونے کو نہیں جانتے۔کسی نے کہا ہے کہ دنیا کو اس کی حقیقت کے ساتھ نہیں جانتے، صرف اس کے ظاہر کو جانتے ہیں۔ ظاہر اس کا یہی اس کی لذتیں اور لہو ولعب ہیں اور اس کے باطن کو نہیں جانتے، وہ باطن یہی اس کے نقصانات اور تکلیفیں ہیں۔

آیتِ کریمہ نے یہ بات بتائی کہ دنیا کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے، ظاہر تو اس کا وہ ہے جس کو جاہل لوگ جانتے ہیں کہ اس کی زینتوں سے نفع اٹھانا اور اس کی لذتوں سے مزہ لینا اور عیش وآرام کرنا۔ اس کا باطن یہ ہے کہ وہ آخرت کی طرف ایک گزرگاہ ہے۔ اطاعت وعبادت واعمالِ صالح کر کے اس سے آخرت کی طرف توشہ لیا جاتا ہے۔ ظاہر کو جو نکرہ ذکر فرمایا تو اس نے یہ فائدہ دیا کہ وہ لوگ دنیا کے ظواہر میں سے صرف ایک ظاہر کو جانتے ہیں، باقی ظواہر سے بھی بالکل بے خبر ہیں، باطن کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ غرضیکہ حیاتِ دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں کوئی سا

ظاہر ہو، اور آخرت جو ہمیشہ کی نعمت اور خالص لذت ہے اس سے غافل ہیں، اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور نہ اس شے کو اس کے لیے تیار کرتے ہیں جس کی اس کے لیے ضرورت ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ آخرت پر ایمان لانے سے اور اس کے آنے کی تصدیق کرنے سے غافل ہیں۔ دوسرا ﴿ هُمْ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ غٰفِلُوْنَ ﴾ خبر۔ یہ جملہ خبر ہے اول ﴿ هُمْ ﴾ کی۔ اس میں یہ بات ہے کہ یہ لوگ آخرت میں غفلت کے معدن اور مقر ہیں، یعنی ایسے پورے غافل ہیں کہ آخرت کی غفلت کی کان اور قرارگاہ ہو رہے ہیں۔[1] (كذا قاله النسفي)۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ﴿ هُمْ ﴾ کو دوسری دفعہ تاکید کے لیے لائے ہیں۔[2]

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝۸ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۹ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْۤاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰

کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور و فکر نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے صرف حق کے ساتھ اور مقرر وقت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور بلاشبہ اکثر لوگ اپنے رب کی ملاقات ہی کے منکر ہیں ⑧ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں، پھر وہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو اُن سے پہلے تھے۔ وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے اور انھوں نے زمین کو (ان سے زیادہ) جوتا بویا اور جتنا اُنھوں نے زمین کو آباد کیا تھا اتنا انھوں نے آباد نہیں کیا ہے اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے، پھر اللہ (ایسا) نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ (خود ہی) اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے ⑨ پھر جن لوگوں نے برے

[1] تفسير النسفي (۳/ ۲٦٨)
[2] تفسير الجلالين (١/ ٥٣١) فتح البيان (١٠/ ٢٢٣ ـ ٢٢٩)

کام کیے تھے ان کا انجام بھی بُرا ہی ہوا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا تھا، اور وہ ان کا مذاق اُڑایا کرتے تھے ⑩

توحید کے دلائل پر غور وفکر کی دعوت:

ہر چیز کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہے۔ انسان، حیوان درخت کی ابتدا اور انتہا تو نظر آتی ہے۔ آسمان میں ہر گردش کی ایک مدت ہے، مہینے یا برس یا بارہ برس پر ختم ہے، جو ہر چیز میں صفت ہے، وہ سارے جہاں میں ہے، اپنے وقت پر اس کو فنا ہونا ہے۔ پھر یہ ابتدا اور انتہا کھیل نہیں ہے، اس سے کچھ منظور ہے، وہی آخرت میں نظر آئے گا۔ اللہ ان پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، یعنی اللہ بغیر رسول بھیجے نہیں پکڑتا۔ برا کرنے والوں کا برا انجام ہوا، یعنی ایک قوم کو جن باتوں پر سزا ملی سب کو وہی ملتی ہے، سب کی فنا بھی ایک کی فنا سے سمجھو اور سب کی سزا بھی ایک کی سزا جانو۔ انتہٰی.

اللہ پاک اس بات سے آگاہ فرماتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں غور وفکر کریں، وہ مخلوقات جو اس کے وجود پر دال ہیں اور اس بات پر کہ تنہا اسی نے اس کو پیدا کیا ہے اور اس کے سوا نہ کوئی معبود ہے نہ کوئی رب ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: ﴿ اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ تفکر سے مراد غور وفکر، تدبر و تامل ہے، یعنی اللہ پاک نے جو تمام اشیاء کو پیدا کیا ہے۔ عالمِ علوی اور عالمِ سفلی کو اور جو انواع واقسام کی مخلوقات اور آسمان اور زمین کے درمیان جو مختلف قسم کی مخلوقات ہیں، ان سب کے پیدا کرنے میں دھیان کریں تو جان لیں گے کہ یہ سب بے فائدہ اور بے کار پیدا نہیں کی گئی ہیں، بلکہ ان کو حق کے ساتھ بنایا ہے۔ ان کے بنانے میں طرح طرح کی حکمتیں رکھی ہیں اور ایک مقررہ وعدے تک ان کی مدت رکھی گئی ہے، وہ وعدہ روزِ قیامت ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴾ پھر ان کو اپنے رسولوں کے سچا اور درست ہونے کے بارے میں آگاہ کیا کہ جو کچھ وہ اس کی طرف سے لائے اس میں وہ سچے تھے۔ ان کی سچائی اس طرح سے ظاہر ہوئی کہ معجزوں اور کھلی کھلی دلیلوں سے ان کی تائید کی۔ وہ دلیلیں یہ تھیں کہ جس نے ان کو نہ مانا اس کو ہلاک کیا اور جس نے ان کو مانا اس کو بچا لیا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی کیا انھوں نے اپنی فہموں اور عقلوں سے اور نظر سے اور اگلے لوگوں کی خبریں سننے سے زمین میں سیر نہیں کیا اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ ... الآیۃ ﴾ یعنی اے وہ لوگو جن کی طرف نبی محمد ﷺ بھیجے گئے! گذشتہ اُمتیں اور اگلی سنگتیں قوت میں تم سے زیادہ سخت تھیں اور مال اور اولاد میں تم سے بڑھ کر تھیں اور جو کچھ وہ دی گئی تھیں اس کا دسواں حصہ بھی تم کو نہیں دیا گیا اور ان کو دنیا میں ایسا جماؤ دیا گیا تھا جس کو تم نہیں پہنچے اور اس میں ان کو لمبی لمبی عمریں دی گئیں، چنانچہ انھوں نے تم سے

بڑھ کر اس زمین کو بسایا اور تمھارے غلہ اور آمدنی لینے سے زیادہ انھوں نے اس کا غلہ اور آمدنی لی، اس کے باوجود جب ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور جو کچھ دنیا کا مال ومتاع انھیں ملا تھا، اس سے خوش ہوئے اور اترائے تو اللہ پاک نے ان کے گناہوں کے سبب سے ان کو پکڑا اور کوئی بھی ان کو اللہ سے بچانے والا نہ ہوا، اور نہ ہی ان کے مال اور اولاد ان کے اور اللہ کے عذاب کے درمیان حائل ہوئے اور نہ ان سے ذرہ برابر کوئی چیز دور کر سکے۔

اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں تھا کہ جو ان کو عذاب اور سزا دی، اس میں ان پر ظلم کرے، لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، یعنی جو بلا ان پر آئی وہ خود انہیں کی طرف سے آئی، اس لیے کہ اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی اور ان کے ساتھ ٹھٹھا کیا اور یہ سب کچھ صرف ان کے اگلے گناہوں اور ان کی تکذیبِ سابق کے سبب سے ہوا۔ اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) جیسے اللہ تعالیٰ فرمایا: ﴿ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١٠] ''اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ [الصف: ٥] ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ﴾ [المائدة: ٤٩] ''پھر اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو جان لیں کہ اللہ کا فقط یہی ارادہ ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے انھیں سزا دے۔'' اس معنی کی بنا پر ﴿ السُّوْٓاٰۤى ﴾ منصوب ومفعول ہوگا ﴿ اَسَآءُوا ﴾ کا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس صورت میں معنی یہ ہیں: "أَيْ: كَانَتِ السُّوْآى عَاقِبَتَهُمْ لِأَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِئُوْنَ" پس اس بنیاد پر ﴿ السُّوْٓاٰۤى ﴾ منصوب وخبر "كَانَ" ہوگا۔ یہ توجیہ ابن جریر رحمہ اللہ کی ہے اور اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے[1] اور امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ان دونوں سے اور ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ سے اور یہی ظاہر ہے۔ واللہ أعلم۔ بہ سبب اس قول کے ﴿ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾.[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ہمزۂ استفہام انکاری ہے اور حرفِ واو عطف کے لیے ہے مقدر پر جس طرح کہ اس کے نظائر میں ہے۔ ﴿ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ﴾ ظرف ہے تفکر کا مفعول نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو غور وفکر کے اسباب حاصل ہیں، وہ یہی ان کے نفوس ہیں، اگر وہ ان میں صحیح طور پر فکر کرتے تو ضرور جان لیتے

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ٧٩) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٦٢)

اللہ پاک کی وحدانیت کو اور اس کے نبیوں کے صدق اور سچائی کو۔ کسی نے کہا ہے کہ تفکر کا مفعول ہے۔ معنی یہ ہیں: کیا اس بات میں انھوں نے غور وفکر نہیں کیا کہ اللہ نے ان کو پیدا کیا، حالاں کہ وہ کوئی شے نہ تھے۔ اس کا بیانِ واضح یہ ہے کہ ﴿ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ﴾ ظرف ہے تفکر کا۔

ظرفیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نفوس وقلوب تفکر کے محل ہیں۔ معنی یہ ہیں: کیا انھوں نے اپنے دلوں کو فکرِ صالح کے ساتھ مشغول نہیں کیا، جو فکر سے فارغ اور خالی پڑے ہیں۔ تفکر اگر چہ قلوب میں ہوتا ہے ﴿ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ﴾ کہنے کی ضرورت نہ تھی، مگر متفکرین کے حال کی عکاسی کے لیے اس کو زیادہ کیا، جس طرح کہ ان مثالوں میں ہے: ﴿ وَلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیۡنِکَ ﴾ [العنکبوت: ٤٨] ''اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے لکھتے تھے۔'' حالاں کہ لکھنا اسی ہاتھ سے ہوتا ہے۔ ''وَأَبْصَرَهُ بِعَيْنِهِ'' اور دیکھا اس کو اپنی آنکھ سے، حالاں کہ دیکھنا آنکھ ہی سے ہوتا ہے۔ ''وَأَضْمَرَهُ فِي نَفْسِهِ'' یعنی چھپایا اس کو اپنے جی میں، حالانکہ چھپانا جی ہی میں ہوتا ہے۔ ان کے سوا اور مثالیں بھی ہیں۔

غرضیکہ ﴿ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ﴾ کے ذکر کرنے کی اگر چہ ضرورت نہ تھی، مگر اس کو اس لیے زیادہ کیا کہ فکر کرنے والوں کے حال کی خوب تصویر کھینچ دی جائے۔ اس صورت میں جملۂ ﴿ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ﴾ ماقبل سے متصل ہوگا محلِ نصب میں اور ﴿ اَوَ لَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا ﴾ اس کا ناصب ٹھہرے گا، اس طرح سے کہ ﴿ مَا ﴾ کے قبل ''إِنْ'' مخففہ مضمر ہوگا اور اس سے پہلے کلمۂ ﴿ فِیۡ ﴾ بھی مقدر کیا جائے گا۔ ان کا وصل کے لیے مضمر کرنا جائز ہے، جس طرح کہ اسی سورت میں آیا ہے: ﴿ وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ ﴾ [الروم: ٢٤] ''اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمھیں (ڈرانے اور اُمید دلانے کے لیے) بجلی دکھاتا ہے۔'' ''أَيْ: أَنْ يُّرِيكُمْ'' اور تفکر واقع ہوگا آسمان وزمین کے پیدا کرنے میں حق کے ساتھ۔ معنی یہ ہوں گے: کیا فکر نہ کی انھوں نے اپنے دلوں میں اس بات کی کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے۔ اس بنیاد پر متفکر فیہ مذکور ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ﴾ قول یا علم محذوف سے متعلق ہے۔ (شیخ زادہ رحمہ اللہ نے اس قول کو اظہر کہا ہے)۔ یعنی ''أَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ فَيَقُولُوا أَوْ فَيَعْلَمُوا أَنَّ مَا خَلَقَ اللّٰهُ... الخ'' اس بنا پر متفکر فیہ مذکور نہ ہوگا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ﴾ مفعول بہ غیر صریح ہے ﴿ یَتَفَکَّرُوۡا ﴾ کا اور اس کا ظرف نہیں ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اَوَ لَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ ﴾ [الأعراف: ١٨٥] ''کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی میں نظر نہیں ڈالی؟''

معنی یہ ہیں: کیوں نہیں فکر کی انھوں نے اپنی جانوں کے حال میں۔ کون سی جانیں جو ساری مخلوقات سے زیادہ ان کے قریب ہیں اور وہ ان کے احوال کو خوب جانتے ہیں۔ کلمۂ ﴿ اَوَ ﴾ استبطاء کے واسطے ہے۔ گویا یوں کہا گیا: کیا دیر ہے، کیا ڈھیل ہے، ان کو چاہیے کہ اپنے نفوس کے حال میں فکر کریں، تاکہ اللہ پاک کی کمال قدرت ان پر

کھل جائے، کیوں کہ جو کوئی انسانی بدن کی تشریح میں فکر کرے گا اور جو جو اللہ کی تدبیر کی عجیب وغریب چیزیں اس میں رکھی گئی ہیں، ان کو سوچے گا تو ضرور اس کو اس بات کا قطعی علم حاصل ہو جائے گا کہ اللہ پاک فاعلِ مختار ہے، مکمل علم وقدرت والا ہے اور جو ایسا عالم و قادر ومختار ہے ضروری ہے کہ وہ کسی شریک ونظیر وضد ونِد سے پاک اور مبرا ہو گا، ورنہ جب اس کا شریک اس کے ارادے کے خلاف چاہے گا تو عاجز ہو جائے گا۔ معاذ اللّٰہ۔ اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ ضد ہے۔ وہی آپ اکیلا ہے، جو چاہے سو کرے۔

دوسری یہ بات ہے کہ حشر و جزا کی حقیقت کا علم بھی اس کو حاصل ہو جائے گا، کیوں کہ جس وقت وہ اپنے نفس کے حال میں فکر کرے گا تو اپنے قویٰ کو دیکھے گا کہ زوال کی طرف جا رہے ہیں اور اس کے اجزا انحلال کی طرف مائل ہو رہے ہیں تو قطعاً اس بات کا یقین کر لے گا کہ عن قریب فنا ہو جائے گا۔ پھر اگر اس کے واسطے دوسری زندگی نہ ہو تو اس وجہ کی بنا پر اس کا پیدا کرنا بے فائدہ ٹھہرے گا۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴾[المؤمنون: ١١٥] ''کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آ ؤ گے۔''

اور یہ بات ظاہر ہے، کیوں کہ جو شے ایسی ہو کہ عن قریب بالکل فنا ہو جائے گی، پھر کوئی شخص اس کی تدبیر میں مبالغہ کرے اور اس کی اچھی سے اچھی صورت بنائے اور اس کے حال کا انتظام کرنے میں بہت زیادہ اہتمام کرے، یہ جاننے کے باوجود کہ عن قریب وہ ایسے ہو جائے گی، جیسے کوئی شے ہی نہ تھی تو لوگ ایسے شخص پر ہنسیں گے اور اس کی کم عقلی اور حماقت پر تعجب کریں گے کہ دیکھو کیا احمق آدمی ہے کہ عن قریب ختم ہو جانے والی شے کے لیے کیا کیا اہتمام کرتا ہے، چنانچہ جو شخص اپنے نفس کے حال میں اس طور پر فکر کرے گا تو وہ اس بات کو خوب جان لے گا کہ اس کو تو بقا کے واسطے بنایا ہے اور بقا نہ ہو گی مگر حشر اور دوبارہ زندہ کرنے کے ساتھ۔ لہٰذا یہ بات ظاہر ہو گئی کہ آدمی کا اپنے نفس کی حالت میں فکر کرنا اس بات کی طرف اس کی تایید کرے گا کہ وہ یقیناً اس کو جان لے گا کہ عالم کا ایک معبود ہے جو پہلے پیدا کرنے پر اور دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔

اس احتمال کی بنا پر جملہ ﴿ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ... الخ ﴾ مستانفہ ہو گا۔ ماقبل سے اس کے اعراب کا کچھ تعلق نہ ہو گا۔ اس کے ذکر کا فائدہ یہ ہو گا کہ انفس کی دلیل قائم کی، اس کے بعد اس جملے کے ساتھ دلیلِ آفاق سے استدلال کیا۔ اللہ پاک کی عادت پاک یہی ہے کہ اپنی یکتائی پر دلائلِ انفس و آفاق سے استدلال فرمایا کرتا ہے۔ چنانچہ اس وجہ پر آیت کے معنی یہ ہیں: کیا انھوں نے آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں غور وفکر نہیں کیا، تاکہ اس بات کو جان لیتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عبث اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے، لیکن ان کو تو اس لیے بنایا ہے کہ اس کے بندے اس سے عبرت حاصل کریں اور اس کی وحدانیت اور کمال قدرت پر ان سے دلیل پکڑیں اور اس بات پر کہ ان چیزوں کو

صرف اپنے بندوں کے فائدے کے لیے بنایا ہے، تاکہ بندے اس دنیا میں ان سے فائدہ اٹھائیں اور جو شے دارِ آخرت میں ان کو سعید اور نیک بخت بنائے اس کے حاصل کرنے میں ان کی مدد ہو۔

﴿ بِالْحَقِّ ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ حرفِ باء سببیت کے واسطے ہے یا حالیت کے واسطے۔ یعنی نہیں پیدا کیا ان کو مگر حق کے لیے، یا اس حال میں کہ حق کے ساتھ متلبس ہیں، یعنی ان کی پیدائش حق کے ساتھ مقرون (پیوستہ) ہوئی ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان کا بنانا باطل وعبث ہو اور حکمتِ بالغہ سے خالی ہو اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں۔ ان کو تو ایک مقررہ مدت کے لیے بنایا ہے کہ اس وقت تک رہیں، پھر فنا ہو جائیں۔ نفوسِ بشری اور ﴿ وَمَا بَيْنَهُمَآ ﴾ کے مفہوم میں مندرج ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے اور اس جملے میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ جملہ مستانفہ ہے، ماقبل سے اس کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ دوسری یہ ہے کہ وہ تفکر کے واسطے معلق ہے تو وہ محلِ نصب میں ہو گا بنا بر اسقاطِ خافض اور ﴿ مَا ﴾ کا استفہامیہ بہ معنی نفی ہونا ضعیف ہے اور جملے میں وہی ہر دو وجہ مذکور ہیں۔ انتھی. امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ بہ معنی "لِلْحَقِّ" ہے۔[1] یعنی ان کو پیدا نہیں کیا مگر ثواب اور عقاب کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ "بِالْعَدْلِ" کے معنی میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "بِالْحِكْمَةِ" کے معنی میں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں: "إِنَّهُ هُوَ الْحَقُّ وَلِلْحَقِّ خَلَقَهَا"۔

﴿ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ معطوف ہے حق پر، یعنی نہیں بنایا ان کو مگر حق کے ساتھ اور مدتِ مقرر کے ساتھ، جو آسمان، زمین اور جو کچھ ان میں ہے، کے لیے ٹھہرائی گئی ہے، جس کی طرف ان کی انتہا ہو گی وہ قیامت کا دن ہے۔ اس میں اس بات سے آگاہی بخشی ہے کہ ایک دن یہ سب فنا ہوں گے۔ دوسری یہ بات ہے کہ ہر مخلوق کے واسطے ایک مدت مقرر ہے، وہ اس سے تجاوز نہیں کرتی ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک نے پیدا کیا جو کچھ کہ پیدا کیا ایک وقت میں، جس کو اس شے کے پیدا کرنے کے لیے مقرر کیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴾ ان لوگوں سے مرادا تمام کفار علی الاطلاق ہیں، یا خاص کفارِ مکہ اور لقائے رب سے مراد بعث بعد الموت ہے، اور حرفِ لام تاکید کے لیے ہے۔ یعنی بہت سے لوگ مر کر جینے کے بڑے منکر ہیں، وہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا ابدی ہے اور آخرت ہونی نہیں ہے، جبکہ اللہ پاک نے ارشاد کیا اس شے کی طرف جو آخرت کے علم کی حقیقت کی طرف پہنچاتی ہے اور یہ بات بتا دی کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے، سب کے سب ایک مدتِ معین تک پہنچنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کو تہدید کی جو آخرت سے غافل ہیں اور انبیاء کے ساتھ کفر کرنے اور ان کی تکذیب کرنے پر مصر ہیں۔

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٨)

چنانچہ فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا ﴾ استفہام دھمکی اور ڈرانے دھمکانے کے لیے ہے اور حرفِ "فاء" ﴿ فَيَنْظُرُوْا ﴾ میں "يَسِيْرُوْا" پر عطف کے لیے ہے اور اسی دھمکی اور ڈرانے کے تحت میں داخل ہے، جس کو استفہام شامل ہے، یعنی انھوں نے جو ہلاک شدہ لوگوں کے آثار میں غور و فکر نہ کیا اور عبرت حاصل کرنے والی جگہوں پر سوچا نہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ ان کو تنبیہ اور توبیخ کر کے فرماتا ہے کہ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ بے شک وہ زمین میں چلے پھرے اور دیکھا کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو اُن سے پہلے تھے، یعنی کفار کے وہ گروہ جو اپنے کفر اور حق کو نہ ماننے اور نبیوں کو جھٹلانے کی وجہ سے ہلاک کر دیے گئے۔ پھر پہلے کے ہلاک شدہ لوگوں کی کیفیت بیان کی جس پر وہ تھے۔ فرمایا:

﴿ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ﴾ یعنی وہ لوگ ان مکے والوں اور ان کے تابعین سے زیادہ قوت والے تھے، جیسے: عاد و ثمود۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان لوگوں میں سے جو تم سے پہلے تھے، ایسا مرد تھا جس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان میل بھر کا فاصلہ تھا۔[1] جب طول و عرض کا یہ حال ہے تو قوت اور طاقت کا کیا کہنا ہے۔ اور دنیوی امور میں بھی مکے والوں سے بڑھ کر ان کو قدرت حاصل تھی۔ اسی لیے فرمایا ہے:

﴿ وَ اَثَارُوا الْاَرْضَ ﴾ اثارت: زمین کی زراعت کے لیے لوٹنے پوٹنے کو کہتے ہیں۔ یعنی انھوں نے کاشتکاری کی اور زمین میں ہل چلائے اور زراعت کے اسباب کی مزاولت (مہارت حاصل) کی۔ مکے والے کاشتکار نہ تھے۔

﴿ وَعَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا ﴾ یعنی انھوں نے زمین کو ان کے بسانے و آباد کرنے سے زیادہ بسایا اور آباد کیا، کیوں کہ وہ ان سے عمروں کے لحاظ سے زیادہ دراز اور جسموں میں زیادہ قوی اور اسبابِ معاش کے حاصل کرنے میں زیادہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے زمین کو مکانات اور زراعت سے اور درخت لگانے سے زیادہ آباد کیا۔ اس میں مکے والوں سے ٹھٹھا کیا ہے کہ یہ تو دنیا سے مغرور ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ فخر کر رہے ہیں، حالاں کہ اس میں ان کی حالت انتہائی کمزور ہے، کیوں کہ دنیا کے کام کا دار و مدار اس پر ہے کہ شہروں میں وسعت اور فراخی ہو، لوگوں پر غلبہ ہو اور زمین کے چاروں طرف عمارتوں اور آبادی کے ساتھ حکومت ہو، حالاں کہ یہ لوگ ضعیف اور کمزور ہیں، ایک وادیِ بے کشت کی طرف مضطر کر دیے گئے ہیں، یعنی دھکیل دیے گئے ہیں، جس میں کسی طرح کا نفع نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ﴾ یعنی ان کے پاس رسول آئے معجزے لے کر اور کھلی کھلی دلیلیں لے کر یا حلال و حرام اور حدود میں شرعی احکام لے کر۔ ﴿ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ چنانچہ اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر ظلم کرے، اس طرح سے کہ ان کے گناہ اور جرم کے بغیر ان کو عذاب کرے یا ہلاک کرے، لیکن وہ خود کفر کر کے اور رسولوں کی تکذیب کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، یہاں اتنی

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٨٤۔ ٤٨٥)

عبارت مقدر ہے۔ پھر وہ ایمان نہ لائے تو ہلاک کیے گئے۔ چنانچہ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا کہ بغیر گناہ کے اور ان کو وعظ و نصیحت کیے بغیر ان کو ہلاک کر ڈالے۔ غرض یہ ہے کہ مکے والے اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو ہلاک کیا جائے، کیوں کہ ان سے پہلے جو عاد و ثمود وغیرہ تھے، وہ ان سے قوت میں زیادہ سخت تھے اور مال اور عمارت میں ان سے بڑھ کر تھے اور اُن کی قوتوں نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا اور نہ ہی ان کے مال اور قلعوں نے ان کو ہلاک ہونے سے بچایا۔ ان کے مقابلے میں یہ تو کسی شمار اور قطار ہی میں نہیں ہیں۔ جب وہ لوگ اس قوت و شوکت کے باوجود ہلاک کر دیے گئے تو ان کی کیا ہستی ہے؟!

﴿ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ کلمہ ﴿ ثُمَّ ﴾ ترتیبِ اخبار کے واسطے ہے۔ امام نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے "عَاقِبَةُ" کو مرفوع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ کا اسم ہے اور ﴿ كَانَ ﴾ کی تذکیر اس لیے ہے کہ "عَاقِبَةُ" کی تانیث غیر حقیقی ہے اور ﴿ اَلسُّوْٓاٰى ﴾ کان کی خبر ہے۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی قراءت کو اختیار کیا ہے۔[2] تقدیر یہ ہے: "ثُمَّ كَانَ عَاقِبَتُهُمُ الْعُقُوْبَةَ السُّوْآى أَوِ الْخَصْلَةَ السُّوْآى" یعنی پھر ان کا انجام بدتر عقوبت یا بدتر خصلت ہوا۔ مضمر کی جگہ مظہر رکھا، یعنی "عَاقِبَتُهُمْ" کے بجائے ﴿ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا ﴾ کہا۔ چنانچہ غرض اس سے یہ ہے کہ جو شے ان کی بدتر عقوبت کی عاقبت کی مقتضی ہوئی وہ معلوم ہو جائے۔ دوسری یہ بات سمجھی جائے کہ جیسی ان کی حرکتیں اور کام تھے، ویسی ان کو جزا ملی۔

چنانچہ یہ دونوں امر ﴿ اَلَّذِيْنَ اَسَآءُوا ﴾ سے معلوم ہو گئے، یعنی جن لوگوں نے برا کیا تھا، شرک اور معاصی کیے تھے ان کا انجام بدتر عقوبت ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ دنیا میں تو ان کو یہ سزا دی گئی کہ ہلاک کر دیے گئے، پھر آخرت میں ان کا انجام بدترین سزا ہوئی۔ یہ سزا دوزخ کی آگ ہے جو کافروں کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ اور ﴿ اَنْ كَذَّبُوْا ﴾ یا تو علت ہے بہ تقدیر لامِ علت کے "أَيْ: لِأَنْ كَذَّبُوْا" (یہ قول کسائی کا ہے)۔[3] یا بتقدیر بائے سببیت کے "أَيْ: بِأَنْ كَذَّبُوْا" یا بدل یا عطفِ بیان ہے "سُوْآى" کا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تکذیب، یعنی رسولوں کو جھٹلانا خصلتِ "سُوْآى" اور عقوبتِ "سُوْآى" ہے، اس لیے تکذیب کا بدل یا عطفِ بیان ہونا خصلتِ "سُوْآى" اور عقوبتِ "سُوْآى" کے واسطے صحیح ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ پھر ان کا انجام تکذیب ہی ہوئی، یعنی وہ اسی تکذیب پر مرے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ان کو بدلا دیا ان کے برا کرنے پر اس طرح سے کہ ان کے دلوں پر مہر کر دی، یہاں تک کہ تکذیب پر مر گئے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ﴿ اَنْ كَذَّبُوْا ﴾ خبر ہو ﴿ كَانَ ﴾ کی۔ اس صورت میں "سُوْآى"، مثل "يُسْرٰى" و "ذِكْرٰى" کے مصدر ہوگا بہ معنی "إِسَاءَتُ" کے اور "أَسَاءُوا" سے منصوب ہوگا،

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٠) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٣٢٩) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٠)

یا "أَسَاءُوا" کا مفعول ہوگا، اس لیے کہ "أَسَاءُوا" میں "اِقْتَرَفُوْا" (اقتراف، ارتکاب و اکتساب) کے معنی شامل ہیں اور "سُوْآى" تانیث "أَسْوَأُ" بہ معنی "أَقْبَحُ" ہوگا۔ (یا مصدر ہی رہے گا، لیکن مبالغے کے لیے خطیہ یا عقوبت کو اس کے ساتھ موصوف کر دیں گے) معنی یہ ہیں: ان لوگوں کا جنھوں نے خطیہ کمایا، جو بدترین خطایا تھا، ان کا انجام یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، یہاں تک کہ انھوں نے آیتوں کی تکذیب کی اور ان کے ساتھ ٹھٹھا کیا۔

یہ بھی احتمال ہے کہ "سُوْآى" "أَسَاءُوا" کا مفعول ہو اور ﴿ اَنْ كَذَّبُوْا ﴾ اس کا بدل یا عطفِ بیان ہو اور ابہام اور تہویل کے لیے خبر محذوف ٹھہرے۔ معنی یہ ہیں پھر ان لوگوں کا جنھوں نے تکذیب اور استہزاء، جیسا بدترین گناہ کمایا، ایسا انجام ہوا جس کی حقیقت بیان نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس کی شدت اور سختی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اَنْ ﴾ مفسرہ ہو، کیوں کہ جب "إساءت" کی تفسیر تکذیب و استہزاء کے ساتھ کی گئی تو "إساءت" قول کے معنی میں ہوگئی۔ امام ابن عامر اور کوفیین نے ﴿ عٰقِبَةَ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "سُوْآى" ﴿ كَانَ ﴾ کا اسم ہے اور ﴿ اَنْ كَذَّبُوْا ﴾ میں وہی وجوہ مذکور ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "سُوْآى" نام ہے جہنم کا جس طرح کہ "حُسْنٰى" جنت کا نام ہے۔ امام فراء، زجاج، ابن قتیبہ اور اکثر مفسرین رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔

جہنم کا نام "سُوْآى" اس لیے رکھا ہے کہ وہ اپنے صاحب کو برا لگتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں: پھر ان لوگوں کا انجام جنھوں نے شرک کیا، نار ہوا، اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے اور ان کے استہزاء کے سبب سے۔[2] جملہ ﴿ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ كَذَّبُوْا ﴾ پر اور اس کے ساتھ علیت کے حکم میں داخل ہے "أحد القولين" کی بنا پر۔ یا ﴿ كَانَ ﴾ کے حکمِ اسمیت میں۔ یا اس کی خبریت میں داخل ہے دیگر قول کی بنا پر۔ پھر جب اللہ پاک یہ ذکر کر چکا کہ برائی کرنے والے کا انجام بدتر عقوبت ہوئی تو یہ امر بیان کیا کہ موت کے بعد ساری مخلوقات حشر کی جائے گی، پھر جزا کے لیے اسی کی طرح لوٹائی جائے گی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[3]

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۱۲ وَلَمْ يَكُنْ
لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآىِٕهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝۱۳
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۝۱۴ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۝۱۵ وَاَمَّا الَّذِيْنَ

[1] تفسير البيضاوي (٤/ ٣٢٩) [2] فتح القدير (٤/ ٢٨٤) [3] فتح البيان (١٠/ ٢٢٩ـ ٢٣١)

كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

اللہ ہی پہلی بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے، پھر وہی اسے لوٹائے گا، پھر اسی کی طرف تمھیں لوٹایا جائے گا⑪ اور جس دن قیامت قائم ہو گی (تو) مجرم لوگ سخت مایوس ہوں گے⑫ اور ان کے شریکوں (معبودوں) میں سے کوئی ان کا سفارشی نہیں ہوگا اور وہ خود بھی اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے⑬ اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو جائیں گے⑭ پھر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے تو وہ باغ (بہشت) میں خوش و خرم ہوں گے⑮ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا تو وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے⑯

مخلوق کو دوبارہ پیدا کرنے اور مجرموں کی مایوسی کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ﴾ یعنی جس طرح وہ خلق کو پہلی بار بنانے پر قادر ہے، اسی طرح اس کے دہرانے پر قادر ہے۔ ﴿ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی پھر قیامت کے دن اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے تو وہ ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کی جزا دے گا۔ پھر فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "يَيْأَسُ"۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "يَفْتَضِحُ" اور ایک روایت میں "يَكْتَئِبُ" ہے،[1] یعنی جس دن قیامت قائم ہوگی، نا امید رہ جائیں گے یا رسوا ہو جائیں گے یا گنہگار چپ رہ جائیں گے۔

شفاعت اور خود ساختہ شریکوں کی نفی:

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی جن معبودوں کو وہ اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے، وہ ان کے حق میں شفاعت نہ کریں گے اور ان کے منکر ہو جائیں گے اور ان کی خیانت کریں گے، ایسے وقت میں کہ سب اوقات سے بڑھ کر ان کی طرف محتاج ہوں گے۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! یہ وہ فرقت ہے جس کے بعد کسی طرح کا اجتماع نہ ہوگا،[2] یعنی جس وقت یہ تو علیین کی طرف اوپر اٹھا لیا جائے گا اور یہ ﴿ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴾ کی طرف نیچے پھینکا جائے گا،

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٨٨ـ ٣٠٨٩) ② تفسير الطبري (٢٠/ ٨١)

تو یہ باہم دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴾ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ يُحْبَرُوْنَ ﴾ بہ معنی "یُنْعَمُوْنَ"، یعنی جنت میں ان کو عیش و آرام ملے گا۔ امام یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ نے کہا: مراد سماعِ غنا ہے اور حبرہ اس سب سے زیادہ عام ہے۔ عجاج نے کہا ہے:

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَعْطَى الْحَبَرْ مَوَالِيَ الْحَقِّ إِنَّ الْمَوْلٰى شَكَرْ [1]

[سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے خوشیاں عطا کیں اپنے سچے دوستوں کو اور بلاشبہ وہ دوست قدر دانی کرنے والا ہے]

فتح البیان کا بیان

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ اللہ پاک خلق کو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے، پھر موت کے بعد اس کو دوبارہ ویسے ہی زندہ کرے گا جیسے وہ تھی۔ پھر وہ اس جگہ کی طرف پھیر کر لائے جائیں گے جو حساب کتاب کے لیے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ نیک کو اس کی نیکی کرنے کی جزا دے گا اور بد کو اس کی بدی کرنے کی سزا دے گا۔ لفظ ﴿ اَلْخَلْقَ ﴾ کے اعتبار سے ﴿ يُعِيْدُهٗ ﴾ میں ضمیر مفرد ذکر کی ہے اور ﴿ تُرْجَعُوْنَ ﴾ میں معنی کے اعتبار سے ضمیر جمع ذکر فرمائی ہے۔ امام ابوبکر اور ابوعمرو رحمہما اللہ نے "یُرْجَعُوْنَ" بیائے تحتیہ اور باقی قراء نے بتائے خطاب پڑھا ہے۔ خطاب میں التفات ہے، جو مبالغے کی خبر دے رہا ہے۔ جمہور نے ﴿ يُبْلِسُ ﴾ بہ صیغۂ معروف اور سلمی نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ جب کوئی شخص ساکت ہو جاتا ہے اور اس کی حجت منقطع ہو جاتی ہے تو عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: "أَبْلَسَ الرَّجُلُ"، چنانچہ یہ لفظ لازم ہے متعدی نہیں ہوتا۔ امام فراء اور زجاج رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "مُبْلِسٌ" وہ ہے جو ساکت ومنقطع ہے اپنی حجت میں اور حجت کی طرف راہ پانے سے نا امید ہو گیا ہے، اسی بارے میں عجاج کا قول ہے:

يَا صَاحِ هَلْ تَعْرِفُ رَسْمًا مُكْرَسًا؟ قَالَ نَعَمْ أَعْرِفُهُ وَأَبْلَسَا [2]

یعنی اے میرے دوست! کیا تو پہچانتا ہے خانۂ محبوب کے نشان کو، جو سرگیں سے پُر ہو گیا ہے؟ تو اس نے کہا: ہاں میں اس کو پہچانتا ہوں اور چپ ہو رہا۔ قراءتِ مجہول میں بُعد ہے، کیوں کہ "أَبْلَسَ"، متعدی نہیں آتا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ مشرکین ہر خیر سے نا امید ہو گئے، جبکہ انھوں نے عذاب کا معائنہ کیا۔ [3] "إِبْلَاسٌ" کی تفسیر ﴿ فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٤٤] کے تحت گزر چکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا لفظ ﴿ يُبْلِسُ ﴾ کی تفسیر میں "یَبْتَئِسُ" ہے۔ دوسرا لفظ "یَکْتَئِبُ" ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ "إِبْلَاسٌ" بہ معنی فضیحت ہے۔ [4]

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ٨٢) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٦٢۔ ٥٦٣)
[2] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٠۔ ١١) فتح القدیر (٤/ ٢٨٧)
[3] فتح القدیر (٤/ ٢٨٧)
[4] فتح القدیر (٤/ ٢٩٢)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآىِٕهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس دن قیامت قائم ہو گی تو اس دن مشرکوں کے لیے ان کے شرکاء میں سے جن کو اللہ کے سوا پوجا ہے، یعنی بت نہ ہوں گے کہ وہ شفاعتی بن کر ان کی شفاعت کریں اور اللہ کے عذاب سے ان کو پناہ دیں اور اس وقت اپنے شرکاء کے منکر ہو جائیں گے، یعنی جن معبودوں کو اللہ پاک کا شریک ٹھہرایا تھا ان کے معبود ہونے کا انکار کریں گے، کیوں کہ اس وقت خوب جان لیں گے کہ وہ نہ نفع پہنچاتے ہیں نہ ضرر۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ دنیا میں ان کو پوجنے کی وجہ سے کافر تھے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ يَتَفَرَّقُوْنَ ﴾ کی ضمیر جمیع خلق کی طرف راجع ہے، ﴿ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ﴾ سے اس پر دلالت کی گئی ہے۔ تفرق سے مراد یہ ہے کہ ہر گروہ علاحدہ علاحدہ ہو جائے گا، چنانچہ مومنین تو جنت کی طرف چلے جائیں گے اور کافر آگ کی طرف، ان میں سے ہر فرد کا تفرق مراد نہیں ہے، اس کی مثل دوسری یہ آیت ہے: ﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾ [الشوریٰ: ۷] ''ایک گروہ جنت میں ہو گا اور دوسرا بھڑکنے والی آگ میں۔'' یہ تفریق حساب کے ختم ہونے کے بعد ہو گی۔ پھر کبھی وہ جمع نہ ہوں گے۔

پھر اللہ پاک نے ان کے متفرق ہونے کی کیفیت بیان فرمائی: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴾ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: میں نے زجاج کو سنا، وہ کہتے تھے کہ ''اَمَّا'' کے یہ معنی ہیں: ''دَعْ مَا كُنَّا فِيْهِ وَخُذْ فِيْ غَيْرِهِ'' یعنی جس حال میں ہم تھے اس کو چھوڑ اور اس کے غیر میں شروع کر۔ اسی طرح امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں: ''مَهْمَا يَكُنْ مِنْ شَيْءٍ فَخُذْ فِيْ غَيْرِ مَا كُنَّا فِيْهِ''[1] ''روضہ'' ہر اس زمین کو کہتے ہیں جو روئیدگی اور پانی اور رونق و تازگی والی ہو۔ کسی نے کہا: وہ باغ ہے جو بہت زیادہ تر و تازہ ہو۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اس جگہ اس سے مراد جنت ہے اور اس کو نکرہ لانا ابہامِ امر اور عظمتِ شان کے لیے ہے، یعنی وہ ایک بڑا عظیم الشان باغ ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: روضہ وہ ہے جو پستی میں ہو، پھر جب کہ وہ بلند جگہ میں ہو تو وہ ترعہ ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا: ''أَحْسَنُ مَا تَكُوْنُ الرَّوْضَةُ إِذَا كَانَتْ فِيْ مَكَانٍ مُّرْتَفِعٍ''[2] بہت بلند جگہ پر نہایت خوبصورت باغ کو روضہ کہتے ہیں۔

﴿ يُحْبَرُوْنَ ﴾ بہ معنی ''يُسَرُّوْنَ'' ہے۔ ''حُبُوْرٌ'' و ''حَبْرَةٌ'' بہ معنی سرور ہے، یعنی وہ جنت کے باغوں میں عیش و آرام کرائے جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ يُحْبَرُوْنَ ﴾ بہ معنی ''يُكْرَمُوْنَ'' ہے۔[3] امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: کسائی نے حکایت کیا ہے: ''حَبَرْتُهُ أَيْ: أَكْرَمْتُهُ وَنَعَّمْتُهُ''۔[4] کسی نے کہا: ''يُحَلَّوْنَ'' یعنی زیور پہنائے جائیں گے۔ اولیٰ تفسیر ﴿ يُحْبَرُوْنَ ﴾ کی سرور کے ساتھ ہے، چنانچہ اس کے عربی معنی یہی ہیں۔

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١١) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ١١) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٨٢) [4] تفسير القرطبي (١٤/ ١٢)

جنت کا داخلہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس پر بہت زیادہ اکرام اور نعمتیں اور سرور ہے۔ کسی نے کہا: "تحبیر" تحسین ہے۔ چنانچہ ﴿ یُحْبَرُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ حسین بنائے جائیں گے، زیور وغیرہ سے آراستہ کیے جائیں گے۔ کسی نے کہا: سماع ہے جس کو وہ جنت میں سنیں گے۔ اس کے سوا اور اقوال ہیں، بہتر وہ ہے جو پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

دیلمی نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کہاں ہیں وہ لوگ جو اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کو مزامیرِ شیطان سے منزہ رکھتے تھے، یعنی شیطان کے راگوں سے، ان کو علاحدہ کرو، پھر وہ مشک اور عنبر کے ڈھیروں پر جدا کیے جائیں گے۔ پھر فرشتوں سے فرمائے گا: ان کو میری تسبیح و تحمید و تہلیل سناؤ۔ فرمایا: پھر وہ ایسی آوازوں سے تسبیح کریں گے کہ سننے والوں نے اس کے مثل کبھی نہ سنا ہو گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا، پھر پہلی حدیث کی مثل ذکر کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے۔ اپنے تنا پر اس کا سایہ اتنا بڑا ہو گا کہ ایک تیز چلنے والا سوار سو برس تک اس میں چلے۔ چنانچہ جنت والے نکلیں گے، بالا خانوں والے اور دوسرے تو اس کے سائے میں بات چیت کریں گے، پھر ان میں سے کوئی خواہش کرے گا اور دنیا کے لہو کو یاد کرے گا تو اللہ جنت سے ایک ہوا بھیجے گا، پس وہ اس درخت کو ہر لہو کے ساتھ حرکت دے گی جو دنیا میں تھا۔[1] (أخرجه ابن أبي الدنيا والضياء المقدسي كلاهما في صفة الجنة، قال السيوطي: بسند صحيح وأخرج الحكيم الترمذي في نوادر الأصول عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ مرفوعا نحوه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کا انکار کیا اور قرآن کو اور بعث و جنت اور دوزخ کو جھٹلایا تو وہ لوگ جن میں یہ صفتیں ہیں، عذاب میں قیام کرنے والے ہیں، اس سے باہر نہ نکلیں گے اور نہ ان سے تخفیف کی جائے گی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ﴾ [المائدة: ٣٧] "مگر وہ اس میں سے نہیں نکل سکیں گے۔" کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مُحْضَرُوْنَ ﴾ بہ معنی "مَجْمُوْعُوْنَ" ہے۔ کسی نے کہا کہ "نَازِلُوْنَ"۔ کسی نے کہا کہ "مُعَذَّبُوْنَ"۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں، مراد ان کے عذاب کا ہمیشہ رہنا ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے طائفہ مومنین اور طائفہ کافرین کا انجام بیان کیا تو مومنین کو وہ شے بتائی جس میں اجرِ وافر اور عام بھلائی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿١٧﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿١٨﴾

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٨٦۔ ٤٨٧) [2] فتح البیان (١٠/ ٢٣١۔ ٢٣٤)

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿١٩﴾

لٰہذا تم اللہ کی تسبیح (پاکی بیان) کرو جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو⑰ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے تمام حمد ہے، اور (تسبیح کرو) پچھلے پہر اور جب تم ظہر کے وقت میں داخل ہو⑱ وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، اور وہی زمین کو اس کے مردہ (ویران) ہونے کے بعد زندہ (آباد) کرتا ہے اور اسی طرح تمھیں بھی (زمین سے) نکالا جائے گا⑲

نمازِ پنج گانہ کا حکم:

یعنی پاک اللہ کو یاد کرو اور اس کی خوبی آسمان و زمین میں ہو رہی ہے۔ ان چار وقتوں پر یاد کرو: صبح کی نماز اور شام کی نماز، اسی میں مغرب اور عشا آ چکیں، اور پچھلے وقت عصر اور دوپہر ظہر۔ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے، یعنی مٹی مردہ سے جیتے جاندار نکالتا ہے۔ انتھیٰ[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے اپنے نفسِ مقدس کے لیے تسبیح ہے۔ اور اپنے بندوں کو ارشاد ہے کہ ان وقتوں میں جو یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور اس کی کمال قدرت اور عظیم سلطان پر دلالت کرتے ہیں، اس کی تحمید و تسبیح کیا کریں۔ "مساء" رات کا اپنی تاریکی لے کر آنا ہے۔ "صباح" دن کا اپنی روشنی سے روشن ہونا ہے۔ پھر تسبیح کی مناسبت سے جملہ معترضہ کے ساتھ اپنی حمد کا ذکر فرمایا۔ یہ تحمید ہوئی۔ پھر فرمایا: ﴿ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اس پر وہی تعریف کے لائق ہے، اسی کی حمد کی جاتی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴾ عشا تو شدتِ تاریکی ہے اور اظہار روشنی کی قوت ہے۔ فَسُبْحَانَ خَالِقُ هٰذَا وَهٰذَا.

﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا ﴾ [الأنعام: ٩٦] ''وہ صبح کی سپیدی نکالتا ہے اور اس نے رات کو سکون کا باعث بنایا۔'' جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ﴾ [الشمس: ٣۔ ٤] ''اور دن کی قسم جب وہ سورج کا جلوہ دکھاتا ہے۔ اور رات کی جب وہ اسے ڈھانپ لیتی ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ﴾ [الليل: ١۔ ٢] ''رات کی قسم جب وہ چھا جائے۔ اور دن کی جب وہ روشن ہو۔'' اور فرمایا: ﴿ وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ﴾ [الضحیٰ: ١۔ ٢] ''دھوپ چڑھنے کے وقت کی قسم! اور رات کی جب وہ چھا جائے۔'' اس بارے میں آیتیں بہت ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سہل بن معاذ بن انس جہنی عن ابیہ عن رسول اللہ ﷺ

روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو خبر نہ دوں کہ اللہ نے ابراہیم خلیل کا نام ﴿ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴾ [النجم: ۳۷] ''اور ابراہیم جس نے (صحیفوں میں جو باتیں تھیں، انھیں) ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا۔'' کیوں رکھا، اس لیے کہ وہ جب صبح کرتا اور جب شام کرتا تو کہا کرتا تھا: ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴾ (فتحسین میں کہا ہے: وأخرجه أحمد والطبراني وابن السني وغيرهم وفي إسناده ابن لهيعة)[1]

امام طبرانی رحمہ اللہ نے عن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عن رسول اللہ ﷺ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص جب صبح کرے تو یہ آیت اچھی طرح سے کہے: ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴾ تو وہ اس شے کو پالے گا جو اس کے دن میں اس سے فوت ہوئی اور جو کوئی اس کو شام کے وقت کہے تو وہ اس سے اس شے کو پالے گا جو اس سے اس کی رات میں فوت ہوئی۔ (هذا إسناد جيد و رواه أبو داود في سننه) (فتحسین میں یوں کہا ہے: وأخرجه أبو داود و الطبراني و ابن السني وغيرهم و إسناده ضعيف)[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ﴾ یہ اللہ پاک کی وہ قدرت ہے جس میں ہم ہیں کہ جو اشیاء باہم ایک دوسرے کی ضد ہیں ان کے پیدا کرنے پر اس کو قدرت ہے کہ شب و روز اس قسم کی اشیاء پیدا فرماتا ہے۔ یہ آیاتِ متتابعہ کریمہ سب کی سب اسی قسم سے ہیں، کیوں کہ ان میں یہ بات ذکر کرتا ہے کہ وہ اشیاء کو پیدا فرماتا ہے اور ان کی ضدوں کو، تاکہ اپنی خلق کو اپنی کمال قدرت سے آگاہ فرمائے۔ چنانچہ ان سب میں سے دانے سے انگوری نکالنا ہے اور دانے کا روئیدگی سے نکالنا ہے، اور انڈوں کا مرغی سے اور مرغی کا انڈوں سے اور انسان کا نطفے سے اور نطفے کا انسان سے اور مومن کا کافر سے اور کافر کا مومن سے۔

زمین کی روئیدگی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴾ [یٰس: ۳۳۔ ۳٤] ''اور ان کے لیے ایک نشانی (خشک) زمین ہے جس کو ہم نے زندہ کر دیا اور اس سے غلہ نکالا جس میں سے وہ کھاتے ہیں اور ہم نے اس میں کھجوروں کے اور انگور کے باغات پیدا کر دیے اور جن میں ہم نے چشمے بھی جاری کر دیے۔''

---

[1] مسند أحمد (۳/ ٤۳۹) المعجم الكبير (۲۰/ ۱۹۲) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔

[2] المعجم الكبير (۱۲/ ۲۳۹) سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۰۷٦) فتح القدير (٤/ ۲۹۲۔ ۲۹۳) فتح البيان (۱۰/ ۲۳۵) اس کی سند میں ''محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانی اور سعید بن بشیر'' ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث. ۵۷۳۳)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُۥ يُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ﴾ [الحج: ٥۔ ٧] ''اور آپ زمین کو بنجر اور خشک پڑی دیکھتے ہیں، پھر جب ہم نے اس پر پانی نازل کیا تو وہ لہلہا اُٹھی، اور پھولی، اور اس نے ہر طرح کی خوش نما نباتات نکالیں۔ یہ (سب کچھ) اس لیے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے اور بے شک وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور بے شک وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ اور یہ کہ بلاشبہہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور بے شک اللہ ان کو اُٹھائے گا جو قبروں میں (پڑے) ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِۦ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِۦ مِن كُلِّ الثَّمَرَٰتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴾ [الأعراف: ٥٧] ''اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت سے پہلے خوش خبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے، حتی کہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بادلوں کو اٹھاتی ہیں تو ہم انھیں کسی مردہ شہر کی طرف ہانک دیتے ہیں، پھر ہم ان کے ذریعے سے پانی نازل کرتے ہیں، پھر ہم اس کے ذریعے سے (زمین سے) ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' اور اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ﴾[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ حرفِ فاء ماقبل پر مابعد کی ترتیب کے لیے ہے، یعنی جب تم یہ بات جان چکے تو اللہ کی تسبیح کرو، یعنی جو شے اس بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں ہے، اس سے اس کی پاکیزگی بیان کرو اس کو اس سے مبرا اور منزہ سمجھو اور کمال صفات کے ساتھ اس کا وصف کرو، صبح و شام کے وقت اور دن کے پچھلے حصے میں اور دوپہر میں۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا کہ اس جگہ تسبیح سے مراد پانچوں نمازیں ہیں، چنانچہ ﴿ حِينَ تُمْسُونَ ﴾ تو مغرب اور عشاء کی نماز ہے اور ﴿ حِينَ تُصْبِحُونَ ﴾ فجر کی نماز ہے اور ﴿ عَشِيًّا ﴾ نمازِ عصر اور ﴿ حِينَ تُظْهِرُونَ ﴾ نمازِ ظہر ہے۔ امام ضحاک اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ وغیرہما نے اسی طرح کہا ہے۔

﴿ وَعَشِيًّا ﴾ معطوف ہے ﴿ حِينَ ﴾ پر۔ وقتِ عشی نمازِ مغرب سے عتمہ تک ہے۔[2] (قاله الجوهري)۔ ایک قوم نے کہا کہ زوالِ آفتاب سے طلوعِ فجر تک ہے۔ جملہ ﴿ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان معترضہ ہے۔ اس سے غرض حمد کی طرف ہدایت دینا ہے اور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ حمد

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٦٣۔ ٥٦٤) [2] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٤۔ ١٥)

اور تسبیح کو جمع کرنا مشروع ہے، جس طرح کہ اس آیت میں آیا ہے: ﴿ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾ [الحجر: ٩٨] ''آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ ﴾ [البقرة: ٣٠] ''اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔''

کلمہ ﴿ فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ نفسِ حمد سے متعلق ہے، یعنی حمد اللہ کے واسطے ہوتی ہے آسمانوں اور زمین میں۔ کسی نے کہا: ﴿ وَلَهُ الْحَمْدُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کے ساتھ حمد کو خاص کرنا نماز کے ساتھ ہے جس میں حمد پڑھی جاتی ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ ﴾ کے معنی ''فَصَلُّوا لِلّٰهِ'' یعنی اللہ کے لیے نماز پڑھو۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: اہلِ تفسیر اس پر ہیں کہ یہ آیت پانچوں نمازوں کے بارے میں ہے۔ کہا: میں نے محمد بن یزید کو سنا، وہ کہتے تھے کہ میرے نزدیک اس کی حقیقت یہ ہے: ''فَسَبِّحُوا اللّٰهَ فِيْ الصَّلَوَاتِ'' یعنی تم نمازوں میں اللہ کی تسبیح کرو، اس لیے کہ تسبیح نماز میں ہوتی ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''كُلُّ تَسْبِيْحٍ فِيْ الْقُرْآنِ فَهُوَ صَلَاةٌ''[2] یعنی قرآن شریف میں جہاں کہیں تسبیح کا ذکر ہے تو اس سے مراد نماز ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت نے نماز کے اوقات کو جمع کر لیا ہے۔ ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ ﴾ مغرب وعشاء ہے۔ ﴿ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴾ فجر ہے۔ ﴿ وَعَشِيًّا ﴾ عصر ہے۔ ﴿ وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴾ ظہر ہے۔[3] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے ''حِيْنًا تُمْسُوْنَ وَحِيْنًا تُصْبِحُوْنَ'' پڑھا ہے،[4] یعنی تم تسبیح کرو اللہ کی اس وقت جس میں تم شام کرتے ہو اور اس وقت جس میں تم صبح کرتے ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ﴾ کا بیان سورت آل عمران میں گزر چکا ہے۔[5] اس آیت کے ماقبل کے ساتھ تعلق کی وجہ یہ ہے کہ انسان صبح کے وقت نیند سے نکلتا ہے جو موت سے مشابہ ہے اور بیداری کی طرف آتا ہے جو وجود کے مشابہ ہے اور عشاء کے وقت بیداری سے نکلتا ہے نیند کی طرف۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴾ یعنی زمین کی خشکی کی وجہ سے مر جانے کے بعد اس کو روئیدگی کے ساتھ زندہ کرتا ہے۔ یہ زندہ کو مردے سے نکالنے کے مشابہ ہے اور اس نکالنے کی طرح تم اپنی قبروں سے نکالے جاؤ گے۔ جمہور نے ﴿ تُخْرَجُوْنَ ﴾ بصیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ اور حمزہ نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ چنانچہ نکلنے کی نسبت لوگوں کی طرف کی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ ﴾[6] [المعارج: ٤٣] ''جس دن وہ قبروں سے نکلیں گے۔'' معنی یہ ہیں کہ جو ذات پاک مردے کو زندے سے اور زندے کو مردے سے نکالنے پر قادر ہے، اس کی قدرت میں پہلی دفعہ پیدا کرنا اور دوبارہ پیدا کرنا دونوں برابر ہیں۔[7]

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٨٨) [2] تفسير الطبري (١٩/ ١٩١) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٨٤) [4] تفسير القرطبي (١٤/ ١٥)
[5] رقم الآية (٢٧) [6] فتح القدير (٤/ ٢٨٨) [7] فتح البيان (١٠/ ٢٣٤۔ ٢٣٥)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ
تَنْتَشِرُوْنَ ۝۲۰ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱

اور (یہ) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اب تم بشر ہو (جو ہر طرف) پھیل رہے ہو (20) اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے عظیم نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں (21)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے درخت کی نسل چلائی ایک سے اور جانور کی نسل دو سے۔ پھر بعضے جانور کا جوڑا مقرر نہیں (باز شکاری پرندہ مادہ ہی ہوتا ہے، اس کا نر اس کی جنس سے نہیں ہے، بلکہ اس کا نر اور شکاری پرندوں سے ہوتا ہے، جیسے صقر وغیرہ۔ "حیاۃ الحیوان" میں اس کی خوب بحث ہے) اور بعضوں کا مقرر ہے۔ انسان کو جوڑا مقرر ٹھہرایا، اس میں نسل کے سوا اُنسیت اور پیار ہے اور چین و محبت تا کہ جہان کی بستی ہو۔ جو کوئی جوڑا مقرر نہ کرے، یعنی زنا کرے وہ انسان سے حیوان ہوا۔ انتھی[1].

جو نشانیاں اللہ پاک کی عظمت اور اس کی قدرت کا کمال بتا رہی ہیں، ان میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھارے باپ آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اب تم انسان ہو اور پھیل چکے ہو۔ چنانچہ تمھاری اصل مٹی سے ہے، پھر ایک ضعیف پانی سے، پھر صورت بنائی گئی، پھر جما ہوا خون، پھر گوشت کا ٹکڑا، پھر وہ ہڈیاں ہو گیا، جس کی شکل انسان کی شکل ہوئی، پھر اللہ پاک نے ان ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اس میں روح پھونکی تو اسی دم وہ ہنستا کھیلتا ہو گیا، پھر اپنی ماں کے پیٹ سے اس حال میں نکلا کہ وہ چھوٹا سا ضعیف القویٰ، ضعیف الحرکت تھا، پھر جب اس کی عمر دراز ہوئی تو اس کے قویٰ اور حرکات کامل ہو گئے، یہاں تک کہ آخر کو اس کا یہ حال ہوا کہ شہر اور قلعے بنانے لگا اور اقالیم کے اطراف میں سیر وسفر کرنے لگا، دریاؤں کی پشت پر سوار ہونے لگا، زمین کے اطراف میں پھرنے لگا اور کمانے، کھانے اور مال جمع کرنے لگا۔ اس کو غور وفکر کرنا اور دانائی و چالاکی و ہوشیاری، مکر و فریب اور داؤ گھات اور رائے و علم اس کو خوب آ گیا۔ دنیا اور آخرت کے کاموں میں اچھی طرح وسعت و فراخی اس کو حاصل ہوئی۔ ہر ایک کو اس کے

حوصلے اور لیاقت کے مطابق ان امور میں سے حصہ ملا۔

پاک ہے وہ ذات جس نے ان کا اندازہ کیا اور ان کو چلایا، پھرایا اور مسخر کیا، اور ان کو طرح طرح کی معیشت اور کسب کرنے کے طریقوں میں ان کو گردش دی اور ان کے درمیان علم وفکر، خوبصورتی اور بدصورتی، امیری وفقیری، نیک بختی اور بدبختی کے معاملے میں فرق رکھا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ ... الآية﴾۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، جس کو ساری زمین سے بھرا، چنانچہ بنی آدم زمین کے اندازے پر آئے۔ ان میں سے سفید رنگ کے ہیں اور سرخ و سیاہ ہیں اور ان کے درمیان، خبیث اور پاک اور نرم وسخت اور اس کے درمیان ہیں۔[1] (ورواه أبو داود و الترمذي من طرق عن عوف الأعرابي به، وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح)

ایک ہی جنس سے میاں بیوی کی پیدائش:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ... الآية﴾ یعنی اور اس کی نشانیوں سے یہ ہے کہ اس نے پیدا کیں تمھارے واسطے تمھاری جنس سے عورتیں کہ وہ تمھارے جوڑے ہوں، تاکہ تم ان کے پاس چین پکڑو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ﴾ [الأعراف: ۱۸۹] ''وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے تمھیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔'' زوج سے مراد حوا ہیں۔ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کے پہلوئے کوتاہ و بائیں طرف سے ان کو پیدا فرمایا۔ اگر اللہ پاک سارے بنی آدم کو مذکر کر دیتا اور ان کی عورتوں کو ان کے سوا کسی اور جنس سے بناتا، جن سے یا حیوان سے تو ان کے اور بیبیوں کے درمیان یہ الفت ہرگز حاصل نہ ہوتی، بلکہ اگر بیبیاں غیر جنس سے ہوتیں تو نفرت حاصل ہوتی۔

پھر اللہ پاک کی بنی آدم پر اپنی رحمت میں سے یہ ہے کہ اس نے ان کی بیبیاں انہیں کی جنس سے بنائیں اور ان کے درمیان مودت رکھی۔ ﴿ مَّوَدَّةً ﴾ کے معنی محبت ہیں اور رحمت بہ معنی رافت یا نرمی ہے، کیوں کہ مرد جو عورت کو اپنے پاس رہنے دیتا ہو، یا تو اس لیے ہے کہ اس سے محبت رکھتا ہے، یا اس لیے کہ اس پر رحم کرتا ہے، اس وجہ سے کہ اس عورت کا اس مرد سے کوئی بچہ ہوتا ہے، یا وہ عورت خرچ میں اس کی محتاج ہوتی ہے، یا اس لیے کہ دونوں کے درمیان الفت ہوتی ہے یا کچھ اور۔[2] (كذا في ابن كثير)

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٤٠٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٥٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٥٩)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٦٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ اللہ پاک نے ﴿ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ ﴾ کا لفظ چھے بار ذکر فرمایا ہے۔ ان کی انتہا ﴿ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴾ پر ہے۔ ان میں انسانی پیدایش کی ابتداء کا ایک ایک آیت کر کے ذکر کیا ہے، اس وقت تک کہ قبر سے مبعوث ہوگا اور اس آیت کو آسمان وزمین کے قیام پر ختم کیا ہے۔ اس لیے کہ ان کا قیام لازمی طور پر پیش آنے والی باتوں میں سے ہے، کیوں کہ آسمان وزمین میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نکلتا یا ہلتا نہیں ہے۔ اس لیے زمین کے ٹھہرے رہنے اور نیچے نہ اترنے سے اور آسمان کی بلندی اور اس کے بغیر ستون کے قائم رہنے سے تعجب کیا جاتا ہے۔

پھر اس کے بعد پچھلی اٹھان کا ذکر فرمایا ہے، وہ یہی ساری مخلوق کا زمین سے نکلنا ہے۔ "أنفس" سے دو امر کا ذکر کیا ہے: ایک تو انسان کی مٹی سے پیدایش کا، دوسرے اسی کی جنس سے اس کے جوڑے کا پیدا کرنا اور آفاق میں سے آسمان اور زمین کا ذکر کیا ہے۔ اور انسانی لوازمات سے دو باتوں کا ذکر کیا: ایک تو زبانوں کا اختلاف، دوسرے رنگ کا اختلاف اور اس کے عوارض سے دو شے کا ذکر کیا: ایک تو سونا، دوسرے روزی تلاش کرنا اور آفاق کے عوارض سے بجلی اور بارش کا ذکر کیا ہے اور ان کے لوازم سے آسمان کے قیام اور زمین کے قیام کا ذکر فرمایا ہے۔ "النہر" میں اسی طرح ہے۔ لہٰذا جو امور نوعِ انسانی سے متعلق ہیں، وہ چھے ہیں: دو اصول، دو لوازم اور دو عوارض اور چھے امور آفاق سے متعلق ہیں: دو اصول، دو لوازم اور دو عوارض۔

چنانچہ پہلے نوعِ انسانی کے اصول کا ذکر فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ یعنی اللہ پاک کی کھلی نشانیاں جو بعث اور نشور پر دال ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تم کو یعنی تمھارے باپ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا اور ان کی پیدایش کے ضمن میں تم کو بھی مٹی سے پیدا کیا، کیوں کہ فرع یعنی شاخ اصل سے مستمد و ماخوذ ہوتی ہے۔ اس کی تفسیر سورۃ الانعام میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔[1] کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ موضع رفع میں ہے بنا بر ابتدا اور ﴿ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ ﴾ اس کی خبر ہے۔

﴿ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴾ کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ ترتیب اور مہلت کے لیے ہوتا ہے، پس یہ دونوں یہاں ظاہر ہیں، کیونکہ وہ جو بشر ہوتے ہیں تو بعد اطوارِ کثیر کے۔ کلمۂ ﴿ اِذَآ ﴾ فجائیہ ہے۔ اگرچہ زیادہ تر یہ کلمۂ فاء کے بعد واقع ہوتا ہے، لیکن یہاں ﴿ ثُمَّ ﴾ کے بعد واقع ہوا ہے۔ چنانچہ یہ بہ نسبت اس شے کے ہے جو اس حالتِ خاص کے ساتھ لائق ہے، وہ حالت یہی اطوارِ انسان ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک نے کئی جگہ ان کا ذکر فرمایا ہے کہ پہلے وہ نطفہ ہوتا ہے، پھر علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈی جس پر گوشت پہنایا جاتا ہے: ان حالتوں کے بعد ناگاہ تم میں بشریت اور

[1] رقم الآیة (۲)

انتشار آ جاتا ہے۔ ﴿ تَنْتَشِرُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو شے تمھاری معاش اور گزران کے قوام سے ہے، اس میں تم تصرف کرتے ہو اور زمین میں پھیل جاتے ہوں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ﴾ یعنی اللہ پاک کی علامتوں اور نشانیوں میں سے جو بعث پر دال ہیں؛ ایک یہ ہے کہ جو شے بشریت اور انسانیت میں تمھاری جنس ہے، اس سے تمھارے لیے جوڑے بنا دیے۔ کسی نے کہا: ازواج سے مراد حوا علیہا السلام ہیں، کیوں کہ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کی پسلی سے ان کو پیدا کیا اور ان کے بعد عورتیں مردوں کی پشتوں اور عورتوں کے نطفوں سے پیدا کی گئیں۔ ﴿ لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا ﴾ کا یہ مطلب ہے: تاکہ تم ان سے الفت کرو، ان کی طرف مائل ہو، کیوں کہ دو مختلف جنسیں ایک دوسرے سے سکون حاصل نہیں کر سکتیں اور نہ ہی ایک کا دل دوسرے کی طرف مائل ہوتا ہے۔

﴿ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تمھارے درمیان محبت اور رحمت رکھی عصمتِ نکاح کے سبب سے کہ جس کی وجہ سے تمھارا بعض دوسرے پر شفقت اور مہربانی کرتا ہے، اس کے باوجود کہ نکاح سے پہلے تمھاری آپس میں کوئی جان پہچان نہیں ہوتی، محبت اور رحمت کا کیا ذکر! امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مودت جماع ہے اور رحمت اولاد ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مودت محبت ہے اور رحمت شفقت ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ مودت مرد کا اپنی بی بی کو دوست رکھنا ہے اور رحمت مرد کا اپنی جورو پر رحم کرنا ہے، اس سے کہ اسے کوئی تکلیف پہنچائے۔ کسی نے کہا ہے کہ مودت تو جوان عورت کے لیے ہے اور رحمت بوڑھی عورت کے لیے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مودت و رحمت اللہ کی طرف سے ہے اور فرک شیطان کی طرف سے۔ فرک عورت کا اپنے خاوند سے بغض رکھنا اور خاوند کا اپنی عورت سے بغض رکھنا ہے۔ ﴿ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ ﴾ موضع رفع میں ہے بنا بر ابتداء اور ﴿ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ ﴾ اس کی خبر ہے۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی یہ بات جو پہلے مذکور ہوئی البتہ اس میں عظیم الشان بدیع البیان اور واضح البرہان نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو اس بات میں غور و فکر کرتے ہیں کہ دنیا کا قیام وجودِ تناسل سے ہے۔ اس لیے کہ استدلال پر یہی لوگ قدرت رکھتے ہیں، کیوں کہ غور و فکر کرنا استدلال کے لیے ایک مادہ ہے، جس سے استدلال حاصل ہوتا ہے، یا اس لیے کہ چیزوں کا باہمی اُنس اور تجانس جوز وجین، یعنی شوہر اور بیوی کی طرح ہوتا ہے، اس سے جو معنی مطلوب ہیں، ان کو جاننے کے لیے ایسی ہی فکر چاہیے۔ رہے وہ لوگ جو غور و فکر سے غافل ہیں تو وہ صرف چوپایوں کی طرح ہیں۔[2]

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧) [2] فتح البيان (١٠/ ٢٣٦۔ ٢٣٧)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿22﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿23﴾

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے، بلاشبہ اس میں علم والوں کے لیے عظیم نشانیاں ہیں﴿22﴾ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمھارا رات اور دن کو سونا اور تمھارا اس کے فضل کو تلاش کرنا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے عظیم نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں﴿23﴾

رنگا رنگ مخلوق اور ان کی مختلف بولیوں کا بیان:

سب انسان ایک ماں باپ سے بنائے، ملا کر بسائے، پھر ان کی بولیاں جدا کر دیں، ایک ملک کا آدمی دوسرے ملک کے آدمی سے مختلف ہوتا ہے، جس طرح ایک ملک کے جانور دوسرے ملک کے جانوروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ انسان کی دو حالتیں بدلتی رہتی ہیں: وہ سوتا ہے تو پتھر کی طرح بے جان ہوتا ہے۔ روزی وغیرہ کی تلاش میں لگا تو ایسا ہوشیار ہوتا ہے کہ دوسرا کوئی ایسا نہیں۔ اصل تو رات سونے کے لیے ہے اور دن تلاش کے لیے، پھر دونوں وقت میں دونوں کام ہوتے ہیں۔ سننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں کہ اپنی نیند کے وقت کوئی چیز نظر نہیں آتی تو لوگوں سے زبانی سنتے ہیں۔ انتہٰی.

جو نشانیاں اللہ پاک کی عظیم قدرت کو ظاہر کرتی ہیں، ان میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ہے۔ دیکھو! اس نے آسمان کو کیسا بلند اور وسیع اور فراخ بنایا ہے اور ان کے اجرام کو شفاف و صاف اور ان کے ثوابت اور سیاروں تاروں کو کیسا چمکتا دمکتا پیدا کیا ہے۔ زمین کو دیکھو! کیسی پست اور موٹی تہہ والی بنائی ہے اور اس میں پہاڑ، وادیاں، دریا، جنگل، حیوان اور درخت پیدا کیے ہیں۔

دوسری نشانی یہ ہے کہ انسانوں میں زبانوں کا اختلاف کر دیا ہے، چنانچہ یہ عرب ہیں کہ عربی بولتے ہیں، یہ تتر ہیں ان کی کوئی اور ہی بولی ہے، یہ گرج ہیں، یہ روم ہیں، یہ فرنج ہیں، یہ بربر ہیں، یہ تکرور ہیں، یہ حبشی ہیں، یہ ہنود ہیں، یہ عجم ہیں، یہ صقالیہ ہیں، یہ جزر ہیں، یہ ارمن ہیں، یہ اکراد ہیں؛ ان کے سوا اور قومیں ہیں جن کی گنتی اور زبانوں کے اختلاف کو اللہ پاک ہی خوب جانتا ہے۔ رنگوں کے اختلاف سے مراد حلیے کا اختلاف ہے، ساری زمین والے بلکہ

دنیا والے جب سے کہ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، قیامت کے قائم ہونے تک، ہر انسان کی دو آنکھیں ہیں، دو بھنویں اور ناک، پیشانی، منہ اور دو گال ہیں، حالاں کہ ان میں ایک کسی دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتا، بلکہ بدن، طرز و روش یا ہیئت وصورت یا زبان میں وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ، باہم ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔

یہ بات غور کرنے کے وقت ظاہر ہوتی ہے، ان میں سے ہر ایک چہرے کا ایک اپنا خاص اسلوب اور ایک ہیئت ہوتی ہے، جو دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتی، اگر کوئی جماعت خوبصورتی یا بدصورتی میں ایک دوسرے کے موافق ہو تو بھی ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی نہ کوئی فرق کرنے والی چیز ہوگی، جس سے باہم تمیز ہو جائے گی۔

تیسری نشانی یہ ہے کہ رات اور دن میں تمھارے لیے خواب کی صفت پیدا کی۔ نیند میں راحت حاصل ہوتی ہے، حرکت کا سکون ہوتا ہے، تھکاوٹ جاتی رہتی ہے۔ اور معیشت کے اسباب اور سفر میں پھیلنا اور کوشش کرنے کے لیے دن ٹھہرایا، یہ نیند کی ضد ہے۔ ﴿ يَسْمَعُوْنَ ﴾ بہ معنی ''يَعُوْنَ'' ہے، یعنی بے شک اس میں البتہ ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو یاد رکھتے ہیں۔ امام طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مجھے رات کو بے خوابی لاحق ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس طرح دعا کر: « اَللّٰهُمَّ غَارَتِ النُّجُوْمُ، وَهَدَأَتِ الْعُيُوْنُ، وَأَنْتَ حَيٌّ قَيُّوْمٌ، يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ أَهْدِئْ لَيْلِيْ » ''الٰہی! پست ہو گئے یا ڈوب گئے تارے، اور ساکن ہو گئیں آنکھیں، اور تو حی اور قیوم ہے، اے حی، اے قیوم! تو آرام دے میری رات کو۔'' (هدوء: بضمتین آرامیدن واهداء: آرام دادن)۔ پھر میں نے ان کلمات کو کہا تو وہ مرض مجھ سے دور ہو گیا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جو نشانیاں امرِ بعث پر اور جو اس کے بعد جزا ہوگی، اس پر دال ہیں، ان میں سے آسمان و زمین کا پیدا کرنا ہے، کیوں کہ جس ذات پاک نے آسمان و زمین کے ان اجرامِ عظیم کو بغیر کسی ایسے مادے کے پیدا کیا جو اُن کی پیدائش میں مدد و معاون ہو، اور پھر ان کو اس وقت تک قائم رکھا، جب تک دنیا باقی ہے اور ان میں ایسی عجیب وغریب صنعتیں اور چیزیں پیدا کیں، جو عبرت لینے والوں کے لیے عبرت ہیں، وہی اس پر قادر ہے کہ موت کے بعد تم کو پیدا کرے اور تم کو تمھاری قبروں سے نکال کھڑا کرے۔ آسمان کا نام زمین سے پہلے اس لیے لیا کہ آسمان مذکر کی طرح ہے۔ چنانچہ پانی کا آسمان سے زمین پر اترنا ایسا ہے جیسے مرد کی منی عورت میں اترتی ہے، کیونکہ زمین اُگاتی ہے اور پانی سے سرسبز ہوتی ہے۔

زبانوں کا اختلاف یہ ہے کہ کسی کی زبان عربی ہے، کسی کی عجمی، کسی کی ترکی، کسی کی رومی، کسی کی کچھ اَور، اور

[1] المعجم الكبير (٥/ ١٢٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٦٥) اس کی سند میں ''عمرو بن حصین عقیلی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣٢٨)

یہ اختلاف اس طرح کیا کہ ہر صنف نے اپنی زبان جان لی۔ یا اس کو اس کی زبان کی شکل کا الہام کر دیا اور اس کو اس پر قدرت دے دی، یا زبان کی قسمیں اور شکلیں مراد ہیں، کیوں کہ تو دو بات کرنے والوں کو ہر لحاظ سے اور کیفیت میں برابر نہیں پائے گا۔ رنگوں کا مختلف ہونا یہ ہے کہ کوئی سفید ہے، کوئی سیاہ، کوئی سرخ، کوئی زرد، کوئی سرخ و سفید ہے، کوئی کبود رنگ، کوئی سبز، اس کے باوجود کہ تم سب ایک ماں باپ کی اولاد ہو اور ایک نوعِ انسانی سے ہو اور تم سب میں ایک خصلت یعنی نطق (بولنا) عام ہے۔ یہاں تک کہ تم ایک دوسرے سے زبان کے لحاظ سے مختلف ہو۔

یہ شخص اس شخص کے ساتھ متلبس نہیں ہوتا، بلکہ تم میں سے ہر فرد میں کوئی نہ کوئی ایسی شے ہے جو اسے دوسرے افراد سے متمیز کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ جو دو بچے جڑواں پیدا ہوتے ہیں، باوجود اس بات کے کہ ان کا مواد و اسباب اور دیگر امور جو ان کی پیدائش میں ہوتے ہیں، ایک جیسے ہوتے ہیں، وہ اگرچہ انتہا درجے میں آپس میں مشابہ ہوتے ہیں، پھر بھی وہ ضرور کسی نہ کسی شے میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے مختلف ہونے میں اللہ پاک کی وہ بدیع قدرت ہے جس کو عالم لوگ اور غور و فکر کرنے والے ہی سمجھتے بوجھتے ہیں۔ اگر آوازیں اور صورتیں سب کی متفق ہو جاتیں اور سب باہم ایک ہی شکل والے ہوتے اور سب ایک قسم کے ہو جاتے تو پھر تجاہل اور التباس واقع ہوتا اور بہت سی مصلحتیں بے کار ہو جاتیں، نہ دشمن دوست سے پہچانا جاتا، نہ قریب والا دور والے سے مختلف نظر آتا۔

چنانچہ پاک ہے وہ ذات جس نے خلق کو اس حال پر پیدا کیا جو اس نے چاہا اور جس کیفیت پر ارادہ کیا۔ رہی یہ بات کہ زبان اور رنگ کے اختلاف کو آفاقی آیات کے سلسلے کے ساتھ منسلک کیا باوجود اس کے کہ یہ دونوں باتیں انسانی جانوں کی نشانیوں میں سے ہیں اور یہ اس لائق تھیں کہ ان کو انسانوں اور ان کی ازواج کی پیدائش کے سلسلے میں منسلک ہوتیں۔ چنانچہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات سے آگاہ کرنا منظور ہے کہ یہ دونوں امر نشانی ہونے میں ایک مستقل درجہ رکھتے ہیں اور اس وہم سے بچنا ہے کہ یہ تتمۂ خلق انفس سے ہوں۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴾ امام خازن رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: ”لِعُمُوْمِ الْعِلْمِ فِيْهِمْ“[1] جمہور نے اس کو بہ فتحِ لام پڑھا ہے، یعنی بے شک البتہ اس میں دلالتیں ہیں اللہ پاک کی قدرتِ تامہ پر، ان لوگوں کے لیے جو اس عالم کی جنس سے ہیں بغیر فرق کے درمیان بر و فاجر کے۔ صرف حفص نے اس کو بکسرِ لام پڑھا ہے۔ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسرہ کی وجہ جید ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ [الرعد: ٤] ”بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔“ نیز فرمایا ہے: ﴿ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ [آل عمران: ١٩٠] ”عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾[2] [العنکبوت: ٤٣] ”اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔“

[1] تفسیر الخازن (٥/ ٢٠٦) [2] فتح القدیر (٤/ ٢٨٩)

.. قولہ تعالیٰ. ﴿ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ کسی نے کہا کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَابْتِغَاءُكُمْ مِّنْ فَضْلِهِ بِالنَّهَارِ" یعنی اس کی نشانیوں میں سے ہے تمھارا رات کو سونا اور دن میں تمھارا اس کے فضل سے تلاش کرنا۔ کسی نے کہا ہے کہ بغیر تقدیم و تاخیر کے معنی ٹھیک ہیں، یعنی اس کی بڑی نشانیوں سے یہ ہے کہ تم رات کو سوتے ہو اور بعض حالات میں دن کو استراحت کے لیے سوتے ہو، مثلاً: قیلولے کے وقت، اور تمھارا اس کے فضل کو تلاش کرنا رات اور دن دونوں میں ہے۔ کیوں کہ ابتغائے فضل ان میں سے ہر ایک میں واقع ہوتا ہے، اگرچہ دن میں رات کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ پہلے معنی تو باقی آیتوں کے مطابق، جو اس معنی میں وارد ہوئی ہیں، مناسب ہیں اور اس جگہ دوسرے معنی نظم قرآنی کے لحاظ سے مناسب ہیں۔ نیند اور ابتغاء (فضل تلاش کرنا) کا، جو یہاں ذکر کیا ہے اور ان کو بعث کی دلیلوں میں شامل کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوم موت کے مشابہ ہے اور حاجتوں کے لیے بھاگ دوڑ کرنا اور کمائی کرنے کے لیے سعی و کوشش کرنا؛ حیات بعد الموت کے مشابہ ہے۔ ﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴾ یعنی بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو آیات اور نصیحتوں کو ایسے سنتے ہیں جیسے غور وفکر کرنے والا تدبر کرنے والا سنتا ہے، چنانچہ وہ بعث پر اس سے استدلال کرتے ہیں۔[1]

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمھیں ڈرانے اور اُمید دلانے کے لیے بجلی دکھاتا ہے اور وہ آسمان سے پانی نازل کرتا ہے، پھر اس سے زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد اسے زندہ کرتا ہے، بلاشبہہ اس میں ان لوگوں کے لیے عظیم نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں (24) اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جب وہ تمھیں زمین میں سے ایک ہی بار پکارے گا تو تم یکایک (باہر) نکل آؤ گے (25)

[1] فتح البیان (۱۰/ ۲۳۷۔ ۲۳۹)

بجلیوں کا کوندنا بھی قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی ہے:

معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کھڑا ہے، اس میں تارے چلتے ہیں، جس کو اور جگہ فرمایا: تیرتے ہیں۔ انتھٰی.

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی نشانیوں میں سے، جو اس کی عظمت کی دلیل ہیں، یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی خوف اور طمع کے لیے دکھاتا ہے، یعنی کبھی تو تم ڈرتے ہو امطارِ مزعجہ وصواعقِ متلفہ سے جو اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ (''أَمْطَارٌ''، جمع ''مَطَرٌ'' بہ معنی باران۔ ''ازعاج'' از جا برکندن۔ ''صواعق'' جمع ''صاعقة''، صاعقہ وہ آگ ہے جو آسمان سے سخت گرج میں گر پڑتی ہے۔ اتلاف بہ معنی ہلاک کرنا) اور کبھی تم امید رکھتے ہو کہ اس بجلی میں ومیض ہے۔ (ومیض بجلی کے چمکنے کو کہتے ہیں، بغیر اس کے کہ ابر میں پراگندہ ہو جائے ایسے چمکنے کے بعد پانی آتا ہے)۔ اور اس بارش کی اُمید رکھتے ہو جس کی تمھیں حاجت ہوتی ہے جو ومیض کے بعد آتی ہے۔

اسی لیے اللہ پاک یوں فرماتا ہے: ﴿ وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾ یعنی بعد اس کے کہ زمین دبی پڑی تھی، نہ اس میں روئیدگی تھی نہ کوئی اور شے۔ پھر جب اس کو پانی ملا تو تازہ ہوئی اور ابھری اور طرح طرح کی رونق والی چیزیں اُگائیں۔ اس میں معاد پر اور قیامت کے قائم ہونے پر ایک کھلی عبرت اور دلیل ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [الحج: ٦٥] اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر (نہ) گرے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ﴾ [الفاطر: ٤١] ''بلاشبہ اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے (کہیں) وہ دونوں (اپنی جگہ سے) ہٹ نہ جائیں۔'' سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جس وقت قسم میں اجتہاد و کوشش کرتے تو یوں فرماتے: ''لَا وَالَّذِيْ تَقُوْمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ'' یعنی آسمان اور زمین قائم و ثابت ہے، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کو امر کیا ہے اور ان کو مسخر فرمایا ہے۔ پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو زمین و آسمان بدل کر اور کر دیے جائیں گے اور مردے زندہ ہو کر اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے، اللہ پاک کے حکم سے اور اس کے پکارنے سے، ان کو اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴾ یعنی تبھی تم نکل پڑو گے زمین سے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٢] ''جس دن وہ (اللہ) تمھیں بلائے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے تعمیلِ ارشاد کرو گے اور تم خیال کرو گے کہ بس تھوڑا عرصہ ٹھہرے ہو۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [النازعات: ١٣۔ ١٤] ''چنانچہ وہ (قیامت) تو صرف ایک (خوفناک) ڈانٹ ہوگی۔ تب لوگ ایک دم کھلے میدان میں

(جمع) ہوں گے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۵۳] ''وہ بس ایک (ہولناک) چیخ ہوگی، پھر یکا یک وہ سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔''[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ يُرِيْكُمُ ﴾ کے اول میں کلمۂ ''أن'' مقدر ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرِيْكُمْ... الخ'' حذف کی وجہ یہ ہے کہ کلام اس پر دال ہے جس طرح کہ طرفہ نے کہا ہے:

أَلَا أَيُّهَذَا اللَّائِمِي أَحْضُرُ الْوَغَا وَأَنْ أَشْهَدَ اللَّذَّاتِ هَلْ أَنْتَ مُخْلِدِي

تقدیر: ''أَنْ أَحْضُرَ الْوَغَا'' ہے، یعنی اے وہ شخص جو مجھ کو اس سے روکتا ہے ہوشیار ہو کہ میں لڑائیوں میں حاضر ہوں، جو کہ جان دینے کا مقام ہے اور اس سے کہ میں حاضر ہوں لذتوں کی مجلسوں میں جو روپیہ خرچ کرنے کا موقع ہے اور اس پر مجھے ملامت کرتا ہے کیا تو ہمیشہ مجھ کو دنیا میں رکھ سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ پھر بزدلی کرنے سے اور مال کے خوف سے لذت کو چھوڑنے سے کیا حاصل۔ لہٰذا جہاں تک بن سکے بہادری کی داد خوب دے، تاکہ نقشِ نیک نامی صفحۂ روزگار پر جما رہے اور خوب لذت لے اور مزہ اٹھالے، کیوں کہ بقا تو کسی کے لیے نہیں ہے۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

غرضیکہ پھر جب آیتِ کریمہ اور بیتِ مذکور میں حرفِ ''أَنْ'' حذف کیا گیا تو اس کا عمل بھی باطل ہو گیا۔ اسی بارے میں یہ مثل مشہور ہے: ''تَسْمَعُ بِالْمُعَيْدِيْ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَرَاهُ''۔ تقدیر: ''أَنْ تَسْمَعَ'' ہے۔ یعنی معیدی کو تیرا سننا، تیرے اس کو دیکھنے سے بہتر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''وَيُرِيْكُمُ الْبَرْقَ مِنْ آيَاتِهِ'' یعنی تجھ کو اپنی نشانیوں میں سے بجلی دکھاتا ہے، اس صورت میں جملہ فعلیہ کا جملہ اسمیہ پر عطف ہو گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ يُرِيْكُمُ ﴾ موصوف محذوف کی صفت ہو۔ ''أَيْ: وَمِنْ آيَاتِهِ آيَةٌ يُرِيْكُمْ بِهَا وَفِيْهَا الْبَرْقُ'' یعنی اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، جس کو وہ تم کو دکھاتا ہے اور اس میں بجلی ہے۔ کسی نے کہا: تقدیر یہ ہے: ''وَمِنْ آيَاتِهِ سَحَابٌ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا مِنْ آيَاتِهِ''۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عطفِ جملہ بر جملہ کے باب سے ہوگا۔[2]

﴿ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ مفعول لہ ہیں بحذفِ مضاف ''أَيْ: إِرَادَةَ خَوْفٍ وَّطَمَعٍ''۔ یا دونوں حال ہیں، بہ معنی ''خَائِفِيْنَ وَطَامِعِيْنَ''۔ اس کے معنی میں کئی قول ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مسافر کو خوف دلانے اور مقیم کو طمع دلانے کے لیے تم کو بجلی دکھاتا ہے۔[3] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صواعق سے خوف کے لیے اور بارش کے طمع کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵٦۵۔ ۵٦٦) [2] معاني القرآن (٤/ ۱۸۲) [3] تفسیر الطبري (۲۰/ ۸۸)

واسطے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: سردی کے خوف کے لیے کہ کہیں کھیتی کو برباد نہ کر دے اور پانی کے طمع کے لیے کہ اس سے کھیتی کو زندہ کر دے۔ ابن بحر نے کہا کہ اس خوف سے کہ برقِ خلّب ہو (ایسا بادل جس میں بارش نہ ہو) کہ پانی نہ برسائے اور اس بات کے طمع کے لیے کہ پانی برسانے والی ہو۔ ابن بحر نے اس معنی کی سند میں یہ شعر پڑھا ہے:

لَا يَكُنْ بَرْقُكَ بَرْقًا خُلَّبَا   إِنَّ خَيْرَ الْبَرْقِ مَا الْغَيْثُ مَعَهُ[1]

یعنی تیری بجلی خالی بجلی نہ ہو، کیوں کہ بہتر بجلی وہ ہے جس کے ساتھ پانی ہو۔ قولہ تعالیٰ: ﴿وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ یعنی اللہ پاک آسمان سے پانی اتارتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے خشکی کے ساتھ مرنے کے بعد روئیدگی دے کر زندہ کرتا ہے۔ ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ یعنی بے شک ان باتوں میں البتہ نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں، کیوں کہ جس کسی کو عقل کا کچھ حصہ بھی ملا ہے، وہ جان لے گا کہ یہ ایک ایسی نشانی ہے جس سے اللہ کی قدرتِ باہرہ پر استدلال کیا جاتا ہے، کیسے نہ کیا جائے، حالاں کہ عقل تو ملاکِ امر ہے اور یہی علم کی طرف پہنچانے والی ہوتی ہے اس شے میں جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ اور باتوں کی طرف۔

رہی یہ بات کہ اس جگہ ﴿يَعْقِلُونَ﴾ فرمایا اور پہلی آیت میں ﴿يَتَفَكَّرُونَ﴾ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کا والد کے ذریعے سے وجود میں آنا، چونکہ ایک ایسا امر تھا جو عادی، پے در پے واقع ہونے والا اور جس میں بہت کم اختلاف تھا تو اس سے اوہامِ قاصر پیدا ہو سکتے تھے کہ یہ حدوث بالطبیعہ ہے، کیوں کہ جو چیز پے در پے واقع ہو، وہ مختلف ہونے کی نسبت طبیعت اور عادت کے قریب ہوتی ہے اور بجلی اور بارش کوئی ایسا امرِ مطرد (جو پے در پے واقع ہونے والا ہے) اور غیر مختلف نہیں ہے، بلکہ مختلف ہوتا ہے، کیوں کہ ایک شہر میں واقع ہوتا ہے دوسرے میں نہیں ہوتا، کسی وقت میں پڑتا ہے کسی میں نہیں پڑتا، کبھی قوی ہوتا ہے کبھی ضعیف۔ چنانچہ اس کی دلالت عقل میں فاعلِ مختار پر زیادہ تر ظاہر ہے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ اس شخص کے لیے ایک نشانی ہے جس کے پاس عقل ہے، گو وہ کامل طور پر غور و فکر نہ کرے۔ (كذا قاله الكرخي)

پہلے اللہ پاک نے ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ میں آسمان و زمین کی ایجاد کا بیان فرمایا تھا۔ اب ان کی بقا اور ثبات کا بیان شروع کیا تو ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ﴾ یعنی آسمان و زمین کا بقا و ثبات اور قیام اور استمساک محض اللہ پاک کے ارادہ اور قوت سے ہے بغیر کسی ستون کے جو ان کو تھامے اور بغیر کسی قرار گاہ کے جس پر وہ قرار پکڑیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ہیں: "أَنْ تَدُومَا قَائِمَتَيْنِ بِأَمْرِهِ"[2] یعنی ان کا دائم قائم رہنا اس کے حکم سے ہے۔ کلمۂ ﴿أَنْ﴾ جو استقبال کی نشانی ہے، اس کا اس جگہ اظہار

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٨۔ ١٩)
[2] فتح القدير (٤/ ٢٩٠)

کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قیام بہ معنی بقاء ہے، ایجاد کے معنی میں نہیں ہے اور بقا باعتبار اپنے اواخر اور ان آیتوں کے نزول کے بعد مستقبل ہے۔[1] (قاله الشهاب)

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ﴾ چار جگہ ذکر کیا اور پہلی دفعہ میں، یعنی ﴿ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ اس کا ذکر نہ کیا اور نہ اخیر میں، وہ یہی ہے: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ... الخ ﴾۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی میں انفس اور ازواج کی پیدایش کا ذکر تھا جو ایک ہی باب سے تھا۔ یعنی ایجاد۔ اس لیے ان میں اس کا ایک ہی بار ذکر کرنے پر اکتفا کیا۔ رہا قیامِ سماوات وارض جو اخیر قول ہے، اس میں ذکر نہ کرنے کی یہ وجہ ہے کہ آیاتِ سماویہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ "إِنَّهَا آيَاتٌ لِّلْعَالِمِيْنَ، وَلِقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ، وَلِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ" ان کے ظہور کے سبب سے، پھر جب اول امر میں آیت ہونا ظاہر تھا تو آخر امر میں دلائل بیان کرنے کے بعد ظاہر تر ہوگا، اس لیے ایک کا ایک سے تمیز نہ کیا اور جو اس کا مدلول تھا، یعنی اعادے پر اللہ پاک کی قدرت تو اس کا ذکر کر دیا۔[2] (كذا قال الرازي)

﴿ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴾ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ ﴿ دَعَاكُمْ ﴾ سے متعلق ہے۔ پھر تمھارے مرنے کے بعد اور تمھارے قبروں میں چلے جانے کے بعد جب تم کو پکارے گا، ایک دفعہ پکارنا اس زمین سے جس میں تم ہو تو اسی وقت اس سے تیزی سے نکل پڑو گے، بغیر رکے ہوئے اور توقف کیے ہوئے، جس طرح کہ کوئی مطیع اور فرمانبردار، جس کو پکارا جائے تو وہ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ ﴿ مِنْ ﴾ کا دعا سے تعلق ایسا ہے جیسا کہ محاورے میں بولتے ہیں: "دَعَوْتُهُ مِنْ أَسْفَلِ الْوَادِيْ فَطَلَعَ إِلَيَّ"۔ کسی نے کہا ہے کہ محذوف سے متعلق ہے اور وہ ﴿ دَعْوَةً ﴾ کی صفت ہے۔ یا اس محذوف سے متعلق ہے جس پر ﴿ تَخْرُجُوْنَ ﴾ دال ہے۔ "أَيْ: خَرَجْتُمْ مِنَ الْأَرْضِ"۔ ﴿ تَخْرُجُوْنَ ﴾ سے متعلق ہونا جائز نہیں، اس لیے کہ ﴿ اِذَاۤ ﴾ کا مابعد اس کے ماقبل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔

یہ دعوت وہی اسرافیل علیہ السلام کا آخری نفخہ ہے، جو وہ صور میں پھونکیں گے، جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ اِذَاۤ ﴾ فجائیہ قائم مقام حرفِ فاء کے ہے جوابِ شرط میں۔ اس جگہ ﴿ اِذَاۤ اَنْتُمْ ﴾ فرمایا ہے اور خلقِ انسان میں ﴿ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ ﴾ تو اس کی یہ وجہ ہے کہ وہاں خلق و تقدیر و تدریج ہے، یہاں تک کہ مٹی حیات کے قابل ہو جائے۔ پھر اس میں روح پھونکی جائے۔ پھر ناگاہ وہ بشر ہو جائے۔ رہا دوبارہ زندہ کرنا تو اس میں کچھ تدریج نہیں ہے، بلکہ زندہ ہونا اور نکلنا ایک دم ہوگا، اس لیے یہاں ﴿ ثُمَّ ﴾ نہیں فرمایا۔ (كذا قال الكرخي)۔ اس جگہ قراء نے تائے ﴿ تَخْرُجُوْنَ ﴾ کی فتح پر اتفاق کیا ہے اور جس نے یہ کہا ہے کہ اس جگہ بہ ضمِ تاء بہ صیغۂ مجہول پڑھا گیا ہے تو اس نے غلطی کی ہے۔ بہ ضمِ تاء تو سورت اعراف میں پڑھا گیا ہے۔[3]

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١١٨) [2] تفسير الرازي (٢٥/ ١٠١۔ ١٠٢)

[3] رقم الآية (٢٥) فتح البيان (١٠/ ٢٣٩۔ ٢٤١)

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝٢٦
وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ
الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٢٧

اور آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، اسی کی ملکیت ہیں، سب اسی کے فرماں بردار ہیں (26) اور وہی (اللہ) ہے جو مخلوق پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی اسے لوٹائے گا، اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی صفتِ اعلیٰ ہے، اور وہی نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے (27)

نوری ہوں یا ناری سب ہی اللہ تعالیٰ کے تابع ہیں:

یعنی آسمان کے لوگ نہ کھائیں نہ پئیں، نہ بشری حاجات رکھیں، سوائے بندگی کے اور کچھ کام نہیں کرتے اور زمین کے لوگ سب چیزوں میں آلودہ ہیں۔ اللہ کی صفت نہ ان سے ملی نہ ان سے، اور وہ پاک ذات ہے۔ انتہٰی.

﴿ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں سب اس کی ملک ہیں اور اس کے غلام ہیں۔ ﴿ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴾ یعنی اس کے لیے طوعاً و کرہاً خضوع اور خشوع کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سارے اس کے آگے فروتنی اور عاجزی کرتے ہیں، کوئی خوشی سے کوئی ناخوشی سے۔ سب کے سب اس کی قدرتِ قاہرہ میں دبے ہوئے ہیں۔ دراج عن أبي الهيثم عن أبي سعيد رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث ہے کہ ہر حرف جس میں قرآن میں قنوت کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ طاعت ہے۔[1] غرض یہ ہے کہ قرآن شریف کے عرف میں قنوت بہ معنی طاعت آتی ہے۔

مخلوق کا اعادہ زیادہ آسان ہے:

امام ابن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، یعنی "أَيْسَرُ عَلَيْهِ" امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اعادہ اللہ تعالیٰ کے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہے اور اس کے لیے شروع میں پیدا کرنا بھی آسان ہے۔ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا

---

(1) مسند أحمد (۳/ ۷۵) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤١٠٥)

(2) تفسير الطبري (٢٠/ ٩٢)

ہے: مجھ کو ابن آدم نے جھٹلایا۔ «وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ» اور یہ اس کو لائق نہ تھا اور مجھے گالی دی اور یہ اس کو لائق نہ تھا۔ چنانچہ اس کا مجھ کو جھٹلانا اس طرح ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ مجھے ہرگز دوبارہ زندہ نہ کرے گا جس طرح اس نے مجھے پہلی دفعہ پیدا کیا، حالانکہ میرے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنا دوسری دفعہ کے پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں ہے، اور اس کا مجھے گالی دینا اس کا یہ کہنا ہے کہ اللہ نے بیٹا پکڑا ہے، حالانکہ میں تو احد اور صمد ہوں، جس نے نہ کسی کو جنا نہ اس کو کسی نے جنا اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے۔[1] (انفرد بإخراجه البخاري كما انفرد بروايته أيضا من حديث عبد الرزاق عن معمر عن همام عن أبي هريرة رضي الله عنه به وقد رواه الإمام أحمد منفردا به عن حسن بن موسى عن ابن لهيعة حدثنا أبو يونس سليم بن جبير عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم بنحوه أو مثله)

دوسروں نے کہا ہے کہ قدرت کے لحاظ سے دوبارہ زندہ کرنا اور پہلی دفعہ پیدا کرنا برابر ہیں۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "كُلٌّ عَلَيْهِ هَيِّنٌ" یعنی دوبارہ زندہ کرنا اور پہلی دفعہ پیدا کرنا اس کے لیے آسان ہے۔ اسی طرح ربیع بن خثیم نے کہا ہے اور ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کی طرف میل کیا ہے اور اس پر بہت سے شواہد ذکر کیے ہیں، کہا: اور احتمال ہے کہ ﴿هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ کی ضمیر خلق کی طرف راجع ہو۔ "أَيْ: وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَى الْخَلْقِ"[2] قولہ تعالیٰ: ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ یہ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کے مثل ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ١١] "اس جیسی کوئی چیز نہیں۔" امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کے مثل کہا ہے کہ "أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وَلَا رَبَّ غَيْرُهُ"۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کے مثل کہا۔[3] اس آیت کا ذکر کرتے ہوئے بعض مفسرین نے بعض اہلِ معارف کا یہ قول پڑھا ہے:

إِذَا سَكَنَ الْغَدِيْرُ عَلٰى صَفَاءٍ — وَجُنِّبَ أَنْ يُّحَرِّكَهُ النَّسِيْمُ
يُرَى فِيْهِ السَّمَاءُ بِلَا امْتِرَاءٍ — كَذَاكَ الشَّمْسُ تَبْدُوْ وَالنُّجُوْمُ
كَذَاكَ قُلُوْبُ أَرْبَابِ التَّجَلِّيْ — يُرَى فِيْ صَفْوِهَا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

یعنی جس وقت تالاب صفائی پر ساکن ہوتا ہے اور ہوائے نرم کے حرکت دینے سے بچایا جاتا ہے تو بلاشک اس میں آسمان دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح سورج اور ستارے اس میں ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح تجلی والوں کے دل ہیں کہ ان کی صفائی میں اللہ عظیم دکھائی دیتا ہے۔

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

سُبْحَانَهُ مَا أَعْظَمَ شَأْنَهُ.

قولہ تعالیٰ: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ یعنی اللہ پاک وہ ہے کہ کوئی اس پر غالب نہیں ہوسکتا اور نہ اس کو کسی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٩٠) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٩٢۔ ٩٤) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٩٤)

کام سے روک سکتا ہے، بلکہ وہی ہر شے پر غالب ہے اور اسی نے ہر شے کو اپنی قدرت اور غلبے سے مقہور کیا ہے اور شرع اور تقدیر کی راہ سے اپنے اقوال و افعال میں حکیم ہے۔ وَعَنْ مَالِكٍ فِيْ تَفْسِيْرِهِ الْمَرْوِيِّ عَنْهُ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ فِيْ قَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ.[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ساری مخلوقات جو آسمان و زمین میں ہیں وہ ملک وخلق وتصرف کی راہ سے اللہ ہی کی ہیں، اس میں اس کے غیر کا کچھ بھی نہیں ہے۔ ﴿قٰنِتُوْنَ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ طاعت اور فرماں برداری کر کے سب اس کے مطیع ہیں۔ یہ امام نحاس رحمہ اللہ کا قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عبودیت کا اقرار کرنے والے ہیں یا تو بہ مقال یا بہ دلالت۔ یہ قول امام عکرمہ، ابو مالک اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی "مُصَلُّوْنَ" ہے، یعنی نماز پڑھنے والے۔ کسی نے کہا ہے کہ روزِ قیامت میں کھڑے ہونے والے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [المطففين: ٦] ''جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔'' یعنی حساب کے لیے۔ یہ قول امام ربیع بن انس رحمہ اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا: "بِالشَّهَادَةِ أَنَّهُمْ عِبَادُهُ" (قاله الحسن) یعنی اس پر گواہی قائم کرنے والے ہیں کہ وہ اس کے بندے ہیں۔ کسی نے کہا کہ اس کے افعال کے مطیع ہیں، وہ جو کچھ ان کے ساتھ کرنے کا ارادہ کرتا ہے، حیات، موت، مرض اور صحت کا تو کوئی شے اس کو روکنے والی نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے ارادے کی اطاعت مراد ہے، اطاعتِ عبادت نہیں ہے۔ کسی نے کہا: اخلاص کرنے والے ہیں۔[2] (قاله سعيد بن جبير) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مطیع ہیں حیات، نشور اور موت میں اور اس کے سوا عبادت میں وہ اس کے نافرمان ہیں۔[3]

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ... الآية﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہی ہے جو پہلی بار بناتا ہے۔ پھر موت کے بعد اس کو دہرائے گا۔ پھر اس کو ہمیشہ کے لیے زندہ کرے گا۔ ﴿هُوَ﴾ کی ضمیر بعث کی طرف راجع ہے، یا اعادے کی طرف، معنی کے لحاظ سے نہ کہ الفاظ کے لحاظ سے۔ یعنی "رَجْعَهُ أَوْ رَدَّهُ" یا تذکیر باعتبار خبر کے ہے۔ یعنی خلق کا زندہ کر کے اٹھانا یا اس کا پھیر لانا اس پر آسان ہے، وہ اس کو مشکل نہیں سمجھتا، یا یہ معنی ہیں کہ تمھاری قدرت کی نسبت اس پر بہت زیادہ آسان ہے اور اس شے کی بنا پر جس کو تم میں کوئی کسی کے لیے کہتا ہے، ورنہ اس کی قدرت میں کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ اس میں سے کوئی شے زیادہ آسان ہو۔ بلکہ اس کے لیے ساری اشیاء برابر ہیں۔ وہ قول ﴿كُنْ﴾ سے چیزوں کو ایجاد فرماتا ہے تو وہ ہو جاتی ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کسی نے ﴿اَهْوَنُ﴾

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٦٦۔ ٥٦٧) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٠) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٩٠)

کو تفضیلِ شے علی شے سے عبارت ٹھہرایا ہے تو اس کا قول اس آیت سے رد ہوتا ہے: ﴿ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴾ [النساء: ٣٠] ''اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔'' اور اس آیتِ کریمہ سے: ﴿ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ﴾ [البقرۃ: ٢٥٥] ''اور اسے ان دونوں کی حفاظت تھکاتی نہیں۔'' عرب لوگ صیغۂ افعل کو فاعل پر بہت محمول کیا کرتے ہیں، چنانچہ فرزدق کے اس شعر میں ہے:

إِنَّ الَّذِيْ سَمَكَ السَّمَاءَ بَنَى لَنَا بَيْتًا دَعَائِمُهُ أَعَزُّ وَأَطْوَلُ

[بلاشبہ جس نے آسمان کو بلند کیا اس نے ہمارے لیے ایک گھر بنایا جس کے ستون مضبوط اور لمبے ہیں]

یعنی ''دَعَائِمُهُ: عَزِيْزَةٌ طَوِيْلَةٌ'' [اس کے ستون مضبوط اور لمبے ہیں] احمد بن یحییٰ ثعلب نے اس پر یہ شعر پڑھا:

تَمَنَّى رِجَالٌ أَنْ أَمُوْتَ وَإِنْ أَمُتْ فَتِلْكَ سَبِيْلٌ لَسْتُ فِيْهَا بِأَوْحَدِ

[کچھ لوگ میرے مرنے کی تمنا کرتے ہیں، اور اگر میں ان کی حسبِ خواہش مر ہی جاتا ہوں تو موت کی اس راہ پر چلنے والا میں تنہا نہیں ہوں (سارے ہی، بشمول میری موت کی تمنا کرنے والے، مرنے والے ہیں)]

یعنی ''بِوَاحِدٍ'' ''اکیلا'' اور جس طرح اللہ اکبر بہ معنی اللہ کبیر ہے۔ یہ عوفی کی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''وَهُوَ عَلَيْهِ هَيِّنٌ'' پڑھا ہے۔ یہ قراءت اس پر دال ہے کہ ﴿ اَهْوَنُ ﴾ سے تفضیل مراد نہیں ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے لیے دوبارہ زندہ کرنا پہلی دفعہ پیدا کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہے، اگرچہ اس کے لیے سب ہی آسان ہے۔[2] کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ جو کچھ اس نے پیدا کیا اس کا دوبارہ زندہ کرنا پہلی دفعہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَلَيْهِ ﴾ میں ضمیر ''خلق'' کی طرف راجع ہے، یعنی عود مخلوق پر آسان تر ہے، یعنی جلد تر۔ کم تر و آسان تر و کوتاہ تر ہے۔ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کی رو سے، کیوں کہ قیامت میں تو ان پر ایک دفعہ چیخ ماری جائے گی تو وہ کھڑے ہو جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ ہو جاؤ تو وہ ہو جائیں گے، چنانچہ یہ ان پر زیادہ آسان ہے، اس کی نسبت کہ نطفہ ہوں، پھر علقہ، پھر مضغہ آخر پیدائش تک۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اعادہ مخلوق پر زیادہ آسان ہے، اس لیے کہ قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا: ہو جا تو وہ ہو جائے گی۔ پیدائش کی ابتداء تو نطفے سے ہے، پھر علقہ سے، پھر مضغہ سے۔ اس قول کو ابن انباری نے ان سے روایت کیا ہے۔[3] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ہو سکتا ہے کہ

---

① تفسير الطبري (٢٠/ ٩٢) ② تفسير القرطبي (١٤/ ٢١) ③ الدر المنثور (٦/ ٤٩١)

پہلے قول سے مرتبط ہو، وہ یہ قول ہے: ﴿ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ یعنی اللہ نے تمھارے واسطے اس کی مثال بیان کی ہے، اس شے میں جو آسان ہوتی ہے اور اس شے میں جو مشکل ہوتی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔[1]

یہ بھی جائز ہے کہ مابعد سے مرتبط ہو، یعنی ﴿ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ﴾ خلیل نے کہا: مثل بہ معنی صفت ہے، یعنی اس کے لیے آسمان و زمین میں وصفِ اعلیٰ ہے۔ مثل بہ معنی صفت قرآن شریف میں واقع ہوا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [الرعد: ۳۵] ''جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا، اس کی صفت یہ ہے کہ۔'' یعنی ''صِفَةُ الْجَنَّةِ''۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَلْمَثَلُ الْاَعْلٰى ﴾ قول: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں،[2] یعنی اس کے لیے وحدانیت ہے۔ کسی نے کہا: مثلِ اعلیٰ کے یہ معنی ہیں کہ جس شے کا ارادہ کرتا ہے وہ ''کُنْ'' کہنے سے ہو جاتی ہے۔

﴿ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ جملہ متقدم کے مضمون سے متعلق ہے، یعنی اللہ پاک آسمان و زمین میں مثلِ اعلیٰ کے ساتھ معروف اور موصوف ہے۔ یا اعلیٰ سے متعلق ہے، یعنی وہ اعلیٰ اور برتر ہے ان دو جہتوں میں، یا محذوف سے متعلق ہے کہ وہ حال ہے اعلیٰ سے یا مثل سے یا اس ضمیر سے جو اعلیٰ میں ہے، اس لیے کہ وہ مثل کی طرف پھرتی ہے۔ تفسیر ابو السعود میں یہ ہے: اس کے لیے وصفِ اعلیٰ عجیب الشان قدرتِ عامہ وحکمتِ تامہ اور باقی صفاتِ کمال و جلال اور جمال سے ایسی صفتیں ہیں کہ اس کے غیر کے لیے ان صفتوں کے قریب یا لگ بھگ صفتیں بھی نہیں ہیں، ان کے برابر ہونے کا کیا ذکر![3]

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا
مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ
فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۞ ۲۸ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ
بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ۞ ۲۹

اس نے تمھارے (سمجھانے کے) لیے خود تمھی میں سے ایک مثال بیان کی ہے کہ ہم نے تمھیں جو رزق دیا ہے، کیا اس میں جس کے تمھارے دائیں ہاتھ مالک ہوئے ہیں شریک ہو سکتے ہیں کہ تم اس میں برابر ہو جاؤ۔ تم ان سے ایسے ڈرتے ہو جیسے اپنے (ہمسر) لوگوں

[1] معاني القرآن (٤/ ١٨٤) [2] تفسیر القرطبي (١٤/ ٢٢) [3] تفسیر أبي السعود (٧/ ٥٨) فتح البیان (١٠/ ٢٤١۔ ٢٤٣)

سے۔ اسی طرح ہم (اپنی) آیات ان لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو عقل کرتے ہیں ﴿28﴾ بلکہ جن لوگوں نے ظلم کیا انھوں نے بغیر علم کے اپنی خواہشوں کی پیروی کی، پھر جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ اور ان کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ہیں ﴿29﴾

توحید سمجھانے کے لیے ایک عمدہ مثال کا بیان:

تمھاری مثال بیان کی، یعنی تم جھوٹے مالک ہو لونڈی غلام کے۔ سب اللہ کی روزی کھاتے ہو، پھر بھی برابر ساجھی نہیں ہو سکتے تمھارے جیسے اپنے بھائی بند، اور تم کو کچھ پروا نہیں کہ ان کی مرضی لے کر کام کرو تو وہ سچا مالک اپنے اس غلام کی کیا پروا کرے، جس کو تم اس کا شریک گنتے ہو۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ ایک مثال ہے جس کو اللہ پاک نے ان لوگوں کے لیے بیان کیا ہے جو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجتے ہیں اور اس کے لیے شریک ٹھہراتے ہیں اور اس کے باوجود یہ اقرار کرتے ہیں کہ اس کے شرکاء بت اور ساجھی اس کے غلام اور اس کی ملکیت ہیں۔ چنانچہ وہ یوں کہا کرتے تھے: "لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ" پس اللہ پاک نے بیان فرمایا کہ تمھارے لیے تمھیں میں سے ایک مثال بیان کی، یعنی تم اس کی شہادت دیتے ہو اور اس کو سمجھتے ہو۔ ﴿هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا غلام اس کے مال میں شریک ہو اور اس میں مالک اور غلام برابر ہوں۔

﴿تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ یعنی تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ وہ تم سے تمھارے مال میں مقاسمہ کریں (یعنی شریک ہوں)۔ امام ابو مجلز نے کہا کہ تیرا مملوک جو ہے تو اس بات سے نہیں ڈرتا کہ وہ تجھ سے تیرے مال میں مقاسمہ کرے اور نہ ہی یہ اس کو حق پہنچتا ہے۔ اسی طرح اللہ پاک ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے،[1] معنی یہ ہیں کہ تم میں ہر کوئی اس سے عار کرتا ہے، پھر تم اللہ کے لیے اس کی مخلوق میں سے شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ﴾ [النحل: ٦٢] یعنی اللہ کے لیے وہ شے ٹھہراتے ہیں جو اپنے لیے مکروہ سمجھتے ہیں، یعنی بیٹیاں، اس لیے کہ ﴿وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا﴾ [الزخرف: ١٩] "اور انھوں نے فرشتوں کو، جو رحمان کے بندے ہیں، (رحمان کی) بیٹیاں ٹھہرایا ہے۔"

یعنی ان کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا، حالاں کہ ان میں کوئی جس وقت بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری دیا جاتا تھا

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٩٦)

تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا اور وہ غصہ پی جانے والا ہوتا، اور قوم سے چھپتا پھرتا تھا اس شے کی برائی سے جس کی خوش خبری اس کو دی گئی۔ اس کو ذلیل کر کے رکھتا، یا اس کو مٹی میں دبا دیتا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ بیٹیوں سے عار کرتے ہیں اور حال یہ ہے کہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا، چنانچہ اس کی طرف وہ شے منسوب کی جس کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے، چنانچہ یہ سخت ترین کفر ہے۔

اسی طرح اس مقام میں ہے کہ اس کے لیے اس کے بندوں اور اس کی مخلوق سے شریک ٹھہرائے حالاں کہ ان میں ہر ایک اس بات سے سخت انکار اور عار کرتا ہے کہ اس کا غلام اس کا شریک ہو اس کے مال میں اور مال میں اس کے برابر ہو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے اس کے شریک کیسے بناتے ہو! امام طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اہلِ شرک تلبیہ اس طرح پکارا کرتے تھے: "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ، إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾[1] اور جبکہ اس کی مثال کے ساتھ تنبیہ ہوئی اس بات پر کہ اللہ پاک بطریقِ اولیٰ و احریٰ اس سے مبرا و منزہ ہے تو یہ ارشاد فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان فرمائی کہ مشرکوں نے جو غیر اللہ کو پوجا ہے تو وہ اپنی کم عقلی اور جہالت سے پوجا ہے۔ ﴿ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ یعنی شریکوں کو بے سمجھے پوجنے میں مشرکوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔ ﴿ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ﴾ یعنی جب کہ اللہ ان کی گمراہی لکھ چکا تو پھر کوئی نہیں جو اُن کو ہدایت دے۔ ﴿ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ یعنی پھر کوئی نہیں ہے جو انھیں اللہ کی قدرت سے خلاصی دینے والا ہو، یا کوئی پناہ دینے والا ہو، اور نہ ان کو کوئی اس سے بھاگنے کی جگہ ہے، کیوں کہ جو کچھ اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ وہ خداوند و مالک ہے، اس میں کسی کا کیا زور۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ مثال کی حقیقت پہلے گزر چکی ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنْ اَنْفُسِكُمْ ﴾ میں حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے اور وہ مع اپنے مجرور کے محلِ نصب میں صفت ہے ﴿ مَثَلًا ﴾ کی، یعنی اے مشرکو! تمھارے لیے ایک ایسی مثال بیان کی جو تمھاری ہی جانوں سے لی گئی ہے، کیوں کہ وہ سب چیزوں سے

---

[1] المعجم الكبير (١٢/ ٢٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَفِيْهِ حَمَّادُ بْنُ شُعَيْبٍ وَهُوَ ضَعِيْفٌ" (مجمع الزوائد: ٣/ ٥٠٦)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٦٧)

زیادہ تمھارے قریب ہیں اور دوسروں کی نسبت تمھارے نزدیک ظاہر و واضح ہیں۔ پھر جب شرک کے بطلان میں تمھارے لیے ان کی مثال بیان کی جائے گی تو وہ دلالت میں، وضاحت میں اور ظہور میں زیادہ واضح اور ظاہر ہو گی۔

پھر وہ مثال اس طرح بیان فرمائی: ﴿ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ استفہام انکاری بہ معنی نفی ہے۔ حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے۔ ﴿ مِنْ شُرَكَآءَ ﴾ کا حرف ﴿ مِنْ ﴾ زائدہ ہے جو تاکید کے لیے ہے۔ ﴿ مَا مَلَكَتْ ﴾ سے مراد غلام لونڈی ہیں۔ ﴿ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ سے مراد اموال وغیرہ ہیں۔ ﴿ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾ استفہام انکاری کا جواب ہے، اور مالکوں اور غلام لونڈیوں کے درمیان ان کے مالوں میں شریک نہ ہو سکنے کی حقیقت بیان کرنے والا ہے، معنی یہ ہیں کہ کیوں جی تمھارے غلام اور لونڈیاں تمھارے مال وغیرہ میں شریک ہیں اور وہ اس مال میں برابر کا اختیار رکھتے ہیں، جس طرح کہ تم نے اللہ کے شریکوں کو سمجھ رکھا ہے؟

کلمۂ ﴿ فِيْهِ ﴾، ﴿ سَوَآءٌ ﴾ سے متعلق ہے۔ پھر ﴿ سَوَآءٌ ﴾ متعلق مقدم کے ساتھ "أَنْتُمْ" کی خبرِ اول ہے۔ ﴿ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾ "أَنْتُمْ" کی خبرِ ثانی ہے۔ حرفِ کاف مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی "تَخَافُوْنَهُمْ خِيْفَةً كَخِيْفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ"۔ ﴿ اَنْفُسَكُمْ ﴾ سے مراد آزاد لوگ ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ تم غلام لونڈیوں سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آزاد لوگوں سے ڈرتے ہو، جو آزادی میں اور مالوں کی ملکیت اور ان پر تصرف کے جواز میں تمھاری طرح ہیں۔ مراد تینوں چیزوں کی نفی ہے: ایک تو تصرف میں مالکوں اور مملوکوں کا ایک دوسرے کے برابر ہونا، دوسرے مالکوں اور مملوکوں کے درمیان شرکت ہونا اور تیسرے مالکوں کا مملوکوں سے آزاد لوگوں سے ڈرنے کی طرح ڈرنا۔

شرکت کا ثبوت، برابری کی نفی اور خوف مراد نہیں ہے، جس طرح کہ "مَا تَأْتِيْنَا فَتُحَدِّثُنَا" میں کہا گیا ہے۔ اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ ہیں کہ تو ہمارے پاس اس حال میں نہیں آتا ہے کہ باتیں کرنے والا ہو، بلکہ تو آتا ہے اور ہم سے باتیں نہیں کرتا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ نہ تو آتا ہے نہ باتیں کرتا ہے؛ دونوں امر کی نفی ہے۔ اسی طرح اس جگہ بھی تینوں امر کی نفی مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ تمھارے غلام اور لونڈی ہماری دی ہوئی روزی میں تمھارے شریک ہوں اور اس کے تصرف میں تم اور وہ برابر ہوں اور تم ان سے ڈرو، حالاں کہ تمھارے غلام لونڈی بشریت میں تمھارے برابر ہیں۔ مراد مشرکوں پر حجت قائم کرنا ہے، کیوں کہ وہ ضرور یہ بات کہیں گے کہ ہم اس کو پسند نہیں کرتے تو ان سے کہیں گے: پھر تم اپنے آپ کو غلام لونڈیوں کی شرکت سے پاک کیوں کرتے ہو کہ وہ تمھارے شریک ہو جائیں، حالاں کہ بشر ہونے کے ناطے سے وہ تمھاری طرح ہیں اور اللہ پاک کے غلاموں کو

اس کا شریک ٹھہراتے ہو؟! پھر جب اللہ پاک کے درمیان اور اس کی مخلوق میں سے کسی ایک کے درمیان شرکت باطل ہو چکی اور تمام مخلوق اللہ کی غلام ہے تو اب کچھ باقی نہ رہا، مگر یہی کہ اللہ پاک ہی اکیلا رب ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جمہور نے "أَنفُسَكُمْ" بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مصدر کا معمول ہے، جو اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔ امام ابن ابی عبلہ نے بہ رفع پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔[1]

﴿ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی جیسا ہم نے یہ مفصل بیان کیا، اسی طرح ہم واضح تفصیل اور بیانِ جلی کرتے ہیں، کیوں کہ مثال بیان کرنے سے معنی کی وضاحت ہو جاتی ہے، ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں، اس لیے کہ تنزیلی اور تکوینی آیتوں سے یہی عقل والے فائدہ حاصل کرتے ہیں، اس طرح سے کہ ان کے سوچنے سمجھنے میں اپنی عقلوں سے کام لیتے ہیں۔ پہلے اللہ پاک نے مشرکوں سے خطاب کیا اور ان کے لیے مثال بیان کر کے حق کی طرف ان کو ہدایت کی۔

پھر اس سب سے اضراب فرما کر یہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ اس میں اضراب ہے مع التفات کے۔ یہ جگہ ضمیر کی تھی؛ "بَلِ اتَّبَعُوا" کہنا کافی تھا، مگر ان پر ظلم کے وصف کی تسجیل کرنے کے لیے اسمِ ظاہر کو ضمیر کی جگہ میں رکھا، یعنی جن لوگوں نے شرک کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا، انھوں نے آیتوں کو سمجھا بوجھا نہیں، بلکہ اپنی پراگندہ خواہشات اور فاسد آراء کی پیروی کی۔ ﴿ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ کا محل نصب ہے بنا بر حال، یعنی اپنی باطل خواہشوں کی پیروی کی، اس حال میں کہ وہ اس بات سے جاہل ہیں کہ وہ گمراہی پر سوار ہیں۔

﴿ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ﴾ بھلا پھر کون اس کو ہدایت دینے کی قدرت رکھتا ہے جس کو اللہ نے گمراہ کیا؟! یعنی کسی کو قدرت نہیں، کیونکہ رشاد و ہدایت اللہ پاک کی تقدیر اور ارادے سے ہوتا ہے۔ ﴿ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ جمع کی ضمیر ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی یہ لوگ جن کو اللہ نے گمراہ کیا ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے کہ ان کی مدد کرے اور ان کے اور اللہ کے عذاب کے درمیان حائل ہو۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو اپنی توحید اور عبادت کا حکم دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿30﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿31﴾

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٩٤) [2] فتح البيان (١٠/ ٢٤٣۔ ٢٤٥)

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۳۲

چناں چہ (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (30) اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے (دین پر قائم رہو) اور تم اس سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو اور تم مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ (31) (یعنی) جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور وہ کئی گروہ ہو گئے، ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، وہ اسی پر خوش ہے (32)

عقیدۂ توحید ہی پر قائم رہنے کا حکم:

یعنی اللہ سب کا حاکم مالک سب سے نرالا ہے، کوئی اس کے برابر نہیں اور اس پر کسی کا زور نہیں؛ یہ باتیں سب جانتے ہیں، ان پر چلنا چاہیے۔ ایسے ہی کسی کی جان مال کو ستانا، ناموس میں عیب لگانا؛ ہر کوئی برا جانتا ہے۔ ایسے ہی اللہ کو یاد کرنا، غریب پر ترس کھانا، حق پورا دینا، دھوکا نہ دینا؛ ہر کوئی اچھا سمجھتا ہے۔ اس پر چلنا وہی سچا دین ہے، اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعے ان چیزوں کی تعلیم دی۔ یعنی اصل دین کو پکڑو اس کی طرف رجوع ہو کر۔ اگر یہ کام صرف دنیا کی بہتری کے لیے کیے گئے تو دین درست نہ ہوا۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تو اپنا منہ سیدھا رکھ، یعنی اپنا رخ سیدھا رکھ اور اس دین پر مستمر رہ جس کو اللہ نے تیرے لیے مشروع کیا ہے، یعنی حنیفیہ ملتِ ابراہیم جس کی اللہ نے تجھے راہ بتائی اور اس کو تیرے لیے ہر طرح سے انتہائی درجے کا کامل کیا اور اس کے باوجود تو اپنی فطرتِ سلیم کو لازم پکڑنے والا ہو۔ وہ فطرت جس پر اللہ پاک نے تمام مخلوق کو پیدا کیا اور اس بات پر مستمر رہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، چنانچہ یہ بات اس آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے: ﴿ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ﴾ [الأعراف: ۱۷۲] ''اور انھیں ان کی جانوں پر گواہ بنایا (اور پوچھا:) کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں!'' اور حدیثیں ہم آیندہ ذکر کریں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اسلام پر پیدا کیا، پھر بعض مخلوق پر فاسد دین عارض اور طاری ہو گئے، جیسے: یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ﴾ بعض نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی مخلوق کو مت بدلو کہ لوگوں کو ان کی اس فطرت سے تبدیل کر ڈالو، جس پر اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اس معنی کی بنا پر یہ خبر بہ معنی طلب ہو گی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ [آل عمران: ۹۷] ''اور جو اس میں داخل ہو جائے، وہ

امن والا ہو جاتا ہے۔'' یعنی جو کوئی حرم میں داخل ہو تو تم اس کو امن دو۔ یہ معنی حسن و صحیح ہیں۔ دوسروں نے کہا ہے کہ یہ خبر اپنے باب پر ہے، یعنی خبر ہی ہے، طلب کے معنی میں نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے اپنی ساری مخلوق کے پیدا کرنے میں برابری کی ہے، یعنی سب کو ایک ہی جبلتِ مستقیم پر پیدا کیا ہے، سب کے سب اسی سیدھی اور درست فطرت پر پیدا کیے جاتے ہیں، لوگوں کے درمیان کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، قتادہ، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ نے ﴿ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ﴾ کی تفسیر میں ''لِدِيْنِ اللّٰهِ'' کہا ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ﴾ کے معنی ہیں: ''لِدِيْنِ اللّٰهِ''. اور ''خَلْقُ الْاَوَّلِيْنَ'' کے معنی ہیں: اگلوں کے دین، اور فطرت کے معنی اسلام ہیں۔[2]

پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں ہے کوئی مولود جو پیدا کیا جاتا ہے مگر فطرت پر، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں، جس طرح کہ کوئی جانور مادہ بچہ جنتی ہے پورا۔ ((هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟)) یعنی کیا تم چوپایوں میں کوئی ناک و کان کٹا پاتے ہو؟ غرض یہ ہے کہ جانوروں کا بچہ تمام اعضاء کے ساتھ درست پیدا ہوتا ہے۔ پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ﴾[3] (ورواه مسلم من حديث عبد الله بن وهب عن يونس بن يزيد الأيلي عن الزهري به و أخرجاه أيضا من حديث عبد الرزاق عن معمر عن همام عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم) اس حدیث شریف کے معنی میں اَور حدیثیں صحابہ کی ایک جماعت سے وارد ہوئی ہیں، ان میں سے اسود بن سریع رضی اللہ عنہ ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے، کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوہ کیا، یعنی جنگ کی، چنانچہ میں فتح مندی کو پہنچا۔ پھر لوگوں نے اس دن قتل کیا، یہاں تک کہ بچوں کو قتل کر ڈالا۔ جب یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان سے آج کے دن قتل نے تجاوز کیا، یعنی حد سے بڑھ گیا، یہاں تک کہ انھوں نے ذریت (اولاد، یعنی چھوٹے بچوں کو) مار ڈالا، تو ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ تو مشرکین کے بیٹے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، تم میں سے جو بہترین ہیں وہ مشرکین کے بیٹے ہیں۔

پھر فرمایا: مت قتل کرو ذریت کو، مت قتل کرو ذریت کو اور فرمایا: ((كُلُّ نَسَمَةٍ تُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ حَتّٰى يُعْرِبَ عَنْهَا لِسَانُهَا)) یعنی ہر جان فطرتِ اسلام پر پیدا کی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی زبان ظاہر کرے، یعنی

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩١) تفسير الطبري (٢٠/ ٩٨۔ ٩٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤/ ١٧٩١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٨)

باتیں کرنے لگے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی بنا لیتے ہیں۔① (ورواه النسائي في كتاب السير عن زياد بن أيوب عن هشيم عن يونس وهو ابن عبيد عن الحسن البصري به) اور ان صحابہ میں سے سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر مولود فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ ظاہر کرے اس سے اس کی زبان۔ پھر جس وقت اس سے اس کی زبان تعبیر کرے تو یا وہ شاکر ہوگا یا کفور، یعنی ناشکرا۔②

ان میں سے عبد اللہ بن عباس ہاشمی رضی اللہ عنہما ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے مشرکین کی اولاد کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ، إِذْ خَلَقَهُمْ» یعنی اللہ زیادہ جانتا ہے اس شے کو جو وہ عمل کرنے والے تھے، جبکہ ان کو پیدا کیا۔③ (أخرجاه في الصحيحين من حديث أبي بشر جعفر بن أياس اليشكري عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً كذلك) نیز امام احمد نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھ پر ایک زمانہ آیا، جب میں کہتا تھا کہ مسلمانوں کی اولاد مسلمانوں کے ساتھ ہے اور مشرکوں کی اولاد مشرکوں کے ساتھ، یہاں تک کہ مجھے حدیث بیان کی فلاں عن فلاں نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے ان کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ» کہا: میں ملا اس شخص سے تو اس نے مجھے خبر دی، پھر میں اپنے قول سے رک گیا۔④

من جملہ ان کے عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ ہیں، ان سے امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ پڑھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں یہ فرمایا کہ بے شک میرے رب عزوجل نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو وہ شے بتا دوں جس سے تم ناواقف ہو، جو مجھ کو میرے رب نے اس دن میں سکھائی ہے۔ یعنی اللہ پاک نے فرمایا: ہر وہ شے، یعنی مال جو میں نے اپنے بندوں کو عطا کیا، وہ حلال ہے۔ یہ انکار ہے سائبہ وصیلہ وغیرہ کا جس کو کفارِ مکہ نے اپنی جانوں پر حرام کر لیا تھا اور بے شک میں نے اپنے بندوں کو حنفاء پیدا کیا، یعنی مستعد اور حق کو قبول کرنے کی لیاقت رکھنے والے اور شرک اور معاصی سے بَری، اور بے شک آئے ان کے پاس شیاطین اور ان کو ان کے دین سے بہکا دیا اور حرام کر دی ان پر وہ شے جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھی، اور ان کو اس بات کا حکم دیا کہ میرے ساتھ اس شے کو شریک کریں جس کی میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، یعنی بت۔ پھر اللہ عزوجل نے زمین

---

① مسند أحمد (٣/ ٤٣٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ١٨٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٠٢)

② مسند أحمد (٣/ ٣٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٥٩)

③ مسند أحمد (١/ ٣٢٨) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٠)

④ مسند أحمد (٥/ ٧٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٧/ ٤٤٠۔ ٤٤١)

والوں کی طرف نظر کی تو اُن کے عرب وعجم کو مبغوض رکھا، اس لیے کہ ان کو شرک پر متفق پایا، مگر اہلِ کتاب سے جو باقی تھے، یعنی یہود، یہ لوگ شرک سے بے زار ہوئے تھے۔ اور فرمایا کہ میں نے تو تجھ کو اس لیے بھیجا کہ تجھے آزماؤں، یعنی آیا تو قوم کے ایذا دینے پر صبر کرتا ہے، اور تیرے ساتھ اَور لوگوں کا امتحان کروں کہ وہ تجھے مانتے ہیں یا نہیں اور تجھ پر میں نے ایک ایسی کتاب اتاری، جس کو پانی نہیں دھوسکتا اور تو اس کو سوتے اور جاگتے ہوئے پڑھتا ہے۔

پھر اللہ نے مجھ کو یہ امر کیا کہ میں قریش کو ہلاک کروں تو میں نے کہا: اے میرے رب! ابھی وہ میرا سر توڑ ڈالیں گے۔ پھر اسے روٹی کی طرح کر کے چھوڑ دیں گے۔ فرمایا تو ان سے نکلنے کے لیے کہہ جس طرح کہ انھوں نے تجھ سے کہا ہے اور تو اُن پر چڑھائی کر، چڑھائی کے اسباب ہم تیرے واسطے مہیا کریں گے اور تو خرچ کر، پھر ہم عن قریب تجھ پر خرچ کریں گے اور تو ایک لشکر بھیج، ہم اس جیسے پانچ لشکر بھیج دیں گے، یعنی ان سے پانچ گنے فرشتے، تاکہ وہ ان کی اعانت کریں اور ان کے ساتھ مل کر جنھوں نے تیری اطاعت کی ان لوگوں کے ساتھ لڑ جنھوں نے تیری نافرمانی کی ہے۔

فرمایا: جنت والے تین قسم کے شخص ہیں: عادل بادشاہ، خیرات کرنے والا خیر کی توفیق دیا ہوا اور نہایت مہربانی والا مرد، ہر رشتے دار کے لیے نرم دل اور ہر مسلمان کے لیے نرمی کرنے والا اور پارسا، یعنی سوال سے بچنے والا عیال دار۔

"قَالَ: وَأَهْلُ النَّارِ خَمْسَةٌ: اَلضَّعِيفُ الَّذِي لَا زَبْرَ لَهُ الَّذِيْنَ هُمْ فِيكُمْ تَبَعًا لَا يَبْتَغُوْنَ أَهْلًا وَّلَا مَالًا وَالْخَائِنُ الَّذِي لَا يَخْفىٰ لَهُ طَمَعٌ وَإِنْ دَقَّ إِلَّا خَانَهُ، وَرَجُلٌ لَا يُصْبِحُ وَلَا يُمْسِيْ، إِلَّا وَهُوَ يُخَادِعُكَ عَنْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ، وَذَكَرَ الْبُخْلَ وَالْكَذِبَ وَالشِّنْظِيْرَ الْفَحَّاشَ" [1] (انفرد بإخراجه مسلم فرواه من طرق عن قتادة به) یعنی فرمایا: دوزخ والے پانچ قسم کے آدمی ہیں: ایک تو وہ شخصِ ضعیف ہے جس کو کچھ عقل نہیں ہے، لیکن اس معنی میں یہ بات ہے کہ ایسے شخص پر کسی طرح کی تکلیف نہیں ہے۔ پھر وہ اہلِ نار میں سے کیوں کر ہو گا؟ اس لیے ضعیف کے یہ معنی کہیں گے کہ وہ وہ شخص ہے جو خواہشِ نفس کے وقت رکتا نہیں ہے۔ [2] (کذا قال الطیبی)

صاحبِ مجمع البحار فرماتے ہیں: شاید طیبی اس طرف گئے کہ "اَلَّذِيْنَ فِيْكُمْ تَبَعًا" ایک اور قسم ہے پانچ میں سے، اسی لیے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ وہ شہوات اور محرمات پر اکتفا کرتے ہیں، جیسا کہ قاضی نے کہا ہے کہ وہ خدام ہیں، جن کا مطمحِ نظر سوائے پیٹ بھرنے کے اور کچھ نہیں ہے، کسی وجہ سے بھی ہو، اُن کی ہمتیں اس کے سوا کسی امرِ دینی یا دنیوی کی طرف تجاوز نہیں کرتی ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ کبھی تو ضعیف کی صفت مفرد کے ساتھ کی گئی اس کے لفظ کے اعتبار سے اور کبھی جمع کے ساتھ اس کی جنس کے اعتبار سے۔ یا موصول ثانی بدل ہے ماقبل سے حرفِ عطف کے نہ ہونے کی وجہ سے۔ اس پر کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ (تو ریشتی) اور یا پانچ قسمیں یہ ہیں: ضعیف، خائن، رجل، بخیل، شنظیر۔

[1] مسند أحمد (٤/ ١٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥) [2] شرح المشكاة للطيبي (١٠/ ٣١٨٠)

"تبعٌ" بفتحتین ہے۔ "اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْكُمْ تَبَعٌ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو امراء کے گرد گھومتے ہیں، ان کی خدمت کرتے ہیں، لوگوں کو پکڑتے مارتے ہیں، اس حرام و حلال کے سبب سے جس کو کھاتے اور پہنتے ہیں۔ نہ جورو چاہتے ہیں نہ مال، بلکہ جس شے پر قدرت پاتے ہیں، اس سب کو لیتے اور کھاتے ہیں، اس کے سوا ان کا جورو اور مال کا کچھ اور قصد نہیں، ان لوگوں کو سرہنگ و پردہ دار کہتے ہیں۔ کلمۂ "تبع" بہ رفعِ مبتداء ہے، یا ظرف کا فاعل ہے اور جملہ خبر ہے اور بہ نصب حال ہے۔

"لا یتبعون" بعینِ مہملہ بہ تخفیف و تشدید اور بہ غینِ معجمہ مروی ہے۔ "لَا یَخْفٰی لَهٗ طَمَعٌ" کے یہ معنی ہیں کہ جس شے میں کچھ بھی طمع ممکن ہو گو ذرا ہی سی کیوں نہ ہو، اس کی جستجو میں سعی و کوشش کرتا ہے، اس کے حاصل کرنے میں جان دے دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کو پائے تو اس میں خیانت کرے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ظاہر نہیں ہوتی اس کو کوئی شے جس میں طمع کی جاتی ہے، مگر وہ اس میں خیانت کرتا ہے، اگرچہ ادنیٰ سی شے کیوں نہ ہو۔ یہ معنی اس بنا پر ہیں کہ "خفی" من جملہ اضداد ہے۔ "یُخَادِعُكَ عَنْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ" کے یہ معنی ہیں کہ بسبب تیرے اہل و مال کے تجھ سے فریب کرتا ہے، یعنی ان میں طمع کرتا ہے اور تیرے نزدیک امانت و عفت کا اظہار کرتا ہے۔[1] شنظیر فحاش بکسرِ شین و سکونِ نون وظائے معجمہ بہ معنی بدخلق ہے۔ برفع معطوف ہے "رجل" پر اور فحاش اس کی صفت ہے۔ چاہیے یوں کہ منصوب ہو اور تتمہ "ذَكَرَ الْبُخْلَ وَالْكَذِبَ" سے ٹھہرے بنا بر روایتِ واو، یعنی راوی نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بخیل و کذاب کا ذکر کیا، لیکن اکثر روایتوں میں بہ کلمۂ "أو" ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾ یعنی شریعت اور فطرتِ سلیم کے ساتھ تمسک کرنا اس کو خوب مضبوط پکڑنا۔ سیدھا اور صحیح دین یہی ہے۔ ﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی اسی لیے اکثر لوگ اس کو جانتے پہچانتے نہیں ہیں، اس سے کنارہ کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [یوسف: ١٠٣] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ [الأنعام: ١١٦] ''اور اگر آپ اہلِ زمین کی اکثریت کی اطاعت کریں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے، وہ اپنے گمان کے سوا کسی بات کی پیروی نہیں کرتے، اور وہ اٹکل پچو باتیں ہی کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ﴾ یعنی اس کی طرف رجوع کرنے والے اور ڈرو اس سے اور اس کا مراقبہ کرو، اس کا پاس اور لحاظ رکھو اور نماز قائم کرو، نماز طاعتِ عظیم ہے اور مت ہو جاؤ مشرکوں میں سے، بلکہ ان لوگوں سے ہو جاؤ جو اس کی توحید کرتے ہیں، اس کے لیے عبادت کو خالص کرتے ہیں اور اس عبادت سے وہ اس کے

[1] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٢٥٨۔ ٢٥٩)

سوا کسی کو نہیں چاہتے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یزید بن ابی مریم سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر گزرے تو فرمایا کہ اس آیت کا قوام، یعنی لب لباب کیا ہے؟ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تین خصلتیں اور وہ منجیات، یعنی نجات دلانے والی ہیں: اخلاص اور وہ فطرت ہے: ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ﴾ اور نماز اور وہ ملت و طاعت ہے اور وہ عصمت ہے۔ پس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے سچ کہا۔[1] (حدثني يعقوب أنبانا ابن علية أنبانا أيوب عن أبي قلابة أن عمر رضي الله عنه قال لمعاذ رضي الله عنه: ما قوام هذا الأمر فذكر نحوه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ یعنی تم مشرکوں سے مت ہو جاؤ، جنھوں نے اپنے دین کو تبدیل و تغییر کر ڈالا اور بعض کو مانا اور بعض کا انکار کیا۔ بعض نے "فَارَقُوْا دِيْنَهُمْ" پڑھا ہے، یعنی اس کو اپنے پسِ پشت چھوڑ دیا، یہ لوگ یہود و نصاریٰ کی مثل ہیں اور مجوس اور بت پرست اور باقی ادیانِ باطل والوں کی طرح ہیں جو اہلِ اسلام کے سوا ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٥٩] "بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ بازی کی، اور وہ گروہوں میں بٹ گئے، آپ کا اُن سے کوئی تعلق نہیں، بے شک ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، پھر وہ انھیں ان کاموں سے آگاہ کرے گا جو وہ کرتے رہے تھے۔"

ہم سے پہلے کے دین والوں نے اپنی آراء اور باطل فرقے بنا لینے پر باہم اختلاف کیا۔ ان میں سے ہر فرقہ یہ زعم کرتا ہے کہ وہ کسی شے پر ہے۔ اور اس امت نے بھی جھوٹے مذاہب پر باہم اختلاف کیا جو سب باطل ہیں، مگر ایک اور وہ اہلِ سنت و جماعت ہیں جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمسک کرتے ہیں اور اس شے کو اخذ کرتے ہیں جس پر پہلے زمانے کے صحابہ، تابعین اور ائمۂ مسلمین زمانۂ قدیم اور حدیث میں تھے، جیسا کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے ان میں فرقہ ناجیہ کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ « مَنْ كَانَ عَلٰى مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِيْ »[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ اقامتِ وجہ سے مراد دین پر متوجہ ہونا ہے۔ متوجہ ہونے کی تشبیہ اس بات کے ساتھ دی کہ کوئی شخص کسی شے کی طرف اپنا منہ سیدھا کرے اور اس پر متوجہ ہو، کیوں کہ جو کوئی کسی شے کا اہتمام کرتا ہے تو اپنی آنکھ اس پر باندھتا ہے اور اپنی نظر کو اس کی طرف سیدھا کرتا ہے اور اس پر متوجہ ہو کر اپنا چہرہ اس کے

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٩٧_ ٩٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) مستدرك الحاكم (١/ ٢١٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٤٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٦٨_ ٥٧٠)

لیے سیدھا اور درست کرتا ہے۔ ﴿حَنِيفًا﴾ منصوب ہے بنا بر حال "أَقِمْ" کے فاعل سے، یعنی تو خوب متوجہ ہو دین پر اس حال میں کہ تو اس کی طرف مائل ہو، اس پر جمنے والا ہو اور اس کے سوا اور باطل دینوں کی طرف التفا کرنے والا نہ ہو۔ یا حال ہے "أَقِمْ" کے مفعول سے، یعنی تو سیدھا کر اپنا منہ اس حال میں کہ وہ منہ سب دینوں سے ہٹ کر اسی دین کی طرف مائل ہونے والا ہو، مآل واحد ہے۔

فطرت اصل میں بہ معنی خلقت ہے، اس جگہ اس سے مراد ملت ہے، یعنی اسلام اور توحید۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ فطرت کے بارے میں مفسرین کا قول ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد دین کی قابلیت ہے اور اس کے لیے متہیٰ و مستعد ہونا ہے۔ ﴿فِطْرَتَ﴾ کا رسم خط بہ تائے مجرورہ ہے، اس کے سوا قرآنِ مجید میں اور نہیں ہے۔ ﴿اَلنَّاسَ﴾ سے اس جگہ وہ لوگ مراد ہیں جن کو اللہ پاک نے اسلام پر پیدا کیا ہے، کیوں کہ مشرک اسلام پر پیدا نہیں ہوا۔ "أَقِمْ" کا خطاب گو رسول اللہ ﷺ کو خاص ہے، لیکن آپ کی امت آپ کے ساتھ اس خطاب میں شامل ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر اہلِ تاویل کا اتفاق ہے۔[2]

زیادہ صحیح ناس کو عموم پر محمول کرنا ہے، مسلمان اور کافر کے درمیان فرق کیے بغیر، اور وہ سب فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں اگر وہ عوارض نہ ہوں جو ان کو عارض ہوتے ہیں، جن کے سبب سے وہ کفر پر باقی رہتے ہیں، جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مذکور میں وارد ہوا ہے اور سیدنا اسود بن سریع اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے مروی حدیثوں میں وارد ہوا ہے۔ اور عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نے اس حدیث کی تایید کی ہے جو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[3] احادیثِ مذکورہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان ملتِ اسلام پر پیدا ہوا ہے، لیکن فطری ایمان و اسلام کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ اعتبار تو شرعی ایمان اور اسلام کا ہے وگرنہ ہیچ ہے۔

یہ قول صحابہ اور ان کے بعد کی ایک جماعت کا ہے اور مفسرین کے ایک گروہ کا قول ہے اور حق بات یہی ہے۔ اور یہ قول کہ اس جگہ فطرت سے مراد اسلام ہے، جمہور سلف کا مذہب ہے۔ دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ فطرت وہ پیدایش ہے جس پر ان کی ابتداء کی، اس لیے کہ ان کی ابتداء حیات، موت، سعادت، شقاوت کے لیے کی ہے۔ کلامِ عرب میں "فاطر" کا مطلب ابتداء کرنے والا ہے، جو لوگ اس قول کے قائل ہیں، وہ فطرت کے لغوی معنی کی طرف گئے ہیں اور اس کے شرعی معنی کو ترک کیا ہے، حالاں کہ اس بات پر اہلِ شرع کا اتفاق ہے کہ شرعی معنی لغوی معنی پر مقدم ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ کتاب و سنت میں بعض جگہ لفظ "فطرة" واقع ہوا ہے اور اس سے مراد لغوی معنی ہیں تو یہ کچھ اس کے منافی نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [الفاطر: ۱] "تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔" نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٩٤) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٤) [3] ان تمام احادیث کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

﴿ وَمَا لِیَ لَآ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ ﴾ [یٰسٓ: ۲۲] ''اور مجھے کیا ہے کہ میں اس ذات کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا؟'' کیوں کہ اس میں کسی طرح کا نزاع نہیں ہے کہ معنی لغوی یہی ہیں، لیکن نزاع فطرت کے شرعی معنی میں ہے اور شرعی معنی اس کے وہی ہیں جو پہلے لوگوں نے ذکر کیے ہیں۔ چنانچہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ﴿ فِطۡرَتَ ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ اگلے جملے کا مصدر موکد ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اِتَّبِعْ فِطْرَةَ اللّٰهِ'' کے معنی میں منصوب ہے،[1] یعنی پیروی کر اللہ کی فطرت کی۔

غرضیکہ فطرت فعل محذوف کا مفعول ہے، اس لیے کہ ﴿ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اتباع کر دین کی اور اتباع کر اللہ کی فطرت کی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ ﴾ کے معنی سے فطرة مصدر ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں: ''فِطْرَةُ اللّٰهِ النَّاسَ عَلَى الدِّيْنِ''۔[2] کسی نے کہا کہ اغراء کی بنا پر (ابھارنے کی بنا پر) منصوب ہے: ''أَيْ: اِلْزَمُوْا فِطْرَةَ اللّٰهِ'' یا ''عَلَيْكُمْ فِطْرَةَ اللّٰهِ''۔ یعنی اللہ کی فطرت کو لازم پکڑو۔ اس وجہ کو امام ابو حیان رحمہ اللہ نے رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اغراء کا کلمہ چھپایا نہیں جاتا، کیوں کہ وہ فعل کا عوض ہوتا ہے، چنانچہ اگر اس کو حذف کر دیا تو عوض اور معوض عنہ دونوں کو حذف کرنا لازمی ہوگا اور یہ امر اجحاف ہے، یعنی ستم ہے۔[3] اس کا جواب یوں دیا ہے کہ یہ بصریوں کی رائے ہے۔ رہے کسائی رحمہ اللہ اور اس کے اتباع تو وہ اس کو جائز سمجھتے ہیں۔[4]

غرضیکہ اللہ پاک نے فطرت کو لازم پکڑنے کا حکم دیا، پھر اس کی تعلیل یہ بیان کی کہ ﴿ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ﴾ یعنی یہ فطرت جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور وہ حق کی قبولیت جس پر ان کو پیدا کیا گیا اور ان کی طبیعتیں بنائی گئیں، اس کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہے۔ یا یہ تعلیل ہے اس حکم کے واجب ہونے کی جو فطرت کو لازم پکڑنے کے لیے ہے، یعنی تم پر واجب ہے کہ تم فطرت کو لازم پکڑنے کے بارے میں حکم کو مانو، اس لیے کہ اللہ کی پیدایش کو تبدیل کرنے یا تبدیل ہونے کا عقیدہ رکھنا کسی طرح سے صحیح اور درست نہیں ہے۔ اس طرح سے کہ خواہشات کا اتباع کر کے اور شیطانی وسوسوں کے پیچھے لگ کے اس فطرت میں خلل ڈالو اور اس کے مقتضا کو اس پر مترتب نہ کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ کوئی اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اللہ کی پیدایش کو متغیر کر ڈالے۔

اس معنی کی بنا پر کہ تبدیلی کا یہ مطلب کیا جائے کہ اس سے مراد نفسِ فطرت کا بدلنا ہے اس طریقے سے کہ اس کو بالکل بدل دے اور اس کی جگہ میں ایسی فطرت رکھے جو حق کے قبول کرنے کے لیے صحیح نہیں ہے اور اس کے سمجھنے کا موقع پانے کے لیے، کیوں کہ یہ بات ضروری ہے کہ تبدیلی پہلے معنی پر مقدور ہے، بلکہ قطعی طور پر واقع ہے۔ چنانچہ اس وقت تعلیل اس لحاظ سے ہوگی کہ ہر ایک کی فطرت کی سلامتی حقیقی ہے تو اس کو لازم پکڑنا ضروری ہے، اس طریقے

[1] معاني القرآن (٤/ ١٨٤) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٩٧) [3] البحر المحيط (٧/ ١٦٧) [4] فتح القدير (٤/ ٢٩٥)

سے کہ اس کے مقتضا کو اس پر مرتب کریں اور اتباع ہو۔ شیطانی وساوس جن کا ذکر ہوا ہے اس سے اس میں خلل نہ ڈالیں۔[1] (ذکرہ أبو السعود) کسی نے کہا: نفی بہ معنی نہی ہے، یعنی مت بدلو اللہ کی خلق کو۔ امام مجاہد اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں: "لَا تَبْدِيلَ لِدِيْنِ اللّٰهِ"۔ امام قتادہ، ابن جبیر، ضحاک اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معتقدات میں ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جانوروں میں اللہ کی پیدائش میں تبدیلی نہ کی جائے، اس طرح سے کہ ان کے زخصی کیے جائیں۔[2] کسی نے کہا: مت بدلو توحید کو شرک کے ساتھ اور سنت کو بدعت کے ساتھ۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ جس سعادت اور شقاوت پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے، اس کے لیے کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہے، چنانچہ نہ بدبخت نیک بخت ہوتا ہے اور نہ نیک بخت بدبخت ہوتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾ یعنی وہ دین جس کی طرف منہ سیدھا کرنے کا حکم دیا گیا ہے دینِ قیم ہے۔ یا فطرت کو لازم پکڑنا دینِ مستقیم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: دین قضا ہے۔[3] ﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ اکثر لوگوں سے مراد اہلِ مکہ ہیں۔ یعنی اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔ یہاں تک کہ اس کو کریں اور اس پر عامل ہوں۔

﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ﴾ یعنی توبہ اور اخلاص کے ساتھ اللہ پاک کی طرف رجوع ہونے والے اور اس کے اوامر ونواہی میں اس کے مطیع۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "أَنَابَ إِلَى اللّٰهِ" کے یہ معنی ہیں: "أَقْبَلَ وَتَابَ" یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اور توبہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا نصب "أَقِمْ" کے فاعل سے بنا بر حال ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ سیدھا کر تو اپنا منہ اور وہ لوگ بھی جو تیرے ساتھ ہیں اس حال میں کہ اس کی طرف رجوع ہونے والے ہوں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "فَأَقِمْ وَجْهَكَ وَأُمَّتَكَ"[4] چنانچہ سب سے حال ہے۔ معطوف کا حذف کرنا جائز ہے، اس لیے کہ ﴿مُنِيْبِيْنَ﴾ جمع کے صیغے کے ساتھ اس پر دال ہے۔ کسی نے کہا: قطع کی بنا پر منصوب ہے۔ کسی نے کہا: اس بنیاد پر منصوب ہے کہ ﴿كَانَ﴾ محذوف کی خبر ہے، یعنی "كُوْنُوْا مُنِيْبِيْنَ إِلَيْهِ" اس لیے کہ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اس پر دلالت کرتا ہے۔

غرضیکہ اللہ پاک نے پہلے ان کو انابت کا حکم دیا، اس کے بعد تقویٰ کا امر فرمایا۔ ﴿وَاتَّقُوْهُ﴾ فعل مقدر پر معطوف ہے، جو ﴿مُنِيْبِيْنَ﴾ کا ناصب ہے۔ یعنی "أَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ مُنِيْبِيْنَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ"، معنی یہ ہیں کہ اس کی طرف رجوع ہو کر اپنے منہ سیدھے کرو اور اس سے اس طرح سے ڈرو کہ اپنے معاصی سے بچو اور نماز قائم کرو جس کا تمھیں حکم ہوا ہے۔ اور مت ہو جاؤ ان لوگوں میں سے جو غیر کو اس کے ساتھ عبادت میں شریک کرتے ہیں۔

---

[1] تفسير أبي السعود (٧/ ٦٠)
[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٩٨۔ ٩٩)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩١)
[4] فتح القدير (٤/ ٢٩٦)

﴿ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ﴾ باعادہ جار ماقبل سے بدل ہے۔ اور ''شیع'' فرقوں کے معنی میں ہے، یعنی ان لوگوں میں سے مت ہو جاؤ جو دین میں فرقے فرقے ہو گئے کہ بعض بعض کا ساتھ دیتا ہے اور پیروی کرتا ہے، یعنی اہل بدعت اور خواہشات کی پیروی کرنے والے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ امام حمزہ اور کسائی نے ''فَارَقُوْا دِيْنَهُمْ'' پڑھا ہے۔ یہ قراءت سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور سبعیہ ہے، یعنی اس دین سے مفارقت کی جس کی پیروی واجب ہے، یعنی توحید۔ اس آیت کی تفسیر سورۃ الانعام کے آخر میں گزر چکی ہے۔[1]

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جائز ہے کہ ﴿ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ﴾ کلامِ مستانف ہو، جس طرح یہ جائز ہے کہ اپنے سے پہلے کلام کے ساتھ متصل ہو۔[2] ﴿ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ پہلی آیت میں جو دین کی تفریق کا اور فرقے فرقے بن جانے کا ذکر تھا تو یہ جملہ اس کے لیے اعتراض مقرر ہے، یعنی اس کی تاکید وتقریر کرتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان میں سے ہر فرقہ اس دین پر جو غیر صواب پر مبنی ہے، یعنی صحیح دین نہیں ہے، اس پر خوش اور مسرور ہے، خیال کرتا ہے کہ وہ حق پر ہے، حالاں کہ اصل دین میں سے اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسی کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ اپنی طرف سے انھیں رحمت (کا مزہ) چکھاتا ہے تو ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں (33) تاکہ وہ اس چیز (نعمت) کی ناشکری کریں، جو ہم نے انھیں دی تو تم فائدہ اٹھا لو، پھر جلد تم جان لو گے (34) کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل نازل کی ہے کہ وہ ان کے شرک کرنے کو (صحیح) بتاتی ہو (35) اور جب ہم لوگوں کو (اپنی) رحمت (کا مزہ)

[1] رقم الآیة (۱۵۹) [2] فتح القدیر (۴/ ۲۹۶)

چکھاتے ہیں تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں، اور اگر ان کے ہاتھوں کی آگے بھیجی ہوئی کمائی کی وجہ سے کوئی مصیبت انھیں آلے تو وہ فوراً نا امید ہو جاتے ہیں ﴿36﴾ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔ بلاشبہ اس (فراخی و تنگی) میں ان لوگوں کے لیے عظیم نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿37﴾

انسانوں کے توحید سے شرک اور خوشی سے نا امیدی کی طرف پلٹنے کا بیان:

جیسے بھلے کام ہر انسان کی جبلت پہچانتی ہے؛ اللہ کی طرف رجوع ہونا بھی ہر ایک کی جبلت جانتی ہے، ڈر کے وقت کھل جاتا ہے، یعنی جس کو چاہے روزی ناپ تول کر دے، جس کو چاہے روزی پھیلا دے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ لوگ حالتِ اضطرار، یعنی مجبوری کی حالت میں اسی وحدہ لاشریک لہ کو پکارتے ہیں اور جس وقت وہ ان پر نعمتوں کو کامل کرتا ہے، تبھی ان میں سے ایک گروہ حالتِ اختیار میں اللہ پاک کے ساتھ شریک کرتا ہے اور اس کے ساتھ غیر کو پوجتا ہے۔ ﴿ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ﴾ میں حرفِ لام لامِ عاقبت ہے، بعض کے نزدیک اور دوسروں کے نزدیک یہ لام تعلیل کا ہے، لیکن یہ تعلیل اس کی ہے کہ اللہ پاک نے ان کے لیے اس کفر کی تقییض و تعیین فرمائی ہے۔ پھر اللہ پاک نے ﴿ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾ سے ان کو وعید سنائی۔ بعض نے کہا: واللہ! اگر کوچے کا کوئی چوکیدار مجھ کو وعید سناتا تو البتہ میں اس سے ڈر جاتا، پھر میں کیوں کر نہ ڈروں، حالاں کہ اس جگہ وعید سنانے والا وہ ذات پاک ہے جو کسی شے سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ اسی دم ہو جاتی ہے۔

پھر غیر اللہ کے پوجنے کا جو مشرکوں نے بغیر کسی دلیل اور حجت و برہان کے اختلاق اور افترا کر لیا ہے، اس میں اللہ پاک ان پر انکار کر کے یوں فرماتا ہے: ﴿ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴾ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی کیا ہم نے ان پر کوئی حجت اتاری ہے جو بولتی ہے تو یہ شریک بتاتے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں ہوا، اس کی کوئی سند نہیں اتاری، یہ صرف ان کی افترا پردازی ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَاِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ... الآية ﴾ یہ انکار ہے انسان پر، وہ جہاں کہیں ہو، مگر جس کو اللہ بچائے اور توفیق دے، کیوں کہ انسان کو جب کچھ نعمت ملتی ہے تو اترانے لگتا ہے اور کہتا ہے: ﴿ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴾ [ھود: ۱۰] ''مجھ سے سختیاں دور ہوگئیں، بے شک وہ (اس وقت) اترانے والا اور فخر جتانے والا ہو جاتا ہے۔'' یعنی برائیاں مجھ سے دور ہوگئیں۔ بے شک وہ البتہ بڑا خوش ہونے والا، بڑا بڑائی مارنے والا ہے، اپنے جی میں خوش ہوتا ہے اور دوسروں پر فخر کرتا ہے اور جس وقت اس کو کوئی سختی پہنچتی ہے تو بالکل نا امید ہو جاتا ہے۔ آس توڑ دیتا ہے، اس سے کہ اس کے بعد اسے کوئی خیر اور بھلائی حاصل ہو۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ

صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [ھود: ۱۱] یعنی مگر وہ لوگ جنھوں نے تکلیف میں صبر کیا اور راحت و آرام میں نیکیاں کیں۔ جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ مومن کے لیے تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں جاری کرتا اس کے لیے کوئی حکم، مگر وہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے، اگر اس کو خوشی پہنچے تو شکر کرے، چنانچہ یہ اس کے لیے بہتر ہو اور جو اسے تکلیف پہنچے تو صبر کرے، چنانچہ یہ اس کے لیے بہتر ہو۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی فراخی اور تنگی کرنے والا روزی میں اور متصرف اور فاعل اپنی حکمت اور عدل سے اللہ پاک ہی ہے۔ چنانچہ وہی کسی قوم پر فراخی کرتا ہے اور کسی پر تنگی، بے شک اس میں البتہ بڑی نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لیے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جس وقت کفارِ مکہ وغیرہم کو خشک سالی لگے یا شدت یا لاغری یا بیماری پہنچے تو وہ اپنے رب کو پکاریں کہ وہ تکلیف ان سے دور کر دے اور اس سے مدد چاہیں، اسی کی طرف رجوع ہو کر اور ملتجی ہو کر دعا کریں اور اس کے غیر پر بھروسا نہ کریں، یا اپنے پورے دلوں سے اس پر متوجہ ہو کر دعا کریں۔ پھر جہاں ان کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کچھ مہربانی چکھائے، اس طرح سے کہ ان کی دعا قبول کر لے اور ان شدتوں اور تکالیف کو ان سے دور کر دے، تبھی ان میں کوئی اپنے رب کا شریک بتانے لگے۔

کلمہ ﴿ اِذَا ﴾ فجائیہ ہے شرط کا جواب واقع ہوا ہے، اس لیے کہ افادۂ تعقیب میں حرفِ فاء کی طرح ہے، یعنی ناگاہ ان میں سے ایک گروہ پر شرک آ جاتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کو پکارا تھا اور جس سختی میں وہ مبتلا تھے، اللہ نے اس سے ان کو نجات دی تھی۔ یہ کلام اس لیے لایا گیا ہے کہ ان کے احوال پر تعجب دلانا منظور ہے کہ دیکھو بڑا تعجب ہے کہ سختیاں نازل ہونے کے وقت ان کا کیا حال ہو گیا کہ اللہ پاک کی وحدانیت کا اقرار کیا اور جب اس نے وہ سختیاں دور کر دیں تو اسی دم شرک کی طرف لوٹ آئے۔ ﴿ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ میں اور اسی طرح ﴿ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ﴾ میں لفظِ فریق کے معنی کی رعایت ہے اور حرفِ لام بہ معنی ''كَيْ'' ہے۔ کسی نے کہا: لامِ امر ہے قصدِ وعید و تہدید کے لیے۔ کسی نے کہا: لامِ عاقبت ہے، اس میں نظر ہے، اس لیے کہ عاقبت کا لام مہلت کا مقتضی ہوتا ہے، اس لیے اس کو لامِ مآل کہتے ہیں اور شرک اور کفران ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، ان کے درمیان کسی طرح کی مہلت نہیں ہے، معنی یہ ہیں: تاکہ ناشکری کریں اس نعمت کی جو ہم نے ان کو عطا کی۔

پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کو مخاطب کیا، جن سے شکر کے بجائے کفر واقع ہوا اور ارشاد فرمایا: ﴿ فَتَمَتَّعُوْا ﴾۔

---

(1) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۹۹) (2) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۷۰)

جمہور نے بتائے خطاب پڑھا ہے، اس میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات ہے، ان کی ڈانٹ ڈپٹ میں مبالغے کے لیے۔ مراد تہدید و وعید ہے، یعنی پس تم کام چلاؤ نفع اٹھاؤ اب آگے تم اس عذاب کو جان لو گے، جو اس عارضی فائدے کے بعد آئے گا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے ''فَيُمَتَّعُوْا'' بیائے تحتیہ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ''فَلْيَتَمَتَّعُوْا'' ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ ﴾ کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ ہے اور کوفیوں کے مذہب کی بنا پر استفہام انکار کے لیے ہے۔ بصریوں کا یہ مذہب ہے کہ ﴿ اَمْ ﴾ بہ معنی ''بَلْ'' وہمزہ ہے، اس میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے۔ اس سے غرض یہ بات بتانا ہے کہ وہ لوگ بارگاہِ خطاب سے دور پڑے ہوئے ہیں، وہ اس قابل ہیں کہ ان سے اعراض کیا جائے، یعنی منہ موڑ لیا جائے۔ ﴿ فَهُوَ يَتَكَلَّمُ ﴾ نفی کی جگہ میں ہے، جو ﴿ اَمْ ﴾ سے نکلتی ہے، ﴿ يَتَكَلَّمُ ﴾ کے معنی ''يَدُلُّ'' ہیں، جس طرح کہ اس آیت میں ہیں: ﴿ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ﴾ [الجاثیة: ٢٩] ''(کہا جائے گا:) یہ ہماری کتاب ہے، یہ تمھارے متعلق سچ سچ بولتی ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی ''يَنْطِقُ بِإِشْرَاكِهِمْ بِاللّٰهِ سُبْحَانَهُ'' یا حرفِ باء سببیہ ہے، یعنی ''بِالْأَمْرِ الَّذِيْ كَانُوْا بِسَبَبِهٖ يُشْرِكُوْنَ''. ﴿ سُلْطٰنًا ﴾ بہ معنی حجتِ ظاہرہ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ سلطان کو مونث استعمال کرتے ہیں۔ ''قَضَتْ بِهٖ عَلَيْكَ السُّلْطَانُ'' بولتے ہیں۔ بصری لوگوں کے نزدیک اس کا مذکر ہونا زیادہ فصیح ہے اور اسی پر قرآن آیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کی تانیث بھی جائز ہے، اس لیے کہ بہ معنی حجت ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ ''سُلْطَانٌ'' بہ معنی ملک ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت کفارِ مکہ کو اور دوسروں کو ہم اپنی رحمت چکھاتے ہیں، یعنی ارزانی، بارش، نعمت، فراخی، صحت اور عافیت تو خوش ہوتے ہیں اِترانے اور فخر کرنے کے طور پر، نہ کہ اس طرح سے کہ اس کا شکر ادا کریں اور اس کی رحمت کے پہنچنے پر مسرور ہوں، جس طرح کہ یہ آیت اس پر دال ہے: ﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ﴾ [یونس: ٥٨] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے، لہٰذا (لوگوں کو) چاہیے کہ وہ اسی کے ساتھ خوش ہوں۔''

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴾ یعنی اور اگر پہنچے ان کو کوئی مصیبت خشک سالی سے، یا کوئی تنگی یا کچھ بیماری یا کسی طرح کی شدت اور سختی وہ کسی صفت کی ہو، ان کے گناہوں اور بدبختی اور نحوست کی وجہ سے جن کو ان کے ہاتھ اعمال کی صورت میں آگے بھیج چکے ہیں، تبھی وہ آس

[1] فتح القدیر (٤/ ٢٢٥) [2] تفسیر القرطبي (١٤/ ٣٣)

توڑنے لگیں۔ "قُنُوطٌ" رحمت سے نا امید ہونے کو کہتے ہیں۔ جمہور نے اسی طرح کہا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "قُنُوطٌ" اللہ پاک کے فرائض کو چھوڑ دینا ہے۔ جمہور نے ﴿ يَقْنَطُوْنَ ﴾ بہ ضم نون اور ابو عمرو، کسائی اور یعقوب رحمہ اللہ نے بہ کسرِ نون پڑھا ہے۔[1] دونوں سبعیہ ہیں اور باب "ضَرَبَ" اور "تَعِبَ" ہے۔ غرضیکہ شدت کے وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت سے نا امید ہونا، مومنین کی صفت کے خلاف ہے، کیوں کہ ان کی شان تو یہ ہے کہ نعمت کے وقت شکر کرتے ہیں اور شدت کے وقت اپنے رب سے اُمید رکھتے ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ زبان سے دعا کرنا ایک عادت کے طور پر دل کی نا امیدی کی نفی نہیں کرتا۔ ایسی بات بہت سے لوگوں میں مشاہدہ کی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ قول اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مخالف نہ ہو گا: ﴿ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ ﴾۔ یا یہ مراد ہے کہ قانطین کا سا فعل کرتے ہیں، مثلاً: گرانی کے دنوں میں ذخیرہ جمع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ (كذا قال الكرخي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے: کیا حال ہے ان کا کہ خوشی اور ناخوشی میں مومنین کی طرح شکر اور صبر نہیں کرتے اور اس بات کو نہیں جانتے کہ اللہ پاک اپنے بندوں میں سے جس کی روزی فراخ کرتا ہے تو وہ اس امتحان کرنے کے لیے کرتا ہے کہ آیا وہ شخص شکر کرتا ہے یا سرکشی، یعنی ناشکری کرتا ہے۔ اور جس پر چاہتا ہے تنگی کرتا ہے، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا وہ صبر کرتا ہے یا تنگ دل ہوتا ہے کہ کفر کرے۔ بے شک اس فراخی اور تنگی میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں، پھر ان سے حق پر استدلال کرتے ہیں، کیوں کہ وہ نشانیاں اللہ پاک کی کمال قدرت اور عجیب و غریب حکمت اور کاری گری پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر جب اللہ پاک نے امرِ الٰہی کی تعظیم بیان کی تو قرابت داروں اور حاجت مندوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی خبر گیری کی طرف اشارہ کیا۔ جو اُن لوگوں کا فرض ہے جن کی روزی میں اللہ پاک نے فراخی دی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۳۸ وَمَآ اٰتَيْتُمْ
مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۠ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ
اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝۳۹ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ

---

[1] فتح القدير (٤/ ٢٩٧)
[2] فتح البيان (١٠/ ٢٤٩-٢٥١)

يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ
ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۴۰

لہٰذا آپ قرابت دار کو اس کا حق دیں اور مسکین اور مسافر کو بھی، یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کا چہرہ چاہتے ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿38﴾ اور تم سود پر جو (قرض) دیتے ہو، تا کہ وہ لوگوں کے مالوں میں (شامل ہوکر) بڑھے، تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا، اور تم اللہ کا چہرہ چاہتے ہوئے جو کچھ بطور زکات دیتے ہو، تو ایسے لوگ ہی (اپنا مال) کئی گنا بڑھانے والے ہیں ﴿39﴾ اور وہ ذات ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر اس نے تمھیں رزق دیا، پھر وہ تمھیں مارے گا، کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو ان (کاموں) میں سے کچھ کر سکے؟ اللہ ان کے شریک ٹھہرانے سے پاک اور اعلیٰ ہے ﴿40﴾

صلہ رحمی کا حکم اور سود کی ممانعت کا بیان:

اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ قرابت دار کا حق نیکی اور صلہ رحمی سے ادا کرو اور مسکین کو دو۔ مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس اپنے خرچ کے لیے کوئی شے نہیں ہے، یا اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے کفایت نہیں کرتا، یعنی اس کے اخراجات کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اور ﴿ اِبْنَ السَّبِيْلِ ﴾ کو دینے کا بھی حکم دیا۔ یہ وہ مسافر ہے جو خرچ کے لیے محتاج ہے اور جس شے کی اس کو سفر میں ضرورت ہے، اس کی طرف حاجت مند ہے۔ ان لوگوں کو دینا بہتر ہے ان کے لیے جو قیامت کے دن اللہ پاک کی طرف نظر کرنے کی خواہش اور ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ دیدار فائض الانوار مومنوں کو بہت ہی مطلوب ہے اور یہی لوگ دنیا اور آخرت میں فلاح پانے والے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ ... الآية ﴾ یعنی جو شخص کوئی عطیہ دے اور وہ چاہے کہ لوگ اس کی طرف اس سے زیادہ لوٹائیں جو اس نے دیا تو اس شخص کے لیے اللہ کے نزدیک کوئی ثواب نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک، قتادہ، عکرمہ، محمد بن کعب اور شعبی رحمہم اللہ نے اس کی یہی تفسیر کی ہے، یہ کام مباح ہے، گو اس میں کسی طرح کا ثواب نہیں ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کو خاص طور پر اس فعل سے منع کیا گیا ہے۔ یہ قول ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔ اس پر اس آیت سے استدلال کیا ہے: ﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴾[1] [المدثر: ٦] ''اور حصولِ کثرت کے لیے احسان نہ کیجیے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ رِبًا ﴾ دو طرح کے ہیں: ایک ﴿ رِبًا ﴾ تو صحیح نہیں ہے، یعنی بیع کا ﴿ رِبًا ﴾ اور ایک ﴿ رِبًا ﴾ ایسا ہے جس میں حرج نہیں ہے۔ یہ

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٠٤ـ ١٠٥) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩١ـ ٣٠٩٢)

﴿ رِبًا ﴾ کسی کا ہدیہ کرنا ہے اور وہ اس کے زیادہ ملنے کی خواہش کرتا ہے۔

پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴾ [1] یعنی جو تم پاک مال میں سے صرف اللہ کی رضا کی خاطر دیتے ہو سو وہی لوگ ہیں جن کے لیے اللہ ثواب اور جزا کئی گنا کر دے گا۔ جیسا کہ صحیح میں مروی ہے کہ نہیں صدقہ کیا کسی نے ایک کھجور کے برابر پاک کمائی سے، مگر اس کو رحمان اپنے دائیں ہاتھ مین لے لیتا ہے۔ پھر اسے اس شخص کے لیے پرورش کرتا ہے، جس طرح تم میں سے کوئی اپنے فلو (گھوڑے کا بچھیرا جس کا دودھ چھڑا دیا گیا ہو) یا اپنے فصیل (گائے کا بچھیرا جس کا دودھ چھڑا دیا گیا ہو) کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھجور اُحد پہاڑ سے بھی بڑی ہو جاتی ہے۔ [2] (اصل روایت کے الفاظ: «مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ» ہیں، یعنی "مَا یُعَادُ لَهَا فِي الْقِیمَةِ" یعنی اتنی خیرات کرے جو قیمت میں ایک کھجور کے برابر ہو۔)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ﴾ یعنی اللہ پاک ہی خالق و رازق ہے۔ انسان کو اس کی ماں کے شکم سے برہنہ نکالتا ہے، نہ اس کو کچھ علم ہوتا ہے نہ سمع و بصر نہ قویٰ، پھر اس کے بعد یہ سب چیزیں اور لباس و مال، جائیداد اور کمائی کے ذرائع اس کو عطا کرتا ہے، جیسا کہ امام احمد نے حبہ وسواء پسران خالد سے روایت کیا ہے، کہا: ہم نبی اکرم ﷺ پر داخل ہوئے اور آپ ﷺ کوئی شے درست فرما رہے تھے جس نے آپ ﷺ کو مشقت میں ڈالا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: تم رزق سے اس وقت تک ناامید نہ ہو، جب تک تمھارے سر حرکت کرتے ہیں، کیوں کہ انسان کو اس کی ماں جنتی ہے سرخ، (یعنی وہ لال لال ایک گوشت کا لوتھڑا سا ہوتا ہے۔) اس پر کوئی قشر نہیں ہوتا، پھر اللہ عز وجل اس کو رزق دیتا ہے۔ [3]

قولہ: ﴿ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ﴾ یعنی پھر اللہ پاک اس حیات کے بعد تم کو مارتا ہے، پھر قیامت کے دن تم کو زندہ کرے گا۔ ﴿ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ ﴾ یعنی وہ لوگ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ ﴿ مَنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ﴾ یعنی ان میں سے کوئی بھی ان کاموں میں سے کسی کام پر قدرت نہیں رکھتا۔ بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی پیدا کرنے، رزق دینے، زندہ کرنے اور مارنے کے ساتھ مستقل ہے۔ پھر قیامت کے دن مخلوقات کو مبعوث کرے گا، اسی لیے اس سب کے بعد یہ فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات سے بلند، مقدس، پاک، عظمت والا، جلیل اور غالب ہے کہ اس کے لیے کوئی شریک یا نظیر یا مساوی یا بیٹا یا باپ ہو، بلکہ وہ تو واحد، فرد اور صمد ہے، جس نے نہ کسی کو جنا نہ اس کو کسی نے جنا اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے۔ [4]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩١) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٧١)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣٤٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠١٤)

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٦٩) اس کی سند میں "سلام بن شرحبیل" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ٤٧٩٨)

[4] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٧١)

فتح البیان کا بیان.

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ فَاٰتِ ﴾ کا خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے اور آپ ﷺ کی امت آپ ﷺ کی مقتدی ہے۔ یا ہر اس مکلّف کو خطاب ہے جس کے پاس مال ہے اور اللہ نے اس مال کی اس پر وسعت کی ہے۔ قرابت پر احسان کرنے کا ذکر پہلے اس لیے کیا ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو قریب پر ہوتا ہے، چنانچہ وہ صدقۂ مضاعفہ اور صلۂ رحم ہے، جس میں ان پر احسان کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان کو صدقہ و خیرات دے، ان کے ساتھ صلہ رحمی کرے، حسنِ سلوک سے پیش آئے، وہ کسی مخمصے یا حاجت میں ہوں یا نہ ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں محارم کے لیے نفقے کے وجوب کی دلیل ہے۔ حنفیہ اسی کے قائل ہیں۔ مستحقِ زکات کی باقی قسموں کا ذکر نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صدقۂ نفلی میں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے تمام اقارب کا چچا کی اولاد پر قیاس کیا ہے، سوائے اصول و فروع کے، کیوں کہ ان کے درمیان کسی طرح کی ولادت نہیں ہے۔ غرضیکہ ناتے والے کو اور مسکین اور مسافروں کو ان کا حق دے، جس کے وہ مستحق ہیں۔

ان تینوں قسموں کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ احسان کرنے کے لیے یہ لوگ باقی اصناف سے اولیٰ ہیں اور اس واسطے کہ یہ دینا ان کے لیے واجب ہے ہر اس شخص پر جس کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ مال ہے اور اس کی کفایت سے زیادہ ہے جس کی وہ عیالداری کرتا ہے۔ برابر ہے کہ یہ شخص صاحبِ زکات ہو یا نہ ہو، اور برابر ہے کہ سال سے پہلے ہو یا سال کے بعد، کیوں کہ اس جگہ مقصود شفقتِ عامہ ہے اور ان تین شخصوں پر احسان واجب ہے، اگرچہ انسان کے پاس فالتو مال نہ ہو۔ فقیر مسکین میں داخل ہے، کیوں کہ کوئی شخص اگر مساکین کے لیے کسی شے کی وصیت کرے تو وہ وصیت فقراء پر بھی خرچ کی جائے گی۔ اور جس وقت تو باقی اصناف کی طرف نظر کرے تو ان کو دیکھے گا کہ ان کے لیے مال خرچ کرنا واجب نہیں ہے، سوائے ان کے جن پر زکات واجب ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قریبی رشتے دار کو سب سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ اس کی حاجت کو دور کرنا واجب ہے، خواہ وہ مخمصہ میں ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ اسی لیے اس کو اس سے پہلے رکھا ہے، جس کی حاجت کو دور کرنا واجب نہیں ہے غیر مالِ زکات کے ذریعے، مگر جب وہ شدت میں ہو۔

رہا مسکین تو اس کی حاجت کسی خاص مقام کے ساتھ مختص نہیں، لہٰذا اسے مقدم کیا گیا اس پر جس کی حاجت مختص بہ موضع دون موضع ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: مسکین کا حق یہ ہے کہ اس پر صدقہ کرے اور ﴿ اِبْنَ السَّبِيْلِ ﴾ کا حق ضیافت ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اختلاف ہے کہ آیا محکم ہے یا منسوخ۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت وراثت کی آیت سے منسوخ ہے۔ کسی نے کہا: محکم ہے۔

قریبی فقیر کے لیے اپنے قریبی غنی کے مال میں حق واجب ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: کسی سے صدقہ اس حال میں قبول نہیں کیا جاتا کہ اس کا قریبی رشتہ داری محتاج ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ الْقُرْبٰى ﴾ سے مراد نبی اکرم ﷺ کی قرابت ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ ان کا حق تو کتاب اللہ میں اللہ عزوجل کے اس فرمان میں بیان کیا گیا ہے: ﴿ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى ﴾ [الأنفال: ٤١] ''اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (اس کے) رشتے داروں کے لیے ہے۔'' امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: اِیتائے ذوی القربیٰ میں حکم ندب کے لیے ہے۔[1]

رہی یہ بات کہ قرابت والے کو اور مسکین کو اور ابن سبیل کو اس جگہ دینے کا حکم دیا ہے تو صدقہ نفلی سے دے یا صدقۂ واجب، یعنی زکات سے؟ تو ظاہر یہی ہے کہ صدقۂ تطوع، یعنی نفلی مراد ہے، کیوں کہ سورت مکی ہے اور زکات مدینہ منورہ میں ۲ ہجری میں فرض ہوئی۔ ﴿ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ﴾ یعنی یہ دینا روک لینے سے افضل ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ پاک کے تقرب کا ارادہ کرتا ہے اور اپنے احسان کرنے سے خالص اس کی ذات پاک کا قصد کرتا ہے۔ ﴿ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ اور وہی لوگ اپنے مطلوب کو حاصل کرنے والے ہیں، اس لیے کہ خاص اللہ پاک کی ذات کے اس کا حکم مانتے ہوئے خرچ کیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اٰتَيْتُمْ ﴾ جمہور نے بہ مد پڑھا ہے، بہ معنی "أَعْطَيْتُمْ" اور مجاہد، حمید اور ابن کثیر رحمہم اللہ نے بقصر بہ معنی "مَا فَعَلْتُمْ" پڑھا ہے،[2] یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ کسی نے کہا: بالقصر بہ معنی "مَا جِئْتُمْ بِهِ مِنْ إِعْطَاءِ رِبًا" ہے۔ یہ قول معنی کی حیثیت سے مشہور قراءت کی طرف راجع ہوتا ہے، یعنی مد، کیوں کہ اس کے معنی یہ ہیں: "مَا فَعَلْتُمْ عَلٰى وَجْهِ الْإِعْطَاءِ" جس طرح کہ محاورے میں بولتے ہیں: "أَتَيْتُ خَطَاءً وَأَتَيْتُ صَوَابًا" یعنی میں نے خطا کیا اور صواب کیا۔ یا جب کوئی نیک و بد کام کرتا ہے تو کہتے ہیں: "أَتٰى مَعْرُوْفًا وَّأَتٰى قَبِيْحًا" اور ﴿ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ ﴾ میں قراءتِ مد پر اجماع کیا ہے۔

اصل ربا کی زیادت یا اضافہ ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ شے جو تم نے عطا کی اضافی، ایسا اضافہ جو عوض سے خالی ہے، اس طریقے سے کہ کوئی شے بطور ہبہ یا عطیہ یا ہدیہ دو، تاکہ وہ زیادہ ہو اور لوگوں کے مال میں بڑھے تو وہ اللہ کے نزدیک نہ بڑھے گی، جمہور نے ﴿ لِيَرْبُوَا ﴾ بیائے تحتیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ فعل ضمیر ربا کی طرف مسند ہے اور امام نافع اور یعقوب رحمہما اللہ نے بتائے فوقیہ مضمومہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ خطاب ہے جماعت کو اس معنی میں "لِتَكُوْنُوْا ذَوِيْ زِيَادَاتٍ"۔ اور امام ابو مالک رحمہ اللہ نے "لِتَرْبُوْهَا" پڑھا ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ شے اللہ کے نزدیک نہ بڑھے گی اور نہ وہ اس پر ثواب دے گا، کیونکہ وہ تو اسی شے کو قبول کرتا ہے جس سے خالص اس کی ذات کا ارادہ کیا

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٣٥) فتح القدير (٤/ ٢٩٨) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٣٦)

جاتا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ رِبًا ﴾ اس جگہ ہدیہ ہے، جس کو آدمی اپنے بھائی کے واسطے بھیجتا ہے، اس پر مکافات طلب کرتا ہے۔ چنانچہ یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، یعنی ہدیہ والے کو اس پر اجر نہیں دیا جاتا اور نہ اس پر کسی طرح کا گناہ ہے۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ مفسرین کی جماعت کا قول ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی آدمی کا کوئی شے اس خیال سے دینا کہ اس کے عوض میں اس کو اس سے زیادہ دیا جائے، یہ کچھ حرام نہیں ہے، لیکن اس میں کسی طرح کا ثواب نہیں ہے، اس لیے کہ ہبہ کرنے والا اس شے کا ایسا عوض چاہتا ہے جو اس سے زیادہ ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس شے کے ساتھ انسان کسی کی خدمت کرتا ہے، تاکہ اس سے اپنی دنیا میں منتفع ہو تو یہ نفع جس کے ساتھ خدمت جاری ہوتی ہے اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ خاص طور پر نبی اکرم ﷺ پر حرام تھا اس آیت کے سبب سے: ﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴾ [المدثر: ٦] ”اور حصولِ کثرت کے لیے احسان نہ کیجیے۔“

معنی اس کے یہ ہیں کہ تو عطا کرے کوئی شے، پھر اس سے اکثر لے اس کے عوض میں۔ آپ ﷺ کی عزت اور بزرگی کے لیے یہ بات آپ پر حرام ہوئی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت ہبۂ ثواب میں نازل ہوئی ہے، یعنی ہبہ بالعوض۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابن جبیر، طاؤس اور مجاہد رحمہم اللہ اس کے قائل ہیں۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا اور جو شے اس کی قائم مقام ہے اس قبیل سے جس کو انسان اس لیے کیا کرتا ہے کہ اس پر جزا دیا جائے، جیسے سلام وغیرہ گو اس میں کسی طرح کا گناہ نہیں ہے، مگر نہ اس میں اجر ہے اور نہ زیادت ہے اللہ کے نزدیک۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ربا دو طرح کے ہیں: ایک ربا حلال ہے، ایک ربا حرام۔ حلال ربا تو وہ ہے کہ کوئی ہدیہ کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اس چیز کی جو اس سے افضل ہے، یعنی جس طرح اس آیت میں ہے۔ کسی نے کہا: یہ جو اس آیت میں ہے ربائے محرم ہے تو اس قول کی بنا پر ﴿ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ لینے والے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ہے جس سے لیا گیا ہے۔

امام مہلب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما نے اس شخص کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے کوئی ایسا ہبہ کیا، جس کا عوض طلب کرتا ہے۔ چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں نظر کی جائے، پس اگر وہ ہبہ کرنے والا ان لوگوں میں سے ہے جو اس سے بدلے کے طالب ہوتے ہیں جس کو ہبہ کرتے ہیں تو اس کے لیے اس کے مثل ہے، جیسے کوئی فقیر کسی غنی کو ہبہ کرے، یا خادم مخدوم کو ہبہ کرے اور آدمی اپنے امیر و سردار کو ہبہ کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے دو قول میں سے یہ ایک ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے واسطے کوئی عوض نہ ہوگا جبکہ اس نے شرط نہیں کی ہے، یہ دوسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مواہب (ہبہ) تین ہیں: ایک موہبہ وہ ہے جس سے اللہ کی ذات کا ارادہ کیا جاتا ہے اور ایک موہبہ وہ ہے جس سے لوگوں کی تعریف کا ارادہ کیا جاتا ہے اور ایک موہبہ وہ

ہے جس سے عوض طلب کیا جاتا ہے۔ پس موہبۂ عوض میں تو اس کا صاحب رجوع کر سکتا ہے، اگر اس پر عوض نہ دیا جائے، پہلی دو قسموں کے برخلاف کہ ان میں اُن کا صاحب رجوع نہیں کر سکتا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴾ زکات سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ صدقے کو جو زکات کے پیرایہ میں ادا کیا تو اس کا نکتہ یہ ہے کہ وہ صدقہ پاک کرنے والا ہے، یعنی جو تم نے دیا نفلی صدقہ، جس کا عوض تم طلب نہیں کرتے اور اس سے صرف اس ثواب کو چاہتے ہو جو اللہ کے پاس ہے اور اس سے تم اپنے مالوں کو پاک صاف کرتے ہو شبہات سے اور اپنے بدنوں کو گناہوں کی ناپاکی سے پاک کرنا چاہتے ہو اور اپنے اخلاق کو خیانت اور بدخوئی سے پاک کرنا چاہتے ہو تو ایسے ہی وہ لوگ ہیں جو ذوو الاضعاف ہیں نیکیوں سے. جو ایک نیکی کے عوض دس گنا یا سات سو گنا تک دیے جاتے ہیں۔

"مُضْعِفُوْنَ" بہ ضم میم و کسرِ عین میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ "أَضْعَفَ" سے اسم فاعل ہے۔ جب کوئی شخص صاحبِ ضعف ہو جاتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "أَضْعَفَ"۔ اس کی نظیر "أَقْوَی" و "أَيْسَر" ہے، یعنی فلاں شخص صاحبِ قوت و صاحبِ غنا ہو گیا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول قولِ عرب کے مثل ہے، جب کسی کے اونٹ موٹے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: "فُلَانٌ مُسْمِنٌ" اور جب پیاسے ہوتے ہیں تو بولتے ہیں: "مُعْطِشٌ" اور جب ضعیف ہوتے ہیں تو کہتے: "مُضْعِفٌ"[2]۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اصحابِ اضعاف ہیں، ان کے لیے ان کے دیے ہوئے کا ثواب دس گناہ دیا جائے گا یا اس سے بھی زیادہ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "أَضْعَفَ"، متعدی سے ہے، یعنی تضعیف کیے جائیں اپنے ثواب و اموال کو زکات کی برکت کے سبب سے۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے "مُضْعَفُوْنَ" بہ فتحِ عین بہ صیغۂ اسم مفعول پڑھا ہے۔[3]

اب رہی یہ بات کہ اسلوبِ کلام یہ تھا کہ "فَأَنْتُمُ الْمُضْعِفُوْنَ" فرمایا جاتا تو یوں نہ کہا، بلکہ خطاب سے التفات کیا غیبت کی طرف اور ﴿ فَاُولٰٓىِٕكَ ﴾ فرمایا۔ تو اس کا نکتہ یہ ہے کہ یہ التفات تعظیم کے واسطے کیا گیا، گویا ان کے حال کی تعریف کرنے کے لیے اس کا خطاب فرشتوں کو اور خواص مخلوق کو کیا۔ چنانچہ اس میں "أَنْتُمُ الْمُضْعِفُوْنَ" کہنے سے بڑھ کر ان کی تعریف ہے۔ یا غیر مخاطبین کی عمومیت کے لیے ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ جو کوئی یہ کام کرے گا تو وہ لوگ وہی ہیں "مُضْعِفُوْنَ"، یعنی اس کی سبیل مخاطبین کی سبیل ہو گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ظاہر مقابلہ کا مقتضا یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: "فَيَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ"، مگر ربا کی عبارت کو تغیر دے کر اضعاف کہا اور جملہ فعلیہ کے عوض میں جملہ اسمیہ ذکر کیا جو دوام پر دال ہے اور ضمیر فصل پر مشتمل ہے، جو حصر کے لیے مفید ہے۔ معنی "اَلْمُضْعِفُوْنَ بِهٖ" ہیں، کیوں کہ اس کے لیے ضمیر کا ہونا ضروری ہے کہ مائے موصولہ کی طرف راجع ہو۔

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ٣٦۔ ٣٩) فتح القدير (٤/ ٢٩٩) [2] فتح القدير (٤/ ٢٩٩) [3] فتح القدير (٤/ ٢٩٩)

پھر اللہ پاک نے مشرکوں پر حجت قائم کرنے کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ﴾ یعنی پیدا کرنے، رزق دینے، زندہ کرنے اور مارنے کے ساتھ وہی مختص ہے۔ پھر بطور استفہام فرمایا: ﴿ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ﴾ شرکاء کی اضافت ان کی طرف اس لیے کی کہ وہ ان کا نام الٰہ رکھتے تھے اور اپنے مالوں میں سے ان کے لیے ایک حصہ ٹھہراتے تھے، یعنی کیا ہے تمھارے بتوں سے جن کو تم نے زعم کیا ہے کہ وہ شریک ہیں، کوئی ایسا شخص جو پیدا کرنے، رزق دینے، مارنے اور زندہ کرنے میں سے کوئی کام کر سکے؟ اور یہ بات معلوم ہے کہ وہ اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے، جو اُن میں سے کوئی کام کر سکے۔ پھر ان پر حجت قائم ہو جائے گی۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسم کریم مبتدا ہے اور اسم موصول اس کی خبر۔

یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول صفت ہو اور خبر جملہ ﴿ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ ﴾ ہو اور اس کا رابطہ ﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ کے اسمِ اشارہ میں ہو، کیوں کہ یہ "من أفعاله" کے معنی میں ہے۔ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ پہلا اور دوسرا شیوعِ حکم کے بیان کے لیے ہے جنسِ شرکاء و افعال میں اور تیسرا ﴿ مِنْ ﴾ زیادہ ہے تعمیم نفی کے لیے۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ ﴾ خبر مقدم ہے اور ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا اور ﴿ مَّنْ یَّفْعَلُ ﴾ مبتدا اور ﴿ مِنْ ذٰلِكُمْ ﴾ محذوف سے متعلق ہے، کیوں کہ وہ حال ہے ﴿ مِّنْ شَیْءٍ ﴾ سے جو اس کے بعد ہے، کیوں کہ وہ اصل میں اس کی صفت ہے اور تیسرا ﴿ مِنْ ﴾ زیادہ کیا گیا ہے مفعول بہ میں، کیوں کہ وہ حیز نفی (نفی کی جگہ) میں ہے، جو استفہام سے مستفاد ہے۔ تقدیر یہ ہے: "مَنِ الَّذِي يَفْعَلُ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكُمْ مِنْ شُرَكَاءِكُمْ لَا يَعْنِي لَيْسَ مِنْهَا مَنْ يَّفْعَلُ شَيْئًا مِنْ هٰذِهِ الْأَفْعَالِ" پھر اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس کی تنزیہ فرمائی: ﴿ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی تم اس کی تنزیہ کرو اس باتوں سے جو اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں ہیں، وہ متعالی و برتر ہے، اس بات سے کہ اس میں سے کچھ بھی اس پر جائز ہو۔[2]

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝۴۱ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِیْنَ ۝۴۲

خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے فساد ظاہر ہو گیا ہے، تا کہ اللہ انھیں ان

[1] تفسير أبي السعود (٧/ ٦٢) [2] فتح البيان (١٠/ ٢٥١۔ ٢٥٥)

کے بعض اعمال (کا مزہ) چکھائے، جو انھوں نے کیے، تاکہ وہ (ہدایت کی طرف) رجوع کریں (41) آپ کہہ دیجیے: تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ ان کے اکثر مشرک ہی تھے (42)

گناہوں کے سبب دنیا میں فساد و بگاڑ:

یعنی کفر اور ظلم پھیل پڑا ہے زمین میں اور تری میں، یعنی جہازوں میں لوٹ مار ہر طرف اس کا وبال پڑا۔ اصل سزا تو آخرت میں ہے، لیکن کچھ یہاں پر بھی ہے۔ شاید ڈر کر راہ پر آجائیں۔ انتھٰی.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے: "بَرّ" سے اس جگہ مراد فیافی، یعنی جنگل ہیں اور "بحر" سے مراد شہر اور گاؤں ہیں۔ ایک روایت میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ رحمہ اللہ سے یہ ہے کہ "بحر" وہ شہر اور گاؤں ہیں جو اُن میں سے نہر کے کنارے پر ہیں۔[1] دوسروں نے کہا ہے کہ بلکہ "بَرّ" سے مراد یہی برِ معروف، یعنی خشکی اور "بحر" سے مراد یہی بحرِ معروف، یعنی تری ہے۔

زید بن رفیع نے کہا: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ﴾ یعنی فساد ظاہر ہوا جنگل سے بارش کا انقطاع جس کے بعد قحط ہوتا ہے اور دریا سے اس کے جانور اندھے ہو جاتے ہیں۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ "بَرّ" کا فساد بنی آدم کا قتل ہے اور "بَحر" کا فساد کشتیوں کو غصب کر لینا ہے۔[3] امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بَرّ" سے مراد شہر اور گاؤں ہیں جو اس میں ہیں اور "بَحر" سے مراد اس کے جزیرے ہیں۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے اور اکثر اسی پر ہیں۔ اس کی تائید وہ بات کرتی ہے جو محمد بن اسحاق نے سیرت میں کہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہ ایلہ سے مصالحت کی۔ "وَكَتَبَ إِلَيْهِ بِبَحْرِهِ" یعنی "بِبَلَدِهِ".[4] غرض یہ ہے کہ "بَحر" کے معنی شہر سنت سے ثابت ہیں۔

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ معاصی کے سبب سے کھیتوں اور پھلوں میں نقصان ظاہر ہو گیا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: جس نے نافرمانی کی اللہ کی زمین میں تو مقرر اس نے زمین میں فساد کیا، کیوں کہ زمین و آسمان کا صحیح طور پر قائم رہنا طاعت سے ہے،[5] اسی لیے اس حدیث شریف میں جس کو امام ابو داود رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، یوں مروی ہے: البتہ ایک حد جو قائم کی جائے زمین میں وہ اس کے رہنے والوں کے لیے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ ان پر چالیس دن بارش برسائی جائے۔[6]

---

(1) تفسير الطبري (٢٠/ ١٠٨) الدر المنثور (٦/ ٤٩٦) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٢)

(3) تفسير الطبري (٢٠/ ١٠٩) (4) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٢) (5) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٨٥٣)

(6) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٣٨) مسند أحمد (٢/ ٣٦٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣١) البتہ سنن ابی داود میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت حدیں قائم کی جاتی ہیں تو اکثر لوگ یا بہت سے لوگ محرمات میں غور کرنے یا ان میں پڑنے سے باز رہتے ہیں اور جب معاصی ترک کیے جاتے ہیں تو یہ معاصی کو چھوڑنا آسمان و زمین کے بیچ میں برکات کے حصول کا سبب ہوتا ہے، اور اسی لیے جب عیسی بن مریم علیہ السلام آخر زمانے میں نازل ہوں گے تو اس وقت اسی شریعتِ مطہرہ کے ساتھ حکم کریں گے۔ خنزیر کا قتل کرنا، صلیب کا توڑنا، وضعِ جزیہ، یعنی جزیہ کا ترک کرنا؛ نافذ کریں گے، چنانچہ وہ صرف اسلام یا تلوار قبول کریں گے۔

پھر جب اللہ پاک ان کے زمانے میں دجال کو اور اس کے اتباع اور یاجوج ماجوج کو ہلاک کر ڈالے گا تو زمین سے کہا جائے گا کہ اپنی برکت نکال تو ایک انار میں سے لوگوں کے گروہ کھالیں گے اور اس کے چھلکے سے سایہ لیں گے اور ایک اونٹنی کا دودھ لوگوں کی ایک جماعت کے لیے کافی ہوگا۔ یہ صرف نبی اکرم ﷺ کی شریعتِ مطہرہ کی برکت سے ہوگا۔ جب کبھی عدل قائم کیا گیا تو برکات اور خیر کی کثرت ہوئی۔ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ فاجر جس وقت مرجاتا ہے تو اس سے عباد و بلاد و درخت اور جانور راحت پاتے ہیں۔[1] اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ زیاد کے زمانے میں ایک تھیلی پائی گئی، اس میں گیہوں کے دانے کھجور کی گٹھلیوں کے برابر تھے، اس میں لکھا ہوا تھا کہ یہ اس زمانے میں اُگا ہے جس میں عدل کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا۔[2] امام مالک نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ اس جگہ فساد سے مراد شرک ہے۔ اور اس میں نظر ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا ﴾ یعنی مال و جان اور پھل کے کم کرنے سے ان کو آزماتا ہے، یہ اس کی طرف سے ان کو جانچنا ہے اور ان کو ان کے کام پر بدلہ دینا ہے۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴾ یعنی شاید وہ معاصی سے رجوع ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَبَلَوْنَٰهُم بِالْحَسَنَٰتِ وَالسَّيِّـَٔاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴾ [الأعراف: ١٦٨] ''اور ہم نے انھیں خوش حالی اور بدحالی کے ساتھ آزمایا، شاید کہ وہ (اللہ کی طرف) لوٹ آئیں۔'' پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ ﴾ یعنی ملک میں پھرو تو دیکھو کہ پہلے لوگوں پر رسولوں کے جھٹلانے اور نعمتوں کی ناشکری کرنے کی وجہ سے کیا کچھ نازل ہوا ہے۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ اللہ پاک نے بیان فرمایا کہ دنیا میں فساد کے ظاہر ہونے کا سبب شرک اور معاصی ہیں۔ ''فَسَادٌ'' مصدر ہے ''فَسَدَ'' سے، جیسے: ''نَصَرَ وَكَرُمَ''۔ ''فَسَاداً'' ضد ہے صلح کی۔ فساد

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٥٠)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٩٦) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٢)

مال کو از راہِ ظلم لینا ہے اور خشک سالی ہے اور مفسدہ ضد مصلحت ہے۔[1] (كذا في القاموس) ظہورِ فسادِ مذکور کے معنی میں اختلاف ہے، چنانچہ کسی نے کہا: قحط، سبزہ کا نہ ہونا، رزق کا نقصان، خوف کی کثرت اور اس طرح کی اُور باتیں ہیں۔

امام مجاہد اور عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بَرّ" میں فساد ابن آدم کا اپنے بھائی کو مار ڈالنا ہے، یعنی قابیل کا ہابیل کو قتل کرنا ہے اور "بَحر" میں فساد وہ بادشاہ ہے جو ہر کشتی کو غصب کرنے کے طور پر لیا کرتا تھا۔[2] کاش میں جان لیتا کہ اس تخصیصِ بعید اور تعیینِ غریب پر ان دونوں صاحبوں کی دلیل کیا ہے، کیوں کہ آیتِ کریمہ تو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی ہے اور فساد کی تعریف میں جنس پر دلالت کر رہی ہے، لہٰذا جو فساد بر و بحر کے کناروں میں واقع ہونے والا ہے، یہ فساد اس سب کو عام و شامل ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فساد شرک ہے اور یہ بہت بڑا فساد ہے۔ ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ شرک اگرچہ گناہوں کی قسموں میں ایک کامل فرد ہے، لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ خاص طور پر وہی مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فساد کسادِ اسعار (قیمتوں میں کمی) اور قلتِ معاش ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ راستوں کا قطع کرنا اور ظلم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ برکت کا نقصان ہے بندوں کے اعمال کے سبب سے، تاکہ وہ توبہ کریں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب اقوال سے بہترین قول ہے، جو اس آیت کے بارے میں کہے گئے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بحر میں فساد بنی آدم کے گناہوں کے سبب سے اس کے شکار کا منقطع ہونا ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: پھر جب بارش کم ہوتی ہے تو دریا میں غوطہ لگانا کم ہو جاتا ہے اور دریا کے جانور اندھے ہو جاتے ہیں۔[3] ان کے سوا اور اقوال ہیں، جو تخصیص بلا دلیل ہیں۔ آیتِ کریمہ سے جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ اس شے کا ظاہر ہونا ہے جس پر فساد کا اطلاق صحیح ہوتا ہے، وہ ظاہر ہونا بنی آدم کے افعال کی طرف راجع ہو، یعنی ان کے گناہ اور برائیاں اور ان کا باہمی قطع تعلق کرنا، ظلم کرنا اور قتل کرنا۔ یا وہ راجع ہو اس شے کی طرف جو اللہ پاک کی طرف سے بنی آدم کے گناہوں کے سبب سے پہنچے، جیسے: قحط و کثرتِ خوف اور عام موت اور کھیتیوں اور پھلوں کا نقصان اور جلنے اور غرق ہونے کی کثرت اور ہر شے سے برکتوں کا مٹ جانا۔

بر و بحر سے مراد وہی معروف و مشہور بر و بحر ہیں، یعنی جنگل و دریا۔ کسی نے کہا: "بر" فیافی ہیں اور "بحر" وہ بستیاں ہیں جو پانی کے کنارے پر ہیں۔ یہ قول امام عکرمہ رحمہ اللہ کا ہے۔ عرب لوگ امصار کا نام بحار رکھتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "بَرّ" وہ شہر اور گاؤں ہیں جو غیر نہر پر ہوں اور "بَحر" وہ ہیں جو نہر کے کنارے پر ہوں۔ اسی کے مثل سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے،[4] لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ نیز "بَرّ" کے معنی "بَرّ" کے شہر ہیں اور "بَحر" کے معنی "بَحر" کے شہر ہیں اور جو اُن کے متصل ان کے کھیت اور چراگاہیں ہیں۔

---

[1] القاموس المحيط (١/ ٣٠٦)
[2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٠٩) تفسير القرطبي (١٤/ ٤٠)
[3] تفسير القرطبي (١٤/ ٤٠) فتح القدير (٤/ ٣٠٠)
[4] تفسير القرطبي (١٤/ ٤٠) فتح القدير (٤/ ٣٠٠)

﴿ بِمَا كَسَبَتْ ﴾ میں حرف باء سببیہ ہے اور کلمۂ "ما" موصولہ ہے یا مصدریہ۔ ﴿ لِيُذِيْقَهُمْ ﴾ میں حرف لام علت کا ہے اور ﴿ ظَهَرَ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی ظاہر ہوا فساد جنگل اور دریا میں بہ سبب ان گناہوں کے جن کو کمایا لوگوں کے ہاتھوں نے، اس لیے کہ چکھائے ان کو بعض سزا ان کے اعمال کی، یا ان کے بعض اعمال کی جزا دنیا میں ہی چکھائے اس سے پہلے کہ آخرت میں ان اعمال پر ان کو عذاب کرے۔ کسی نے کہا کہ محذوف سے متعلق ہے: "أَي: عَاقَبَهُمْ بِذٰلِكَ لِيُذِيْقَهُمْ" کسی نے کہا ہے کہ لام صیرورۃ کے لیے ہے، یعنی اس کے واقع ہونے کے لیے ہے۔ قنبل رحمہ اللہ نے "لِنُذِيْقَهُمْ" بہ نونِ عظمت اور باقی قراء نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔[1] ﴿ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ شاید وہ رجوع کریں ان گناہوں سے جن میں مبتلا ہو رہے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "يَرْجِعُوْنَ مِنَ الذُّنُوْبِ"[2] جبکہ اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ بر و بحر میں فساد ظاہر ہوا، مشرکین اور عاصین کے گناہوں کے سبب سے تو ان کے لیے ان جیسے پہلے لوگوں کی گمراہی بیان کی۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴾ یہ ان کو حکم کیا کہ زمین میں چلیں پھریں، تاکہ پہلے لوگوں کے آثار پر نظر کریں اور مشاہدہ کریں کہ ان کا انجام کیسا ہوا، کیوں کہ ان کے منازل اور مکانات اُجاڑ پڑے ہیں اور ان کی زمینیں بے آب و گیاہ اور وحشت ناک پڑی ہیں، جیسے: عاد، ثمود اور ان کی طرح کے اَور کافروں کے جتھے۔ جملہ ﴿ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴾ مستانفہ ہے۔ اس سے غرض اس حالت کا بیان کرنا ہے جس پر وہ قائم و دائم تھے اور اس سبب کا ظاہر کرنا ہے، جس کی وجہ سے ان کا یہ حال ہوا، جس کا وہ مشاہدہ کر رہے ہیں۔ وہ سبب یہی ان میں شرک اور عصیان کا ظاہر ہونا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ شرک تو اُن کے اکثر لوگوں میں تھا اور اس سے کم درجے کے گناہ ان کے قلیل لوگوں میں تھے۔[3] واللہ أعلم

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿43﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿44﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿45﴾

آپ اپنا رخ درست دین کی طرف سیدھا رکھیں، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس کے لیے اللہ کی طرف سے ٹلنا نہیں ہے، اس دن وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو جائیں گے ﴿43﴾ جس شخص نے کفر کیا، تو اس کے کفر کا وبال اسی پر ہوگا اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے ہی

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٤١) [2] الدر المنثور (٦/ ٤٩٧) [3] فتح البيان (١٠/ ٢٥٦۔ ٢٥٧)

لیے راہ ہموار کر رہے ہیں (44) تاکہ اللہ ان لوگوں کو اپنے فضل سے جزا دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، بلاشبہہ اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا (45)

دین پر استقامت کا حکم:

وہ دن آ جائے، یعنی جب دین کا غلبہ ہو اور سزا پانے والے اور اللہ کے مقبول الگ الگ ہوں۔ انتہی۔

اللہ پاک اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت میں استقامت کی طرف مبادرت کریں، یعنی جلدی کریں اور بھلائیوں اور نیکیوں کی طرف دوڑیں۔ ﴿ يَصَّدَّعُوْنَ ﴾ کے معنی ''یتفرقون'' ہیں، یعنی اس دن لوگ الگ الگ ہوں گے، چنانچہ ایک فریق تو جنت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا:

﴿ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ ﴾ یعنی ان کو جزا دے گا جزا فضل کی، ایک نیکی کے عوض میں دس گنا بدلہ سے لے کر سات سو گنا تک، جہاں تک اللہ پاک چاہے گا دے گا۔ ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک دوست نہیں رکھتا منکروں کو اور باوجود اس کے وہ ان کے بارے میں ایسا عادل ہے کہ ذرا بھر بھی ظلم نہیں کرتا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ فَاَقِمْ ﴾ کا خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے اور آپ ﷺ کی امت اس میں آپ ﷺ کی مقتدی ہے، گویا معنی یہ ہیں کہ جس وقت فساد ظاہر ہو چکا سبب مذکور کی وجہ سے تو اے محمد! اپنا منہ دینِ قیم کے لیے سیدھا کریں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تو اپنی جہت دینِ قیم کی اتباع کو کر،[2] وہ دین جو انتہا درجے کا استقامت اور راستی والا ہے، جس میں کسی طرح کی کجی آ ہی نہیں سکتی، وہ دین حضرتِ اسلام، سلمہ اللہ تعالیٰ، ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: تو واضح کر حق کو اور عذر کو قطع کرنے میں مبالغہ کر اور اس حال میں مشغول رہ جس میں تو ہے اور ان پر رنج نہ کر۔[3] (قاله القرطبي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ﴾۔ ﴿ مَرَدَّ ﴾ مصدر ہے بہ معنی رد، اور ﴿ مِنَ اللّٰهِ ﴾ متعلق ہے ﴿ يَاْتِيَ ﴾ سے، یا محذوف سے جس پر مصدر دال ہے، یعنی پہلے اس سے کہ آئے وہ دن، یعنی قیامت کا دن جس کو اللہ سے کوئی رد نہیں کر سکتا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا ﴾ [الأنبياء: ٤٠] ''پھر وہ اسے ٹال نہ سکیں گے۔'' چنانچہ کوئی اس کے لوٹانے پر قادر نہیں ہے اس کا واقع ہونا ضروری ہے۔ کسی نے کہا جائز ہے کہ یہ معنی ہوں: رد نہ کرے گا اس کو اللہ، کیوں کہ اس کا بہت قدیم ارادہ اس کے آنے کے متعلق

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٣) [2] معاني القرآن (٤/ ١٨٨) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ٤٢)

ہو چکا ہے۔ اس قول میں ضعف اور اللہ کے ساتھ وہ سوئے ادب ہے جو مخفی نہیں ہے۔ ﴿ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴾ اصل میں "يَتَصَدَّعُوْنَ" ہے۔ "تَصَدَّعَ" بہ معنی "تَفَرَّقَ" ہے، جس وقت قوم متفرق ہو جاتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "تَصَدَّعَ الْقَوْمُ" اسی بارے میں کسی شاعر کا یہ قول ہے: ؎

وكُنَّا كَنُدْمَانَي جَذِيْمَةَ حِقْبَةً مِنَ الدَّهْرِ حَتَّى قِيْلَ لَنْ يَتَصَدَّعَا

مصباح میں کہا ہے: "صَدَّعْتُهُ صَدْعًا" باب "نَفَعَ" سے بہ معنی "شَقَقْتُهُ فَانْصَدَعَ" یعنی میں نے اس کو چیرا پھاڑا تو وہ چر پھٹ گیا "وَصَدَّعْتُ الْقَوْمَ صَدْعًا فَتَصَدَّعُوْا" یعنی میں نے ان کو متفرق کر دیا تو وہ متفرق ہو گئے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ﴾ [الحجر: ٩٤] "چناں چہ آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے، کھول کر سنا دیں۔" اس کے بارے میں کسی نے کہا ہے کہ اسی سے ماخوذ ہے، یعنی تو ان کی جماعتوں کو توحید سے چیر پھاڑ ڈال۔ کسی نے کہا کہ توحید سے فرق کر دے حق و باطل کے درمیان۔ کسی نے کہا ہے کہ تو اس کا اظہار کر۔ "صَدَّعْتُ بِالْحَقِّ" کے یہ معنی ہیں کہ میں نے کھلم کھلا حق کے ساتھ کلام کیا۔ اور "صَدَّعْتُ الْفَلَاةَ" کے یہ معنی ہیں کہ میں نے جنگل کو قطع کیا۔[1] ان کے تفرق سے اس جگہ مراد یہ ہے کہ جنت والے جنت کی طرف جائیں گے اور نار والے نار کی طرف جائیں گے۔

پھر اللہ پاک نے متصدعین کی یہ تفصیل بیان فرمائی: ﴿ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ﴾ یعنی جس کسی نے انکار کیا تو اس کے انکار کا بدلہ اور وبال اسی پر پڑے گا، وہ بدلہ دوزخ ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا۔ قولہ: ﴿ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴾ یعنی اور جس نے نیک عمل کیا تو وہ اپنے ہی واسطے توطیہ و تمہید کرتے ہیں، یعنی جنت میں اپنے عملِ صالح کی بدولت منازل تیار کرتے ہیں یا بچھاتے ہیں۔ "مِهَادٌ" بہ معنی فرش ہے۔ جب تو بچھونا بچھائے گا اور اسے نرم کرے گا تو یوں بولے گا: "مَهَّدْتُّ الْفِرَاشَ مَهْدًا" چنانچہ اعمالِ صالحہ جو دخولِ جنت کا سبب ہیں، ان کو ایسا ٹھہرایا جیسا جنت میں منازل و مکانات کا بنانا اور ان میں فرش اور بچھونے بچھانا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: "فَعَلَى أَنْفُسِهِمْ يُشْفِقُوْنَ" یعنی وہ اپنے ہی نفوس پر شفقت کرتے ہیں۔ یہ معنی عرب کے قول سے ماخوذ ہیں، جو وہ مشفق اور مہربان کے حق میں بولتے ہیں کہ "أُمٌّ فَرَشَتْ فَأَنَامَتْ"، یعنی فلاں مہربان ماں کی طرح ہے کہ بچھونا بچھایا، پھر سلا دیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ فِي الْقَبْرِ"[2] یعنی اپنی ہی جانوں کے لیے قبروں میں بستروں کو نرم کرتے ہیں اور درست کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کوئی نیک کام کرتا ہے تو وہ اپنے لیے قبر میں راحت و آرام کا سامان درست کرتا ہے کہ موت کے بعد وہاں چین سے بسر کرے گا۔ تقدیمِ ظرف دونوں جگہ اس لیے ہے کہ اختصاص پر دال ہو۔

---

[1] المصباح المنير (١/ ١٧٥) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ١١٢)

﴿ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ میں حرف لام ﴿ يَصَّدَّعُوْنَ ﴾ یا ﴿ يَمْهَدُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے۔ یعنی وہ لوگ متفرق ہوں گے، اس لیے کہ اللہ اپنے فضل سے مومنوں کو اس شے کے ساتھ بدلہ دے جس کے وہ مستحق ہیں اور کافروں کو اپنے عدل سے اس شے کے ساتھ بدلہ دے جس کے وہ لائق ہیں، اس بنا پر کہ کفر کا نقصان کافر ہی کو ہوگا اور ایمان وعمل کا فائدہ مومن ہی کو پہنچے گا، اس سے تجاوز نہ کرے گا۔ یا یہ معنی ہیں کہ اعمالِ صالحہ کے ساتھ اپنی جانوں کے لیے راہ سنوارتے ہیں، تاکہ اللہ ان کو جزا دے۔ کسی نے کہا: لام محذوف سے متعلق ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "ذٰلِكَ لِيَجْزِيَ... الخ" اور یہ اشارہ ہوگا: ﴿ مَنْ كَفَرَ ﴾ اور ﴿ مَنْ عَمِلَ ﴾ کی طرف جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ لِيَجْزِيَ ﴾ کے یہ معنی ہیں: "لِيُثِيْبَهُمُ اللّٰهُ ثَوَابًا أَكْثَرَ مِنْ أَعْمَالِهِمْ"[2] یعنی تاکہ ان کو اللہ ان کے اکثر اعمال کا ثواب عطا کرے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے ﴿ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ کا قسیم محذوف قرار دیا ہے، اس لیے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ اس پر دال ہے،[3] کیونکہ یہ قول ان کے لیے اللہ پاک کے بغض کا اشارہ ہے، کون سا بغض وہ جو اللہ پاک کے غضب کا موجب ہے اور اس کا غضب اس کے عذاب کو لے کر آتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ قول تقریر بعد تقریر ہے، طرد وعکس کی بنا پر اور اس میں کفار کے لیے تہدید ووعید ہے۔[4]

(الطرد ما يوجب الحكم لوجود العلة وهو التلازم في الثبوت[5] و العكس في اصطلاح الفقهاء عبارة عن تعليق نقيض الحكم المذكور بنقيض علته المذكورة رداً إلى أصول آخر كقولنا ما يلزم بالنذر يلزم بالشروع كالحج وعكسه ما لم يلزم بالنذر لم يلزم بالشروع فيكون العكس على هذا ضد الطرد ـكذا في التعريفات۔ و العكس هو التلازم في الانتفاء بمعنى كلما لم يصدق الحد لم يصدق المحدود و قيل العكس عدم الحكم لعدم العلة)[6]

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۴۶ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۭ

[1] فتح القدير (٤/ ٣٠١) [2] تفسير البغوي (٦/ ٢٧٥) [3] تفسير البحر المحيط (٧/ ١٧٢)
[4] فتح البيان (١٠/ ٢٥٨ـ ٢٦٠) [5] التعريفات للجرجاني (١/ ١٨٣) [6] التعريفات للجرجاني (١/ ١٩٨)

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بشارت دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے اور تا کہ وہ تمھیں اپنی رحمت (کا مزہ) چکھائے، اور تا کہ اس کے حکم سے کشتیاں چلیں، اور تا کہ تم اس کا فضل تلاش کرو، اور تا کہ تم شکر کرو ﴿46﴾ اور بلاشبہ ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول ان کی قوموں کی طرف بھیجے، پھر وہ ان کے پاس روشن دلائل لے کر آئے (مگر انھوں نے انھیں جھٹلایا)، پھر جن لوگوں نے جرم کیے تھے، ہم نے ان سے انتقام لیا اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہے ﴿47﴾

ہوائیں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی:

شاید تم شکر گزاری کرو، یعنی ہوا چلنے سے اتنے فائدے ہیں اس سے مینہ کی خبر آتی ہے اور جہاز چلتے ہیں۔ بیچ میں ہوا کا ذکر اس لیے کیا کہ جیسے یہ مینہ کی خبر لاتی ہیں، اسی طرح دین کے غلبے کی نشانیاں روشن ہوتی جاتی ہیں۔ انتہی[1]۔

اللہ پاک اپنی نعمتوں کا ذکر فرماتا ہے جو اس کی مخلوق پر ہیں، اس بات میں کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے، خوش خبری لانے والیاں اس کی رحمت کے آگے آگے، اس بات کی خوش خبری کہ ان کے پیچھے پانی آتا ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ وَلِيُذِيقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهِ ﴾۔ رحمت سے مراد باران ہے، جس کو اللہ پاک اتارتا ہے، پھر اس سے عباد اور بلاد کو زندہ کرتا ہے۔ ﴿ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهِ ﴾ یعنی اور تا کہ چلیں جہاز دریا میں اس کے حکم سے اور ان کو جو چلایا ہے تو ہوا سے چلایا ہے۔ ﴿ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ﴾ یعنی اور تا کہ تم اس کا فضل تلاش کرو تجارتوں اور معایش میں اور ایک اقلیم سے دوسری اقلیم کی طرف چلنے میں اور زمین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جانے میں۔ ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ یعنی اور شاید تم ان بے حد و حساب اور ظاہری اور باطنی نعمتوں پر جن کا اس نے تم کو انعام فرمایا ہے، تم اللہ کا شکر کرو۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا ﴾ یہ اللہ پاک کی طرف سے اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ کے لیے تسلی ہے، اس طرح سے کہ اگرچہ ان کی قوم کے بہت سے لوگوں نے اور دوسرے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تو پہلے رسولوں کی بھی تکذیب ہو چکی ہے، ان واضح دلیلوں کے باوجود جن کو وہ اپنی اپنی امت کے پاس لے کر آئے، لیکن جن لوگوں نے ان کو جھٹلایا اور ان کی مخالفت کی اللہ پاک نے ان سے بدلہ لیا اور جو لوگ ان پر ایمان لائے تھے ان کو نجات دی۔

﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ یعنی ایمان والوں کی مدد کرنا ایک حق ہے، جس کو اللہ پاک نے اپنے نفسِ کریم پر اپنے فضل و کرم کے طور پر واجب کر لیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ

نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ [الأنعام: ٥٤] ''تمھارے رب نے مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے: نہیں ہے کوئی مسلمان مرد کہ رد کرے اپنے بھائی کی آبرو سے، مگر اللہ پر یہ حق ہے کہ قیامت کے دن اس سے جہنم کی آگ کو رد کرے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (وكذا رواه الطبراني و ابن مردويه و الترمذي وهو من طريق شهر بن حوشب عن أم الدرداء رضي الله عنها كذا في الفتحين و كذا في ابن كثير)[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک کی بدیع قدرت کی دلالتوں میں سے ہواؤں کا بھیجنا ہے، یعنی بادِ شمال، بادِ صبا اور بادِ جنوب کا، اس لیے کہ یہ رحمت کی ہوائیں ہیں۔ رہی دبور تو وہ عذاب کی ہوا ہے، اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کا یہ قول پاک ہے: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رِيَاحًا وَّلَا تَجْعَلْهَا رِيْحًا»[2] جمہور نے ﴿ اَلرِّيٰحَ ﴾ بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے اور امام اعمش رحمہ اللہ نے ''الريح'' بہ صیغۂ مفرد بہ ارادۂ جنس پڑھا ہے، اس لیے کہ آگے ﴿ مُبَشِّرٰتٍ ﴾ فرمایا ہے۔[3] یعنی وہ ہوائیں بارش کی خوش خبری لانے والی ہیں، اس لیے کہ بارش کے آگے آگے چلتی ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے:

﴿ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ﴾ [الأعراف: ٥٧] ''جو اپنی رحمت سے پہلے خوش خبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے۔''

﴿ وَلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ يُرْسِلَ ﴾ سے متعلق ہے: ''أَيْ: يُرْسِلُ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَّيُرْسِلُ لِيُذِيْقَكُمْ''۔ رحمت سے مراد غیث و خصب، یعنی بادل ہے۔ یا مراد شیریں پانی، ترو تازہ درخت اور جانوں کی صحت اور جو اُمور ان کے تابع ہیں، جن کی گنتی اللہ پاک کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ سب اللہ سبحانہ کی نعمتیں ہیں، یعنی اللہ ہواؤں کو بارش کی خوش خبری دینے والی بھیجتا ہے، تاکہ تم کو ان کے سبب سے بارش اور ارزانی اور اپنی نعمت کا مزہ چکھا دے۔ کسی نے کہا ہے کہ لام متعلق ہے: ''وَأَرْسَلَهَا'' محذوف سے، یعنی اور بھیجا ان کو، تاکہ تم کو چکھا دے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ واو زاید ہے، اس شخص کی رائے کی بنا پر، جو اس کو جائز سمجھتا ہے تو اس صورت میں خود ﴿ يُرْسِلَ ﴾ مذکور سے متعلق ہوگا اور حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ ﴾ معطوف ہے ﴿ لِيُذِيْقَكُمْ ﴾ پر، یعنی ہواؤں کو بھیجتا ہے، تاکہ دریا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٣) مسند أحمد (٦/ ٤٤٩) الدر المنثور (٦/ ٤٩٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٣) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ آیت کے ذکر کے بغیر سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٣١) اور دیگر کتب میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ (صحيح الجامع، رقم الحديث: ٦٢٦٢)

[2] المعجم الكبير (١١/ ٢١٣) اس کی سند میں ''حسین بن قیس'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٢١٧)

[3] فتح القدير (٤/ ٣٠١)

میں جہاز اُن کے چلنے کے وقت چلیں۔ چونکہ چلنے کی نسبت فلک کی طرف کی ہے۔اس لیے اس کے بعد ﴿ بِاَمْرِهٖ ﴾ کا لفظ فرمایا ہے، یعنی وہ جہاز اللہ پاک کی تدبیر اور اس کی تکوین سے دریا میں چلتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [یٰسٓ: ۸۲] ''جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ اور تاکہ تلاش کرو روزی بہ سبب سامانِ تجارت کے، جس کو جہاز اٹھائے پھرتے ہیں۔ ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ اور شاید تم ان نعمتوں کا شکر کرو تو اکیلے اللہ پاک کو خالص کر کے پوجو اور بہ کثرت اس کی طاعت کرو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یہ دو کلام کے درمیان جملہ معترضہ ہے، وہ کلام جو معنی میں متصل ہیں، یعنی ایک کلام تو قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ ... الخ ﴾ ہے۔اور دوسرا کلام قولہ تعالیٰ: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ ... الخ ﴾ ہے جو آئندہ آتا ہے۔

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کلام نبی اکرم ﷺ کو اُنس دینے کے لیے اور مدد کے وعدے کے لیے اور اہلِ کفر کی وعید کے لیے آیا ہے،[1] اور مومنین کی مدد کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ دنیا ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ آخرت کو بھی عام اور شامل ہے۔ پھر جو مدد آخرت میں ہوگی، وہ اس آیت کے متناولات سے ہے، یعنی اس میں شامل ہے۔ معنی یہ ہیں کہ البتہ مقرر بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی قوم کی طرف، جیسا کہ ہم نے تجھ کو تیری قوم کی طرف بھیجا، پھر وہ اپنی اپنی قوم کے پاس واضح واضح معجزے اور روشن روشن حجتیں اور دلیلیں لے کر آئے، جو ان کی رسالت کی سچائی اور راستی پر دلالت کرتی تھیں۔ چنانچہ ایک قوم نے تو ان کو مانا اور ایک قوم ان کی منکر ہوئی۔

اس عبارتِ مضمر پر قولہ تعالیٰ: ﴿ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ﴾ دال ہے۔ یعنی ہم نے ان لوگوں کو، جنھوں نے گناہ اور جرم کیے تھے، دنیا میں ہلاک کر کے بدلہ لیا۔ ﴿ حَقًّا ﴾ یعنی ہم پر حق ہے کہ کافروں پر ایمان والوں کی مدد کریں۔ کافروں کے ہلاک کرنے اور مومنوں کو نجات دینے کے ساتھ اللہ پاک کی طرف سے یہ خبر دینا ہے کہ اپنے مومن بندوں کی مدد کرنا اس پر ایک حق ہے اور وہ صادق الوعد ہے، وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اس میں مومنین کے لیے عزت اور تعظیم ہے اور مزید عزت افزائی ہے عبادِ صالحین کے لیے۔ بعض قراء نے ﴿ حَقًّا ﴾ پر وقف کیا ہے اور ﴿ كَانَ ﴾ میں اس کے اسم کی ضمیر ٹھہرائی ہے اور ﴿ حَقًّا ﴾ اس کی خبر قرار دی ہے، "أَيْ: وَكَانَ الْاِنْتِقَامُ حَقًّا" یعنی بدلہ لینا حق تھا۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول ضعیف ہے، صحیح یہ ہے کہ ﴿ نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ﴿ كَانَ ﴾ کا اسم ہے اور ﴿ حَقًّا ﴾ اس کی خبر ہے اور ﴿ عَلَيْنَا ﴾ متعلق ہے ﴿ حَقًّا ﴾ سے، یا محذوف سے، اور وہ ﴿ حَقًّا ﴾ کی صفت ہے۔[2]

---

[1] تفسیر البحر المحیط (۷/ ۱۷۳)
[2] فتح القدیر (٤/ ۳۰۳) فتح البیان (۱۰/ ۲٦۰۔ ۲٦۱)

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ
كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ
فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾
وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾
فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾
وَلَىِٕنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ
يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ
اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ
اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾

اللہ وہ ذات ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے، پھر وہ بادل اُٹھاتی بھڑکاتی ہیں، پھر اللہ اسے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے اور وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر آپ بارش دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر سے نکلتی ہے، پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے بارش برساتا ہے تو اس وقت وہ خوش ہو جاتے ہیں 48 اور اگرچہ ان پر بارش برسائے جانے سے قبل، اس (بارش کی خوشی) سے پہلے وہ نا اُمید ہو رہے تھے 49 چناں چہ آپ اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھیں، وہ زمین کو اس کی موت (ویرانی) کے بعد کیسے زندہ (آباد) کرتا ہے، بے شک وہ ضرور مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے 50 اور اگر ہم (تند و تیز) ہوا بھیج دیں، پھر وہ اس (کھیتی) کو زرد پڑتی دیکھیں، تو اس کے بعد وہ ضرور ناشکری کرنے لگتے ہیں 51 تو (اے نبی!) بلاشبہہ آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ آپ بہروں کو (اپنی) پکار سنا سکتے ہیں، جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر لوٹ جائیں 52 اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہدایت کی طرف لا سکتے ہیں، آپ تو صرف انھیں سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، لہٰذا وہی فرماں بردار ہیں 53

زمین کو زندہ کرنے سے موت کے بعد کی زندگی پر دلیل:

پھیلاتا ہے جس طرح چاہے، یعنی پہلے کسی طرف بعد میں کسی طرف، اسی طرح دین بھی پھیلا۔ ناشکری کرنے

لگیں، یعنی غرض کے ساتھ ہی ان کا شکر اور ناشکری ہے، یہاں اس لیے فرمایا کہ اپنی مراد پا کر بندہ بے خوف نہ ہو جائے، اللہ کی قدرت رنگا رنگ ہے۔ انتہیٰ۔

اللہ تعالیٰ بادل کے پیدا کرنے کی کیفیت بیان فرماتا ہے، وہ جس سے پانی نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے، پھر وہ ابھارتی ہیں بدلی یا تو دریا سے، جیسا کہ کئی ایک اہلِ علم لوگوں نے ذکر کیا ہے، یا جس شے سے اللہ پاک چاہتا ہے، پھر اس کو آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے۔ ''بسط'' بہ معنی ''مد'' ہے، یعنی اس کو پھیلاتا ہے، پھر اس کو بہت کرتا ہے اور بڑھاتا ہے اور تھوڑے سے بہت زیادہ کر دیتا ہے۔ ایک بدلی کو آنکھ کے دیکھنے میں اٹھاتا ہے، وہ مثل ڈھال کے دکھائی دیتی ہے، پھر اسے پھیلاتا ہے، یہاں تک کہ افق کے کناروں کو بھر دیتی ہے اور کبھی بدلی بھاری بوجھل ہو کر پانی سے بھری ہوئی دریا کی طرف سے آتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٧] ''اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت سے پہلے خوش خبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے، حتی کہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بادلوں کو اٹھاتی ہیں تو ہم انھیں کسی مردہ شہر کی طرف ہانک دیتے ہیں، پھر ہم ان کے ذریعے سے پانی نازل کرتے ہیں، پھر ہم اس کے ذریعے سے (زمین سے) ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' امام مجاہد، ابو عمرو بن العلاء، مطر وراق اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ''قِطَعاً''۔ ان کے غیر نے کہا ہے ''مُتَرَاكِمًا'' یعنی تہہ بہ تہہ، جیسا کہ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ پانی کی کثرت کے مارے سیاہ، تو اس کو سیاہ بھاری زمین سے قریب دیکھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ یعنی پھر دیکھے تو پانی کے قطروں کو کہ اس بدلی کے درمیان سے نکل رہے ہیں۔ ﴿ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ یعنی پھر جب اس کو پہنچایا، جس کو چاہا اپنے بندوں میں سے، تبھی وہ خوشیاں کرنے لگیں۔ یعنی اس لیے کہ ان کو اس کی حاجت ہے، اس کے اترنے سے اور اپنی طرف پہنچنے سے خوش ہوتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴾ معنی اس کے یہ ہیں کہ اس سے پہلے یہ لوگ، جن کو یہ پانی پہنچا، اپنی طرف پانی کے نازل ہونے کی آس توڑے ہوئے تھے۔ پھر جب وہ ان کے پاس آیا تو عین ضرورت کے وقت آیا، چنانچہ وہ ان کے نزدیک ایک بہت ہی عظیم موقع میں واقع ہوا، اس کی بڑی قدر ہوئی، کیوں کہ ناامیدی کے بعد انتہائی ضرورت کے وقت برسا۔ نحویوں نے ﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١١٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٤)

قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴾ میں اختلاف کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ پہلے والے ﴿ مِنْ قَبْلِ ﴾ کی تاکید ہے اور اس قول کو بعض اہل عرب سے حکایت کیا ہے۔[1] کچھ دوسرے اہل علم نے اس کی یوں تفسیر کی ہے: ﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ ﴾ اَلْمَطَرُ ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ أَيْ: اَلْإِنْزَالِ ﴿ لَمُبْلِسِيْنَ ﴾". (امام محشی مصر نے کہا ہے: "وَقَالَ آخَرُوْنَ إِلٰى قَوْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ: هٰذِهِ الْعِبَارَةُ زَائِدَةٌ فِيْ بَعْضِ النُّسَخِ وَلَعَلَّهَا عَيْنُ مَا قَبْلَهَا، فَتَأَمَّلْ، انتهىٰ مصححه" واقع میں یہ عبارت زائد ہے، دوسرا قول نہیں ہوسکتا ہے۔)

اور احتمال ہے کہ یہ دلالت تاسیس سے ہو، یعنی ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ اول کی تاکید نہیں ہے، بلکہ اس کے جدید معنی ہیں اور معنی کلام کے یہ ہوں کہ وہ لوگ پانی کے محتاج تھے قبل اس کے نزول کے، اور اس سے قبل بھی۔ ان کے نزدیک پانی کا نزول ایک وقت میں بعد ایک وقت کے فوت ہو چکا تھا، چنانچہ انھوں نے پانی کے وقت میں اس کا انتظار کیا تو اس نے تاخیر کی، پھر ایک مدت گزری تو اس کا انتظار کیا پھر اس نے تاخیر کی، پھر یأس وقنوط اور ناامیدی کے بعد ناگاہ ان پر آ گیا، اس کے بعد کہ ان کی زمین سمٹی دبی پڑی تھی کہ تازہ ہوگئی اور ابھری اور ہر ہر قسم کی بارونق روئیدگی آ گائی، اسی لیے اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾ یعنی دیکھ نشانیاں اللہ کی مہربانی کی۔ مراد پانی ہے کہ کس طرح زمین کو اس کے بے جان ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے، پھر اس سے اس بات سے آگاہی بخشی کہ مرنے کے بعد اور جسموں کے ریزہ ریزہ ہونے کے بعد ان کو زندہ کرے گا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ﴾ یعنی جس ذات پاک نے یہ سب کچھ کیا ہے، وہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، بے شک وہ ہر چیز کر سکتا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَلَىِٕنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴾ یعنی البتہ اگر ہم اس کھیتی پر، جس کو انھوں نے بویا ہے اور وہ اُگ اٹھی اور جوان وقوی ہوگئی اور اپنی نال پر کھڑی ہوگئی، کوئی خشک ہوا بھیجیں، پھر انھوں نے دیکھا کہ وہ کھیتی زرد پڑ گئی اور بگڑنا شروع ہوگئی تو ان تمام نعمتوں کے بعد جو ان پر گزر چکی ہیں ناشکری کرنے لگیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴾ [الواقعة: ٦٣۔ ٦٧] "بھلا بتاؤ تو جو کچھ تم بوتے ہو۔ کیا اسے تم اُگاتے ہو یا ہم ہی اُگانے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے ضرور ریزہ ریزہ کر دیں، پھر تم پشیمان ہونے والے ہو جاؤ۔ کہ بلاشبہ ہم پر چٹی ڈال دی گئی۔ (نہیں) بلکہ ہم محروم ہی رہ گئے۔"

امام ابن ابی حاتم نے سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہوائیں آٹھ ہیں، ان میں سے چار تو

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ١١٥)

رحمت ہیں اور چار عذاب ہیں۔ رحمت کی ہوائیں یہ ہیں: ناشرات، مبشرات، مرسلات، ذاریات اور عذاب کی ہوائیں یہ ہیں: عقیم وصرصر، یہ دونوں جنگل میں ہیں اور عاصف و قاصف، یہ دونوں دریا میں ہیں۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «اَلرِّيْحُ مُسَخَّرٌ مِنَ الثَّانِيَةِ» یعنی ہوا دوسری زمین سے تسخیر کی گئی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ عاد کو ہلاک کرے تو ہوا کے خزانچی کو حکم دیا کہ ان پر ایک ہوا بھیج دے جو ان کو ہلاک کر ڈالے تو اس نے عرض کی: اے رب! کیا ان پر بیل کے نتھنے کی مقدار جتنی ہوا بھیجوں؟ جبار تبارک وتعالیٰ نے اس سے فرمایا: نہیں، کیوں کہ وہ تو زمین کو اور ان کو جو زمین پر ہیں اُلٹ پلٹ کر دے گی۔ لیکن تو ان پر انگوٹھی کے سوراخ جتنی ہوا بھیج۔ یہ ہوا وہ ہے جس کا ذکر اللہ پاک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ﴿ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴾[2] [الذاریات: ۴۲] یہ حدیث غریب ہے، اس کا مرفوع ہونا منکر ہے، واضح یہ ہوتا ہے کہ یہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا کلام ہے۔

کفار مُردوں کی طرح ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴾ یعنی جس طرح تیری قدرت میں یہ بات نہیں ہے کہ تو مردوں کو ان کی قبروں میں سنائے اور نہ یہ ہے کہ تیری بات بہروں کو پہنچے جو سنتے نہیں ہیں اور باوجود نہ سننے کے تجھ سے پیٹھ پھیرنے والے ہوں۔ اسی طرح تو اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ جو حق سے اندھے ہو رہے ہیں ان کو راہ بتائے اور ان کی گمراہی سے ان کو پھیر لائے۔ بلکہ یہ اللہ پاک کی طرف ہے، وہی اپنی قدرت سے جب چاہتا ہے مردوں کو زندوں کی آوازیں سنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ یہ کام اس کے سوا کسی اور کا نہیں ہے۔

اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ یعنی تو نہیں سنا سکتا، مگر اس کو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتا ہے۔ چنانچہ وہ خضوع وفروتنی کرنے والے ہیں اور جواب دینے والے، قبول کرنے والے اور ماننے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کو سنتے ہیں، پھر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ حال تو مومنوں کا ہے اور اول مثال کافروں کی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۳۶] ''حق کو قبول تو صرف وہ کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں، اللہ انھیں اٹھائے گا، پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

---

[1] الدر المنثور (۱/ ۳۹۷)

[2] مستدرك الحاكم (٤/ ٦٣٦) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الترغیب والترھیب: ۲/ ۲۳٤)

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آیت ﴿ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ سے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی توہیم پر استدلال کیا ہے، ان کی اس روایت میں کہ نبی اکرم ﷺ نے تین دن کے بعد ان مقتولین سے خطاب کیا جو بدر کے کنویں میں ڈال دیے گئے تھے، اور آپ نے ان پر عتاب کیا اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ فرمائی۔ یہاں تک کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا آپ اس قوم کو خطاب فرما رہے ہیں جو مردہ ہو کر پڑی ہوئی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم اس بات کو جو میں کہتا ہوں، ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، لیکن وہ جواب نہیں دے سکتے۔[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اس قول کی یہ تاویل کی کہ آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ وہ اب اس بات کو جان چکے ہیں کہ جو میں ان سے کہا کرتا تھا، وہ حق ہے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے آپ کے لیے ان کو زندہ کر دیا تھا، یہاں تک کہ ملامت اور ڈانٹ اور سزا کے طور پر آپ ﷺ کی بات انھوں نے سن لی۔[3] علماء کے نزدیک صحیح روایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے، کیوں کہ اس کے لیے وجوہِ کثیرہ سے شواہد ہیں، جو اس کی صحت پر شہادت دیتے ہیں۔ ان میں سے سب سے مشہور شاہد وہ ہے جس کو ابن عبد البر رحمہ اللہ نے صحیح کہہ کر سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: نہیں ہے کوئی کہ جو اپنے مسلمان بھائی کی قبر پر سے گزرے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا، پھر وہ ان پر سلام کرے، مگر اللہ اس کی روح اس کی طرف لوٹاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ جملہ ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ ﴾ مستانفہ ہے جو احوالِ ریاح کے بیان کے لیے لایا گیا ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا، اس بنا پر جملہ ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ معترضہ ہو گا، چنانچہ پہلے اس طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ امام حمزہ، ابن کثیر، کسائی اور ابن محیصن رحمہم اللہ نے "اَلرِّيْحَ" مفرد پڑھا ہے۔ باقی قراء نے جمع پڑھا ہے۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا: "كُلُّ مَا كَانَ بِمَعْنَى الرَّحْمَةِ فَهُوَ جَمْعٌ، وَمَا كَانَ بِمَعْنَى الْعَذَابِ فَهُوَ مُوَحَّدٌ"[5] یعنی ہر جگہ رحمت کے معنی میں ریاح (جمع) ہوتا ہے اور عذاب کے معنی میں ریح (مفرد)۔

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٣)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٦٠)
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٥٧)
4. الاستذكار لابن عبد البر (١/ ١٨٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٣_ ٥٧٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٤٩٣)
5. تفسير القرطبي (١٤/ ٤٤)

﴿ فَتُثِيْرُ سَحَابًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ہوائیں بادل کو برانگیختہ کرتی ہیں، ہیجان میں لاتی ہیں، حرکت دیتی ہیں۔ ﴿ فَيَبْسُطُهٗ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک اس بادل کو پھیلاتا ہے، اس حال میں کہ بعض اس کا بعض سے متصل ہوتا ہے، یعنی کامل طور پر اس کو پھیلاتا ہے، ورنہ اصل انتشار تو ہمیشہ بادل میں موجود ہوتا ہے۔

﴿ فِي السَّمَآءِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ آسمان کی سمت و جہت میں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴾ [إبراهيم: ٢٤] ''اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔'' یعنی اس کی شاخیں اوپر کی طرف سے ہیں۔ ''سَمَاءٌ'' سے مراد حقیقی معروف آسمان نہیں ہے۔ ﴿ كَيْفَ يَشَآءُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ کبھی تو وہ بدلی چلتی پھرتی ہے، کبھی ٹھہری ہوتی ہے، کبھی مطبق (گھیرنے والی) کہ سارے آسمان کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے، کبھی غیر مطبق ہوتی ہے اور کبھی دور کی مسافت تک، کبھی قریب کی مسافت تک، کبھی شمالی کنارے سے، کبھی جنوبی کنارے سے، کبھی مشرق سے، کبھی مغرب سے۔

﴿ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا ﴾ یعنی اور کبھی اس کو متفرق کرتا ہے، یا اس کو پھیلانے کے بعد ٹکڑے کر دیتا ہے، ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے پر۔ ''كِسَفٌ'' بہ فتحِ سین جمع ہے ''كِسْفَةٌ'' بالکسر کی۔ ''كِسْفَةٌ'' کسی شے کے یا بادل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ بہ فتح و کسرِ سین دونوں طرح پڑھا گیا ہے اور مسکن مخفف ہے محرک سے، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ ''كِسْفَةٌ'' کی جمع الجمع ''أَكْسَافٌ'' اور ''كُسُوْفٌ'' ہے۔ ''كَسَفَهُ يَكْسِفُهُ'' بہ معنی ''قَطَعَهُ'' ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورۃ البقرہ اور سورۃ النور میں گزر چکی ہے۔ ''وَدْقٌ'' بہ معنی مطر و بارش ہے۔ ﴿ خِلٰلِهٖ ﴾ بہ معنی بین و وسط ہے۔ امام ابو العالیہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے ''مِنْ خَلَلِهٖ'' پڑھا ہے۔[1] ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر ﴿ الْوَدْقَ ﴾ کی طرف راجع ہے۔

﴿ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾ سے مراد ''بِلَادُهُمْ وَأَرْضُهُمْ'' ہے۔ استبشار بہ معنی فرح (خوشی) ہے۔ کلمۂ ﴿ إِذَا ﴾ فجائیہ ہے، یعنی پھر دیکھے تو پانی کو کہ نکل رہا ہے بدلی کے بیچ سے، پھر جب وہ پانی اپنے بندوں کے شہروں اور زمینوں میں جس کو چاہتا ہے پہنچایا تو ناگاہ وہ خوش ہونے لگتے ہیں، پانی اور اس کے ذریعے سے ارزانی کے آنے کے سبب سے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِنْ كَانُوْا ﴾ میں کلمۂ ﴿ إِنْ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے اور اس میں ضمیرِ شان مقدر اس کا اسم ہے، یعنی بے شک حالت یہ ہے کہ اس پانی کے اتارے جانے سے پہلے وہ ناامید ہو رہے تھے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے بغوی رحمہ اللہ کا اتباع کرتے ہوئے ﴿ إِنْ ﴾ کی تفسیر ''قَدْ'' کے ساتھ کی ہے،[2] لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ ﴿ لَمُبْلِسِيْنَ ﴾ میں حرفِ لام اسی پر دال ہے، کیوں کہ وہ ﴿ إِنْ ﴾ مخففہ اور ''إِنْ'' شرطیہ کے درمیان فرق

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٠٣)
[2] تفسير الجلالين (١/ ٥٣٧) تفسير البغوي (٦/ ٢٧٦)

کرنے والا ہوتا ہے۔ ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ میں لفظ ﴿ قَبْلِ ﴾ کو تاکید کے لیے دہرایا گیا ہے، یہ امام اخفش اور اکثر نحویوں کا قول ہے، چنانچہ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کو ان سے نقل کیا ہے۔① جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ﴾ [الحشر: ١٧] ”لہٰذا ان دونوں کا انجام یہی ہو گا کہ بے شک وہ ہمیشہ (دوزخ کی) آگ میں رہیں گے۔“

امام زمخشری نے کہا ہے کہ یہ تاکید اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان پر پانی برسنے کا زمانہ دراز ہو، یعنی بہت دیر تک پانی نہ برسا تو ان کی ناامیدی مستحکم ہوئی اور ناامیدی پھیل گئی، چنانچہ اس وجہ سے وہ جس قدر غمگین ہوئے تھے، اسی قدر ان کو خوش خبری ہوئی۔② امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: یہ کلام حسن ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس تاکید کا مطلب یہ ہے کہ یہ خبر دے کہ لوگوں کے دل ناامیدی سے خوشی کی طرف تیزی کے ساتھ مائل ہوئے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ ﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ ﴾ میں احتمال ہے کہ اس پانی کے برسنے سے بہت پہلے وہ ناامید ہو چکے تھے، چنانچہ اس احتمال کے دور کرنے کے لیے ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ آیا۔ مطلب یہ ہے کہ اس پانی کے برسنے سے پہلے تک ان کی ناامیدی تھی اور پانی سے آس ٹوٹ چکی تھی کہ ادھر پانی برس پڑا، فوراً ہی ناامیدی خوشی میں بدل گئی، لہٰذا یہ صرف تاکید ہی نہیں ہے، بلکہ تاکید مفید ہے۔③

امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ قَبْلِهٖ ﴾ کی ضمیر ”مَطَر“ کی طرف راجع ہے: ”أَيْ: وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ التَّنْزِيلِ مِنْ قَبْلِ الْمَطَرِ“ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: ”مِنْ قَبْلِ تَنْزِيلِ الْغَيْثِ عَلَيْهِمْ: مِنْ قَبْلِ الزَّرْعِ وَالْمَطَرِ“ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر ”سحاب“ کی طرف راجع ہے: ”أَيْ: قَبْلَ رُؤْيَتِهِ“ یعنی وہ بارش کے آنے سے پہلے، جب انھیں بدلی نظر نہیں آتی تھی، تو وہ ناامید تھے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔④ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر ”کسف“ کی طرف راجع ہے، یا ارسال کی طرف، یا استبشار کی طرف۔ پہلی وجہ راجح ہے اور بعد کی وجوہ میں بہت زیادہ تکلف اور تعسف ہے۔ ﴿ لَمُبْلِسِيْنَ ﴾ ﴿ كَانُوْا ﴾ کی خبر ہے، معنی اس کے ”آيِسِينَ“ یا ”يَائِسِينَ“ ہیں، یعنی ناامید۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”أَبْلَسَ الرَّجُلُ إِبْلَاسًا: سَكَتَ وَأَبْلَسَ أَيِسَ“ غرضیکہ ابلاس کے معنی سکوت و ناامیدی کے ہیں۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

﴿ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ ﴾ یعنی تو آثارِ رحمت اللہ کی طرف نظر کر، جو پانی کے نازل ہونے سے پیدا ہونے والی ہے، ایسی نظر جس سے عبرت اور بصیرت حاصل ہو، تاکہ تو اس سے اللہ کی توحید پر استدلال کرے اور اس بات پر کہ اس عجیب و غریب کاریگری کے ساتھ وہی متفرد ہے۔ یہ کام اسی اکیلے کا ہے، کوئی اس میں اس کا شریک نہیں

① تفسیر القرطبي (١٤/ ٤٤) ② الکشاف (٣/ ٤٩١)
③ اللباب في علوم الکتاب (١٥/ ٤٢٤) ④ تفسیر القرطبي (١٤/ ٤٤)

ہے۔ آثارِ رحمت سے مراد نبات، سبزہ اور پھل اور کھیتیاں ہیں کہ جن سے زندگی کی ارزانی اور فراوانی حاصل ہوتی ہے۔ جمہور نے "أثر" مفرد پڑھا ہے اور امام ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے ﴿اٰثٰرِ﴾ بہ جمع پڑھا ہے۔[1]

جملہ ﴿كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ محلِ نصب میں ہے اس بنا پر کہ "اُنْظُرْ" کا مفعول بہ ہے۔ (کسی نے کہا: نصب کی جگہ میں ہے بنزعِ خافض اور "کَیْفَ" معلق ہے "اُنْظُرْ" کا)۔ ﴿يُحْيِ﴾ کی ضمیر اللہ پاک کی طرف راجع ہے یا "أثر" کی طرف۔ یعنی تو اس زندہ کرنے کی طرف نظر کر اور غور کر کہ کس طرح اللہ پاک یا وہ اثر زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ نظر سے مراد اللہ پاک کی عظیم قدرت اور وسیع رحمت سے آگاہ کرنا ہے، اس تمہید کے ساتھ جو امرِ بعث کی اس میں ہے۔ امام جحدری اور ابو حیوہ رحمہما اللہ نے تائے فوقیہ کے ساتھ "تُحْيِیْ" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اس کی ضمیر رحمت یا ﴿اٰثٰرِ﴾ کی طرف راجع ہے قراءتِ جمع کی بنا پر۔[2]

﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ یعنی بے شک اللہ پاک عظیم الشان اور جلی البرہان جو مذکورہ اشیاء کو اختراع کرنے والا ہے، البتہ ان کو آخرت میں زندہ کرنے پر اور ان کو جزا دینے پر قادر ہے، جس طرح کہ اس نے مردہ زمین کو پانی سے زندہ کیا۔ اور یہ مردہ چیزوں کے زندہ کرنے سے مردہ لوگوں کے زندہ کرنے پر استدلال ہے۔ ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ یعنی وہ عظیم القدرت و کثیر القدرت ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: اللہ مقدورات میں سے ہر شے پر قادر ہے اور یہ یعنی دوبارہ زندہ کرنا من جملہ مقدورات ہے انشاء کی دلیل سے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَلَىِٕنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ﴾ حرفِ لام توطئہ قسم، یعنی قسم کی تمہید ہے اور قسم کا جواب ﴿لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ ہے اور یہ جواب شرط کے جواب کا قائم مقام ہے، اس لیے کہ یہاں شرط اور قسم دونوں جمع ہیں اور شرط موخر ہے۔ لہٰذا اس کا جواب محذوف ہوگا، کیوں کہ قسم کا جواب حسبِ قاعدہ اس پر دال ہے۔ "ریح" سے مراد بادِ مضر (نقصان پہنچانے والی ہوا) ہے، یعنی بادِ دبور جس سے عاد کو ہلاک کیا گیا۔ ﴿فَرَاَوْهُ﴾ کی ضمیر زرع و نبات کی طرف راجع ہے، جو ﴿اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ﴾ سے ہے۔ معنی یہ ہیں: قسم ہے اللہ کی! البتہ اگر ہم کوئی مضر ہوا بھیجیں، پھر وہ کھیتی کو دیکھیں کہ وہ سبز ہونے کے بعد مارے سردی یا گرمی کے زرد ہوگئی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کی نعمتوں کا انکار کرنے لگیں۔ مطلب یہ ہے کہ خصب اور ارزانی سے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر ان کی کھیتی پر کوئی عذاب اور آفت بھیج دوں تو میری پہلی نعمتوں کا انکار کرنے لگیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "رَأَوْہُ" کی ضمیر "ریح" کی طرف راجع ہے۔

کلام عرب میں ریح کو مذکر یا مونث استعمال کرنا جائز ہے۔ کسی نے کہا کہ اثر کی طرف پھرتی ہے جس پر ﴿اٰثٰرِ﴾

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٤٥) [2] فتح القدير (٤/ ٣٠٣_٣٠٤) [3] تفسير النسفي (٣/ ٢٧٧)

دلالت کر رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ سحاب کی طرف راجع ہے، کیونکہ بادل جب زرد پڑ جاتا ہے تو پانی نہیں برساتا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس آیت میں اس کی سرعتِ تقلب (جلدی سے پھر جانا)، بے صبری اور ضعفِ قلوب کی دلیل ہے۔ یعنی بڑے بے صبرے اور کمزور دل ہیں کہ ذرا سی دیر میں ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ اہلِ ایمان کا حال ایسا نہیں ہے۔ پھر اللہ پاک نے کفار کو مُردوں اور بہروں سے تشبیہ دی۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ یعنی تو مردوں کو نہیں سنا سکتا جب تو ان کو پکارے۔ اسی طرح یہ لوگ مردہ دل ہیں، نہ حقائق سمجھتے ہیں اور نہ صحیح بات کو پہچانتے ہیں۔ ﴿ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ﴾ اور تو بہروں کو اپنی بات نہیں سنا سکتا جب تو ان کو حق کی طرف پکارے اور مواعظِ الٰہی کے ساتھ ان کو وعظ و نصیحت کرے اور ان کو آخرت یاد دلائے اور اس میں جو حالات اور ہولناکیاں ہیں، وہ ان کو بتائے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے پہلے یہ بیان کیا کہ وہ مُردوں کی طرح ہیں۔ پھر فرمایا کہ کانوں سے بہرے ہیں، اس کے بعد یہ بیان کیا کہ وہ حق سے منہ موڑتے ہیں۔

فرمایا: ﴿ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴾ یعنی جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس حال میں ان سے کسی طرح سننے کی امید نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہرا مقبل ہو یا مدبر، یعنی سامنے منہ کیے ہوئے یا منہ پھیرے ہوئے دونوں حال میں نہیں سنتا، پھر اس تخصیص کا کیا فائدہ ہے؟ اس کا فائدہ یہ بیان کیا ہے کہ بہرا جس وقت چہرہ سامنے کیے ہوئے ہو تو اگرچہ آواز نہیں سنتا، مگر رمز اور اشارے سے سمجھ لیتا ہے، پھر جب وہ پیٹھ موڑ کر جاتا ہے تو نہ سنتا ہے نہ اشارے سے سمجھتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بدر کو پکارنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی اسناد ضعیف ہے۔ صحیحین وغیرہ میں مشہور یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس روایت کے رد کرنے پر استدلال کیا، جس کو صحابہ میں سے جس نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ قلیبِ بدر کو ندا کی۔[1] یہ استدلال اس باب سے ہے جو عام کے ساتھ ردِ خاص پر ہوتا ہے، کیوں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا گیا کہ آپ بوسیدہ جسموں کو پکارتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس بات کو جو میں کہہ رہا ہوں، ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔[2] اور صحیح مسلم میں بروایتِ سیدنا انس رضی اللہ عنہ یہ ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ندا فرماتے ہیں تو عرض کی: یا رسول اللہ! آپ تین رات کے بعد ان کو پکارتے ہیں اور کیا وہ سنتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ تو یوں فرماتا ہے: ﴿ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ مِنْهُمْ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يُطِيْقُوْنَ أَنْ يُّجِيْبُوْا»[3]

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
② اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
③ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

پھر اللہ پاک نے کفار کو نابینائی کے ساتھ موصوف کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا ﴾ یعنی تو اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر راہ پر نہیں لا سکتا، کیوں کہ آنکھ کی بینائی سے جیسا نفع لینا چاہیے، وہ ان میں نہیں ہے۔ یا اس لیے کہ ان کے دل کی آنکھیں مفقود ہیں۔ تو تو انہیں کو سنا سکتا ہے جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، کیوں کہ تدبر و تفکر کرنے والے اور سوچنے والے اور آثار سے موثر طور پر استدلال کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ ﴿ فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ وہ تو حق کے مطیع اور فرماں بردار اور متبع ہیں۔ ﴿ يُؤْمِنُ ﴾ میں لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کی اور یہاں معنی ﴿ مَنْ ﴾ کی رعایت ملحوظ ہے۔[1]

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿54﴾

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمھیں کمزوری (کی حالت) سے پیدا کیا، پھر اس نے کمزوری کے بعد قوت دی، پھر اس نے قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا، وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے، اور وہ خوب جاننے والا، بڑا قدرت والا ہے (54)

انسانی زندگی کے مختلف مراحل کا بیان:

انسان کا جو پیدایش کے مراحل کا حال ہے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف منتقل ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ پاک اس سے آگاہ فرماتا ہے کہ اس کی اصل تو مٹی سے، پھر پانی کی بوند سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے، پھر ہڈیاں ہو جاتا ہے، پھر ہڈیوں پر گوشت پہنایا جاتا ہے اور پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ پھر اپنی ماں کے شکم سے ضعیف، ناتواں اور ضعیف القویٰ نکلتا ہے۔ پھر ذرا ذرا قوی ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ صغیر ہو جاتا ہے۔ پھر حدث (نوعمر)، پھر مراہق، یعنی قریب البلوغ، پھر شاب، یعنی جوان ہو جاتا ہے۔ یہ ضعف کے بعد قوت ہے۔ پھر نقصان میں شروع کرتا ہے تو کہل ہوتا ہے، یعنی ادھیڑ آدھی عمر کا، پھر شیخ ہوتا ہے، یعنی بوڑھا، پھر هرم ہوتا ہے، یعنی زیادہ بوڑھا۔ یہ قوت کے بعد ضعف ہے۔ پھر اس کی ہمت و حرکت اور گرفت اور حملہ ضعیف ہو جاتا ہے۔ بال سفید ہو جاتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی صفتیں بدل جاتی ہیں۔

اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ﴾ یعنی جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اپنے بندوں میں جو ارادہ کرتا ہے اس میں تصرف کرتا ہے۔ ﴿ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴾ امام

[1] فتح البیان (١٠/ ٢٦٢۔ ٢٦٦)

احمد رحمہ اللہ نے عطیہ عوفی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ کہا: میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر پڑھا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا ﴾ تو کہا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ... ضُعْفًا ﴾ پھر کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ پر پڑھا جیسا کہ تو نے مجھ پر پڑھا تو انھوں نے مجھ پر لیا، جیسا کہ میں نے تجھ پر لیا (اس سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ضعف کو بہ فتح پڑھا اور نبی اکرم ﷺ نے بہ ضم پڑھا)۔[1] (ورواه أبو داود و الترمذي وحسنه من حديث فضيل به و رواه أبو داود من حديث عبد الله بن جابر رضی اللہ عنہ عن عطية عن أبي سعيد رضی اللہ عنہ بنحوه. كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنی کمالِ قدرت پر ایک اور استدلال کا بیان کیا، یعنی خود انسان کا مختلف اطوار میں پیدا کرنا۔ ﴿ مِنْ ضُعْفٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تمھارا بدء و انشاء (پیدایش اور افزایش) ضعف پر کیا۔ ضعف قوت کی ضد ہے اور مصدر ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: مفسرین نے کہا ہے کہ ''مِنْ نُّطْفَةٍ'' یعنی ''مِنْ ذِيْ ضُعْفٍ''[2] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مِنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [المرسلات: ۲۰] ''کیا ہم نے تمھیں حقیر پانی (منی) سے تخلیق نہیں کیا؟'' کسی نے کہا: ﴿ ضُعْفٍ ﴾ سے مراد طفولیت اور صغر کا حال ہے۔ یہ احوال انتہائی ضعف کے ہیں۔ ضعف کے بعد قوت سے مراد جوانی کی قوت اور جوانی کو پہنچنا ہے، کیوں کہ اس وقت قوت مستحکم ہو جاتی ہے اور خلقت سخت اور قوی ہو جاتی ہے، جوانی کی آخری حد تک۔

قوت کے بعد جو ضعف ہے، اس سے مراد بڑی عمر، بڑھاپا اور بہت زیادہ بڑھاپا ہے، یہ بہت زیادہ کمزوری اور بڑھاپے کا آخر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سیاہ بالوں کی سفیدی ہے، غالباً یہ حال تینتالیس برس کی عمر میں شروع ہوتا ہے۔ یہ ادھیڑ عمری کی ابتدا ہے اور کام کے لحاظ سے کمزوری پچاس برس کے بعد شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ تریسٹھ برس کی عمر میں کمزوری زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ شیوخت کی عمر کی ابتداء ہے اور ضعف زیادہ ہوتا جاتا ہے، جہاں تک اللہ پاک چاہے۔ یہاں سب جگہ جمہور نے ''ضُعْفٌ'' بہ ضمِ ضاد پڑھا ہے اور امام عاصم اور حمزہ رحمہما اللہ نے بہ فتح پڑھا ہے، یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ جحدری نے پہلے دو میں فتح کے ساتھ اور تیسرے میں ضم کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضم قریش کا لغت ہے اور فتح تمیم کا لغت ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: ضعف، ضعفِ قوت اور صحت کی ضد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فتح کے ساتھ ضعف رائے میں ہوتا ہے اور ضم کے ساتھ ضعف جسم میں ہوتا ہے۔ کوفیوں نے بہ فتحتین جائز رکھا ہے۔[3]

[1] مسند أحمد (۲/ ۵۸) سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۹۷۸۔ ۳۹۷۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۳۶)

[2] فتح القدير (۴/ ۳۰۴)

[3] تفسير القرطبي (۱۴/ ۴۶۔ ۴۷)

﴿ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمام اشیاء میں سے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، ان میں سے بنی آدم میں قوت، ضعف، جوانی اور بڑھاپا ہے۔ ﴿ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنی تدبیر کو اور بندوں کے احوال کو خوب جانتا ہے اور جس شے کا ارادہ کرتا ہے، اس پر بڑا قادر ہے، اسی طرح بندوں کو متغیر کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: یہ سب کام طبعی کام نہیں ہیں، بلکہ اللہ پاک کی مشیت و قدرت سے ہیں۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ حالات کے بدلنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی واضح تر دلیل ہے۔ ضعف میں ضم اور فتح دونوں دو لغت ہیں اور قراءت میں ضم قوی تر ہے، اس لیے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہا: میں نے اس کو رسول اللہ ﷺ پر پڑھا "مِنْ ضَعْفٍ"، تو آپ ﷺ نے مجھ کو "مِنْ ضُعْفٍ" پڑھایا۔[2]

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿55﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿56﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿57﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿58﴾ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿59﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿60﴾

اور جس دن قیامت قائم ہوگی، مجرم قسمیں کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) گھڑی بھر کے سوا نہیں ٹھہرے، اسی طرح وہ (دنیا میں) بہکے رہے (55) اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا وہ کہیں گے: یقیناً تم تو، جیسا کہ اللہ کی کتاب (لوحِ محفوظ) میں ہے، دوبارہ اُٹھانے کے دن (قیامت) تک ٹھہرے رہے، چناں چہ یہی دوبارہ اُٹھنے کا دن ہے اور لیکن تم تو (اسے حق) نہیں جانتے تھے (56) چناں چہ جن لوگوں نے ظلم و زیادتی کی اس دن ان کی معذرت (انھیں) کوئی نفع نہ دے گی، اور نہ ان سے (اپنے رب کو) راضی کرنے کے لیے کہا جائے گا (57) اور

[1] تفسير الخازن (٥/ ٢١٢) [2] تفسير النسفي (٣/ ٢٧٨) فتح البيان (١٠/ ٢٦٦۔ ٢٦٧)

بلاشبہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر مثال بیان کر دی ہے، اور اگر آپ ان کے پاس کوئی نشانی لائیں تو جن لوگوں نے کفر کیا وہ ضرور کہیں گے: تم تو نرے جھوٹے ہو﴿58﴾ اسی طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے، مہر لگا دیتا ہے﴿59﴾ لہٰذا آپ صبر کیجیے: بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور آپ کو وہ لوگ ہلکا (بے صبر) نہ کر دیں جو یقین نہیں رکھتے﴿60﴾

دنیا و آخرت میں کفار کی جہالت کا بیان:

ایک گھڑی کے سوا نہیں ٹھہرے، یعنی قبر میں رہنا تھوڑا معلوم ہوگا اور دنیا میں ایسی ہی غلط باتیں جانتے تھے۔ انتھٰی. اللہ پاک دنیا اور آخرت میں کافروں کی جہالت کی خبر دیتا ہے۔ دنیا میں تو یہ کیا کہ بتوں کو پوجا اور اس کے علاوہ اور کیا جو کچھ کہ کیا اور آخرت میں بھی ان سے بڑی جہالت ہوگی، اس میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں گے کہ دنیا میں گھڑی بھر سے زیادہ نہ ٹھہرے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ان پر حجت قائم نہ ہو، حالاں کہ ان کو مہلت نہ دی جائے گی، تاکہ ان کا عذر قطع کیا جائے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴾ پھر مومنین علماء آخرت میں ان پر رد کریں گے، جس طرح کہ دنیا میں ان پر اللہ کی حجت قائم کی تھی، لہٰذا جب کفار قسم کھا کر کہیں گے: ﴿ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ﴾ تو مومنین کہیں گے: ﴿ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ﴾ یعنی البتہ مقرر تم ٹھہرے ہو کتابِ اعمال میں اس دن سے کہ جب تم پیدا کیے گئے، یہاں تک کہ تم مبعوث ہوئے، پھر تم مانتے نہ تھے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ ﴾ یعنی پھر اس دن نفع نہ دے گا ظالموں کو ان کا اپنے کیے سے عذر کرنا۔ ﴿ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴾ یعنی نہ وہ دنیا کی طرف پھیرے جائیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴾ [حم السجدة: ٢٤] ''اور اگر وہ معافی مانگیں گے تو وہ معاف کیے گئے (لوگوں) میں سے نہ ہوں گے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ﴾ یعنی اللہ پاک فرماتا ہے کہ ہم نے حق کو ان کے لیے ظاہر اور واضح کیا ہے اور ان کے لیے قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں، تاکہ حق کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اس کا اتباع کریں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ ﴾ یعنی اگر وہ کوئی سی آیت دیکھیں، ان کی فرمایش کی ہو یا غیر فرمایش کی تو اس پر ایمان نہ لائیں اور اعتقاد کریں کہ وہ سحر و باطل ہے، جیسا کہ انشقاقِ قمر وغیرہ میں کہا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿96﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ٩٦۔ ٩٧] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔'' اسی

لیے اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی تو ان کی مخالفت وعناد و دشمنی پر صبر کر، کیونکہ اللہ نے جو تجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تجھے ان پر نصرت دے گا، وہ اس کو ضرور پورا کرے گا اور تیرے لیے اور تیرے متبعین کے لیے دنیا اور آخرت میں نیک انجام ٹھہرائے گا۔

﴿ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ یعنی تجھے اچھال نہ دیں وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے، بلکہ تو تو اسی پر جما ہوا رہ جس کو دے کر اللہ نے تجھے مبعوث کیا ہے، کیوں کہ وہ ایسا حق ہے جس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے اور تو اس سے مائل مت ہو، اس کے ماسوا میں کوئی ہدایت نہیں ہے جس کی پیروی کی جائے، بلکہ تمام حق اسی میں منحصر ہے۔ امام سعید رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ خارجیوں میں سے ایک شخص نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پکارا اور وہ صبح کی نماز میں تھے، چنانچہ کہا: ﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الزمر: ٦٥] ”اور بلاشبہ آپ کی طرف اور ان لوگوں (نبیوں) کی طرف، جو آپ سے پہلے ہوئے، (یہ) وحی کی گئی کہ اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے اعمال ضرور ضائع ہو جائیں گے اور آپ ضرور خسارہ اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس کے لیے چپ رہے، یہاں تک کہ جو اس نے کہا اس کو سمجھ لیا، پھر اس کو نماز ہی کی حالت میں یہ جواب دیا: ﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بوجہ دیگر علی بن ربیعہ رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ خارجیوں میں سے ایک شخص نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پکارا اور وہ فجر کی نماز میں تھے۔ چنانچہ کہا: ﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الزمر: ٦٥] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کو نماز ہی کی حالت میں یہ جواب دیا: ﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ [1] دیگر طریق سے امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو یحییٰ رحمہ اللہ سے روایت کیا، کہا: سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز پڑھی، پس خوارج میں سے ایک شخص نے ان کو ندا کی: ﴿ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کو جواب دیا اور وہ نماز میں تھے: ﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ [2] یہ بیان ہے اس شے کا جو اس سورت شریفہ کی فضیلت میں روایت کی گئی ہے اور نماز فجر میں اس کے پڑھنے کے مستحب ہونے کا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے عبد الملک بن عمیر سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے شبیان ابو روح کو سنا، وہ نبی اکرم ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صبح کی نماز پڑھائی تو آپ ﷺ نے اس میں سورۃ الروم پڑھی، چنانچہ آپ ﷺ کو وہم ہوا۔ پھر جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا: بے شک ہم پر

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٢١۔ ١٢٠) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٥)

قرآن خلط کیا جاتا ہے، بے شک تم میں سے کئی لوگ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، اچھی طرح وضو نہیں کرتے، لہٰذا جو کوئی تم میں سے نماز میں ہمارے ساتھ حاضر ہو تو چاہیے کہ اچھی طرح وضو کرے۔[1] (وهذا إسناد حسن و متن حسن) اور اس میں ایک عجیب راز کی بات ہے اور عجیب وغریب خبر ہے، وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس شخص کے وضو میں کمی کی وجہ سے متاثر ہوئے، جس نے آپ کی اقتدا کی، چنانچہ یہ امر اس پر دلالت کرتا ہے کہ امام کی نماز کے ساتھ مقتدی کی نماز کا تعلق ہے۔[2] آخر تفسیر سورة الروم ولله الحمد والمنة. كذا في ابن كثير.

یہ حدیث شریف اس سورت کے شروع میں بیان ہو چکی ہے۔ مجمع البحار میں کہا ہے، اس میں یہ بات ہے کہ سنن و آداب کا ترک کرنا فتوحاتِ غیبیہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اور وہ غیر کی طرف سرایت کرتا ہے اور ان کی برکت غیر میں سرایت کرتی ہے۔ پھر ذرا غور کریں کہ جب نبی ﷺ جیسی ہستی ایسی حالت میں متاثر ہو تو اور اہلِ ہوا و بدعت کا اثر کیوں کر نہیں ہوگا؟! اور صالحین کی صحبت اس کے برعکس ہے۔[3] یعنی جس طرح برے لوگوں کا برا اثر پڑتا ہے، اسی طرح نیک لوگوں کا اثر ضرور اُن کے پاس بیٹھنے والوں پر پڑتا ہے۔ ﴿ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴾ [طٰہٰ: ٤٧].

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ تَقُوْمُ ﴾ بہ معنی "تُوجَدُ وَتُحَصَّلُ" یعنی جس دن وجود میں لائی جائے گی ساعت اور اس کا حصول ہوگا۔ ساعت سے مراد قیامت ہے، یعنی نفخۂ ثانیہ۔ اس کا نام ساعت اس لیے رکھا ہے کہ وہ دنیا کی گھڑیوں میں سے آخری گھڑی میں واقع ہوگی۔ یا اس لیے کہ "بغتة" (اچانک) واقع ہو جائے گی۔ ﴿ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ مشرک اور بعث کے منکر اس بات کی قسم کھائیں گے کہ دنیا میں گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے، جیسا کہ خطیب، صاحبِ کشاف اور قاضی نے کہا ہے۔[4] یا اپنی قبروں میں نہیں ٹھہرے، جیسا کہ امام مقاتل اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[5]

ممکن ہے کہ انھوں نے اپنے ٹھہرنے کی مدت کم سمجھی اور یہ بات ان کے ذہنوں میں جم گئی، چنانچہ اس پر قسم کھائی اور خیال کیا کہ ان کی قسم واقع کے مطابق ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے جھوٹ بولا اس وقت جس طرح کہ اس سے پہلے جھوٹ بولا کرتے تھے۔ ظاہر یہی قول ہے۔ اس لیے کہ اگر ان کی مراد دنیا میں ٹھہرنا ہے تو ان میں سے ہر ایک اس کی مقدار کو جان چکا ہے اور اگر ان کی مراد قبروں میں ان کا ٹھہرنا ہے تو انھوں نے جہالت پر قسم کھائی، اگر وہ برزخ میں رہنے کے اوقات کو پہچانتے نہیں ہیں۔ ﴿ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴾ محاورے میں بولتے

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٩٤٧) مسند أحمد (٣/ ٤٧١) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٥٣)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٦۔ ٥٧٧)

[3] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٤٦٢)

[4] الكشاف (٣/ ٤٩٣) تفسير البيضاوي (٤/ ٣٤٢)

[5] تفسير البغوي (٦/ ٢٧٨)

ہیں: ''أُفِكَ الرَّجُلُ''[1] جبکہ وہ شخص صدق وحق سے پھیرا جائے، یعنی مثل اس صرف کے (پھیرے جانے کے) وہ دنیا میں پھیرے جاتے تھے اور کہتے تھے: ﴿ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٩] ''زندگی تو بس ہماری دنیا ہی کی زندگی ہے، اور ہمیں (دوبارہ) نہیں اُٹھایا جائے گا۔'' کسی نے کہا ہے کہ حق سے پھیرے جاتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ خیر سے پھیرے جاتے تھے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ان کی قسم جھوٹی ہے۔

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ ... الآية ﴾ ان لوگوں کی تعیین میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس قول کے قائل فرشتے ہیں۔ کسی نے کہا: انبیاء علیہم السلام ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ علمائے امم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس امت کے مومنین۔ ان سب پر محمول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ غرضیکہ ان کافروں کی تردید کرنے کے لیے اور ان کو جھٹلانے کے لیے، سب نے یوں کہا کہ تم کو اللہ پاک کے علم اور قضا جو پہلے سے طے تھی، اس کے مطابق بعث کے دن تک ٹھہرے ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے علم کے مطابق جو لوحِ محفوظ میں مثبت ہے۔[2]

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین نے اس کو تقدیم و تاخیر پر محمول کیا ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''قَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ''۔ بالجملہ اہلِ علم نے قسم کے ساتھ رد کیا۔ چنانچہ یہ یا تو تاکید کے لیے ہے، یا قسم کے ساتھ قسم کے مقابلے کے لیے ہے کہ جو بات انھوں نے کہی تھی وہ ان پر رد کر دی اور اس پر قسم کھائی اور حقیقت پر ان کو اطلاع دی، چنانچہ اس کے ساتھ ہی بعث کے انکار پر ان کو ملامت کی اور ڈرایا، دھمکایا اور سرزنش اور ڈانٹ کے طور پر ان کو تنبیہ کر کے یوں کہا: ﴿ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ ﴾[3] یعنی یہ وقت جس میں تم پھر کر آئے ہو بعث کا دن ہے، جس کا تم دنیا میں انکار کیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ فاء شرط محذوف کا جواب ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ اگر تم بعث کے منکر ہو تو یہ اس کا دن ہے، یعنی مقرر تمھارے انکار کرنے کا بطلان ظاہر ہو گیا، لیکن تم دنیا میں نہیں جانتے تھے کہ اس کا واقع ہونا حق ہے، بلکہ تکذیب اور استہزاء کے لیے اس کو جلدی طلب کرتے تھے۔

﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ ﴾ ماقبل سے جو یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ مدتِ بعث (ٹھہرنے کی) کا قلیل ہونا اور اس کا بھول جانا انھیں کچھ فائدہ نہ دے گا تو یہ حرفِ فاء اس کی تفصیل ہے۔ کسی نے کہا: یہ بھی شرط مقدر کا جواب ہے، یعنی اگر وہ عذر کرنا چاہیں تو اس دن ظالموں کو ان کا عذر کوئی فائدہ نہ دے گا اور نہ ہی ان کا قیامت کو جان لینا، انھیں کوئی فائدہ دے گا۔ گویا انھوں نے یہ وہم کیا کہ ٹھہرنے کی مدت کا قلیل ہونا، ان کی اطاعت نہ کرنے میں ان کا عذر ہو جائے گی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ ﴾ [الفاطر: ٣٧] ''(اللہ فرمائے گا:) کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو شخص نصیحت حاصل کرنا

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٠٥) [2] معاني القرآن (٤/ ١٩٢) [3] فتح القدير (٤/ ٣٠٥)

چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا؟'' کسی نے کہا: جب مومنوں نے اس پر رد کیا تو انھوں نے دنیا کی طرف رجوع کرنے کا سوال کیا اور عذر کیا تو ان کا عذر قبول نہیں ہوا۔ جمہور نے ''تنفع'' بتائے فوقیہ پڑھا ہے اور امام عاصم، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔[1] یہ دونوں سبعیہ ہیں۔

﴿ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴾ یعنی ان سے عتبیٰ طلب نہ کیا جائے گا۔ عتبیٰ اس شے کی طرف رجوع ہونے کو کہتے ہیں جو اللہ پاک کو راضی کر دے، یعنی توبہ اور عملِ صالح۔ اور اس کے قبول نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ اس دن میں تکلیف منقطع ہو گئی، یعنی عمل کرنا منقطع ہو گیا۔ محاورے میں بولتے ہیں: "اِسْتَعْتَبْتُهُ فَأَعْتَبَنِي أَيْ: اِسْتَرْضَيْتُهُ فَأَرْضَانِي وَذٰلِكَ إِذَا كُنْتَ جَانِيًا عَلَيْهِ". "أَعْتَبْتُهُ" کی حقیقت "أَزَلْتُ عَتْبَهُ" ہے۔ معنی یہ ہیں: وہ توبہ اور طاعت کی طرف بلائے نہ جائیں گے، تاکہ ان کا عذاب دور کیا جائے، جس طرح کہ دنیا میں اس کی طرف بلائے گئے۔

﴿ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ﴾ یعنی ان کے لیے ہم نے ہر ایک صفت بیان کی، گویا وہ اپنی غرابت اور ندرت میں ایک مثال تھے اور ان سے ہر ایک عظیم الشان قصہ بیان کیا، مثلاً: ان لوگوں کی صفت جو قیامت کے دن مبعوث ہوں گے اور وہ باتیں جو وہ کہیں گے اور جو کچھ اُن سے کہا جائے گا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ان کا عذر کرنا انھیں کوئی فائدہ نہ دے گا اور نہ ہی ان کی توبہ اور معذرت کو سنا جائے گا۔ اور اسی طرح ہم نے ان کے لیے ان مثالوں میں سے ہر ایک مثال بیان کی جو ان کو اللہ کی توحید اور اس کے رسولوں کی سچائی کے متعلق آگاہ کرے اور اسی طرح ان پر ہر ایک حجت قائم کی جو شرک کے بطلان پر دلالت کرے۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اب کیوں عذر کرتے ہیں، ان کے عذر تو پہلے ہی دور کر دیے گئے اور مافوق الکفایہ ان کے پاس انذار لایا گیا۔ یعنی ان کے پاس ایسا انذار لایا گیا جو کافی تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴾ حرفِ لام موکدہ ہے، قسم کے جواب میں واقع ہے۔ یعنی قسم ہے اللہ کی! اگر تو لائے ان کے پاس قرآن کی آیتوں میں سے کوئی آیت، وہ آیتیں جو توحید کا بیان کرتی ہیں، یا کوئی اور نشانی، جیسے: موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور یدِ بیضا ہے، یا ہر وہ نشانی جس کو اللہ کے رسول لائے تھے تو پھر بھی ان میں سے منکر لوگ یہی کہیں گے کہ نہیں ہے تو اے محمد! اور تیرے ساتھی مگر ﴿ مُبْطِلُوْنَ ﴾، یعنی تم اصحابِ اباطیل، یعنی باطل باتوں والے ہو۔ تم تو جادو کی پیروی کرتے ہو اور اس بات کی جو بطلان میں جادو کی طرح ہے۔ یا اے رسولو! تم سب کے سب مبطل ہو۔

﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اس مہر لگانے کی طرح اللہ ان لوگوں کے

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ٤٩)

دلوں میں مہر لگاتا ہے، جو علمِ نافع کو گم کرنے والے ہیں، وہ علمِ نافع جس سے حق و توحید کی طرف راہ پاتے ہیں اور باطل اور شرک سے نجات پاتے ہیں۔ اور وہ ان خرافات پر اصرار کرنے والے ہیں، یعنی جمے ہوئے ہیں، جن کا اعتقاد کر بیٹھے ہیں، اس لیے کہ مکمل جہالت حق کے پا لینے سے روکتی ہے، بلکہ حق بات کو جھٹلانے کا موجب بنتی ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی کو صبر کا حکم دیا اور اپنے وعدے کی حقیقت سے اور اس میں خلاف نہ کرنے سے اس کو معلل کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ حرفِ فاءِ فصیحہ ہے جملۂ محذوف کی خبر دے رہا ہے، یعنی جب تو نے ان کا حال جان لیا اور اللہ پاک نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی تو اب تو ان سے جو کچھ ایذا کی بات سنتا ہے اور ان کے کفریہ افعال اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس سب پر صبر کر، کیوں کہ اللہ کا وعدہ سچا پکا ہے۔ وہ تجھ سے وعدہ کر چکا ہے کہ تجھ کو ان پر نصرت دے گا اور تیری حجت کو بالا کرے گا اور تیری دعوت کو غالب کرے گا۔ اس کا وعدہ حق ہے، اس میں کسی طرح کا خلاف نہ ہو گا۔

﴿ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ یعنی اے محمد! جو لوگ اللہ پر یقین نہیں رکھتے اور نہ اس کے انبیاء کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ اس کی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں، نہ بعث کو مانتے ہیں، یہ لوگ تجھ کو خفت، جہالت اور طیش پر برانگیختہ کر کے تمھیں صبر کے ترک کرنے پر آمادہ نہ کریں۔ جس دین پر تو جما ہوا ہے اور جس شریعت پر تو قائم و دائم ہے، اس سے تجھے ہٹا نہ دے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "اِسْتَخَفَّ فُلَانٌ فُلَانًا" یعنی فلاں نے فلاں کو جاہل بنا لیا، یہاں تک کہ اس کو گمراہی میں اپنی اتباع پر آمادہ کر لیا۔ جمہور نے بجائے معجمہ و فاء پڑھا ہے اور امام یعقوب اور ابن اسحاق رحمہ اللہ نے بجائے مہملہ وقاف ماخوذ استحقاق سے پڑھا ہے۔[1] شاید اس کے یہ معنی ہوں کہ وہ تیرے مستحق نہ بن جائیں کہ تجھے اپنا تابع کر لیں۔ واللّٰه أعلم۔ اس آیت میں نہی "لَا أَرَيَنَّكَ هٰهُنَا" کے باب سے ہے۔[2] واللّٰه أعلم بأسرار كتابه.

الحمد للّٰه والمنة یہ تفسیر مبارک ۶/ ذی الحجہ ۱۳۱۱ ہجری روز دوشنبہ وقت ظہر محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ اس کو اپنی ذات خاص کے لیے کرے اور مجھ کو اور سب مومنین و مومنات کو اس سے فائدہ دے اور آیندہ لکھنے کی قوت دے اور اپنے حول اور قوت سے جلد تمام کرا دے اور جس کی ہمت سے یہ کام ہوتا ہے، اس کو بھلائی کی توفیق دے اور دارین کی نیکیاں نصیب کرے اور دنیاوی افکار سے نجات دے اور دنیا اور دین کے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے۔ جان و مال میں برکت دے۔ شریروں کے شر سے، مکاروں کے مکر سے ہم کو بچائے اور دین و دنیا کے دشمنوں پر کامیابی دے۔ اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا، وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ

[1] فتح القدير (٤/ ٣٠٦) - [2] فتح البيان (١٠/ ٢٦٧۔ ٢٧٠)

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِصَاحِبِ التَّرْجَمَانِ مَغْفِرَةً ظَاهِرَةً، وَّبَاطِنَةً لَا تُغَادِرُ ذَنْبًا، اَللّٰهُمَّ اغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرْدِ، وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ مِنَ الدَّنَسِ، آمِيْنَ آمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَأَتْبَاعِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ مِلْءَ مَا عَلِمَ وَزِنَةَ مَا عَلِمَ وَعَدَدَ مَا عَلِمَ وَأَنَا الْعَبْدُ الْمُذْنِبُ الرَّاجِيْ رَحْمَةَ رَبِّهِ الْبَارِيْ ذُوالْفِقَار أَحْمَدَ النَّقْوِيْ الْبَوْفَالِيْ السَّارَنْفُوْرِيْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَلِوَالِدَيْهِ وَأَحْسَنَ إِلَيْهِمَا وَإِلَيْهِ آمِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ أَوَّلًا وَّآخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُوْرَۃُ لُقْمٰنَ

اس سورت میں ۳۳ یا ۳۴ آیتیں ہیں اور ساری سورت مکی ہے، مگر تین آیتیں، یعنی قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿27﴾ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿28﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾۔ (قاله ابن عباس فيما أخرجه النحاس عنه) ابن ضریس و ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور استثنا نہیں کیا۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ مکی ہے سوائے دو آیتوں کے۔[2] امام نسائی اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھا کرتے تھے تو ہم آپ سے سورت لقمان اور سورۃ الذاریات کی آیات ایک کے بعد دوسری آیت سنا کرتے تھے۔[3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
الٓمّٓ ﴿1﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿2﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴿3﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿4﴾ اُولٰۗىِٕكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿5﴾

”شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الم ① یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں ② (جو) نیکو کاروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہیں ③ جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ④ یہی لوگ

---

① الدر المنثور (٦/ ٥٠٣) ② تفسير القرطبي (١٤/ ٥٠)

③ سنن النسائي، رقم الحديث (٩٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٣٠) اس کی سند میں ”ابو اسحاق“ مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤١٢٠)

اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ⑤

صالح لوگوں کی صفات:

جو شے اس سورت کے سرنامے کے ساتھ متعلق ہے، اس پر سورۃ البقرہ کے شروع میں پوری طرح کلام گزر چکا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس قرآن پاک کو نیک لوگوں کے لیے ہدایت اور شفا اور رحمت ٹھہرایا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اتباعِ شریعت میں اچھے اعمال کیے، چنانچہ انھوں نے فرض نماز کو اس کے حدود میں اور اس کے وقتوں میں قائم رکھا اور جو نفلی نمازیں راتبہ اور غیر راتبہ فرض نماز کے تابع ہیں، ان کو بھی قائم رکھا اور جو زکات ان پر فرض کی گئی ہے، وہ اس کے مستحقین کو دی اور اپنے قرابت داروں اور رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کی اور دارِ آخرت میں جزا کا یقین کیا، اللہ تعالیٰ سے اس کے ثواب میں رغبت کی اور اس کے ساتھ ریاکاری نہ کی اور نہ لوگوں سے سزا اور شکریے کا ارادہ کیا، جس نے یہ کام اسی طرح سے کیے تو وہ اُن لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ﴾ یعنی وہ لوگ بصیرت اور بینہ پر اور واضح اور روشن راستے پر ہیں، یعنی بینائی کے ساتھ اپنے رب کی طرف سے ظاہر اور واضح شاہراہ پر ہیں۔ ﴿ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ یعنی اور وہی ہیں جن کو دنیا اور آخرت میں فلاح نصیب ہوگی۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ حکیم یا تو بہ معنی "مُفْعِلٌ" ہے یا بہ معنی فاعل، یا بہ معنی ذی حکمت، یا یہ معنی ہیں کہ اس کتاب کا قائل حکیم ہے اور کتابِ حکیم کی طرف آیات کی اضافت ﴿ مِنْ ﴾ کے معنی میں ہے۔ ﴿ هُدًى وَّرَحْمَةً ﴾ جمہور کی قراءت پر منصوب ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہ آیتیں کتابِ حکیم کی ہیں، ہدایت اور رحمت کے حال میں ہیں۔[2] امام حمزہ رحمہ اللہ نے اس بنا پر رفع کے ساتھ پڑھا ہے کہ دونوں کلمے مبتدائے محذوف کی خبر ہیں۔ "أَيْ: هُوَ هُدًى وَّرَحْمَةٌ"، یعنی وہ محسنین کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ تِلْكَ ﴾ کی خبر ہوں۔[3]

محسن سے مراد حسنات پر عمل کرنے والا ہے، یا وہ شخص جو اللہ کی عبادت اس طرح کرتا ہے، گویا اسے دیکھ رہا ہے، جس طرح کہ صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام نے آپ سے احسان کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے، گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔[4]

---

① تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۷۷۔ ۵۷۸)
② معاني القرآن (٤/ ١٩٣)
③ تفسیر القرطبي (١٤/ ٥٠)
④ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨)

پھر اللہ پاک نے محسنین کے عمل کا بیان کیا کہ وہ کیا عمل کرتے ہیں۔ محسنین وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور وہ آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ ﴿ اَلَّذِیْنَ ﴾ محلِ جر میں اسمِ موصول محسنین کی صفت ہے، یا محلِ رفع میں ہے، یا محلِ نصب میں مدح یا قطع کی بنا پر۔ ان تین عبادتوں کو اس لیے خاص طور پر ذکر کیا کہ یہ عمدہ عبادات ہیں، ساری عبادتوں کی جڑ ہیں۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ کی تفسیر سورۃ البقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔① معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں میں احسان اور اطاعت گزاری کی صفات ہیں، جو عبادات کے اصول ہیں، وہی ہدایت کے طریقے پر ہیں اور وہی اپنے مطالب حاصل کرنے والے ہیں اور دارین کی خیر و خوبی کو حاصل کرنے والے ہیں۔②

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو دل فریب (غافل کر دینے والا) کلام خریدتے ہیں، تاکہ وہ علم کے بغیر اللہ کی راہ (دین) سے گمراہ کریں اور اس کا مذاق اُڑائیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے ⑥ اور جب ایسے شخص پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ تکبر کرتے ہوئے پلٹ جاتا ہے، جیسے اس نے وہ سنی ہی نہیں، گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں بہرا پن ہو، چناں چہ آپ اسے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے ⑦

بے ہودہ باتیں بدبختوں کا شغل ہے:

لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہکائیں: ایک کافر تھا جس کو دیکھتا کہ نرم دل ہو کر اسلام کی طرف جھکا ہے، اس کو اپنے گھر لے جاتا، شراب پلاتا اور راگ اور ناچ دکھاتا، اس رنڈی کی مجلس سے ایمان کا اثر مٹ جاتا، اس کو یہ فرمایا۔ انتھی۔

جبکہ اللہ پاک نے نیک بخت لوگوں کا حال ذکر فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں، اس کے سننے سے ان کو فائدہ ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ

① رقم الآیۃ (٥) ② فتح البیان (١٠/ ٢٧٣)

﴿ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾ [الزمر: ۲۳] ''اللہ نے بہترین کلام نازل کیا جو ایک کتاب ہے باہم ملتی جلتی، بار بار دہرائی جانے والی، جس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی جلدیں اور ان کے دل اللہ کی یاد کی طرف نرم (ہو کر مائل) ہو جاتے ہیں، یہی اللہ کی ہدایت ہے، وہ اس کے ذریعے سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔''

اس کے بعد بدبختوں کا حال بیان کیا، جنھوں نے اللہ کے کلام سے منہ موڑا کہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور راگ باجوں کے سننے پر متوجہ ہوئے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: واللہ! یہ غنا ہے، یعنی راگ گانا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو الصہباء بکری سے روایت کیا ہے کہ اس نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سنا جب کہ اُن سے کوئی اس آیت کی تفسیر پوچھ رہا تھا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ تو فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ! یہ غنا ہے، انھوں نے یہ بات تین بار کہی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ خود ابو الصہباء نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ غنا ہے۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس، جابر رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، مکحول، عمرو بن شعیب اور علی بن بذیمہ رحمہم اللہ نے کہا ہے۔[1] حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت غنا اور مزامیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[2]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: قولہ: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ اللہ کی قسم ہے! شاید وہ اس میں ایک بال برابر خرچ نہیں کرتا، لیکن اس کو خریدنا اسے پسند ہے۔ آدمی کی گمراہی کے لیے یہ کافی ہے کہ حدیثِ باطل کو حدیثِ حق پر اختیار کرے اور اس شئے کو پسند کرے جو ضرر دیتی ہے اس شے کی نسبت جو فائدہ دیتی ہے۔[3] کسی نے کہا: ﴿ يَشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ سے مراد گانے والی لونڈیوں کا خریدنا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گانے بجانے والی لونڈیوں کی خرید و فروخت حرام ہے اور ان کی قیمتوں کا کھانا حرام ہے۔ انہیں کے حق میں اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ (وهكذا رواه الترمذي و ابن جرير من حديث عبيد الله بن زحر بنحوه، ثم قال الترمذي: هذا حديث غريب و ضعف علي بن يزيد المذكور.، یعنی اس کی سند میں: عبيد الله بن زحر عن علي بن يزيد عن القاسم بن عبدالرحمن عن أبي أمامه ہے)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''عَلِيٌّ وَّشَيْخُهٗ وَالرَّاوِيْ عَنْهُ كُلُّهُمْ ضُعَفَاءُ.[4] والله أعلم'' امام

[1] تفسير الطبري (۲۰/ ۱۲۷۔ ۱۲۹) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۹۶) [3] تفسير الطبري (۲۰/ ۱۲۶۔ ۱۲۷)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۳۰۹٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۱۹۵) تفسير الطبري (۲۰/ ۱۲٦) تفسير ابن كثير (۳/ ۵۷۸) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں، البتہ امام البانی رحمہ اللہ نے ''السلسلة الصحيحة'' (رقم الحديث: ۲۹۲۲) میں اس روایت پر مفصل بحث کرتے ہوئے دیگر طرق اور احادیث کی بنا پر اسے صحیح کہا ہے۔

ضحاک نے ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد شرک ہے، اسی کے قائل عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ ہر وہ کلام ہے جو اللہ کی آیتوں سے اور اس کی راہ کی پیروی کرنے سے روکتا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ یعنی وہ جو یہ کام کرتا ہے تو اسلام اور اہلِ اسلام کی مخالفت کی بنا پر کرتا ہے۔ یائے تحتیہ کی فتح کی قراءت کی بنا پر حرفِ لام لامِ عاقبت ہوگا، یا امرِ قدری کی تعلیل کے لیے، یعنی وہ اس کام کے لیے متعین کیے گئے ہیں، تاکہ وہ ایسے ہوں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "وَيَتَّخِذَ سَبِيْلَ اللّٰهِ هُزُوًا، وَيَسْتَهْزِئُ بِهَا" یعنی اور تاکہ اللہ کی راہ کو ہنسی اور مذاق ٹھہرائیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "وَيَتَّخِذَ آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا"[2] مطلب یہ ہے کہ مفعول کی ضمیر آیات اللہ کی طرف راجع ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول زیادہ صحیح ہے، یعنی اس لیے کہ سبیل اللہ بہ نسبت آیات کے زیادہ قریب ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جنھوں نے اللہ کی آیتوں کی اور اس کی راہ کی توہین کی، ویسی ہی ان کی توہین قیامت کے دن ہمیشہ رہنے والے عذاب میں کی جائے گی۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ﴾ یعنی یہ شخص جو لہو ولعب اور گانے بجانے کی طرف متوجہ ہو رہا ہے تو اس کو عذابِ الیم کی خوش خبری دے۔ یہ ایسا شخص ہے کہ جب اس پر آیاتِ قرآنی پڑھی جائیں تو اُن سے منہ موڑ لیتا ہے، اعراض کرتا ہے، پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے، یعنی بہرا بن جاتا ہے، حالاں کہ اس میں بہرا پن نہیں ہے، گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں، کیوں کہ وہ ان کے سننے سے ایذا پاتا ہے، اس لیے کہ وہ ان آیات سے کسی طرح فائدہ اٹھانا چاہتا ہی نہیں اور نہ ہی اس کو ان میں کچھ حاجت ہے۔ قیامت کے دن اسے ایسا ہی عذاب دیا جائے گا، جیسا کہ اللہ کی کتاب اور اس کی آیتوں کو سن کر وہ دردمند ہوا۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا مضبوط بیان یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ موصولہ ہے یا موصوفہ اور لفظ کی راہ سے مفرد ہے اور معنی کی رو سے جمع (﴿ مِنَ النَّاسِ ﴾ محلِ رفع میں ہے بنابر ابتداء جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا، اور خبر اس کی ﴿ مَنْ يَّشْتَرِيْ ﴾ ہے۔[4] قاله في فتح القدير)۔ پس پہلی تین ضمیروں میں تو اس کے لفظ کی رعایت کی گئی ہے، وہ یہ ہیں: "يَشْتَرِيْ وَيُضِلُّ وَيَتَّخِذُ" پھر دو جگہ اس کے معنی کی رعایت کی گئی، وہ یہ ہیں: ﴿ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ ﴾۔ پھر پانچ ضمیروں میں اس کے لفظ کی مراعات کی گئی، وہ یہ ہیں: ﴿ وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا ... الخ ﴾ ظاہر وجہ تو اس کی یہ ہے

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٢٩۔ ١٣٠)
[2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٣١)
[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٨۔ ٥٧٩)
[4] فتح القدير (٤/ ٣٠٨)

کہ تفنن وتلون (گونا گوں اور رنگ برنگ ہونا) کے لیے ایسا کیا ہے اور معنی کے اعتبار سے شاید یہ وجہ ہو کہ یہ آیت خاص شخص کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ آیندہ اس کا شانِ نزول بیان ہو گا، چونکہ واقعی اس نے یہ کام کیا تھا، جس کا اللہ پاک نے ذکر فرمایا ہے کہ اس نے باطل حدیث خریدی، اس مقصد سے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ، یعنی اسلام اور قرآن سے بے سمجھے گمراہ کرے اور اس کو ہنسی ٹھہرائے۔ اس لیے یہ تین ضمیریں مفرد ذکر کی ہیں۔

یہ کام اس نے صرف اپنی عزت اور اسلام و قرآن کی ذلت کے لیے کیا۔ چوں کہ جزا عمل کی طرح کی ہونی چاہیے، اس لیے اللہ نے اس کی جزا یہ بیان فرمائی: ﴿ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾۔ کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ بہ سبب ابہام کے مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے، اس جگہ اس کے معنی کا لحاظ کر کے ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ صیغۂ جمع ذکر فرمایا۔ اس سے غرض یہ ہے کہ جو کوئی اس شخص جیسا فعل کرے، ان سب کی یہی جزا ہے کہ آخرت میں ان پر ایسا سخت عذاب ہو کہ جس پر وہ واقع ہو، وہ ذلیل وخوار ہو جائے۔ یہ وعید سنانے کے بعد اس شخص کا حال یہ بیان کیا کہ جس وقت اس پر قرآن شریف کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو انتہا درجے کا تکبر کر کے ان سے منہ پھیر لیتا ہے، گویا کہ ان کو سنا ہی نہیں۔ یہ حال خاص اسی شخص کا ذکر کیا ہے، اس لیے ضمیریں مفرد ذکر کیں اور اس کے جنسِ فعل کی وعید سنائی اور ﴿ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ فرمایا۔ یعنی جس طرح وہ آیاتِ قرآنی کے سننے سے ایذا پاتا اور دردمند ہوتا تھا، اسی طرح اس کو خبر دی کہ اس فعلِ شنیع (برا) کے بدلے میں اس کے لیے ایسا عذاب ہے، جو درد، تکلیف اور ایذا دہی میں پرلے درجے کو پہنچا ہوا ہے۔

"بَشِّرْ" سے مراد "أَخْبِرْ" ہے۔ بشارت کا ذکر مذاق اور استہزا کے طور پر ہے۔ ﴿ لَهْوَ ﴾ مصدر ہے "لَهَا يَلْهُوْ" کا۔ "يَلْهُوْ" کھیلنے کو کہتے ہیں، اس جگہ اس سے مراد اسم فاعل ہے، یعنی ہر باطل اور بے کار شے، جو انسان کو خیر و اطاعت، رب کے ذکر اور فائدے کی باتوں سے دور کرتی ہے اور باز رکھتی ہے، جیسے: غنا، کھیل کود، جھوٹی کہانیاں، ہنسی کی باتیں اور بے اصل کہاوتیں اور خرافات اور گھڑے ہوتے قصے اور معازف اور مزامیر (گانا بجانا، باجے) اور ہر شے جو شرعاً بری ہے۔ ﴿ لَهْوَ ﴾ کی اضافت ﴿ الْحَدِيْثِ ﴾ کی طرف اضافتِ بیانیہ بہ معنی "مِنْ" ہے، یعنی وہ لہو جو حدیث سے کائن ہے، کیوں کہ لہو حدیث اور غیرِ حدیث دونوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ اضافت ایسی ہے، جیسے: "ثَوْبُ خَزٍّ" میں ہے، یعنی کپڑا جو ریشم سے بنا ہوا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حذف مضاف سے ابلغ (زیادہ موثر) ہے۔ ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ میں بہت قول ہیں۔ ان میں سے یہ ہیں:

1. کسی نے کہا ہے کہ گانے والے لونڈی غلام کو خریدنا ہے، اس صورت میں تقدیر یہ ہو گی: "مَنْ يَشْتَرِيْ أَهْلَ لَهْوِ الْحَدِيْثِ"، یعنی جو خریدتا ہے لہو الحدیث والوں کو۔
2. امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ معازف وغنا ہے۔

③ ان سے دوسرا قول یہ مروی ہے کہ کفر و شرک ہے۔ اس قول میں بُعد ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: اس باب میں جو کہا گیا ہے، اس میں سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ سے مراد غنا ہے، کہا: اور یہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کا قول ہے۔[1]

④ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ﴾ باطل حدیث ہے۔ اس کو خریدنے والا نضر بن حارث بن علقمہ ہے۔ "اِشْتَرَى أَحَادِيْثَ الْأَعَاجِمِ وَأَخْبَارَ الْأَكَاسِرَةِ وَصَنِيْعَهُمْ فِيْ دَهْرِهِمْ" یعنی عجمیوں کے قصے کہانیاں اور اکاسرہ کی خبریں اور جو کچھ انھوں نے اپنے وقت میں کام کیے تھے، اس نے ان کو خریدا۔ حیرہ سے ملکِ شام کی طرف کتابیں لکھا کرتا تھا اور قرآن کی تکذیب کرتا تھا۔[2] (أخرجه البيهقي في الشعب عنه)

⑤ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ باطل الحدیث اور وہ غنا اور اس جیسی دیگر چیزیں ہیں۔[3] ﴿ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ قراءتِ قرآن اور ذکر اللہ۔ قریش کے ایک شخص کے حق میں نازل ہوئی ہے، اس نے ایک گانے والی لونڈی خریدی تھی۔[4] (أخرجه الفريابي و ابن جرير و ابن مردويه عنه)

⑥ ان کا تیسرا قول یہ ہے کہ وہ غنا اور اس سے مشابہت رکھنے والی چیزیں ہیں۔[5] (أخرجه البخاري في الأدب المفرد و ابن أبي الدنيا و ابن جرير و ابن أبي حاتم و ابن مردويه و البيهقي في السنن عنه)

⑦ ان کا چوتھا قول یہ ہے: "اَلْجَوَارِيُ الضَّارِبَاتِ"[6] یعنی بجانے والی لونڈیاں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "هُوَ وَاللّٰهِ: اَلْغِنَاءُ"۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "هُوَ الْغِنَاءُ وَاللّٰهِ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ" انھوں نے اسے تین مرتبہ دہرایا۔[7]

⑧ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مت بیچو قینات کو، یعنی گانے والیوں کو اور مت خریدو ان کو اور ان کی تجارت میں کوئی خیر نہیں ہے اور ان کی قیمت حرام ہے۔ اس کی مثل میں یہ آیت نازل کی گئی ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾۔[8] (أخرجه سعيد بن منصور وأحمد والترمذي وابن ماجه وابن أبي الدنيا وابن أبي حاتم والطبراني وابن مردويه والبيهقي وفي إسناده عبيد الله بن زحر عن علي بن زيد عن القاسم بن عبد الرحمن وفيهم ضعف)

⑨ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اللہ نے حرام کیا ہے قینہ کو اور اس کی

---

① تفسير القرطبي (١٤/ ٥١ـ ٥٢) ② شعب الإيمان (٤/ ٣٠٥)

③ تفسير الطبري (٢٠/ ١٢٨) ④ تفسير الطبري (٢٠/ ١٣٠)

⑤ الأدب المفرد (١/ ٢٧٤) تفسير الطبري (٢٠/ ١٢٧ـ ١٢٨) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٠٩٦) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ٢٢١)

⑥ فتح القدير (٤/ ٣١٠) ⑦ تفسير الطبري (٢٠/ ١٢٧) ⑧ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

خرید وفروخت کو اور اس کی قیمت کو اور اس کی تعلیم کو اور اس کی طرف کان لگانے کو، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾۔[1] (أخرجه ابن أبي الدنيا في ذم الملاهي و ابن مردويه)

10 سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «اَلْغِنَاءُ يُنْبِتُ النِّفَاقَ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الْبَقْلَ» یعنی راگ نفاق کو اُگاتا ہے جس طرح پانی روئیدگی کو اُگاتا ہے۔[2] (أخرجه ابن أبي الدنيا و البيهقي في السنن و ابن مردويه و روياه عنه موقوفاً)

11 سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی آواز غنا کے ساتھ بلند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو شیطان بھیجتا ہے، جو اس کے دونوں مونڈھوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی ایڑیوں سے اس کے سینے پر مارتے ہیں، یہاں تک کہ وہ رک جائے۔[3] (أخرجه ابن أبي الدنيا وابن مردويه وأخرج الترمذي عنه مرفوعا نحوه، وفي الباب أحاديث في كل حديث منها مقال)

12 سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ مراد لونڈی خریدنا ہے کہ رات دن اسے گانا سناتی ہے۔[4] (أخرجه البيهقي في الشعب)

13 سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں: سوا اس کے نہیں کہ یہ مرد کا لعب اور باطل کو خریدنا ہے۔[5] (أخرجه ابن مردويه)

14 امام نافع کہتے ہیں: میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہمراہ کسی راستے پر چلا جاتا تھا کہ انھوں نے زمارہ کو سنا، («قَصَبَةٌ يُزْمَرُ بِهَا» یعنی نے (بانسری) جس کو بجاتے ہیں)، تو اپنی دونوں انگلیاں دونوں کانوں میں کر لیں، پھر راستہ بدل لیا۔ پھر کہتے رہے: اے نافع! کیا تو سنتا ہے؟ میں نے کہا: نہیں اور اپنی انگلیاں کانوں سے نکال لیں اور کہا کہ میں نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔[6] (أخرجه ابن أبي الدنيا والبيهقي)

15 سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں دو احمق فاجر آوازوں سے منع کیا گیا ہوں: ایک آواز نغمے کے وقت لہو اور شیطان کی مزامیر اور ایک آواز مصیبت کے وقت منہ کا نوچنا اور

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٥٠٤) [2] سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ٢٢٣)

[3] المعجم الكبير (٨/ ٢٠٤) الدر المنثور (٦/ ٥٠٦) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٩٣١)

[4] شعب الإيمان (٤/ ٢٧٩) [5] الدر المنثور (٦/ ٥٠٧)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٢٤) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ٢٢٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (تحريم آلات الطرب: ١/ ١١٦)

گریبانوں کو پھاڑنا اور رنہ شیطان، یعنی چیخنا اور بَین کرنا۔[1] (أخرجه ابن أبي الدنيا)

16 امام خازن رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث بن کلدہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ یہ شخص تجارت کیا کرتا تھا۔ حیرہ میں آتا اور عجم کے اخبار خریدتا اور قریش کے سامنے ان کو بیان کرتا اور کہتا کہ محمد تو تم سے عاد و ثمود کا قصہ بیان کرتے ہیں اور میں تم سے رستم اور اسفندیار کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ چنانچہ قریش اس کا قصہ سنتے اور قرآن کا سننا چھوڑ دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[2] غرضیکہ شانِ نزول اور لہو الحدیث کے اقوال تو ذکر ہو چکے۔

اب رہی یہ بات کہ اشتراء کے کیا معنی ہیں تو وہ یا تو "شراء" بہ معنی خریدنا سے ماخوذ ہے، جیسا کہ نضر کے قصے میں مروی ہے یا "اشتری" بہ معنی استبدال و اختیار ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اِشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ ﴾ [آل عمران: ١٧٧] "بے شک جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر خرید لیا۔" یعنی ایمان کے عوض میں کفر لیا اور کفر کو ایمان پر اختیار کیا، اسی طرح یہاں ہے کہ حدیثِ باطل کو حدیثِ حق پر اختیار کرتے ہیں۔[3] (كما قاله النسفي)

جمہور نے ﴿ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ کو بہ ضمِ یائے تحتیہ پڑھا ہے، یعنی تاکہ اپنے غیر کو راہِ ہدایت سے اور شاہراہِ حق سے گمراہ کرے اور جبکہ اپنے غیر کو گمراہ کیا تو وہ خود یقیناً گمراہ ہوا۔ ابن کثیر، ابو عمرو، ابن محیصن، حمید، ورش اور ابن ابی اسحاق رحمہم اللہ نے بہ فتحِ یاء پڑھا، یعنی تاکہ وہ خود گمراہ ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: جس نے بہ ضمِ یاء پڑھا تو اس کے یہ معنی ہیں، تاکہ وہ گمراہ کرے اپنے غیر کو، پھر جب اس نے اپنے غیر کو گمراہ کیا تو خود تو وہ یقیناً گمراہ ہوا۔ اور جس نے بہ فتحِ یاء پڑھا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں، تاکہ انجام کار اس کا گمراہی کی طرف ہو۔ اگرچہ وہ گمراہی کے لیے نہیں خریدتا، لیکن انجام کار اس کا اسی طرف ہونا ہے۔ چنانچہ اس تعلیل نے یہ فائدہ دیا کہ مذمت کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جو لہوِ حدیث کو اس مقصد کے لیے خریدتا ہے، چنانچہ سببِ نزول مذکور اسی کی تائید کرتا ہے۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی وہ لہوِ حدیث کو اس حال میں خریدتا ہے کہ جس کو خریدتا ہے اس کے بارے میں جاہل ہے۔ یا اس کو اس تجارت کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ نفع دے گی یا نقصان پہنچائے گی۔ اسی لیے خیر کے عوض میں وہ شے لی جو محض شر ہے۔ ﴿ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ﴾ جمہور نے برفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ يَشْتَرِيْ ﴾ پر معطوف ہے، پس من جملۂ صلہ ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ رفع بنا بر استیناف ہے اور ضمیر منصوب آیات کی طرف راجع ہے، جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ لیکن قولِ اول زیادہ صحیح ہے۔ امام حمزہ، کسائی اور اعمش رحمہم اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ لِيُضِلَّ ﴾ پر عطف ہے[5] اور ضمیر منصوب ﴿ سَبِيْلِ ﴾ کی طرف

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٠٥) مستدرك الحاكم (٤/ ٤٣) الدر المنثور (٦/ ٥٠٧) السلسلة الصحيحة (٢١٥٧)

[2] تفسير الخازن (٥/ ٢١٣) [3] تفسير النسفي (٣/ ٢٨٠) [4] فتح القدير (٤/ ٣٠٨) [5] تفسير القرطبي (١٤/ ٥٦)

راجع ہے۔ اس قراءت کی بنا پر من جملہ تعلیل ہوگا واسطے تحریم کے۔ معنی یہ ہیں کہ لہو حدیث کو اس لیے خرید تا ہے کہ اللہ کی راہ سے گمراہ کرے اور اللہ کی راہ کو ﴿ هُزُوًا ﴾ (مذاق) ٹھہرائے۔ "أَيْ: مَهْزُوًّا بِهِ" یعنی اللہ کی راہ کو ہنسی ٹھہراتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اسے ایسی راہ قرار دیتا ہے کہ اس کے ساتھ ہنسی کی جائے۔ کلمۂ ﴿ سَبِيْلِ ﴾ کلامِ عرب میں مذکر و مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا ﴾ یعنی جس وقت اس ہنسی کرنے والے پر قرآن کی آیتیں پڑھی جائیں تو ان سے اعراض کرے، منہ موڑے، اس حال میں کہ تکبر میں مبالغہ کرنے والا ہو اور اپنی جان کو قرآن شریف کی طرف کان لگانے سے بہت بلند و بالا سمجھنے والا ہو۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ﴾۔ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی یہ مُعرض متکبر قرآن کے سننے سے اس حال میں اعراض کرے کہ گویا اس نے اس کو سنا ہی نہیں، باوجود اس کے کہ اس کو سن لیا ہے، لیکن اس کا حال اس شخص کے حال کے مشابہ ہے جس نے سنا ہی نہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ﴾ حالِ ثانی ہے، یا پہلے حال سے بدل ہے، یا ﴿ يَسْمَعْهَا ﴾ کی ضمیر سے حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ جملۂ مستانفہ ہو۔ "وَقْرٌ" بہ معنی "ثِقْلٌ" ہے، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اس جملے میں بیان ہے اس منہ پھیرنے والے کے اعراض کے مبالغے کا۔ پہلے تو یوں کہا کہ آیاتِ قرآنی کے سننے سے اعراض کرتا ہے، گویا ان کو سنا ہی نہیں۔ پھر فرمایا: گویا اس کے کانوں میں بوجھ ہے۔ غرض یہ ہے کہ انتہا درجے کا اعراض کرتا ہے کہ اس سے زیادہ اعراض ہو نہیں سکتا۔ چوں کہ اس نے اپنے خیال میں اچھا کام کیا ہے اور جو کوئی اچھا کام کرتا ہے تو وہ اس کی جزا کی خوش خبری کی توقع رکھتا ہے، اس لیے اللہ پاک نے اس کی جزا کی خبر دینے کو بشارت کے پیرایہ میں ادا کر کے فرمایا: ﴿ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ یعنی جیسے اس نے اعراض میں مبالغہ کیا ہے، ویسے ہی غایت درجے کے دردناک عذاب کی تو اس کو بشارت دے، کیوں کہ جزا ویسی ہی ہونی چاہیے جیسا عمل ہو۔

امام طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مختلف دور کے علماء نے غنا کی کراہت اور ممنوع ہونے پر اجماع کیا ہے۔ صرف ابراہیم بن سعد اور عبداللہ عنبری نے اس اجماع سے علاحدگی کی ہے۔ قاضی ابوبکر العربی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ آدمی کے لیے اپنی لونڈی کا گانا سننا جائز ہے، کیوں کہ اس کی کوئی شے اس پر حرام نہیں ہے، نہ اس کے ظاہر کی نہ باطن کی، پھر وہ اس کی آواز کے ساتھ لذت لینے سے کیوں منع کیا جائے۔[1]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں بابِ غنا میں جو اختلاف واقع ہوا اس کو دلائل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ محلِ نزاع جبکہ دائرۂ حرام سے خارج ہو گیا تو دائرۂ اشتباہ سے تو خارج نہیں ہو سکتا ہے، یعنی اگر وہ حرام کے زمرے سے نکل گیا ہے تو مشتبہ چیزوں میں تو شامل ہے۔ "وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَقَّافُوْنَ عِنْدَ الشُّبُهَاتِ"

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٥٥)

یعنی مومنون کی شان یہ ہے کہ شبہات کے پاس ٹھہر جاتے ہیں، اس سے تجاوز نہیں کرتے، چنانچہ صحیح حدیث اس کی صراحت فرماتی ہے: «وَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِعِرْضِهِ وَدِيْنِهِ، وَمَنْ حَامَ حَوْلَ الْحِمَى يُوْشِكُ أَنْ يَّقَعَ فِيْهِ»[1] یعنی جس کسی نے شبہات کو چھوڑا تو بے شک اس نے اپنی آبرو اور دین کو بچالیا اور جو کوئی چراگاہ کے گرد گھوما تو قریب ہے کہ اس میں واقع ہو جائے گا۔

"وَلَا سِيَّمَا إِذَا كَانَ مُشْتَمِلًا عَلٰى ذِكْرِ الْقُدُوْدِ وَالْخُدُوْدِ وَالْجَمَالِ وَالدَّلَالِ وَالْهَجْرِ وَالْوِصَالِ وَمُعَاقَرَةِ الْعُقَارِ وَخَلْعِ الْعِذَارِ وَالْوَقَارِ، فَإِنَّ سَامِعَ مَا كَانَ كَذٰلِكَ لَا يَخْلُوْ عَنْ بَلِيَّةٍ وَإِنْ كَانَ مِنَ التَّصَلُّبِ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ عَلَى حَدٍّ يَقْصُرُ عَنْهُ الْوَصْفُ، وَكَمْ لِهٰذِهِ الْوَسِيْلَةِ الشَّيْطَانِيَّةِ مِنْ قَتِيْلٍ دَمُهُ مَطْلُوْلٌ، وَأَسِيْرٍ بِهُمُوْمِ غُرَامِهِ وَهُيَامِهِ مَكْبُوْلٌ، نَسْأَلُ اللّٰهَ السَّدَادَ وَالثَّبَاتَ"[2] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے یہ عبارت انتہائی بلیغ و رقاص لکھی ہے اور مسئلۂ سماع میں ایک رسالہ "إبطال دعوى الإجماع على تحريم مطلق السماع" نام تالیف فرمایا ہے۔ غنا میں اہلِ علم کے تمام اقوال کو جمع کیا ہے، حلال اور حرام کہنے والوں کی دلیلیں ذکر کی ہیں اور اس مسئلے کی خوب تحقیق کی ہے، جو کوئی اسے دیکھے اور اس کے معانی میں غور و فکر کرے تو ناظر غیر مناظر کو اس مسئلے میں کسی اور کتاب کے دیکھنے کی ضرورت نہ رہے۔

اسی طرح سیدنا و مولانا ابو الوفاء الصدیق صاحبِ ترجمان القرآن رحمہ اللہ نے غنا کے جواز اور عدمِ جواز کا بیان کتاب "هداية السائل" اور "دليل الطالب" میں خوب تحریر فرمایا ہے۔[3] جس کسی کو اس کی پوری تحقیق منظور ہو تو اسے چاہیے کہ کتبِ مذکور کی طرف رجوع فرمائے اور اپنے سینے کو ٹھنڈا کرلے۔ وباللّٰہ التوفیق۔ امام شوکانی رحمہ اللہ کی عربی عبارت جو اوپر ذکر کی گئی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ راگ کے فتنے بے حساب ہیں، خصوصاً جبکہ اشعار میں مختلف معشوقانِ طناز اور اداؤں اور ناز نخرے والی محبوباؤں کے قد اور رخسار اور ان کے طرح طرح کے اور قسموں کے اوصاف کا ذکر ہو اور حسن و جمال اور ناز و ادا اور ہجر و وصال کا بیان ہو، چنانچہ کسی نے کہا:

وہ وصل کے وعدے وہ شبِ ہجر کے صدمے مرنے نہیں دیتے مجھے جینے نہیں دیتے

اور شراب، شراب خوری، بے باکی، بے حیائی، شہوت پرستی اور بوسہ بازی وغیرہ وغیرہ کا اس میں ذکر ہو تو ایسے مضامین کا سننے والا فتنے اور بلا میں ضرور پڑ کر رہے گا، گو وہ اللہ پاک کی ذاتِ مقدس کے شغل میں حد درجے کا سخت اور درشت ہو اور ایسی حد پر ہو کہ بیان سے باہر ہو۔ کچھ نہ کچھ اس فتنے کا اثر اس کے قلب کو پہنچے گا۔ بہت سے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩) [2] نيل الأوطار (٨/ ١٧٩)

[3] الحمد للہ یہ دونوں کتابیں فارسی زبان سے منتقل ہو کر اردو زبان کا جامہ پہنے ''فتاویٰ نواب صدیق حسن خاں'' کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں ادارہ دار ابی الطیب کے زیرِ اہتمام زیرِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

اس وسیلۂ شیطان کے مقتول ہیں کہ ان کا خوف رائگان گیا اور بہت سے اس کے قیدی ہیں کہ عشق ومحبت کے ہموم وافکار کی قید میں مقید ہیں۔ ہم اللہ پاک سے راستی ودرستی وثابت قدمی کا سوال کرتے ہیں کہ ہم کو دین کے مضبوط اور سیدھے راستے پر ثابت قدم رکھے اور فتنوں اور آفات اور شیطانی وسوسوں اور شیطانِ رجیم کے جال سے محفوظ ومامون رکھے۔ آمین۔

یہ جو فرمایا بے شک سچی بات ہے، اسی لیے صوفیائے کرام اور علمائے باللہ عظام نے سماع کے شروط وآداب ذکر کیے ہیں کہ اگر ان شرطوں کے ساتھ ہو تو خیر درست ہے ورنہ درست نہیں۔ وَالْمَهْدِيُّ مَنْ هَدَاهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ۔ بالجملہ جبکہ اللہ پاک نے اس شخص کا حال بیان کیا جو قرآنی آیات سے اعراض کرتا ہے تو اس کے بعد اس شخص کا حال ذکر کیا جو ان پر متوجہ ہوتا ہے اور کان لگا کر سنتا ہے اور اُن پر عمل کرتا ہے اور آخرت میں اس پر جو جزا اس کو ملے گی، اس کا بھی بیان کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴿٨﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۖ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴿١٠﴾ هَٰذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ ۚ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿١١﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے پُرنعمت باغ ہیں ⑧ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے، اور وہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے ⑨ اس (اللہ) نے ستونوں کے بغیر آسمان پیدا کیے، تم انھیں دیکھتے ہو، اور اس نے زمین میں (اونچے اونچے) پہاڑ جما دیے، تاکہ زمین تمھیں ساتھ لیے ہلنے جلنے (نہ) لگے اور اس نے اس میں ہر قسم کے چوپائے پھیلائے، اور ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر ہم نے اس (زمین) میں ہر قسم کی نفیس اور عمدہ چیزیں اُگائیں ⑩ یہ تو ہے اللہ کی مخلوق، پھر مجھے دکھاؤ کہ اَوروں نے اس (اللہ) کے سوا کیا تخلیق کیا ہے (کچھ بھی نہیں) بلکہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں ⑪

مومنوں کے اچھے انجام کا بیان:

نیک بخت لوگوں میں جو ابرار، نیکوکار لوگ ہیں، یہ ان کے انجام کار کا ذکر ہے، وہ لوگ جو کہ اللہ پر ایمان

---

[1] فتح البیان (۱۰/ ۲۷۴۔ ۲۷۸)

لائے اور رسولوں کی تصدیق کی اور نیک کام کیے، جو شریعت کے تابع ہیں آخرت میں ان لوگوں کے لیے نعمت کے باغات ہیں، یعنی وہ طرح طرح اور قسم قسم کی لذتوں مزوں اور خوشیوں کے ساتھ ان میں عیش و آرام کریں گے۔ طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزیں، قسم قسم کے لباس اور نوع نوع کے مکان و محل طرح طرح کی سواریاں اور عورتیں اور سماع و راگ، جس کا خیال تک بھی کسی کے دل پر نہیں گزرا اور وہ اس سب عیش و آرام میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان باغوں میں رہنے بسنے والے ہیں، نہ وہاں سے کوچ کریں گے اور نہ ہی وہاں سے کسی اور جگہ منتقل ہونا چاہیں گے۔

﴿ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ﴾ یعنی یہ سب ضرور ہونے والا ہے، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے وعدے سے ہے اور اللہ وعدے کا خلاف نہیں کرتا ہے، کیوں کہ وہ تو کریم اور منان ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، ہر شے پر قادر ہے اور وہ عزیز اور زبردست ہے، جس نے ہر شے کو مغلوب کیا ہے اور ہر شے اس کی مطیع اور فرمانبردار ہے۔ اپنے اقوال اور افعال میں حکمتوں والا ہے، جس نے قرآن کو مومنوں کے لیے ہدایت ٹھہرایا ہے: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ [فصلت: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔''

توحید کے دلائل کا ذکر:

پھر اللہ پاک اپنی عظیم قدرت کا ذکر کرتا ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جو کچھ اُن میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، ان سب کو بنایا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ ﴾ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمانوں کے ستون نہیں ہیں، نہ ایسے کہ دکھائی دیں اور نہ ایسے کہ دکھائی نہ دیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ان کے ستون ہیں، تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔[1] اس مسئلے کے بارے میں سورۃ الرعد کے شروع میں ایسا بیان گزر چکا ہے[2] کہ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿ رَوَاسِيَ ﴾ سے مراد پہاڑ ہیں، انھوں نے زمین کو جما دیا ہے اور بوجھل کر دیا ہے، تاکہ زمین اپنے اوپر رہنے والے لوگوں کو لے کر پانی کے اوپر مضطرب نہ ہو۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ ﴾ یعنی تم کو لے کر

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ٣٢) [2] رقم الآية (٢)

جھک نہ پڑے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ ﴾ یعنی زمین میں طرح طرح کے اور قسم قسم کے جانور پیدا کیے، جن کی شکلوں اور رنگوں کی تعداد کو سوائے پیدا کرنے والے کے کوئی نہیں جانتا۔ جب اللہ پاک یہ بات ثابت کر چکا کہ خالق وہی ہے تو اس بات سے آگاہ فرمایا کہ رازق بھی وہی ہے۔ فرمایا: ﴿ وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾۔

﴿ مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہر قسم کے جوڑے روئیدگی سے اُگائے۔ ﴿ كَرِيمٍ ﴾ کے معنی حسن المنظر، خوش شکل خوبصورت۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسان بھی زمین کی روئیدگی سے ہیں، جو کوئی جنت میں داخل ہوا تو وہ کریم ہے اور جو نار میں داخل ہوا وہ لئیم ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ هَٰذَا خَلْقُ اللَّهِ ﴾ یعنی یہ آسمانوں اور زمین کا اور جو شے ان کے درمیان ہے ان کا پیدا کرنا اللہ پاک کے فعل، خلق اور تقدیر سے صادر ہوا ہے۔ یہ سب اسی وحدہ لا شریک لہ کا کام ہے، اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ ﴾ یعنی جن بتوں اور شریکوں کو تم پوجتے اور پکارتے ہو، ان میں سے کس نے کیا پیدا کیا ہے، چنانچہ مجھے تم وہ دکھاؤ۔ اس کا وہ کیا خاک جواب دیں گے! وہ خود مخلوق ہیں، کسی کو کیا پیدا کریں گے۔ اسی لیے اس سے اعراض کر کے یہ اشارہ فرمایا: ﴿ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾ یعنی جو لوگ اللہ پاک کے ساتھ شریک کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجتے ہیں واضح اور ظاہر جہالت اور نابینائی میں پڑے ہوئے ہیں، جس میں کسی طرح کی پوشیدگی نہیں ہے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے، بے شک وہ لوگ جو اللہ پر اور اس کی آیتوں پر ایمان لائے اور ان سے منہ نہیں موڑا، بلکہ ان کو قبول کیا اور ان پر عمل کیا، ان کے لیے ﴿ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴾ ہے، یعنی "نعيم الجنات"۔ اصل میں اسی طرح ہے مبالغے کے لیے اس کا عکس کر کے ﴿ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴾ فرمایا، یعنی ان کے لیے نعمت کے باغ ٹھہرائے، جس طرح کہ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے ﴿ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴾ ٹھہرایا۔ ﴿ خَالِدِينَ ﴾ کا نصب ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر سے بنا بر حال ہے، یعنی ایسا ہے کہ جناتِ نعیم میں ہمیشہ رہنا مقدر کر دیا گیا ہے، جب کہ وہ اُن میں داخل ہوں گے، چنانچہ یہ حالِ مقدرہ ہے۔ زید بن علی نے "خَالِدُونَ" برفع پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ان کی خبرِ ثانی ہے: ﴿ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ﴾۔ دونوں مصدر ہیں، پہلا مصدر تو موکد لنفسہٖ ہے، یعنی "وَعَدَ اللّٰهُ وَعداً" اور دوسرا موکد لغیرہ ہے، وہ غیر جملۂ اول کا مضمون ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "حَقَّ ذٰلِكَ حَقًّا"[3] یعنی اللہ کا یہ وعدہ کہ ان کے لیے ﴿ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴾ ہیں، ضرور ہونے والا ہے، اس میں کسی طرح کا خلاف نہیں ہے اور وہ ایسا غالب ہے کہ اس پر کوئی غالب غلبہ نہیں کر سکتا ہے۔ وہ اپنے اقوال و افعال میں حکیم ہے۔

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٢٨٩) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٧٩۔ ٥٨٠) [3] فتح القدير (٤/ ٣٠٩)

پھر اللہ پاک نے اپنی عزت و حکمت کا یہ بیان فرمایا کہ ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ﴾. ﴿عَمَدٍ﴾ جمع ہے عماد کی، جیسے: "أَهَبٌ"، "إِهَابٌ" کی جمع ہے۔ عماد وہ شے ہے جس پر دیوار کی ٹیک لگائی جاتی ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "عَمَدْتُ الْحَائِطَ إِذَا دَعَّمْتَهُ"، یعنی میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگایا، جبکہ تو اس کو دعامہ پر رکھے۔ مصباح میں کہا ہے: "دِعَامَةٌ" بالکسر وہ شے ہے، جس کے ساتھ دیوار ٹیک لگائی جاتی ہے، جبکہ وہ جھک جائے، وہ دعامہ اس کو گر پڑنے سے روکے۔ "دَعَمْتُ الْحَائِطَ دَعْمًا" باب "نفع" سے ہے،[1] اس کا بیان سورۃ الرعد میں گزر چکا ہے۔[2]

﴿تَرَوْنَهَا﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور ضمیر ﴿اَلسَّمٰوٰتِ﴾ کی طرف راجع ہے، یعنی اللہ نے آسمانوں کو بغیر ستون کے پیدا کیا اور حال یہ ہے کہ تم ان کو اسی طرح بغیر ستون کے دیکھتے ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ محلِ جر میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿عَمَدٍ﴾ کی صفت ہے، یعنی ان کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے، ایسے ستون کہ دکھائی دیں۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ وہاں ستون ہوں، لیکن دکھائی نہ دیتے ہوں، یا بالکل ستون ہی نہ ہوں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: میں نے علی بن سلیمان کو سنا، وہ کہتے تھے: اولیٰ یہ ہے کہ جملہ مستانفہ ہو، یعنی وہاں بالکل ستون نہیں ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ آسمان مبسوط پیدا کیا گیا مثل مستوی، یعنی برابر رکابی کے۔ یہ مفسرین کا قول ہے۔ اور آسمان فضا میں ہے، یعنی ایک میدان میں اور فضا کی کوئی انتہا نہیں ہے، اور آسمان کا بعض فضا میں ہونا، یہ صرف قادر مختار کی قدرت ہی سے ہے۔ ﴿بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ سے اسی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی اس کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کو اپنی جگہ سے ٹلنے سے روکے، حالاں کہ وہ ثابت ہیں اور زائل نہیں ہوتے ہیں۔ یہ صرف اللہ پاک کی قدرتِ تامہ سے ہے۔

﴿وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ﴾۔ ﴿رَوَاسِيَ﴾ کا واحد "رَاسِيَةٌ" ہے، جب کوئی شے ثابت ہوتی ہے، جم جاتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "رَسَى الشَّيْءُ" اس کا باب "عَدَا وَسَمَا" ہے۔ ﴿رَوَاسِيَ﴾ بہ معنی رواسخ ہے، یعنی اونچے جمے ہوئے پہاڑ ہیں۔ من جملہ "أوتاد أرض" کے یہ سترہ پہاڑ ہیں، ان میں سے کوہِ قاف، ابوقبیس، جودی، لبنان، طور سینین اور طور سیناء ہیں۔ (أخرجه ابن جرير) لیکن ان کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں، زیادہ صحیح اس کا عموم ہے، زمین پر اس سے زیادہ پہاڑ ہیں اور رسو کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ﴿اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ﴾ محلِ نصب میں ہے، بنا بر علت "أَيْ: كَرَاهَةَ أَنْ تَمِيْدَ"۔ کوفیوں کی تقدیر: "لِئَلَّا تَمِيْدَ" ہے، یعنی زمین میں پہاڑ ڈالے، اس کراہت کی وجہ سے کہ وہ تم کو لے کر جھک پڑیں، یا تاکہ وہ جھک نہ پڑیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے زمین کو پیدا کیا اور اس کو مستقر و ثابت کیا، تاکہ وہ ان پہاڑوں کی وجہ سے جن کو زمین پر بنایا اور اس کی پشت پر ان کو جمایا، تاکہ وہ زمین نہ ہلے۔

---

[1] المصباح المنير (١/ ١٠٣) [2] رقم الآية (٢) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ٥٧)

﴿ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ﴾ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے۔ یعنی نشر وتفریق کیے اور زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلائے۔ ﴿ بَثَّ ﴾ کے معنی پہلے گزر چکے ہیں۔ چوں کہ پانی کا نازل کرنا ایک عظیم الشان نعمت ہے، اس لیے غیبت سے متکلم کی طرف التفات کر کے فرمایا: ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ یعنی ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا، یہ اللہ پاک کے اپنے بندوں پر انعام اور فضل وکرم سے ہے۔ ﴿ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴾ یعنی پھر ہم نے پانی اتارنے کے سبب سے زمین میں ہر قسم کی اچھی صنف سے اُگایا۔ مراد ہر قسم کی خوبصورت روئیدگی ہے، اس کے حسنِ رنگ اور کثرتِ منافع کی جہت سے اس کو کریم کی صفت کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ ﴿ هٰذَا ﴾ مبتداء ہے۔ ﴿ خَلْقُ اللّٰهِ ﴾ اس کی خبر ہے، یعنی یہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور جو امور ان سے متعلق ہیں، جن کا ذکر ہوا، یہ سب اللہ کی مخلوق ہیں۔

﴿ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ﴾ سوالیہ انداز ملامت اور ڈانٹنے کے لیے ہے اور امر، یعنی حکم اُن کی سرزنش کے لیے ہے، یعنی تم مجھے دکھاؤ کہ ان لوگوں نے جو اس کے سوا ہیں، تمھارے معبودوں میں سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، کیا پیدا کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی خلق کے مشابہ وقریب کون سی چیز پیدا کی ہے کہ وہ تمھارے نزدیک عبادت کے مستحق ہو گئے ہیں؟ پھر اللہ پاک نے ان کی سرزنش سے اِضراب کر کے، یعنی آگے بڑھ کر ان پر ظاہری گمراہی کا حکم لگایا اور جس شے پر وہ جمے ہوئے ہیں، اس کے باطل ہونے کی خبر دی، فرمایا: ﴿ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ پہلے ان کا ظلم ثابت کیا، پھر ان کی گمراہی اور گمراہی کو واضح اور کھلی گمراہی فرمایا، چنانچہ جو شخص ایسا ہوتا ہے وہ نہ حجت کو سمجھتا ہے نہ حق کی طرف راہ پاتا ہے۔[1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿12﴾

اور بلاشبہہ ہم نے لقمان کو حکمت دی تھی کہ تو اللہ کا شکر کر اور جو کوئی شکر کرے تو یقیناً وہ اپنی ہی ذات کے لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو بلاشبہہ اللہ بے پروا ہے، تعریف کیا ہوا ہے ⑫

لقمان علیہ السلام کا تذکرہ:

لقمان حبشی غلام تھے داود علیہ السلام کے وقت میں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت دی، یعنی عقل کے طور پر ان کے لیے وہ باتیں واضح کیں جو پیغمبروں کے حکم کے موافق ہوں۔ انتھی۔

لقمان کے بارے میں سلف نے اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ نبی تھے یا بغیر نبوت کے ایک بندۂ صالح تھے، یہ دو

[1] فتح البیان (۱۰/ ۲۷۸۔ ۲۸۰)

قول ہوئے۔ زیادہ لوگ دوسرے قول پر ہیں۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن أشعث عن عکرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ لقمان غلام حبشی نجار تھے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے کہا کہ لقمان کے بارے میں تم کو کیا خبر پہنچی ہے؟ کہا: "كَانَ قَصِيرًا أَفْطَسَ الْأَنْفِ مِنَ النُّوبَةِ"[2] یعنی کوتاہ قد، پھن بنی، قومِ نوبہ سے تھے۔ یحییٰ بن سعید انصاری نے سعید بن مسیّب سے روایت کیا ہے کہ لقمان سوڈانِ مصر سے ذومشافر تھے، یعنی ان کے ہونٹ بڑے بڑے تھے، جیسے حبشیوں کے ہوتے ہیں۔ اللہ نے ان کو حکمت عطا کی تھی اور نبوت ان سے روک رکھی تھی۔[3]

امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن حرملہ نے مجھے حدیث کی کہ ایک سیاہ فام شخص سعید بن مسیّب کی طرف آیا، ان سے سوال کرتا تھا تو سعید نے اس سے کہا کہ تو اس بات سے غم نہ کر کہ تو سیاہ ہے، کیوں کہ بہترین لوگوں میں جو سیاہ فام تھے، تین آدمی تھے: بلال اور مہجع رضی اللہ عنہما جو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے غلام تھے اور لقمان حکیم رحمہ اللہ۔ یہ سیاہ نوبی تھے بڑے ہونٹ والے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے خالد ربعی سے روایت کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام اور نجار تھے۔ ان کے مولیٰ نے ان سے کہا کہ تو اس بکری کو ہمارے واسطے ذبح کر۔ انھوں نے اس کو ذبح کیا۔ پھر مالک نے کہا کہ اس میں جو دو ٹکڑے سب سے پاک ہیں، وہ نکال لا۔ آپ زبان اور دل نکال لائے۔ پھر وہ ٹھہرا جتنا اللہ نے چاہا۔ پھر کہا ہے کہ ہمارے لیے یہ بکری ذبح کر، چنانچہ انھوں نے اسے ذبح کیا۔ پھر کہا کہ اس میں دو سب سے ناپاک ٹکڑے لے کر آؤ، وہ زبان اور دل نکال لائے۔ ان کے مالک نے ان سے کہا کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ تو دو اطیب مضغتان (سب سے پاک دو ٹکڑے) اس میں سے نکال کر لا تو تو ان کو نکال کر لایا اور میں نے تجھے حکم کیا کہ دو سب سے زیادہ ناپاک ٹکڑے اس میں سے نکال کر لا تو تو انہیں کو نکال لایا؟ تو لقمان نے کہا کہ کوئی شے ان سے زیادہ پاک نہیں جب وہ پاک ہو جائیں، اور کوئی ان سے زیادہ خبیث نہیں جب وہ خبیث ہو جائیں۔

امام شعبہ رحمہ اللہ نے "عن الحكم عن مجاهد" روایت کیا ہے کہ لقمان عبد صالح تھے، نبی نہ تھے۔ امام أعمش رحمہ اللہ کی روایت مجاہد سے یہ ہے کہ لقمان غلام اسود عظیم الشفتین مشقق القدمین تھے، یعنی بڑے بڑے ہونٹوں والے اور دونوں پاؤں میں شقوق پڑے ہوئے۔ حکام بن سلم نے "عن سعيد الزبيدي عن مجاهد" روایت کیا ہے کہ لقمان حکیم حبشی غلیظ الشفتین مصفح القدمین (یعنی موٹے ہونٹوں والے اور اُن کے دونوں پاؤں میں تلوا نہ تھا، زمین پر برابر لگتے تھے، حبشیوں کے پاؤں اکثر اسی طرح کے ہوتے ہیں)۔ بنی اسرائیل پر قاضی تھے۔ ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل پر قاضی تھے، داود علیہ السلام کے وقت میں تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عمرو بن قیس سے روایت کیا ہے کہ لقمان غلام اسود غلیظ الشفتین مصفح القدمین تھے۔ ان کے پاس ایک شخص آیا اور وہ لوگوں کی مجلس میں

---

(1) تفسير الطبري (٢٠/ ١٣٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٨٠) (2) الدر المنثور (٦/ ٥٠٩) (3) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٧)

تھے، ان کو حدیث بیان کر رہے تھے، یعنی حکمت کی باتیں ان سے بیان کرتے تھے تو اس شخص نے ان سے کہا: کیا تو وہ نہیں جو فلاں فلاں جگہ میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا؟ کہا: ہاں، یعنی میں وہی ہوں۔ کہا: تو پھر کس شے نے تجھے اس مرتبے کو پہنچایا جس کو میں دیکھ رہا ہوں؟ کہا: "صِدْقُ الْحَدِيْثِ، وَالصَّمْتُ عَمَّا لَا يَعْنِيْ" سچ بولنے اور بے فائدہ بات سے چپ رہنے نے مجھے اس مرتبے کو پہنچایا۔[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے روایت کیا ہے، کہا: بے شک اللہ نے لقمان کو اس کی حکمت کے سبب سے بلند مرتبہ کیا۔ چنانچہ ایک شخص نے ان کو دیکھا، وہ ان کو اس سے پہلے پہنچانتا تھا تو ان سے کہا کہ تو بنی فلاں کا غلام نہیں ہے جو کل بکریاں چرایا کرتا تھا؟ کہا: ہاں۔ کہا: پھر کس چیز نے تجھ کو اس رتبے تک پہنچایا جس کو میں دیکھ رہا ہوں؟ کہا: اللہ کی قدر نے اور امانت کے ادا کرنے نے اور بات کے سچ کہنے نے اور اس شے کو میرے ترک کرنے نے جو مجھے فائدہ نہیں دیتی۔[2] چنانچہ یہ آثار ہیں، ان میں سے بعض میں تو ان کے نبی نہ ہونے کی تصریح کی گئی ہے اور بعض وہ ہیں جو اُن کے نبی نہ ہونے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا غلام ہونا اور ان کو غلامی کا چھونا، ان کے نبی ہونے کے منافی ہے، اس لیے کہ رسول اپنی قوم کے حسب والے لوگوں میں سے مبعوث ہوتے ہیں، جتنے پیغمبر ہوئے قوم کے شریف ہوئے ہیں، اسی لیے جمہور سلف اسی خیال پر ہیں کہ وہ نبی نہ تھے۔ ان کا نبی ہونا صرف عکرمہ رحمہ اللہ سے منقول ہے، اگر ان تک سند صحیح ہو جائے، کیوں کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حدیث وکیع عن اسرائیل عن جابر عن عکرمہ کو روایت کیا ہے کہ لقمان نبی تھے۔[3] یہ جابر بن یزید جعفی ضعیف ہے۔ واللہ أعلم.

امام عبداللہ بن وہب رحمہ اللہ نے کہا: مجھے عبداللہ بن عیاش فتیانی نے خبر دی (اصل روایت میں فتیانی ہے، مگر قتبانی یاد آتا ہے۔ واللہ أعلم) عمر مولی غفرہ سے، کہا: ایک شخص لقمان حکیم کے پاس آ کھڑا ہوا تو کہا کہ تو لقمان ہے، تو بنی حسحاس کا غلام ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: تو بکریوں کا چرواہا ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: تو کالا ہے؟ لقمان نے کہا کہ میری سیاہی جو ہے وہ ظاہر ہے۔ کہا: پھر وہ کیا شے ہے جس نے تجھ کو میرے بارے میں تعجب میں ڈالا؟ وہ شخص بولا کہ اس بات نے کہ لوگ تیرے فرش کو روندتے ہیں، تیرے دروازے کو ڈھانکتے ہیں، تیری بات سے راضی ہوتے ہیں۔ کہا: اے میرے بھتیجے! اگر تو اس بات پر اپنے کان لگائے جو میں تجھ سے کہتا ہوں تو تو بھی ایسا ہی ہو جائے۔ لقمان نے کہا کہ میرا اپنی نگاہ کو نیچا رکھنا، میرا اپنی زبان کو روکنا، اپنے کھانے کو پاک رکھنا، میرا اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا، میرا سچ بولنا، میرا اپنے وعدے کو پورا کرنا، میرا اپنے مہمان کی آؤ بھگت کرنا، میرا اپنے پڑوسی کو محفوظ رکھنا اور میرا اس شے کو ترک کرنا جو مجھے فائدہ نہیں دیتی، چنانچہ یہ وہ شے ہے جس نے مجھے اس حال کی طرف پہنچا دیا ہے، جسے تو دیکھ رہا ہے۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٣٤۔ ١٣٥)
[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٨١)
[3] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٣٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٨)
[4] تفسیر الطبري (٢٠/ ٥٨١)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے ایک دن کہا اور لقمان حکیم کا ذکر کیا تو کہا کہ ان کو جو کچھ ملا وہ گھر والوں کی طرف سے نہیں ملا، نہ مال کی وجہ سے ملا، نہ حسب نسب کی طرف سے، نہ اور خصلتوں کے سبب سے ملا، لیکن وہ ایک صمصامہ مرد تھا، یعنی پکے عزم اور ارادے والا شمشیر بران کی طرح، نہایت چپ رہنے والا، انتہائی گہری نظر والا اور دور کی سوچنے والا، کبھی دن کو نہ سویا اور کبھی کسی نے اس کو تھوکتے، کھنکار پھینکتے، نہاتے، ٹٹی پیشاب کرتے، بے فائدہ باتیں اور کام کرتے اور ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ کسی بات کو دھراتا نہیں تھا جس کو بول چکا ہو، مگر اس صورت میں کہ کوئی ایسی حکمت کی بات ہو کہ کوئی شخص اس کے دہرانے کی درخواست کرے، نکاح کر چکا تھا اور اس کی اولاد ہوئی تھی، پھر وہ مرگئی تو ان پر نہ رویا۔ وہ بادشاہ کے پاس آمد و رفت رکھتا تھا، حکام کے پاس آتا تھا، تاکہ نظر کرے اور غور و فکر کرے اور عبرت حاصل کرے۔ چنانچہ اس سبب سے اس کو ملا جو کچھ ملا۔

ایک اثر غریب وارد ہوا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے لقمان حکیم کو اختیار دیا نبوت و حکمت کے درمیان تو اس نے حکمت کو نبوت پر اختیار کیا، کہا: پھر اس کے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور وہ سویا ہوا تھا تو جبریل علیہ السلام نے اس پر حکمت بُر بُرائی یا اس پر حکمت چھڑک دی۔ کہا: چنانچہ صبح کو حکمت بولتا ہوا اٹھا۔ سعید بن بشیر، جو قتادہ سے راوی ہیں، کہتے ہیں: پھر میں نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے سنا، وہ کہتے تھے: لقمان علیہ السلام سے پوچھا گیا: تو نے حکمت کو نبوت پر کیوں اختیار کیا، حالاں کہ تیرا رب تو تجھے اختیار دے چکا تھا؟ تو لقمان نے کہا کہ اگر وہ نبوت دے کر قطعی طور پر میری طرف بھیجتا تو البتہ میں اس میں کامیابی کی امید رکھتا اور البتہ میں امید رکھتا کہ میں اس کو قائم رکھوں گا، لیکن اس نے مجھے اختیار دیا تھا تو میں ڈرا کہ نبوت سے ضعیف ہو جاؤں، یعنی اس کی ذمے داری نہ اُٹھا سکوں تو مجھے حکمت زیادہ پسند ہوئی۔[1] چنانچہ یہ قول سعید بن بشیر رحمہ اللہ کی روایت سے ہے اور اس میں ضعف ہے، لوگوں نے اس کے سبب سے اس میں کلام کیا ہے۔ فاللّٰہ أعلم۔ اس آیت کی تفسیر میں سعید ابن ابی عروبہ نے جو امام قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، وہ یہ ہے کہ حکمت سے مراد فقہ فی الاسلام ہے اور لقمان نبی نہ تھے نہ ان کی طرف وحی کی گئی۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ﴾ یعنی البتہ مقرر دیا ہم نے لقمان کو فہم وعلم و تعبیر۔ ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ﴾ یعنی ہم نے اس کو حکم کیا کہ اللہ عزوجل کا شکر کرے اس فضل پر جو اس کو عطا کیا اور بخشا جس کے ساتھ اس کو اپنے وقت کے لوگوں اور انسانوں میں سے اس کو مخصوص کیا۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ﴾ یعنی اس شکر کا نفع وثواب جو عائد ہوگا، وہ شکر کرنے والوں ہی پر ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴾ [الروم: ٤٤] ”اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے ہی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٨۔ ٣٠٩٧) [2] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٣٤)

لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴾ یعنی اللہ پاک بندوں سے بے نیاز ہے۔ کفر سے اس کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ اگر سارے زمین والے ایک ساتھ کافر ہو جائیں تو وہ اپنے ما سوا سے غنی ہے۔ ''فَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ'' [1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور بطلانِ شرک کے بیان کے لیے لایا گیا ہے۔ لقمان کے لفظ میں اختلاف ہے کہ عربی ہے اور لقم سے مشتق ہے، یا عجمی ہے۔ جس نے کہا کہ عجمی ہے تو تعریف اور عجمہ کی وجہ سے اس کو غیر منصرف ٹھہرایا ہے اور جس نے عربی کہا ہے تو اس نے بسبب تعریف والف ونون مزید کے اس کو غیر منصرف ٹھہرایا ہے۔ حفناوی نے عجمی ہونے کو زیادہ ظاہر کہا ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ نبی تھے یا مردِ صالح۔ پس اکثر اہلِ علم تو اس طرف گئے ہیں کہ نبی نہ تھے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے عکرمہ، سدی اور شعبی رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی تھے۔ پہلا قول زیادہ راجح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی نبوت کے قائل صرف عکرمہ رحمہ اللہ ہیں اور مزید یہ کہ عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت کرنے والا جابر جعفی ہے اور یہ شخص سخت ضعیف ہے، جس طرح کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ نسب یہ ہے: لقمان بن فاغور ابن ناخور بن تارخ۔ تارخ آزر ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے۔ کسی نے یوں کہا ہے: لقمان بن عنقا بن مرون۔ یہ اہلِ ایلہ سے نوبی تھے۔ (ذكره السهيلي)

امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لقمان ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ان کی خالہ کے بیٹے تھے، ایک ہزار برس زندہ رہے۔ ایوب علیہ السلام سے علم اخذ کیا۔ داود علیہ السلام کی بعثت سے پہلے فتوے دیا کرتے تھے، پھر جب وہ مبعوث ہوئے تو فتویٰ دینا چھوڑ دیا۔ کسی نے اس بارے میں ان سے کہا تو فرمایا: ''أَلَا أَكْتَفِي إِذْ كُفِيتُ''، یعنی کیا میں کفایت نہ کروں جبکہ میں کفایت کیا گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ خیاط تھے۔ کسی نے کہا: نجار تھے۔ کسی نے کہا: راعی (چرواہ) تھے۔ امام واقدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں قاضی تھے۔ [2] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کیا تم جانتے ہو کہ لقمان کیا تھا؟ صحابہ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: حبشی تھے۔ [3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِتَّخِذُوا السُّوْدَانَ» یعنی سودان کو اختیار کرو، کیوں کہ ان میں سے تین آدمی اہلِ جنت کے سردار ہیں: لقمان حکیم اور نجاشی اور بلال موذن۔ [4] (أخرجه

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٨٠۔ ٥٨٢) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٥٨) فتح القدير (٤/ ٣١٢) [3] الدر المنثور (٦/ ٥٠٩)

[4] المعجم الكبير (١١/ ١٩٨) الدر المنثور (٦/ ٥٠٩) اس کی سند میں ''ابین بن سفیان'' سخت ضعیف راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٨٧)

الطبراني وابن حبان في الضعفاء وابن عساكر قال الطبراني: أراد الحبشة)۔ جو حکمت اللہ تعالیٰ نے لقمان کو عطا فرمائی تھی، وہ فقہ وعقل اور قول میں اصابت ہے، یعنی بات کا درست ہونا ہے۔ اور جو شخص ان کی نبوت کا قائل ہے اس نے حکمت کی تفسیر نبوت کے ساتھ کی ہے۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حکمت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ غیر نبوت میں عقل وفہم وفطنت مراد ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لقمان حکیم کہا کرتا تھا: "إِنَّ اللّٰهَ إِذَا اسْتُوْدِعَ شَيْئًا حَفِظَهُ"، یعنی بے شک جب کوئی شے اللہ کے پاس ودیعت رکھی جاتی ہے تو وہ اس کو محفوظ رکھتا ہے۔[2] (أخرجه أحمد و الحكيم الترمذي و الحاكم في الكنىٰ والبيهقي في الشعب)

اہلِ حدیث کی ایک جماعت نے صحابہ وتابعین کی ایک جماعت سے روایتیں بیان کیں، ان میں لقمان کے مواعظ اور حکمتیں شامل ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان میں سے کوئی شے روایت صحیح نہیں ہوئی اور نہ ان میں سے کسی شے کا اسناد لقمان تک صحیح ثابت ہوا کہ ہم اس کو قبول کرلیں۔ لقمان نے جو نصیحتیں اپنے فرزند کو کیں، ان میں سے اللہ پاک نے جس کا بیان فرمایا ہے، وہ یہی ہے جو اس جگہ نقل کیا ہے، وہ کافی ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ اس قبیل سے ہے جو صحیح نہیں ہوا ہے، چنانچہ اس کے ذکر کرنے میں صرف حیز کا مشغول کرنا ہے اور وقت ضائع کرنا ہے اور وہ کوئی نبی نہ تھے کہ جو کچھ اُن سے منقول ہو تو من جملہ شرعی احکام کے ہو، جس کو ہم قبول کریں اور نہ جو کلمات ان سے مروی ہیں، ان کی اسناد صحیح ہوئی ہے، یہاں تک کہ ان کا ذکر کرنا تدوینِ کلامِ حکمت سے ہو، کون سی حکمت جو مومن کی گمشدہ چیز ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ﴾ میں کلمہ ﴿ اَنْ ﴾ مفسرہ ہے، اس لیے کہ "إيتاء" میں قول کے معنی ہیں، اس لیے کہ قول تعلیم ہے یا وحی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "قُلْنَا لَهُ هٰذَا الْقَوْلَ"، امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "لِأَنْ أَشْكُرَ"[3] کسی نے کہا: "بِأَنْ أَشْكُرَ"، یعنی ہم نے لقمان سے یہ کہا کہ تو شکر کر اللہ کے لیے، چنانچہ اس نے کیا تو اپنے شکر کے سبب سے حکیم اور دانش مند ہوگیا۔ شکر اللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی ثنا کرنا اس کی نعمت پر اور اس شے میں اس کی اطاعت کرنا جس کا اس نے حکم دیا ہے۔ کسی نے کہا: شکر یہ ہے کہ تو اس کی نعمتوں کے ساتھ اس کی نافرمانی نہ کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی نعمتوں میں اس کے ساتھ کسی اور شریک کو نہ دیکھے۔ کسی نے کہا کہ شکر یہ ہے کہ اپنے عجز کا اقرار کرے اور یہ ہر چیز میں اپنی عاجزی کا اظہار کرنا اور ہر چیز کو قبول کرنا ہے۔

[1] الدر المنثور (٦/ ٥١٠)

[2] مسند أحمد (٢/ ٨٧) شعب الإيمان (٣/ ٢١١) اس کی سند میں "ابو غالب" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣١٩١) البتہ یہ روایت لقمان حکیم کے ذکر کے بغیر صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ٢٥٤٧)

[3] معاني القرآن (٤/ ١٩٥)

از دست وزبان . کہ برآید | کز عہدۂ شکرش بدر آید

''وہ کون ہے جو اپنے ہاتھوں اور زبان سے اس (اللہ) کے شکر سے عہدہ برا ہو سکے؟!''

بندہ ہمان بہ کہ ز تقصیرِ خویش | عذر بدرگاہ خدائے آورد

''آدمی وہی بہتر ہے جو اپنی خطا پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معذرت کرتا ہے۔''

پھر اللہ پاک نے یہ بیان فرمایا کہ شکر سے شاکر ہی کو فائدہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا نفع اور ثواب اسی کی طرف رجوع کرتا ہے، اس کا فائدہ اسی کو حاصل ہوتا ہے، کیوں کہ شکر کے سبب سے نعمت باقی رہتی ہے اور اس کی زیادتی اللہ سے طلب کی جاتی ہے۔ جملہ ﴿ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ﴾ مستانفہ ہے۔ مضمونِ ماقبل کا مقرر ہے۔ حکم کی بجا آوری کا موجب ہے۔ ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو کوئی نعمت کا شکر کرنے کے بجائے ناشکری کرے تو بے شک اللہ پاک اس کے شکر سے غنی ہے، اس کا محتاج نہیں ہے۔ اپنی خلق سے حمد وثنا کا مستحق ہے، اس لیے کہ اس نے ان پر ایسی نعمتوں کا انعام فرمایا ہے جس کی قدر کا احاطہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کی حمد کوئی نہ کرے تو بے شک نہ کرے، اس کی حمد تو ہر موجود شے زبانِ حال سے کرتی ہے۔

یحییٰ ابن سلام نے کہا ہے کہ وہ اپنی خلق سے غنی ہے اور اپنے فعل میں حمید ہے۔[1]

نہ بلبل برگلش تسبیح خوانیست | کہ ہر خارے بہ تسبیحش زبانی ست

''باغ میں بلبل ہی (اللہ کی) پاکی بیان کرنے والی نہیں ہے، بلکہ ہر کانٹا اس کی تسبیح بیان کرنے کے لیے ایک زبان کی حیثیت رکھتا ہے۔''

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۣ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝۱۴ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۵

اور (یاد کریں) جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا، جب کہ وہ نصیحت کر رہا تھا: اے میرے

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ٦١) فتح البیان (١٠/ ٢٨١۔ ٢٨٣)

پیارے بیٹے! تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا، بے شک شرک تو بہت بڑا ظلم ہے (13) اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق (حسنِ سلوک کا) حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے (پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری کے باوجود اُٹھائے رکھا اور اس کا دودھ دو سال میں چھڑانا ہوتا ہے، (اور) یہ کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر کر (بالآخر) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے (14) اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے، جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کرنا اور دنیا میں بھلے طریقے سے ان دونوں سے اچھا سلوک کر اور اس شخص کے طریقے کی اتباع کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے، پھر میری ہی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر میں تمھیں بتاؤں گا جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے (15)

لقمان علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو کئی ایک نصیحتیں:

یہ جو ماں باپ کا حق بتایا، یہ کلام بیچ میں اللہ تعالیٰ کا معلوم ہوتا ہے۔ لقمان نے بیٹے کو ماں باپ کا حق نہ بتایا تھا کہ اس سے اپنی غرض معلوم ہوتی، اللہ پاک نے شرک کے پیچھے اور نصیحتوں سے پہلے ماں باپ کا حق فرما دیا کہ اللہ کے حق کے بعد ماں باپ کا حق ہے۔ باپ نے اللہ کا حق بتایا، اللہ نے باپ کا۔ رسول کا اور مرشد کا حق اللہ کے حق کی طرف میں ہے کہ اس کے نائب ہیں۔ اللہ کا شریک نہ مان جو معلوم نہیں، یعنی شبہے میں بھی نہ مان اور یقین سمجھ کر تو کیوں کر مانے۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لقمان نے جو اپنے فرزند کو نصیحت اور وصیت کی ہے، اللہ پاک اس کی خبر دیتا ہے۔ لقمان کے والد کا نام عنقا بن سدون ہے۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے جو قول نقل کیا ہے، اس میں والد کا نام ثاران ہے (اصل روایت میں یوں ہے: "وَاسْمُ أَبِيهِ ثَارَانُ فِيْ قَوْلٍ حَكَاهُ السُّهَيْلِيُّ"، مگر "أبيه" کا لفظ غلط معلوم ہوتا ہے، بجائے "أبيه" کے "ابنه" ہے، یعنی لقمان کے فرزند کا نام ثاران ہے، چنانچہ فتحین سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔[1] واللّٰہ أعلم)۔ اللہ پاک لقمان کا ذکر بہترین ذکر فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت عطا فرمائی اور وہ اپنے فرزندِ دلبند کو وصیت کرتے ہیں۔ کون سا فرزند جس پر سب سے زیادہ شفقت کرتے ہیں اور وہ سب سے زیادہ ان کو محبوب ہے، لہٰذا وہ اس بات کا مستحق ہے کہ جس شے کو وہ جانتے پہچانتے ہیں اس میں سے سب سے بہترین بات اس کو سکھائیں۔

اسی لیے پہلے پہل اس کو یہ وصیت کی کہ اللہ وحدہ کی عبادت کرے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، پھر اس کو شرک سے ڈرایا کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣١٢) فتح البيان (١٠/ ٢٨٣)

ہے کہ جب آیت: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ [الأنعام: ٨٢] ''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا۔'' تو یہ بات اصحابِ رسول اللہ ﷺ پر شاق گزری۔ عرض کی کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّهُ لَيْسَ بِذٰلِكَ » یعنی یہ وہ بات نہیں ہے، کیا تو لقمان کا قول نہیں سنتا ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾۔[1] (ورواه مسلم من حديث الأعمش به)

لقمان نے جو اپنے بیٹے کو اللہ وحدہ کی عبادت کرنے کی وصیت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا ذکر خود فرمایا، جس طرح کہ اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ''اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین سے اچھا سلوک کرو۔'' اللہ سبحانہ قرآن شریف میں اپنی عبادت کا اور والدین کے ساتھ نیکی کا سلوک کرنے کا ذکر ساتھ ساتھ فرماتا ہے۔ اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''مَشَقَّةُ وَهْنِ الْوَلَدِ''[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''جُهْدًا عَلٰى جُهْدٍ''[3] امام عطا خراسانی رحمہ اللہ نے کہا: ''ضُعُفًا عَلٰى ضُعْفٍ''[4] حاصل سب کا ایک ہی ہے۔

بچہ ماں کے پیٹ میں جس قدر بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر اس کو کمزوری اور مشقت بڑھتی جاتی ہے۔ یہ ماں کا حق زیادہ ہونے کا بیان ہے کہ دیکھو اس نے کس مشقت اور ضعف سے بچے کو پیٹ میں رکھا اور اسے لادے لادے پھری، طرح طرح کی تکلیف اور ایذا اٹھائی۔ بچے کو چاہیے کہ ان ساری مشقتوں کا لحاظ کر کے اس کے ساتھ احسان کرے، اپنی جان اور مال اور اچھے برتاؤ سے خدمت کرے اور میٹھی میٹھی باتیں کرے اور کسی طرح کی ایذا دہی کا روادار نہ ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ یعنی جننے کے بعد اس کا پالنا پوسنا پرورش کرنا، دودھ پلانا، پھر دو برس میں دودھ چھڑانا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ [البقرة: ٢٣٣] ''اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں، (یہ حکم) اس شخص کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے۔''

اسی جگہ سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اور ان کے سوا ائمہ نے استنباط کیا ہے کہ حمل کی کم تر مدت چھے مہینے ہیں، کیوں کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں یہ فرمایا ہے: ﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ [الأحقاف: ١٥] ''اور اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ (کی مدت) ہے۔'' اللہ پاک نے جو ماں کی تربیت و پرورش کا اور اس کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٨)
[3] تفسير الطبري (٢٠/ ١٣٧) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٨)

مشقت اور تھکنے کا ذکر کیا ہے کہ وہ رات دن جاگتی ہے، ایذا اٹھاتی ہے، یہ اس لیے کہ پہلا احسان جو ماں کا بیٹے پر گزر چکا ہے، اس کو یاد دلائے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٤] ''اور کہہ: میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جیسے انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔'' اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی تو میرا اور اپنے ماں باپ کا شکر کر مجھی تک لوٹ کر آنا ہے، پس میں ضرور اس پر تجھ کو بھرپور بدلہ دوں گا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن وہب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئے، ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا تو وہ کھڑے ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی۔ پھر کہا: بے شک میں تمھاری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں کہ تم اللہ کو پوجو، اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کرو اور میری اطاعت کرو، میں تم سے کوئی بھلائی کم نہیں کروں گا اور لوٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے اور جنت یا دوزخ میں رہ پڑنا ہے۔ پھر کسی طرح کا کوچ کرنا نہیں ہے اور پھر خلود اور ہمیشگی ہے، پھر موت نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ اِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ﴾ یعنی اگر وہ تجھ پر ہر طرح کی حرص کریں کہ تو ان کے دین پر ان کی پیروی کرے تو تو ان کی اس بات کو مت قبول کر اور یہ قبول نہ کرنا تجھے اس بات میں رکاوٹ نہ بنے کہ تو دنیا میں دستور کے مطابق ان کا مصاحب رہے (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: « وَلَا يَمْنَعُكَ ذٰلِكَ مِنْ أَنْ تُصَاحِبَهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا أَيْ: مُحْسِنًا إِلَيْهِمَا » یعنی تو دنیا میں اس کا مصاحب رہ، اس حال میں کہ تو اُن پر احسان کرنے والا ہو)۔ وہ یہی ہے کہ تو ان سے احسان کرتا رہ، حسنِ سلوک کو مت چھوڑ۔ ﴿ وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ﴾ یعنی اس شخص کی راہ چل جو میری طرف رجوع ہوا، مراد مومنین ہیں۔

سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ﴿ وَ اِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰۤى ... الآية ﴾ میرے بارے میں نازل کی گئی ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ احسان کرنے والا شخص تھا۔ پھر جب میں مسلمان ہوگیا تو اس نے کہا: اے سعد! یہ کیا شے ہے جو میں دیکھ رہی ہوں کہ تو نے نئی نکالی ہے؟ البتہ تو چھوڑ دے اپنے اس دین کو، ورنہ میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی، یہاں تک کہ میں مر جاؤں گی اور تجھے میری وجہ سے عار دلائی جائے گی، پھر تجھ سے کہیں گے: اے اپنی ماں کے قاتل! تو میں نے کہا کہ اماں تو ایسا مت کر، کیوں کہ میں اپنے اس دین کو کسی چیز کے سبب سے نہ چھوڑ دوں گا، پھر وہ ایک دن رات ٹھہری رہی، کھایا نہیں۔ پھر وہ صبح کو اٹھی تو اسے مشقت پہنچی تھی، پھر ایک دن رات اور ٹھہری رہی، کھایا نہیں۔ پھر صبح کو اُٹھی تو اسے تکلیف پہنچی تھی، پھر ایک دن رات اور ٹھہری رہی، کچھ کھاتی نہ تھی۔ پھر صبح کو اٹھی تو اسے سخت تکلیف

پہنچی تھی، پھر جب میں نے دیکھا تو کہا: اماں تم جانتی ہو اللہ کی قسم! اگر تمھاری سو جانیں ہوں، پھر ایک ایک جان کر کے نکلے تو میں اپنے اس دن کو کسی چیز کی وجہ سے نہیں چھوڑوں گا، لہٰذا تم چاہو کھاؤ، چاہو نہ کھاؤ، پھر اس نے کھا لیا۔[1]

فتح البیان کا بیان

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ ﴾ ماقبل پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ”وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ حِيْنَ جَعَلْنَاهُ شَاكِرًا فِيْ نَفْسِهٖ وَحِيْنَ جَعَلْنَاهُ وَاعِظًا لِّغَيْرِهٖ“ یعنی البتہ دی ہم نے لقمان کو حکمت، جب کہ ہم نے اس کو اپنے نفس میں شکر کرنے والا کیا اور جب ہم نے اس کو اپنے غیر کو نصیحت کرنے والا کر دیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ محلِ نصب میں ہے ﴿ اٰتَيْنَا ﴾ سے، یعنی اس کا ظرف ہے۔ معنی یہ ہیں: ”وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ إِذْ قَالَ“ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: میں اس قول کو غلط خیال کرتا ہوں، کیوں کہ یہاں عبارت میں واو ہے، وہ اس معنی سے مانع ہے۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابن جریر اور قتیبی رحمہما اللہ کے قول میں لقمان کے فرزند کا نام ثاران ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشکم ہے۔ امام نقاش رحمہ اللہ نے کہا: انعم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ماتان ہے۔

امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لقمان کا بیٹا اور اُن کی بیوی دونوں کافر تھے، چنانچہ وہ ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ دونوں مسلمان ہو گئے۔[2] اس بات پر قولہ: ﴿ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ دلالت کرتا ہے۔ ﴿ وَهُوَ يَعِظُهٗ ﴾ جملہ حالیہ ہے، یعنی لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا اس حال میں کہ وہ اس سے ایسے مواعظ اور نصیحتوں کے ساتھ خطاب کر رہے تھے جو اس کو توحید پر راغب کریں اور شرک سے اسے باز رکھیں۔ بیٹے کو اس لیے وعظ کرتے تھے کہ انسان کا سب سے بلند مرتبہ یہ ہے کہ وہ خود فی نفسہٖ کامل ہو اور اپنے علاوہ دوسروں کو کامل کرنے والا ہو، اس لیے اپنے بیٹے سے ابتداء کی جو سب سے زیادہ آدمی کے قریب ہوتا ہے۔ چونکہ انسان کو اپنے بیٹے سے انتہا درجے کی شفقت اور محبت ہوتی ہے، خصوصاً نصیحت کرتے وقت شفقت کے اظہار کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، تاکہ نصیحت کو قبول کر لے، اس لیے از راہِ شفقت و محبت اور نصیحت کی قبولیت کے، ”ابن“ کی پیار سے تصغیر کر کے ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ﴾ کہا، یعنی اے میرے ننھے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک مت کر۔ یہ شرک سے منع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کافر تھا، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔

امام خطیب اور خازن رحمہما اللہ نے کہا: پھر وہ اپنے باپ کی طرف رجوع ہوا اور اسلام لایا۔ کسی نے کہا کہ مسلمان تھا، اس کی بنیاد پر شرک سے منع کرنے کی وجہ یہ ہو گی کہ آیندہ زمانے میں اس سے شرک کا وقوع نہ ہو۔ جمہور نے

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٨٢۔ ٥٨٣)
[2] تفسیر القرطبي (١٤/ ٦١)

"بُنَيَّ" کو بکسرِ یائے تحتیہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے باسکانِ یاء اور حفص نے بہ فتحِ یاء پڑھا ہے۔[1] پھر شرک سے منع کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾، یعنی بے شک شرک بڑی ہی بے انصافی ہے، کیوں کہ شرک برابری کرنا ہے درمیان اس شخص کے کہ کوئی نعمت نہیں ہے، مگر اسی کی طرف سے اور اس شخص کے کہ جس کی اصلاً کوئی نعمت ہی نہیں ہے۔ ایسے دو شخصوں کے درمیان برابری کرنا، اس سے بڑھ کر اور کیا بے انصافی ہو گی۔

وعظ کے شروع میں شرک سے منع کیا، اس لیے کہ شرک سے منع کرنا سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس جملے میں اختلاف ہے کہ کس کی طرف سے ہے، کسی نے تو یہ کہا کہ لقمان ہی کے کلام سے ہے تو اس صورت میں ماقبل کی علت ہو گا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کا کلام ہے تو ماقبل سے منقطع ہو گا، اس کی وہ بات تائید کرتی ہے جو صحیح حدیث میں آئی ہے کہ جب آیت: ﴿ وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ [الأنعام: ٨٢] نازل ہوئی تو یہ بات صحابہ پر شاق گزری اور کہا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا؟ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ پس صحابہ کے نفوس خوش ہو گئے۔[2] (اس تائید میں خفا ہے، کیوں کہ انزال صریح اس باب میں نہیں، جس پر استدلال مقصود ہے۔ البتہ اس شخص کا قول مؤید ہے جو اس کو لقمان کا قول قرار دیتا ہے، کیوں کہ احادیثِ صحیحہ مرفوعہ میں اس قول کی صریح نسبت لقمان کی طرف وارد ہے۔ کما مر في عبارة ابن كثير فافهم از مصحح سلمه الله تعالىٰ)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسٰنَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ⑭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑮ ﴾ جملہ معترضہ ہے برطریق استطراد۔ ماقبل میں جو شرک باللہ کی ممانعت گزر چکی ہے، اس کی تاکید کے قصد سے لایا گیا ہے اور اس وصیت کی تفسیر قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ﴾ ہے اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، مفسَّر اور مفسر کے درمیان وہ جملہ معترضہ ہے۔ ماں باپ کے شکر کو جو اللہ کے شکر کے ساتھ ذکر کیا تو اس میں یہ بتانا ہے کہ بیٹے پر دونوں کا حق حقوقِ واجبہ میں سے سب سے بڑا اور سخت ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو اس بات کا حکم کیا ہے کہ ان سے احسان کرے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ ﴾. ﴿ وَهْنٍ ﴾ ضعف اور مشقت کو کہتے ہیں۔ "وَهْنٌ" باب "وَعَدَ" سے ہے: "وَهَنَهُ غَيْرُهُ" لازم و متعدی ہے اس سے بابِ افعال و تفعیل بھی آیا ہے۔ "أَوْهَنَهُ ووَهَّنَهُ تَوْهِينًا" بولتے ہیں۔ وہن و موہن کے ایک معنی ہیں: "نحو من نصف الليل"۔ جمہور نے ﴿ وَهْنًا ﴾

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣١٢) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

دونوں جگہ بہ سکونِ ہاء پڑھا ہے اور عیسیٰ ثقفی نے بہ فتحِ ہاء اور یہ روایت ابوعمرو سے ہے۔[1] سکون وفتح دونوں دولغت ہیں، معنی یہ ہیں کہ اس کو اس کی ماں نے اپنے پیٹ میں اٹھایا، اس حال میں کہ ہر دن اس کا ضعف بڑھتا جاتا تھا، کیوں کہ اس کا شکم ہمیشہ بڑھتا جاتا تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”شِدَّةً بَعْدَ شِدَّةٍ وَخَلْقًا بَعْدَ خَلْقٍ“[2] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ عورت ضعیف الخلقت ہے، پھر حمل اس کو ضعیف کر دیتا ہے۔ ﴿وَهْنًا﴾ کا نصب مصدر کی بنا پر ہے، یعنی مفعول مطلق فعل کا مؤکد ہے اور وہ فعل حال ہے۔ ”أَيْ: تَهِنُ وَهْنًا“ اور ﴿عَلٰى وَهْنٍ﴾ صفت ہے مصدر کی۔ ”أَيْ: وَهْنًا كَائِنًا عَلٰى وَهْنٍ“ یعنی وہ اس کو اس حال میں اٹھاتی ہے کہ کمزور ہوتی جاتی ہے، کیوں کہ اس کی کمزوری بڑھتی جاتی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿وَهْنًا﴾ مفعولِ ثانی ہے باسقاطِ حرف ”أَيْ: حَمَلَتْهُ بِضُعْفٍ عَلٰى ضُعْفٍ“[3]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کے اٹھانے کی وجہ سے اسے یہ بات لازم ہوئی کہ وہ دن بہ دن ضعیف ہوتی جاتی ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ عورت جب حاملہ ہوتی ہے تو پے در پے اس پر کمزوری اور مشقت آتی ہے، کیوں کہ حمل ایک ضعف ہے اور دردِ زہ ایک ضعف ہے اور جننا ایک ضعف ہے اور دودھ پلانا ایک ضعف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿وَهْنًا﴾ کا نصب بنا بر حال ہے ﴿أُمُّهٗ﴾ سے۔ ”أَيْ: ذَاتِ وَهْنٍ“ یعنی اس کو اس کی ماں اس حال میں اٹھاتی ہے کہ صاحبِ ضعف ہے ضعف پر، مطلب یہ ہے کہ ضعیف و کمزور ہو ہو کر اس کو اُٹھاتی ہے، یہاں تک کہ جننے کا وقت آتا ہے تو ادھر دردوں کی تکلیف، ادھر پیدا ہونے کی تکلیف، خونِ نفاس کا جاری ہونا، اس کا ضعف، پھر دودھ پلانا۔ یہ تو صحت کی صورت میں ہے، پھر اگر اس حال میں کوئی اور بیماری لگ گئی تو ضعف کا کیا کہنا، ضعف ہی کی بہار ہے۔ غرضیکہ ماں کے ضعف اور تکلیف کو اللہ ہی خوب جانتا ہے جو اس کا خالق ہے اور خود ماں جانتی ہے جس پر یہ ساری تکلیفیں گزرتی ہیں۔ بیٹا کیا جانے کہ اس پر کیا کچھ گزری۔ جب ان کی یہ صورت نظر آئی، اب زور اور قوت آیا تو لگے ماں کو گھرکنے اور نیلی پیلی آنکھیں دکھانے، جورو کی دُم میں گھسنے۔ گویا ماں سے کچھ تعلق ہی نہیں، جو کچھ ہے جورو ہی جورو ہے، اسی کی پوجا ہے، اسی کی خوشی اور ناخوشی میں جنت و دوزخ ہے۔ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِصَالِحِ الْأَعْمَالِ، وَأَجِرْنَا مِنَ الْخِزْيِ وَالنَّكَالِ، وَلِبِرِّ الْوَالِدَيْنِ فِي جَمِيعِ الْأَحْوَالِ آمِينَ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ وَصَحْبِهِ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ.

قولہ تعالیٰ: ﴿وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ ”فِصَالٌ“ بہ معنی ”فِطَامٌ“ ہے۔ ”فِطَامٌ“ یہ ہے کہ بچہ ماں سے جدا کیا جائے، یعنی اس کا دودھ پلانا چھڑا دیں۔ امام جحدری، قتادہ، ابو رجاء، حسن اور یعقوب رحمہم اللہ نے ”فَصْلُهٗ“ پڑھا ہے۔ ”فِصَالٌ“ و ”فَصْلٌ“ دونوں دولغت ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”اِنْفَصَلَ عَنْ كَذَا“ یعنی فلاں فلاں

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٦٣) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٣٧) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ٦٣) [4] معاني القرآن (٤/ ١٩٦)

شے سے متمیز ہوا، اسی معنی سے جب اونٹ کا بچہ ماں سے جدا ہوتا ہے تو اس کو فصیل کہتے ہیں۔[1] ﴿ فِصٰلُهٗ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ اس کی خبر ہے۔ یعنی اس کا دودھ چھڑانا دو برس کا وقت پورا ہونے پر ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ مدتِ رضاع دو برس ہے۔[2]

﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: کلمۂ ﴿ اَنِ ﴾ مصدریہ ہے۔ "أَيْ: بِأَنِ اشْكُرْ لِيْ" یعنی ہم نے اس کو وصیت کی کہ ہمارا شکر کرے اور اپنے ماں باپ کا شکر کرے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ ﴿ اَنِ ﴾ مفسرہ ہے، چنانچہ پہلے اس طرف اشارہ ہو چکا ہے، یعنی ہم نے اس کو یہ وصیت کی کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا شکر کر۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا: جس نے پانچوں نمازیں پڑھیں تو واقعی اس نے اللہ کا شکر کیا اور جس نے پانچوں نمازوں کے بعد اپنے ماں باپ کے لیے دعا کی تو اس نے واقعی اپنے والدین کا شکر کیا۔[3] قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ حکم کی بجا آوری کے واجب ہونے کی تعلیل، یعنی وجہ ہے، یعنی تم پر اس حکم کی بجا آوری کرنا واجب ہے، اس لیے کہ لوٹ کر میری طرف آنا ہے، نہ کہ میرے علاوہ کسی کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ میری طرف پھر آنے کے وقت اس کی جزا دینا مجھ پر واجب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ اس پر اڑ جائیں کہ تو میرے ساتھ اس شے کو شریک کرے جس کی شرکت کا تجھ کو علم نہیں ہے تو ﴿ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾، یعنی تو اس بارے میں ان کی اطاعت مت کر، کیوں کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کچھ اطاعت نہیں ہے۔ ﴿ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ کی قید واقع کے مطابق ہے اور اس کا کوئی مفہوم مخالف نہیں ہے، کیوں کہ اللہ کے لیے کوئی شریک نہیں ہے کہ اس کا علم ہو، اس لیے کہ وہ محال ہے۔ اس بارے میں مجمل بات یہ ہے کہ کسی کبیرہ گناہ کے ارتکاب میں یا کسی عین فرض چیز کے ترک کرنے میں ماں باپ کی فرماں برداری نہیں کی جاسکتی۔ مباحات میں ان کی اطاعت لازمی ہے۔ اس آیت کی تفسیر اور شانِ نزول سورۃ العنکبوت میں گزر چکی ہے۔[4] امام ابو یعلیٰ، طبرانی، ابن مردویہ اور ابن عساکر رحمہم اللہ نے ابو عثمان نہدی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، اسی طرح امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے،[5] مفسرین کی ایک جماعت بھی اسی پر ہے۔

﴿ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ﴾۔ ﴿ مَعْرُوْفًا ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ "أَيْ: وَصَاحِبْهُمَا صِحَابًا مَعْرُوْفًا" یعنی ساتھ دے ان کا دستور کا ساتھ دینا۔ کسی نے کہا: بہ نزعِ خافض منصوب ہے، یعنی "بِمَعْرُوْفٍ"۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے: "أَيْ: فِيْ أُمُوْرِهِمَا الَّتِيْ لَا تَتَعَلَّقُ بِالدِّيْنِ مَا دُمْتَ

---

(1) فتح القدير (٤/ ٣١٣) (2) تفسير البيضاوي (٤/ ٣٤٧) (3) تفسير القرطبي (١٤/ ٦٤)
(4) رقم الآية (٨) (5) الدر المنثور (٦/ ٥٢١_ ٥٢٢)

حَيًّا مَعْرُوْفًا بِبِرِّهِمَا إِنْ كَانَا عَلٰى دِيْنٍ يُقِرَّانِ عَلَيْهِ وَمُعَامَلَتُهُمَا بِالْحِلْمِ وَالْاِحْتِمَالِ وَمَا تَقْتَضِيْهِ مُكَارِمُ الْأَخْلَاقِ وَمَعَالِي الشِّيَمِ" یعنی تو دنیا کے کاموں میں جو دین سے متعلق نہیں ہیں ان کا ساتھ دے، جب تک کہ تو زندہ ہو دستور کے مطابق، اس طرح سے ساتھ دینا کہ تو ان کے ساتھ حلم اور برداشت کا معاملہ رکھے اور مکارم اخلاق اور عالی خصلتیں، جس شئے کا تقاضا کریں تو ان سے ویسا برتاؤ کرے۔

﴿وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾ یہ سارے مکلفوں کو خطاب ہے۔ یعنی اے مکلّف! تو اس شخص کے دین کی پیروی کر جو میرے صالح بندوں میں سے میری اطاعت کی طرف رجوع ہوا اور متوجہ ہوا توبہ اور اخلاص کے ساتھ۔ مراد نبی اکرم ﷺ ہیں اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم۔ کسی نے کہا: مراد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ اس وقت ہوا کہ ابوبکر صدیق اسلام لائے تو ان کے پاس سیدنا عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم آئے اور ان سے کہا: تو نے اس شخص کی تصدیق کر لی اور اس پر ایمان لے آیا؟ کہا: ہاں، بے شک وہ سچا ہے، چنانچہ تم بھی اس پر ایمان لے آؤ۔ پھر ان کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے آئے، یہاں تک کہ وہ مسلمان ہوگئے، چنانچہ ان لوگوں کے لیے سابقۂ اسلام ہے، یہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغ سے اسلام لائے۔[1]

﴿ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ﴾ پھر میری ہی طرف تم سب کا لوٹ کر آنا ہے نہ کہ میرے غیر کی طرف۔ یعنی تیرا اور تیرے باپ کا اور اس کا جو میری طرف رجوع ہوا، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ ﴿فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ یعنی پھر جب تم میری طرف رجوع کر آؤ گے تو تم کو ہر خیر یا شر کی خبر دوں گا جو تم کرتے تھے، پھر ہر عامل کو اس کے عمل کی جزا دوں گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ﴾ سے لے کر یہاں تک لقمان کے کلام سے ہے۔ اس صورت میں جملہ معترضہ نہ ہوگا، لیکن اس قول میں بُعد ہے، پکی بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہے۔ پھر اللہ پاک نے لقمان کے بقیہ کلام کو بیان فرمایا، جس کو وہ اپنے بیٹے کو وعظ کرتے ہوئے کہتے تھے:[2]

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿16﴾ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿17﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿18﴾ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ

[1] تفسیر البغوي (٦/ ٢٨٨) [2] فتح البیان (١٠/ ٢٨٣۔ ٢٨٦)

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝

اے میرے (پیارے) بیٹے! بے شک اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو اور وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں اور زمین کے اندر کہیں بھی ہو تو اللہ اسے نکال لائے گا، بلاشبہ اللہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے⑯ اے میرے (پیارے) بیٹے! تو نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور جو تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کر، بے شک یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے⑰ اور تو تکبر وغرور سے اپنے رخسار کو لوگوں سے نہ پھیر، اور زمین پر اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ ہر مغرور، ڈینگیں مارنے والے کو پسند نہیں کرتا⑱ اور تو اپنی چال درمیانی رکھ اور اپنی آواز دھیمی رکھ، بلاشبہ سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے⑲

اولاد کے حق میں کچھ مزید نصیحتیں:

نماز کے ساتھ زکات نہیں کہی۔ ایسوں کے پاس مال کہاں رہتا ہے۔ گال نہ پھلا، یعنی غرور سے نہ دیکھ۔ انتہٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ وصیتیں نفع بخش ہیں۔ اللہ پاک نے لقمان حکیم سے ان کو نقل فرمایا ہے، تاکہ لوگ ان کی پیروی کریں اور اقتدا کریں۔ چنانچہ کہا: ﴿ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ ﴾ یعنی بے شک مظلمہ یا خطیۂ اگر رائی کے دانے کے برابر ہو۔ ﴿ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ﴾ اللہ اس کو قیامت کے دن حاضر کرے گا، جبکہ عدل کا ترازو رکھے گا اور اس پر جزا دے گا، خیر ہے تو اچھی جزا اور شر ہے تو بری جزا۔ بعض نے جائز رکھا ہے کہ ﴿ اِنَّهَآ ﴾ کی ضمیر شان اور قصہ کی ضمیر ہو اور اس کی بنا پر ﴿ مِثْقَالَ ﴾ کا رفع جائز رکھا ہے، لیکن قولِ اول زیادہ صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام میں فرمایا ہے: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـــًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤٧] ''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا تو ہم اسے (تولنے کے لیے) لے آئیں گے، اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ٧۔ ٨] ''لہٰذا جس نے ذرہ بھر بھلائی کی، وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔'' اگر چہ وہ ذرہ کسی سخت پتھر میں محفوظ اور چھپا ہوا ہو، یا آسمان اور زمین کے کناروں میں جا کر کہیں غائب ہو گیا ہو تو اللہ پاک اس کو لے آئے گا، کیوں کہ اس پر تو کوئی پوشیدہ شے مخفی ہے اور نہ ہی ذرہ برابر کوئی چیز آسمانوں اور زمین میں اس سے غائب ہے۔

اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ لطیف العلم ہے۔ اس کا علم انتہائی باریک ہے، کوئی شے اس سے پوشیدہ نہیں رہتی، گو وہ بہت چھوٹی اور باریک اور کمزور ہو اور وہ اندھیری رات میں چیونٹی کی چال سے خبردار ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ﴿ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ ﴾ سے وہ پتھر مراد ہے جو ساتوں زمینوں کے نیچے ہے۔ (و ذكره السدي بإسناده ذلك المطروق عن ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہ وجماعة من الصحابة إن صح ذلك)

امام عطیہ عوفی، ابو مالک، ثوری اور منہال بن عمرو رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی یہ مروی ہے۔[1] واللّٰه أعلم۔ گویا یہ اسرائیلیات سے اخذ کیا گیا ہے، جن کی نہ تصدیق کی جاتی ہے نہ تکذیب۔ واللّٰه أعلم۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ دانہ اپنی کمی کے باوجود اگرچہ کسی پتھر کے اندر ہی کیوں نہ ہو، اللہ پاک اپنے لطیف علم سے اس کو ظاہر کر دے گا، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور وہ راوی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی عمل کرے کسی سخت پتھر میں، جس کا نہ کوئی دروازہ ہو نہ کوئی سوراخ تو البتہ اس کا عمل کیسا ہی عمل ہو، وہ لوگوں کے لیے نکلے گا۔[2]

پھر فرمایا: ﴿ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ یعنی اے میرے بیٹے! قائم کر نماز اس کے حدود و فروض اور اوقات کے ساتھ۔ ﴿ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ یعنی حکم کر نیک بات کا اور منع کر بری بات سے اپنی طاقت کے مطابق۔ ﴿ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ﴾ اور صبر کر اس پر جو تجھے پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیک بات کا حکم کرنے والے کو اور بری بات سے روکنے والے کو لوگوں کی طرف سے ایذا ضرور پہنچتی ہے، اس لیے اس کو صبر کرنے کا حکم دیا۔ قولہ: ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ یعنی لوگوں کی ایذا پر صبر کرنا ہمت کے کاموں سے ہے۔

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ ﴾ یعنی جبکہ تو لوگوں سے یا وہ تجھ سے باتیں کریں تو اپنی طرف سے ان کو حقیر جان کر اور ان پر تکبر کر کے اپنے منہ کے ساتھ ان سے اعراض مت کر، بلکہ اپنی جانب ان کے لیے نرم کر اور اپنا چہرہ ان کی طرف کشادہ کر۔ تکبر کے مارے منہ موڑ کر ان سے بات چیت مت کر، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے: «وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ وَوَجْهُكَ إِلَيْهِ مُنْبَسِطٌ» یعنی اگرچہ تو ملے اپنے بھائی سے اس حال میں کہ تیرا چہرہ اس کی طرف منبسط اور کشادہ ہو، اور تو ازار کو لٹکانے سے بچ، کیوں کہ وہ مخیلہ سے ہے، یعنی تکبر سے ہے اور مخیلہ کو اللہ دوست نہیں رکھتا۔[3] علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ تو تکبر مت کر کہ اللہ کے بندوں کو حقیر جانے اور جب وہ تجھ سے بات کریں تو تو اپنا چہرہ ان سے پھیر لے، اسی طرح امام عوفی اور عکرمہ رحمہما اللہ نے ان سے

---

(1) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٨٣۔ ٥٨٤)

(2) مسند أحمد (٣/ ٢٨) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٨٠٧)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٨٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١١٠٩)

روایت کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ تو اس حال میں کلام مت کر کہ تو اعراض کرنے والا ہو۔

اسی طرح امام مجاہد، عکرمہ، یزید بن الاصم، ابو الجوزاء، سعید بن جبیر، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی مروی ہے۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد تشدیق فی الکلام ہے، یعنی فصاحت سے بنا بنا کر بے احتیاطی کے ساتھ باتیں کرنا۔ پہلا قول صحیح ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "صعر" کی اصل یہ ہے کہ اونٹوں کی گردنوں یا سروں میں ایک بیماری آجاتی ہے، جس سے ان کی گردنیں ان کے سروں سے مڑ جاتی ہیں۔ تکبر کرنے والے مرد کو اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے، گویا متکبر اس اونٹ کی طرح ہے اور اپنے گال کو تکبر کے مارے ٹیڑھا کرتا ہے۔ اس بارے میں عمرو بن حی تغلبی کا قول ہے:

وَكُنَّا إِذَا الْجَبَّارُ صَعَّرَ خَدَّهُ أَقَمْنَا لَهُ مِنْ مَيْلِهِ فَتَقَوَّمَا[1]

[ہم ہمیشہ سے یوں چلے آتے ہیں کہ جب کوئی جبار مارے تکبر کے ہمارے لیے اپنے گال کو ٹیڑھا کرتا تو ہم اس کا ٹیڑھا پن سیدھا کر دیتے تو وہ سیدھا ہو جاتا]

اور ابو طالب کے شعر میں واقع ہوا ہے:

وَكُنَّا قَدِيمًا لَا نُقِرُّ ظُلَامَةً إِذَا مَا ثَنَوْا صُعْرَ الرُّؤُوسِ نُقِيمُهَا

[شروع سے ہمارا یہ وطیرہ رہا ہے کہ ہم ظلم کو جاری نہیں رہنے دیتے، جب بھی وہ تکبر کی وجہ سے اپنے سروں کو ٹیڑھا کرتے تو ہم انھیں سیدھا کر دیتے]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ "أَيْ: خُيَلَاءَ مُتَكَبِّرًا جَبَّارًا عَنِيدًا" یعنی زمین میں اکڑتا، اِتراتا، تکبر کرتا اور سرکشی کرتا ہوا مت چل۔ ایسا مت کر، وگرنہ اللہ تجھے مبغوض رکھے گا، یعنی تجھ سے بغض رکھے گا، ناراض ہو گا۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ "أَيْ: مُخْتَالٍ مُعْجِبٍ فِي نَفْسِهِ فَخُورٍ عَلَىٰ غَيْرِهِ" یعنی بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر اکڑنے والے کو، جو اپنے جی میں عجب کرتا ہے، غرور کرتا ہے اور دوسروں پر بڑائی مارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٣٧] ''اور زمین پر اکڑ کر مت چل، بلاشبہ تُو نہ تو کبھی زمین پھاڑ سکتا ہے اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچ سکتا ہے۔'' اس پر پہلے کلام گزر چکا ہے۔ حافظ ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کبر کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سختی کی۔

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٤٣۔ ١٤٥) تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٩)

پھر فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ قوم میں سے ایک شخص نے عرض کی: واللہ یا رسول اللہ! بے شک میں دھوتا ہوں اپنے کپڑوں کو تو ان کی سفیدی مجھے اچھی لگتی ہے اور اپنے جوتے کا شراک (شراک بالکسر بندِ نعل از دوال، جوتی کا تسمہ) اور اپنے کوڑے کا علاقہ (علاقہ بالکسر مثل علاقہ کمان و تازیانہ، علاقہ کیس وہ تاگا ہے جس سے کیس کو باندھتے ہیں) مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پس فرمایا: «لَيْسَ ذٰلِكَ الْكِبَرَ، إِنَّمَا الْكِبْرُ أَنْ تُسَفِّهَ الْحَقَّ وَتَغْمِطَ النَّاسَ» یعنی یہ کبر نہیں ہے، کبر تو یہ ہے کہ تو استخفاف کرے حق کا، اس کو خفیف سمجھے اور لوگوں کو حقیر جانے۔[1] (ورواه من طريقة أخرى بمثله وفيه قصة طويلة و مقتل ثابت ووصيته بعد موته)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ ﴾ "أَيْ: اِمْشِ مَشْيًا مُقْتَصِدًا لَيْسَ بِالْبَطِيْءِ الْمُتَثَبِّطِ، وَلَا بِالسَّرِيْعِ الْمُفْرِطِ، بَلْ عَدْلًا وَسَطًا بَيْنَ بَيْنَ" یعنی وہ چال چل جو نہ تو بہت ہی آہستہ ہو اور نہ ہی بہت تیز درجے کی ہو، بلکہ اس کے درمیان ہو۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ﴾ یعنی کلام میں مبالغہ مت کر، یعنی جس بات میں کسی طرح کا فائدہ نہیں ہے اس میں اپنی آواز بلند نہ کر، اسی لیے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴾.

امام مجاہد اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ قبیح اور بری آواز گدھوں کی آواز ہے، یعنی جو شخص اپنی آواز بلند کرتا ہے اس کی غایت یہ ہے کہ وہ اپنی آواز کی بلندی میں گدھوں کے مشابہ ہوتا ہے اور اس کے باوجود وہ اللہ پاک کو مبغوض ہے۔ اس بارے میں گدھوں کے ساتھ جو تشبیہ دی گئی ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ اتنی اونچی آواز نکالنا حرام ہو اور اس کی انتہائی مذمت کی جائے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ، اَلْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَقِيْءُ ثُمَّ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهِ»[2] یعنی ہمارے لیے بری مثال نہیں ہے، اپنے ہبہ میں عود کرنے والا، یعنی ہبہ کی ہوئی چیز کو واپس لینے والا کتے کی طرح ہے کہ قے کرتا ہے، پھر اپنی قے میں رجوع کرتا ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم ﷺ سے راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس وقت تم مرغ کا چیخنا سنو تو اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو اور جب تم گدھے کا رینگنا سنو تو اللہ کی پناہ مانگو شیطان سے، کیوں کہ اس نے کسی شیطان کو دیکھا۔[3] (وقد أخرجه بقية الجماعة سوى ابن ماجه من طرق عن جعفر بن ربيعة به، وفي بعض الألفاظ بالليل فالله أعلم) چنانچہ یہ بہت نفع مند وصیتیں ہیں اور قرآن عظیم کے قصوں سے ہیں اور لقمان حکیم سے مروی ہیں۔ حکمت اور نصیحت کی بہت سی باتیں لقمان سے مروی ہیں۔ لہٰذا چاہیے

---

① المعجم الكبير (٢/ ٦٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کا سماع سیدنا ثابت رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (مجمع الزوائد: ٥/ ٢٣٦)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٢)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٥٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٣٤۔ ٢٣٣)

کہ ان میں سے کچھ بطور نمونہ و دستور بیان کی جائیں:

1 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو خبر دی، فرمایا کہ لقمان حکیم کہا کرتا تھا: "إِنَّ اللّٰهَ إِذَا اسْتُوْدِعَ شَيْئًا حَفِظَهُ"[1] اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

2 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے قاسم بن مخیمرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: لقمان حکیم نے اپنے بیٹے سے کہا اور وہ اسے وعظ کر رہا تھا: "يَا بُنَيَّ! إِيَّاكَ وَالتَّقَنُّعَ فَإِنَّهُ مَخُوفَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَذَمَّةٌ بِالنَّهَارِ"[2] یعنی اے بیٹے! بچ تو قناع ڈالنے سے، یعنی سر پر مقنع مت ڈال، کیوں کہ وہ رات کو خوف کا سبب ہے اور دن کو مذمت کا سبب ہے۔ واللہ أعلم۔ مجمع البحار میں اس کی شرح نہیں ملی۔

3 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سری بن یحییٰ سے روایت کیا ہے کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا: اے بیٹے! بے شک حکمت نے مساکین کو بادشاہوں کی مجلس میں بٹھایا۔ (مصحح مصر نے حاشیہ اصل پر لکھا ہے: قوله: البری بن یحییٰ كذا بالاصل وحرر... انتھیٰ سچ کہا ہے۔ واللہ أعلم۔ یہ کیا نام ہے شاید سری بن یحییٰ بن ایاس بن حرملہ شیبانی ابو الہیثم بصری ہوں، ثابت بن عمرو بن دینار سے روایت کرتے ہیں اور ان سے حماد بن زید و ابن وہب راوی ہیں۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ امام ابن ابی عاصم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ۱۶۷ ہجری میں انتقال ہوا۔ كذا في الخلاصة، واللہ أعلم)۔

4 عون بن عبداللہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا: اے بیٹے! جس وقت تو کسی قوم کی مجلس میں آئے تو اسلام کے تیر سے ان کو مار، یعنی ان پر سلام کر، پھر ان کے کنارے میں بیٹھ جا۔ پھر مت بول یہاں تک کہ تو ان کو دیکھے کہ وہ بولے۔ پھر اگر وہ اللہ کے ذکر میں خوض کریں تو تو اُن کے ساتھ اپنے تیر کو جولانی دے اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کے ذکر میں خوض کریں تو تو ان سے ان کے غیر کی طرف منتقل ہو جا۔[3]

5 حفص بن عمر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رائی کی ایک تھیلی اپنی جانب رکھی اور اپنے بیٹے کو وعظ کرنے لگے ایک نصیحت کرتے اور ایک دانہ رائی کا نکالتے، یہاں تک کہ رائی تمام ہوگئی، پھر کہا: اے بیٹے! البتہ میں نے یقیناً تجھ کو ایسا وعظ کیا کہ اگر وہ وعظ پہاڑ کو کیا جاتا تو وہ پھٹ جاتا، کہا: پھر ان کا بیٹا پھٹ پڑا۔[4]

6 امام طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِتَّخِذُوا السُّوْدَانَ... الخ»[5] یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

---

[1] مسند أحمد (۲/ ۸۷) اس کی سند میں "ابو غالب" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۳۱۹۱) البتہ یہ روایت لقمان حکیم کے ذکر کے بغیر صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ۲۵۴۷)

[2] مستدرك الحاكم (۲/ ۴۴۶) [3] الدر المنثور (۶/ ۵۱۸۔ ۵۱۹) [4] الدر المنثور (۶/ ۵۱۳)

[5] المعجم الكبير (۱۱/ ۱۹۸) اس کی سند میں "ایمن بن سفیان" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۶۸۷)

خمول وتواضع کے بیان میں:

یعنی گمنامی اور فروتنی کے بیان میں لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو وصیت کی ہے، یہ اس سے متعلق ہے۔ حافظ ابوبکر بن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک مستقل کتاب جمع کی ہے، ہم اس میں سے اس کے مقاصد ذکر کرتے ہیں:

① حفص بن عبداللہ بن انس سے روایت کیا ہے، وہ اپنے دادا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں، کہا: میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ فرماتے تھے: «رُبَّ أَشْعَثَ فِيْ طِمْرَيْنِ يُصْفَحُ عَنْ أَبْوَابِ النَّاسِ إِذَا أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ»[1] (صَفَحْتُهُ فُلَانًا وَّأَصْفَحْتُهُ إِذَا سَأَلَكَ فَرَدَدْتَّهُ، كذا في الصراح)۔ "ثم رواه من حديث جعفر بن سليمان عن ثابت وعلي بن زيد عن أنس عن النبي ﷺ فذكره وزاد منهم البراء بن مالك" یعنی بہت سے پریشان بال والے ہیں جو دو چادروں میں ہیں، لوگوں کے دروازوں سے رد کیے جاتے ہیں، جس وقت وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو وہ ان کو سچا کر دے۔

بر درِ میکدہ رندان قلندر باشند کہ ستانند ودہند افسر شاہنشاہی

"شراب خانے کے دروازے پر آزاد لوگ درویش ہوتے ہیں کہ شہنشاہی تاج کا لین دین کرتے ہیں۔"

② ابوبکر بن سہل تمیمی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے تو اچانک سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ملے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے نزدیک رو رہے ہیں۔ پھر معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا: اے معاذ! تجھے کون سی چیز رلاتی ہے؟ کہا کہ ایک حدیث ہے جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، میں نے آپ کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: "إِنَّ الْيَسِيْرَ مِنَ الرِّيَاءِ شِرْكٌ، وَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْأَتْقِيَاءَ الْأَخْفِيَاءَ الْأَثْرِيَاءَ، اَلَّذِيْنَ إِذَا غَابُوْا لَمْ يُفْتَقَدُوْا وَإِذَا حَضَرُوْا لَمْ يُعْرَفُوْا، قُلُوْبُهُمْ مَصَابِيْحُ الْهُدَى، يَنْجُوْنَ مِنْ كُلِّ غَبْرَاءَ مُظْلِمَةٍ"[2] (اصل روایت میں "ينجون" ہی آیا ہے، اور روایتوں میں "يخرجون" ہے۔ "نجا ينجو، نجا" بہ معنی "أسرع" آیا ہے۔ والله أعلم)۔ یعنی بے شک ذرا سی ریا شرک ہے اور بے شک اللہ دوست رکھتا ہے متقی پرہیز گار لوگوں کو جو لوگوں سے چھپے رہتے ہیں، ان سے کنارہ کیے ہوئے ہیں، ان کا مکان مخفی ہے، غنی اور بے نیاز ہیں، جب وہ غائب ہوں تو کوئی ان کی خبر نہ پوچھے اور جب حاضر ہوں تو پہچانے نہ جائیں، دل ان کے ہدایت کے چراغ ہیں، نکلیں گے ہر تاریک زمین سے۔ "غبراء مظلمة" کنایہ ہے ان کے مساکن کے حقیر ہونے سے، یعنی ان کے رہنے بسنے کی جگہ تاریک وغبار آلود

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٥٤) العمجم الأوسط (١/ ٢٦٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٧٣)

② سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٨٩) التواضع والخمول (١/ ٢٨) اس کی سند میں "عیسیٰ بن عبد الرحمٰن" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٩٧٥)

ہے، کیوں کہ جو شے اس کو روشن اور صاف کرے، وہ مفقود ہے۔ یہ لوگ سب سے علاحدہ ہو کر ایک تاریک گوشے میں پڑے ہوئے ہیں، اللہ کی عبادت میں مشغول ہیں، زینت اور آرائش سے مبرا ہیں۔

③ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی کریم ﷺ سے راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «رُبَّ ذِيْ طِمْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ» یعنی بہت سے دو پرانی چادروں والے ہیں کہ ان کی پروا نہیں کی جاتی، اگر وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو البتہ اللہ ان کو سچا کر دے۔ اگر وہ کہیں کہ الٰہی ہم تجھ سے جنت مانگتے ہیں تو البتہ ان کو جنت عطا کر دے اور عطا نہ کرے ان کو دنیا سے کچھ۔[1]

④ سالم بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک میری اُمت سے وہ شخص ہے کہ وہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر آئے اور اس سے دینار کا یا درہم کا یا پیسے کا سوال کرے تو وہ اس کو نہ دے، اور اگر وہ اللہ سے جنت کا سوال کرے تو البتہ وہ اس کو عطا کر دے، اور اگر وہ اس سے دنیا کا سوال کرے تو وہ اس کو نہ دے اور دنیا کو اس سے اس کی ذلت کی وجہ سے نہیں روکا، یعنی وہ دو پرانی چادروں والا ہے، اس کی پروا نہیں کی جاتی۔ اگر قسم کھا بیٹھے اللہ پر تو البتہ اس کو سچا کر دے۔[2] یہ حدیث اس وجہ سے مرسل ہے۔

⑤ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک جنت کے بادشاہوں میں سے ہے ہر پریشان بالوں والا، غبار آلود، دو پرانی چادروں والا، اس کی پروا نہیں کی جاتی، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جس وقت امیر لوگوں کے پاس آنے کا اذن مانگیں تو ان کو اذن نہ دیا جائے اور جب لوگوں سے نکاح کا پیغام کریں تو ان سے نکاح نہ کریں اور جب وہ بات کہیں تو ان کے لیے انصاف نہ کیا جائے اور ان میں سے کسی کی حاجتیں اس کے سینے میں دبی رہ جاتی ہیں۔ وہ ایسا شخص ہے کہ قیامت کے دن اس کا نور اگر بانٹا جائے تو لوگوں کو سما لے۔[3] ("قَالَ: وَأَنْشَدَنِيْ عُمَرُ بْنُ شَبَّةَ عَنِ ابْنِ عَائِشَةَ قَالَ: قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْمُبَارَكِ رحمہ اللہ" یہ کہنے والے ابن ابی الدنیا ہیں یا ابوبکر بن سہل تمیمی۔ واللّٰہ أعلم)۔

أَلَا رُبَّ ذِيْ طِمْرَيْنِ فِيْ مَنْزِلٍ غَدَا ... زَرَابِيُّهُ مَبْثُوْثَةٌ وَنَمَارِقُهُ
قَدِ اطَّرَدَتْ أَنْوَارُهُ حَوْلَ قَصْرِهِ ... وَأَشْرَقَ وَالْتَفَّتْ عَلَيْهِ حَدَائِقُهُ[4]

اس شعر میں اس وقت کا سماں باندھا ہے کہ جس وقت مومن تقی، نقی اور خفی جنت کی عالی منزل میں نازل ہوگا اور اس میں عیش و آرام کرے گا۔ کہتے ہیں: سنتے ہو! کتنے دو پرانی چادروں والے اس عمدہ منزل میں گئے، جس کی مسندیں

① ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ ② التواضع والخمول (۱/ ۱۵) یہ روایت مرسل ہے۔
③ شعب الإیمان (۷/ ۳۳۲) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔
④ التواضع والخمول (۱/ ۲٤)

بچھی ہوئی ہیں اور تکیے صف باندھے ہوئے ہیں، ان کے نور اپنے محل کے گرداگرد پیہم آرہے ہیں اور وہ چمک دمک رہا ہے اور درختوں کی کثرت کی وجہ سے اس کے باغ اس پر لپٹ رہے ہیں۔

6 حدیث عبیداللہ بن زحر عن علی بن زید عن القاسم عن ابی امامہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً مروی ہے: «قَالَ اللّٰهُ: مِنْ أَغْبَطِ أَوْلِيَائِي عِنْدِي مُؤْمِنٌ خَفِيفُ الْحَاذِ ذُوْ حَظٍّ مِنْ صَلَاةٍ، أَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهِ ("أغبط" اسم تفضیل مبنی للمفعول ہے۔ أي: أحق أحبائي أن يغبط به و يتمنى مثل حاله "خفيف الحاذ" أي: الحال و أصله طريقة المتن و هو ما يقع عليه اللبد من ظهر الفرس أي: خفيف الظهر من العيال مف أي من ليس له عيال و كثرة شغل "ذو حظ من الصلاة" أي: يستريح بها مناجيا بالله عن التعب الدنيوية "وأحسن عبادة الله تعالى" تعميم بعد تخصيص "وأطاعه في السر" تفسير لأحسن فصبر على ذلك المذكور "وكان غامضا" أي: خاملا ذليلا لا يعرف "ثم نقد" بالدال من نقدته بأصبع واحد أبعد واحد و هو كالنقر بالراء و يروى به أيضا و المراد ضرب الأنملة على الأنملة أو على الأرض كالمتقلل للشيء أي: يقلل عمره وعدد بواكيه و مبلغ تراثه، وقيل: هو فعل المتعجب من الشيئ، و قيل للتنبيه على أن ما بعده مما يهتم به، وقيل: عجلت منيته أي: يسلم روحه سريعا لقلة تعلقه بالدنيا وغلبة شوقه إلى الآخرة أو أراد أنه قليل مؤن الممات كما كان قليل مؤن الحياة أو كان قبض روحه سريعاً "بواكيه" جمع باكية أي إمراة تبكي على الميت[1] كذا في مجمع البحار) وَأَعْطَاهُ فِيْ السِّرِّ (كذا في الأصل ولكنه أطاعه في السر، والله أعلم)، وَكَانَ غَامِضاً فِيْ النَّاسِ لَا يُشَارُ إِلَيْهِ بِالْأَصَابِعِ أَنْ صَبَرَ عَلٰى ذٰلِكَ، قَالَ: ثُمَّ أَنْفَذَ (كذا في الأصل ولكنه نقد والله أعلم) رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهِ، وَقَالَ: عُجِّلَتْ مَنِيَّتُهُ وَقَلَّ تُرَاثُهُ وَقَلَّتْ بَوَاكِيْهِ»[2]۔ یعنی اللہ پاک نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں سے اس بات کا میرے نزدیک زیادہ مستحق کہ اس پر رشک کیا جائے اور اسی کے حال کی سی تمنا کی جائے، وہ مومن ہے جو خفیف الحال ہے، جس کی پشت عیال داری کے بوجھ سے ہلکی پھلکی ہے، مطلب یہ ہے کہ نہ اس کے اہل وعیال ہیں، نہ زیادہ مصروفیت ہے، وہ بہرہ مند ہے نماز سے، یعنی اس کے ساتھ دنیا کی تکان اور ایذا سے راحت پاتا ہے۔ اپنے رب سے خود دل لگا کر مناجات کرتا ہے۔ اپنے رب

[1] مجمع بحار الأنوار (١/ ٦٠١۔ ٦٠٢)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٤٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١١٧) التواضع والخمول (١/ ٣٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ (ضعيف الجامع: ٩٧٤)

کی اچھی عبادت کی اور خفیہ طور پر اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی۔ مطلب یہ ہے کہ خالص اسی کے لیے کی، جو ریاکاری سے پاک تھی۔ لوگوں میں گمنام اور ذلیل رہا کہ انگلیوں سے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا جاتا ہے، اگر وہ اس سب پر صبر کرے، یعنی قابلِ رشک جب ہی ہے کہ امورِ مذکورہ پر قائم و دائم ہو۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ مارا اور فرمایا جلدی کی گئی موت اس کی اور قلیل ہوئی میراث اس کی (قلت کا اطلاق کثرت کے مقابلے میں ہوتا ہے اور کبھی اس سے مراد عدم (بالکل نہ ہونا) ہوتا ہے) اور قلیل ہوئیں رونے والیاں اس کی، غرضیکہ دنیا سے کچھ تعلق نہ تھا، آخرت ہی کا ذوق وشوق تھا، نہ اہل وعیال تھے نہ مال تھا، جلدی سے موت آگئی، ہلکے پھلکے راحت و آرام سے چل دیے: ؎

تو رہ از کثرت اسباب برخود تنگ میدارے — سبکروحان چو بوی گل فرو بستند محملہا
چوں بوی گل آمدند بر باد سوار — در زیر زمین چو قطرہ ہائے باراں رفتند

"تو مال واسباب کی زیادتی کی وجہ سے راستے میں تنگ ہو رہا ہے۔ بے تعلق خوش خلق آدمیوں نے پھول کی خوشبو کی مانند کجاوہ کو بہت ہلکا رکھا۔ وہ پھول کی خوشبو کی مانند ہوا پر سوار آئے اور زمین کے نیچے بارش کے قطروں کی طرح چلے گئے۔"

کچھ مال نہ تھا کہ میراث بٹے۔ جورو نہیں کہ پایہ پکڑ کر روئے دھوئے، کسی سے جان پہچان نہیں کہ قبر پر آئے جائے، صرف اللہ ہی سے واسطہ ہے، جس نے پیدا کیا، اپنا انس دیا، ساغرِ محبت سے سرشار کیا، دگر ہیچ۔

بر مزارِ ما غریباں نہ چراغے نہ گلے — نہ پر پروانہ باشد نہ صدائے بلبلے
بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا — کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس ست

"میری قبر پر نہ کوئی چراغ جلتا ہے نہ ہی کوئی پھول چڑھاتا ہے اور نہ کوئی پروانہ پر مارتا ہے اور نہ ہی کوئی بلبل چہچہاتی ہے۔ میرے مزار کو ہری گھاس کے سوا کسی نے نہیں چھپایا۔ اجنبیوں کا قبر پوش بس یہی گھاس ہے۔"

(7) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہا: "أَحَبُّ عِبَادِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ الْغُرَبَاءُ" یعنی اللہ کو محبوب ترین عباد اللہ غرباء ہیں۔ عرض کی گئی کہ غرباء کیا ہیں؟ فرمایا: بڑے بھاگنے والے اپنا دین لے کر، قیامت کے دن عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی طرف جمع کیے جائیں گے۔

(8) فضیل بن عیاض رحمہ اللہ سے مروی ہے، فرمایا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندے سے فرمائے گا: کیا میں نے تجھ پر انعام نہیں کیا؟ کیا میں نے تجھ کو عطا نہیں کیا؟ کیا میں نے تیری ستر پوشی نہیں کی؟ کیا میں نے تیرا ذکرِ جمیل نہیں کیا؟ پھر فضیل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر تو اس کی طاقت رکھے کہ پہچانا نہ جائے تو کر

اور کیا ہے تجھ پر کہ تیری ثنا نہ کی جائے، کیا ہے تجھ پر کہ تو لوگوں کے نزدیک مذموم ہو، اللہ کے نزدیک محمود۔[1]

(9) خلیل بن احمد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي عِنْدَكَ مِنْ أَرْفَعِ خَلْقِكَ وَاجْعَلْنِي فِي نَفْسِي مِنْ أَوْضَعِ خَلْقِكَ وَعِنْدَ النَّاسِ مِنْ أَوْسَطِ خَلْقِكَ"[2] الٰہی! تو مجھ کو کر اپنے نزدیک اپنی بلند تر مخلوق سے اور کر مجھ کو میرے جی میں پست تر مخلوق سے اور لوگوں کے نزدیک اپنی اوسط مخلوق سے۔

(10) ابن محیریز رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ ذِكْرًا خَامِلًا"[3] یعنی اے اللہ! میں تجھ سے گمنامی کا سوال کرتا ہوں۔ اس کے بعد ابن ابی الدنیا نے کہا ہے:

شہرت کے بیان میں:

1 امام ابن ابی الدنیا نے بہ سندِ خود سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ راوی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے شر کے لیے یہ کافی ہے، سوائے اس کے جس کو اللہ بچالے، کہ لوگ اس کی طرف اس کے دین اور دنیا کے بارے میں انگلیوں سے اشارہ کریں اور بے شک اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں کی طرف نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔[4] (وروي مثله عن إسحاق بن البهلول عن ابن أبي فديك عن محمد بن عبد الواحد الأخنسي عن عبد الواحد بن أبي كثير عن جابر بن عبد الله مرفوعاً مثله وروي عن الحسن مرسلًا) اس پر حسن رحمہ اللہ سے کسی نے کہا ہے کہ تمھاری طرف تو انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا ہے؟ تو فرمایا کہ مراد وہ شخص ہے جس کی طرف اس کے دین کی بدعت اور دنیا کے فسق کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔[5]

2 سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: "لَا تَبْدَأْ لِأَنْ تَشْتَهِرَ، وَلَا تَرْفَعْ شَخْصَكَ لِتُذْكَرَ، وَتَعَلَّمْ، وَاكْتُمْ، وَاصْمُتْ تَسْلَمْ، تَسُرُّ الْأَبْرَارَ، وَتَغِيظُ الْفُجَّارَ" یعنی ابتداء مت کر اس لیے کہ تو مشہور ہو اور مت بلند کر اپنے شخص کو اس لیے کہ تیرا ذکر کیا جائے اور علم سیکھ اور چھپا اور چپ رہ تو سلامت رہے گا، نیکوں کو خوش کرے گا، اور بدوں کو غیظ میں لائے گا، یا نیک خوش ہوں گے اور بدخفا ہوں گے۔[6]

3 ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے فرمایا: "مَا صَدَقَ اللّٰهَ مَنْ أَحَبَّ الشُّهْرَةَ"، یعنی سچا نہ جانا اللہ کو جس نے شہرت کو دوست رکھا۔

4 ایوب رحمہ اللہ نے فرمایا: " مَا صَدَقَ اللّٰهَ عَبْدٌ إِلَّا سَرَّهُ أَنْ لَّا يُشْعَرَ بِمَكَانِهِ "، یعنی نہیں سچا جانا اللہ کو کسی

---

(1) التواضع والخمول (١/ ٤٢۔ ٤٣) (2) التواضع والخمول (١/ ٤٦) (3) التواضع والخمول (١/ ٤٤)

(4) التواضع والخمول (١/٥٥، ٦١) اس کی سند میں "سنان بن سعد" ضعیف راوی ہے۔ البتہ حدیث کا دوسرا حصہ (بے شک اللہ تمھاری... دیکھتا ہے) صحیح مسلم (رقم الحديث: ٢٥٦٤) میں مروی ہے۔

(5) التواضع والخمول (١/ ٦٢) (6) التواضع والخمول (١/ ٦٤)

بندے نے، مگر اس کو اس بات نے خوش کیا کہ کوئی اس کے مکان کو نہ جانے۔

5 امام محمد بن العلاء رحمہ اللہ نے کہا: "مَنْ أَحَبَّ اللّٰهَ أَحَبَّ أَنْ لَّا يَعْرِفَهُ النَّاسُ"، یعنی جس نے اللہ کو دوست رکھا، اس نے اس بات کو دوست رکھا کہ لوگ اسے نہ پہچانیں۔[1]

6 امام سماک بن سلمہ رحمہ اللہ نے کہا: "إِيَّاكَ وَكَثْرَةَ الْأَخِلَّاءِ"، یعنی بچ تو دوستوں کی کثرت سے۔[2]

7 امام ابان بن عثمان رحمہ اللہ نے کہا: "إِنْ أَحْبَبْتَ أَنْ يَّسْلَمَ إِلَيْكَ دِيْنُكَ فَأَقِلَّ مِنَ الْمَعَارِفِ"[3] یعنی اگر تو اس بات کو محبوب رکھتا ہے کہ تیری طرف تیرا دین صحیح سالم رہے تو پہچان والوں سے کمی کر۔

8 امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کی عادت تھی کہ جس وقت تین آدمیوں سے زیادہ ان کی طرف بیٹھتے تو وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور ان کو چھوڑ جاتے۔[4] اور کہا: "حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَوْفٍ عَنْ أَبِيْ رَجَاءَ"۔ کہا: سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ نے ایک قوم دیکھی کہ وہ ان کے ساتھ چل رہے ہیں تو فرمایا: "ذُبَابُ طَمَعٍ وَّفَرَاشُ النَّارِ"، یعنی طمع کی مکھیاں ہیں اور آگ کے پتنگے ہیں۔

9 ابن ادریس رحمہ اللہ نے کہا: "عَنْ هَارُوْنَ ابْنِ أَبِيْ عَنْزَةَ عَنْ سَلِيْمِ بْنِ حَنْظَلَةَ، قَالَ: بَيْنَا نَحْنُ حَوْلَ أُبَيٍّ إِذْ عَلَاهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ بِالدُّرَّةِ، وَقَالَ: إِنَّهَا مَذَلَّةٌ لِّلتَّابِعِ وَفِتْنَةٌ لِّلْمَتْبُوْعِ"[5] یعنی سلیم بن حنظلہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے گرد بیٹھے تھے کہ اچانک سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر چڑھ آئے، یعنی ان کے سر کے پاس یکا یک آ کھڑے ہوئے ہاتھ میں دُرہ لیے ہوئے اور فرمانے لگے کہ یہ بیٹھک تابع لوگوں کی ذلت کا سبب ہے اور متبوع کے فتنے کا سبب ہے، کیوں کہ احتمال ہے کہ متبوع کے دل میں تعلّی و تکبر پیدا ہو، جیسے منقول ہے کہ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ درس کے وقت ستون سے ٹک کر نہیں بیٹھتے تھے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا درہ لے کر آنا، اس فعل کی ممانعت کی دلیل ہے، گویا انھوں نے اس فعل کو قابلِ تادیب، یعنی سزا کے قابل سمجھا۔

10 امام ابن عون نے امام حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نکلے تو کچھ لوگ ان کے پیچھے ہو لیے۔ چنانچہ فرمایا: "وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أُغْلِقُ عَلَيْهِ بَابِيْ مَا اتَّبَعَنِيْ مِنْكُمْ رَجُلَانِ"[6] یعنی اللہ کی قسم! اگر تم اس بات کو جان لیتے جس پر میں اپنا دروازہ بند کرتا ہوں تو تم میں سے دو شخص بھی میرے پیچھے نہ چلتے۔

11 امام حماد بن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم جس وقت مجلس پر سے گزرتے اور ہمارے ساتھ ایوب ہوتے، پھر وہ سلام

---

[1] التواضع والخمول (١/ ٦٣۔ ٦٤) [2] التواضع والخمول (١/ ٦٧) [3] التواضع والخمول (١/ ٧٠)

[4] التواضع والخمول (١/ ٧٣) [5] التواضع والخمول (١/ ٧٥۔ ٧٦) [6] التواضع والخمول (١/ ٧٨)

کرتے: ''رَدُّوْا رَدًّا شَدِیْدًا'' [1] یعنی مجلس کے لوگ خوب اچھی طرح سلام کا جواب دیتے، سو یہ ایک نعمت تھی۔
غرض یہ ہے کہ لوگ ایوب کو مکرم و معظم سمجھتے تھے، ان کے سلام کا جواب سب مل کر بڑے اہتمام سے دیتے تھے۔

12 عبدالرزاق رحمہ اللہ نے معمر سے روایت کیا ہے کہ ایوب اپنا کرتا طویل رکھا کرتے تھے، اس بارے میں ان سے کسی نے کہا تو فرمایا کہ پہلے زمانے میں قمیص کے طول میں شہرت تھی اور آج یعنی اس وقت اس کی شہرت تشمیر میں ہے، یعنی اس کا طول کم کرنے میں ہے، یعنی اس لیے میں اس کو طویل رکھتا ہوں۔ ایک بار جوتی بنوائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین شریف کے مطابق، پھر ان کو کئی دن پہنا، پھر ان کو اُتار ڈالا اور کہا: میں دیکھتا نہیں کہ لوگ اس جیسی نعلین پہنتے ہوں۔

13 امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کپڑوں میں سے وہ کپڑا مت پہن، جو فقہا میں مشہور ہے اور نہ وہ جس کے سبب سے بے وقوف لوگ تجھ کو حقیر جانیں۔

14 امام ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا: مکروہ رکھتے تھے (یعنی سلف مراد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ ہیں۔ واللہ أعلم) کپڑوں میں سے عمدہ کپڑوں کو جن کے سبب سے آدمی مشہور ہو جائے اور لوگ اس کی طرف اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور ان ردی کپڑوں کو جن میں حقیر ہو اور اپنے دین کو ذلیل کرے۔

15 ''وَحَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ خِدَاشٍ حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ أَبِيْ حَسْنَةَ صَاحِبِ الزِّيَادِيِّ'' کہا: ہم ابوقلابہ کے پاس تھے کہ اس وقت ان کے پاس ایک شخص آیا۔ ''عَلَيْهِ أَكْسِيَةٌ'' (''أَكْسِيَةٌ''، جمع ''كِسَاءٌ'' بالکسر بہ معنی گلیم ہے، یعنی کمل۔ شاید اس وقت یہ شہرت کا لباس ہوگا، اس لیے اس کی مذمت فرمائی، جس طرح کہ اس وقت بعض لوگ کمل کا لباس پہنتے ہیں، برخلاف عام لباس کے۔ واللہ أعلم) یعنی اس پر چادریں تھیں تو ابو قلابہ نے فرمایا: ''إِيَّاكُمْ وَهٰذَا الْحِمَارَ النَّهَّاقَ'' یعنی تم اس بڑے رینکنے والے گدھے سے بچو۔

16 امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایک قوم نے تکبر کو اپنے دلوں میں اور تواضع کو اپنے کپڑوں میں ٹھہرایا ہے۔ ''فَصَاحِبُ الْكِسَاءِ بِكِسَائِهِ أَعْظَمُ مِنْ صَاحِبِ الْمِطْرَفِ بِمِطْرَفِهِ مَا لَهُمْ تَفَاقَدُوْا'' [2] (''كِسَاءٌ'' تو کمل ہوا اور مطرف۔ واللہ أعلم۔ کیا لباس ہے شاید تہ بر تہ جمائے ہوئے کپڑے کو کہتے ہوں۔ واللہ أعلم۔ ''تَفَاقَدَ الْقَوْمُ'' بہ معنی ''فَقَدَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا'' ہے۔)

17 بعض اخبار میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: کیا ہے تم کو کہ تم میرے پاس اس حال میں آتے ہو کہ تم پر کپڑے تو رہبان کے ہیں اور تمھارے دل بھیڑیوں کے دل ہیں۔ پہنو بادشاہوں کے کپڑے اور اپنے دل خشیت کے ساتھ نرم کرو [3]۔

---

[1] التواضع والخمول (۱/ ۸۳)
[2] التواضع والخمول (۱/ ۸۵۔ ۹۰)
[3] التواضع والخمول (۱/ ۱۹۳) البتہ اس میں ''موسیٰ علیہ السلام'' کے بجائے ''عیسیٰ علیہ السلام'' کا ذکر ہے۔

در عمل کوش وہرچہ خواہی پوش تاج بر سر نہ و علم بردوش

''عمل کی کوشش کر اور جو چاہے پہن۔ سر پر تاج رکھ اور کندھوں پر علم۔''

حسنِ خلق کے بیان میں:

1 ابو التیاح نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ''كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ خُلُقًا'' [1] یعنی رسول اللہ ﷺ اخلاق کے لحاظ سے بہترین انسان تھے۔ آپ کا حسنِ خلق سب سے بڑھا ہوا تھا۔

2 امام عطا رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، عرض کی: یا رسول اللہ! مومنین میں سے کون افضل ہے؟ فرمایا: جو ازروئے اخلاق ان میں بہترین ہو۔ [2]

3 نوح بن عباد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، بے شک ایک بندہ اپنی کم عبادت کے باوجود اپنے حسنِ خلق کے سبب سے آخرت کے درجے اور باعزت مقام حاصل کرتا ہے اور بے شک ایک بندہ جو بڑا عابد ہے اپنی بدخلقی کی وجہ سے جہنم کے نچلے طبقے میں پہنچ جاتا ہے۔ [3]

4 سنان بن ہارون نے عن حمید عن انس مرفوعاً روایت کیا ہے کہ حسنِ خلق دنیا اور آخرت کی بھلائی کو لے گیا۔ [4]

5 مطلب نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بے شک البتہ بندہ اپنے حسنِ خلق کے سبب سے دن کو روزہ رکھنے والے اور رات کو قیام کرنے والے کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ [5]

6 امام ابن ابی الدنیا نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس شے کے متعلق پوچھا گیا جس کی زیادتی لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی تو فرمایا کہ اللہ کا تقویٰ اور اچھا اخلاق۔ اور آپ سے اس شے کے متعلق پوچھا گیا جو اکثر لوگوں کو نار میں داخل کرے گی تو فرمایا: «أَلَا جَوْفَانِ: اَلْفَمُ وَالْفَرْجُ» یعنی منہ (زبان) اور شرم گاہ۔ [6]

7 اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا، آپ ﷺ کے پاس ہر جگہ سے اعرابی آئے تو

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٩) التواضع والخمول (١/ ٢٠٥)

(2) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥٩) التواضع والخمول (١/ ٢٠٧) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ١٦٤)

(3) المعجم الكبير (١/ ٢٦٠) التواضع والخمول (١/ ٢١٣) اس کی سند میں ''نوح بن عباد'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٠٣٠)

(4) المعجم الكبير (٢٣/ ٢٢٢) التواضح والخمول (١/ ٢١٥) اس کی سند میں ''سنان بن ہارون اور عبید بن اسحاق'' ضعیف راوی ہیں۔

(5) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٩٨) التواضع والخمول (١/ ٢١٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٩٥)

(6) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٤٦) التواضع والخمول (١/ ٢١٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٧٧)

عرض کی: یارسول اللہ! انسان کو جو چیزیں عطا کی گئیں، ان میں سب سے بہتر کیا چیز ہے؟ فرمایا: اچھا اخلاق۔[1]

8 امام یعلی بن مملک رحمہ اللہ نے عن ام الدرداء عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہما مرفوعاً روایت کیا ہے، فرمایا کہ ترازوں میں حسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہیں ہے۔[2] (وكذا رواه عطاء عن أم الدرداء رضی اللہ عنہا به)

9 مسروق نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے: «إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا» یعنی تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق بہترین ہیں۔[3]

10 سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک البتہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کے حسنِ خلق پر ایسا ثواب عطا کرتا ہے، جیسا ثواب مجاہد فی سبیل اللہ کو عطا کرتا ہے کہ صبح اور شام اس کا اجر ملتا رہتا ہے۔[4]

11 امام مکحول رحمہ اللہ نے ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: «إِنَّ أَحَبَّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبَكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا أَحَاسِنُكُمْ أَخْلَاقًا وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي مَنْزِلًا فِي الْجَنَّةِ مَسَاوِيكُمْ أَخْلَاقًا، الثَّرْثَارُونَ الْمُتَشَدِّقُونَ الْمُتَفَيْهِقُونَ»[5] (''ثرثرة'' کثرتِ کلام و تردیدِ کلام کو کہتے ہیں۔ وهم الذين يكثرون الكلام تكلفا وخروجا عن الحق وهو إما بدل من مساويك فيلزم أن يكون هذا الأوصاف أسوء الأخلاق لأن البدل كالتمهيد وإما رفع على الذم فيكون أشنع ـ والمتشدقون هم المتوسعون في الكلام بلا احتياط قيل: المراد المستهزئ بالناس يلوي شدقه بهم وعليهم ج هم من يتكلمون على أفواههم تفاضحا وتعظيما لنطقهم والمتفيهقون هم الذين يتوسعون في الكلام ويفتحون به أفواهم. والله أعلم) یعنی مجھے ازروئے مجلس تمھارے سب سے محبوب اور مجھ سے سب سے زیادہ قریب تم میں سے وہ لوگ ہیں، جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں اور تم میں سے سب سے زیادہ مبغوض (جن سے بغض کیا جائے) اور جنت میں ازروئے منزل مجھ سے سب سے زیادہ دور تم میں سے وہ لوگ ہیں، جو بد اخلاق ہیں، جو تکلف کر کے بہت سی باتیں کرتے ہیں اور اپنی باتوں کو بے احتیاطی کے ساتھ وسعت دیتے ہیں، یعنی پھیلاتے ہیں اور احتیاط نہیں کرتے اور متکبر بنتے ہیں۔

---

1. مسند أحمد (٤/ ٢٧٨) التواضع والخمول (١/ ٢١٩) امام البانی رحمہ اللہ نے ''السلسلة الصحيحة'' (رقم الحديث: ٤٣٢) میں بحث کرتے ہوئے یہ روایت لا کر اس کو صحیح کہا ہے۔

2. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٩٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٠٣) التواضع والخمول (١/ ٢٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٧٢١)

3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢١) التواضع والخمول (١/ ٢٢٢)

4. التواضع والخمول (١/ ٢٢٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن ابی سارہ کا سماع سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

5. مسند أحمد (٤/ ١٩٣) التواضع والخمول (١/ ٢٢٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٥٣٥)

12 ابو اویس نے عن محمد بن المنکدر عن جابر مرفوعاً روایت کیا ہے: ''أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَكْمَلِكُمْ إِيمَانًا أَحَاسِنُكُمْ أَخْلَاقًا اَلْمُوَطَّئُونَ أَكْنَافًا اَلَّذِينَ يُؤْلَفُونَ وَيَأْلَفُونَ''[1] (الموطؤن هو مثل أخذ من التوطئة وهي التمهيد والتذليل وفراش وطئ لا يؤذي جنب النائم والأكناف الجوانب أي: من جوانبهم وطيئة يتمكن فيها من يصاحبهم ولا يتأذى ش الموطئون بفتح طاء مفعول التوطئة[2] كذا في مجمع البحار۔ أكنافا بالنون كذا في الأصل وفي مجمع البحار) یعنی کیا میں تم کو تم میں سے کامل تر ایمان والوں کی خبر نہ دوں۔ وہ ہیں جن کے تم میں سے بہترین اخلاق ہیں جن کی جانبین نرم ہیں، ان کے ساتھ رہنے والا ان سے ایذا نہیں پاتا، ان کے ساتھ رہ سکتا ہے، جو لوگوں کو مالوف کر دیتے ہیں اور خود آپ اُلفت کرتے ہیں۔

13 لیث نے عن یزید بن عبداللہ بن اسامہ عن بکر بن ابی الفرات روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «مَا حَسَّنَ اللّٰهُ خَلْقَ رَجُلٍ وَخُلُقَهُ فَتَطْعَمَهُ النَّارُ»[3] یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کی سیرت وصورت حسین نہیں کی، پھر اسے آگ کھائے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کی صورت وشکل اور خلق اچھا ہے، اسے آگ نہ کھائے گی، مگر اس کے ساتھ ایمان کا ہونا ضروری ہے۔

14 عبداللہ بن غالب حدانی نے سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ مومن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہوتیں: بخل اور برا اخلاق۔[4]

15 میمون بن مہران نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے نزدیک بدخلقی سے بڑا گناہ کوئی نہیں ہے، یہ اس لیے کہ بد اخلاق آدمی ایک گناہ سے نکل کر دوسرے میں جا پڑتا ہے۔[5]

16 عبدالرحمٰن بن اسحاق سے روایت کیا ہے، وہ قریش کے ایک شخص سے راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک بدخلقی سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے، بے شک اچھا اخلاق البتہ گناہوں کو ایسے پگھلا دیتا ہے، جیسا کہ سورج برف کو پگھلا دیتا ہے اور بدخلقی عمل کو ایسے خراب کر دیتی ہے، جیسے سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے۔[6]

17 عبداللہ بن ادریس عن ابیہ عن جدہ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں: «إِنَّكُمْ لَا تَسَعُونَ النَّاسَ

---

1. شعب الإيمان (٦/ ٢٧٠) التواضع والخمول (١/ ٢٢٦)
2. مجمع بحار الأنوار (٥/ ٧٦)
3. التواضع والخمول (١/ ٢٢٩) یہ روایت مرسل ہے۔
4. سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٦٢) التواضع والخمول (١/ ٢٣٠) اس کی سند میں ''صدقہ بن موسیٰ'' ضعیف راوی ہے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١١١٩)
5. التواضع والخمول (١/ ٢٣١) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف بھی ہے۔
6. التواضع والخمول (١/ ٢٣٣) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن اسحاق'' ضعیف اور ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

بِأَعْوَانِكُمْ (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن "بِأَمْوَالِكُمْ" معلوم ہوتا ہے، تصحیف قریب قریب ہے۔ واللہ أعلم) وَلٰكِنْ يَسَعُهُمْ مِنْكُمْ بَسْطُ وُجُوْهٍ وَحُسْنُ خُلُقٍ ﴾ یعنی بے شک تم سا نہیں سکتے ہو لوگوں کو اپنے مالوں سے، لیکن سا سکتا ہے ان کو تم سے منہ کا کشادہ کرنا اور حسنِ اخلاق۔

18 محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حُسْنُ الْخُلُقِ عَوْنٌ عَلَى الدِّيْنِ"[1] یعنی حسنِ خلق دین پر مدد ہے۔

تکبر کی مذمت کے بیان میں:

1 علقمہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں دانہ برابر تکبر ہے اور آگ میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہے۔[2]

2 ابراہیم بن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے عن ابی سلمہ عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہے، اللہ اس کو اوندھا کر کے منہ کے بل جہنم میں ڈالے گا۔[3]

3 ایاس بن سلمہ عن ابیہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ایسا شخص جو ہمیشہ اپنے نفس کو لیے جاتا ہے، یعنی اپنی بڑائی ہی کرتا رہتا ہے، ایسا شخص اللہ کے نزدیک جبارین میں لکھا جاتا ہے، پھر اس کو وہ عذاب پہنچے گا جو ان کو پہنچا۔[4]

4 مالک بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک دن سلیمان بن داود علیہما السلام بساط پر سوار ہوئے، یعنی اس فرش پر جس کو جنوں نے ان کے لیے بنایا تھا، دو لاکھ آدمیوں اور دو لاکھ جنوں میں، پھر وہ اوپر کو اٹھائے گئے، یہاں تک کہ انھوں نے آسمان میں فرشتوں کی تسبیح سنی، پھر نیچے لائے گئے، یہاں تک کہ ان کے قدم نے دریا کے پانی کو چھوا، پھر سب نے ایک آواز سنی کہ اگر تمھارے صاحب کے دل میں ایک ذرے کے دانے کے برابر کبر ہوتو وہ اس بلندی سے بھی زیادہ دور تک دھنسا دیا جائے، جس پر وہ بلند کیا گیا۔

5 سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم کو خطبہ سنایا کرتے تو انسان کی ابتدائے پیدایش کا ذکر فرماتے، یہاں تک کہ ہم میں کوئی اپنے نفس کو گندہ سمجھتا کہ دو دفعہ پیشاب کی جگہ سے نکلا ہے۔[5]

6 امام شعبی رحمہ اللہ نے فرمایا: جس شخص نے دو آدمی مار ڈالے تو وہ جبار ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ ﴾[6] [القصص: ١٩]

---

[1] التواضع والخمول (١/ ٢٣٩۔ ٢٤٠)
[2] صحیح مسلم، رقم الحديث (٩١) التواضع والخمول (١/ ٢٤١)
[3] مسند أحمد (٢/ ٢١٥) التواضع والخمول (١/ ٢٤٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ١/ ٢٨٢)
[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٠٠) التواضع والخمول (١/ ٢٣٨) اس کی سند میں "عمر بن راشد" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٩١٤)
[5] التواضع والخمول (١/ ٢٥٠)
[6] التواضع والخمول (١/ ٢٥٣)

’’کیا تو مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے، جیسے تو نے کل ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، تو یہی چاہتا ہے کہ زمین میں بڑا متکبر وسرکش ہو۔‘‘

7 امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابن آدم پر تعجب ہے کہ دن میں دو بار اپنے ہاتھ سے پاخانے کو دھوتا ہے، پھر تکبر کرتا ہے اور جبارِ سمٰوت سے مقابلہ کرتا ہے۔

8 امام ضحاک بن سفیان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، پھر یہ حدیث بیان کی کہ دنیا کی مثال اس شے کے ساتھ بیان کی گئی، جو انسان سے نکلتی ہے، یعنی پاخانہ۔

9 "قال الحسن عن یحییٰ عن أبي، قَالَ: إِنَّ مَطْعَمَ ابْنِ آدَمَ ضُرِبَ مَثَلًا لِلدُّنْيَا وَإِنَّ قَزَحَهُ وَمَلَّحَهُ"[1] (مصحح مصر نے اصل کے حاشیے پر لکھا ہے۔ قوله: وقال الحسن عن یحییٰ إلی قوله: وملحه كذا في النسخ و حري. انتهىٰ. سچ کہتے ہیں: اس میں تصحیف بھی ہے اور عبارت بھی ساقط معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کہ اصل ملے تصحیح ممکن نہیں ہے)۔

10 محمد بن الحسین بن علی جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں، فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے دل میں کبر سے کوئی شے جب داخل ہوتی ہے تو اسی قدر اس کی عقل کم ہو جاتی ہے۔[2]

11 یونس بن عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں ہے سجود کے ساتھ کوئی کبر اور نہیں ہے توحید کے ساتھ کوئی نفاق۔

12 طاؤس رحمہ اللہ نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی طرف دیکھا، ان کے پہلو میں چونکا مارا اور کہا کہ یہ اس شخص کی شان نہیں ہے، جس کے پیٹ میں پاخانہ ہے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز نے معذرت کے انداز سے کہا: اے میرے چچا! میرا تو ہر عضو اس چال پر مارا گیا ہے، یہاں تک کہ میں نے اس کو سیکھا ہے۔[3] امام ابوبکر بن ابی الدنیا رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اُمیہ اپنی اولاد کو مارا کرتے تھے، یہاں تک کہ اس چال کو سیکھیں۔

اختیال (تکبر سے چلنا) کے بیان میں:

1 امام ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے عن ابن بریدہ عن ابیہ مرفوعاً روایت کیا ہے: «مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ» یعنی جو شخص از راہِ تکبر اپنے کپڑے کو کھینچ کر چلے تو اللہ اس کی طرف نظر نہ کرے گا۔[4] (ورواه عن إسحاق ابن إسماعيل عن سفيان عن زيد بن أسلم عن ابن عمر مرفوعاً مثله)

2 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا گیا ہے کہ اللہ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نظر نہ کرے گا جس نے اپنی ازار کھینچی۔ ایک وقت ایک شخص اپنی دو چادروں میں تبختر کر رہا تھا، اس کو اس کے نفس نے فخر میں مبتلا

[1] التواضع والخمول (١/ ٢٥٧_ ٢٥٨) [2] التواضع والخمول (١/ ٢٧٢) [3] التواضع والخمول (١/ ٢٨٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨٥) التواضع والخمول (١/ ٢٨٤_ ٢٨٦)

کر دیا تھا تو اللہ نے اسے زمین میں دھنسا دیا، چنانچہ وہ اس میں روزِ قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔[1] (وروی الزهري عن سالم عن أبيه: بينما رجل... الخ)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ اِنَّهَآ ﴾ کی ضمیر "خَطِيئَةٌ" کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ مروی یوں ہے کہ لقمان کے بیٹے نے لقمان سے کہا تھا کہ اے میرے باپ! اگر میں ایسی جگہ گناہ کروں، جہاں مجھے کوئی نہ دیکھے تو کیا اللہ اس کو جان لے گا؟ اس کے جواب میں لقمان نے کہا: ﴿ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ ﴾ جمہور نے ﴿ تَكُ ﴾ بتائے فوقیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ضمیر راجع ہے "خَطِيئَةٌ" کی طرف، یا مسئلے کی طرف، یا خصلت یا قصے کی طرف اور ﴿ مِثْقَالَ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "تَكُنْ" کی خبر ہے اور اسم اس کا مذکورہ مقدرات میں سے ایک ہے۔ نافع نے برفع "مِثْقَالُ" پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ "تَكُنْ" کا اسم ہے اور "كَانَ" تامہ ہے۔

رہی فعل کی تانیث تو اس لیے کہ ﴿ مِثْقَالَ ﴾ کی اضافت مونث کی طرف ہوئی ہے۔[2] پس بلحاظ مضاف الیہ کے فعل کو مونث ذکر کر دیا ہے اور جملہ شرطیہ ﴿ اِنَّهَآ ﴾ کی ضمیر کا مفسر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ تقدیر یہ ہے: "إِنَّ الَّتِي سَأَلْتَنِي عَنْهَا إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ جِنْسِ الْخَرْدَلِ"[3] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّهَآ ﴾ کی ضمیر نیک وبد خصلت کی طرف راجع ہے، یعنی وہ خطیہ وگناہ، یا وہ خصلت جس کا تو نے مجھ سے سوال کیا ہے، یا وہ فعل نیک وبد اگر ایک رائی کے دانے کے برابر ہو۔ دانۂ خردل کے ساتھ اس لیے تعبیر کی کہ رائی کا دانہ سب دانوں سے زیادہ چھوٹا ہوتا ہے اور اس کی گرانی کا اندازہ حس سے نہیں ہوسکتا اور نہ ہی وہ ترازو کو بھاری کرتا ہے۔ چوں کہ اس جگہ علمِ الٰہی کی لطافت کا بیان منظور ہے اور رائی کا دانہ اپنے خفیف اور صغیر ہونے میں ضرب المثل ہے، اس لیے خاص کر اس کا ذکر کیا۔

پھر اس پر بھی قناعت نہ کی، بلکہ باوجود اس کے ہلکے پن اور چھوٹا ہونے کے اس کے بیانِ خفا میں زیادہ مبالغہ کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ ﴾ یعنی اول تو وہ فی نفسہٖ خفیف وصغیر ہے، پھر وہ کسی پتھر کے اندر ہو، کیوں کہ جب وہ پتھر میں ہوگا تو نہایت خفی جگہ میں انتہائی محفوظ مکان میں ہوگا۔ جمہور نے "تَكُنْ" بہ ضم کاف پڑھا ہے "كَوْنٌ" سے اور جحدری نے بکسرِ کاف وتشدیدِ نون ماخوذ "كَنَّ" سے پڑھا ہے، جس کے معنی شے مغطی ومستور کے ہیں،[4] یعنی پھر وہ دانہ کسی پتھر کے اندر چھپایا ہو۔ اس میں بہ نسبت قراءت جمہور کے زیادہ مبالغہ ہے، کیوں کہ اس میں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨٨) التواضع والخمول (١/ ٢٧٦۔ ٢٧٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٨٣۔ ٥٩٠)

[2] تفسير القرطبي (١٤/ ٦٦) فتح القدير (٤/ ٣١٤) [3] معاني القرآن (٤/ ١٩٧۔ ١٩٨) [4] فتح القدير (٤/ ٣١٤)

تو صرف پتھر کے اندر ہونا ہے اور اس میں پتھر کے اندر مستور و مغطی ہونا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ وہ پتھر ہے، جو نہ آسمانوں میں ہے نہ زمین میں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک صخرہ ساتوں زمینوں کے نیچے ہے، یہ وہی ہے، جس میں فاجروں کے اعمال لکھے جاتے ہیں، یعنی "سِجِّین"۔ آسمان کی سبزی اسی سے ہے،[2] اس کے سوا اور اقوال ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ ﴾ کا مطلب ہے کہ وہ دانہ آسمان و زمین کے قطعات میں سے کسی جگہ میں ہو۔ امام محلی نے کہا: "أَيْ: فِيْ أَخْفَى مَكَانٍ مِنْ ذٰلِكَ"[3] یعنی وہ دانہ پتھر و آسمان و زمین کی کسی خفیہ تر جگہ میں ہو۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صخرے (پتھر) میں خفی تر جگہ یہ ہے کہ اس صخرہ میں ہو جو ساتوں زمینوں کے نیچے ہو اور آسمانوں میں خفیہ تر مکان یہ ہے کہ ان کے سب سے اعلیٰ جگہ میں ہو اور زمین سے خفیہ تر جگہ یہ ہے کہ ان سب سے نیچے ہو۔ ﴿ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ خطیہ (گناہ) کتنا ہی چھوٹا اور ہلکا ہو اور کہیں پر ہو، اللہ پاک قیامت کے دن اس کو حاضر کر دے گا اور اس پر اس کے کرنے والے سے حساب لے گا۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ ﴾ بے شک اللہ بڑا باریک علم والا ہے، اس کے نکال لانے کا اس کو خوب علم ہے، اس سے کوئی چھپی ہوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، بلکہ ہر پوشیدہ چیز کی طرف اس کا علم پہنچتا ہے۔ ﴿ خَبِيْرٌ ﴾ یعنی اس کی جگہ کی اور ہر شے کی اس کو خوب خبر ہے، کوئی شے اس سے غائب نہیں ہوتی۔ آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک چھوٹی بڑی ساری اشیاء کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

پھر اللہ پاک نے لقمان سے نقل کیا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کو حکم کیا کہ نماز کو قائم رکھ اور نیک بات سکھلا اور بری بات سے منع کر اور اس ایذا پر صبر کر جو تجھے اللہ کی ذات کے بارے میں پہنچے، جب تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ یا یہ معنی ہیں کہ جو مصیبتیں اور مشکلات تجھے پہنچیں، ان پر صبر کر، کیوں کہ وہ منح و من وعطایا کے مورث ہوتے ہیں، یعنی مصیبتوں اور مشکلات پر صبر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں اور احسانات عطا ہوتے ہیں۔ ان طاعات کی وجۂ تخصیص یہ ہے کہ یہ عبادات کے اصول ہیں اور ساری خیر و خوبی کے ستون ہیں، اسی لیے یوں فرمایا کہ ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ یعنی یہ طاعاتِ مذکورہ جن کی وصیت کی ہے، یہ ان امور سے ہیں، جن کو اللہ پاک نے عزیمت ٹھہرایا ہے اور اپنے مکلفین بندوں پر اُن کو واجب کیا ہے اور ان کو چھوڑنے کی رخصت نہیں دی۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ وہ حق امور سے ہیں، یعنی ثابت و پختہ کاموں میں سے ہیں، جن کو اللہ نے واجب فرمایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عزم بہ معنی معزوم ہو، یعنی امورِ معزومہ و مقصودہ، یا عزم بہ معنی عازم، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ﴾ [محمد: ٢١] "پھر جب (جہاد کا) قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے۔" یعنی امورِ عازمہ ثابت و پختہ۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرفِ عین صرف حاء سے بدلا جاتا ہے تو عزم و حزم بولتے ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا:

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٤١) [2] تفسیر البغوي (٦/ ٢٨٨) [3] تفسیر الجلالین (١/ ٥٤٢)

احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ یہ امور مکارم اہلِ اخلاق اور عزائم اہلِ حزم سے ہیں، جو راہِ نجات پر گامزن ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس قول کو درست کہا ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ طاعات تمام اُمتوں میں مامور بہا، یعنی لازمی تھے۔

جمہور نے ﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ ﴾ پڑھا ہے اور ابن کثیر، ابن عامر اور عاصم رحمہم اللہ نے "تُصَاعِرْ" پڑھا ہے۔ دونوں کے معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں،[1] ان میں ہر ایک کا رسم الخط مصحفِ امام میں بغیر الف کے ہے۔ "صَعَر" بہ معنی "مَیَل" ہے، جب کوئی اپنے رخسار کو جھکائے تو اس وقت عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: "صَعَّرَ خَدَّهُ وَصَاعَرَ خَدَّهُ"، یعنی اس نے اپنا چہرہ جھکایا اور تکبر کے مارے اعراض کیا۔ معنی یہ ہیں کہ تو لوگوں سے اعراض مت کر تکبر کرتے ہوئے، اسی باب میں شاعر کا قول ہے: ؎

وَكُنَّا إِذَا الْجَبَّارُ صَعَّرَ خَدَّهُ   مَشِيْنَا إِلَيْهِ بِالسُّيُوْفِ نُعَاتِبُهُ

یعنی ہماری یہ عادت تھی کہ جس وقت جبار سرکش متکبر اپنا گال موڑتا تھا اور ہم سے اعراض کرتا تھا تو ہم اس پر عتاب کرتے ہوئے تلواریں لے کر اس کی طرف چلتے تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس شعر کو یوں روایت کیا ہے: ؎

وَكُنَّا إِذَا الْجَبَّارُ صَعَّرَ خَدَّهُ   أَقَمْنَا لَهُ مِنْ مَيْلِهِ فَتَقَوَّمَا[2]

یعنی ہم اس کے میل کو سیدھا کر دیتے تو وہ سیدھا ہو جاتا تھا۔ امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَا تُصَاعِرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ"[3] کے یہ معنی ہیں کہ تو ان سے تکبر کرنے کے لیے اعراض مت کر۔ جس وقت اونٹ کو کوئی بیماری پہنچے، جو اس کی گردن کو موڑ دے تو اس وقت محاورے میں کہتے ہیں: "أَصَابَ الْبَعِيْرَ صَعَرٌ"۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جب تیرے پاس کسی آدمی کا ذکر کیا جائے تو تو اپنی باچھ (چہرے) کو مت موڑ گویا تو اس کو حقیر جانے۔ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَيُّ الشِّدْقِ"[4] (أخرجه الطبراني و ابن عدي و ابن مردويه)

"لَيّ" موڑنے کو کہتے ہیں اور "شِدْق" بالکسر کنج دھان ہے، یعنی باچھ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دو قول مروی ہیں: ایک یہ ہے: "لَا تَتَكَبَّرْ فَتَحْتَقِرَ عِبَادَ اللهِ وَتُعْرِضَ عَنْهُمْ إِذَا كَلَّمُوْكَ"[5] دوسرا یہ ہے کہ یہ وہ شخص ہے کہ جس وقت اس پر سلام کیا جائے تو تکبر کرنے والے کی طرح اپنی گردن موڑ لے۔ حاصل معنی یہ ہیں کہ تو اپنے چہرے سے لوگوں کی طرف انکساری اور عاجزی کے لیے متوجہ ہو اور اپنے چہرے کی جانب اور صفحہ کو ان کی طرف سے مت پھیر جس طرح کہ متکبر لوگ کیا کرتے ہیں، بلکہ فقیر اور امیر تیرے نزدیک برابر ہونے چاہییں۔ پھر اِترا کر چلنے سے منع کیا۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٦٨) فتح القدير (٤/ ٣١٤) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٤٣) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ٦٨)

[4] المعجم الكبير (٤/ ١٧٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه واصل بن السائب وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٨/ ٢١١)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٩٩)

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ "مَرَحٌ" مصدر ہے بہ معنی خیلاء و فرح، اور منصوب ہے بنا بر حال۔ یعنی تکبر اور تجبر کرتا ہوا اِتراتا ہوا زمین میں مت چل۔ مختال اور متکبر اپنی چال میں اِتراتا ہے اور اکڑ کر چلتا ہے، اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ پھر مذکورہ ممانعت کی وجہ یہ بیان کی کہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ کیوں کہ اختیال بہ معنی مرح ہے، یعنی اللہ ہر مختال اور فخور کو دوست نہیں رکھتا۔ فخور وہ ہے جو اپنے مال و دولت اور عزت سے لوگوں پر فخر کرتا ہے، یا اپنے مناقب اور فضائل کو تکبر کے طور پر شمار کرتا ہے، یا اس کے سوا اور چیزوں کو تکبر کے لیے شمار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا کی نعمتیں اس کو اس لیے ملی ہیں کہ اللہ پاک کو اس سے محبت ہے، حالاں کہ اس قسم کا خیال اس کی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے تو کافر اور منکر کو اپنی نعمتیں وافر طور پر عطا فرمائی ہیں۔

چنانچہ ایک عارف کے لائق یہ ہے کہ اللہ کے بندوں پر تکبر نہ کرے۔ رہا اللہ کی نعمتوں کو شکر کے طور پر بیان کرنا تو اس کا حکم تو اس نے خود دیا ہے: ﴿ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ [الضحیٰ: ١١] ''اور اپنے رب کی نعمت کا ذکر کرتے رہیں۔'' پھر اس کو حکم دیا کہ بیچ کی چال چلے: ﴿ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ ﴾ یعنی اپنی چال میں توسط اور میانہ روی اختیار کر۔ قصد وہ چال ہے جو جلدی چلنے اور آہستہ چلنے کے درمیان میں ہے۔ عرب محاورے میں بولتے ہیں: "قَصَدَ فُلَانٌ فِيْ مِشْيَتِهٖ إِذَا مَشٰى مُسْتَوِيًا لَا يَدِبُّ دَبِيْبَ الْمُتَمَاوِتِيْنَ وَلَا يَثِبُ وُثُوْبَ الشَّيَاطِيْنِ" یعنی توسط کیا فلاں نے اپنی چال میں، جبکہ وہ برابر سیدھی چال چلے، نہ کہ چیونٹی کی چال چلے، ان لوگوں کے چلنے کی طرح جو زہد اور عبادت کا اظہار کرنے کے لیے کمزور بنتے ہیں اور نہ جست کرے شیطانوں کے جست کرنے کی طرح۔ (متماوتین یعنی "من تماء ت الرجل إذا أظهر من نفسه التخافت و التضاعف من العبادة والزهد")۔

اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت چلتے تو جلدی فرماتے، چنانچہ ضروری ہے کہ اس جگہ قصد کو اس چال پر محمول کیا جائے جو سرعت میں حد سے تجاوز کرے۔ فتحین میں اسی طرح ہے،[1] لیکن قصد کے یہ معنی ٹھیک نہیں بنتے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب دبیب مذموم ٹھہری اور سرعت ثابت ہوئی تو ضروری ہوا کہ یہاں قصد سے مراد یہ ہے کہ سرعت و آہستگی میں حد سے تجاوز نہ کرے، بلکہ درمیان درمیان میں ہو، نہ انتہائی درجے کی تیز رفتار نہ انتہائی درجے کی آہستہ رفتار، جیسا کہ کہا گیا ہے۔ ع كِلَا جَانِبَيْ قَصْدِ الْأُمُوْرِ ذَمِيْمٌ

''میانہ روی کے دونوں کنارے قابلِ مذمت ہے۔''

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: "لَا تَخْتَلْ فِيْ مِشْيَتِكَ"[2] یعنی اپنی چال میں تکبر مت کر۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "كَانُوْا يُنْهَوْنَ عَنْ خَبَبِ الْيَهُوْدِ وَدَبِيْبِ النَّصَارٰى" یعنی صحابہ کو یہود کی طرح تیز چلنے اور نصاریٰ کی طرح سست چلنے سے منع کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے درمیان کی چال چلنا۔[3] امام عطاء رحمہ اللہ

[1] فتح القدير (٤/ ٣١٥) فتح البيان (١٠/ ٢٨٨) [2] فتح القدير (٤/ ٣١٥) [3] روح المعاني (٢١/ ٩١)

نے کہا: "اِمْشِ بِالسَّكِيْنَةِ وَالْوَقَارِ"[1] یعنی سکینت اور بردباری سے چل۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ [الفرقان: ٦٣] ''وہ زمین پر آہستگی (وقار اور عاجزی) سے چلتے ہیں۔'' کسی نے کہا ہے کہ تواضع اور فروتنی کرتا ہوا اپنے دونوں قدموں کی جگہ پر نظر کر۔ صوفیائے کرام کے ہاں جو نظر بر قدم ہے، وہ اسی باب سے ہے۔

پھر آواز کو پست کرنے کا حکم دیا کہ ﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ یعنی کم کر اپنی آواز سے اور اس کو پست کر اور اس کو بلند کرنے کا تکلف مت کر، کیوں کہ ضرورت سے زیادہ اونچی آواز سننے والے کو تکلیف دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی آواز کو پست ہے جاہلیت کے لوگوں کی تعریف کی جاتی تھی، جب وہ آواز بلند کرتے تھے۔ کلمۂ ﴿مِنْ﴾ تبعیضیہ ہے اور امام اخفش رحمہ اللہ کے نزدیک زائدہ ہے۔[2] اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس کی تائید کرتا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ﴾ [الحجرات: ٣] ''بلاشبہہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں۔''

پھر اس حکم کی وجہ یہ بیان کی کہ ﴿اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ یعنی آواز پست کر اپنی، اس لیے کہ تمام آوازوں سے قبیح آواز گدھوں کی آواز ہے۔ امرِ مذکور کی یہ وجہ زیادہ موثر اور تاکیدی طور پر ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی آوازیں بلند کرتے ہیں، ان کی تشبیہ گدھوں کے ساتھ دی اور اُن کی آوازوں کو گدھے کی آواز کے ساتھ تشبیہ دی اور آواز کو بلند کرنے سے شدید نفرت دلائی ہے۔[3] كذا يفهم من أبي السعود)۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ قبیح آواز گدھوں کی آواز ہے۔ اس کا شروع زفیر ہے، یعنی آواز قوی اور اس کا آخر شہیق ہے،[4] یعنی ضعیف آواز، یہ دونوں آوازیں دوزخ والوں کی ہیں۔ ﴿اَنْكَرَ﴾ کو کہا ہے کہ یہ فعل مجہول سے بنایا گیا ہے "أَشْغَلُ مِنْ ذَاتِ النِّحْيَيْنِ" کی طرح، اور یہ مختلف فیہ ہے۔ ("نحی" بالکسر مشک روغن کو کہتے ہیں یہ تیم اللہ بن ثعلبہ کے قبیلے کی جاہلیت کے زمانے میں ایک عورت تھی، جو گھی بیچا کرتی تھی، چنانچہ وہ گھی کی دو مشکیں لائی، اس کے پاس خوات بن جبیر نامی انصار کا ایک شخص آیا، اس سے اس کی قیمت طے کی، پھر اس عورت نے ایک بھری ہوئی مشک کھولی۔ انصاری نے کہا: تو اس کو پکڑ یہاں تک کہ میں دوسری کو دیکھوں، پھر دوسری مشک کھولی اور اس سے کہا: اس کو پکڑ، پھر جب اس کے دونوں بازوؤں کو مشغول کر دیا تو اس پر جست کی، پھر اپنی خواہشِ نفسانی اس سے پوری کی اور بھاگ گیا، پھر وہ انصاری مسلمان ہو گیا اور جنگِ بدر میں حاضر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: اے خوات! تیرا خریدنا کیسا تھا اور آپ نے تبسم فرمایا تو اس نے عرض کی: "قَدْ رَزَقَ اللّٰهُ خَيْرًا وَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْحَوَرِ بَعْدَ الْكَوَرِ" یعنی اللہ نے مجھ کو خیر عطا فرمائی اور میں اللہ کے ساتھ زیادتی کے بعد نقصان سے پناہ مانگتا ہوں)۔

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تاویل اس کی یہ ہے کہ آواز کو بلند کرنا اچھا نہیں ہے اور وہ صوتِ منکر کے باب

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣١٥)
[2] اللباب في علوم الكتاب (١٥/ ٤٥١)
[3] تفسير أبي السعود (٧/ ٧٣)
[4] تفسير الطبري (٢٠/ ١٤٦)

میں داخل ہے، اور حرفِ لام تاکید کے لیے ہے۔ رہی یہ بات کہ صوت کو مفرد ذکر کیا اس کے باوجود کہ جمع کی طرف مضاف ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صوت مصدر ہے "صَاتَ يَصُوْتُ صَوْتًا فَهُوَ صَائِتٌ"[1] کا اور دال ہے کثرت پر۔ کسی نے کہا ہے کہ مفرد لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس جنس کے آحاد سے ہر واحد کا صوت ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ اس کی جمع کی جائے، بلکہ مراد یہ ہے کہ حیوان کی ہر جنس کی ایک آواز ہے اور انکر اصوات اس اجناس کا صوت اس جنس کا ہے، اس لیے اس کا واحد لانا واجب ہوا۔ ثوری رحمہ اللہ سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے کہ "صِيَاحُ كُلِّ شَيْءٍ تَسْبِيْحٌ إِلَّا الْحِمَارَ" یعنی ہر شے کا چیخنا چلانا تسبیح ہے مگر گدھے کا۔ کسی نے کہا: قبیح منکر چھینک ہے۔[2] (ذکرہ الخازن) جب کہ پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

اپنی آواز بلند کرنے والوں کو گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی اور اُن کی آوازوں کی مثال گدھوں کی نہاق (آواز) کے ساتھ دی۔ چنانچہ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ آواز کا بلند کرنا انتہائی مکروہ ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ آواز کو بلند کرنے سے جو امر مانع ہے اس کا تو ذکر کیا اور رفتار میں تیزی سے جو چیز مانع ہے اس کا ذکر نہ کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آواز کو بلند کرنے سے سننے والے کو تکلیف ہوتی ہے، یعنی وہ آواز کا بلند ہونا کان کے سوراخ کو اپنی قوت سے ٹھونکتا ہے اور کبھی کان کے اندر والے پردے کو پھاڑ دیتا ہے۔ رہا تیزی سے چلنا تو وہ ایذا نہیں دیتا اور اگر ایذا دیتا ہے تو اسی کو جو اس کی راہ میں ہے اور آواز تو دائیں بائیں طرف والوں کو پہنچتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ چلنا چلنے والے اعضاء کو ایذا دیتا ہے، یعنی پاؤں کو اور آواز آلۂ سمع، یعنی کان کو ایذا دیتی ہے اور آلۂ سمع دل کے دروازے پر ہے، کیوں کہ بات کان سے دل کی طرف نقل کی جاتی ہے اور "مَشْي" (چلنا) ایسا نہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ قبیح قول، یعنی قبیح آواز قبیح فعل سے زیادہ بری ہے اور حسن القول یعنی اچھی آواز احسن ہے حُسنِ فعل سے، کیوں کہ زبان ترجمانِ قلب ہے، چونکہ ضرورت سے زیادہ آواز کو بلند کرنا منکر ہے، جس طرح کہ ضرورت سے بھی زیادہ آواز کو پست کرنا تکبر اور تماوت کی وجہ سے منکر ہے تو اس سے منع کرنے کی طرف کلمۂ ﴿مِنْ﴾ سے اشارہ کیا ہے، چنانچہ یہ بات سمجھا دی کہ دونوں چیزیں مذموم ہیں۔

اس لیے پہلی بات کے منع کرنے کی یہ وجہ بیان کی کہ ﴿اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ یعنی آوازوں کو سب سے بری اور شنیع اور وحشی آواز کے ساتھ ضرورت سے بلند کرنا اس جنس کی آواز ہے، اس لیے کہ اس آواز میں بغیر ضرورت کے بلندی اور تیزی ہے، کیوں کہ ہر حیوان کی آواز سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہ بوجھ کی وجہ سے یا تھکاوٹ کی وجہ سے ایسی آواز نکال رہا ہے، جیسے: اونٹ۔ یا کسی اور وجہ سے۔ اور گدھا اگر بوجھ کے نیچے مر جائے تو نہ چیخے اور اگر قتل کیا جائے تو نہ چلائے اور بعض اوقات حاجت کے بغیر چیختا ہے اور ایسی آواز سے رینکتا ہے جس کا پہلا حصہ تو زفیر ہے اور آخری شہیق ہے۔ یہ دونوں فعل اہلِ نار کے ہیں۔ "صوت" کو واحد اس لیے ذکر کیا کہ ارادۂ جنس پر نص ہو جائے، تا کہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ اس میں اجتماع شرط ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣١٥) [2] تفسير الخازن (٥/ ٢١٧)

رہا ضرورت کے تحت آواز کا بلند کرنا تو یہ مذموم نہیں ہے، کیوں کہ یہ مستنکر (ممنوع) ہے اور نہ مکروہ ہے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ گدھے کی آواز کو سب آوازوں سے زیادہ منکر آواز کیوں کہا گیا باوجود اس کے کہ آرے کا کھینچنا اور لوہے سے تانبے کا کوٹنا آواز کے لحاظ سے زیادہ سخت ہوتا ہے؟ تو اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد انکر اصواتِ حیوانات ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ سخت حاجت اور مصلحت کے لیے آواز کو بلند کرنا مکروہ نہیں ہوتا ہے اور نہ اس سے ایذا ہوتی ہے، جیسے: آرے کی آواز۔ بخلاف اس آواز کے جو فائدے سے خالی ہے۔ یہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ (کذا ذکر الخطیب) پھر جب اللہ پاک لقمان علیہ السلام کے قصے سے فارغ ہوا تو جو اس سے پہلے مشرکوں کو سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کا ذکر تھا، اسی طرف رجوع کیا اور ان پر حجتیں قائم کرنا شروع کیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ
فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ
اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، تمھارے مطیع و تابع فرماں کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور چھپی نعمتیں پوری کر دیں ہیں اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں (20) اور جب ان سے کہا جائے کہ تم اس کی اتباع کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اسی (طریقے) کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، کیا اگرچہ شیطان انھیں عذابِ جہنم کی طرف بلاتا رہا ہو تب بھی؟ (21)

نعمتوں کی یاد دہانی:

اللہ تعالیٰ مخلوق کو اپنی ان نعمتوں سے آگاہ فرماتا ہے جن کا اس نے دنیا اور آخرت میں اُن پر انعام کیا ہے، اس طرح سے کہ ان چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں ان کے کام میں لگا دیا ہے، مثلاً: تارے ہیں کہ اپنے رات دن میں ان سے روشنی لیتے ہیں اور ابرو باراں اور برف اور اَولے جو اُن میں پیدا کیے ہیں اور آسمانوں کو ایک محفوظ چھت بنا دیا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید وفلک در کارند　　　تاتو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری

(1) فتح البیان (۱۰/ ۲۸۶۔ ۲۸۹)

"بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان کام میں لگے ہوئے ہیں، تاکہ تو روزی حاصل کرے اور غفلت میں نہ کھائے۔"

اور زمین میں جو کچھ اُن کے واسطے پیدا کر دیا ہے اس کو قرار گاہ بنایا ہے۔ نہریں، ندیاں، درخت، کھیتیاں، میوے پیدا کر دیے ہیں، اپنی ظاہر و باطن نعمتیں ان پر پوری کر دی ہیں۔ وہ نعمتیں یہ ہیں کہ رسول بھیج دیے، کتابیں نازل کر دیں، شبہے اور علتیں دور فرما دیں، پھر بھی باوجود ان سب انعامات و اکرامات کے سارے لوگ ایمان نہ لائے، بلکہ ان میں سے وہ لوگ ہیں جو اللہ پاک کی توحید میں اور اس کے رسولوں کے بھیجنے کے بارے میں جھگڑتے ہیں، حالاں کہ اس بارے میں ان کا جھگڑنا کسی سمجھ بوجھ سے نہیں، نہ ہی کسی حجتِ صحیح کی سند سے اور نہ ہی کسی کتابِ ماثورِ صحیح کی بنا پر ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴾ کتابِ منیر بہ معنی مبین مضیئ، یعنی ظاہر روشن اور جب ان لوگوں سے کہیے جو اللہ پاک کی توحید میں جھگڑتے ہیں کہ شریعتِ مطہرہ کی پیروی کرو، جس کو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے تو کہتے ہیں: بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں، مگر یہی اپنے اگلے باپ دادوں کی پیروی۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧٠] "کیا (وہ پیروی کریں گے) اگر چہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ انھوں نے راہِ ہدایت ہی پائی ہو؟"[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے: امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ کا لوگوں کے لیے مسخر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس سے فائدہ اٹھانا۔[2] چنانچہ آسمانوں کی مخلوقات میں سے جو بنی آدم کے لیے مسخر کی گئی ہیں اللہ پاک کے حکم سے وہ سورج، چاند، تارے اور بادل وغیرہ ہیں اور زمین کی مسخر کی گئی مخلوقات میں سے پتھر، معدنیات، مٹی، کھیتی، درخت، میوے، دریا، نہریں، حیوانات اور چار پائے ہیں، جن سے نفع لیتے ہیں اور گھاس جس میں اپنے جانوروں کو چراتے ہیں۔ ان کے سوا اور چیزیں ہیں جن کی تعداد کا شمار نہیں ہو سکتا، چنانچہ تسخیر سے مراد اس شے کو جو مسخر کی گئی ہے، اس طرح پر کر دینا ہے کہ جس کے لیے مسخر کی گئی وہ اس سے فائدہ مند ہو، خواہ وہ چیز اس کی مطیع اور فرمانبردار ہو اور اس کے قبضے میں ہو یا نہ ہو۔

"إِسْبَاغٌ" مکمل اور کمال ہونے کو کہتے ہیں۔ جب نعمت مکمل اور کامل ہوتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "سَبَغَتِ النِّعْمَةُ"، جمہور نے "أَسْبَغَ" بسینِ مہملہ پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور یحییٰ بن عمارہ نے "أَصْبَغَ" بہ صادِ مہملہ بجائے سین پڑھا ہے۔ سین کو صاد سے بدل لیا ہے۔ یہ بنو کلب کا لغت ہے۔ یہ لوگ ہر سین کو جو غین، خاء اور قاف کے ساتھ جمع ہو، ایسا ہی کیا کرتے ہیں، جیسے: "صَلَخَ وَصَقَرَ"۔ "نِعَمٌ" نعمت کی جمع ہے،

---

[1] تفسیر ابن کثير (٣/ ٥٩٠) [2] معاني القرآن (٤/ ١٩٩)

بنا بر قراءتِ نافع، ابوعمرو اور حفص۔ باقی قراء نے "نِعْمَةٌ" بہ سکونِ عین علی الافراد والتنوین پڑھا ہے۔ نعمت اسم جنس ہے، اس سے مراد جمع ہے، اس سے کثرت پر دلالت کی جاتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ﴾ [إبراھیم: ۳٤] ''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو، تو انھیں شمار نہ کرسکو گے۔'' یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے۔[1] نعمت ہر نفع کو کہتے ہیں، جس سے احسان کا ارادہ ہو۔

نعم ظاہرہ سے مراد وہ ہیں جن کا ادراک عقل سے کیا جاتا ہے یا حس سے، یعنی حواسِ خمسہ ظاہرہ سے۔ اور پہچان لے ان کو جو کوئی ان کو پہچاننے کی کوشش کرے اور باطنہ سے مراد وہ ہیں جن کا ادراک لوگوں کے واسطے نہیں کیا جاتا اور وہ ان پر مخفی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ظاہری نعمتیں صحت، پیدائش کے لحاظ سے مکمل ہونا، آنکھیں، کان، زبان اور باقی ظاہری اعضاء ہیں اور باطنی نعمتیں معرفت، یعنی چیزوں کی پہچان، اور عقل، دل اور فہم ہیں اور ان جیسی اور چیزیں۔ کسی نے کہا: ظاہری نعمت وہ ہے جو آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے، جیسے: مال و دولت، جاہ، جلال، جمال اور وہ افعال جو اطاعت اور عبادت کے لیے بجا لائے جاتے ہیں اور باطنی نعمت وہ ہے جس کو آدمی اپنے دل میں پاتا ہے، جیسے: علم باللہ اور حسنِ یقین اور وہ آفات جن کو اللہ پاک اپنے بندے سے دور کرتا ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے اس میں نو قول ذکر کیے ہیں، سب کے سب اسی طرف راجع ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظٰهِرَةً ﴾ تو دنیا کی نعمتیں ہیں اور ﴿ بَاطِنَةً ﴾ آخرت کی نعمتیں۔ کسی نے کہا: ﴿ ظٰهِرَةً ﴾ اسلام، قرآن اور جمال ہے اور ﴿ بَاطِنَةً ﴾ وہ اعمالِ سیۂ جن کو اللہ نے بندے پر مستور رکھا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظٰهِرَةً ﴾ تسویۂ اعضاء (اعضاء کا متوازن اور صحیح سالم ہونا) اور حسنِ صورت ہے اور ﴿ بَاطِنَةً ﴾ اعتقاد بقلب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظٰهِرَةً ﴾ رزق ہے اور ﴿ بَاطِنَةً ﴾ حسنِ خلق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظٰهِرَةً ﴾ تخفیفِ شرائع ہے اور ﴿ بَاطِنَةً ﴾ شفاعت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظٰهِرَةً ﴾ ظہورِ اسلام اور دشمنوں پر نصرت اور فتح ہے اور ﴿ بَاطِنَةً ﴾ فرشتوں سے مدد کرنا ہے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ ظٰهِرَةً ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے اور ﴿ بَاطِنَةً ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ اور لفظِ قرآنی اس سے بھی عام تر ہے۔

امام عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو فرمایا یہ تو میرے علم کے خزانوں میں سے ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا پوچھا تھا تو فرمایا: «أَمَّا الظَّاهِرَةُ فَمَا سَوَّى مِنْ خَلْقِكَ، وَأَمَّا الْبَاطِنَةُ فَمَا سَتَرَ مِنْ عَوْرَتِكَ وَلَوْ أَبْدَاهَا لَقَلَاكَ أَهْلُكَ فَمَنْ سِوَاهُمْ» یعنی ظاہر نعمت تو وہ ہے جو اللہ نے تیری شکل و صورت صحیح اور درست کی، اسے ٹھیک ٹھیک بنایا اور باطن وہ ہے جو تیرے عیب چھپا دیے، اگر ان کو ظاہر کر دیتا تو تیرے گھر والے تجھ سے نفرت کرتے اور بغض رکھتے۔ ان کے سوا اور لوگ بھی تجھ سے نفرت کرتے۔[2] (أخرجه البيهقي)

---

[1] تفسیر القرطبي (۱٤/ ۷۲) فتح القدیر (٤/ ۳۱۷)

[2] شعب الإیمان (٤/ ۱۲۰) اس کی سند میں ''محمد بن عبدالرحمٰن عرزمی عن ابیہ عن جدہ'' تینوں ضعیف راوی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو فرمایا: «أَمَّا الظَّاهِرَةُ فَالْإِسْلَامُ وَمَا سَوَّى مِنْ خَلْقِكَ وَمَا أَسْبَغَ عَلَيْكَ مِنْ رِزْقِهِ، وَأَمَّا الْبَاطِنَةُ فَمَا سَتَرَ مِنْ مَسَاوِئِ عَمَلِكَ» (أخرجه ابن النجار والديلمي والبيهقي) ان کی تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نعمتِ ظاہرہ اسلام ہے اور نعمتِ باطنہ ہر وہ شے ہے جو تمھارے گناہوں اور عیبوں اور حدود میں سے تم پر پوشیدہ کیے۔[1] (أخرجه ابن مردويه) ان کی چوتھی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ لا إلہ إلا اللہ ہے۔[2] (أخرجه ابن أبي شيبة وابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم)

قولہ تعالیٰ: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى﴾ کا یہ مطلب ہے کہ کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ پاک کی شان میں اس کی توحید و صفات میں مکابرہ اور عناد اور دشمنی کی خاطر جھگڑا کرتے ہیں، اس کے بعد کہ حق ظاہر ہوگیا اور ان پر حجت قائم ہوگئی۔ اسی لیے فرمایا کہ ﴿بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ یعنی بغیر علم کے جو عقل اور نقل سے حاصل ہوتا ہے اور رسول کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر کہ جس کے سبب سے سیدھی راہ معلوم کر لیں۔ ﴿وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ﴾ اور بغیر کسی روشن اور واضح کتاب کے جس کو اللہ پاک نے نازل کیا ہے۔ بلکہ محض عیب جوئی، سرکشی، صرف عناد، دشمنی اور گمراہ آباء کی تقلید پر رہ کر جھگڑا کرتے ہیں۔ ایسی آیت کی تفسیر سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث، ابی بن خلف اور امیہ بن خلف وغیرہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ لوگ نبی اکرم ﷺ سے اللہ پاک کی شان اور اس کی صفات سے متعلق بغیر علم کے جھگڑا کرتے تھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَإِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾ میں جمع کی ضمیر ﴿مَنْ﴾ کے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی جب ان جھگڑنے والوں سے کہا جائے کہ اللہ نے جو کتاب اپنے رسول پر نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو صرف خالص تقلید سے چمٹے رہیں اور کہیں کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا ہے۔ چنانچہ ہم انھیں بتوں کو پوجیں گے جن کو وہ پوجا کرتے تھے اور اپنے دین میں جس راہ پر وہ چلتے تھے، اسی پر ہم بھی چلیں گے۔ اس قسم کی آبائی تقلید کی اور سرداروں کی تقلید کی مذمت قرآن شریف میں بہت مذکور ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیتوں سے علماء نے تقلید کے باطل ہونے میں حجت پکڑی ہے۔ ان لوگوں کا کفران آیتوں سے حجت پکڑنے سے مانع نہ ہوا، اس لیے کہ ایک کی کفر کی جہت سے تشبیہ اور دوسرے کی ایمان کی جہت سے تشبیہ واقع نہیں ہوئی۔ تشبیہ جو واقع ہوئی ہے، وہ مقلدین کے درمیان مقلد کے لیے حجت کے بغیر ہے، مثلاً: اگر ایک شخص کی تقلید کی، پھر وہ کافر ہوگیا اور دوسرے کی تقلید کی، پھر اس نے گناہ کر لیا اور ایک اور کی تقلید کی کسی مسئلے میں، پھر اس کی وجہ کو چوک گیا تو ہر ایک تقلید پر ملامت کیا جائے گا جو اس نے بغیر حجت کے کی، اس لیے کہ ہر تقلید میں کچھ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتا ہے، مگر اس میں گناہ مختلف ہیں۔

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٥٢٥۔ ٥٢٦) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٤٩) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٠)

تقلید کی قسمیں:

تقلید کی تین قسمیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اس شے سے اعراض کرنا جس کو اللہ پاک نے نازل کیا ہے اور آباء کی تقلید پر اکتفا کر کے اس کی طرف توجہ نہ کرنا۔ دوسری یہ ہے کہ اس شخص کی تقلید کی جائے کہ مقلد اس بات کو نہیں جانتا کہ وہ اس لائق ہے کہ اس کا قول لیا جائے۔ تقلید کی تیسری قسم یہ ہے کہ قیامِ حجت کے بعد اور ظہورِ دلیل کے برخلاف کسی کے قول کی تقلید کی جائے۔ اس قسم کی تقلید اور پہلی قسم کی تقلید میں فرق یہ ہے کہ پہلی تقلید تو اس وقت کی کہ ابھی اسے علم اور حجت کی قدرت نہیں تھی اور دوسری تقلید یہ ہے کہ اس نے اس وقت تقلید کی جب اس کے لیے حجت ظاہر ہوگئی تو یہ مذمت کا زیادہ مستحق ہے اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی معصیت کا۔ اللہ پاک نے اپنی کتابِ مقدس میں کئی جگہ ان تینوں قسم کی تقلید کی مذمت فرمائی ہے۔ اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تقلید علم نہیں ہے اور بندہ اس وقت تک ہدایت یافتہ اور راہ یاب نہیں ہوتا جب تک کہ اس شے کا اتباع نہ کرے جس کو اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔

چنانچہ اگر یہ مقلد ”مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ“ کو جانتا پہچانتا ہے تو ہدایت یافتہ ہے اور مقلد نہیں ہے اور اگر ﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کی معرفت نہیں رکھتا تو اپنی جان کے بارے میں اپنے ہی اقرار سے جاہل اور گمراہ ہے، پھر وہ کیسے اس بات کو جانے گا کہ وہ تقلید کرنے میں ہدایت پر ہے۔ یہ ہر اس سوال کا جواب ہے جو اس بارے میں لوگ کرتے ہیں۔ ائمہ رحمہم اللہ کا طریقہ اتباعِ حجت تھا اور اپنی تقلید سے انھوں نے منع کیا، لہٰذا جو کوئی حجت کو ترک کرے اور اس بات کو ترک کرے جس بات سے ائمہ نے منع کیا اور ان سے پہلے اللہ اور رسول نے اس کی ممانعت فرمائی، اس کا مرتکب ہو تو وہ اُن کے طریق پر نہیں ہے، بلکہ وہ تو ان کے مخالفوں میں سے ہے۔ ان کے طریق پر تو وہ ہی ہوگا جس نے حجت کا اتباع کیا اور دلیل کا منقاد اور مطیع ہوا اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی معین شخص کو نہیں پکڑا اس طریقے سے کہ کتاب و سنت پر اس کو مختار کر کے انھیں اس کے قول پر پیش کرے۔

اس سے اس شخص کا باطل ہونا ظاہر ہوتا ہے جس نے تقلید کو اتباع ٹھہرایا ہے، حالانکہ اللہ اور رسول ﷺ اور اہلِ علم نے ان کے درمیان فرق کر دیا ہے، جس طرح کہ حقائق کے درمیان فرق کیا گیا ہے، کیوں کہ اتباع تو اس شخص کی راہ پر چلنا، جس کی اتباع کی جائے اور ویسی شے کا لانا ہے جیسی وہ لایا اور جو لوگ سنت میں مصنف ہیں، انھوں نے تقلید کے فساد اور ابطال اور زلۃ عالم کے بیان کو اکٹھا کیا ہے تاکہ اس سے تقلید کی خرابی بیان کریں اور یہ بات کہ عالم کبھی پھسل جاتا ہے، اس سے لغزش ہو جاتی ہے اور یہ ضروری ہے کیونکہ وہ کچھ معصوم نہیں ہے کہ اس سے کبھی لغزش نہ ہو، لہٰذا جائز نہیں کہ جو کچھ وہ کہے اس سب کو قبول کر لے اور اس کے قول کو معصوم کے قول کے برابر رکھے۔ چنانچہ یہ وہ شے ہے کہ روئے زمین پر جو عالم ہے اس نے اس کی مذمت کی ہے اور اس کو حرام کیا ہے اور اس کے لوگوں کی مذمت کی ہے اور یہ بلاء اور فتنہ مقلدین کی اصل ہے، کیونکہ وہ عالم کی اس بات میں تقلید کرتے ہیں جس میں اس نے لغزش کی ہے اور جس میں لغزش نہیں کی ہے۔ اس کے درمیان میں ان کو کسی طرح کی پہچان نہیں ہے، چنانچہ وہ دین کو

خطا کے ساتھ لیتے ہیں اور ضرورت ہوتی ہے تو اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال کرتے ہیں اور حلال چیز کو حرام کرتے ہیں اور اس شے کو مشروع کرتے ہیں جو مشروع نہیں ہے۔ اور ان کو اس کا اتفاق ضرور ہوتا ہے، کیوں کہ جس کی انھوں نے تقلید کی ہے، اس عصمت منتفی ہے، یعنی وہ معصوم نہیں ہے، پس خطا اس سے واقع ہوتی ہے اور ضرور ہوتی ہے۔[1] انتهیٰ بتصرف في العبارة بالجملة.

پھر اللہ پاک نے سوالیہ انداز میں دھمکی اور ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں ارشاد فرمایا: ﴿ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴾ یعنی اگرچہ شیطان ان کے باپ دادوں کو عذاب دوزخ کی طرف بلاتا ہو، پھر بھی وہ اپنے باپ دادوں کی پیروی کریں گے، جن کا انھوں نے اس شرک پر جس پر وہ ہیں، اپنے دین میں اقتدا کیا ہے۔ یہ معنی تو اس بنا پر ہیں کہ ﴿ يَدْعُوْهُمْ ﴾ کی ضمیر مفعول آباء متبوعین کی طرف راجع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اتباع کی طرف راجع ہو، یعنی اگرچہ شیطان ان پیروی کرنے والوں کو عذابِ دوزخ کی طرف بلاتا ہو، کیوں کہ اسی نے ان کو اپنے دادوں کی پیروی کرنا اور ان کا دین قبول کرنا اچھا کر دکھایا ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ اتباع کے انکار اور استبعاد کا مدار ہونا متبوعین کا ہے تابع واسطے شیطان کے، نہ کہ خود اتباع کا ایسا ہونا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر تابعین اور متبوعین کی طرف راجع ہو، یعنی اگرچہ شیطان ان سب تابعین اور متبوعین کو عذاب کی طرف بلاتا ہو۔ شیطان کا متبوعین کو بلانا تو اس طرح سے ہے کہ ان کو شرک اچھا کر دکھایا اور تابعین کا بلانا اس طرح سے ہے کہ ان کو اپنے باپ دادوں کا دین اچھا کر دکھایا۔ ﴿ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ ...الخ﴾ کا جملہ شرطیہ ہے حال کے واسطے۔ تقدیر یہ ہے: "أَيَتَّبِعُوْنَهُمْ وَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوْهُمْ، أي: فِيْ حَالِ دُعَاءِ الشَّيْطَانِ إِيَّاهُمْ إِلَى الْعَذَابِ"

اس صورت میں ضروری نہیں ہے کہ ﴿ لَوْ ﴾ کا جواب محذوف ہو، یعنی کیا پیروی کریں گے ان کی اس حال میں کہ شیطان ان کو عذاب کی طرف بلاتا ہو۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ اختیار کیا ہے کہ حرفِ واوعطف کا ہے اور عطف انشاء کا اخبار پر لازم نہ آئے گا، اس لیے کہ استفہام انکاری ہے، یعنی لائق نہیں ہے کہ ان کا حال ایسا ہو۔[2] (والأول أولیٰ كما في الكشاف، قاله الكرخي) کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لَوْ ﴾ کا جواب محذوف ہے۔ "أَيْ: يَدْعُوْهُمْ فَيَتَّبِعُوْنَهُ" یعنی کیا اور جو اُن کو شیطان عذابِ دوزخ کی طرف بلائے تو اس کی پیروی کریں گے۔ فتح البیان میں کہا ہے: "وَمَا أَقْبَحَ التَّقْلِيْدَ، وَأَكْثَرَ ضَرَرَهُ عَلٰى صَاحِبِهِ، وَأَوْخَمَ عَاقِبَتَهُ وَأَشْأَمَ عَائِدَتَهُ عَلٰى مَنْ وَقَعَ فِيْهِ فَإِنَّ الدَّاعِيَ لَهُ إِلٰى مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ كَمَنْ يُرِيْدُ أَنْ يَذُوْدَ الْفِرَاشَ عَنْ لَهَبِ النَّارِ لِئَلَّا تَحْتَرِقَ فَتَأْبٰى ذٰلِكَ وَتَتَهَافَتُ فِيْ نَارِ الْحَرِيْقِ وَعَذَابِ السَّعِيْرِ"[3]

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۭ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ

[1] أعلام الموقعين (٢/ ١٨٧) [2] تفسير البيضاوي (٤/ ٣٤٩) [3] فتح القدير (٤/ ٣١٨) فتح البيان (١٠/ ٢٩٠_٢٩٤)

كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ۝ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝
وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ لِلّٰهِ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

اور جو شخص اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کر دے اور وہ نیکو کار بھی ہو تو بلاشبہ اس نے مضبوط کڑا تھام لیا، اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے پاس ہے (22) اور (اے نبی!) جس کسی نے کفر کیا تو اس کا کفر آپ کو غم میں نہ ڈالے، (بالآخر) ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے، چناں چہ ہم انھیں بتائیں گے جو کچھ انھوں نے کیا ہو گا، بے شک اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے (23) ہم انھیں تھوڑا سا فائدہ دیتے ہیں، پھر ہم انھیں سخت عذاب کی طرف مجبور کر دیں گے (24) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے! آپ کہہ دیجیے: سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے (25) اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، بے شک اللہ ہی بے نیاز، تعریف کیا ہوا ہے (26)

اطاعتِ الٰہی اور اخلاصِ عمل کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس شخص کے بارے میں خبر دیتا ہے، جس نے اللہ کے لیے اخلاصِ عمل کیا، اس کے حکم کا مطیع اور تابع ہوا، اس کی شریعت کا اتباع کیا۔ اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ وَهُوَ مُحْسِنٌ ﴾ یعنی وہ اپنے عمل میں اس طرح اخلاص کرنے والا ہے کہ جس شے کا اس کو امر کیا گیا ہے اس کی پیروی کرتا ہے اور جس شے سے منع کیا گیا ہے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ ﴿ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ﴾ تو واقعی اس نے اللہ سے ایک پکا عہد لیا اس بات کا کہ وہ اسے عذاب نہ کرے گا۔

﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ﴾ یعنی اے محمد! تو ان لوگوں کے انکار پر کہ جو منکر ہوئے اللہ کے اور اس چیز کے جس کو تو لے کر آیا ہے رنج مت کر، کیوں کہ اللہ کی تقدیر ان میں نافذ ہونے والی ہے اور اللہ کی طرف ہے ان کا پھر آنا۔ چنانچہ وہ اس پر ان کو بدلہ دے گا، بے شک وہ خوب جانتا ہے جو کچھ دلوں میں ہے، اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ﴾ یعنی ہم دنیا میں تھوڑے دن ان کا کام چلا دیں گے پھر ان کو پکڑ کر بلائیں گے سخت عذاب کی طرف جو جانوں پر بہت تکلیف دہ اور سخت ہو گا، یعنی وہ عذاب جو نفوس پر انتہائی سخت اور شاق اور

دشوار ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴾ [یونس: ٦٩۔ ٧٠] ''بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اُٹھانا ہے، پھر انھیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ان کے کفر کرنے کی وجہ سے ہم انھیں شدید عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے۔''

مشرکوں کا اعتراف کہ اللہ ہی خالق ہے:

پھر اللہ پاک ان لوگوں کے بارے میں خبر دیتا ہے جو اس کے ساتھ شریک کرتے ہیں، اس بات کی خبر کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور وحدہ لا شریک لہ ہے، اس کے باوجود اس کے ساتھ ایسے شرکاء کو پوجتے ہیں جن کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی مخلوق اور ملکیت ہیں۔ اسی لیے فرمایا ہے: ﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ ﴾ یعنی سب خوبی اور تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جبکہ تمھارے اقرار سے تم پر حجت قائم ہوگئی۔ ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ یعنی جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، وہ سب اللہ پاک کی خلق اور ملکیت ہے اور وہ اپنے ماسوا سے بے نیاز ہے اور ہر شے اس کی محتاج ہے۔ جو کچھ اس نے پیدا کیا اس سب میں وہ تعریف کیا گیا ہے، اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں اس شے پر حمد ہے جو اس نے پیدا کی اور مشروع فرمائی اور وہی سارے امور میں تعریف کیا گیا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جو شخص اپنا کام اللہ کو سونپے اور عبادت کو اس کے لیے خالص کرے اور بالکل اسی کی طرف متوجہ ہو اس حال میں کہ وہ اپنے اعمال میں محسن ہو تو بے شک اس نے مضبوطی سے تھام لیا ایک مضبوط اور محکم عہد کو اور اس سے متعلق ہو گیا، کیونکہ جس عبادت میں احسان نہیں ہوتا اور نہ ہی اس شے کی معرفت ہوتی ہے جس کی طرف اس میں حاجت ہے تو وہ عبادت اس درجے میں نہیں واقع ہوتی جس میں محسنین کی عبادت واقع ہوتی ہے۔ صادق و مصدوق ﷺ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آپ سے احسان کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اس طرح گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔[2]

﴿ اِسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ﴾ اس شخص کی تمثیل ہے کہ جس نے اپنا منہ اللہ کی طرف تابع کیا اس حال میں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٩٠۔ ٥٩١)
[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨)

کہ اس نے ارادہ کیا کہ بلند پہاڑ کی طرف چڑھے، پھر وہ اس مضبوط کڑے اور رسی کو پکڑے جو اس سے لٹک رہی ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، سلمی اور عبداللہ بن مسلم بن یسار نے ''یُسَلِّمْ'' بہ تشدیدِ لام پڑھا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں تخفیف زیادہ پہچانی ہوئی ہے، جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ ﴾[1] [آل عمران: ٢٠] ''تو کہہ دیجیے: میں نے اپنا سر اللہ کے آگے جھکا دیا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ [البقرة: ٢١٠] ''آخر سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔'' یعنی سارے امور کا مصیر و مرجع اللہ ہی کی طرف ہے نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔

قولہ: ﴿ فَلَا يَحْزُنْكَ ... الآية ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ منکر کے انکار کی وجہ سے تو رنجیدہ مت ہو، کیونکہ اس کا انکار تجھے کوئی ضرر نہ دے گا۔ ﴿ يَحْزُنْكَ ﴾ بفتحِ تحتیہ وضمِ زاء اور بضمِ تحتیہ وکسرِ زاء دونوں طرح پڑھا گیا ہے اور دونوں سبعیہ ہیں۔ پہلے اللہ پاک نے مومنین کا حال بیان کیا، اس کے بعد کافروں کا حال بیان کیا، پھر ان کو یہ وعید سنائی: ﴿ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ... الخ ﴾ یعنی ان کا پھر آنا ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم ان کو ان کے بداعمال کی خبر دیں گے اور ان پر ان کو جزا دیں گے، کیونکہ اللہ پاک خوب جانتا ہے اس شے کو جس کو ان کے سینے چھپاتے ہیں اس میں سے کوئی چھپی ہوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک تو سِرّ بھی علانیہ کی طرح ہے۔

﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے، یا زمانِ محذوف کی۔ ''أَيْ: تَمْتِيعًا قَلِيلًا أَوْ زَمَانًا قَلِيلًا'' یعنی ہم ان کو فائدہ دیں گے تھوڑا، یا تھوڑے دنوں کے لیے۔ غرض یہ ہے کہ دنیا میں ایک قلیل مدت ان کو باقی رکھیں گے کہ اپنی اجل پوری ہونے تک اس سے فائدہ اٹھالیں۔ قلیل اس لیے فرمایا کہ زائل ہونے والی نعمت خواہ کتنی ہی طویل ہو، پھر بھی دائمی نعمت کی نسبت بہت تھوڑی ہے۔ ﴿ ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ یعنی پھر تو ہم ان کو مضطر کر دیں گے اور آخرت میں عذابِ نار کی طرف پھیر کر لے جائیں گے، جس سے بھاگ جانے کا کوئی راستہ نہ پائیں گے۔ غِلظت سے مراد سختی اور ثقل ہے، اس کے لیے جسے عذاب کیا جائے گا۔ کیوں کہ جو کوئی اس میں واقع ہوگا اور وہ عذاب اسے پہنچے گا تو اس سے زیادہ سخت اس پر کوئی اور شے نہ ہوگی، اسی لیے عذاب کی شدت کے لیے غِلظ کا استعارہ کیا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ میں حرفِ لام قسم کا ہے، یعنی قسم ہے اللہ کی اگر تو ان سے پوچھے گا کہ آسمان وزمین کس نے بنائے تو وہ اس بات کا اقرار کریں گے کہ ان کا خالق اللہ ہے، کیونکہ اس بارے میں ان کے نزدیک ظاہر بات یہی ہے، یہ ان کی طرف سے اس شے کا اقرار ہے جو توحید پر اور شرک کے باطل ہونے پر دال ہے اور ان کو ان کے اقرار پر الزام دینا

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٧٣) فتح القدير (٤/ ٣١٨)

ہے۔ اسی لیے فرمایا: اے محمد! تو کہہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾، یعنی اللہ کی تعریف ہے تمھارے اقرار پر۔ پھر اس کے غیر کو کیوں پوجتے ہو اور اس کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ یا یہ معنی ہیں تو کہہ اللہ کے لیے حمد ہے، اس پر کہ اس نے ہم کو دین کی ہدایت دی اور نہیں ہے کوئی حمد اس کے غیر کے لیے۔ یا یہ معنی ہیں کہ اللہ کے لیے حمد ہے اس پر کہ اس نے توحید کی دلیلیں ایسے طور پر قرار دیں کہ مقابلہ کرنے والے اور انکار کرنے والے بھی ان کا انکار نہیں کر سکتے۔

پھر اللہ پاک نے اس امر سے اضراب کر کے (التفاظ کر کے) فرمایا: ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ اکثر لوگ ان کے اس امر کو نہیں جانتے کہ یہ بات ان کو لازم آتی ہے اور جب اس پر آگاہ کیے جاتے ہیں تو ہوشیار نہیں ہوتے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ وہ نہ غور وفکر کرتے ہیں نہ سوچتے سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ اس بات کو جان لیں کہ ان اشیاء کا خالق وہی ہے جس کے لیے عبادت واجب ہے اور اس کے علاوہ کسی کے لیے کسی طرح کی عبادت جائز نہیں ہے، کیوں کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کی ملکیت اور مخلوق ہے اور اس کے غلام اور فرماں بردار ہیں، پھر غیر اللہ ان میں عبادت کا مستحق کس طرح ہو سکتا ہے۔

توحیدِ عبادت کا جو مخلوق کو حکم دیا ہے تو وہ اس لیے ہے کہ اس کا مستحق صرف خالق ہی ہے نہ کہ اس لیے کہ اس میں اس کا کچھ فائدہ یا ضرورت ہے، کیوں کہ اللہ پاک تو اپنے غیر سے بے نیاز ہے اور بڑا بے پروا۔ اس کو کسی کی ذرا بھی پروا نہیں ہے اور وہ حمد وستایش کا مستحق اور سزاوار ہے، گو مخلوق اس کی حمد نہ کرے۔ یا حمید کے یہ معنی ہیں کہ اپنے بندوں سے زبانِ مقال سے اور زبانِ حال سے تعریف کیا گیا ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے یہ بیان فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کا پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے تو اس کے بعد اس بات کا ذکر کیا جو اس بات پر دال ہے کہ اس کے لیے تو ان کے علاوہ ایسی اشیاء ہیں کہ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی ان کی حد ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۷ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۲۸

اور بلاشبہہ اگر زمین میں جتنے درخت ہیں، سب قلم بن جائیں اور سمندر کی روشنائی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر (اس میں مزید روشنائی شامل کریں) تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں، بے شک اللہ نہایت غالب، بہت حکمت والا ہے (27) تمھیں پیدا کرنا اور تمھیں (دوبارہ)

[1] فتح البیان (١٠/ ٢٩٤۔ ٢٩٦)

اُٹھانا (اللہ کے نزدیک) ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا، بلاشبہہ اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے (28)

اللہ تعالیٰ کی صفات بے شمار ولازوال ہیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنی عظمت و کبریائی اور جلال اور اسمائے حسنیٰ و صفاتِ عالیہ اور کلماتِ تامہ کی خبر دیتا ہے کہ ان کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا اور نہ کسی بشر کو ان کی اصلیت اور حقیقت اور ان کی تعداد اور گنتی کے بارے میں کسی طرح کی اطلاع ہے، جس طرح کہ خاتم الرسل، سید البشر، صاحبِ قبرِ اطہر و اعطر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: «لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَىٰ نَفْسِكَ»[1] یعنی میں تجھ پر ثنا کی گنتی کا شمار نہیں کرتا، جیسی کہ تو نے اپنے نفس پر ثنا کی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ﴾ یعنی اگر زمین کے سارے درخت قلم بنائے جائیں اور سمندر سیاہی بنا دیا جائے اور سات سمندر اس کے ساتھ اور شامل ہو جائیں، پھر ان سے اللہ کی باتیں لکھی جائیں، جو اس کی عظمت و صفات اور جلال پر دال ہیں تو قلم ٹوٹ جائیں اور سمندروں کا پانی خشک اور ختم ہو جائے، اگرچہ ان کی طرح کے اَور سمندر مدد کو آئیں۔

سات کا ذکر تو مبالغے کے طور پر کیا گیا ہے، ایک خاص تعداد تک رکھنا مراد نہیں ہے اور نہ یہ مراد ہے کہ وہاں سات سمندر موجود ہیں اور عالم کو گھیرے ہوئے ہیں، جیسا کہ وہ شخص کہتا ہے جس نے اسرائیلیات کے قصوں سے اخذ کیا، جن کی نہ تصدیق کی جاتی ہے نہ تکذیب، بلکہ جس طرح یہاں ذکر کیا ہے، یہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ [الکھف: ۱۰۹] ''کہہ دیجیے: اگر میرے رب کی باتوں (کے لکھنے) کے لیے سمندر روشنائی ہو تو یقیناً میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اور اگرچہ ہم اس کے مثل (اور سمندر) بطور مدد لے آئیں۔'' چنانچہ ﴿بِمِثْلِهٖ﴾ سے مراد فقط اس کے مثل ایک اور نہیں ہے، بلکہ اس کے مثل اور، پھر اس کے مثل اور، پھر اس کے مثل اور، پھر اسی طرح اور گنتے چلے جاؤ، کیوں کہ اللہ پاک کی آیات اور کلمات کا کچھ شمار تو ہے نہیں کہ کسی حد تک انتہا ہو جائے، وہ تو ایک بے حد اور لامتناہی امر ہے: ؎

درگہ او بے نہایت درگہیست — ہرچہ بروی میرسی بروی مایست

''اس کی بارگاہ اتھاہ درگاہ ہے تو جو کچھ بھی لے گیا (اس سے) ہر اس چیز کو پالے گا، جو تیرے لیے نہیں ہے۔''

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر زمین کے درخت قلم بنائے جائیں اور سمندر سیاہی ہو جائیں اور اللہ پاک

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٨٦)

فرمائے: ''إِنَّ مِنْ أَمْرِيْ كَذَا وَمِنْ أَمْرِيْ كَذَا'' یعنی وہ اپنی باتیں کہنا شروع کرے کہ میرے امر سے ایسا ہے، میرے امر سے ایسا ہے تو البتہ دریاؤں کا پانی ختم ہو جائے اور قلم ٹوٹ جائیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مشرکوں نے کہا تھا کہ یہ تو ایک کلام ہے قریب ہے کہ ختم ہو جائے۔ اس پر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ ... الآية ﴾ یعنی اگر زمین کے درخت قلم ہوں اور سمندر کے ساتھ سات سمندر اور سیاہی ہوں تو اللہ کے عجائب اور اس کی حکمت، خلق اور علم ایسے نہیں ہیں کہ ختم ہو جائیں۔[1] امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے بندوں کے علم کی مثال اللہ کے علم کے مقابلے میں اس طرح ہے جیسے سارے سمندروں کے پانی کے مقابلے میں ایک قطرہ ہو۔ اور یقیناً اللہ نے یہ نازل کیا: ﴿ وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ ... الآية ﴾

فرماتا ہے کہ اللہ کے کلمات کو لکھنے کے لیے اگر سمندر سیاہی بن جائیں اور سارے درخت قلم ہو جائیں تو قلم ٹوٹ جائیں اور دریا کا پانی ختم ہو جائے، مگر اللہ کے کلمات باقی قائم رہ جائیں ان کو کوئی شے فنا نہیں کرتی، اس لیے کہ کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کی قدر کا اندازہ کرے اور نہ ہی کوئی کما حقہ اس کی ثنا کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنے نفس پر ثنا کرتا ہے۔ بے شک ہمارا رب ویسا ہے جیسا وہ کہتا ہے، اور اس سے بہت بلند ہے جو ہم کہتے ہیں۔[2] مروی ہے کہ یہ آیت یہود کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہود کے احبارِ نے مدینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ اے محمد! تم ہم کو اپنے اس قول کے بارے میں بتاؤ: ﴿ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥] ''اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔'' تم اس سے ہم کو مراد لیتے ہو یا اپنی قوم کو؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''كُلًّا'' یعنی سب کو، ہم کو اور تم کو۔ اس پر وہ بولے: کیا تم نہیں پڑھتے ہو اس شے میں جو تمھارے پاس آئی ہے کہ ہم کو واقعی تورات ملی ہے، جس میں ہر شے کا تبیان ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو اللہ کے علم میں سے قلیل ہے اور تمھارے پاس اس میں سے وہ ہے جو تمھیں کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں جو انھوں نے دریافت کیا تھا، یہ آیت نازل کی: ﴿ وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ ... الآية ﴾ اسی طرح امام عکرمہ اور عطا بن یسار رحمہما اللہ سے بھی مروی ہے،[3] یہ شانِ نزول اس بات کا مقتضی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے مکی نہیں ہے۔ حالاں کہ مشہور یہ ہے کہ مکی ہے۔ والله سبحانه أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ نے ہر شے کو مقہور و مغلوب کیا ہے، چنانچہ جس چیز کا اس نے ارادہ کیا، اس کا کوئی مانع نہیں اور نہ ہی کوئی اس کے حکم کا مخالف اور پیچھے ہٹنے والا ہے، وہ اپنے خلق و امر اور اقوال و افعال و شرع اور تمام حالات میں حکمت والا ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٥١۔ ١٥٢) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٩١) [3] تفسیر الطبري (٢٠/ ١٥٢۔ ١٥٣)

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ یعنی سارے لوگوں کا پیدا کرنا اور ان کے مرنے کے بعد قیامت کے دن اُن کو زندہ کرنا اس کی قدرت کے لیے ایک جان کے پیدا کرنے اور مارنے کے برابر ہے۔ اس کے لیے ہر کام آسان ہے، اس کا امر تو یہی ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ اسی دم ہو جاتی ہے۔ فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ ﴾ [القمر: ۵۰] ''اور ہمارا حکم تو آنکھ جھپکنے کی طرح ایک (کلمہ) ہی ہوتا ہے۔'' یعنی امر نہیں کرتا کسی شے کا مگر ایک بار، چنانچہ وہ شے ہو جاتی ہے، اسے دوبارہ کہنے یا امر کی تاکید کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ نیز فرمایا ہے: ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [النازعات: ۱۳۔ ۱۴] ''چنانچہ وہ (قیامت) تو صرف ایک (خوفناک) ڈانٹ ہو گی۔ تب لوگ ایک دم کھلے میدان میں (جمع) ہوں گے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴾ یعنی جس طرح وہ ان کے اقوال کا سننے والا اور ان کے افعال کا دیکھنے والا ہے، اس کے سننے اور دیکھنے کی نسبت ایک نفس کی طرح ہے، اسی طرح اس کی قدرت ان سب پر ہے، جیسے ایک نفس پر۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ ... الآیۃ ﴾[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ مَا فِي الْاَرْضِ ﴾ سے مراد جمیع ما فی الارض ہے۔ ﴿ شَجَرَةٍ ﴾ بہ صیغۂ مفرد فرمایا۔ شجر یا اشجار نہ کہا، اس کی یہ وجہ ہے کہ علمِ معانی میں ثابت ہو چکا ہے کہ استغراق مفرد کا اشمل ہوتا ہے اور یہاں استغراق مقصود ہے۔ کسی نے مفرد لانے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ مراد ہر قسم کے شجر کی تفصیل اور استقصاء ہے۔ تو گویا یوں کہا: ''مِنْ كُلِّ شَجَرَةٍ شَجَرَةٍ''. یعنی ہر ایک ایک درخت یہاں تک کہ درختوں کی جنس میں سے ایک بھی باقی نہ رہے۔ مگر حال یہ ہے کہ وہ سب قلم بنائے جائیں۔ اگر مفرد نہ لایا جاتا تو اس سے یہ معنی مراد نہ لیے جاتے، کیوں کہ جمع تین سے اوپر کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر یہ کہ اس پر استغراق کا لام داخل ہو۔ علماء نے اسی طرح تقریر کی ہے۔ لیکن امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں بحث ہے، کیوں کہ یہ بات کہ مفرد تفصیل کا فائدہ دے بغیر تکرار کے یا استغراق کا بغیر نفی کے محلِ نظر ہے،[2] اس لیے کہ یہ بات تو اس قسم کی ترکیب میں معروف و معہود ہے۔

''جَاءُوْنِيْ رَجُلًا رَجُلًا''، یعنی لوگ میرے پاس ایک ایک شخص کر کے آئے۔ ''وَمَا عِنْدِيْ تَمْرَةٌ'' میرے پاس کوئی کھجور نہیں ہے۔ غرض یہ ہے کہ مفرد تفصیل یا استغراق کا فائدہ جب ہی دیتا ہے کہ تکرار ہو یا نفی، حالاں کہ یہاں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، پھر کیسے مذکورہ فائدہ دے گا؟ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس باب سے ہے جس میں مفرد جمع کی جگہ اور نکرہ معرفہ کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت کی طرح: ﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ ﴾[3] [البقرۃ: ۱۰۶] ''جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلوا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۹۱۔ ۵۹۲) [2] حاشیۃ الشہاب علی تفسیر البیضاوي (۷/ ۱۴۰) [3] البحر المحیط (۷/ ۱۸۷)

اسی کی مثل ہی لے آتے ہیں۔'' رہی یہ بات کہ اقلام بہ صیغۂ جمع فرمایا تو یہ کثرت کا قصد کرنے کے لیے ہے۔

''بحر'' سے مراد بحرِ محیط ہے، کیوں کہ اس کے معرفہ ذکر کرنے سے متبادر (جلدی ذہن میں آنے والا) یہی ہے، اس لیے کہ دریا کا فردِ کامل وہی ہے۔ جمہور نے ﴿ وَالْبَحْرُ ﴾ برفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتداء ہے اور ﴿ يَمُدُّهٗ ﴾ اس کی خبر ہے اور جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی حال یہ ہے کہ بحرِ محیط باوجود اپنی وسعت اور فراخی کے اس کی مدد کریں، سات سمندروں کے ختم ہو جانے کے بعد، ایسی مدد کہ منقطع نہ ہو۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْبَحْرُ ﴾ مرفوع ہے فعلِ مقدر سے۔ تقدیر یہ ہے: ''وَلَوْ ثَبَتَ الْبَحْرُ حَالَ كَوْنِهِ تَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ'' کسی نے کہا ہے کہ مرفوع ہے اس بنا پر کہ ''أَنَّ'' پر معطوف ہے اور جو اس کے تحت میں ہے اس پر معطوف ہے۔ غرضیکہ رفع کی قراءت کی تین وجوہ مذکور ہیں۔ امام ابو عمرو اور ابن ابی اسحاق رحمہما اللہ نے ''اَلْبَحْرَ'' بہ نصب پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ''أَنَّ'' کے اسم پر معطوف ہے۔ یا فعلِ مضمر سے منصوب ہے، جس کی تفسیر ﴿ يَمُدُّهٗ ﴾ کر رہا ہے۔

امام ابن ہرمز اور حسن رحمہما اللہ نے ''يُمِدُّهُ'' بہ ضمِ یائے تحتانی و کسرِ میم پڑھا ہے ''أَمَدَّ'' سے ماخوذ اور جعفر بن محمد رحمہما اللہ نے ''وَالْبَحْرُ مِدَادُهُ'' پڑھا ہے۔ ﴿ لَوْ ﴾ کا جواب ﴿ مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ﴾ ہے۔ ﴿ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ﴾ سے مراد اللہ سبحانہ کے معلومات ہیں، کیوں کہ ان کی انتہا نہیں ہے۔ امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے کہا: ۔والله أعلم۔ ﴿ كَلِمٰتُ ﴾ سے مراد وہ ہیں جو مقدور و امکان میں ہیں، نہ وہ جو اس سے وجود اور زمان کی طرف نکلے ہیں۔ قفال رحمہ اللہ نے اس کی موافقت کی ہے۔ کہا: معنی یہ ہیں کہ درخت اگر قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی۔ پھر ان سے اللہ پاک کی کاری گری کے عجائبات لکھے جائیں، جو اس کی قدرت اور وحدانیت پر دال ہیں تو وہ عجائب تمام نہ ہوں۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قفال رحمہ اللہ کلمات کے معنی کو مقدورات کی طرف پھیر لے گئے، حالاں کہ آیت کو کلامِ قدیم پر محمول کرنا زیادہ درست ہے، مخلوق کے لیے انتہائی ضروری ہے اور جب انتہا کی نفی کی گئی تو یہ اس چیز کی انتہا کی نفی ہے جس کے ایجاد کرنے میں مستقبل میں قدرت رکھتا ہے۔

اب رہی وہ شے جو وجود میں آچکی ہے تو اس کا متناہی ہونا ضروری ہے اور تحقیق کی بنا پر قدیم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یقینی طور پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اس جگہ کلمات سے اشیاء کا علم اور حقائق مراد لیے جائیں، کیوں کہ اللہ عزوجل مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے جان چکا تھا کہ وہ آسمانوں اور زمین میں کیا پیدا کرنے والا ہے۔ اور جان چکا تھا اوزانِ ذرات کو جو اس میں ہیں۔ اور ساری اجناس کو جان چکا تھا اور جو کچھ ان میں بال اور عضو ہیں اور درختوں کے پتے کتنے ہیں اور ان میں کیا کیا قسمیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کی غرض یہ ہے کہ کلمات اللہ کے کثرتِ معانی کی خبر دے، وہ اپنی ذات میں غیر متناہی ہیں۔ صرف ان کی کثرت کو انسان کے فہم

کے قریب کر دیا ہے، مراد یہ نہیں ہے کہ ان سمندروں اور قلموں کے اکثر کے ساتھ وہ کلمات تمام ہو جائیں گے۔ نزولِ آیت کا سیاق اس پر دال ہے کہ کلمات سے مراد کلامِ قدیم ہے (کلامِ قدیم کلامِ نفسی ہے، جو اللہ پاک کی ذاتِ مقدس کے ساتھ قائم ہے۔ کذا قیل)۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ یہود نے کہا کہ اے محمد! اس قول سے ہم کیوں کر مراد لیے گئے: ﴿ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥] ''اور تمھیں علم میں سے بہت تھوڑے کے سوا نہیں دیا گیا۔'' حالاں کہ ہم کو تو تورات دی گئی ہے اور اس میں اللہ کا کلام ہے اور اس کے احکام ہیں اور تمھارے نزدیک وہ ہر شے کی تبیان ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تورات قلیل ہے کثیر میں سے اور یہ آیت نازل ہوئی۔ اور آیت مدنی ہے۔ انتہٰی. امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قریش نے کہا تھا: ''مَا أَكْثَرَ كَلَامَ مُحَمَّدٍ'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ بحر سے مراد آبِ شیریں ہے جو قلمیں اُگاتا ہے۔ رہا کھارہ پانی تو وہ ان کو نہیں اُگاتا۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''مَا أَسْقَطَ هٰذَا الْكَلَامَ، وَأَقَلَّ جَدْوَاهُ''[1] یعنی یہ بات کیا ساقط اور ردی ہے اور کیا کم اس کا فائدہ ہے۔ بالجملہ اللہ پاک کے کلمات غیر متناہی ہیں، ان کی کچھ انتہا ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ یعنی وہ ایسا غالب ہے کہ کوئی شے اس کو عاجز نہیں کرتی اور نہ ہی اس کی حکمت اور علم کے احاطے سے مخلوقات کے افراد میں سے کوئی فرد نکل سکتا ہے، جب وہ ایسا ہے تو اس کے کلمے اور اس کی حکمتیں بھی ختم نہیں ہوتیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴾۔ ﴿ كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ سے مراد ایک نفس کا پیدا کرنا اور اس کی بعث، یعنی مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نحویوں نے اسی طرح تقدیر کی ہے، یعنی ''كَخَلْقِ نَفْسٍ'' مثل ﴿ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ ﴾ [يوسف: ٨٢] کی۔[2] غرض یہ ہے کہ مضاف محذوف ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اللہ کی قدرت ساری مخلوق کو پیدا کرنے اور اسے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر ایسی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے پر اس کی قدرت ہے،[3] یعنی اس کی قدرت میں تھوڑے اور زیادہ برابر ہیں، ایک حالت دوسری حالت سے اس کو مشغول نہیں کرتی، ایک کام اسے دوسرے کام سے باز نہیں رکھتا، کیوں کہ اس کا کام تو کلمۂ ﴿ كُنْ ﴾ سے ہوتا ہے۔ ﴿ كُنْ ﴾ کہتے ہی کام فوراً ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ جس ذات کی صفت عزیز و حکیم ہے، اس کے نزدیک خلق اور بعث کیا چیز ہے۔ پھر یہ منکر لوگ جو بعث کو نہیں مانتے اور اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پوجتے ہیں رسول ﷺ اور قرآن کی شان میں بے ہودہ باتیں بکتے ہیں، اللہ ان

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٧٥۔ ٧٦) فتح القدير (٤/ ٣١٩) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٧٧) [3] معاني القرآن (٤/ ٢٠٠)

کے اقوال و افعال کو سنتا اور دیکھتا ہے، کیوں کہ وہ تو بڑا سننے والا ہے، ہر اس چیز کو جو سنائی دیتی ہے اور بڑا دیکھنے والا ہے ہر اس چیز کو جو دکھائی دیتی ہے، قیامت کے دن ان کو پوری پوری جزا دے گا۔[1]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٣٠﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا ہے، ہر ایک مقررہ وقت تک چلتا رہے گا، اور بے شک جو تم عمل کرتے ہو، اللہ اس سے خوب باخبر ہے (29) یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے اور بے شک اس کے سوا جسے وہ پکارتے ہیں باطل ہے اور بلاشبہ اللہ ہی بلند مرتبہ، بہت بڑا ہے (30)

قدرت و عظمتِ الٰہی کا بیان:

وقت مقررہ یا قیامت ہے، یا ہر ایک کا دورہ۔ انتہٰی.

اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ وہ رات کو دن میں اس طرح سے داخل کرتا ہے کہ رات کے کچھ حصے کو دن میں لے لیتا ہے تو دن لمبا ہو جاتا ہے اور رات چھوٹی۔ موسمِ گرما میں ایسا ہوا کرتا ہے۔ دن انتہائی درجہ تک بڑھ جاتا ہے، پھر اس میں کمی شروع کرتا ہے تو رات لمبی ہو جاتی ہے اور دن چھوٹا، موسم سرما میں ایسا ہوتا ہے۔ ﴿اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ایک انتہائی حد تک۔ یہ ایک قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ روزِ قیامت تک۔ دونوں معنی صحیح ہیں۔ پہلے قول کی شاہد وہ حدیث ہے جو سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابو ذر! کیا تو جانتا ہے کہ یہ سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا: بے شک وہ جاتا ہے، پھر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، پھر اپنے رب سے اِذن مانگتا ہے۔ قریب ہے کہ اس سے کہا جائے گا: لوٹ جا، جہاں سے تو آیا ہے۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا:

---

[1] فتح البيان (١٠/ ٢٩٦۔ ٢٩٨) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩)

کہ سورج بہ منزلہ ساقیہ (ساقیہ جوی خرد۔ جمع سواقی۔ كذا في الصراح) ہے۔ دن کو آسمان میں اپنے فلک، یعنی گھیرے میں چلتا ہے، پھر جب غروب ہوتا ہے تو رات کو اپنے گھیرے میں کھینچا جاتا ہے زمین کے نیچے، یہاں تک کہ اپنے مشرق سے طلوع کرتا ہے۔ اسی طرح چاند ہے۔[1] اس کی اسناد صحیح ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الحج: ۷۰] ''کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔'' اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک ساری اشیاء کا خالق اور عالم ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ۱۲] ''اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبٰطِلُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جو اپنی آیتوں کو تمھارے لیے ظاہر کرتا ہے تو اس لیے کہ تم ان سے اس بات پر استدلال کرو کہ وہ حق ہے، یعنی موجود حق ہے۔ خبردار! بے شک وہ حق ہے اور بے شک اس کے سوا ہر چیز باطل ہے، کیوں کہ وہ تو اپنے ماسوا سے غنی اور بے نیاز ہے اور ہر شے اس کی طرف محتاج ہے، اس لیے کہ ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، سب کے سب اس کی مخلوق اور غلام ہیں، ان میں سے کوئی بھی کسی ذرے کو حرکت دینے پر قادر نہیں ہے، مگر اس کے اذن سے۔ اگر تمام زمین والے اس کام کے لیے جمع ہو جائیں کہ ایک مکھی بنائیں تو اس سے عاجز ہوں، اسی لیے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبٰطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾ یعنی اللہ پاک ایسا برتر ہے کہ اس سے برتر کوئی نہیں ہے اور ایسا بزرگ ہے کہ ہر شے سے بڑا بزرگ ہے، چنانچہ اس کی نسبت ہر چیز خاضع اور عاجز اور ذلیل و حقیر ہے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کا خطاب ہر ایک کو ہے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے، یا رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے۔ ایلاجِ لیل ونہار کی تفسیر سورۃ الحج اور انعام میں گزر چکی ہے۔ جملہ ﴿ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ﴾ ماقبل پر معطوف ہے باوجود اختلاف ماضی و مضارع کے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ رات دن کا ایک دوسرے میں داخل کرنا ہر وقت متجدد ہے۔ رہی سورج اور چاند کی تسخیر تو یہ ایک ایسا امر ہے کہ اس میں کسی طرح کا تجدد و تعدد نہیں۔ تجدد و تعدد جو ہے وہ اس کے آثار میں ہے۔ ان کی تسخیر کے معنی یہ ہیں کہ اجلوں کا اندازہ کرنے اور

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٤٣)
[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٩٢۔ ٥٩٣)

آن کے فائدہ کو پورا کرنے کے لیے ان کو طلوع و غروب کے ساتھ مطیع اور فرماں بردار کر دیا ہے۔

﴿ اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ روزِ قیامت مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ طلوع اور غروب کا وقت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سورج کی مقررہ مدت آخر سال تک ہے اور چاند کی آخر ماہ تک۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

نکتہ:

یہاں بہ حرفِ ﴿ اِلٰٓى ﴾ فرمایا اور سورۃ الفاطر اور سورۃ الزمر میں بہ حرفِ لام، یعنی وہاں ﴿ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ فرمایا ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ اس جگہ اس کا وقوع دو آیتوں کے درمیان ہوا ہے، جو اس شے کی انتہا پر دال ہیں، جس کی طرف مخلوق منتہی ہو گی، ایک آیت تو ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ... الآیۃ ﴾ ہے۔ دوسری ﴿ اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا ﴾۔ اس لیے یہاں حرف ﴿ اِلٰٓى ﴾ مناسب ہے جو انتہا پر دال ہے اور سورت فاطر اور زمر میں جو ہے، وہ ذکر انتہا سے خالی ہے، کیوں کہ سورۃ الفاطر میں جو ہے اس کا ذکر نہ ابتدائے خلق کے ساتھ ہے نہ انتہائے خلق کے ساتھ اور سورت زُمَر میں ابتدائے خلق کے ساتھ مذکور ہے، اس لیے ان دونوں جگہوں میں حرفِ لام مناسب ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہر ایک، یعنی سورج اور چاند اجل تک پہنچنے کے لیے چلتا ہے۔ (كذا قاله الكرخي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ معطوف ہے جملہ ﴿ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ ﴾ پر۔ رؤیت کے تحت میں داخل ہے، یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ کو خوب خبر ہے تمھارے اعمال کی جن کو تم کرتے ہو ان میں سے کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ چیز بھی اس پر مخفی نہیں ہے، کیوں کہ جو ذات پاک ایسے عظیم امور پر قادر ہے تو جو کچھ اعمال وہ کر رہے ہیں اس کے علم پر بہ طریقۂ اولیٰ اس کی قدرت ہو گی۔ ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ... الآیۃ ﴾ یعنی یہ آیاتِ کریمہ مذکورہ جو علم کی وسعت اور شمولِ قدرت اور عجائبِ صنع (عجیب کاریگری) اور اللہ تعالیٰ کے ان کے ساتھ خاص ہونے پر مشتمل ہیں، اس سب سے کہ اللہ پاک ہی حق ہے، یعنی اس کی اُلوہیت ثابت ہے۔ غرض یہ ہے کہ حرفِ باء سببیت کے لیے ہے، یا فعلِ محذوف سے متعلق ہے۔ "أَيْ: فَعَلَ ذٰلِكَ لِيَعْلَمُوْا أَنَّهُ الْحَقُّ"، یعنی یہ سب اس نے اس لیے کیا ہے کہ اس بات کو جان لیں کہ مستحقِ عبادت وہی ہے اور یہ جان لیں کہ جو کچھ وہ اس کے ساتھ پکارتے ہیں وہ باطل ہے، یعنی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ﴾ سے مراد شیطان ہے۔[1] کسی نے کہا: وہ ہے جس کو اس کے ساتھ شریک کیا ہے، وہ بت ہو یا کچھ اور۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے۔

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٠٤)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾ معطوف ہے جملہ ﴿ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ ﴾ پر، یعنی وہ اپنی مکانت، منزلت اور مرتبہ میں عالی و بلند تر ہے۔ اپنی ربوبیت، سلطان اور غلبے میں صاحبِ کبریاء و بزرگی ہے۔ حاصل معنی یہ ہے کہ یہ کاریگری اور عجیب وغریب کام جس کا آیاتِ متقدمہ میں بیان ہو چکا ہے، یہ اس لیے کیا ہے تاکہ اس سے اللہ پاک کی حقیقت پر اور اس کے ماسوا کے باطل ہونے پر استدلال کریں اور اس پر استدلال کریں کہ وہ ساری مخلوق پر عالی اور برتر ہے اور سب سے زیادہ بزرگ ہے، اس کے لیے صفاتِ علیا اور اسمائے حسنیٰ ہیں۔ "وَهُوَ عَلِيُّ الذَّاتِ، سَمِيُّ الصِّفَاتِ، كَبِيْرُ الشَّأْنِ، جَلِيْلُ الْقَدَرِ، رَفِيْعُ الذِّكْرِ، مُطَاعُ الْأَمْرِ، جَلِيُّ الْبُرْهَانِ، سُبْحَانَهُ مَا أَعْظَمَ شَأْنَهُ" پھر اللہ پاک نے اپنی عجیب کاریگری اور قدرت اور انتہائی حکمت اور نعمتوں میں سے ایک اور قسم کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ
مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۳۱ وَاِذَا
غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ
فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا
كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝۳۲

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بے شک سمندر میں اللہ کے فضل سے کشتیاں چلتی ہیں، تاکہ وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے، اس میں بلاشبہہ ہر بڑے صابر شاکر کے لیے نشانیاں ہیں (31) اور جب (سمندر میں) سائبانوں کے مانند کوئی موج انھیں ڈھانپ لیتی ہے تو وہ اطاعت وفرماں برداری کو اسی (اللہ) کے لیے خاص کرتے ہوئے اللہ کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ انھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو ان میں سے چند میانہ رو (ہی عہد پر قائم رہتے) ہیں اور ہر عہد توڑنے والا ناشکرا ہی ہماری آیات کا انکار کرتا ہے (32)

قدرتِ الٰہی کی نشانیوں کا بیان:

اعتدال پر رہتے ہیں، یعنی کوئی بیچ کی چال پر ہے، یعنی وہ چال جو خوف کے وقت تھی، ایسی کیفیت کسی کی نہیں رہتی، مگر بالکل بھول بھی نہ جائے۔ ایسے بھی کم ہیں، نہیں تو اکثر اللہ کی قدرت کے منکر ہوتے ہیں۔ نجات کو اپنی تدبیر

---

[1] فتح البیان (۱۰/ ۲۹۸۔ ۲۹۹)

کی وجہ سے یا کسی روح کی مدد کی وجہ سے سمجھتے ہیں۔ انتہی۔

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ وہی ہے جس نے دریا کو مسخر اور مطیع کر دیا ہے، تاکہ اس میں اس کے حکم سے جہاز چلیں، یعنی اس کے لطف و کرم سے اور مسخر کرنے سے، کیوں کہ اگر وہ پانی میں ایسی قوت پیدا نہ کرتا، جس سے وہ جہازوں کو اٹھاتا ہے تو وہ ہرگز نہ چلتے۔ اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ﴾ یعنی تاکہ تم کو اپنی قدرت دکھائے کہ دیکھو وہ کیسی عظیم الشان قدرت والا ہے، پانی کو کیسی قوت عطا کی ہے کہ بڑے بڑے جہازوں کو تنکے کی طرح اٹھائے پھرتا ہے اور خود جہاز اس کی قدرت کا ایک بڑا نمونہ ہے کہ کس قدر آدمیوں کو اور بھاری وزن کو لے کر پانی کی پشت پر بآسانی چلتا ہے، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں واسطے ہر اس شخص کے جو تکلیف میں بڑا صبر کرنے والا ہے اور راحت و آرام میں شکر کرنے والا ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ یعنی جس وقت ان کو موج اس طرح ڈھانک لیتی ہے جیسے پہاڑ اور بدلیاں تو اللہ کو صرف اسی کی بندگی کرتے ہوئے پکارتے ہیں، جس طرح کہ دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ''اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم ہو جاتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٦٥] ''پھر جب وہ (مشرکین) کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اطاعت و فرماں برداری کو اسی (اللہ) کے لیے خاص کرتے ہوئے اللہ کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ انھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو فوراً وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔''

پھر فرمایا: ﴿ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: کافر۔[1] گویا اس جگہ ﴿ مُّقْتَصِدٌ ﴾ کی تفسیر جاحد اور منکر کے ساتھ کی ہے، جیسے فرمایا ہے: ﴿ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٦٥] ''پھر جب وہ انھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو فوراً وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔'' امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمل میں توسط کرنے والا ہے[2] اور یہ جو ابن زید رحمہ اللہ نے کہا، پس یہ اس آیت میں مراد لیا گیا ہے: ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ﴾ [الفاطر: ٣٢] ''پھر بعض تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں میانہ رو ہیں۔''

چنانچہ اس جگہ ﴿ مُّقْتَصِدٌ ﴾ یہی بیچ کی چال اختیار کرنے والا ہے اپنے عمل میں، اور احتمال ہے کہ یہاں بھی یعنی آیتِ باب: ﴿ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ﴾ میں بھی یہی معنی مراد ہوں اور آیت انکار کے باب سے ٹھہرے اس شخص پر جس نے دریا کی ہولناکیوں، بڑے بڑے امور اور ظاہر نشانیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ پاک نے اس کو اس مصیبت سے نجات دے کر انعام فرمایا تو اس کو چاہیے تھا کہ وہ اس کا مقابلہ اپنے اچھے اور مکمل

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٥٧) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٥٧)

اور کامل عمل کے ساتھ اور عبادت میں مستقل مزاجی اور دوام اختیار کر کے اور نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے کر کرتا۔ چنانچہ جس نے اس کے بعد صرف اقتصاد وتوسط کیا تو وہ مقصر ہوگا، یعنی کمی کرنے والا۔ حالت یہ ہے کہ جب ایسی سخت قسم کی مصیبت سے نجات دی اور بڑا انعام کیا تو چاہیے تھا کہ اس کے شکر میں خوب پورا عملِ خیر کرتا، پس جب ایسا نہ کیا اور درمیانے درجے کا عمل کیا تو قاصر ٹھہرا اور اس کا مستحق ہوا کہ اس پر توسطِ عمل کا انکار کیا جائے۔ واللہ أعلم۔ ﴿خَتَّارٍ﴾ بہ معنی غدّار ہے۔ امام مجاہد، حسن، قتادہ اور مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے اس کو روایت کیا ہے، یہ وہ شخص ہے کہ جب معاہدہ کرتا ہے تو اپنے عہد کو توڑ ڈالتا ہے۔ "ختر" مکمل اور پورے غدر کو کہتے ہیں، یعنی کامل تر بدعہدی۔ عمرو بن معدیکرب نے کہا ہے:

وَإِنَّكَ لَوْ رَأَيْتَ أَبَا عُمَيْرٍ ... مَلَأْتَ يَدَيْكَ مِنْ غَدْرٍ وَّخَتْرٍ [1]

شاعر عمرو بن معدیکرب ابوعمیر کی مذمت کرتا ہے کہ اگر تو ابوعمیر کو دیکھے، اس سے ملے جلے تو اپنے ہاتھوں کو بدعہدی اور کامل تر بدعہدی سے بھر لے گا۔ غرض یہ ہے کہ وہ بڑا پکا غدار اور بدعہد ہے، اس سے تجھ کو سوا اس کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، اس کے پاس اس جنس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ﴿كَفُوْرٍ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ نعمتوں کا بڑا منکر اور ناشکری کرنے والا ہے۔ ان کا شکر نہیں کرتا، بلکہ جان بوجھ کر ان کو بھلاتا ہے اور ان کا ذکر نہیں کرتا۔ [2] (کذا في ابن کثیر)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿اَلْفُلْكَ﴾ سے مراد کشتیاں اور جہاز ہیں۔ ﴿بِنِعْمَتِ اللّٰهِ﴾ سے مراد بندوں پر اللہ کا لطف وکرم اور رحمت ہے، یا مراد ریح، یعنی ہوا ہے، کیوں کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہوا بھی ایک نعمت ہے۔ یعنی دریا میں جہازوں کا چلنا تم پر اللہ پاک کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ہے، کیوں کہ جس وقت تم روزی کی تلاش میں دریا میں سفر کرتے ہو تو وہ، یعنی جہاز تم کو ڈوبنے سے بچاتے ہیں۔ امام ابن ہرمز رحمہ اللہ نے "بنعمات اللہ" پڑھا ہے جمع نعمت کی۔ [3] حرفِ باء صلہ وتعدیہ کے لیے ہے، یعنی کیا نہ دیکھا تو نے کہ دریا میں جہاز اللہ کی نعمت کو چلاتے ہیں۔ یا سببیت کا ہے، یعنی چلتے ہیں اللہ کی نعمت، لطف، کرم اور رحمت کے سبب سے۔ یا واسطے حال، ملابست اور مصاحبت کے ہے، مع اپنے متعلق کے حال واقع ہوا ہے۔ "أَي: مَصْحُوْبَةً بِنِعْمَةِ اللّٰهِ"، یعنی اس حال میں چلتے ہیں کہ اللہ کی نعمت کو لیے ہوئے ہیں۔

﴿لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ﴾ میں حرفِ ﴿مِنْ﴾ تبعیض کا ہے، یعنی تاکہ تم کو اپنی بعض نشانیاں دکھا دے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: وہ جہازوں کا دریا میں ہوا کے ساتھ چلنا ہے۔ ابن شجرہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿مِنْ اٰيٰتِهٖ﴾ سے مراد اللہ پاک کی قدرت ہے، جس کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ امام نقاش رحمہ اللہ نے کہا: وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ دریا سے ان کو دیتا

---

[1] تفسیر الطبري (۲۰/ ۱۵۷۔ ۱۵۸) [2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۹۳) [3] تفسیر القرطبي (۱٤/ ۷۸)

ہے۔[1] جملہ ﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے، یعنی دریا میں جہازوں کے چلنے کو دیکھنا چاہیے اور اس میں ضرور غور وفکر کرنا چاہیے، اس لیے کہ بے شک اس میں البتہ عظیم نشانیاں اور عبرتیں ہیں، ہر اس شخص کے لیے جو صبرِ بلیغ اور شکرِ کثیر کرتا ہے۔ اللہ کی نافرمانیوں کے ارتکاب سے اپنے نفس کو روکتا ہے اور اس کی نعمتوں کا شکر کرتا ہے۔ یہ دونوں مومن کی صفتیں ہیں۔ ایمان کے دو حصے ہیں: نصف ایمان شکر ہے اور نصف ایمان صبر۔ گویا یوں فرمایا ہے کہ اس میں البتہ ہر مومن کے لیے نشانیاں ہیں، اس طرح سے کہ اپنے نفس کو غور وفکر کرنے کے لیے آمادہ اور تیار کرتا ہے کہ دیکھو دور دراز کے ملکوں اور دور کی جگہوں کی طرف گیا اور ڈوبا نہیں۔ دور کے مقامات کی سیر کی۔ آنے جانے میں دو ہواؤں سے چلتا رہا، کبھی ایک ہی ہوا سے چلا۔

اللہ پاک نے ہمارے باپ نوح علیہ السلام کو نجات دی اور اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہا بچا لیا اور سارے زمین والوں کو ڈبو دیا۔ اس کے سوا اپنے مزید حالات اور معاملات اور کاموں اور صنائع میں سوچ بچار کرتا ہے۔ ﴿ کَالظُّلَلِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پہاڑوں کی طرح جو سایہ کرتے ہیں، اس پر جو ان کے نیچے ہوتا ہے۔ موج کو اس شے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو اپنی بڑائی کی وجہ سے انسان پر سایہ کرتی ہے، جو اس کے نیچے ہوتا ہے، پہاڑ ہو یا بدلی یا ان کے سوا کچھ اَور۔ رہی یہ بات کہ موج کی تشبیہ ظُلل سے دی، حالاں کہ موج واحد ہے اور ظُلل جمع؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موج چونکہ ایک کے بعد ایک پر چڑھتی ہوئی آتی ہے تو اس معنی میں اس میں جمعیت ہوگئی۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَوْجٌ ﴾ جمع کے معنی میں ہے، کیوں کہ وہ مصدر ہے۔

﴿ مَوْجٌ ﴾ کی اصل حرکت و ازدحام ہے، اس معنی سے یہ محاورہ ہے: "مَاجَ الْبَحْرُ وَمَاجَ النَّاسُ" یعنی موجزن ہوا دریا اور موج زن ہوئے لوگ۔ جبکہ دریا میں موجوں کی کثرت ہوتی ہے اور لوگوں کا ازدحام ہوتا ہے، ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے ہیں، باہم کشمکش ہوتی ہے اور گھمسان اور کھچا کھچ ہوتا ہے، جس طرح کہ لڑائیوں میں یا میلے ٹھیلے میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ بالجملہ محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ نے "کَالظِّلَالِ" پڑھا ہے "ظل" کی جمع۔[2] مطلب یہ ہے کہ دریا میں جس وقت ان کو موجیں پہاڑوں یا بدلیوں کی طرح ڈھانک لیتی ہیں تو اس وقت وہ اپنی نجات کے لیے صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ کو پکارتے ہیں، اللہ کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کرتے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی نہ ضرر پہنچاتا ہے اور نہ نفع دیتا ہے، لیکن ان کی طبیعتوں پر ان کی عادات اور مرے ہوئے لوگوں کی تقلید غالب ہو جاتے ہیں، پھر جب ایسی ہولناک حالت کا سامنا کرتے ہیں تو اللہ پاک کی وحدانیت اور یکتائی کا اعتراف کرتے ہیں اور جس بلا اور مصیبت میں پڑ گئے ہیں اس سے نجات اور سلامتی چاہنے کے لیے اپنے دین کو اللہ سبحانہ کے لیے خالص کرتے ہیں، اس لیے کہ جو سختیاں ان پر اچانک آپڑیں اس کی وجہ سے اپنی خواہشات اور آبائے ضالین کی تقلید جن

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ٧٨) [2] تفسیر القرطبي (١٤/ ٧٩)

فطرتِ ایمانی سے جھگڑا ہے، وہ زائل ہوگئی تو وہی فطرت واپس آ گئی، اب خالص اللہ کو پکارنے لگے کہ اے ہمارے سچے رب! ہم تجھی کو پوجیں گے، تیرا شریک کسی کو نہ کریں گے، تو ہم کو اس آفت سے بچا لے۔ چونکہ اللہ پاک اکرم الاکرمین اور ارحم الراحمین ہے اور اخلاص اور توحید کو پسند کرنے والا ہے، کافر بھی اگر اخلاص سے دعا کرے تو قبول فرمالیتا ہے، اس لیے ان کی دعا قبول کی اور اس مصیبت سے نجات دی۔ پھر جب ان کو دریا سے خشکی کی طرف بچا لایا تو وہ دو قسم کے ہوگئے۔ ان میں سے ایک قسم تو مقتصد ہوئے، یعنی عادل، وفا کرنے والے خشکی میں اس اخلاصِ دین کے عہد کو جو اللہ پاک سے دریا کے اندر کیا تھا، اس عہد پر باقی رہے، اس کے بعد کہ اللہ پاک نے دریا کی ہولناکی سے ان کو نجات دی اور خشکی کی طرف صحیح وسالم نکال لایا۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ مُّقْتَصِدٌ ﴾ کے معنی مومن کے ہیں جو توحید اور اطاعت کے ساتھ تمسک کرنے والا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقتصد وہ ہے جو قول میں اضمار کرنے والا (پوشیدہ کرنے والا) ہے واسطے کفر کے۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا: مقتصد وہ ہے جو سابق بالخیرات اور ظالم لنفسہ کے درمیان، یعنی توسط کرنے والا ہے۔ یہ وہی ہے جس کی بدیاں اور نیکیاں برابر ہوئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ متوسط کفر اور ایمان کے درمیان، کیوں کہ کچھ انزجار تو اس کو ہو گیا اور بعض ان میں سے اپنے کفر پر باقی رہے۔ اس لیے کہ ان میں سے بعض بعض سے قول میں سخت تر تھے اور افترا میں بہت زیادہ تھے۔ زیادہ صحیح وہی قول ہے جو پہلے ذکر ہو چکا ہے اور عبارت میں حذف ہوگا۔ تقدیر یہ ہوگی: "فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ كَافِرٌ" اس محذوف پر یہ قول دال ہے۔

﴿ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴾ یعنی ان میں سے بعض وہ ہیں کہ عہد کو پورا کیا اور بعض وہ ہیں کہ جو عہد کیا تھا اس کو پورا نہ کیا۔ انکار نہیں کرتا ہماری آیتوں کا مگر ہر ﴿ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴾ کیوں کہ اس نے عہدِ فطری کو توڑ ڈالا اور جس بات پر دریا میں تھا اس کو ترک کیا۔ یہ دو لفظ ﴿ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴾ کے مقابلے میں فرمائے ہیں، جس طرح کہ ﴿ كَفُوْرٍ ﴾ ﴿ شَكُوْرٍ ﴾ کے مقابلے میں ہے۔ ختر بدتر اور قبیح تر غدر کو کہتے ہیں، اسی معنی سے اعشیٰ کا یہ قول ہے:

بِالْأَبْلَقِ الْفَرْدِ مِنْ تَيْمَاءَ مَنْزِلُهُ　　　حِصْنٌ حَصِيْنٌ وَجَارٌ غَيْرُ خَتَّارِ

("أَبْلَق": ایک حصار کا نام ہے، مثل میں ہے: "تَمَرَّدَ مَارِدٌ وَّعَزَّ الْأَبْلَقُ" یہ دو قلعے ہیں۔ زباء ملکہ جزیرہ نے ان کا قصد کیا تھا، پھر جب اس کو ان پر غلبہ حاصل نہ ہوا تو یہ مثل کہی۔ تیماء: دشت کو کہتے ہیں اور ایک موضع کا نام ہے، یعنی اس کی منزل تیماء کی ابلق فرد و یکتا میں ہے، وہ ایک محکم و استوار قلعہ ہے اور پڑوسی بد عہد نہیں ہے۔ غرض یہ ہے کہ محبوب ایک ایسی محفوظ جگہ میں ہے کہ اس کا ملنا دشوار ہے)۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "ختر" بہ معنی غدر ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "خَتَرَهُ فَهُوَ خَتَّارٌ أَيْ: غَدَّارٌ"۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا: یہ جمہور کا قول ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٧٩)

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ خَتَّارٍ ﴾ بہ معنی جاحد ہے، یعنی منکر۔[1]

جحدِ آیات انکارِ آیات ہے۔ ﴿ كَفُوْرٍ ﴾ "عَظِيْمُ الْكُفْرِ بِنِعَمِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ"، یعنی اللہ کی نعمتوں کی بہت ناشکری کرنے والا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ﴿ خَتَّارٍ ﴾ بہ معنی "جَحَّادٌ"[2] یعنی بڑا منکر۔ کہا ہے کہ یہ آیت عکرمہ بن ابی جہل کے حق میں نازل ہوئی۔ قصہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے سال وہ دریا کی طرف بھاگا، چنانچہ ان کو ایک تیز ہوا آئی تو عکرمہ بولا کہ اگر اللہ نے ہم کو اس سے نجات دی تو البتہ میں محمد ﷺ کی طرف رجوع کروں گا اور البتہ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں رکھ دوں گا۔ چنانچہ وہ تھم گئی اور عکرمہ مکے کی طرف لوٹ آیا، پھر مسلمان ہوا اور اس کا اسلام اچھا ہوا۔[3] (ذکرہ الخازن)۔ ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ سے مراد عکرمہ رضی اللہ عنہ ہوا، کیوں کہ اس نے عہد کو وفا کیا۔[4]

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَ اخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۝۳۳

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور ڈرو اس دن سے جب کوئی باپ اپنی اولاد کے کام نہ آئے گا اور نہ اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آئے گی، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، لہٰذا دنیاوی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے اور کوئی دھوکے باز تمھیں اللہ کے متعلق دھوکے میں نہ ڈالے (33)

اللہ تعالیٰ اور قیامت سے خوف کرنے کا بیان:

شیطان کا دھوکا یہ ہے کہ اللہ غفور رحیم ہے اور دنیا کا جینا بہکا دے کہ جس کو یہاں بھلائی ملی ہے، اس کو وہاں بھی بھلائی ہے، یعنی جو اس دنیا میں عیش وعشرت میں ہے، اس کو آخرت میں بھی عیش ہے۔ انتھٰی۔

اللہ پاک قیامت کے دن سے لوگوں کو ڈراتا ہے اور ان کو تقویٰ کا اور اللہ سے ڈرنے کا اور روزِ قیامت کا خوف رکھنے کا حکم کرتا ہے، جس جگہ کوئی اپنے بیٹے کے کام نہ آئے گا، یعنی اگر باپ چاہے کہ اپنی جان اس کے بدلے میں دے تو یہ بات اس سے قبول نہ کی جائے گی، اسی طرح اگر بیٹا چاہے کہ اپنی جان باپ کے بدلے میں دے تو یہ بات اس سے قبول نہ کی جائے گی، پھر ان کو وعظ کرنا شروع کیا کہ ﴿ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ﴾ یعنی دنیا کا جینا تم کو مشغول نہ کرے، غفلت میں نہ ڈالے کہ اس میں مطمئن ہو کر آخرت سے غافل ہو جاؤ۔ ﴿ وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴾ یعنی شیطان۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے،[5] کیوں کہ شیطان

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٧٩۔ ٨٠) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٥٨) [3] تفسير الخازن (٥/ ٢١٩)

[4] فتح البيان (١٠/ ٣٠٠۔ ٣٠١) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠١) تفسير الطبري (٢٠/ ١٥٩)

ابن آدم کو دھوکا دیا کرتا ہے اور اسے وعدے اور تمنائیں دیتا ہے، حالاں کہ اس میں سے کچھ بھی نہیں ہے، جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ [النساء: ۱۲۰] ''شیطان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں امیدیں دلاتا ہے، مگر شیطان کے سارے وعدے فریب کے سوا کچھ نہیں۔''

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام نے فرمایا: جبکہ میں نے اپنی قوم کی بلا، یعنی مصیبت اور آزمائش دیکھی تو میرا حزن شدید ہوا اور مجھے بہت زیادہ غم ہوا، رنج کے مارے میری نیند جاتی رہی۔ پھر میں نے اپنے رب سے تضرع وزاری کی، نماز پڑھی اور روزہ رکھا، میں اس تضرع میں رو رہا تھا کہ اس وقت میرے پاس فرشتہ آیا تو میں نے اس سے کہا: تو مجھے خبر دے کہ آیا مصدقین کی روحیں ظالموں کے لیے شفاعت کریں گی یا باپ اپنے بیٹوں کے لیے شفاعت کرے گا؟ وہ بولا: بے شک قیامت میں معاملات کے فیصلے ہوں گے اور جو جس کے اعمال ہوں گے، ویسا ہی اس کو اجر ملے گا، اس میں کوئی رخصت نہیں ہے، اس دن رحمان کی اجازت کے بغیر کوئی کلام نہ کرے گا اور نہ اس دن باپ اپنے بیٹے کی طرف سے پکڑا جائے گا اور نہ بیٹا باپ کی طرف سے اور نہ بھائی کی طرف سے اور نہ غلام اپنے مالک کی طرف سے۔ نہ کوئی اپنے غیر کے غم سے غمگین ہوگا، نہ اس کے رنج سے رنجیدہ ہوگا اور نہ کوئی اس پر رحم کرے گا۔ ہر ایک اپنے نفس کے بارے میں مشفق اور خائف ہوگا اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی طرف سے نہ پکڑا جائے گا۔ ہر ایک کو اپنی فکر مہموم کرے گی اور اپنے بوجھ پر روئے گا اور اپنے بھار کو خود اٹھائے گا اور اس کے بوجھ کو اس کے ساتھ کوئی اور نہیں اٹھائے گا۔ اس کو امام ابن ابی حاتم نے روایت کیا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ لَا يَجْزِيْ ﴾ کے معنی ''لَا يُغْنِيْ وَلَا يَقْضِيْ'' ہیں، یعنی کوئی باپ اپنے بیٹے سے کچھ کفایت نہ کرے گا اور اس کی طرف سے کچھ ادا نہ کرے گا اور نہ ہی کسی وجہ سے اس کو کسی قسم کا کوئی فائدہ پہنچائے گا، کیوں کہ وہ خود اپنے نفس کے ساتھ مشغول ہوگا، اسے اپنی پڑی ہوگی۔ ﴿ وَلَا مَوْلُوْدٌ ﴾ مبتدائے اول ہے اور ﴿ هُوَ ﴾ مبتدائے ثانی، ﴿ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ﴾ اس کی خبر۔ پھر یہ جملہ ﴿ مَوْلُوْدٌ ﴾ کی خبر ہے۔ چونکہ ﴿ مَوْلُوْدٌ ﴾ نکرہ سیاقِ نفی میں واقع ہوا ہے، اس لیے اس کا مبتداء ہونا جائز ہوا۔ یا یوں کہو کہ ﴿ وَلَا مَوْلُوْدٌ ﴾ معطوف ہے ﴿ وَالِدٌ ﴾ پر اور جملہ ﴿ هُوَ جَازٍ ﴾ صفت ہے ﴿ مَوْلُوْدٌ ﴾ کی۔ کلمۂ ﴿ شَيْـًٔا ﴾ میں ﴿ يَجْزِيْ ﴾ اور ﴿ جَازٍ ﴾ کا تنازع ہے، ہر ایک کہتا ہے کہ وہ میرا مفعول ہو، چنانچہ اس کا فیصلہ یہ ہوگا کہ اس کو ﴿ جَازٍ ﴾ کا مفعول ٹھہرا دیں گے اور ﴿ يَجْزِيْ ﴾ کے واسطے ایک ''شَيْـًٔا'' اور مقدر کر دیں گے، جیسا کہ امام محلی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2] لو! تنازع کا فیصلہ ہو چکا۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٩٣۔ ٥٩٤) [2] تفسير الجلالين (١/ ٥٤٤)

اب رہی یہ بات کہ یہ دونوں جملے کیا ہیں، ماقبل سے ان کو کیا رشتہ ہے؟ تو رشتہ یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ يَوْمًا ﴾ کی صفت ہیں اور کلمۂ ”فِيْهِ“ دونوں میں بعد ﴿ وَلَدِهٖ ﴾ اور ﴿ وَالِدِهٖ ﴾ کے مقدر ہے۔ طرزِ کلام یہ ہے کہ یوں ہوتا: ”وَلَا وَلَدِ عَنْ وَّالِدِهٖ“ مگر یوں نہ کہا اور کلام کے طور کو بدل کر کئی تاکیدوں سے اس کو موکد کیا: اول تو جملہ اسمیہ کہ فعلیہ سے موکد تر ہے، کیوں کہ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرے کلمۂ ﴿ هُوَ ﴾ کا کہ ضمیر فصل ہے۔ تیسرے کلمۂ ﴿ مَوْلُوْدٌ ﴾ کا، گویا اس جملے کو سراپائے تاکید کر دیا، تو اس کا یہ سبب ہے کہ آیت میں مومنین کو خطاب ہے اور ان کے باپ دادا کفر پر مرچکے تھے، انھوں نے یہ طمع کیا کہ آخرت میں شفاعت کرکے ان کو نفع پہنچائیں گے تو اللہ پاک نے چاہا کہ اس خیال سے ان کی طمع کو بالکل منقطع کر دیا جائے، اس لیے بیٹے کے باپ کے کام نہ آنے کو بڑی دھوم دھام سے ذکر فرمایا۔ دوسری یہ بات ہے کہ جب باپ اپنی بہت شفقت و محبت کے باوجود بیٹے کے کام نہ آئے گا تو بیٹا تو بطریقِ اولیٰ کسی طرح بھی کام نہ آئے گا، کیوں کہ اس کو باپ کے ساتھ وہ شفقت اور محبت نہیں ہے، جو باپ کو بیٹے سے ہے۔

لفظ ﴿ مَوْلُوْدٌ ﴾ میں جو تاکید ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی شخص اپنے حقیقی و قریبی عزیز باپ کے لیے شفاعت کرے گا تو اس کی شفاعت مقبول نہ ہوگی، پھر دادا پردادا کے لیے سفارش کرنے کا کیا ذکر! کیوں کہ ولد کا کلمہ بیٹے پر اور بیٹے کے بیٹے پر بولا جاتا ہے بہ خلاف مولود کے کہ یہ وہی بیٹا ہے، جو تجھ سے پیدا ہوا ہے۔[1] (کذا في الکشاف) غرضیکہ اللہ پاک نے قرابت داروں میں دو افراد کا ذکر فرمایا ہے، یعنی باپ اور بیٹا، ان میں سے ایک کو دوسرے سے انتہا درجے کی شفقت و محبت ہوتی ہے، جب یہی ایک دوسرے کے کام نہ آئیں گے تو ان کے سوا اور رشتہ دار بالاولیٰ کام نہ آئیں گے۔ پھر اجنبی لوگوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔

نیز اس آیت میں ایک بات یہ ہے کہ اعلیٰ سے ادنیٰ پر اور ادنیٰ سے اعلیٰ پر تنبیہ کی ہے۔ دنیا میں والد اپنی کمال شفقت کی وجہ سے اپنے بیٹے کے کام آتا ہے اور بیٹا باپ کے کام آتا ہے، اس لیے کہ باپ کا بیٹے پر تربیت وغیرہ کا حق ہے۔ پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو ہر انسان نفسی نفسی پکارے گا، اس کو نہ کسی قریبی کی فکر ہوگی اور نہ دور کے رشتہ دار کا غم۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”كُلُّ امْرِئٍ تَهُمُّهُ نَفْسُهُ“[2] یعنی ہر آدمی کو اس کا نفس ہی غم اور فکر میں ڈالے گا۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ لَّا يَرْجُوْ سِوَاكَ وَلَا يَعُوْلُ عَلٰى غَيْرِكَ. آمین۔ کسی نے ”لَا يُجْزِيْ“ پڑھا ہے ”أَجْزٰى إِذَا أَغْنٰى“ سے۔

﴿ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ یعنی بے شک اللہ کا وعدہ بعث وغیرہ کا حق ہے اس کے خلاف نہ ہوگا۔ چنانچہ جس خیر کا اس نے وعدہ کیا ہے اور جس شر کی اس نے وعید سنائی ہے تو وہ ضرور ہونے والا ہے۔ ﴿ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ

[1] الکشاف (۳/ ۵۱۱) [2] تفسیر البغوي (٦/ ٢٩٤)

الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴾ یعنی تم کو دنیا کی زندگی اور اس کی زینتیں اسلام و اعمالِ صالح سے دھوکا نہ دیں، کیوں کہ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت اور رونق زائل ہو جانے والی ہے اور فنا ہونے والی ہے۔ جمہور نے "غَرُوْر" بہ فتحِ غین پڑھا ہے، مراد شیطان ہے، یعنی وہ تم کو یہ دھوکا نہ دے کہ تم سے توبہ اور بخشش طلب کرنے میں تاخیر کرا دے، پھر تمھیں گناہوں پر دلیر کر دے۔ یہ اسی کی شان ہے کہ لوگوں کو دھوکا دیا کرتا ہے۔ جھوٹی جھوٹی اور بے کار و خالی آرزوئیں اور تمنائیں ان کے دلوں میں ڈالتا رہتا ہے، آخرت سے غافل کرتا ہے اور ان کو راہِ حق سے روکتا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گناہ کیے جاتا ہے اور مغفرت کی تمنا کرتا ہے۔ امام سماک بن حرب، ابو حیوہ اور ابن سمیفع رحمہ اللہ نے بہ ضمِ غین پڑھا ہے مصدر "غَرَّ یَغُرُّ غُرُوْرًا"[1] کا۔ یہ بھی جائز ہے کہ مصدر ہو اور بطور مبالغے کے شیطان کی صفت واقع ہو۔ ﴿ بِاللّٰهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ بہ سبب اللہ کے، یا اللہ کے حِلم اور مہلت دینے کے سبب سے۔[2]

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾

بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے جو (ماؤں کے) پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ خوب جاننے والا، خوب باخبر ہے (34)

عالم الغیب اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ غیب کی مفاتیح یعنی کنجیاں ہیں، جن کا علم صرف اللہ سبحانہ کو ہے، ان کو کوئی نہیں جانتا مگر اس کے بعد کہ اللہ ہی اس کو بتائے۔ چنانچہ قیامت کے وقت کا علم ایسا ہے کہ اس کو نہ کوئی نبی مرسل جانتا ہے نہ کوئی مقرب فرشتہ۔ اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی اس کے وقت میں ظاہر کرے گا۔ اسی طرح بارش نازل کرنا ہے کہ اس کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا، لیکن جس وقت وہ اس کا امر فرماتا ہے تو جو فرشتے اس پر مقرر ہیں، اس کو جان لیتے ہیں اور وہ شخص جان لیتا ہے جس کو اللہ اپنی مخلوق میں سے چاہے۔ اسی طرح اللہ کے سوا کوئی بھی اس شے کو نہیں جانتا جو رحموں میں ہے اور جس کے پیدا کرنے کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے، لیکن جس وقت اس کے مذکر یا مونث یا بد بخت اور نیک بخت ہونے کا امر فرماتا ہے تو جو فرشتے اس کام پر مقرر ہیں، وہ اس کو جان لیتے ہیں اور وہ شخص جان لیتا ہے جس کو اپنی مخلوق میں سے اللہ بتانا چاہے۔ اسی طرح کوئی نفس نہیں جانتا کہ اپنی دنیا اور آخرت میں کل کیا

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ٨٠) [2] فتح البیان (١٠/ ٣٠٢۔ ٣٠٣)

کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کو موت کس زمین پر آئے گی، اپنے شہر میں یا اس کے سوا کسی اور شہر میں۔ اس بات کا کسی کو علم نہیں۔

یہ آیتِ کریمہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (پھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو؟'' سنتِ مطہرہ میں ان پانچوں باتوں کا نام مفاتیح الغیب وارد ہوا ہے:

① امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن بریدہ سے روایت کیا ہے، عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے اپنے والد بریدہ رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: « خَمْسٌ لَّا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ »[1] (هذا حديث صحيح الإسناد و لم يخرجوه) یعنی پانچ چیزیں ہیں کہ نہیں جانتا ان کو مگر اللہ عزوجل۔

② امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ لَّا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ... الآية ﴾ »[2] (انفرد بإخراجه البخاري فرواه في كتاب الاستسقاء في صحيحه عن محمد بن يوسف الفريابي عن سفيان بن سعيد الثوري به، و رواه في التفسير من وجه آخر بسنده أن عبد الله بن عمر قال: قال النبي ﷺ: مفاتيح الغيب خمس، ثم قرأ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ... الآية ﴾ انفرد به أيضاً)

وَرَوَاهُ الْإِمَامُ أَحْمَدُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أُوتِيتُ مَفَاتِيحَ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا الْخَمْسَ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ... الآية ﴾ یعنی مجھے ہر چیز کی کنجیاں دی گئی ہیں مگر پانچ۔[3] (وكذا رواه عن محمد بن جعفر عن شعبة عن عمرو بن مرة به وزاد في آخره قال: قلت له: أنت سمعته من عبدالله؟ قال: نعم، أكثر من خمسين مرة، و رواه أيضا عن وكيع عن مسعر عن عمرو بن مرة به، و هذا إسناد حسن على شرط السنن ولم يخرجوه)

③ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس تشریف فرما تھے کہ اس وقت ایک شخص چلتا ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پھر عرض کی: یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے؟

---

① مسند أحمد (٥/ ٣٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٢٥٥)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩٢۔ ٤٥٠٠) مسند أحمد (٢/ ٢٤)

③ مسند أحمد (٢/ ٨٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے پہلے حصے (مجھے ہر چیز کی... پانچ) کو شاذ کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں. (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٣٣٥)

آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اس سے ملاقات پر اور ایمان لائے تو بعثِ آخر پر۔ عرض کی: یا رسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو پوجے اللہ کو اور شریک نہ کرے اس کے ساتھ کسی شے کو اور قائم کرے تو نماز کو اور زکاتِ مفروضہ ادا کرے اور روزے رکھے تو رمضان کے۔ عرض کی: یارسول اللہ! احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔ عرض کی: یا رسول اللہ! قیامت کب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے متعلق جس سے سوال کیا گیا ہے، وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں تجھ سے اس کی نشانیاں بیان کیے دیتا ہوں، جس وقت کہ لونڈی اپنے صاحب کو جنے تو یہ اس کی نشانیوں سے ہے اور جس وقت ننگے پاؤں والے اور ننگے بدن والے لوگوں کے سردار ہوں تو یہ اس کی نشانیوں سے ہے۔ پانچ چیزیں وہ ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ... الآية ﴾ پھر وہ شخص چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: « رُدُّوْهُ عَلَيَّ » یعنی اس کو میرے پاس پھیر لاؤ۔ ”فَأَخَذُوْهُ لِيَرُدُّوْهُ“ یعنی لوگوں نے تلاش شروع کی، تاکہ اسے پھیر لائیں، مگر کچھ نہ دیکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ جبریل علیہ السلام تھے، یہ آئے تھے تاکہ لوگوں کو ان کا دین سکھائیں۔[1]

(و رواه البخاري أيضا في كتاب الإيمان و مسلم من طرق عن أبي حيان به، وقد تكلمنا عليه في أول شرح البخاري و ذكرنا ثَمّ حديث أمير المؤمنين عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ في ذلك بطوله وهو من أفراد مسلم)

4 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں بیٹھے، تو آپ ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور رسول اللہ ﷺ کے آگے بیٹھے، اپنی دونوں ہتھیلیاں رکھے ہوئے نبی کریم ﷺ کے گھٹنوں پر۔ پھر کہا: یارسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تو اپنا منہ اللہ عزوجل کے واسطے تابع یعنی فرماں بردار کر دے اور گواہی دے اس بات کی کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک محمد ﷺ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔ کہا: پھر جب میں نے یہ کر لیا تو یقیناً میں اسلام لایا؟ فرمایا: جس وقت تو نے یہ کر لیا تو بے شک تو مسلمان ہو گیا، کہا: یا رسول اللہ! پھر آپ مجھ سے بیان کریں کہ ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور ایمان لائے تو مرنے پر اور موت کے بعد جینے پر اور ایمان لائے تو جنت و دوزخ اور حساب و میزان پر اور ایمان لائے تو تقدیر پر، اس کے کُل پر، اس کے خیر و شر پر۔ کہا: پھر جس وقت میں نے یہ کر لیا تو میں ایمان لے آیا؟ فرمایا کہ جس وقت تو نے یہ کر لیا تو واقعی تو مومن ہو گیا۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٩، ٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩، ٨)

کہا: یا رسول اللہ! آپ مجھ سے بیان کریں کہ احسان کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اللہ کے لیے عمل کرے، گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔ کہا: یارسول اللہ! پھر آپ مجھ سے بیان کریں کہ قیامت کب ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! پانچ چیزیں ہیں جن کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ... الآية﴾ « وَلٰكِنْ إِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ بِمَعَالِمِ لَهَا دُوْنَ ذٰلِكَ » یعنی لیکن اگر تو چاہے تو میں اس کی کچھ علامتیں بیان کر دوں، جو اس سے پہلے ہوں گی۔

اس شخص نے کہا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَحَدِّثْنِيْ" یعنی آپ کو ان کا علم ہے تو مجھ سے بیان کر دیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِذَا رَأَيْتَ الْأَمَةَ وَلَدَتْ رَبَّتَهَا أَوْ رَبَّهَا » یعنی جس وقت تو دیکھے لونڈی کو کہ اپنے صاحب کو جنے۔ « وَرَأَيْتَ أَصْحَابَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ وَرَأَيْتَ الْحُفَاةَ الْجِيَاعَ الْعَالَةَ رُؤُوْسَ النَّاسِ فَذٰلِكَ مِنْ مَعَالِمِ السَّاعَةِ وَأَشْرَاطِهَا۔ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَنْ أَصْحَابُ الشَّاءِ وَالْحُفَاةُ الْجِيَاعُ الْعَالَةُ؟ قَالَ: اَلْعَرَبُ »[1] (حديث غريب ولم يخرجوه) ("عالة" جمع عائل بہ معنی فقیر)۔

کاتب الحروف ۔عفا اللّٰه عنه۔ کہتا ہے کہ رب کے معنی لغت میں مالک وسید ومربی ومدبر ومتمم ومنعم کے ہیں، اللہ کے سوا غیر پر بغیر اضافت کے نہیں بولا جاتا، مگر بہت کم یہاں مراد مولیٰ اور مالک ہے۔ یعنی قیدیوں کی کثرت اور بہت سی نعمتوں کے باعث لونڈیوں کی کثرت ہوگی تو لونڈی اپنے مالک کے لیے بچہ جنے گی، پس وہ بچہ لونڈی کے لیے مولیٰ کے مثل ہوگا، کیوں کہ حسب میں اپنے باپ کے مثل ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ لونڈیاں بادشاہوں کو جنیں گی تو ماں من جملہ رعایا ہو جائے گی۔ یا یہ زمانے کے فساد سے کنایہ ہے، جو اولاد کی بہت زیادہ مائیں ہونے کے سبب سے ہوگا۔ چنانچہ ان کے مالک نوبت بنوبت ان کا دور کریں گے تو ایسا اتفاق پڑ جائے گا کہ آدمی اپنی ماں کو خرید لے گا اور اسے خبر نہ ہوگی یا یہ کنایہ ہے اولاد کی نافرمانی سے کہ بیٹا اپنی ماں سے ویسا معاملہ کرے گا، جیسا کہ مالک اپنی لونڈی سے اسے ذلیل کرنے میں اور گالی گلوچ کرنے اور برا بھلا کہنے میں کیا کرتا ہے۔ "رَبَّتَهَا" جو بتائے تانیث آیا ہے، چنانچہ اس سے مراد جان اور روح ہے، تاکہ مذکر ومونث دونوں کو شامل ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ قوتِ اسلام کی طرف اس لحاظ سے اشارہ ہے کہ قیدیوں کی کثرت ہوگی، بیٹا مالک کے مثل ہوگا، کیوں کہ آدمی کا مال بالآخر اس کے بیٹے ہی کا ہوتا ہے اور فی الحال بھی اگر باپ اس کو اجازت دے تو اس کا ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ قیامت کی علامت ہوا۔ اس لیے کہ ہر کمال کے پیچھے زوال لگا ہوا ہے۔ ؎

نہ بیٹھ پھول کی یوں شاخ گل پہ اے بلبل   کہ دم کے پیچھے لگی ہے خزاں بہار کی ساتھ

[1] مسند أحمد (١/ ٣١٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٤٥)

کسی نے کہا ہے کہ زمانے کے فساد اور خرابی کے باعث اُمِّ ولد کی خرید وفرخت بہ کثرت ہوگی تو اس کا لوٹ پھیر مشرکوں کے ہاتھوں میں بہت ہوگا، یہاں تک کہ ماں کو اس کا بیٹا خرید لے گا اور اسے خبر نہ ہوگی۔ ''رَبَّهَا'' کے بجائے ''بَعْلَهَا'' بھی مروی ہے۔ ''بعل'' کے معنی مالک کے ہیں یا خاوند کے۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ لونڈیوں کی خرید وفروخت بہ کثرت ہوگی، یہاں تک کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کر لے گا، ایک نشانی تو یہ ہوئی۔ دوسری یہ ہے کہ تو مکان والوں کو دیکھے گا کہ مکان کے طول اور بلندی میں باہم فخر کریں گے، مثلاً: ایک کہے گا کہ میرا مکان لمبا اور بلند ہے۔ دوسرا کہے گا کہ میرا مکان اس سے اونچا اور بڑا ہے۔ غرض یہ ہے کہ دنیا کی رونق اور تازگی میں خوب غرقاب ہو جائیں گے۔ مکانوں کی لمبائی اور اونچائی میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے اور تو دیکھے گا ننگے پاؤں والوں اور بھوکوں محتاجوں کو کہ لوگوں کے سردار ہیں؛ پس یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! ننگے پاؤں والے محتاج کون ہیں؟ فرمایا: عرب لوگوں میں۔ مجمع البحار میں شرح حدیث کے تحت کہا: یعنی جنگل کے لوگ جن کے پاس نہ لباس تھا نہ جوتیاں، بلکہ اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے تھے، یہ لوگ شہروں میں جا بسیں گے اور اونچے محل بنائیں گے۔[1]

5 امام احمد رحمہ اللہ نے بنی عامر کے ایک شخص سے روایت کیا ہے کہ اس نے نبی اکرم ﷺ پر اذن طلب کیا۔ ''فَقَالَ: أسلج (مصحح مصر نے اصل کے حاشیے پر لکھا ہے: ''قوله: أسلج كذا بالنسخ التي بأيدينا و حرر'' انتهى. سچ کہتے ہیں: اس کے معنی نہیں بنتے، کیسے بنیں یہ تو تصحیف ہے، حقیقت میں ''أَأَلِجُ'' ہے۔ ''وُلُوج'' بہ معنی دخول سے مشتق۔ کاتبوں کی غلطی سے اس کی شکل ''أسلج'' کی ہوگئی) فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِخَادِمِهِ: «أُخْرُجِي إِلَيْهِ فَإِنَّهُ لَا يُحْسِنُ الِاسْتِئْذَانَ فَقُولِي لَهُ: فَلْيَقُلْ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ، أَأَدْخُلُ» یعنی پس اس شخص نے کہا: کیا میں داخل ہو جاؤں تو نبی مکرم ﷺ نے اپنی خادمہ سے فرمایا: تو اس کی طرف نکل، کیوں کہ وہ اچھی طرح سے اِذن طلب کرنا نہیں جانتا، تو اس سے کہہ کہ وہ یوں کہے: ''السلام علیکم! کیا میں داخل ہو جاؤں۔'' وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے آپ کو سنا کہ یہ فرما رہے ہیں تو میں نے کہہ دیا: ''السلام علیکم! کیا میں داخل ہو جاؤں۔'' آپ ﷺ نے اجازت دی تو میں داخل ہوگیا۔ پھر میں نے عرض کی کہ آپ ہمارے پاس کیا شے لے کر آئے ہیں؟ فرمایا: میں تمھارے پاس نہیں لے کر آیا مگر خیر، میں تمھارے پاس آیا ہوں کہ تم اللہ وحدہ لاشریک لہ کو پوجو اور لات وعزیٰ کو چھوڑ دو اور رات اور دن میں پانچ نمازیں پڑھو اور سال میں ایک مہینے کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اور اپنے خوشحال لوگوں کے مالوں میں سے زکات لو اور اس کو اپنے محتاجوں میں تقسیم کرو۔ راوی کہتا ہے: پھر اس شخص نے کہا کہ کیا علم میں سے کوئی ایسی شے باقی ہے جس کو آپ نہیں جانتے؟ فرمایا کہ مجھے اللہ عزوجل نے یقینی طور پر خیر سکھائی ہے اور بے شک علم میں سے وہ

[1] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٤٧١)

شے جس کو اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا؛ پانچ چیزیں ہیں: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ ... الآية ﴾[1] یہ اسناد صحیح ہے۔

6 امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اہلِ بادیہ (جنگل والے، دیہاتی لوگ) سے ایک شخص آیا تو اس نے کہا: میری عورت حاملہ ہے وہ کیا جنے گی؟ اور ہماری زمینیں خشک اور بغیر سبزہ کے ہیں، آپ مجھے خبر دیں کہ مینہ کب نازل ہو گا؟ اور میں جان چکا ہوں کہ کب پیدا ہوا ہوں، آپ مجھے بتائیں کہ میں کب مروں گا؟ اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ ... الآية ﴾۔

7 امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: وہ مفاتیحِ غیب ہیں، جن کا اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ... الآية ﴾[2] [الأنعام: ٥٩] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير)

8 امام شعبی رحمہ اللہ نے عن مسروق عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے، فرمایا جو شخص تجھ سے یہ بیان کرے کہ وہ اس شے کو جانتا ہے جو کل ہو گی تو یقیناً اس نے جھوٹ کہا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اشیاء ہیں، یعنی یہ کئی چیزیں ہیں جن کے ساتھ اللہ متاثر ہوا ہے، یعنی جن کا علم اس نے اپنے پاس رکھا ہے، چنانچہ ان کے بارے میں نہ کسی مقرب فرشتے کو مطلع کیا نہ کسی نبی مرسل کو: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ چنانچہ لوگوں میں سے کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب ہو گی، کون سے برس میں، یا کون سے مہینے میں، یا رات میں یا دن میں۔ ﴿ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ﴾ کوئی نہیں جانتا کہ مینہ کب نازل ہو گا، رات یا دن کو۔ ﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ﴾ پس کوئی نہیں جانتا کہ رحموں میں کیا ہے، نر ہے یا مادہ، سرخ ہے یا سیاہ اور وہ کیا ہے۔

﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾ آیا خیر یا شر اور اے ابن آدم! تو نہیں جانتا کہ کب مرے گا، شاید تو کل ہی مردہ ہو، شاید تو کل مصاب ہو، یعنی کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ﴾ یعنی لوگوں میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کا مضجع، یعنی زمین میں خواب گاہ کہاں ہے، وہ دریا میں ہے یا جنگل میں ہے، یا نرم زمین میں ہے یا پہاڑ میں۔[4] حدیث شریف میں مروی ہے کہ جس وقت اللہ کسی بندے کو کسی زمین میں قبض کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے اس زمین کی طرف کوئی حاجت کر دیتا ہے:

1 حافظ ابو القاسم طبرانی نے اپنی "معجم کبیر" میں سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی مسند میں سے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ٹھہرایا اللہ نے کسی بندے کا مرنا کسی زمین میں مگر اس کے لیے

---

1 مسند أحمد (٥/ ٣٦٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله كلهم ثقات أئمة" (مجمع بحار الأنوار: ١/ ١٩٧)

2 تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠١) تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٠) یہ روایت مرسل ہے۔

3 تفسير الطبري (٢٠/ ١٦١۔ ١٦٢) 4 تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٠)

اس میں کوئی حاجت کر دی۔[1]

2 عبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ نے مطر بن عکاش رضی اللہ عنہ (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن یہ عکامس ہے بہ ضمِ عین و فتحِ کاف وسینِ مہملہ، جیسا کہ خلاصہ میں لکھا ہے۔ مطر کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « إِذَا قَضَى اللّٰهُ مَيْتَةَ عَبْدٍ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً »[2] (وهكذا رواه الترمذي في القدر من حديث سفيان الثوري به، ثم قال: حسن غريب ولا يعرف لمطر عن النبي ﷺ غير هذا الحديث، و قد رواه أبو داود في المراسيل، فاللّٰه أعلم)

3 امام احمد نے سیدنا ابوعزہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ قَبْضَ رُوحِ عَبْدٍ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ فِيهَا أَوْ قَالَ بِهَا حَاجَةً » "و أبو عزة هذا هو يسار بن عبد اللّٰه ويقال: ابن عبد الهذلي" امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔[3]

4 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابوعزہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کیا ہے: « قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ قَبْضَ عَبْدٍ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً فَلَمْ يَنْتَهِ حَتّٰى يَقْدَمَهَا ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ ... الآية ﴾ »[4]

5 حافظ ابوبکر بزار نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ قَبْضَ عَبْدٍ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً »[5] (ثم قال البزار: وهذا الحديث لا نعلم أحداً يرفعه إلا عمر بن علي المقدمي)

6 امام ابن ابی الدنیا نے کہا: سلیمان بن ابی شیخ نے مجھے حدیث کی، کہا کہ محمد بن الحکم نے اعشیٰ ہمدان کے یہ شعر مجھے پڑھ کر سنائے:

فَمَا تَزَوَّدَ مِمَّا كَانَ يَجْمَعُهُ ۔۔۔ سِوٰى حَنُوطٍ غَدَاةَ الْبَيْنِ مَعَ خِرَقِ
وَغَيْرَ نَفْحَةِ أَعْوَادٍ تُشَبُّ لَهُ ۔۔۔ وَقَلَّ ذٰلِكَ مِنْ زَادٍ لِمُنْطَلِقِ
لَا تَأْسَيَنَّ عَلٰى شَيْءٍ فَكُلُّ فَتًى ۔۔۔ إِلٰى مَنِيَّتِهِ سَيَّارٌ فِي عَنَقِ
وَكُلُّ مَنْ ظَنَّ أَنَّ الْمَوْتَ يُخْطِئُهُ ۔۔۔ مُعَلَّلٌ بِأَعَالِيلَ مِنَ الْحَمَقِ
بِأَيِّمَا بَلْدَةٍ تُقْدَرُ مَنِيَّتُهُ ۔۔۔ إِنْ لَّا يُسَيَّرُ إِلَيْهَا طَائِعًا يُسَقِ[6]

(اصل میں سیار ہی ہے مگر موزون نہیں ہے۔ اگر "قد سار" ہو تو موزون ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ یہی ہے یا

---

[1] المعجم الكبير (١/ ١٧٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٦٠٦)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٥)

[3] مسند أحمد (٥/ ٢٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٥)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٥٩٧) اس کی سند میں "عبیداللہ بن ابی حمید" ضعیف راوی ہے۔

[5] مسند البزار (٥/ ٢٧٤) [6] تاريخ دمشق (٣٤/ ٤٨١_ ٤٨٢)

کوئی اور لفظ ہے)۔ حافظ ابن عساکر ترجمۂ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن حارث میں ان شعروں کو لائے ہیں۔ عبدالرحمٰن ہمدان کا اعشٰی ہے۔ شعبی اس کی بہن کے خاوند تھے اور اس کا نکاح شعبی کی بہن سے ہوا تھا۔ یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے علم اور تفقہ طلب کیا ہے۔ پھر شعر و شاعری کی طرف مائل ہوا تو شعر کے ساتھ مشہور ہوگیا۔ اعشٰی ہمدان لقب پایا۔ اشعار کا حاصل معنی یہ ہے کہ آدمی دنیا کا جو کچھ مال و متاع اور ساز و سامان جمع کیا کرتا تھا، اس میں سے مرنے کے بعد اپنے ساتھ کچھ نہ لیا سوا ان چیزوں کے: ایک حنوط جو کافور وغیرہ سے ملی ہوئی خوشبو ہوتی ہے۔ دوسرے کفن کے کپڑے۔ تیسرے عود کی لکڑیوں کی خوشبو، جو اس کے لیے جلائی جاتی ہیں۔ صبح فراق یعنی موت کے دن ان چیزوں کے سوا اور کچھ نہ لیا۔ چلنے والے کے لیے یہ توشۂ قلیل ہے۔ تو کسی شے پر رنج مت کر، چنانچہ ہر جوان اپنی موت کی طرف تاریکیِ شب میں تیز چلنے والا ہے۔ جس شخص نے یہ خیال کیا کہ موت اس سے چوک جائے گی تو وہ حماقت، یعنی بے وقوفی کے بہانوں کے ساتھ بہانہ کرنے والا ہے۔ جس شہر میں اس کی موت مقدر کی گئی ہے تو اگر وہ اس کی طرف مطیع ہو کر نہ چلا جائے گا تو زبردستی گھسیٹ کر اس کو لے جائیں گے۔

7 امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے احمد بن ثابت و عمر بن شبہ سے روایت کیا ہے، یہ دونوں عمر بن عکرمہ سے مرفوعاً راوی ہیں کہ جس وقت تم میں سے کسی کی اجل کسی زمین میں آتی ہے تو اس کے لیے اس زمین کی طرف کوئی حاجت آتی ہے، پھر جس وقت وہ اس زمین میں اپنے آخری قدم پر پہنچتا ہے تو اللہ عزوجل اس کو قبض فرما لیتا ہے۔ زمین قیامت کے دن کہے گی: اے میرے رب! یہ وہ شے ہے جو تو نے میرے پاس ودیعت رکھی تھی۔[1]

8 طبرانی نے اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا جَعَلَ اللّٰهُ مَنِيَّةَ عَبْدٍ بِأَرْضٍ إِلَّا جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً»[2] (آخر تفسير سورة لقمان. والحمد لله رب العلمين وحسبنا الله ونعم الوكيل)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک کے نزدیک اس وقت کا علم ہے جس میں قیامت قائم ہو گی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کلام کے معنی نفی ہیں، یعنی گو ظاہر میں اثبات ہے، لیکن معنی نفی کی طرف راجع ہیں، یعنی نہیں جانتا قیامت کے علم کو مگر اللہ عزوجل۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں جو نفی کے معنی ہو گئے ہیں تو اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں وارد ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ وہ یہی ہیں۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اتارتا ہے مینہ کو ان وقتوں میں اور ان جگہوں میں جن کو

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٤٥)

[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٩٤۔ ٥٩٧)

[3] تفسير القرطبي (١٤/ ٨١)

اس کے اتارنے کے لیے مقرر کر دیا ہے، اس کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ ﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ﴾ وہ جانتا ہے اس شے کو جو رِحموں میں ہے۔ نر ہے یا مادہ، صلاح ہے یا فساد۔ ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ﴾ یعنی تمام نفوس میں سے بغیر کسی فرق کے فرشتوں اور انبیاء، جنوں اور انسانوں کے، کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا کمائی کرے گا، دین کی کمائی یا دنیا کی، خیر کی یا شر کی۔ ﴿ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ﴾ یعنی کوئی نفس نہیں جانتا کہ کس جگہ میں اللہ اس پر موت طاری کرے گا۔ زمین میں یا جنگل میں۔ دریا میں یا نرم زمین میں، یا پہاڑ میں۔ کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ آدمی کسی جگہ اقامت کرتا ہے اور اپنی میخیں گاڑ دیتا ہے، یعنی مستقل ٹھکانا بنا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس سے نہ ٹلوں گا، پھر مرامِی قدر الٰہی، یعنی تقدیر کے ہدف وہاں سے اس کو اُکھاڑ پھینکتے ہیں، یہاں تک کہ اس جگہ میں جا کر مرتا ہے، جس کا خیال تک بھی کبھی اس کے دل میں نہ گزرا تھا۔

حکایت:

مروی ہے کہ ملک الموت کا گزر سلیمان علیہ السلام پر ہوا تو وہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک شخص کی طرف دیکھنے لگے، پھر اس شخص نے کہا: یہ کون ہے؟ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ملک الموت ہے۔ اس شخص نے کہا: گویا وہ میرا ارادہ کرتے ہیں اور سلیمان علیہ السلام سے درخواست کی کہ اسے ہوا پر سوار کر دیں اور اسے بلادِ ہند میں ڈال دیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا، پھر ملک الموت نے سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ میں جو اس شخص کی طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا تو یہ اس بات پر تعجب کے لیے تھا کہ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ اس کی روح ہند میں قبض کروں اور وہ شخص آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ (ذكره النسفي)

حکایت:

منصور خلیفہ عباسی نے ملک الموت کی صورت خواب میں دیکھی اور ان سے اپنی عمر کی مدت پوچھی تو ملک الموت نے اپنی پانچوں انگلیوں سے اشارہ کر دیا۔ تعبیر کرنے والے لوگوں نے اس کی تعبیر پانچ برس پانچ مہینے اور پانچ دن کی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ اس آیت کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ ان پانچ علموں کو سوائے اللہ پاک کے اور کوئی نہیں جانتا۔[1]

نکتہ:

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان پانچوں میں سے تین میں تو اللہ پاک نے علم کی اپنی طرف اضافت کی اور آخری دو باتوں میں بندوں سے علم کی نفی کی، حالاں کہ پانچوں اس بات میں برابر ہیں کہ اللہ پاک ان کے علم کے ساتھ مختص ہے اور بندوں سے ان کے علم کی نفی کی گئی ہے؟ تو اس کی یہ وجہ ہے کہ پہلی تین باتوں کا معاملہ بہت بڑا اور

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٢٨٨)

عظیم ہے، یعنی وہ بڑے بھاری ہیں۔ اس لیے ان کی اضافت خاص طور پر اپنی طرف کی اور آخری دو صفتیں بندوں سے ہیں، اس لیے خاص کر ان کی اضافت بندوں کی طرف کی باوجود اس کے کہ جب ان دو کا علم ان سے منتفی ہوا تو ان کے علاوہ دوسری چیزوں کا علم ان سے بہ طریقہ اولیٰ منتفی ہوگا۔

جمہور نے ﴿ يُنَزِّلُ ﴾ کو تشدید کے ساتھ اور امام ابن کثیر، ابو عمرو، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی بابِ تفعیل و افعال سے پڑھا گیا ہے۔ جمہور نے ﴿ بِاَيِّ اَرْضٍ ﴾ اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ و موسیٰ اہوازی نے "بِأَيَّةِ" پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس کو جائز کہا ہے اور ہر ایک ضعیف لغت ہے۔[1] امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ یوں بولا جائے: "مَرَرْتُ بِجَارِيَةٍ أَيِّ جَارِيَةٍ". ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ بے شک اللہ جاننے والا ہے ان چیزوں کو اور ان کے سوا اور غیب کی باتوں کو۔ ﴿ خَبِيْرٌ ﴾ ہے اس شے کا جو ہو چکی ہے اور آیندہ ہوگی اور ساری اشیاء کے باطن سے باخبر ہے۔ اس کا علمِ تام صرف ظاہری صورت کو محیط نہیں ہے، بلکہ اس کے علمِ محیط میں ظاہر و باطن دونوں برابر ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی اس بات کا دعویٰ کرے کہ وہ ان پانچ چیزوں میں سے کسی شے کو جانتا ہے تو وہ یقیناً قرآن کا کافر ہوا، کیوں کہ اس نے اس کی مخالفت کی۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کو نہ کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے اور نہ ہی کوئی نبیِ مرسل جانتا ہے۔ چنانچہ جس نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ ان میں سے کسی شے کو جانتا ہے تو یقیناً اس نے قرآن کے ساتھ کفر کیا۔[3] انتہیٰ۔ اس میں نجومی اور کاہن کا رد ہے، جو بارش اور موت وغیرہ کی خبر دیتے ہیں۔ اس کا شانِ نزول مجاہد کی روایت میں پہلے گزر چکا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے بھی اسی کی طرح مروی ہے، اتنا زیادہ کہا ہے کہ اس بدوی نے یہ کہا کہ میں یقیناً یہ جان چکا ہوں جو میں نے آج کمائی کی ہے، پھر کل میں کیا کمائی کروں گا اور یہ بھی زیادہ ہے کہ اس نے قیامت کے قائم ہونے کے بارے میں بھی سوال کیا تھا۔[4] کسی نے کہا ہے کہ حارث بن عمرو بن حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ شخص اہلِ بادیہ میں سے تھا۔ یعنی دیہاتی تھا۔ زُہری سے مروی ہے: "أَكْثِرُوا قِرَاءَةَ سُورَةِ لُقْمَان فَإِنَّ فِيهَا أَعَاجِيبَ وَاللّٰهُ أَعْلَم"[5] یعنی سورت لقمان کو بہت پڑھا کرو، کیوں کہ اس میں عجیب عجیب باتیں ہیں۔

الحمد للہ و المنۃ کہ مواہب الرحمٰن فی تفسیر سورۃ لقمان من اجزاء ترجمان القرآن بتاریخ ۲۱/ ماہ ذی الحجہ ۱۳۱۱ ہجری روز سہ شنبہ بعد مغرب محلہ امیر گنج من محلات شاہجہان آباد بھوپال میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اپنی ذات پاک کے لیے ٹھہرائے اور مجھ کو اور سب مومنین و مومنات کو اس سے فائدہ پہنچائے اور

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٨٢) فتح القدير (٤/ ٣٢٣) [2] معاني القرآن (٤/ ٢٠٢) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ٨١)
[4] الدر المنثور (٦/ ٥٣٠_٥٣١) [5] تفسير النسفي (٣/ ٢٨٨) فتح البيان (١٠/ ٣٠٣_٣٠٥)

آیندہ لکھنے کی توفیق رفیق فرمائے اور ہمارے دین و دنیا کے کام بنائے، اپنے معاصی و افکارِ دنیا سے بچائے اعمالِ صالحہ کی توفیق دے۔ حسنِ خاتمہ عطا فرمائے، بلیات و آفات سے محفوظ رکھے۔ آمین!

و أنا العبد الراجي رحمة ربه الباري ذو الفقار أحمد بن علي السهارنفوري البوفالي غفر الله لهما و أحسن إلهيما آمين، الحمد لله أولًا و آخراً و ظاهراً وباطناً.

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ

اس سورت کی انتیس (۲۹) یا تیس (۳۰) آیتیں ہیں، اس اختلاف کی بنا پر جو اس بات میں ہے کہ آخرِ آیت ﴿ لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴾ ہے یا ﴿ کٰفِرُوۡنَ ﴾ ہے۔ چنانچہ پہلے کی بنا پر تو تیس ہوں گی اور دوسرے کی بنا پر انتیس۔ یہ سورت مکی ہے، جس طرح کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ (رواہ ابن الضریس و ابن مردویہ والبیہقي في الدلائل عنه و رواہ ابن مردویہ عن ابن الزبیر)۔ ابن نحاس رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مکی ہے، سوائے تین آیتوں کے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں: ﴿ اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ﴿۱۸﴾ اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ جَنّٰتُ الۡمَاۡوٰی ۫ نُزُلًۢا بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡا فَمَاۡوٰىهُمُ النَّارُ ؕ کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَاۤ اُعِیۡدُوۡا فِیۡهَا وَ قِیۡلَ لَهُمۡ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِهٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴾[1] امام کلبی اور مقاتل رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ کسی نے کہا: مگر پانچ آیتیں ﴿ تَتَجَافٰی جُنُوۡبُهُمۡ ﴾ سے لے کر ﴿ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِهٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴾ تک۔[2]

سورت سجدہ کی فضیلت کا بیان:

اس سورت کے فضائل میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے یہ ہیں:

① سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن نمازِ فجر میں "الم تنزیل السجدة" اور "هل أتى على الإنسان" پڑھا کرتے تھے۔[3] (أخرجه مسلم و أهل السنن عنه و أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما من حديثه أيضا)

② سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سوتے نہ تھے، یہاں تک کہ "الم تنزیل السجدة" اور "تبارك الذي بيده الملك" نہ پڑھ لیتے۔[4] (أخرجه أبو عبيد في فضائله و أحمد و عبد بن حميد و الدارمي والترمذي والنسائي و الحاكم و صححه و ابن مردويه) ان دونوں حدیثوں کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔

---

① الدر المنثور (٦/ ٥٣٤) ② تفسير القرطبي (١٤/ ٨٣)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٠) سنن النسائي الكبرىٰ (١/ ٣٣٠) سنن ابن ماجه رقم الحديث (٨٢٣)

④ مسند أحمد (٣/ ٣٤٠) مسند عبد بن حميد ١٠/ ٣١٨) سنن الدارمي (٢/ ٥٤٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٩٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٧٨) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٤٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٨٥)

③ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو شخص چار رکعتیں بعد نمازِ عشاء آخر کے پڑھے اور پہلی دو رکعتوں میں تو ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھے اور آخری دو میں ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ اور ”الم تنزيل السجدة“ تو وہ اس کے لیے لیلۃ القدر کی چار رکعتوں کی طرح لکھی جائیں گی۔[1] (أخرجه أبو نصر و الطبراني والبيهقي في سننه عنه)

④ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مغرب اور عشاء کے درمیان ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ اور ”الم تنزيل السجدة“ پڑھے تو گویا اس نے لیلۃ القدر میں قیام کیا۔

⑤ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی رات میں ”الم تنزيل السجدة“، ﴿يٰسٓ﴾، ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾ اور ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ پڑھے تو وہ اس کے لیے نور اور شیطان سے بچاؤ ہو جائیں گی اور روزِ قیامت تک اس کے درجوں میں بلندی کی جائے گی۔

⑥ ابن ضریس نے میبّب بن رافع رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ”الم تنزیل“ قیامت کے دن اس حال میں آئے گی کہ اس کے دو بازو ہوں گے، یہ اپنے صاحب پر سایہ کرے گی اور کہے گی: ”لَا سَبِيْلَ عَلَيْهِ لَا سَبِيْلَ عَلَيْهِ“ یعنی اس پر راہ نہیں ہے، اس پر راہ نہیں ہے۔[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳ اَللّٰهُ
الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا
شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۤءِ اِلَى
الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ

---

① المعجم الكبير (١١/ ٤٣٧) اس کی سند میں ''ابوفروہ'' ضعیف راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٠٦٠)

② الدر المنثور (٦/ ٥٣٥)

سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ۙ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ الم ① اس میں کوئی شک نہیں کہ (اس) کتاب کا نزول رب العالمین کی طرف سے ہے ② کیا وہ کہتے ہیں کہ اس (نبی) نے اسے خود گھڑ لیا ہے، (نہیں) بلکہ وہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پائیں ③ اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوا، اس کے سوا نہ تمھارا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارشی، کیا پھر تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ ④ وہی آسمان سے زمین تک (سارے) معاملے کی تدبیر کرتا ہے، پھر ایک دن میں، جس کی مقدار تمھارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے، وہ (معاملہ) اسی کی طرف چڑھتا ہے ⑤ وہ (مدبر ہی) چھپے اور ظاہر کا جاننے والا، نہایت غالب، خوب رحم کرنے والا ہے ⑥

قرآنِ مجید کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے:

بڑے بڑے کاموں کا حکم عرش سے جاری ہو کر نیچے اترتا ہے، اس کے سب اسباب آسمان و زمین سے جمع ہو کر وہ کام بن جاتا ہے، پھر ایک مدت تک جاری رہتا ہے۔ پھر اللہ کی طرف اُٹھ جاتا ہے، پھر اللہ کی طرف سے دوسرا رنگ اترتا ہے، جیسے: بڑے بڑے پیغمبر جن کا اثر قرنوں تک، یعنی کئی صدیوں تک رہا۔ یا بڑی قوم کے سردار جو عمروں چلے۔ وہ ہزار برس اللہ کے نزدیک ایک دن ہے۔'' انتھی[1]

سورۃ البقرہ کے شروع میں حروفِ مقطعات پر کلام گزر چکا ہے، اس کو دھرانے کی ضرورت نہیں۔ ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں کہ کتاب رب العالمین کی طرف سے اتاری گئی ہے۔ ﴿ اِفْتَرٰىهُ ﴾ کے معنی ہیں: ''اِخْتَلَقَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِهِ'' یعنی کیا کافر کہتے ہیں کہ اس کو اپنے جی سے بنا لیا ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ تو تیرے رب کی طرف سے حق ہے۔ ﴿ يَهْتَدُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں: ''يَتَّبِعُوْنَ الْحَقَّ'' یعنی شاید وہ حق کا اتباع کریں۔ پھر اللہ پاک یہ بتاتا ہے کہ وہ اشیاء کا خالق ہے، تو اس نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے، ان سب کو چھے دن میں بنایا، پھر عرش پر قائم ہوا۔ ﴿ اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے: بلکہ اللہ پاک ہی ازمۂ امور کا مالک ہے،

یعنی سارے کاموں کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے، وہی ہر شے کا خالق ہے اور وہی مدبر ہے، وہی ہر شے پر قاہر اور غالب ہے، چنانچہ اس کے سوا نہ کوئی اس کی مخلوق کا حمایتی ہے نہ سفارشی، مگر اس کی اجازت کے بعد ﴿ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی اے اس کے غیر کو پوجنے والو اور اسے بھروسا کرنے والو اس کے ماسوا پر! وہ تو بلند و بالا اور برتر اور مقدس اور منزہ اور پاک وصاف ہے اس بات سے کہ اس کا کوئی نظیر یا شریک یا وزیر یا ہمسر ہو، یا اس جیسا ہو۔

لا إله إلا الله، ولا رب سواہ۔ اس کے سوا نہ کوئی قابلِ پرستش معبود ہے نہ کوئی رب اور پروردگار ہے۔

امام نسائی رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک حدیث بہ سندِ خود عن عطاء عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ وارد کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں اور ان کے درمیان ہے چھے دن میں پیدا کیا، پھر ساتویں دن عرش پر مستوی ہوا۔ چنانچہ مٹی کو سنیچر کے دن پیدا کیا اور پہاڑوں کو اتوار کے دن اور درختوں کو پیر کے دن۔ مکروہ کو منگل کے دن، نور کو بدھ کے دن، جانوروں کو جمعرات کے دن اور آدم علیہ السلام کو جمعے کے دن کی آخری گھڑی میں عصر کے بعد پیدا کیا اور اس کو ادیمِ ارض سے، یعنی روئے زمین سے اس کے سرخ و سیاہ اور طیب و خبیث حصے سے پیدا کیا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے کسی کو طیب اور کسی کو خبیث کیا ہے۔[1] (هكذا أورد هذا الحديث إسنادًا) اور مسلم اور نسائی رحمہما اللہ نے دوسری سند سے عن عبداللہ بن رافع عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ اس کے مثل روایت کیا ہے،[2] بخاری نے کتاب تاریخ کبیر میں اس حدیث کو معلل کیا ہے، کہا: بعض نے کہا ہے کہ ابو ہریرہ عن کعب الاحبار یہ اصح ہے[3] اور اسی طرح حفاظ میں سے کئی ایک اہلِ علم نے اس حدیث کو معلل کیا ہے۔ واللّٰه أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ ﴾ یعنی اس کا امر آسمانوں کے اوپر سے ساتوں زمینوں تک نازل ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ١٢] ''اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل، ان کے درمیان اس کا حکم نازل ہوتا ہے۔'' اور اعمال آسمانِ دنیا کے اوپر اپنے دیوان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ آسمان اور زمین کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور آسمان کا دل، یعنی موٹائی پانچ سو برس کی ہے۔

امام مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا کہ فرشتے کا نزول پانچ سو برس کی راہ میں ہے اور اس کا چڑھنا پانچ سو برس کی راہ میں ہے،[4] لیکن وہ اس فاصلے کو پلک جھپکنے میں طے کر لیتا ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ ﴿ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ یعنی یہ ہے مدبر ان کاموں کا جو

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٦/ ٤٢٧) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٩٣)
[3] التاريخ الكبير (١/ ٤١٣) اس مسئلے پر مکمل وضاحت کے لیے دیکھیں: (تفسیر ترجمان القرآن: ١/ ٢٠٤)
[4] تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٧)

کہ شہید ہے اپنے بندوں کے اعمال پر، اس کی طرف تمام معاملات اٹھائے جاتے ہیں، خواہ جلیل ہوں یا حقیر، صغیر ہوں یا کبیر ہو۔ ﴿ اَلْعَزِيْزُ ﴾ یعنی غالب وہی ہے کہ ہر شے پر غالب ہوا ہے، پھر اس کو مقہور و مغلوب کر لیا ہے اور بندے و رقاب (گردنیں) سب اس کے لیے ذلیل اور مطیع ہیں، وہ اپنے مومن بندوں پر بڑا مہربان ہے، چنانچہ وہ اپنی رحمت میں عزیز ہے اور اپنی عزت میں رحیم ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ﴾ میں پانچ وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ الٓمّٓ ﴾ کی خبر ہے کہ ﴿ الٓمّٓ ﴾ سے مراد سورت اور بعض قرآن ہے۔ ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ بہ معنی منزل ہے۔ جملۂ ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ کتاب سے حال ہے اور عامل اس میں ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ ہے، اس لیے کہ مصدر ہے اور ﴿ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ بھی ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ سے متعلق ہے۔ یا ﴿ فِيْهِ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے، اس واسطے کہ ﴿ فِيْهِ ﴾ خبر واقع ہوئی اور عامل اس میں ظرف ہے یا استقرار، یعنی یہ سورت ایک ایسی منزل کتاب ہے، جس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے رب العالمین کی طرف سے۔ یا اس میں کسی طرح کا شک ہو نہیں سکتا، کیوں کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

دوسری یہ ہے کہ ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ مبتدا اور ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ اس کی خبر اور ﴿ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ﴿ فِيْهِ ﴾ کی ضمیر سے حال، یعنی کتاب کا اتارنا ایسا ہے کہ اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے، کیوں کہ وہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ اس صورت میں ﴿ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ سے متعلق نہ ہوگا، اس لیے کہ وہ مصدر ہے اور مخبر عنہ ہو چکا، اب وہ عامل نہ ہوگا۔ ہاں جو شخص جار میں وسعت کرتا ہے، اس کو اس کی کچھ پروا نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ بھی مبتدا اور ﴿ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اس کی خبر اور ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ حال یا جملہ معترضہ۔ چوتھی یہ ہے کہ ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ اور ﴿ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ دونوں خبریں ہیں ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ کی۔ پانچویں یہ ہے کہ ﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی، یعنی ﴿ هُوَ ﴾۔ اسی طرح ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ اور اسی طرح ﴿ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾۔ چنانچہ ہر ایک جملہ خود مستقل ہے اور جائز ہے کہ یہ دونوں ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ سے حال ہوں اور یہ بھی کہ ﴿ مِنْ رَّبِّ ﴾ حال ہو اور ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ معترضہ۔ یہ سب وجوہ سمین رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں۔

امام مکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احسن وجوہ یہ ہے کہ ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ موضع حال میں ہو اور ﴿ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ خبر۔[2] معنی یہ ہیں کہ اتارنا ہے کتاب کا کہ پڑھی جاتی ہے، اس میں کسی طرح کا شک و شبہہ نہیں ہے اور وہ رب العالمین کی طرف سے اتاری گئی ہے اور وہ نہ جھوٹ ہے نہ جادو، نہ کہانت اور نہ اگلوں کی کہانیاں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۹۸۔ ۵۹۹) [2] تفسیر القرطبي (۱٤/ ۸٤)

پھر اس بات سے ہٹ کر اس کے بارے میں کفار کے اعتقاد کو بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ﴾۔
کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی ﴿ بَلْ ﴾ و ہمزۂ استفہام کے ہے۔ استفہام سے غرض دھمکی دینا اور ڈانٹنا ہے، یعنی ان کو زجر و توبیخ کر کے فرماتا ہے: بلکہ کیا وہ ایسی سچی اور پکی شے کو کہتے ہیں کہ اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے۔ ﴿ اِفْتَرٰىهُ ﴾ بہ معنی "اِفْتَعَلَهُ وَاخْتَلَقَهُ" ہے۔

پھر ان کے اس اعتقاد سے ہٹ کر کتاب اللہ کی شان میں جو بات حق ہے وہ بیان کی، فرمایا: ﴿ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ﴾۔ اگر اس کو صرف ﴿ اِفْتَرٰىهُ ﴾ کے واسطے اضراب ابطال کہیں تو یہ کہنا ٹھیک ہوگا اور اسی کی بنا پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس قدر اضراب قرآن شریف میں ہیں وہ انتقالی ہیں، یعنی ایک مطلب بیان کیا، پھر اس سے اعراض کر کے دوسرا مطلب بیان کرنا شروع کر دیا، مگر خاص یہ اضراب، کیوں کہ یہ ہوسکتا ہے کہ اضراب ابطالی ہو، اس لیے کہ یہ ان کے قول کا ابطال ہے، یعنی قرآن شریف ویسا نہیں ہے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ اپنی طرف سے بنا لیا ہے، بلکہ وہ تو ٹھیک ہے تیرے رب کی طرف سے، چنانچہ اللہ پاک نے دعوائے افترا میں ان کی تکذیب کر دی۔

پھر وہ علت بیان کی جس کے واسطے تنزیلِ کتاب ہوئی ہے۔ فرمایا: ﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ اس قوم سے مراد عرب ہیں۔ یہ لوگ ایک امی امت تھے، ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ خاص قریش مراد ہیں۔ کسی نے کہا: اہلِ فترت ہیں جو عیسی علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھے۔ ﴿ لِتُنْذِرَ ﴾ کا مفعول محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "لِتُنْذِرَ قَوْمًا الْعِقَابَ"۔ جملہ ﴿ مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ ﴿ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ صفت ہے ﴿ نَذِيْرٍ ﴾ کی۔ کلمۂ ﴿ مَآ ﴾ نافیہ ہے، یعنی تنزیلِ کتاب اس لیے ہوئی ہے کہ تو ایک ایسی قوم کو عذاب سے ڈرائے کہ ان کے پاس کوئی ایسا نذیر تجھ سے پہلے نہیں آیا جو حقیقی معنوں میں ڈرانے والا ہو۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ کلمۂ ﴿ مَآ ﴾ موصولہ ہو، یعنی تاکہ تو ڈرائے ایک قوم کو اس عذاب سے جو اُن کو تیرے سے پہلے نذیر سے آیا۔[1] یہ قول انتہائی ضعیف ہے، اس لیے کہ مراد انزال کی وجہ بیان کرنا ہے، انذار کے ساتھ اس قوم کے لیے جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا۔ انذار کے ساتھ انزال کی تعلیل اس قوم کے لیے مراد نہیں جس کو پہلے سے انذار ہو چکا ہے۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾، ﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا ﴾ سے متعلق ہے اور ترجی معتبر ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے، یعنی تاکہ تو ان کو ڈرائے اس حال میں کہ تو ان کے راہ پانے کی امید رکھنے والا ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ﴾۔ ﴿ خَلَقَ ﴾ کے معنی ہیں: "أَوْجَدَ وَأَبْدَعَ" یعنی اللہ پاک نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اُن کے اندر اور اُن کے درمیان ہے، اس کو

[1] البحر المحیط (۷/ ۱۹۲)

ایجاد اور ابداع (بغیر کسی نمونے کے پیدا کیا) کیا چھے دن میں، اس تقسیم کی بنا پر جو پہلے گزر چکی ہے اور سورت فصلت میں آئے گی۔ اس کی تفسیر سورۃ الاعراف وغیرہ میں گزر چکی ہے، اس جگہ اس کے ذکر سے مراد ان کو اپنی کمال قدرت اور عظیم صنعت کا معلوم کرانا ہے، تاکہ قرآن شریف کو سنیں اور اس میں غور وفکر کریں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس ﴿ اَیَّامٍ ﴾ سے مراد دنیا کے ایام ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دن کی مقدار دنیا کے ہزار برس کے برابر ہے۔ یہ ضحاک رحمہ اللہ کا قول ہے،[1] اس قول کی بنا پر یہاں ﴿ اَیَّامٍ ﴾ سے مراد آخرت کے ایام ہوں گے نہ کہ دنیا کے ایام۔ چنانچہ اس حساب سے چھے ہزار برس ہوئے چھے دن کے۔

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ میں کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ ترتیب کا نہیں ہے، بلکہ بہ معنی واو ہے۔ عرش لغت میں بادشاہ کے تخت کو کہتے ہیں۔ اس جگہ اس سے مراد وہ نورانی جسم ہے جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ ﴿ اِسْتَوٰى ﴾ کا ذکر قرآن شریف میں سات جگہ ہے۔ اس بارے میں قابلِ ترجیح اصل بات یہ ہے کہ ہم اس شے کا اعتقاد کریں، جس کے ساتھ قرآن شریف میں وارد ہوا ہے اور اس کی تاویل نہ کریں، نہ اسے اس کی وجہ سے پھیریں۔ یہ نص اور ظاہر ہے، اس میں کہ اللہ پاک فوق العرش ہے اپنی خلق کے ساتھ، اس معنی میں بائن ہے جو اس کی بارگاہِ اقدس و اعلی کے لائق ہیں اور اس کی تاویل کرنا نص یا ظاہر سے باہر نکال دینا ہے اس کے معنی کو اور یہ بالکل جائز نہیں ہے، مگر اس شے کے موجود ہو جانے پر جو اس کے برابر ہو، یا اس پر متقدم ہو، یا اس کے مخالف ہو۔ دونہ خرط القتاد ہو۔ لوگوں نے اس بارے میں چودہ مختلف اقوال کہے ہیں۔ سب سے صحیح اور درست مذہب سلف اور ائمۂ امت کا ہے کہ اللہ پاک عرش پر مستوی ہے بغیر کیفیت کے، اس چیز سے پاک ہے جو اس پر جائز نہیں۔ اس بارے میں صریح آیات اور صحیح احادیث بہت ہیں۔

فتح البیان میں ہر جگہ اس پر خوب کلام کیا ہے، یہاں بھی کچھ لکھا ہے۔ آخر کو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا قول نقل فرمایا ہے، وہ یہ ہے: "وَاسْتَطَالَ هٰؤُلَاءِ الْخَائِضُوْنَ عَلٰى مَعْشَرِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ، وَسَمُّوْهُ مُجَسِّمَةً مُشَبِّهَةً وَقَالُوْا: هُمُ الْمُتَسَتِّرُوْنَ بِالْبَلْكَفَةِ، وَقَدْ وَضَحَ عَلَيَّ وُضُوْحًا بَيِّنًا أَنَّ اسْتِطَالَتَهُمْ هٰذِهِ لَيْسَتْ بِشَيْءٍ، وَأَنَّهُمْ مُخْطِئُوْنَ فِيْ مَقَالَتِهِمْ رِوَايَةً وَّدِرَايَةً، وَخَاطِئُوْنَ فِيْ طَعْنِهِمْ أَئِمَّةَ الْهُدٰى"[2] انتهٰى. "ان لوگوں نے زبان درازی کرتے ہوئے جماعت اہلِ حدیث کو مجسمہ و مشبہہ ہونے کا الزام دیا اور کہا کہ یہ لوگ "بلا کیف" کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں، جب کہ مجھے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آئی ہے کہ ان کی زبان درازی کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور وہ اپنی اس بات میں سراسر غلطی پر ہیں اور ائمۂ ہدایت پر طعن کر کے خطا کے مرتکب ہو رہے ہیں۔" غرضیکہ اللہ پاک نے اپنی قدرتِ تامہ بیان فرما کر ان کو دھمکی دی: ﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ﴾ یعنی اللہ کے ورے یا اس کے عذاب کے ورے تمھارا کوئی حامی و مددگار و دوست نہیں ہے، جو تمھاری حمایت

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٧) فتح القدير (٤/ ٣٢٦) [2] حجة الله البالغة (١/ ١٣٣۔ ١٣٤)

اور مدد کرے، تمھارے ساتھ دوستی کا برتاؤ کرے اللہ کے عذاب کو تم سے دور کرے، نہ کوئی سفارشی ہے کہ اس کے پاس تمھاری سفارش کرے۔ ﴿ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ پھر کیا تم سوچتے نہیں ہو غور وفکر کے ساتھ اور ان مواعظ اور نصیحتوں کو غور سے سنتے نہیں ہو کہ اس سے فائدہ اٹھاؤ اور مومن ہو جاؤ۔ پھر جب اللہ پاک نے آسمانوں اور زمین اور ان کے اندر اور درمیان کی چیزوں کے پیدا کرنے کا بیان کیا تو پھر ان کے امور کی جو وہ تدبیر کرتا ہے، اس کا بیان فرمایا:

﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾

جمہور نے ﴿ يَعْرُجُ ﴾ بہ صیغۂ معرف پڑھا ہے اور امام ابن ابی عبلہ نے بہ صیغۂ مجہول۔ اصل میں "يُعْرَجُ بِهٖ" ہے۔ پھر جار حذف ہوا اور ضمیر مستتر (پوشیدہ) ہوگئی اور ﴿ تَعُدُّوْنَ ﴾ کو جمہور نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے خطاب کی بنا پر اور بیائے تحتیہ بھی پڑھا گیا ہے۔ (یہ قراءت امام حسن، سلمی، ابن وثاب اور اعمش رحمہ اللہ کی ہے۔)[1] اس آیت کے معنی میں بڑا اختلاف ہے:

1 علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: تدبیر کرتا ہے دنیا کے کام کی آسمان سے زمین کی طرف، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو، پھر چڑھے گا وہی سارا کام، یعنی اس کی طرف جائے گا، تاکہ اس میں حکم کرے اس دن میں جس کی مقدار ایک ہزار برس کی ہے، دنیا کے دنوں میں سے جن کو تم گنتے ہو۔ یہ قیامت کا دن ہے۔[2] انتہیٰ.

2 دوسرے وہ معنی ہیں جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھے ہیں، جو پہلے گزر چکے ہیں۔

3 تیسرے معنی یہ ہیں کہ امر سے مراد مامور بہ ہے، یعنی جن اعمال کا امر کیا گیا ہے، ان کو نازل کرتا ہے، تدبیر کیے ہوئے آسمان سے زمین کی طرف۔

4 چوتھے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے کام کی آسمانی اسباب سے تدبیر کرتا ہے، یعنی فرشتے وغیرہ ان کے احکام اور آثار لے کر زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں۔

5 پانچویں معنی یہ ہیں کہ وحی کو جبریل علیہ السلام کے ہمراہ اتارتا ہے۔ عمرو بن مرہ نے عبدالرحمٰن بن سابط سے روایت کیا ہے کہ دنیا کے کام کی تدبیر چار فرشتے کرتے ہیں: جبریل، میکائیل، ملک الموت اور اسرافیل۔ جبریل علیہ السلام تو ہواؤں اور لشکروں پر مقرر کیے گئے ہیں اور میکائیل علیہ السلام بارش اور پانی پر مقرر ہیں اور ملک الموت علیہ السلام روحوں کو قبض کرنے پر مقرر ہیں اور اسرافیل علیہ السلام امرِ الٰہی کو لے کر اُن پر نازل ہوتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ عرشِ معلّٰی وہ جگہ ہے، جہاں تدبیر کی جاتی ہے، جس طرح کہ ما دون عرش موضعِ تفصیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ ﴾ [الرعد: ۲] "پھر وہ عرش پر مستوی ہوا، اور سورج اور چاند کو کام پر لگایا، ہر ایک مقررہ مدت کے لیے

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٢٧۔ ٣٢٨) [2] تفسير النسفي (٣/ ٢٨٩)

چل رہا ہے۔ وہ کام کی تدبیر کرتا ہے، (اپنی) نشانیاں تفصیل سے بیان کرتا ہے۔'' اور ما دون سماوات موضعِ تصریف ہے (فتح البیان میں اس جگہ موضع التصرف ہے)۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ﴾ [الفرقان: ٥٠] ''اور بلاشبہہ ہم نے اس کو ان کے سامنے بار بار بیان کیا، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔''[1]

(ذكره القرطبي)

6 ﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ﴾ "أَيْ: أَمْرَ الدُّنْيَا، أَيْ: شَأْنَهَا وَحَالَها" یعنی تدبر کرتا ہے دنیا کی شان اور حال کی اور ان امور کی جو اس میں واقع ہوتے ہیں۔ تدبیرِ امرِ دنیا سے مراد وہ قضائے سابق ہے جو ارادۂ ازلیہ مقتضیہ ہے، ایک خاص ترتیب پر موجودات کے نظام کو چلانے کے لیے۔ قضا کو مبتداء ٹھہرایا جانبِ آسمان سے، اس لیے کہ قضا آسمانی اسباب سے منوط ہے، یعنی وابستہ ہے۔ منتہیٰ زمین کی طرف کیا، اس لیے کہ ان اسباب کے آثار زمین کی طرف منتہی ہوتے ہیں اور امرِ دنیا کا عروج اللہ پاک کی طرف مجاز ہے امرِ دنیا کے ثبوت سے اللہ کے علم میں۔ (ذكره محي الدين شيخ زاده) پس کلمۂ ﴿ اِلَى ﴾ ﴿ يُدَبِّرُ ﴾ سے متعلق ہے، اس وجہ سے کہ وہ "ینزل" کے معنی کو شامل ہے اور کلمۂ ﴿ مِنَ ﴾ ابتدائیہ ہے اور ﴿ اِلَى ﴾ انتہائیہ۔

پھر جب اللہ پاک نے تدبیرِ امر کا ذکر کیا تو اس کے عروج کا بیان اس طرح فرمایا:

1 ﴿ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ یعنی پھر عائد اور راجع ہو گا وہ امر، تدبیر اور تصرف مخلوقات میں حشر، حساب، وزنِ اعمال، عذاب اور انعامات وغیرہ کے ساتھ جو اللہ پاک کی طرف سے اس دن واقع ہو گا، جس کی مقدار تمھاری گنتی میں ہزار برس ہے، جو تم دنیا میں شمار کرتے ہو۔ اس سے مراد روزِ قیامت ہے کہ جس کی مقدار ایامِ دنیا سے ہزار برس ہے۔ یہ اس وقت ہو گا کہ دنیا کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور جو لوگ اس میں ہیں مر جائیں گے، یہ وہی معنی نسفی رحمہ اللہ کے ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔

2 کسی نے کہا ہے کہ رجوع کرتا ہے وہ امر اور عود کرتی ہے وہ تدبیر اللہ پاک کی طرف ایک دن میں جس کی مقدار ہزار برس ہے۔ یہ مسافت آسمان سے نزول اور زمین سے چڑھنے کے اعتبار سے ہے، کیوں کہ آسمان اور زمین کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے اور پانچ سو اترنے کے اور پانچ سو چڑھنے کے، یہ پورے ہزار ہو گئے۔

3 کسی نے کہا ہے کہ اہلِ زمین کی خبریں مراد ہیں جو اللہ پاک کی طرف ان فرشتوں کے ساتھ چڑھتی ہیں جن کو وہ زمین کی طرف بھیجتا ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے پاس ثبت کیے جاتے ہیں اور زمین والوں نے جو کچھ عمل کیا ہے، وہ اس کے فرشتوں کے صحیفوں میں ہر وقت لکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ دنیا کی مدت اپنے آخر کو پہنچ جائے۔

4 کسی نے کہا: ﴿ يَعْرُجُ اِلَيْهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ثابت ہوتا ہے وہ امر اللہ کے علم میں درآنحالیکہ وہ موجود

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٨٥)

بالفعل ہے ایک مدت دراز میں، جس کی مقدار ہزار برس ہے، مراد اس زمانے کی مدت ہے جو ان کی تدبیر کرنے اور واقع ہونے کے درمیان ہے۔

5 کسی نے کہا ہے کہ روزانہ کے معمولات کی تدبیر کرتا ہے، ان کو لوحِ محفوظ میں ثبت کرنے کے ساتھ، چنانچہ فرشتے ان کو لے کر اترتے ہیں، پھر اس کی طرف چڑھتے ہیں، ایک زمانے میں جو دنیا کے دنوں میں ہزار برس کی مثل ہے۔

6 کسی نے کہا ہے کہ ہزار برس کی قضا جاری کرتا ہے، چنانچہ فرشتے اس کو لے کر اترتے ہیں، پھر ہزار برس کے بعد دوسرے ہزار برسوں کے لیے چڑھتے ہیں۔

7 کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ وہ اعمال جو طاعات ہیں، اللہ پاک ان کی تدبیر کرتا ہے اور اس کے فرشتے ان کو لے کر اترتے ہیں، پھر ان میں سے خالص اس کی طرف نہیں چڑھتے مگر ایک مدتِ دراز کے بعد، کیوں کہ مخلص بندے قلیل ہیں۔

8 کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَعْرُجُ ﴾ کی ضمیر فرشتے کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ سیاق سے یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے، اگرچہ عبارت میں اس کا ذکر نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ ﴾ [المعارج: ٤] ''فرشتے اور روح (جبریل) اس کی طرف چڑھیں گے۔'' اس میں صریحاً اس کا ذکر آچکا ہے اور ﴿ اِلَيْهِ ﴾ کی ضمیر سماء کی طرف راجع ہے، اس شخص کی لغت کی بنا پر جو اس کو مذکر بولتا ہے۔ کلامِ عرب میں سماء کا استعمال مذکر و مونث دونوں طرح ہوتا ہے۔ یا راجع ہے مکانِ ملک کی طرف جس کی طرف وہ رجوع کرتا ہے، یہ وہی مکان ہے جس میں اللہ نے اس کو قرار پذیر کیا ہے۔

9 کسی نے کہا ہے کہ امرِ آفتاب کے طلوع اور غروب کی اور اس کے اپنی طلوع کی جگہ سے رجوع کی تدبیر کرتا ہے، ایک دن میں جس کی مقدار مسافت کے لحاظ سے ایک ہزار برس ہے۔

10 کسی نے کہا ہے کہ فرشتہ اللہ کی طرف چڑھتا ہے ایک دن میں، جس کی مقدار اگر غیر فرشتہ اس کو چلے تو ایک ہزار برس ہو، کیوں کہ آسمان و زمین کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ پانچ سو برس کی راہ ہے، چنانچہ آسمان سے زمین کی طرف اترنے کا اور زمین سے آسمان کی طرف چڑھنے کا فاصلہ ہزار برس ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس کو ترجیح دی ہے۔ ان میں سے امام ابن جریر رحمہ اللہ ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اترنے کی مسافت ایک ہزار برس اور چڑھنے کی مسافت ایک ہزار برس ہے۔ یہ قول ضحاک رحمہ اللہ سے مروی ہے۔[2] یہ یوم ایک زمانے سے عبارت ہے، جس کا ہزار برس کے ساتھ اندازہ کیا جاتا ہے، اس سے مسمّیٰ یوم کا مراد نہیں

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٩) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٨٧)

ہے جو دو راتوں کے درمیان کی مدت ہے۔ عرب لوگ کبھی مدت کو دن کے پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے: ؎

يَوْمَانِ يَوْمُ مَقَامَاتٍ وَأَنْدِيَةٍ   وَيَوْمُ سَيْرٍ إِلَى الْأَعْدَاءِ تَأْوِيْبُ

کیونکہ شاعر نے یومان سے دو مخصوص دنوں کا ارادہ نہیں کیا ہے، اس کی مراد تو یہ ہے کہ ممدوحین کا زمانہ دو حصوں پر منقسم ہوتا ہے، چنانچہ دو حصوں میں سے ہر ایک کی تعبیر یوم سے کی۔ غرض یہ ہے کہ ان کا زمانہ دو ہی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ بزم و رزم، یا بزم آرائی ہوتی ہے، دوست آشنا بیٹھتے ہیں، لطائف وظرائف ہو رہے ہیں، شعر اشعار پڑھ رہے ہیں، یا دشمنوں کی طرف جا رہے ہیں، ان سے مقابلہ ہو رہا ہے، دادِ شجاعت دے رہے ہیں، ان کی تادیب کر رہے ہیں، تاکہ پھر سر نہ اٹھائیں۔

یہاں ایک جماعت نے استشکال کیا ہے کہ اس آیت میں اور قولہ تعالیٰ: ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ [المعارج: ٤] ''فرشتے اور روح (جبریل) اس کی طرف چڑھیں گے ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔'' میں جمع کیسے ہوگا، اس لیے کہ اس آیت میں تو ہزار برس کا دن ہے اور اس میں پچاس ہزار برس کا؟ تو علماء نے اس کے کئی جواب دیے ہیں:

1 ایک یہ ہے کہ قیامت کے دن کی مقدار دنیا کے دنوں سے ایک ہزار برس ہے، لیکن اپنی سختی اور صعوبت اور سخت ہولناکیوں کی وجہ سے کفار کے لیے پچاس ہزار برس کے برابر ہوگا۔ عرب لوگ سختی اور لڑائی کے دن کو اکثر طول کے ساتھ موصوف کیا کرتے ہیں، جس طرح کہ سرور اور خوشی کے دن کو قصر (کم ہونا) کے ساتھ موصوف کرتے ہیں، چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے: ؎

وَيَوْمٌ كَظِلِّ الرُّمْحِ قَصَّرَ طُوْلَهُ   دَمُ الزِّقِّ عَنَّا وَاصْطِفَاقُ الْمَزَاهِرِ

کسی اور نے کہا ہے: ع وَيَوْمٌ كَإِبْهَامِ الْقَطَاةِ قَطَّعْتُهُ

2 کسی نے کہا ہے کہ روزِ قیامت میں ایام ہیں، ان میں سے کسی دن کا مقدار تو ہزار برس کا ہے اور کسی کا پچاس ہزار برس کا۔

3 کسی نے کہا ہے کہ اوقات مختلف ہیں۔ انواعِ عذاب میں سے ایک نوع کے ساتھ کافر کو ہزار برس عذاب ہوگا، پھر ایک اور قسم کی طرف منتقل کیا جائے گا تو پچاس ہزار برس عذاب کیا جائے گا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ وَمِنْ أَحْوَالِ أَهْلِ النَّارِ، اَللّٰهُمَّ أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ آمِيْنَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

4 کسی نے کہا ہے کہ روزِ قیامت کے مواقف (کھڑے ہونے کی جگہ) پچاس ہیں، ہر موقف ہزار برس کا ہے، یعنی ﴿يَعْرُجُ اِلَيْهِ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ چڑھے گا، اس کی طرف ان وقتوں میں سے ایک وقت میں، یا ان

مواقف میں سے ایکْ موقف میں۔ یہ جواب اس بنا پر تھے کہ اس آیت میں یوم سے مراد روزِ قیامت ہے، جس طرح کہ اقوالِ مذکورہ میں گزر چکا ہے۔

5 امام مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے کہ آیت ﴿ تَعْرُجُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ سے اللہ پاک کی مراد وہ مسافت ہے جو زمین سے سدرۃ المنتہیٰ تک ہے، جہاں جبریل علیہ السلام کا مقام ہے۔ مراد یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام اور جو فرشتے ان کے ہمراہ ہیں، اس مقام سے زمین ہی کی طرف چلتے ہیں، پچاس ہزار برس کی راہ ایک دن کی مقدار میں دنیا کے دنوں سے۔[1] اور ﴿ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ میں مراد وہ مسافت ہے جو زمین اور آسمانِ دنیا کے درمیان ہے، اترنے اور چڑھنے دونوں کو ملا کر، کیوں کہ وہ دنیا کے دنوں کے حساب سے ہزار برس کی مقدار ہے۔[2]

6 کسی نے کہا ہے کہ یہ امر کے نافذ کرنے کی مدت کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ جس شخص کا امر نفاذ کی غرض سے ایک یا دو دن میں نافذ ہو اور منقطع ہو جائے، یہ شخص اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا جس کا امر سالہائے دراز میں نافذ رہتا ہے، چنانچہ ﴿ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ ایسے زمانے میں تدبیر کرتا ہے جس کا ایک دن ہزار برس کا ہے۔ پھر اس کا مہینا کتنا ہوگا، اس کا سال کتنا ہوگا، اس بنیاد پر اب ہزار برس اور پچاس ہزار برس کے درمیان کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔

اس کے سوا اَور اقوال ہیں۔ حقیقت میں یہ آیتیں مشکل ہیں، خود عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حبرِ امت ترجمان القرآن نے توقف فرمایا، جبکہ کسی نے ان سے ان کے بارے میں سوال کیا، چنانچہ ان کا ذکر آتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں کئی قول مروی ہیں:

1 ﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: یہ دنیا میں ہے۔ چڑھتے ہیں فرشتے ایک دن میں جس کی مقدار ہزار برس ہے۔[3] (أخرجه ابن جرير و ابن المنذر عنه)

2 ﴿ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: دوپہر نہ ہوگی دنیا کے دنوں میں سے ایک دن میں یہاں تک کہ فیصلہ کیا جائے گا بندوں کے درمیان، چنانچہ نازل ہوں گے اہلِ جنت، جنت میں اور اہلِ نار، نار میں، اور اگر اس کے غیر کی طرف ہوتا تو وہ پچاس ہزار برس میں بھی فارغ نہ ہوتا۔[4] (أخرجه ابن أبي حاتم عنه)

3 ﴿ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: ان چھے دنوں سے جن میں اللہ نے آسمان و زمین بنائے۔[5] (أخرجه الفريابي و ابن جرير و ابن أبي حاتم و الحاكم و صححه عنه)

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٨٨) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٧) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٨)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٤) [5] تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٨)

4 ﴿ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: تمھارے ان دونوں میں سے ایک دن میں اور آسمان اور زمین کے درمیان مسافت پانچ سو برس کی ہے۔[1] (أخرجه ابن جرير عنه)

5 عبداللہ بن ابی ملیکہ رحمہ اللہ کہتے ہیں میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر داخل ہوا اور میرے ساتھ عبداللہ بن فیروز مولی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے تو ابن فیروز نے ان سے کہا: اے ابو عباس! قولہ ﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ ﴾ پس گویا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو متہم کیا تو فرمایا: کیا دن ہے جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہے؟ ابن فیروز بولا کہ میں نے تو آپ سے پوچھا ہے، تاکہ آپ مجھے خبر دیں۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ دو دن ہیں، اللہ نے اپنی کتاب میں ان کو ذکر فرمایا ہے، اللہ ہی ان کو خوب جانتا ہے اور میں مکروہ جانتا ہوں کہ اللہ کی کتاب میں وہ بات کہوں جس کو میں جانتا نہیں ہوں۔ "فَضَرَبَ الدَّهْرُ مِنْ ضَرَبَاتِهِ" (ویروی: "من ضربه" أي: مر من مروره وذهب بعضه.[2] كذا في مجمع البحار)۔

یعنی پھر کچھ وقت گزرا، یہاں تک کہ میں ابن مسیّب کی طرف بیٹھ گیا، تو ان سے ایک شخص نے انہیں آیتوں کے بارے میں پوچھا تو ابن مسیّب نے اس کو خبر نہ دی نہ ان کو معلوم ہوا، پھر میں نے کہا: کیا میں تجھے خبر نہ دوں اس بات کی جو میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا، پھر میں نے ابن مسیّب سے وہ قصہ کہہ دیا تو ابن مسیّب نے سائل سے کہا: یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ابھی انکار کر چکے ہیں کہ اس کے بارے میں کچھ کہیں، حالاں کہ وہ مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں۔[3] (أخرجه عبدالرزاق وسعيد بن منصور وابن المنذر وابن أبي حاتم وابن الأنباري في المصاحف والحاكم وصححه)

﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ اللہ پاک کی طرف ہے اس اعتبار سے کہ وہ مذکورہ صفات کے ساتھ متصف اور متبداء ہے، اس کی خبر ﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ ہے۔ یعنی یہ خالق و مدبر اس شے کا جاننے والا ہے جو مخلوق سے غائب ہے اور جو ان کو حاضر ہے۔ اس میں تہدید کے معنی ہیں، کیوں کہ جس وقت اللہ پاک غائب اور حاضر کو جان چکا ہے تو وہ ضرور ہر عامل کو اس کے عمل کی جزا دینے والا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ کام کی اس شے کے ساتھ تدبیر کرے گا جس کی مقتضی اس کی حکمت ہو گی۔ ﴿ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴾ یعنی قاہر و غالب ہے اور اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ یہ سب خبریں ہیں ﴿ ذٰلِكَ ﴾ متبداء کی، اسی طرح ﴿ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ اور خبر ہے اس کی۔

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝۷ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝۸ ثُمَّ

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٦٧) [2] مجمع البحار الأنوار (٣/ ٣٩١)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٣-٣١٠٤) الدر المنثور (٦/ ٥٣٧-٥٣٨)

سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝٩ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ
ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝١٠
قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ
تُرْجَعُوْنَ ۝١١

جس نے ہر چیز کو اچھے طریقے سے پیدا کیا، اور اس نے تخلیقِ انسان کی ابتدا مٹی سے کی ⑦ پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے جوہر (نطفے) سے چلائی ⑧ پھر اس (کے اعضاء) کو درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم کم ہی شکر کرتے ہو ⑨ اور ان لوگوں (کافروں) نے کہا: کیا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا ضرور ہم نئی پیدائش میں (ظاہر) ہوں گے؟ (نہیں!) بلکہ وہ تو اپنے رب کی ملاقات ہی کے منکر ہیں ⑩ کہہ دیجیے: تمھیں موت کا فرشتہ فوت کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے، پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ⑪

انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا بیان اور منکرینِ بعث کا رد:

اپنی روح پھونکی۔ جس کو عزت دی اس کو اپنا کہا، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ ﴾ سو انسان کی جان غیب سے آئی ہے، مٹی گارے سے نہیں بنی، اس کو اپنی کہا اور یہ نہ سمجھے کہ اللہ کی جان۔ جان ہو تو بدن بھی ہو، بدن ہو تو ترکیب بھی ہو، ذات پاک کہاں رہی۔ یعنی تم اپنے آپ کو دھڑ سمجھتے ہو کہ خاک میں رل گئے۔ تم جان ہو وہ فرشتہ لے جاتا ہے فنا نہیں ہو جاتی۔ انتھیٰ۔

اللہ پاک بتاتا ہے کہ اس نے اشیاء کی پیدائش کو خوب بنایا ہے اور ان کا اِحکام و اِتقان کیا ہے، یعنی ان کو محکم اور مضبوط کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ "أَحْسَنَ خَلْقَ كُلِّ شَيْءٍ"، یعنی ہر شے کی پیدائش خوب بنائی۔ گویا زید نے اس کو مقدم و موخر کے باب سے ٹھہرایا ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے خلق سمٰوٰت والارض کا ذکر کیا تو خلقِ انسان کا ذکر شروع فرمایا۔ ﴿ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴾ یعنی اللہ نے ابو البشر آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا۔ ﴿ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ یعنی پھر بنی آدم کی نسل نطفے سے ہونے لگی جو مرد کی پشت کے درمیان سے اور عورت کے سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔

﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ ﴾ یعنی پھر جب آدم کو مٹی سے پیدا کیا تو اس کو برابر ٹھیک مستقیم سیدھا بنایا۔ ﴿ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ﴾ اور پھونکی اس میں اپنی جان سے۔ ﴿ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ﴾ یعنی تمھارے لیے مختلف عقول کر دیں۔ ﴿ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ یعنی یہ قویٰ جو اللہ عزوجل نے تم کو عطا کیے، تم ان کا بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔ چنانچہ سعید اور نیک بخت وہ ہے جو اُن کو اپنے رب عزوجل کی طاعت میں استعمال کرے۔ پھر اللہ پاک مشرکوں کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ انھوں نے معاد کو بعید سمجھا، کہنے لگے: کیا جس وقت ہمارے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور زمین کے اجزا میں رل مل گئے اور جاتے رہے تو کیا ہم اس حالت کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے۔ معاد کو بعید سمجھتے ہیں اور یہ جو بعید سمجھتے ہیں تو اپنی عاجزی کی وجہ سے ہے، اس ذات پاک کی قدرت کے لیے کچھ بھی بعید نہیں، جس نے ان کی ابتداء کی اور عدم سے ان کو پیدا کیا، جس کا امر تو یہ ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ کرے تو اس سے کہتا ہے: ہو جا تو اسی وقت وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴾

پھر فرمایا: ﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ﴾ اس آیتِ کریمہ سے ظاہر یہ ہے کہ ملک الموت فرشتوں میں سے ایک خاص شخص ہے جس طرح کہ سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے، جس کا ذکر سورت ابراہیم میں ہو چکا ہے۔[1] بعض آثار میں ملک الموت کا نام عزرائیل آیا ہے اور مشہور یہی ہے۔ (قالہ قتادة و غير واحد) اور اُن کے معاون اور مددگار ہیں، اسی طرح حدیث شریف میں مروی ہے کہ ان کے معاون روحوں کو جسم سے کھینچتے ہیں، یہاں تک کہ جس وقت وہ حلقوم کو پہنچتی ہے تو ملک الموت اس کو لے لیتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: زمین ان کے لیے گھیر دی گئی ہے، پھر وہ ان کے لیے طشت کی طرح کر دی گئی ہے، لیتے ہیں اس سے جہاں چاہتے ہیں۔[2] (و رواه زهير بن محمد عن النبي ﷺ بنحوه مرسلا و قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے جعفر بن محمد سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے اپنے باپ کو سنا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملک الموت کی طرف نظر کی جب وہ انصار کے ایک شخص کے سر کے قریب تھے تو نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا: «أَيْ مَلَكَ الْمَوْتِ أَرْفُقْ بِصَاحِبِيْ فَإِنَّهُ مُؤْمِنٌ » یعنی تو میرے ساتھی سے نرمی کر، کیوں کہ وہ تو مومن ہے۔ ملک الموت نے کہا: "يَا مُحَمَّدُ! طِبْ نَفْسًا وَقَرَّ عَيْنًا فَإِنِّيْ بِكُلِّ مُؤْمِنٍ رَفِيْقٌ" یعنی آپ اپنا جی خوش رکھیں اور آنکھ ٹھنڈی، میں تو ہر مومن سے نرمی کرنے والا ہوں اور آپ جان رکھیں کہ زمین میں کوئی گھر مٹی کا یا بالوں کا نہیں ہے نہ خشکی میں نہ دریا میں، مگر حال یہ ہے کہ میں ان کے چہروں کو ہر دن میں پانچ دفعہ دیکھ لیتا ہوں، یہاں تک کہ میں ان کے ہر چھوٹے بڑے کو ان کی اپنی جانوں سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ قسم ہے اللہ کی! اے محمد! اگر میں ارادہ کروں کہ ایک مچھر کی روح کو قبض کروں تو میں اس پر قادر نہیں ہوں، یہاں تک کہ اللہ اس کو

---

[1] رقم الآية (٢٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٢٠/ ١٧٥)

قبض کرنے کا حکم دے۔ جعفر رحمہ اللہ نے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ جو اُن کے چہروں کو دیکھتا ہے تو وہ نماز کے اوقات میں دیکھتا ہے، پھر جس وقت وہ ان کے پاس حاضر ہوگا موت کے وقت تو اگر وہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جو نماز کی محافظت کرتے ہیں تو فرشتہ اس کے قریب ہوگا اور شیطان کو اس سے دور کر دے گا اور اس حالتِ عظیم میں فرشتہ اس کو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تلقین کرے گا۔[1]

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ نہیں ہے زمین کی پشت پر کوئی گھر جو بالوں کا یا مٹی ڈھیلوں کا بنا ہوا ہو، مگر حال یہ ہے کہ ملک الموت اس گھر کا ہر دن میں دو بار گشت کرتا ہے۔[2] کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا: قسم ہے اللہ کی! نہیں ہے کوئی گھر جس میں اہلِ دنیا میں سے کوئی رہتا ہے، مگر حال یہ ہے کہ ملک الموت دن میں دو بار اس کا گشت کرتا ہے، اس کے دروازے پر ہر دن میں سات دفع نظر کرتا ہے کہ آیا اس میں کوئی ایسا شخص ہے کہ جس کو وفات دینے کا اسے حکم کیا گیا ہو۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم) قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی پھر اپنے رب کی طرف رجوع کیے جاؤ گے، یعنی قیامت کے دن اور قبروں سے اٹھنے کے دن اپنے عملوں کی جزا کے لیے۔[4] (کذا في ابن کثیر)

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ خَلَقَهٗ ﴾ بہ فتحِ لام اور امام ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر رحمہم اللہ نے باسکانِ لام پڑھا ہے۔ پہلی قراءت کی بنا پر فعل ماضی صفت ہے ﴿ شَيْءٍ ﴾ شے کی محلِ جر میں۔ جمہور کی قراءت کو امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے۔[5] یہ بھی جائز ہے کہ مضاف کی صفت ہو تو محلِ نصب میں ہوگا۔ دوسری قراءت کی بنیاد پر اس کے نصب میں پانچ وجہیں ہیں: اول یہ ہے کہ ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ سے بدلِ اشتمال ہے اور ضمیر راجع ہے ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ کی طرف۔ نحویوں کے نزدیک مشہور وجہ یہی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بدل الکل من الکل ہے اور ضمیر اللہ سبحانہ کی طرف راجع ہے۔ ﴿ اَحْسَنَ ﴾ کے معنی "حَسَّنَ" ہیں۔ اس لیے کہ نہیں ہے کوئی شے مگر وہ اللہ پاک کی حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہے، اس لیے ساری مخلوق حسن اور خوب ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ مفعولِ اول ہے اور "خَلْقَهُ"، مفعولِ ثانی، اس بنا پر کہ "أَعْطىٰ" میں ﴿ اَحْسَنَ ﴾ کے معنی شامل ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ہر شے کو اس کی خلق عطا کی جس کے ساتھ اس کو خاص کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَلْهَمَ" کے معنی میں ﴿ اَحْسَنَ ﴾ شامل ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی خلق کو ہر اس شے کا الہام کیا، جس کی طرف وہ محتاج ہوتی ہے۔[6]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۱۰۵) المعجم الکبیر (٤/ ۲۲۰) اس کی سند میں "عمرو بن شمر" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ٦٤١٠)

[2] تفسیر الطبري (۱۱/ ٤١٢) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۱۰۵) [4] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۹۹۔ ۶۰۰)

[5] تفسیر القرطبي (١٤/ ۸۹) [6] فتح القدیر (٤/ ۳۲۸)

چوتھی وجہ یہ ہے کہ منصوب ہے اس بنا پر کہ مصدر مؤکد ہے مضمونِ جملہ کے لیے "أَيْ: خَلَقَه خَلْقًا"، مثل "صُنْعَ اللّٰهِ" کے۔ یہ قول سیبویہ کا ہے اور ضمیر اللہ سبحانہ کی طرف راجع ہے۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ منصوب بنزعِ خافض ہے، معنی یہ ہیں: "أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ فِي خَلْقِهِ" یعنی خوب بنایا ہر شے کو اپنی خلق میں۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے اپنی مخلوقات کی پیدایش کو خوب مضبوط اور محکم کیا، لہٰذا بعض مخلوقات گو فی نفسہٖ حسین اور خوبصورت نہیں ہیں، لیکن مضبوط اور محکم تو ضرور ہی ہیں۔ چنانچہ اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شے کو اس کی خلق عطا کی، یعنی انسان کو خلقِ بہیمہ پر پیدا نہیں کیا اور نہ ہی چار پایوں کو انسانی تخلیق پر پیدا کیا۔ اتقان کے معنی پہلے گزر چکے ہیں۔ اتقان یہی ہے کہ ہر شے کو ایسا بنایا جیسا کہ چاہیے خوب اچھی طرح۔ اور سادہ بنائی کوئی بات جو اس میں ضروری اور مناسب ہے باقی نہیں چھوڑی۔ کسی نے کہا کہ یہ لفظ میں عموم ہے اور معنی میں خصوص۔ یعنی خوبصورت بنائی ہر شے، اس کی خلق کو خوبصورت کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ یوں پڑھتے تھے: "أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ" فرمایا: کیا تو نے نہیں دیکھا بندر کو کہ وہ خوبصورت نہیں ہے، لیکن اس کی خلق کو محکم کیا ہے، یعنی اس کو خوب مضبوط اور پختہ بنایا ہے۔ (أخرجه ابن أبي شيبة والحكيم الترمذي في نوادر الأصول و ابن جرير و ابن المنذر عنه)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: خبردار بے شک بندر کی دُبر خوبصورت نہیں ہے، لیکن اس کی خلق کو خوب محکم و مضبوط بنایا ہے اور فرمایا: "خَلْقَهُ صُوْرَتَهُ" یعنی خلقِ شے سے مراد اس کی صورت ہے۔ یعنی اللہ پاک نے اچھی طرح بنایا ہے ہر شے کو، بدصورت کو اور خوبصورت کو اور بچھوؤں کو اور سانپوں کو اور ہر شے کو ان اشیاء میں سے جن کو پیدا کیا اور اس کا غیر اُن میں سے کسی شے کو اچھی طرح نہیں بنا سکتا۔[1]

امام طبرانی رحمہ اللہ نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک دفع ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ اس وقت عمرو بن زرارہ انصاری ہم سے ملے اپنی چادر پہنے ہوئے، اس طرح سے کہ اس کو لٹکایا تھا، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کپڑے کا کنارہ پکڑ لیا تو عمرو بولے: یا رسول اللہ! میں تو پتلی پنڈلیوں والا ہوں، یعنی ان کا عیب چھپانے کے لیے تہبند لٹکا لیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو بن زرارہ! بے شک اللہ عزوجل نے یقیناً اچھی طرح بنایا ہے ہر شے کو۔ اے عمرو! بے شک اللہ دوست نہیں رکھتا ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانے والوں کو۔[2] امام احمد اور طبرانی رحمہ اللہ نے شرید بن سوید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے اپنا تہبند لٹکا لیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنا تہبند اونچا کر۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں تو احنف ہوں، یعنی میرے دونوں گھٹنے باہم لڑ جاتے ہیں، غرض یہ ہے کہ میرے پاؤں ٹیڑھے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنا تہبند اونچا کر، اللہ کی ہر مخلوق اور پیدایش اچھی ہے۔[3]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٤) الدر المنثور (٦/ ٥٣٩) [2] المعجم الكبير (٨/ ٢٣٢)

[3] مسند أحمد (٤/ ٣٩٠) المعجم الكبير (٧/ ٣١٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٥/ ٢١٦)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسٰنِ مِنۡ طِيۡنٍ ﴾ یعنی اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا تو وہ ایک بدیع صورت اور بدیع وحسین شکل پر ہو گئے۔ ﴿ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ﴾ نسل سے مراد ذریت، یعنی اولاد ہے۔ ﴿ سُلٰلَةٍ ﴾ بہ معنی نطفہ ہے۔ ذریت کا نام ﴿ سُلٰلَةٍ ﴾ اس لیے رکھا کہ وہ اصل سے کھنچتی ہے اور جدا ہوتی ہے اور نطفے کو ﴿ سُلٰلَةٍ ﴾ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آدمی کے سارے بدن سے کھینچا جاتا ہے۔ ﴿ مَآءٍ مَّهِيۡنٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ایک بے قدر پانی جس کی لوگوں کے نزدیک قدر نہیں ہے۔ مراد منی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ماءِ ضعیف۔[1] اس کی تفسیر سورۃ المومنین میں گزر چکی ہے۔[2] وہاں تو آدم علیہ السلام کی صفت مذکور ہے اور یہاں اولادِ آدم کی صفت۔ ﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ ﴾ یعنی پھر اس انسان کی خلق برابر کی، جس کی ابتدائی پیدایش مٹی سے کی تھی۔ یعنی آدم علیہ السلام یا ساری نوعِ، اور اس کی شکل ٹھیک کی اور اس کو سیدھا کیا اور جو چاہیے وہ تناسب کیا اس کے اعضاء کے درمیان، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ ﴾ [التين: ٤] ''بہترین شکل وصورت میں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ ﴾ یعنی کر دیا اس کو زندہ حساس اس کے بعد کہ وہ بے جان جماد تھا۔ روح کی اضافت جو اپنی طرف کی تو یہ عزت وتکریم کے لیے ہے۔ یہ اضافت اس بات کو تقویت دیتی ہے کہ گفتگو آدم علیہ السلام کے بارے میں ہے نہ کہ ان کی اولاد کے بارے میں، گو اس کی توجیہ بہ نسبت سب کے ممکن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اضافت تخصیص کے لیے ہے، یعنی اس میں اس شے سے پھونکا جس کے ساتھ اور جس کے علم کے ساتھ اللہ پاک مختص ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

پھر اللہ پاک نے ساری نوعِ انسانی کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ﴾ اس میں صیغۂ غائب سے صیغۂ حاضر کی طرف خطاب کو تبدیل کیا۔ اس سے پہلے ان کو مخاطب نہیں کیا، اس لیے کہ خطاب تو زندہ کو ہوتا ہے۔ چنانچہ جب یوں فرمایا کہ ﴿ نَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ ﴾ تو اس کے بعد اس کو مخاطب کیا اور فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ﴾ ''سَمۡعٌ'' بہ معنی ''إِسۡمَاعٌ'' ہے اور ''أَفۡئِدَةٌ'' بہ معنی قلوب، یعنی اور بنا دیے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل۔ یہ سب چیزیں تمھارے لیے پیدا کر دیں، تاکہ اپنی نعمت تم پر پوری کر دے اور تمھاری پیدایش کو ٹھیک اور مکمل کر دے یہاں تک کہ یہ ساری نعمتیں تمھارے لیے اکٹھی ہو جائیں اور تم ہر سننے والی چیز کو سن سکو اور ہر دیکھنے والی چیز کو دیکھ سکو اور ہر سمجھنے بوجھنے کی چیز کو سمجھو بوجھو۔

''سمع'' کے واحد ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ ''سمع'' مصدر ہے، قلیل اور کثیر کو شامل ہے۔ پھر یہ بات کہ سمع کو خاص کر مصدر ذکر کیا اور بصر اور فؤاد کو اِسم کے طور پر ذکر کیا، اسی لیے ان کی جمع کی گئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سمع قوتِ واحد ہے اور اس کا ایک ہی محل ہے، یعنی کان اور اس کو اس میں کچھ اختیار نہیں ہے، کیوں کہ آواز اس کی

---

[1] معاني القرآن (٤/ ٢٠٥) [2] رقم الآية (١٤)

طرف پہنچتی ہے۔ نہ وہ اس کو رد کرنے کی قدرت رکھتا ہے نہ سننے کی تخصیص پر کہ سننے کی بعض چیزوں کو سنے اور بعض کو نہ سنے۔ اس کے برخلاف ابصار ہے، ان کا محل آنکھ ہے اور ان کو اس میں اختیار ہے، کیوں کہ وہ دیکھے جانے والی چیز کی طرف حرکت کرتی ہے نہ کہ اس کے غیر کی طرف اور اپنے پپوٹوں کو بند کر لیتی ہے جب کسی شے کو دیکھنا نہیں چاہتی اور اسی طرح دل ہے کہ اس کو ایک طرح کا اختیار ہے اپنے ادراک میں کہ اس چیز پر غور کرے اُس پر نہ کرے، اِس کو سمجھے اُس کو نہ سمجھے۔ جمہور نے "بَدَأَ" بہ ہمزہ اور زہری نے صرف الف کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔[1]

﴿ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی "شُكْراً قَلِيلًا"۔ یا صفت ہے زمان محذوف کی، یعنی "زَمَاناً قَلِيلًا"، اس میں اس بات کا بیان ہے کہ وہ اللہ پاک کی نعمتوں کا کفران کرتے ہیں اور ان کے شکر کو چھوڑتے ہیں مگر شاذ و نادر کسی حال میں۔

﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾ ضلال کے معنی ہیں: غیوبت، جس وقت مُردہ زمین میں غائب ہو جاتا ہے، رَل مِل جاتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "ضَلَّ الْمَيِّتُ فِي التُّرَابِ"، یعنی مردہ مٹی میں غائب غُلا ہو گیا، رل مل گیا، اس کا کچھ اَتا پتا نہ رہا، جبکہ کسی شے پر کوئی شے یہاں تک غالب ہو جائے کہ اس کا اثر و نشان چھپ جائے تو ایسی شے کے لیے عرب لوگ یوں بولتے ہیں کہ "قَدْ ضَلَّ"، یعنی وہ بالکل غائب ہو گئی۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا: جبکہ ہم غائب ہو گئے زمین میں۔ جمہور نے "ضَلَلْنَا" پڑھا ہے، بہ فتحِ ضادِ معجمہ و لامِ مفتوحہ۔ معنی یہ ہیں: "ذَهَبْنَا وَضِعْنَا، وَصِرْنَا تُرَابًا، وَغِبْنَا عَنِ الْأَعْيُنِ" یعنی جبکہ جاتے رہے، ضائع ہو گئے، مٹی ہو گئے، آنکھوں سے غائب ہو گئے، زمین میں دفن ہونے کی وجہ سے۔ یحییٰ بن یعمر، ابن محیصن اور ابو رجاء رحمہم اللہ نے بکسرِ لام پڑھا ہے، یہ نجد سے عالیہ کی لغت ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: اہلِ عالیہ کہتے ہیں: "ضَلِلْتُ" بکسرِ لام۔ کہا: "وَأَضَلَّهُ أَيْ: أَضَاعَهُ وَأَهْلَكَهُ يُقَالُ: ضَلَّ الْمَيِّتُ إِذَا دُفِنَ" یعنی فلاں نے ضائع کیا، ہلاک کیا فلاں شے کو۔ جب مردہ دفن کر دیا جاتا ہے تو کہتے ہیں: "ضَلَّ الْمَيِّتُ"۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے، امام حسن، اعمش اور ابان بن سعید رحمہم اللہ نے "صَلَلْنَا" بہ صادِ مہملہ و لامِ مفتوحہ پڑھا ہے۔ "أَيْ: أَنْتَنَّا"، یعنی جبکہ ہم بدبو ہو گئے، گل سڑ گئے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "صَلَلْنَا" لغت میں معروف نہیں ہے، لیکن گوشت جس وقت بدبودار ہو جاتا ہے تو اس وقت بولتے ہیں: "صَلَّ اللَّحْمُ"، امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "صَلَّ اللَّحْمُ يَصِلُّ بِالْكَسْرِ صُلُوْلًا إِذَا أَنْتَنَ مَطْبُوْخًا كَانَ أَوْ نِيْئًا"[2] یعنی گوشت جب بدبودار ہو جاتا ہے پکا ہوا یا کچا تو اس وقت "صَلَّ اللَّحْمُ" کہتے ہیں۔ رہا قراء کا ان دونوں ہمزوں میں اختلاف تو اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور ہمزہ استنکار کے لیے ہے۔ ﴿ اِذَا ﴾ کا عامل محذوف ہے۔ تقدیر اس کی

[1] فتح القدير (٤/ ٣٢٩) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٩٠۔ ٩١) فتح القدير (٤/ ٣٢٩)

"نُبْعَثُ"، یا "نُخْرَجُ" ہے، حذف کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾ اس پر دال ہے۔

جملہ ﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾ مستانفہ ہے، کفار کی واہیات باتوں کو بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے، تاکہ خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہو، کیوں کہ اس سے پہلے ﴿ تَشْكُرُوْنَ ﴾ ہے۔ چاہیے تو یوں تھا کہ "قُلْتُمْ" ہوتا، لیکن یہ نہ کہا اور ﴿ قَالُوْٓا ﴾ بہ صیغہ غائب کہا۔ اس سے غرض اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کا جو ذکر ہوا تو وہ اس کا سبب ہے کہ ان سے اعراض کیا جائے، یہ ناشکرے اس قابل نہیں کہ انھیں مخاطب کیا جائے اور ان کی جنایتیں (گناہ) شمار کی جائیں۔ گویا طرزِ کلام یوں ہے کہ ان سے باتیں کرتے کرتے ان سے اظہارِ غیظ وغضب کے لیے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ دیکھو ہم نے ان پر کیا کیا انعام کیے اور کیسی کیسی نعمتیں ان کو عطا کیں اور انھوں نے نعمتوں کا کچھ شکر نہیں کیا، بلکہ پوری پوری ناشکری کی اور دیکھو یوں کہا: کیا جس وقت ہم زمین میں رل مل گئے، کیا ہم اٹھائے جائیں گے اور زندہ ہو جائیں گے؟ یعنی یہ ہرگز نہیں ہونا، یہ تو ایک انتہائی اوپری بات ہے، یہ بھلا کہیں ہو سکتا ہے؟ غرضیکہ اللہ پاک نے ان کفار کا کفر بیان کیا جو بعث کے منکرین تھے۔ پھر اس سے اضراب کر کے (ہٹ کر) ایک اور کفر جو انتہائی درجے کا بڑھا ہوا ہے، اس کا ذکر کیا، یعنی اللہ کی ملاقات کا کفر۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی بعث کا انکار کیا سو کیا، بلکہ یہ تو مکابرہ (تکبر) اور عناد کے مارے اپنے رب کی ملاقات کے انکاری ہیں۔ یہ انکار صرف عناد ہے، کیوں کہ ان کے یہ اعتراف کر لینے سے کہ اللہ پاک خلق کی ابتدا کرنے والا ہے، یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ اس بات کا بھی اعتراف کریں کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ ان کے لیے حق بات بیان کر دیں اور جس باطل کا انھوں نے زعم کیا ہے اس کو ان پر رد کریں۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ تمھیں موت کا وہ فرشتہ وفات دیتا ہے جو تمھاری روح قبض کرنے پر متعین ہے اور وہ تمھاری اَجل کا وقت آجانے پر تمھاری روح قبض کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد بعث ونشور کے ساتھ زندہ ہو کر آخر کو اپنے ہی رب کی طرف جاؤ گے نہ کہ کسی غیر کی طرف، پھر وہ تم کو تمھارے اعمال کی جزا دے گا۔ خیر ہیں تو خیر اور برے ہیں تو بُری جزا۔ جس وقت اللہ پاک کسی کو اپنی طرف قبض کرے تو محاورے میں بولیں گے: "تَوَفَّاهُ اللّٰهُ وَاسْتَوْفَا رُوْحَهٗ" "تفعل واستفعال" کئی جگہ ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، جیسے: "تَقَضَّيْتُهٗ، وَاسْتَقْضَيْتُهٗ وَتَعَجَّلْتُهٗ وَاسْتَعْجَلْتُهٗ"، ملک الموت سے مراد عزرائیل علیہ السلام ہیں۔

نکتہ:

یہاں ''توفی'' کی نسبت ان (ملک الموت) کی طرف کی ہے اور سورت انعام میں یوں فرمایا ہے:
﴿ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا ﴾ [الأنعام: ٦١] ''تو ہمارے فرشتے اسے فوت کرتے ہیں۔'' اور سورۃ الزمر میں اس طرح فرمایا ہے:
﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ [الزمر: ٤٢] ''اللہ ہی موت کے وقت جانیں قبض کرتا ہے۔'' ان میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے، اس لیے کہ حقیقتاً وفات دینے والا اللہ پاک ہی ہے۔ اس لیے کہ وہی موت کو پیدا کرتا ہے اور وسائط (ملک الموت کے معاون فرشتے) کو روح کو کھینچنے کا حکم فرماتا ہے۔ یہ لوگ روح کو ناخنوں سے لے کر حلقوم تک کھینچتے ہیں، لہٰذا ساری اضافتیں درست ہوگئیں۔ کہا ہے کہ ملک الموت ارواح کو پکارتے ہیں تو وہ ان کو جواب دیتی ہیں، پھر وہ اپنے معاونین کو ان کے قبض کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اس کا امر کرنے والا اللہ پاک ہی ہے۔ آیتوں کے درمیان جمع کی یہ وجہ ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ ٥

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝۱۲ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۳ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴

کاش! آپ دیکھیں جب مجرم اپنے رب کے حضور سر جھکائے (پیش) ہوں گے، (وہ کہیں گے:) اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، لہٰذا ہمیں واپس بھیج کہ ہم نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں⑫ اور اگر ہم چاہتے تو ہم ہر شخص کو اس کی ہدایت دے دیتے، لیکن میری طرف سے بات ثابت ہوگئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا⑬ چناں چہ تم (عذاب) چکھو اس لیے کہ تم نے اپنے اس دن کی ملاقات بھلائے رکھی، بے شک (آج) ہم نے بھی تمھیں بھلا دیا، اور جو (برے) عمل تم کرتے تھے، ان کی وجہ سے تم ہمیشہ کا عذاب چکھو⑭

قیامت کے دن مشرکوں کے برے حال کا بیان:

اللہ تعالیٰ مشرکوں کے حال اور قال (باتوں) کی خبر دیتا ہے، جب وہ بعث کا معائنہ کریں گے اور اللہ عزوجل

کے سامنے ذلیل وخوار ہو کر سر جھکائے ہوئے مارے شرم وخجالت کے کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا ﴾ یعنی اب ہم تیری بات کو سنتے ہیں اور تیرے حکم کو مانتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا ﴾ [مریم: ٣٨] ''وہ لوگ کیا ہی خوب سننے والے اور کیا ہی خوب دیکھنے والے ہوں گے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے!'' اسی طرح جب نار میں داخل ہوں گے تو اپنی جانوں کو ملامت کریں گے اور یوں کہیں گے: ﴿ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴾ [الملك: ١٠] ''اور وہ کہیں گے: کاش ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔'' اسی طرح یہ لوگ کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا ﴾ یعنی تو ہم کو پھر دنیا کی طرف بھیج ہم بھلائی کریں گے، ہم واقعی یقین اور تحقیق کر چکے ہیں، اس بات میں کہ تیرا وعدہ سچا ہے اور تیرا ملنا حق ہے۔

پروردگار ان سے اس بات کو جان چکا ہے کہ اگر ان کو پھر دارِ دنیا کی طرف بھیجے تو وہ پھر ویسے ہی ہوں جیسے وہ دنیا میں کافر ومنکر تھے اور اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور اس کے رسولوں کی مخالفت کرتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٧۔ ٢٨] ''اور اگر آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ آتش پر کھڑے کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: کاش! ایک بار ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور ہم اپنے رب کی آیات کو ہرگز نہ جھٹلائیں گے، اور ہم مومنوں میں سے ہوں گے۔ (نہیں!) بلکہ ان کے وہ کرتوت ظاہر ہو چکے ہوں گے جنھیں وہ پہلے چھپاتے تھے۔ اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔'' اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا ﴾ اور جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ﴾ [یونس: ٩٩] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب، سارے ہی ایمان لے آتے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ یعنی ان دونوں صنفوں سے میں ضرور اس کو بھروں گا، چنانچہ ان کا گھر نار ہے، ان کو اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ نعوذ باللّٰه وكلماته التامة من ذلك.

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ دھمکی اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے اہلِ نار سے کہا جائے گا کہ اس عذاب کو چکھو اس سبب سے کہ تم اس کو جھٹلاتے تھے اور اس کے وقوع کو بعید سمجھتے تھے اور اس کو بھلاتے تھے، کیوں کہ تم نے اس سے اس شخص کا سا معاملہ کیا جو اس کو بھولنے والا ہو۔ ﴿ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ ﴾ یعنی ہم بھی تمھارے ساتھ بھولنے والے کی طرح کا معاملہ کریں گے، کیوں کہ اللہ پاک تو نہ کسی شے کو بھولتا ہے نہ کوئی شے اس سے غائب ہوتی ہے، بلکہ یہ مقابلے کے باب سے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقِيْلَ الْيَوْمَ

تَنۡسٰكُمۡ كَمَا نَسِيۡتُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا ﴾ [الجاثیة: ٣٤] ''اور (ان سے) کہا جائے گا: آج ہم تمھیں بھول جائیں گے، جیسے تم اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡخُلۡدِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ یعنی تم ہمیشگی کا عذاب چکھو اپنی تکذیب اور کفر کے سبب سے جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ لَا يَذُوۡقُوۡنَ فِيۡهَا بَرۡدًا وَّلَا شَرَابًا ۞ اِلَّا حَمِيۡمًا وَّغَسَّاقًا ۞ جَزَآءً وِّفَاقًا ۞ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا لَا يَرۡجُوۡنَ حِسَابًا ۞ وَّكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۞ وَكُلَّ شَىۡءٍ اَحۡصَيۡنٰهُ كِتٰبًا ۞ فَذُوۡقُوۡا فَلَنۡ نَّزِيۡدَكُمۡ اِلَّا عَذَابًا ﴾ [النبأ: ٢٤۔ ٣٠] ''وہ اس میں کسی ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے نہ کسی مشروب کا۔ (ہاں) مگر کھولتا پانی اور بہتی پیپ۔ (یہ ہے) بدلہ پورا۔ انھیں تو حساب کی اُمید ہی نہ تھی۔ انھوں نے ہماری آیات کو بے دریغ جھٹلایا۔ اور ہم نے ہر چیز کو ایک کتاب میں گن رکھا ہے۔ لہٰذا اب تم (اپنے کیے کا مزہ) چکھو، ہم تمھارا عذاب بڑھاتے ہی رہیں گے۔''[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان کے یہ ہے کہ کلمۂ ''لَوْ'' امتناعیہ ہے، یعنی شرطیہ حرفِ امتناع ہے زمانہ ماضی میں امتناع کے لیے، اس بنا پر اس کا جواب محذوف ہوگا۔ یعنی ''لَرَأَيْتَ أَمْرًا فَظِيعًا وَهَوْلًا هَائِلًا لَا يُقْدَرُ قَدْرُهُ'' اور حرفِ ''إِذْ'' ماضی کے لیے ہے، یہاں یہ دونوں اس لیے آئے ہیں کہ جو شے اللہ پاک کے علم میں ثابت ہے، وہ بہ منزلہ واقع ہے، اگرچہ یہ معاملہ مستقبل میں واقع ہوگا، مگر تحقیقِ وقوع کے اظہار کے لیے یہ دونوں کلمے ماضی کے لائے گئے ہیں، جس طرح کہ ﴿ اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ ﴾ [النحل: ١] ''اللہ کا حکم آ پہنچا'' فرمایا ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس کو ان مواضع سے ٹھہرایا ہے، جن میں ''إِذْ'' موقع ''إِذَا'' میں واقع ہوا ہے،[2] حالاں کہ اس کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ﴿ تَرٰۤى ﴾ کا مفعول ہے یا نہیں؟ تو اس کا مفعول مقدر کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ اگر تجھ سے رؤیت ہو اس وقت میں، یا جس پر ''إِذْ'' کا کلمہ مضاف الیہ دال ہے، اس کو مقدر نکال لیں گے، یعنی اگر تو مجرموں کو دیکھے یا ان کے آگ پر وقوف کو۔

یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ لَوْ ﴾ کا کلمہ تمنی کے واسطے ہو۔ اس صورت پر تقدیر جواب کی حاجت نہ ہوگی۔ ﴿ تَرٰۤى ﴾ کا خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو خطاب آپ کی اُمت کو خطاب ہے۔[3] معنی یہ ہیں کہ اے محمد! اگر تو منکرینِ بعث کو دیکھے تو البتہ ایک امرِ عجیب اور ایک سخت ہولناک شے کو دیکھے گا کہ جس کی شدت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ یا یہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جو رویت کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ کوئی ہو، کیوں کہ اس کا مقصد اس بات کو بیان کرنا ہے کہ ان کی بدحالی پوری ہے اور وہاں تک پہنچی ہے کہ اس کا استغراب (عجیب وغریب)

[1] تفسیر ابن كثير (٣/ ٦٠٠) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٤٨) [3] معاني القرآن (٤/ ٢٠٦)

اور استعظام (عظیم سمجھنا) کسی خاص دیکھنے والے کے لیے نہیں ہے، جو عجیب وغریب امور اور سخت مصیبتوں کو دیکھنے کے عادی ہیں، بلکہ ان کی ہولناکی اور سختی کی یہ نوبت ہو چکی ہے کہ ہر کوئی جس کو دیکھنے کی صلاحیت ہے، وہ ان سے تعجب کرے۔ ﴿ اَلْمُجْرِمُوْنَ ﴾ سے مراد ﴿ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ﴾ کے کہنے والے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد ہر مجرم اور گناہ گار ہو اور یہ کہنے والے بدرجۂ اولیٰ اس میں داخل ہوں گے۔ ناکسین رؤوس سے مراد مطاطین و خافضینِ رؤوس ہیں، یعنی اپنے سروں کو جھکانے والے اور مارے حیا اور ندامت کے جو اس شرک اور عصیان پر، جو دنیا میں ان سے صادر ہو چکا ہے، اپنے سروں کو پست کرنے والے۔ ﴿ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان سے اللہ پاک کے حساب لینے کے وقت۔

﴿ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا ﴾ سے پہلے ﴿ يَقُوْلُوْنَ ﴾ مقدر ہے، اسی وجہ سے ﴿ رَبِّهِمْ ﴾ پر وقف کیا جاتا ہے، یعنی کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم ان لوگوں میں سے ہو گئے ہیں جو دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں اور ہمیں ان آیتوں کے سمجھنے کی استعداد اور قابلیت حاصل ہو گئی ہے جو دیکھی اور سنی جاتی ہیں اور اس سے پہلے ہم اندھے اور بہرے تھے، کسی شے کو سمجھتے نہیں تھے، اب تو ہم کو دنیا کی طرف پھر بھیج دے، تاکہ ہم عملِ صالح کریں۔ ان آیتوں کے مقتضا کے مطابق ﴿ اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴾ ہم یقین کرنے والے ہیں، یہ ان کی طرف سے دلوں کے صحیح ہونے کا اور آیات کے معانی سمجھنے اور ان پر عمل کرنے پر قادر ہونے کا دعویٰ ہے، جس طرح کہ اس سے پہلے دیکھنے اور سننے کی صحیح صلاحیت رکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ گویا یوں کہا کہ ہم نے یقین کر لیا اور اس سے پہلے ہم اصلاً کچھ نہ سمجھتے تھے۔

رہی یہ بات کہ پہلے تو جملہ فعلیہ کہا تھا، اب یہاں طرزِ کلام بدل کر جملہ اسمیہ موکد "بِأَنَّ" کہا؟ تو اس سے غرض اپنے پکے یقین کا اور اس میں مکمل رغبت اور دلچسپی کا ظاہر کرنا ہے اور یہ سب اپنی درخواست میں پوری کوشش کرنے کے لیے ہے، تاکہ جو واپس لوٹنے کی درخواست کی ہے، وہ کسی طرح سے قبول ہو جائے۔ یا ﴿ مُوْقِنُوْنَ ﴾ بہ معنی "مُصَدِّقُوْن" ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم اُس شے کی تصدیق کرنے والے ہیں جس کو محمد ﷺ لائے۔ غرضیکہ اس معنی کی بنا پر ﴿ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا ﴾ کے مفعول مقدر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں فعلوں کے مناسب مفعول مقدر کیے جائیں، کیوں کہ اس وقت وہ لوگ کفر اور معاصی کو بڑی ہولناک صورتوں پر دیکھیں گے اور فرشتے ان کو بتائیں گے کہ ان کا پھر جانا ضرور ہی دوزخ کی طرف ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اپنے اعمال کی قباحت دیکھ لی، حالاں کہ ہم ان کو دنیا میں حسین دیکھتے تھے، اور سن لیا ہم نے اس بات کو کہ ہمارا پھرنا آگ کی طرف ہے۔ یہ معنی اس عملِ صالح کے وعدہ کے لحاظ سے مناسب ہیں، جو اس کے بعد ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ جس شے کی ہم تکذیب کرتے تھے اس کو اب دیکھ لیا ہے اور جس چیز کا ہم انکار کرتے تھے اس کو سن لیا ہے۔ کسی نے کہا ہے

کہ ہم نے تیری وعید کی صداقت کو دیکھ لیا اور تیرے رسولوں کی تصدیق سن لی۔

چنانچہ ان لوگوں نے اس وقت دیکھا کہ اس دیکھنے نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا اور اس وقت سنا کہ سننے نے کچھ فائدہ نہ دیا۔ اللہ پاک سے تصدیقِ رسل سننے کے یہ معنی ہیں کہ رسولوں نے جس وعدے اور وعید کی خبر دی تھی اللہ پاک نے اس کے مدلول کو اس وقت ظاہر کر دیا۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ پاک نے اس وقت یہ خبر دی کہ رسول سچے ہیں یہاں تک کہ کفار اس کو سنیں۔ کسی نے کہا یہ معنی ہیں کہ ہم نے رسولوں کا قول سنا، یعنی ہم نے اس کو کان لگا کر اور اطاعت کی نیت سے سنا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو شکوک دنیا میں ان کو خلط ملط ہوتے تھے، وہ ان سے زائل ہو گئے، جبکہ انھوں نے دیکھا جو کچھ کہ دیکھا اور سنا جو کچھ کہ سنا۔

﴿ صٰلِحًا ﴾ یا تو مفعول ہے ﴿ نَعْمَلْ ﴾ کا، یا مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی "نَعْمَلُ عَمَلًا صَالِحًا"۔ غرضیکہ پھر جب انھوں نے واپس جانے کی درخواست کی تو اللہ پاک نے ان پر اس طرح سے رد فرمایا: ﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا ﴾ یعنی اگر ہم چاہتے تو البتہ ہر نفس کو اس کا رُشد اور دنیا میں ایمان کی توفیق دیتے، یعنی وہ لطف و کرم جو ہمارے پاس ہے وہ دیتے کہ اگر ان سے ان کا اختیار (آزمایش) ہوتا تو وہ سب راہ یاب ہوتے، پھر ان میں سے کوئی کافر نہ ہوتا، لیکن وہ لطف ہم نے ان کو عطا نہیں کیا، اس لیے کہ ہم ان سے کفر کے لیے اختیار اور ایثار جان چکے تھے۔ یہ معتزلہ پر حجت ہے، اس لیے کہ ان کے نزدیک اللہ نے یہ چاہا کہ ہر نفس کو وہ شے عطا کرے، جس سے وہ راہ یاب ہو جائے اور یہ شے اس نے اس کو عطا کی اور وہ راہ یاب نہ ہوا۔ اور اس آیت کی مشیئتِ جبر کے ساتھ تاویل کی، حالاں کہ یہ تاویل غلط ہے، اس دلیل کی وجہ سے جو تبصرۃ الأدلۃ میں پہچانی گئی ہے۔[1] (كذا قال النسفي)

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: اس کے معنی میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ اس سے دنیا میں ہدایت کا دینا مراد ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد آخرت میں ہے، یعنی اگر ہم چاہتے تو ان کو دنیا کی طرف پھیر لاتے۔ ﴿ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ ﴾

﴿ وَلَوْ شِئْنَا ﴾ کے شروع میں قول مقدر ہے اور اس قول پر معطوف ہے جو ﴿ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا ﴾ سے پہلے مقدر ہے، یعنی وہ کہتے: اے ہمارے رب! ہم نے اب دیکھ لیا اور سن لیا...الخ۔ اور ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت عطا کرتے، لیکن میری قضا اور قدر نافذ و واجب ہوئی اور میرا کلمہ سابق ہوا اور میری وعید ثابت ہوئی کہ البتہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ یہ وہی قول ہے جو اللہ پاک کی طرف سے واجب ہو چکا ہے اور اس کے بندوں پر ثابت ہو گیا ہے اور اس میں اس کی قضا نافذ ہو چکی ہے۔ پس اس قول کا یہ مقتضا ہوا کہ وہ ہر نفس کو اس کی ہدایت عطا نہ کرے اور یہ حکم جو ان پر جاری کر چکا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک اس بات کو جان چکا تھا کہ وہ بد بخت لوگوں میں سے ہیں اور وہ ان میں سے ہیں جو ہدایت کو گمراہی پر اختیار کرتے ہیں۔ جن کو انسان

[1] تفسیر النسفی (۳/ ۲۹۱)

سے پہلے اس لیے رکھا کہ یہ مقام تحقیر کا مقام ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جنوں میں سے اکثر جہنمی ہیں، اس قول کی بنا پر جو اس بارے میں کہا گیا ہے۔

کلمۂ ﴿ اَجْمَعِيْنَ ﴾ سے یہ لازمی نہیں کہ سارے انسان اور جن جہنم میں داخل ہوں، کیوں کہ یہ کلمۂ ﴿ اَجْمَعِيْنَ ﴾ عام قسم کے معنی میں ہے نہ کہ عام افراد کے لیے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ اس کو میں ان دونوں قسموں کو ملا کر بھر دوں گا۔ یہ بات بعض محققین نے کہی ہے۔ اس قول کو کسی نے یوں رد کیا ہے کہ اگر مقصود دونوں قسمیں بالعموم ہوتیں تو تثنیہ مناسب تھا نہ کہ جمع اس طرح کہ "كِلَيْهِمَا" کہتے، چنانچہ جب یوں نہ کہا تو ظاہر یہ ہے کہ ﴿ اَجْمَعِيْنَ ﴾ عمومِ افراد کے لیے ہے۔ پھر جب عمومِ افراد کے لیے ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ سب داخل ہوں گے، حالاں کہ بات یوں نہیں ہے، چنانچہ کہیں گے کہ الف و لام جن و انس میں عہد خارجی کے لیے ہے، مراد جنوں اور انسانوں کے عاصی اور گناہ گار ہیں۔ اس کی تائید وہ بات کرتی ہے جو دوسری آیت میں ابلیس کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی ہے: ﴿ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ص: ٨٥] "میں تجھ سے اور ان سب سے جنھوں نے تیری پیروی کی، جہنم کو ضرور بھر دوں گا۔"[1] (كذا قال الشهاب)

جنوں اور انسانوں کو جو خاص کر کے ذکر فرمایا ہے تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنے فرشتوں کو اس عمل سے معصوم اور محفوظ رکھا ہے، جس کی وجہ سے جہنم کے حق دار ہوں۔ ﴿ فَذُوْقُوْا ﴾ میں حرفِ فاء ماقبل پر امر بالذوق کی ترتیب کے لیے ہے، یعنی پھر جس وقت وہ نار میں داخل ہو جائیں گے تو جہنم کے خازن اور داروغے ان سے کہیں گے کہ لو اب عذاب کا مزہ چکھو، جس طرح کہ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] "ذوق" اصل میں کھانے کی چیز کے چکھنے کو کہتے ہیں، لیکن کلامِ عرب میں "ذوق" کا استعارہ مجازاً احساس کے لیے ہوا کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو شے نفس پر طاری و پیش ہوتی ہے، اس کی تعبیر "ذوق" سے کی جاتی ہے، گو وہ شے کھانے کی نہ ہو، اس لیے کہ نفس اس شے کا احساس کرتا ہے، جس طرح کہ ذائقہ کھانے کی چیز چکھنے سے احساس کرتا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ذُقْتُ مَا عِنْدَهُ أَيْ: خَبَرْتُهُ"، یعنی میں نے جانچ لیا اور اس شے کا تجربہ کر لیا جو فلاں کے پاس ہے۔ "وَذُقْتُ الْقَوْسَ" اس وقت کہے گا جب کمان کی تانت کو کھینچے، تاکہ دیکھے کہ اس کی سختی کیا ہے۔ "وَأَذَاقَهُ اللّٰهُ وَبَالَ أَمْرِهِ" یعنی اللہ نے فلاں کو اس کے کام کا وبال معلوم کرا دیا۔ مجرب اور معلوم کام کو امرِ مستذاق بولتے ہیں۔[3]

﴿ بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ ﴾ میں حرفِ باء سببیت کے واسطے ہے، یعنی اب چکھو تم عذاب اپنے اس دن کے ملنے کو بھول جانے کی وجہ سے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ ان کا عذاب صرف اس لحاظ سے نہیں ہے کہ اس بارے میں

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٥٠) [2] تفسير البغوي (٦/ ٣٠٣) [3] الصحاح للجوهري (٥/ ١٦٥_ ١٦٦)

قول سابق ہو چکا ہے، بلکہ اُس لحاظ سے اور اِس کی وجہ سے بھی ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کو عذاب کرنے کا ایک ہی سبب نہیں ہے، بلکہ اس کے اور اسباب بھی ہیں۔ یہ نسیان جو یہاں مذکور ہے، اس میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد حقیقی نسیان ہے، وہ یہ کہ جب وہ آجاتا ہے تو یاد جاتی رہتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد ترک ہے، یہ قول امام ضحاک اور یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

پہلے قول کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس دن کے لیے عمل نہ کیا تو وہ ایسے ہو گئے جیسے اس کے بھولنے والے۔ دوسرے قول کی بنا پر ضروری ہے کہ ﴿ لِقَآءَ ﴾ سے قبل مضاف مقدر کیا جائے۔ ''أَيْ: فَذُوْقُوْا بِسَبَبِ تَرْكِكُمْ لِمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ عَذَابَ لِقَاءِ يَوْمِكُمْ هٰذَا'' یعنی اب تم بہ سبب تمھارے اس شے کو ترک کرنے کے، جس کا میں نے تم کو حکم دیا، اپنے اس دن کے ملنے کے عذاب کو چکھو۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ ﴿ هٰذَآ ﴾ کے اشارے میں تین احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ لِقَآءَ ﴾ کی طرف اشارہ ہو۔ دوسرا یہ ہے کہ اشارہ ہو ''یوم'' کی طرف۔ تیسرا یہ ہے کہ اشارہ ہو عذاب کی طرف۔[2]

﴿ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ ﴾ یعنی ہم نے تم کو بالکل غیر ملتفت الیہ کر کے چھوڑ دیا، جس طرح کہ بھولنے والا کیا کرتا ہے، تاکہ تمھاری امید منقطع ہو جائے۔ یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تمھارے اس دن میں بعث پر ایمان کو ترک کرنے کی وجہ سے ہم نے تم کو خیر سے ترک کیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ترک کیا ہم نے تم کو عذاب میں۔[3]

﴿ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی اپنے کفر، معاصی اور تکذیب کے سبب سے جن کو تم دنیا میں کیا کرتے تھے تم دائمی عذاب کو چکھو، جس کو کسی طرح کا انقطاع نہیں ہے۔ اس کو دوبارہ ذکر کرنے کی تین وجوہ ہیں، ایک تو تاکید و تشدید ہے، دوسرے ذوق کے مفعول مطوی کا بیان کرنا۔ تیسرے اس بات کی خبر دینا کہ ذوق کا سبب صرف نسیان ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے اور اسباب بھی ہیں اور وہ کفر و معاصی کی بہت سی قسمیں ہیں، جن پر وہ دنیا میں استمرار پذیر تھے، یعنی جمے ہوئے تھے۔ پھر اللہ پاک نے جملہ مستانفہ سے یہ بات بیان کی کہ ایمان کی طرف ہدایت کرنے کا مستحق کون ہے اور کون اس کا مستحق نہیں ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:[4]

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ﴿۱۵﴾ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٩٧) [2] تفسير الرازي (٢٥/ ١٥٧) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ٩٧) [4] فتح البيان (١١/ ٢٠ ـ ٢٤)

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾

ہماری آیتوں پر تو صرف وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب انھیں ان کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے ⑮ ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور اُمید سے پکارتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے، اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں ⑯ کوئی شخص نہیں جانتا کہ (ان کے اعمال کے بدلے میں) ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کی کون کون سی چیزیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں ⑰

ایمان والوں کی حالت اور ان کی جزاء کا بیان:

اللہ سے لالچ رکھنا برا نہیں اور نہ ہی اس سے ڈرنا برا ہے۔ اسی کے لیے بندگی کرے تو قبول ہے، ڈر اور لالچ دنیا کا ہو یا آخرت کا، اگر کسی اور خوف اور لالچ سے بندگی کرے تو یہ ریاکاری ہے، قبول نہیں۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک کی آیتوں کی تصدیق وہی لوگ کرتے ہیں کہ جس وقت ان کو وعظ و نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں، یعنی ان کو کان لگا کر سنتے ہیں اور قول و فعل سے ان کی اطاعت کرتے ہیں اور ان کے اتباع سے اور ان کے لیے مطیع اور فرمانبردار ہونے سے تکبر نہیں کرتے، جس طرح کہ کافروں اور فاجروں میں سے جاہل لوگ تکبر کیا کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ﴾ اس سے مراد قیامِ لیل ہے، یعنی تہجد کی نماز پڑھنا اور نیند کا چھوڑنا اور نرم بچھونوں پر لیٹنے کو ترک کرنا۔ امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد قیامِ لیل ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ، امام عکرمہ، محمد بن منکدر، ابو حازم اور قتادہ رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ یہ مغرب اور عشاء کے درمیان نماز ہے، یعنی صلاۃِ اوابین۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ نمازِ عشاء کا انتظار ہے۔ (رواہ ابن جریر باسناد جید) امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نمازِ عشاء ہے، جماعت میں اور صبح کی نماز ہے جماعت میں۔[1]

① تفسیر الطبري (٢٠/ ١٧٨۔ ١٨٠) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٠١)

﴿ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اپنے رب کو اس کے وبالِ عذاب کے خوف سے اور اس کے جزیلِ ثواب میں طمع کے لیے پکارتے ہیں۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ پس لازمی و متعدی قربات کے فعل کرتے ہیں، یعنی لازمی اور متعدی عبادتیں ادا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے مقدم اور سردار و فخر دنیا و آخرت میں سید المرسلین، خاتم النبیین، شفیع المذنبین، رحمت للعالمین جناب رسول اللہ ﷺ ہیں، جیسا کہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی مدح شریف میں عرض کیا ہے: ؎

فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ يَتْلُوْ كِتَابَهُ　　إِذَا انْشَقَّ مَعْرُوْفٌ مِنَ الْفَجْرِ سَاطِعُ

يَبِيْتُ يُجَافِيْ جَنْبَهُ عَنْ فِرَاشِهِ　　إِذَا اسْتَثْقَلَتْ بِالْمُشْرِكِيْنَ الْمَضَاجِعُ[1]

یعنی ہم میں اللہ کے رسول ہیں جو اس کی کتاب کو پڑھتے ہیں، جس وقت فجر سے روشنی پھٹتی ہے اور ظاہر و بلند ہوتی ہے، غرض یہ ہے کہ فجر کے طلوع ہونے کے وقت قرآن شریف پڑھتے ہیں۔ رات اس حال میں بسر کرتے ہیں کہ اپنی کروٹ کو بچھونے سے الگ کرتے ہیں، جس وقت بچھونے مشرکوں کو لے کر بھاری ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آخر رات کو گہری نیند کا وقت ہوتا ہے اور مشرک لوگ خوابِ گراں میں ہوتے ہیں، اس وقت اٹھنا نفس پر سخت گراں گزرتا ہے، ایسے وقت میں آپ ﷺ اپنے بچھونے سے کروٹ علاحدہ کر کے میٹھی نیند کو چھوڑ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہوتے ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «عَجِبَ رَبُّنَا مِنْ رَّجُلَيْنِ: رَجُلٌ ثَارَ مِنْ وِطَائِهِ وَلِحَافِهِ مِنْ بَيْنِ حِبِّهِ وَأَهْلِهِ إِلَى صَلَاتِهِ رَغْبَةً فِيْمَا عِنْدِيْ وَشَفْقَةً مِّمَّا عِنْدِيْ...» یعنی ہمارے رب نے دو آدمیوں پر تعجب کیا: ایک وہ شخص کہ جو اپنے نرم بچھونے اور لحاف میں اپنے محبوب اور بیوی کے درمیان سے اٹھا اور نماز کی طرف گیا، اس ثواب کی رغبت کے لیے جو میرے پاس ہے اور اس عذاب سے ڈرتے ہوئے جو میرے نزدیک ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کی، پھر لوگ جنگ سے بھاگے تو اس نے وہ بات جان لی جو اس پر بھاگنے کی وجہ سے ہے اور وہ بات جو اس کے لیے ہے جنگ کی طرف رجوع کرنے میں، چنانچہ وہ لوٹا، یہاں تک کہ اس کا خون بہایا گیا، اس شے کی رغبت کے لیے جو میرے پاس ہے اور اس شے سے خوف کے لیے جو میرے پاس ہے۔ پس اللہ عزوجل فرشتوں سے فرماتا ہے کہ میرے بندے کی طرف دیکھو، وہ اس شے میں رغبت کے لیے لوٹ آیا، جو میرے پاس ہے اور اس شے سے خوف کے لیے جو میرے پاس ہے یہاں تک کہ اس کا خون بہایا گیا۔[2] (وهكذا رواه أبو داود في الجهاد عن موسى بن إسماعيل عن حماد بن سلمة به بنحوه)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٠٤)

[2] مسند أحمد (١/ ٤١٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٣٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ٢/ ٢٥٦)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں ایک سفر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا۔ ایک دن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گیا اور ہم چل رہے تھے تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے ایسے عمل کے متعلق بتائیں جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور جہنم سے دور کر دے۔ فرمایا: البتہ واقعی تو نے ایک بڑی بات کا سوال کیا ہے اور وہ بے شک اس شخص کے لیے آسان ہے جس پر اللہ آسان کر دے۔ وہ عمل یہ ہے کہ تو عبادت کرے اللہ کی اور شریک نہ کرے اس کے ساتھ کسی شے کو اور قائم کرے تو نماز اور دے تو زکات اور روزے رکھے تو رمضان کے اور حج کرے تو بیت اللہ کا۔ پھر فرمایا: کیا میں تیری راہنمائی نہ کروں ابوابِ خیر کی طرف؟ روزہ ڈھال ہے اور صدقہ گناہ کو بجھاتا ہے اور مرد کی نماز رات کے جوف میں (جوف سے مراد رات کا وسط معلوم ہوتا ہے۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ بندے کو جوفِ لیل آخر میں زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات کے دو ٹکڑے ہیں اور ہر ٹکڑے کا ایک جوف ہے تو جوف بہ معنی وسط ہوا۔ واللہ أعلم۔ پس گویا رات کے چھے ٹکڑے ہوئے اور زیادہ تر قبولیت کا وقت رات کا ثلث آخر ہوا، یعنی رات کے چھے حصوں میں سے پانچواں حصہ)۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ﴾ یہاں تک کہ پہنچے ﴿ يَعْمَلُوْنَ ﴾ تک۔

پھر فرمایا: کیا خبر نہ دوں میں تجھ کو اِس امر کی اور اس کے ستون اور کوہان کی بلندی کی؟ یعنی ایسی شے کی کہ جس سے ان سب کا قیام ہے۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! البتہ ہم کیا اس شے کی وجہ سے مواخذہ کیے جائیں گے، جس کے ساتھ ہم بات چیت کرتے ہیں؟ تو فرمایا: تجھ کو تیری ماں روئے اے معاذ! « وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِيْ النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ أَوْ قَالَ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ » یعنی لوگوں کو آگ میں ان کے منہ کے بل یا ان کے نتھنوں کے بل اوندھا نہ ڈالیں گی، مگر ان کی زبانوں کی کاٹی ہوئی باتیں۔[1] (و رواہ الترمذي و النسائي و ابن ماجه في سننهم من طرق عن معمر به وقال الترمذي: حسن صحيح)

غرض یہ ہے کہ جو آدمی بے احتیاط ہو کر رات دن چر چر کچھ کچھ بے فائدہ باتیں کیا کرتا ہے، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشبیہ کاٹی ہوئی گھاس سے دی، جو درانتی سے کاٹتے ہیں، ذرا سی دیر میں کاٹ کر ایک ڈھیر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ واہیات باتیں جو زبانِ ہنسیا (ہنسانے والا) رات دن کاٹا کرتا ہے اور انبار کے انبار کاٹ کر ڈال دیے ہیں، یہی جہنم میں داخلے کا باعث ہوں گے۔ نعوذ باللہ۔ سارے اعمالِ صالحہ کا ملاک زبان کو اسی لیے ٹھہرایا ہے کہ اگر زبان محفوظ رہے گی تو جو اعمال کیے ہیں وہ بھی محفوظ رہیں گے، ورنہ خیر سلاًّ۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ حقیقت میں اعمالِ صالحہ ہوں اور جب کہ اعمالِ صالحہ کا تو اَتا پتا نہیں اور زبان کی چر چر اور کچھ کچھ ڈھیر کے ڈھیر ہیں تو اب کہو

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٣١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦١٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٧٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٣٦)

کیا گت بنے گی۔ نعوذ باللہ من جمیع ما کرھہ اللہ، اللھم غفرا و توفیقا.

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: «أَلَا أَدُلُّكَ عَلٰى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُكَفِّرُ الْخَطِيئَةَ، وَقِيَامُ الْعَبْدِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ، وَتَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ »[1]

(و رواه أيضا من حديث الثوري عن منصور بن المعتمر عن الحكم عن ميمون بن أبي شبيب عن معاذ عن النبي ﷺ بنحوه و من حديث الأعمش عن حبيب بن أبي ثابت و الحكم عن ميمون بن أبي شبيب عن معاذ مرفوعاً بنحوه و من حديث حماد بن سلمة عن عاصم بن أبي النجود عن شهر عن معاذ أيضا عن النبي ﷺ في قوله تعالىٰ: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ﴾ قال: قيام العبد من الليل) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوۂ تبوک میں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو میں تجھے ابوابِ خیر کی خبر دوں۔ روزہ ڈھال ہے اور صدقہ خطیئہ کو بجھاتا ہے اور رات کے جوف میں مرد کا قیام۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾[2]

پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت قیامت کے دن اللہ اولین اور آخرین کو جمع کرے گا تو ایک منادی آئے گا، پھر وہ ایسی آواز سے ندا کرے گا کہ خلائق کو سنا دے گا کہ تمام جمع ہونے والے جان لیں گے کہ آج کے دن کون اللہ کے کرم کا زیادہ مستحق ہے۔ پھر رجوع کرے گا تو آواز کرے گا کہ وہ لوگ کھڑے ہوں، جن کی کروٹیں بچھونوں سے الگ ہوتی تھیں۔ (الآیۃ) تو وہ کھڑے ہو جائیں گے اور وہ قلیل ہیں۔[3] امام بزار رحمہ اللہ نے عن زید بن اسلم عن ابیہ روایت کیا ہے، کہا: سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ تو ہم مجلس میں بیٹھتے تھے اور اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کچھ لوگ نماز پڑھتے تھے، مغرب کے بعد عشاء تک تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾[4] (ثم قال: لا نعلم روى زيد بن أسلم عن بلال سواه و ليس له طريق عن بلال غير هذه الطريق)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں:

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٨١_ ١٨٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٦_ ٣١٠٧)

[3] شعب الإيمان (٣/ ١٦٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٠٢) اس کی سند میں ''عبدالرحمن بن اسحاق'' ضعیف راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٠١٤)

[4] مسند البزار (٤/ ٢٠٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه البزار عن شيخه عبدالله بن شبيب وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ٢٠٥)

کوئی نہیں جانتا ہے عظمت اس شے کی جو اللہ پاک نے ان کے لیے جنتوں میں مخفی رکھی ہے نعیم مقیم سے اور ان لذتوں سے جن کے بارے میں کسی کو اطلاع نہیں، جبکہ انھوں نے اپنے اعمال کو پوشیدہ کیا تو اسی طرح اللہ نے ان کے ثواب کو پوشیدہ رکھا، یعنی پورا بدلہ، کیوں کہ جزا عمل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایک قوم نے عمل کو چھپایا تو اللہ پاک نے ان کے لیے اس شے کو چھپایا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی اور نہ ہی کسی بشر کے دل میں اس کا خیال ہی گزرا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم).

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ شے تیار کر رکھی ہے، جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی بشر کے دل پر گزری۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پڑھو اگر تم چاہو: ”﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾[2] قال وحدثنا سفيان حدثنا أبو الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال الله مثله، قيل لسفيان رواية، قال: ”فأي شيء“ (و رواه مسلم و الترمذي من حديث سفيان بن عيينة به وقال الترمذي: حسن صحيح).

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے: «يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالىٰ: أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلىٰ قَلْبِ بَشَرٍ ذُخْراً مِنْ بَلْهَ ("بله" بہ فتحِ باء و فتحِ ہاء بہ معنی "دع" ہے، یا بہ معنی "سوی"، نسخوں کا اتفاق "من بله" کی روایت پر ہے اور درست یہ ہے کہ اسقاط ہے کلمۂ ﴿مِنْ﴾ کا، یعنی چھوڑا اس شے کو جس پر تم کو اطلاع دی گئی ہے نعیم جنت سے اور وہ لذتیں جن کو تم پہچان چکے ہو، کیوں کہ وہ تو بہت ہی کم ہیں اس کے مقابلے میں جو اُن کے لیے مخفی رکھا گیا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ سوائے اس کے جس کا ذکر قرآن شریف میں کیا گیا ہے۔ کلمۂ "ذُخْرًا" متعلق ہے "أَعْدَدْتُ" سے) مَا اطُّلِعْتُمْ عَلَيْهِ ثُمَّ قَرَأَ: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾[3] قَالَ أَبُوْ مُعَاوِيَةَ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ أَبِيْ صَالِحٍ قَرَأَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ قُرَّاتِ أَعْيُنٍ» اِنْفَرَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ“

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے: «إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ قَالَ: أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلىٰ قَلْبِ بَشَرٍ»[4] (أخرجاه في الصحيحين

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٧٢، ٤٥٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٩٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٠٢)

[4] مسند أحمد (٢/ ٣١٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٢) تفسير الطبري (٢٠/ ١٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣٠٧) البتہ صحیحین میں ”عبدالرزاق“ سے روایت نہیں ملی ہے۔

من رواية عبد الرزاق قال: ورواه الترمذي في التفسير وابن جرير من حديث عبدالرحيم بن سليمان عن محمد بن عمر وعن أبي سلمة عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ من رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بمثله) ثُمَّ قَالَ التِّرْمِذِيُّ: هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ. قَالَ حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَبِي رَافِعٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ حَمَّادٌ: أَحْسِبُهُ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: «مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ يَنْعَمُ لَا يَبْأَسُ، لَا تَبْلَى ثِيَابُهُ وَلَا يَفْنَى شَبَابُهُ فِي الْجَنَّةِ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ»[1] (رواه مسلم من حديث حماد بن سلمة به) یعنی جو شخص جنت میں داخل ہوگا تو وہ آسودہ رہے گا، محتاج نہ ہوگا، نہ اس کے کپڑے پرانے پڑیں گے اور نہ اس کی جوانی فنا ہوگی، اس کے لیے جنت میں وہ شے ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی، نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال گزرا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو حازم سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ کہتے تھے: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا اس مجلس میں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کا وصف فرمایا، یہاں تک کہ انتہا کو پہنچے، پھر اپنی حدیث کے آخر میں فرمایا: «فِيهَا مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ» پھر یہ آیت پڑھی: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾[2] (وأخرجه مسلم في صحيحه عن هارون بن معروف وهارون بن سعيد كلاهما عن ابن وهب به) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب عزوجل سے راوی ہیں، فرمایا: «أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ»[3] لم يخرجوه.

نیز امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں شعبی سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو منبر پر سنا وہ مرفوعاً کہہ رہے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب عزوجل سے سوال کیا کہ ایک ادنیٰ جنتی کا رتبہ کیا ہے؟ فرمایا: وہ ایک شخص ہے کہ آئے گا جب سب جنت والے جنت میں داخل ہو چکیں گے تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جا۔ چنانچہ وہ عرض کرے گا: «يَا رَبِّ! كَيْفَ وَقَدْ أَخَذَ النَّاسُ مَنَازِلَهُمْ وَأَخَذُوا أَخَذَاتِهِمْ» (بفتح ہمزہ وخائے معجمہ "وهو ما أخذوا من كرامة مولاهم وحصلوه"[4] (كذا في مجمع البحار)۔) یعنی اے میرے رب میں کیوں کر داخل ہوؤں حالانکہ لوگ تو اپنے منازل لے چکے اور اپنے رب کی کرامت حاصل کر چکے؟ تو اس سے کہا جائے گا: کیا تو اس سے راضی ہوتا ہے کہ تیرے لیے دنیا کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کی مثل ہو؟ تو وہ عرض کرے گا: میں راضی ہوا اے رب!۔

پھر اللہ فرمائے گا: تیرے لیے یہ ہے اور مثل اس کے اور مثل اس کے اور مثل اس کے تو وہ

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۳۶) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۲۵) مسند أحمد (۵/ ۳۳٤)
[3] تفسیر الطبري (۲۰/ ۱۸٦) [4] مجمع بحار الأنوار (۱/ ۲۸۔ ۲۹)

پانچویں بار میں کہے گا: میں راضی ہوا اے رب! پھر فرمائے گا: یہ تیرے واسطے ہے اور اس کا دس گنا مزید تیرے لیے ہے اور تیرے لیے وہ شے ہے جس کو تیرا جی چاہے اور تیری آنکھ مزہ لے تو وہ کہے گا: راضی ہوا میں اے رب!۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: پھر اُن میں سے منزلت کے لحاظ سے جو سب سے اعلیٰ ہے، وہ کیسا ہے؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کی کرامت میں نے اپنے ہاتھ سے لگائی۔ (أولئك الذين غرست كرامتهم بيدي۔ "غرس" درخت کے زمین میں نصب کرنے کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ان کے اجر وثواب کے درخت اللہ پاک نے اپنے دستِ مقدس سے نصب کیے، ان کی تعظیم اور تکریم کے لیے)۔ اور اس پر مہر کی، پس نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی، نہ کسی بشر کے دل پر گزری۔ کہا کہ اللہ عزوجل کی کتاب سے اس کا مصداق یہ ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [1] (ورواه الترمذي عن ابن أبي عَمرو قال: حسن صحيح، قال: ورواه بعضهم عن الشعبي عن المغيرة و لم يرفعه والمرفوع أصح)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عامر بن عبدالواحد سے روایت کیا ہے، کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اہلِ جنت کا مرد ستر برس اپنے مکان میں ٹھہرا رہے گا، پھر التفات کرے گا تو اچانک ایک عورت ہے جو اس سے زیادہ خوبصورت ہے جس میں وہ تھا، چنانچہ وہ عورت اس سے کہے گی: اب تیرے واسطے اس کا وقت آگیا ہے کہ ہمارا تجھ سے حصہ ہو تو وہ کہے گا: تو کون ہے؟ وہ کہے گی: میں مزید سے ہوں، پھر وہ اس کے ساتھ ستر برس ٹھہرا رہے گا۔ پھر التفات کرے گا تو اچانک ایک عورت ہے جو اس سے بھی بڑھ کر خوبصورت ہے جس میں وہ تھا تو وہ اس سے کہے گی: تیرے لیے اس کا وقت آگیا ہے کہ ہمارا تجھ سے حصہ ہو، وہ اس سے کہے گا: تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی: میں وہ ہوں جو اللہ نے کہا ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ [2]

ابن لہیعہ رحمہ اللہ نے کہا: مجھے حدیث بیان کی عطاء بن دینار نے سعید بن جبیر سے، کہا: داخل ہوں گے ان پر فرشتے دنیا کے دنوں کے حساب سے دن میں تین بار، ان کے پاس اللہ پاک کی طرف سے جناتِ عدن کے تحفے ہوں گے جو ان کی جنتوں میں نہیں ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا وہ قول ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ اور خبر دیں گے کہ اللہ ان سے راضی ہے۔[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو الیمان فزاری سے یا اس کے غیر سے روایت کیا ہے، کہا: جنت کے سو درجے ہیں: پہلا ان کا چاندی کا درجہ ہے، اس کی زمین چاندی کی ہے، اس کی رہائش گاہیں چاندی کی ہیں اور اس کی مٹی مُشک کی ہے۔ دوسرا درجہ سونے کا ہے، اس کی زمین سونے کی ہے اور اس کی رہائش گاہیں سونا ہیں اور برتن اس کے سونے کے اور مٹی اس کی مُشک کی ہے۔ تیسرا درجہ موتی کا ہے، اس کی زمین

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٩٨)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٨) [3] الدر المنثور (٦/ ٥٥٠)

موتی کی، رہایش گاہیں موتی، برتن موتی کے اور مٹی مشک کی ہے اور اس کے بعد ستانوے درجے وہ ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے، نہ کسی کان نے سنے اور نہ ہی کسی بشر کے دل میں ان کا خیال تک گزرا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ﴾۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الروح الامین روایت کیا ہے، کہا: بندے کی نیکیاں اور بدیاں لائی جائیں گی، بعض ان کا بعض سے کم کرے گا، پھر اگر ایک نیکی باقی رہ جائے گی تو اللہ اس کے لیے جنت میں فراخی کرے گا۔ راوی کہتا ہے: پھر میں یزداد پر داخل ہوا تو اس نے اس حدیث کی طرح حدیث بیان کی، کہا: پس میں نے کہا کہ پھر وہ نیکی کہاں گئی؟ تو یزداد نے کہا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ١٦] ''یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم اچھے عمل قبول کرتے ہیں، جو انھوں نے کیے، ان کی برائیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں، (تو یہ) جنتیوں میں ہوں گے۔ (یہ) سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔'' میں نے کہا: قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ﴾؟ کہا کہ بندہ اللہ کے لیے پوشیدہ عمل کرتا ہے، اس کو چھپاتا ہے، لوگوں نے اس کو نہیں جانا تو اللہ اس کے لیے قیامت کے دن آنکھ کی ٹھنڈک پوشیدہ کرے گا۔[2] (امام ابن جریر رحمہ اللہ کی پوری سند یہ ہے: "حدثني يعقوب بن إبرهيم حدثنا معتمر بن سليمان عن الحكم بن أبان عن الغطريف عن جابر بن زيد عن ابن عباس... الخ" والله أعلم۔ ان میں سے وہ راوی کون ہے، جس نے یزداد سے گفتگو کی؟!)۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ اللہ پاک کی آیتوں کی تصدیق وہی لوگ کرتے ہیں اور ان سے وہی نفع حاصل کرتے ہیں کہ جب ان کو وعظ ونصیحت کی جاتی ہے تو نصیحت پذیر ہوتے ہیں نہ کہ ان کے غیر جو وہ لوگ ہیں کہ جن کو نصیحت کی جاتی ہے تو نہ نصیحت پذیر ہوتے ہیں، نہ ان پر ایمان لاتے ہیں۔ ﴿ خَرُّوْا سُجَّدًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ سجدہ کرتے ہوئے اپنے منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔ ان کا سجدہ اللہ کی آیات کی تعظیم کی خاطر، اللہ پاک کے دباؤ، عذاب کے خوف کے مارے اور تواضع، عاجزی، فروتنی کے لیے اور اسلام کی نعمت، جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دی ہے، اس پر شکر ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

﴿ وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک کی تنزیہ و پاکی بیان کرتے ہیں۔ ہر اس شے سے

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٨٥)

[2] تفسير الطبري (٢٠/ ١٨٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٠١۔ ٦٠٤) اس کی سند میں ''غطریف ابو ہارون'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٤٣٠)

اس کی پاکی کرتے ہیں جو اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں ہے۔ اس حال میں کہ وہ ہمہ وقت اس کی نعمتوں پر حمد کرتے رہتے ہیں، ان سب سے بڑی اور کامل نعمت یہ ہے کہ انھیں آیتوں پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت نمازِ پنج گانہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔[1] معنی یہ ہیں کہ اپنے سجدے میں "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" یا "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى وَبِحَمْدِهِ" کہتے ہیں۔ سفیان رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اپنے رب کی حمد کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔[2]

﴿ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ جملہ حالیہ ہے، یعنی اس حال میں کہ اللہ پاک پر ایمان لانے اور اس کے لیے سجدہ کرنے سے تکبر نہیں کرتے، جس طرح کہ مکے والوں نے سجدے سے تکبر کیا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ اس حال میں کہ خضوع وخشوع اور فروتنی اور عاجزی کرنے والے ہیں اللہ کے لیے اور غیر مستکبر ہیں، یعنی تکبر نہیں کرتے۔ اس پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے آنے سے تکبر نہیں کرتے۔[3] کہا ہے کہ اس آیت پر سجدہ ہے اور یہ سجدہ پڑھنے اور سننے والے کے لیے عزائمِ سجودِ قرآن سے ہے۔ امام جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد اگر صرف قرآن ہو، اگرچہ اس میں آیتِ سجدہ نہ ہو تو ﴿ خَرُّوْا سُجَّدًا ﴾ مشکل ہوتا ہے، کیوں کہ صرف تلاوتِ قرآن کے لیے سجدہ مشروع نہیں ہے، مگر اسی وقت جب کہ اس میں کوئی آیتِ سجدہ ہو، معروف آیاتِ سجدہ میں سے۔ اور اگر آیات سے مراد خاص طور پر آیاتِ سجدات ہوں تو ﴿ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا ﴾ مشکل ہوتا ہے، باوجود اس کے کہ تذکیر کی تفسیر وعظ کے ساتھ کی ہے، جس طرح کہ ذکر کیا ہے۔ اشکال کی وجہ یہ ہے کہ اکثر بلکہ تمام سجدے کی آیتوں میں وعظ نہیں ہے۔

وعظ سے مراد یہی ڈرانا اور عواقب اور انجام کا یاد دلانا ہے، کیوں کہ وعظ کی حقیقت یہی ہے، بلکہ زیادہ تر سجدے کی آیتیں صریحاً سجدہ کرنے والوں کی تعریف کے لیے ہیں اور ان کے علاوہ کی مذمت کے لیے ہیں، تلویحاً اور اشارتاً، جس طرح کہ یہ آیت ہے اور کبھی اس کا الٹ ہوتا ہے، یعنی صریحاً سجدہ نہ کرنے والوں کی مذمت ہوتی ہے اور اشارتاً سجدہ کرنے والوں کی تعریف ہوتی ہے، جس طرح کہ آیتِ انشقاق ہے، پس غور کرنا چاہیے، کیوں کہ ہم نے نہیں دیکھا کہ کسی مفسر نے اس کا بیان کیا ہو یا اس کا متعرض ہوا ہو۔ انتہیٰ.

جملہ ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ﴾ مستانفہ ہے یا حالیہ ہے۔ ﴿ تَتَجَافٰى ﴾ کے معنی "تَرْتَفِعُ وَتَنْبُوْ وَتَنْتَحِي" ہیں، جبکہ کوئی شے کسی شے سے چپکی ہوئی اور لگی ہوئی نہ ہو اور اس سے دور اور علاحدہ ہو تو محاورے میں کہیں گے: "جَفَى الشَّيْءُ عَنِ الشَّيْءِ وَتَجَافٰى عَنْهُ" امام زجاج اور رمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تجافی وتجھی اوپر کی طرف سے ہوتی ہے، یعنی کسی شے کو کسی شے کے اوپر سے علاحدہ کرنے کو اور اس پر سے اٹھا لینے کو کہتے ہیں۔ اسی

---

[1] شعب الإيمان (٣/ ٧٥) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٩٨) [3] شعب الإيمان (٣/ ٧٥)

طرح گالی گلوچ میں کوئی شخص قصوروار ہو تو اس سے درگزر کرنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ "جنوب" "جنب" کی جمع ہے۔[1] "جنب" پہلو اور کروٹ کو کہتے ہیں۔ "مضاجع" "مضجع" کی جمع ہے۔ "مضجع" وہ جگہ ہے جس میں آدمی لیٹتا ہے۔ حال کی بنا پر یہ معنی ہیں: اس حال میں کہ اٹھ جاتے ہیں اور ان کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہوں سے علاحدہ ہو جاتی ہیں اور یکسو ہو جاتی ہیں۔ یہ لوگ تہجد کی نماز پڑھنے والے ہیں۔ رات کو نماز کے لیے اپنے بچھونوں سے اٹھتے ہیں۔ امام حسن، مجاہد، عطاء اور جمہور رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔

نماز سے مراد رات کو نفلی نماز بغیر کسی تقیید کے پڑھنا ہے۔ امام قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ مغرب اور عشاء کے درمیان نفلی نماز پڑھنا ہے۔ امام ابو حازم اور محمد بن منکدر رحمہما اللہ اس کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ صلاۃِ اوابین ہے۔ کسی نے کہا: صرف عشاء کی نماز ہے۔ امام حسن اور عطا رحمہما اللہ سے بھی یہ ایک روایت ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: عشاء اور صبح کی نماز ہے جماعت میں۔[2] ان میں سے بعض قول پہلے گزر چکے ہیں، انسجامِ بیان کے لیے دوبارہ لائے گئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز میں یا اس کے علاوہ اللہ کے ذکر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت نماز کے انتظار کے متعلق نازل ہوئی ہے، جس کو عَتَمہ کہتے ہیں یعنی نمازِ عشاء۔ ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نمازِ عشاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ وہ سوتے نہ تھے، جب تک کہ عشاء کی نماز نہ پڑھ لیں۔ چوتھی روایت یہ ہے کہ ہم نمازِ عشاء سے پہلے بچھونوں سے بچتے تھے۔ پانچویں روایت یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی عشاء سے قبل سوتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ اس کے بعد باتیں کرتے ہوئے دیکھا، کیوں کہ یہ آیت اسی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو نمازِ عشاء سے پہلے سوتے نہیں، اللہ نے ان کی تعریف فرمائی ہے۔ پھر جب یہ ذکر کیا تو آدمی اس خوف سے اپنے بستر سے کنارہ کرنے لگا کہ اس پر نیند غلبہ نہ پالے، پس عشاء کا وقت اس سے قبل ہے کہ چھوٹا سو جائے اور بڑے کو سستی آئے۔[4] (أخرجه ابن مردويه) نیز امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان پر کوئی رات گزرتی نہ تھی، مگر وہ اس سے لیتے تھے۔ سیدنا کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس وقت لوگ حشر کیے جائیں گے تو ایک منادی ندا کرے گا کہ یہ فیصلے کا دن ہے، کہاں ہیں وہ لوگ جن کی کروٹیں بچھونوں سے الگ ہوتی تھیں۔[5] (الحديث رواه عبد الله بن أحمد في زوائد الزهد من طريق لأبي عبد الله الجدلي عن عبادة بن الصامت عن كعب... الخ)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کی کروٹیں اللہ کے ذکر کے لیے

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٣٣) [2] ان کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٦) الدر المنثور (٦/ ٥٤٥) [4] الدر المنثور (٦/ ٥٤٦) [5] الدر المنثور (٦/ ٥٤٧۔ ٥٤٨)

الگ ہوتی ہیں، جب کبھی بیدار ہوئے تو اللہ کا ذکر کیا، یا تو نماز میں، یا قیام میں، یا بیٹھے ہوئے، یا اپنی کروٹوں پر ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔[1] سب قولوں سے زیادہ مشہور یہ قول ہے کہ اس سے مراد رات کی نماز ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ قیامِ لیل کی فضیلت میں اور اس پر مستعد اور آمادہ کرنے کے لیے صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں، جو کتبِ سنتِ مطہرہ میں معروف و مذکور ہیں۔

جملہ ﴿ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ حال ہے ﴿ جُنُوْبُهُمْ ﴾ کی ضمیر سے، یا حال بعد حال ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ پہلا جملہ مستانفہ ہو اطاعات کی قسموں میں سے ایک قسم کا بیان کرنے کے لیے ہو۔ اور ﴿ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ مفعول لہ ہیں، یعنی جدا ہوتی ہیں ان کی کروٹیں اس حال میں کہ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں اور ان کو اس کے عذاب کا خوف ہوتا ہے اور اس کی رحمت کا طمع ہوتا ہے۔ دونوں حال بھی ہو سکتے ہیں، یعنی پکارتے ہیں اس حال میں کہ ڈرنے والے اور طمع کرنے والے ہوتے ہیں، یا دونوں فعل محذوف کے مصدر ہیں، یعنی "يَخَافُوْنَ خَوْفًا وَّيَطْمَعُوْنَ طَمَعًا"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "خَوْفاً مِّنَ النَّارِ وَطَمَعاً فِي الْجَنَّةِ"[2] یعنی پکارتے ہیں اپنے رب کو نار سے ڈر کر اور جنت کا طمع کر کے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ خوف اور طمع کے سبب سے عبادت اور دعا صحیح ہے۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ نے "هداية السائل" میں اس کی خوب تحقیق فرمائی ہے۔ تفصیل کا طلب گار اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ یعنی اس روزی سے جو ہم نے ان کو دی ہے، یا اپنے رزق سے اللہ کی اطاعت میں اور بھلائی کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ مراد فرض یا نفلی صدقہ ہے۔ زیادہ مناسب ہے کہ عام معنی پر محمول کیا جائے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ نکرہ نفی کے تحت عموم کو ظاہر کرتا ہے، یعنی نفوس میں سے کوئی نفس اس شے کو نہیں جانتا جو اللہ پاک نے ان لوگوں کے لیے چھپا رکھی ہے، جن کا ذکر ابھی ہوا ہے، اس قسم سے کہ جس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے نہ کوئی نبی مرسل، پھر اور کسی کا کیا ذکر ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ علم کی نفی سے تفصیلی علم کی نفی ہے، ورنہ جو نعمتیں اللہ پاک نے مومنوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں، ہم ان کو اجمالاً جانتے ہیں اس طرح سے کہ وہ جنت میں بالا خانے اور محل ہیں اور درخت ہیں اور نہریں ہیں اور لباس ہیں اور کھانے پینے کی چیزیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جمہور نے ﴿ قُرَّةِ ﴾ بافراد اور ابن مسعود، ابو ہریرہ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہم نے قراءت بہ جمع پڑھا ہے اور امام حمزہ رحمہ اللہ نے "ما أُخْفَى" بہ سکونِ یاء اس بنا پر کہ فعل مضارع مسند ہے اللہ پاک کی طرف اور باقی قاریوں نے بہ فتح یاء بنا بر فعل ماضی

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ١٨٠) [2] تفسير البغوي (٦/ ٣٠٦) [3] تفسير أبي السعود (٧/ ٨٥)

مجہول پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''نُخْفِيْ'' بہ نونِ مضموم اور امام اعمش رحمہ اللہ نے ''يُخْفِيْ'' بیائے تحتیہ مضموم پڑھا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے قراءتِ حمزہ کے معنی میں کہا ہے کہ وہ شے جو اللہ پاک نے ان کے لیے مخفی رکھی ہے۔ یہی قراءت محمد بن کعب رحمہ اللہ کی بھی ہے۔[1] کلمۂ ﴿ مَآ ﴾ موضع نصب میں ہے بنا بر مفعولیت۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے اپنے لیے ایک جنت بنائی، پھر اس کے سوا ایک اور بنائی، پھر ان کو ایک موتی سے ڈھانک دیا۔ پھر فرمایا: ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴾ [الرحمن: ٦٢] ''دو باغوں کے علاوہ دو باغ (اور) ہیں۔'' خلق کو نہیں معلوم کہ ان میں کیا کچھ ہے، یہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ ان کے پاس اس میں سے ہر روز ایک تحفہ آئے گا۔[2] (أخرجه ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم وغيرهم) یہ بھی ان سے مروی کہ اس قسم سے ہے جس کی کچھ تفسیر نہیں ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک البتہ تورات میں لکھا ہوا ہے کہ البتہ واقعی اللہ نے ان لوگوں کے لیے جن کی کروٹیں بچھونوں سے الگ ہوتی ہیں، وہ شے تیار کر رکھی ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی، نہ کسی بشر کے دل پر گزری اور نہ اس کو کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے، نہ ہی کوئی نبی مرسل جانتا ہے، اور بے شک وہ البتہ قرآن میں ہیں: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾[4]۔ اس بارے میں حدیثیں ہیں، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہیں، کچھ پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

غرض کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ ﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ ﴾ سے مراد صلاۃ فی جوف اللیل (رات کی نماز ہے)، تاکہ جزا پورم پور ہو۔ کیوں کہ جیسا انھوں نے اپنے عمل کو پوشیدہ کیا تھا، ویسا ہی اللہ نے ان کے ثواب کو مخفی رکھا۔ پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی، یہ جزا ان کے اعمالِ صالحہ کے سبب سے ہے۔ فرمایا: ﴿ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یا تو ﴿ اُخْفِيَ ﴾ کا مفعول لہ ہے، یعنی وہ شے ان کے لیے اس شے کا، جو وہ دنیا میں طاعات کیا کرتے تھے، بدلہ دینے کے لیے مخفی رکھی گئی، یا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ ''أَيْ: جُوْزُوْا جَزَاءً بِذٰلِكَ'' یعنی وہ بدلہ دیے گئے پوری طرح اس شے کا جس کو وہ کیا کرتے تھے۔[5] پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ جو شخص طاعت اور ایمان کی روشنی میں ہے، وہ اس شخص کے برابر نہ ہوگا جو کفر و عصیان کی تاریکی میں گھرا ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا

[1] فتح القدير (٤/ ٣٣٣۔ ٣٣٤) [2] مستدرك الحاكم (٢/ ٥١٦) الدر المنثور (٦/ ٥٤٩)
[3] تفسير البغوي (٦/ ٣٠٧) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٠٨) [5] فتح البيان (١١/ ٢٤۔ ٢٧)

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا
اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ قِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ
النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ
الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَنْ
اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ
مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

کیا پھر مومن ایسے ہو سکتا ہے جیسے فاسق، وہ (کبھی) برابر نہیں ہو سکتے ⑱ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے رہنے کے باغات ہیں، ان اعمال کے بدلے میں مہمانی ہے جو وہ کیا کرتے تھے ⑲ اور لیکن جن لوگوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا آگ ہے، جب بھی وہ ارادہ کریں گے کہ وہ اس سے نکلیں تو انھیں اسی میں لوٹا دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ اس آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے ⑳ اور ہم (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے انھیں (دنیا کا) چھوٹا عذاب ضرور چکھائیں گے، شاید وہ (ہماری طرف) رجوع کریں ㉑ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی، پھر اس نے ان سے اعراض کیا، یقیناً ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں ㉒

مومن اور فاسق برابر نہیں ہیں:

قریب کا چھوٹا عذاب، یعنی بندے دنیا میں لوٹ مار دیکھ لیں گے۔ انتھٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے عدل و کرم کی خبر دیتا ہے کہ وہ قیامت کے اپنے فیصلے میں برابری نہیں کرے گا، اس شخص میں جو اس کی آیتوں پر ایمان لانے والا اور اس کے رسولوں کی پیروی کرنے والا ہے اور اس شخص میں جو اپنے رب کی اطاعت سے نکلنے والا اور اس کے رسول، جو اس کی طرف بھیجے گئے، کی تکذیب کرنے والا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [الجاثیة: ۲۱] ''کیا جن لوگوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انھیں ان لوگوں کے مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کا جینا اور مرنا برابر ہے۔ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴾ [ص: ۲۸] ''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان لوگوں کے مانند کر دیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں؟ یا ہم متقین کو بدکاروں کے مانند کر دیں گے؟'' نیز فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ [الحشر: ۲۰] ''آگ والے (دوزخی) اور باغ والے (جنتی) کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی ہی کامیاب ہیں۔'' اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ ﴾ یعنی قیامت کے دن اللہ پاک کے نزدیک وہ برابر نہ ہوں گے۔

امام عطاء بن یسار اور سدی رحمہ اللہ وغیر ہما نے کہا ہے کہ یہ آیت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور عقبہ بن ابی معیط کے حق میں نازل ہوئی ہے اور اسی لیے ان کے حکم کی یہ تفصیل فرمائی ہے: ﴿ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ یعنی جن لوگوں کے دلوں نے اللہ کی آیتوں کو سچا جانا اور ان کے مقتضیٰ پر عمل کیا، صالحات یہی ہیں تو ان کے لیے جنتِ ماویٰ ہے، یعنی وہ باغ جن میں رہنے بسنے کے مکانات ہیں، اونچے اونچے بالا خانے ہیں اور مہمانی اور عزت ہے ان اعمال کی بدولت جو وہ کرتے تھے۔ اور جو لوگ اطاعت سے نکل گئے، ان کا گھر آگ ہے، جب اس سے نکلنے کی کوشش کریں یا ارادہ کریں، پھر اسی میں الٹا دیے جائیں، جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ [الحج: ۲۲] ''اور وہ جب بھی مارے غم کے اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے، اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا:) بے شک جلانے والا عذاب چکھو!'' فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا: واللہ! بے شک ہاتھ تو البتہ کس کے بندھے ہوئے ہیں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں اور آگ کی لہب، یعنی اس کا شعلہ اور لپٹ ان کو اوپر اٹھا رہی ہے اور فرشتے ان کو عمود سے مار رہے ہیں، یا ان پر سختی کر رہے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ آگ کا عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے، یعنی ڈانٹ ڈپٹ کر کے ان سے یہ کہا جائے گا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عذابِ ادنیٰ سے مراد دنیا کے مصائب، تکالیف، بیماریاں اور آفات ہیں اور وہ چیزیں ہیں جو اُن میں سے اہلِ دنیا پر نازل ہوتی ہیں، جن کے ساتھ اللہ پاک اپنے بندوں کو مبتلا کرتا ہے، تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور امام ابو العالیہ، حسن، ابراہیم نخعی، ضحاک، علقمہ، عطیہ، مجاہد، قتادہ، عبدالکریم جزری اور خصیف رحمہ اللہ علیہم سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں یہ ہے کہ مراد اُن پر حدوں کا قائم کرنا ہے۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ، امام مجاہد اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے عذابِ قبر مراد ہے۔[2] نعوذ باللہ منه۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قحط کے سال ہیں، جو اُن کو پہنچے تھے۔[3] عبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قمر، دخان، بطشہ

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۶۰۵) [2] تفسیر الطبري (۲۰/ ۱۸۸۔ ۱۹۰) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۶۰۵) [3] سنن النسائی الکبریٰ (۶/ ۴۲۹)

اورلزام تو گزر چکے۔[1] (ورواه مسلم من حديث شعبة به موقوفاً نحوه و عند البخاري عن ابن مسعودؓ نحوه)

نیز سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یہ ہے کہ عذابِ ادنی وہ قتل اور قید ہے جو اُن کو بدر کے دن پہنچا تھا۔ اسی طرح امام مالک نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ سدی وغیرہ نے کہا کہ مکے میں کوئی گھر باقی نہیں رہا مگر اس میں رنج وغم داخل ہوا ان کے کسی مقتول یا قیدی کی وجہ سے۔ چنانچہ ان کو مصیبت پہنچائی گئی، یا ان کو ہزیمت ہوئی اور ان میں کسی کو یہ دونوں مصیبتیں پہنچیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ﴾ یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جس کو اللہ پاک نے اپنی آیتوں سے وعظ ونصیحت کی اور اس کے لیے ان کو خوب ظاہر اور واضح کر کے بیان کیا، پھر اس کے بعد اس نے ان کو چھوڑا اور ان کا انکار کیا اور ان سے منہ موڑا اور جان بوجھ کر ان کو بھلایا، گویا ان کو جانتا پہچانتا ہی نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: تم اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے سے بچو، کیوں کہ جس نے اس کے ذکر سے منہ موڑا تو "فَقَدِ اغْتَرَّ أَكْبَرَ الْغِرَّةِ، وَأَعْوَزَ أَشَدَّ الْعَوَزِ، وَعَظَّمَ مِنْ أَعْظَمِ الذُّنُوبِ" یعنی مقرر وہ بڑا عزت دار بنا اور نہایت درجہ حاجت مند ہوا اور سب سے بڑا گناہ کیا۔ اسی لیے جس نے یہ کام کیا اللہ پاک اس کو ڈانٹ کر یوں فرماتا ہے: ﴿ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ یعنی میں اب اس شخص سے سخت انتقام لوں گا جس نے یہ کام کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تین کام ایسے ہیں جس نے ان کو کیا تو یقیناً اس نے جرم کیا: وہ شخص جس نے غیر مستحق کے لیے جھنڈا گاڑا، یا اپنے ماں باپ کی نافرمانی کی، یا ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لیے گیا تو اس نے یقیناً جرم کیا، اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ یعنی ہم تو مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں۔[2] (ورواه ابن أبي حاتم من حديث إسماعيل بن عياش به وهذا حديث غريب جدا. وكذا أخرجه ابن منيع والطبراني وغيرهما. قال السيوطي: بسند ضعيف، كذا في الفتحين)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ اَفَمَنْ كَانَ ﴾ میں استفہام انکاری بہ معنی نفی ہے، یعنی مومن مثل فاسق کے نہیں ہے، جو دوری اور فرق ان کے درمیان ہے، وہ ظاہر ہوگیا، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَوٗنَ ﴾ چنانچہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٨) مسند أحمد (٥/ ١٢٨)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١١٠) المعجم الكبير (٢٠/ ٦١) الدر المنثور (٦/ ٥٥٥) فتح القدير (٤/ ٣٣٧) فتح البيان (١١/ ٣١) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٠٥۔ ٦٠٦) اس کی سند میں ''عبدالعزیز بن عبیداللہ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٩٥١)

جس انکار کا استفہام نے فائدہ دیا ہے اور وہ انکار جس شے کو ظاہر کرتا ہے، اس کی اس میں تصریح ہے زیادہ موثر اور مؤکد وجہ سے، وہ بات یہی ہے کہ مومن اور فاسق میں بڑا فرق ہے، ان میں کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ اس شد و مد اور مبالغے سے یہ تصریح اس لیے کی ہے کہ جو تفصیل آیندہ آتی ہے، اس کی بنا اس پر کی جائے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو کو جمع قرار دیا، جبھی تو ﴿ لَا يَسْتَوٗنَ ﴾ بہ صیغۂ جمع فرمایا، تو اس میں ''مَنْ'' کے معنی کا لحاظ کیا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ قلیل ترین جمع دو ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مومن اور فاسق سے مراد جنس ہے، ایک مومن اور ایک فاسق مراد نہیں ہے۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ عام لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب کا۔ امام سمین رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ﴿ فَاسِقًا ﴾ پر قصداً وقف کرتے اور ﴿ لَا يَسْتَوٗنَ ﴾ سے ابتدا فرماتے تھے۔

﴿ لَا يَسْتَوٗنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ مومن اور فاسق انجام اور اپنی قرار گاہ کے لحاظ سے اور اپنی عزت و تکریم اور ثواب و جزا کے لحاظ سے برابر نہ ہوں گے، اس میں ضمیر ''مَنْ'' کی طرف راجع ہے جو فریقین پر واقع ہے اور پہلے میں اس کے لفظ کی رعایت کی ہے، اس کے بعد اس میں اس کے معنی کی رعایت فرمائی ہے۔ اس جگہ فسق سے مومنین کے مقابلہ کے قرینے سے فسقِ کامل مراد ہے، ورنہ مومن بھی کبھی فاسق ہوتا ہے، اس کی نظیر یہ دو آیتیں ہیں: ﴿ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [القلم: ٣٥] ''کیا ہم مسلمانوں کو مثل گناہ گاروں کے کر دیں گے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [الجاثية: ٢١] ''کیا جن لوگوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انھیں ان لوگوں کے مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کا جینا اور مرنا برابر ہے۔ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔'' کیوں کہ ہر مجرم و مسیٔ کافر نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ولید بن عقبہ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''أَنَا أَحَدُّ مِنْكَ سِنَانًا، وَأَبْسَطُ مِنْكَ لِسَانًا، وَأَمْلَأُ لِلْكَتِيْبَةِ مِنْكَ. فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ: اُسْكُتْ، فَإِنَّمَا أَنْتَ فَاسِقٌ فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ يَعْنِي بِالْمُؤْمِنِ عَلِيًّا وَبِالْفَاسِقِ الْوَلِيْدَ بْنَ عُقْبَةَ بْنِ أَبِي مُعِيْطٍ''[2] (أخرجه أبو الفرج الأصبهاني في كتاب الأغاني والواحدي وابن عدي وابن مردويه والخطيب و ابن عساكر من طرق عنه وأخرج ابن مردويه والخطيب وابن عساكر في الآية نحوه وروى نحو هذا عن عطاء بن يسار والسدي وعبد الرحمن بن أبي ليلى)

امام کرخی رحمہ اللہ نے یوں نقل کیا ہے کہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا بھائی تھا ماں کی طرف سے، اس کے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے درمیان باہم تنازع تھا تو ولید نے ان سے کہا: ''اُسْكُتْ فَإِنَّكَ صَبِيٌّ وَأَنَا وَاللّٰهِ أَبْسَطُ مِنْكَ لِسَانًا وَّأَشْجَعُ مِنْكَ جِنَانًا وَّأَمْلَأُ مِنْكَ حَشْوًا فِي الْكَتِيْبَةِ'' معنی یہ ہیں کہ ولید نے

[1] معاني القرآن (٤/ ٢٠٨) [2] الدر المنثور (٦/ ٥٥٣)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا: چپ رہ، یعنی تجھ سے کیا بات بنے گی، کیوں کہ تو تو بچہ ہے اور میں واللہ! تجھ سے زبان میں کشادہ تر ہوں اور دل میں تجھ سے زیادہ شجاع ہوں اور نیزے کی بھال میں تجھ سے زیادہ تیز ہوں اور لشکر کو تجھ سے زیادہ پُر کرنے والا ہوں، یا لشکر کی بھرتی میں تجھ سے زیادہ پُر کرنے والا ہوں۔ غرض یہ ہے کہ زبان درازی، بہادری، قوتِ دل، نیزہ بازی اور لشکر کی بھرتی میں تجھ سے بڑھ کر ہوں اور جوان قوی تجربہ کار اور جنگ آزمودہ ہوں، تو مجھ سے کیا مقابلہ کر سکتا ہے؟!

پس سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: چپ رہ، یعنی تو کیا یہ بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا ہے، تو محض بے حقیقت ہے، کیونکہ تو تو ایک فاسق آدمی ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مومن سے مراد سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں اور فاسق سے ولید بن عقبہ۔ غرضیکہ پہلے اللہ پاک نے دنیا میں فریقین کا حال بیان کیا، اس کے بعد آخرت میں دونوں کے مرتبے کا ذکر کیا اور مومنین سے ابتداء کی، جس طرح کہ پہلے بھی انہیں کو مقدم ذکر کیا تھا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًاۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ جمہور نے ﴿ جَنّٰتُ ﴾ بہ جمع پڑھا ہے اور طلحہ بن مصرف نے "جَنَّةُ الْمَأْوٰى" واحد پڑھا ہے۔ "مَاْوٰى" وہ شے ہے جس کی طرف ٹھکانا پکڑیں گے۔ جنات کی اضافت ماویٰ کی طرف کی، اس لیے کہ حقیقی ماویٰ وہی ہیں، کیوں کہ مومنین کا اصلی گھر وہی ہے، دنیا کا رہنا بسنا تو ایسا ہے جیسے کوئی مسافر کسی جگہ جاتا ہے تو راہ میں منزل بہ منزل اترتا جاتا ہے۔ جاتے جاتے منزلِ مقصود کو پہنچ جائے گا، کچھ مسکن و ماویٰ نہیں ہے۔ ؎

زندگی ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

کسی نے کہا: ماویٰ تمام جنتوں میں سے ایک جنت ہے جس میں شہیدوں کی روحیں بسیرا لیتی ہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ عرشِ معلیٰ کے داہنی طرف واقع ہے، پہلے اس پر کلام گزر چکا ہے۔ "نُزُلٌ" بہ ضمتین اصل میں وہ کھانا پینا ہے جو مہمانِ نازل کے واسطے اس کی عزت و تعظیم کے لیے تیار کیا جاتا ہے، جس طرح کہ اس کا بیان سورت آلِ عمران میں گزر چکا ہے۔[1] امام ابو حیوہ رحمہ اللہ نے اس کو بہ سکونِ زائے معجمہ پڑھا ہے، اس کا نصب بنا بر حال ہے۔[2] ﴿ بِمَا ﴾ میں حرف باء سببیت کے لیے ہے، یعنی جو لوگ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں تو ان کے لیے باغ ہیں، جن کی طرف وہ ٹھکانا پکڑیں گے، درآنحالیکہ وہ ان کے لیے تیار کیے گئے ہیں، تاکہ وہ ان میں اتریں جس طرح کہ مہمان عزیز کے لیے کھانے پینے کا ساز و سامان تیار کیا جاتا ہے اور یہ ساری آؤ بھگت اور تنظیم و تکریم جو کی گئی، ان اعمال کے سبب سے ہے جن کو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ اعمال کا جنت میں داخل ہونے کا سبب ہونا اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ حقیقی سبب ہیں، تاکہ اس حدیث شریف کی مخالفت لازم آئے کہ تم میں سے کوئی جنت میں اپنے عمل کے سبب داخل نہ

[1] رقم الآية (١٩٨) [2] فتح القدير (٤/ ٣٣٤)

ہوگا، بلکہ وہ سبب مراد ہے جو وعدۂ الٰہی کے مقتضیٰ کے تحت جنت کی طرف جانے کا سبب ہوگا۔[1]

پھر اللہ پاک نے دوسرے فریق کا ذکر فرمایا: ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ﴾ یعنی اور وہ لوگ جو اللہ کی اطاعت سے خارج ہوئے اور اس پر اور اس کے رسولوں پر کفر و تکذیب کر کے سرکشی کی تو ان کی منزل جس کی طرف آخرت کو جائیں گے اور اس میں قرار پکڑیں گے، وہ نار ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح کی بڑی تاثیر ہے، چنانچہ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾۔ رہا کفر تو اس کے ساتھ اعمال کسی توجہ کے مستحق نہیں ہیں۔ اسی لیے "وَعَمِلُوا السَّيِّئَاتِ" نہیں فرمایا، کیونکہ ﴿ فَسَقُوْا ﴾ سے مراد "كَفَرُوْا" ہے اور اگر عقاب کفر و عمل کے مقابلے میں ٹھہرایا جاتا تو یہ خیال کیا جاتا کہ محض کفر پر کچھ عذاب نہیں ہے۔

جملہ ﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ﴾ مستانفہ ہے، اس سے غرض اس بات کا بیان کرنا ہے کہ نار جو ان کا ماویٰ اور مسکن ہوئی، اس کی کیا کیفیت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جس وقت وہ اس سے نکلنا چاہیں گے تو خوار و ذلیل ہو کر زبردستی اسی میں لوٹا دیے جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس وقت ان کو شعلۂ نار کے اوپر کی جانب دھکایا جائے گا تو پھر اپنی جگہ کی طرف پھیر دیے جائیں گے۔ مروی ہے کہ آگ ان کو مارے گی تو اس کے طبقات کی طرف اوپر اُٹھ آئیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے دروازے کے قریب ہوں گے اور چاہیں گے کہ اس سے نکل جائیں تو اس کا شعلہ ان کو مارے گا، پھر اس کی تہہ کی طرف نیچے چلے جائیں گے، اسی طرح ہمیشہ ان کے ساتھ کیا جائے گا۔ کلمۂ "فِيْ" سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ وہ اس میں قرار پذیر ہیں۔ رہا اعادہ تو یہ اس کے ایک طبقے سے دوسرے طبقے کی طرف ہے۔

جملہ ﴿ وَقِيْلَ لَهُمْ ﴾ معطوف ہے ﴿ اُعِيْدُوْا ﴾ پر، یعنی ایک تو یہ عذاب کہ آگ سے نکلنا چاہیں تو نکلنا نصیب نہیں، اسی میں لوٹا دیے جائیں، اس پر طرہ یہ کہ ان کو غیظ میں لانے اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے آگ کے خزانچی فرشتے یا خود اللہ عزوجل ان سے فرمائے گا: ﴿ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ یعنی آگ کا عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ باوجود آگ میں ہونے کے کہ جل بُھن رہے ہیں کباب کی طرح پک رہے ہیں، ایسی حالت میں اس بات کا کہنا گویا نمک و مرچ کا چھڑکنا ہے۔ (ذوق حسی و معنوی دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ حسی تو آگ میں جلنا ہے اور معنوی اس بات کا سننا)۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ فاسق سے کافر مراد ہے، کیوں کہ تکذیب ایمان کے مقابلے میں ہوتی ہے۔

نکتہ:

﴿ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ عذاب کی صفت ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ نار کی صفت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦)

ہو۔ یہ بات کہ نار مونث سماعی ہے، اس کی صفت ﴿ اَلَّذِیْ ﴾ مذکر، کیوں کر ہو سکتی ہے تو اس لیے کہا ہے کہ صفت کا مذکر لانا جحیم یا حریق کے معنی کی بنا پر ہے۔[1] اللہ پاک نے اس جگہ تو ﴿ اَلَّذِیْ کُنْتُمْ بِهٖ ﴾ فرمایا ہے اور سورت سبا میں ﴿ اَلَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا ﴾ [سبا: ٤٢] فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں مضاف کا لحاظ کر کے صفت اور ضمیر دونوں کو مذکر ذکر کیا ہے، مضاف کلمۂ عذاب مذکر ہے اور وہاں بلحاظ مضاف الیہ، یعنی کلمۂ نار دونوں کو مونث فرمایا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ یہ دونوں اعتبار یہاں وہاں برابر ٹھیک ہو سکتے ہیں پھر تخصیص کی کیا وجہ ہے کہ یہاں خاص کر کے مذکر کہا اور وہاں مونث؟ تو اس کی یہ وجہ ہے کہ اس جگہ کلمۂ نار اپنی ضمیر کے موقع میں واقع ہوا ہے اس لیے کہ اس کا ذکر مقدم ہو چکا ہے اور ضمیر موصوف ہوتی نہیں ہے اس لیے یہاں مناسب تذکیر ہے اور وہاں نہ نار کا ذکر مقدم ہوا ہے نہ اس کی ضمیر کا اس لیے وہاں مناسب تانیث ہے۔ (كذا ذكر الكرخي والله سبحانه أعلم بأسرار كتابه ونكاته)

عذابِ ادنیٰ سے مراد عذابِ دنیا ہے، یا دنیا کی مصیبتیں اور بیماریاں ہیں۔[2] (قاله الحسن و أبو العالية والضحاك والنخعي)، یا حدود یا بدر کے دن قتل بہ سیف، یا مکے میں سات سال کی قحط سالی جس میں مردار اور ہڈیاں اور کتے کھا گئے تھے، یا عذابِ قبر۔ نعوذ بالله منه۔ یہ سب اقوال پہلے گزر چکے، ان سب قولوں پر عذابِ ادنیٰ کو محمول کرنے سے کوئی امر مانع نہیں ہے اور عذابِ اکبر سے مراد عذابِ آخرت ہے۔

﴿ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم ان کو آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا کا عذاب چکھائیں گے، شاید وہ شرک اور معاصی سے جس میں گرفتار ہیں، اس سے ایمان اور طاعت کی طرف رجوع کریں اور توبہ کریں اس حالت سے جس میں وہ مبتلا ہیں، اس عذاب کی وجہ سے جو دنیا میں ان پر نازل ہو۔ یہ وجہ جو ادنیٰ عذاب کے چکھانے کی ذکر فرمائی ہے، اس میں اس شخص کے قول کے ضعیف ہونے کی دلیل ہے جس نے کہا ہے کہ عذابِ ادنیٰ سے مراد عذابِ قبر ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے رجوع نہیں ہو سکتا ہے۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ اس ترجی میں کیا حکمت ہے، حالاں کہ ترجی تو اللہ پاک پر محال ہے؟ تو اس کے جواب میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان کو رجا اور امید رکھنے والوں کی طرح چکھا دیں گے جس طرح کہ ﴿ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ ﴾ فرمایا ہے، یعنی ہم نے تم کو ترک کیا، جس طرح کہ بھولنے والا ترک کرتا ہے، اس طریقے سے کہ اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتا ہے، چنانچہ اسی طرح یہاں بھی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم ان کو ایسا چکھنا چکھائیں گے کہ کہنے والا جس وقت ان کو دیکھے تو یوں کہے کہ شاید وہ اس کی وجہ سے رجوع کریں۔ انتہیٰ

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٥٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٢٠/ ١٨٩۔ ١٩٠)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ﴾ میں استفہام انکاری ہے، یعنی اس شخص سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جو اپنے رب کی آیتوں سے وعظ و نصیحت کیا گیا، کیوں کہ آیاتِ الٰہی سے اس نے اس شے کو سنا جو ایمان و طاعت پر متوجہ ہونے کو واجب کرتی ہے، تو اس نے بجائے متوجہ ہونے کے منہ کو موڑے رکھا، بھلا جس نے ایسا کیا، اس سے بڑھ کر اور کوئی ظالم اور بے انصاف اور ظالم ہو سکتا ہے۔ یہاں پر جو کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ ذکر فرمایا ہے تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تذکیر آیاتِ الٰہی کے بعد ان سے اعراض کرنا ایک مستبعد امر ہے اور اس قسم سے ہے جس کو نہ ہونا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کو رب العالمین کی آیات سے تذکیر کی جائے، پھر وہ ان سے اعراض کرے، یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے، ہو ہی نہیں سکتی، پھر جو کوئی ایسے مستبعد امر کا مرتکب ہو اور ایسا کام کرے جو نہ ہونا چاہیے تو واقعی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم جرم کرنے والے لوگوں سے عام طور پر انتقام لینے والے ہیں۔ چنانچہ جس شخص نے اللہ کی آیتوں سے اعراض کیا ہے تو وہ بدرجۂ اولیٰ اس میں داخل ہو گا۔ ابو السعود نے کہا ہے کہ ہر وہ شخص جس سے جرم سرزد ہوا ہو تو گو اس کا جرم سہل اور آسان ہو تو اللہ پاک اس سے انتقام لے گا، بھلا پھر جو شخص ہر ظالم سے بڑھ کر ظالم ہو اور ہر مجرم سے اس کا جرم بڑا ہو، اس سے کیوں کر انتقام نہ لے گا؟![1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، لہٰذا (اے نبی!) آپ اس کی ملاقات کے متعلق شک میں نہ رہیں اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا (23) اور جب انھوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں کچھ ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہنمائی کرتے تھے اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے (24) بلاشبہ آپ کا رب ہی روزِ قیامت ان کے مابین اس کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے (25)

موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات اور ان کے بنی اسرائیل کا امام ہونے کا بیان:

اس کی ملاقات میں شک نہ کرنا چاہیے، یعنی کتاب کے ملنے میں، یا معراج کی رات میں موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات

---

[1] تفسير أبي السعود (۷/ ۸٦) فتح البيان (۱۱/ ۲۸۔ ۳۱)

کرنے میں، ان سے کئی بار ملے تھے، جس طرح ان لوگوں نے صبر کیا، تم بھی صبر کرو تو تم میں بھی وہی پھل ہو۔ انتھیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے بندے اور رسول موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ ان کو کتاب دی، یعنی تورات شریف۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مِنْ لِّقَآىِٕهٖ ﴾ سے مراد شبِ معراج ہے۔ یعنی معراج کی رات نبی اکرم ﷺ موسیٰ علیہ السلام سے ملے تھے، چنانچہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ تو بے شک موسیٰ علیہ السلام سے ملا ہے، اس میں کسی طرح کا شک مت کر۔ پھر قتادہ رحمہ اللہ نے امام ابو العالیہ ریاحی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا مجھ سے حدیث بیان کی تمھارے نبی کے چچا کے بیٹے نے، یعنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس رات جس میں مجھے سیر کرائی گئی، مجھے موسیٰ بن عمران علیہ السلام دکھائے گئے، وہ ایک گندم گوں مرد تھے، دراز قد اور گھونگریالے بالوں والے، گویا وہ قبیلۂ شنوءہ کے مردوں میں سے ہیں اور میں نے دیکھا عیسیٰ علیہ السلام کو مربوع الخلق، یعنی میانہ قد، سرخی اور سفیدی کی طرف مائل رنگ اور سیدھے بالوں والے اور میں نے داروغۂ دوزخ مالک کو اور دجال کو دیکھا ان نشانیوں میں سے جو اللہ نے ان کو دکھائیں، چنانچہ تو ان کے اس ملنے میں شک نہ کر۔ بے شک آپ ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس رات میں دیکھا جس رات میں آپ کو سیر کرائی گئی۔[1]

طبرانی نے عن قتادہ عن ابی العالیہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ ﴿ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ کی تفسیر میں یہ روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا اور ﴿ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ لقائے موسیٰ علیہ السلام، یعنی اس سے ملاقات میں شک میں نہ رہ۔[2] قولہ ﴿ وَجَعَلْنٰهُ ﴾ "أَيِ: الْكِتَابَ الَّذِيْ آتَيْنَاهُ"، ﴿ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ یعنی ہم نے اس کتاب کو جو موسیٰ علیہ السلام کو دی اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔ یہ معنی اس بنا پر ہیں کہ ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ کی ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے جس طرح کہ سورت بنی اسرائیل میں فرمایا ہے: ﴿ وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢] ''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا (اور انھیں حکم دیا) کہ تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جب وہ لوگ اللہ کے اوامر پر صابر ہوئے اور اس کی منع کی ہوئی اور ان چیزوں کو چھوڑنے پر صابر ہوئے جو اس کے غصے کا باعث ہوتی ہیں اور اس کے رسولوں کی تصدیق اور اتباع پر اس شے میں جس کو وہ لے کر آئے تھے، ثابت قدم رہے تو ان میں ایسے امام اور پیشوا ہوئے جو حق کی راہ پر اللہ کے حکم سے چلاتے ہیں اور خیر کی طرف دعوت دیتے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٥) تفسير الطبري (٢٠/ ١٩٤)

[2] المعجم الكبير (١٢/ ١٦٠) اس کی سند میں ''محمد بن عثمان بن ابی شیبہ'' ضعیف راوی ہے۔

ہیں اور نیک بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے روکتے ہیں۔ پھر جب انھوں نے اللہ کی کتاب میں تبدیلی اور تحریف اور تاویل کی تو وہ مقام ان سے چھین لیا گیا اور ان کے دل سخت پڑ گئے اور وہ کلموں کی ان کی جگہوں سے تحریف کرنے لگے، پھر نہ کوئی عمل صالح رہا اور نہ ہی اعتقاد صحیح رہا۔

اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ ﴾ [الجاثیة: ١٦] ''اور یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب دی۔'' امام قتادہ اور سفیان رحمہ اللہ نے کہا: جبکہ انھوں نے دنیا سے صبر کیا۔ اور اسی طرح حسن بن صالح نے کہا ہے۔ سفیان نے کہا ہے کہ یہ لوگ اسی طرح کے تھے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کا کوئی امام ہو جس کی وہ اقتدا کرے، یہاں تک کہ دنیا سے کوچ کرے۔ امام وکیع رحمہ اللہ نے کہا: سفیان نے کہا ہے کہ دین کے واسطے علم ضروری ہے، جس طرح کہ جسم کے لیے روٹی ضروری ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نواسے نے کہا ہے کہ میرے باپ نے میرے چچا پر پڑھا، یا میرے چچا نے میرے باپ پر پڑھا کہ سفیان سے کسی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قول کے بارے میں پوچھا کہ ''اَلصَّبْرُ مِنَ الْإِيْمَانِ بِمَنْزِلَةِ الرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ'' یعنی صبر کو ایمان سے وہ نسبت ہے جو سر کو جسم سے ہے۔

کیا تو نے اللہ پاک کا قول نہیں سنا ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ﴾ تو کہا کہ جب انھوں نے اس امر کو پکڑ لیا تو سردار ہو گئے، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَاٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴾ [الجاثیة: ١٦۔ ١٧] ''اور یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت دی اور ہم نے انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے انھیں جہانوں پر فضیلت دی۔ اور ہم نے انھیں دین کی بابت واضح واضح (نشانیاں) دیں، پھر انھوں نے اپنے پاس علم آجانے کے بعد ہی، محض آپس کی بغاوت وعداوت سے، اختلاف کیا۔ بے شک آپ کا رب روزِ قیامت ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا، جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔'' جس طرح کہ اس جگہ یہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴾ یعنی جن اعتقادات و اعمال میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، قیامت کے دن اللہ پاک اس کا فیصلہ کر دے گا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ کتاب سے مراد تورات شریف ہے۔ خاص کر موسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کے دین پر ہیں، وہ آپ کے وقت میں

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٠٦۔ ٦٠٧)

موجود تھے، ان کے الزام دینے کو موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو ذکر اور استدلال کے لیے اختیار نہ کیا، اس کی یہ وجہ ہے کہ یہود ان کی نبوت پر موافق نہ تھے۔ رہے نصاریٰ تو وہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کرتے تھے، سو جس کی نبوت پر یہود و نصاریٰ دونوں کا اجماع تھا، ایسے مجمع علیہ شخص کے ساتھ اللہ پاک نے تمسک کیا، تاکہ کسی قسم کی گفتگو کی گنجایش نہ رہے۔ ﴿ مِرْيَةٍ ﴾ بہ معنی شک وشبہہ کے ہے۔ "لقاء" دیدار کرنے اور ملنے کو کہتے ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: مفسرین نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کریں گے وفات سے قبل، پھر آپ نے ان سے آسمان میں ملاقات کی، یا بیت المقدس میں جبکہ آپ کو سیر کرائی گئی۔ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: "وَعَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ سَيَلْقَى مُوْسَى قَبْلَ أَنْ يَّمُوْتَ... الخ" پس یہ ترجمہ اس پر مبنی ہے کہ "وَعَدَ" فعل ماضی معروف ہے، لیکن اس جگہ احتمال یہ بھی ہے کہ "وُعِدَ" فعل ماضی مجہول ہو اور توجیہ ظاہر ہے۔ از مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)۔

یہ قول امام مجاہد، کلبی اور سدی رحمہ اللہ کا ہے۔[1] کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ تو قیامت میں موسیٰ علیہ السلام کے ملنے سے شک میں نہ رہ اور تو عن قریب اس سے قیامت میں ملے گا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو کتاب ملنے سے شک میں نہ رہ۔ یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا ہے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں کہ البتہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تو اس کی تکذیب کی گئی اور اسے ایذا پہنچائی گئی، چنانچہ تو اس بات سے شک میں نہ رہ کہ عن قریب تکذیب اور ایذا تجھے بھی پیش آئے گی، جو اسے پیش آئی تھی۔ اس بنا پر ﴿ لِقَآئِهٖ ﴾ میں ضمیر محذوف کی طرف راجع ہوگی۔ معنی یہ ہیں کہ "مِنْ لِقَاءِ مَا لَاقَى مُوْسٰى" یعنی تو اس شے کے ملاقات کرنے میں شک میں نہ رہ، جس نے موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول غریب ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اس عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے، معنی یہ ہیں: "قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِنْ لِّقَائِهٖ" یعنی تو کہہ دے کہ تم کو موت کا وہ فرشتہ وفات دیتا ہے جو تم پر متعین کیا گیا ہے، پس تو اس کے ملنے سے شک میں نہ رہ۔

پس جملہ ﴿ فَلَا تَكُنْ ﴾ معترض ہو گیا ہے ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا... الخ ﴾ اور ﴿ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى... الخ ﴾ کے درمیان، حالاں کہ خود ﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ ﴾ اور ﴿ فَلَا تَكُنْ ﴾ کے درمیان کتنے جملے ہیں۔ یہ بھی عجیب قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ لِّقَآئِهٖ ﴾ کی ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے جو فرقان ہے، اس لیے کہ قرآن شریف کے حق میں لقاء کا اطلاق آیا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [النمل: ٦] "اور (اے نبی!) بلاشبہہ آپ کو تو ایک کمال حکمت والے، خوب جاننے والے کی طرف سے یہ قرآن سکھایا جاتا ہے۔" معنی یہ ہیں کہ واقعی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اس کتاب کے مثل جو ہم نے تجھے دی۔ "وَلَقَّيْنَاهُ مِثْلَ مَا لَقَّيْنَاكَ مِنَ الْوَحْيِ" اور ہم نے اس کو ویسی وحی سکھائی جیسی تجھ کو سکھائی۔ چنانچہ تو اس بات سے شک میں نہ رہ کہ

[1] فتح القدير (٤/ ٣٣٧۔ ٣٣٨) [2] معاني القرآن (٤/ ٢٠٩) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٠٧)

تو اس کا مثل ونظیر سکھایا گیا ہے۔ (یعنی ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے مضاف کے حذف کی بنا پر، یعنی "مِنْ لِقَاءِ مِثْلِ كِتَابِ مُوْسیٰ" (كذا في السمين)) یہ قول بھی بہت بعید ہے۔

شاید قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴾ اس بات کا باعث ہوا کہ اس قول کا قائل یہ بات کہے، کیوں کہ اس میں ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ لِّقَآىِٕهٖ ﴾ کی ضمیر رجوع کی طرف راجع ہے جو ﴿ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾ سے سمجھا جاتا ہے، یعنی تو رجوع کے ملنے سے شک میں نہ ہو۔ یہ قول بھی نہایت بعید ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے چھے قول نقل کر کے پھر کہا ہے کہ یہ بعید اقوال ہیں۔ میں نے ان کا ضعف بتانے کے لیے ان کو نقل کیا ہے۔ سب اقوال سے زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ضمیر یا تو موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے یا کتاب کی طرف، یعنی اس میں شک مت کر کہ موسیٰ علیہ السلام نے کتاب کی ملاقات کی اور وہ اس پر اتاری گئی۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے: ﴿ فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآىِٕهٖ ﴾ کہا لقائے موسیٰ سے۔ کسی نے کہا: کیا آپ نے موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی؟ کہا: ہاں، کیا تو اللہ پاک کے قول کی طرف نہیں دیکھتا: ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥] "اور ہم نے جو اپنے رسول آپ سے پہلے بھیجے تھے ان سے پوچھیے، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی اور معبود مقرر کیے تھے کہ اُن کی عبادت کی جائے۔"[1] (أخرجه الطبراني و ابن مردويه والضياء في المختارة بسند قال السيوطي: صحيح)

غرض یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسل سابقین سے سوال کرنے کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ آپ ان سے ملے، اگر آپ نہ ملتے تو پھر سوال کا حکم دینے کا کیا مطلب ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں شبِ معراج میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس ریت کے ایک سرخ ٹیلے کے پاس آیا اور وہ اپنی قبر میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔[2] حدیثِ معراج میں یہ بات بھی صحیح ہوئی ہے کہ آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو چھٹے آسمان میں دیکھا۔[3] پس ان دونوں حدیثوں کے درمیان جمع جو امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے، یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر میں دیکھنا شاید آسمان کی طرف چڑھنے سے پہلے تھا، پھر آپ آسمان کی طرف چڑھے تو ان کو وہاں پایا، وہ آپ سے پہلے چلے گئے، اس امر کی وجہ سے جس کا اللہ پاک نے ارادہ کیا۔[4]

پھر ﴿ جَعَلْنٰهُ ﴾ کی ضمیر میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کتاب کی طرف پھرتی ہے، یہ قول امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ کوفیوں نے "أَإِمَّةً" پڑھا ہے۔ (اس میں دو قراءتیں ہیں، ایک تو ہر دو ہمزہ کے ساتھ۔ دوسری قراءت دوسرے ہمزہ کو یاء سے

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٥٥٦) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٥) البتہ صحیح بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤) [4] تفسير الخازن (٥/ ٢٢٧)

بدل کر، یہ عربیت کی رو سے جائز ہے نہ کہ قراءت کے لحاظ سے۔ شرح عقائد میں کہا ہے: ائمہ کی اصل "أ أممة" ہے، اس لیے کہ امام کی جمع ہے، لیکن جبکہ دو حرف ایک جنس کے جمع ہوئے یعنی دو میم تو پہلے کو دوسرے میں ادغام کر دیا اور اس کی حرکت منتقل کر کے ہمزہ کو دی تو ائمہ دو ہمزہ کے ساتھ ہو گیا۔ پھر دو ہمزہ کو اکٹھا کرنے کی کراہت کی وجہ سے ہمزہ مکسور کو یا سے بدل لیا۔ کذا في الجمل)۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ لحن ہے، یعنی سارے نحویوں کے نزدیک غلط ہے، کیوں کہ یہ ایک کلمے میں دو ہمزوں کا جمع کرنا ہے۔ (اس کو غلط کہنا سراسر غلط ہے، بلکہ سوئے ادب اور کمال نافہمی۔ جب ثابت ہوا کہ چار قاریوں کی یہ متواتر قراءت ہے، پھر اس سے بڑھ کر جواز کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ قراءت سے استشہاد کیا جاتا ہے قراءت اپنے ثبوت میں کسی غیر کے کلام کی محتاج نہیں ہے اس قسم کے کلام کرنے والوں پر ملا علی قاری وغیرہ نے بہت تشدد کیا ہے۔ از مصحح)۔ ائمہ قادہ ومقتدا و پیشوا ہیں، جن کا اپنے دین میں لوگ اقتدا کرتے ہیں، یہ وہ انبیاء ہیں جو بنی اسرائیل میں تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اتباعِ انبیاء ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ علماء۔ اول قول قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

﴿ لَمَّا صَبَرُوْا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو ہدایت کی طرف بلاتے ہیں تورات کے ان احکام اور مواعظ کے ساتھ جن کا وہ ان کی طرف القا کرتے ہیں۔ اس کے سبب سے ہم نے ان کو اس کا امر کیا ہے۔ یا ہمارے امر کے واسطے۔ ﴿ لَمَّا صَبَرُوْا ﴾ میں کلمہ ﴿ لَمَّا ﴾ "حِینَ" کے معنی میں ہے۔ اور اس میں جزا کے معنی ہیں۔ تقدیر ہے: "کَمَا صَبَرُوْا جَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً" یعنی جبکہ ان اماموں نے صبر کیا تو ہم نے ان کو پیشوا بنا دیا۔ امام حمزہ، کسائی، خلف، ورش عن یعقوب اور یحییٰ بن وثاب نے بکسرِ لام و تخفیفِ میم پڑھا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس قراءت کو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت "بِمَا صَبَرُوْا" سے استدلال کر کے اختیار کیا ہے۔[2] یعنی ہم نے ان کو پیشوا کیا ان کے صبر کی وجہ سے۔ اس صبر سے مراد یہ ہے کہ تکلیف پر اور لوگوں کی ہدایت کی مشقتوں پر انھوں نے صبر کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا سے صبر کیا۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ صبر کا پھل امامت ہے، یعنی صبر کرنے سے آدمی لوگوں کا پیشوا ہو جاتا ہے۔

﴿ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ہماری نازل کی گئی آیتوں کی تصدیق کرتے تھے، وہ آیتیں جو کتاب کی پیچیدگیوں میں ہیں اور جانتے تھے کہ وہ حق ہیں اور اللہ کے پاس سے ہیں، اس لیے کہ وہ ان میں خوب تفکر و تدبر کرتے تھے اور ان کو اچھی طرح سوچتے سمجھتے تھے۔ ﴿ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور مومنین اور کفار کے درمیان حکم یعنی فیصلہ کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ انبیاء اور ان کی امتوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اس قول کو نقاش نے حکایت کیا ہے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٠٨) فتح القدير (٤/ ٣٣٨)
[2] تفسير القرطبي (١٤/ ١٠٨)
[3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٠٨) [illegible] (١١/ ٣١-٣٤)

أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ
فِي مَسَاكِنِهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ ۖ أَفَلَا يَسْمَعُونَ ﴿٢٦﴾ أَوَلَمْ
يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا
تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ ۖ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿٢٧﴾ وَيَقُولُونَ
مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٨﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا
يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٢٩﴾ فَأَعْرِضْ
عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ إِنَّهُمْ مُنْتَظِرُونَ ﴿٣٠﴾

کیا ان پر واضح نہیں ہوا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی اُمتیں ہلاک کر دیں، جن کے گھروں میں (اب) وہ چلتے پھرتے ہیں۔ بے شک اس میں عظیم نشانیاں ہیں، کیا پھر وہ سنتے نہیں؟ 26 کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم پانی کو بنجر زمین کی طرف بہالے جاتے ہیں، پھر ہم اس کے ذریعے سے کھیتی نکالتے ہیں، اس سے ان کے چوپائے اور وہ خود بھی کھاتے ہیں، کیا پھر وہ غور نہیں کرتے؟ 27 اور وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو (بتاؤ) یہ فیصلہ کب ہوگا؟ 28 کہہ دیجیے: فیصلے کے دن کافروں کو ان کا ایمان لانا نفع نہیں دے گا اور نہ انھیں مہلت ہی دی جائے گی 29
چناں چہ آپ اُن سے اعراض کریں اور انتظار کریں، بے شک وہ بھی انتظار کر رہے ہیں 30

گذشتہ اقوام کے انجام سے عبرت پکڑنے کا حکم:

اللہ پاک فرماتا ہے کہ ان رسولوں کے جھٹلانے والوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ جو اُمتیں ان سے پہلے تھیں اللہ نے ان کو اس وجہ سے ہلاک کر ڈالا کہ رسول جو ان کے پاس سیدھی راہ لے کر آئے تو انھوں نے ان کو جھٹلایا اور اس میں ان کی مخالفت کی۔ پھر ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، سب بالکل نیست و نابود ہو گئے، ان کا کچھ اُتا پتا نہ رہا: ﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ [مریم: ۹۸] ''کیا آپ ان میں سے کسی ایک کو محسوس کرتے ہیں، یا ان کی کوئی بھنک (آہٹ) بھی سنتے ہیں؟'' اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ﴾ یعنی یہ جھٹلانے والے ان جھٹلانے والوں کے مکانات میں پھرتے ہیں، تو جو لوگ ان میں رہتے سہتے تھے ان کو آباد رکھتے تھے، ان میں سے کسی کو نہیں دیکھتے ہیں۔ وہاں سے ایسے چلے گئے، جیسے کبھی ان میں رہے بسے ہی نہ تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا﴾ [النمل: ۵۲] ''چناں چہ یہ ہیں ان کے گھر خالی (اُجڑے اور ویران) پڑے ہوئے۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۞ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴾ [الحج: ٤٥۔ ٤٦] ''چناں چہ کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، جبکہ وہ ظالم تھیں، تو وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر، اور (کتنے ہی) کنویں بے کار، اور (کتنے ہی) مضبوط محل (ویران پڑے ہوئے ہیں!)۔ کیا پھر وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے، یا کان (ہوتے) جن سے وہ سنتے، پس بے شک قصہ یہ ہے کہ (ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔'' اور اسی لیے یہاں یہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ﴾ یعنی بے شک ان لوگوں کے جانے اور ہلاک ہونے میں اور اس عذاب کے نازل ہونے میں جو اُن کی تکذیب کی وجہ سے ان پر نازل ہوا اور ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے تھے، ان کے نجات پانے میں البتہ نشانیاں ہیں اور عبرتیں اور وعظ و نصیحتیں ہیں اور ایسے دلائل ہیں جو متناظرہ ہیں۔

﴿ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ پھر کیا وہ اگلوں کی خبریں نہیں سنتے کہ ان کا کیسا حال ہوا۔ پھر جو اللہ پاک کا اپنی مخلوق پر پانی کے بھیجنے میں لطف و احسان ہے، اب اس کا بیان فرماتا ہے۔ ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴾ پانی کا بھیجنا یا تو آسمان سے ہے، یا سَیح سے۔ سَیح وہ پانی ہے جس کو نہریں ندیاں اٹھاتی ہیں اور اپنے وقت میں وہ پہاڑوں سے اس زمین کی طرف اترتا ہے، جو اس کی محتاج ہے، اسی لیے ﴿ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ ﴾ فرمایا ہے۔ ''جُرُز'' وہ زمین ہے جس میں روئیدگی نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ﴾ [الکھف: ٨] ''اور جو کچھ اس (زمین) پر ہے، بلاشبہ یقیناً ہم اسے چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔'' ''أَيْ: يَبَسًا لَا تُنْبِتُ شَيْئًا'' یعنی خشک زمین جو کسی چیز کو نہیں اُگاتی۔

''ارضِ جرز'' سے مراد صرف زمینِ مصر ہی نہیں ہے، بلکہ بعض زمین مقصود ہے، اگرچہ بہت سے مفسروں نے اسی کی مثال دی ہے تو صرف وہی مقصود نہیں ہے، لیکن اس آیت سے قطعاً وہ مراد ہے، اس لیے کہ مصر کی زمین اپنی ذات میں ارضِ رخوہ غلیظہ ہے، یعنی مسترخی ڈھیلی سطبر زمین ہے، کچھ پانی کی محتاج ہے۔ اگر بارش ہو اور پانی اس پر پڑے تو اس کے مکانات ڈھے جائیں، اس لیے اللہ پاک دریائے نیل کو پانی کی اس زیادتی کے ساتھ جو اسے بلادِ حبشہ کی بارشوں سے حاصل ہوتی ہے، اس کی طرف ہانک لاتا ہے اور اس پانی میں سرخ مٹی ہوتی ہے، پھر وہ مصر کی زمین کو ڈھانک لیتا ہے۔ یہ زمین شورہ ناک ریتلی ہے، اس پانی کی اور اس مٹی کی بھی محتاج ہے، تاکہ اس میں کھیتی اُگے۔ چنانچہ وہ ہر سال اس نئے پانی کی وجہ سے پیداواری آمدنی حاصل کرتے ہیں، جو کسی اور جگہ پر برسایا گیا اور اس نئی مٹی

کی وجہ سے جو کسی اور زمین کی مٹی ہے۔ فسبحن الحکیم الکریم المنان المحمود أبدا.

امام ابن لہیعہ رحمہ اللہ قیس بن حجاج سے روایت کرتے ہیں اور وہ اس شخص سے جس نے ان کو حدیث کی، کہا کہ جب مصر فتح ہوا تو اہلِ مصر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، اس وقت کہ ماہ بؤنہ داخل ہوا (یہ عجم کے مہینوں سے ایک مہینے کا نام ہے) تو کہا: اے امیر! ہمارے اس نیل کی ایک رسم ہے کہ اس کے بغیر یہ جاری نہیں ہوتا، فرمایا: وہ کیا ہے؟ کہا: جس وقت اس مہینے کی بارہ راتیں گزر جاتی ہیں تو ہم ایک کنواری لڑکی کی طرف قصد کرتے ہیں، جو اپنے ماں باپ کے پاس ہوتی ہے، پھر ہم اس کے ماں باپ کو راضی کرتے ہیں اور اس کو بہتر سے بہتر زیور اور لباس پہناتے ہیں۔ پھر اس کو اس نیل میں ڈال دیتے ہیں۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ کام اسلام میں ہرگز نہیں ہوتا، اسلام تو ہر اس شے کو ہدم کرتا ہے، یعنی گراتا ہے جو اس سے پہلے تھی۔ پھر وہ بؤنہ کا پورا مہینا ٹھہرے رہے اور نیل اس وقت بہتا نہ تھا، یہاں تک کہ انھوں نے وطن کو چھوڑنے کا ارادہ کیا، چنانچہ عمرو رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ قصہ لکھ بھیجا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ جواب لکھا: "إِنَّكَ قَدْ أَصَبْتَ بِالَّذِيْ فَعَلْتَ" یعنی جو کام تو نے کیا خوب ہی کیا۔ میں نے اپنے خط کے ساتھ ایک رقعہ تیری طرف بھیجا ہے تو اس کو نیل میں ڈال دینا۔ پھر اُن کا خط آیا تو سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے اس کو لیا، پھر اس کو کھولا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا: "مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ عُمَرَ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِلٰى نِيْلِ أَهْلِ مِصْرَ أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّكَ إِنْ كُنْتَ إِنَّمَا تَجْرِ مِنْ قَبْلِكَ فَلَا تَجْرِ وَإِنْ كَانَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ هُوَ الَّذِيْ يُجْرِيْكَ فَنَسْأَلُ اللّٰهَ أَنْ يُّجْرِيَكَ" یعنی اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی طرف سے اہلِ مصر کے نیل کے لیے، بے شک تو جو ہے سو اگر اپنی ہی طرف سے بہتا تھا تو تو مت بہہ، اور اگر اللہ اکیلا زبردست ہی تجھ کو بہاتا ہے تو ہم اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تجھے جاری کر دے۔ کہا: اس رقعہ کو نیل میں ڈال دیا تو شنبے کے دن صبح کو اٹھے، اس حال میں کہ اللہ پاک نے ایک رات میں سولہ گز نیل کو جاری کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ مصر سے وہ رسم ختم کر دی، یہ آج کے دن تک ہے۔[1] (رواہ الحافظ أبو القاسم اللالکائي الطبري في کتاب السنة له)

اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ ﴾ جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسٰنُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴾ [عبس: ٢٤۔ ٣٢] "چنانچہ انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے۔ بے شک ہم نے خوب مینہ برسایا۔ پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا۔ پھر ہم نے اس میں سے اناج اُگایا۔ اور انگور اور سبزیاں۔ اور زیتون اور کھجوریں۔ اور گھنے باغات۔ اور میوے اور چارا۔ (جو) تمھارے اور تمھارے جانوروں کے لیے سامانِ زندگی (ہے)۔" اور اسی لیے اس جگہ فرمایا ہے: ﴿ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴾

[1] کرامات الأولیاء (١/ ١١٩۔ ١٢٠)

امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے عن رجل عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ''ارضِ جرز'' کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ یہ وہ زمین ہے جس پر مینہ برسایا نہیں جاتا، مگر اتنا جو اس کو کافی نہیں ہوتا، مگر وہ سیلیں (سیلاب) جو اس پر آتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے مروی ہے کہ یہ یمن میں ایک زمین ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: یمن اور شام کے درمیان دیہات ہیں۔ امام عکرمہ، ضحاک، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ارضِ جرز'' وہ ہے جس میں کسی طرح کی روئیدگی نہیں ہے اور غبار دار ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴾[2] [یٰسٓ: ۳۳۔ ۳۴] ''اور ان کے لیے مردہ زمین ایک (عظیم) نشانی ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس سے (اناج کا) دانہ نکالا، پھر وہ اسی سے کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کیے اور ہم نے ان میں چشمے جاری کیے۔''

کفار کا جلد عذاب طلب کرنے کا بیان اور ان کا جواب:

پھر اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ کافر لوگ استبعاد و تکذیب اور عناد کی وجہ سے اللہ سبحانہ کے عذاب، غضب، انتقام اور تکلیف کے واقع ہونے اور ان کو لاحق ہونے کی جلدی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کب ہے یہ فتح؟ یعنی اے محمد! تو ہم پر کب مدد دیا جائے گا، جس طرح کہ تو زعم کرتا ہے کہ تیرے لیے ایک وقت ہے، جس میں ہم پر تیری نصرت کی جائے گی اور تیرے لیے ہم سے انتقام لیا جائے گا، پس یہ کب ہو گا؟ ہم تو تجھے اور تیرے اصحاب کو نہیں دیکھتے، مگر چھپے ہوئے اور ڈرے ہوئے ذلیل۔

اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِيْمَانُهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ فتح کے دن، یعنی جس وقت تم پر اللہ پاک کا عذاب اور غصہ اور غضب دنیا اور آخرت میں نازل ہو گا تو ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا ان کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا اور نہ ہی ان کو مہلت ملے گی۔ جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴾ [المؤمن: ۸۳۔ ۸۴] ''پھر جب ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے تو وہ اس (جھوٹے) علم پر اِتراتے رہے جو اُن کے پاس تھا، اور انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ چناں چہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا

[1] تفسير الطبري (۲۰/ ۱۹۷) تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۳۱۱۱)
[2] تفسير ابن كثير (۳/ ۶۰۸)

تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔''

اور جس شخص نے یہ خیال کیا کہ اس فتح سے مراد فتح مکہ ہے تو اس نے بہت دور کی بات کی اور خطا کی اور بڑی غلطی کی، کیوں کہ فتح مکہ کے دن تو رسول اللہ ﷺ نے ''طُلَقَاء'' کا اسلام قبول فرمایا، یہ لوگ قریباً دو ہزار لوگ تھے۔ اگر فتح مکہ مراد ہوتی تو آپ ان کا اسلام قبول نہ فرماتے، اسی آیت کی رو سے کہ ﴿ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ اس فتح سے مراد صرف قضا اور فصل ہے، اس آیتِ کریمہ کی طرح: ﴿ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۱۱۸] ''لہٰذا تو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما اور مجھے اور جو میرے ہمراہ مومن ہیں ان کو نجات دے۔''

نیز اس آیت کی طرح ﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾ [سبأ: ۲۶] ''کہہ دیجیے: ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا، پھر وہ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' اور اس آیت کی طرح: ﴿ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴾ [إبراهيم: ۱۵] ''اور انھوں نے فتح مانگی اور ہر سرکش، عناد رکھنے والا ناکام ہوا۔'' اور اس آیت کی طرح: ﴿ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [البقرة: ۸۹] ''اور اس سے پہلے وہ ان لوگوں کے خلاف فتح مانگتے تھے، جنھوں نے کفر کیا۔'' اور اس آیت کی طرح: ﴿ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ﴾ [الأنفال: ۱۹] ''(کافروں سے کہہ دیجیے:) اگر تم فیصلہ مانگتے تھے تو فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا۔''

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴾ یعنی تو ان مشرکوں سے اعراض کر اور جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے تیرے رب کی طرف سے تو اس کو پہنچا دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ۱۰۶] ''(اے نبی!) آپ اس وحی کی پیروی کریں جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے (نازل) کی جاتی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکین کی طرف دھیان نہ دیں۔'' اور انتظار کر، کیوں کہ اللہ نے جس بات کا تجھ سے وعدہ کیا ہے وہ عن قریب تیرے لیے اس کو پورا کر دے گا اور تیرے مخالفوں پر تجھ کو کامیابی عطا فرمائے گا اور مدد فرمائے گا، کیوں کہ بے شک وہ وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴾ یعنی تو منتظر ہے اور وہ بھی تم پر گردشیں اور حادثات نازل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴾ [الطور: ۳۰] ''کیا وہ (کافر) کہتے ہیں: (یہ نبی) شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں حوادثِ زمانہ (موت) کا انتظار کر رہے ہیں؟'' اور عن قریب تو ان پر اپنے صبر کرنے کا انجام دیکھ لے گا اور تو اللہ تعالیٰ کی رسالت ادا کرنے پر اپنی نصرت اور تائید کو پا لے گا اور وہ عن قریب اس

شے کی نذر کو پالیں گے، جس کا وہ تیرے حق میں اور تیرے اصحاب کے حق میں انتظار کر رہے ہیں، یعنی ان پر اللہ کا سخت عذاب اور عقاب نازل ہوگا۔ وحسبنا الله و نعم الوكيل. آخر تفسير سورة السجدة و لله الحمد والمنة.[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ہمزۂ استفہام انکار کے لیے ہے اور حرفِ واؤ عطف کے لیے ہے فعل مقدر پر جو مقام کا تقاضا ہے۔ اور "يَهْدِيْ" بہ معنی "يَتَبَيَّنُ" ہے "أَيْ: أَغَفَلُوْا وَلَمْ يَتَبَيَّنْ لَهُمْ" اور "يَهْدِ" کا فاعل وہ ہے جس پر ﴿ كَمْ اَهْلَكْنَا ﴾ دال ہے۔ "أَيْ: كَثْرَةُ إِهْلَاكِنَا"۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موضع رفع ہے "يَهْدِ" سے، یعنی اس کا فاعل ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فاعل "هدٰى" ہے، جس پر "يَهْدِ" سے دلالت کی گئی ہے: "أَيْ: أَوَ لَمْ يَهْدِ لَهُمُ الْهُدٰى"

﴿ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ حال ہے ﴿ مِنَ الْقُرُوْنِ ﴾ سے اور ﴿ مِنَ الْقُرُوْنِ ﴾ بیان ہے ﴿ كَمْ ﴾ کا۔ "قُرُوْنٌ" سے مراد اگلی امتیں ہیں، جیسے: قومِ عاد، ثمود اور لوط وغیرہم۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے: "کم" موضع نصب میں ہے ﴿ اَهْلَكْنَا ﴾ سے، یعنی اس کا مفعول ہے۔ جمہور نے "يَهْدِ" بہ فتح یائے تحتیہ پڑھا ہے اور سلمی اور قتادہ نے اور ابو زید نے عن یعقوب بہ نون پڑھا ہے۔ یہ قراءت واضح ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قراءت یائے تحتیہ میں اشکال ہے، کیوں کہ کہتے ہیں کہ فعل فاعل سے خالی نہیں ہوتا۔ پس "یهد" کا فاعل کہاں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فاعل وہ ہے جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں،[2] معنی یہ ہیں: کیا مکے والے غافل ہوگئے اور انھیں ہمارا اُمتوں کو کثرت سے ہلاک کرنا ظاہر نہیں ہوا، حالاں کہ وہ اُمتیں تو پہلے گزر چکی ہیں۔ یا یہ معنی ہیں: کیا ہمارا بہت سی اُمتوں کو، جو اُن سے پہلے تھیں، ہلاک کرنا ان پر ظاہر نہیں ہوا۔ یا کیا ہم نے ان کے لیے ظاہر نہیں کر دیا کہ ہم نے بہت سی امتوں کو جو اُن سے پہلے گزر چکی ہیں، ہلاک کر دیا تھا۔

جملہ ﴿ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ﴾ حال ہے ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر سے، یعنی کیا ظاہر نہیں ہوا ان کو حالانکہ وہ چلتے پھرتے ہیں ان مکانوں میں جو ہلاک شدہ لوگوں کے ہوا کرتے تھے اور ان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان میں جو عبرتیں اور عذاب کی نشانیاں ہیں ان کو دیکھتے ہیں اور اس سے عبرت نہیں پکڑتے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ يَمْشُوْنَ ﴾ کی ضمیر ہلاک کردہ شدہ لوگوں کی طرف راجع ہے، یعنی ہم نے ان کو ہلاک کیا اس حال میں کہ وہ اپنے مکانوں میں چل پھر رہے تھے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے، جو وجۂ ہدایت کے بیان کرنے کے لیے

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٠٧۔ ٦٠٩)

[2] تفسير القرطبي (١٤/ ١٠٩) فتح القدير (٤/ ٣٣٨۔ ٣٣٩)

لایا گیا ہے، یعنی مکے والوں کو اگلی اُمتوں کا ہلاک ہونا ضرور ظاہر ہو گیا ہے، کیوں کہ یہ جو تجارت کے لیے سفر کیا کرتے ہیں، اس میں ان قوموں کے دیار اور بلاد پر گزرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اجڑے پڑے ہیں۔ ان میں کسی رہنے بسنے والے کا اتا پتا نہیں ہے۔

﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ ﴾ یعنی یہ کثرت سے ہمارا اگلی امتوں کو ہلاک کرنا جس کا ذکر ہوا اس میں بے شک البتہ بڑی نشانیاں ہیں، کیا پھر ان کو سنتے نہیں ہیں اور ان سے نصیحت پذیر نہیں ہوتے۔ چونکہ اہلِ مکہ بعث کے منکر تھے اس لیے اللہ پاک نے اپنی ایک بڑی قدرت و منت بیان کی جس میں بعث پر ظاہری دلیل ہے۔ یہ خیال نہ کریں کہ اگلے لوگوں نے جو تکذیب کی تو وہ ہلاک ہو گئے بلا سے ہلاک ہو گئے بعث تو ہے نہیں کہ اس کی کچھ پوچھ پاچھ ہو، اول تو عذاب آنا نہیں ہے، بالفرض اگر آیا بھی تو اگلوں کی طرح ہم بھی ہلاک ہو جائیں گے، مٹی میں رل مل جائیں گے، پھر کچھ کسی طرح کی پوچھ گچھ نہ ہو گی، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ... الآیۃ ﴾ یعنی یہ خیال باطل ہے، اللہ سبحانہ بڑی قدرت والا ہے اور بڑا منعم و محسن ہے، بعث ضرور ہونا ہے، اس کے بعد حساب و کتاب ہو گا، ہر ایک کو پوری پوری جزا سزا ملے گی، تم کو تو چاہیے کہ اس کی نعمتوں کا شکر کر کے اس کی توحید کرو، شرک سے باز آؤ اور بعث کا اقرار کرو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا وہ بعث کے منکر ہوئے اور انھوں نے ہماری اس بڑی قدرت و منت کو نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک اور بغیر سبزہ کے زمین کی طرف ہانک لاتے ہیں، پھر اس پانی کے سبب سے کھیتی نکالتے ہیں، جس سے ان کے چوپائے کھاتے ہیں، جیسے: گھاس، چارہ اور پتے اور دانے جو مخصوص جانوروں کے کھانے کے لیے ہیں اور اسی طرح کی وہ چیزیں جن کو آدمی کھاتے ہیں۔ ﴿ وَاَنْفُسُهُمْ ﴾ یعنی اور وہ خود کھاتے ہیں دانوں سے اور میووں سے اور اقوات سے جو کھیتی سے نکلتے ہیں، ان چیزوں میں سے جو ان کی غذا ہوتی ہے۔ ''ارضِ جرز'' سے مراد وہ زمین ہے جو اس کی طرف پانی لائے بغیر کچھ نہیں اُگاتی۔ کسی نے کہا: زمینِ یابس (خشک) ہے۔ ''جُرُز'' کی اصل جرز سے ہے۔ ''جرز'' قطع کو کہتے ہیں، یعنی وہ زمین جس کی روئیدگی پانی نہ ہونے کی وجہ سے پارہ پارہ ہو گئی اور بالکل زائل کر دی گئی اور جرز اس زمین کو نہیں کہتے جو اصلاً اُگاتی ہی نہیں ہے۔ جیسے: سباخ، یعنی شورہ ناک، اس لیے کہ بعد میں اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا ﴾ غرض یہ ہے کہ پانی کے بعد اس میں روئیدگی اُگتی ہے اور شورہ زار میں بالکل روئیدگی نہیں اُگتی تو معلوم ہوا کہ شورہ زار مراد نہیں ہے۔ زمینِ شور کے بارے میں شیخ شیراز رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ؎

زمین شور سنبل بر نیارد   درو تخم و عمل ضائع مگردان

''شوریلی زمین سنبل کو نہیں اُگاتی۔ اس میں محنت اور بیج کو ضائع نہ کر۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ یمن میں ایک زمین ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسناد صحیح ہے، اس میں کسی طرح کا مطعن نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ "ابین" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عدن کی زمین ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ عطشا زمین ہے، یعنی زمینِ تشنہ۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: وہ زمین ہے جس میں کچھ نبات نہیں ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا: وہ جو کسی شے کو نہیں اُگاتی۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: یہ بعید ہے کہ جرز کسی خاص زمین کے لیے ہو، اس وجہ سے کہ اس پر الف لام داخل کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا: عرب کے اس قول سے مشتق ہے کہ "رَجُلٌ جَرُوْزٌ" جبکہ باقی نہ چھوڑے کسی شے کو مگر اسے کھالے۔ اسی طرح ناقۃ جروز ہے، جبکہ کھالے ہر شے کو جس کو پائے، اس معنی سے راجز کا قول ہے: ؎

خِبٌّ جَرُوْزٌ وَإِذَا جَاعَ بَكٰى وَيَأْكُلُ التَّمْرَ وَلَا يُلْقِي النَّوٰى

بخیل کا وصف کرتا ہے کہ بڑا بخیل اور دلدر کھاؤ ہے کہ شے کو بالکل کھا لیتا ہے، کچھ باقی نہیں چھوڑتا اور جب بھوکا ہوتا ہے تو روتا ہے اور کھجوریں کھاتا ہے اور گٹھلیاں نہیں ڈالتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نیل کی زمین ہے،[1] اس لیے کہ اس میں تو ہر سال پانی آتا ہے۔ جملہ ﴿ تَاْكُلُ ﴾ حال ہونے کی بنا پر موضع نصب میں ہے۔ انعام کا ذکر پہلے کیا، کیوں کہ انعام کا نفع لینا نبات پر منحصر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انعام کا نبات سے کھانا مقدم ہے، کیوں کہ وہ تو اس کو اس کے پھل لانے سے پہلے کھاتے ہیں اور خوشہ نکلنے سے پہلے کھاتے ہیں۔

﴿ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر ان نعمتوں کو دیکھتے نہیں ہیں اور منعمِ حقیقی کا شکر نہیں کرتے اور اس کی توحید نہیں کرتے، اس لیے کہ ان ساری اشیاء کا موجد تنہا وہی ہے، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہاں فاصلہ ﴿ يُبْصِرُوْنَ ﴾ ٹھہرایا گیا، اس لیے کہ کھیتی دکھائی دیتی ہے تو اس کے مناسب حال دیکھنا ہے اور پہلی آیت میں ﴿ يَسْمَعُوْنَ ﴾ فرمایا، اس لیے کہ اس میں سنی جانے والی شے کا ذکر ہے، تو اس کے مناسب حال سننا ہے، یا وعظ قبول کرنے میں بطور مبالغہ نصیحت کرنے کے لیے اور عذر کو دور کرنے کے لیے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کے واسطے اس کو ذکر کیا۔

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ ﴾ اس قول کے کہنے والے عام طور پر کفار ہیں، یا خاص طور پر کفارِ مکہ ہیں، یا تکذیب اور استہزا کے طور پر جلدی مچاتے ہوئے کہتے ہیں، کب ہے یہ فتح جس کا تو ہم کو وعدہ دیتا ہے۔ فتح سے ان کی مراد بندوں کے درمیان قضا اور فیصلہ ہے اور یہ روزِ بعث ہے جس میں اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ (قالہ مجاھد وغیرہ) امام فراء اور قتیبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد فتح مکہ ہے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصحابِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے کہا کہ ہمارے لیے ایک دن ہے جس میں ہم تنعم کریں گے اور راحت و آرام پائیں گے اور اللہ قیامت کے دن ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اس پر کفار نے کہا ہے کہ یہ فتح کب ہے؟[3] امام سدی رحمہ اللہ نے

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٠٩۔ ١١٠) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ١١٠) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ١٩٨)

کہا ہے کہ مراد روزِ بدر ہے، اس لیے کہ اصحابِ نبی اکرم ﷺ کفار سے کہا کرتے تھے کہ بے شک اللہ ہمارا ناصر ہے اور ہم کو تم پر غالب کرنے والا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ بدر کے دن نبی اکرم ﷺ کے واسطے فتح دی گئی تو ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا ان کے موت کے بعد ایمان نے کچھ فائدہ نہ دیا۔[2] کلمۂ ﴿ مَتٰى ﴾ موضع رفع میں ہے یا موضع نصب میں بنابر ظرفیت۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم اس بات میں سچے ہو جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ مومنین منصور ہوں گے اور کافرین پر ان کا غلبہ ہوگا تو یہ فتح کب ہوگی۔ اس سے ان کی غرض استہزاء ہے، یعنی یہ ہونا نہیں ہے۔ صرف بات ہی بات ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو یہ جواب دیں: ﴿ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ﴿ يَوْمَ الْفَتْحِ ﴾ سے روزِ قیامت مراد ہے جو مومنین اور ان کے دشمنوں کے درمیان فیصلے کا دن ہے، اس لیے کہ فتح مکہ کا دن اور بدر کا دن، دونوں اس قبیل سے ہیں، جس میں ایمان نفع دیتا ہے۔ فتح کے دن مکے والے مسلمان ہوگئے اور نبی اکرم ﷺ نے ان سے اسلام قبول فرما لیا، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس دن ان سے ایمان قبول نہ ہوگا۔ رہی یہ بات کہ ان کے ظاہر سوال پر جواب کی تطبیق نہ کی، اس سے اعراض کیا اور ایسے وقت میں ایمان کے بے فائدہ ہونے کا ذکر کیا؟ تو اس سے غرض یہ بتانا ہے کہ جو بات انھوں نے پوچھی ہے، وہ پوچھنے کے قابل نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو ظاہر امر ہے بیان کرنے کی محتاج تو یہی بات ہے کہ اس دن ان کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔ گویا یوں کہا کہ تم جلدی مت کرو، گویا میں ابھی تمھارے پاس موجود ہوں کہ تم ایمان لے آئے تو تمھارے ایمان نے تم کو نفع نہ دیا اور تم نے مہلت طلب کی تو تم کو مہلت نہ ملی۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر یہ آیت عام ہے، ان لوگوں کے لیے جو استہزاء نہیں کرتے تو پھر یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہوگی اور اگر ان کے ساتھ خاص ہے تو یوں کہنا چاہیے تھا: "فَلَا يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ" تو یوں نہ کہا، بلکہ اضمار کی جگہ میں اظہار کیا، یعنی ﴿ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾ کہا، اس کی یہ وجہ ہے کہ ان پر کفر کی تسجیل کرنا ہے، یعنی کفر کی مُہر و سکّہ کرنا ہے ان پر اور ان کو فائدہ نہ دینے اور مہلت نہ دینے کی علت بیان کرنا ہے، وہ علت یہی ان کا کفر ہے۔ محی الدین شیخ زادہ رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ قولہ: ﴿ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ ﴾ یہ اس تقدیر پر ظاہر ہے کہ ﴿ يَوْمَ الْفَتْحِ ﴾ سے ﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ مراد لیا جائے، کیوں کہ ایمان مقبول وہی ہے، جو دارِ دنیا میں ہوتا ہے اور اس سے خارج ہونے کے بعد مقبول نہیں ہے۔

﴿ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے دنیا کی طرف لوٹائے جانے کی، تاکہ ایمان لائیں۔

---

[1] تفسير البغوي (٦/ ٣١٠) [2] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٤٩)

اور جس نے ﴿ يَوْمَ الْفَتْحِ ﴾ کو یومِ فتح مکہ یا روزِ بدر پر محمول کیا ہے تو اس نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ منکروں کو ان کا اس وقت کا ایمان کوئی فائدہ نہ دے گا، جس وقت کہ ان پر عذاب آجائے اور وہ قتل کیے جائیں، کیوں کہ ایسا ایمان ایک اضطراری ایمان ہے، جو حالتِ قتل میں لایا گیا ہے۔ ﴿ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ اور نہ وہ عذاب کی تاخیر کے ساتھ مہلت دیے جائیں گے۔ جب مکہ فتح ہوگیا تو بنی کنانہ کی ایک قوم بھاگی، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کا پیچھا کیا اور ان سے جا ملے تو انھوں نے اسلام کا اظہار کیا۔ خالد نے ان سے اسلام قبول نہ کیا اور ان کو قتل کر ڈالا، پس یہ اللہ پاک کا وہ قول ہے: ﴿ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِيْمَانُهُمْ ﴾ انتہی۔ ﴿ يَوْمَ الْفَتْحِ ﴾ منصوب ہے ظرفیت کی بنا پر اور امام فراء رحمہ اللہ نے رفع بھی جائز رکھا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴾ یعنی تو ان کی کم فہمی اور حماقت اور کم عقلی اور ان کی تکذیب سے اعراض کر اور ان کو جواب مت دے، مگر وہ جواب جس کا تجھ کو حکم ہے اور روزِ فتح کا، یعنی روزِ قیامت کا یا قتل کے ساتھ ان کی ہلاکت کے دن کا انتظار کر اور میرے وعدے کا انتظار کر جو میں نے ان پر تیرے منصور ہونے اور غالب ہو جانے کا کیا ہے۔ بے شک وہ بھی موت یا قتل کے ذریعے تمھاری ہلاکت کے منتظر ہیں، تاکہ تم سے راحت پائیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ تو ان پر ہمارے عذاب کا انتظار کر، پس وہ بھی اس کے منتظر ہیں۔ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے، اس قول کو خازن نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ منسوخ نہیں ہے،[2] اس لیے کہ اعراض کبھی قتال کے حکم کے ساتھ بھی واقع ہوتا ہے۔ امام ابن سمیفع رحمہ اللہ نے ﴿ مُنْتَظَرُوْنَ ﴾ کو بہ فتحِ ظائے معجمہ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ یہ قراءت مجاہد اور ابن محیصن رحمہما اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے مگر اضمار سے، یعنی "مُنْتَظِرٌ بِهِمْ" امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح کسرہ کے ساتھ ہے، یعنی تو انتظار کر ان کے عذاب کا، وہ منتظر ہیں تیری ہلاکت کے۔[3]

هذا آخر تفسير سورة السجدة. الحمد لله والمنة کہ یہ تفسیر مسمی بحسن النجدہ فی تفسیر سورۃ السجدہ بتاریخ بست ونہم ماہ ذی الحجہ ۱۳۱۱ ہجری روز چہار شنبہ وقت دو بجے شب سی ام ماہ ذی الحجہ محلہ امیر گنج شاہجہان آباد میں خاکسار ذوالفقار نقوی سارنفوری بھوپالی کے ہاتھ پر تمام ہوئی۔ الٰہی سیدی مولائی جس طرح تو نے اپنے فضل و کرم سے اتنی لکھوا دی، اسی طرح بعافیتِ تمام آیندہ لکھنے کی توفیق دے اور اس کو خاص اپنی ذات کے واسطے ٹھہرا اور مجھے اور ساری اولاد و احباب اور مومنین و مومنات کو اس سے نفع دے اور ہمارے دینی دنیاوی سارے مطالب اس کی برکت سے پورے کر دے اور حسنِ عمل کی توفیق دے اور دین و دنیا کے اعداء کے شر سے محفوظ رکھ اور افکارِ دنیوی سے اور

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١١١) [2] تفسير الخازن (٥/ ٢٢٨) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ١١١) فتح البيان (١١/ ٣٤۔ ٣٧)

قرض کے ادا سے سبکدوش کر اور جس خیرِ مجسم کی ہمت سے یہ کام ہو رہا ہے، اس کے جان و مال اور اقبال میں برکت دے اور اسے ہمیشہ خوش وخرم وآباد رکھ۔ مکاروں کے مکر سے اور شریروں کی شرارت سے محفوظ رکھ آمین! آمین! آمین!

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلِوَالِدِيْنَا وَلِأَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَأَحْبَابِنَا وَلِجَمِيْعِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ، اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَوَاقِبَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا، وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْبَرْزَخِ وَعَذَابِ الشَّرِّ، وَارْحَمْنَا وَتُبْ عَلَيْنَا وَاجْعَلْنَا مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ لَدَيْكَ وَالْوَاصِلِيْنَ إِلَيْكَ، رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، يَا رَحْمٰنُ يَا رَحِيْمُ يَا كَرِيْمُ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِصَاحِبِ تَرْجُمَانِ الْقُرْآنِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا أَبِي الْوَفَاءِ الصَّدِيْقِ الصِّدِّيْقِ أَعْنِي نَوَابَ سَيِّدَ صِدِّيْقَ حَسَنَ خَانَ صَاحِبَ مَغْفِرَةً ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً لَا تُغَادِرُ ذَنْبًا وَّارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الرَّفِيْقِ الْأَعْلٰى آمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ فَصَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَأَتْبَاعِهِ وَأَشْيَاعِهِ وَذُرِّيَّاتِهِ عَدَدَ مَا عَلِمْتَ وَزِنَةَ مَا عَلِمْتَ وَمِلْأَ مَا عَلِمْتَ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ آمِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ أَوَّلًا وَّآخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ

یہ سورت مبارک مدنی ہے، اس کی تہتر (۷۳) آیتیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ الاحزاب مدینے میں نازل ہوئی ہے۔[1] (أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل من طرق عنه، وأخرج ابن مردويه عن ابن الزبير مثله) زر بن حبیش رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا کہ مجھ سے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: تو سورۃ الاحزاب کو کتنی پڑھتا ہے یا کتنی شمار کرتا ہے؟ تو اس کو میں نے کہا: تہتر (۷۳) آیتیں، پس سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: "أَقَطّ"، یعنی کیا بس اتنی؟ البتہ واقعی میں نے اس کو دیکھا ہے اور بے شک وہ البتہ برابر ہوتی تھی، سورۃ البقرہ کے یا سورۃ البقرہ سے زیادہ اور البتہ مقرر ہم نے اس میں پڑھا ہے: "اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ إِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ" یعنی بیاہا ہوا مرد اور بیاہی ہوئی عورت جس وقت زنا کریں تو ان کو ضرور سنگسار کر دو، اللہ کی طرف سے عذاب کے لیے اور اللہ زبردست اور حکمتوں والا ہے۔

"فَرُفِعَ فِیْمَا رُفِعَ"[2] یعنی پھر جن آیتوں کے الفاظ اٹھا لیے گئے ان میں اس کے لفظ بھی اٹھا لیے گئے۔

(أخرجه عبدالرزاق في المصنف، والطيالسي وسعيد بن منصور وعبد الله بن أحمد في زوائد المسند، وابن منيع والنسائي وابن المنذر و ابن الأنباري في المصاحف، والدارقطني في الأفراد، والحاكم وصححه ابن مردويه والضياء في المختارة عن زر) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو امام احمد کی تخریج سے "عن عاصم بن بهدلة عن زر" ذکر کیا ہے۔ پھر کہا ہے: "ورواه النسائي من وجه آخر عن عاصم وهو ابن أبي النجود وهو أبو بهدلة به وهذا إسناد حسن وهو يقتضي أنه قد كان فيها قرآن ثم نسخ لفظه وحكمه أيضا والله أعلم"[3] انتہی۔

امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ وغیرہما نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خطبہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ پھر اللہ کی حمد و ثنا کی۔ پھر کہا: اما بعد! اے لوگو! بے شک اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٥٥٨)

[2] مصنف عبد الرزاق (٣/ ٣٦٥) مسند الطيالسي (١/ ٧٣) مسند أحمد (٥/ ١٣٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٢٧١) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٥٠) الدر المنثور (٦/ ٥٥٨)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٠٩)

ساتھ بھیجا اور اُن پر کتاب اتاری، تو جو اُن پر نازل کیا، اس میں رجم کی آیت تھی، چنانچہ ہم نے اس کو پڑھا اور اس کو یاد رکھا: ''اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا'' اور البتہ رجم کیا رسول اللہ ﷺ نے اور ان کے بعد ہم نے بھی رجم کیا، اب مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ دراز گزر جائے تو کوئی کہنے والا یہ کہے کہ ہم رجم کی آیت اللہ کی کتاب میں نہیں پاتے، تو لوگ ایک فریضہ جس کو اللہ نے نازل کیا ہے اس کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں۔ [1]

(وقد روي عنه نحو هذا من طرق)

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ تم سورۃ الاحزاب کو کتنی شمار کرتے ہو؟ میں نے کہا: بہتر (۷۲) یا تہتر (۷۳) آیتیں، فرمایا: بے شک وہ البتہ سورۃ البقرہ کے قریب ہوتی تھی اور بے شک اس میں البتہ رجم کی آیت تھی۔ [2] (أخرجه ابن مردويه) امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ پر سورۃ الاحزاب پڑھی۔ پھر میں اس میں سے ستر آیتیں بھول گیا، میں نے ان کو نہ پایا۔ [3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ام المومنین سے مروی ہے کہ سورۃ الاحزاب نبی اکرم ﷺ کے وقت میں دو سو آیتوں کی پڑھی جاتی تھی۔ پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف لکھے تو انھیں قدرت نہ ہوئی لکھنے کی، مگر اب جو کچھ سورۃ الاحزاب میں ہے۔ [4] (أخرجه أبو عبيد في الفضائل و ابن الأنباري و ابن مردويه) علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور وہ بات جو نقل کی جاتی ہے کہ وہ ایک صحیفے میں زیادتی تھی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں جس کو گھر کی پلی ہوئی بکری کھا گئی، سو یہ بات ملحدین اور رافضیوں کی تالیفات سے ہے۔ [5] انتہٰی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

''شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ اے نبی! اللہ سے ڈرتے رہیے اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجیے، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (1) اور اس کی اتباع کیجیے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کی جاتی ہے، بے شک تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُس سے خوب باخبر ہے (2) اور آپ اللہ پر توکل کیجیے اور اللہ بطورِ کارساز کافی ہے (3)

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩١) [2] الدر المنثور (٦/ ٥٥٩)
[3] التاريخ الكبير (٤/ ٢٤١) [4] الدر المنثور (٦/ ٥٦٠) [5] تفسير النسفي (٣/ ٢٩٤)

اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے اور کفار کے مقابلے میں ڈٹ جانے کا حکم:

کافر اپنی طرف نرم کرنا چاہتے تھے اور منافق اپنی چال سکھانا چاہتے تھے اور پیغمبر کو اللہ پاک پر بھروسا ہے، اس سے زیادہ دانا کون ہے۔ انتہٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تنبیہ ہے ادنیٰ کو اعلیٰ کے ساتھ، کیوں کہ جب اللہ پاک اپنے بندے اور رسول کریم ﷺ کو تقوے کا حکم فرمائے تو جو کوئی آپ سے رتبے میں کم ہے تو وہ تو بطریقِ اولیٰ و احریٰ اس حکم کی بجا آوری کرے۔ طلق بن حبیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کے نور کے ساتھ اللہ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرے اور اللہ کے ثواب کی امید رکھے اور معصیت کے کاموں کو اللہ کی عطا کردہ ہدایت کی روشنی میں، اللہ کے عذاب کے خوف سے چھوڑ دے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ﴾ یعنی کافروں اور منافقوں کی بات مت سن اور نہ ان سے مشورہ لے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک اس کا بڑا مستحق ہے کہ تو اس کے حکموں کی پیروی کرے اور اس کا مطیع ہو، کیوں کہ وہ تو امور کے انجام کو خوب جانتا ہے اور اپنے اقوال و افعال میں حکمتوں والا ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا: ﴿وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ یعنی تو اس شے کی پیروی کر جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف وحی کی گئی ہے۔ مراد کتاب و سنت ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾ یعنی اللہ پاک کو تمھارے کاموں کی خوب خبر ہے، کیوں کہ اس سے تو کوئی مخفی شے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ تم جو کتاب و سنت کے مطابق عمل کرو گے تو اس کو اس کی خوب خبر ہے، تم کو وہ اجر و ثواب دے گا۔ ﴿وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ یعنی اپنے سارے کاموں میں اور تمام احوال میں اللہ پر بھروسا کر، اللہ کام بنانے والا کافی ہے، اس شخص کے لیے جو اس پر بھروسا کرے اور اس کی طرف رجوع ہو۔ غرض یہ ہے کہ تم تو قرآن و سنت پر چلو اور اللہ پر بھروسا کرو، مخالفوں کی کچھ نہ چلے گی، اللہ تعالیٰ تمھارے سب کام بنا دے گا، تم کو ان پر مظفر اور منصور کر دے گا، یعنی کامیابی عطا فرمائے گا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ نبی کہتے ہیں اللہ کی طرف سے خبر دینے والے کو۔ معنی یہ ہیں کہ اے ہماری طرف سے خبر دینے والے اور اے ہمارے اسرار پر امین بنائے جانے والے اور اے ہمارے خطاب کو دوسروں تک پہنچانے والے! اللہ سے ڈر، یعنی تقویٰ پر ہمیشگی کر اور زیادہ تقویٰ اختیار کر۔ تقویٰ ایک ایسی وسیع و عریض شے ہے،

---

(1) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۶۰۹)

جس کی انتہا معلوم نہیں اور نہ ہی کوئی اس تک پہنچ سکتا ہے، اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ پاک نے خود نبی اکرم ﷺ کو اس کا حکم فرمایا۔ آپ کو جو ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ ﴾ کہہ کر خطاب فرمایا اور ''یا محمد'' نہ کہا، جیسا کہ ''یا آدم'' اور ''یا موسیٰ'' کہا، سو اس سے غرض آپ ﷺ کی عزت اور عظمت کا اظہار ہے اور آپ ﷺ کی فضیلت سے آگاہ کرنا ہے اور ایک جگہ آپ ﷺ کے اسمِ مبارک کی تصریح کر کے ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ فرمایا، تو اس سے مقصود لوگوں کو اس بات کی تعلیم دینا ہے کہ آپ ﷺ رسول اللہ ہیں، تاکہ لوگ آپ ﷺ کو اس لقب سے پکاریں، غرضیکہ پہلے آپ ﷺ کو اپنے تقوے کا حکم دیا۔

پھر فرمایا کہ کافروں کا کہنا مت مان، یعنی مکے والے اور ان کی طرح کے اور لوگ جو کفر پر ہیں، ان کا کہنا مت مان اور منافقوں کا بھی کہنا مت مان۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کو ظاہر کرتے ہیں اور کفر کو چھپاتے ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ سے اللہ پاک کی مراد ابوسفیان، عکرمہ اور ابو الاعور سلمی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ہی نبی اکرم ﷺ سے کہا تھا کہ ہمارے معبودوں کا ذکر چھوڑ دے اور یہ کہہ کہ وہ اپنے عابدوں کے سفارشی ہیں۔ کہا: اور ﴿ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ سے مراد عبداللہ بن ابی اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ہیں۔ ﴿ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ کے معنی ''كَثِيْرُ الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ وَبَلِيْغُ الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ'' ہیں، یعنی اللہ پاک کا علم و حکمت بے حد و حساب ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ جملہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ سے یہ بات بتائی کہ نبی اکرم ﷺ ان کی طرف مائل ہوتے تھے اس لیے کہ ان کو اسلام کی طرف بلانا چاہتے تھے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ عزوجل کو اگر تیرے ان کی طرف جھکنے میں کچھ فائدہ معلوم ہوتا تو تجھے ان سے منع نہ کرتا، کیوں کہ وہ تو بڑی حکمت والا ہے،[1] لیکن یہ بات جو امام نحاس رحمہ اللہ نے خیال کی ہے، اس کا بُعد مخفی نہیں ہے، یہ جملہ تو تمھیں تقویٰ کا حکم دینے اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت سے منع کرنے کی وجہ بیان کرتا ہے۔ یعنی اللہ نے جو تجھے تقویٰ کا حکم دیا اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت سے منع فرمایا تو اس لیے کہ وہ تجھے اسی چیز کا حکم دیتا ہے جس میں کوئی بہتری جانتا ہے اور اسی شے سے منع کرتا ہے جس میں کوئی فساد جانتا ہے، کیوں کہ اس کا علم بہت زیادہ ہے اور اس کی حکمت بہت وسیع ہے۔

پھر وحی کی اتباع کا حکم فرمایا، یعنی قرآن کا۔ یعنی اپنے سارے کاموں میں وحی کا اتباع کر اور اس کے سوا کافروں اور منافقوں کے مشوروں میں سے کسی شے کی پیروی مت کر اور نہ صرف رائے کی پیروی کر، کیوں کہ تیری طرف جس شے کی وحی کی گئی ہے، وہ ان سب چیزوں کو کفایت کرتی ہے، یعنی وہ باقی سب چیزوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ پھر وحی کے اتباع کرنے کے حکم کی وجہ اور تاکید فرمائی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ یعنی تو وحی

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٤٢)

کا اتباع کر، اس لیے کہ اللہ کو تمھارے کاموں کی خوب خبر ہے۔ اور وحی کی اتباع کرنے کا جو نبی اکرم ﷺ کو حکم فرمایا تو یہ بعینہٖ آپ ﷺ کی اُمت کو حکم ہے، چنانچہ جیسے آپ ﷺ کو قرآن کی اتباع کا حکم کیا گیا ہے، ویسے ہی آپ ﷺ کی امت بھی مامور ہے، اسی لیے آپ ﷺ کو خطاب کیا اور جمہور کی تائے فوقیہ والی قراءت کی بنا پر آپ ﷺ کی امت کو اس جملے میں خطاب کیا: ﴿ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾۔ ابوعبیدہ اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے اسی قراءت کو اختیار کیا ہے۔ ابوعمرو، سلمی اور ابن ابی اسحاق رحمہ اللہ نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔[1] اس کی بنا پر ضمیر کافروں اور منافقوں کی طرف راجع ہوگی، یعنی بے شک اللہ کو ان کے مکر وفریب کی اچھی طرح خبر ہے تو وہ ان کو تجھ سے دور کر دے گا۔

پھر اللہ پاک نے توکل کا حکم فرمایا، یعنی تو اس پر اعتماد کر اور اپنے سارے کام اس کے سپرد کر دے۔ ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ حفاظت کرنے والا کافی ہے۔ جو کوئی اس پر بھروسا کرتا ہے تو وہ اس کو محفوظ رکھتا ہے۔ پھر جس وحی کی اتباع کا اللہ پاک نے نبی کریم ﷺ کو امر فرمایا ہے، اس میں سے کچھ احکامِ قرآنی بعد میں بیان فرمائے گا، ان کے لیے تمہید کے طور پر پہلے ایک مثال بیان فرمائی۔[2]

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔ اور تم اپنی جن بیویوں کو ماں کہہ بیٹھتے ہو، انھیں اس (اللہ) نے تمھاری مائیں نہیں بنایا اور نہ اس نے تمھارے لے پالکوں (منہ بولے بیٹوں) کو تمھارے (حقیقی) بیٹے بنایا ہے، یہ تو تمھارے اپنے مونہوں کی باتیں ہیں اور اللہ حق (بات) کہتا ہے، اور وہی (سیدھا) راستہ دکھاتا ہے ④ ان (لے پالکوں) کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارو، اللہ کے نزدیک یہ بہت انصاف کی بات ہے، پھر اگر تمھیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی اور تمھارے دوست ہیں اور اس معاملے میں تم بھول

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١١٤) [2] فتح البيان (١١/ ٤١۔ ٤٢)

چوک جاؤ تو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور لیکن تمھارے دل جس بات کا عزم کر لیں (تو وہ گناہ ہے) اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے ⑤

رسم متبنیٰ کے ابطال کا بیان:

کفر کے وقت کوئی بیوی کو ماں کہہ دیتا تو وہ ساری عمر کے لیے اس سے جدا ہو جاتی اور کسی کو بیٹا بنا لیتا تو وہ اس کا سچا اور حقیقی بیٹا ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں حکم تبدیل کر دیے، بیوی کو ماں کہنے کے بارے میں سورۃ المجادلہ میں بیان آئے گا اور لے پالک کا حکم آگے آ رہا ہے۔ تیسری بات یہ فرما دی کہ ایسی باتیں کہنے کے لیے بہت ہیں، ان پر عمل نہیں ہو سکتا، جیسے مستقل مزاج شخص کو کہتے ہیں کہ اس کے دو دل ہیں، چھاتی چیر کر دیکھیں تو کسی کے دو دل نہیں ہوتے۔ بھول چوک کا گناہ کسی چیز میں نہیں، گناہ تو ارادے کا ہے، اس میں بھی اللہ چاہے تو بخش دے۔ چوک یہ ہے کہ منہ سے نکل گیا فلانی کا بیٹا فلاں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ حقیقی مقصد بیان کرنے سے پہلے ایک امرِ معروف حسی کو تمہید کے طور پر بیان فرماتا ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح ایک مرد کے اندر دو دل نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کی بیوی جس سے وہ "أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّيْ" (تو میرے لیے اس طرح ہے جس طرح میری ماں کی پیٹھ) کہہ کر ظہار کرتا ہے، اس کی ماں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح منہ بولا بیٹا اس کا بیٹا نہیں ہو جاتا، جب وہ اس کو متبنیٰ کرتا ہے اور اپنا بیٹا کہہ کر اس کو پکارتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: ﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ ... الآية ﴾ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴾ [المجادلة: ۲] "تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے "ظِهار" کرتے ہیں، وہ ان کی مائیں نہیں، ان کی مائیں وہی ہیں جنھوں نے انھیں جنا اور بے شک وہ ناگوار بات اور جھوٹ کہتے ہیں اور بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ﴾ نفی سے مقصود یہی قول ہے، کیوں کہ یہ آیت زید بن حارثہ مولائے رسول اللہ ﷺ کے حق میں نازل ہوئی ہے، آپ نے نبوت سے پہلے زید کو اپنا متبنیٰ بنایا تھا، تو وہ زید بن محمد کہلاتے تھے۔ پھر اللہ پاک نے ارادہ کیا کہ اس الحاق اور اس نسبت کو اس آیت کے ساتھ ختم کرے: ﴿ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ﴾ جس طرح کہ اس سورت کے دوران میں فرمایا ہے: ﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴾ اور اس جگہ یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ﴾ یعنی تمھارا ان کو بیٹا بنا لینا ایک منہ کی بات ہے، اس کا مقتضیٰ یہ نہیں ہے کہ وہ حقیقی بیٹا ہو جائے، کیوں کہ وہ تو ایک اور مرد کی پشت سے پیدا کیا گیا ہے، چنانچہ یہ ممکن نہیں کہ اس کے دو باپ ہوں، جس

طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک بشر کے دو دل ہوں، اللہ تعالیٰ حق بات کہتا ہے اور وہی راہ بتاتا ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق عدل کے معنی میں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: سبیل سے مراد صراطِ مستقیم ہے۔ کئی ایک اہلِ علم نے یوں کہا ہے کہ یہ آیت قریش کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کو ذوالقلبین کہتے تھے اور وہ یہ زعم کرتا تھا کہ اس کے دو دل ہیں، ان میں سے ہر ایک میں وافر عقل ہے، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی، تاکہ اس کے زعم کو رد کیا جائے۔

اسی طرح امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور امام مجاہد، عکرمہ، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے قابوس بن ابی ظبیان سے روایت کیا ہے۔ ابو ظبیان کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: آپ مجھے بتائیں کہ اللہ کے اس قول سے کیا مراد ہے: ﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ﴾، فرمایا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کوئی خیال گزرا تو منافقوں نے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، کہا: کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اس کے دو دل ہیں، ایک دل تو تمھارے ساتھ ہے اور ایک دل ان کے ساتھ ہے، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔[2] (وهكذا رواه الترمذي عن عبداللّٰه بن عبدالرحمن الدارمي عن صاعد الحراني عن عبد بن حميد وعن أحمد بن يونس كلاهما عن زهير وهو ابن معاوية ثم قال: وهذا حديث حسن۔ وكذا رواه ابن جرير وابن أبي حاتم من حديث زهير به)

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو معمر نے زہری سے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ یہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے حق میں تھا، اس کے لیے ایک مثال بیان کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک اور مرد کا بیٹا تیرا بیٹا نہیں ہے اور اسی طرح مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے،[3] یہ اس تفسیر کے موافق ہے جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ واللّٰه سبحانهٗ و تعالیٰ أعلم.

متبنّٰی کو اپنے حقیقی باپ ہی کی طرف منسوب کیا جائے:

قولہ عزوجل: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ ابتدائے اسلام میں جو یہ امر جائز تھا کہ اجنبی بیٹوں کو اپنے بیٹے کہہ کر پکارتے تھے تو یہ امر اس کا ناسخ ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ جو ان کے حقیقی

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٠٤_ ٢٠٥)

[2] مسند أحمد (١/ ٢٦٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٩٩) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٠٤) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١١٢) اس کی سند میں ''قابوس بن ابی ظبیان'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٠٥_ ٢٠٦)

باپ ہیں، ان کی طرف ان کے نسب کو پھیرو اور یہ بات عدل، قسط اور بر، یعنی نیکی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مولائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم زید بن محمد ہی کہہ کر پکارتے تھے، یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾[1] (وأخرجه مسلم والترمذي والنسائي من طرق عن موسى بن عقبة به)

متبنٰی بیٹوں سے حقیقی بیٹوں کا معاملہ کیا کرتے تھے ہر وجہ سے، محرم عورتوں کے ساتھ ملنے اور اس کے سوا دوسرے امور میں۔ اسی لیے سہلہ دختر سہیل ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بی بی نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم تو سالم کو بیٹا کہہ کر پکارا کرتے تھے اور اب اللہ نے نازل کیا ہے جو کچھ کہ نازل کیا ہے اور وہ مجھ پر داخل ہوا کرتا تھا اور میں ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے جی میں اس سے کچھ پاتی ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اسے دودھ پلا دے تو تو اس پر حرام ہو جائے گی۔[2] (الحديث) اور اسی لیے جبکہ یہ حکم منسوخ ہوگیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے متبنٰی کی بیوی مباح کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا مطلقۂ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا اور اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ﴾ [الأحزاب: ٣٧] ”تاکہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح) میں کوئی حرج نہ رہے، جب وہ ان سے (اپنی) حاجت پوری کر لیں۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے آیۃ التحریم میں فرمایا: ﴿ وَحَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ﴾ [النساء: ٢٣] ”اور تمھارے صُلبی بیٹوں کی بیویاں۔“ متبنٰی کی بیوی سے احتراز کرنے کے لیے یہ فرمایا، کیوں کہ متبنٰی اس کی صلب سے نہیں ہے۔ رہا رضاعی بیٹا تو وہ شرعی لحاظ سے صلبی بیٹے کے قائم مقام کیا گیا ہے، اس کی دلیل صحیحین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک ہے کہ « حَرِّمُوْا مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ »[3] یعنی رضاعت سے حرام سمجھو اس کو جو نسب سے حرام ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ غیر کو عزت افزائی اور محبت کے طور پر بیٹا کہہ کر پکارنا تو یہ اس قسم سے نہیں ہے جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے اور ترمذی کے سوا دوسرے اہلِ سنن نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ”قَالَ: قَدَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم أُغَيْلِمَةَ بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ عَلٰى حُمُرَاتٍ لَّنَا مِنْ جَمْعٍ، فَجَعَلَ يُلَطِّخُ أَفْخَاذَنَا وَيَقُوْلُ: « أُبَيْنِيَّ لَا تَرْمُوا الْجَمْرَةَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ »“[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٢٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٣) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٥)

[4] مسند أحمد (١/ ٢٣٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٤٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٦٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٢٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (إرواء الغليل: ٤/ ٢٧٦)

قَالَ: أَبُوْ عُبَيْدَةَ وَغَيْرُهُ: أُبَيْنِيَّ تَصْغِيْرُ بَنِيَّ. وَهٰذَا ظَاهِرُ الدَّلَالَةِ، فَإِنَّ هٰذَا كَانَ فِيْ حِجَّةِ الْوَدَاعِ سَنَةَ عَشْرٍ"[1] (أغيلمة بدل من ضمير قدمنا وهو تصغير أغلمة جمع غلام ولم يرد في جمعه أغلمة وإنما جمعه غلمة ويريد بهم الصبيان ولذا صغر.[2] (كذا في مجمع البحار) يلطخ كذا في الأصل بالخاء المعجمة وليس كذلك بل بالحاء المهملة فإن اللطح بالحاء المهملة الضرب بالكف وليس بالشديد.[3] كما في مجمع البحار۔ أبينيّ: قال في مجمع البحار أبيني، قيل: هو تصغير ابني كأعمى و أعيمى و ابني اسم مفرد يدل على الجمع و قيل: إن ابنا يجمع على أبناء مقصورا و ممدودا. أبوعبيد هو تصغير بني جمع ابن مضافا فوزنه شريحى.[4] انتهى .اگر یوں کہیں کہ ہمزہ ندائے قریب کے لیے آتا ہے تو ہمزہ تو ندا کا ہوا اور "بني" اپنے حال پر ہے، جیسے ﴿ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ ﴾ [يوسف: ٦٧] ہے تو بھی بن سکتا ہے)۔یعنی رسول اللہ ﷺ نے ہم بنی عبدالمطلب کے لڑکوں کو ہماری گدھیوں پر مزدلفہ سے آگے بھیجا تو آپ ﷺ اپنی ہتھیلی سے ہماری رانوں کو مارنے لگے اور فرمانے لگے: میرے ننھے بیٹو! سورج نکلنے سے پہلے کنکریاں نہ مارنا، اس فرمانے سے آپ ﷺ کی غرض یہ تھی کہ بچوں کو جو رات کے وقت روانہ کیا تھا تو کہیں وہ رات ہی کو رمی جمار نہ کرنے لگیں، کیوں کہ اس کا وقت تو سورج کے طلوع کے بعد ہوتا ہے۔ پس اس حدیث شریف سے صاف ظاہر ہے کہ محبت سے غیر کے بیٹے کو اپنا بیٹا کہہ دینا درست ہے۔اسی طرح صحیح مسلم میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: «يَا بُنَيَّ!» یعنی اے میرے ننھے بیٹے![5] (ورواه أبو داود والترمذي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ ﴾ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے۔ زید غزوۂ موتہ سنہ دس ہجری میں شہید ہوئے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ﴾ اللہ پاک نے حکم دیا کہ منہ بولے بیٹوں کے نسب ان کے حقیقی باپوں کی طرف پھیرو، اگر وہ جانے پہچانے ہوں، پھر اگر وہ معروف نہ ہوں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں، یعنی اس وجہ سے کہ ان سے ان کا نسب فوت ہو گیا ہے اور اسی لیے جس دن رسول اللہ ﷺ عمرۂ قضا کے سال مکے سے نکلے اور حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی چچا چچا پکارتے ان کے پیچھے لگی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کو لے لیا اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اپنے چچا کی بیٹی کو لے لو تو انھوں نے اس کو اٹھا لیا، پھر اس کے بارے میں سیدنا علی، زید اور جعفر رضی اللہ عنہم جھگڑے کہ ان میں سے اس کا کفیل کون ہو، پھر ہر ایک نے حجت پیش کی۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦١١)
[2] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٥٩)
[3] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٤٨٥)
[4] مجمع بحار الأنوار (١/ ٩)
[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٦٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٣١)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس کا زیادہ مستحق ہوں، وہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے، یعنی اسماء بنت عمیس۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کو اس کی خالہ کے حوالے کیا جائے اور فرمایا کہ خالہ بہ منزلہ ماں کے ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَنْتَ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْكَ» یعنی تو میرا ہے اور میں تیرا ہوں اور سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَشْبَهْتَ خَلْقِيْ وَخُلُقِيْ» یعنی تو میری صورت وسیرت کے مشابہ ہے اور زید سے فرمایا: «أَنْتَ أَخُوْنَا وَ مَوْلٰنَا» یعنی تو ہمارا بھائی ہے اور مولیٰ ہے۔[1] چنانچہ اس حدیث شریف میں بہت سے احکام ہیں، ان میں سے سب سے بہترین یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کے ساتھ فیصلہ کیا اور جھگڑنے والوں میں سے ہر ایک کو راضی فرما دیا اور سیدنا زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا تو ہمارا بھائی ہے اور ہمارا مولیٰ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ﴾

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عیینہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے، وہ اپنے باپ سے راوی ہیں، سیدنا ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ پس میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے باپ پہچانے نہیں جاتے ہیں تو میں تمھارے دینی بھائیوں میں سے ہوں۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! بے شک میں البتہ اس کو گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ یہ جانتا کہ اس کا باپ گدھا تھا تو وہ اس کی طرف منسوب ہو جاتا۔[2] اور حال یہ ہے کہ حدیث شریف میں آچکا ہے: «لَيْسَ مِنْ رَّجُلٍ اِدَّعَى إِلٰى غَيْرِ أَبِيْهِ وَهُوَ يَعْلَمُهُ إِلَّا كَفَرَ»[3] یعنی نہیں ہے کوئی شخص کہ اس نے اپنے باپ کے غیر کی طرف دعویٰ کیا، حالاں کہ وہ اس کو جانتا ہے، مگر وہ کافر ہو گیا۔ معلوم نسب سے بری ہونے پر یہ تشدید اور تہدید اور سخت وعید ہے۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ ﴾ یعنی جب تم نے غلطی سے کسی کی نسبت اس کے باپ کے علاوہ کسی سے کر دی، حالاں کہ تم نے پوری کوشش اور طاقت صَرف کر دی اس کا صحیح نسب معلوم کرنے کے لیے تو بے شک اللہ نے غلطی میں حرج کو دور کر دیا ہے اور اس کے گناہ کو اٹھا دیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اس بات کی ہدایت دے کر اپنے بندوں کو امر فرمایا ہے کہ یوں کہیں: ﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦] ''اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کر۔'' اور صحیح مسلم میں ثابت ہوا ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: «قَدْ فَعَلْتُ»[4] صحیح بخاری میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٠٥) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٠٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦١) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٦)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جس وقت کہ حاکم اجتہاد کرے، پھر اس کا اجتہاد صحیح ہو جائے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اجتہاد کرے اور چوک جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔[1]

دوسری حدیث شریف میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا اور نسیان کو اور اس امر کو اُٹھا لیا ہے جس پر وہ زبردستی کیے جائیں۔[2] اللہ تعالیٰ نے اس جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِ ﴾ یعنی گناہ اسی پر ہے جس نے باطل کا ارادہ کیا ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ أَيْمَٰنِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴾ [البقرة: ٢٢٥] ''اللہ تمھاری لغو قسموں پر تمھیں نہیں پکڑے گا، لیکن وہ ان قسموں پر تمھیں ضرور پکڑے گا جن کا تمھارے دلوں نے ارادہ کیا، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت حوصلے والا ہے۔'' اور حدیث متقدم میں ہے: «مَنِ ادَّعَى إِلىٰ غَيْرِ أَبِيهِ وَهُوَ يَعْلَمُهُ إِلَّا كَفَرَ» اور قرآن منسوخ میں ہے: ''فَإِنَّ كُفْرًا بِكُمْ أَنْ تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ'' یعنی کفر سے یہ بات ہے کہ تم اپنے باپوں سے اعراض کرو۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ انھوں نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی، پس جو اُن پر نازل کیا، اس میں رجم کی آیت تھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور ان کے بعد ہم نے رجم کیا، پھر کہا: مقرر ہم پڑھتے تھے: ''وَلَا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ فَإِنَّهُ كُفْرٌ بِكُمْ أَوْ إِنَّ كُفْرًا بِكُمْ أَنْ تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ'' یعنی تم اپنے باپوں سے اعراض مت کرو، کیوں کہ یہ تمھارا کفر ہے کہ تم اپنے باپوں سے اعراض کرو اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «لَا تُطْرُونِي كَمَا أُطْرِيَ عِيسَىٰ بْنُ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُ اللّٰهِ، فَقُولُوا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ» اور بہت دفعہ معمر نے یوں کہا: «كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارىٰ ابْنَ مَرْيَمَ»[3] یعنی تم میری تعریف میں مبالغہ مت کرو، جس طرح کہ عیسی بن مریم کا مبالغہ کیا گیا، میں جو ہوں پس اللہ کا بندہ ہوں تو تم اس طرح کہا کرو: اس کا بندہ اور اس کا رسول۔ دوسری حدیث میں یہ روایت کیا ہے: «ثَلَاثٌ مِنَ النَّاسِ كُفْرٌ: اَلطَّعْنُ فِي النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ وَالْاِسْتِسْقَاءُ بِالنُّجُومِ»[4] یعنی لوگوں میں تین باتیں کفر یہ ہیں: نسب میں طعن کرنا، میت پر نوحہ کرتے ہوئے رونا اور ستاروں سے بارش طلب کرنا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ پاک نے ظہار کرنے والے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) [2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٣١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٤٢) مسند أحمد (١/ ٤٧)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧، ٩٣٤) مسند أحمد (٥/ ٣٤٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٠٩۔ ٦١٢)

کے لیے بیان فرمائی ہے۔ یعنی جس طرح کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے، اسی طرح ظہار کرنے والے کی بیوی اس کی ماں نہیں ہو جاتی، یہاں تک کہ اس کی دو مائیں ہوں اور اسی طرح منہ بولا بیٹا کسی مرد کا بیٹا نہیں ہو جاتا۔ کسی نے کہا کہ منافقوں میں سے ایک شخص تھا جو کہتا کہ میرا ایک دل مجھے اس بات کا امر کرتا ہے اور دوسرا دل ہے جو مجھے اس بات کا امر کرتا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس سے نفاق کا رد کیا اور اس بات کو رد کیا کہ نفاق اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہوتا، جس طرح کہ دو دل جمع نہیں ہوتے۔ قلب گوشت کا ایک چھوٹا ٹکڑا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو صنوبر کی شکل پر پیدا کیا ہے اور اس کو علم کا محل ٹھہرایا ہے۔

حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے مفعول میں اور ﴿ فِيْ جَوْفِهٖ ﴾ اس لیے فرمایا ہے کہ قلب روحِ حیوانی کا معدن ہے، جو نفسِ انسانی سے متعلق ہے اور سارے قویٰ کا منبع ہے تو اس کا متعدد (ایک سے زیادہ تعداد) ہونا ممکن نہیں، کیوں کہ یہ باہم مخالف ہونے کا اور ایک دوسرے کو توڑنے کا باعث ہوتے ہیں، اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک کل قویٰ کے لیے اصل ہو، یا ان کے لیے اصل نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت پہلے گزر چکی ہے۔ دوسری یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک نماز پڑھی، جس میں آپ ﷺ کو سہو ہو گیا تو آپ ﷺ سے اچانک کوئی کلمہ نکل گیا۔ پس منافقوں نے اس کو سنا تو کہا کہ اس کے دو دل ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] تیسری روایت یہ ہے کہ قریش کا ایک شخص تھا، اس کی دانائی اور عقل مندی کی وجہ سے اس کو ذوالقلبین کہتے تھے، چنانچہ یہ آیت اس کی شان میں نازل ہوئی۔[2] کوفیوں نے ﴿ اٰلّٰٓئِيْ ﴾ بیائے ساکنہ بعد ہمزہ پڑھا ہے اور اسی طرح ابن عامر نے اور ابو عمرو وبزّی نے بیائے ساکنہ بعد الفِ محضہ پڑھا ہے۔ امام ابو عمرو بن العلا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قریش کا وہ لغت ہے جس کے پڑھنے کا لوگوں کو حکم ہوا ہے۔

قُنبل نے اور ورش نے بہ ہمزۂ مکسورہ بدون یاء اور عاصم نے ﴿ تُظٰهِرُوْنَ ﴾ بہ ضمِ فوقیہ وکسرِ ہاء بعد الف ظاہر کا صیغۂ مضارع اور ابنِ عامر نے بہ فتحِ فوقیہ و باء وتشدیدِ ظاء۔ "تَظَاهَرَ" کا مضارع اصل اس کی "تَتَظَاهَرُوْنَ" ہے۔ باقی قراء نے "تَظَّهَّرُوْنَ" بہ فتحِ تاء وتشدیدِ ظاء بدون الف، اصل میں "تَتَظَهَّرُوْنَ" ہے۔[3] "ظِهَارٌ" مشتق ہے "ظَهْرٌ" بہ معنی پشت سے، جیسا کہ "لبی" تلبیہ سے ماخوذ ہے۔ حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ کے ساتھ اس کو اس لیے متعدی کیا ہے کہ اس میں تباعد کے معنی شامل ہیں، گویا یوں کہا گیا کہ "مُتَبَاعِدِيْنَ مِنْ نِسَائِكُمْ بِسَبَبِ الظِّهَارِ"، جس طرح کہ سورۃ البقرہ میں تعدیت ایلاء کی حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ کے ساتھ گزر چکی ہے۔ اصل اس کی یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی سے کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔

معنی یہ ہیں کہ اللہ نے تمھاری بیویوں کو جن کے واسطے تم یہ بات کہتے ہو حرمت میں تمھاری ماؤں کی طرح

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٥٦١) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٠٤) [3] فتح القدير (٤/ ٣٤٣)

نہیں کیا، لیکن یہ ایک بری بات ہے اور جھوٹ ہے۔ ایسا کہنے سے جو شے واجب ہوتی ہے وہ اس کی شرط کے ساتھ کفارہ ادا کرنا ہے۔ وہ شرط عود ہے (رجوع کرنا ہے) جس طرح کہ سورۃ المجادلہ میں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا ﴾ [المجادلة: ۳] ''اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں، پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کرتے ہیں۔'' ''أَيْ: فِيْهِ'' یعنی عود یہ ہے کہ اپنی بات کی مخالفت کریں، اس طرح سے کہ جس عورت سے ظہار کیا ہے اس کو اتنا زمانہ روک رکھیں جس میں ان سے علاحدہ رہنا ممکن ہو، یا اس سے علاحدگی نہ کرے کہ ظہار کرنے والے کا مقصد عورت کو حرام ٹھہرا دینا ہے اور اس کا روک رکھنا اس کے مخالف ہے۔ (كذا قاله الكرخي)

﴿ اَدْعِيَآ ﴾ جمع ہے ''دَعِيٌّ'' کی۔ ''دَعِيٌّ'' وہ ہے جو اپنے غیر باپ کا بیٹا پکارا جائے۔ فعیل کا وزن بہ معنی مفعول ہے، لیکن اس کی جمع ﴿ اَدْعِيَآءَ ﴾ غیر قیاسی ہے، اس لیے کہ افعلاء جو فعیل کی جمع آتی ہے، تو وہ فعیل معتل اللام کی آتی ہے، جبکہ بہ معنی فاعل ہو۔ جیسے ''تَقِيٌّ'' کی جمع ''أَتْقِيَاءُ'' اور ''غَنِيٌّ'' کی جمع ''أَغْنِيَاءُ''۔ ''دَعِيٌّ'' اگرچہ فعیل معتل اللام ہے، کیوں کہ اصل میں ''دَعِيْوٌ'' ہے، پھر ادغام ہو گیا ہے، مگر اتنی بات ہے کہ بہ معنی مفعول ہے، چنانچہ قیاس اس کی جمع کا یہ تھا کہ ''فَعْلٰی'' کے وزن پر آتی جس طرح کہ ''قَتِيْلٌ'' کی جمع ''قَتْلٰی''، ''جَرِيْحٌ'' کی جمع ''جَرْحٰی''، ''مَرِيْضٌ'' کی ''مرضٰی'' آتی ہے، اس کی نظیر کبھی کبھی ''أَسِيْرٌ وَأَسَارٰی'' ہے۔ قیاسی جمع ''أَسْرٰی'' اس میں اصل یہی سننے میں آئی ہے۔ (كذا قال السمين)

﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ کا اشارہ ظہار و ادعاء کی طرف ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ مبتداء ہے اس کی خبر ﴿ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ﴾ ہے، یعنی یہ ظہار کرنا اور غیر کے بیٹے کو اپنا کر کے پکارنا صرف ایک منہ کی بات ہے، اس کی خارج میں کچھ تاثیر نہیں ہے۔ چنانچہ یہ کہنے سے نہ تو بیوی ماں ہو جاتی ہے اور نہ غیر کا بیٹا اپنا بیٹا ہو جاتا ہے اور نہ ماں بننے اور بیٹا بننے کے حکموں سے کچھ اس پر مترتب ہوتا ہے۔ پہلے تین باتوں کا ذکر ہوا ہے: ایک تو دو دل ہونا، دوسرے ظہار اور تیسرے ادعاء (کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا کہنا)۔

چنانچہ یا تو ﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ کا اشارہ تینوں امور کی طرف ہے، یا صرف آخری امر کی طرف، کیوں کہ سیاقِ کلام سے یہی مقصود ہے، یعنی تمھارا یہ ادعاء کہ غیر کے بیٹے تمھارے بیٹے ہیں، اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے، یہ صرف منہ کی بات ہے، کیوں کہ بیٹا تو ولادت سے ہوتا ہے، اس میں نسخ ہے تبنّیٰ کا۔ جاہلیت میں کوئی آدمی کسی کو بیٹا بنا لیتا تو اس کو مولود کے بیٹے کی طرح ٹھہراتا تھا، لوگ اس کو اسی کی طرف منسوب کر کے پکارتے تھے اور وہی اس کی میراث کا وارث ہوتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے قبل وحی کے زید بن حارثہ کلبی کو آزاد کر کے متبنّیٰ کر لیا تھا، اور اس کے درمیان اور حمزہ رضی اللہ عنہ کے درمیان بھائی چارہ کر دیا تھا، پھر جب آپ ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا اور وہ زید کے تحت میں رہی تھیں تو منافقوں نے کہا کہ محمد ﷺ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کیا، حالاں کہ وہ لوگوں کو اس سے منع کرتا ہے،

اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس سے متبنی بنانے کو منسوخ کر دیا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سنت کا نسخ قرآن کے ساتھ ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ تفسیر نے اس بات پر اجماع کیا کہ یہ آیت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ ﴾ یعنی اللہ پاک وہ حق کہتا ہے جس کا اتباع لازمی ہے، کیوں کہ وہ فی نفسہٖ حق ہے، باطل نہیں ہے، چنانچہ بیٹوں کا ان کے باپوں کی طرف نسبت کر کے پکارنا اس کے تحت میں داخل ہے اور وہی وہ راہ بتاتا ہے جو حق کی طرف پہنچا دیتی ہے۔ اس میں بندوں کو ارشاد ہے کہ حق بات کہیں، باطل اور جھوٹ بات کو چھوڑ دیں۔ اس میں بندوں کو اس بات کی تصریح فرمائی کہ بیٹوں کو ان کے باپوں کا کہہ کر پکارنا بندوں پر واجب ہے۔ اور فرمایا: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ ﴾ یعنی وہ جن باپوں کی پشت سے ہیں، ان کو انھیں کا کہہ کر پکارو اور ان کو انھیں کی طرف منسوب کرو، ان کے غیر کی طرف نسبت کر کے مت پکارو۔

جملہ ﴿ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ مذکورہ حکم کی وجہ ہے اور ضمیر ﴿ هُوَ ﴾ مصدر ﴿ اُدْعُوْهُمْ ﴾ کی طرف راجع ہے جس طرح کہا کہ ﴿ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ [المائدة: ٨] ''عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔'' میں ﴿ هُوَ ﴾ کی ضمیر عدل کی طرف پھرتی ہے اور ﴿ اَقْسَطُ ﴾ کے معنی ہیں "أَعْدَلُ". یہ أَفْعَل تفضیل ہے "قسط" بہ معنی عدل سے۔ اس سے مقصود محض زیادتی ہے، یعنی ان کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف نسبت کر کے پکارو، کیوں کہ یہ پکارنا اللہ کے حکم اور فیصلے میں زیادہ انصاف کرنا ہے۔ یا یوں کہو کہ ہر کلام میں سے جو اس کے متعلق ہے عادل تر ہے۔ چنانچہ عموم کے لیے اضافت ترک کی گئی ہے، جس طرح کہ اللہ اکبر میں ہے۔ کبھی مضاف الیہ خاص بھی مقدر کیا جاتا ہے، یعنی یہ کہنا زیادہ صحیح ہے تمھارے کہنے سے کہ وہ فلاں کا بیٹا ہے، حالاں کہ وہ اس کے صلب کا نہیں ہے، اس کلامِ بلیغ کی فصاحت کی طرف غور کرنا چاہیے کہ جُمل طلبیہ کا وصل کیا، پھر ان سے جملہ خبریہ کی فصل کی اور اس کے درمیان وصل کیا، پھر جملہ طلبیہ کے ساتھ فصل کی اول سے، یہاں تک سب جملوں میں غور و فکر کرو، یہ سب کیفیت بہ خوبی ظاہر و واضح ہو جائے گی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے بندوں کے لیے ارشاد کو مکمل کر کے یوں فرمایا: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْكُمْ ﴾ یعنی پھر اگر تم ان کے باپوں کو نہ جانو کہ ان کی طرف ان کی طرف نسبت کرو تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں اور تمھارے موالی ہیں، چنانچہ یوں کہو کہ میرا بھائی ہے اور میرا مولیٰ۔ اور جب ان کے حقیقی باپوں کا علم نہ ہو تو ابن فلاں مت کہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا اور جائز ہے کہ یوں ہوں کہ موالی تمھارے دین میں تمھارے اولیاء ہیں۔[3] کسی نے کہا: یہ معنی ہیں: پھر اگر وہ آزاد کیے ہوئے ہوں اور حُر و آزاد نہ ہوں تو موالی فلاں کہو۔ کسی نے موالی

---

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ١١٨۔ ١١٧) [2] تفسیر النسفي (٣/ ٢٩٦) [3] معاني القرآن (٤/ ٢١٥)

کی تفسیر بنی عم (چچا کا بیٹا) کی ہے، اس لیے کہ مولیٰ کا اطلاق اُور معانی پر بھی ہوتا ہے جن میں سے ایک معنی ابن العم کے بھی ہیں، یعنی پھر اگر تم کسی شخص کے باپ کو نہ پہچانتے ہو کہ اس کی طرف منسوب کرو اور اس کو مخاطب کرنا چاہو تو اس طرح سے کہو۔ ''یَا ابْنَ عَمِّيْ'' یعنی اے میرے چچا کے بیٹے!

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اس بات میں جو تم سے واقع ہوگئی بلاارادہ خطا کے طور پر اور ممانعت کا حکم آنے سے پہلے تم نے اس کو غیر باپ کی طرف منسوب کر دیا۔ لیکن گناہ وہ ہے جو تم نے ارادتاً بیٹوں کی نسبت ان کے غیر آباء کی طرف کی باوجود علم کے اور ممانعت کا حکم آ جانے کے بعد۔ یا یہ معنی ہیں کہ تم پر کچھ گناہ نہیں ہے جب تم غیر کے بیٹے کو غلطی سے کہہ دو اے میرے بیٹے! اور یہ بات زبان کی سبقت سے کہو۔ لیکن جب تم اس کو قصداً کہو تو گناہ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تو کسی شخص کو اس کے غیر باپ کی طرف نسبت کر کے پکارے، حالاں کہ تو اسے اس کا باپ گمان کرتا ہے تو تجھ پر کچھ برائی نہیں ہے۔[1] زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسا کہنا اس حال کے خلاف ہے، کیوں کہ زید رضی اللہ عنہ کے حق میں زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز نہیں، اس لیے کہ اگر ارادتاً ایسا کہے گا تو گناہ گار ہوگا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اور سیدنا ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے غیر باپ کی طرف دعویٰ کرے اور وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہے۔[2] (أخرجه البخاري و مسلم)

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ بخشتا ہے چُوک جانے والے کو اور اس پر رحم کرتا ہے اور اس سے درگزر فرماتا ہے، وہ وہ شخص ہے جس نے بھول کر کسی کو اس کے غیر باپ کی طرف نسبت کر کے پکارا، یا ممانعت کے حکم سے پہلے پکارا، یا بطور سبق لسانی (زبان کی پھسلن) کے پکارا۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول کے واسطے ایک ایسی مزیتِ عظیم اور خصوصیتِ جلیل ذکر فرمائی جس میں بندوں میں سے کوئی آپ کا شریک نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[3]

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰۗىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۶

نبی مومنوں پر اُن کی (اپنی) جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں، اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں

---

[1] تفسیر الطبري (۲۰/ ۲۰۸) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٠٧١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٣)

[3] فتح البیان (۱۱/ ٤٢۔ ٤٦)

ہیں اور رشتے دار اللہ کی کتاب کی رو سے (دوسرے) مومنین اور مہاجرین کی نسبت آپس میں (ترکے کے) زیادہ حق دار ہیں، مگر تم اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی کرنا چاہو (تو کر سکتے ہو) یہ کتاب (الٰہی) میں لکھا ہوا ہے ⑥

نبی مکرم ﷺ مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں:

نبی اللہ کا نائب ہے۔ مومنین کو اپنی جان و مال میں اتنا تصرف نہیں جتنا نبی کا ہے۔ اپنی جان جلتی ہوئی آگ میں ڈالنا جائز نہیں اور نبی حکم کرے تو فرض ہے اور اس کی عورتیں سب کی مائیں ہیں، حرمت کے لحاظ سے، پردے کے لحاظ سے نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ جنھوں نے وطن چھوڑا بھائی بندوں سے علاحدہ ہوئے، ان کو آپ ﷺ نے آپس میں بھائی بھائی کر دیا تھا دو دو۔ ان کے بعد ان کے ناتے والے مسلمان ہوئے، فرمایا کہ اس بھائی چارے پر ناتا مقدم ہے۔ ناتے ہی پر وراثت ہے اور دوسرے احکام، مگر احسان اور سلوک اس کا بھی کرتے رہو۔ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے، یعنی قرآن میں۔ یہ حکم ہمیشہ کے لیے جاری رہا، یا تورات میں بھی یہی حکم ہوگا۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی امت کے لیے شفقت اور خیر خواہی کو جان لیا تو اپنے نبی کو ان کے ساتھ ان کی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ والا ٹھہرایا اور ان پر اس کا یہ حکم ٹھہرایا کہ اس کو ان سے بھی زیادہ ان کی جانوں پر اختیار ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [النساء: ٦٥] ''چنانچہ (اے نبی!) آپ کے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر آپ کے کیے ہوئے فیصلے پر ان کے دلوں میں کوئی تنگی نہ آنے پائے اور وہ اسے دل و جان سے مان لیں۔''

صحیح میں ہے: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کوئی تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کو اس کی جان سے اور اس کے مال سے اور اس کی اولاد سے اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب اور عزیز نہ ہوں۔[1] نیز صحیح میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! واللہ! آپ مجھے ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں سوائے میری اپنی جان کے تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں اے عمر! یہاں تک کہ میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ محبوب ہوں۔ پس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: واللہ! یا رسول اللہ! البتہ آپ مجھے ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں، یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اب اے عمر! یعنی اب تیرا ایمان پورا ہوا۔[2] اسی لیے اللہ پاک نے اس آیت میں یوں فرمایا ہے: ﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ... الآية ﴾

---

① صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٥) ② صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢٥٧)

امام بخاری ﷫ نے اس کی تفسیر میں سیدنا ابوہریرہ ﷜ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: نہیں ہے کوئی مومن مگر حال یہ ہے کہ میں اس کے ساتھ سب لوگوں سے بڑھ کر دنیا و آخرت میں لگاؤ والا ہوں۔ اگر چاہو تو یہ پڑھ لو: ﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ... الآية ﴾ پس جب کسی نے مال چھوڑا تو چاہیے کہ اس کے عصبہ (قریبی رشتے دار) اس کے وارث ہوں، وہ کوئی ہوں اور اگر اس نے قرض چھوڑا یا چھوٹے بچے تو چاہیے کہ وہ میرے پاس آئیں تو میں اس کا مولیٰ ہوں۔[1] (تفرد به البخاري ورواه أيضا في الاستقراض وابن جرير وابن أبي حاتم من طرق عن فليح به مثله، ورواه أحمد من حديث أبي حصين عن أبي صالح عن أبي هريرة ﷜ عن رسول الله ﷺ بنحوه) امام احمد ﷫ نے سیدنا جابر بن عبداللہ ﷠ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر مومن سے اس کی جان سے بھی زیادہ لگاؤ والا ہوں۔ چنانچہ جو کوئی شخص فوت ہوگیا اور اس نے قرض چھوڑا تو میری طرف ہے اور جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے۔[2] (ورواه أبو داود عن أحمد بن حنبل به نحوه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾ یعنی نبی کی بیویاں حرمت و احترام اور عزت و اکرام اور اعظام میں مومنوں کی مائیں ہیں، لیکن ان کے ساتھ خلوت جائز نہیں ہے اور ان کی بیٹیوں بہنوں کی طرف یہ حرمت منتشر نہیں ہوتی بالاجماع۔ اگرچہ بعض نے ان کی بیٹیوں کا نام خواہرانِ مومنین (مومنوں کی بہنیں) رکھا ہے، جس طرح کہ یہ بات امام شافعی ﷫ سے منصوص ہے مختصر میں اور یہ امر اطلاقِ عبارت کے باب سے ہے اثباتِ حکم نہیں۔ سیدنا معاویہ ﷜ کو اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو مومنوں کے ماموں کہنا چاہیے یا نہیں۔ اس مسئلے میں علماء کے دو قول ہیں: امام شافعی ﷫ کی نص اس پر ہے کہ یہ کہا جائے اور یہ بات کہ نبی کریم ﷺ کو مومنوں کا باپ کہا جائے تو جمع مذکر سالم میں عورتیں داخل ہو جائیں، اس میں بھی دو قول ہیں۔ سیدہ عائشہ ﷞ سے صحیح ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ یہ نہ کہا جائے۔ امام شافعی ﷫ کے مذہب میں یہ احد الوجہین ہے۔

سیدنا ابی بن کعب ﷜ اور سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ سے مروی ہے کہ انھوں نے یوں پڑھا ہے: "اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ وَهُوَ أَبٌ لَّهُمْ"[3] اور یہ سیدنا معاویہ ﷜، امام مجاہد، عکرمہ اور حسن ﷭ سے مروی ہے۔[4] امام شافعی ﷫ کے مذہب میں یہ احد الوجہین ہے۔ امام بغوی ﷫ وغیرہ نے اس کو بیان کیا ہے[5] اور اس پر اس حدیث شریف سے استیناس کیا جس کو امام ابو داود ﷫ نے سیدنا ابوہریرہ ﷜ سے روایت کیا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٠٣، ٢٢٦٩) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٠٩) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١١٤) مسند أحمد (٢/ ٣٣٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٥٦) مسند أحمد (٣/ ٢٩٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٤٥٦)

[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٥٠) [4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٠٨۔ ٢٠٩) [5] تفسير البغوي (٦/ ٣١٩)

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں جو ہوں تو تمھارے لیے بہ منزلۂ والد ہوں، میں تم کو تعلیم دیتا ہوں، چنانچہ جب کوئی تم میں سے پاخانے کو آئے تو نہ قبلے کی طرف منہ کرے نہ اس کی طرف پیٹھ کرے اور اپنے سیدھے ہاتھ سے استنجا اور پاکی نہ کرے اور آپ ﷺ تین پتھر لینے کا حکم فرماتے تھے اور روث ورمہ سے منع فرماتے تھے۔[1] (وأخرجه النسائي وابن ماجه من حديث ابن عجلان) (''روث'' تمام سم والے جانوروں کی پس افگندہ (مینگنی و لید) کو کہتے ہیں اور رِمّہ اور رمیم بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں، پہلی کو نجاست کے لحاظ سے منع فرمایا اور رمہ سے اس لیے کہ اس میں احتمال ہے کہ کسی نجس مردار کی ہڈی ہو، یا اس لیے کہ چکنے پن کی وجہ سے پتھر کے قائم مقام نہ ہو)۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ نہ کہا جائے کہ اس آیت سے احتجاج کیا ہے: ﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ ﴾ [الأحزاب: ٤٠] ''محمد (ﷺ) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ ﴾ یعنی ناتے والے بعض ان کے اللہ کے حکم میں مومنین اور مہاجرین کے بعض سے زیادہ لگاؤ والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرابت والے مہاجرین و انصار میں سے وراثت کے زیادہ حق دار ہیں، اس سے پہلے جو اُن میں آپس میں حلف اور مؤاخات (معاہدے اور دینی بھائی ہونے کے ناتے سے) کے سبب ان میں جو وراثت ہوتی تھی اس آیت نے اس کو منسوخ کر دیا، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ مہاجر انصاری کا وارث ہوتا تھا، اس کی قرابت والے اور ذوی الارحام (رشتے دار) وارث نہیں ہوتے تھے، اس بھائی چارے کے سبب سے جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان قائم کر دیا تھا۔ اور اسی طرح امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اور سلف و خلف میں سے کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک حدیث بروایت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ وارد کی ہے۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے ﴿ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ ﴾ خاص ہمارے گروہ قریش و انصار کے حق میں نازل کی ہے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ ہم گروہِ قریش جب مدینہ میں آئے تو اس حال میں آئے کہ ہمارے پاس کوئی مال نہ تھے۔ چنانچہ ہم نے انصار کو اچھا بھائی پایا تو ہم نے ان سے بھائی چارہ کیا اور باہم ان کے وارث ہوئے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تو خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ سے بھائی چارہ کیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فلاں سے اور عثمان رضی اللہ عنہ نے بنی زریق بن سعد زرقی میں سے ایک شخص سے بھائی چارہ کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی اور تھا۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھائی چارہ کیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خاص ہمارے گروہِ قریش و انصار میں یہ آیت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ١/ ٣٠۔ ٣١)

نازل فرمائی تو ہم اپنے مواریث (وارثوں) کی طرف رجوع ہوئے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ﴾ یعنی میراث گئی اور نصر و برّ وصلہ و احسان و وصیت باقی رہی۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴾ یعنی یہ حکم کہ ﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ ﴾ ایک مقدر کیا ہوا اور لکھا ہوا حکم تھا جو اللہ کی طرف سے تھا اور پہلی کتاب میں تھا جس میں کوئی تغیر و تبدیل نہیں کیا جاتا۔ یہ مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا قول ہے، اگرچہ اللہ پاک نے ایک وقت میں اس کے خلاف حکم کو مشروع کیا، اس لیے کہ اس میں اس کی مصلحتِ بالغہ ہو اور حال یہ ہے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ وہ اس کو اس شے سے منسوخ کر دے گا جو اس کی قدرِ ازلی اور قضائے قدری شرعی میں جاری ہوئی ہے۔[2] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مومنوں کے زیادہ مستحق ہیں اور زیادہ مہربانی اور شفقت کرنے والے ہیں ان کی جانوں سے دین و دنیا کے ہر معاملے میں، جس طرف وہ ان کو بلائیں، کیونکہ ان کے نفوس تو ان کو اس شے کی طرف بلاتے ہیں جس میں ان کی ہلاکت ہے اور وہ محبت و کرم کے طور پر ان کو اس شے کی طرف بلاتے ہیں جس میں ان کی ابدی نجات ہے۔ جب حقیقت میں یہ بات ٹھہری تو ان پر واجب ہے کہ ان کے مالوں میں سے جو مال وہ چاہیں اس کے ساتھ ان کو سب پر اختیار کریں، گو وہ خود اس کے حاجت مند ہی کیوں نہ ہوں اور ان پر یہ واجب ہے کہ جس قدر وہ اپنی جانوں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت رکھیں اور یہ واجب ہے کہ جو وہ اپنی جانوں کے لیے فیصلہ کرتے ہیں، اس پر آپ ﷺ کے فیصلے کو اپنے اوپر مقدم کریں۔ چنانچہ جس وقت نبی اکرم ﷺ ان کو کسی شے کے لیے بلائیں اور ان کے دل ان کو دوسری طرف بلائیں تو ان پر واجب ہے کہ آپ ﷺ کے بلانے کو مقدم کریں اور اپنے جی کی بلائی ہوئی شے کو پیچھے ڈال دیں اور ان پر واجب ہے کہ جس قدر اپنے جی کی اطاعت کرتے ہیں، اس سے بڑھ کر آپ ﷺ کی اطاعت کریں اور جس طرف ان کے دل مائل ہوتے ہیں اور جس شے کو ان کے دل طلب کرتے ہیں، ان سب پر آپ ﷺ کی اطاعت کو مقدم کریں۔

کسی نے کہا کہ ﴿ اَنْفُسِهِمْ ﴾ سے مراد ﴿ بَعْضُهُمْ ﴾ ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ بعض مومنین جو بعض سے لگاؤ رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر نبی کا لگاؤ ہے مومنوں سے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت قضا کے ساتھ خاص ہے، یعنی نبی ان کی جانوں کا زیادہ حق دار ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ جہاد کرنے میں نبی اکرم ﷺ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ وہ اس کے آگے لڑیں اور اس کے ورے اپنی جان کو صرف کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣١١٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦١٢_ ٦١٤)

''أَوْلٰى بِهِمْ'' کے یہ معنی ہیں کہ نبی ان پر سب سے بڑھ کر مہربانی، رحمت اور عطوفت (مہربانی) کرنے والا ہے اور سب سے بڑھ کر ان کو نفع پہنچانے والا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ۱۲۸] ''مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔'' پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: ''اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَهُوَ أَبٌ لَّهُمْ ''①

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ہر نبی اپنی امت کا باپ ہے،② اسی لیے مومنین بھائی ہوئے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ دین میں ان کے باپ ہیں۔ بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن کا غزوہ کیا تو میں نے ان میں کچھ سختی اور درشتی دیکھی، پھر جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو میں نے ان کو گھٹایا، چنانچہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا کہ متغیر ہو رہا ہے اور فرمایا: اے بریدہ! کیا میں مومنوں سے ان کی جانوں سے اولیٰ نہیں ہوں؟ میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: «مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ» یعنی میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی بھی اس کا مولیٰ ہے۔③

کاتب الحروف۔عفا اللہ عنہ۔کہتا ہے کہ مولیٰ کے بہت سے معنی ہیں: ① رب ② مالک ③ سید ④ منعم ⑤ معتِق ⑥ ناصر ⑦ محبّ ⑧ تابع ⑨ جار ⑩ ابن العم ⑪ حلیف ⑫ عقید ⑬ صہر ⑭ عبد ⑮ معتَق ⑯ منعم علیہ۔ ان میں سے اکثر معانی حدیث شریف میں آئے ہیں، جو شخص کسی امر کا والی ہو اور اس کے ساتھ قائم ہو تو وہ مولیٰ وولی ہے۔ اس کے مصادر مختلف آتے ہیں، پس وَلایت بالفتح تو نسب ونصرت وعتق میں ہے اور بالکسر وِلایت امارت میں اور وَلاء معتق میں اور ''موالاۃ'' ''والی القوم'' سے مصدر ہے۔ حدیثِ مذکور اکثر اسمائے مذکورہ پر محمول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مراد ولائے اسلام ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [محمد: ۱۱] ''یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''أَصْبَحْتَ مَوْلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ'' کسی نے کہا: اس کا سبب یہ تھا کہ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم میرے مولیٰ نہیں ہو، میرے مولیٰ تو رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی جو شخص مجھ سے دوستی رکھے اور مجھے چاہے تو اسے چاہیے کہ اس سے بھی دوستی رکھے۔④ (كذا في مجمع البحار)

بعض علمائے شیعہ نے مولیٰ بہ معنی اولیٰ میں ایک جلد لکھی ہے، مختلف کتابوں سے اقوالِ شاذہ وفاذہ جمع کیے ہیں، غرض وہی خلافت کا جھگڑا ہے۔ اب اگر غور سے دیکھو تو اس بکھیڑے کی کچھ ضرورت نہیں، جب کہ خود امیر (سیدنا علی رضی اللہ عنہ)

---

① الدر المنثور (٤/ ٤٥٧) ② تفسير الطبري (١٥/ ٤١٣۔ ٤١٤)

③ سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٤٥) مسند أحمد (٥/ ٣٤٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٢٣)

④ مجمع بحار الأنوار (٥/ ١١٣)

نے شیخین کی بیعت کرلی تو سب جھگڑے طے ہوگئے۔ ہمارا ایمان ہے کہ انھوں نے حق سمجھ کر بیعت کی، اگر وہ حق نہ جانتے تو ہرگز نہ کرتے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کہیں میان میں رہ سکتی تھی۔ دیکھو! جب وقت آیا تو کس قدر حرب وضرب سے پیش آئے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے خوب لڑے، کیوں کہ وہ اس وقت اپنا حق سمجھتے تھے اور بے شک خلیفۂ راشد اور امام برحق تھے، وہ سب لڑائیوں میں حق پر تھے اور ان کے مخالف خطا پر تھے گو خطائے اجتہادی تھی۔

دیکھو! جب اپنا حق سمجھا تو کیسی دھوم دھام سے لڑے بھڑے اور دلیرانہ مردانہ جنگ کی، وہ ایسے فردِ کامل اور بہادر بلکہ شجاعوں کے بادشاہ تھے کہ اگر اس وقت اپنا حق سمجھتے تو ایسے لڑتے کہ زمین بھی یادرکھتی کہ میری پشت پر بھی کوئی واقعہ ہوا ہے، چنانچہ بعد کو اسی طرح لڑے۔ بھائی لوگ جو چوتھی خلافت کو ان کے حق میں منقصت (نقصان) خیال کرتے ہیں، اگر غور کر کے دیکھیں تو عین منقبت (ہنر، تعریف) ہے۔ ہاں اگر خلیفۂ اول ہوتے تو نقصان تھا، کیوں کہ یہ بات مصلحتِ نبوت کے خلاف ہوتی، اس لیے کہ مخالفینِ اسلام کہتے کہ یہ سب کام دنیا کے لیے تھا جب تو وفاتِ نبوی کے بعد ان کا بیٹا نہ تھا تو ان کا داماد اور چچا کا بیٹا خلیفہ ہوا، جس طرح کہ ملوک کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی مصلحتیں ہیں جن کو اللہ پاک ہی خوب جانتا ہے۔ مفتی خیر اللہ رحمہ اللہ نے مشاجرات (باہم جھگڑے) کے بارے میں خوب فرمایا ہے۔ ؎

قصہ ان کا ان پر چھوڑ ہاتھ علی کے حق کی ڈور

اتنا کہہ کر سکوت کرے۔ اس کے بعد اب مفت کی لڑائی ہے، اس جھگڑے سے کیا حاصل ہے، ان جیسے کام کرو تو کچھ نجات کی امید بندھے۔ اللہ پاک ہم سب کو ان کی محبتِ شرعی پوری پوری عطا فرمائے۔ آمین

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات برابر ہے کہ آپ نے ان سے دخول فرمایا ہو یا نہیں اور آپ نے ان کو چھوڑ کر وفات فرمائی ہو یا ان کو طلاق دی ہو، یہ سب مومنوں کی ماؤں کے مثل ہیں۔ حرمت اور عظمت کے حکم میں ان کے قائم مقام ہیں، پس کسی کو حلال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرے، جس طرح یہ حلال نہیں کہ اپنی ماں کے ساتھ نکاح کرے۔ یہ ماں بننا ان کے ساتھ نکاح حرام ہونے کے ساتھ خاص ہے۔ بہ تحریمِ مؤبد (ابدی حرمت کے ساتھ) ان سے نکاح حرام ہے۔ ان کی حرمت میں یہ بات شامل ہے کہ ان کی جنابِ فیض مآب میں تعظیم کے ساتھ آئیں اور اس لیے نہیں ہے کہ ان کی طرف نظر کریں اور ان کے ساتھ خلوت کریں، کیوں کہ یہ تو ان کے حق میں اسی طرح حرام ہے جس طرح کہ اجنبی عورتوں کے حق میں حرام ہے۔ مومنین کی تخصیص اس کی دلیل ہے کہ وہ مومنین کی بیویوں کی مائیں نہیں ہیں اور نہ ان کی بیٹیاں مومنین کی بہنیں ہیں اور نہ ان کے بھائی مومنین کے ماموں ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو بات مجھے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ مومن مرد وعوتوں کی مائیں ہیں، یعنی

مردوں اور عورتوں کو ان کی تعظیم کرنے کے لیے یہ فرمایا گیا ہے۔ جس طرح کہ یہ آیت اس پر دال ہے: ﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ اور یہ مردوں اور عورتوں دونوں کو ضرورتاً شامل ہے۔ کہا: پھر یہ بات کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں: "وَأَزْوَاجُهُمْ أُمَّهَاتُهُمْ وَهُوَ أَبٌ لَّهُمْ" ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ اَنْفُسِهِمْ ﴾ کے لفظ کے بعد "وَهُوَ أَبٌ لَّهُمْ وَ أَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ" پڑھا ہے۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک عورت نے ان سے کہا: "يَا أُمَّه" یعنی اے ماں! تو فرمایا کہ میں تمھارے مردوں کی ماں ہوں اور تمھاری عورتوں کی ماں نہیں ہوں۔[2] (أخرجه ابن سعد و ابن المنذر والبيهقي في سننه) سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہا میں تم میں سے مردوں اور عورتوں کی ماں ہوں۔ (أخرجه ابن سعد)

بجالہ رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک لڑکے کے پاس سے گزرے اور وہ مصحف میں پڑھ رہا تھا: "وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ وَهُوَ أَبٌ لَّهُمْ" تو فرمایا: اے لڑکے! تو اس کو چھیل ڈال، تو وہ بولا کہ یہ تو سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ کا مصحف ہے۔ چنانچہ وہ سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ کی طرف گئے تو ان سے پوچھا، انھوں نے کہا کہ مجھے تو قرآن مشغول کرتا تھا اور تجھے بازاروں میں صفق (یعنی خرید وفروخت کا معاملہ) مشغول کرتا تھا۔[3] (أخرجه عبد الرزاق و سعيد بن منصور و إسحاق بن راهويه و ابن المنذر و البيهقي)

"أَرْحَام" جمع رحم بہ معنی قرابت اور اولیٰ بہ معنی احق ہے، یعنی قرابت والے بعض بعض کے ساتھ میراث میں زیادہ حق دار ہیں۔ اس آیت کی تفسیر سورۃ الانفال کے آخر میں گزر چکی ہے۔ ہجرت اور موالات کے ساتھ میراث جو شروع اسلام میں تھی، یہ آیت اس کی ناسخ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جب سورۃ الانفال کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ﴾ [الأنفال: ٧٢] "اور جو لوگ ایمان لے آئے، مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی، ان کی دوستی سے تمھیں کوئی غرض نہیں، حتی کہ وہ ہجرت کریں۔" تو مسلمان ہجرت کی وجہ سے ایک دوسرے کے وارث ہوئے، پھر یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہوگیا۔[4] اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انفال کی اس آیت سے منسوخ ہو: ﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾ [الأنفال: ٧٥] "اور اللہ کی کتاب میں (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔"

امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: یہ احتمال زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ سورۃ الانفال نزول میں اس سورت سے پہلے ہے تو منسوخ ہونے کی نسبت اسی کی طرف زیادہ صحیح ہے[5] اور یہ آیت اس کی تاکید میں ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت تو

---

① تفسير القرطبي (١٤/ ١٢٢) ② سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٧٠)

③ تفسير الصنعاني (٣/ ١١٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٦٩)

④ تفسير القرطبي (١٤/ ١٢٣) ⑤ حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٥٩)

"توارث بالحلف" اور "مواخاة في الدين" کی ناسخ ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ مسلم اور کافر کے درمیان اور مہاجر و غیر مہاجر کے درمیان وراثت نہیں ہے۔ ﴿ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾ یا تو اولیٰ سے متعلق ہے، کیوں کہ اسم تفضیل ظرف میں عمل کرتا ہے، یہ بھی جائز ہے کہ محذوف سے متعلق ہو اور وہ حال ہو ضمیر سے۔ "أَيْ: كَائِنًا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ" اور کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے یا قرآن شریف یا آیتِ مواریث، یعنی یہ اولویت اور یہ استحقاق اللہ کی کتاب میں ہے، درآں حالیکہ وہ کائن اور ثابت ہے اللہ کی کتاب میں۔

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ ﴾ یا تو ﴿ اُولُوا الْاَرْحَامِ ﴾ کا بیان ہے، یعنی قرابت والے، جو مومنین و مہاجرین سے ہیں ان کا بعض بعض کے ساتھ اولیٰ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اولیٰ سے متعلق ہو۔ معنی یہ ہیں کہ قرابت والے ان کے بعض ان مومنوں اور مہاجروں سے اولیٰ ہیں جو اجنبی ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کے بعض ﴿ اُولُوا الْاَرْحَامِ ﴾ بعض کے اولیٰ ہے۔ مگر وہ بات جو ازواجِ نبی اکرم ﷺ کے لیے جائز ہے کہ وہ حرمتِ نکاح میں ماؤں کی طرح ہیں، اس قول میں جو ضعف ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ﴾ میں استثنا یا تو عام لوگوں کے لیے ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ قرابت والے ان کے بعض بعض کے ساتھ اولیٰ ہیں، وراثت وغیرہ کی ہر شے میں، مگر یہ کہ تم اپنے اولیاء کے ساتھ کوئی نیکی کرو، یعنی صدقہ و خیرات یا وصیت، کیوں کہ یہ جائز ہے۔

(قاله قتادة و الحسن و عطاء و محمد بن الحنفية)

امام محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت یہودی اور نصرانی کے لیے وصیت کی اجازت کے لیے نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ کافر ولی ہے نسب میں دین میں ولی نہیں ہے تو اس کے لیے وصیت جائز ہے۔[1] استثناء منقطع بھی ہو سکتا ہے، معنی یہ ہیں لیکن فعل معروف اولیاء کے لیے "لا بَأْسَ بِهِ" ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ پاک نے حلف کی وجہ سے اور دینی اخوت اور ہجرت کی بنا پر وراثت کو منسوخ کیا تو یہ امر مباح فرمایا کہ آدمی اس شخص کے لیے وصیت کرے جس سے دوستی کی ہے، جو چاہے اپنے مال کے ایک تہائی حصے میں سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معروف سے مراد نصرت اور حفظِ حرمت ہے بحقِ ایمان و ہجرت۔[2]

رہی یہ بات کہ ﴿ تَفْعَلُوْٓا ﴾ کو حرفِ ﴿ اِلٰٓى ﴾ سے متعدی کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ تَفْعَلُوْٓا ﴾ میں "تُوْصِلُوْا" یا "تَسُدُّوْا" کے معنی شامل کیے، یہ دونوں حرفِ ﴿ اِلٰٓى ﴾ سے متعدی ہوتے ہیں۔ ﴿ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس میراث کا منسوخ کرنا جو ہجرت اور مخالفت اور معاقدت کی وجہ سے ہوئی تھی، اس کو قرابت والوں کی طرف لوٹانا لوحِ محفوظ میں یا توریت یا قرآن میں لکھا ہوا تھا۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٢٥) [2] تفسير البغوي (٦/ ٣٢٠) [3] فتح البيان (١١/ ٤٦۔ ٤٩)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ۝۷ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۸

اور (اے نبی! یاد کریں) جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی اور ان سے ہم نے پختہ عہد لیا ⑦ تا کہ اللہ سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق پوچھے اور اس نے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ⑧

انبیاء کے عہد و پیمان کا بیان:

اور پیغمبر کو فرمایا کہ سب لوگوں پر تصرف رکھتا ہے ان کی جان سے زیادہ۔ یہاں فرمایا کہ یہ درجہ نبیوں کو ملا کہ ان کو محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے، ساری مخلوق سے مقابلہ کرتے ہیں اور کسی سے خوف اور امید یا طمع نہیں رکھتے۔ ان پیغمبروں کو اولوا العزم کہتے ہیں کہ ان کی ہدایت کا اثر ہزاروں برس تک رہا، بلکہ جب تک دنیا ہے، اس وقت تک اثر رہے گا۔ ان میں پہلا نام ہمارے نبی اکرم ﷺ کا لیا۔ ان کی زبانی اپنے احکام مخلوق کو پہنچائے، پھر ہر ایک سے پوچھے گا اور منکروں کو سزا دے گا۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک پانچ اولوا العزم نبیوں کی اور باقی نبیوں کی خبر دیتا ہے کہ اس نے ان سے اس بات کا عہد و پیمان لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دین قائم کریں گے، اس کی رسالت پہنچائیں گے اور تعاون، تناصر اور اتفاق کریں گے، جیسا کہ اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۸۱] ”اور (یاد کرو) جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اللہ نے فرمایا: کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ اللہ نے فرمایا: تو تم گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔“

چنانچہ ان سے یہ عہد و پیمان ان کو رسالت عطا کرنے کے بعد لیا گیا اور اسی طرح یہ ہے۔ تمام انبیاء میں سے ان پانچ پر نص فرمائی، یہ اولوا العزم نبی ہیں۔ "عطف الخاص علی العام" کے باب سے ہے، انہیں کے ذکر کی اس آیت میں بھی تصریح فرمائی ہے اور اس آیت میں: ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ

اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ [الشوریٰ: ١٣] ”اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی!) آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا (تاکیدی) حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم اس دین کو قائم رکھو اور تم اس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ۔“

پس طرفین کا ذکر کیا اور وسط فاتح و خاتم کا اور ان کا جو اُن کے درمیان میں ہیں علی الترتیب۔ یہ وہ وصیت ہے جس کا ان سے عہد و پیمان لیا گیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں آخری نبی ﷺ سے ابتداء فرمائی، آپ کے شرف کی وجہ سے۔ پھر ترتیب وار انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں ان کے ظہور کے مطابق ذکر کیا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن الحسن عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ میں پیدایش میں نبیوں کا اول ہوں اور مبعوث ہونے میں ان کا آخر ہوں۔ سو مجھ سے ابتداء کی قبل ان کے۔[1] اس حدیث کی اسناد میں قتادہ کے شاگرد سعید بن بشیر میں ضعف ہے۔ (وقد رواه سعيد بن أبي عروبة عن قتادة مرسلا وهو أشبه ورواه بعضهم عن قتادة موقوفا والله أعلم)۔ امام ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے عن ابی حازم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ بہترین اولادِ آدم پانچ ہیں: نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ اور ان میں بہترین محمد ﷺ ہیں۔[2] یہ حدیث موقوف ہے۔ حمزہ زیات جو اس میں ہے اس میں ضعف ہے۔

کہا ہے کہ اس میثاق سے مراد وہ ہے جو اُن سے اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذُریّت کی صورت میں نکالے گئے، جیسا کہ امام ابوجعفر رازی نے عن الربیع بن انس عن ابی العالیہ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا کہ ان کے باپ آدم علیہ السلام کو اٹھایا تو انھوں نے اپنی ذریت کی طرف نظر کی اور بے شک ان کی اولاد میں غنی تھا، فقیر تھا اور خوبصورت اور اس کے سوا تھا تو عرض کی کہ اے میرے رب! کاش تو اپنے بندوں کے درمیان برابری فرماتا۔

پس فرمایا: بے شک میں نے پسند کیا کہ میں شکر کیا جاؤں اور ان میں انبیاء کو مثل چراغوں کے دکھایا، ان پر نور ہے اور وہ ایک اور میثاقِ رسالت و نبوت کے ساتھ خاص کیے گئے، یہ وہی میثاق ہے جس کا ذکر اس آیت میں فرماتا ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾[3] یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میثاق پکا عہد ہے۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صادقین وہ لوگ ہیں جو رسولوں کی طرف سے پہنچانے والے اور ادا کرنے والے ہیں۔

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١١٦) اس کی سند میں ”سعید بن بشیر“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٦١)

② مسند البزار (١٧/ ١٤١) ③ تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٥) ④ تفسير الطبري (٢٠/ ٢١٣_ ٢١٤)

کافرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں سے کافر ہوئے۔ ﴿عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ کے معنی موجع، یعنی درد دینے والا عذاب۔ پس ہم گواہی دیتے ہیں، اس بات کی کہ رسولوں نے اپنے رب کی رسالتیں پہنچا دیں اور اُمتوں کی خیر خواہی کی اور ان کے لیے حقِ مبین اور واضح وجلی کو ان کے لیے ظاہر کر دیا اور خوب کھول کھول کر ان سے بیان کر دیا۔ کون سا حقِ مبین؟ جس میں نہ کسی طرح کا دھوکا ہے نہ کوئی شک وشبہہ۔ گو جاہلوں، دشمنوں، مارقوں (دین سے نکل جانے والے) اور ظالموں میں سے جس نے ان کی تکذیب کی اس نے کی۔ چنانچہ جس شے کو رسول لے کر آئے وہی حق اور درست ہے اور جس نے ان کی مخالفت کی وہی ضلالت اور گمراہی پر ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ کلمۂ ﴿اِذْ﴾ میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اس میں عامل "اُذْكُرْ" محذوف ہے، گویا یوں فرمایا کہ اے نبی! اللہ سے ڈر اور اس بات کو یاد کر کہ اللہ نے نبیوں سے میثاق لیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ معطوف ہے ﴿فِي الْكِتٰبِ﴾ کے محل پر تو "مَسْطُوْرًا" اس میں عامل ہوگا۔ یعنی یہ حکم کتاب میں لکھا ہوا تھا، اس وقت جس وقت ہم نے انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا۔ (كذا قال السمين) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے نبیوں سے خصوصاً اس بات کا عہد لیا کہ ان کا بعض بعض کی تصدیق کرے اور بعض بعض کی پیروی کرے[2] اور امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سے اس بات پر عہد لیا کہ اللہ کو پوجیں اور اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دیں اور اس پر کہ ان کا بعض بعض کی تصدیق کرے اور اس پر کہ اپنی قوم کے لیے خیر خواہی کریں۔[3] غرض کہ لوگوں کو ربِ رحیم کی عبادت اور صراطِ مستقیم اور دینِ قدیم کی طرف بلائیں اور اپنے رب کی رسالتیں پہنچائیں۔

یہ عہد اس وقت کیا کہ ان کو آدم علیہ السلام کی پشت سے مثل ذر کے نکالا۔ "ذر" جمع ہے "ذَرَّہ" کی۔ "ذَرَّہ" چھوٹی سے چھوٹی چیونٹی کو کہتے ہیں وہ ایسی ذرا سی ہوتی ہے کہ ان میں سے چالیس چیونٹیاں مچھر کے ایک پر سے بھی چھوٹی ہوتی ہیں۔ "میثاق" سے مراد قسم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کا اقرار اور وصیت وامر۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ پھر اللہ پاک نے عام ذکر کے بعد خاص کر کے بعض نبیوں کا ذکر کیا، جو اُن کو اور اُن کے غیر کو شامل اور عام تھا۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ یعنی اور خصوصاً تجھ سے اور نوح وغیرہ سے۔ ان کے خاص کرنے کی وجہ اس بات کی خبر دینا ہے، ان کے لیے مزید شرف اور فضیلت ہے، کیوں کہ وہ مشہور شریعتوں اور مذکورہ کتب والے ہیں اور اولوالعزم رسولوں کی جماعت سے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٦١٤ـ ٦١٥) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢١٣) [3] فتح القدير (٤/ ٣٤٧)

سب سے پہلے کیا، باوجود اس کے کہ آپ کا عہدِ مبارک آخر میں ہے، چنانچہ اس میں آپ کے لیے وہ شرف اور عظمت ہے جو مخفی نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ نوح علیہ السلام کا ذکر جو آیت: ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ﴾ [الشوریٰ: ١٣] ''اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا۔'' میں مقدم کیا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت اس لیے ذکر کی گئی ہے کہ جس عہدِ قدیم کو لے کر نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے اور جس عہدِ جدید کو لے کر ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور جس شے کو ان کے درمیان کے مشہور انبیاء لے کر مبعوث ہوئے، اس کا وصف بیان کرنا منظور ہے۔ چنانچہ اس میں نوح علیہ السلام کے ذکر کو پہلے کرنے کو مقصود سے سخت تر مناسبت ہے، وہ مقصود یہی اصالت وقِدمِ دین کا بیان کرنا ہے۔ یہ امام کرخی رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل ہے۔

پھر جو عہد و میثاق انبیاء علیہم السلام سے لیا اس کو بار بار ذکر کر کے اور اس کو غلیظ (سخت) کہہ کر اس کی تاکید کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴾ یعنی ہم نے ان سے نہایت سخت عہد لیا، یعنی اس بات پر کہ ان پر عبادتِ الٰہی کا اور اس کی طرف بلانے کا بار جو اُن پر رکھا گیا ہے اور اللہ نے جس شے کا ان سے عہد لیا ہے، اس کو پورا پورا وفا کریں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ پاک نے ان سے دوبارہ عہد لیا ہو، پہلی بار تو صرف میثاق ہو بغیر تغلیظ اور تشدید کے، پھر دوبارہ مغلظ سخت عہد لیا ہو۔ ابو مریم غسانی سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کی نبوت میں سب سے پہلے کیا چیز تھی؟ فرمایا: اللہ نے مجھ سے میثاق لیا، جیسا کہ نبیوں سے ان کا میثاق لیا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴾ تک اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا پڑھی: ﴿ وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [البقرة: ١٢٩] ''اور ان لوگوں کے لیے انھی میں سے ایک رسول بھیج۔'' اور عیسیٰ بن مریم کی خوش خبری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے اپنے خواب میں دیکھا تھا کہ ان کے دونوں پاؤں کے درمیان سے ایک چراغ نکلا، جس کے واسطے شام کے محل روشن ہوگئے۔[1] (أخرجه الطبراني و ابن مردويه و أبو نعيم في الدلائل)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کسی نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ کا میثاق کب لیا گیا؟ فرمایا: اس وقت جب کہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔[2] ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں، کسی نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ کب نبی تھے؟ فرمایا: اس حال میں کہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔[3] (أخرجه البزار والطبراني) اس بارے میں اور حدیثیں بھی ہیں جن میں سے بعض کی تصحیح کی گئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ مِيْثَاقَهُمْ ﴾ ''عَهْدَهُمْ'' دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ پاک نے جو میثاق نبیوں کا لیا وہ ان کی قوم پر لیا۔[4]

---

[1] المعجم الكبير (٢٢/ ٣٣٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله وثقوا'' (مجمع الزوائد: ٨/ ٤١٠) [2] الدر المنثور (٦/ ٥٦٩)

[3] مسند البزار (١١/ ٤٧٦) المعجم الأوسط (٤/ ٢٧٢) اس کی سند میں ''جابر جعفی'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ یہ روایت دیگر طرق سے صحیح ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ١٨٥٦)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١١٦)

﴿ لِيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ﴾ میں حرف لام لامِ ''كَيْ'' ہے، یعنی تاکہ سچوں سے پوچھے کہ انھوں نے اپنی قوم کی طرف رسالت کو صحیح پہنچایا اور واقعی پہنچا دیا۔ یہ سوال ان لوگوں کے عاجز کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے ہے جنھوں نے ان کا انکار کیا ہے، کیوں کہ اس میں غیر انبیاء کے لیے وعید ہے، کیوں کہ جب ان سے اس کا سوال ہوگا تو ان کے غیر سے کیوں نہیں ہوگا۔ کسی نے کہا کہ یہ معنی ہیں: تاکہ سوال کرے انبیاء سے اس بات کے متعلق جس کے ساتھ ان کی قوم نے ان کو جواب دیا، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٦] ''چناں چہ ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم رسولوں سے بھی ضرور سوال کریں گے۔'' اور اس آیت میں ہے: ﴿ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ﴾ [المائدة: ١٠٩] ''اس دن (کو یاد کرو) جب اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر (ان سے) کہے گا کہ تمھیں کیا جواب دیا گیا تھا؟''

یہ بھی جائز ہے کہ لام محذوف سے متعلق ہو، یعنی ''فَعَلَ ذٰلِكَ لِيَسْأَلَ... الخ''۔ حاصل یہ ہے کہ یہاں ایک امر تو یہ ہے کہ لام کس معنی میں ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ کس سے متعلق ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ صادقین سے کون مراد ہیں۔ چوتھا یہ ہے کہ صدق کے کیا معنی ہیں۔ چنانچہ پہلے امر کا بیان تو یہ ہے کہ لام بہ معنی ''كَيْ'' ہے، جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ یا صیرورت کا لام ہے، یعنی اللہ نے نبیوں سے عہد لیا، تاکہ امر اس طرف کو منتقل ہو جائے کہ سوال کرے صادقوں سے ان کے صدق کے بارے میں۔ دوسرے امر کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اَخَذْنَا ﴾ سے متعلق ہے اور کلام میں التفات ہے متکلم سے غائب کی طرف، یا محذوف سے متعلق ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

تیسرے کا بیان یہ ہے کہ صادقین سے مراد رسول ہیں، جس طرح کہ پہلے گزرا، یا مومنین مراد ہیں، تاکہ مومنین سے ان کے صدق کے بارے میں پوچھے اور کافروں سے ان کے کذب کے بارے میں پوچھے، چوں کہ دوسرے جملے کا مسبب مذکور ہے، یعنی ﴿ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ اس لیے اس پر کفایت کر کے اس کو حذف کر دیا ہے۔ چوتھے امر کا بیان یہ ہے کہ صدق کے معنی راستی اور سچائی کے ہیں، یا بہ معنی تصدیق ہے، اس صورت میں اس کا مفعول محذوف ہے۔ ''أَيْ: عَنْ تَصْدِيْقِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ''، یعنی تاکہ مومنوں سے ان کے نبیوں کی تصدیق کرنے کے بارے میں پوچھے اور کافروں سے ان کی تکذیب کے بارے میں۔ یا صدق کے معنی اخلاص کے ہیں، یعنی تاکہ مومنوں سے ان کے اخلاص کے بارے میں پوچھے کہ ان کا عمل خالص اللہ عزوجل کے لیے ہے یا نہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ معنی ہیں: تاکہ ان صادقین سے جو اپنے منہ سے سچے ہیں، ان کی سچائی کے بارے میں پوچھے، جو ان کے دلوں میں ہے اور کافروں سے ان کی تکذیب کا پوچھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ معطوف ہے، اس شے پر جس پر ﴿ لِيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾

دال ہے، کیوں کہ تقدیر یہ ہے: ''فَأَثَابَ الصَّادِقِينَ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ'' یعنی تا کہ پوچھے صادقین سے جب ان کا صدق ظاہر ہوگیا تو ان کو ثواب دیا اور کافروں کے لیے دُکھ کی مار تیار کی۔ یا معطوف ہے ﴿ اَخَذْنَا ﴾ پر، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ بے شک اللہ نے نبیوں کو تاکید کی ہے کہ وہ اس کے دین کی طرف بلائیں مومنوں کو ثواب دینے کے لیے اور کافروں کے لیے عذابِ الیم تیار کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دوسرے جملے سے وہ شے حذف کی گئی ہے جس کا مقابل پہلے جملے کے اندر ثابت کیا گیا ہے اور پہلے سے وہ شے حذف کی گئی ہے جس کا مقابل دوسرے میں ثابت کیا گیا ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''لِيَسْأَلَ الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ فَأَثَابَهُمْ وَيَسْأَلَ الْكَافِرِينَ عَمَّا أَجَابُوا بِهِ رُسُلَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا'' یعنی تا کہ سچوں سے ان کے بارے میں پوچھے۔ پھر ان کو ثواب دیا اور پوچھے کافروں سے وہ چیز جس کے ساتھ انھوں نے اپنے رسولوں کو جواب دیا اور ان کے لیے عذابِ الیم تیار کیا۔ (کذا ذکر السمین) کسی نے کہا ہے کہ فعل مقدر پر معطوف ہے جو ﴿ لِيَسْئَلَ ﴾ میں عامل ہے: ''أَيْ: فَعَلَ ذٰلِكَ لِيَسْأَلَ وَأَعَدَّ'' جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَنْ صِدْقِهِمْ ﴾ پر کلام پورا ہوگیا۔

رہا ﴿ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ تو یہ مستقل جملہ مستانفہ ہے، اس سے غرض وہ چیز بیان کرنا ہے جو کفار کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ گویا جواب ہے سوال مقدر کا۔ مثلاً: کسی نے کہا ہے کہ اللہ سچوں سے سچ کا پوچھ کر جو سچ کی جزا ہے وہ ان کو عطا کرے گا، منکرین اور مکذبین کے بارے میں بتاؤ کہ ان کی کیا گت بنے گی تو یہ اس کا جواب ہے کہ ان کے لیے دکھ کی مار تیار کر رکھی ہے۔[1]

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ۚ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ ﴾

اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو، جب تمھیں (کفار کے) لشکروں نے آلیا تھا، پھر ہم نے ان پر آندھی اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر بھیجے، جنھیں تم نے دیکھا نہیں اور تم جو عمل کرتے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے ⑨ جب دشمن تم پر تمھارے اوپر (کی طرف) سے اور تمھارے نیچے (کی طرف) سے چڑھ آئے اور جب آنکھیں (خوف وہراس کی وجہ سے

[1] فتح البیان (۱۱/ ۵۰۔ ۵۲)

اصل جگہ سے) ہٹ گئیں اور کلیجے حلقوں کو پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے ⑩

غزوۂ احزاب کا بیان:

ہجرت کے چوتھے سال یہود بنی نضیر جو مدینے سے نکالے گئے تھے، وہ ہر قوم میں پھرے اور قریش کو اور فزارہ اور غطفان کو اور بنی قریظہ کو جو مدینے کے پاس تھے جمع کر کے نبی اکرم ﷺ پر چڑھائی کی، بارہ ہزار آدمی تھے۔ اس کا ذکر سورۃ الحشر میں آئے گا۔ مسلمان کم تھے صرف تین ہزار۔ مدینے سے باہر لشکر پڑا۔ خندق کھودی گئی۔ جب فوجیں آئیں دور دور سے لڑتے رہے، تقریباً ایک ماہ تک۔ پھر ایک رات اللہ تعالیٰ نے پُروا کی تیز ہوا بھیجی، کافروں کی آگیں بجھ گئیں، بھوکے مرے اور خیمے گر پڑے، گھوڑے چھوٹ گئے، سب لشکر برباد ہوا، مجبوراً اٹھ کر چلے گئے، یہ جنگِ احزاب یا جنگِ خندق کہلاتی ہے۔ جاڑے کے موسم میں اناج کی تنگی، لڑائی لڑنا اور خندق کھودنا، جبکہ اِردگرد سب مخالف ہوں، اس میں منافق دل کی باتیں بولنے لگے اور مومن ثابت قدم رہے، اس جنگ میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اب ہم کفار پر چڑھائی کریں گے، وہ ہم پر چڑھائی نہیں کریں گے۔ اُوپر سے اور نیچے سے چڑھ آئے، یعنی مدینے کی مشرقی طرف سے جو اونچی ہے اور مغربی طرف سے جو نیچی ہے۔ آنکھیں پتھرا گئیں، یعنی لوگوں کے تیور بدلنے لگے، دوستی جتانے والے آنکھیں چُرانے لگے اور کلیجے منہ کو آگئے، یعنی ڈر وخوف سے دھڑک دھڑک کر۔ طرح طرح کے گمان کرنے لگے، یعنی مسلمانوں نے سمجھا کہ اب کے اور سخت آزمائش آئی اور کچے ایمان والوں نے سمجھا کہ اب کی بار نہ بچیں گے۔ انتہٰی

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک اپنی نعمت وفضل وکرم اور احسان کی خبر دیتا ہے، جو اس نے اپنے مومن بندوں پر اس بارے میں کیا کہ اس نے ان کے دشمنوں کو پھیر دیا اور جس سال وہ عداوت اور کینہ کی وجہ سے ان پر جمع ہوگئے تھے اور جتھے بن گئے تھے تو ان کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ خندق کا سال تھا، ماہِ شوال ۵ ہجری میں صحیح اور مشہور قول کی بنا پر۔ موسیٰ بن عقبہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ ۴ میں ہوا۔ فوجوں کے آنے کا سبب یہ تھا کہ اشراف یہود کا ایک گروہ، یعنی بنی نضیر جن کو رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی طرف جلا وطن کر دیا تھا، ان میں سے سلام بن ابی الحقیق اور سلام بن مشکم وکنانہ بن ربیع تھے، یہ لوگ مکے کی طرف نکلے اور اشرافِ قریش سے ملے اور ان کو نبی اکرم ﷺ کے خلاف لڑائی کے لیے جمع کیا اور اپنی طرف سے ان کو مدد اور اعانت کا وعدہ دیا تو انھوں نے ان کی یہ بات قبول کر لی، پھر غطفان کی طرف نکلے اور انھیں بھی یہی دعوت دی جو انھوں نے بھی قبول کر لی اور قریش اپنے احابیش اور تابعین کی طرف گئے۔ (احابیش جماعاتِ مجتمع کو کہتے ہیں، متفرق قبیلوں میں سے۔ ''تحبش'' بہ معنی

"تجمع" ہے۔ حبشی بالضم مکے کی پست جانب میں ایک پہاڑ ہے۔ اسی سے احابیشِ قریش ہیں، کیوں کہ ان لوگوں نے اللہ کی قسم اس بات پر کھائی تھی کہ وہ مدد ہیں ان کے غیر پر، جب تک کہ رات تاریک ہو اور دن روشن ہو اور حبشی جما رہے۔ الفاظ یہ ہیں: "إنھم لید علی غیرھم ما سجا لیل ووضح نھار ورسی حبشی"[1] كذا في القاموس ومجمع البحار)۔

تمام لشکروں کا سردار ابوسفیان صخر بن حرب تھا اور غطفان پر عیینہ بن حصن بن بدر سردار تھا اور سب لوگ تقریباً دس ہزار تھے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے ان کے روانہ ہونے کی خبر سنی تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مدینے کے گرد اس طرف سے خندق کھودنے کا حکم دیا جو مشرقی جانب سے متصل ہے۔ یہ کام سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اشارے سے کیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس میں خوب دل لگا کر اور کوشش سے کام کیا اور خود رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ مٹی اٹھائی اور کھودا۔ آپ ﷺ کے اس کھودنے میں کھلی کھلی نشانیاں اور واضح واضح دلیلیں ہوئیں۔ مشرکین آئے تو مدینے کے مشرقی جانب اُحد کے قریب اترے اور ان کا ایک گروہ مدینہ کی زمین کی بلند جانب میں اترا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ﴾ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان جو آپ کے ہمراہ تھے نکلے۔ یہ لوگ تقریباً تین ہزار تھے۔ کسی نے کہا: سات سو تھے، پس انھوں نے اپنی پشت سلع پہاڑ کی طرف کی اور منہ دشمن کی طرف کیے ("سَلْع" بہ فتحِ سین وسکونِ لام مدینے میں ایک پہاڑ ہے۔) خندق ایک چھوٹا گڑھا تھا، اس میں کچھ پانی نہ تھا، وہ ان کے اور دشمنوں کے درمیان سواروں اور پیدلوں کو روکتا تھا کہ ان کی طرف پہنچیں۔ اور عورتوں اور بچوں کو آطامِ مدینہ، یعنی مدینے کے قلعوں یا بلند عمارتوں میں رکھ دیا تھا۔

بنی قریظہ یہود کا ایک گروہ ہے جو مدینے کے مشرقی جانب ہے۔ ان کا ایک قلعہ تھا اور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ان کے لیے عہد اور ذمہ تھا۔ یہ لوگ قریباً آٹھ سو لڑنے والے افراد تھے۔ چنانچہ حیی بن اخطب نضری ان کی طرف گیا، ان کو سمجھاتا بجھاتا رہا، یہاں تک کہ انھوں نے عہد توڑ ڈالا اور فوجیں رسول اللہ ﷺ کی طرف جھک پڑیں تو حادثۂ عظیم ہوا۔ سخت امر پیش آیا، حالت تنگ ہوگئی جس طرح کہ اللہ پاک نے ذکر فرمایا ہے: ﴿ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴾ [الأحزاب: ١١] "وہاں مومن آزمائے گئے اور شدت سے ہلا مارے گئے۔"

فوجیں نبی اکرم ﷺ کو اور آپ ﷺ کے اصحاب کو قریباً ایک ماہ تک گھیرے ہوئے پڑی رہیں، مگر وہ آپ ﷺ تک پہنچتی نہ تھیں اور نہ ان کے درمیان لڑائی واقع ہوئی، مگر عمرو بن عبدِ ود عامری، جو جاہلیت میں بہادری اور شہہ سواری میں مشہور تھا، وہ اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر سوار ہوا اور یہ لوگ بے دھڑک خندق میں گرے اور مسلمانوں کی طرف پہنچ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمان سواروں کے ایک دستے کو اس کی طرف روانہ فرما دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے

[1] القاموس المحيط (١/ ٧٥٩) مجمع بحار الأنوار (١/ ٤٣٧)

سامنے کوئی نہ آیا تو آپ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، پس وہ اس کی طرف نکلے، پھر گھڑی بھر کے لیے دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیا، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر ڈالا، پس اس کا قتل نصرتِ غیبی اور کامیابی کی نشانی ٹھہرا۔ پھر اللہ عزوجل نے ان فوجوں پر ایک سخت زور دار چلنے والی ہوا بھیجی، یہاں تک کہ ان کا نہ کوئی خیمہ باقی رہا نہ کوئی اور شے۔ نہ ان کی آگ جلی نہ ان کو کچھ قرار ہوا، یہاں تک کہ خائب و خاسر ہوتے ہوئے وہاں سے کوچ کر گئے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا ﴾[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "ریح" سے مراد بادِ صبا ہے۔[2] دوسری حدیث اسی کی تائید کرتی ہے کہ «نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَأُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ»[3] یعنی مجھے بادِ صبا سے فتح مندی ہوئی اور عاد بادِ دبور سے ہلاک کیے گئے ؎

صبا کا کام ہے فتح وظفر دینا مسلمان کا الٰہی تو ہی حامی ہے ہمارے دین و ایمان کا

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ احزاب کی رات کو جنوبی ہوا نے شمالی سے کہا کہ چل ہم رسول اللہ ﷺ کی مدد کریں تو شمالی نے کہا کہ حرہ رات کو نہیں چلتی ("إن الحرة لا تسري بالليل" اصل میں اسی طرح ہے، یعنی آزاد اور شریف عورت کی شان نہیں کہ رات کو چلے پھرے، گویا بادِ شمال نے رات کو نہ چلنے کا یہ عذر پیش کیا اور ایک بڑی عظیم الشان خیر سے محروم رہی۔ اللہ پاک نے یہ خیر بادِ صبا کو عنایت فرمائی)۔ کہا: پھر وہ ہوا جو اُن پر بھیجی گئی، وہ صبا تھی۔[4] (رواہ ابن أبي حاتم بسندہ عن عكرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فذكرہ)

نیز امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مجھے میرے ماموں عثمان بن مظعون نے خندق کی رات سخت سردی میں مدینے کی طرف بھیجا اور کہا کہ ہمارے پاس کھانا اور لحاف لے آ۔ کہا: پھر میں نے رسول اللہ ﷺ سے اِذن مانگا تو آپ ﷺ نے مجھے اِذن دے دیا اور فرمایا کہ راستے میں میرے جن اصحاب سے تو ملے تو ان کو حکم کرنا کہ وہ لوٹ جائیں۔ کہا: پھر میں چلا اور حال یہ تھا کہ ہوا ہر شے کو اڑا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے شروع کیا کہ جس سے میں ملتا تو اس کو نبی اکرم ﷺ کی طرف لوٹنے کا حکم کرتا۔ کہا: پھر ان میں سے کوئی اپنی گردن کو نہیں موڑتا تھا۔ کہا: اور میرے پاس میری ڈھال تھی، جس کو ہوا مجھ پر مارتی تھی، اس میں لوہا تھا۔ کہا: پھر اس کو ہوا نے مارا، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ لوہا میری ہتھیلی پر گرا اور اس کو چیرتے ہوئے زمین کی طرف چلا گیا۔[5]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ سے مراد فرشتے ہیں، انھوں نے ان کو خوب جھڑ جھڑایا اور ان کے دلوں میں رعب وخوف ڈالا، چنانچہ ہر قبیلے کا سردار کہتا تھا: اے بنی فلاں! میری طرف آؤ، پھر وہ اس کی طرف جمع ہوتے تو

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦١٥۔ ٦١٦) [2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢١٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٩٨٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٠٠)

[4] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢١٤) [5] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢١٥) اس کی سند میں "عبداللہ بن عمر عمری" ضعیف راوی ہے۔

کہتا: ''اَلنَّجَاءَ اَلنَّجَاءَ'' یعنی نجات طلب کرو، اس رعب کی وجہ سے جو اللہ عزوجل نے ان کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے عن یزید بن زیاد عن محمد بن کعب قرظی روایت کیا ہے کہ کوفے والوں میں سے ایک جوان نے حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے کہا: اے ابوعبداللہ! تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور ان کی صحبت میں رہے؟ کہا: ہاں، اے بھتیجے! کہا کہ تم کس طرح کرتے تھے؟ فرمایا: واللہ! البتہ واقعی ہم جہد اور مشقت کرتے تھے۔ وہ جوان بولا: واللہ! اگر ہم ان کو پاتے تو ان کو زمین پر چلنے نہ دیتے اور ان کو اپنی گردنوں پر سوار کر لیتے۔ کہا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے بھتیجے! واللہ! اگر تو دیکھتا ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جنگِ خندق میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو دیر تک نماز پڑھی، پھر ہماری طرف توجہ فرمائی اور فرمایا کہ کون ہے جو کھڑا ہو اور دیکھے کہ ہمارے دشمنوں نے ہمارے لیے کیا کیا؟ یعنی جاسوسی کرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے شرط کرتے تھے کہ اگر وہ لوٹ آئے گا تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ کہا کہ کوئی مرد کھڑا نہ ہوا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیر تک رات کو نماز پڑھی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ویسی ہی بات فرمائی تو ہم میں سے کوئی مرد کھڑا نہ ہوا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو دیر تک نماز پڑھی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کون شخص ہے جو کھڑا ہو اور دیکھے کہ ہمارے لیے قوم نے کیا کیا، پھر وہ لوٹ آئے تو اس کے لیے اللہ کا رسول اس کے لوٹ آنے کی شرط کرتا ہے اور فرمایا کہ میں اللہ سے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ وہ جنت میں میرا رفیق ہو۔

پھر خوف، بھوک اور سردی کی شدت کی وجہ سے کوئی شخص کھڑا نہ ہوا۔ پھر جب کوئی بھی کھڑا نہ ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا۔ پس میرے لیے اب کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حذیفہ! تو جا اور قوم میں داخل ہو، پھر دیکھ وہ کیا کرتے ہیں اور تو کوئی نئی شے نہ کرنا، یہاں تک کہ تو ہمارے پاس آجائے۔ پھر میں گیا اور قوم میں داخل ہوا درآنحالیکہ ہوا اور اللہ عزوجل کے لشکر ان کے ساتھ کر رہے تھے جو کچھ کر رہے تھے۔ ان کو نہ کچھ قرار ہوتا تھا، نہ آگ رہتی تھی، نہ کوئی ڈیرا ٹھہرتا تھا۔ پھر ابوسفیان کھڑا ہوا اور کہا: اے گروہِ قریش! چاہیے کہ ہر آدمی اپنے جلیس (ساتھی) پر نظر کرے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پس میں نے اس مرد کا ہاتھ پکڑا، جو میرے پہلو کی طرف تھا اور کہا کہ تو کون ہے؟ وہ بولا: میں فلاں بن فلاں ہوں۔ پھر ابوسفیان نے کہا: اے گروہِ قریش! بے شک تم واللہ صبح نہ کرو گے دارِ مقام میں۔ البتہ مقرر ہلاک ہو گئے گھوڑے اور اونٹ اور بنی قریظہ نے ہم سے وعدہ خلافی کی اور ہمیں ان سے وہ چیز پہنچی جس کو ہم پسند نہیں کرتے اور اس ہوا سے ہم کو وہ شے لاحق ہوئی جس کو تم دیکھ رہے ہو، واللہ! نہ تو ہماری دیگ جمتی ہے، نہ ہماری آگ قائم رہ سکتی ہے، نہ ہمارا کوئی خیمہ تھم سکتا ہے، لہٰذا تم کوچ کرو، کیوں کہ میں تو کوچ کرنے والا ہوں، پھر وہ اپنے اونٹ کی طرف گیا جو بندھا ہوا تھا، وہ اس پر بیٹھ گیا تو اس کو مارا تو وہ اس کو لے کر تین پاؤں پر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے اس کے پاؤں کا بندھن اس کے کھڑے

ہوئے ہی کھولا۔ اگر رسول اللہ ﷺ کا مجھ سے یہ عہد نہ ہوتا کہ تو کوئی نئی شے نہ کرنا یہاں تک کہ تو میرے پاس آئے تو اگر میں چاہتا تو اس کو تیر سے قتل کر ڈالتا۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ آیا اور آپ ﷺ اس وقت کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ کے اوپر اپنی کسی بی بی کی مرط مرجل تھی۔ (مرط بالکسر صوف کی چادر ہے۔ مرجل بہ جیم و حائے مہملہ دونوں پر مروی ہے۔ پہلے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں ہنڈیوں دیگوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ دوسرے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں اونٹ کے کجاوں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں)۔ جس وقت آپ ﷺ نے مجھے دیکھا تو اپنے دونوں پاؤں کے درمیان مجھے بٹھا لیا اور مرط کا کنارا مجھ پر ڈال دیا۔ پھر آپ ﷺ نے رکوع اور سجدہ کیا اس حال میں کہ میں ان کے پاؤں کے درمیان تھا، پھر جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو میں نے آپ ﷺ سے خبر بیان کی۔ قریش نے جو کچھ کام کیا اس کے بارے میں غطفان نے سنا تو وہ بھی لوٹتے ہوئے اپنے بلاد کی طرف چل دیے۔[1]

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں "من حديث الأعمش عن إبراهيم التيمي عن أبيه" روایت کیا ہے کہ ہم سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ ان سے ایک شخص نے کہا کہ اگر میں رسول اللہ ﷺ کو پاتا تو آپ ﷺ کے ساتھ ہو کر لڑتا اور خوب کام دیتا تو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ تو یہ کام کرتا، البتہ ہم نے یقیناً اپنے آپ کو سخت سردی کی رات میں، یعنی شبِ احزاب میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ دیکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا نہیں ہے کوئی ایسا شخص جو جا کر قوم کی خبر لائے تو قیامت کے دن میرے ساتھ ہو، تو ہم میں سے کسی نے آپ ﷺ کو جواب نہ دیا۔ پھر دوسری بار، پھر تیسری بار ویسا ہی فرمایا۔ پھر فرمایا: اے حذیفہ! کھڑا ہو اور ہمارے پاس قوم سے کوئی خبر لا۔ چنانچہ میں نے کوئی چارہ نہ پایا، جب آپ ﷺ نے میرا نام لے کر مجھ کو پکارا، اس سے کہ میں کھڑا ہو جاؤں۔

پھر فرمایا: «اِئْتِنِي بِخَبَرِ الْقَوْمِ وَلَا تَذْعَرْهُمْ عَلَيَّ» یعنی تو میرے پاس قوم کی خبر لا اور تو ان کو گھبراہٹ میں نہ ڈال اور ان کو مجھ پر حرکت نہ دے۔ ("تَذْعَرْهُمْ" بہ فتح تائے فوقیہ "أي: لا تفزعهم علي و تحركهم علي، يعني لا تحركهم عليك فإنهم إن أخذوك كان ذلك ضررا علي لأنك رسولي" مطلب یہ ہے کہ چپکے سے جا کر ان کی خبر لے آ، تیری ان کو خبر نہ ہونے پائے۔ ان کو مجھ پر حرکت مت دے، یعنی اپنے اوپر ان کو حرکت مت دے، اگر تجھے پکڑ لیں گے تو اس کا ضرر مجھ پر ہوگا، کیوں کہ تو میرا قاصد ہے۔ قاصد کی تعظیم و توہین بھیجنے والے کی تصور کی جاتی ہے)۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں چلا، گویا میں حمام میں چل رہا ہوں، یہاں تک کہ میں ان کے پاس آیا تو دیکھا کہ ابوسفیان اپنی پیٹھ آگ سے تاپ رہا ہے۔ میں نے اپنی کمان کے بیچ میں ایک تیر رکھا اور چاہا کہ اس کو ماروں،

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢١٥۔ ٢١٦) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کا قول یاد کیا کہ «لَا تَذْعَرْهُمْ عَلَيَّ» اور اگر میں اس کو مارتا تو البتہ تیر نشانے پر لگاتا، چوکتا نہیں۔ کہا: پھر میں لوٹا تو گویا حمام میں چل رہا ہوں۔ چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا، پھر مجھے سردی لگی، جبکہ میں فارغ ہو گیا اور چین پکڑا (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: "ثم أصابني البرد حين فرغت و قررت" چوں کہ "قررت، فرغت" کے پاس ہے، اس لیے بہ معنی قرار بہتر معلوم ہوتا ہے۔ یا "قَرٌّ" بہ معنی سردی ہو تو "أصابني البرد" کی تاکید ہو گی۔ واللّٰہ أعلم)۔ پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی۔ "وَأَلْبَسَنِيْ مِنْ فَضْلِ عَبَاءَةٍ كَانَتْ عَلَيْهِ يُصَلِّيْ فِيْهَا" یعنی جس کپڑے میں آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، اس میں سے کچھ کپڑا مجھ پر ڈال دیا، یعنی سردی کے خیال سے، پھر میں صبح تک سوتا رہا، پھر جب میں نے صبح کی، یعنی سوتے سوتے صبح ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «قُمْ يَا نَوْمَانُ» یعنی اُٹھ کھڑا ہو اے زیادہ سونے والے![1]

یونس بن بکیر نے عن ہشام بن سعد عن زید بن اسلم اس کو یوں روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہم اللہ سے شکوہ کرتے ہیں تمھاری صحبت کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کہ تم نے تو ان کو پایا اور تم نے تو ان کو دیکھا اور ہم نے ان کو نہ پایا اور نہ دیکھا تو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم اللہ کی طرف تمھارے ان پر ایمان لانے کا شکوہ کرتے ہیں، حالاں کہ تم نے ان کو نہیں دیکھا۔ قسم ہے اللہ کی اے بھتیجے! تو نہیں جانتا کہ اگر تو ان کو پاتا تو کیسا ہوتا، البتہ ہم نے واقعی اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ دیکھا ہے شبِ خندق میں ایک سرد بارش والی رات کو، پھر تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کیا جو گزر چکا ہے۔[2] بلال بن یحییٰ عبسی نے بھی سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔[3]

امام حاکم اور بیہقی نے دلائل میں "من حديث عكرمة بن عمار عن محمد بن عبد الله الدؤلي عن عبدالعزيز ابن أخي حذيفة" روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مشاہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا تو ان کے ہم نشیں لوگ بولے: سنتے ہو، واللہ! اگر ہم ان میں حاضر ہوتے تو البتہ ہم کرتے اور کرتے، یعنی خوب کام کرتے اور بہ خوبی لڑتے بھڑتے، خوب سعی و کوشش بجا لاتے، پس سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم اس کی تمنا مت کرو۔ البتہ واقعی ہم نے اپنے آپ کو احزاب کی رات کو اس حال میں دیکھا ہے کہ ہم صف باندھے بیٹھے ہوئے ہیں اور ابوسفیان اور اس کے ساتھ والے لوگ ہمارے اوپر ہیں اور یہود کے قریظہ ہمارے نیچے ہیں، ہم ان سے ڈر رہے ہیں، اپنی ذریات (بچوں) پر اور ہم پر اس رات سے زیادہ سخت اور اندھیری اور تیز ہوا والی کوئی رات نہیں آئی۔ اس ہوا کی آواز ایسی تھی، جیسے سخت گرج کے ساتھ بجلی ہوتی ہے اور وہ ایسی تاریک رات تھی کہ کسی کو اپنی انگلی نظر نہیں آتی تھی۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (١٧٨٨) [2] دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ٤٥٤) [3] دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ٤٥٠)

منافقوں نے شروع کیا کہ نبی اکرم ﷺ سے اجازت مانگتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں، حالاں کہ وہ کھلے پڑے ہوئے نہیں تھے۔ چنانچہ جس کسی نے ان میں سے اذن مانگا اس کو اذن دیا اور آپ ﷺ ان کو اذن دیتے تو سٹک جاتے تھے اور ہم تین سو آدمی تھے یا اس کے قریب جس وقت کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے آئے، ایک ایک شخص کر کے، یہاں تک کہ آپ ﷺ مجھ پر آئے، اس حال میں کہ مجھ پر بچاؤ کی شے نہ تھی، نہ دشمنوں سے بچاؤ کی نہ سردی سے بچاؤ کی، مگر صوف کی ایک چادر جو میری بیوی کی تھی اور وہ میرے گھٹنوں کے نیچے تک آتی تھی، کہا: پس رسول اللہ ﷺ میرے پاس آئے اور میں اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا تو فرمایا: یہ کون ہے؟ میں نے عرض کی: ''حُذَيْفَةُ، فَتَقَاصَرْتُ الْأَرْضَ'' (تفسیر ابن کثیر میں اسی طرح ہے اور فتحین میں ''إِلَى الأرض'' ہے[1])

یعنی پھر میں زمین میں بچھ گیا، پھر میں نے کہا: ہاں یارسول اللہ! اس بات کی کراہت کرتے ہوئے کہ کھڑا ہوؤں (فتحین میں یوں ہے: «قَالَ: قُمْ فَقُمْتُ فَقَالَ: إِنَّهُ كَانَ فِي الْقَوْمِ خَبَرٌ فَأْتِنِي بِخَبَرِ الْقَوْمِ...[2] الخ»)۔

پھر میں کھڑا ہوا تو فرمایا: « إِنَّهُ كَائِنٌ فِي الْقَوْمِ خَبَرٌ فَأْتِنِي بِخَبَرِ الْقَوْمِ » یعنی قوم میں ضرور کوئی خبر ہونے والی ہے سو تو میرے پاس قوم کی خبر لا۔ کہا: اور میں سب لوگوں سے زیادہ خوف زدہ تھا اور زیادہ سردی محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نکلا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی: « اَللّٰهُمَّ احْفَظْهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ وَعَنْ يَّمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ وَمِنْ فَوْقِهِ وَمِنْ تَحْتِهِ » یعنی الٰہی! تو اسے محفوظ رکھ اس کے آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے اور اوپر سے اور نیچے سے۔ کہا: پھر قسم ہے اللہ کی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی ڈر کو اور کسی سردی کو میرے پیٹ میں پیدا نہیں کیا، مگر وہ پیٹ میں سے نکل گیا تو میں اپنے اندر کسی شے کو نہیں پاتا تھا۔ کہا پھر میں جب پشت پھیر کر چلا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے حذیفہ! قوم میں ہرگز کوئی نئی شے نہ کرنا، یہاں تک کہ تو میرے پاس آجائے۔

کہا: پھر میں نکلا، یہاں تک کہ جس وقت میں قوم کے لشکر کے قریب ہوا تو ان کی آگ جو چل رہی تھی، اس کی روشنی میں مَیں نے دیکھا تو اچانک ایک سیاہ فام شخص سطبر اپنے ہاتھ سے آگ پر اشارہ کر رہا ہے اور اپنی کمر کو مسح کر رہا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ہاتھ کو آگ سے گرم کر کے اپنی کمر پر پھیرتا ہے، اس کو سینکتا ہے اور کہہ رہا ہے: ''اَلرَّحِيْلَ اَلرَّحِيْلَ'' یعنی کوچ کرو، کوچ کرو اور میں اس سے پہلے ابوسفیان کو پہچانتا نہ تھا، پھر میں نے اپنے ترکش سے ایک سفید پَر والا تیر نکالا اور میں اس کو اپنی کمان کے وسط میں رکھ رہا تھا، تاکہ اس سے آگ کی روشنی میں اس کو ماروں، پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کا قول یاد کیا کہ تو ان میں کوئی نئی شے مت کرنا، یہاں تک کہ میرے پاس آجائے، پھر میں رک گیا اور اپنا تیر ترکش میں واپس رکھ دیا، پھر میں نے اپنے دل کو مضبوط اور دلیر کیا، یہاں تک کہ لشکر میں گھسا تو مجھ سے سب سے زیادہ قریب بنی عامر تھے، وہ کہہ رہے تھے: ''يَا آلَ عَامِرٍ اَلرَّحِيْلَ اَلرَّحِيْلَ لَا

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦١٨) فتح القدیر (٤/ ٣٥٣) فتح البیان (١١/ ٥٣)
[2] فتح القدیر (٤/ ٣٥٣) فتح البیان (١١/ ٥٣)

مُقَامَ لَكُمْ"، یعنی کوچ کرو کوچ کرو، تمھارے لیے جائے قیام نہیں ہے اور دیکھا تو وہ ہوا صرف انھی کے لشکر میں ہے اور بالشت بھر بھی ان کے لشکر سے آگے نہیں بڑھتی، سو قسم ہے اللہ کی بے شک میں ان کی منازل میں پتھروں کی آواز کو سنتا تھا اور ان کے بچھونوں میں وہ ہوا ان پتھروں سے ان کو مارتی تھی۔

پھر نکلا میں نبی اکرم ﷺ کی طرف، جب آدھی راہ یا اس کے قریب پہنچا تو اچانک بیس کے قریب سوار ملے، جو عمامے باندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے صاحب کو خبر کر دے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے قوم سے اس کی کفایت کر دی۔ پھر میں رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ آیا، اس حال میں کہ آپ شملہ میں مشتمل ہو کر نماز پڑھ رہے تھے (شملہ وہ چادر ہے جس کو اوڑھتے ہیں۔ "اشتمال" چادر سے بدن لپیٹنے کو کہتے ہیں)۔ پس قسم ہے اللہ کی! جب میں لوٹ کر واپس آیا تو سردی مجھ پر لوٹ آئی اور میں سردی کے مارے کانپنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے میری طرف اشارہ فرمایا اور آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے تو میں آپ ﷺ کے قریب ہوا، پس آپ ﷺ نے مجھ پر شملہ، یعنی چادر لٹکا دی، تاکہ سردی کا بچاؤ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی عادتِ شریف تھی کہ جس وقت آپ کو کوئی امر پیش آتا تو نماز پڑھنے لگتے تھے۔ پھر میں نے آپ ﷺ کو قوم کی خبر کی اور یہ بتایا کہ میں ان کو کوچ کرتے ہوئے چھوڑ کر آیا ہوں اور اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴾[1] (و أخرج أبو داود في سننه منه كان رسول الله ﷺ إذا حزبه أمر صلى۔ من حديث عكرمة بن عمار به)[2]

قولہ سبحانہ و تعالیٰ: ﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ﴾ یعنی احزاب۔ پہلے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے گزر چکا ہے کہ یہ بنی قریظہ ہیں۔ ﴿ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ ﴾ یعنی خوف اور گھبراہٹ کی شدت سے۔ ﴿ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض لوگوں نے، جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے، یہ خیال کیا کہ دائرہ، یعنی حادثہ اور آزمائش مومنوں پر ہے اور اللہ عن قریب اس کو کرے گا۔[3] محمد بن اسحاق نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مومنین نے گمان کیا، ہر ایک گمان اور نفاق ظاہر ہو گیا، یہاں تک کہ معتب بن قشیر اخو بنی عمرو بن عوف نے کہا کہ محمد ﷺ تو ہم کو یہ وعدہ دیا کرتے تھے کہ ہم قیصر و کسریٰ کے خزانے کھائیں گے، حالاں کہ ہم میں سے کوئی اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ غائط کی طرف جائے[4] (غائط اصل میں پست جگہ کو کہتے ہیں، شہر کے باہر ایسی جگہ میں پاخانہ کو جایا کرتے تھے، چوں کہ محاصرے کی وجہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے، اس لیے یوں کہا)۔

حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مختلف ظنون کا یہ مطلب ہے کہ منافقوں نے تو یہ گمان کیا کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ٤٥١)
[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣١٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٠٣)
[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٢١)
[4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢١٧ ـ ٢١٨)

کے اصحاب جڑ سے اکھاڑ دیے جائیں گے اور مومنوں نے یہ یقین کیا کہ جو اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا ہے وہ حق ہے اور وہ ان کو عن قریب سارے ادیان پر غالب کر دے گا گو مشرک بُرا مانتے رہیں۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم نے خندق کے دن عرض کی: یارسول اللہ! کیا کوئی شے ہے جس کو ہم کہیں، بلاشبہہ دل تو واقعی گلوں تک پہنچ گئے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، کہو: ''اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَآمِنْ رَوْعَاتِنَا'' پس اللہ نے آپ کے دشمنوں کے منہ کو ہوا سے مارا، پھر ان کو ہوا سے ہزیمت دی۔ اور اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ابو عامر عقدی سے روایت کیا ہے، یعنی اے اللہ! تو ہمارے عیوب کو اور شرم و حیا کی چیزوں کو چھپا لے اور ہمارے خوف اور ڈر کو امن دے۔ آمین

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴾ تحقیق ہے امر بالتقویٰ کی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس طرح سے کہ تقوی کے ساتھ کسی اور کا خوف باقی نہیں رہتا۔ کلمۂ ﴿ نِعْمَةَ ﴾ کو اگر مصدر ٹھہراؤ گے تو ﴿ عَلَيْكُمْ ﴾ اس سے متعلق ہو جائے گا، ورنہ محذوف سے متعلق ہوکر ﴿ نِعْمَةَ ﴾ سے حال ہو گا یعنی ''كَائِنَةً عَلَيْكُمْ''. کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ بہ معنی ''حِيْنَ'' ظرف ہے نعمت کا، یا ''كَائِنَةً'' کا جو ﴿ عَلَيْكُمْ ﴾ میں عامل ہے۔ یا ''اُذْكُرْ'' محذوف کا۔ ﴿ جُنُوْدٌ ﴾ سے مراد احزاب کے لشکر ہیں جو نبی اکرم ﷺ پر جمع ہو کر آئے تھے اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تھی، اس کا نام غزوۂ خندق ہے۔ غزوۂ احد سے سال بھر بعد میں ہوا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں ابوسفیان بن حرب مع قریش کے اور الفاف، یعنی اور وہ لوگ جو اُن جیسے ان کے ہمراہ تھے۔ دوسرے عیینہ بن حصن فزاری اور وہ لوگ جو اس کے ہمراہ تھے اپنی قوم غطفان سے۔ تیسرے بنی قریظہ و بنی نضیر ان سب نے آکر مسلمانوں کو سخت تنگ کیا تھا، جس کا بیان اللہ پاک نے ان آیتوں میں فرمایا ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کا قول ماہِ شوال ۵ر ہجری ہے اور امام ابن وہب اور ابن قاسم رحمہ اللہ نے امام مالک سے سنہ ۴ ہجری کی روایت کی ہے۔[2] اہلِ سیر نے اس واقعے کو خوب تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ ﴾ کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ ''كَانَ يَوْمَ أَبِيْ سُفْيَانَ يَوْمُ الْأَحْزَابِ''[3] (كما أخرجه ابن جرير و ابن أبي حاتم و ابن مردويه والبيهقي في الدلائل عنه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا ﴾ معطوف ہے ﴿ اِذْ جَآءَتْكُمْ ﴾ پر۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہ ریحِ صبا

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٢١)　[2] تفسير القرطبي (١٤/ ١٢٧)

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢١٦۔ ٢١٧) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١١٦)

ہے، جو احزاب پر بھیجی گئی خندق کے دن، یہاں تک کہ اس نے ان کی ہنڈیاں گرا دیں اور ان کے خیمے اکھاڑ ڈالے۔[1] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ہوا مشرق کی جانب سے چلتی ہے جو سرد اور بہت زور کی تھی، حتی کہ ان کے ڈیرے اُکھاڑ دیے اور ان کو پتھروں اور کنکروں سے مارا اور ان کے منہ میں مٹی ڈال دی اور باوجود اس زور اور شدت کے ان سے تجاوز نہیں کیا، یعنی ان کے ڈیروں تک ہی رہی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب احزاب کی رات ہوئی تو بادِ شمال بادِ جنوبی کی طرف آئی اور کہا: چل پس مدد کر اللہ کی اور اس کے رسول کی تو بادِ جنوبی بولی کہ حرہ رات کو نہیں چلتی، چنانچہ اللہ اس پر خفا ہوا اور اس کو عقیم کر دیا۔ (پہلے ابن جریر کی روایت عکرمہ سے گزر چکی ہے کہ جنوبی نے شمالی سے کہا۔ واللّٰہ أعلم۔ ان میں سے کون سی روایت صحیح ہے)۔ پھر اللہ نے ان پر صبا بھیجی تو اس نے ان کی آگیں بجھا دیں اور ان کے خیموں کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَأُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ » پس یہ ہے اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ﴾[2] (أخرجه ابن جرير و ابن أبي حاتم و الحاكم في الكنى وأبو الشيخ وابن مردويه وأبو نعيم في الدلائل) کسی نے کہا ہے کہ صبا ایک ہوا ہے، اس میں روح ہے، یعنی راحت و آسایش، نہیں چلی کسی محزون پر مگر اس کا حزن جاتا رہا۔ شعراء کو بادِ صبا کے ساتھ تفنن کثیر ہے، اپنے اشعار میں اکثر اس کا ذکر کیا کرتے ہیں، انواع و اقسام کے مضامین اس میں نظم کرتے ہیں، جس کو ان کے دیوانوں (کلام) سے فریفتگی ہے، وہ اس بات کو خوب جانتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ سے مراد فرشتے ہیں، کہتے ہیں کہ ایک ہزار تھے، لڑے نہیں صرف احزاب کے دلوں میں رعب ڈالا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے ان پر فرشتے بھیجے تو انھوں نے میخیں اکھاڑ ڈالیں، خیموں کی طنابیں کاٹ ڈالیں، آگیں بجھا دیں، ہنڈیاں اوندھی کر دیں۔ گھوڑے کھل گئے، بعض بعض میں جولان کرنے لگے اور اللہ نے ان پر رعب بھیجا۔ مسلمانوں کی تکبیر لشکر کی جانبوں میں بہ کثرت ہوئی، یہاں تک کہ ہر قوم کا سردار اپنی قوم سے کہتا تھا: اے بنی فلاں! میری طرف آؤ، پھر جب وہ جمع ہو جاتے تو ان سے کہتا تھا: "اَلنَّجَاءَ اَلنَّجَاءَ" پھر وہ سب کے سب بغیر جنگ کے بھاگ گئے۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴾ جمہور نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے، یعنی اے مسلمانو! تم جو لڑائی کی ترتیب کرتے اور خندق کھودتے اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے اور اس پر توکل کرتے تھے، اللہ اس سب کو خوب دیکھتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ ﴾ یہ ﴿ اِذْ ﴾ اور اس کا مابعد دونوں اول ﴿ اِذْ ﴾ کے بدل ہیں اور جو اس میں عامل تھا، وہی اس میں بھی عامل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "اُذْكُرْ" محذوف کا ظرف ہے۔ ﴿ مِنْ فَوْقِكُمْ ﴾

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢١٦) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١١٧) الدر المنثور (٦/ ٥٧٣)

کے معنی ہیں: "مِنْ أَعْلَى الْوَادِي" یعنی وادی کے بلند جانب۔ یہ مشرقی جہت میں تھے، اس جہت سے جو آئے وہ یہ لوگ ہیں: ① غطفان۔ ان کا سردار عیینہ بن حصن تھا۔ ② ہوازن۔ ان کا سردار عوف بن مالک تھا۔ ③ اہلِ نجد۔ ان کا سردار طلیحہ بن خویلد اسدی تھا اور عوف بن مالک ان کے ساتھ مل گیا تھا۔ ④ بنی نضیر۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ﴾ یعنی مغربی سمت سے، یعنی اسفل وادی ناحیۂ مکہ سے۔ وہ یہ لوگ ہیں: ① قریش اور احابیش جو ان کے ہمراہ تھے۔ ان کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا۔ ② ابو الاعور سلمی اور اس کے ساتھ حیی بن اخطب یہودی، وہ بنی قریظہ کے یہود میں آیا خندق کے سامنے سے اور ان کے ساتھ عامر بن طفیل تھا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ ﴾ معطوف ہے ما قبل پر، حکمِ تذکیر میں داخل ہے، یعنی یاد کرو اس وقت کو کہ جب آنکھیں مائل ہو گئیں ہر شے سے، سو نہ دیکھا مگر اپنے دشمن کو کہ ہر جانب سے آ رہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دہشت کے مارے اوپر کو چڑھ گئیں خوف اور حیرت کی زیادتی سے۔

﴿ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ ﴾ ﴿ اَلْحَنَاجِرَ ﴾ "حَنْجَرَةٌ" کی جمع ہے۔ "حَنْجَرَةٌ" جوفِ حلقوم کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ راسِ غلصمہ کو، غلصمہ راسِ حلقوم کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ منتہائے حلقوم ہے اور حلقوم مجرائے طعام و شراب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مجرائے نفس اور مُرِیٔ مجرائے طعام و شراب ہے، یہ حلقوم کے نیچے ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ راسِ غلصمہ ہے، خارج سے۔[1] معنی یہ ہیں کہ دل اپنی جگہ سے اوپر کو چڑھ گئے اور گھبراہٹ اور ڈر کی وجہ سے حناجر تک پہنچ گئے۔ چنانچہ اگر حلقوم ان سے تنگی نہ کرے، اور حلقوم وہ ہے جس کی انتہا حنجرہ ہے، تو وہ نکل جائیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مبالغے کے لیے ہے جو عرب کے کلام میں معہود و معروف ہے، اگرچہ دل اس جگہ کی طرف بلند نہ ہوں اور نہ ہی اپنی جگہ سے نکلیں، لیکن مبالغے کے لیے اس طرح بولتے ہیں۔ دلوں کے اضطراب و بے قراری اور بزدلی میں یہ ایک مثال ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ بزدل ہو گئے اور ان کی گھبراہٹ بہت زیادہ ہوئی۔ بزدل آدمی کا طریقہ یہ ہے کہ جس وقت اسے سخت خوف ہوتا ہے تو اس کا پھیپھڑا پھول جاتا ہے۔ پھر جب وہ پھول جاتا ہے تو دل حنجرے کی طرف چڑھ جاتا ہے، اسی لیے جبان اور بزدل کے لیے کہتے ہیں کہ "اِنْتَفَخَ سَحْرُهٗ"[2] یعنی اس کا پھیپھڑا پھول گیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴾ ظنون سے مراد مختلف گمان ہیں۔ چنانچہ بعض نے تو نصرت اور کامیابی کا گمان کیا اور فتح کی امید رکھی اور بعض نے اس کے برعکس گمان کیا۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: منافقوں نے گمان کیا کہ نبی اکرم ﷺ کا اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا استیصال کیا جائے گا۔ اور مومنوں نے یہ گمان کیا کہ آپ منصور ہوں گے۔[3] کسی نے کہا کہ یہ خطاب منافقوں کو ہے۔ زیادہ صحیح وہی ہے جو حسن رحمہ اللہ نے فرمایا۔ چنانچہ خطاب ان لوگوں کو

[1] روح المعاني (٢٤/ ٥٨) [2] فتح القدير (٤/ ٣٤٩) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٢١)

ہو گا جنھوں نے اسلام کا اظہار کیا عام طور پر، یعنی خواہ وہ حقیقی مومن ہوں یا منافق۔ ﴿ اَلظُّنُوْنَا ﴾ کے الف میں قاریوں نے اختلاف کیا ہے، چنانچہ ایک جماعت نے وصل و وقف میں اس کو ثابت رکھا ہے اور مصحف عثمانی کے رسم الخط کے ساتھ تمسک کیا ہے اور سارے مصاحف کے خط سے جو شہروں میں گئے، اس لیے کہ ان سب میں الف ثابت ہے۔

امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے، مگر یہ کہا ہے کہ قاری کو لائق نہیں ہے کہ ان الفوں کے بعد قراءت کو درج کرے، بلکہ ان پر وقف کرے، نیز اس قسم کے الف سے تمسک کیا ہے جو اشعارِ عرب میں آیا ہے اور نیز یہ الف ہائے سکتہ کے مشابہ ہے بیانِ حرکت کے لیے اور ہائے سکتہ ثابت رکھی جاتی ہے حالتِ وقف میں، اس لیے کہ اس کی طرف حاجت ہے اور کبھی وصل میں ثابت رکھی جاتی ہے وصل کے مجرائے وقف میں جاری کرنے کے لیے۔ امام ابو عمرو، حمزہ، جحدری اور یعقوب رحمہم اللہ نے بہ حذفِ الف پڑھا ہے وصل اور وقف دونوں میں اور کہا ہے کہ یہ زیادات خط سے ہے۔[1]

چنانچہ وہ اسی طرح لکھا گیا ہے، اس کے ساتھ نطق لائق نہیں۔ رہا شعر تو اس میں ضرورت کے لیے وہ شے جائز ہے جو اس کے علاوہ جائز نہیں ہے۔ ان کا یہ قول کہ فواصل مجرائے قوافی میں جاری کیے گئے ہیں غیر متعد بہ ہے، کیوں کہ قوافی پر تو وقف غالباً لازم ہوتا ہے اور فواصل میں لازم نہیں ہے، پس وہ قوافی کے مشابہ نہیں ہیں۔ امام ابن کثیر، کسائی اور ابن محیصن رحمہم اللہ نے بہ اثباتِ الف وقف میں اور بہ حذفِ الف وصل میں پڑھا ہے،[2] واسطے جاری کرنے فواصل کے مجرائے قوافی کے الفِ اطلاق کے ثبوت میں اور اس لیے کہ یہ مثل ہائے سکتہ کے ہے اور وقف میں اس کا اثبات اور وصل میں حذف ہوتا ہے۔ (قالہ السمین) یہ قراءت لغتِ عربی کے اعتبار سے راجح ہے۔ یہ وہی الف ہے جس کو نحوی الفِ اطلاق کہتے ہیں، اس میں جو گفتگو ہے وہ علمِ نحو میں مشہور و معروف ہے۔ اسی طرح اس الف میں قراء کا اختلاف ہے، جو "الرسولا" اور "السبیلا" میں ہے، چنانچہ اس سورت کے آخر میں آئے گا۔[3]

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿11﴾ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿12﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿13﴾

وہاں مومن آزمائے گئے اور شدت سے ہلا مارے گئے (11) اور جب منافق اور جن لوگوں کے

(1) تفسیر القرطبي (١٤/ ١٤٤) (2) فتح القدیر (٤/ ٣٤٩) (3) فتح البیان (١١/ ٥٢۔ ٥٦)

دلوں میں مرض تھا، کہہ رہے تھے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے نہیں وعدہ کیا مگر دھو کے فریب کا⑫ اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہلِ یثرب! (آج) تمھارے لیے (لشکر کے ساتھ) کوئی قیام گاہ نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا، وہ کہتے تھے: بے شک ہمارے گھر کھلے پڑے (غیر محفوظ) ہیں، حالاں کہ وہ کھلے (غیر محفوظ) نہیں تھے، وہ تو صرف (جنگ سے) فرار چاہتے تھے⑬

غزوۂ احزاب میں اہلِ ایمان کی آزمایش اور منافقوں کی بہانے بازی:

بعض منافق کہنے لگے کہ پیغمبر کہتا ہے کہ میرا دین مشرق و مغرب تک پہنچے گا، یہ محض دھوکا اور فریب ہے، یہاں جائے ضرور کی طرف تو نکل نہیں سکتے! مسلمانوں کو چاہیے اب بھی نا امیدی کے وقت بے ایمانی کی باتیں نہ بولیں۔ یثرب مدینے کا نام تھا۔ یعنی سارے عرب ہمارے دشمن ہوئے تو ہمارے لیے رہنے کا ٹھکانا کہاں ملے گا، لہٰذا اس لشکر سے جدا ہو جاؤ اور نبی کریم ﷺ لشکر کے ساتھ باہر کھڑے تھے۔ شہر میں مضبوط حویلیوں کو نا کے بند کر کے عورتوں کو ان میں رکھ دیا تھا، یہ بہانہ کرنے لگے کہ ہمارے گھر کھلے ہیں اور وہ جھوٹ بات تھی۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس حال کی خبر دیتا ہے جس وقت مدینہ کے اردگرد فوجیں اتریں اور مسلمان گِھرے ہوئے نہایت درجے کی تکلیف اور تنگی میں مبتلا تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان موجود تھے، وہ یہ ہے کہ مومنین جانچے گئے اور ان کا امتحان لیا گیا اور خوب جھنجھوڑے گئے، چنانچہ اس وقت نفاق ظاہر ہو گیا اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض تھا تو جو بات ان کے جی میں تھی، اس کو زبان پر لے آئے اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے، یہ کہنے لگے کہ ہم کو اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ دیا تھا وہ سب فریب تھا۔

رہا منافق تو اس کا نفاق تو کھل گیا اور جس کے دل میں کوئی شبہہ تھا، یا کوئی خار اس کے ضعفِ حال کی وجہ سے تو جو وسوسہ اپنے دل میں پاتا تھا اس کو زبان سے نکال دیا اپنے ضعفِ ایمان کی وجہ سے اور تنگی کی شدت کی وجہ سے جس میں وہ مبتلا تھا اور ایک اور قوم نے ویسا کہا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ ﴾ یثرب سے مراد مدینہ طیبہ ہے، جس طرح صحیح میں آیا ہے کہ میں خواب میں تمھارا دارِ ہجرت دکھایا گیا، یہ دو سنگستانوں کے درمیان ایک زمین ہے، سو میرا خیال گیا کہ وہ ''ھَجَر'' ہے، پس نا گاہ یثرب تھا اور ایک روایت میں یثرب کے بجائے مدینہ ہے۔[1]

اب رہی وہ حدیث جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٢)

کہ جو شخص مدینے کا نام یثرب لے تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے، وہ جو ہے پس طابہ ہے، وہ طابہ ہے۔[1] (تفرد به الإمام أحمد و في إسناده ضعف) وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ کا نام یثرب رکھنے کی اصل جو وجہ ہے تو وہ یہ ہے کہ عمالیق کا ایک شخص وہاں اترا تھا، اس کو کہتے تھے: ''یثرب بن عبید بن مہلائیل بن عوص بن عملاق بن لاوذ بن ارم بن سام بن نوح'' (قاله السُّهَيْلِي)۔ کہا بعض سے مروی ہے کہ تورات میں اس کے گیارہ (۱۱) نام ہیں: مدینہ، طابہ، طیبہ، جلیلہ، جابرہ، محبہ، محبوبہ، قاصمہ، مجبورہ، عذراء اور مرحومہ۔ کعب احبار رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا ہم تورات میں پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مدینہ سے فرماتا ہے: "یا طیبة و یا طابة و یا مسکینة لا تقلي الکنوز ارفع أحاجرك علی أحاجر القریٰ"۔ (اجارّ بروزن فعال، بام خانہ بہ نعتِ شام وحجاز. أجاجیر جمع وأجاجره كذلك. كذا في الصراح)

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا مُقَامَ لَكُمْ ﴾ یعنی اس جگہ مراد ان کی یہ ہے کہ نبی ﷺ کے نزدیک جنگ کے مقام سے۔ ﴿ فَارْجِعُوْا ﴾ یعنی اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ۔ ﴿ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ ﴾ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ لوگ بنی حارثہ ہیں، انھوں نے کہا تھا کہ ہم اپنے گھروں میں چوری سے ڈرتے ہیں[2] اور اسی طرح کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اس کا قائل اوس بن قیظی ہے۔ یعنی اپنے گھروں کی طرف لوٹ جانے میں یہ عذر کیا کہ وہ عورۃ ہیں، یعنی ان کے آگے پیچھے کوئی شے نہیں، جو اُن کو دشمنوں سے روکے، تو وہ ان پر دشمنوں سے ڈرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ﴾ یعنی بات ویسی نہیں ہے، جیسی وہ کہتے ہیں۔ ﴿ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴾ یعنی یہ کہنے سے ان کی کوئی غرض نہیں ہے مگر لڑائی سے بھاگنا۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ هُنَالِكَ ﴾ ظرفِ مکان ہے۔ دور کی جگہ کے لیے ﴿ هُنَالِكَ ﴾ بولتے ہیں، جس طرح کہ قریب کی جگہ کے لیے "هُنَا" اور متوسط جگہ کے لیے "هُنَاكَ" بولتے ہیں۔ اور کبھی ظرفِ زمان کے لیے بھی آتا ہے۔ اس جگہ ظاہر وجہ یہ ہے کہ ظرفِ مکان بعید کے لیے ہے، جیسا کہ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی وہ جائے لغزان مراد خندق ہے۔ ظرف زمان کا شاہد یہ شعر ہے:

وَإِذَا الْأُمُورُ تَعَاظَمَتْ وَتَشَاكَلَتْ فَهُنَاكَ يَعْتَرِفُوْنَ أَيْنَ الْمَفْزَعُ

یعنی جس وقت امور بڑے اور مشکل ہو جائیں تو اس وقت اقرار کریں گے کہ جائے پناہ کہاں ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کا عامل کون ہے اور یہ کس کا ظرف ہے؟ سو یا تو ﴿ اِبْتُلِيَ ﴾ کا ہے یا ﴿ تَظُنُّوْنَ ﴾ کا۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٨٥) اس کی سند میں ''یزید بن ابی زیاد'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٦٠٧)

[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٢٦) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٦١٩۔ ٦٢٠)

نے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے،[1] معنی یہ ہیں کہ اس جگہ میں یا اس وقت میں مومنین جانچے گئے خوف کے ساتھ اور لڑنے اور بھوک کے ساتھ اور روکنے کے ساتھ۔ اس کے علاوہ ایذا اور تکلیف کی اَور باتوں کے ساتھ ان کا امتحان لیا گیا، تاکہ مومن منافق سے ظاہر ہو جائے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنین ایمان پر صبر کرنے کے ساتھ آزمائے گئے۔[2]

جمہور نے ﴿ زُلْزِلُوْا ﴾ بہ ضمِ زائے اولیٰ وکسرِ ثانیہ پڑھا ہے اصل کی بنا پر جو صیغۂ مجہول میں ہے۔ امام ابوعمرو سے پہلی زاء کا کسرہ مروی ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے ابوعمرو رحمہ اللہ سے یہ روایت کیا ہے کہ انھوں نے اس کو باشمامِ کسرہ پڑھا ہے۔ جمہور نے "زِلْزَالًا" کو بکسرِ زائے اول اور امام عاصم، جحدری اور عیسی بن عمر نے بفتحِ زاء پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر مصدر مضاعف کا جو فعلال کے وزن پر ہے، اس میں کسرہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں، جیسے "قَلْقَلْتُهُ قِلْقَالًا وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا" اور کسرہ زیادہ بہتر ہے۔ کبھی مفتوح سے اسم فاعل مراد ہوتا ہے، جیسے: "صلصال" بہ معنی "مصلصل" ہے اور "زلزال" بہ معنی "مزلزل" ہے۔ امام ابن سلام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ زُلْزِلُوْا ﴾ کے معنی "حُرِّكُوْا بِالْخَوْفِ تَحْرِيْكًا شَدِيْدًا بَلِيْغًا" ہیں، یعنی خوف کے ساتھ خوب حرکت دیے گئے، اچھی طرح ہلا ڈالے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ بے انتہا خوف میں مبتلا ہوئے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے مکانوں سے ان کا تحریکِ شدید کو دور کرنا ہے، یہاں تک کہ ان کے لیے خندق کے بعد کوئی جگہ نہ رہی۔[3] کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ مختلف طریقے سے مضطرب اور بے قرار کیے گئے، پس ان میں سے کوئی تو اپنی جان میں مضطرب ہوا اور کوئی اپنے دین میں۔

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ ... الآية ﴾ ﴿ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ ﴾ پر معطوف ہے۔ منافقوں سے مراد معتب بن قشیر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی اور ﴿ اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ سے مراد شک واضطراب اور ریبت والے، یعنی شک وشبہہ والے ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ وہ قوم ہے جس کو دین میں کچھ بصیرت نہ تھی، منافق لوگ شبہے میں مبتلا کر کے ان کو اپنی طرف مائل کرتے تھے۔ غرضیکہ ﴿ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ ﴾ کہنے والے منافق اور شک والوں میں سے ستر آدمی تھے، یعنی وہ یہ کہتے تھے کہ ہم کو جو اللہ اور رسول نے مدد اور کامیابی یا فتحِ فارس وروم کا وعدہ دیا تھا تو یہ ایک باطل اور بے اصل بات تھی، یہ جو بات ان لوگوں سے نقل کی گئی، یہ ظنونِ مذکورہ کی تفسیر کی طرح ہے، یعنی ان لوگوں کا یہ ظن تھا، جیسا کہ مومنین کا ظن نصر واعلائے کلمۃ اللہ تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ ﴾ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یہ لوگ منافقوں میں سے بنی سالم ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔[4] کسی نے کہا ہے کہ اوس بن قیظی اور اس کے ساتھی

[1] فتح القدير (٤/ ٣٤٩)
[2] تفسير النسفي (٣/ ٢٩٩)
[3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٤٦) فتح القدير (٤/ ٣٥٠)
[4] فتح القدير (٤/ ٣٥٠)

ہیں۔ کلمۂ ﴿ طَآئِفَةٌ ﴾ واحد اور اس سے زیادہ پر واقع ہوتا ہے۔ بالجملہ ان لوگوں نے جو بات کہی وہ یہ ہے: ﴿ يَآهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ ﴾ یعنی اے یثرب والو! تمھارے لیے اقامت کی کوئی جگہ نہیں، یا اس جگہ لشکر میں تمھارے لیے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یثرب زمین کا نام ہے اور مدینۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ایک کنارے میں ہے۔ امام سہیلی رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یثرب نفسِ مدینہ کا نام ہے، علمیت اور وزنِ فعل کی وجہ سے غیر منصرف ہے، کیوں کہ اس کا وزن "یضرب" ہے۔ جمہور نے مقام بہ فتحِ میم اور امام حفص، سلمی، جحدری اور ابو حیوہ رحمہم اللہ نے بہ ضمِ میم پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "أَقَامَ يُقِيمُ" کا مصدر ہے اور پہلے کی بنیاد پر اسم مکان ہے[1] اور دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔

امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ وغیرہما نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میں حکم کیا گیا ہوں ایک قریہ، یعنی بستی کا جو بستیوں کو کھائے گی، اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے۔ نکالتی ہے وہ لوگوں کو جس طرح کہ بھٹی لوہے کے میل کو نکالتی ہے۔[2] امام احمد، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے جو روایت کی ہے اور جو پہلے گزر چکی ہے، اس میں "طابة" کا لفظ تین بار ہے (حدیث مشار الیہ جو تفسیر ابن کثیر سے پہلے مذکور ہو چکی اس میں لفظ "طابة" دو بار ہے تین بار نہیں، فلیتنبہ۔ مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ « إِنَّمَا هِيَ طَابَةُ » ہیں،[3] اس کی اسناد ضعیف ہے۔ اس لفظ کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکروہ رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تثریب ہے۔ تثریب دھمکی اور ڈانٹ ڈپٹ کو کہتے ہیں، جس طرح کہ سورت یوسف میں ہے: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ [یوسف: ٩٢] "تم پر آج کوئی ملامت نہیں۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ کسی کا نام برا ہوتا تو اس کو بدل کر اچھا نام رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ حسنین رضی اللہ عنہما کا نام پہلے حَزن رکھا گیا تھا، آپ نے بدل کر حسن و حسین رکھ دیا۔ اسی طرح بعض دوسرے صحابہ کے نام بھی بدل دیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھے نام پسند تھے، برے ناموں کو ناپسند فرماتے تھے۔ بالجملہ جب مدینہ منورہ کا نام اگلی کتابوں میں طابہ و طیبہ آچکا اور خود آپ نے اس کا نام « إِنَّمَا طَابَةُ » کہہ کر فرما دیا، اب کیا ضرورت ہے باوجود اس کے پھر اس کو یثرب کہیں، پھر بھی اگر زبان سے نکل جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اس سے استغفار کرے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری ہو جائے۔

﴿ فَارْجِعُوْا ﴾ یعنی منافقوں نے لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر سے بھاگنے کو کہا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کے سال مدینے سے نکلے، یہاں تک کہ اپنی پشت سلع پہاڑ کی طرف کی اور خندق مومنین اور

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٤٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٢)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

قوم (دشمن حملہ آور) کے درمیان تھی۔ چنانچہ ان منافقوں نے کہا کہ اس جگہ جائے اقامت نہیں ہے اور لوگوں کو مدینے میں اپنے گھروں کو لوٹ جانے کو کہا۔ سلع مدینے کے باہر ایک پہاڑ ہے، اس کے قریب اس کے اور خندق کے درمیان۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ ایمان سے کفر کی طرف پھر جاؤ۔ کسی نے کہا ہے کہ لڑائی سے پھر جاؤ۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَسْتَـْٔذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ ﴾ معطوف ہے ﴿ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ ﴾ پر، یعنی ان میں سے ایک گروہ نبی مکرم ﷺ سے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جانے کا اذن مانگتا ہے۔ یہ لوگ بنی حارثہ و بنی سلمہ ہیں۔ جملہ ﴿ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ﴾ بدل ہے ﴿ يَسْتَـْٔذِنُ ﴾ سے، یا حال ہے اس سے، یا مستانفہ ہے۔ سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ کیوں جی وہ کس طرح اذن مانگتے تھے؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے گھر "عورة" ہیں، یعنی کھلے پڑے ہیں، محفوظ اور مستحکم نہیں ہیں اور نہ دشمنوں سے باز رہنے والے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مَخْلِيَّةٌ نَخْشَى عَلَيْهَا السَّرَقَ"[1] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔[2] امام مجاہد، مقاتل اور حسن رحمہ اللہ نے کہا: "ضَائِعَةٌ نَخْشَى عَلَيْهَا السُّرَّاقَ" یعنی خالی چھٹے پڑے ہیں، ہم کو ان پر چوروں کا خوف ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے گھر دشمن سے متصل ہیں اور ہم اپنے گھر والوں پر بے خوف نہیں ہیں۔[3] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: محاورے میں بولتے ہیں: "عَوِرَ الْمَكَانُ يَعْوَرُ عَوَرًا وَّعَوْرَةً وَبُيُوْتٌ عَوِرَةٌ وَّعَوْرَةٌ"[4]۔ "عَوْرَةٌ" مصدر ہے۔ امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا: ہر مکان جو ممنوع و مستور نہ ہو تو وہ "عَوْرَةٌ" ہے۔ "عَوْرَةٌ" اصل میں وہ خلل اور رخنہ ہے جو بنا (تعمیر) وغیرہ میں ہو، اس طرح پر کہ اس میں چور کا داخلہ ممکن ہو، پھر اس کا اطلاق مختل پر کیا گیا۔ مراد "ذَوَاتُ عَوْرَةٍ" ہے۔

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "اَلْعَوْرَةُ كُلُّ خَلَلٍ يُتَخَوَّفُ مِنْهُ فِيْ ثَغْرٍ أَوْ حَرْبٍ" یعنی ہر رخنہ جس میں خوف کیا جائے، ثغر (سرحد) میں ہو یا لڑائی میں اس کو "عَوْرَةٌ" کہتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ کہتے ہیں: "أَعْوَرَ الْمَكَانُ" بولتے ہیں: جب اس میں کوئی خلل ظاہر ہو اور "أَعْوَرَ الْفَارِسُ" بولتے ہیں، جبکہ سوار سے جائے خلل ظاہر ہو جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، مجاہد، ابورجاء اور عطاردی رحمہم اللہ نے "عَوِرَةٌ" بکسرِ واو پڑھا ہے۔ "أَيْ: قَصِيْرَةُ الْجُدْرَانِ"[5] یعنی ہمارے گھر چھوٹی چھوٹی دیواروں والے ہیں۔

بالجملہ اللہ پاک نے ان پر رد کیا اور جو بات انھوں نے ذکر کی تھی، اس میں ان کی تکذیب کی اور فرمایا: ﴿ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ﴾ یعنی جو بات یہ کہتے ہیں وہ نہیں ہے۔ پھر ان کے اذن مانگنے کا جو اصل سبب تھا اور اس سے ان کی جو

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٢٦) [2] الدر المنثور (٦/ ٥٧٩) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٢٦) فتح القدير (٤/ ٣٥١)
[4] معاني القرآن (٤/ ٢١٩۔ ٢٢٠) [5] تفسير القرطبي (١٤/ ١٤٧۔ ١٤٨)

غرض تھی وہ بیان فرمائی: ﴿ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴾ یعنی ان کی اور کچھ غرض نہیں، مگر یہی کہ لڑائی سے بھاگ جائیں۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ ان کا ارادہ اور کچھ نہیں، مگر دین سے بھاگنا۔[1] واللہ أعلم.

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿١٥﴾ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٦﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْۗءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٧﴾

اور اگر اس (مدینہ) کے اطراف سے ان پر (کفار کے) لشکر داخل کیے جاتے، پھر ان سے فتنہ وفساد (خانہ جنگی یا شرک) کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ (فوراً) اس میں کود پڑتے، اور اس (شرکتِ فتنہ) میں بس تھوڑا ہی توقف کرتے ⑭ اور بلاشبہ اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ کے عہد کی پوچھ گچھ تو ہونی ہے ⑮ آپ کہہ دیجیے: اگر تم موت سے یا قتل ہونے سے بھاگو تو تمھارا بھاگنا تمھیں ہرگز نفع نہیں دے گا اور تب تم بہت کم فائدہ اُٹھاؤ گے ⑯ کہہ دیجیے: کون ہے جو تمھیں اللہ سے بچا سکے، اگر وہ تمھارے ساتھ کسی سختی کا ارادہ کرے یا وہ تم پر رحمت کا ارادہ کرے؟ اور وہ اللہ کے سوا اپنے لیے نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار ⑰

منافقوں کے جھوٹے بہانوں کا بیان:

جنگِ اُحد کے دن اقرار کیا تھا کہ پھر ہم ایسی حرکت نہ کریں گے۔ یعنی جس کی قسمت میں موت ہے اس کو بھاگنے سے بچاؤ نہ ہوگا اور اگر موت نہیں ہے تو بھاگ کر کتنے دن کے لیے بچے گا، بالآخر تو موت آنی ہی ہے۔ عرب کی مخالفت سے ڈرتے ہو۔ اگر اللہ حکم دے تو مسلمان ابھی تم کو قتل کر ڈالیں۔ انتہیٰ.

اللہ پاک ان لوگوں کے حال کی خبر دیتا ہے جو کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں... الخ کہ اگر مدینے

[1] فتح البیان (۱۱/ ۵۶۔ ۵۹)

کی ہر طرف سے ان پر دشمن داخل ہو جائیں اور ان سے کفر میں داخل ہونے کا سوال کریں تو بہت جلد کافر ہو جائیں اور ایمان پر محافظت نہ کریں اور نہ ہی ادنیٰ سے خوف و گھبراہٹ کے ساتھ اس کو تھامیں۔ امام قتادہ، عبدالرحمن بن زید اور ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی طرح اس کی تفسیر کی ہے۔[1] اور یہ ان کی انتہائی مذمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑے ڈرپوک بزدل ہیں کہ ذرا سے خوف سے ایمان جیسی نعمت کے بدلے میں کفر لینے کو تیار ہو جائیں، اس کا کچھ بھی پاس اور لحاظ نہ کریں۔

پھر اللہ پاک ان کو وہ عہد یاد دلاتا ہے جو اس خوف سے پہلے انھوں نے اللہ سے کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور لڑائی سے نہ بھاگیں گے۔ ﴿وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا﴾ کا یہ مطلب ہے کہ عن قریب اللہ ان سے اس عہد کے متعلق پوچھے گا اور یہ سوال ضرور ہوگا۔ پھر اللہ پاک نے ان کو یہ خبر دی کہ ان کا بھاگنا کچھ ان کی اَجلوں کو موخر نہ کرے گا اور نہ ان کی عمروں کو دراز کرے گا، بلکہ بسا اوقات یہی ان کو جلد اور اچانک پکڑنے کا سبب ہو جائے گا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ یعنی پھر بھی تم بھاگنے کے بعد بہت تھوڑے دن ہی فائدہ اٹھاؤ گے۔ ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى﴾ [النساء: ۷۷] ''کہہ دیجیے: دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے اس شخص کے لیے جس نے پرہیز گاری اختیار کی۔'' پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا﴾ یعنی ان کے لیے اور ان کے علاوہ دوسروں کے لیے اللہ کے سوا کوئی پناہ دینے والا اور فریاد رسی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿دُخِلَتْ﴾ کا نائب فاعل ان کے گھر ہیں یا مدینہ۔ ''أقطار''، جمع قطر بہ معنی جانب و کنارہ ہے۔ یعنی اگر ان پر ان کے گھروں یہ لشکر اور جتھے بندھے ہوئے میں گھس آئیں۔ یا یہ مدینے کے چاروں طرف سے یا کسی کنارے سے یہ لشکر حملہ کر دیں اور ان پر یہ سخت حادثہ نازل ہو اور ان کے گھر مباح کیے جائیں اور لوٹ لیے جائیں اور ان کی بی بیوں کی اور گھروں کی بے حرمتی کی جائے، پھر اس سخت حادثے کے وقت کسی اور طرف سے ان کو فتنے کی طرف بلایا جائے تو البتہ اس فتنے کو قبول کر لیں۔ فتنے سے اس جگہ مراد عصبیت میں لڑنا ہے، جس طرح کہ ضحاک نے کہا ہے، یا اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے، یا کفر کی طرف رجوع کرنا ہے، جس کو وہ چھپاتے ہیں اور اس کے برعکس ظاہر کرتے ہیں، جیسا کہ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ جمہور نے ''آتَوْهَا'' کو مد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ''أَعْطَوْهَا مِنْ أَنْفُسِهِمْ''

[1] تفسیر الطبري (۲۰/ ۲۲۷) [2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۶۲۰)

امام نافع اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہ قصر "لَاَتَوْهَا" پڑھا ہے، یعنی "لَجَاؤُوْهَا" ﴿ وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ فتنے کی دعوت کو قبول کرنے کے بعد، یا اس میں آنے کے بعد وہ مدینے میں تھوڑا ہی ٹھہریں گے، یہاں تک کہ ہلاک ہو جائیں گے۔ امام حسن، سدی اور فراء رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ شرک کے فتنے سے نہ رکیں مگر تھوڑا، بلکہ وہ تو اس کی طرف جلدی کرنے والے ہیں، رغبت کرنے والے ہیں اس میں، توقف نہیں کرتے اس سے مگر صرف اتنا کہ سوال ان کے لیے ہو اور اس سوال کو قبول کرنے کے لیے یہ بہانہ نہیں کرتے کہ ان کے گھر اس حالت میں کھلے پڑے ہیں، باوجود اس کے کہ اب وہ حقیقتاً کھلے ہیں، جس طرح کہ رسول کی بات ماننے سے اور اس کے ساتھ ہو کر لڑنے سے یہ بہانہ کیا کہ ان کے گھر کھلے پڑے ہیں، حالاں کہ اس وقت وہ کھلے نہیں پڑے تھے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ وَلَوْ دُخِلَتْ ..... الآیۃ ﴾ کی تاویل ساٹھ برس کے بعد آئی، یعنی بنی حارثہ کا اہلِ شام کو مدینے میں داخل کرنا۔[2]

پھر اللہ پاک نے ان سے یہ بات نقل کی کہ وہ اس سے پہلے اللہ اور رسول سے عہد کر چکے ہیں کہ لڑائی میں ثابت رہیں گے اور اس سے نہ بھاگیں گے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴾ یعنی غزوۂ خندق سے پہلے اور غزوۂ بدر کے بعد انھوں نے قسم کھائی تھی کہ دشمنوں سے بھاگ کر اپنی پشت نہ پھیریں گے، بلکہ قتال پر ثابت قدم رہیں گے یہاں تک کہ شہید ہو کر مر جائیں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جو واقعۂ بدر میں حاضر نہ ہوئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ اس لیے کہا کہ وہ بدر سے غائب ہوئے اور اللہ پاک نے اہلِ بدر کو جو کرامت اور نصر عطا فرمائی، اس کو انھوں نے دیکھا تو بولے: قسم ہے اللہ کی! البتہ اگر اللہ ہم کو کسی جنگ میں حاضر کرے گا تو ہم خوب لڑیں گے۔[3] یہ بنی حارثہ و بنی سلمہ ہیں۔ ﴿ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پیٹھ نہ پھیریں گے، یعنی بھاگیں گے نہیں۔ اس کو حکایت بالمعنی کی بنا پر بلفظِ غائب فرمایا، اگر لفظ کی حکایت کی بنا پر ہوتا تو "لَا نُوَلِّيْ" فرمایا جاتا۔ عہدِ الٰہی کے متعلق سوال کیے جانے سے یہ مراد ہے کہ اس کی پوچھ ہو گی اور عہد والے سے اس کی وفا طلب کی جائے گی اور اس کے پورا نہ کرنے پر اس کو سزا دی جائے گی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ ﴾ یعنی اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگو گے تو تم کو یہ بھاگنا ہرگز نفع نہ دے گا، کیوں کہ انسان کو مرنا ضرور ہے، یا تو اپنی موت سے مرے گا یا تلوار سے قتل ہو گا کسی وقتِ معین میں جو اس کی قضا میں مقدر ہو چکا ہے اور اس پر قلم چل چکا ہے۔ چنانچہ جس شخص کی اجل آ گئی، وہ مرے گا یا مارا جائے گا، بھاگے یا نہ بھاگے۔ ﴿ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ مثلاً بھاگنے نے تم کو اگر نفع دیا، پھر تم کو تاخیر سے نفع ملا تو یہ نفع پانا نہ ہو گا، مگر تھوڑا نفع پانا، یا تمھارے بھاگنے کے تھوڑے

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٤٨۔ ١٤٩) [2] دلائل النبوۃ (٣/ ٤٧٣۔ ٤٧٤) [3] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٢٨)

دن بعد، یہاں تک کہ تمھاری اجلیں پوری ہوں اور ہر شے آنے والی قریب ہوتی ہے۔ جمہور نے ﴿ تُمَتَّعُوْنَ ﴾ بتائے فوقیہ پڑھا ہے اور یعقوب حضرمی نے ساجی کی روایت میں جو ان سے ہے بیائے تحتیہ۔ اور بعض روایات میں "لَا تُمَتَّعُوْا" بہ حذف نون اس بنا پر کہ ﴿ إِذًا ﴾ کو نصب کا عمل دیا ہے، اس لیے نون کو حذف کر دیا ہے اور جمہور کی قراءت پر وہ ملغیٰ ہے،[1] یعنی اس کو بے عمل چھوڑا ہے۔

﴿ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ کون پناہ دے گا اللہ سے، اگر وہ تمھیں ہلاک کرنا چاہے، یا تمھاری ہزیمت کا اور مالوں کے نقصان کا اور تم کو قحط اور بیماری دینے کا ارادہ کرے۔ ﴿ اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ﴾ فعل سابق کا معمول نہیں ہے، یعنی ﴿ یَعْصِمُكُمْ ﴾، کیوں کہ اس صورت میں معنی ٹھیک نہیں ہوتے، اسی لیے اس کے واسطے اور فعل نکالا۔ "أَيْ: أَوْ یُصِیْبُكُمْ بِسُوْءٍ إِنْ أَرَادَ اللّٰهُ بِكُمْ رَحْمَةً یَّرْحَمُكُمْ بِهَا" یعنی کون تم کو برائی پہنچائے، اگر اللہ تمھارے ساتھ رحمت کا ارادہ کرے، ارزانی کا اور نصرت و مدد کا اور صحت و عافیت کا اور عمر دراز کرنے کا۔ یہ ایسا ہے، جیسا کہ "عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَمَاءً بَارِدًا" ہے یعنی "مَاء" کا عامل "سَقَیْتُهَا" محذوف ہے کہ چرایا میں نے اونٹنی کو گھاس اور پلایا اس کو سرد پانی۔

امام سمین رحمہ اللہ نے یہاں امام زمخشری رحمہ اللہ کی عبارت نقل کی ہے کہ اگر تو کہے کہ رحمت کیوں کر قرینۂ سوء کی ٹھہرائی گئی عصمت میں، حالاں کہ عصمت تو شر سے ہوتی ہے؟ تو میں کہوں گا کہ اس کے یہ معنی ہیں: "أَوْ یُصِیْبَكُمْ بِسُوْءٍ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً" چنانچہ عبارت کو مختصر کیا ہے اور قولہ "مُتَقَلِّدًا سَیْفًا وَّرُمْحًا" کے جاری مجریٰ ٹھہرایا ہے، یا یوں کہیں کہ ثانی اول پر اس لیے محمول ہے کہ عصمت میں منع کے معنی ہیں۔[2] شیخ نے کہا ہے کہ پہلی وجہ میں تو جملے کا حذف ہے بغیر کسی ضرورت کے جو حذف کی طرف داعی ہو اور وجہ جو ہے تو وہ دوسری ہے، خصوصاً جبکہ مضاف محذوف مقدر مانا جائے: "أَيْ: یَمْنَعُكُمْ مِنْ مُرَادِ اللّٰهِ"۔ امام سمین رحمہ اللہ کہتے ہیں: "وَأَیْنَ الثَّانِيْ مِنَ الْأَوَّلِ وَلَوْ کَانَ مَعَهُ حَذْفُ جُمَلٍ" یعنی ثانی وجہ اول کو نہیں پہنچ سکتی، گو اس کے ساتھ جملوں کا حذف ہی کیوں نہ ہو۔ غرض یہ ہے کہ بہتر وجہ اول ہی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴾ یعنی اور نہ پائیں گے اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست و حامی کہ ان کے ساتھ دوستی کرے اور ان کو نفع پہنچائے اور ضرر کو ان سے دور کرے اور نہ کوئی مددگار کہ اللہ کے عذاب کے وقت ان کی مدد کرے اور ان کو بچالے۔[3]

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا ۚ وَلَا یَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۸﴾ اَشِحَّةً عَلَیْكُمْ ۚۖ فَاِذَا

[1] تفسیر القرطبي (۱۴/ ۱۵۰) [2] الکشاف (۳/ ۵۳۷) [3] فتح البیان (۱۱/ ۶۰۔ ۶۲)

جَآءَ الْخَوْفُ رَاَیْتَهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ كَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَی الْخَیْرِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَمْ یُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا ﴿۱۹﴾ یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ یَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآىِٕكُمْ ؕ وَلَوْ كَانُوْا فِیْكُمْ مَّا قٰتَلُوْۤا اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۲۰﴾

بے شک اللہ انھیں جانتا ہے جو تم میں سے (جہاد میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں اور انھیں بھی جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں: ہمارے پاس آ جاؤ اور وہ جنگ میں کم ہی آتے ہیں ⑱ اس حال میں کہ وہ تمھارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں، چناں چہ جب خوف (کا وقت) آئے تو آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، ان کی آنکھیں (اس طرح) گھومتی ہیں، جیسے وہ شخص جس پر موت کی غشی طاری ہو، پھر جب خطرہ دور ہو جائے تو مال (غنیمت) کے انتہائی حریص بن کر تیز زبانوں کے ساتھ تمھارے بارے میں زبان درازی کرنے لگتے ہیں، یہ لوگ ایمان لائے ہی نہیں، لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے ⑲ وہ سمجھتے ہیں کہ (ابھی تک) لشکر گئے نہیں اور اگر یہ لشکر چڑھ آئیں تو وہ تمنا کرتے ہیں کاش! وہ صحرا نشین دیہاتیوں میں جا بسے ہوتے اور (وہاں) تمھاری خبریں دریافت کیا کرتے اور اگر وہ تم میں موجود ہوتے تو وہ (دشمن سے) لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے ⑳

حریص اور لالچی لوگوں کا بیان:

یعنی برے وقت میں رفاقت سے جی چراتے ہیں اور ڈر کے مارے جان نکلتی ہے اور فتح کے بعد اپنی مردانگی جتاتے ہیں سب سے زیادہ اور غنیمت پر ڈھکتے ہیں۔ جہاں اعمال کے ضائع ہونے کا ذکر ہے تو فرمایا کہ یہ اللہ پر آسان ہے، یعنی اللہ کی حکمت کے تحت کسی کی محنت ضائع کرنا عجیب لگتا ہے، لیکن جب ضائع کرنے پر آئے، اسی عمل میں ایسا نقص پکڑ لے جس سے وہ درست ہی نہیں ہوا، جیسے بے ایمان کا عمل کہ عمل کے قبول اور بارآور ہونے کے لیے ایمان شرط ہے۔ نامردی کے مارے یقین نہیں آتا کہ فوجیں پھر گئیں اور باتوں میں تو تمھاری خیرخواہی جتائیں اور لڑائی میں کچھ کام نہ کریں۔ انتہٰی

اللہ پاک اپنے احاطۂ علم کی خبر دیتا ہے کہ اس کا علمِ تام ان لوگوں کو احاطہ کیے ہوئے ہے جو دوسروں کو لڑائی میں حاضر ہونے سے روکتے ہیں اور ان لوگوں کو جو اپنے ساتھیوں سے اور کنبے والوں سے اور شریکوں سے کہتے ہیں کہ اس طرف آجاؤ جس میں ہم ہیں، یعنی ہم سایوں میں اور میووں میں اقامت کر رہے ہیں، اس کے باوجود لڑائی میں نہیں آتے، مگر کبھی کبھار۔ ﴿ اَشِحَّةً عَلَیْكُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم پر مودت و محبت و شفقت کا بخل کرنے والے ہیں، یعنی تم سے اپنی مہر و شفقت کو روک رکھتے ہیں، تمھارے حال پر مشفق اور مہربان نہیں ہیں اور کہنے کو جو کچھ کہو سو ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم پر غنیمتوں میں بخل کرنے والے ہیں۔[1]

﴿ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَیْتَهُمْ ... الآیة ﴾ یعنی پھر جب خوف کا وقت آئے تو اس خوف کی شدت اور گھبراہٹ کی وجہ سے ایسے ہو جاتے ہیں، جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی آجائے، اسی طرح یہ نامرد لڑائی سے خوف کھاتے ہیں، پھر جب امن ہو جائے تو لمبی چوڑی فصیح و بلیغ باتیں کریں اور اپنے لیے شجاعت اور بہادری کے اونچے اونچے دعوے کریں، حالاں کہ اس میں وہ جھوٹے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ سَلَقُوْكُمْ ﴾ کے معنی ہیں: "اِسْتَقْبَلُوْکُمْ" یعنی تیز تیز زبانوں سے تمھارے سامنے آئیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ غنیمت کے وقت تو بخیل ترین قوم ہیں اور تقسیم کے لحاظ سے بدترین قوم ہیں، ہم کو دو ہم کو دو، ہم تو واقعی تمھارے ساتھ جنگ میں حاضر ہوئے۔ رہا لڑائی کا وقت تو اس وقت نامرد ترین قوم ہیں اور سب سے بڑھ کر حق کو بے یار و مددگار چھوڑنے والے۔[2] باوجود اس کے خیر پر بہت بخل کرنے والے ہیں، یعنی ان میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے، انھوں نے خود میں تو نامردی اور جھوٹ اور قلتِ خیر کو جمع کیا، گویا ان بدترین اجزاء کی معجونِ مرکب ہیں، جس طرح کہ کسی شاعر نے اس قسم کے لوگوں کے حق میں کہا ہے:

أَفِي السِّلْمِ أَعْيَارًا جَفَاءً وَّغِلْظَةً وَفِي الْحَرْبِ أَمْثَالَ النِّسَاءِ الْعَوَارِكِ

"أَعْيَارٌ" جمع "عیر" بہ معنی خر ہے، یعنی حالتِ مسالمت (سلامتی، امن) میں تو سختی اور شدت کے لحاظ سے گدھوں کی طرح ہیں اور لڑائی میں ایسے جیسے حیض والی عورتیں۔ اور اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ لَمْ یُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا ﴾ یعنی اللہ پاک کے نزدیک ان کے اعمال کا ضائع کر دینا آسان ہے، پھر ان کے جو اوصافِ قبیحہ از قسم نامردی و ضعف اور خوف ہیں اللہ پاک نے ان میں سے یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ ﴿ یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا ﴾ یعنی مارے خوف اور نامردی کے خیال کرتے ہیں کہ فوجیں نہیں گئیں، بلکہ ان سے قریب ہیں اور ان کو پھر ان کی طرف آنا ہے۔ اور جب فوجیں آجائیں تو یہ بات پسند کریں کہ تمھارے ساتھ مدینے میں حاضر نہ ہوں، بلکہ دیہاتوں میں ہوں اور تمھاری خبریں پوچھا کریں اور جو کچھ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٢١) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٢٢)

دشمن کے ساتھ جنگ کی صورت حال ہو، اس کے متعلق پوچھا کریں۔ اور اگر تمھارے درمیان میں ہوں تو نہ لڑیں تمھارے ساتھ مل کر مگر تھوڑا، اپنی نامردی اور ذلت اور ضعفِ یقین کی وجہ سے، حالاں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان سے خوب واقف ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی طرف کا ارادہ رکھتا ہو، پھر کوئی اور اس کو اس طرف سے پھیر دے تو اس وقت محاورۂ عرب میں یوں بولتے ہیں: "عَاقَهُ وَاعْتَاقَهُ وَعَوَّقَهُ أَيْ: صَرَّفَهُ" امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ معوقین و قائلین منافقین کی ایک قوم ہے جو نبی اکرم ﷺ کے انصار کو باز رکھا کرتے تھے۔ ان سے کہتے تھے کہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب نہیں ہیں، مگر کھانے والے ایک سری کے اور اگر وہ لحم ہوتے (یعنی صاحبِ حیثیت) تو ابوسفیان اور اس کا گروہ ان کو لقمہ کر لیتا۔ غرض یہ ہے کہ وہ قلیل ذلیل ذرا سے لوگ ہیں لہٰذا تم ان کو چھوڑ دو ہماری طرف آؤ۔[2] کسی نے کہا کہ یہ بات کہنے والے یہود ہیں۔ ﴿ هَلُمَّ ﴾ بہ معنی "أَقْبِلْ وَاَحْضُرْ" اسم فعل بہ معنی امر ہے۔

حجاز والے اس میں واحد جمع اور مذکر و مونث برابر رکھتے ہیں، یعنی سب کے لیے یہی ایک کلمہ بولتے ہیں اور اہلِ حجاز کے سوا اور عرب، جیسے: بنی تمیم یہ لوگ واحد مذکر کے لیے "هَلُمَّ" اور مونث کے لیے "هَلُمِّيْ" اور تثنیہ کے لیے "هَلُمَّا" اور جمع کے لیے "هَلُمُّوْا" بولتے ہیں۔ سورۃ الانعام میں اس پر کلام گزر چکا ہے،[3] معنی یہ ہیں کہ تم ہماری طرف رجوع کرو اور محمد ﷺ کو چھوڑ دو، لہٰذا ان کے ساتھ لڑائی میں حاضر مت ہو جاؤ، کیوں کہ ہمیں تمھاری ہلاکت کا ڈر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تم ہماری طرف آؤ، تاکہ راحت پاؤ۔ یعنی مدینے کے یہود نے منافقوں کو طلب کیا، تاکہ وہ راحت پائیں اور مومنوں کو ڈرایا، تاکہ وہ رجوع ہوں۔

تنبیہ:

﴿ هَلُمَّ ﴾ اس جگہ تو لازم ہے اور سورۃ الانعام میں متعدی ہے، اس لیے کہ اس نے اپنے مفعول کو نصب دیا ہے، وہ مفعول "شُهَدَآءَكُمْ" ہے، یعنی تم حاضر کرو اپنے شہداء کو اور یہاں یہ معنی ہیں کہ تم حاضر ہو جاؤ اور آؤ۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کا کلام اس جگہ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ یہ "هَلُمَّ" بھی متعدی ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے، کیوں کہ اس نے ﴿ هَلُمَّ اِلَيْنَا ﴾ کی یہ تفسیر کی ہے کہ "قَرِّبُوْا أَنْفُسَكُمْ إِلَيْنَا" یعنی تم اپنی جانوں کو ہماری طرف قریب کرو۔ "بَأْسٌ" کے معنی حرب و قتال ہیں۔ ﴿ قَلِيْلًا ﴾ صفت ہے مفعول مطلق محذوف کی۔ "أَيْ: إِتْيَانًا قَلِيْلًا"، یعنی نہیں آتے ہیں لڑائی میں مگر آنا تھوڑا، موت کے خوف کے مارے اور اتنا تھوڑا سا ٹھہرتے ہیں جس سے

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٢٠۔ ٦٢١) [2] فتح القدير (٤/ ٣٥٥) [3] رقم الآية (١٥٠)

ان کا حاضر ہونا دکھائی دے، پھر چلے جاتے ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ حاضر نہیں ہوتے لڑائی میں مگر دکھانے سنانے کو، اجر وثواب طلب کیے بغیر۔ اگر یہی قلیل خاص اللہ پاک کے لیے ہوتا تو کثیر ہو جاتا، مگر کہاں قلیل بھی اور وہ بھی دکھانے کے لیے۔

﴿ اَشِحَّةً عَلَيۡكُمۡ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم پر بخل کرنے والے ہیں، خندق کھودنے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ تمھاری معاونت نہیں کرتے۔[1] (قاله مجاهد و قتادة) کسی نے کہا ہے کہ تمھارے ساتھ ہو کر لڑنے میں بخیل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تمھارے فقیروں مسکینوں پر خرچ کرنے میں بخیل ہیں۔ کسی نے کہا: غنیمتوں کے ساتھ بخیل ہیں، جب ان کو پہنچیں۔ (قاله السدي كما مر) عامہ کی قراءت بہ نصب ﴿ اَشِحَّةً ﴾ ہے۔ اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ منصوب ہے بنا بر ذم۔ دوسری بنا بر حال ﴿ لَا يَاۡتُوۡنَ ﴾ کی ضمیر سے، یہ امام زجاج رحمہ اللہ کا قول ہے۔[2] یا ﴿ هَلُمَّ اِلَيۡنَا ﴾ سے، یہ قول طبری کا ہے، یا "مُعَوِّقِيۡنَ" سے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے نصب میں چار وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ فعل محذوف سے منصوب ہے: "أَيْ يَأْتُوْنَهُ أَشِحَّةً"۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: معوقین و قائلین کا اس میں عامل ہونا جائز نہیں ہے، تاکہ صلہ وموصول کے درمیان تفریق نہ کی جائے۔[3] امام ابن ابی عبلہ نے اس کو بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ یعنی "هُمْ أَشِحَّةٌ".[4] ﴿ اَشِحَّةً ﴾ جمع ہے "شَحِيْحٌ" کی۔ یہ جمع غیر قیاسی ہے۔ اس لیے کہ فعیل وصفی جس کا عین و لام ایک وادی سے ہو، یعنی ایک جنس سے ہو، اس کی جمع بروزن افعلاء آتی ہے، جیسے خلیل کی اخلاء، ظنین کی اظناء، ضنین کی اضناء۔ شحیح کی جمع اشحاء بھی سنی گئی ہے، یہ قیاسی ہے اور شح بہ معنی بخل ہے، آلِ عمران میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ (قاله السمين)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ رَاَيۡتَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ تَدُوۡرُ اَعۡيُنُهُمۡ كَالَّذِىۡ يُغۡشٰى عَلَيۡهِ مِنَ الۡمَوۡتِ ۚ ﴾ پھر جس وقت دشمن کی جانب سے خوف آجائے، جیسا کہ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ یا نبی ﷺ سے، جیسا کہ امام ابن شجرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[5] تو دیکھے تو ان کو کہ وہ تیری طرف نظر کرتے ہیں (بنا بر قول اول) لڑائی کے خوف سے اور (بنا بر قول ثانی) نبی کریم ﷺ کے خوف سے، اس حال میں کہ عقلیں جاتے رہنے سے ان کی آنکھیں دائیں بائیں پھرتی ہیں، یہاں تک کہ کسی طرف اُن کی نظر ٹھیک نہیں ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے خوف کی شدت کی وجہ سے کہ ان پر ہر طرف سے قتل کرنے والے آجائیں، ان کی آنکھیں دائیں بائیں پھرتی ہیں۔ بزدل کا یہی طریقہ ہوتا ہے، جب وہ اس شے کو دیکھتا ہے جس سے ڈرتا ہے۔

﴿ كَالَّذِىۡ ﴾ کا حرفِ کاف مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے۔ "أَيْ: تَدُوْرُ أَعْيُنُهُمْ دَوَرَانًا مِثْلَ دَوَرَانِ

---

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٥١) [2] معاني القرآن (٤/ ٢٢٠) [3] تفسیر القرطبي (١٤/ ٢٥٢)
[4] روح المعاني (٢١/ ١٦٥) [5] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٥٢)

عَيۡنِ الَّذِيۡ... الخ“ یعنی آنکھیں ان کی اس شخص کی آنکھوں کی طرح پھرتی ہیں جو موت سے قریب ہے، یہ وہ ہے جس پر موت آ اتری ہے اور موت کے اسباب نے اس کو ڈھانک لیا ہے، تو اس کی عقل اور ہوش و حواس جاتے رہتے ہیں اور اس کی نگاہ اوپر کو چڑھ جاتی ہے، پھر وہ پلک نہیں جھپکتا۔ اسی طرح یہ لوگ ہیں کہ خوف لاحق ہونے کے سبب سے ان کی آنکھیں اوپر کو چڑھ جاتی ہیں تو محاورے میں بولتے ہیں: ”دَارَتْ عَيْنَاهُ وَدَارَتْ حَمَالِيْقُ عَيْنَيْهِ“ (”حماليق“ جمع ”حِملاق“ بالکسر ”وهو باطن أجفان العين الذي يسوده الكحل أو ما غطته الأجفان من بياض المقلة“)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِذَا ذَهَبَ الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡكُمۡ بِاَلۡسِنَةٍ حِدَادٍ ﴾ ”زبانِ حدید“ تیز زبان کو کہتے ہیں، گویا وہ تیز شے کی طرح کام کرتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی کے واسطے جہر کر کے بات چیت میں درشتی و سختی کرے تو اس وقت محاورے میں یوں بولتے ہیں کہ ”سَلَقَ فُلَانٌ فُلَانًا بِلِسَانِهِ“ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ پھر جب خوف جاتا رہتا ہے تو امن اور بے خوفی میں تم کو ایذا دیتے ہیں السنة سليطة ذربة کے کلام سے، یعنی اپنی تیز زبانوں سے۔ جب کوئی خطیب بلیغ ہوتا ہے تو اس کو مسلاق و مصلاق کہتے ہیں۔ قتیبی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم کو سخت کلام کے ساتھ ایذا دیتے ہیں۔ ایذا دینے کو سلق کہتے ہیں۔[1]

امام خازن رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے۔ ”عَضُوْكُمْ وَتَنَاوَلُوْكُمْ بِالنَّقْصِ وَالْغِيْبَةِ“[2] یعنی تمھاری گھٹتی لیتے ہیں اور تمھاری غیبت کرتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ اپنی زبانیں تمھارے حق میں کھولتے ہیں۔ غنیمت کی تقسیم کے وقت کہتے ہیں کہ ہم کو دو، کیوں کہ ہم تو تمھارے ساتھ حاضر ہوئے، چنانچہ غنیمت کے وقت اشح قوم ہیں، یعنی سب سے بڑھ کر ڈھکنے والے (طمع کرنے والے) اور سب سے بڑھ کر زبان کے کھولنے والے اور لڑائی کے وقت سب سے بڑھ کر ہٹنے اور ڈرپوک۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول حسن ہے۔[3] کچھ معنی کی زیادتی ہے، اس لیے دوبارہ لکھ دیا ہے، ورنہ پہلے گزر چکا ہے۔

﴿ اَشِحَّةً عَلَى الۡخَيۡرِ ﴾ منصوب ہے بنا بر حال ﴿ سَلَقُوۡكُمۡ ﴾ کے فاعل سے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ذم کی بنا پر منصوب ہو۔ امام ابن ابی عبلہ نے بہ رفع پڑھا ہے، یعنی بڑے ڈھکنے والے ہیں (طمع کرنے والے)۔ غنیمت پر تقسیم کے وقت مسلمانوں سے جھگڑتے ہیں۔ (قاله يحيى بن سلام) کسی نے کہا ہے کہ مال پر بخیل ہیں کہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔[4] (قاله السدي) اور ممکن ہے کہ اس کے معنی یوں کہیں کہ وہ قلیل الخیر ہیں، اس کے بغیر کہ خیر کو خیر کی قسموں میں سے کسی ایک کے ساتھ مقید کریں۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٥٥) [2] تفسير الخازن (٥/ ٢٤٥)

[3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٥٣) [4] تفسير القرطبي (١٤/ ١٥٣) فتح القدير (٤/ ٣٥٥-٣٥٦)

﴿ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ﴾ یعنی یہ لوگ جن کے اوصاف بیان ہوئے، ایمان نہیں لائے بلکہ وہ منافق ہیں ایمان کو ظاہر کرتے ہیں اور کفر کو چھپاتے ہیں، اس لیے اللہ نے ان کے اعمال باطل کر دیے اس معنی سے کہ ان کے بطلان کو ظاہر کر دیا، کیوں کہ صحیح اعمال نہ تھے کہ ان پر ثواب دیا جا سکے، یہاں تک کہ اللہ ان کو باطل کرے اور وہ ضائع کیے جائیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کے جہاد کو باطل کر دیا، کیوں کہ وہ ایمان میں نہ تھا[1] یا یہ مراد ہے کہ ان کے تصنع اور نفاق کو باطل کر دیا تو وہ اصلاً کسی منفعتِ دنیوی کا ساتھ لینے والا باقی نہ رہا۔ یہ ان کے اعمال کا اکارت کرنا ہے، یا ان کا نفاق اللہ پر سہل اور آسان ہے اس کے ارادے میں۔

بزدلی کی انتہاء:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ۭ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ یعنی یہ منافق اپنی نامردی اور بزدلی کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ احزاب یعنی قریش، غطفان اور یہود اپنے لشکرگاہ میں موجود ہیں، ابھی اپنے شہروں کو نہیں گئے اور نہ وہ منہزم (شکست خوردہ) ہوئے۔ چنانچہ منافق مدینہ کے اندر کی طرف بھاگ گئے۔ یہ خیال اس لیے ہے کہ بزدلی، نامردی اور انتہا درجے کا خوف ان پر طاری ہوا تھا اور اگر اس دفعہ کے بعد اور فوجیں چلی جانے کے بعد دوبارہ آ جائیں تو وہ تمنا کریں کہ کاش وہ جنگل میں ہوں (اس خوف کی وجہ سے جو ان پر نازل ہوا) اور تمھاری خبریں پوچھتے رہیں اور جو کچھ تمھارا حال ہو اور جو ماجرا گزرا ہو، وہ تمھاری طرف سے ہر آنے جانے والے سے پوچھتے رہیں، یا یہ کہ ان کا بعض ان خبروں کے متعلق پوچھتا رہے جو احزاب اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اس کو پہنچیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس بات کی تمنا کریں کہ تم سے دور ہوں، مگر تمھاری خبریں پوچھتے رہیں اس کے بغیر کہ لڑائی کا مشاہدہ کریں اپنی بزدلی اور نیتوں کی کمزوری کی وجہ سے۔ اور اگر وہ اس غزوے میں تمھارے ساتھ لڑائی کا مشاہدہ کرنے والے ہوں تو تمھارے ساتھ مل کر نہ لڑیں، مگر تھوڑا سا لڑنا، یہ اس وجہ سے کہ انھیں عار و ننگ کا خوف ہے اور دیار کی حمیت ہے ریاکاری کے طور پر اور اجر و ثواب حاصل کرنے کی کوئی نیت نہیں ہے۔ بادی حاضر کا خلاف یعنی عکس ہے، یعنی حاضر شہر کا رہنے والا اور بادی بادیہ کا رہنے والا۔ جب کوئی شخص بادیہ کی طرف نکل جاتا ہے اور وہاں رہتا بستا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "بَدَا يَبْدُوْ بَدَاوَةً"۔ "مَنْ بَدَا فَقَدْ جَفَا"، بھی اسی معنی سے ہے۔[2]

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾ وَلَمَّا

[1] فتح القدیر (٤/ ٣٥٦) [2] فتح البیان (١١/ ٦٢۔ ٦٥)

رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ
اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ؀٢٢ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ
رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی
نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ؀٢٣ لِّیَجْزِیَ اللّٰهُ
الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ یَتُوْبَ
عَلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ؀٢٤

یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ رسے ملاقات) اور یوم آخرت کی اُمید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے (21) اور .سوں نے جب لشکر دیکھے تو کہا: یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس (چیز) نے ان کے ایمان اور فرماں برداری کو اور زیادہ کر دیا (22) مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چناں چہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے)، اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی (23) تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو اگر چاہے تو عذاب دے یا ان کی توبہ قبول فرمائے، یقیناً اللہ بہت مغفرت والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (24)

اتباعِ رسول ﷺ کا حکم:

رسول کا نمونہ، یعنی رسول کو دیکھو ان سختیوں میں کیا استقلال رکھتا ہے، سب سے زیادہ محنت اور اندیشہ اس پر ہے۔ اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ فرمایا تھا کہ تم کافروں کے ہاتھ سے تکلیف پاؤ گے آخر غلبہ تمھارا ہے اور یہ بھی کہ رسول نے فرمایا تھا کہ آٹھ دس دن میں تم پر فوجیں آتی ہیں۔ عہد پورا کر دیا، یعنی جہاد ہی میں جان دے چکا، جیسے: شہدائے بدر اور احد، اور منتظر ہیں، یعنی اَور اصحاب جو جہاد کے لیے مستعد ہیں موت کی راہ دیکھتے ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طلحہ ان میں ہے جو شہید ہو چکے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال و احوال میں آپ کی اقتدا کرنے میں ایک بڑی اصل ہے اور اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا کہ احزاب کے دن نبی اکرم ﷺ کی اقتدا

کریں، آپ کے صبر، مصابرت، مرابطت اور مجاہدہ میں اور کشائش کا انتظار کرنے میں اپنے رب عزوجل سے۔ صلوات الله وسلامه عليه دائما إلى يوم الدين۔ اور اسی لیے جو لوگ احزاب کے دن اپنے حال میں بے چین و بے قرار و متزلزل اور مضطرب ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ فرمایا کہ ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ یعنی تم نے اللہ کے رسول کا اقتدا کیوں نہیں کیا اور ان کے شمائل و خصائل کی پیروی کیوں نہیں کی اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾

غزوۂ خندق کے دن مومنوں کی ثابت قدمی:

پھر اللہ پاک نے اپنے مومن بندوں کے بارے میں خبر دی جو اللہ کے وعدے کی تصدیق کرنے والے ہیں اور اس کی کہ دنیا و آخرت میں اللہ پاک نے انجامِ نیک ان کے لیے حاصل رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اس سے مراد اللہ پاک کا قول ہے جو سورة البقرہ میں ہے: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾[1] [البقرة: ٢١٤] ''(پھر) کیا تمھارا خیال ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالاں کہ ابھی تک تمھیں ان لوگوں کے مانند (مشکلیں) پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلے گزرے، ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا ڈالے گئے، یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، کہنے لگے: اللہ کی مدد کب (آئے گی؟) آگاہ رہو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔'' یعنی یہ وہ آزمایش و اختیار اور امتحان ہے جس کے بعد نصرِ قریب آئے گی اور جس کا اللہ نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾

قولہ: ﴿ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کا ایمان بڑھتا اور گھٹتا ہے ان کے احوال کے مطابق جیسا کہ جمہور ائمہ نے کہا ہے کہ ایمان بڑھتا ہے اور گھٹتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے صحیح بخاری کی شرح کے شروع میں اس کی تقریر کی ہے۔ ولله الحمد والمنة۔ اس آیتِ کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ اس حال اور تنگی و شدت اور سختی نے ان کے اللہ کے احکام کی تابعداری اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور فرماں برداری میں صرف اضافہ ہی کیا ہے۔ پھر جب اللہ عزوجل نے منافقوں کی طرف سے یہ بات ذکر کی کہ انھوں نے جو عہد اللہ تعالیٰ سے کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے اس کو توڑ ڈالا تو مومنوں کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جس بات پر اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کیا تھا، اس کو سچا کر دکھایا۔

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٣٦۔ ٢٣٧)

﴿ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ ﴾ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ نَحْبَهٗ ﴾ کے معنی "أَجَلَهُ" ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی "عَهْدَهُ" ہیں،[1] یہ اول کی طرف راجع ہے۔ ﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ یعنی اللہ کے عہد کو نہ متغیر کیا اور نہ اس کو توڑا اور نہ اس کو بدلا۔

1 امام بخاری رحمہ اللہ نے خارجہ بن زید بن ثابت عن ابیہ سے روایت کیا ہے، کہا: جبکہ ہم نے مصحف لکھا تو سورۃ الاحزاب سے ایک آیت میں نے گم پائی، رسول اللہ ﷺ کو میں سنا کرتا تھا کہ آپ ﷺ اس کو پڑھتے تھے، میں نے اس کو کسی کے پاس نہ پایا مگر خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس، جس کی گواہی کو رسول اللہ ﷺ نے دو مردوں کی گواہی کے برابر ٹھہرایا۔ وہ یہ آیت ہے: ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ﴾[2] (انفرد به البخاري دون مسلم و أخرجه أحمد في مسنده و الترمذي والنسائي في التفسير من سننيهما من حديث الزهري به، وقال الترمذي: حسن صحيح)

2 نیز بخاری نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم دیکھتے ہیں اس آیت کو کہ سیدنا انس بن نضر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ... الآية ﴾[3] (انفرد به البخاري من هذا الوجه ولكن له شواهد من طرق أخر)

3 امام احمد رحمہ اللہ نے ثابت رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے چچا انس بن نضر رضی اللہ عنہ جن کے نام پر میرا نام رکھا گیا، وہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حاضر نہیں ہوئے، چنانچہ یہ ان پر شاق گزرا اور کہا کہ اول مشہد یعنی جائے حضور مراد لڑائی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ حاضر ہوئے میں اس سے غائب رہا، البتہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی مشہد رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ دکھائے تو البتہ اللہ عزوجل اس شے کو دیکھے گا جو میں کروں گا، پھر وہ ڈرے کہ اس کے سوا کوئی کلمہ نہ کہیں (یعنی اسی مبہم لفظ پر اکتفا کیا اس خوف سے کہ کسی اور کلمے سے عہد کرنے کے بعد عاجز ہو جائیں، یا اس لیے کہ ان کے لیے حول وقوت سے ابراء ہو جائے۔[4] كذا في مجمع البحار)۔

پھر وہ احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حاضر ہوئے تو سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے سامنے آئے۔ چنانچہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اے ابو عمرو! کدھر؟ "قَالَ وَاهاً لِرِيحِ الْجَنَّةِ إِنِّي أَجِدُهُ دُوْنَ أُحُدٍ أَيْ: عِنْدَ أُحُدٍ" یعنی واہ ہے جنت کی ہوا کو، یا اس کی خوشبو کو، میں تو اس کو احد پہاڑ سے ورے (اس طرف) پا رہا ہوں۔ ("واہا" کا کلمہ کہا ہے کہ اس کے معنی تلہف ہیں اور کبھی کسی شے پر تعجب کے لیے اور دردمندی کے اظہار کے لیے آتا

---

1 صحيح البخاري، رقم الحديث (٤/ ١٧٩٥)

2 صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٥٢) مسند أحمد (٥/ ١٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٠٤) سنن النسائي الكبرى (٦/ ٤٣٠)

3 صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٠٥) 4 مجمع بحار الأنوار (٤٥٠٥)

ہے۔ کسی نے کہا کہ دردمندی کے لیے آھا ہے، یہاں تو وَاھا کا کلمہ تعجب کے لیے ہے، یعنی واہ ری جنت کی ہوا کیا خوب آ رہی ہے، لے میں بھی آتا ہوں۔ إن شاء اللّٰہ تعالیٰ واللّٰہ أعلم۔ تفسیر ابن کثیر میں حدیث شریف کے الفاظ اسی طرح ہیں، جس طرح اس کا ترجمہ گزرا ہے، لیکن فتح القدیر میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: ”فَشَهِدَ يَوْمَ أُحُدٍ فَاسْتَقْبَلَهُ سَعْدُ بْنُ مُعَاذٍ قَالَ: يَا أَبَا عَمْرٍو أَيْنَ؟ قَالَ: وَاهًا رِيحُ الْجَنَّةِ أَجِدُهَا دُوْنَ أُحُدٍ فَقَاتَلَ حَتّٰى قُتِلَ... الخ“[1] غرض یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا انس بن نضر رضی اللہ عنہ کے سامنے سعد بن معاذ آئے تو سعد نے انس رضی اللہ عنہ سے کہا: اے ابوعمرو! کدھر جا رہے ہو؟ تو سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: واہ ہے جنت کی ہوا کو کہ میں اسے پا رہا ہوں اُحد کے نزدیک، پھر لڑے یہاں تک کہ شہید ہوئے اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ”فَاسْتَقْبَلَ سَعْدَ بْنَ مُعَاذَ فَقَالَ لَهُ أَنَسٌ: يَا أَبَا عَمْرٍو إِلَى أَيْنَ وَاهًا لِرِيحِ الْجَنَّةِ... الخ“[2] واللّٰہ أعلم)۔ پھر وہ کفار سے لڑے، یہاں تک کہ شہید ہوئے۔ کہا: پھر ان کے جسم پر اسی (۸۰) سے زیادہ تلوار کی ضربیں اور بھالے کے چونکے اور تیر کی ماریں پائی گئیں۔ پس ان کی بہن میری پھوپھی ربیع رضی اللہ عنہا نضر کی بیٹی نے کہا کہ میں نے اپنے بھائی کو صرف اس کی انگلیوں کی پوروں سے پہچانا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ... الآية﴾ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گمان کرتے تھے کہ یہ آیت سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے حق میں اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[3] (ورواه مسلم والترمذي والنسائي من حديث سليمان بن المغيرة به ورواه النسائي أيضا وابن جرير من حديث حماد بن سلمة عن ثابت عن أنس رضي الله عنه به نحوه)

4 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ ان کے چچا یعنی سیدنا انس بن نضر رضی اللہ عنہ بدر کی لڑائی سے غائب رہے تو کہا کہ میں پہلی لڑائی سے غائب رہا کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں سے لڑے۔ البتہ اگر اللہ عزوجل مشرکوں کے ساتھ کسی لڑائی میں مجھے حاضر کرے تو اللہ تعالیٰ اس شے کو دیکھے گا جو میں کروں گا۔ کہا: پھر جب اُحد کا دن ہوا تو مسلمان منہزم (بھاگنے والے شکست کھانے والے) ہوئے۔ چنانچہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! بے شک میں تیری طرف اس شے سے عذر پیش کرتا ہوں جو انھوں نے کی، یعنی ان کے ہمراہیوں نے، اور بے زار ہوتا ہوں میں تیری طرف اس شے سے جس کو یہ لوگ، یعنی مشرکین لائے ہیں۔ پھر آگے بڑھے تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کو اُحد کے نزدیک ملے تو کہا کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر مجھے قدرت نہ ہوئی کہ وہ کام کروں جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کیا۔ پھر جب انس رضی اللہ عنہ مارے

---

1 فتح القدير (٤/ ٣٥٩) فتح البيان (١١/ ٦٨) 2 تفسير ابن كثير (٣/ ٦٢٢)

3 مسند أحمد (٣/ ١٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠٠) سنن النسائي الكبرى (٦/ ٤٣١) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٣٩_ ٢٤٠)

گئے تو کہا کہ ان کے جسم میں اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ ضربیں تلوار کی اور چوکے نیزے کے اور تیر کی ماریں پائی گئیں۔ اور لوگ کہا کرتے تھے کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ اور اس کے ساتھیوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾[1] (وأخرجه الترمذي في التفسير عن عبد بن حميد، عن إسحاق بن ابراهيم كلاهما عن يزيد بن هارون به، وقال الترمذي: حسن، و قد رواه البخاري في المغازي عن حسان بن حسان عن محمد بن طلحة عن مصرف عن حميد عن أنس رضی اللہ عنہ به ولم يذكر نزول الآية و رواه ابن جرير من حديث المعتمر بن سليمان عن حميد عن أنس رضی اللہ عنہ به)

5 نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد سے لوٹ کر تشریف لائے تو منبر پر چڑھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور مسلمانوں کو جو کچھ پہنچا تھا، اس کی ان کو تعزیت فرمائی اور تسلی دی اور اس میں جو اجر و ثواب تھا، اس کی ان کو خبر دی۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ... الآية﴾ پس مسلمانوں کا ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا: اے اللہ کے رسول! یہ کون لوگ ہیں؟ پھر میں سامنے آیا اور مجھ پر حضر موت کے بنے ہوئے دو سبز کپڑے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے سائل! یہ ان میں سے ہے۔[2] (كذا رواه ابن جرير من حديث سليمان بن أيوب الطلحي به وأخرجه الترمذي في التفسير والمناقب أيضا و ابن جرير من حديث يونس بن بكير عن طلحة بن يحيى عن موسىٰ و عيسى ابني طلحة عن أبيهما رضی اللہ عنہ به، وقال: حسن غريب لا نعرفه إلا من حديث يونس)

6 سیدنا موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا: میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر داخل ہوا، پھر جب ان کے پاس سے نکلا تو مجھے بلایا، پھر کہا: اے بھتیجے! کیا میں تجھ سے ایک حدیث نہ کہوں جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ البتہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے: طلحہ ﴿مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ سے ہے۔[3]

7 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو موسیٰ بن طلحہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ خطبہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو کہا: بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے، فرماتے تھے: طلحہ ﴿مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ سے ہے۔[4] اسی لیے مجاہد نے ﴿نَحْبَهٗ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد "عَهْدَهٗ" ہے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ یعنی اور ان میں سے وہ شخص ہے جو انتظار کر رہا ہے اس دن کا کہ جس میں لڑائی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٢٤، ٣١٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠١) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٣٠) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٤٠)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٢٥) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٤٠۔ ٢٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو "حسن" کہا ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ١٢٥)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٩١٦)

[4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٤٠)

ہو تو دشمن کے ساتھ مقابلے میں سچا ہو۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿ نَحْبَهٗ ﴾ سے مراد "مَوْتَه" ہے، یعنی جس نے اپنا مرنا صدق و وفا پر پورا کیا، اور کوئی ان میں سے وہ ہے جو انتظار کر رہا ہے مرنے کا اسی کے مثل پر اور ان میں سے وہ ہے جس نے تبدیل نہ کیا اپنا عہد۔ اسی طرح امام قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے۔[1] بعض نے کہا کہ ﴿ نَحْبَهٗ ﴾ کے معنی "نَذْرَهٗ" ہیں۔

قولہ سبحانہ: ﴿ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ یعنی انھوں نے اپنے عہد کو تبدیل نہیں کیا اور اپنی وفاداری کو بے وفائی سے نہیں بدلا، اور اس پر قائم رہے جس پر اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا، اور اس کو منافقوں کی طرح توڑا نہیں جنھوں نے کہا کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں، حالاں کہ وہ کھلے ہوئے نہیں پڑے تھے، ان کی غرض صرف بھاگنا تھا، حالاں کہ وہ اس سے پہلے اللہ سے پکا عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہ پھیریں گے۔

قولہ سبحانہ تعالیٰ: ﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ ... الآية ﴾ اللہ تعالیٰ تو پرکھتا ہے اپنے بندوں کو ڈر سے اور جھڑ جھڑانے سے، تاکہ پلید کو پاک سے علاحدہ کر دے اور اس کا کام اس کے فعل سے ظاہر ہو جائے اور اس کا کام اس کے فعل سے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر شے کو اس کے ہونے سے پہلے سے ہی جانتا ہے، لیکن اپنی مخلوق کے بارے میں اس کا جو علم ہے اس کی بنا پر ان کو عذاب نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ اس شے کا عمل کر لیں جس کو وہ ان سے جانتا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ﴾ [محمد: ٣١] "اور ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے، حتی کہ تم میں سے مجاہدین کو اور صبر کرنے والوں کو جان لیں، اور ہم تمھارے حالات جانچ لیں۔"

چنانچہ یہ شے کا علم اس کے ہونے کے بعد ہے، اگرچہ اس کا علمِ سابق اس کے وجود سے قبل حاصل تھا، اسی طرح اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے: ﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ ﴾ [آل عمران: ١٧٩] "اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علاحدہ کر دے اور نہ اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے۔" اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ ﴾ یعنی تاکہ اللہ سچوں کو ان کے صبر کرنے کا بدلہ دے، اس پر جس پر انھوں نے اللہ سے عہد کیا ہے اور ان کے اس کے ساتھ قائم رہنے اور اس کی محافظت کا بدلہ دے اور منافقوں کو عذاب کرے، یہ لوگ اللہ کے عہد کو توڑنے والے ہیں اور اس کے حکموں کی مخالفت کرنے والے ہیں، اس وجہ سے وہ عذاب اور سزا کے مستحق ہوئے، لیکن وہ دنیا میں اللہ کے زیرِ مشیت ہیں، اگر وہ چاہے تو انھیں اس فعل پر قائم رہنے دے جو انھوں نے کیا ہے، یہاں تک کہ اسی کو لے کر اس سے ملیں تو وہ ان

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٣٨۔ ٢٣٩)

کو اس پر عذاب کرے اور چاہے تو وہ اس سے رجوع کر لیں اس طرح سے کہ اللہ ان کو اس طرف راہ بتائے اور وہ نفاق سے ایمان کی طرف رجوع کریں اور فسق کے بعد عمل صالح کریں اور چوں کہ اللہ تعالیٰ کی نرمی اور رحمت ہی اس کے غضب پر غالب ہے اس لیے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾[1] یعنی بے شک اللہ پاک تو اپنی بنائی ہوئی مخلوق پر بڑا ہی بخشنے والا ہے اور بڑا ہی مہربان ہے۔ اللھم اغفرلنا وتب علینا إنك أنت التواب الرحیم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ بہ معنی "قُدْوَةٌ صَالِحَةٌ" ہے، یعنی اچھی پیروی کرنا۔ عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "لِيْ فِيْ فُلَانٍ أُسْوَةٌ" یعنی مجھ کو فلاں کا اقتدا ہے۔ ﴿ اُسْوَةٌ ﴾ ماخوذ ہے "اِئْتِسَاء" سے، جس طرح کہ "قُدْوَةٌ" ماخوذ ہے "اِقْتِدَاء" سے، یہ ایک اسم ہے جو مصدر کی جگہ رکھا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی شخص کا اقتدا کرے تو محاورے میں یوں بولیں گے: "اِئْتَسٰی فُلَانٌ بِفُلَانٍ" یعنی فلاں نے فلاں کی پیروی کی۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أُسوہ" و "اِسوہ" بہ ضم و کسر دونوں طرح ہے، اس کی جمع "أُسیً واِسیً" ہے۔ جمہور نے بہ ضم ہمزہ پڑھا ہے اور عاصم نے بہ کسر ہمزہ، یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں اور یہ دونوں دو لغت بھی ہیں، جیسا کہ امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔[1] اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں پر عتاب ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگ کرنے سے پیچھے رہنے والے ہیں، یعنی تم کو اللہ کے رسول کی اچھی پیروی کرنی تھی، جب انھوں نے اپنی جان لڑائی میں ڈالی اور اللہ کے دین کی مدد کرنے کے لیے خندق کی طرف نکلے۔

مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے رسول کی اچھی پیروی کرو، وہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کی نصرت کرو اور اس کے رسول کی معاونت و مدد کرو اور اس سے پیچھے نہ رہو اور جو کچھ ایذا اور تکلیف تم کو پہنچے اس پر صابر رہو، جس طرح کہ خود اس (رسول اللہ ﷺ) نے کیا، جب کہ اس کے اگلے دانت ٹوٹے اور زخمی ہوا اور سر میں زخم لگا اور اس کا شکم گرسنہ رہا اور اس کا چچا مارا گیا اور اسے طرح طرح کی ایذا دی گئی، چنانچہ اس نے صبر کیا اور باوجود اس کے اس نے اپنی جان سے تمھاری مواسات کی، یعنی غم خواری کی، پس تم بھی اسی طرح کرو اور اس کی چال چلو۔ اس آیتِ شریف کا شانِ نزول اگرچہ خاص ہے، لیکن یہ ہر شے میں عام ہے۔ اسی کی طرح یہ آیت ہے: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ۷] "اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔" اور یہ آیتِ کریمہ ﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ۳۱] "آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔"

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے بھوکے رہنے کے باب سے ہے۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

---

[1] فتح القدیر (٤/ ٣٥٦)   [2] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٥٤)

کی ایک جماعت نے بہت سے مسئلوں میں اس آیتِ کریمہ سے استدلال کیا ہے، ان مسئلوں پر کتبِ سنت مشتمل ہیں، چوں کہ وہ اس بات سے خارج ہیں جو ہم بیان کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ان کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اس میں اتباعِ سنت پر اور ترکِ بدعت پر روشن دلالت ہے۔ ہر سنت کا اتباع موجبِ نور و رحمت ہے اور ہر بدعت کا ارتکاب باعثِ ظلمت و زحمت ہے۔ اللهم ارزقنا اتباع كتابك وسنة نبيك صلى الله عليه وآله وسلم، وجنبنا عن الابتداع واتباع الأهواء، وأحينا على اتباع السنة وأمتنا عليها آمين يا أرحم الراحمين۔ اب رہی یہ بات کہ یہ اقتدا بطور ایجاب ہے یا بطریقِ استحباب؟ تو اس میں دو قول ہیں: امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ امورِ دین میں تو واجب پر محمول ہو اور امورِ دنیا میں مستحب ہو۔[1]

﴿ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ حَسَنَةٌ ﴾ سے متعلق ہے، یا محذوف سے متعلق ہے، جو ﴿ حَسَنَةٌ ﴾ کی صفت ہے۔ "أَيْ: حَسَنَةً كَائِنَةً لِّمَنْ يَرْجُوْ اللّٰهَ" کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ ﴿ لَكُمْ ﴾ کے کاف سے بدل ہے، لیکن امام ابوحیان نے اس کو یوں رد کیا ہے کہ ضمیر مخاطب سے باعادہ جار بدل نہیں ہوتا۔ کسی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ کوفیوں نے اور اخفش نے اس کو جائز رکھا ہے، گو بصری اس کے مانع ہیں۔[2] ﴿ لِمَنْ كَانَ ﴾ سے مراد مومنین ہیں، کیوں کہ یہی لوگ اللہ پاک سے امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، یعنی اللہ پاک کے ثواب کی اور اس سے ملنے کی اور اس کے دیدار فائض الانوار سے مشرف ہونے کی امید رکھتے ہیں۔ روزِ آخر کی امید رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک کی رحمت جو اس دن ہوگی اس کی امید رکھتے ہیں، یا یہ معنی ہیں کہ اس کے حصول کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ پہلے جملے سے تعمیم کی ہے، پھر اس کے بعد اس جملے سے تعمیم کے بعد تخصیص فرمائی ہے۔

جملہ ﴿ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ معطوف ہے ﴿ كَانَ ﴾ پر، یعنی اللہ کے رسول کا اقتدائے نیک اس شخص کے لیے ہے جس نے اللہ کی امید رکھی اور آخرت کے دن کی اُمید رکھی اور اس کے لیے ہے جس نے اپنے سارے حالات میں اللہ کو بہت سا یاد کیا اور اللہ کی یاد کے ساتھ ساتھ اس کی ملاقات کی امید بھی رکھی، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اچھا اقتدا اس سے حقیقی ثابت ہوتا ہے۔ بالجملہ مومنین مخلصین نے جس وقت فوجوں کو دیکھا اور بحرِ زخار کی طرح ان لشکروں نے ان کا احاطہ کیا اور ان کو آ کر گھیر لیا تو اس وقت ان سے جو بات صادر ہوئی اللہ پاک اس کا بیان فرماتا ہے: ﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ یعنی جب مومنوں نے وہ فوجیں دیکھیں تو بولے: یہ وہ شے ہے جس کا ہم کو اللہ نے وعدہ دیا تھا اور اس کے رسول نے۔ ﴿ هٰذَا ﴾ کا اشارہ ان لشکروں کی طرف ہے جن کو انھوں نے دیکھا، یا اس حادثۂ عظیم کی طرف جو نازل ہوا اور وہ بلائے ناگہانی ان پر آ پڑی۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٥٥) [2] البحر المحيط (٧/ ٢١٦)

غرضیکہ اللہ نے اور اس کے رسول نے ان سے جو ان لشکروں کے آنے کا وعدہ کیا تھا اور اس بات کا کہ ان کے آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصر اور ظفر (کامیابی) کا نزول ہوگا۔ چنانچہ اس وعدے کے حاصل ہونے اور پورا ہونے سے خوش ہو کر یہ بات کہی۔ کلمۂ ﴿مَا﴾ موصولہ ہے یا مصدریہ۔

پھر اس بات کے بعد یہ بات کہی: ﴿وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ یعنی اللہ اور اس کے رسول کی خبر کا صدق ظاہر ہوگیا۔ پہلے ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ کہا تھا تو یہاں "صَدَقَا" کہہ دینا کافی تھا، چنانچہ یوں نہ کہا، بلکہ اسم شریف کا اور لفظِ رسول کا اظہار کیا تو ایک وجہ تو یہ ہے کہ تعظیم کے ارادے سے ایسا کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر "صَدَقَا" کہتے تو اللہ اور رسول کی ضمیروں کا ایک لفظ میں جمع کرنا لازم آتا، حالاں کہ ایسی ضمیروں کے جمع کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جیسا کہ «بِئْسَ خَطِيْبُ الْقَوْمِ أَنْتَ» کی حدیث شریف میں مروی ہے۔[1] اس نے یوں کہا تھا: "وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَقَدْ غَوٰى"، یعنی جو کوئی نافرمانی کرے ان دونوں کی تو وہ یقیناً گمراہ ہوا، چوں کہ اس خطیب نے اللہ اور رسول کی ضمیروں کو ایک لفظ میں جمع کیا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تو تو قوم کا بُرا خطیب ہے۔ غرض یہ ہے کہ اس کو یوں کہنا چاہیے تھا: "مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ غَوٰى"

رہا خود نبی کریم ﷺ کا قولِ مبارک: «مَنْ كَانَ وَرَسُوْلُهٗ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا»[2] آپ ﷺ نے "مَا سِوَاهُمَا" میں دونوں ضمیروں کو جمع فرمایا ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ آپ ﷺ ہم سے بڑھ کر اللہ پاک کی قدر مقدس کو پہچاننے والے ہیں، ہم کو حق نہیں پہنچتا کہ ہم ویسا کہیں جیسا آپ ﷺ فرماتے ہیں۔ (قاله السمين)

قولہ تعالیٰ: ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا﴾ "زَادَ" کا فاعل ان پر اجتماعِ احزاب ہے اور ان کا ان کی طرف آنا ہے، یعنی فوجوں کے جمع ہونے نے صرف ان کے ایمان میں اور اس کا حکم ماننے میں اضافہ کیا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فاعل نظر ہے، یعنی زیادہ نہیں کیا ان کو فوجوں کی طرف نظر کرنے نے مگر ایمان اور تسلیم میں۔ علی بن سلیمان نے کہا ہے کہ ﴿رَاٰ﴾ دال ہے رؤیت پر اور رؤیت کی تانیث غیر حقیقی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "زَادَ" کا فاعل رؤیت ہے، یعنی زیادہ نہ کیا ان کو دیکھنے نے مگر رب کے ساتھ ایمان میں اور قضا کے لیے تسلیم میں۔[3] اور اگر "زَادَتْهُمْ" بتانیث فعل فرماتا تو بھی جائز ہوتا، کیوں کہ مونث غیر حقیقی میں فعل کا مذکر و مونث لانا دونوں طرح درست ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ پاک نے سورۃ البقرہ میں مومنوں سے فرمایا ہے: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ [البقرة: ٢١٤]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٠)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣)
[3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٥٦)

”(پھر) کیا تمھارا خیال ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالاں کہ ابھی تک تمھیں ان لوگوں کے مانند (مشکلیں) پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلے گزرے، ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا ڈالے گئے، یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، کہنے لگے: اللہ کی مدد کب (آئے گی؟) آگاہ رہو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔“ چنانچہ جب ان کو بلانے چھوا جس جگہ کہ انھوں نے خندق میں احزاب کی مرابطت کی، یعنی فوجوں کے مقابلے کو گھوڑے باندھے اور لڑائی کی تیاری کی اور سرحد کی حفاظت کی تو کہا: یہ وہ ہے جس کا ہم سے اللہ نے اور اس کے رسول نے وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا مومنوں نے اس آیت کی تاویل کی، یعنی اس حکم کی بجا آوری کی، پس اس نے ان کو نہ بڑھایا، مگر ایمان اور تسلیم میں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ﴾ ﴿ صَدَقُوْا ﴾ کے معنی ہیں: ”أتوا بِالصِّدْقِ“ یعنی صدق و راستی لائے، سچ بولے۔ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب کوئی سچ بولتا ہے تو کہتے ہیں: ”صَدَقَنِيْ“ اس نے مجھ سے سچ کہا۔ ﴿ مَا عٰهَدُوا ﴾ کا محل نصب ہے بنا بر نزعِ خافض۔ ”أَيْ: وَفَوْا بِمَا عَاهَدُوْا“ یعنی مومنین مخلصین میں سے کچھ لوگ ہیں جنھوں نے اس عہد کو وفا کیا جو عقبہ کی رات کو رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا کہ ان کے ساتھ ثابت رہیں گے اور جو کوئی ان سے لڑے گا اس سے لڑیں گے، بخلاف ان لوگوں کے جو اپنے عہد میں جھوٹے ہوئے اور اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی۔ یہ لوگ منافقین ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نذر مانی تھی کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ لڑائی میں دشمن سے ملیں گے تو آپ ﷺ کے لیے ثابت رہیں گے اور نہیں بھاگیں گے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ اُحد سے لوٹے تو آپ مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے اور وہ مقتول پڑے ہوئے تھے، چنانچہ آپ ﷺ ان کے پاس ٹھہرے اور ان کے لیے دعا فرمائی، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ﴾ پھر فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ لوگ اللہ کے نزدیک شہید ہیں، چنانچہ تم ان کے پاس آؤ اور ان کی زیارت کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! روزِ قیامت تک جو بھی ان پر سلام کرے گا تو یہ اس کے سلام کا جواب دیں گے۔ (أخرجه الحاكم وصححه البيهقي في الدلائل)

امام حاکم رحمہ اللہ نے جو اس حدیث کو صحیح کہا ہے تو ذہبی نے اس میں حاکم کا تعاقب کیا ہے۔[2] كما ذكر ذلك

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٣٦)

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٢٧١) دلائل النبوة (٣/ ٢٨٤) الدر المنثور (٦/ ٥٨٧) اس کی سند میں اضطراب ہے۔ مزید دیکھیں (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٢٢١)

السیوطي۔ لیکن امام حاکم رحمہ اللہ نے ایک اور حدیث کی تخریج کی ہے اور اس کی تصحیح کی ہے اور بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اس کی تخریج دلائل میں کی ہے۔ وہ حدیث شریف یہ ہے کہ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کے دن فارغ ہوئے تو آپ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے پاس سے اس حال میں گزرے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں مقتول پڑے ہوئے تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا... الآية﴾[1] (وأخرج ابن مردويه من حديث خباب مثله) یہ دونوں حدیثیں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کی شہادت دیتی ہیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

غرضیکہ پھر جن لوگوں نے اللہ پاک سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سچا وعدہ کیا تھا اللہ پاک نے ان کے حال کی تفصیل بیان کی اور ان کو دو قسم کے ٹھہرایا، چنانچہ فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾، یعنی ان میں سے وہ شخص ہے جو اپنی نذر سے فارغ ہوا اور اپنا عہد پورا کیا اور جہاد پر صبر کیا، یعنی ثابت قدمی کی، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس تصدیق اور ایمان پر وہ تھا، اسی پر مر گیا۔[2] "نَحْب" وہ شے ہے جس کو انسان لازمی طور پر اختیار کرتا ہے اور اس کو پورا کرنے کا معتقد ہوتا ہے اور اس کو اپنے نفس پر واجب کر لیتا ہے۔ اس کا اطلاق نذر و قتل و موت پر ہوتا ہے۔

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ کے معنی ہیں: "قُتِلَ"۔ یعنی مارا گیا اور "نَحْب" کی اصل نذر ہے۔[3] بدر کے دن انھوں نے نذر کی تھی کہ اگر دشمن سے ملیں گے تو لڑیں گے، یہاں تک کہ مارے جائیں یا اللہ ان کو فتح دے، پھر وہ مارے گئے تو کہا گیا کہ فلاں نے اپنا "نَحْب" پورا کیا، یعنی مارا گیا۔ "نَحْب" کے معنی حاجت کے اور آرزو پانے کے بھی ہیں، ان کا کہنے والا، یعنی عرب لوگوں میں سے اپنے محاورے میں یوں کہتا ہے: "مَالِيَ عِنْدَهُمْ نَحْبٌ" یعنی میری ان کے پاس کوئی حاجت نہیں ہے۔ اور "نَحْب" کے معنی عہد کے بھی ہیں، یہ سب معانی عرب کے اشعار میں وارد ہوئے ہیں۔ آیت کے یہ معنی ہیں کہ مومنین میں یہ وہ مرد ہیں جنھوں نے اپنی آرزو پائی اور اپنی حاجت پوری کی اور اپنی نذر وفا کی، چنانچہ لڑے یہاں تک کہ مارے گئے، یہ قصہ اُحد کے دن کا ہے، جیسے: سیدنا حمزہ، مصعب بن عمیر اور انس بن نضر رضی اللہ عنہم۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ یعنی اور ان میں سے وہ ہے جو انتظار کر رہا ہے اپنی نذر کے پورا کرنے کا، یہاں تک کہ اس کی اجل حاضر ہو، جیسے: سیدنا عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اور ان جیسے اَور لوگ، کیوں کہ یہ لوگ اس عہد کی وفا پر قائم رہنے والے ہیں جو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت رہیں گے اور اس کے دشمن

[1] مستدرك الحاكم (٣/ ٢٢١) دلائل النبوة (٣/ ٢٨٤۔ ٢٨٥) الدر المنثور (٦/ ٥٨٧)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٢٥) [3] فتح القدير (٣٥٨)

سے لڑیں گے اور اپنی حاجت پوری کرنے کا انتظار کر رہے ہیں، یعنی قتل اور شہادت کی فضیلت حاصل کرنے کی آرزو کے پورا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

جملہ ﴿ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ معطوف ہے ﴿ صَدَقُوْا ﴾ پر، یعنی اپنے عہد کو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کیا تھا، نہیں بدلا جیسا کہ منافقوں نے اپنے عہد کو بدل ڈالا، بلکہ یہ لوگ اپنے عہد پر پوری طرح قائم ہیں۔ جو لوگ اپنی نذر پوری کر چکے ان کا حال تو ظاہر ہے اور وہ لوگ جو اپنی "نحب" کے پورا ہونے کے منتظر ہیں تو وہ واقعی اس پر قائم رہے، یہاں تک کہ دنیا سے مفارقت کی اور تغیر و تبدیل نہیں کیا۔ سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصحابِ رسول ﷺ نے ایک جاہل اعرابی سے کہا کہ تو ان سے ﴿ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ ﴾ کے متعلق پوچھ کہ وہ کون شخص ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ سے پوچھنے پر جرأت نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی توقیر کرتے اور آپ ﷺ سے ڈرتے تھے، چنانچہ اس اعرابی نے آپ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا، پھر اس نے سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا، پھر میں نے مسجد کے دروازے سے جھانکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ ﴾ کا سائل کہاں ہے؟ اعرابی نے کہا: میں ہوں۔ فرمایا: یہ ﴿ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ ﴾ سے ہے۔[1] (أخرجه الترمذي وحسنه وأبو يعلىٰ وابن جرير وابن مردويه وأخرج ابن جرير وابن أبي حاتم والطبراني وابن مردويه من حديثه نحوه)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ وہ ایک شخص کی طرف دیکھے جو اپنی نذر پوری کر چکا ہے اور زمین پر چل رہا ہے تو چاہیے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرف نظر کرے۔[2] (أخرجه سعيد بن منصور وأبو يعلى وأبو نعيم وابن المنذر وابن مردويه وأخرج ابن مردويه من حديث جابر مثله وأخرج ابن منده وابن عساكر من حديث أسماء بنت أبي بكر رضي الله عنها نحوه) سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت طلحہ رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[3] (أخرجه أبو الشيخ و ابن عساكر) سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احزاب کے دن فرمایا کہ اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے اور وہ ہم پر چڑھائی نہ کریں گے۔[4] (أخرجه أحمد و البخاري و ابن مردويه)

قولہ سبحانہ و تعالیٰ: ﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ﴾ حرفِ لام جائز ہے کہ ﴿ صَدَقُوْا ﴾ سے متعلق ہو، یا ﴿ زَادَهُمْ ﴾ سے، یا ﴿ مَا بَدَّلُوْا ﴾ سے، یا محذوف سے۔ گویا یوں کہا گیا کہ واقع ہوا یہ سب جو کچھ کہ واقع ہوا، تاکہ اللہ صادقین کو ان کے عہد وفا کرنے کا بدلہ دے اور اگر چاہے تو منافقوں کو اس تغییر و تبدیل کے سبب سے جو انھوں نے کی انھیں عذاب کرے اگر وہ توبہ نہ کریں، اور

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠٣) مسند أبي يعلىٰ (٢/ ٢٦) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٤٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٥)

[2] مسند أبي يعلىٰ (٨/ ٣٠١) الدر المنثور (٦/ ٥٨٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٥) [3] الدر المنثور (٦/ ٥٨٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٨٣) مسند أحمد (٤/ ٢٦٢)

اگر وہ توبہ کرلیں تو ان پر رجوع ہو۔ منافقوں کو ایسا ٹھہرایا، گویا انھوں نے انجامِ بد کا قصد کیا اور اس کا ارادہ کیا اپنی تبدیلی اور تغییر کے سبب سے، جس طرح کہ صادقوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے کے سبب سے انجامِ صدق کا ارادہ کیا۔ چنانچہ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک اپنے انجام کے ثواب اور عذاب کی طرف ہانکا گیا۔ پس گویا اپنے اپنے انجام کی طلب میں اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے میں دونوں برابر ہوئے۔

﴿ اِنْ شَآءَ ﴾ کا مفعول و جواب دونوں محذوف ہیں، یعنی اگر ان کو عذاب کرنا چاہے تو ان کو عذاب کرے، یہ اس صورت میں ہے کہ وہ نفاق پر قائم رہیں اور اس کو ترک نہ کریں اور اس سے توبہ نہ کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے بڑا بخشنے والا ہے جو اُن میں سے توبہ کرے، اس کی توبہ قبول کرکے اور اس پر بڑا مہربان ہے جو اس نفاق سے باز آجائے جس پر وہ تھا، اس کے گناہ معاف کرکے۔ پھر اللہ پاک نے باقی ماندہ قصے کی طرف رجوع کیا اور جس نعمت کا اپنے رسول ﷺ اور مومنوں پر احسان کیا، اس کو بیان کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿٢٥﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿٢٦﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢٧﴾

اور (غزوۂ احزاب میں) اللہ نے کافروں کو ان کے (ناکامی کے) غصے میں لوٹا دیا، وہ کوئی خیر و بھلائی نہ پا سکے، اور (اس) لڑائی میں اللہ مومنوں کے لیے کافی ہوگیا اور اللہ بڑی قوت والا، نہایت غالب ہے (25) اور اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کافروں کی مدد کی تھی، انھیں اللہ نے ان کے قلعوں سے اتارا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، تم ان (بنوقریظہ) کے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے تھے (26) اور اللہ نے تمھیں ان کی زمینوں، ان کے گھروں، ان کے مالوں اور اس زمین کا وارث بنا دیا، جسے تم نے پامال نہیں کیا تھا اور اللہ ہر شے پر خوب قادر ہے (27)

---

[1] فتح البیان (۱۱/ ٦٦۔ ۷۱)

اللہ تعالیٰ کے دشمن فوجوں کو ناکام و نامراد واپس لوٹانا:

یہ بنو قریظہ کے یہود تھے جو مدینہ کے قریب رہتے تھے، پہلے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صلح رکھتے تھے، اس ہنگامے میں پھر گئے، اس لڑائی سے فارغ ہوئے کہ جبرائیل علیہ السلام حکم لائے تو جلدی سے جا کر ان کو گھیرا، چوبیس دن تک گھرے رہنے کے بعد تھک گئے اور اس بات پر باہر آنے کو تیار ہوئے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں جو فیصلہ کریں وہ منظور ہے، نبی اکرم ﷺ نے تجویز قبول کی۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ جوانوں کو قتل کر دیا جائے اور بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے، اللہ اور رسول ﷺ کی مرضی یہی تھی اور ان کی بدعہدی کی سزا ملی۔ یہ زمین جو مدینے کے نزدیک تھی مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ نبی کریم ﷺ نے مہاجرین میں بانٹی، ان کی گزر بسر کا بندوبست ہو گیا اور انصار پر ان کے خرچ کا بوجھ ہلکا ہو گیا، اور اس دوسری زمین سے مراد خیبر کی زمین ہے، جو دو برس بعد ان یہودیوں سے ہاتھ لگی، اس سے نبی اکرم ﷺ کے سب اصحاب خوش حال ہو گئے۔ انتھی[1]۔

اللہ پاک اس وقت کی خبر دیتا ہے جب احزاب کو تیز ہوا کے ذریعے سے مدینے سے نکالا اور اللہ تعالیٰ کے ان لشکروں کے ذریعے سے جو اُن پر بھیجے۔ اگر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو رحمۃ للعالمین نہ کیا ہوتا تو یہ ہوا اس ریح عقیم سے بھی زیادہ سخت ہوتی جو عاد پر بھیجی گئی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ [الأنفال: ٣٣] ''اور (اے نبی!) اللہ ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ آپ بھی ان کے درمیان (موجود) ہوں۔'' پس ان پر ایک ایسی ہوا مسلط کی، جس نے ان کی جماعت کو متفرق کر دیا جس طرح کہ ہوا ہی ان کے اکھٹے ہونے کا سبب ہوئی تھی۔ یہ لوگ متفرق قبیلوں کے ملے جلے تھے، کئی جتھے تھے، جن کی رائیں مختلف تھیں، اس لیے یہ مناسب ہوا کہ ان پر وہ ہوا بھیجے جو ان کی جماعت کو متفرق کر ڈالے۔

اللہ پاک نے ان کو اپنے غیظ و غضب میں خائب و خاسر ہو کر پھیر دیا ان کو کوئی بھلائی نہ ملی، نہ تو دنیا میں ان کو وہ کامیابی اور غنیمت ملی جو اُن کے جی میں تھی اور نہ آخرت میں ان گناہوں کے سبب سے کوئی بھلائی ملی جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھلم کھلا دشمنی کر کے اپنے سر پر لادے اور ان کے قتل کا ارادہ کر کے اور ان کے لشکر کو ختم کرنے کا ارادہ کر کے۔ جو کوئی کسی شے کا قصد کرے اور اپنے فعل میں اپنے قصد کو سچا کرے تو وہ حقیقت میں اس کام کے کرنے والے کی طرح ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ مومنین ان کے منازلہ و مبارزت کی طرف محتاج نہ ہوئے کہ گھوڑوں پر سے اتر کر میدان میں ان سے مقابلہ اور جنگ کریں، یہاں تک کہ اپنے بلاد سے ان کو نکالیں، بلکہ اللہ وحدہٗ نے کفایت فرمائی اور اپنے بندے کی مدد کی اور اپنے لشکر کو غالب کیا اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ

فرمایا کرتے تھے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَأَعَزَّ جُنْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ فَلَا شَيْءَ بَعْدَهُ»[1] (أخرجاه من حديث أبي هريرة رضی اللہ عنہ) صحیحین میں یہ حدیث اسماعیل بن ابی خالد عن عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب پر دعا کی تو فرمایا: «اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ، سَرِيْعَ الْحِسَابِ، اِهْزِمِ الْأَحْزَابَ، اَللّٰهُمَّ اِهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ»[2]

قولہ: ﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ﴾ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومنین اور قریش کے درمیان لڑائی موقوف ہوئی اور اس لڑائی کے بعد واقعی اسی طرح ہوا۔ مسلمانوں نے ان پر ان کے بلاد میں چڑھائی کی، مشرکوں نے مسلمانوں پر چڑھائی نہیں کی۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب خندق والے خندق سے چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس حدیث میں جو ہم کو پہنچی ہے کہ قریش تم پر تمھارے اس سال کے بعد ہرگز چڑھائی نہ کریں گے، لیکن تم ان پر چڑھائی کرو گے، پھر اس کے بعد قریش نے چڑھائی نہیں کی اور اس کے بعد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر چڑھائی کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے پر فتح نصیب فرمائی۔ یہ حدیث جو امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بیان کی ہے، صحیح حدیث ہے، جس طرح کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب کے دن فرمایا: «اَلْآنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَا»[3] (وهكذا رواه البخاري في صحيحه من حديث الثوري وإسرائيل عن أبي إسحاق به)

قولہ تعالیٰ: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ زور آور اور زبردست ہے کہ اس نے اپنی طاقت اور قوت سے ان کو خائب و خاسر کر کے پھیر دیا اور انھیں کوئی خیر نصیب نہ ہوئی اور اللہ نے اسلام اور اہلِ اسلام کو غالب کیا اور اپنے وعدے کو سچ فرمایا اور اپنے رسول اور بندے کی مدد کی۔ فله الحمد والمنة۔

غزوۂ بنو قریظہ:

پہلے گزر چکا ہے کہ جب احزاب کے لشکر آئے اور مدینے پر نازل ہوئے تو بنی قریظہ نے وہ عہد توڑ ڈالا جو اُن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھا اور یہ عہد شکنی حیی بن اخطب نضری ۔لعنه الله۔ کی سفارت سے ہوئی۔ وہ بنی قریظہ کے قلعے کے اندر گیا اور ان کے سردار کعب بن اسد کو سمجھاتا بجھاتا رہا، یہاں تک کہ اس نے عہد توڑ ڈالا۔

حیی نے کعب سے جو گفتگو کی اس میں یہ کہا کہ تیری خرابی ہو، میں تو تیرے پاس زمانے کی عزت لے کر آیا ہوں، قریش کو اور ان کے احابیش کو اور غطفان کو اور اس کے اتباع کو لے کر آیا ہوں اور وہ یہاں اس وقت تک پڑے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٨٣) مسند أحمد (٤/ ٢٦٢)

ہیں جب تک دینِ محمد کا اور اُن کے اصحاب کا استیصال کر دیں۔ اس پر کعب نے اس سے کہا: بلکہ واللہ! تُو تو میرے پاس زمانے کی ذلت لے آیا۔ اے حیی! تیری خرابی ہو تو بے شک مشوم ہے، یعنی منحوس اور نامبارک ''فَدَعْنَا مِنْكَ'' یعنی تو ہم کو اپنی باتوں سے چھوڑ دے۔ ''فَلَمْ يَزَلْ يَفْتِلُ فِي الذَّرْوَةِ وَالْغَارِبِ حَتّٰى أَجَابَهُ'' (غارب کہتے ہیں کوہان کی اگلی طرف کو اور ذروہ کوہان کے اوپر والے حصے کو۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جو شخص سخت سرکش سواری کو رام کرنا چاہتا ہے تو اپنا ہاتھ اس پر پھیرتا ہے اور اس کے غارب کو مسح کرتا ہے اور اس کی پشم کو بٹتا ہے، تاکہ اسے مانوس بنائے اور اس کی نکیل چڑھائے، پھر یہ مثال بن گئی، جب کوئی شخص کسی کو نرمی اور مکر و فریب کر کے اس کی رائے کو تبدیل کر دے اور اپنا مطیع اور فرماں بردار بنا لے اور اپنا ہم رائے کر لے تو اس وقت اس کو بولا کرتے ہیں۔) یعنی پھر حیی کعب کو اپنے مکر و فریب کے دام میں پھانستا رہا، یہاں تک کہ اس نے اس کا کہا مان لیا اور حیی نے کعب کے لیے یہ شرط کی کہ اگر فوجیں چلی گئیں اور اس کے کام سے کچھ نہ ہوا تو وہ ان کے ہمراہ گڑھے میں داخل ہو گا، پھر وہ ان کا تابعدار ہو گا، یعنی جو اُن کا حال سو اس کا حال۔ پھر جب قریظہ نے عہد توڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپ کو یہ بات بری لگی اور آپ پر اور مسلمانوں پر نہایت شاق گزری۔

پھر جب اللہ پاک نے آپ کی تایید اور مدد فرمائی اور دشمنوں کو ذلیل و خوار کیا اور ان کو اخسر صفقہ (سب سے زیادہ خسارے والا سودا) لے کر خائب و خاسر پھیر دیا اور رسول اللہ ﷺ موید اور منصور ہو کر مدینے کی طرف لوٹے اور لوگوں نے ہتھیار رکھ دیے، پھر اس دوران میں کہ رسول اللہ ﷺ اس مرابطت (دشمن کی نگرانی) کی مشقت سے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں غسل فرما رہے تھے کہ اس وقت جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے لیے ظاہر ہوئے۔ وہ استبرق کا عمامہ (ریشمی کپڑے کا عمامہ) سر پر لپیٹے اور اس کا پلو منہ پر ڈالے ہوئے ایک خچر پر سوار تھے، جس پر دیباج کا قطیفہ تھا اور کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے ہتھیار رکھ دیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ کہا: لیکن فرشتوں نے تو ابھی اپنے ہتھیار نہیں رکھے اور اس آن میں مَیں طلبِ قوم کے لیے لوٹا ہوں۔ پھر کہا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو حکم کرتا ہے کہ آپ بنی قریظہ کی طرف اُٹھیں اور ایک روایت میں یہ ہے: «فَقَالَ لَهُ: عَذِيْرَكَ مِنْ مُقَاتِلٍ أَوَضَعْتُمُ السَّلَاحَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: لٰكِنَّا لَمْ نَضَعْ أَسْلِحَتَنَا بَعْدُ» تم چلو ان لوگوں کی طرف۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کہاں؟ کہا کہ بنی قریظہ سے بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں ان پر زلزلہ کروں۔

پھر رسول اللہ ﷺ اسی وقت روانہ ہوئے اور لوگوں کو بنی قریظہ کی طرف چلنے کا حکم فرمایا اور وہ مدینے سے کئی میل کے فاصلے پر تھے اور یہ نمازِ ظہر کے بعد ہوا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں کوئی ہرگز نمازِ عصر نہ پڑھے، مگر بنی قریظہ میں۔ پھر لوگ چلے تو راستے میں نماز کا وقت ہو گیا، بعض نے تو راستے میں نماز پڑھ لی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارادہ صرف یہ تھا کہ ہم جلدی سے روانہ ہوں اور دوسرے لوگ بولے کہ ہم تو نماز نہیں پڑھیں گے، مگر بنی قریظہ میں۔

پھر آپ نے دونوں فریق میں سے کسی پر ملامت نہیں فرمائی اور رسول اللہ ﷺ ان کے پیچھے چلے اور ابن اُم مکتوم کو مدینے میں خلیفہ بنایا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نشان عطا فرمایا۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے منازلہ کیا، یعنی ان سے کہا کہ لڑائی کے لیے گڑھے سے اترو اور پچیس رات ان کا محاصرہ کیا۔ پھر جب ان پر محاصرہ طول پکڑ گیا تو ان کے سردار نے یہ سوچا کہ سعد اس بارے میں ان پر احسان کریں گے، جیسا کہ عبداللہ بن ابی ابن سلول نے اپنے موالی بنو قینقاع کے حق میں کیا تھا جبکہ ان کو رسول اللہ ﷺ سے چھڑایا۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ خیال کیا کہ سعد اُن کے حق میں ضرور ویسا ہی کریں گے جیسا کہ ابن ابی نے ان کے بارے میں کیا تھا اور یہ نہ جانا کہ خندق کے زمانے میں سعد کے ہفت اندام رگ میں ایک تیر لگا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ہفت اندام میں داغ دیا تھا اور مسجد کے اندر ایک قبے میں ان کو اتارا تھا، تاکہ قریب سے ان کی عیادت کریں اور سعد رضی اللہ عنہ نے جو دعا کی تھی اس میں یوں کہا تھا: ”اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ أَبْقَيْتَ مِنْ حَرْبِ قُرَيْشٍ شَيْئًا فَأَبْقِنِي لَهَا، وَإِنْ كُنْتَ وَضَعْتَ الْحَرْبَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ فَافْجُرْهَا وَلَا تُمِتْنِي حَتّٰى تَقِرَّ عَيْنِي مِنْ بَنِي قُرَيْظَةَ“ یعنی الٰہی! اگر قریش کی لڑائی سے تو نے کچھ باقی رکھا ہے تو تُو اس کے واسطے مجھے باقی رکھنا اور اگر تو نے ہمارے اور ان کے درمیان لڑائی موقوف کر دی ہے تو اس رگ کو جاری کر دینا اور تو مجھے موت مت دے، یہاں تک کہ بنی قریظہ سے میری آنکھوں کو ٹھنڈا کر دے۔

چنانچہ اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی تھی اور بنی قریظہ پر یہ بات مقدر کر دی تھی کہ اپنے ہی اختیار سے خود اپنی طرف سے چاہ کر سیدنا سعد رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کرانے کے لیے اتریں تو اس وقت رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو مدینے سے بلوایا، تاکہ ان کے بارے میں فیصلہ کریں، پھر جب وہ آئے اور گدھے کے اوپر سوار تھے، اس پر ان کے لیے نرم بچھونا بچھا دیا گیا تھا۔ قبیلہ اَوس کے لوگ ان کی پناہ لینے لگے اور کہنے لگے: اے سعد! یہ تو تیرے موالی ہیں تو ان میں احسان کر اور سعد رضی اللہ عنہ کو ان پر نرم دل اور مہربان کرنے لگے اور سعد رضی اللہ عنہ چپ تھے، ان کو کچھ جواب نہیں دیتے تھے۔ پھر جب سعد رضی اللہ عنہ کے سامنے بہت کچھ باتیں بنائیں تو سعد رضی اللہ عنہ بولے کہ اب سعد کو اس بات کا وقت آ گیا ہے کہ اللہ کے حق میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اس کو نہ پکڑے۔ اب اَوس پہچان گئے کہ سعد بنی قریظہ کو باقی چھوڑنے والا نہیں ہے۔

پھر جب سعد رضی اللہ عنہ اس خیمے سے قریب ہوئے جس میں رسول اللہ ﷺ تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ سردار کی طرف کھڑے ہو جاؤ، چنانچہ مسلمان ان کی طرف کھڑے ہو گئے تو اُن کو اتارا۔ یہ جو آپ ﷺ نے کھڑے ہونے کے لیے فرمایا تو یہ سعد رضی اللہ عنہ کے اعظام، اکرام اور احترام کے لیے تھا جو اُن کی ولایت کے مقام کی وجہ سے تھا، تاکہ سعد کے حکم کا زیادہ تر اکرام اور احترام ان میں نافذ ہونے والا ہو۔ پھر جب سعد رضی اللہ عنہ بیٹھے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ یہ لوگ، یعنی بنی قریظہ جن کی طرف اشارہ فرمایا، واقعی تمھارے فیصلے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، لہٰذا تو اُن کے

بارے میں جو فیصلہ کر جو تو چاہے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرا حکم ان پر نافذ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: اور ان پر جو اس خیمے میں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: اور ان پر جو اس جگہ ہیں؟ اور اس طرف اشارہ کیا جس میں رسول اللہ ﷺ تھے اور سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے اجلال اور اعظام اور اکرام کے لیے اپنا منہ رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیرا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ پھر سعد رضی اللہ عنہ بولے: میں تم کو یہ حکم کرتا ہوں کہ ان کے لڑنے والے لوگ تو مارے جائیں اور ان کی اولاد، یعنی عورتیں اور بچے اور مال غلام بنائے جائیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا: البتہ واقعی تو نے وہ فیصلہ کیا ہے جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر کیا۔ ایک روایت میں یوں ہے: «لَقَدْ حَكَمْتَ بِحُكْمِ الْمَلِكِ» یعنی تو نے بادشاہ کا فیصلہ کیا۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے گڑھوں کا حکم دیا اور وہ زمین میں کھودے گئے اور ان کو مشکیں بندھی ہوئی لائے، پھر ان کی گردنیں مار دی گئیں، یہ لوگ سات سو اور آٹھ سو کے درمیان تھے اور ان میں سے جن کے زیرِ ناف بال نہیں اُگے تھے، ان کو عورتوں اور مالوں کے ساتھ غلام بنا لیا۔ یہ سارا قصہ دلائل اور احادیث کے ساتھ تفصیل سے "کتاب السیرۃ" (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی مستقل تصنیف "کتاب السیرۃ" ہے) میں درج کیا گیا ہے۔[1] یہ کتاب ہم نے مختصر و مفصل مستقل لکھی ہے۔ وللّٰہ الحمد والمنۃ۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظٰهَرُوْهُمْ﴾ یعنی ان لوگوں کو گڑھے سے اتارا، جنھوں نے اہلِ کتاب میں سے احزاب کی معاونت اور مساعدت کی رسول اللہ ﷺ سے لڑائی کرنے کے لیے، یعنی بنو قریظہ۔

یہود کے یہ لوگ بنی اسرائیل کے بعض اسباط میں سے تھے، ان کے باپ دادے زمانۂ قدیم میں حجاز میں اترے تھے، اس طمع سے کہ نبی اُمی کی اتباع کریں گے، جس کو وہ اپنے نزدیک تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، پھر جب ان کے پاس وہ شے آگئی، جس کو پہچان لیا تو اس کے منکر ہوگئے، پس ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ "صَيَاصِيْ" سے مراد ان کے قلعے اور گڑھیاں ہیں۔ یہ قول امام مجاہد، عکرمہ، عطاء، قتادہ اور سُدی رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے،[2] اسی معنی سے بیلوں کے سینگوں کا نام صیاصی رکھا گیا ہے، کیوں کہ سینگ ان میں سب سے اونچی شے ہوتی ہے۔

"رُعب" سے مراد خوف ہے، یعنی اللہ پاک نے بنی قریظہ کے دلوں میں رعب، یعنی خوف ڈال دیا، کیوں کہ انہیں لوگوں نے مشرکوں کو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ لڑنے پر اُکسایا تھا اور جو شخص جانتا ہے وہ اس کے برابر نہیں ہے جو جانتا نہیں ہے، اور مسلمانوں کو ڈرایا اور ان کے قتل کا ارادہ کیا، تاکہ احزاب کو دنیا میں عزت دیں، مگر حال انہیں پر منعکس، یعنی اُلٹا ہوا اور لڑائی انہیں پر لوٹ پڑی۔ مشرک لوگ کھنچے منقبض ہوئے، یعنی سمٹ گئے تو ان کے ہاتھ صفقۂ مغبون (گھاٹے کا سودا) لگا، وہ ٹوٹے میں رہے، کچھ نفع نہ ہوا، جس طرح انھوں نے عزت حاصل کرنے کا ارادہ کیا تھا ذلیل

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٢٥-٦٢٦) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٤٩)

ہوئے، اور مسلمانوں کو جڑ سے اُکھاڑنا چاہا تھا تو خود ہی جڑ سے اُکھاڑ دیے گئے، اور آخرت کی بدبختی کا اس پر اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ حاصل کلام یہ ہوا کہ خسارے کا سودا یہی ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَأْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴾ یعنی اس سے بڑھ کر ان کے حق میں اور کیا گھاٹے کا معاملہ ہوگا کہ ایک فریق کو تو تم جان سے مار رہے ہو اور ایک فریق کو غلام بنا رہے ہو۔ جن کو قتل کیا وہ جوان لڑنے بھڑنے والے لوگ ہیں اور قیدی چھوٹے بچے اور عورتیں ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ نے عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں قریظہ کے دن نبی اکرم ﷺ پر پیش کیا گیا تو لوگوں نے مجھ میں شک کیا، یعنی بالغ ہے یا نابالغ تو نبی اکرم ﷺ نے میرے بارے میں حکم دیا کہ نظر کریں، آیا اس کے زیرِ ناف بال آگئے ہیں، تو انھوں نے مجھے دیکھا تو میرے بال زیرِ ناف نہ پائے، چنانچہ مجھے چھوڑ دیا اور قیدیوں میں ملا دیا۔[1] (وكذا رواه أهل السنن كلهم من طرق عن عبد الملك بن عمير به، وقال الترمذي: حسن صحيح، ورواه النسائي أيضاً من حديث ابن جريج عن ابن أبي نجيح عن مجاهد عن عطية بنحوه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم نے جوان کو قتل کیا، اس سبب سے ان کی زمین اور گھر اور مال تمھارے کر دیے۔ ﴿ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ﴾ سے مراد کسی نے کہا: خیبر ہے۔ کسی نے کہا: مکہ۔ اس کو امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ کسی نے کہا: مراد فارس اور روم ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ یہ سب مراد ہوں۔[2] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا: میں خندق کے دن نکلی لوگوں کے پیچھے جاتی تھی، میں نے اپنے پیچھے وئید ارض، یعنی زمین پر چلنے کی سخت آواز سنی۔ "فَإِذَا أَنَا بِسَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ رضی اللہ عنہ" یعنی پس اچانک دیکھا کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ آ رہے ہیں اور ان کے ہمراہ ان کے بھائی حارث بن اوس کا فرزند ایک ڈھال اٹھائے ہوئے ہے۔ فرمایا: پھر میں زمین کی طرف بیٹھ گئی، یعنی شرم کے مارے بچھ گئی۔ پھر سیدنا سعد رضی اللہ عنہ گزرے اور ان پر لوہے کی زرہ تھی، اس سے ان کی انگلیاں نکلی ہوئی تھیں تو میں سعد رضی اللہ عنہ کی انگلیوں پر ڈرتی تھیں۔ فرمایا: سعد رضی اللہ عنہ سب سے بزرگ اور لمبے آدمیوں میں سے تھے، پھر وہ گزرے اور رجز پڑھتے اور یہ کہتے تھے:

لَيْتَ قَلِيْلًا يَّشْهَدُ الْهَيْجَا جَمَلْ مَا أَحْسَنَ الْمَوْتَ إِذَا حَانَ الْأَجَلْ

یعنی کاش ذرا دیر حاضر ہو لڑائی میں سردار، کیا خوب ہے موت جب کہ اجل کا وقت آپہنچے۔ فرمایا: پھر میں

[1] مسند أحمد (٥/ ٣١١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٨٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٤١) مستدرك الحاكم (٢/ ١٣٤) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٥٠ـ ٢٥١)

کھڑی ہوئی تو بے دھڑک ایک باغیچے میں گھس گئی تو اچانک دیکھا کہ اس میں مسلمانوں کا ایک گروہ تھا اور ان میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے اور ان میں ایک شخص تھا جس پر خود تھا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مَا جَاءَ بِكِ؟ لَعَمْرِيْ وَاللّٰهِ إِنَّكِ لَجَرِيْئَةٌ، وَمَا يُؤْمِنُكِ أَنْ يَكُوْنَ بَلَاءٌ أَوْ يَكُوْنَ تَجَوُّزٌ" (ابن کثیر میں تجوز اسی طرح بہ جیم ہے، لیکن بہ جیم غلط ہے، کاتب کی غلطی سے نقطہ زیادہ ہوگیا ہے، صحیح لفظ بجائے مہملہ ہے اس آیت سے ماخوذ ہے: "أو ﴿مُتَحَيِّزًا إِلٰى فِئَةٍ﴾ أي منضما إليها تحوز و تحيز و انحياز" کے ایک معنی ہیں۔[1] کما في مجمع البحار)۔ یعنی تجھے کون سی چیز یہاں لائی، مجھے قسم ہے اپنے خالقِ عمر کی! قسم ہے اللہ کی! تو تو بڑی دلیر ہے اور تجھے کون سی شے بے خوف کرتی ہے، اس سے کہ کوئی بلا ہو کوئی تحوز ہو۔ غرض یہ ہے کہ ان کو ایسے ہنگامے میں تنہا دیکھ کر خفا ہوئے کہ تیرا یہاں آنے کا کیا کام تھا، یہ لڑائی کا ہنگامہ ہے، کوئی بلا پیش ہو تو بھاگنا پڑے، یا لڑائی کی مصلحت کے لیے بظاہر بھاگ کر اپنی جماعت مین آملیں! ایسے بکھیڑے میں عورتوں کا کیا کام!

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر وہ مجھے ملامت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے یہ تمنا کی کہ اس گھڑی زمین میرے لیے پھٹ جائے اور میں اس میں گھس جاؤں۔ پھر اس شخص نے اپنے منہ پر سے خود اٹھایا تو وہ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ تھے، وہ بولے: "وَيْحَكَ يَا عُمَرُ! إِنَّكَ قَدْ أَكْثَرْتَ مُنْذُ الْيَوْمَ وَأَيْنَ التَّحَوُّزُ أَوِ الْفِرَارُ إِلَّا إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى"، یعنی رحم ہو تجھ پر اے عمر! تم نے ابتدائے دن سے بہت سی باتیں کیں اور کہاں ہے تحوز یا فرار، یعنی نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف۔ (کلمہ "ویح" ترحم و توجع کے لیے آتا ہے، اس شخص کے لیے جو کسی ہلاکت میں پڑتا ہے جس کا وہ مستحق نہیں ہوتا ہے اور کبھی مدح اور تعجب کے لیے آتا ہے اور منصوب ہوتا ہے بنا بر مصدر اور کبھی مرفوع و مضاف و غیر مضاف ہوتا ہے۔ "وَيْحَ زَيْدٌ، وَوَيْحَ لَهُ" بولتے ہیں اور "وَيْلٌ" کا کلمہ اس کے لیے ہے جو ہلاکت میں پڑ گیا اور "ویح" زجر ہے اس کو جو قریب الوقوع ہے کسی ہلاکت میں۔ اس کے سوا اور قول بھی ہیں، غرض یہاں ترحم ہے۔ واللّٰه أعلم)

نیز فرمایا کہ قریش کا ایک شخص تھا جس کو ابن العرقہ کہتے تھے، وہ شخص سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کو تیر مارنے لگا اور ان سے کہا: "خُذْهَا وَأَنَا ابْنُ الْعَرَقَةِ"، یعنی لے تو اس کو اور میں عرقہ کا بیٹا ہوں، وہ تیر ان کے ہفت اندام میں لگا تو اس کو کاٹ ڈالا۔ پھر سعد رضی اللہ عنہ نے دعا کی تو یوں کہا کہ الٰہی تو مجھے نہ ماریو، یہاں تک کہ تو بنی قریظہ سے میری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے۔ فرمایا: بنی قریظہ جاہلیت میں سعد کے حلفاء اور موالی تھے۔ فرمایا: پھر سعد کا زخم بہنے سے تھم گیا اور اللہ تعالیٰ نے مشرکوں پر ہوا بھیجی اور اللہ نے لڑائی میں مومنوں سے کفایت کی اور اللہ زور آور اور زبردست ہے۔ پھر ابوسفیان اور وہ جو اس کے ہمراہ تھے، تہامہ میں جا ملے اور عیینہ بن بدر اور اس کے ہمراہی نجد میں جا ملے اور بنو قریظہ لوٹے تو

[1] مجمع بحار الأنوار (١/ ٦٠٤)

اپنی گڑھیوں (بستیوں) میں پناہ لی اور رسول اللہ ﷺ مدینے کی طرف لوٹ آئے اور ایک چمڑے کے قبے کا حکم دیا تو وہ مسجد میں سعد رضی اللہ عنہ پر نصب کیا گیا، فرمایا: پھر جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اس حال میں کہ ان کے اگلے دانتوں پر غبار کی گرد تھی۔ (تفسیر ابن کثیر میں اس طرح ہے: "و إن علی ثنایاہ لنقع الغبار" اور فتح البیان میں "لوقع الغبار" ہے، یہی اچھا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ نقع کے معنی تو خود غبار کے ہیں، پھر اضافت کیسی۔ ہاں اگر اضافت بیانی ہو تو خیر، یعنی نقع جو بعینہٖ غبار ہے۔ واللہ أعلم)[1]

جبریل علیہ السلام نے کہا: کیا تم ہتھیار رکھ چکے، اللہ کی قسم! فرشتوں نے تو ابھی تک ہتھیار نہیں اتارے۔ بنی قریظہ کی طرف نکلو اور ان سے لڑو۔ فرمایا: پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہتھیار پہنے اور لوگوں میں کوچ کا اعلان کیا کہ نکلیں۔ پھر آپ بنی تمیم پر سے گزرے، یہ لوگ مسجد کے پڑوسی تھے، اس کے آس پاس رہتے تھے تو فرمایا: تم پر سے کوئی شخص گزرا، وہ بولے: ہم پر دحیہ کلبی نے گزر گیا ہے۔ دحیہ کلبی کی ڈاڑھی اور دانت اور چہرہ جبریل علیہ السلام کے مشابہ ہوتا تھا۔

پھر رسول اللہ ﷺ بنی قریظہ کے پاس آئے اور پچیس رات ان کا محاصرہ فرمایا۔ پھر جب ان کا حصار سخت ہوا اور آزمائش شدید ہوئی تو ان سے کہا گیا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے حکم پر اترو تو انھوں نے ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو اس نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تو ذبح کا حکم ہے۔ بنی قریظہ بولے کہ ہم تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اتریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سعد بن معاذ کے حکم پر اترو تو وہ اترے اور رسول اللہ ﷺ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف آدمی بھیجا تو ان کو گدھے پر سوار کر کے لائے، جس پر اکاف تھالیف کا، یعنی درختِ خرما کے پوست کا پالان تھا، سعد رضی اللہ عنہ کو اس پر بٹھایا تھا اور ان کی قوم ان کو گھیرے ہوئے تھی۔ بنی قریظہ بولے: اے ابوعمرو! ہم تیرے حلیف ہیں اور تیرے موالی ہیں اور اہلِ کتاب ہیں اور وہ لوگ ہیں جن کو تو جان چکا ہے۔

فرمایا: سعد رضی اللہ عنہ ان کو کچھ جواب نہیں دیتے تھے، نہ ہی ان کی طرف توجہ کرتے تھے، یہاں تک کہ جس وقت ان کے گھروں کے قریب ہوئے تو اپنی قوم کی طرف توجہ کی۔ پھر فرمایا: اب واقعی میرے لیے اس بات کا وقت آ گیا ہے کہ میں اللہ کے حق میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کروں، پھر جب سعد رضی اللہ عنہ سامنے آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے سردار کی طرف کھڑے ہو جاؤ، پھر ان کو اتارا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سید ہمارا اللہ ہے (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول یہاں ویسا ہے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا تھا کہ "أَنْتَ سَيِّدُ قُرَيْشٍ" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اَلسَّيِّدُ اللّٰهُ"[2] یعنی اللہ ہی ہے جس کے لیے سیادت لائق ہے۔ گویا آپ نے منہ در منہ تعریف کرنے کو مکروہ رکھا اور تواضع کو محبوب رکھا اور یہاں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو سید کہنے کی وجہ پہلے گزر چکی ہے کہ یہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٢٧) فتح القدیر (٤/ ٣٦٢) فتح البیان (١١/ ٧٣)
[2] سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٧٠)

لفظ ان کی عزت اور احترام کے لیے فرمایا، تاکہ ان کا فیصلہ زیادہ تر نافذ ہو۔ نبی کریم ﷺ تو بلیغوں کے سردار ہیں، ہر جگہ کے موقع کا خوب لحاظ فرماتے ہیں۔ پس غور کرو)۔ فرمایا: اتارو اس کو پھر ان کو اتارا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم ان میں فیصلہ کرو۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تو ان میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے لڑنے والے قتل کیے جائیں اور ان کے بیوی بچے بندے بنائے جائیں، یعنی قیدی بنائے جائیں اور ان کے مال بانٹے جائیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: البتہ تو نے ان میں واقعی اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ پھر سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے دعا کی تو یوں کہا کہ الٰہی! اگر تو نے اپنے نبی پر قریش کی لڑائی میں سے کچھ باقی رکھا ہے تو تو مجھے اس کے لیے باقی رکھ اور اگر تو نے ان کے درمیان لڑائی قطع کر دی ہے تو تو مجھے اپنی طرف قبض کر لے۔ کہا: پھر ان کا زخم بہ نکلا اور وہ زخم اچھا ہو چکا تھا، مگر مثل خرص کے اور لوٹ آئے اپنے قبے کی طرف جو رسول اللہ ﷺ نے ان پر نصب کر دیا تھا (خُرص بالضم والکسر زیور کے چھوٹے سے حلقے کو کہتے ہیں، یعنی بالی۔ غرض یہ ہے کہ وہ زخم اچھا ہونے سے ذرا سا باقی رہ گیا تھا اور سب اچھا ہو گیا تھا)۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! بے شک میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رونا عمر رضی اللہ عنہ کے رونے سے پہچانتی تھی اور میں اپنے حجرے میں تھی اور یہ لوگ ایسے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح: ٢٩] ''آپس میں نہایت مہربان ہیں۔'' یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے پر آپس میں بڑے مہربان تھے۔ علقمہ کہتے ہیں، پھر میں نے کہا: اے امّاں! پھر رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے؟ تو فرمایا کہ آپ کی آنکھ کسی پر نہ بہتی تھی، لیکن جس وقت آپ رنج فرماتے تو یہی کرتے کہ اپنی ریش مبارک کو پکڑ لیتے تھے۔[1] (وقد أخرج البخاري ومسلم من حديث عبد الله بن نمير عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة رضي الله عنها نحوا من هذا ولكن أخصر منه وفيه دعاء سعد رضي الله عنه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَرَدَّ اللّٰهُ ... الآية ﴾ معطوف ہے ﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا ﴾ پر، یا معطوف ہے محذوف پر جو ﴿ لِيَجْزِيَ ﴾ میں عامل ہے۔ گویا یوں کہا گیا: ''وَقَعَ مَا وَقَعَ مِنَ الْحَوَادِثِ وَرَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا''. موصول سے مراد احزاب ہیں اور ﴿ بِغَيْظِهِمْ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور حرفِ با مصاحبت کے لیے ہے۔ ''أَيْ: حَالَ كَوْنِهِمْ مُتَلَبِّسِيْنَ بِغَيْظِهِمْ وَمُصَاحِبِيْنَ'' یہ بھی جائز ہے کہ با سببیت کا ہو۔ جملہ ﴿ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ﴾ بھی محلِ نصب میں ہے بنا بر حال موصول سے، یا حال اول سے بنا پر تعاقب یا تداخل، معنی یہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٩) مسند أحمد (٦/ ١٤١)

ہیں کہ واقع ہوئے جو حوادث کہ واقع ہوئے اور پھیر دیا اللہ نے فوجوں کو اس حال میں کہ وہ اپنے غیظ وغضب کو ساتھ لیے ہوئے تھے، ان کے سینے صاف نہ ہوئے، انھوں نے شفا نہ پائی، جیسے غصے میں بھرے ہوئے آئے تھے، ویسے ہی گئے، درآنحالیکہ انھوں نے کوئی بھلائی نہ پائی جو اُن کے اعتقاد میں تھی، یعنی جو سوچ رکھی تھی، یعنی مسلمانوں پر فتح حاصل کرنا، یا اَور کسی قسم کی خیر وخوبی، بلکہ خائب و خاسر ہوتے ہوئے لوٹ گئے، کوئی نفع نہ پایا اور اس کے علاوہ سفر کی مشقت اور خرچ کی چٹی ملی اور کچھ حاصل نہ ہوا، مفت جاڑوں میں مرے اور لڑائی کے سامان اور خوراک کا خسارا سر پڑا۔ جیسا کیا تھا ویسا پایا۔ بھلا کیا دماغ خراب ہوا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے آگئے! بھلا احمق سے احمق بھی ایسا کرتا ہے کہ اپنے خالق و رازق، مالک و پروردگار سے اور اس کے بھیجے ہوئے سے لڑنے کا ارادہ کرے! اور جو کوئی کرتا ہے تو اس کی یہی گت بنتی ہے جو اُن کی ہوئی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک نے ہوا کو اور فرشتوں کے لشکروں کو بھیج کر مسلمانوں سے لڑائی کی کفایت کر دی، ان کو لڑنا بھڑنا کچھ نہ پڑا۔ ہوا نے اور فرشتوں نے خیموں کی طنابیں کاٹ کر، آگ بجھا کر، دیگچیاں اوندھی کر کے، گھوڑوں کو آپس میں لڑوا کر، دلوں میں رعب وخوف ڈال کر بھگا دیا۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴾ اور اللہ بڑی قوت والا ہے ہر اس شے پر جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ وہ تو جس وقت کسی شے سے کہتا ہے ہو جا تو وہ اسی دم ہو جاتی ہے۔ وہ قاہر و غالب ہے، اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس پر غلبہ نہیں کر سکتا اور نہ اس کے غلبے اور جبروت میں کوئی مقابلہ کرنے والا اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

مظاہرت کے معنی ہیں: معاضدت و معاونت، یعنی باہم ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ "صَيَاصِيُ" سے مراد قلعے ہیں۔ جمع ہے "صَيْصَةٌ" کی۔ ہر شئے جس کے ساتھ تحصن (قلعہ بند ہونا) وتحفظ کیا جائے وہ صیصہ ہے، اسی معنی سے "صَيْصَةُ الدِّيْكِ" ہے، یعنی مرغ کا خار (کانٹا) جو اس کے پاؤں میں ہوتا ہے اور "صَيَاصِيُّ بَقَرٍ وَّظِبَاءٍ" یعنی بیلوں اور ہرنوں کے سینگوں کو بھی "صَيَاصِيُ" بولتے ہیں، اس لیے کہ وہ ان سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں اور جولاہے کا کانٹا جس سے وہ تانے بانے کو برابر کرتا ہے، اس کو بھی "صَيْصَةٌ" کہتے ہیں۔ دُرید بن صمہ نے خوب کہا ہے:

فَجِئْتُ إِلَيْهِ وَالرِّمَاحُ تَنُوْشُهُ كَوَقْعِ الصَّيَاصِي فِي النَّسِيْجِ الْمُمَدَّدِ[1]

یعنی پھر میں اس کے پاس آیا اس حال میں کہ نیزے اس کو پکڑ رہے تھے، لگ رہے تھے، لے رہے تھے، نوچ کھسوٹ رہے تھے، جس طرح کہ جولاہے کے کانٹے تنے ہوئے بننے کے کپڑے میں واقع ہوتے ہیں اور "صَيَاصِيُ" بہ معنی "حُصُوْن" اس شعر میں واقع ہے:

فَأَصْبَحَتِ الثِّيْرَانُ صَرْعَى وَأَصْبَحَتْ نِسَاءُ تَمِيْمٍ يَبْتَدِرْنَ الصَّيَاصِيَا

---

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٦٠)

یعنی پس صبح کی بیلوں نے اس حال میں کہ پچھڑے پڑے ہوئے تھے اور صبح کی تمیم کی عورتوں نے اس حال میں کہ جھپٹ کر قلعوں کی طرف بھاگی جاتی تھیں۔ غرضیکہ صیص کے مادے میں حفاظت کرنا اور روکنا کے معنی ہیں۔ "رُعب" کے معنی شدید خوف ہیں، یعنی ان کے دلوں میں سخت ڈر ڈال دیا، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی جانوں کے قتل کے لیے اور اپنی اولاد اور عورتوں کو قیدی بنانے کے سپرد کر دیا اور یہ معنی ہے اس آیت کے: ﴿ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴾

جمہور نے دونوں فعلوں کو بتائے فوقیہ پڑھا ہے بنا بر خطاب۔ ابن ذکوان نے ایک روایت میں ہر دو فعل کو بیائے تحتیہ اور یمانی نے اول کو بہ فوقیہ اور ثانی کو بہ تحتیہ پڑھا ہے اور امام ابوحیوہ رحمہ اللہ نے ﴿ تَاْسِرُوْنَ ﴾ بہ ضمِ سین پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے سین کا کسرہ وضمہ نقل کیا ہے۔[1] پس یہ دونوں دو لغت ہیں۔ فریقِ اول سے مراد مرد ہیں اور فریقِ ثانی سے عورتیں اور بچے۔ یہ جملہ مبین ومقرر ہے، ان کے دلوں میں رعب ڈالنے کے لیے ہے۔ اول میں تو مفعول کو پہلے ذکر کیا اور ثانی میں موخر رکھا، اس کی یہ وجہ ہے کہ مرد چوں کہ صاحبِ شوکت ہیں اور جو حکم ان پر وارد ہوا، وہ دونوں حکموں میں زیادہ سخت ہے، یعنی قتل، اس لیے ان کو پہلے ذکر کرنے کا اہتمام کرنا مقام کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے۔ مقتولین اور ماسورین (قید کیے جانے والے) کے عدد میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مقتول چھے سو سے سات سو تک تھے، کسی نے کہا: چھے سو۔ کسی نے کہا: سات سو۔ کسی نے کہا: آٹھ سو۔ کسی نے کہا: نو سو۔ قیدی سات سو تھے۔ کسی نے کہا: سات سو پچاس۔ کسی نے کہا: نو سو۔ ارض سے مراد ان کی زمین اور کھجوروں کے باغ ہیں۔ دیار سے مراد ان کے گھر اور قلعے اور بستیاں ہیں۔ اموال سے مراد زیور اور گھر کا سامان وغیرہ اور مویشی اور ہتھیار اور اشرفیاں ونقدی اور دوسرے مال ومتاع کی چیزیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ﴾ جمہور نے بہ ہمزۂ مضمومہ پڑھا ہے پھر واو ساکن، اور زید بن علی نے "تَطَوْهَا" بہ فتحِ طاء اور واو ساکن۔ جملہ ﴿ لَمْ تَطَـُٔوْهَا ﴾ صفت ہے ﴿ اَرْضًا ﴾ کی، یعنی اور تم کو وارث کیا ایک ایسی زمین کا جس کو تم نے ابھی تک لڑائی کے قصد سے نہیں روندا ہے۔ اس زمین کی تعیین میں مفسروں کا اختلاف ہے، چنانچہ یزید بن رومان، ابن زید اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ زمین خیبر ہے، اس وقت انھوں نے اس کو پایا نہ تھا۔ اللہ پاک نے ان سے اس کا وعدہ کیا۔[2] سلیمان جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خیبر قریظہ سے دو یا تین برس کے بعد لی گئی۔ اس لیے کہ خیبر کا غزوہ محرم سات ہجری میں ہوا ہے۔ خیبر ایک بڑا شہر ہے، اس میں آٹھ قلعے ہیں اور کھیت ہیں اور بہت سے کھجور کے درخت۔ اس کے اور مدینہ منورہ کے درمیان چار منزل کی مسافت ہے۔ انتھی۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٦١) [2] فتح القدير (٤/ ٣٦٢)

اس کا پورا قصہ سیرتِ حلبی میں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم یہ حدیث بیان کیے جاتے تھے کہ وہ مکہ ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فارس و روم ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ ہر زمین ہے جو قیامت تک مسلمانوں پر مفتوح ہوتی رہے گی۔[1] رہی یہ بات کہ ماضی کا صیغہ جو فرمایا ہے تو یہ اس کے واقع ہونے کے تحقق کی وجہ سے ہے۔ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا﴾ یعنی اللہ پاک بڑی قدرت والا ہے ہر خیر و شر اور نعمت و نقمت پر جس کا اس نے ارادہ فرمایا ہے اور اس شے کے پورا کرنے پر جس کا اس نے وعدہ کیا ہے کہ مسلمانوں کو فتح دے گا۔[2]

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا ﴿۳۰﴾ وَ مَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ ۙ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِیْمًا ﴿۳۱﴾

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے: اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ (دنیوی) فائدہ دوں اور تمھیں اچھے طریقے سے رخصت کر دوں (28) اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو، تو اللہ نے تم میں سے نیک کام کرنے والیوں کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے (29) اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے، اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا، اور اللہ کے لیے یہ نہایت آسان ہے (30) اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے اور نیک عمل کرے تو ہم اسے اس کا اجر دوگنا دیں گے اور اس کے لیے ہم نے اچھا رزق تیار کر رکھا ہے (31)

ازواجِ مطہرات کو عقدِ نبوی میں رہنے یا نہ رہنے کا اختیار:

نبی کریم ﷺ کی ازواج نے دیکھا کہ لوگ آسودہ حال ہوگئے ہیں، چاہا کہ ہم بھی آسودہ ہوں، بعضوں نے بات چیت کی، نبی اکرم ﷺ نے قسم کھائی کہ ایک ماہ تک گھر نہ جائیں گے۔ پھر ایک مہینے کے بعد یہ آیت اتری۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٦٠) [2] فتح البيان (١١/ ٧١ـ ٧٤)

آپ ﷺ گھر میں آئے، پہلے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا، انھوں نے اللہ اور رسول کی مرضی اختیار کی۔ پھر اسی طرح سب نے کہا۔ نبی کریم ﷺ کے گھر میں ہمیشہ فقر و فاقہ تھا، اپنے اختیار سے جو آتا تھا اس کو جلدی سے خرچ کر دیتے تھے، پھر قرض لینا پڑتا۔ یہ جو فرمایا کہ جو نیکی پر ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ آپ ﷺ کی ازواج سب نیک ہی رہیں۔ ﴿ اَلطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ ﴾ [النور: ٢٦] مگر حق تعالیٰ صاف خوش خبری کسی کو نہیں دیتا، کہیں بے خوف نہ ہو جائے، خاتمہ کا ڈر لگا رہے۔ یہ بڑے درجے کا لازمی جز ہے، نیکی کا ثواب دونا اور برائی کا عذاب دونا۔ پیغمبر کو بھی فرمایا ہے: ﴿ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ ﴾ [بني إسرائيل: ٧٥] ''پھر تو ہم بھی آپ کو دوہرا عذاب دنیا کا کرتے۔'' انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے کہ اپنی بیویوں کو اس بات کا اختیار دیں کہ یا تو وہ آپ سے علاحدہ ہو جائیں اور آپ کے علاوہ ان لوگوں کے پاس جائیں جن کے پاس ان کو دنیا کی زندگی اور اس کی رونق حاصل ہو، یا جو تنگیِ حال آپ ﷺ کے پاس ہے، اس پر صبر کریں اور اس پر ان کے لیے اللہ کے پاس ثوابِ جزیل (بہت زیادہ اجر) ہو۔ چنانچہ انھوں نے اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو اختیار کیا ۔رضي الله عنهن و أرضاهن۔ اس پر اللہ پاک نے اس کے بعد ان کے لیے دنیا کی خیر اور آخرت کی سعادت جمع فرما دی:

1 امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ اپنی بیویوں کو اختیار دے دیں۔ کہا: پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ابتدا کی تو فرمایا: میں تجھ سے ایک بات ذکر کرنے والا ہوں، لہٰذا تجھ پر اس کا کوئی ضرر نہیں کہ تو جلدی نہ کرے، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے مشورہ لے لے، حالاں کہ آپ ﷺ یہ جان چکے تھے کہ وہ دونوں آپ ﷺ سے جدائی کا مجھے حکم نہ کریں گے۔ کہا: پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿28﴾ وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ تو میں نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ میں اس کی کون سی بات میں اپنے ماں باپ سے مشورہ لوں، میں تو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو چاہتی ہوں۔[1] (و كذا رواه معلقا عن الليث حدثني يونس عن الزهري عن أبي سلمة عن عائشة رضي الله عنها فذكره وزاد قالت: ثم فعل أزواج النبي ﷺ مثل ما فعلت۔ وقد حكى البخاري: أن معمرا اضطرب فيه، فتارة رواه عن الزهري عن أبي سلمة، و تارة رواه عن الزهري عن عروة عن عائشة رضي الله عنها)

2 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابوسلمہ سے روایت کیا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جبکہ خیار نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٠٧۔ ٤٥٠٨)

نے مجھ سے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ تجھ سے ایک امر کا ذکر کروں تو تُو اس میں کچھ فیصلہ نہ کرنا، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ «قَالَتْ: فَرَدَّهُ عَلَيْهَا، فَقَالَتْ: مَا هُوَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟! قَالَتْ: فَرَدَّهُ عَلَيْهَا، فَقَالَتْ: وَمَا هُوَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟! قَالَتْ: فَقَرَأَ ﷺ عَلَيْهَا: ﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ ... إلىٰ آخر الآية﴾»۔ غرض یہ ہے کہ تین بار نبی کریم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں پوچھا تو دو بار میں نہ بتایا۔ تیسرے سوال میں آپ نے ان پر یہ آیت پڑھی۔ فرماتی ہیں: پھر میں نے عرض کی: بلکہ ہم تو اللہ کو، اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو اختیار کرتے ہیں۔ فرمایا: اس سے رسول اللہ ﷺ خوش ہوئے۔[1]

3 ابوسلمہ رحمہ اللہ سے امام ابن جریر رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب آیتِ تخییر نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ابتدا فرمائی۔ چنانچہ فرمایا: اے عائشہ! میں تجھ پر ایک امر پیش کرنے والا ہوں لہٰذا تو اس میں جلدی نہ کرنا، یہاں تک کہ تو اس کو اپنے ماں باپ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اُم رومان رضی اللہ عنہا پر پیش نہ کرلے۔ پھر میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ ... إلىٰ آخر الآية﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ میں تو اللہ کو، اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو چاہتی ہوں اور اس بارے میں اپنے باپ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اور اپنی ماں اُم رومان رضی اللہ عنہا سے مشورہ نہیں کرتی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے۔ پھر آپ ﷺ نے تمام امہات المومنین کے حجروں کا استقرا کیا، یعنی ہر ایک بی بی کے حجرے میں آپ ﷺ تشریف فرما ہوئے تو فرمایا کہ عائشہ نے ایسا ایسا کہا ہے تو وہ سب بیبیاں بولیں کہ ہم بھی ویسا ہی کہتے ہیں، جیسا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے۔ رضي الله عنهن كلهن۔[2] (و رواه ابن أبي حاتم عن أبي سعيد الأشج عن أبي أسامة عن محمد بن عمرو به)

4 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن عمرہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے، "قَالَتْ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا نَزَلَ إِلَىٰ نِسَائِهِ أُمِرَ أَنْ يُخَيِّرَهُنَّ" (یہاں اصل میں بیاض ہے) پس رسول اللہ ﷺ مجھ پر داخل ہوئے تو فرمایا کہ میں تجھ سے ایک امر ذکر کرتا ہوں، پس تو جلدی نہ کرنا، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے مشورہ لے۔ میں نے عرض کی کہ وہ کیا ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا: مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ تم کو اختیار دے دوں اور آیتِ تخییر دو آیتوں کے اخیر تک اُن پر پڑھیں، کہا: پس میں نے عرض کیا کہ وہ کیا ہے؟ جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ میں جلدی نہ کروں، یہاں تک کہ اپنے باپ سے مشورہ نہ کرلوں، کیوں کہ میں تو اللہ کو اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں تو رسول اللہ ﷺ خوش ہوئے، یہی بات آپ ﷺ نے اپنی بیبیوں پر پیش کی، چنانچہ ان سب نے

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٥٣) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٥٤) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٢٦، ٣١٢٧)

پے در پے یہی کہا۔ پھر اللہ کو اور اس کے رسول ﷺ کو اختیار کیا۔[1]

5 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ آیتِ تخییر نازل کی گئی تو آپ ﷺ نے اپنی بیبیوں میں پہلے پہل مجھ سے ابتدا کی اور فرمایا: میں تجھ سے ایک امر ذکر کرنے والا ہوں تو تجھ پر اس کا کوئی ضرر نہیں کہ تو جلدی نہ کرے، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لے۔ کہا: آپ اس بات کو جان چکے تھے کہ وہ مجھے آپ کے فراق کا مشورہ دینے والے نہیں ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ ... إلىٰ آخر الآية﴾۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر میں نے عرض کی: کیا میں اس بات میں اپنے باپ سے مشورہ لوں، کیوں کہ میں تو چاہتی ہوں اللہ کو، اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی ساری بیبیوں کو اختیار دیا تو انھوں نے ویسا ہی کہا جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تھا۔ رضي الله عنهن۔[2] (و أخرجه البخاري و مسلم جميعاً عن قتيبة عن الليث عن الزهري عن عروة عن عائشه رضی اللہ عنہا مثله)

6 امام احمد رحمہ اللہ نے عن مسروق عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو اختیار دیا تو ہم نے آپ ﷺ کو اختیار کیا۔ پھر آپ ﷺ نے اس کو ہم پر کچھ شمار نہ فرمایا[3] (یہ اس شخص پر رد ہے جو یہ کہتا ہے کہ تخییر رجعی یا بائن طلاق ہے۔ اصل کے الفاظ یہ ہیں: "فلم يعدها علينا شيئا"، ضمیر مؤنث خصلت کی طرف راجع ہے، یعنی خصلتِ تخییر کو ہم پر طلاق وغیرہ شمار نہیں کیا)۔ (أخرجه من حديث الأعمش)

7 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے رسول اللہ ﷺ سے اذن مانگتے تھے اور لوگ آپ ﷺ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے اور نبی اکرم ﷺ جلوس فرماتے تھے تو ان کو اذن نہ ملا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آئے اور اذن مانگا تو اذن نہ ملا، پھر دونوں کو اذن ملا تو اندر گئے اور نبی اکرم ﷺ جلوس فرماتے اور آپ ﷺ کی بیبیاں آپ ﷺ کے گرد تھیں اور آپ ﷺ خاموش تھے۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں ضرور نبی اکرم ﷺ سے کچھ بات کروں، شاید آپ ﷺ ہنسیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: یا رسول اللہ! اگر آپ دیکھیں دخترِ زید، یعنی زوجۂ عمر کو کہ اس نے ابھی مجھ سے نفقہ کا سوال کیا تو میں نے اس کی گردن کو مارا، اس پر نبی اکرم ﷺ ہنس پڑے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی کچلی کھل گئی اور فرمایا کہ یہ میرے گرد ہیں، مجھ سے نفقہ مانگ رہی ہیں۔ پھر تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف کھڑے ہوئے، تاکہ ان کو ماریں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف کھڑے ہوئے، دونوں کہنے لگے کہ تم نبی کریم ﷺ سے وہ شے مانگتی ہو جو اُن کے پاس نہیں

---

1. تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٥٤)
2. تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٢٧) البتہ صحیحین میں اس سند کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٧) مسند أحمد (٦/ ٤٥)

ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو منع فرمایا۔ تو آپ ﷺ کی بیبیاں بولیں: قسم ہے اللہ کی! ہم اس مجلس کے بعد رسول اللہ ﷺ سے وہ شے نہیں مانگیں گی جو آپ ﷺ کے پاس نہیں ہے۔ کہا: اور اللہ عزوجل نے خیار نازل فرمایا تو آپ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابتدا کی۔ چنانچہ فرمایا: میں تجھ سے ایک ایسا امر ذکر کرتا ہوں کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ تو اس میں جلدی کرے، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: وہ کیا ہے؟ پھر آپ ﷺ نے ان پر یہ آیت پڑھی: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ ... إلیٰ آخر الآیة ﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بولیں: کیا میں آپ کے بارے میں اپنے ماں باپ سے مشورہ کروں، بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں اور میں آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ جو بات میں نے اختیار کی ہے، آپ اپنی بیبیوں میں سے کسی بی بی سے اس کا ذکر نہ فرمائیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے سختی اور درشتی کرنے والا نہیں بھیجا ہے، لیکن اس نے تو مجھے تعلیم کرنے والا آسانی کرنے والا بھیجا ہے، ان میں سے کوئی بی بی اگر مجھ سے اس بات کا پوچھے گی جو تو نے اختیار کی ہے تو میں اس کو خبر دے دوں گا۔[1] (انفرد بإخراجه مسلم دون البخاري فرواه هو والنسائي من حديث زكريا بن إسحاق المكي به)

8 عبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ نے عن عثمان بن علی بن حسین عن ابیہ عن علی رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو دنیا اور آخرت کا اختیار دیا تھا اور ان کو طلاق کا اختیار نہیں دیا تھا۔[2] یہ حدیث منقطع ہے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما سے بھی اس کے مثل مروی ہے[3] اور یہ اس بات کے خلاف ہے جو آیت سے ظاہر ہے، کیوں کہ فرمایا یوں ہے: ﴿ فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴾ یعنی میں تم کو تمھارے حقوق دے دوں اور تمھاری سراح کا اطلاق کر دوں، یعنی تمھیں رخصت دے دوں۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر آپ ان کو طلاق دے دیتے تو کسی اور کا ان سے نکاح کرنا جائز ہوتا یا نہیں؟ تو اس میں دو قول ہیں: زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ہاں جائز ہوتا اگر طلاق واقع ہوتی، تاکہ سراح کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہو جائے۔ واللّٰه أعلم۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس وقت آپ ﷺ کے نکاح میں نو بیویاں تھیں؛ پانچ تو قریش کی: سیدہ عائشہ، حفصہ، ام حبیبہ، سودہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہن، اور آپ ﷺ کے تحت میں یہ تھیں: صفیہ بنت حیی نضیریہ، میمونہ بنت حارث ہلالیہ، زینب بنت جحش اسدیہ، جویریہ بنت حارث مصطلقیہ۔[4] رضي الله عنهن و أرضاهن أجمعين۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٨) مسند أحمد (٣/ ٣٢٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٨٣)

[2] مسند أحمد (١/ ٧٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ علی بن حسین کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں ''محمد بن عبیداللہ'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٥٢) [4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٥٢)

ازواجِ مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں:

پھر اللہ پاک رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کو وعظ ونصیحت فرماتا ہے، جنھوں نے اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو اختیار کیا اور جن کا امر زیرِ نکاح رسول اللہ ﷺ قرار پذیر ہوا کہ ان کو ان کے حکم وتخصیص کی خبر دی جائے سوائے باقی عورتوں کے، اس طرح سے کہ ان میں سے جو کوئی بی بی فاحشۂ بینہ کو لائے گی تو اسے دوگنا عذاب ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد نشوز وسوئے خلق ہے (خاوند پر عورت کا نشوز اس کی طاعت سے نکلنا ہے اور خاوند کا عورت پر نشوز اس پر جفا کرنا اور اس کو ضرر پہنچانا ہے۔ نشوز بی بی کی میاں سے کراہت ہے اور میاں کی بی بی سے اور ایک کا دوسرے سے برا برتاؤ کرنا ہے۔ اصل میں ''نشز'' ارتفاع اور بلندی کو کہتے ہیں، چوں کہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کراہت اور ناخوشی کی وجہ سے دوسرے پر کبر کرتا ہے اور خود کو بڑا سمجھتا ہے، اس لیے ان کی کراہت کا نام نشوز ٹھہرا)۔

اور ہر تقدیر پر یہ ایک شرط ہے اور شرط وقوع کی مقتضی نہیں ہوتی، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ [الزمر: ٦٥] ''یقیناً تیری طرف بھی اور تجھ سے پہلے (کے تمام نبیوں) کی طرف بھی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو بلاشبہہ تیرا عمل ضائع ہو جائے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٨٨] ''اور اگر فرضاً یہ حضرات بھی شرک کرتے تو جو کچھ یہ اعمال کرتے تھے، وہ سب اکارت ہو جاتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٨١] ''آپ کہہ دیجیے! اگر بالفرض رحمان کی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوتا۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ [الزمر: ٤] ''اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ اولاد ہی کا ہوتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا چن لیتا۔ (لیکن) وہ تو پاک ہے، وہی اللہ تعالیٰ ہے یگانہ اور قوت والا۔''

پھر جب ان کا رتبہ عالی اور بلند ٹھہرا تو مناسب ہوا کہ ان کا گناہ بھی بالفرض اگر ان سے واقع ہو تو زیادہ غلیظ ٹھہرایا جائے، ان کے حجابِ رفیع اور رتبۂ اعلی کو محفوظ رکھنے کے لیے، اور اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ ... الآیۃ ﴾ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے عذاب کے دوگنا ہونے کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ دنیا اور آخرت میں دوگنا عذاب ہوگا۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے بھی امام مجاہد رحمہ اللہ سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔ ﴿ يَسِيْرًا ﴾ کے معنی ہیں: ''سَهْلًا''، ''هَيِّنًا''، یعنی آسان۔

امہات المومنین کے لیے انعامات:

پھر اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ میں اپنا عدل اور فضل ذکر فرمایا۔ ﴿ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾

یعنی جو کوئی تم میں سے اللہ کی اطاعت کرے اور اس کے رسول کی اور ان کا کہا مانے، ﴿نُّؤۡتِهَآ أَجۡرَهَا مَرَّتَيۡنِ وَأَعۡتَدۡنَا لَهَا رِزۡقٗا كَرِيمٗا﴾ تو اس کو ہم دیں گے اس کا اجر دو بار اور تیار رکھی ہے ہم نے اس کے لیے جنت میں عزت کی روزی، کیوں کہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے منازل میں ہوں گی اعلیٰ علیین میں، ساری مخلوق کی منازل سے بلند وسیلہ کے مقام میں جو عرشِ معلّٰی کے سب سے قریب کی جنت کی منزل ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ اس آیت سے پہلے نبی اکرم ﷺ کی ایذا دہی کی ممانعت گزر چکی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اسی کے معنی سے متصل ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کو اپنی بعض ازواج سے ایذا پہنچی تھی۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بیویوں نے دنیا کے اسباب و سامان میں سے آپ ﷺ سے کسی شے سوال کیا تھا اور نفقے میں زیادتی کا مطالبہ کیا تھا اور بعض نے بعض پر رشک کر کے آپ ﷺ کو ایذا دی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے مہینا بھر اُن سے علاحدہ رہنے کی قسم کھا لی۔ اللہ پاک نے یہ آیتِ تخییر نازل فرمائی، اس وقت آپ ﷺ کے نکاح میں نو بیویاں تھیں،[1] جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ازواج کی گنتی میں، ان کی ترتیب میں، اس شمار میں کہ آپ ﷺ سے قبل کتنی بیویوں نے وفات پائی، آپ ﷺ نے کتنی چھوڑ کر وفات پائی، کتنی بیویوں سے دخول فرمایا اور کتنی سے نہیں، کس کو پیغام بھیجا اور نکاح نہیں کیا، کس نے آپ ﷺ پر اپنا نفس پیش کیا، اس سب میں اختلاف ہے جن سے آپ ﷺ نے دخول فرمایا اس میں متفق علیہ یہ ہے کہ گیارہ بیویاں ہیں۔[2] (كذا في المواهب اللدنية) اس کے مقصدِ ثانی میں ان امور پر نہایت مفصل کلام کیا ہے، اگر کوئی اس کی تفصیل جاننا چاہے تو اس کتاب کی طرف رجوع فرمائے، اس سے بہتر کسی کتاب میں اس کی تفصیل نہیں ہے۔

حیاتِ دنیا اور زینتِ دنیا سے مراد اس کی فراوانی، تازگی، عیش و عشرت اور مال اور نعمت کی کثرت ہے۔ اس میں "تَعَالَيۡنَ" فعل امر ہے مبنی ہے یاء کے سکون پر اور نون جمع اس کا فاعل ہے۔ اس امر کی اصل یہ ہے کہ امر کرنے والا بلند مقام میں ہو اور جس کو امر کرتا ہے وہ پست جگہ میں ہو، پھر وہ اس کو بلائے کہ خود کو اس کی طرف چڑھا لے جائے، پھر اس کا استعمال کثرت سے ہوا، یہاں تک کہ اس کے معنی "أَقۡبِلۡ" کے ہو گئے، یعنی پھر کچھ بلندی اور پستی کا لحاظ نہ رہا، مطلق "بیا" (آؤ) کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور یہاں پر یہ اختیار اور ارادہ سے کنایہ ہے، اسی لیے علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے: "تَعَالَيۡنَ" کے یہ معنی ہیں: "أَقۡبِلۡنَ بِإِرَادَتِكُنَّ وَاخۡتِيَارِكُنَّ لِأَحَدِ الۡأَمۡرَيۡنِ"[3] یعنی دو باتوں میں سے ایک بات کو اختیار کریں۔ یہ مراد نہیں کہ خود کو اُٹھا کر اُن کی طرف لے جائیں۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٦٣) [2] المواهب اللدنية (١/ ٤٩٠) [3] تفسير النسفي (٣/ ٣٠٣)

﴿ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴾ یعنی ''اُعْطِكُنَّ الْمُتْعَةَ وَاُطَلِّقْكُنَّ'' دونوں فعل مجزوم ہیں اس بنا پر کہ امر کا جواب ہیں۔ جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے۔ حمید خزاز نے دونوں فعلوں کو برفع پڑھا ہے بنا بر استیناف۔ کسی نے کہا ہے کہ جزم دونوں کا بنا بر جوابِ شرط ہے، اس بنیاد پر جملۂ ﴿ فَتَعَالَيْنَ ﴾ معترضہ ہو گا شرط و جزا کے درمیان۔ سراحِ جمیل سے وہ طلاق مراد ہے جو مقتضائے سنت پر بغیر ضرر کے واقع ہو۔ معنی یہ ہیں کہ اگر تم دنیا کی فراخی اور تازگی اور رونق اور عیش و آرام اور مال و متاع کی کثرت چاہتی ہو تو تم دو باتوں میں سے ایک کا ارادہ اور اختیار کر کے میری طرف آؤ، میں تم کو فائدہ دوں اور اچھی طلاق دے دوں بغیر کوئی ضرر پہنچائے، اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو، اس کے رسول کو، جنت اور نعیمِ جنت کو تو بے شک اللہ نے تم میں سے ان بیبیوں کے لیے جنھوں نے نیک کام کیے ہیں، ایسا بڑا اجر و ثواب تیار کر رکھا ہے جس کی صفت اور بیان ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کی قدر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ ثواب ان کے نیکی کرنے کے سبب سے اور عملِ صالح کے مقابلے میں ہے۔ اللہ پاک کا پیارا نام جو یہاں ذکر کیا ہے، اس سے غرض یہ بتانا ہے کہ اللہ پاک کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کا رتبہ جلیل اور عظیم ہے، آپ ﷺ کا چاہنا اللہ سبحانہٗ کا چاہنا ہے۔

یہ اختیار جو نبی اکرم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو دیا اس کی کیفیت میں علماء نے دو قول میں اختلاف کیا ہے: پہلا قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو اللہ پاک کے اذن سے اختیار دیا کہ یا وہ زوجیت میں باقی رہیں یا طلاق لے لیں۔ چنانچہ انھوں نے زوجیت میں باقی رہنے کو اختیار کیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، امام مجاہد، عکرمہ، شعبی، زہری اور ربیعہ رحمہم اللہ اس کے قائل ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو جو اختیار دیا تھا، وہ درمیان دنیا کے اور آخرت کے تھا۔ دنیا اختیار کرنے کی صورت میں ان سے مفارقت کریں اور آخرت اختیار کرنے کی صورت میں ان کو روک رکھیں۔ طلاق میں ان کو اختیار نہیں دیا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ اس کے قائل ہیں۔[1] فتحین میں کہا ہے کہ راجح قول پہلا ہے۔[2]

پھر جس عورت کو اختیار دیا ہے اس میں اختلاف کیا ہے کہ جب وہ اپنے خاوند کو اختیار کر لے تو آیا صرف یہ اختیار دینا زوج پر طلاق شمار کیا جائے گا یا نہیں؟ تو سلف و خلف میں سے جمہور اس طرف گئے ہیں کہ عورت کے اپنے خاوند کو اختیار کرنے کے باوجود یہ تخییر طلاق نہ ہو گی نہ ایک نہ زیادہ۔ سیدنا علی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اگر عورت اپنے خاوند کو اختیار کر لے گی تو ایک طلاقِ بائن پڑے گی۔ امام حسن اور لیث رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور خطابی اور نقاش نے امام مالک رحمہ اللہ سے اس کو روایت کیا ہے کہ پہلا قول راجح ہے،[3] اس حدیث کے سبب سے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٦٩) [2] فتح القدير (٤/ ٣٦٣) فتح البيان (١١/ ٧٦) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٠)

سے صحیحین میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو اختیار دیا تو ہم نے آپ ﷺ کو اختیار کیا۔ پھر اس کو کوئی طلاق شمار نہیں کیا۔[1]

مجرد تخییر کو طلاق ٹھہرانا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے اور یہ دعویٰ کہ تخییر طلاق کے کنایوں میں سے ایک کنایہ ہے، پس یہ دعویٰ اس بات سے اُٹھ جاتا ہے کہ اختیار دینے والے نے صرف علاحدگی کے اختیار کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ اس نے تو تفویضِ عورت کا ارادہ کیا ہے اور اس معاملے کو اس کے ہاتھ میں رکھ دیا ہے۔ اگر اس نے باقی رہنے کو اختیار کیا تو وہ اسی زوجیت پر باقی رہے گی جس پر وہ پہلے تھی اور اگر اس نے علاحدگی اختیار کی تو مطلقہ ہو جائے گی۔ پھر اس کے اپنی جان کے اختیار کرنے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ طلاق رجعی ہوگی یا بائنہ۔ چنانچہ پہلی کے تو سیدنا عمر، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم، امام ابن ابی لیلیٰ، ثوری اور امام شافعی رحمہم اللہ قائل ہیں اور دوسری کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب قائل ہیں اور یہ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

فتحسین میں ہے کہ راجح قول پہلا ہے، اس لیے کہ یہ بات بہت بعید ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں کو طلاق دیں برخلاف اس کے جس کا اللہ پاک نے آپ ﷺ کو امر کیا ہے، حالاں کہ اللہ سبحانہ نے تو آپ ﷺ کو یہ امر فرمایا ہے: ﴿ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾[2] [الطلاق: ١] ''جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت (کے دنوں کے آغاز) میں انھیں طلاق دو۔'' سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہ قول مروی ہے کہ جب وہ عورت اپنے نفس کو اختیار کر لے تو تین طلاقیں ہیں۔ اس قول کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ جب وہ اپنے نفس کو اختیار کر لے تو کچھ نہیں ہے اور جب اپنے خاوند کو اختیار کرنے تو ایک رجعی طلاق ہے۔[3]

پھر جب آپ ﷺ کی بیبیوں نے آپ ﷺ کو اختیار کیا تو اللہ پاک نے ان کی عزت و تکریم کے لیے اور ان کے حق کی تعظیم کے لیے ان کی شان میں یہ آیتیں نازل فرمائیں: ﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ ... الآية ﴾ کلمۂ ''مِنْ'' بیانیہ ہے، اس لیے کہ وہ تو سب کی سب محسنات ہیں، یہاں تبعیض کا کیا کام ہے۔ ''فاحشة'' سے مراد معصیت ہے۔ ﴿ مُبَيِّنَةٍ ﴾ سے مراد وہ معصیت ہے جس کی قباحت اور فحش ظاہر اور واضح ہے۔ اللہ پاک نے ان کو اس سے محفوظ رکھا ہے اور ان کو مبرا و مطہر فرمایا ہے۔ چنانچہ یہ ایسا ہے، جیسا کہ ﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ [الزمر: ٦٥] ''اگر تو نے شرک کیا تو بلاشبہہ تیرا عمل ضائع ہو جائے گا۔'' فرمایا ہے۔ چنانچہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ فاحشہ سے مراد نشوز اور سوئے خلق ہے، یہ بھی گزر چکا ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ فاحشہ

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[2] فتح القدير (٤/ ٣٦٤) فتح البيان (١١/ ٧٦)
[3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٠)

جب معرف (معرفہ یعنی الف لام کے ساتھ) وارد ہو تو وہ زنا ولواط ہوتا ہے اور جس وقت منکر وارد ہو تو باقی گناہ مراد ہوتے ہیں اور جب منعوت (تعریف کیا گیا) وارد ہو تو مراد عقوقِ زوج اور اس کا فسادِ عشرت مراد ہوتا ہے اور ایک فرقے نے کہا کہ قولہ تعالیٰ: ﴿بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ عام ہے ساری معاصی کے لیے اور اسی طرح فاحشہ کسی طرح وارد ہو بالجملہ معنی یہ ہیں کہ اے نبی کی بیبیو! جو کوئی تم میں سے صریح بے حیائی کا کام لائے تو اللہ اس کو دوگنا عذاب دے گا دوسری عورتوں کی نسبت، جب کہ وہ ویسا ہی صریح بے حیائی کا کام لائیں۔

عذاب کی یہ زیادتی ان کے شرف و بزرگی اور بلند درجہ اور اونچی قدر و منزلت کی وجہ سے ہے اور اس لیے کہ جو چیز باقی عورتوں کے لیے قبیح ہے تو وہ ان کے لیے اقبح، یعنی بہت زیادہ قبیح ہے۔ چنانچہ قباحت کی زیادتی ان کی فضیلت کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ کسی عورت کی وہ فضیلت نہیں ہے جو ازواجِ مطہرات کی فضیلت ہے اور اسی لیے ایک عالم گناہ گار کی معصیت زیادہ ہے ایک جاہل گناہ گار سے۔ اس لیے کہ عالم سے گناہ کا سرزد ہونا بہت زیادہ قبیح ہے۔ اسی لیے آزاد لوگوں کے لیے حد غلاموں کی نسبت زیادہ کی گئی ہے اور اس شریعتِ مطہرہ میں کئی جگہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شرف و بزرگی کا اضافہ اور درجات کی بلندی اس صاحب کے لیے کئی گنا عذاب کا موجب ہوتا ہے، جبکہ وہ معصیت کرے۔ کسی نے خوب کہا ہے: ؏ جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔ ؎

نزدیکاں را بیش بود حیرانی ایشاں دانند سیاست سلطانی

''قریب رہنے والوں کو زیادہ پریشانی ہوتی ہے، کیوں کہ وہ بادشاہی سیاست کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

امام ابو عمرو نے ﴿يُضْعَفْ﴾ پڑھا ہے بہ صیغۂ مجہول اور ابو عمرو اور ابو عبید نے ''يُضَاعَفُ'' اور ''يُضْعَفُ'' کے درمیان فرق کیا ہے۔ کہا کہ ''يُضَاعَفُ''، تو تین عذاب ہیں اور ''يُضْعَفُ'' دو عذاب۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ فرق جو اہلِ لغت میں سے یہ دونوں لائے ہیں، اس کو کوئی نہیں پہچانتا۔ ''يُضَاعَفُ'' اور ''يُضْعَفُ''، معنی میں ایک ہیں، یعنی دو ضعف (دوگنا) عذاب کیا جائے گا۔[1] اسی طرح امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان دونوں کے قول کو ضعیف کہا ہے۔[2] ایک قوم نے کہا: اگر اللہ مقدر کرے زنا کو کسی ایک بی بی سے، حالاں کہ اللہ پاک نے ان کے دامنِ عصمت کو گناہوں کی آلایش سے پناہ میں رکھا ہے تو اس پر دو حدیں پڑیں گی، اس کی عظمت اور قدر و منزلت کے سبب سے، جس طرح کہ آزاد عورت کی حد لونڈی کی حد سے زیادہ کی جاتی ہے۔ عذاب حد کے معنے میں آیا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [النور: ۲] ''ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔''

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٤) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٥٥)

اس بنا پر ﴿ضِعۡفَيۡنِ﴾ کے معنی ہوں گے "مِثۡلَيۡنِ" یا "مَرَّتَيۡنِ"۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جو عذاب کا دوگنا ہونا ہے تو یہ آخرت میں ہے، جس طرح کہ اجر کا دوبار ہونا دنیا و آخرت میں ہے۔ یہ قول حسن ہے اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کسی فاحشہ کو نہیں لائیں، جو حد کی موجب ہو اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ کبھی کسی نبی کی بی بی نے زنا نہیں کیا اور دو نے جو خیانت کی تھی (یعنی نوح علیہ السلام کی بیوی اور لوط علیہ السلام کی بیوی) تو وہ ایمان اور اطاعت میں خیانت کی تھی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ عذاب جس کے ضعفین (دوگنا کرنے) کی ان کو وعید سنائی گئی ہے وہ دنیا اور آخرت کا عذاب ہے اور اسی طرح اجر بھی۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول ضعیف ہے۔ اللھم مگر یہ ہو کہ ازواجِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا کی حدود آخرت کے عذاب کو رفع نہ کریں اس بنا پر جس پر لوگوں کا حال ہے سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث کے حکم سے، حالاں کہ یہ ایک ایسا امر ہے کہ ازواجِ مطہرات کے حق میں مروی نہیں ہوا اور نہ اس کا تقرر محفوظ ہے۔[1]

﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا﴾ یعنی یہ عذاب کا دوگنا کرنا اللہ پاک پر سہل و آسان ہے، اس کے نزدیک یہ کوئی بڑی شے نہیں ہے اور نہ اس پر مشکل ہے، لہٰذا تمھارا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ نکاح ہونا اور جلیل اور باعزت ہونا اس قبیل سے نہیں ہے کہ اللہ پاک کے عذاب کو تم سے دور کر دے۔ اللہ کا امر مخلوق کے امر کی طرح نہیں ہے کہ عزت داروں کو عذاب کرنا اس کے لیے مشکل ہو، ان کے اولیاء اور مددگاروں کی کثرت کے سبب سے اور ان کے شفاعت کرنے والوں اور اخوان کے زیادہ ہونے کی وجہ سے۔ جمہور نے ﴿يَقۡنُتۡ﴾ بیائے تحتیہ پڑھا ہے اور اسی طرح ﴿يَاۡتِ مِنۡكُنَّ﴾ کو دونوں جگہ لفظ ﴿مَنۡ﴾ پر محمول کر کے پڑھا ہے۔ اور امام جحدری، یعقوب اور ابن عامر رحمہما اللہ نے ایک روایت میں اور ابوجعفر نے بتائے فوقیہ ﴿مَنۡ﴾ کے معنی پر محمول کر کے پڑھا ہے۔ اسی طرح ﴿مُبَيِّنَةٍ﴾ پر قراء کا اختلاف ہے۔ کسی نے تو بالکسر اور کسی نے بہ فتح یا پڑھا ہے جیسا کے سورۃ النساء میں ہے۔[2] ابن کثیر اور ابن عامر رحمہما اللہ نے "نضعف"، بہ نون اور بہ نصبِ عذاب پڑھا ہے اور کسی نے "يُضَاعِفۡ" بہ کسرِ عین بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔

امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے "يُؤۡتِهَا" اور "يَعۡمَلۡ" بیائے تحتیہ اور باقی قراء نے "تَعۡمَلۡ" بہ فوقیہ اور ﴿نُؤۡتِهَآ﴾ بہ نون پڑھا ہے۔[3] قنوت کے معنی طاعت کے ہیں، یعنی اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک کام کرے گی تو ہم اسے اس کا اجر دوبار دیں گے، یعنی اطاعت پر ان کے لیے اس سے دوگنا اجر ہوگا جس کی مستحق ان کے سوا اور عورتیں ہوں گی، جب کہ وہ اس اطاعت کو بجا لائیں گی۔ اس میں اس بات پر قوی دلیل ہے کہ ﴿يُضٰعَفۡ لَهَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَيۡنِ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ عذاب دوبار ہوگا نہ کہ تین بار۔ کیوں کہ مراد ان کی عزت اور مرتبے کو ظاہر کرنا ہے اطاعت اور معصیت میں۔ ان کی نیکی دو نیکیوں کے برابر ہوگی اور ان کی

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٥) [2] رقم الآية (١٩) [3] فتح القدير (٤/ ٣٦٤)

برائی دو برائیوں کے برابر اور اگر وہ تین برائیوں کے مثل ہو تو اس کے مناسب نہیں ہے کہ ان کی نیکی دو نیکیوں کی مثل ہو، کیوں کہ اللہ پاک اس سے بہت زیادہ عادل ہے کہ ان کی سزا کی ایسی مضاعفت کرے کہ ان کے اجر کی مضاعفت سے بڑھ جائے۔ کہا ہے کہ ایک نیکی کے عوض میں بیس نیکیاں۔ ان کے ثواب کی یہ تضعیف ان کی قدر و منزلت کی بلندی کی وجہ سے ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ساری دنیا کی عورتوں سے زیادہ عزت والی اور فضیلت والی ہیں۔ ﴿ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے اس کے واسطے دگنے اجر سے بھی زیادہ جلیل القدر روزی تیار کر رکھی ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ رزقِ کریم جنت کی نعمت ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کی ان سے حکایت کی ہے۔[1] پھر اللہ پاک نے ان کی فضیلت دوسری عورتوں پر تصریحاً ظاہر کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿32﴾ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿33﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿34﴾

اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم متقی و پرہیزگار ہو تو (کسی بھی غیر محرم سے) آہستگی و نرمی سے بات نہ کیا کرو کہ پھر وہ شخص، جس کے دل میں روگ ہو طمع و لالچ کرنے لگے اور تم سیدھی صاف اچھی بات (سختی سے) کہا کرو ﴿32﴾ اور تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور گذشتہ دورِ جاہلیت کی زیب و زینت کی نمائش کے مانند (اپنی) زیب و زینت کی نمائش نہ کرتی پھرو اور نماز قائم کرو اور زکات دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اے اہلِ بیت بس اللہ تو چاہتا ہے کہ وہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تمھیں بالکل پاک صاف کر دے ﴿33﴾ اور تمھارے گھروں میں جو اللہ کی آیات اور سنت (کی باتیں) پڑھی جاتی ہیں وہ یاد کرو، یقیناً اللہ نہایت باریک بین، خوب باخبر ہے ﴿34﴾

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٥) [2] فتح البيان (١١/ ٧٤-٨٠)

ازواجِ مطہرات دوسری عورتوں کے لیے نمونہ ہیں:

نرم لہجے سے بات نہ کرو۔ یہ ایک ادب سکھایا کہ کسی مرد سے بات کہو تو اس طرح کہو جیسے ماں بیٹے کو کہتی ہے۔ قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح، یعنی کفر کے وقت عورتیں بے پردہ پھرتی تھیں۔ یہ خطاب ازواجِ مطہرات کو ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کی سب گھر والی داخل ہیں۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ کئی ادب کی باتیں ہیں جن کا اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کی بیبیوں کو حکم فرمایا ہے۔ امت کی دوسری عورتیں اس بارے میں ان کی تابع ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک نے آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ جس وقت وہ اللہ عزوجل سے ڈر رکھیں گی، جیسا کہ ان کو حکم کیا ہے تو عورتوں میں سے کوئی عورت ان کے مشابہ نہ ہوگی اور نہ ہی فضیلت اور قدر و منزلت میں ان کے ساتھ برابری کر سکے گی۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾ امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد نرم بات کرنا ہے، جبکہ مردوں سے خطاب کریں اور اسی لیے اللہ پاک نے یہ فرمایا: ﴿فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ پھر طمع کرے وہ شخص جس کے دل میں فساد و تباہی ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: قولِ معروف سے مراد قولِ حسن، جمیل، معروف خیر میں۔[1] مطلب یہ کہ اجنبی مردوں سے ایسی بات کے ساتھ خطاب کریں جس میں نرمی نہ ہو، یعنی عورت اجنبی مردوں سے ایسا خطاب نہ کرے جیسا کہ اپنے خاوند سے کرتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اپنے گھروں کو لازم پکڑو اور بغیر کسی حاجت کے باہر نہ نکلو۔ شرعی حاجتوں میں سے مسجد میں نماز ہے اس کی شرط کے ساتھ، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ کی لونڈیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو اور چاہیے کہ وہ اس طرح سے نکلیں کہ زینت کو ترک کیے ہوئے ہوں،[2] یعنی بن ٹھن کے نہ نکلیں، سیدھے سادھے طریقے سے جائیں۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔[3]

① حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے عن ثابت البنانی عن انس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ عورتیں رسول اللہ ﷺ کی طرف آئیں تو عرض کی: یا رسول اللہ! مرد تو جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت لے گئے تو کیا ہمارے لیے بھی کوئی ایسا عمل ہے جس سے ہم بھی مجاہدین فی سبیل اللہ جیسا عمل پا لیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی تم میں سے اپنے گھر میں بیٹھے (یا اسی طرح کا کوئی اور کلمہ فرمایا) تو وہ مجاہدین فی سبیل اللہ کا عمل پا لے گی۔ پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ اس حدیث کو روح بن میسّب کے سوا کسی اور نے روایت کیا ہو اور یہ بصرے والوں کا مشہور شخص ہے۔[4]

---

① تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٥٨) ② سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٦٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٤٥٧)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٦٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٤٥٨)

⑤ مسند البزار (١٣/ ٣٣٩) اس کی سند میں ''روح بن میسّب'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٧٤٤)

② نیز امام بزار رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «إِنَّ الْمَرْأَةَ عَوْرَةٌ فَإِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ، وَأَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ بِرَوْحَةِ رَبِّهَا وَهِيَ فِي قَعْرِ بَيْتِهَا» یعنی عورت ایک ستر کی شے ہے، اس کی یہ شان ہے کہ مستور و محجوب رہے، اس کے کشف (پردے کے کھل جانے) سے شرم کی جاتی ہے، لہٰذا جب تک وہ اپنے پردے میں ہے تو شیطان اس میں طمع نہیں کرتا، پھر جس وقت وہ باہر نکلے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے، اس کی طرف نظر کرتا ہے، اپنی نظر اس کی طرف بڑھاتا ہے، تاکہ اس کو بہکائے، یا اس میں کسی کو بہکائے، کیوں کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں اور اپنے رب کی رحمت کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتی ہیں جب کہ اپنے گھر کی نہایت مستور جگہ میں ہوں۔[1] (ورواه الترمذي عن بزار عن عمرو بن عاصم به نحوه)

③ نیز امام بزار رحمہ اللہ نے پہلے ذکر کی گئی اسناد کے ساتھ اور امام ابو داود رحمہ اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ عورت کی نماز اپنے مخدع میں (مخدع بہ ضم میم و بہ فتح نیز۔ وہ بیت ہے جس میں بہتر سامان چھپا کر رکھا جاتا ہے، یعنی خزانہ بڑے گھر کے اندر، جیسے گھر میں کوٹھری ہوتی ہے) افضل ہے اس کی بیت میں نماز سے اور اس کی نماز اپنے بیت میں اس کی اپنے حجرے میں نماز سے افضل ہے،[2] یہ اسناد جید ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجٰهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى ﴾۔

(1) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عورت نکلتی تھی اور مردوں کے درمیان میں چلتی تھی، یہ جاہلیت کا تبرج ہے۔[3]

(2) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا اور تبرج مت کرو، جیسا کہ جاہلیتِ اولیٰ کا تبرج تھا، یعنی جس وقت تم اپنے گھروں سے نکلو۔ جاہلیت میں عورتوں کی ایک چال تھی اور تکسر و تغنج تھا، یعنی لچک کر اور ناز و ادا و کرشمہ کر کے چلتی تھی، چنانچہ اللہ پاک نے اس سے منع فرمایا۔[4]

(3) امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: تبرج یہ ہے کہ عورت اپنے سر پر اوڑھنی ڈالے اور اس کو نہ باندھے کہ گلو بندوں کو اور بالی اور گردن کو چھپائے، یہ سب چیزیں اس سے کھلی رہیں۔ پھر مومنوں کی عورتیں تبرج میں عام ہوگئیں۔[5]

(4) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی، فرمایا کہ جاہلیتِ اولیٰ نوح علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے درمیان میں تھی، وہ ہزار برس کی مدت تھی۔ آدم علیہ السلام کی اولاد سے ایک بطن سے جو پیدا ہوتا وہ نرم زمین میں اور دوسرا پہاڑ میں رہتا بستا تھا۔ پہاڑ کے مرد خوبصورت ہوتے اور عورتوں میں بدصورتی ہوتی اور نرم زمین کی عورتیں خوبصورت ہوتیں اور مردوں میں بدصورتی ہوتی۔ نرم زمین والوں کے ایک

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٧٣) مسند البزار (٥/ ٤٢٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٨٨)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٧٠) مسند البزار (٥/ ٤٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٣٣)

③ الدر المنثور (٦/ ٦٠٢) ④ تفسير الطبري (٢٠/ ٢٥٩۔ ٢٦٠) ⑤ الدر المنثور (٦/ ٦٠٢)

مرد کے پاس ابلیس، لعنہ اللہ، ایک لڑکے کی صورت میں آیا، پھر خود کو اس شخص کا مزدور بنایا تو اس کی خدمت کیا کرتا تھا۔ پھر ابلیس نے ایک شے بنائی بانسلی کی طرح، جس کو چرواہے بجایا کرتے ہیں، پھر اس میں ایسی آواز لایا جو کبھی لوگوں نے پہلے نہ سنی تھی، پھر یہ آواز اس کے آس پاس کے لوگوں کو پہنچی تو وہ پے در پے ان کے پاس آنے لگے، اس کی آواز سنتے تھے اور سال میں ایک عید مقرر کی، وہاں جمع ہوتے تو مرد عورتوں کے لیے تبرج کرتے، یعنی زینت کرتے اور بنتے ٹھنتے تھے۔ کہا: اور مرد عورتوں کے لیے اترتا تھا اور ایک پہاڑ والوں کا مرد اچانک نرم زمین والوں پر ان کی اس عید میں آگیا تو اس نے عورتوں کو دیکھا اور ان کے حسن اور خوبصورتی میں نظر کی، پھر وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آیا تو ان کو اس کی خبر دی۔ پھر وہ لوگ ان عورتوں کی طرف اٹھ آئے، ان کے ساتھ اترے۔ غرض یہ ہے کہ اسی جگہ رہنے بسنے لگے اور ان عورتوں میں فاحشہ ظاہر ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجٰهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى ﴾ وہ یہ ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ اللہ پاک نے اول تو نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو برائی سے منع فرمایا، پھر ان کو بھلائی کا حکم دیا۔ پہلے نماز کے قائم کرنے کا حکم فرمایا۔ نماز اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت ہے۔ پھر زکات دینے کا حکم دیا، یہ اللہ کی مخلوق کے ساتھ احسان ہے اور ﴿ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ خاص پر عطف عام کے باب سے ہے۔

ازواجِ مطہرات اہلِ بیت میں سے ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ اس بات میں نص ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات اہلِ بیت میں داخل ہیں، کیوں کہ وہ اس آیت کا سببِ نزول ہیں اور سببِ نزول اس میں داخل ہے: "لِأَنَّهُنَّ سَبَبُ نُزُوْلِ الْآيَةِ وَسَبَبُ نُزُوْلٍ دَاخِلٌ فِيْهِ قَوْلًا وَّاحِدًا إِمَّا وَحْدَهُ عَلٰى قَوْلٍ أَوْ مَعَ غَيْرِهِ عَلَى الصَّحِيْحِ" (یعنی نبی ﷺ کی ازواج اس میں داخل ہیں، اس لیے کہ وہ اس آیت کی سببِ نزول ہیں اور سببِ نزول آیت میں داخل ہوتا ہے ایک قول کر کے، یا تو تنہا سببِ نزول ایک قول پر، یا مع اپنے غیر کے بنا بر قولِ صحیح)۔

1. امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ امام عکرمہ رحمہ اللہ بازار میں ندا کرتے کہ ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ... الآية ﴾ خاص طور پر نسائے نبی کریم ﷺ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[2]

2. اسی طرح امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ خاصتاً انہیں کے حق میں نازل

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٠۔ ٢٦١)
[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٧)

ہوئی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: اگر کوئی چاہے تو میں اس سے مباہلہ کروں، اس بات پر کہ وہ نسائے نبی ﷺ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔[1] چنانچہ اگر امام عکرمہ رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ اس آیت کا سببِ نزول وہی ہیں کوئی اور نہیں تو یہ بات صحیح ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ اس آیت سے فقط وہی مراد ہیں ان کے علاوہ کوئی اور مراد نہیں ہیں تو اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ حدیثیں وارد ہوئی ہیں جو اس پر دال ہیں کہ اس آیت سے مراد عام تر ہے۔ اس سلسلے میں بعض احادیث درج ذیل ہیں:

1 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر گزر کرتے چھ مہینے تک، جب فجر کی نماز کے لیے نکلتے تو فرماتے: "اَلصَّلَاةُ يَا أَهْلَ الْبَيْتِ ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾۔"[2] (ورواه الترمذي عن عبد بن حميد عن عفان به وقال: حسن غريب)

2 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الحمراء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے مدینے میں سات مہینے تک مرابطت کی، یعنی اقامت کی رسول اللہ ﷺ کے عہد میں۔ کہا: میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ کو کہ جس وقت فجر طلوع ہوتی تو آپ ﷺ سیدنا علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما کے دروازے کی طرف آتے اور فرماتے: "اَلصَّلَاةَ اَلصَّلَاةَ ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ... الآية﴾۔"[3] ابو داود اعمٰی جو کہ سیدنا ابو الحمراء رضی اللہ عنہ سے راوی ہے۔ اس کا نام نفیع بن الحارث ہے اور کذاب ہے۔

3 امام احمد رحمہ اللہ نے شداد بن عمار رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ پر داخل ہوا اس حال میں کہ ان کے پاس ایک قوم تھی، چنانچہ اس نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو ان کو گالیاں دیں، یعنی برا کہا تو شداد کہتے ہیں: میں نے بھی ان کے ساتھ ان کو برا کہا۔ پھر جب وہ قوم اُٹھ گئی تو سیدنا واثلہ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ تو نے بھی اس شخص کو برا کیوں کہا؟ یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو۔ میں نے کہا ہے کہ ان لوگوں نے ان کو گالیاں دیں تو میں نے بھی ان کے ساتھ ان کو برا کہا۔ سیدنا واثلہ رضی اللہ عنہ بولے: کیا میں تجھے اس بات کی خبر نہ دوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے دیکھی ہے؟ میں نے کہا: ہاں، خبر دو۔ سیدنا واثلہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا، ان سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھتا تھا تو انھوں نے کہا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف گئے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹/ ۳۱۳۲)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۰۶) مسند أحمد (۳/ ۲۵۹) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير الطبري (۲۰/ ۲۶٤) المعجم الكبير (۳/ ۵٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه أبو داود الأعمىٰ وهو كذاب" (مجمع الزوائد: ۹/ ۱٦۰)

ہیں، چنانچہ میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ کے ہمراہ سیدنا علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے آپ ﷺ کا دستِ مبارک پکڑ رکھا تھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ اندر آئے۔ پھر آپ ﷺ نے سیدنا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے قریب بلایا اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا اور سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سے ہر ایک کو اپنی ران مبارک پر بٹھایا، پھر ان پر اپنا کپڑا یا اپنی کملی لپیٹی، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ... الآية ﴾ اور فرمایا: «اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِي وَأَهْلُ بَيْتِي أَحَقُّ» یعنی اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں اور میرے اہلِ بیت زیادہ تر حق دار ہیں۔ (وقد رواه أبو جعفر بن جرير عن عبدالكريم عن ابن أبي عمير عن الوليد عن مسلم عن أبي عمرو الأوزاعي بسنده نحوه) اس کے آخر میں اتنا زیادہ کیا ہے کہ سیدنا واثلہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر میں نے اور میں، یا رسول اللہ! درود بھیجے اللہ آپ پر، آپ کے اہلِ بیت سے ہوں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اور تو میرے اہل سے ہے۔ سیدنا واثلہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "وَإِنَّهَا مِنْ أَرْجَى مَا أَرْتَجِيْ"، یعنی جن چیزوں کی میں سب سے بڑھ کر امید رکھتا ہوں، نبی اکرم ﷺ کا یہ کلمہ انہیں میں سے ہے۔[1]

4 پھر اس حدیث کو باسنادِ دیگر شداد بن ابی عمار سے روایت کیا ہے (پہلے شداد بن عمار گزرا ہے یہاں کلمۂ ابی زائد ہے۔ واللّٰه أعلم)۔ کہا: میں سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اس وقت لوگوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو ان کو گالیاں دیں، پھر جب وہ اٹھ گئے تو سیدنا واثلہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تو بیٹھ جا، یہاں تک کہ میں تجھ کو اس شخص کی خبر دوں جس کو انھوں نے گالیاں دیں۔ بے شک میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا کہ اس وقت سیدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم آئے تو آپ ﷺ نے اپنی کملی ان پر ڈال دی۔ پھر فرمایا: الٰہی! یہ میرے اہلِ بیت ہیں تو ان سے گندگی کو دور کر اور ان کو اچھی طرح سے پاک کر۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اور میں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اور تو۔ واثلہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "فَوَ اللّٰهِ إِنَّهَا لَأَوْثَقُ عَمَلٍ عِنْدِيْ"، یعنی اللہ کی قسم بے شک آپ ﷺ کا یہ کلمہ میرے نزدیک البتہ زیادہ تر وثوق اور اعتماد والا عمل ہے۔[2]

5 نیز امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ ذکر کرتی تھیں کہ نبی اکرم ﷺ ان کے گھر میں تھے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے پاس ایک ہانڈی لیے ہوئے آئیں، جس میں خزیرہ تھا (خزیرہ ایک کھانے کا نام ہے، گوشت کے ذرا ذرا سے ٹکڑے کر کے اس میں بہت سا پانی ڈالتے ہیں، پھر جب وہ پک جاتا ہے تو اس پر آٹا بُرادیتے ہیں، پھر اگر اس میں گوشت نہ ہو تو اس کو عصیدہ بولتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ حساء ہے، آٹے اور چکنائی سے بنتا ہے، یعنی آٹا اور گوشت اور پانی اور تیل ڈال کر پتلا پکاتے ہیں اور اس کو سڑپتے ہیں۔

[1] مسند أحمد (٤/ ١٠٧) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٤_ ٢٦٥) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٤) المعجم الكبير (٣/ ٥٥)

کسی نے کہا ہے کہ اگر آٹے کا ہے تو حریرہ ہے اور اگر بھوسی کا ہے تو خزیرہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بجائے مہملہ ورائے مکرر ہے، دودھ سے بنتا ہے۔[1] كذا في مجمع البحار)۔ پھر وہ اس کو لیے ہوئے آپ ﷺ کے پاس اندر آئیں تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اپنے خاوند کو اور دونوں بیٹوں کو بلا لو۔ کہا: پھر سیدنا علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم آئے اور آپ ﷺ پر داخل ہوئے۔ پھر بیٹھے اور اس خزیرے سے کھانے لگے اور آپ ﷺ اپنے سونے کے بستر پر تھے اور آپ ﷺ کے نیچے ایک خیبری کملی تھی۔ کہا: اور میں اپنے حجرے میں نماز پڑھ رہی تھی۔ پھر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ... الآية ﴾ بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں. پھر آپ ﷺ نے کملی کا فاضل پلو لیا، پھر اس سے ان سب کو ڈھانک لیا، پھر اپنا دستِ مبارک نکالا اور اس کو آسمان کی طرف اٹھایا۔ پھر فرمایا: « اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِيْ وَحَامَتِيْ فَاذْهَبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا » (حامة الإنسان و حميمه خاصته ومن يقرب منه.[2] كذا في مجمع البحار)۔ یعنی الٰہی! یہ میرے اہلِ بیت ہیں اور میرے خاص قریب لوگ ہیں، پس تو دور کر اُن سے گندگی اور ان کو اچھی طرح سے پاک کر۔ پھر میں نے اپنا سر گھر میں داخل کیا تو میں نے عرض کی: اور میں تمھارے ساتھ ہوں یا رسول اللہ؟! آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّكِ إِلٰى خَيْرٍ ، إِنَّكِ إِلَى خَيْرٍ » یعنی تو طرف خیر کے ہے۔[3] (في إسناده من لم يسم و هو شيخ عطاء و بقية رجاله ثقات)

6 طریقِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن ابن سیرین عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے، کہا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنی ایک ہانڈی لیے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں، اس میں عصیدہ پکایا تھا، اس کو ایک طباق پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ پھر اس کو آپ ﷺ کے سامنے رکھ دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تیرے چچا کا بیٹا اور تیرے دونوں بیٹے کہاں ہیں؟ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ گھر پر ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو بلا لا۔ پھر وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف گئیں اور کہا: "أَجِبْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَنْتَ وَابْنَاكَ" یعنی تم اور تمھارے دونوں بیٹے رسول اللہ ﷺ کو جواب دو۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ پھر جب آپ ﷺ نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو اپنا دستِ مبارک کملی کی طرف بڑھایا جو بسترِ خواب پر تھی۔ پھر اس کو کھینچا اور بچھایا اور ان کو اس پر بٹھایا (ان روایتوں میں "کساء" کا لفظ ہے۔ "کساء" کمل کو کہتے ہیں۔ "کساء" کی جمع "أكسيه" ہے)۔ پھر کملی کے چاروں کونے اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑے۔ پھر اُن کو اُن کے سروں کے اوپر ملا دیا اور داہنے ہاتھ سے اپنے رب کی طرف اشارہ کیا۔ پھر فرمایا: الٰہی! یہ لوگ میرے اہلِ بیت ہیں پس تُو ان سے گندگی کو دور کر اور ان کو اچھی طرح سے پاک کر۔[4]

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٣٤) [2] مجمع بحار الأنوار (١/ ٥٨٧)

[3] مسند أحمد (٦/ ٢٩٢) المعجم الكبير (٩/ ٢٥) [4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٥)

7 طریقِ دیگر: نیز امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حکیم بن سعد سے روایت کیا ہے، کہا: ہم نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو وہ بولیں کہ میرے گھر میں ﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ ... الآیۃ ﴾ نازل ہوئی ہے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف لائے تو فرمایا کہ کسی کو اذن مت دینا، یعنی گھر میں آنے کی اجازت نہ دینا۔ پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو مجھ سے نہ ہو سکا کہ میں ان کو اپنے باپ سے روکوں۔ پھر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ آئے تو مجھ سے نہ ہو سکا کہ ان کو اپنے نانا اور ماں سے روکوں۔ پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ آئے تو مجھے اس بات کی ہمت نہ ہوئی کہ ان کو روکوں۔ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ آئے تو مجھے قدرت نہ ہوئی کہ ان کو روکوں۔ پھر جب یہ سب جمع ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کملی سے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی، ان کو ڈھانک لیا، پھر فرمایا: « هٰؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِي فَاذْهَبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا » پس یہ آیت نازل ہوئی، اس وقت کہ وہ بچھونے پر جمع ہو گئے۔ کہا: پھر میں نے کہا: یا رسول اللہ! اور میں؟ "قَالَتْ: فَوَ اللّٰهِ مَا أَنْعَمَ، وَقَالَ: « إِنَّكِ إِلٰى خَيْرٍ » یعنی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، کیا بڑا انعام کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور فرمایا: بے شک تو طرف خیر کے ہے۔[1]

8 طریقِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عطیہ طفاوی عن ابیہ سے روایت کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عطیہ کے باپ کو حدیث کی کہ اس دوران میں کہ ایک دن رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ اس وقت خادمہ نے عرض کی کہ سیدہ فاطمہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما سُدَّہ پر ہیں، یعنی ڈیوڑھی پر ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ تو کھڑی ہو اور میرے اہلِ بیت سے علاحدہ ہو جا۔ کہا: پھر میں کھڑی ہوئی تو گھر میں قریب ہی ایک طرف ہو گئی۔ پھر سیدنا علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما اندر آئے اور ان کے ساتھ سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما تھے اور یہ دونوں چھوٹے بچے تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں بچوں کو پکڑا اور ان کو اپنی گود میں رکھا اور ایک ہاتھ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اور دوسرے ہاتھ سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے معانقہ کیا۔ پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بوسہ لیا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا بوسہ لیا اور ان پر سیاہ خمیصہ چھوڑ دی، یعنی سیاہ رنگ کی منقش پلو دار کملی ڈال دی اور فرمایا: « اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ لَا إِلَى النَّارِ وَأَهْلُ بَيْتِي »۔ یعنی اے اللہ! تیری طرف نہ کہ آگ کی طرف اور میرے اہلِ بیت۔ کہا: پھر میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اور میں؟ فرمایا اور تو۔[2]

9 طریقِ دیگر: (رواه ابن جرير أيضا عن أبي كريب عن وكيع عن عبدالحميد بن بهرام عن شهر بن حوشب عن أم سلمة رضي الله عنها بنحوه)

10 طریقِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن ابی سعید عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے، کہا: یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی ہے: ﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ ... الآیۃ ﴾ کہا: اور میں گھر کے دروازے پر بیٹھی ہوئی تھی تو میں نے عرض کی:

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٧) [2] مسند أحمد (٦/ ٢٩٦)

اے اللہ کے رسول! کیا میں اہلِ بیت میں سے نہیں ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک تو خیر کی طرف ہے اور تو ازواجِ نبی سے ہے۔ کہا اور گھر میں رسول اللہ تھے اور سیدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم تھے۔

11 طریقِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن وہب بن زمعہ سے روایت کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مجھے خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو جمع کیا، پھر ان کو اپنے کپڑے کے نیچے داخل کیا۔ "ثُمَّ جَأَرَ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ" یعنی پھر اللہ عزوجل کی طرف آواز بلند کی اور استغاثہ کیا، یعنی درخواست کی اور فرمایا: یہ لوگ میرے اہلِ بیت ہیں۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! مجھے ان کے ساتھ داخل کریں تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو میرے اہل سے ہے۔[1]

12 طریقِ دیگر: (رواها ابن جرير أيضا بسنده عن عمر بن أبي سلمة عن أمه رضي الله عنها بنحو ذلك)

13 حدیثِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک صبح کو نکلے اور آپ پر سیاہ بالوں کی مِرط مُرَحّل تھی (یعنی کملی جس میں ہانڈیوں کی یا (اگر مُرجّل ہو تو) اونٹ کے کجاووں کی صورتیں بنی ہوئی تھیں۔) سیدنا حسن رضی اللہ عنہ آئے تو آپ ﷺ نے ان کو اپنے ساتھ داخل کر لیا۔ پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ آئے تو اُن کو آپ ﷺ نے اپنے ساتھ داخل کر لیا۔ پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو اُن کو اپنے ساتھ داخل کر لیا۔ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ آئے تو اُن کو اپنے ساتھ داخل کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ... الآية ﴾[2]

(ورواه مسلم عن أبي بكر بن أبي شيبة عن محمد بن بشر به)

14 طریقِ دیگر: امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عوام بن حوشب سے روایت کیا ہے، عوام اپنے چچا سے راوی ہیں، کہا: میں اپنے باپ کے ساتھ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس داخل ہوا تو میں نے ان سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: تو مجھ سے اس شخص کا پوچھتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کو لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبوب تھا اور ان کے تحت میں آپ ﷺ کی صاحبزادی تھیں، جو آپ ﷺ کو سب لوگوں سے زیادہ محبوب تھیں، البتہ یقیناً میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ نے سیدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا۔ پھر ان پر ایک کپڑا ڈالا۔ پھر فرمایا: «اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِي فَاذْهَبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيْرًا» کہا: پھر میں ان سے قریب ہوئی تو میں نے عرض کی: یارسول اللہ! اور میں آپ کے اہلِ بیت میں سے ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو علاحدہ ہو جا، بے شک تو خیر پر ہے۔

15 حدیثِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن عطیہ عن ابی سعید رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ آیت پانچ کی شان میں اتری ہے: مجھ میں اور سیدنا علی، حسن، حسین اور فاطمہ رضی اللہ عنہم میں: ﴿ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ... الآية ﴾

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٥ـ ٢٦٦) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٢٤) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٣)

حدیث کی سند کے بارے میں پہلے گزر چکا ہے کہ اس کو فضیل بن مرزوق نے روایت کیا ہے۔ ”عن عطية عن أبي سعيد عن أم سلمة رضی اللہ عنہا كما تقدم“ اور امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ”من حديث هارون بن سعد العجلي عن عطية عن أبي سعيد رضی اللہ عنہ“ موقوفاً روایت کیا ہے۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم۔[1]

16 حدیثِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عامر بن سعد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اور اُن کے دونوں بیٹوں کو اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پکڑا۔ پھر ان کو اپنے کپڑے کے نیچے داخل کیا۔ پھر فرمایا: «هٰؤُلَاءِ أَهْلِي وَأَهْلُ بَيْتِي»[2]

17 حدیثِ دیگر: امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں یزید بن حبان سے روایت کیا ہے، کہا: میں اور حصین نے ان سے کہا: اے زید! البتہ واقعی تُو تو خیرِ کثیر سے ملا، تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور ان کی حدیث سنی اور ان کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوئے اور ان کے پیچھے نماز پڑھی۔ اے زید! البتہ تُو تو خیرِ کثیر سے ملا۔ اے زید! تو ہم کو حدیث کر اس شے کی جو تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے کہا: اے بھتیجے! واللہ! مقرر میری عمر بڑی ہو گئی اور میرا زمانہ پرانا ہو گیا اور جو کچھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد رکھتا تھا اس کا بعض بھول گیا، پس جو کچھ میں تم کو حدیث کر چکا ہوں اس کو قبول کرو اور جو نہیں کی تو اس میں تکلف مت کرو۔ پھر کہا: ایک دن ہم میں ایک پانی والی جگہ پر، جس کو خم کہتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے (”غدیرِ خُمّ“ بہ ضمِ خائے معجمہ وتشدیدِ میم، مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے، وہاں ایک چشمہ ہے، وہ اس میں گرتا ہے ان کے درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے۔ کسی نے کہا: ایک غیظ ہے، یعنی گھنے درختوں کی جگہ جو جحفہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے، اس کے پاس ایک تالاب ہے)۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور وعظ و نصیحت فرمائی۔ پھر فرمایا: «أَمَّا بَعْدُ! أَلَا أَيُّهَا النَّاسُ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوْشِكُ أَنْ يَأْتِيَنِي رَسُوْلُ رَبِّي فَأُجِيْبُ وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ تَعَالٰى فِيْهِ الْهُدَى وَالنُّوْرُ فَخُذُوْا بِكِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِكُوْا بِهِ» یعنی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: خبردار رہو اے لوگو! پس میں جو ہوں تو ایک بشر ہوں، قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا قاصد آجائے تو میں اس کی دعوت قبول کرلوں اور میں تم میں ثقلین (دو بھاری چیزیں) چھوڑ کر جانے والا ہوں، ان میں سے اول ان کا اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ چنانچہ تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پکڑو اور خوب مضبوط پکڑو اس کو، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزوجل کی کتاب پر آمادہ کیا اور اس میں رغبت دلائی۔ پھر فرمایا: «وَأَهْلُ بَيْتِي أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي ثَلَاثًا» یعنی دوسری چیز میرے اہلِ بیت ہیں، میں اپنے اہلِ بیت کے حق میں

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٦٣) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٣٥) [2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٦٦)

تمھیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔ اس کلمے کو تین بار فرمایا۔ (کتاب اللہ اور اہلِ بیت کو ثقلین فرمایا۔ اس لیے کہ ان دونوں کا اَخذ کرنا اور ان پر عمل کرنا ثقلین ہے اور ہر شے شریف و نفیس کو ثقل بولتے ہیں، چنانچہ ان کی عظمت اور شان کی بلندی کی وجہ سے ان کا نام ثقیل رکھا۔ اس لیے کہ دین کی درستی اور آبادی انھیں دونوں سے تو ہے، جس طرح کہ دنیا کی آبادی ثقلین سے ہوتی ہے، یا اس لیے کہ کتاب اللہ اور عترت کے ساتھ اَخذ کرنا عزیمت ہے۔ جن وانس کو ثقلین اس لیے کہتے ہیں کہ وہ زمین میں رہتے اور بستے ہیں، اس کو بھاری کرتے ہیں۔[1] (کذا في مجمع البحار))

حصین رحمہ اللہ نے زید رضی اللہ عنہ سے کہا: اے زید! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کون ہیں؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں آپ کے اہلِ بیت سے نہیں ہیں؟ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں آپ کے اہلِ بیت سے ہیں، لیکن آپ کے اہلِ بیت وہ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدقے سے محروم ہیں۔ سیدنا حصین رحمہ اللہ نے کہا: وہ کون ہیں؟ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ آلِ علی، آلِ عقیل، آلِ جعفر اور آلِ عباس ہیں۔ رضي اللّٰہ عنھم۔ حصین رحمہ اللہ نے کہا: کیا یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدقہ سے محروم ہیں؟ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں۔ پھر امام مسلم رحمہ اللہ نے بسندِ دیگر زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا، اس روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ پھر میں نے زید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں؟ کہا: نہیں، قسم ہے اللہ کی! بے شک عورت مرد کے ساتھ ایک مدت تک ہوتی ہے، پھر وہ اسے طلاق دیتا ہے تو وہ اپنے باپ اور اپنی قوم کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل اور عصبہ ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدقہ سے محروم ہیں۔[2]

اس روایت میں اسی طرح واقع ہوا ہے۔ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اس کو لینا زیادہ بہتر ہے اور اس دوسری روایت میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ تفسیر سے مراد اہل ہے، جن کو ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہی آپ کی آل ہیں، جو صدقہ سے محروم ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اہل سے مراد صرف بیویاں نہیں ہیں، بلکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے ساتھ ہیں، یہ احتمال اس روایت اور پہلی روایت کے جمع کرنے کے لیے راجح تر ہے اور قرآن شریف کے اور اوپر بیان کی گئی حدیثوں میں جمع کرنے کے لیے بھی یہ احتمال راجح تر ہے، اگر وہ صحیح ہو جائیں، کیوں کہ ان کی اسانید میں نظر ہے۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم.

پھر وہ بات جس میں وہ شخص شک نہیں کرتا جس نے قرآن شریف کو سمجھا بوجھا ہے، یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ... الآية﴾ میں داخل ہیں، کیوں کہ سیاقِ کلام ان کے ساتھ ہے اور اسی لیے یہ سب کچھ کہنے کے بعد اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ یعنی تم عمل کرو اس شے پر جس کو اللہ تعالیٰ تمھارے گھروں میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرماتا ہے، یعنی کتاب وسنت۔

[1] مجمع بحار الأنوار (۱/ ۲۹۳۔۲۹۴) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۴۰۸)

یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ کا ہے۔ اور یاد کرو اس نعمت کو جس کے ساتھ تم خاص کی گئی ہو لوگوں کے درمیان میں سے کہ باقی لوگوں کے سوا وحی تمھارے گھروں میں نازل ہوتی ہے اور سیدہ عائشہ بنت صدیق رضی اللہ عنہما سب سے بڑھ کر اس نعمت کی مستحق ہیں اور سب سے زیادہ اس غنیمت کے ساتھ بہرہ مند ہیں اور اس عام رحمت کے ساتھ سب سے زیادہ خاص ہیں، کیوں کہ ان کے سوا کسی اور بیوی کے بچھونے میں آپ ﷺ پر وحی نازل نہیں ہوئی، چنانچہ خود نبی کریم ﷺ نے اس بات پر نص فرمائی ہے۔

بعض علماء رحمہم اللہ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے سوا کسی کنواری عورت سے نکاح نہیں کیا اور سوا آپ ﷺ کے ان کے بچھونے میں کوئی مرد نہیں سویا۔ اس لیے مناسب ہوا کہ اس فضیلت اور شرف کے ساتھ وہی خاص کی جائیں اور اس بلند مرتبے کے ساتھ وہی مستقل ہوں، لیکن جب کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آپ ﷺ کے اہلِ بیت سے ہوئیں تو آپ ﷺ کی قرابت اس سے زیادہ مستحق ہے کہ اس کا نام اہلِ بیت رکھا جائے، جس طرح کہ پہلے حدیث شریف میں گزر چکا ہے: «وَأَهْلُ بَيْتِي أَحَقُّ»[1]

یہ اس بات کے مشابہ ہے جو صحیح مسلم میں ثابت ہوئی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے کسی نے اس مسجد کے متعلق پوچھا جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوے پر رکھی گئی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ یہ میری مسجد ہے،[2] چنانچہ یہ بات اسی قبیل سے ہے، کیوں کہ آیت ﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾ [التوبة: ۱۰۸] ''البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقوے پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' صرف مسجد قبا کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جس طرح دوسری حدیثوں میں وارد ہوا ہے، لیکن جبکہ مسجد قبا کی بنا اول دن سے تقوے پر رکھی گئی تو رسول اللہ ﷺ کی مسجد شریف زیادہ مستحق ہے کہ اس کو یہ نام دیا جائے۔ واللّٰه سبحانه أعلی.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن جمیلہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا ہے، اس اثنا میں کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے کہ اس وقت ایک شخص نے ان پر جست لگائی اور خنجر سے ان کو چونکا مارا۔ حصین جو ابن جمیلہ سے راوی ہے، اس کا زعم یہ ہے کہ اسے یہ بات پہنچی ہے کہ جس نے ان کو چونکا مارا، وہ بنی اسد کا ایک شخص تھا اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سجدہ کر رہے تھے۔ کہا: پس زعم کرتے ہیں کہ وہ چونکا ان کے سرین میں لگا تو وہ اس سے کئی مہینے بیمار رہے، پھر اچھے ہوگئے تو منبر پر بیٹھے۔ پھر فرمایا: "يَا أَهْلَ الْعِرَاقِ! اِتَّقُوا اللّٰهَ فِينَا فَإِنَّا أُمَرَاءُكُمْ وَضِيفَانُكُمْ وَنَحْنُ وَأَهْلُ الْبَيْتِ الَّذِي قَالَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۹۸)

﴿ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ '' یعنی اے اہلِ عراق! تم ہمارے حق میں اللہ سے ڈرو، پس بے شک ہم تمھارے امیر ہیں اور تمھارے مہمان ہیں اور ہم وہ اہلِ بیت ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ... الآية ﴾ پھر اس کو فرماتے رہے، یہاں تک کہ مسجد والوں میں کوئی ایسا نہ رہا جس نے رو کر نوحہ نہ کیا ہو۔[1] امام سُدّی رحمہ اللہ نے ابو الدیلم سے روایت کیا ہے کہ علی بن حسین رحمہ اللہ سے اہلِ شام کے ایک شخص سے فرمایا: کیا تو نے سورۃ الاحزاب میں یہ نہیں پڑھا: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ ... الآية ﴾؟ کہا: ہاں اور البتہ تم وہ ہو؟ فرمایا: ہاں۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴾ یعنی اللہ پاک کا لطف و کرم جو تمھارے ساتھ ہے، اس کے سبب سے تم اس مرتبے کو پہنچے ہو اور اس کو تمھاری خبر ہے اور اس بات کی کہ تم اس لائق ہو، اس وجہ سے اس نے تم کو یہ مرتبہ عطا کیا ہے اور تم کو اس کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے کہ تم کو ایسے گھروں میں رکھا ہے جن میں اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں پڑھی جاتی ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اور حمد کرو[3]، بے شک اللہ تعالیٰ تم پر صاحبِ لطف و کرم ہے، جب کہ اس نے تم کو ان گھروں میں رکھا ہے، جن میں اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں یعنی سنت پڑھی جاتی ہیں، تم سے اچھی طرح باخبر ہے، جبھی تو تم کو اپنے رسول ﷺ کے لیے بیبیاں پسند کیا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ ان پر اس کا احسان رکھتا ہے۔[4] (رواه ابن جرير) عطیہ عوفی نے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ ''لَطِيفًا بِاسْتِخْرَاجِهَا خَبِيرًا بِمَوْضِعِهَا''[5] (رواه ابن أبي حاتم، ثم قال: وكذا روي عن الربيع بن أنس عن قتادة)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاۗءِ ﴾ فرمایا اور ''كَوَاحِدَةٍ'' نہ کہا، اس لیے کہ کلمۂ ''أحد'' ایک عام لفظ ہے، جو مذکر و مونث اور واحد و جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے،[6] کبھی غیر آدمی پر بھی بولا جاتا ہے، جس طرح کہ کہتے ہیں: ''لَيْسَ فِيهَا أَحَدٌ لَا شَاةَ وَلَا بَعِيرَ'' یعنی گھر میں کوئی نہیں ہے، نہ بکری نہ اونٹ۔ معنی یہ ہیں کہ تم فضیلت اور شرف میں عورتوں کی مختلف جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت کی طرح نہیں ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمھاری قدر و منزلت دوسری صالح عورتوں کی قدر و منزلت

---
[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٣٢) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٦) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٧)
[4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٨) [5] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٣١ـ ٦٣٧) [6] معاني القرآن (٤/ ٢٢٤)

جیسی نہیں ہے۔ تم میرے نزدیک زیادہ عزت والی ہو اور تمھارا ثواب دوسری عورتوں کے ثواب سے زیادہ ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے اس شرفِ عظیم کو ایک قید کے ساتھ مقید کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ ﴾ یعنی اگر تم اللہ کا ڈر رکھو، پھر اس کی اطاعت کرو، کیوں کہ اللہ سبحانہ کے نزدیک جو زیادہ متقی ہے وہی زیادہ تر عزت و شرف والا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کو جو فضیلت نصیب ہوئی وہ صرف اس لیے کہ تقوے کو انھوں نے لازم پکڑا، نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ الحمد للہ بے شک ان سے ظاہری طور پر اور حقیقی طور پر تقویٰ اور ایمانِ خالص اور رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر چلنا آپ ﷺ کی زندگی میں اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی واقع ہوا۔

شرط کا جواب محذوف ہے، اس لیے کہ ماقبل اس پر دال ہے، یعنی اگر تم اللہ سے ڈرو گی تو تم عورتوں میں سے کسی ایک کے مثل نہیں ہو گی۔ کسی نے کہا ہے کہ جواب ﴿ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ ﴾ ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، یعنی لوگوں سے بات چیت کرتے وقت نرم بات مت کرو، جس طرح کہ عورتوں میں سے شک و تہمت والی عورتیں کیا کرتی ہیں اور رقیق اور نرم کلام مت کرو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "لَا تُرَخِّصْنَ بِالْقَوْلِ وَلَا تَخْضَعْنَ بِالْكَلَامِ"[2] یعنی نزاکت سے بات مت کرو اور دب کر مت بولو۔

ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: "مُقَارَنَةُ الرِّجَالِ فِي الْقَوْلِ حَتّٰى يَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ"[3] مرض سے مراد فجور اور شہوت ہے، یا شک و شبہہ و تہمت و نفاق۔ نرم نرم نازک نازک باتیں کرنے سے فسادِ عظیم پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ جس کے دل میں امورِ مذکورہ ہوتے ہیں تو وہ عورت میں طمع کرنے لگتا ہے۔ یعنی تم ایسی بات مت کہو اور اس طریقے سے مت بولو، جس سے منافق اور فاجر تم میں طمع کرنے کی طرف راہ پائے۔ عورت کے واسطے مستحب ہے اور اس سے مطلوب ہے کہ جس وقت اجنبی مردوں سے مخاطب ہو تو سختی اور درشتی سے باتیں کرے، کڑی بات کڑک کر بے دھڑک کہے، تاکہ ان کے جی میں اگر طمع ہو تو قطع ہو جائے اور انھیں اظہارِ مرض کا حوصلہ نہ ملے اور سمجھ لیں کہ مقصد حاصل کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

جمہور نے ﴿ فَيَطْمَعَ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ نہی کا جواب مضارع مع الفاء ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اعرج نے بہ فتح یائے تحتیہ و کسرِ میم پڑھا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: میں اس کو غلط خیال کرتا ہوں، یہ قراءت عیسی بن عمرو و ابن محیصن سے بھی مروی ہے اور یہ بھی ان سے روایت کیا گیا ہے کہ انھوں نے فعل نہی کے عمل پر اس کو عطف کر کے بہ جزم پڑھا ہے۔[4]

﴿ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ایسی بات کہو جو لوگوں کے نزدیک معروف ہو، یعنی باوجود اس

---

[1] تفسير البغوي (٦/ ٣٤٨) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٥٨)

[3] فتح القدير (٤/ ٣٧١) [4] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٦) فتح القدير (٤/ ٣٦٥)

کے کہ وہ سخت اور تہمت سے دور ہو شرعی طریقے پر، اچھی اور نیک بات ہو کہ اس کا سننے والا اس سے کسی شے کا انکار نہ کرے، اس کو برا نہ جانے اور نہ اس کے سبب سے فسق و فجور والے تم میں طمع کریں۔ یا قولِ معروف یہ ہے کہ ایسی بات ہو جس کو اسلام اور دین ضرورت کے وقت واجب کرے اور وہ ایسی زبان میں ہو جس میں خشوع اور عاجزی اور دباؤ نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ قولِ معروف اللہ پاک کا ذکر ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ﴿قِرْنَ﴾ جمہور نے بہ کسرِ قاف پڑھا ہے۔ "وَقَرَ يَقِرُ وَقَارًا" سے ماخوذ بہ معنی سکن سے صیغہ امر کا واحد مذکر کے لیے۔ "قِرْ" بہ کسرِ قاف ہے اور جمع مؤنث کا "قِرْنَ" ہے، جیسے: "عِدْنَ وَزِنَّ"۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرار سے ہے وقار سے نہیں ہے۔ محاورے میں تو یوں کہے گا کہ "قَرَرْتُ بِالْمَكَانِ" بہ فتحِ راء، یعنی قرار پکڑا میں نے مکان میں۔

اصل میں "إِقْرِرْنَ" بہ کسرِ را تھا، پھر پہلی راء حذف کی گئی تخفیف کے لیے جس طرح کہ "ظَلِلْتُ" میں "ظَلْتُ" کہا ہے۔ پھر اس کی حرکت منتقل کر کے قاف کو دی، قاف کے متحرک ہونے کی وجہ سے ہمزۂ وصل کی ضرورت نہ رہی۔ امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کراہت کی تضعیف کی وجہ سے اول راء کو یائے تحتیہ سے بدلا، جس طرح کہ قیراط و دینار میں بدلی گئی ہے اور یاء کی حرکت اس حرف کے لیے ہوگئی جس سے وہ بدلی گئی ہے۔ تقدیر "اِقْيِرْنَ" ہے، پھر یاء کی حرکت قاف پر ڈالی اس کراہت سے کہ یا کو کسر کی حرکت دی جائے، پھر دو ساکن کے جمع ہونے کی وجہ سے یا ساقط ہوئی اور ہمزۂ وصل ما بعد کی تحریک کی وجہ سے گر گیا تو "قِرْنَ" ہو گیا۔ امام نافع اور عاصم رحمہ اللہ نے "قَرْنَ" بہ فتحِ قاف پڑھا ہے، اصل اس کی "قَرِرْتُ بِالْمَكَانِ إِذَا أَقَمْتَ فِيهِ" بہ کسرِ راء "أَقَرُّ" بہ فتحِ قاف مثل "حَمِدَ يَحْمَدُ" یہ حجاز والوں کی لغت ہے۔

امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کو امام کسائی رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے اور امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہ ایسا ہے، جیسا کوئی کہتا ہے: "هَلْ حَسَسْتَ صَاحِبَكَ أَيْ: هَلْ أَحْسَسْتَهُ" امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ عربیت میں سے ہمارے اشیاخ قراءت بہ فتحِ قاف کا انکار کرتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ "قَرَرْتُ بِالْمَكَانِ أَقَرُّ" کو بہت سے اہلِ عربیت جائز نہیں رکھتے۔ صحیح "قَرِرْتُ أَقَرُّ" بالکسر ہے، معنی اس کے یہ ہیں کہ آپ کی ازواجِ مطہرات کو اپنے گھروں میں تو قر و سکون کا حکم ہے اور اس بات کا کہ باہر نہ نکلیں، یہ قول اس قول کے مخالف ہے جو ہم نے عن ابی عبید عن الکسائی ذکر کیا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ ابو عبید کے اجل مشائخ سے ہیں اور اس قراءت کے انکار پر امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے بھی کسائی رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے۔ کہا ہے کہ کلامِ عرب میں "قَرْنَ" بہ فتحِ قاف کے لیے کوئی مذہب نہیں ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابو حاتم رحمہ اللہ کے اس قول کی مخالفت کی گئی ہے، بلکہ اس میں دو مذہب ہیں: ایک کو تو امام کسائی رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے اور دوسرا مذہب علی بن سلیمان سے مروی ہے۔ جس مذہب کو کسائی نے

بیان کیا ہے وہ تو وہی ہے جس کو ہم ابو عبید عن الکسائی پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ رہا وہ مذہب جس کو علی بن سلیمان نے بیان کیا ہے تو علی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ وہ ماخوذ ہے: "قَرَرْتُ بِهِ عَيْنًا أَقِرُّ" سے۔ معنی یہ ہیں کہ تم ان سے اپنے گھروں میں اپنی آنکھ ٹھنڈی کرو۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ وجہ حسن ہے۔ تحسین میں کہا ہے کہ یہ حسن نہیں ہے اور نہ یہ آیت کے معنی ہیں، اس لیے کہ آیت سے مراد ازواجِ مطہرات کو اپنے گھروں میں سکون اور استقرار کا امر کرنا ہے اور یہ قرۃ العین سے نہیں ہے۔ امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے "اِقْرِرْنَ" بالفِ وصل و دو راء اول مکسور بر اصل، یعنی لازم پکڑو اپنے گھروں کو۔[1]

محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا: مجھے اس بات کی خبر دی گئی کہ کسی نے سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا زوج النبی ﷺ سے عرض کی کہ آپ کو کیا ہے کہ آپ نہ حج کرتی ہیں نہ عمرہ، جس طرح کہ آپ کی بہنیں کرتی ہیں؟ تو فرمایا کہ میں تو حج اور عمرہ کر چکی اور مجھے اللہ نے یہ امر فرمایا کہ میں اپنے گھر میں قرار پکڑوں۔ قسم ہے اللہ کی کہ میں اپنے گھر سے نہ نکلوں گی، یہاں تک کہ مرجاؤں۔ قسم ہے اللہ کی کہ وہ اپنے حجرے کے دروازے سے نہ نکلیں، یہاں تک کہ ان کا جنازہ نکالا گیا۔ امام مسروق رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جس وقت وہ ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ پڑھتیں تو روتیں، یہاں تک کہ اپنی اوڑھنی کو تر کر دیتی تھیں۔[2] (رواه ابن أبي شيبة وغيره)

﴿تَبَرُّجَ﴾ یہ ہے کہ عورت اپنی زینت و زیور اور بناؤ سنگار اور خوبیوں سے وہ شے ظاہر کرے جس کا چھپانا اس پر ضروری ہے کہ جس کے ساتھ مرد شہوت و خواہش کو طلب کرتے ہیں۔ ﴿تَبَرُّجَ﴾ کے معنی سورۃ النور میں گزر چکے ہیں۔[3] امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿تَبَرُّجَ﴾ ماخوذ ہے "سِعَة" سے۔ جس کے دانت متفرق ہوتے ہیں تو محاورے میں بولتے ہیں: "فِيْ أَسْنَانِهِ بَرَجٌ"[4] یعنی اس کے دانتوں میں کشادگی و فراخی ہے۔ مراد زینت کا اظہار اور مردوں کے لیے اپنی خوبیوں کا ظاہر کرنا ہے۔ کسی نے کہا: ﴿تَبَرُّجَ﴾ چال میں تغنج و تبختر و تکسر ہے، یعنی ناز، ادا اور تکبر کر کے اور لچک کر چلنا۔ یہ قول نہایت ضعیف ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ جاہلیتِ اولیٰ میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے:

1. کسی نے کہا کہ وہ زمانہ ہے جو آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان تھا یا داود اور سلیمان علیہما السلام کے درمیان والا زمانہ ہے۔
2. کسی نے کہا ہے کہ نوح اور ادریس علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور پہلے گزر چکا ہے یہ زمانہ ہزار برس کا تھا۔[5]
3. کسی نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان کا زمانہ ہے۔

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٧ـ ١٧٨) فتح القدير (٤/ ٣١٩) [2] الدر المنثور (٦/ ٥٩٩ـ ٦٠٠) [3] رقم الآية (٦٠)
[4] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٨) [5] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٠ـ ٢٦١)

4 کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ ہے۔

5 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جاہلیت وہ ہے جو عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہے۔[1]
(أخرجه ابن مردويه)

6 امام ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ تو مجھے خبر دے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی جو ازواجِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجٰهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى ﴾ کیا جاہلیت غیر واحدہ ہے، یعنی کئی ہیں کہ اولیٰ کہا ہے؟ تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں نے کوئی اولیٰ نہیں دیکھا مگر اس کے لیے آخرہ ہے۔ پس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: تو میرے پاس کتاب میں سے وہ شے لا جو اس کی تصدیق کرے تو انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ ﴾ [الحج: ٧٨] ''اور اللہ کی راہ میں ویسا ہی جہاد کرو، جیسے جہاد کا حق ہے، اسی نے تمھیں برگزیدہ بنایا ہے۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ کون ہیں جن سے جہاد کرنے کا ہم کو حکم ہوا؟ تو کہا کہ وہ مخزوم وعبد شمس ہیں۔[2]

7 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں ان سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ ایک جاہلیت اُخریٰ ہو گی۔[3]

8 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا کہ جاہلیتِ اولیٰ ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں تھی۔[4] امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ جس وقت میں ان کی ولادت ہوئی، (یعنی ابراہیم علیہ السلام کی) تو یہ حال تھا کہ عورت موتیوں کا کرتا پہنتی، راہ کے بیچ میں چلتی، اپنے نفس کو مردوں پر پیش کرتی ہوئی جاتی تھی۔[5] امام ابن العربی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ میں ہزار سے کچھ زیادہ بستیوں میں گیا، کہیں ایسی پارسا عورتیں نہیں دیکھیں، جیسی کہ نابلس میں ہیں۔ یہ وہ بستی ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے۔ میں اس بستی میں ٹھہرا، میں نے دن کو راہ میں کوئی عورت نہیں دیکھی مگر جمعے کے دن، وہ مسجد کی طرف آتیں، پھر مسجد اُن سے بھر جاتی، پھر جب نماز پوری ہو جاتی تو وہ دوسرے جمعے تک اپنے گھروں کو چلی جاتیں، ان میں سے کسی عورت پر میری آنکھ نہیں پڑی اور مسجدِ اقصیٰ میں مَیں نے پارسا عورتیں دیکھی ہیں کہ اپنی جائے اعتکاف سے نہ نکلیں، یہاں تک کہ اس میں شہید کی گئیں۔[6]

9 کسی نے کہا ہے کہ جاہلیتِ اولیٰ اسلام سے ماقبل تھی اور جاہلیتِ اخریٰ ایک قوم ہے کہ آخر زمانے میں ان کے سے افعال کریں گے۔

---

(1) فتح القدير (٤/ ٣٧١) (2) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦١۔ ٢٦٢) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٣١)
(3) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٣١) (4) الدر المنثور (٦/ ٦٠٢) (5) تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٨) (6) تفسير القرطبي (١٤/ ١٨٠)

10 یا جاہلیتِ اولیٰ جاہلیتِ کفر ہے اور اخریٰ جاہلیتِ فسوق وفجور ہے اسلام میں، اللہ پاک نے اس کا ذکر آیت ﴿ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ... الآية ﴾ [النور: ۳۱] میں فرمایا ہے۔

11 کسی نے کہا ہے کہ اولیٰ کو ذکر کرتے ہیں، گو اس کے لیے اُخریٰ نہ ہو۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: جاہلیتِ اولیٰ ایسی ہے، جیسے کہتے ہیں: جاہلیتِ جہلاء۔[1]

12 امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ زمانہ داود اور سلیمان علیہما السلام کا ہے،[2] اس میں عورت موتیوں کا کرتا پہنتی، جس کی دونوں جانبیں سلی ہوئی نہیں ہوتی تھیں اور جس شے کا ظاہر کرنا قبیح ہے عورتیں اس کو ظاہر کرتی تھیں، یہاں تک کہ عورت اپنے خاوند اور یار کے ساتھ بیٹھتی تھی تو اس کا یار ما فوق الازار کے ساتھ منفرد ہوتا اور اس کا خاوند ما دون الازار کے ساتھ نیچے تک اور کبھی ایک دوسرے سے اس کو تبدیل کر لیتا تھا۔

13 امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، جو امر مجھے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس جاہلیت کی طرف اشارہ کیا ہے جو اُن کو لاحق ہوئی اور اس کو انھوں نے پایا، اسی لیے ان کو حکم دیا کہ جس سیرت میں وہ تھیں، اس سے نقل کریں، یعنی اس کو چھوڑ کر دوسری سیرت اختیار کریں، یہ وہی کافروں کی سیرت ہے جو شرع سے پہلے تھی کہ ان کے نزدیک کسی طرح کی غیرت نہ تھی۔ عورتیں بے پردہ رہتی تھیں اور اس جاہلیت کو اولیٰ قرار دیا بہ نسبت اس حال کے جس پر وہ تھیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں کوئی جاہلیتِ اخریٰ بھی ہے۔[3] کذا قال۔ یہ قول حسن ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جاہلیتِ اُخریٰ سے مراد وہ مشابہت ہو جو اسلام میں جاہلیت کے قول وفعل میں واقع ہوگی۔ چنانچہ معنی یہ ہوں گے کہ اے مسلمان عورتو! تم اپنے اسلام کے بعد ویسا تبرج نہ کرو جس پر تم تھیں، بلکہ تم سے پہلے کی عورتیں تھیں، یعنی تم اپنے افعال واقوال سے کوئی نئی جاہلیت مت نکالو، جو اگلی جاہلیت کے مشابہ ہو۔

پھر اللہ پاک نے صلاتِ واجبہ اور زکاتِ مفروضہ کے ادا کرنے کا حکم دیا۔ ان دونوں کے خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ طاعاتِ بدنیہ و مالیہ کی اصل ہیں اور اس لیے کہ جو کوئی ان دو پر محافظت و مداومت کرتا ہے تو یہ اپنے سوا اور عبادتوں کی طرف اس کو کھینچ لے جاتی ہیں۔ پھر عموماً اللہ اور رسول کی اطاعت کا امر فرمایا ہر امر ونہی میں۔

قولہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ... الآية ﴾ کا یہ مطلب کہ اللہ تعالیٰ نے جو تم کو تقوے کی وصیت کی ہے اور اس بات کی کہ بات دب کر نہ کی جائے اور قول معروف کہا جائے اور گھروں میں قرار پکڑا جائے اور تبرج نہ کیا جائے اور نماز و زکات ادا کی جائے اور شریعت کے احکام مانے جائیں اور ممنوعہ چیزوں سے باز رہا جائے تو اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے رجس (ناپاکی) کو دور کر دے۔ رجس سے مراد اثم اور ذنب (گناہ) ہیں جو آبرو کو میلا کرتے ہیں اور اللہ پاک کے امر کو ترک کر دینے اور ممنوعہ چیزوں کو کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس شے میں اللہ پاک کی رضا

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٩) [2] تفسير البغوي (٦/ ٣٤٩) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ١٧٩)

اور خوشی نہیں ہے، وہ سب اس میں داخل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ رجس شک ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سُوء ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عملِ شیطان۔ اس کو عام رکھنا زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ کا نصب مدح کی بنا پر ہے، جیسا کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ کہا اور اگر تو چاہے تو بنا بر بدل۔ کہا اور رفع اور خفض بھی جائز ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خفض بنا بر بدل ہے کاف اور میم سے۔ اس پر امام مبرد رحمہ اللہ نے یہ اعتراض کیا کہ مخاطب سے بدل جائز نہیں ہے،[1] یا اس کا نصب بنا بر ندا ہے۔ ﴿ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴾ یعنی اور پاک کرے تم کو گندگی و میل کچیل سے پوری طرح پاک کرنا۔ رجس کا تو معصیت کے لیے استعارہ کیا اور تطہیر کے لفظ کے ساتھ اس کی ترشیح فرمائی، چنانچہ اس میں معصیت سے موثر طریقے سے نفرت دلائی گئی ہے اور اس کے کرنے والے کو سخت ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ اہلِ بیت کا جو اس آیتِ کریمہ میں ذکر ہے، ان میں اختلاف ہے۔

① سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، عطاء، کلبی، مقاتل اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ اہلِ بیت جن کا اس آیت میں ذکر ہے خاصتاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات ہیں۔ کہا: بیت سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر ہے اور آپ کی بیویوں کے مساکن۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ ﴾۔ دوسری یہ وجہ ہے کہ آیت کا سیاق ﴿ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ ﴾ سے لے کر ﴿ لَطِيفًا خَبِيرًا ﴾ تک زوجات کے حق میں ہے۔

② سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا اور کلبی سے بھی مروی ہے کہ اہلِ بیت جو اس آیت میں مذکور ہیں، وہ خاصتاً سیدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ہیں، ان کی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آیت میں اس شے کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے جو مذکر اور مونث دونوں کے لیے صلاحیت رکھتی ہے، یعنی "عَنْكُمْ" اور "لِيُطَهِّرَكُمْ" اور اگر خطاب خاص طور پر عورتوں کو ہوتا تو "عَنْكُنَّ" اور "لِيُطَهِّرَكُنَّ" فرماتا۔

پہلے لوگوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ تذکیر لفظ ﴿ اَهْلَ ﴾ کے اعتبار سے ہے جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ [هود: ٧٣] "کیا تو اللہ کی قدرت سے تعجب کر رہی ہے؟ تم پر اے اس گھر کے لوگو! اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔" اور جس طرح کہ آدمی محاورے میں اپنے دوست سے کہتا ہے: "كَيْفَ أَهْلُكَ؟" مراد اس کی بیوی ہوتی ہے یا اس کی بیبیاں تو اس کے جواب میں کہتا ہے: "هُمْ بِخَيْرٍ" یعنی وہ اچھی ہیں۔[2] اب ہم ہر فریق کے دلائل ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ اس نے تمسک کیا ہے۔ سو اول لوگوں کی تو یہ دلیلیں ہیں: ① سیاق کے ساتھ تمسک کیا ہے، کیوں کہ وہ زوجات کے بارے میں ہے۔ کما ذکرنا۔ ② سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول کہ خاصتاً ازواجِ مطہرات کے حق میں

① تفسير القرطبي (١٤/ ١٨١) ② فتح القدير (٤/ ٣٦٧)

نازل ہوئی ہے۔ ③ امام عکرمہ رحمہ اللہ کا اس پر مباہلہ کرنے کے لیے مستعد ہونا۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا چند طرق سے ان سے مروی ہے۔ یہ قول پہلے گزر چکے ہیں۔

فریقِ ثانی کے دلائل یہ ہیں: ① حدیث اُم سلمہ رضی اللہ عنہا جو چند طرق سے پہلے گزر چکی ہے۔ ② سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث۔ یہ بھی گزر چکی ہے۔ ③ عمر بن ابی سلمہ سے مروی حدیث جو ربیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ بھی گزر چکی ہے۔ ④ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث۔ ⑤ سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث۔ ⑥ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث۔ ⑦ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث۔ ⑧ سیدنا ابوالحمراء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث۔ یہ سب حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔[1] ⑨ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ نے مخلوق کو دو قسم کا بنایا تو مجھ کو ان میں سے بہتر قسم میں ٹھہرایا۔ پس یہ اللہ پاک کا وہ قول ہے جو سورۃ الواقعہ میں ہے: ”و أصحاب الیمین و أصحاب الشمال“ سو میں اصحابِ یمین سے ہوں اور اصحابِ یمین کا بہتر ہوں، پھر اس نے دو قسموں کو اثلاث کیا تو مجھ کو ان کے بہتر ثلث میں ٹھہرایا۔

وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴾، ﴿ وَاَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ﴾، ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾ سو میں سابقین سے ہوں اور میں سابقین میں سے بہتر ہوں، پھر اثلاث کو قبائل کیا تو مجھ کو ان کے بہترین قبیلے میں ٹھہرایا۔ وہ یہ قول ہے: ﴿ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣] ”اور تمھیں کنبے اور قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے“۔ اور میں آدم کی اولاد کا متقی تر اور ان کا اکرم ہوں اللہ کے نزدیک اور کوئی فخر نہیں ہے۔ پھر قبائل کو بیوت کیا تو مجھ کو ان کے بہترین گھر میں کیا۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ... الآیة ﴾ پس میں اور میرے اہلِ بیت ذنوب سے مطہر ہیں۔[2] (أخرجه الحکیم الترمذي والطبراني و ابن مردویه والبیهقي في الدلائل) اس بارے میں اور احادیث اور آثار ہیں، ہم نے یہاں وہی ذکر کیے ہیں جو تمسک کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ کہ وہ جو اس کے قابل نہیں ہیں۔

ایک تیسری جماعت دونوں طریقین کے درمیان متوسط ہوئی تو اس نے اس آیت میں زوجات کو شامل ٹھہرایا اور سیدنا علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کو شامل کیا۔ زوجات تو اس لیے شامل ہیں کہ ان آیتوں سے سیاق میں وہ مراد ہیں، جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے اور اس لیے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں قیام پذیر ہیں اور آپ کی منازل میں

---

① ان تمام کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

② المعجم الکبیر (۳/ ۵٦) الدر المنثور (٦/ ٦٠۵۔ ٦٠٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”فیه یحیی بن عبدالحمید الحماني وعبایة ابن ربعي وکلاهما ضعیف“ (مجمع الزوائد: ۸/ ۳۹٦)

نازل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے جو بات مروی ہے وہ اس کی تائید کرتی ہے۔

رہا سیدنا علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کا داخل ہونا تو اس لیے ہے کہ یہ لوگ آپ کی قرابت ہیں اور نسب میں آپ کے اہلِ بیت ہیں، اس کی تائید وہ حدیثیں کرتی ہیں جو اس بات کی تصریح کر رہی ہیں کہ آیت کا سببِ نزول یہی بابرکت ہستیاں ہیں۔ لہٰذا جس کسی نے آیت کو ان دو فریقوں میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص ٹھہرایا تو اس نے ایسا عمل کیا جو جائز نہیں اور ایسا اہمال (دیر لگانا) کیا جو صحیح نہیں تھا۔ محققین کی ایک جماعت نے اس قول کو ترجیح دی ہے ان میں سے امام قرطبی اور ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہما ہیں۔ ایک جماعت نے کہا کہ یہ لوگ بنی ہاشم ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا قول جو پہلے گزر چکا ہے،[1] اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ آپ کی آل وہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدقے سے محروم ہیں، یعنی آلِ علی، آلِ عقیل، آلِ جعفر اور آلِ عباس۔ چنانچہ یہ لوگ اس طرف گئے ہیں کہ بیت سے مراد بیتِ نسب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ﴾۔ یعنی تم یاد کرو موضع نعمت کو اس لیے کہ تم کو ایسے گھروں میں رکھا ہے جن میں اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں۔ یا آیتوں کو یاد کرو اور ان میں غور وفکر کرو، تاکہ ان سے نصیحت پذیر ہوؤ۔ یا لوگوں سے ان کا ذکر کرو تاکہ وہ ان سے نصیحت پذیر ہوں اور ان کی ہدایت سے راہ یاب ہوں۔ یا تلاوت کے ساتھ ان کا ذکر کرو، تاکہ ان کو حفظ کرو اور کثرت سے تلاوت کرنے کو ترک مت کرو۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ تاویل نے کہا ہے کہ آیات اللہ سے مراد قرآن شریف ہے اور حکمت سے مراد سنت ہے۔[2] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیات وحکمت سے اللہ پاک کا امر ونہی مراد ہے جو قرآن میں ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ قرآن ان دو باتوں کو جمع کرتا ہے: ایک تو آیاتِ بینات جو توحید اور صدقِ نبوت پر دال ہیں، دوسرا حکمت جو علوم اور شریعت کی مختلف قسموں اور شاخوں پر مشتمل ہے۔ ابن سعد نے سیدنا ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیبیوں کے گھروں میں نوافل پڑھا کرتے تھے رات کو اور دن میں۔[4]

﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴾ بے شک اللہ پاک اپنے دوستوں سے بڑا لطف کرنے والا ہے اور اپنی ساری مخلوق کی خوب خبر رکھنے والا ہے اور جو کچھ خیر وشر اور اطاعت ومعصیت ان سے صادر ہوتی ہے، اس سب سے خوب واقف ہے۔ نیکی کرنے والے کو اس کی نیکی کی جزا اور برائی کرنے والے کو اس کی برائی کی سزا پوری دے گا۔

---

1. اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
2. تفسير القرطبي (١٤/ ١٨٢)
3. فتح القدير (٤/ ٣٧٠)
4. الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٨/ ١٩٩)

نکتہ:

﴿ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾ فرمایا۔ "مَا يُنَزَّلُ" نہ کہا، باوجود اس کے کہ نزول زیادہ مناسب ہے، کیوں کہ ان کے گھر نزولِ وحی کی جگہ ہیں، چنانچہ اس سے غرض تلاوت کا عموم ہے ساری آیتوں کو اور وقوع آیتوں کو کل گھروں میں اور تکرر آیتوں کو جو موجب ہے ان کے متمکن ہونے کو ذکر و تذکیر سے بہ خلاف نزول کے۔ اور تلاوت کرنے والے کے معین نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تلاوت میں جبریل علیہ السلام کی تلاوت بھی اور نبی اکرم ﷺ کی تلاوت اور ازواجِ مطہرات کی تلاوت اور ان کی علاوہ دوسروں کی تلاوت جو سیکھنے اور سکھانے کی غرض سے ہو، وہ سب شامل ہیں۔[1] (كذا في أبي السعود)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۳۵

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا بکثرت ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے (35)

بخشش اور اجرِ عظیم کے مستحق لوگوں کا بیان:

نبی کریم ﷺ کی ایک بی بی نے کہا تھا کہ قرآن میں سب ذکر مردوں کا ہے عورتوں کا کہیں نہیں، اس پر یہ آیت اتری، نیک عورتوں کی خاطر، ورنہ جو حکم مردوں کے لیے دیا وہی عورتوں کے لیے بھی ہے، ہر بار الگ کہنے کی حاجت نہیں۔ انتهى.

[1] تفسير أبي السعود (۷/ ۱۰۳) فتح البيان (۱۱/ ۸۰۔ ۹۰)

1 امام احمد رحمہ اللہ نے عبدالرحمٰن بن شیبہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا زوج النبی ﷺ کو سنا، وہ کہتی تھیں: میں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی: ہم کو کیا ہے کہ قرآن میں ہمارا ذکر نہیں کیا جاتا، جیسے کہ مرد ذکر کیے جاتے ہیں؟ کہا: پھر مجھے ایک دن آپ ﷺ کی طرف سے کسی شے نے نہیں گھبرایا، مگر منبر پر آپ کی ندا نے اور میں اپنے بال کھول رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے بال لپیٹ لیے۔ پھر میں اپنے گھر میں اپنے حجرے کی طرف نکلی تو میں نے اپنا کان جرید کے نزدیک رکھا، یعنی کھجور کی ٹہنیوں کی ٹٹی کے نزدیک رکھا تو دیکھا کہ آپ ﷺ منبر کے نزدیک یہ فرما رہے ہیں: اے لوگو! بے شک اللہ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ ... الآية ﴾[1]

(و هكذا رواه النسائي و ابن جرير من حديث عبد الواحد بن زياد به مثله)

2 طریقِ دیگر: نیز امام نسائی رحمہ اللہ نے ابوسلمہ سے روایت کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی: یا نبی اللہ! مجھے کیا ہے کہ میں سنتی ہوں کہ قرآن میں مردوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور عورتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ ... الآية ﴾[2]۔

3 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن عبدالرحمٰن بن حاطب عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مردوں کا ہر شے میں ذکر کیا جاتا ہے اور ہمارا ذکر نہیں کیا جاتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ ... الآية ﴾۔

4 طریقِ دیگر: امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن ابن ابی نجیح عن مجاہد روایت کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یا رسول اللہ! مرد ذکر کیے جاتے ہیں اور ہم ذکر نہیں کیے جاتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

5 حدیثِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عورتوں نے نبی ﷺ سے عرض کی: اسے کیا ہے کہ مومنین کا ذکر کرتا ہے اور مومنات کا ذکر نہیں کرتا، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

6 نیز امام قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ عورتیں نبی اکرم ﷺ کی بیبیوں کے پاس آئیں تو عرض کی کہ تمھارا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر کیا ہے اور ہم کسی شے کے ساتھ ذکر نہیں کیے گئے۔ کیا ہم میں وہ شے نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ ... الآية ﴾[3] چنانچہ اللہ پاک کا یہ قول کہ ﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾ اس پر دلیل ہے کہ ایمان اسلام کے علاوہ ہے اور وہ اسلام سے زیادہ خاص ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٤] ”دیہاتی لوگ

[1] مسند أحمد (٦/ ٣٠٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٣١) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٧٠)

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٣١) [3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٦٩ـ ٢٧٠)

کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجیے کہ درحقیقت تم ایمان نہیں لائے، لیکن تم یوں کہو کہ ہم اسلام لائے (مخالفت چھوڑ کر مطیع ہو گئے) حالاں کہ ابھی تک تمھارے دلوں میں ایمان داخل ہی نہیں ہوا۔'' صحیحین میں ہے کہ نہیں زنا کرتا زانی جب زنا کرتا ہے اور وہ مومن ہو۔[4] پس ایمان اس سے سلب کیا جاتا ہے اور اس سے باجماعِ مسلمین اس کا کفر لازم نہیں آتا، پس اس نے اس پر دلالت کی کہ ایمان اسلام سے زیادہ خاص ہے، جس طرح کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے شرح بخاری کے شروع میں اس کو ثابت کیا ہے۔

قنوت سکون میں طاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ أَمَّنْ هُوَ قَٰنِتٌ آنَاءَ ٱلَّيْلِ سَاجِدًا وَقَآئِمًا يَحْذَرُ ٱلْءَاخِرَةَ وَيَرْجُوا۟ رَحْمَةَ رَبِّهِۦ ﴾ [الزمر: ٩] ''بھلا جو شخص راتوں کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت میں (عبادت میں) گزارتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَهُۥ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ كُلٌّ لَّهُۥ قَٰنِتُونَ ﴾ [الروم: ٢٦] ''اور زمین و آسمان کی ہر ہر چیز اسی کی ملکیت ہے اور ہر ایک اس کے فرمان کے تحت ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَٰمَرْيَمُ ٱقْنُتِى لِرَبِّكِ وَٱسْجُدِى وَٱرْكَعِى مَعَ ٱلرَّٰكِعِينَ ﴾ [آل عمران: ٤٣] ''اے مریم! تو اپنے رب کی اطاعت کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقُومُوا۟ لِلَّهِ قَٰنِتِينَ ﴾ [البقرہ: ٢٣٨] ''اور اللہ تعالیٰ کے لیے با ادب کھڑے رہا کرو۔''

پس اسلام لانے کے بعد ایک اور مرتبہ ہے کہ اس پر چڑھا جاتا ہے وہ ایمان ہے، پھر ان دونوں سے قنوت پیدا ہونے والا ہے اور صدق اقوال میں ہوتا ہے، کیوں کہ صدق ایک محمود خصلت ہے اور اسی لیے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے تھے کہ ان پر کسی جھوٹی بات کا تجربہ نہیں کیا گیا، نہ تو جاہلیت میں اور نہ اسلام میں۔ صدق ایمان کی ایک نشانی ہے جس طرح کہ کذب (جھوٹ) نفاق کی ایک علامت ہے اور جس کسی نے سچ بولا، اس نے نجات پائی، تم لازم پکڑو صدق و راستی کو، کیوں کہ صدق نیکی کی طرف راہ بتاتا ہے اور نیکی راہ بتاتی ہے جنت کی طرف اور بچو تم جھوٹ سے، کیوں کہ جھوٹ فجور کی طرف راہ بتاتا ہے اور فجور آگ کی طرف راہ بتاتا ہے۔ ایک مرد ہمیشہ سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کا قصد کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک صدیق، یعنی بڑا سچ بولنے والا لکھا جاتا ہے۔ اور ایک مرد ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا قصد کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک کذاب، یعنی بڑا جھوٹا لکھا جاتا ہے۔ اس بارے میں بہت کثرت سے حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

صبر نتیجہ ہے ثبات (ثابت قدمی) کا، یہ صبر کرنا ہے مصائب پر اور اس بات کو جاننا ہے کہ جو شے مقدر ہو چکی ہے اس کا ہونا ضروری ہے اور مقدر سے صبر اور ثبات کے ساتھ پیش آنا ہے اور صبر وہی ہے جو پہلے صدمہ کے وقت ہوتا ہے، یعنی صعوبت اور صبر کا سخت تر مرحلہ دہلہ (ڈر، غم) کے شروع میں ہے، پھر اس کے بعد کا وقت اس سے سہل تر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧)

ہوتا ہے۔ صبر گویا طبیعت کو ثابت و قائم و راست و درست رکھنا ہے ایسے وقت میں جب کوئی ناپسندیدہ بات پیش آجائے۔ خشوع سے مراد سکون وطمانیت وتوؤدہ و وقار وتواضع وفروتنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف اس کا حامل اور باعث ہوتا ہے اور اس کا مراقبہ، یعنی خشوع اللہ پاک کے خوف سے اور اس کو اپنے اوپر نگہبان سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جب اس کو اپنے اوپر حاضر و ناظر ونگہبان سمجھے گا، تب کہیں اس سے فروتنی کرے گا۔ اس کے سامنے دبے گا۔

حدیث شریف میں اس کا بیان یوں آیا ہے کہ تو اللہ کی عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔[1] صدقہ ایسے حاجت مند اور کمزور لوگوں کے ساتھ احسان کرنا ہے، جن کے لیے نہ کوئی پیشہ ہے نہ کمائی، نہ کوئی کمانے والا، ایسے لوگوں کو اپنا فالتو مال اللہ کے لیے اطاعت سمجھ کر اور اس کی مخلوق پر احسان سمجھ کر دیں۔ صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ سات آدمی ہیں؛ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن کہ کوئی سایہ نہ ہوگا سوائے اس کے سائے کے۔ پھر ان میں سے ذکر کیا: اور وہ شخص جس نے کوئی صدقہ دیا، پھر اس کو چھپایا، یہاں تک کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں جانتا کہ اس کا سیدھا ہاتھ کیا خرچ کرتا ہے[2] («حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا يُنْفِقُ يَمِيْنُهُ» کلمۂ ''ما'' استفہامیہ ہے، موصولہ بھی بن سکتا ہے)۔ اور دوسری حدیث شریف میں آیا ہے کہ صدقہ خطیہ کو اس طرح بجھاتا ہے جس طرح کہ پانی آگ کو بجھاتا ہے۔[3] صدقے کی ترغیب میں حدیثیں بہت کثرت سے ہیں، ان کے لیے ایک مستقل جگہ ہے۔

روزہ:

جس حدیث شریف کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اس میں یہ ہے کہ روزہ بدن کی زکات ہے،[4] یعنی طبعی اور شرعی لحاظ سے جو غلط کام ہو جاتے ہیں، ان سے بدن کو صاف و پاک ومنقیٰ کرتا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کسی نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے اور ہر مہینے سے تین دن تو وہ اس آیت میں داخل ہوگیا: ﴿ وَالصّٰٓىِٕمِيْنَ وَالصّٰٓىِٕمٰتِ ﴾[5] چوں کہ روزہ شہوت کو توڑنے کے لیے بڑے مددگاروں میں سے ہے، جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اے نوجوانوں کے گروہ! جو کوئی تم میں سے باءت کی طاقت رکھے، یعنی نکاح کے خرچ کی یا نکاح کی قوت کی تو اسے چاہیے کہ شادی کرے، کیوں کہ نکاح نگاہ کو بڑا پست کرنے والا اور شرم گاہ کو بڑا محفوظ رکھنے والا ہے۔ اور جو کوئی طاقت نہ رکھے تو وہ روزہ رکھنا لازم کرے، کیوں کہ بے شک وہ اس کے لیے خصی کرنا ہے۔[6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣١)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٣٦)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٤٥) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الصحيحة، رقم: ١٣٢٩)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٣٣۔ ٣١٣٤) [6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٠)

تو مناسب ہوا کہ روزے کے بعد ﴿ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ﴾ کا ذکر کیا جائے، یعنی اور حفاظت میں رکھنے والے مرد اپنی شرم گاہوں کو اور حفاظت میں رکھنے والی عورتیں محارم و مآثم سے مگر مباح سے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴾ [المومنون: ٥۔ ٧] ''جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں اور ملکیت کی لونڈیوں کے یقیناً یہ ملامتیوں میں سے نہیں ہیں جو اس کے سوا کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کر جانے والے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ﴾

① امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس وقت مرد اپنی بی بی کو رات کے وقت جگائے، پھر وہ دو رکعت نماز پڑھیں تو وہ دونوں اس رات میں ﴿ اَلذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ﴾ میں سے ہوں گے۔[1] (وقد رواه أبو داود و النسائي و ابن ماجه من حديث الأعمش عن الأغر أبي مسلم عن أبي سعيد رضی اللہ عنہ و أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم بمثله)

② سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! کون سے بندے اللہ کے نزدیک درجے میں افضل ہیں قیامت کے دن؟ تو فرمایا کہ اللہ کو بہت سا یاد کرنے والے۔ میں نے کہا: اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا؟ تو فرمایا کہ اگر وہ اپنی تلوار سے کافروں اور مشرکوں کو مارے، یہاں تک کہ وہ ٹوٹ جائے اور وہ خون میں رنگ جائے تو بھی اللہ کو یاد کرنے والے اس سے افضل ہوں گے۔[2]

③ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے کی راہ میں جا رہے تھے، پھر آپ جُمدان آئے، جو مدینہ منورہ سے ایک رات کی راہ پر ایک پہاڑ ہے، تو فرمایا: یہ جمدان ہے، چلو « فَقَدْ سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ » ''یقیناً سبقت کر گئے مفردون''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ''مفردون'' کیا ہے؟ فرمایا: اللہ کا بہت سا ذکر کرنے والے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! بخش دے سر منڈانے والوں کو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اور بال کترانے والوں کو؟ فرمایا: اے اللہ! مغفرت کر سر منڈانے والوں کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اور بال کترانے والوں کی۔ فرمایا: اور بال کترانے والوں کی۔[3] (تفرد به من هذا الوجه ورواه مسلم دون آخره)

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٥١) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣٥) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٣٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣٣)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٦) مسند أحمد (٣/ ٧٥) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم اور ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٧٠٢٦)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٦) مسند أحمد (٢/ ٤١١)

④ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی آدمی نے کبھی کوئی عمل ایسا نہیں کیا جو اللہ عزوجل کے ذکر سے زیادہ اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے والا ہو۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کیا تم کو میں تمھارے بہترین اعمال کی خبر نہ دوں، وہ اعمال جو تمھارے ملیک (اللہ) کے نزدیک سب سے زیادہ پاک ہیں اور جو تمھارے درجوں میں سب سے زیادہ بلند ہیں اور تمھارے لیے سونے چاندی کے لین دین سے بہتر ہیں اور اس سے بھی بہتر ہیں کہ تم اپنے دشمن سے جہاد کرو، پھر تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمھاری گردنیں ماریں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: اللہ عزوجل کا ذکر۔[1]

⑤ امام احمد رحمہ اللہ نے سہل بن معاذ بن انس جہنی عن ابیہ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! مجاہدین میں سے سب سے بہتر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: «أَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ تَعَالٰى ذِكْرًا» یعنی وہ ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ کا ذکر کرنے والا ہے۔ کہا: پھر کون روزہ داروں میں سے زیادہ اجر پانے والا ہے؟ فرمایا: «أَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ ذِكْرًا» ۔ پھر نماز، زکات، حج اور صدقہ کا ذکر کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک کے بارے میں فرماتے تھے: «أَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ تَعَالٰى ذِكْرًا»۔ پس سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ذاکرین ہر خیر کو لے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔[2] کثرتِ ذکر کے متعلق جو باقی حدیثیں ہیں، ان کو ہم ۔ان شاء اللہ۔ اسی سورت میں ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ... الآية﴾ [الأحزاب: ٤١] کی تفسیر کرتے وقت ذکر کریں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ ان سب لوگوں کی خبر ہے جن کا ذکر ہوا، یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کے لیے جن کا ذکر ہوا اپنی طرف سے ان کے گناہوں کی بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے، یعنی بہشت عنبر سرشت۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ اللہ پاک نے اسلام کے ذکر سے ابتدا کی جو صرف دین میں داخل ہونا ہے اور عمل کے ساتھ دین کے لیے مطیع اور فرماں بردار ہونا ہے، جس طرح کہ صحیح حدیث میں ثابت ہوا ہے کہ جب

① مسند أحمد (٥/ ٢٣٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ''زیادہ بن ابی زیاد'' نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ (مجمع الزوائد: ١٠/٦٩)

② مسند أحمد (٣/ ٤٣٨) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ٢٢٨)

③ تفسير ابن كثير (٣/ ٦٣٧_ ٦٤٠)

جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ سے اسلام کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ یہ ہے کہ گواہی دے تو اس بات کی کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور قائم کرے تو نماز اور دے تو زکات اور حج کرے بیت اللہ کا اور روزے رکھے تو رمضان کے۔[1]

پھر مسلمین پر مسلمات کا عطف کیا ان کے ذکر کے شرف کے لیے اور اسی طرح بعد میں بھی کیا گیا ہے، اگرچہ وہ سب مسلمین اور مومنین کے الفاظ میں شامل ہیں اور تذکیر جو ہوتی ہے، تو ذکور (مردوں) کی اناث (عورتوں) پر تغلیب (فوقیت) کے لیے چنانچہ کتاب عزیز میں جو اس بارے میں وارد ہوا ہے، وہ سب ایسا ہی ہے۔ پھر مومنین اور مومنات کا ذکر کیا، مومن وہ ہے جو اللہ پر اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر اور تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لاتا ہے، چنانچہ یہ امر صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو چکا ہے۔[2] قانت وہ ہے جو اللہ پاک کا مطیع اور عابد ہے اور اسی طرح قانتہ۔ کسی نے کہا ہے کہ "قانتین" وہ ہیں جو عبادت اور اطاعت پر مداومت (ہمیشگی) کرنے والے ہیں۔ صادقین اور صادقات وہ ہیں جو سچ بولتے ہیں اور جھوٹ سے پرہیز کرتے ہیں اور جس بات پر عہد کیا گیا ہے اس کو پورا کرتے ہیں۔

صابرین اور صابرات وہ ہیں جو اپنی جانوں کو شہوات سے روکتے ہیں اور سختیوں اور تکالیف پر ثابت قدم اور قائم رہتے ہیں۔ خاشعین و خاشعات وہ ہیں جو اللہ کے لیے تواضع اور فروتنی کرتے ہیں، اس سے خائف رہتے ہیں، اپنی عبادتوں میں اللہ کے لیے عاجزی اور خضوع وخشوع کرتے ہیں۔ متصدقین ومتصدقات وہ ہیں جو اپنے مالوں سے وہ شے خیرات کرتے ہیں جس کو اللہ نے ان پر واجب کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ فرضی اور نفلی صدقہ سے عام ہے۔ صائمین و صائمات وہ ہیں جو فرض روزے رکھتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بھی فرض اور نفل سے عام تر ہے۔ حافظین فروج و حافظات وہ ہیں جو پاک دامنی اور تنزہ (عیب سے دور رہنا) اور پارسائی کرکے اور حلال پر اکتفا کرکے اپنی شرم گاہوں کو حرام سے روکتے ہیں۔

﴿ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ﴾ وہ ہیں جو اپنے سارے احوال میں اللہ پاک کا ذکر کرتے ہیں۔ کثرت کا جو یہاں ذکر کیا اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ دل اور زبان سے کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنا مشروع ہے اور مطلوبِ شرعی ہے۔ چوں کہ ﴿ اَلْحٰفِظِيْنَ ﴾ میں ﴿ فُرُوْجَهُمْ ﴾ کا ذکر کیا ہے، اس لیے اس پر اکتفا کرکے حافظات میں نہ کیا اور اسی طرح ذاکرات میں بھی۔ تقدیر یہ ہے: "وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ فُرُوْجَهُنَّ وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرَاتِ اللّٰهَ كَثِيْرًا"۔ اکتفا بلاغت کی ایک قسم ہے قرآن شریف میں بہت جگہ اس کا استعمال کیا گیا ہے اور کیوں نہ کیا جائے قرآن پاک تو سب سے بلیغ نظام اس میں بلاغت کی تمام

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨)

قسمیں جمع ہیں، بلکہ علمائے بلاغت نے جس قدر بلاغت کی قسمیں نکالی ہیں وہ سب قرآن شریف کی بلاغت کے مقابلے میں سمندر کا ایک قطرہ یا خشکی کا ایک ذرہ سمجھنا چاہیے۔ کلامِ پاک کی بلاغت کو تو اس کلام کا کہنے والا ہی خوب جانتا ہے، یا وہ مخاطب جس پر وہ کلام نازل ہوا ہے اسے صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے، یعنی نبی اکرم ﷺ، ان کے بعد ازواجِ مطہرات جن کے گھر میں نازل ہوا، پھر اہلِ بیتِ نبوت جو نبی اکرم ﷺ کے جگر گوشے اور اس خانۂ فیض کاشانہ کے روشن چراغ ہیں۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو رات دن کے ہم نشیں اور ادا شناس ہیں۔ پھر تابعین و تبع تابعین وائمہ مجتہدین۔ پھر اولیاء و صالحین۔ پھر مومنین صالحین۔ علی قدر المراتب رحمهم الله عنهم أجمعين۔ ؎

کلام پاک کی خوبی وہی سمجھتا ہے جو حوضِ کوثر تقویٰ سے پانی پیتا ہے

اللهم اجعلنا ممن ائتمر بأمرك العظيم، و اتقوا الله و يعلمكم الله، اللهم صل و سلم و بارك عليه و على آله الطاهرين و صحبه الميامين إلى يوم الدين ملء ما علمت و زنة ما علمت و عدد ما علمت آمين آمين آمين يا الله يا الله يا الله، يا رب يا رب يا رب، يا رحمن يا رحمن يا رحمن، يا رحيم يا رحيم يا رحيم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ خبر ہے ما تقدم کی، یعنی یہ لوگ جن کا ذکر ہوا اللہ نے ان کے لیے ان کے گناہوں کی، جو انھوں نے کیے ہیں، مغفرت تیار کر رکھی ہے، یعنی اسلام و ایمان وقنوت وصدق وصبر وخشوع وتصدق وصوم وعفاف و ذکر اللہ۔ اجر کو عظیم اس لیے کہا، تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کی عظمت انتہا درجے کو پہنچی ہوئی ہے، کوئی شے اس اجر سے بڑی نہیں ہے، جو جنت اور اس کی دائمی نعمتیں ہیں، جن کو انقطاع و نفاد کی ہوا تک نہیں لگی، یعنی وہ منقطع اور ختم ہونے والی نہیں ہے، بلکہ جس شے کی صفت دائم اور خالد کے الفاظ کے ساتھ کی جاتی ہے، وہ یہی روضۂ رضوان ہے جو رضائے رحمان کا مقام ہے۔ اللهم اغفر ذنوبنا و أعظم أجورنا آمين.

آیت کی شانِ نزول کی کئی حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں، ایک یہ جدید ہے کہ ام عمارہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت شریف میں حاضر ہوئیں تو عرض کی کہ میں ہر شے کو مردوں کے لیے دیکھتی ہوں اور عورتوں کو نہیں دیکھتی کہ کسی شے کے ساتھ ان کا ذکر کیا جائے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] (أخرجه عبد بن حميد والترمذي و حسنه والطبراني) اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو قول گزر چکا ہے، فتحین میں اس کے آخر میں یوں کہا ہے۔[2] (أخرجه الطبراني وابن جرير وابن مردويه بإسناد، قال السيوطي: حسن)

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢١١) المعجم الكبير (٢٥/ ٣١)

[2] الدر المنثور (٦/ ٦٠٨) فتح القدير (٤/ ٣٧٣) فتح البيان (١١/ ٩٠۔ ٩١)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝۳۶

اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اپنے معاملے میں ان کا کوئی اختیار (باقی) رہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ یقیناً کھلم کھلا گمراہ ہو گیا (36)

اللہ اور اس کے رسول کے فیصلوں کو رد کرنا واضح گمراہی کا باعث ہے:

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اللہ کے رسول کی پھوپھی کی بیٹی اور قوم کے اشراف میں سے تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ان کا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر دیں اور یہ زید اصل میں عرب تھے، لڑکپن میں کوئی ظالم پکڑ کر لے گیا، شہر مکہ میں آ کر بکے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید لیا، دس برس کی عمر میں ان کے باپ بھائی خبر پا کر مانگنے کے لیے آئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے، مگر زید رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے گھر جانے پر راضی نہ ہوئے۔ پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیٹا بنا لیا اسلام سے پہلے اس وقت کے رواج کے مطابق۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا اور ان کا بھائی راضی نہ ہوئے، اس پر یہ آیت اتری۔ پھر راضی ہو گئے اور ان کا نکاح کر دیا۔ انتہیٰ۔

امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے اپنے جوان زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا پیغامِ نکاح لے کر۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زینب بنت جحش اسدیہ رضی اللہ عنہا پر داخل ہوئے تو ان کو پیغام دیا، وہ بولیں کہ میں اس سے نکاح کرنے والی نہیں ہوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں تو اس سے نکاح کر لے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے جی میں مشورہ کروں گی، پھر اسی اثنا میں کہ دونوں بات چیت کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ بی بی زینب رضی اللہ عنہا بولیں: اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہ کروں گی، میں نے اپنے نفس کا اس سے نکاح کر دیا۔

(1) امام ابن لہیعہ نے عن ابی عمرہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش کو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے لیے نکاح کا پیغام دیا تو بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے ان سے ننگ کیا، یعنی عار کیا اور کہا: میں حسب میں اس سے بہتر ہوں۔ یہ ایک ایسی بی بی تھیں جن میں تیزی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ ... الآیۃ﴾ پوری آیت نازل فرمائی۔ اسی طرح امام مجاہد، قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ

یہ آیت زینب بن جحش کے حق میں نازل ہوئی، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے مولیٰ (غلام) زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے لیے نکاح کا پیغام دیا، جو انھوں نے نہ مانا۔ پھر اس آیت کے نزول کے بعد مان لیا۔

2 عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت اُم کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ عورتوں میں پہلے پہل انھوں نے ہجرت کی تھی، یعنی صلح حدیبیہ کے بعد تو انھوں نے اپنا نفس نبی کریم ﷺ کو ہبہ کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے قبول کیا۔ پھر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کر دیا، یعنی ۔واللہ أعلم۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے زینب رضی اللہ عنہا سے علاحدہ ہونے کے بعد، پھر ام کلثوم اور ان کے بھائی خفا ہوئے اور بولے کہ ہم نے تو رسول اللہ ﷺ کا ارادہ کیا تھا، مگر انھوں نے ہم کو اپنے غلام سے بیاہ دیا، کہا: اس پر قرآن نازل ہوا: ﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ ... الآية ﴾ اور کہا کہ پھر اس سے بھی جامع تر امر آیا، یعنی ﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ کہا: پس وہ تو خاص ہے اور یہ اجمع ہے۔[1]

3 امام احمد رحمہ اللہ نے عن ثابت البنانی عن انس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک انصاری عورت کے لیے اس کے باپ کو جلیبیب کا پیغامِ نکاح دیا تو وہ بولا کہ میں اس کی ماں سے مشورہ کر لوں، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اچھا ابھی مشورہ کر لو۔ کہا: پھر وہ مرد اپنی بیوی کی طرف گیا اور اس سے اس کا ذکر کیا، تو وہ بولی: ”لَاهَا اللّٰهِ إِذًا، مَا وَجَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِلَّا جُلَيْبِيبًا“، یعنی اللہ کی قسم! اب تو نہیں، کیا رسول اللہ ﷺ نے جلیبیب ہی کو پایا، حالاں کہ ہم تو اپنی لڑکی کے لیے فلاں فلاں کو انکار کر چکے ہیں؟! کہا: اور وہ لڑکی اپنے پردے میں یہ باتیں سن رہی تھی۔ کہا: پھر وہ آدمی واپس جانا چاہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر دے کہ وہ لڑکی بولی: کیا تم چاہتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کو ان پر رد کر دو، یعنی اس کو نہ مانو، اگر وہ اس کو تمھارے لیے پسند کر چکے ہیں تو تم اس سے نکاح کر دو، کہا: ”فَكَأَنَّهَا جَلَّتْ عَنْ أَبَوَيْهَا“ (یعنی گویا وہ اپنے ماں باپ سے جلیل و مسن ہوگئی کہ اس نے وہ بات کہی جو اس کے ماں باپ کو نہ سوجھی یا یہ معنی ہیں کہ جو بات اس کے ماں باپ کی سمجھ میں نہ آئی تھی وہ اس نے کھول کر بیان کر دی اور اپنے ماں باپ کو رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی سے بچا لیا)۔ اور دونوں بولے کہ اس نے سچ کہا۔ پھر اس کا باپ رسول اللہ ﷺ کی طرف گیا اور عرض کی کہ آپ اس کو پسند فرما چکے ہیں تو ہم نے بھی یقیناً اس کو پسند کیا۔ کہا: پھر اس کا نکاح کر دیا۔ پھر مدینے والے گھبرائے، یعنی کوئی دشمن چڑھائی کر آیا تو جلیبیب سوار ہوا، پھر اس کو پایا تو مارا گیا تھا اور اس کے گرد مشرکوں میں سے کئی لوگ تھے کہ اس نے ان کو قتل کیا تھا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر البتہ مقرر میں نے اس کو دیکھا، اس حال میں کہ وہ مدینے میں زیادہ خرچ کرنے والے گھر میں سے تھے، یعنی بڑے خراچ تھے، خوب خرچ کرتے

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٧١_ ٢٧٢)

تھے، مدینے میں اس سے بڑھ کر خرچ کرنے والا کوئی اور گھر نہ تھا۔[1] حاصل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا حکم ماننے سے ان کے گھر میں بڑی برکت ہوئی۔

(4) امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جلیبیب ایک شخص تھا جو عورتوں پر داخل ہوتا، ان کو نرم کرتا، ان سے ملاعبہ کرتا تھا تو میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو ہرگز جلیبیب کو اپنے گھر میں داخل نہ کرنا، چنانچہ بے شک اگر وہ تم پر داخل ہوگا تو میں یہ کروں گا اور وہ کروں گا، یعنی وعید سنائی اور ڈانٹا دھمکایا، کہا: اور انصار کی عادت تھی کہ جب کسی کی کوئی عزیزہ رنڈی ہو جاتی تو وہ اس کو اس وقت تک بیاہتا نہیں تھا، جب تک یہ بات معلوم نہ کرے کہ نبی اکرم ﷺ کو اس میں کوئی حاجت ہے یا نہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے انصار کے ایک شخص سے کہا کہ تو مجھے اپنی بیٹی بیاہ دے تو اس نے عرض کی: "نَعَمْ وَكَرَامَةٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَنُعْمَةُ عَيْنٍ" یعنی ہاں میں نے آپ کا فرمانا سنا اور مانا اور میں آپ کے فرمانے کا اکرام کروں گا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس کو اپنے لیے نہیں چاہتا ہوں، تو انصاری بولا: پھر کس کے لیے یا رسول اللہ؟! فرمایا کہ جلیبیب کے لیے تو اس نے عرض کی: یارسول اللہ! میں اس کی ماں سے مشورہ کرلوں۔ پھر وہ اس کی ماں کے پاس آیا تو کہا کہ رسول اللہ ﷺ تیری بیٹی کے لیے نکاح کا پیام دیتے ہیں تو وہ بولی: "نَعَمْ وَنُعْمَةُ عَيْنٍ" پھر اس نے کہا کہ وہ اپنے لیے اس کا پیغام نہیں دیتے وہ تو جلیبیب کے لیے اس کا پیغام فرماتے ہیں تو وہ بولی: "أَجُلَيْبِيْبٌ أَئِنَهْ أَجُلَيْبِيْبٌ أَئِنَهْ أَجُلَيْبِيْبٌ أَئِنَهْ أَلَا لَعَمْرُ اللّٰهِ لَا نُزَوِّجُهُ" یعنی کیا جلیبیب! کیا وہ ایسا ہے کہ ہم اسے بیٹی دیں۔ رسول اللہ ﷺ جلیبیب کے لیے پیام کرتے ہیں، کیا وہ ایسا ہے، نہیں البتہ قسم ہے اللہ کی! ہم تو اپنی بیٹی اس کو نہ بیاہیں گے۔ ("أَئِنَهْ" میں ہمزۂ استفہام کا ہے اور "إِنَّه" بہ معنی "كَذٰلِكَ" ہے یا "إِنَّ" بہ معنی نعم ہے اور حرفِ ہا سکتہ کا ہے)

پھر جب انصاری نے چاہا کہ کھڑا ہو، تاکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور لڑکی کی ماں نے جو کہا اس کے بارے میں آپ ﷺ کو خبر دے تو وہ لڑکی بولی کہ میرا پیام تم سے کس نے کیا ہے؟ اس کی ماں نے اس کو بتا دیا، وہ بولی: کیا تم رسول اللہ ﷺ کے امر کو رد کرتی ہو، تم تو مجھے ان کو دے دو، کیوں کہ وہ مجھے ہرگز ضائع نہ کریں گے، چنانچہ اس کا باپ رسول اللہ ﷺ کی طرف گیا۔ پھر عرض کی: "شَأْنَكَ بِهَا" یعنی آپ کو اس کا اختیار ہے، جو چاہیں کریں۔ پھر آپ ﷺ نے جلیبیب سے اس کا نکاح کر دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ اپنے کسی غزوے میں نکلے تو جس وقت اللہ نے آپ کے ہاتھ لگایا، یعنی آپ کو فتح دی تو آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کیا تم اپنے میں سے کسی کو گم پاتے ہو؟ انھوں نے عرض کی: ہم فلاں کو اور فلاں کو گم پاتے ہیں، فرمایا: نظر کرو۔ آیا گم پاتے ہو کسی کو؟ عرض کی: نہیں، فرمایا:

---

[1] مسند أحمد (٣/ ١٣٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٩/ ٦١٥)

لیکن میں جلیبیب کو گم پاتا ہوں، فرمایا کہ اس کو مقتولوں میں تلاش کرو، پھر اس کو تلاش کیا تو اسے سات آدمیوں کے پہلو میں پایا، ان کو اس نے قتل کیا تھا۔ پھر انھوں نے اس کو مار ڈالا۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ خبردار رہیں، وہ یہ ہے کہ سات آدمیوں کے پاس پڑا ہے جن کو اس نے قتل کیا ہے۔ پھر انھوں نے اس کو مار ڈالا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لائے تو اس پر کھڑے رہے۔ پھر فرمایا کہ اس نے سات کو مار ڈالا اور انھوں نے اس کو قتل کیا، یہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں، یہ کلمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو یا تین بار فرمایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی دونوں کلائیوں پر رکھا اور اس کے لیے قبر کھودی، اس کے لیے کوئی پلنگ نہ تھا، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کلائیاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبر میں رکھا (اور یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ اس کو غسل دیا) رضی اللہ عنہ۔

سیدنا ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر انصار میں کوئی رانڈ عورت ایسی نہ تھی کہ اس سے بڑھ کر خرچ کرنے والی ہو۔ اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ نے ثابت کو حدیث کی، آیا تو جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے کیا دعا کی؟ پھر کہا کہ یوں فرمایا: «اَللّٰهُمَّ صُبَّ عَلَيْهَا صَبًّا وَّاجْعَلْ عَيْشَهَا كَذَا وَكَذَا» یعنی الٰہی! ڈال اس پر ڈالنا اور اس کی گزران ایسی ایسی کر، مطلب یہ ہے کہ اسے فراخیِ رزق کی دعا دی۔ کہا: پھر انصار میں کوئی بیوہ ایسی نہیں تھی جو اس سے بڑھ کر خرچ کرنے والی ہو۔[1] (هكذا أورده الإمام أحمد بطوله وأخرج منه مسلم والنسائي في الفضائل قصة قتله)

حافظ ابو عمر بن عبدالبر نے استیعاب میں ذکر کیا ہے کہ اس لڑکی نے جس وقت اپنے پردے میں کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کو رد کرتے ہو تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ ... الآية﴾۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے عامر بن مصعب نے طاؤس سے خبر دی کہ طاؤس نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عصر کے بعد دو رکعتوں کا پوچھا تو انھوں نے ان کو منع کیا اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ ... الآية﴾۔[2] چنانچہ یہ آیت تمام امور میں عام ہے، جبکہ اللہ پاک اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات کا حکم کریں تو کسی کے لیے اس کی مخالفت جائز نہیں رہی اور نہ اس جگہ کسی کو کچھ اختیار ہے، نہ کوئی رائے ہے نہ کوئی قول ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ [النساء: ٦٥] ''سو قسم ہے تمھارے پروردگار کی! یہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ آپس کے تمام اختلافات میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں۔''

اور حدیث شریف میں وارد ہوا ہے: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی مومن

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٧٢) مسند أحمد (٤/ ٤٢٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٦٨)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٣٤۔ ٣١٣٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٤١)

نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کی ہوا (خواہشات) اس شے کے تابع نہ ہو جس کو میں لایا ہوں[1] اور اسی لیے اس کے خلاف کرنے میں بہت سختی کی ہے۔ چنانچہ یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النور: ٦٣] ''سنو! جو لوگ حکم رسول کی مخالفت کرتے ہیں انھیں ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ان پر کوئی زبردست آفت نہ آپڑے یا انھیں دردناک عذاب نہ پہنچے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ مَا كَانَ ﴾ کے معنی ہیں: "مَا صَحَّ وَلَا اسْتَقَامَ"۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مَا كَانَ ﴾ اور "مَا يَنْبَغِيْ" یا اس جیسے اور الفاظ کے معنی کسی شے سے منع کرنے کے ہیں اور اس بات کی خبر دینے کے لیے ہیں کہ وہ شے شرعاً حلال نہیں ہے اور کبھی اس شے کے لیے ہوتے ہیں جو عقلاً ناممکن ہوتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ﴾[2] [النمل: ٦٠] ''ان باغوں کے درختوں کو تم ہرگز نہ اُگا سکتے۔'' معنی یہ ہیں کہ اس شخص کے لیے جو اللہ پر ایمان لاتا ہے، یہ حلال نہیں ہے کہ جب اللہ کوئی امر جاری کرے تو یہ اپنے نفس سے جو امر چاہے، وہ اختیار کرے، بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ اس فیصلے کی اطاعت کرے، اس کا مطیع اور فرماں بردار ہو اور اللہ نے اس پر جس شے کا حکم جاری کیا ہے اور اس کے لیے پسند فرمایا ہے، اس کے نیچے اپنے نفس کو کھڑا کرے اور اپنی رائے کو اس کی رائے کے تابع کرے۔

﴿ لَهُمُ ﴾ اور ﴿ مِنْ اَمْرِهِمْ ﴾ میں جو جمع کی ضمیر آئی ہے، اس کی یہ وجہ ہے کہ مومن اور مومنہ سیاقِ نفی میں واقع ہوئے ہیں، اس لیے ان دونوں سے مراد ہر مومن اور مومنہ ہیں۔ غرض یہ ہے کہ اس جمعیت کے اعتبار سے ضمیر جمع آئی ہے، ورنہ مومن اور مومنہ کا لفظ واحد ہے۔ کوفیوں نے ﴿ يَكُوْنَ ﴾ بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے۔ اس لیے فعل کے اور اس کے فاعل مونث کے درمیان ﴿ لَهُمُ ﴾ کے ساتھ فصل کی گئی ہے، (یعنی الگ کیا گیا ہے) اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ مونث غیر حقیقی ہے۔ باقی قراء نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے۔ اس لیے کہ فعل مسند ہے "خِيَرَة" کی طرف اور وہ مونث لفظی ہے۔ "خِيَرَة" مصدر ہے بہ معنی اختیار۔ امام ابن سمیفع رحمہ اللہ نے بہ سکونِ تحتیہ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے بہ فتح پڑھا ہے۔[3] آیتِ کریمہ اس بات پر دال ہے کہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس شخص کو وعید سنائی جو اس کی قضاء وقدر کا اذعان نہیں کرتا، یعنی اس کا اعتقاد اور تصدیق نہیں کرتا۔

---

[1] ظلال الجنة (١/ ٧) اس کی سند میں ''نعیم بن حماد'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٨٦)

[3] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٨٦) فتح القدير (٤/ ٣٧٣)

ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ یعنی جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی کسی بھی امر میں نافرمانی کرے، اس میں فیصلے پر راضی نہ ہونا بھی شامل ہے تو وہ یقیناً راہِ حق سے واضح طور پر بہک گیا، جو کسی پر مخفی نہیں ہے۔ پھر اگر وہ نافرمانی ایسی ہے کہ وہ اس امر کو رد کرنا یا اس سے رک جانا ہے، یعنی اس کو قبول نہ کرنا ہے تو یہ بہکنا کفر ہے اور اگر وہ نافرمانی ایسی ہے جو فیصلے کو قبول کر لینے اور اس کو واجب سمجھ لینے کے بعد عملی طور پر کوتاہی ہے تو یہ خطا کی گمراہی اور فسق ہے۔

شانِ نزول کی حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔ ان میں ایک یہ حدیث تھی کہ ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا نے اپنا نفس نبی اکرم ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا تو آپ ﷺ نے اس کا نکاح اپنے غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ زید کا نکاح ہجرت سے آٹھ برس پہلے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوا تھا، اس کے بعد سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دی، آپ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کا نکاح کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا سے کر دیا۔ اس سے پہلے زید رضی اللہ عنہ کی بیوی اُم ایمن رضی اللہ عنہا تھیں اور ان کے بطن سے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ اسامہ کی ولادت بعثت سے تین برس بعد ہوئی تھی۔ کسی نے کہا: پانچ برس بعد۔

شرح مواہب میں ہے کہ اُم ایمن رضی اللہ عنہا برکہ حبشیہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا ہے نبی اکرم ﷺ کے والد عبداللہ نے اس کو آزاد کر دیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ خود نبی مکرم ﷺ نے اس کو آزاد فرمایا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اُم ایمن نبی کریم ﷺ کی والدہ کی لونڈی تھی۔ یہ زمانۂ قدیم مسلمان ہوئی اور دو ہجرتیں کیں اور نبی مکرم ﷺ کی وفات سے پانچ ماہ بعد انتقال کیا۔ کسی نے کہا: چھے ماہ بعد انتقال کیا۔ آیتِ شریفہ اس پر دال ہے کہ کتاب وسنت کے فیصلے کا اتباع لازم ہے اور خالص تقلید اور رائے پر چلنے کی مذمت ہے اور اللہ پاک اور رسول اللہ ﷺ کی نص کے مقابلے میں کسی کے امر کا اختیار نہیں ہے۔ اگرچہ سببِ نزول خاص ہے، لیکن اعتبار عام لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب کا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے بی بی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے زید کا نکاح کر دیا، جیسا کہ گزر چکا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ
زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ
وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ
مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ
فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ
اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝37

اور (اے نبی! یاد کریں) جب آپ اس شخص (زید بن حارثہ) سے جس پر اللہ نے انعام کیا

[1] فتح البیان (۱۱/ ۹۲۔ ۹۳)

اور آپ نے بھی انعام کیا تھا، کہہ رہے تھے کہ تو اپنی بیوی (زینب) کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر اور آپ اپنے دل میں وہ بات (لے پالک کی مطلقہ سے نکاح) چھپاتے تھے، جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے، حالاں کہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں، پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کر دیا، تاکہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح) میں کوئی حرج نہ رہے، جب وہ ان سے (اپنی) حاجت پوری کر لیں اور اللہ کا حکم تو (پورا) ہو کر ہی رہتا ہے ﴿37﴾

قصہ سیدنا زید اور زینب رضی اللہ عنہما کا:

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا زید رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں تو وہ ان کی آنکھوں میں حقیر لگتا تھا، مزاج کی موافقت نہ ہوئی، جب لڑائی ہوتی تو زید رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر شکایت کرتے اور کہتے کہ میں اسے چھوڑتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منع کرتے کہ میری خاطر سے اس نے تجھ کو قبول کیا، اب چھوڑ دینا دوسری ذلت ہے، جب بار بار یہ معاملہ ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آیا کہ اگر ناچار زید چھوڑ دے گا تو زینب رضی اللہ عنہا کی دل جوئی اس کے بغیر نہیں کہ میں نکاح کر لوں، لیکن منافقوں کی بدگوئی سے خطرہ تھا کہ کہیں گے کہ اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنے گھر میں رکھا، حالاں کہ لے پالک کے لیے بیٹے کا حکم نہیں۔ کسی بات میں اللہ تعالیٰ نے زینب رضی اللہ عنہا کی خاطر رکھی، طلاق کے بعد نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں دے دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمانے ہی سے نکاح ہو گیا، ظاہری طور پر نکاح کی ضرورت نہ ہوئی، جیسے اب کوئی لونڈی غلام کا نکاح باندھ دے۔ غرض تمام کرے، یعنی چھوڑ دے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کہی۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ وہ شخص ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرنے کا انعام فرمایا اور جس پر (اے رسول!) تو نے انعام کیا، یعنی غلامی کی پستی اور گڑھے سے آزادی کی بلندی پر پہنچایا۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ ایک کبیر الشان اور جلیل القدر سردار تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھے۔ ان کو حِب، یعنی محبوب کہتے تھے اور ان کے فرزند ارجمند اسامہ رضی اللہ عنہ کو حِب بن حِب، یعنی محبوب، محبوب کے بیٹے کہتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو کسی لشکر میں بھیجا تو اس کو لشکر والوں پر امیر مقرر کیا۔ اور اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہتا تو البتہ اس کو خلیفہ بناتے۔[1] (رواه أحمد عن سعيد بن محمد الوراق و محمد بن عبيد عن وائل بن داود عن عبد الله البهي عنها)

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٢٢٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ "عبداللہ البہی" کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔

بزار نے عن عمر بن ابی سلمہ عن ابیہ روایت کیا ہے، کہا: مجھے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ میں مسجد میں تھا، چنانچہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور کہا: اے اسامہ! تو ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اذن مانگ۔ کہا: پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو میں نے آپ کو اس کی خبر دی اور عرض کی کہ سیدنا علی اور عباس رضی اللہ عنہما اذن مانگتے ہیں، فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ ان کی حاجت کیا ہے؟ میں نے عرض کی: نہیں اے اللہ کے رسول! فرمایا: لیکن میں جانتا ہوں، کہا: پھر ان کو اذن دیا۔ دونوں نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم آپ کے پاس آئے ہیں، تاکہ آپ ہمیں بتائیں کہ آپ کے گھر والوں میں کون آپ کو زیادہ محبوب ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اہل میں سے مجھ کو سب سے زیادہ محبوب فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عرض کی: یارسول اللہ! ہم آپ سے فاطمہ کا نہیں پوچھتے، فرمایا: تو پھر اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما ہے، جس پر اللہ نے انعام کیا ہے اور میں نے اس پر انعام کیا ہے۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی کی بیٹی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے زید رضی اللہ عنہ کا نکاح کر دیا تھا۔ زینب رضی اللہ عنہا کی والدہ اُمیمہ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں اور ان کا مہر دس دینار ساٹھ درہم کا باندھا تھا اور ایک اُوڑھنی اور ملحفہ اور ایک درع، یعنی کرتا اور پچاس مد طعام اور دس مد کھجور۔ یہ قول مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا ہے۔[2] پھر بی بی زینب رضی اللہ عنہا سال بھر یا اس سے زیادہ زید رضی اللہ عنہ کے پاس ٹھہریں، پھر ان کے درمیان کچھ جھگڑا واقع ہوا تو زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان کی شکایت کرنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رہنے دے اور اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ ... الآية ﴾

امام ابن ابی حاتم اور ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ بعض سلف سے آثار ذکر کیے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کو ان کے صحیح نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیں، اس لیے ہم ان کو نہیں لائے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اس جگہ بروایتِ حماد بن زید عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، اس روایت میں غرابت ہے، اس لیے ہم نے اس کے سیاق کو بھی چھوڑ دیا۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی بعض روایات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ یوں کہا ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آیت: ﴿ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ ﴾ سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔[3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے علی بن زید بن جدعان سے روایت کیا ہے، کہا: مجھ سے علی بن الحسین رحمہ اللہ نے پوچھا کہ حسن اس آیت کے متعلق کیا کہتے ہیں: ﴿ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ ﴾ تو میں نے ان سے ذکر

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨١٩) مسند البزار (٧/ ٧١) اس کی سند میں "عمر بن ابی سلمہ" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٨٤٤)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٤٢) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٠٩)

کیا، وہ بولے: نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ بات بتائی کہ وہ عن قریب ان کی بیویوں میں سے ہو گی، قبل اس کے کہ وہ اس سے نکاح کریں۔ پھر جب سیدنا زید رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے، تاکہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ سے ڈرو، اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تجھے خبر دے چکا ہوں کہ میں اس سے تیرا نکاح کرنے والا ہوں اور تو اپنے جی میں وہ شے چھپاتا جس کو اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔[1] (وهكذا روي عن السدي أنه قال نحو ذلك) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سے کوئی چیز چھپاتے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے آپ پر وحی کی گئی تو البتہ یہ آیت چھپاتے: ﴿ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ ... الآية ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا ﴾ "وطر" حاجت و اَرَب کو کہتے ہیں، یعنی جب زید اس سے فارغ ہوا اور اس سے علاحدگی کر لی تو ہم نے اس سے تیرا نکاح کر دیا اور جو شخص بی بی زینب کا نکاح کرانے کے لیے والی ہوا، وہ اللہ عزوجل ہے، اس معنی میں کہ اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ وحی کی کہ زینب کے پاس داخل ہوں، بغیر ولی کے بغیر عقد کے بغیر حق مہر کے، اور آدمیوں میں سے کسی گواہ کے بغیر۔ امام احمد نے عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ جب بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہو چکی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو جا اور ان کو میری اطلاع کر۔ چنانچہ زید چلے، یہاں تک کہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور وہ اپنے آٹے کا خمیر کر رہی تھی۔

سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر جب میں نے ان کو دیکھا تو وہ میرے دل میں عظیم ہو گئیں، یہاں تک کہ مجھ میں طاقت نہ رہی کہ میں ان کی طرف دیکھوں اور کہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر فرمایا ہے تو میں نے اپنی پشت ان کی طرف پھیری اور اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے ہٹا اور میں نے کہا: اے زینب! خوش ہو جا، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے، وہ تمھارا ذکر کرتے ہیں، وہ بولیں کہ میں تو کچھ کرنے والی نہیں ہوں یہاں تک کہ اپنے رب سے مشورہ کر لوں، پھر وہ اپنی نماز کی جگہ پر کھڑی ہوئیں اور قرآن شریف نازل ہوا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور بغیر اجازت ان پر داخل ہوئے اور البتہ واقعی ہم نے اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ جس وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر داخل ہوئیں (ان کی زوجیت میں آئیں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ان کے ولیمے میں روٹی اور گوشت کھلایا۔ پس لوگ نکلے اور کچھ لوگ کھانے کے بعد گھر میں باقی رہ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور میں بھی آپ کے پیچھے ہو لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیبیوں کے حجروں کا تتبع کرنا شروع کیا، یعنی ہر بی بی کے حجرے میں یکے بعد دیگرے تشریف لے گئے، ان کو سلام کرتے اور وہ کہتی تھیں: یا رسول اللہ! آپ نے اپنے اہل کو کیسا پایا؟ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں نہیں جانتا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٣٥)

[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٧٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عامر شعبی رحمہ اللہ کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔

کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ خبر دی کہ وہ لوگ نکل گئے یا کسی اور نے خبر دی تو آپ ﷺ چلے، یہاں تک کہ آپ ﷺ گھر میں داخل ہوئے۔ پھر میں چلا کہ آپ ﷺ کے ساتھ داخل ہو جاؤں تو آپ ﷺ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا، اور حجاب نازل ہوا اور قوم کو جس بات کا وعظ کیا گیا اور نصیحت کی گئی وہ یہ تھی کہ نبی کے گھروں میں داخل مت ہو، جب تک تمھیں اذن نہ دیا جائے... الآیۃ کلھا[1] (ورواہ مسلم و النسائي من طرق عن سليمان بن المغيرة به)

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کی ازواج پر فخر کیا کرتی تھیں تو فرماتیں کہ تم کو تو تمھارے گھر والوں نے بیاہا ہے اور مجھے تو اللہ عزوجل نے ساتوں آسمانوں کے اوپر سے بیاہا ہے۔[2] سورۃ النور میں بروایتِ محمد بن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہما ہم نے ذکر کیا ہے کہ سیدہ زینب اور عائشہ رضی اللہ عنہما نے باہم فخر کیا تو بی بی زینب بولیں کہ میں وہ ہوں کہ میری تزویج آسمان سے نازل ہوئی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں وہ ہوں کہ میرا عذر آسمان سے نازل ہوا۔ چنانچہ زینب رضی اللہ عنہا نے ان کے لیے اعتراف کیا،[3] یعنی ان کی فضیلت کو تسلیم کیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن المغیرہ عن الشعبی روایت کیا ہے کہ زینب رضی اللہ عنہا نبی مکرم ﷺ سے کہا کرتی تھیں کہ میں البتہ آپ پر آپ کی باقی بیویوں میں سے تین باتوں کا ناز کرتی ہوں، یعنی آپ کی بیویوں میں سے کوئی اور ایسی عورت نہیں جو ان باتوں پر ناز کرے: بے شک میرا دادا اور آپ کا دادا ایک ہے، اور آسمان سے اللہ عزوجل نے میرا نکاح آپ سے کیا، اور اس کے سفیر یعنی وکیل جبریل علیہ السلام تھے۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ ... الآیۃ ﴾ یعنی ہم نے جو تیرے لیے زینب سے نکاح کرنا مباح کیا اور یہ کام کر دیا تو اسی لیے کہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی طلاق دی ہوئی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی حرج اور تنگی نہ رہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو متبنیٰ کر لیا تھا تو زید کو زید بن محمد کہتے تھے۔ پھر جب اللہ پاک نے آیت: ﴿ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ﴾ [الأحزاب: ٤] ''اور نہ تمھارے لے پالک لڑکوں کو (واقعی) تمھارے بیٹے بنایا ہے یہ تو تمھارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا ہے اور وہ (سیدھی) راہ سمجھاتا ہے۔'' نازل کر کے اس نسبت کو قطع کر دیا تو پھر اس کا زیادہ بیان کیا اور اس کی تاکید فرمائی، اس طرح سے کہ جب سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی تو رسول اللہ ﷺ سے ان کا نکاح کر

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٨) مسند أحمد (٣/ ١٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٨٤) [3] تفسير الطبري (١٩/ ١١٨۔ ١١٩)

[4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٧٦) یہ روایت مرسل ہے۔

دیا، تاکہ اس نکاح کے واقع ہو جانے سے جو متبنیٰ کی نسبت ختم کی گئی تھی، وہ حکم خوب پختہ ہو جائے اور اسی لیے آیتِ تحریم میں یوں فرمایا: ﴿ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ﴾ [النساء: ٢٣] ''اور تمھارے صلبی سگے بیٹوں کی بیویاں (تم پر حرام کی گئیں)۔'' تاکہ منہ بولے بیٹے سے احتراز ہو جائے، اس لیے کہ یہ ان میں بہت تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴾ یعنی یہ امر جو واقع ہوا ہے، اللہ پاک اس کو مقدر کر چکا تھا اور وہ حتمی اور قطعی ہو چکی تھی اور یہ بات اللہ کے علم میں ضرور ہونے والی تھی کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں سے ہو جائیں گی۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ اِذْ تَقُوْلُ ﴾ کا عامل ''اُذْكُرْ'' محذوف ہے، یعنی یاد کرو اس وقت کو کہ جس وقت تو کہتا تھا اس شخص سے کہ جس پر اللہ نے اسلام کا انعام کیا اور تو نے غلامی سے آزاد کرنے کا انعام کیا، مراد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں، یہ شخص جاہلیت کے قیدیوں میں سے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جاہلیت میں ان کو خریدا اور آزاد کر کے متبنیٰ کیا، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ مقولہ یہ ہے کہ تو اپنی جورو یعنی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو اپنے پاس رہنے دے اور اللہ سے اس کے کام میں ڈر اور اس کو طلاق دینے میں جلدی نہ کر اور حال یہ ہے کہ تو اپنے دل میں اس بات کو چھپاتا ہے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا ہے، یعنی اگر سیدنا زید رضی اللہ عنہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دے تو اس سے نکاح کر لینا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی محبت ہے۔ اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے، یعنی ان سے حیا اور شرم کرتا ہے، یا ان کے عار دلانے سے خوف کرتا ہے کہ کہیں گے کہ اپنے مولیٰ کو اس کی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا، پھر اس سے نکاح کر لیا اور اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تو اس سے ہر حال میں ڈرے اور اس کا خوف رکھے اور اس سے شرم کرے اور زید کو اس بات کا حکم نہ دے کہ وہ اپنی بیوی کو روک رکھے، اس کے بعد کہ اللہ نے تجھے یہ بات بتا دی کہ وہ تیری بیوی ہو گی۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب فرمایا، پھر جب زید رضی اللہ عنہ اس سے قضائے وطر کر چکا تو ہم نے اس سے تیرا نکاح کر دیا۔

قضائے وطر لغت میں اس شے کی انتہا کو پہنچنے کو، جو جی میں ہے، کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''قَضٰی وَطَرًا مِنْهُ'' جبکہ کوئی شخص اس شے میں اپنی حاجت کو پہنچے جس کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ اس جگہ قضائے وطر سے مراد یہ ہے کہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے اس کے نکاح کے ساتھ اپنی حاجت پوری کی اور اس کے ساتھ دخول کرنے سے اس طرح سے کہ اب اس میں اس کی کچھ حاجت باقی نہیں رہی اور اس کی ہمت اس سے کوتاہ ہو گئی اور اس کا جی اس سے خوش ہو چکا۔ کسی نے کہا: قضائے وطر سے مراد طلاق ہے، کیوں کہ مرد اپنی بیوی کو اسی وقت

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٤٢۔ ٦٤٤)

طلاق دیتا ہے کہ اس میں اس کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا کہ وطر بہ معنی شہوت و محبت ہے ؎

وَكَيْفَ ثَوَائِي بِالْمَدِيْنَةِ بَعْدَ مَا قَضَى وَطَرًا مِنْهَا جَمِيْلُ بْنُ مَعْمَرٍ

یعنی میری اقامت مدینے میں کیوں کر ہوسکتی ہے اس کے بعد کہ جمیل بن معمر اس سے شہوت پوری کر چکا۔

امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وطر بہ معنی اَرَب و حاجت ہے۔ كما قال الفزاري: ؎

وَدَّعَنَا قَبْلَ أَنْ نُوَدِّعَهُ لَمَّا قَضَى مِنْ شَبَابِنَا وَطَرَا

یعنی اس نے ہم کو رخصت کر دیا، قبل اس کے کہ ہم اسے رخصت کریں، جبکہ وہ ہماری جوانی سے حاجت پوری کر چکا۔ بالجملہ جمہور نے ﴿ زَوَّجْنٰكَهَا ﴾ پڑھا ہے اور اہلِ بیت کی قراءت "زَوَّجْتُكَهَا" ہے۔ یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کی۔[1] معنی یہ ہیں کہ ہم نے تیری عظمت اور شرف کے لیے تجھے اس بات کا نیازمند نہیں کیا کہ خلق میں سے کوئی تیرا ولی ہو اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح منعقد کرے۔ جب اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلام کر دیا، یعنی خبر دے دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ زینب رضی اللہ عنہا پر بغیر اذن کے داخل ہوئے، نہ عقد ہوا نہ مہر مقرر ہوا اور نہ ہی کوئی اور چیز ہوئی جو نکاح میں اُمت کے لیے معتبر ہے۔ یہ امر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات سے ہے کہ جن میں کوئی اور آپ کا شریک نہیں ہے باجماعِ مسلمین۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے یہ نکاح سنہ ۵ ہجری میں ہوا۔ کسی نے کہا: سنہ ۳ ہجری میں۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دس برس کے بعد ترپن ۵۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

کسی نے کہا: ﴿ زَوَّجْنٰكَهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امر فرمایا کہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیں، غرض یہ کہ اور بیویوں کی طرح ان سے بھی نکاح ہوا، یہ قول ٹھیک نہیں ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس بارے میں صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں، چنانچہ ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ غرضیکہ پھر اللہ پاک نے اس نکاح کے کر دینے کی یہ وجہ ذکر فرمائی: ﴿ لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ﴾ یعنی تاکہ مومنین پر ان لوگوں کی بیویوں سے نکاح کر لینے میں کوئی تنگی اور مشقت نہ رہے جن کو وہ اپنے بیٹے بنا لیتے ہیں، جس طرح کہ عرب لوگ کیا کرتے تھے، کیوں کہ وہ جس کو چاہتے متبنیٰ کر لیتے تھے۔ مومنین کے لفظ میں اس بات کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور امت کے لیے حکم ایک ہے، سوائے اس حکم کے جس کو دلیل خاص کرے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جن میں اُمت شریک نہیں ہے۔ قصہ مختصر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زید کو متبنیٰ کر لیا تھا، ان کو زید بن محمد کہتے تھے، یہاں تک کہ ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ ... الآية ﴾ نازل ہوئی۔

عرب لوگ اس بات کے معتقد تھے کہ متبنیٰ بیٹوں کی عورتیں ان پر حرام ہیں، جس طرح کہ ان کے حقیقی بیٹوں

[1] فتح القدير (٤/ ٣٧٥)

کی بیویاں حرام ہیں۔ ''أَدْعِيَاء'' ''دَعِيٌّ'' کی جمع ہے۔ ''دَعِيٌّ'' وہ ہے جس کو بیٹا کہہ کر پکارتے ہیں، اس کے بغیر کہ وہ حقیقی بیٹا ہو۔ پس اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ ادعیاء کی بیویاں ان کے لیے حلال ہیں، جبکہ وہ ان سے حاجت پوری کر لیں، یعنی صحبت کرنے کے بعد ان کو طلاق دے دیں تو منہ بولے بیٹوں کے باپوں کو ان سے نکاح کر لینا حلال ہے، بخلاف حقیقی بیٹے کے کہ اس کی بیوی اس کے باپ پر صرف عقد پر حرام ہو جاتی ہے، یعنی قبل صحبت کے اس کو طلاق دے دے تو بھی اس کے باپ پر حرام ہے۔

﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قضا جو بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے بارے میں تھی کہ رسول اللہ ﷺ ان سے نکاح کریں گے، ایک ماضی کا فیصلہ جو موجود فی الخارج تھا، ضرور ہی ہونے والا تھا۔ پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان فرمائی کہ اس نکاح میں رسول اللہ ﷺ پر کوئی حرج نہیں ہے۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۝۳۸ۙ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۳۹

اور نبی کے لیے اس بات میں کوئی حرج نہیں جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی، ان لوگوں (انبیاء) میں بھی جو پہلے گزر چکے ہیں، اللہ کا یہی طریقہ رہا ہے اور اللہ کا حکم ایک طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے (38) وہ (انبیاء) جو اللہ کے پیغام پہنچاتے تھے اور اس سے ڈرتے تھے اور وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے، اور اللہ حساب لینے والا کافی ہے (39)

اللہ تعالیٰ کے فیصلے میں کوئی تنگی نہیں ہے:

یعنی پیغمبر کو ایک کام کرنا جو شرع میں جائز ہو گیا، مضائقہ نہیں رکھتا۔ ہمیشہ پیغمبروں کو اس کے سوا کسی کا ڈر نہیں رہا، یا یہ کہ بعضے حکم ہمیشہ پیغمبروں کے لیے خاص رہے ہیں، جیسے عورتوں کی گنتی۔ داود علیہ السلام کی سو عورتیں تھیں۔ دوسرا کوئی اپنی حد سے گزرے اور زیادہ کرے تو گناہ ہے اور جن کے لیے جائز ہوا ان کو مضائقہ نہیں اور پیغمبروں کے لیے بعض حکم خاص اس لیے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے خلاف نہیں کرتے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر اس شے میں کوئی حرج نہیں جو اللہ نے اس کے لیے حلال کی اور جس کا اس کو حکم دیا، یعنی بی بی زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لینے میں جن کو ان کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے طلاق دے دی تھی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ﴾ یعنی یہ اگلے نبیوں میں اللہ تعالیٰ کا طریقہ رہا ہے۔ اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان کو کسی شے کا حکم کرے اور اس میں ان پر حرج ہو۔ منافقوں میں سے جس کسی نے یہ وہم کیا کہ نبی اکرم ﷺ کے اپنے غلام اور منہ بولے بیٹے زید رضی اللہ عنہ کی بیوی سے، جس کو آپ نے متبنیٰ کر لیا، نکاح کر لینے میں نقصان ہے تو یہ اس پر رد ہے کہ اس میں کسی طرح کا نقصان نہیں ہے، اس کا وہم باطل ہے۔

﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ﴾ یعنی اللہ کا امر جس کو وہ مقدر کرتا ہے، وہ ضرور ہی واقع ہونے والا ہے۔ اس سے نہ کسی طرح کا مفر ہے نہ یکسو ہونا، چنانچہ جو کچھ اس نے چاہا وہ ہوگیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ ان لوگوں کی تعریف فرماتا ہے جو اس کی رسالتوں کو مخلوق کی طرف پہنچاتے ہیں اور رسالتوں کی امانتوں کو ادا کرتے ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، چنانچہ ان کو کسی کا دباؤ اللہ پاک کی رسالتیں پہنچانے سے نہیں روکتا۔

﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴾ اور اللہ کافی ہے مدد کرنے والا اور اعانت کرنے والا۔ اس مقام میں بلکہ ہر مقام میں سب لوگوں کے سردار جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، کیوں کہ رسالت کے ادا کرنے اور پہنچانے میں آپ نے بنی آدم کے تمام انواع میں اہلِ مشرق ومغرب میں آپ ﷺ نے قیام فرمایا اور اللہ پاک نے آپ ﷺ کے دین وکلمہ اور شریعت کو سارے ادیان اور شریعتوں پر غالب کیا۔ یہ دعوتِ عام آپ ﷺ ہی کا خاصا ہے، کیوں کہ آپ سے قبل جو کوئی نبی مبعوث ہوتا وہ صرف اپنی قوم کی طرف آتا اور نبی اکرم ﷺ تو عرب وعجم میں ساری مخلوق کی طرف مبعوث ہوئے، چنانچہ اللہ پاک نے آپ کو یہ خطاب فرمایا ہے: ﴿ قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ۱۵۸] ''آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں۔''

پھر آپ ﷺ کی طرف سے آپ ﷺ کی اُمتِ مرحومہ مقامِ بلاغ (تبلیغِ دین) کی وارث ہوئی تو آپ ﷺ کے بعد جنھوں نے اس کے ساتھ قیام کیا ان سب میں اعلیٰ اور افضل و برتر و بہتر آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوئے، انھوں نے آپ ﷺ کی طرف سے خلق کو پہنچایا، جیسا کہ آپ ﷺ نے ان کو امر فرمایا۔ آپ ﷺ کے رات اور دن، حضر اور سفر، پوشیدہ اور ظاہر سارے اقوال و افعال اور احوال میں جو کچھ تھا سب امت کو پہنچا دیا۔ رضي الله عنهم وأرضاهم۔ پھر ہر خلف اپنے سلف سے ہمارے زمانے تک اس کا وارث ہوا، چنانچہ راہ پانے والے ان کے نور کا اقتدا کرتے ہیں اور جن کو اللہ پاک نے توفیق عطا فرمائی ہے وہ انہیں کی شاہراہ پر چلتے ہیں۔ فنسأل الله الكريم المنان أن يجعلنا من خلفهم الصالحين. آمین.

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «لَا يَحْقِرَنَّ أَحَدُكُمْ نَفْسَهُ أَنْ يَّرَى أَمْرًا لِلّٰهِ فِيْهِ مَقَالٌ ثُمَّ لَا يَقُوْلُهُ، فَيَقُوْلُ اللّٰهُ: مَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَقُوْلَ مِنْهُ؟ فَيَقُوْلُ:

رَبِّ خَشِيَتُ النَّاسَ فَيَقُوْلُ: فَأَنَا أَحَقُّ أَنْ يُخْشَى ﴾[1] (ورواه أيضا عن عبد الرزاق عن الثوري عن زيد عن عمرو بن مرة، ورواه ابن ماجه عن أبي كريب عن عبد الله بن نمير وأبي معاوية كلاهما عن الأعمش)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ﴾ محاورے میں بولتے ہیں: "فَرَضَ لَهُ كَذَا" یعنی فلاں کے لیے اتنا مقدر کیا۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے جو بات اپنے نبی کے لیے حلال کی اور اس کے لیے مقدر فرمائی، اس میں اس پر کسی طرح کا حرج نہیں ہے۔

پھر اللہ پاک نے یہ ذکر فرمایا کہ اللہ جو شے اپنے نبی کے لیے حلال کریں، اس میں اس پر کوئی حرج نہیں ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ایک پرانا طریقہ ہے۔ فرمایا کہ ﴿ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ﴾۔ اس کے نصب میں کئی وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ سُنَّةَ ﴾ ایک اسم ہے جو مصدر کی جگہ میں رکھا گیا ہے، جیسا کہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] دوسری یہ ہے کہ مصدر ہے، یعنی مفعول مطلق مثل "صُنْعَ اللّٰهِ وَوَعْدَ اللّٰهِ" کے، یعنی "سَنَّ اللّٰهُ ذٰلِكَ سُنَّةً"۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ منصوب علی الاغراء ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے اس کو اس طرح رد کیا ہے کہ اغراء کا عامل محذوف نہیں ہوتا۔[3] چوتھی یہ ہے کہ "جَعَلَ" کا مفعول ہے، یعنی "جَعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ سُنَّةً"۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ منصوب بہ نزعِ خافض ہے، یعنی "كَسُنَّةِ اللّٰهِ"۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے،[4] اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ بیویاں رکھنے کا عیب لگایا تھا تو اللہ پاک نے ان پر یوں رد فرمایا کہ ﴿ سُنَّةَ اللّٰهِ ﴾ یعنی ان نبیوں میں جو ان سے پہلے گزرے ہیں، اللہ کی یہی سنت رہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ وہی طریقۂ قدیم ہے جو اگلے انبیاء اور اُمتوں میں تھا کہ امرِ نکاح وغیرہ جو اللہ پاک نے ان پر وسعت اور فراخی کرنے کے لیے ان کے واسطے حلال کیا تھا، اس کو اختیار کریں، چنانچہ ان کی آزاد بیبیاں تھیں اور لونڈیاں بھی۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جن عورتوں سے چاہیں نکاح کریں۔ فریضہ یہ ہے اور یہی اگلے نبیوں کا طریقہ تھا۔ سلیمان بن داود علیہما السلام کی ہزار بیویاں تھیں، ان میں سے تین سو لونڈیاں تھیں۔ اور داود علیہ السلام کی سو عورتیں تھیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ الَّذِيْنَ خَلَوْا ﴾ سے مراد داود علیہ السلام ہیں اور وہ عورت جس سے انھوں نے نکاح کیا اور اس کا خاوند۔ اس عورت کا نام الیسبہ تھا، چنانچہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے حق میں سنت ہے۔[5]

﴿ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ﴾ کے معنی ہیں: قضائے مقضی وحکم مبتوت ومقطوع، یعنی یقینی اور پکا حکم تاکید میں۔ ایسا

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٤٤۔ ٦٤٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو البختری کا سماع سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٨٧٢)

[2] الكشاف (٣/ ٥٥٢) [3] البحر المحيط (٧/ ٢٢٧) [4] تفسير الجلالين (١/ ٥٥٦) [5] الدر المنثور (٦/ ٦١٥)

محاورہ بولا کرتے ہیں، جیسا کہ گھنے سائے کو ظل ظلیل اور نہایت اندھیری رات کو لیل الیل اور نہایت تر و تازہ ہرے بھرے باغ کو روض اریض بولتے ہیں۔ قضا ارادۂ ازلیہ کو کہتے ہیں، جو اشیاء کے ساتھ متعلق ہے، اس حال پر جس پر وہ حقیقتاً ہیں اور قدر اس سے عبارت ہے کہ ان اشیاء کو ایک مخصوص و معین تقدیر پر اللہ کا ایجاد کر دینا ہے، لیکن قضا و قدر میں سے ہر ایک دوسرے کے معنی میں مستعمل ہوتی ہے، چنانچہ اس شے کا وجود میں لانا مراد ہے، جس کے ساتھ ارادہ متعلق ہو چکا ہے۔[1] (قاله الشهاب الخفاجي)

پھر اللہ پاک نے اگلے نبیوں کی تعریف فرمائی: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ﴾ یعنی اللہ سبحانہ نے جو شے دے کر ان کو بھیجا ہے، اسے اس کے بندوں کی طرف پہنچاتے ہیں اور ہر قول و فعل میں اس سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور نہ لوگوں کے کہنے اور عار دلانے کی کچھ پروا کرتے ہیں، اس بات میں جو اللہ نے ان کے لیے حلال فرمائی ہے، بلکہ ان کا خوف اور خشیت صرف اللہ پاک ہی پر مقصور ہے۔ موصول محلِ جر میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ خَلَوْا ﴾ کی صفت ہے یا منصوب ہے مدح کی بنا پر۔ ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک کافی ہے ہر مکان میں حاضر ہونے والا، اپنی خلق کے اعمال پر نگاہ رکھنے والا، اپنے غلاموں کی ہر اس چیز سے کفایت کرنے والا ہے جس سے وہ ڈرتے ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان سے ہر شے میں محاسبہ لینے والا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کی تاویل میں اختلاف ہے۔ چنانچہ قتادہ، ابن زید اور مفسرین رحمہم اللہ کا ایک گروہ جن میں امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ وغیرہ ہیں، اس طرف گئے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ سے استحسان (پسند کرنا) زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا واقع ہوا اس حال میں کہ وہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اور آپ ﷺ اس پر حریص تھے کہ زید رضی اللہ عنہ ان کو طلاق دیں تو آپ ﷺ ان سے نکاح کر لیں۔ پھر جب سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو یہ خبر دی کہ وہ ان کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کی یہ شکایت کی کہ وہ سخت باتیں کرتی ہیں اور حکم کی نافرمانی کرتی ہیں اور زبان سے ایذا دیتی ہیں اور شرف کے لحاظ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتی ہیں تو آپ ﷺ نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو جو اس کی طرف سے کہتا ہے اس میں اللہ سے ڈر اور اپنی بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو اپنے پاس رہنے دے، حالاں کہ زید رضی اللہ عنہ کے طلاق دے دینے سے جو آپ ﷺ کو حرص تھی، اس کو چھپاتے تھے، یہ وہ بات تھی جس کو آپ ﷺ اپنے جی میں اخفا فرماتے تھے، لیکن امر بالمعروف جو آپ ﷺ پر واجب ہے، اس کو ادا فرمایا۔

ہمارے علماء رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ قول ان تمام اقوال سے بہترین ہے جو اس آیت کے بارے میں کہے گئے ہیں۔ (مگر سیاقِ آیت میں اس مضمون کی طرف کچھ اشارہ نہیں اور نہ ہی آخر الامر میں اس کا کچھ ظہور ہوا، باوجودیکہ قرآن

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٧٣۔ ١٧٤)

میں صریح نص موجود ہے کہ اللہ اس کو ظاہر کرنے والا ہے۔ چنانچہ اگر پوشیدہ یہی امر تھا تو ضرور اس کا ظہور ہوتا۔ ظہور تو صرف تزوج کا ہوا نہ کہ آپ ﷺ کی حرص اور خواہش کا، اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگرچہ امام قرطبی رحمہ اللہ کے قول میں اس بات کو معتبر رکھا گیا، مگر حسبِ بیانِ سابق یہ قول محض ضعیف، بلکہ غلط ہے۔ معتبر وہ قول ہے جو شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ سے منقول ہوا، اس کے علاوہ سب خیالات فاسدہ اور اقوالِ غیر معتبرہ ہیں۔ مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔ مفسرین اور علمائے راسخین میں سے اہلِ تحقیق اسی قول پر ہیں، جیسے: امام زہری، قاضی ابوبکر بن علاء قشیری اور قاضی ابوبکر بن العربی رحمہم اللہ وغیرہم۔[1] انتہیٰ ما قاله القرطبي ملخصاً.

اور یہ جو اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی محبت نبی اکرم ﷺ کے دلِ تقدس منزل میں واقع ہوئی اور آپ ﷺ نے زید کے طلاق دے دینے کا ارادہ فرمایا، اس میں بڑے سے بڑا حرج ہے اور وہ بات ہے جو نبی کریم ﷺ کے منصب کے لائق نہیں ہے اور اس کے کہنے والے کی طرف سے ایک بہت بڑا اقدام ہے اور نبی کریم ﷺ کے حق اور فضیلت اور شرف کی عدمِ پہچان ہے۔ بھلا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو دیکھا اور وہ آپ ﷺ کو پسند آ گئیں، حالاں کہ وہ تو آپ کی پھوپھی کی صاحبزادی ہیں اور جب سے وہ پیدا ہوئی ہیں، آپ ﷺ ان کو دیکھتے رہے ہیں اور نہ عورتیں آپ ﷺ سے پردہ کرتی تھیں اور خود آپ ﷺ نے ان کا نکاح زید رضی اللہ عنہ سے کرایا۔ چنانچہ یہ بات کہ آپ زید رضی اللہ عنہ کو بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے رہنے دینے کا حکم فرمائیں، اس حال میں کہ آپ ﷺ یہ بات چاہتے ہوں کہ زید رضی اللہ عنہ ان کو طلاق دے دیں، اس بات میں نبی کریم ﷺ کے منزہ کرنے میں کسی طرح کا شک نہیں ہے۔ اس بارے میں جو اقوال ہیں ان سب میں سے زیادہ صحیح علی بن الحسین امام زین العابدین رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اللہ پاک نبی کریم ﷺ کو اس بات کی خبر دے چکا تھا کہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا عن قریب آپ کی بیبیوں میں سے ہو جائیں گی اور زید رضی اللہ عنہ عن قریب ان کو طلاق دیں گے۔ پھر جب سیدنا زید رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کی کہ میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ﴿ اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ ﴾ اس پر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو عتاب کیا اور فرمایا تو نے ﴿ اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ ﴾ کیوں کہا، حالاں کہ میں تو تجھے خبر کر چکا تھا کہ عن قریب وہ تیری بیوی ہوگی۔[2]

امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے حال خیر مآل کے زیادہ لائق اور مطابق یہی قول ہے اور یہی تلاوت کے مطابق ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ وہ اس چیز کو ظاہر کرے گا جس کو انھوں نے چھپایا ہے، حالاں کہ اللہ پاک نے اور کچھ اظہار نہیں کیا، اس کے سوا کہ آپ ﷺ کا نکاح بی بی زینب رضی اللہ عنہا سے کر دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ زَوَّجۡنٰكَهَا ﴾ چنانچہ جو بات رسول اللہ ﷺ نے اپنے جی میں چھپائی تھی، اگر وہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی محبت

[1] تفسیر القرطبي (١٤/ ١٨٨۔ ١٩٠) [2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٧٤) تفسير البغوي (٦/ ٣٣٥)

ہوتی یا ان کی طلاق کا ارادہ تو ضرور اللہ پاک اس کو ظاہر کر دیتا، کیوں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے تو خبر دے کہ اس کو ظاہر کرے گا، پھر اس کو چھپائے اور اس کا اظہار نہ کرے۔ چنانچہ یہ بات اس پر دال ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر جو عتاب کیا گیا تو صرف اس امر پر کہ اللہ پاک نے آپ ﷺ کو خبر کر دی تھی کہ عن قریب وہ آپ ﷺ کی بی بی ہوں گی۔ آپ ﷺ نے اس کا اخفا فرمایا اور آپ ﷺ نے جو اس کو چھپایا تو فقط اس شرم سے کہ زید رضی اللہ عنہ کو یہ خبر دیں کہ جو عورت تیرے تحت میں اور تیرے نکاح میں ہے، وہ عن قریب میری بیوی ہو گی۔ آپ ﷺ نے یہ کہنے سے حیا فرمائی۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمہور کے نزدیک معتبر اور منصور قول یہی ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے فرمایا: زیادہ صحیح یہی قول ہے، اگرچہ یہ دوسرا قول کہ آپ ﷺ نے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی محبت کا اخفا کیا یا زید رضی اللہ عنہ کے طلاق دینے کی صورت میں ان سے نکاح کرنے کے امر کو چھپایا، انبیاء علیہم السلام کے حال میں کوئی عیب کی بات نہیں، اس لیے کہ بندے کے دل میں جو بات پڑ جاتی ہے، ایسی چیزوں میں سے جن میں گناہ کا ارادہ نہیں کیا جاتا ہے، اس پر اسے ملامت نہیں کی جاتی، کیوں کہ الفت اور محبت اور نفس کا میلان انسان کی طبیعت میں سے ہے۔[1] انتھی.

اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کے قلبِ مبارک میں بی بی زینب رضی اللہ عنہا کی محبت تھی اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ چاہا کہ کاش زید رضی اللہ عنہ اس کو طلاق دے دیں۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول حسن و مرضی ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ انسان ان سے تحفظ کرتا ہے اور ان پر لوگوں کے مطلع ہو جانے سے شرماتا ہے، حالاں کہ وہ حقیقت میں حلال ہوتی ہیں اور ان میں وسعت اور فراخی ہوتی ہے اور حلال مطلق، نہ ان میں کوئی گفتگو ہوتی ہے نہ کوئی اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیب ہوتا ہے اور بعض اوقات اس حلال شے میں داخل ہونا، یعنی اس کو کر لینا، ایسے واجبات کے حاصل کرنے کا زینہ ہو جاتا ہے جن کا اثر دین میں عظیم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس جگہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا طلاق دینا اور نبی اکرم ﷺ کا ان سے نکاح کرنا صرف اس لیے ٹھہرایا گیا ہے کہ متبنیٰ کے لیے جو حرمت سمجھی جاتی تھی اسے ختم کر دیا جائے اور اس کے طریقے کو باطل قرار دیا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ ... الآية﴾[3]

امام ابو القاسم عبدالرحمن سہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زید بن محمد کہا جاتا تھا، یہاں تک کہ آیت ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ ... الآية﴾ نازل ہوئی تو کہا کہ میں زید بن حارثہ ہوں اور "أَنَا زَيْدُ بْنُ مُحَمَّدٍ" کہنا ان پر حرام ہوا۔ پھر جب زید رضی اللہ عنہ سے یہ شرف اور فخر کھینچ لیا گیا اور اللہ پاک نے اس سے زید کی وحشت معلوم کی تو ان کو ایک ایسی خصوصیت سے مشرف فرمایا جس کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے کوئی بھی مختص نہیں، وہ یہ ہے کہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا نام قرآن شریف کی اس آیتِ کریمہ میں لیا۔ چنانچہ ذکرِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ان کا نام ذکر فرمایا، یہاں

[1] تفسير البغوي (٦/ ٣٥٦) [2] تفسير البغوي (٦/ ٣٥٥) [3] تفسير الخازن (٥/ ٢٦٣)

تک کہ ان کا نام مبارک قرآن ہو گیا جو محرابوں میں پڑھا جاتا ہے اور اس سے ان کو انتہا درجے کا نیک نام اور حد درجہ بلند نام بنا دیا۔ اس میں سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے لیے تانیس (اُنس پکڑنا) ہے اور اس فخر کا بدل ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ ہونے سے ان کو حاصل تھا۔

کیا تم نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول نہیں سنا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تجھ پر فلاں سورت پڑھوں تو وہ رو دیے اور عرض کی کہ کیا میرا وہاں ذکر کیا گیا؟! ان کا یہ رونا اس وجہ سے خوشی کے مارے تھا کہ اللہ پاک نے ان کا ذکر کیا۔ یہ خوشی تو صرف اس بات کی ہے کہ بارگاہِ ذوالجلال و الاکرام میں صرف ان کا ذکر آیا، پھر بھلا اس شخص کی خوشی اور شرف اور فخر کا کیا کہنا جس کا نام قرآن ہو گیا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پڑھا جائے، بوسیدہ نہ پڑے، دنیا والے جب قرآن شریف پڑھیں تو اس کی تلاوت کریں اور اسی طرح جنت والے جب پڑھیں تو ان کی زبان پر آئے۔ ہمیشہ کے لیے مومنوں کی زبانوں پر جاری رہے، جس طرح کہ علی الخصوص رب العالمین کے نزدیک ہمیشہ مذکور رہا ہے، کیوں کہ قرآن شریف اللہ سبحانہ کا کلامِ قدیم ہے، ہمیشہ باقی ہے فنا نہ ہو گا۔

پس سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا نام مبارک صُحفِ مکرمہ مرفوعہ میں ہے اور سفرۂ کرام بررہ اپنی تلاوت میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات مومنین کے ناموں میں سے کسی نام کے لیے نہیں ہے، سوائے کسی نبی کے اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نام کے۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے اس چیز کا عوض ہے جو اُن سے لے لی گئی اور آیت میں اس کے سوا اتنا اور اضافہ کیا کہ یوں فرمایا: ﴿ وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ ﴾ یعنی وہ شخص جس پر اللہ نے انعام کیا ایمان کے ساتھ، چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہیں اور مرنے سے قبل انھوں نے یہ بات جان لی، یہ ایک دوسری فضیلت ہے۔ رضي الله تعالىٰ عنه۔[1] جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح زینب رضی اللہ عنہا سے ہو گیا تو لوگ کہنے لگے کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی:[2]

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، اور لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر شے کو خوب جاننے والا ہے ﴿40﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں اور خاتم النبیین ہیں:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد یا لڑکے گزر گئے، یا بیٹیاں رہیں، کوئی مرد ہوا نہیں، یعنی کسی کو اس کا بیٹا نہ جانو، مگر وہ

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٩٣) [2] فتح البيان (١١/ ٩٤۔ ١٠٠)

اللہ کا رسول ہے، اس حساب سے سب اس کے بیٹے ہیں اُور پیغمبروں پر مہر ہے (ختم کرنے والے ہیں) یعنی اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں، یہ بڑائی اس کو سب پر ہے۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اس بات کی ممانعت ہے کہ اس کے بعد زید بن محمد کہا جائے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے باپ نہیں ہیں، گو آپ ﷺ نے ان کو متبنیٰ کر لیا تھا، اس لیے کہ آپ کا کوئی بیٹا زندہ نہیں رہا کہ بلوغ تک پہنچے، کیوں کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے بیٹے قاسم، طیب اور طاہر پیدا ہوئے، پھر وہ چھوٹے چھوٹے ہی انتقال کر گئے اور سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ سیدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے پیدا ہوئے، پھر وہ بھی شیر خواری کی حالت میں انتقال کر گئے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں: زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن۔ ان میں سے تین تو آپ ﷺ کی زندگی میں وفات پا گئیں، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا باقی رہیں، انھیں آپ ﷺ کی وفات کی مصیبت پہنچی اور آپ ﷺ کی وفات کے چھے ماہ بعد انھوں نے وفات پائی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴾ اس آیتِ کریمہ کی مثل ہے: ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ''اس موقع کو تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کہاں وہ اپنی پیغمبری رکھے؟'' چنانچہ یہ آیت اس بارے میں نص ہے، یعنی قطعی حکم ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور جب آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے تو بطریقِ اولیٰ واحری کوئی رسول بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ رسالت کا مقام نبوت کے مقام سے زیادہ خاص ہے، کیوں کہ ہر رسول نبی ہے اور ہر نبی رسول نہیں ہے۔ یعنی رسول و نبی میں عام اور خاص مطلق کی نسبت ہے۔ اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے احادیثِ متواترہ وارد ہوئی ہیں:

1. امام احمد رحمہ اللہ نے طفیل بن ابی بن کعب عن ابیہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نبیوں میں میری مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے جس نے ایک گھر بنایا، پھر اس کو اچھا اور کامل کیا اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، اس کو نہ لگایا۔ لوگ اس مکان کا گشت کرنے لگے اور اس پر تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے: کاش! اس اینٹ کی جگہ بھی مکمل ہوتی، میں نبیوں میں اس اینٹ کی جگہ ہوں۔[1] (و رواه الترمذي عن بُندار عن أبي عامر العقدي به وقال: حسن صحيح)

2. حدیثِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک رسالت اور نبوت یقینی طور پر منقطع ہو چکی، اب میرے بعد نہ کوئی رسول ہے نہ کوئی نبی۔ کہا: لوگوں پر یہ بات شاق گزری تو آپ ﷺ نے فرمایا: « وَلٰكِنْ مُبَشِّرَاتٍ »۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ!

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦١٣) مسند أحمد (٥/ ١٣٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٨٥٧)

''مبشرات'' کیا ہے؟ فرمایا: مسلمان کا خواب اور یہ اجزائے نبوت میں سے ایک جز ہے۔[1] (وهكذا رواه الترمذي عن الحسن بن محمد الزعفراني عن عفان بن مسلم به وقال: صحيح غريب من حديث المختار بن فلفل)

3 **حدیثِ دیگر:** امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری مثال اور نبیوں کی مثال ایک شخص کی طرح ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور اس کو کامل کیا اور اچھا کیا، مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، جو شخص اس میں داخل ہوتا اور اس کی طرف نظر کرتا تو کہتا کہ کیسا خوبصورت گھر ہے سوائے اس اینٹ کی جگہ کے! چنانچہ میں اس اینٹ کی جگہ ہوں۔ میرے ساتھ انبیاء علیہم السلام مہر لگائے گئے۔[2] (ورواه البخاري ومسلم والترمذي من طرق عن سليم بن حيان به، وقال الترمذي: صحيح غريب من هذا الوجه)

4 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اور نبیوں کی مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا، پھر اس کو مکمل کیا، مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، پھر میں آیا تو میں نے اس اینٹ کو مکمل کر دیا۔[3] (انفرد بإخراجه مسلم من رواية الأعمش به)

5 **حدیثِ دیگر:** امام احمد رحمہ اللہ نے ابو طفیل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے، مگر مبشرات ہیں۔ کسی نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا: «اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ» یا فرمایا: «اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ»[4] یعنی اچھے خواب۔

6 **حدیثِ دیگر:** امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک میری اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کی مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے جس نے گھر بنائے، پھر ان کو کامل کیا اور حسین و جمیل کیا، مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ پھرنے لگے اور اس بات کو دیکھ کر تعجب کرنے لگے، یعنی ان گھروں کی بنیاد اور دیواریں ان کو بہت اچھی لگیں اور کہنے لگے کہ تو نے اس جگہ ایک اینٹ کیوں نہیں رکھ دی کہ تیری عمارت مکمل ہو جاتی؟! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں وہ اینٹ ہوں۔[5] (أخرجاه من حديث عبدالرزاق)

7 **حدیثِ دیگر:** امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٧٢) مسند أحمد (٣/ ٢٦٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٣١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٧) مسند الطيالسي (١/ ٢٤٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٦٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٦) مسند أحمد (٣/ ٩)

[4] مسند أحمد (٥/ ٤٥٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله ثقات'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٣٦٠)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٦) مسند أحمد (٢/ ٣١٢)

نبیوں پر چھے باتوں کے ساتھ فضیلت دیا گیا ہوں: مجھے جوامع الکلم دیے گئے اور میں رعب کے ساتھ مدد دیا گیا ہوں اور میرے لیے غنیمتیں حلال کی گئیں، میرے لیے زمین کو مسجد اور طہور ٹھہرایا گیا اور میں تمام مخلوق کی طرف بھیجا گیا اور میرے ساتھ نبی ختم کیے گئے، یعنی سلسلۂ نبوت ختم کیا گیا۔[1] (ورواه الترمذي وابن ماجه من حديث إسماعيل بن جعفر، وقال الترمذي حسن صحيح)

8 حدیثِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «مَثَلِي وَمَثَلُ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى دَارًا فَأَتَمَّهَا إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ وَّاحِدَةٍ فَجِئْتُ أَنَا فَأَتْمَمْتُ تِلْكَ اللَّبِنَةَ»[2] (و رواه مسلم عن أبي بكر بن أبي شيبة و أبي كريب كلاهما عن أبي معاوية به)

9 حدیثِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «إِنِّي عِنْدَ اللّٰهِ لَخَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِيْ طِيْنَتِهِ»[3] یعنی بے شک میں اللہ کے نزدیک البتہ خاتم النبیین تھا، اس حال میں کہ بے شک آدم البتہ زمین پر اپنی مٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ ("المنجدل أي: ملقى على الجدالة وهي الأرض ج أي كان بعد ترابا لم يصور و لم يخلق"[4] كذا في مجمع البحار)۔ غرض یہ ہے کہ آدم علیہ السلام ابھی تک مٹی ہی تھے، ان کی صورت اور خلق کچھ نہیں ہوئی تھی۔

10 حدیثِ دیگر: امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: مجھے محمد بن جبیر بن مطعم رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے خبر دی۔ سیدنا جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: بے شک میرے لیے نام ہیں۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں کہ میرے سبب سے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹاتا ہے اور میں حاشر ہوں کہ میرے قدموں پر لوگ حشر کیے جائیں گے اور میں عاقب ہوں کہ جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔[5] (أخرجاه في الصحيحين)

11 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر اس شخص کی طرح نکلے جو رخصت کرنے والا ہوتا ہے تو فرمایا کہ میں نبی امی ہوں، تین بار فرمایا اور نہیں ہے کوئی نبی میرے بعد اور میں فواتح الکلم دیا گیا ہوں اور اس کے جوامع اور اس کے خواتم اور میں نے جان لیا کہ کتنے خازنِ نار ہیں اور کتنے عرش کے اٹھانے والے ہیں۔ ("مفاتیح الکلم" اور "مفاتح الکلم" بھی مروی ہے، یہ دونوں مفتاح کی جمع ہیں اور مفتح کی۔ اصل ان کی وہ شے ہے جن سے بند کی ہوئی چیزوں کو کھولا جاتا ہے جن بند چیزوں کی طرف پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے مراد وہ بلاغت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی تھی اور معنی کی

---

1. صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٦٧)
2. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٦) مسند أحمد (٣/ ٩)
3. مسند أحمد (٤/ ١٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٩١)
4. مجمع بحار الأنوار (١/ ٣٣٢)
5. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٤)

گہرائی تک پہنچنا اور عبارتوں اور الفاظ کی حکمتوں اور خوبیوں کو جان لینا جو آپ ﷺ کے غیر، یعنی دوسروں پر مغلق و متعذر (بند اور مشکل) تھے۔ "جوامع": جامعہ کی جمع ہے، مراد قرآن شریف ہے کہ اس کے ذرا سے لفظوں میں بہت سے معانی جمع کیے گئے ہیں۔ "خواتم": سے مراد قرآن شریف ہے کہ اس سے آسمانی کتابیں ختم کی گئیں، یہ باقی کتابوں پر حجت ہے اور ان کی تصدیق کرنے والا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ "أعطي جوامع الكلم بخواتمه" مراد قرآن و حدیث ہے۔ گویا معانی کثیرہ کو اس طرح سے ختم کرتا ہے کہ کوئی بھی اس کی مٹھاس اور مضبوطی کے لحاظ سے اس کو طلب کیے بغیر نہیں رہ سکتا)۔ میرا اپنی امت سے تعارف کرایا گیا ہے۔ جب تک میں تم میں ہوں میری سنتے رہو اور مانتے چلے جاؤ، جب میں رخصت ہو جاؤں تو کتاب اللہ کو مضبوط تھام لو اور اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔[1]

(تفرد به الإمام أحمد و رواه الإمام أحمد أيضا عن يحيى بن إسحاق عن ابن لهيعة عن عبد لله بن هبيرة عن عبد لله بن شريح الخولاني عن أبي قيس مولى عمرو بن العاص عن عبد الله بن عمرو ﷺ فذكر مثله سواء و الأحاديث في هذا كثيرة)

چنانچہ یہ بندوں پر اللہ پاک کی رحمت میں سے ہے کہ ان کی طرف محمد ﷺ کو بھیجا۔ پھر جن امور کے ساتھ آپ کو مشرف فرمایا ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ سے انبیاء اور مرسلین کو ختم کیا اور آپ کے لیے دینِ حنیف کو کامل فرمایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اس کے رسول ﷺ نے سنتِ متواترہ میں جو اُن سے مروی ہیں، یہ خبر دی ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، تاکہ لوگ جان لیں کہ جو کوئی آپ ﷺ کے بعد اس مقامِ عالی کا دعویٰ کرے، وہ کذاب اور افاک (بہتان باز) اور گمراہ ہے اور گمراہ کرنے والا ہے، خواہ وہ کتنی ہی چالاکی اور شعبدہ بازی کرے اور طرح طرح کے جادو اور طلسم اور نئی نئی باتیں لائے۔

عقل مندوں کے نزدیک یہ سب چیزیں محال اور ضلال (گمراہی) ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے اسود عنسی کے ہاتھ پر یمن میں اور مسیلمہ کذاب کے ہاتھ پر یمامہ میں احوالِ فاسد اور اقوالِ بارد سے وہ شے جاری کر دی تھی، جس سے ہر عقل اور فہم والے شخص نے یہ بات جان لی تھی کہ وہ دونوں جھوٹے ہیں۔ لعنهما الله تعالیٰ۔ اور اسی طرح روزِ قیامت تک ہر کوئی شخص جو نبوت کا دعویٰ کرے، وہ کذاب ہے، یہاں تک کہ ان کذابین کا خاتمہ مسیح دجال پر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ امور میں سے ایسے امر پیدا کرے گا جن کی وجہ سے مومنین اور علماء اس شخص کے جھوٹ کی شہادت دیں گے جو اُن کو لے کر آیا ہے اور یہ بات اپنی مخلوق پر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے ہے، کیوں کہ وہ لوگ بہ سببِ ضرورت واقع کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کریں گے مگر اتفاق سے یا اس لیے کہ اس میں ان کے کوئی اور مقاصد ہوں گے اور وہ اپنے قول و فعل میں حد درجے کے افک اور فجور میں ہوں، جیسا کہ اللہ پاک نے

[1] مسند أحمد (۲/ ۱۷۲) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه ابن لهيعة وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۱/ ۴۱۱)

فرمایا ہے: ﴿ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ [الشعراء: ۲۲۱۔ ۲۲۲] ''کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر جھوٹے گناہ گار پر اترتے ہیں۔'' اور یہ انبیاء علیہم السلام کے حال کے بالکل خلاف ہے، کیوں کہ وہ انتہا درجے کی نیکی اور سچائی اور ہدایت اور استقامت پر ہیں اس شے میں جس کو کہتے ہیں اور کرتے ہیں اور جس کا امر کرتے ہیں اور جس سے منع فرماتے ہیں مع ان خوارقِ عادات (معجزے) اور دلائلِ واضح اور براہینِ باہرات کے کہ جن کے ساتھ ان کی تائید کی جاتی ہے۔ صلوات الله و سلامه عليهم دائما مستمرا ما دامت الأرض والسماوات.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے حقیقی والد نہیں ہیں، یہاں تک کہ ان کی بیوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام ہو اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک کے باپ ہیں، جس کی ولادت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوئی ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے باپ نہیں ہیں جس کی ولادت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوئی ہے۔ اور ذکور (لڑکوں) میں سے آپ کے بیٹے ابراہیم، قاسم، طیب اور مطہر رضی اللہ عنہم پیدا ہوئے۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: لیکن آپ کا کوئی فرزند زندہ نہیں رہا، یہاں تک کہ وہ رَجل ہو، یعنی جوان مرد عاقل و بالغ ہو۔ سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما تو یہ دونوں بچے تھے آپ کے دو ہم عصر مرد نہیں ہوئے۔[3]

علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر رسول اپنی امت کا باپ ہے، اس بات میں جس سے کہ اس کی عزت، وقار اور تعظیم واجب ہوتی ہے اور اس کی طرف سے شفقت اور نصیحت واجب ہوتی ہے نہ کہ اور احکام جو باپ اور اولاد کے درمیان ہوتے ہیں، یعنی آپ اُمت کے باپ ہیں، اس بات میں کہ اُمت پر آپ کی تعظیم اور توقیر باپ کی طرح واجب ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اور آپ پر اُمت کی شفقت اور نصیحت واجب ہے۔ اور سیدنا زید رضی اللہ عنہ تمھارے مردوں میں سے ایک مرد ہیں، جو حقیقتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نہیں ہیں، چنانچہ زید رضی اللہ عنہ کا حکم دوسرے رجال کی طرح ہے اور اس کو متبنیٰ کر لینا ایک خصوصیت اور قرب کے لیے ہے، وگرنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔[4]

امام اخفش اور فراء رحمہما اللہ نے کہا: ''وَلٰكِنْ كَانَ رَسُوْلَ اللّٰهِ'' یعنی ''رَسُوْلَ اللّٰهِ'' اس بنا پر منصوب ہے کہ ''کَانَ'' مقدر کی خبر ہے اور رفع بھی جائز رکھا ہے۔ امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے اسی طرح پڑھا ہے بہ رفع ''رسول'' و ''خاتم'' اس بنا پر کہ ''ھو'' مقدر کی خبر ہے، یعنی لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔ جمہور نے بہ تخفیفِ ''لکن'' اور بہ نصبِ ''رسول'' و ''خاتم'' پڑھا ہے۔ نصب کی وجہ وہی ہے کہ ﴿ كَانَ ﴾ مقدر کی خبر ہے، جیسا کہ

---

① تفسير ابن كثير (٣/ ٦٤٥۔ ٦٤٧)
② فتح القدير (٤/ ٣٧٦)
③ تفسير القرطبي (١٤/ ١٩٥)
④ تفسير النسفي (٣/ ٣٠٨)

گزر چکا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اَبَآ اَحَدٍ ﴾ پر عطف ہو۔ امام ابو عمرو سے ایک روایت میں بہ تشدید "لکن" و نصبِ "رسول" ہے، اس بنا پر کہ "لکن" کا اسم ہے اور اس کی خبر محذوف، یعنی "لٰكِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ هُوَ"۔ جمہور نے "خَاتِم" بکسرِ تاء اور عاصم نے بہ فتحِ تاء "خَاتَم" پڑھا ہے۔ پہلے کہ یہ معنی ہیں کہ آپ نے نبیوں کو ختم کیا ہے، یعنی ان کے آخر میں آئے ہیں۔ دوسرے کے یہ معنی ہیں کہ آپ نبیوں کے لیے خاتم کی طرح ہو گئے کہ جس سے وہ مہر لگائے جاتے ہیں[1] اور آپ کے ان میں سے ہونے کے ساتھ متزین ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ حرف تا کا کسرہ وفتحہ دو لغت ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلْوَجْهُ الْكَسْرُ"، یعنی بہتر وجہ کسرہ ہے، اس لیے کہ تاویل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو ختم کیا ہے تو آپ ان کے خاتم ہوئے اور خود آپ ﷺ نے فرمایا ہے: «أَنَا خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ»[2] اور خاتمِ شے آخرِ شے ہے، اسی معنی سے عرب کا یہ قول ہے: "خَاتِمُهُ الْمِسْكُ"

حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "اَلْخَاتَمُ هُوَ الَّذِيْ خُتِمَ بِهِ"[3] یعنی خاتم وہ شے ہے جس کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے نبوت کو ان سے ختم کر دیا، چنانچہ نہ ان کے بعد کوئی نبوت ہے نہ ان کے ساتھ نبوت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مراد یہ ہے کہ اگر میں اس سے نبیوں کو ختم نہ کرتا تو اس کا کوئی بیٹا ٹھہراتا جو اس کے بعد نبی ہوتا۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ حکم کیا کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہے تو ان کو کوئی نرینہ اولاد عطا نہیں کی کہ وہ رَجل ہو جائے۔[4] اور عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے نبی کیے گئے ہیں اور جس وقت نازل ہوں گے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے نازل ہوں گے، گویا وہ آپ ﷺ کی امت کے بعض ہیں۔

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴾ یعنی اللہ پاک کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس کی معلومات میں سے یہ احکام ہیں جو مذکور ہوئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بی بی زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو لوگ بولے کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ... الآية ﴾ رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو متبنیٰ کیا تھا اور وہ صغیر تھا۔ پھر ٹھہرا یہاں تک کہ رجل ہو گیا، یعنی جوان مرد، اس کو زید بن محمد کہتے تھے، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [الأحزاب: ٥] یعنی اعدل۔[5] (أخرجه الترمذي وصححه وابن جرير وابن المنذر والطبراني وغيرهم)

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ١٩٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٦)

[3] فتح القدير (٤/ ٣٧٦) [4] تفسير البغوي (٦/ ٣٥٩)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠٧) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٧٤) المعجم الكبير (٢٤/ ٤١) فتح البيان (١١/ ١٠٠_ ١٠٢)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿41﴾ وَّسَبِّحُوْهُ
بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿42﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ
لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ
رَحِيْمًا ﴿43﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا
كَرِيْمًا ﴿44﴾

اے ایمان والو! تم اللہ کو کثرت سے یاد کرو (41) اور تم صبح و شام اس کی تسبیح کرو (42) وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی (رحمت کی دعا کرتے ہیں) تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے اور اللہ مومنوں پر بہت رحم کرنے والا ہے (43) جس دن وہ اس (اللہ) سے ملیں گے تو ان کی دعا ہوگی ''سلام'' اور اللہ نے ان کے لیے عمدہ و پاکیزہ اجر و ثواب تیار کیا ہے (44)

ذکرِ الٰہی کی کثرت کے فضائل:

ان کا تحفہ سلام ہوگا، یعنی ان پر سلام بھیجے گا اور آپس میں بھی یہی دعا ہے اور ہوگی۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے مومن بندوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے پروردگار تبارک و تعالیٰ کو بہت یاد کیا کریں، جس نے ان پر انواع و اقسام کی نعمتیں اور احسانات کیے ہیں، اس لیے کہ کثرت سے یاد کرنے میں ان کے لیے بہت زیادہ اجر و ثواب اور بہت اچھا ٹھکانا ہے، یعنی جیسا وہ بہ کثرت اس کو یاد کریں گے، ویسا ہی وہ ان کو ثوابِ کثیر دے گا اور ان کو بہتر ٹھکانے کی جگہ عطا فرمائے گا، یعنی بہشت عنبر سرشت کہ جس میں سوائے راحت و آرام اور عیش و عشرت کے اور کچھ نہ ہوگا۔ رنج و تکلیف کا نام تک نہ سنیں گے۔

بہشت آنجا کہ آزاری نباشد کسی را باکسے کارے نباشد

''بہشت وہ جگہ ہوتی ہے جہاں کسی قسم کا دکھ نہیں ہوتا اور کسی فرد کا کسی دوسرے سے کوئی معاملہ متعلق نہیں ہوتا۔ ہر ایک آزاد اور بے نیاز ہوتا ہے۔''

بس وہ ہوں گے اور حور و قصور و غلمان ہوں گے اور طرائف ہدایا و تحائف (نذرانوں اور تحفوں کے بھرے ہوئے خیمے) ہوں گے اور رحمان کی رضا ہوگی۔ اللهم ارزقنا بكرمك الفسيح وفضلك الوسيع، وصل وسلم وبارك عليه و على آله وصحبه عدد معلوماتك وملء مخلوقاتك يا حي يا قيوم يا ذاالجلال و الإكرام و يا ذا الفضل و الكرم والإنعام آمين.

1 امام احمد رحمہ اللہ نے عن ابی بحریہ عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ وَأَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيكِكُمْ وَأَرْفَعِهَا فِي دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ إِعْطَاءِ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ وَخَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوا أَعْنَاقَكُمْ قَالُوا: وَمَا هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ ﷺ: ذِكْرُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ» [1] (وهكذا رواه الترمذي وابن ماجه من حديث عبد الله بن سعيد ابن أبي هند عن زياد مولى ابن عياش عن أبي بحرية واسمه عبد الله بن قيس التراغمي عن أبي الدرداء رضي الله عنه به، قال الترمذي: ورواه بعضهم عنه فأرسله، قلت: وقد تقدم هذا الحديث عند قوله تعالىٰ: ﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ﴾ في مسند الإمام أحمد من حديث زياد بن أبي زياد مولى عبدالله بن عياش أنه بلغه عن معاذ بن جبل رضي الله عنه عن رسول الله ﷺ بنحوه فالله أعلم) یہ حدیث شریف مع ترجمہ پہلے گزر چکی ہے۔

2 امام احمد رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ایک دعا ہے کہ میں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، میں اسے نہ چھوڑوں گا، وہ دعا یہ ہے: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي أُعْظِمُ شُكْرَكَ، وَأَتَّبِعُ نَصِيحَتَكَ، وَأُكْثِرُ ذِكْرَكَ وَأَحْفَظُ وَصِيَّتَكَ» یعنی الٰہی! مجھے ایسا کر دے کہ میں تیرے شکر کی عظمت کروں اور تیری نصیحت کا پیرو ہوں اور تیری یاد بہت سی کیا کروں اور تیری وصیت کو نگاہ میں رکھوں۔ [2] (و رواه الترمذي عن يحيىٰ بن موسى عن وكيع عن أبي فضالة الفرج بن فضالة عن أبي سعيد الحمصي عن أبي هريرة رضي الله عنه فذكر مثله وقال: غريب وهكذا رواه الإمام أحمد أيضا عن أبي النضر هشيم بن القاسم عن فرج بن فضالة عن أبي سعيد المدني عن أبي هريرة رضي الله عنه فذكره)

3 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ دو اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے تو ایک نے عرض کی: یارسول اللہ! کون سا آدمی بہتر ہے؟ فرمایا: جس کی عمر دراز ہوئی اور اس کا عمل اچھا ہوا۔ دوسرے نے عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک اسلام کی شریعت کے احکام حقیقتاً ہم پر بہت ہوگئے، آپ مجھے ایک ایسے امر کا حکم فرمائیں کہ میں اس کو خوب مضبوط پکڑ لوں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہمیشہ تیری زبان تر رہے۔ [3] (و روى الترمذي و ابن ماجه الفصل الثاني من حديث معاوية بن صالح به، وقال الترمذي: حديث حسن غريب)

4 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد بہت کرو، یہاں تک کہ لوگ تمھیں مجنون کہیں۔ [4]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٩٠) مسند أحمد (٥/ ١٩٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٦٢٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٠٤ـ ٢، ت: بشار عواد) مسند أحمد (٢/ ٣١١) اس کی سند میں ''فرج بن فضالہ'' ضعیف راوی ہے۔(ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١١٦٦)

[3] مسند أحمد (٤/ ١٩٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٩٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٧٠٠)

[4] مسند أحمد (٣/ ٦٨) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥١٧)

5 امام طبرانی رحمہ اللہ نے عن ابی الجوزاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «اُذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْراً» (اس کے بعد اصل میں بیاض ہے قرینہ اس کا مقتضی ہے کہ صرف ''حتی'' کا لفظ ساقط ہو گیا ہے، یعنی اتنا کثرت سے ذکر کرو، یہاں تک کہ منافق کہنے لگیں کہ دکھاوا کرتے ہیں۔ واللہ أعلم۔ فتح میں یہ الفاظ ہیں: «اذكروا الله حتى يقول المنافقون إنكم مراؤون»)۔[1]

6 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے قوم جو کسی مجلس میں بیٹھیں اور اللہ کا ذکر نہ کریں اس مجلس میں، مگر وہ قیامت کے دن اس مجلس کو حسرت دیکھیں گے۔[2]

7 علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بھی کوئی فریضہ مقرر کیا ہے تو اس کے لیے ایک مقرر حد ٹھہرائی ہے، پھر عذر کی حالت میں ان اہلِ فریضہ کا عذر قبول کیا سوائے ذکر کے، کیوں کہ اس کے لیے اللہ پاک نے کوئی حد مقرر نہیں کی کہ وہ اس کی انتہا ہو اور نہ کوئی اس کے ترک کرنے میں معذور رکھا گیا ہے، مگر جو اس کے ترک پر مغلوب کر دیا جائے (فتح کے الفاظ یہ ہیں: ''فإن الله لم يجعل له حدا ينتهي إليه ولم يعذر أحدا في تركه إلا مغلوبا على عقله''[3] یعنی جس کی عقل مغلوب ہو جائے، ہوش وحواس باقی نہ رہیں، اس وقت وہ معذور ہے)۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کا ذکر کرو کھڑے اور بیٹھے ہوئے اور اپنی کروٹوں پر، دن میں اور رات میں، خشکی اور تری میں، سفر وحضر میں، غنا اور فقر میں، صحت اور بیماری میں، چھپے اور کھلے اور ہر حال پر۔ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ یعنی اس کی پاکی بیان کرو صبح اور شام۔ پھر جب تم یہ کرو گے تو تم پر اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجیں گے۔[4]

اللہ کے ذکر پر آمادہ کرنے کے لیے احادیث اور آثار بہت زیادہ ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے پر آمادہ کیا ہے اور رغبت دلائی ہے۔ رات اور دن سے متعلق جو اذکار ہیں ان کے بارے میں لوگوں نے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، جیسے: نسائی ومعمری وغیرہما۔ ذکر کی کتابوں میں سے بہترین کتاب شیخ محی الدین نووی رحمہ اللہ کی تصنیف کردہ کتاب ''كتاب الأذكار'' ہے۔

قولہ سبحانہ: ﴿ وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ سے مراد صبح اور شام ہے جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا

---

[1] المعجم الكبير (١٢/ ١٦٩) فتح القدير (٤/ ٣٨١) فتح البيان (١١/ ١٠٣) اس کی سند میں ''حسن بن ابی جعفر'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥١٥)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٢٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٠)

[3] فتح القدير (٤/ ٣٨٠) فتح البيان (١١/ ١٠٢) [4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٨٠)

ہے: ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴾ [الروم: ۱۷] ''پس اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھا کرو جب کہ تم شام کرو اور جب صبح کرو۔ تمام تعریفوں کے لائق آسمان وزمین میں صرف وہی ہے تیسرے پہر اور ظہر کے وقت بھی (اس کی پاکیزگی بیان کرو)۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ ﴾ میں اللہ کے ذکر پر ابھارنا ہے، یعنی اللہ پاک تمھارا ذکر کرتا ہے تو تم بھی اس کا ذکر کرو جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾ [البقرة: ۱۵۱۔ ۱۵۲] ''جس طرح ہم نے تم میں تمھیں میں سے رسول بھیجا جو ہماری آیتیں تمھارے سامنے تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب وحکمت اور وہ چیزیں سکھاتا ہے جن سے تم بے علم تھے۔ اس لیے تم میرا ذکر کرو، میں بھی تمھیں یاد کروں گا، میری شکر گزاری کرو اور ناشکری سے بچو۔'' اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جو کوئی یاد کرے مجھے اپنے جی میں تو میں یاد کروں اس کو اپنے جی میں اور جو کوئی مجھے مجمع میں یاد کرے تو میں اس کو اس سے بہتر مجمع میں یاد کروں۔[1] اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلات اس کا فرشتوں کے نزدیک بندے کی تعریف کرنا ہے۔ اس قول کو امام بخاری رحمہ اللہ نے امام ابو العالیہ رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے۔[2] اور ابو جعفر رازی رحمہ اللہ نے عن الربیع بن انس عنہ اس کو روایت کیا ہے۔[3] کسی اور نے کہا کہ صلاۃ اللہ عزوجل کی طرف سے رحمت ہے۔ کہا ہے کہ ان دونوں قولوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے۔ واللّٰہ أعلم.

رہی فرشتوں کی صلاۃ تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ لوگوں کے لیے دعا اور استغفار کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [الغافر: ۷۔ ۹] ''عرش کے اٹھانے والے اور اس کے آس پاس کے (فرشتے) اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہر چیز کو اپنی بخشش اور علم سے گھیر رکھا ہے، پس تو انھیں بخش دے جو توبہ کریں اور تیری راہ کی پیروی کریں اور تو انھیں دوزخ کے عذاب سے بھی بچا لے۔ اے ہمارے رب! تو انھیں ہمیشگی والی جنتوں میں لے جا جن کا تو نے ان سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

[2] صحيح البخاري (٤/ ١٨٠١) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٣٩)

وعدہ کیا ہے اور ان کے باپ دادوں اور بیویوں اور اولاد میں سے (بھی) ان (سب) کو جو نیک عمل کرنے والے ہیں۔ یقیناً تو غالب اور باحکمت ہے۔ انھیں برائیوں سے بھی محفوظ رکھ، حق تو یہ ہے کہ اس دن تو نے جسے برائیوں سے بچا لیا اس پر تو نے رحمت کر دی اور بہت بڑی کامیابی تو یہی ہے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ یعنی تاکہ تم کو بسبب اپنی رحمت کے اور تم پر اپنی ثنا کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ اس کے فرشتوں نے تمھارے لیے دعا کی ہے، تمھیں جہالت اور گمراہی کے اندھیروں سے نورِ ہدایت اور یقین کی طرف نکالے۔ ﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک مومنوں پر دنیا اور آخرت میں بڑا مہربان ہے۔ دنیا میں تو اس طرح کہ حق کی طرف ان کو ہدایت کی، کون سا حق؟ وہ حق جس سے دوسرے جاہل اور بے علم رہے اور ان کو وہ راستہ دکھایا جس سے وہ لوگ ناواقف اور گمراہ ہیں جو کفر اور بدعت کی طرف بلانے والے تھے۔ اور دنیا میں یہ بھی رحمت ہے کہ ان کا کھانا ان کے لیے خوش گوار کیا۔ رہی آخرت میں اس کی رحمت اُن پر، تو وہ یہ ہے کہ ان کو بڑی گھبراہٹ سے امن دیا اور اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ جنت پر فائز ہونے اور آگ سے نجات پانے کی خوش خبری لے کر ان سے ملیں اور یہ سب اسی لیے ہے کہ اس کو ان سے محبت ہے اور ان پر نرمی اور رحم ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ کے ساتھ گزرے اور راستے میں ایک بچہ تھا، اس کی ماں نے جب لوگوں کو دیکھا تو اپنے بچے کے لیے ڈری کہ کہیں وہ اس کو روند نہ ڈالیں، چنانچہ وہ دوڑتی ہوئی اور یہ کہتے ہوئے آئی ”میرا بیٹا، میرا بیٹا“ پھر اس کو لے لیا۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈالنے والی نہیں ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی آوازیں پست فرمائیں اور فرمایا: «لَا وَاللّٰهِ!» وہ اپنے حبیب کو آگ میں نہ ڈالے گا۔[1] (إسناده على شرط الصحيحين ولم يخرجه أحد من أصحاب الكتب الستة) لیکن صحیح بخاری میں امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں میں سے ایک عورت کو دیکھا کہ اس نے اپنے بچے کو لیا، پھر اس کو اپنی چھاتی سے چپکایا اور اس کو دودھ پلایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم خیال کرتے ہو کہ یہ اپنے بچے کو آگ میں ڈالے گی اور وہ اس پر قادر ہو؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اللہ کی! البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس عورت کی اپنے بچے سے محبت اور رحمت کی نسبت زیادہ رحمت والا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ﴾ ظاہر یہ ہے۔ واللہ أعلم۔ ﴿ تَحِيَّتُهُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس دن وہ اللہ تعالیٰ سے ملیں گے، اس دن ان پر اللہ تعالیٰ سلام کرے گا، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ [یٰس: ٥٨] ”مہربان پروردگار کی طرف سے انھیں ”سلام“ کہا جائے گا۔“ امام قتادہ رحمہ اللہ

[1] مسند أحمد (٣/ ١٠٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٤)

نے زعم کیا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کو سلام کے ساتھ تحتیہ کرے گا، جس دن وہ دارِ آخرت میں اللہ تعالیٰ سے ملیں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔①

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قول کے لیے اس آیتِ کریمہ سے استدلال کیا جاتا ہے۔ ﴿دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [یونس: ۱۰] ''ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی ''سبحان اللہ'' اور ان کا باہمی سلام یہ ہوگا ''السلام علیکم'' اور ان کی اخیر بات یہ ہوگی: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہان کا رب ہے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا﴾ اجرِ کریم سے مراد جنت ہے اور اس میں جو کچھ کھانے پینے کی چیزیں ہیں اور رہنے بسنے کے مکانات اور عورتیں اور مزہ لینے کی چیزیں اور دیکھنے کی اشیاء جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ ہی کسی بشر کے دل پر ان کا خیال گزرا۔②

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنے بندوں کو امر فرمایا ہے کہ کثرت سے اس کا ذکر کیا کریں، تہلیل، تحمید، تسبیح اور تکبیر کے ساتھ اور پھر اس شے کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ذکرِ کثیر یہ ہے کہ اس کو کبھی نہ بھولے۔③ انتہٰی۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ ذکرِ کثیر پانچ نمازوں کے ساتھ ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر حال میں تحمید، تہلیل اور تکبیر ہے، یعنی الحمد للہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہتے رہنا۔④ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ ذکر کی فضیلت اور اس کی کثرت کے بارے میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ بعض کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ذکر کرنے والوں کی اور ذکر کی فضیلت پر قرآنی آیات ناطق ہیں۔ ائمۂ اہلِ سنت جنھوں نے اذکار کے بارے میں تصنیف فرمائی ہے، ان میں سے امام نسائی، امام نووی اور جزری رحمہم اللہ وغیرہم ہیں۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ نے بھی اس بارے میں کتاب ''نزل الأبرار'' نام کی تصنیف فرمائی ہے، بہت ہی نفیس اور جامع کتاب ہے جو اسلامبول مطبع جوائب میں طبع ہو کر خاص و عام کو پہنچ چکی ہے۔ فجزاه الله خيرا۔ اللہ سبحانہٗ قبول فرمائے۔ آمین.

قولہ تعالیٰ: ﴿وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ کا یہ مطلب ہے کہ دن کے شروع اور آخر میں اس شے سے اللہ پاک کی پاکی بیان کرو جو شے اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے سزاوار نہیں۔ یعنی صبح و شام کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان میں تسبیح کا ثواب زیادہ ہے۔ رہی یہ بات کہ ﴿اُذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ میں تسبیح داخل ہے، کیوں کہ ذکر عام ہے تسبیح بھی اس کی ایک فرد ہے؟ تو غرض اس بات سے آگاہ کرنا ہے اس بات پر کہ تسبیح کو اَور اذکار پر فضیلت اور زیادہ

① تفسير الطبري (۲۰/ ۲۸۰۔ ۲۸۱) ② تفسیر ابن کثیر (۳/ ٦٤٧۔ ٦٤٩)
③ تفسير البغوي (٦/ ٣٦٠) ④ فتح القدير (٤/ ٣٧٨)

شرف ہے اور اس کا ثواب زیادہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تسبیحِ بکرہ سے مراد نمازِ فجر ہے اور تسبیحِ اصیل سے مراد نمازِ مغرب ہے۔

امام قتادہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نمازِ فجر اور نمازِ عصر ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بکرہ تو نمازِ فجر ہے اور اصیل نمازِ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصیل بہ معنی عشی ہے۔ اس کی جمع اصائل ہے۔[1] بالخصوص تسبیح کی فضیلت کے بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں جو صحیحین وغیرہما کتبِ حدیث شریف میں ثابت ہیں۔ ان میں سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو کوئی دن میں سو بار "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" کہے تو اس سے اس کی خطائیں اتار دی جائیں، اگرچہ وہ دریا کی جھاگ کی طرح ہوں۔[2]

امام احمد، مسلم اور ترمذی رحمہم اللہ وغیرہم نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی اس بات سے عاجز ہوتا ہے کہ ہر دن ہزار نیکیاں کمائے؟ اس پر ایک شخص نے عرض کی کہ ہم میں کوئی ایک ہزار نیکیاں کیسے کمائے؟ فرمایا کہ وہ سو بار تسبیح کرے، یعنی "سُبْحَانَ اللّٰهِ" کہے تو اس کے لیے ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس سے ہزار خطائیں اتاری جائیں گی۔[3] کسی نے کہا کہ ﴿سَبِّحُوْهُ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ" "وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ" "وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" "وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" "وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" کہو۔ ایک نسخے میں "اَلْعَلِيِّ الْعَظِيْمُ" زیادہ ہے۔ چنانچہ تسبیح کی تعبیر اس کی اخوات کے ساتھ کی ہے (یعنی تسبیح سے مراد مجموع تسبیح اور اس کی اخوات ہیں نہ صرف اخوات جس طرح کہ ظاہر لفظِ تفسیر دلالت کرتا ہے از مصحح سلمہ)۔ اور ﴿كَثِيْرًا﴾ سے مراد یہ کلمات ہیں کہ طاہر و جنب و حائض اور محدث ان کو کہے۔

جملہ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ﴾ مستانفہ ہے۔ پہلے جو ذکر اور تسبیح کا حکم تھا، اس کے لیے یہ جملہ مثل علت کے ہے۔ اللہ کی طرف سے بندوں پر صلاۃ اس کی رحمت ہے اور اس کی ان پر برکت ہے۔ اور فرشتوں کی طرف سے دعا ہے اور ان کے لیے استغفار ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [المؤمن: ٧] امام مقاتل بن سلیمان اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے: معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے فرشتوں کو تمھارے لیے استغفار کرنے کا حکم کرتا ہے۔[4] کسی نے کہا کہ اللہ کی طرف سے صلاۃ بندے پر یہی ذکرِ جمیل کا شائع کرنا ہے اپنے بندوں میں۔ کسی نے کہا کہ اس پر ثنا ہے۔ ﴿يُصَلِّيْ﴾ کی ضمیر مستکن پر ﴿مَلٰٓئِكَتُهٗ﴾ کا عطف اس لیے ہوا ہے کہ درمیان میں ﴿عَلَيْكُمْ﴾ فاصل واقع ہو گیا ہے۔ اب ضمیر منفصل کے ساتھ تاکید کرنے کی ضرورت نہ رہی،

[1] فتح القدير (٤/ ٣٧٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٨) مسند أحمد (١/ ١٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٦٣)

[4] فتح القدير (٤/ ٣٧٩)

اس جگہ صلاۃ سے مجازی معنی مراد ہیں، جو صلاۃ اللہ بہ معنی الرحمۃ کے لیے عام ہیں اور ''صلاۃ الملائکۃ'' بہ معنی دعا کرنا کے لیے عام ہیں، تاکہ ایک ہی کلمے میں حقیقی اور مجازی معنی جمع نہ ہو جائیں۔

﴿ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ يُصَلِّيْ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی اللہ پاک اور اس کے فرشتے تمھارے امور کی پروا اور اہتمام کرتے ہیں تاکہ تم کو معاصی کی تاریکیوں سے نورِ طاعات کی طرف نکالے اور گمراہی کی ظلمت سے نورِ ہدایت کی طرف لے جائے۔ آیت کے معنی مومنوں کو ہدایت پر قائم و دائم رکھنا ہے، کیوں کہ خطاب کے وقت وہ ہدایت پر تھے۔ امام خفاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظلمات کو جمع کے صیغے میں فرمایا، اس لیے کہ کفر کی قسمیں بہت ہیں اور نور کو واحد ذکر کیا، اس لیے کہ ایمان ایک شے ہے، اس میں کسی طرح کا تعدد نہیں ہے۔

جملہ ﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴾ میں پہلے مضمون کی تقریر ہے، اس میں مومنوں کو اپنی رحمت کی خبر دی ہے، تاکہ وہ مانوس ہوں اور ثابت اور قائم رہیں، یعنی تم ایمان اور اعمالِ دین پر قائم اور دائم رہو۔ اللہ سبحانہ تم پر بڑا مہربان ہے، خاطر جمع رکھو نیک کام کیے جاؤ۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ یہ رحمت صرف انہیں لوگوں کے لیے خاص نہیں جو خطاب کے وقت موجود ہیں، بلکہ یہ رحمت تو ان کے لیے اور ان کے بعد والوں کے لیے اور دارِ آخرت کے لیے شامل اور عام ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ﴾ یعنی اللہ پاک کی طرف سے مومنوں کے لیے تحیت جس دن وہ اس سے ملیں گے، موت کے وقت، یا مر کر جی اُٹھنے کے وقت، یا جنت میں داخل ہوتے وقت، وہ اللہ عزوجل کی طرف سے سلام ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ''۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جس دن اپنے رب کو ملیں گے تو بعض کی تحیت بعض کو سلام ہوگی۔ ان کی یہ تحیت اس لیے ہوگی کہ اللہ مومنوں پر بڑا مہربان ہے، لہٰذا جب اس کی رحمت ان کو حاصل ہوئی اور اس کی سزا سے امن میں ہوئے تو خوشی اور سرور کے لیے ایک نے دوسرے کو تحیت کی، معنی یہ ہیں کہ نار کے عذاب سے سلامتی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ ان کو آفات سے سلامت رکھے گا اور ان کو ہر قسم کے ڈر اور خوف سے امن کی خوش خبری دے گا، جس دن وہ اس سے ملیں گے۔[1] کسی نے کہا کہ ﴿ يَلْقَوْنَهٗ ﴾ کی ضمیر ملک الموت کی طرف راجع ہے، وہی ان کو تحیت کریں گے، جیسا کہ وارد ہوا ہے کہ ملک الموت مومن کی روح قبض کرتے وقت اسے سلام کرتے ہیں۔[2] (قالہ البراء بن عازب رضی اللہ عنہ)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس وقت ملک الموت علیہ السلام مومن کی روح قبض کرنے کے لیے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تیرا رب تجھ پر سلام پڑھتا ہے۔[3] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان پر یہ سلام کرنا فرشتوں کا ہے جس دن کے وہ رب تعالیٰ سے ملیں گے۔ جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٧٩) [2] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٨٣) [3] الدر المنثور (٦/ ٦٢٣)

بَابٍ ﴿٢٣﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ﴾ [الرعد: ٢٣۔ ٢٤] ''اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔ (اور کہیں گے:) تم پر سلام ہو۔'' پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس رحمت کے آثار کا ذکر کیا جو جنت میں داخل ہونے سے پہلے مومنوں کو پہنچی، اس کے بعد وہ آثارِ رحمت بیان کیے جو جنت میں داخل ہونے کے بعد ان پر فائض ہوں گے۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا﴾ یعنی ان کے لیے جنت میں عزت کی روزی یا رزقِ حسن تیار کر رکھا ہے، جس کو ان کے جی چاہیں گے اور ان کی آنکھیں اس سے لطف اندوز ہوں گی۔ پھر اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کی صفات کا ذکر کیا، جن کے لیے ان کو بھیجا ہے، کیوں کہ مومنوں کو جو جنت ملی اور ہمیشہ ہمیشہ کی راحت وعشرت نصیب ہوئی، اس کا سبب وہی ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿٤٧﴾ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٤٨﴾

اے نبی! بلاشبہ ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا (بنا کر) بھیجا ہے ﴿45﴾ اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ (بنا کر بھیجا ہے) ﴿46﴾ اور مومنوں کو اس بات کی بشارت دے دیجیے کہ بے شک ان کے لیے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے ﴿47﴾ اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجیے اور ان کی ایذا رسانی نظر انداز کر دیجیے اور اللہ پر توکل کیجیے اور اللہ کارساز کافی ہے ﴿48﴾

رسول اللہ ﷺ کی بعض صفاتِ جمیلہ کا بیان:

امام احمد رحمہ اللہ نے عطا بن یسار رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ملا تو میں نے کہا ہے کہ تم مجھے رسول اللہ ﷺ کی وہ صفت بتاؤ جو تورات میں ہے تو انھوں نے کہا کہ بے شک وہ تورات میں ان بعض صفتوں کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں جو قرآن میں ہیں، یعنی ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شٰهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا﴾ ''وَحِرْزًا لِلْأُمِّيِّيْنَ، وَأَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ، سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ، لَيْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِيْظٍ وَّلَا سَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَةَ، وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَيَغْفِرُ، وَلَنْ يَّقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ

[1] فتح القدير (٤/ ٣٧٩) [2] فتح البيان (١١/ ١٠٢۔ ١٠٥)

الْعَوْجَاءَ، بِأَنْ يَّقُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَيَفْتَحُ بِهَا أَعْيُنًا عُمْيًا، وَآذَانًا صُمًّا، وَقُلُوْبًا غُلْفًا''، یعنی اے نبی! ہم نے تجھ کو بھیجا ہے گواہی دینے والا اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور بچاؤ اَن پڑھ لوگوں کے لیے، تو میرا بندہ ہے اور میرا بھیجا ہوا ہے، میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے۔ درآنحالیکہ وہ سخت گو اور سخت دل نہیں ہے اور نہ بازاروں میں چیخنے والا ہے اور نہ بدی کو بدی سے دفع کرتا ہے، لیکن معاف کرتا ہے اور بخش دیتا ہے اور ہرگز قبض نہ کرے گا اس کو اللہ، یہاں تک کہ سیدھا کر دے اس سے ٹیڑھی ملت کو، اس طرح سے کہ وہ کہیں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ۔ پس کلمۂ توحید کے سبب سے اندھی آنکھوں کو اور بہرے کانوں کو اور پردے میں پڑے ہوئے دلوں کو کھول دے گا۔[1] (وقد رواه البخاري في البيوع عن محمد بن سنان عن فليح بن سليمان عن هلال بن علي به، ورواه في التفسير عن عبد الله، قيل: ابن رجاء وقيل: ابن صالح عن عبد العزيز بن أبي سلمة عن هلال عن عطاء عن عبدالله بن عمرو به. ورواه ابن أبي حاتم عن أبيه عن عبدالله بن رجاء عن عبد العزيز بن أبي سلمة الماجشون به وقال البخاري في البيوع: وقال سعيد عن هلال عن عطاء عن عبد الله بن سلام)

(حدیث میں آنے والے الفاظ کی تشریح:

''حِرْزًا لِلْأُمِّيِّيْنَ'' بکسرِ حائے مہملہ، یعنی محفوظ اور مضبوط جگہ عرب کے لیے۔ یا ان کے لیے شیطان کی طرف سے ناگہانی آفت یا عجم کی طرف سے حملے کی صورت میں جائے پناہ۔ یا یہ معنی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی قوم کے قتل کے ساتھ نیست و نابود ہونے کے عذاب یا صرف عذاب سے بچنے کا سبب ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ [الأنفال: ٣٣] ''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دے۔''[2] (كذا في المجمع)

''لَيْسَ بِفَظٍّ'' یا تو یہ دوسری آیت ہے جو تورات میں صفت بیان کرنے کے لیے ہے، یا متوکل کی تفسیر ہے، یا ''سميتك'' کے کاف سے حال ہے۔ اس صورت میں خطاب سے صیغۂ غائب کی طرف التفات ہوگا۔ ''فظ'' تو قول میں ہے اور غلاظ قلب فعل میں۔ ''سخاب'' یعنی چیخنے والا ہے۔ ''الملة العوجاء'' یعنی ملتِ ابراہیم جس کو عرب نے اس کی استقامت سے تبدیل کر دیا تھا۔ قولہ: ''بأن يقولوا'' ''يقيم'' سے متعلق ہے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفاتِ مذکورہ قرآن شریف میں موجود ہیں۔ صخب فی الاسواق کا مفہوم ''كن من الساجدين'' سے سمجھ میں آتا ہے، کیوں کہ اس طرح وارد ہوا ہے کہ ''أمرت بأن أكون من الساجدين لا من التاجرين الذين يصخبون في الأسواق'' اسی طرح اس کے علاوہ اور اوصاف مذکور ہیں یا ضمناً یا صریحاً)

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک نبی، جن کو شعیاء کہتے تھے، کی طرف

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠١٨ـ ٤٥٥٨) مسند أحمد (٢/ ١٧٤) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٤٠)

[2] مجمع بحار الأنوار (١/ ٤٨٧)

وحی کی: ”أَنْ قُمْ فِيْ قَوْمِكَ بَنِي إِسْرَائِيْلَ، فَإِنِّيْ مُنْطِقٌ لِسَانَكَ بِوَحْيٍ وَّأَبْعَثُ أُمِّيًّا مِنَ الْأُمِّيِّيْنَ أَبْعَثُهُ لَيْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِيْظٍ وَّلَا سَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ، لَوْ يَمُرُّ إِلٰى جَنْبِ سِرَاجٍ لَمْ يُطْفِئْهُ مِنْ سَكِيْنَتِهِ وَلَوْ يَمْشِيْ عَلَى الْقَصَبِ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ تَحْتِ قَدَمَيْهِ، أَبْعَثُهُ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا لَا يَقُوْلُ الْخَنٰى، أَفْتَحُ بِهَا أَعْيُنًا كُمْهًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوْبًا غُلْفًا، أُسَدِّدُهُ لِكُلِّ أَمْرٍ جَمِيْلٍ وَأَهَبُ لَهُ كُلَّ خُلُقٍ كَرِيْمٍ وَأَجْعَلُ السَّكِيْنَةَ لِبَاسَهُ وَالْبِرَّ شِعَارَهُ وَالتَّقْوٰى ضَمِيْرَهُ وَالْحِكْمَةَ مَنْطِقَهُ وَالصِّدْقَ وَالْوَفَاءَ طَبِيْعَتَهُ وَالْعَفْوَ وَالْمَعْرُوْفَ خُلُقَهُ وَالْحَقَّ شَرِيْعَتَهُ وَالْعَدْلَ سِيْرَتَهُ وَالْهُدٰى إِمَامَهُ وَالْإِسْلَامَ مِلَّتَهُ وَأَحْمَدَ اسْمَهُ، أَهْدِيْ بِهِ بَعْدَ الضَّلَالَةِ وَأُعْلِمُ بِهِ بَعْدَ الْجَهَالَةِ وَأَرْفَعُ بِهِ بَعْدَ الْخَمَالَةِ وَأُعْرِفُ بِهِ بَعْدَ النُّكْرَةِ وَأُكَثِّرُ بِهِ بَعْدَ الْقِلَّةِ وَأُغْنِيْ بِهِ بَعْدَ الْفُرْقَةِ وَأُؤَلِّفُ بِهِ بَيْنَ أُمَمٍ مُتَفَرِّقَةٍ وَقُلُوْبٍ مُخْتَلِفَةٍ وَأَهْوَاءٍ مُتَشَتِّتَةٍ وَأَسْتَنْقِذُ بِهِ فِئَامًا مِنَ النَّاسِ عَظِيْمَةً مِنَ الْهَلَكَةِ وَأَجْعَلُ أُمَّتَهُ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ مُوَحِّدِيْنَ مُؤْمِنِيْنَ مُخْلِصِيْنَ مُصَدِّقِيْنَ لِمَا جَاءَتْ بِهِ رُسُلِيْ أُلْهِمُهُمُ التَّسْبِيْحَ وَالتَّحْمِيْدَ وَالثَّنَاءَ وَالتَّكْبِيْرَ وَالتَّوْحِيْدَ فِيْ مَسَاجِدِهِمْ وَمَجَالِسِهِمْ وَمَضَاجِعِهِمْ وَمُنْقَلَبِهِمْ وَمَثْوَاهُمْ يُصَلُّوْنَ لِيْ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَيُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ صُفُوْفًا وَزُحُوْفًا وَيَخْرُجُوْنَ مِنْ دِيَارِهِمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِيْ أُلُوْفًا، يُطَهِّرُوْنَ الْوُجُوْهَ وَالْأَطْرَافَ وَيَشُدُّوْنَ الثِّيَابَ فِي الْأَنْصَافِ، قُرْبَانُهُمْ دِمَاؤُهُمْ وَأَنَاجِيْلُهُمْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ، رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ لُيُوْثٌ بِالنَّهَارِ، وَأَجْعَلُ فِيْ أَهْلِ بَيْتِهِ وَذُرِّيَّتِهِ السَّابِقِيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ، أُمَّتُهُ مِنْ بَعْدِهِ يَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُوْنَ، وَأُعِزُّ مَنْ نَصَرَهُمْ وَأُؤَيِّدُ مَنْ دَعَا لَهُمْ وَأَجْعَلُ دَائِرَةَ السَّوْءِ عَلٰى مَنْ خَالَفَهُمْ أَوْ بَغٰى عَلَيْهِمْ أَوْ أَرَادَ أَنْ يَّنْتَزِعَ شَيْئًا مِمَّا فِيْ أَيْدِيْهِمْ، أَجْعَلُهُمْ وَرَثَةً لِنَبِيِّهِمْ وَالدَّاعِيَةَ إِلٰى رَبِّهِمْ، يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ وَيُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ، أَخْتِمُ بِهِمُ الْخَيْرَ، بَدَأْتُهُ بِأَوَّلِهِمْ، ذٰلِكَ فَضْلِيْ أُوْتِيْهِ مَنْ أَشَاءُ وَأَنَا ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ“ [1] (هكذا رواه ابن أبي حاتم عن وهب بن منبه اليماني)

”تو کھڑا ہو اپنی قوم بنی اسرائیل میں، پس بے شک میں بلوانے والا ہوں تیری زبان کو وحی کے ساتھ اور میں اُن اَن پڑھوں میں ایک اَن پڑھ کو بھیجوں گا۔ وہ نہ تو سخت گو ہوگا، نہ سخت دل اور نہ بازاروں میں چیخنے والا، اگر وہ کسی چراغ کے پاس سے گزرے گا تو اپنی سکینت کی وجہ سے اسے نہ بجھائے گا اور اگر بانسوں پر چلے گا تو پاؤں کے نیچے سے اس کی آواز سنائی نہ دے گی، میں اس کو خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بھیجوں گا، وہ فحش بات نہ کہے گا،

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۹/ ۳۱۴۰ـ ۳۱۴۱)

میں اس کے کلمۂ توحید سے اندھی آنکھوں کو کھولوں گا، بہرے کانوں کو اور پردہ پڑے ہوئے دلوں کو درست اور صحیح کروں گا۔ سکینت کو اس کا لباس اور نیکی اور احسان کو اس کا شعار اور تقویٰ کو اس کے دل کی چھپی بات اور حکمت کو اس کی بات اور صدق اور راستی اور وفا کو اس کی طبیعت اور عفو و درگزر و نیک بات کو اس کی عادت اور حق کو اس کی شریعت اور عدل کو اس کا طریقہ، یعنی چال چلن اور ہدایت کو اس کا پیشوا اور اسلام کو اس کی ملت اور احمد کو اس کا نام کروں گا۔ میں اس کے ساتھ گمراہی کے بعد ہدایت کروں گا اور اس کے سبب سے جہالت کے بعد علم دوں گا اور اس کی وجہ سے گم نامی کے بعد نام بلند کروں گا اور اس کے سبب سے نہ پہچانے جانے والوں کو پہچنواؤں گا اور اس کے سبب سے کمی کے بعد کثرت کروں گا اور فقر کے بعد غنی کروں گا اور اس کی وجہ سے فرقوں میں بٹے ہوئے لوگوں کو جمع کروں گا اور اس سے مختلف اُمتوں کے درمیان ملاپ کروں گا اور مختلف دلوں کے درمیان اور متفرق خواہشوں کے درمیان۔ اور اس کے سبب سے لوگوں کے بڑے گروہوں کو ہلاکت سے چھڑاؤں گا اور اس کی اُمت کو وہ بہترین اُمت کروں گا جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے، جو نیک بات کا حکم کرتے ہیں اور بری بات سے روکتے ہیں۔ وہ توحید کرنے والے ہیں، ایمان لانے والے ہیں، اخلاص کرنے والے ہیں، اس چیز کی تصدیق کرنے والے ہیں جس کو میرے پیغمبر لائے۔ میں ان کو الہام کروں گا: تسبیح، تحمید، ثنا، تکبیر اور توحید کا ان کی مسجدوں میں، ان کی مجلسوں میں، ان کے بستروں میں، ان کی جائے رجوع میں اور ان کی اقامت گاہوں میں۔ وہ میرے لیے کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر نماز ادا کریں گے اور اللہ کی راہ میں صفیں باندھ کر اور چل کر لڑیں گے اور میری رضا کی خاطر ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلیں گے، اپنے چہروں اور انگلیوں کو ظاہر کریں گے اور اپنے کپڑوں کو کمروں میں باندھیں گے۔ ان کی قربانی ان کے خون ہیں اور ان کی انجیلیں ان کے سینے ہیں۔ رات کو رہبان دن کو شیر ہیں اور میں اس کے اہلِ بیت اور اولاد میں سے سابقین، صدیقین، شہداء اور صالحینِ امت کروں گا جو اس کے بعد حق کے ساتھ ہدایت کریں گے اور اسی کے ساتھ عدل کریں گے اور جو اس کی مدد کرے گا، اس کو عزت دوں گا اور جو اُن کو بلائے گا اس کی تائید کروں گا اور جو اُن کی مخالفت کرے گا یا ان پر بغاوت کرے گا یا یہ ارادہ کرے گا کہ جو کچھ ان کے ہاتھوں میں ہے، اس میں سے کچھ چھین لے تو اس پر دائرۂ سوء کروں گا، یعنی بُرا وقت لاؤں گا، میں ان کو اُن کے نبی کا وارث کروں گا اور اپنے رب کی طرف بلانے والے کر دوں گا، وہ نیک بات کا حکم کریں گے اور بری بات سے منع کریں گے اور نماز کو قائم رکھیں گے اور زکات دیں گے اور اپنے عہد کو پورا کریں گے، میں ان کے ساتھ اس خیر کو ختم کروں گا جس کی میں نے ان سے پہلے ابتدا کی تھی، یہ میرا فضل ہے، میں دیتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میں بڑے فضل والا ہوں۔''

(اس حدیث کے مشکل الفاظ کی تشریح: ''الخنا: بالقصر الفحش في القول'' یعنی فحش کلامی۔ ''السکینة:

التأني في الحركات و اجتناب العبث" یعنی فضول باتوں سے پرہیز کرنا۔ "الأکمه: الأعمی وقیل هو من یولد أعمی"۔ یعنی پیدائشی اندھا۔ "الشعار: ما واری الجسد من الثیاب یعني إن البر یلازمه ملازمة الشعار جسده" یعنی نیکی اس کے ساتھ ایسے لازم ہے جیسے جسم کے ساتھ بال ہوتے ہیں۔ "الخمالة: بفتح معجمة الخامل من لا شرف له ولا رفعة" یعنی جس شخص کی نہ کوئی رفعت اور نہ شرف ہو۔ "النکرة: أعرف به ما تنکر و تغیر و صار مجهولا من قواعد الدین الحنیفیة و أرکانها" یعنی جو شخص دینِ حنیف کے قواعد اور ارکان سے نا واقف ہے۔ "قربانهم": قربان قرب کا مصدر ہے یعنی "یتقربون إلی الله بإراقة دمائهم في الجهاد و کان قربان الأمم الماضیة ذبح البقرة ونحوه"[1] کذا في المجمع)

پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، کہا کہ جب ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ﴾ نازل ہوئی اور آپ سیدنا علی اور معاذ رضی اللہ عنہما کو حکم دے چکے تھے کہ یمن کی طرف جائیں تو فرمایا: تم جاؤ، پس خوش خبری سنانا اور نفرت مت دلانا اور آسانی کرنا اور مشکل مت ڈالنا، بے شک مجھ پر یہ حکم نازل کیا گیا ہے: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ﴾۔[2] امام طبرانی رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود اس حدیث کی مثل روایت کیا ہے اور اس کے آخر میں یوں کہا ہے: پس بے شک مجھ پر نازل کیا گیا ہے: "یَا أَیُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا عَلیٰ أُمَّتِكَ وَمُبَشِّرًا بِالْجَنَّةِ وَنَذِیْرًا مِنَ النَّارِ وَدَاعِیًا إِلَی الشَّهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِیْرًا بِالْقُرْآنِ"[3]

پس ﴿ شَاهِدًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ گواہی دینے والا اللہ کی وحدانیت کی اور اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور قیامت کے دن لوگوں پر ان کے اعمال کی گواہی دینے والا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ شَهِيۡدًا ﴾ [النساء: ٤١] "اور آپ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے۔" نیز فرمایا: ﴿ لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ﴾ [البقرة: ١٤٣] "تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول اللہ (ﷺ) تم پر گواہ ہو جائیں۔" قولہ تعالیٰ: ﴿ وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ مومنوں کو بڑے ثواب کی خوش خبری سنانے والا اور کافروں کو سخت عذاب سے ڈرانے والا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تو خلق کو اپنے رب کی عبادت کی طرف اس کے حکم سے ڈرانے والا ہے۔ ﴿ وَسِرَاجًا مُّنِيۡرًا ﴾ یعنی تیرا کام اس حق میں جو تو لے کر آیا ہے، ظاہر و باہر ہے جس

[1] مجمع بحار الأنور (٤/ ٢٣٩) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤١)

[3] المعجم الکبیر (١١/ ٣١٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فیه عبد الرحمن بن محمد بن عبد الله العرزمي وهو ضعیف" (مجمع الزوائد: ٧/ ٢٠٩)

طرح سورج اپنی روشنی اور چمک میں ظاہر ہے۔ سوائے معاند (دشمن) کے اور کوئی اس کا انکار نہیں کرتا۔ قولہ جل وعلا: ﴿ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ ﴾ یعنی جو کچھ کافر اور منافق کہتے ہیں، اس میں ان کا کہنا مت مان ان سے درگزر کر اور ان کا کام اللہ کو سونپ دے، کیوں کہ اس میں ان کے لیے کفایت ہے اور اسی لیے اللہ جل جلالہ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی اُمت پر شاہد ہیں، جس کسی نے آپ ﷺ کی تصدیق کی اور آپ ﷺ پر ایمان لایا تو اس کے حق میں گواہی دیں گے اور جس نے آپ ﷺ کی تکذیب کی اور آپ ﷺ کا منکر ہوا تو اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی امت پر تو اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان کو رسالت پہنچا دی اور باقی اُمتوں پر یہ شہادت دیں گے کہ ان کے نبیوں نے ان کو رسالتیں پہنچا دیں[2] اور مومنوں کو اللہ کی رحمت کی اور جنت کی اور اس بڑے ثواب اور اجرِ عظیم کی خوش خبری دیں گے جو اُن کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ کافروں اور گناہ گاروں کو اس دردناک عذاب سے اور آگ سے ڈرانے والے ہیں جو اُن کے لیے مہیا کر رکھے ہیں اور اللہ کی طرف بلانے والے ہیں، اللہ کے نیک بندوں کو توحید کی طرف بلاتے ہیں اور اس شے پر ایمان لانے کی طرف بلانے والے ہیں جسے آپ ﷺ لائے ہیں، اور اس شے پر عمل کرنے کی طرف جو اُن کے لیے مشروع ہوئی ہے۔ ﴿ بِاِذْنِهٖ ﴾ کے معنی ہیں: "بِأَمْرِهٖ بِذٰلِكَ وَتَقْدِيْرِهٖ"۔ کسی نے کہا: "بِتَيْسِيْرِهٖ" (قاله الكرخي وغيره)

﴿ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ ایک چمکتا ہوا چراغ ہیں کہ گمراہی کے اندھیروں میں آپ ﷺ سے روشنی لی جاتی ہے جس طرح اندھیرے میں چراغ سے روشنی لی جاتی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ صاحبِ روشن چراغ ہیں، یعنی روشن کتاب مراد قرآن شریف ہے۔[3] نبی کریم ﷺ کی تشبیہ چراغ سے دی سورج سے نہ دی، باوجود اس کے کہ سورج کی روشنی زیادہ بالکل تمام اور کامل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ سراج سے سورج ہی مراد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴾ [نوح: ١٦] "اور سورج کو روشن چراغ بنایا ہے۔" یا سراج کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ہدایت کے سبب سے سارے علماء آپ ﷺ سے اس طرح متفرع (مترتب) ہوئے جس طرح چراغ سے بے حساب چراغ متفرع ہوتے ہیں یہ خلاف سورج کے کہ یہ بات اس میں نہیں ہے۔ ﴿ شَاهِدًا ﴾ کا نصب اور اس کے مابعد کا بنا بر حال ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ... الآية ﴾ معطوف ہے مقدر پر جو اس مقام کا تقاضا ہے۔ گویا یوں کہا:

---

[1] تفسیر ابن کثير (٣/ ٦٤٩۔ ٦٥١) [2] فتح القدير (٤/ ٣٧٩) [3] معاني القرآن (٤/ ٢٣١)

"فَاشْهَدْ" یا "فَدَبِّرْ" یا "فَرَاقِبْ أَحْوَالَ النَّاسِ وَبَشِّرْ" یعنی پس تو گواہی دے۔ یا لوگوں کے احوال کے بارے میں سوچ اور مراقبہ کر اور خوش خبری دے۔ اس جملے کا عطف ہے جملۂ سابقہ پر۔ رہی یہ بات کہ جملۂ سابق خبریہ ہے اور یہ انشائیہ تو پھر عطف کیسے ہوگا؟ تو یہ اختلاف عطف کا مانع نہیں ہے، اس لیے کہ ﴿ بَشِّرِ ﴾ کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے آپ ﷺ کو امر فرمایا اس بات کا کہ خوش خبری دیں اپنی اُمت کے مومنوں کو اس بات کی کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے، یعنی باقی اُمتوں کے مومنوں کی نسبت ان کا رُتبہ اور شرف بڑا ہے اور ان کے اعمال کا اجر، فضیلت اور احسان کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ اللہ پاک نے اس کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ﴾ [الشوریٰ: ٢٢]

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وہ بہشتوں کے باغات میں ہوں گے وہ جو خواہش کریں اپنے رب کے پاس موجود پائیں گے یہی ہے بڑا فضل۔''

امام بخاری اور امام احمد رحمہ اللہ وغیرہما نے عن عطاء بن یسار عن عمرو بن العاص جو حدیث روایت کی ہے وہ پہلے گزر چکی ہے۔ پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی حدیث کو کتاب البیوع میں یوں ذکر کیا: قال سعید عن ہلال عن عطاء عن عبداللہ بن سلام۔[1] یہاں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے بجائے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ اولیٰ ہے کیونکہ تورات کا سوال عبداللہ بن سلام ہی سے ہوا کرتا تھا، پھر جو کچھ توریت میں ہوتا وہ اس کی خبر دیا کرتے تھے۔ (اولیت کی وجہ ظاہر نہیں ہے، کیوں کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اس لحاظ سے کہ اسلام لانے سے پہلے موسوی تھے تورات کے واقف تھے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی دوسرا تورات کا واقف نہ ہو۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما تورات کے مشہور واقف کاروں میں سے ہیں)۔

غرضیکہ پھر اللہ پاک نے نبی ﷺ کو دین کے دشمنوں کی اطاعت سے منع کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: اور مت کہا مان کافروں کا اور منافقوں کا، یعنی اس بات میں جس کا وہ تجھے مشورہ دیتے ہیں کہ دین میں مداہنت کرو اور دعوت کے معاملے میں نرمی برتو۔ تبلیغ میں نرمی کا استعمال کرو، اس آیت میں آپ کی امت کو اس کا اشارہ ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ تو کفار وغیرہم کی اطاعت سے معصوم یعنی بچے ہوئے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر سورت کے شروع میں گزر چکی ہے۔

﴿ وَدَعْ اَذٰىهُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو اپنے دین میں متصلب ہے اور اپنے دشمنوں پر سخت تو اس وجہ سے تجھے ان کی طرف سے ایذا پہنچتی ہے اس کی پروا مت کر۔ اس معنی کی بنا پر مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہوگی، یا یہ معنی ہیں کہ وہ جو تجھے ایذا دیتے ہیں، اس کے بدلے میں تو انھیں ایذا مت دے، ان کی ایذا دہی کو چھوڑ دے، اس بنا پر مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہوگی۔ کسی نے کہا: یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ یعنی اپنے سارے حالات میں اللہ پر بھروسا کر۔ ﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ اور اللہ کافی ہے کام بنانے والا، سارے امور اسی کو سونپے جاتے ہیں۔ سارے کام اسی کے سپرد کیے جاتے ہیں، لہٰذا جو کوئی اپنے کام اس کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ اس کی کفایت کرتا ہے اور جو کوئی اپنے احوال اس کے حوالے کرتا ہے تو اس کو کسی اور کی حاجت نہیں رہتی۔ جب اللہ پاک نے سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا قصہ اور بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے طلاق دینے کا حال ذکر کیا اور وہ ان سے دخول کر چکے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدت پوری ہونے کے بعد ان سے پیام کیا، جیسا کہ گزر چکا ہے تو اب مومنوں کو خطاب کیا اور اس عورت کا حکم بیان فرمایا جس کو اس کا خاوند دخول سے قبل طلاق دے دے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝۴۹

اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں چھونے سے پہلے ان کو طلاق دے دو تو تمھاری طرف سے ان پر کوئی عدت نہیں کہ تم اس (عدت) کو شمار کرو، لہٰذا تم انھیں کوئی فائدہ دو اور اچھے طریقے سے رخصت کر دو ۝۴۹

ان عورتوں کا حکم جنھیں ملاپ سے پہلے طلاق دے دی جائے:

جو مرد بغیر صحبت کیے ہوئے عورت کو چھوڑ دے تو اگر اس کا مہر مقرر ہوا تھا تو آدھا دے، اگر مقرر نہیں ہوا تھا تو کچھ فائدہ دے، یعنی ایک جوڑا کپڑے۔ وہ عورت اگر چاہے تو اسی وقت دوسرا نکاح کر لے کوئی عدت نہیں۔ اور اگر خلوت ہوئی، گو صحبت نہ ہوئی تو مہر بھی پورا دینا اور عدت بھی بٹھانا۔ یہ مسئلہ یہاں فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے ذکر میں۔ شاید اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت سے نکاح کیا تھا، جب اس کے نزدیک گئے تو وہ کہنے لگی: اللہ تجھ سے پناہ دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جواب دیا: تو نے بڑے کی پناہ پکڑی۔ اس پر یہ حکم فرمایا اور ایمان والوں کو خطاب کیا، تاکہ معلوم ہو کہ پیغمبر کے لیے خاص حکم نہیں، سب مسلمانوں پر یہی حکم ہے۔ انتہی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ میں بہت سے احکام ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ صرف عقد پر نکاح کا اطلاق آیا ہے۔ قرآن شریف میں اس بارے میں اس سے زیادہ واضح کوئی اور آیت نہیں ہے۔ نکاح میں اختلاف کیا گیا ہے کہ آیا تنہا عقد میں ہی حقیقت ہے یا وطی میں یا دونوں میں۔ یہ تین قول ہوئے اور قرآن شریف میں جو استعمال ہے تو وہ عقد کے بعد وطی میں ہے مگر اس آیت میں، کیوں کہ یہاں اس کا استعمال صرف عقد

[1] فتح البیان (۱۱/ ۱۰۵۔ ۱۰۷)

میں ہوا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ ﴾ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ عورت کو قبل دخول کے طلاق دینا جائز ہے۔ مومنات کا کلمہ خارج مخرج غالب ہے، کیوں کہ اس بات میں بالاتفاق مومنہ اور کتابیہ کے حکم میں کوئی فرق نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن مسیب، حسن بصری، علی بن الحسین، امام زین العابدین رحمہم اللہ نے اور سلف کی ایک جماعت نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ طلاق صرف ایسی صورت میں واقع ہوتی ہے، جبکہ نکاح پہلے واقع ہو چکا ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ﴾ چنانچہ نکاح کے بعد طلاق کا ذکر کیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ نکاح سے پہلے طلاق صحیح نہیں ہوتی اور نہ ہی واقع ہوتی ہے۔ یہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور سلف و خلف میں سے ایک بڑی جماعت کا مذہب ہے۔ رحمهم الله تعالىٰ۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ قبلِ نکاح طلاق صحیح ہے، اس صورت میں کہ جب کوئی کہے کہ اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اسے طلاق ہے، ان کے نزدیک جب وہ اس عورت سے نکاح کرے گا تو وہ اس سے مطلقہ ہو جائے گی اور اس صورت میں دونوں کا اختلاف ہے کہ جب یوں کہے کہ ہر عورت جس سے میں نکاح کروں تو اسے طلاق ہے۔ پس امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ مطلقہ نہیں ہوگی، یہاں تک کہ عورت کا تعین کرے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کلام کے بعد ہر عورت جس سے وہ نکاح کرے گا، وہ اس سے مطلقہ ہو جائے گی۔

رہے جمہور تو انھوں نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا: جب یوں کہے کہ ہر عورت جس سے میں نکاح کروں اسے طلاق ہے۔ فرمایا: یہ کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ... الآية ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی دوسری روایت عن الحسن بن مسلم بن يناق عن ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے تو یہ فرمایا ہے: ﴿ إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ﴾ کیا تو نہیں دیکھتا کہ طلاق نکاح کے بعد ہے۔ اسی طرح محمد بن اسحاق نے عن داود بن الحصین عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ﴾ پس نہیں ہے طلاق قبل نکاح کے۔[1] اس بارے میں حدیث شریف بھی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ وارد ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابن آدم کے لیے اس شے میں طلاق نہیں ہے جس کا وہ مالک نہیں ہے۔[2] (رواه أحمد وأبو داود والترمذي وابن ماجه وقال الترمذي: هذا حديث حسن وهو أحسن شيء روي في هذا الباب) اور اسی طرح امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے علی اور

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٥١۔ ٦٥٢)

[2] مسند أحمد (٢/ ١٨٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٩٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٨٤)

مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ﴾ یہ ایک امر علماء کے نزدیک مجمع علیہ ہے کہ عورت کو دخول سے قبل اگر طلاق دی جائے تو اس پر کسی طرح کی عدت نہیں ہے۔ پھر وہ چلی جائے اور اسی وقت جس سے چاہے نکاح کر لے۔ اس سے کوئی عورت مستثنیٰ نہیں ہے، مگر وہ عورت جس کا خاوند مر گیا ہے تو وہ چار مہینے دس دن اس کی عدت پوری کرے، گو اس نے اس سے دخول نہ کیا ہو۔ یہ بات بھی بالاجماع ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴾ متعہ اس جگہ عام ہے، اس سے کہ مہر مسمی کا نصف ہو یا متعۂ خاص، اگر اس کے لیے مہر مقرر نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ ﴾ [البقرة: ۲۳۷] ''اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انھیں ہاتھ لگایا ہو اور تم نے ان کا مہر بھی مقرر کر دیا ہو تو مقررہ مہر کا آدھا مہر دے دو۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [البقرة: ۲۳۶] ''اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کیے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، ہاں انھیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو۔ خوش حال اپنے انداز سے اور تنگ دست اپنی طاقت کے مطابق دستور کے مطابق اچھا فائدہ دے۔ بھلائی کرنے والوں پر یہ لازم ہے۔''

صحیح بخاری میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ اور ابی اسید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمیمہ بنت شراحیل سے نکاح کیا، پھر جب وہ ان پر داخل کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس کی طرف پھیلا دیا۔ پھر گویا اس نے اس کو مکروہ جانا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو اسید کو حکم دیا کہ اس کی تیاری کر دے اور اس کو دو کپڑے رازقی پہنا دے[2] (رازقیہ: کتان کے سفید کپڑوں کو کہتے ہیں)۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اگر اس کے لیے مہر مقرر کیا ہے تو اس کے لیے صرف آدھا مہر ہے اور اگر مقرر نہیں کیا تو اس کو اپنی حیثیت کے مطابق متعہ دے دے، یعنی اپنی فراخی اور تنگی کے مطابق، سراحِ جمیل یہی ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس وقت تم مومن عورتوں سے یا کتابی عورتوں سے عقدِ نکاح کرو۔ مومنات کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ اس بات سے آگاہ کرنا منظور ہے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ صرف مومن عورت ہی سے نکاح کرے، تاکہ مومن کا نطفہ مومن کے لیے ہو۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۰۴۸) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (إرواء الغليل: ۷/ ۱۵۲)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٥٧) [3] تفسير الطبري (۲۰/ ۲۸۳) تفسير ابن كثير (۳/ ٦٥١۔ ٦٥٢)

کتاب اللہ میں نکاح کا لفظ صرف عقد کے معنی میں وارد ہوا ہے، جیسا کہ صاحبِ کشاف اور قرطبی وغیرہما نے کہا ہے۔[1] لفظِ نکاح میں جو تین قول ہیں وہ پہلے گزر چکے ہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کا کلام اس جگہ یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ نکاح وطی میں حقیقت ہے، کیوں کہ اس نے یوں کہا ہے کہ "اَلنِّكَاحُ الْوَطْئُ"۔

عقد کا نام نکاح اس لیے رکھا ہے کہ عقد نکاح کو ملابس ہے اس انداز سے کہ عقد طرف نکاح کے طریق ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ شراب کا نام گناہ رکھا ہے، اس لیے کہ شراب گناہ کمانے کا سبب ہے۔ کلمۂ "ثم" تراخی (تاخیر) کے لیے ہے۔ یہاں تراخی قید نہیں ہے۔ فائدہ تعبیر بہ ثم کا یہ ہے کہ اس سے وہم دور ہوتا ہے کہ طلاق کی تاخیر امکانی حد تک، جیسی نسب میں موثر ہوتی ہے ویسی ہی عدت میں موثر ہو۔ (یعنی جب کہ عورت اس بات کا دعویٰ کرے کہ جو بچہ اس کے پیدا ہوا ہے، وہ اس مرد کا ہے اور زمانۂ حمل جتنا وقت گزر گیا۔[2] قاله الشهاب)

﴿ تَمَسُّوْهُنَّ ﴾ کے معنی "تُجَامِعُوْهُنَّ" ہیں۔ لفظِ مس جماع سے کنایہ ہے۔ یہ قرآن شریف کے آداب سے ہے کہ ملامست، مماست، قربان، غشی اور اتیان کے ساتھ وطی سے کنایہ ہوتا ہے۔ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہے، انھوں نے اس آیتِ کریمہ سے استدلال کیا ہے، یہ لوگ جمہور ہیں اور سیدنا علی، ابن عباس، جابر، معاذ اور عائشہ رضی اللہ عنہم، امام سعید بن مسیّب، عروہ، شریح، سعید بن جبیر، قاسم، طاؤس، حسن، عکرمہ، عطاء، سلیمان بن یسار، مجاہد، شعبی، قتادہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر اہلِ علم اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام مالک، ابو حنیفہ، نخعی رحمہم اللہ اور اصحاب الرائے اس کے قائل ہیں کہ طلاق قبل النکاح صحیح ہے، جبکہ مرد کہے کہ جس وقت میں فلاں عورت سے نکاح کروں گا تو اسے طلاق ہے۔ چنانچہ جب وہ اس سے نکاح کرے گا تو وہ مطلقہ ہو جائے گی۔ امام ربیعہ اور اوزاعی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اگر کسی عورت کو معین کرے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر عام کہے گا تو واقع نہ ہو گی۔[3] عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «لَا طَلَاقَ فِيمَا لَا تَمْلِكُ وَلَا عِتْقَ فِيمَا لَا تَمْلِكُ وَلَا بَيْعَ فِيمَا لَا تَمْلِكُ»[4] (أخرجه أبو داود والترمذي بمعناه وعن ابن عباس رضي الله عنهما قال: جعل الله الطلاق بعد النكاح.[5] أخرجه البخاري)

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَعْتَدُّوْنَهَا ﴾ کے معنی "تُحْصُوْنَهَا بِالْأَقْرَاءِ وَالْأَشْهُرِ"، یعنی عدت کو حیض یا طہر اور مہینوں کے ساتھ شمار کرو۔ یا یہ معنی ہیں کہ "تَسْتَوْفُوْنَ عَدَدَهَا"، یعنی استیفا کرو عدت کی گنتی کا۔ یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے: "عَدَدْتُ الدَّرَاهِمَ فَأَنَا أَعْتَدُّهَا"۔ عدت شمار کرنے کی نسبت مردوں کی طرف کی، اس لیے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ عدت مردوں کا حق ہے، چنانچہ ﴿ فَمَا لَكُمْ ﴾ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ علماء رحمہم اللہ نے اس پر اجماع کیا

---

[1] الكشاف (٣/ ٥٥٧) تفسير القرطبي (١٤/ ٢٠٢) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٧٧)
[3] تفسير البغوي (٦/ ٣٦١۔ ٣٦٢) [4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [5] صحيح البخاري (٥/ ٢٠١٧)

ہے کہ جس وقت طلاق مسیس اور خلوت سے قبل ہو تو کچھ عدت نہیں ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ خلوت سے عدت اور مہر واجب ہو جاتے ہیں۔ اس اجماع کو امام قرطبی اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

جمہور نے ﴿ تَعْتَدُّوْنَهَا ﴾ دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک روایت میں اور اہلِ مکہ نے بہ تخفیفِ دال پڑھا ہے۔ اس قراءت میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ پہلے کے معنی میں ہو۔ اعتداد سے ماخوذ ہو، یعنی "یَسْتَوْفُوْنَ عَدَدَهَا" لیکن ان لوگوں نے تضعیف کو بہ قصدِ تخفیف ترک کیا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر اعتداء سے ماخوذ ہو، جس کے معنی ظلم کے ہیں، تو ضعیف ہے، اس لیے کہ اعتداء متعدی بہ "علیٰ" ہوتا ہے۔[1] کسی نے کہا کہ اعتداء سے ماخوذ ہے، بہ حذفِ حرفِ جر "أَيْ: تَعْتَدُّوْنَ عَلَيْهَا" یعنی تم ظلم کرو عدت پر۔ یہ بطور مجاز کے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ معنی یہ ہیں: "تَعْتَدُّوْنَ فِيْهَا" یعنی تم ظلم کرو اس عدت میں۔ یہ وہی اعتداء ہے جو اس آیت میں مذکور ہے: ﴿ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ﴾ [البقرۃ: ٢٣١] "اور انھیں تکلیف پہنچانے کی غرض سے ظلم و زیادتی کے لیے نہ روکو۔" چنانچہ آیت کے معنی آخری قراءت کی بنا پر یہ ہیں: لہٰذا نہیں ہے تمھارے واسطے ان پر کوئی عدت کہ ان پر اس میں ضرر دینے کے ساتھ زیادتی کرو۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے ابن کثیر رحمہ اللہ سے اس قراءت کے صحیح ہونے کا انکار کیا ہے۔ امام بزّی رحمہ اللہ نے کہا کہ ابن کثیر رحمہ اللہ پر اس کو غلط کہہ دیا ہے۔ یہ آیت اس آیت کے عموم کو خاص کرنے والی ہے: ﴿ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ﴾ [البقرۃ: ٢٢٨] "طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔" اور اس آیت کے عموم کو بھی خاص کرنے والی ہے: ﴿ وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ﴾ [الطلاق: ٤] "تمھاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہوگئی ہوں، اگر تمھیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَتِّعُوْهُنَّ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کو وہ شے دو جس سے وہ نفع لیں۔ یہ متعہ جو یہاں مذکور ہے سورۃ البقرہ میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔[2] سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ متعہ جو اس جگہ مذکور ہے سورۃ البقرہ کی آیت سے منسوخ ہے۔ وہ آیت یہ ہے: ﴿ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾[3] [البقرۃ: ٢٣٧] "اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انھیں ہاتھ لگایا ہو اور تم نے ان کا مہر بھی مقرر کر دیا ہو تو مقررہ مہر کا آدھا مہر دے دو یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ مین نکاح کی گرہ ہے۔ تمھارا معاف کر دینا

---

[1] البحر المحیط (٧/ ٢٣١) [2] رقم الآیة (٢٣٦) [3] فتح القدیر (٤/ ٣٨٣)

تقویٰ سے بہت نزدیک ہے اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔'' کسی نے کہا ہے کہ یہ متعہ عام ہے، اس سے کہ نصف مہر ہو یا متعہ خاص اگر اس کے لیے مہر مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر مہر مقرر ہو گیا ہے تو اس کے ساتھ نصف مہرِ مقرر کی مستحق ہو گی اور قولہ تعالیٰ: ﴿ فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ ﴾ [البقرة: ٢٣٧] پر عمل ہوگا۔

اگر مہر مقرر نہیں ہوا تو اس آیت پر عمل کر کے اس کے ساتھ متعہ کی مستحق ہو گی۔ اس کی مؤید یہ آیت ہے:
﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡهُنَّ اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَهُنَّ فَرِيۡضَةً ۚ وَّمَتِّعُوۡهُنَّ عَلَى الۡمُوۡسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الۡمُقۡتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ ﴾ [البقرة: ٢٣٦] ''اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کیے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، ہاں انھیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو۔ خوش حال اپنے انداز سے اور تنگ دست اپنی طاقت کے مطابق دستور کے مطابق اچھا فائدہ دے۔'' دونوں آیتوں کے درمیان اس طرح سے جمع کرنا ضروری ہے اور یہ ترجیح پر اور نسخ کے دعوے پر مقدم ہے۔ اس آیت سے وہ عورت مخصوص ہے جس کا خاوند مر گیا ہے، کیوں کہ وہ جب عقدِ نکاح کے بعد دخول سے قبل مرے گا تو اس کی موت دخول کی طرح ٹھہرے گی، چنانچہ وہ چار ماہ دس دن عدت میں بیٹھے گی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ بالاجماع ہے۔[1] پس اس عورت کی تخصیص اجماع ٹھہرے گی۔

﴿ وَسَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ﴾ یعنی جن عورتوں کو قبل دخول کے تم نے طلاق دی ہے، ان کو اپنے گھروں سے بغیر تکلیف دیے ہوئے اور ان کا حق روکنے کے بغیر نکالو، کیوں کہ تمھارے لیے ان پر کچھ عدت نہیں ہے۔ سراحِ جمیل وہ ہے جس میں کسی طرح کا ضرر نہیں ہے۔ کسی نے کہا: یہ ہے کہ جو کچھ اس کو دے چکا ہے، اس کا اس سے مطالبہ نہ کرے۔ کسی نے کہا: اس جگہ سراحِ جمیل طلاق سے کنایہ ہے۔ یہ قول بعید ہے، اس لیے کہ طلاق کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے اور تمتع کو اس پر مترتب کیا ہے اور سراحِ جمیل کا اس پر عطف کیا ہے تو ضروری ہے کہ سراحِ جمیل سے طلاق کے علاوہ کچھ اور معنی مراد لیے جائیں۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ ﴾ منسوخ ہے۔ اس کو اس آیت نے منسوخ کیا جو سورۃ البقرہ میں ہے، یعنی ﴿ فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ ﴾ [البقرة: ٢٣٧] ''سعید بن مسیّب سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔ امام حسن اور ابو العالیہ رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ منسوخ نہیں ہے، اس کے لیے نصف مہر ہے اور اس کے لیے متاع ہے۔[2] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ بات پہنچی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ یوں کہتے ہیں کہ اگر اس کو طلاق دی جس سے نکاح نہیں کیا تو یہ جائز ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ انھوں نے اس میں خطا کی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٥٢) [2] الدر المنثور (٦/ ٦٢٦)

مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ ﴾ اور یوں نہیں فرمایا: ''إِذَا طَلَّقْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ نَكَحْتُمُوْهُنَّ'' [1] اس بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں کہ طلاق صرف نکاح کے بعد ہے۔[2]

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ
وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ
وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ
مَعَكَ٘ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ
النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا١ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ١ؕ
قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ١ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا۰۰

اے نبی! بے شک ہم نے آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں حلال کر دی ہیں، جن کے مہر آپ نے ادا کر دیے اور وہ (کنیزیں) بھی آپ کے دائیں ہاتھ جن کے مالک ہیں ان (کنیزوں) میں سے جو اللہ نے آپ کو غنیمت میں دیں اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموؤں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں بھی، جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی اور مومن عورت بھی، اگر وہ اپنے آپ کو نبی کے لیے ہبہ (وقف) کر دے، اگر نبی چاہے تو اس سے نکاح کر لے، یہ (اجازت) مومنوں کے علاوہ خاص آپ کے لیے ہے، ہم یقیناً جانتے ہیں جو کچھ ہم نے ان (مومنوں) پر ان کی بیویوں اور جن (لونڈیوں) کے مالک ہوئے ہیں ان کے دائیں ہاتھ (ان) کے بارے میں فرض کیا ہے، (آپ کے لیے ازواج کی یہ حلت اس لیے ہے) کہ آپ پر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (50)

نبی مکرم ﷺ کے لیے حلال کردہ عورتوں کا بیان:

یعنی جو عورتیں تیری ہیں جن کا مہر دیا، یعنی اب نکاح میں ہیں، خواہ قریش سے ہوں اور مہاجر ہوں یا نہ ہوں، یہ حلال ہیں اور ماموں چچا کی بیٹیاں یعنی قریش میں سے بہ شرط ہجرت کے اگر ہجرت نہ کی تو حلال نہیں اور جو اپنی

[1] مصنف عبد الرزاق (٦/ ٦٢٠) [2] فتح البیان (١١/ ١٠٨۔ ١١٠)

جان نبی کو بخشے، یعنی بغیر مہر کے آپ کو نیاز کرے۔ یہ خاص پیغمبر کے لیے ہے اُور مسلمانوں کے لیے وہی حکم ہے:
﴿ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ﴾ [النساء: ٢٤] ''اور عورتیں تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں کہ اپنے مال کے مہر سے تم ان سے نکاح کرنا چاہو۔'' بغیر مہر نکاح نہیں، خواہ وہ ذکر میں آیا خواہ بعد میں ٹھہرا لیا۔ اگر نہ ٹھہرایا تو جو قوم کا مہر ہے، وہ لازمی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی دس بیبیاں مشہور ہیں: سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا پہلی تھیں، ان کے بعد سب نکاح میں آئیں۔ نو بیبیاں آپ کی وفات کے بعد رہیں: سیدہ عائشہ، حفصہ، سودہ، ام سلمہ، ام حبیبہ، زینب، جویریہ، صفیہ اور میمونہ رضی اللہ عنہن۔ آخری تین قریشی نہیں تھیں۔ انتہیٰ.[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اس نے عورتوں میں سے ان کے لیے ان کی بیویاں حلال رکھیں جن کو ان کے مہر دے چکے۔ اس جگہ "اُجُور" سے مراد یہی مہر ہیں، جیسا کہ مجاہد اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے۔ آپ ﷺ کی بیویوں کا مہر بارہ اوقیہ اور نصف اوقیہ تھا سب کا مجموعہ پانچ سو درہم ہوئے، مگر اُم حبیبہ بنت ابو سفیان رضی اللہ عنہا کا مہر نجاشی رحمہ اللہ نے آپ ﷺ کی طرف سے چار سو دینار کا باندھا تھا اور سوائے صفیہ رضی اللہ عنہا کے کہ جن کو آپ نے خیبر کے قیدیوں میں سے پسند کیا، پھر ان کو آزاد کیا اور ان کا آزاد کرنا ان کا مہر ٹھہرایا اور اسی طرح سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا بنت حارث مصطلقیہ کی طرف سے آپ ﷺ نے ان کی کتابت کا روپیہ قیس بن شماس کو ادا کیا اور ان سے نکاح کر لیا۔ رضي الله عنهن أجمعين.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ ﴾ یعنی اور تیرے لیے جائز کر دیا ان عورتوں میں سے لونڈیاں رکھنا جو تو نے غنیمت سے لیں۔ آپ صفیہ اور جویریہ رضی اللہ عنہا کے مالک ہوئے۔ پھر ان کو آزاد کیا اور ان سے نکاح کر لیا اور ریحانہ رضی اللہ عنہا بنت شمعون نضریہ اور ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے مالک ہوئے۔ یہ آپ ﷺ کے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔ یہ دونوں بیبیاں قیدیوں میں سے تھیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ ... الآية ﴾ میں جو بات فرمائی ہے یہ افراط وتفریط کے درمیان ایک درمیانی طریقہ ہے، اس لیے کہ نصاریٰ عورت سے نکاح نہیں کرتے، مگر جب کہ مرد اور اس عورت کے درمیان سات دادا ہوں اور زیادہ۔ اور یہود اپنے بھائی اور بہن کی بیٹیوں سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ کامل طاہر پاک شریعت آئی۔ اس نے نصاریٰ کی افراط کو ختم کر دیا، چچا اور پھوپھی اور ماموں اور خالہ کی بیٹیوں کو مباح کیا اور یہود جو بھتیجی اور بھانجی کو مباح سمجھتے تھے، اس تفریط کو حرام کر دیا، یہ بات انتہائی مکروہ تھی۔ اور لفظ مذکر کو مفرد ذکر کیا، مذکر کے شرف کے لیے اور عورتوں کو جمع کے ساتھ ذکر کیا ان کے نقصان کی وجہ سے، جیسا کہ ان آیتوں میں فرمایا ہے:
﴿ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ ﴾ [النحل: ٤٨] ''دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ [البقرة: ٢٥٧] ''اور انھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ [الأنعام: ١] ''اور تاریکیوں اور نور کو بنایا۔'' اس کے نظائر بہت ہیں۔

قولہ سبحانہ: ﴿ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پیامِ نکاح کیا تو میں نے عذر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا عذر قبول فرمایا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ﴾ کہا: میں آپ کے لیے حلال نہ تھی، میں ان میں سے نہ تھی جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی، میں طلقاء میں سے تھی، (یعنی وہ لوگ جن کو فتح مکہ کے دن چھوڑ دیا۔)[1] (ورواه ابن جرير عن كريب عن عبيد الله بن موسىٰ به ثم رواه ابن أبي حاتم من حديث إسماعيل بن أبي خالد عن أبي صالح عنها بنحوه، ورواه الترمذي في جامعه و هكذا قال أبو رزين و قتادة) مراد وہ ہیں جنھوں نے آپ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ایک روایت میں ﴿ هَاجَرْنَ ﴾ کی تفسیر میں "أَسْلَمْنَ" ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "وَاللَّاتِي هَاجَرْنَ مِنْ مَعَكَ" پڑھا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ ... الآية ﴾ یعنی اور حلال ہے اے نبی! تیرے لیے مومن عورت اگر وہ اپنی جان تجھ کو بخشے کہ تو اس سے بغیر مہر کے نکاح کر لے اگر تو اس کو چاہے۔ اس آیت میں دو شرطیں پے در پے آئی ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کی طرف سے خبر دی ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے یوں کہا: ﴿ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ﴾ [هود: ٣٤] ''تمھیں میری خیر خواہی کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی، گو میں کتنی ہی تمھاری خیر خواہی کیوں نہ چاہوں، بشرطیکہ اللہ کا ارادہ تمھیں گمراہ کرنے کا ہو۔'' نیز جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے: ﴿ يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴾ [يونس: ٨٤] ''اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم مسلمان ہو۔'' نیز اس جگہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا ... الآية ﴾

1 امام احمد رحمہ اللہ نے سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک میں یقیناً اپنی جان آپ کو بخش چکی، پھر وہ کافی دیر تک کھڑی رہی، ایک شخص کھڑا ہوا تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ اس سے میرا نکاح کر دیں، اگر آپ کو اس میں کوئی حاجت

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٢) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٨٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢١٤) اس کی سند میں ''ابو صالح'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٨٦)

نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تیرے پاس کوئی شے ہے جو تو اس کو مہر میں دے؟ تو اس نے عرض کی کہ میرے پاس میرے اس تہد کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تو اس کو اپنا تہد دے دے گا تو تُو اس حال میں بیٹھے گا کہ تیرا کوئی تہد نہ ہو گا، پھر کوئی شے تلاش کر تو اس نے کہا ہے کہ میں کوئی شے نہیں پاتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تلاش کر اگرچہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ہو۔ پھر اس نے تلاش کیا تو کوئی شے نہ پائی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تیرے پاس قرآن سے کوئی شے ہے؟ عرض کی: ہاں، فلاں فلاں سورت۔ اس نے کئی سورتوں کا نام لیا تو نبی اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا: میں نے اس سے تیرا نکاح کر دیا، اس قرآن کے عوض جو تیرے پاس ہے۔[1] (أَخْرَجَاهُ مِنْ حَدِيثِ مَالِكٍ)

2 امام احمد ﷫ نے ثابت سے روایت کیا ہے، کہا: میں سیدنا انس ﷜ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور ان کے پاس ان کی بیٹی تھی تو سیدنا انس ﷜ نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کی: اے اللہ کے نبی! کیا آپ کو مجھ میں کوئی حاجت ہے؟ اس پر ان کی بیٹی نے کہا ہے کہ کس شے نے اس کی حیا کو کم کر دیا تھا؟ تو سیدنا انس ﷜ بولے کہ وہ تجھ سے بہتر تھی کہ اس نے نبی کریم ﷺ میں رغبت کی اور اُن پر اپنی جان پیش کی۔[2]

(انفرد بإخراجه البخاري من حديث مرحوم بن عبدالغفار عن ثابت البناني عن أنس به)

3 نیز امام احمد ﷫ نے عن الحضرمی عن انس بن مالک ﷜ روایت کیا ہے کہ ایک عورت نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی: یارسول اللہ! میری ایک بیٹی ایسی ایسی ہے، اس کے حسن و جمال کا ذکر کیا، چنانچہ میں نے آپ کو اس کے ساتھ اختیار کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مقرر میں نے اس کو قبول کیا، پھر وہ اس کی تعریف کرتی رہی، یہاں تک کہ یہ ذکر کیا کہ کبھی اس کو دردِ سر نہیں ہوا اور نہ کبھی کچھ بیمار ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے تیری بیٹی میں کچھ حاجت نہیں ہے۔[3] (لم يخرجوه)

4 امام ابن ابی حاتم ﷫ نے سیدہ عائشہ ﷞ سے روایت کیا ہے کہ وہ عورت جس نے اپنی جان نبی اکرم ﷺ کو بخشی سیدہ خولہ بنت حکیم ﷞ ہے۔[4] امام ابن وہب ﷫ نے عن سعید بن عبدالرحمٰن وابن ابی الزناد عن ہشام بن عروہ وعن ابیہ روایت کیا ہے کہ خولہ بنت حکیم بن اوقص بنو سلیم سے یہ وہ تھی جس نے اپنی جان نبی کریم ﷺ کو بخشی تھی۔[5] امام ابن وہب ﷫ کی ایک روایت میں عن سعید بن عبد الرحمٰن عن ہشام عن ابیہ یہ ہے کہ ہم حدیث بیان کیے جاتے تھے کہ سیدہ خولہ بنت حکیم ﷞ نے اپنا نفس رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کیا تھا اور یہ ایک

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٥) مسند أحمد (٥/ ٣٣٦)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢٨) مسند أحمد (٣/ ٢٦٨)

③ مسند أحمد (٣/ ١٥٥) اس میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٢٧٩)

④ تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٣) ⑤ تفسير الطبري (٢٠/ ٢٨٩)

صالح عورت تھی، پس احتمال ہے کہ اُم سلیم یہی خولہ بنت حکیم ہو یا وہ کوئی اور عورت ہو۔

5 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود روایت کیا ہے کہ موسیٰ بن عبیدہ نے محمد بن کعب وعمرو بن حاکم وعبداللہ بن عبیدہ سے روایت کیا ہے۔ یہ تینوں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرہ بیبیوں سے نکاح کیا، چھے تو قریش کی تھیں: سیدہ خدیجہ، عائشہ، حفصہ، ام حبیبہ، سودہ، ام سلمہ رضی اللہ عنہن اور تین بیبیاں بنی عامر بن صعصعہ کی اور دو بنی ہلال بن عامر کی۔ سیدہ میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا یہ وہی ہیں جنھوں نے اپنی جان نبی کریم ﷺ کو ہبہ کی تھی اور زینب رضی اللہ عنہا ام المساکین اور ایک اَور عورت بنو ابوبکر بن کلاب کے قرظات میں سے۔ یہ وہی ہے جس نے دنیا اختیار کی اور ایک عورت بنو الجون کی۔ یہ وہی ہے جس نے نبی اکرم ﷺ سے پناہ مانگی تھی اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا اسدیہ اور دو عورتیں قیدیوں میں سے صفیہ بنت حیی بن اخطب اور جویریہ بنت حارث بن عمرو بن المصطلق خزاعیہ۔[1]

سعید بن ابی عروبہ نے عن قتادہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے: ﴿ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ ﴾ فرمایا: یہ میمونہ بنت حارث ہے،[2] اس میں انقطاع ہے اور یہ مرسل ہے۔ مشہور یہ ہے کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو ام المساکین کہتے تھے، وہ زینب بنت خزیمہ انصاریہ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس آپ ﷺ کی حیات میں فوت ہوئیں۔ فاللّٰہ أعلم۔ اس سے غرض یہ ہے کہ جن عورتوں نے نبی کریم ﷺ کو اپنی جان بخشی، وہ بہت ہیں، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ میں ان لوگوں سے غیرت کرتی تھی، جنھوں نے اپنی جانیں نبی کریم ﷺ کو بخشی تھیں اور کہتی تھی کہ کیا عورت اپنی جان بخشتی ہے؟ پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ ﴾ [الأحزاب: ۵۱] ”ان میں سے جسے تو چاہے دور رکھ۔“ تو میں نے عرض کی کہ میں نہیں دیکھتی تیرے رب کو مگر وہ جلدی کرتا ہے تیری خواہش میں۔[3]

6 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایسی کوئی عورت نہیں تھی جس نے اپنی جان آپ کو بخشی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو عن ابی کریب عن یونس بن بکیر روایت کیا ہے۔[4] یعنی جن عورتوں نے آپ ﷺ کو اپنی جانیں بخشیں، آپ ﷺ نے ان میں سے کسی کو قبول نہیں فرمایا، گو یہ بات آپ ﷺ کے لیے خاص طور پر مباح تھی۔ اس لیے کہ یہ معاملہ آپ ﷺ کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ﴾ یعنی اگر وہ اس کو اختیار کرے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موہوبہ (وہ عورت جو اپنا نفس ہبہ کر دے) تیرے علاوہ اور کسی کے لیے حلال نہیں ہے اور اگر کوئی عورت اپنی جان کسی مرد کو بخشے تو وہ اس کے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٣) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٨٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١٠) [4] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٤) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٨٨)

لیے حلال نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کو کچھ دے اور اسی طرح امام مجاہد اور شعبی رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے،[1] یعنی وہ عورت جس وقت اپنی جان کسی مرد کو تفویض کر دے تو وہ مرد جب اس سے دخول کرے گا تو اس پر اس کے لیے اس کا مہرِ مثل واجب ہو گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بروَع بنت واشق کے بارے میں یہی حکم دیا، جبکہ اس نے اپنا آپ سپرد کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے اس کے مہرِ مثل کا حکم فرمایا جس وقت کہ اس کا خاوند مر گیا۔ موت اور دخول مہر کے مقرر کرنے میں برابر ہیں۔

مفوضہ کے لیے مہرِ مثل کا واجب ہونا غیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مفوضہ کے لیے کچھ واجب نہیں، گو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے دخول فرمائیں، کیوں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حق پہنچتا ہے کہ بغیر مہر و ولی اور شہود کے نکاح کریں، جیسا کہ سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے قصے میں واقع ہوا اور اسی لیے قتادہ نے ﴿ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ کسی عورت کو جائز نہیں کہ وہ بغیر ولی اور مہر کے اپنی جان کسی مرد کو ہبہ کرے سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے۔[2] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، حسن، قتادہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے ﴿ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ ... الآية ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ امت کے لیے چار آزاد عورتوں کی حد ہے اور لونڈیوں میں سے جو چاہیں اور ولی و مہر و شہود کی ان پر شرط ہے، یعنی تیرے لیے ہم نے اس میں رخصت دی ہے، اس میں سے تجھ پر کچھ واجب نہیں کیا، تاکہ تجھ پر کچھ تنگی نہ ہو۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ میں نکاح کی قسمیں ذکر فرمائی ہیں جن کو اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال کیا ہے۔ ابتدا آپ کی ان بیبیوں سے کی جن کو آپ ان کے اجور دے چکے۔ اجور سے مراد مہر ہیں، اس لیے کہ مہر البضاع کے اجور ہیں ("ابضاع" "بُضعه" کی جمع ہے۔ "بُضعه" گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ مراد عورت کی شرم گاہ ہے۔ مہر اس کے حلال کرنے کی اُجرت ہے)۔ اسی لیے امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نکاح بلفظِ اجارہ جائز ہے۔ اہل الرائے کہتے ہیں کہ تابید شرطِ نکاح سے ہے اور تاقیت شرطِ اجارہ ہے اور تابید و تاقیت میں تضاد ہے، یعنی پھر نکاح بلفظِ اجارہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ ﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ [البقرة: ١٤٨] ؎

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے　　　من قبلہ راست کردم برطرف کجکلاہے

"ہر قوم کی ایک خاص روش، دین اور قبلہ گاہ ہوتی ہے، میں نے یکسو ہو کر اپنے محبوب کی طرف قبلہ سیدھا کر لیا ہے۔"

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٤) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٨٨ـ ٢٨٩) (2) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٤)

(3) تفسير الطبري (٢٠/ ٢٨٩ـ ٢٩٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٥٢ـ ٦٥٥)

ایتائے اجور یا تو معجّل ان کا تسلیم کر دینا ہے یا ان کا فرض ہے، یعنی مقرر کرنا ٹھہرا لینا، یا ان کا نام لینا اور عقد میں ذکر کرنا ہے۔ آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابن زید اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے آپ ﷺ کے لیے یہ بات حلال کر دی کہ نکاح کریں ہر عورت سے جس کو اس کا مہر دیں۔[1] اس معنی کی بنا پر آیت سوائے ذومحرم عورتوں کے سب عورتوں کو حلال کرنے والی ہے (ذومحرم وہ عورتیں جو نسب وصہر ورضاع کے لحاظ سے حرام ہیں)۔ جمہور نے کہا: مراد یہ ہے کہ حلال رکھیں ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیبیاں جو تیرے پاس موجود ہیں، کیوں کہ وہ دنیا پر اور اس کی رونق پر تجھ کو اختیار کر چکی ہیں۔ ظاہر یہی قول ہے، اس لیے کہ ﴿ اَحْلَلْنَا ﴾ اور ﴿ اٰتَيْتَ ﴾ دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔

حلال ہونے کی قید اجور کے ادا کرنے کے ساتھ اس لیے نہیں ہے کہ حلال ہونا صرف اسی پر موقوف ہے، کیوں کہ عقد تو مہر کا نام لیے بغیر بھی صحیح ہوتا ہے اور مہر وطی کے ساتھ اور متعہ بغیر وطی کے واجب ہو جاتا ہے۔ گویا یہ قید اس قصد و ارادے سے ہے کہ جو بات افضل اور بہتر ہے اس کی طرف ارشاد فرمایا ہے۔ ﴿ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ﴾ سے مراد وہ لونڈیاں ہیں جو غنیمت کے سبب سے آپ کی ملک میں داخل ہوئیں۔ ﴿ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ ﴾ کے معنی یہ ہے: "مِمَّا رَدَّهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ" یعنی ان عورتوں میں سے جن کو اللہ تعالیٰ تجھ پر کفار سے پھیر لایا اس غنیمت کے سبب سے جو قہر اور غلبے کے طور پر لی گئی، جیسے: سیدہ صفیہ اور جویریہ رضی اللہ عنہما کہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کیا اور ان سے نکاح فرمایا۔ ماریہ قبطیہ بھی آپ کی ملکِ یمین سے تھیں، جن سے سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

﴿ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ ﴾ کی قید سے مراد اس لونڈی کا نکالنا نہیں ہے جس کے آپ بغیر غنیمت کے مالک ہوئے، کیونکہ خریدی ہوئی یا ہبہ کی ہوئی اور اس جیسی لونڈی حلال ہے۔ لیکن یہ قید خارج مخرجِ غالب ہے اور اس سے اس شے کی طرف اشارہ کیا ہے جو افضل اور بہتر ہے جس طرح کہ پہلی قیود تھیں جو اُجور ادا کرنے کی تصریح کرتی تھیں، اسی طرح اس آیت میں ہجرت کی قید ہے: ﴿ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ ﴾ یعنی نسائے قریش ﴿ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ ﴾ یعنی بنی زہرہ کی عورتیں۔

﴿ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ﴾ کیوں کہ یہ قید بھی اس لیے ہے کہ اس شے کی طرف اشارہ کیا ہے جو افضل اور بہتر ہے اور ہجرت کے شرف کی خبر دی ہے اور مہاجر کے شرف کی، یعنی ہم نے تیرے لیے یہ عورتیں مزید حلال کیں، ان عورتوں کے علاوہ جن کا مہر تو دے چکا ہے بنا بر قول جمہور کے، کیوں کہ اگر اس سے یہ معنی مراد ہوں کہ ہم نے تیرے واسطے ہر عورت حلال کر دی جس سے تو نکاح کرے اور اس کا مہر دے تو اس کے بعد یہ نہ فرماتا: ﴿ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ ﴾ کیوں کہ یہ عورتیں ان میں داخل ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا۔ معیت سے اس جگہ مراد ہجرت میں مشترک ہونا ہے نہ کہ ہجرت میں ساتھ رہنا۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٠٥)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ کلمۂ ''مع'' قران کے لیے نہیں ہے، بلکہ وجودِ ہجرت کے لیے ہے اور بس، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بلقیس کا قول بیان کیا ہے: ﴿ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[1] [النمل: ٤٤] ''اور (اب) میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی فرماں بردار ہو گئی ہوں۔'' کسی نے کہا ہے کہ مہاجرت کی قید معتبر ہے اور ان میں سے جس عورت نے ہجرت نہ کی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ﴾ [الأنفال: ٧٢] ''اور جو ایمان تو لائے ہیں لیکن ہجرت نہیں کی تمھارے لیے ان کی کچھ بھی رفاقت نہیں، جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔'' اس قول کی مؤید وہ حدیث ہے جو اُم ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔

"عم" اور "خال" کو واحد ذکر کرنے اور "عَمَّة" اور "خَالَة" کو جمع ذکر کرنے کی وجہ جو قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ "عم" اور "خال" اطلاق میں اسم جنس ہیں، مثل شاعر اور راجز کے اور "عمة" اور "خالة" ایسے نہیں ہیں۔ کہا: اور یہ ایک عرفِ لغوی ہے۔ چنانچہ اس کی بنا پر مفصل کلام آیا ہے اور اس کو ابن العربی سے بیان کیا ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی جو وجہ ذکر کی وہ پہلے گزر چکی ہے۔ امام نیسابوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عم" اور "خال" کی جو جمع ذکر نہیں کی تو اس لیے کہ ان کی جنسیت پر اکتفا کیا ہے، مع اس کے کہ "بنات" کی جمع اس پر دلالت کر رہی ہے کہ ایک مرد کے تحت دو بہنوں کا اکٹھا ہونا منع ہے اور یہ اختصار "عمة" اور "خالة" میں حسین نہیں ہے، اس لیے کہ ممکن ہے کہ وہم اس طرف چلا جائے کہ دونوں میں حرفِ تاء وحدت کے لیے ہے۔[3] انتہی.

ان وجوہ میں سے ہر وجہ احتمال رکھتی ہے کہ اس کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ "عمة" و "خالة" کو بہ صیغۂ جمع دینے کی یہ وجہ کہ وہم اس طرف چلا جائے کہ حرفِ تاء وحدت کے لیے ہے بہترین وجہ ہے۔ "عم" اور "خال" میں وہ وجہ نہیں ہے جس کی طرف یہ وہم جائے کہ اس سے مراد وحدت ہے سوائے صیغۂ افراد کے اور یہ صیغہ اس کی اضافت کے بعد اس کا مقتضی نہیں ہے، کیوں کہ اسمائے اجناس مضاف کا عموم ثابت ہو چکا ہے اس پر طرہ یہ کہ وہ بہترین وجہ بھی متنازعہ ہے۔ امام شہاب خفاجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بہت لوگوں سے "عم و خال" کے واحد ذکر کرنے کی وجہ پوچھی گئی کہ کیا وجہ ہے کہ ان کو مفرد کہا اور "عمة" اور "خالة" کو واحد نہ کہا۔ یہاں تک کہ سبکی رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک جز تصنیف کیا، جس کا نام "بذل الهمة في إفراد العم وجمع العمة" رکھا۔ میں نے اس میں لوگوں کے کلمات دیکھے، سب کے سب ضعیف۔ چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ "عم و خال" مصدر کے وزن پر ہیں اور مصدر میں مفرد اور جمع برابر ہوتے ہیں بخلاف "عمة و خالة" کے۔ کسی کا یہ قول ہے کہ "عم و خال" جب اضافت کیے جاتے ہیں تو عام ہو جاتے ہیں اور "عمة" اور "خالة" تائے وحدت کے سبب سے عام نہیں ہوتے ہیں۔[4] انتہی.

[1] تفسير النسفي (٣/ ٣١٠) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٠٧)

[3] فتح القدير (٤/ ٣٨٥) [4] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٧٨)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً ﴾ کا یہ مطلب ہے: اور ہم نے تیرے واسطے مومنہ عورت حلال کی جو توحید کی تصدیق کرنے والی ہے۔ ﴿ اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ ﴾ یعنی اگر وہ مالک کر دے تجھ کو اپنی بضعہ کا، کسی بھی طرح سے ہو اور بغیر صداق کے، یعنی مہر کے بغیر۔ رہی وہ عورت جو مومن نہیں ہے تو وہ صرف اپنا نفس تجھے ہبہ کر دینے سے تیرے لیے حلال نہیں۔ لیکن یہ مومنہ کا اپنی جان کو تجھے ہبہ کر دینا تجھ پر کچھ ایسا واجب نہیں ہے کہ تجھے اس کو قبول کر لینا لازم ہو۔ بلکہ یہ تیرے ارادے کے ساتھ مقید ہے۔ چنانچہ یہ جملہ شرطیہ ہے اس کے لیے وقوع لازم نہیں ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ﴾ یعنی اگر نبی چاہے کہ اس کو بغیر مہر کے اپنی منکوحہ کر لے، اس ہبہ کی وجہ سے اس کے بضعہ کا مالک ہو جائے۔ محاورے میں "نکح" اور "استنکح"، مثل "عجل واستعجل وعجب واستعجب" کے ایک معنی میں آتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ استنکاح سے طلبِ نکاح کے معنی مراد لیے جائیں یا طلبِ وطی کے۔[1] (قاله القرطبي)

امام ابو السعود رحمہ اللہ کا حاصل بیان یہ ہے کہ اگر وہ مومن عورت نبی کو اپنی بضعہ کا مالک کرے، کسی بھی طریقے سے ہو بغیر مہر کے، یعنی اگر اس کا اتفاق پڑ جائے۔ چنانچہ ﴿ اِمْرَاَةً ﴾ کو نکرہ استعمال کرنا اس اتفاق کی خبر دیتا ہے، لیکن مطلقاً نہیں، بلکہ نبی کے اس کے ساتھ نکاح کرنے کے ارادے کی صورت میں۔ چنانچہ ﴿ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ﴾ اس کی خبر دیتا ہے، کیوں کہ نبی کی طرف سے یہ ارادہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے یہ ہبہ قبول ہے اور چوں کہ ہبہ کے ساتھ اس عورت کے نبی کی ملکیت ہو جانے کا واضح حکم نہیں ہے، اس لیے اس آیت سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ ہبہ کے لفظ کے ساتھ نکاح کا منعقد ہونا ضروری نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ذکر دو جگہ پر بعنوانِ نبوت کیا خطاب کے ذریعے سے توجہ دلانے کے لیے۔ چنانچہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصد یہ بات بتانا ہے کہ اصل چیز حکم کے ثبوت کے لیے نبوت ہے، پس یہ ہبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے اس میں اور کوئی ان کا شریک نہیں ہے۔ چنانچہ ﴿ خَالِصَةً لَّكَ ﴾ اس پر ناطق ہے۔[2] انتہیٰ. یہ تو اس کا ذکر ہوا کہ مومن عورت اپنی جان نبی کو بخشے۔

اب رہی کافر عورت تو مومنہ کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ کافر عورت آپ ﷺ کو حلال نہیں۔ امام الحرمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ پر آزاد کافر عورت کے حرام ہونے میں اختلاف ہے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میرے نزدیک صحیح ہے کہ وہ حرام ہے اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کو ہم پر تمیز حاصل ہو گا، یعنی آپ کا مقام ممتاز ہو گا، کیوں کہ جو شے فضائل اور کرامات میں ہے اس کا اکثر حصہ آپ ﷺ کے پاس ہے اور جو شے نقائص میں سے ہے تو آپ کا دامن مقدس اس سے بالکل طاہر اور پاک ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے کتابی عورتوں کا نکاح جائز رکھا گیا اور نبی کریم ﷺ کو صرف مومن عورتوں ہی پر مقصور فرمایا گیا اور اسی لیے کتابیہ کافرہ آپ کے لیے حلال نہیں،

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢١٢) [2] تفسير أبي السعود (٧/ ١٠٩۔ ١١٠)

بسبب اس کمی کے جو اس میں کفر کی وجہ سے ہے۔[1] انتهى من القرطبي.

رہا آپ ﷺ کا کتابی لونڈی کو رکھنا تو اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ وہ حلال ہے، کیوں کہ آپ نے اپنی ریحانہ نامی لونڈی سے نفع لیا اس کے اسلام لانے سے پہلے جیسا کہ مواہب میں ہے۔[2] یہ ریحانہ بنی قریظہ کے قیدیوں میں سے تھی اور یہودیہ تھی۔ نیز آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا حرام ہے، گو وہ مسلمہ ہو، کیوں کہ لونڈی سے نکاح کرنا بدکاری کے خوف سے ہوتا ہے، حالاں کہ آپ ﷺ معصوم ہیں اور آزاد عورت کے مہر کے فقدان سے، حالاں کہ آپ کا نکاح ابتداءً و انتہاءً مہر سے بے نیاز ہے اور بہ رق ولد، یعنی اولاد کا غلام ہونا، حالاں کہ آپ ﷺ کا منصبِ عالی اس سے منزہ ہے۔ كذا في الروض وشرحه۔

نیز آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ آپ کے حق میں نکاح بہ معنی ہبہ منعقد ہو جاتا ہے بغیر ولی و مہر وشہود کے اور چار عورتوں سے زیادہ عورتوں سے نکاح ہو سکتا ہے اور عورتوں کو اختیار دینا آپ ﷺ پر واجب ہے، یعنی یا وہ دین کو پسند کریں یا دنیا کو اختیار کریں۔ ایک جماعت اس پر ہے۔ اس میں اختلاف کیا ہے کہ اُمت کے حق میں لفظ ہبہ سے نکاح کا انعقاد ہوتا ہے یا نہیں۔ اکثر اس طرف گئے ہیں کہ منعقد نہیں ہوتا مگر لفظِ نکاح اور تزویج کے ساتھ۔ یہ امام سعید بن مسیّب، زہری، مجاہد اور عطاء رحمہم اللہ کا قول ہے۔ امام ربیعہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اور اہلِ کوفہ نے کہا کہ تملیک اور ہبہ کے لفظ کے ساتھ نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ پہلے قول کے قائلین نے نبی اکرم ﷺ کے نکاح میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ آپ ﷺ کے حق میں ہبہ کے لفظ کے ساتھ منعقد ہو جاتا تھا۔ دوسری قوم اس طرف گئی ہے کہ منعقد نہیں ہوتا جس طرح کہ ساری امت کے حق میں ہے۔ آپ ﷺ کی خصوصیت ترکِ مہر اور مہر کے لازمی نہ ہونے میں تھی، لفظِ نکاح میں نہیں تھی۔

پھر اس میں اختلاف کیا ہے کہ آپ کے لیے لفظِ ہبہ کے ساتھ عقد بالفعل واقع ہوا یا نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی عورت نہ تھی، مگر بہ عقدِ نکاح یا بہ ملکِ یمین۔ دوسروں نے کہا ہے کہ واقع ہوا۔ پھر اس میں اختلاف کیا کہ اس قسم کی کتنی عورتیں تھیں۔ چنانچہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس میمونہ رضی اللہ عنہا بنت حارث تھیں۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت خزیمہ انصاریہ اُم المساکین تھیں۔ علی بن الحسین، ضحاک اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اُم شریک رضی اللہ عنہا بنت جابر اَسدیہ تھیں۔ عروہ بن الزبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُم حکیم رضی اللہ عنہا بنت الاوقص سلمیہ تھیں۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ سیدہ خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا تھیں۔[4] (رواه ابن أبي حاتم وابن مردويه والبيهقي في السنن وأخرجه البخاري وغيره عن عروة) اور امام محمد بن کعب رحمہ اللہ وغیرہ سے تیرہ ۱۳

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٠٩) [2] المواهب اللدنية (٢/ ٣٢٦) [3] تفسير البغوي (٦/ ٣٦٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٤٤) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٥٥)

بیبیوں کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ موہوبات (اپنی جان ہبہ کرنے والی) چار ہیں: سیدہ میمونہ، زینب، ام شریک اور خولہ رضی اللہ عنہن۔[1]

جمہور نے ﴿ اِمْرَاَةً ﴾ کو منصوب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اَحْلَلْنَا لَكَ ﴾ کے مفعول پر معطوف ہے اور امام ابو حیوہ رحمہ اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتدا اور جمہور نے ﴿ اِنْ وَّهَبَتْ ﴾ کو بکسر "إِنْ" اور اُبی، حسن اور عیسیٰ بن عمر نے بہ فتح "أَن" اس بنا پر کہ ﴿ اِمْرَاَةً ﴾ سے بدلِ اشتمال ہے یا بنا بر حذفِ لام علت، یعنی "لِأَنْ وَّهَبَتْ"۔[2] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ ﴾ اعتراضِ شرط علی الشرط کے باب سے ہے اور شرطِ ثانی شرطِ اول میں قید ہے اور اسی لیے ترکیب میں اس کو حال ٹھہرایا ہے، کیوں کہ حال قید ہوتا ہے اور اسی لیے فقہاء نے یہ شرط کی ہے کہ ثانی اول پر متقدم ہو وجود میں۔ چنانچہ اگر کسی نے یوں کہا: "إِنْ أَكَلْتُ إِنْ رَكِبْتُ فَأَنْتِ طَالِقٌ" تو ضرور ہے کہ رکوب اکل سے پہلے ہو اور یہ اس لیے ہے کہ حالیت اور تقیید متحقق ہو جائے، جس طرح کہ میں نے ذکر کیا ہے، کیوں کہ اگر ثانی متقدم نہ ہوگا تو ایک جزء اکل سے غیر مقید بہ رکوب خالی رہ جائے گا۔ اس لیے ہم نے تقدمِ ثانی کی شرط لگائی ہے اور اس کی تحقیق گزر چکی ہے اور یہ شرط ہے کہ وہاں کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جو تقدمِ ثانی سے اول پر منع کرے، جس طرح کہ یہ قول ہے: "إِنْ تَزَوَّجْتُكَ إِنْ طَلَّقْتُكَ فَعَبْدِيْ حُرٌّ" یہاں تقدیم طلاق کی تزویج پر متصور نہیں ہو سکتی۔

مگر مجھے ایک اشکال عارض ہوا ہے جو اس آیت پر فقہاء کے قول پر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس جگہ شرطِ ثانی کا تقدم وجود میں ممکن نہیں ہے بہ نسبت اس حکم کے جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے نہ یہ کہ عقلاً ممکن نہیں ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ مفسرین نے ﴿ اِنْ اَرَادَ ﴾ کی تفسیر بہ معنی "قبل الهبة" کی ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کے قبول کر لینے سے آپ ﷺ کا نکاح تمام ہوگا اور ہبہ پر اس کا تقدم متصور نہیں ہو سکتا، کیوں کہ قبول تو بعد میں ہوتا ہے۔ اور نیز پھر قصہ وہ تھا جو میں نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کا ارادہ اس عورت کے ہبہ سے متاخر ہے۔ میں نے اس اشکال کو ایک جماعت پر پیش کیا، جو ہمارے وقت کے اعیان تھے تو انھوں نے اس کا اقرار کیا اور کوئی جواب سمجھ میں نہ آیا، مگر وہی جو میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ وہاں ایک قرینۂ مانعہ ہے، اس سے جس طرح کہ ابھی مثال میں بیان کر چکا ہوں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی یہ احلال خاص تیرے لیے ہے نہ کہ کسی اور مومن کے لیے۔ لفظ ﴿ خَالِصَةً ﴾ یا تو حال ہے ﴿ اِمْرَاَةً ﴾ سے۔[3] (کما قال الزجاج) یا حال ہے ﴿ وَهَبَتْ ﴾ کے فاعل سے، یعنی اگر ہبہ کرے وہ عورت درآنحالیکہ وہ خالص تیرے لیے ہے نہ کہ تیرے سوا کسی اور کے لیے۔ یا مصدر

---

[1] الكشاف (٣/ ٥٥٩) [2] فتح القدير (٤/ ٣٨٥۔ ٣٨٦) [3] معاني القرآن (٤/ ٢٣٣)

موکد ہے مثل ﴿ وَعْدَ اللهِ ﴾ کے، یعنی "خَلَصَتْ لَكَ خَالِصَةً" مصدر "فاعلة" کے وزن پر آتا ہے، جیسے "عاقبة و كاذبة" یا مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی "هِبَةً خَالِصَةً" ناصب اس کا ﴿ وَهَبَتْ ﴾ ہے۔ جمہور نے ﴿ خَالِصَةً ﴾ بہ نصب پڑھا ہے۔ وجوہِ نصب وہی ہیں جو مذکور ہوئیں۔ کسی نے بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ "اِمْرَأَةٌ" کی صفت ہے بنا بر قراءت رفع "اِمْرَأَةٌ"۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے اور آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لیے جائز نہیں ہے اور نہ عورت کے ہبہ کرنے سے نکاح منعقد ہوتا ہے، مگر وہ جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے صاحبین رحمہما اللہ سے مروی ہے کہ نکاح صحیح ہو جاتا ہے، جبکہ عورت ہبہ کرے اور مرد اپنے نفس پر مہر کی شہادت دے۔

رہا بغیر مہر کے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے اور اسی لیے یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيٓ أَزْوَٰجِهِمْ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جو شرائط اور حقوقِ عقد کے لیے مومنوں پر ان عورتوں کے حق میں ٹھہرا دیے ہیں تو وہ ان پر فرض اور واجب ہیں۔ ان کو حلال نہیں کہ ان میں خلل اندازی کریں اور نہ ہی ان کو حلال ہے کہ جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے ساتھ خاص فرمایا ہے، اس کو اپنے لیے بھی جائز کر لیں اور اس معاملے میں ان کی تعظیم و تکریم کے لیے ان کا اقتدا کریں۔ چنانچہ نکاح نہ کریں مگر چار عورتوں سے، حق مہر و ولی اور گواہوں کے ساتھ۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ فرض کیا ہے کہ نکاح نہیں ہے مگر ولی کے ساتھ اور دو گواہوں کے ساتھ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس کے مثل مروی ہے اور مہر کا لفظ زیادہ ہے۔[1]

﴿ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُهُمْ ﴾ یعنی اور جان لی ہم نے وہ شے جو اُن پر فرض کی ہے ان عورتوں میں جن کے مالک ہوئے ہیں ان کے داہنے ہاتھ، یعنی وہ ان میں سے ہوں جن کا قید کرنا اور جنگ کرنا جائز ہے، نہ ان میں سے جن کا قید کرنا جائز نہیں ہے۔ یا مسلمانوں کی طرف سے ان کو عہد و ذمہ ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: وہ لونڈیاں جن کو خرید کر ان کے داہنے ہاتھ مالک ہوئے، بشرطیکہ وہ ان میں سے ہوں جو اپنے مالک کے لیے حلال ہوں، جیسے: کتابیہ بہ خلاف مجوسیہ و ثنیہ کے اور یہ کہ وطی سے قبل ان کے رحم کا استبرا کیا جائے۔[2]

﴿ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ﴾ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ اول آیت کی طرف راجع ہے، یعنی حلال رکھیں ہم نے تیرے واسطے تیری بیویاں اور وہ جس کا تیرا داہنا ہاتھ مالک ہوا اور وہ عورت جو اپنا نفس تجھے بخشنے والی ہے، تاکہ تجھ پر کچھ تنگی نہ ہو۔ چنانچہ یہ حرف لام متعلق ہے ﴿ أَحْلَلْنَا ﴾ سے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ خَالِصَةً ﴾ سے متعلق ہے۔[3] (كما قاله البيضاوي و أبو السعود) اور تعلق اس اعتبار سے ہے کہ اس میں ثبوت وحصول واحلال کے معنی ہیں

[1] الدرر المنثور (٦/ ٦٣٢) [2] تفسير الجلالين (١/ ٥٥٧) [3] تفسير البيضاوي (٤/ ٣٨١) تفسير أبي السعود (٧/ ١١٠)

نبی اکرم ﷺ کے لیے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ حَرَجٌ ﴾ ضیق اور تنگی کو کہتے ہیں، یعنی ہم نے حلال کرنے میں تجھ پر وسعت کی، تا کہ تیرا سینہ تنگ نہ ہو تو تو گمان کرے کہ بعض منکوحات میں گناہ گار ہو گیا ہے۔

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے وہ اس شے میں گناہوں کو بخشتا ہے جس سے پرہیز کرنا مشکل ہوتا ہے اور بڑا مہربان ہے، بندوں پر مہربانی کرتا ہے اور اس بارے میں وسعت اور فراخی کرتا ہے۔ اسی لیے اس نے امر کو وسیع کر دیا تنگ نہ کیا۔ جملہ ﴿ قَدْ عَلِمْنَا ... الخ ﴾ معترضہ ہے ﴿ اَحْلَلْنَا ﴾ اور ﴿ لِكَيْلَا ﴾ کے درمیان مضمونِ ماقبل کی تقریر کے لیے لایا گیا ہے۔ ماقبل میں رسول اللہ ﷺ کے لیے خلوصِ احلال کا ذکر تھا اور اس میں یہ بیان کیا کہ اللہ پاک نے مومنوں پر شرائط اور حقوقِ عقد میں سے وہ چیزیں فرض کی ہیں جو اپنے نبی ﷺ پر فرض نہیں کیں، ان کی تکریم اور تعظیم کے لیے اور اُن پر وسعت کرنے کے لیے۔[1] (هذا حاصل أبي السعود)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے آیتِ مذکور کا خوب بیان کیا ہے، اگرچہ اس میں سے بعض مضمون اوپر گزر چکا ہے، مگر بیان کا انسجام (تسلسل) خوب ہے، اس لیے اس کا یہاں ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوا۔ گو فی الجملہ مضمون کے کچھ حصے کی تکرار ہو۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو اختیار دیا، پھر انھوں نے آپ ﷺ کو اختیار کیا تو آپ ﷺ پر ان کے سوا اور عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہوا اور ان کے عوض میں اور عورتوں کا بدلنا ان کے فعل کی جزا کے طور پر۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴾ [الأحزاب: ٥٢] ''اس کے بعد اُور عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں اور نہ یہ (درست ہے) کہ ان کے بدلے اور عورتوں سے (نکاح کرے) اگرچہ ان کی صورت اچھی بھی لگتی ہو، مگر جو تیری مملوکہ ہوں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا (پورا) نگہبان ہے۔''

آیا آپ ﷺ کو یہ حلال ہے کہ اس کے بعد ان میں سے کسی کو طلاق دے دیں؟ چنانچہ کسی نے تو کہا ہے کہ یہ آپ ﷺ کو حلال نہیں ہے، ان کے اس عمل کی جزا کے لیے کہ انھوں نے آپ کو اختیار کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آپ ﷺ کو حلال ہے دوسرے لوگوں کی طرح، لیکن اس کے بدل سے نکاح نہ کریں۔ پھر یہ تحریم منسوخ ہوئی اور آپ ﷺ کے لیے مباح ہوا کہ ان پر جس عورت سے چاہیں نکاح کر لیں، اس پر یہ آیت دلیل ہے: ﴿ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ ﴾ استدلال کی وجہ یہ ہے کہ حلال ہونا مقتضی ہے تقدمِ خطر کو، یعنی اول کوئی شے حرام و ممنوع ہوتی ہے تو یوں کہتے کہ ہم نے اس کو حلال کیا، حالاں کہ آپ ﷺ کی بیبیاں آپ کی حیات میں آپ ﷺ پر محرم نہیں تھیں، آپ ﷺ پر جو حرام ہوا تھا وہ اجنبی عورتوں سے نکاح کرنا تھا تو یہ احلال انھیں کی طرف منصرف ہوا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سیاقِ آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ ﴾ حالاں کہ یہ معلوم ہے کہ آپ کے تحت میں بناتِ عم و بناتِ عمات و بناتِ خال و بناتِ خالات میں سے کوئی عورت نہ تھی، لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ پاک نے آپ کے واسطے ان عورتوں سے

[1] تفسیر أبي السعود (٧/ ١١٠) فتح البیان (١١/ ١١١۔ ١١٧)

نکاح حلال فرمایا، ان بیبیوں کے علاوہ جو آپ کی عصمتِ نکاح میں تھیں، یہ آیت اگرچہ تلاوت میں پہلے ہے، لیکن نزول میں آیت کے بعد ہے، جو اس کے ساتھ منسوخ کی گئی ہے، جس طرح کہ آیتِ وفات ہے سورت بقرہ میں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوٰجَكَ الّٰتِیْٓ ﴾ میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ کسی نے تو کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے یہ حلال کر دیا ہے کہ ہر عورت کو جس کو اس کا مہر دیں۔ یہ قول ابن زید اور ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔ چنانچہ اس قول کی بنا پر یہ آیت ساری عورتوں کو مباح کرنے والی ہوگی سوائے محارم کے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے حلال رکھیں تیرے لیے تیری بیویاں، یعنی جو تیرے پاس موجود ہیں، کیوں کہ انھوں نے تجھ کو اختیار کر لیا ہے دنیا پر اور آخرت کو پسند کر لیا ہے۔ یہ قول علماء میں سے جمہور کا ہے اور یہی ظاہر ہے۔ اس لیے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اٰتَیْتَ ﴾ ماضی ہے اور فعل ماضی مستقبل کے معنی میں نہیں ہوتا، مگر شرط کے ساتھ۔ اور اس کی تاویل کی بنا پر حلال کرنے کا معاملہ تنگ ہوگا نبی اکرم ﷺ پر۔

اس تاویل کی تائید وہ بات کرتی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن لوگوں میں چاہتے تھے نکاح کرتے تھے اور یہ بات آپ کی بیویوں پر شاق گزرتی تھی، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس سے آپ ﷺ پر عورتوں کو حرام کر دیا سوائے ان کے جن کا نام لیا تو اس سے آپ کی بیبیاں خوش ہوگئیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس وجہ کے سبب سے جو ہم نے ذکر کی ہے اور نیز اس کی صحت پر وہ حدیث دال ہے جو ترمذی نے عطاء سے روایت کی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے انتقال فرمایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے عورتیں حلال کر دیں۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[1] انتھٰی.

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَ لَا یَحْزَنَّ وَ یَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ۝۵۱ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ۝۵۲

آپ اپنی بیویوں میں سے جسے چاہیں مؤخر کریں (چھوڑ دیں) اور جسے چاہیں اپنے پاس جگہ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢١٦) تفسير القرطبي (١٤/ ٢٠٥۔ ٢٠٦)

دیں اور جنھیں آپ نے الگ کر دیا ہے، ان میں سے جسے بھی آپ (اپنے پاس رکھنا) چاہیں تو بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں، یہ (اختیار) اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہوں اور جو کچھ بھی آپ انھیں دیں وہ سب اس پر راضی ہوں اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اور اللہ خوب جاننے والا، نہایت بردبار ہے (51) اور ان کے بعد آپ کے لیے (اور) عورتیں حلال نہیں اور نہ یہ (جائز ہے) کہ آپ ان (موجودہ بیویوں) کی جگہ اور بیویاں بدل لیں، اگرچہ ان کا حسن آپ کو اچھا لگے، سوائے ان (لونڈیوں) کے جن کا مالک آپ کا دایاں ہاتھ بنا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب نگہبان ہے (52)

نبی مکرم ﷺ کو اپنی بیویوں کے حوالے سے دیا گیا ایک خصوصی اختیار:

اگر کسی مرد کے پاس کئی عورتیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ سب کے پاس برابر باری باری رہے۔ نبی کریم ﷺ پر یہ واجب نہ رکھا، اس لیے کہ عورتیں اپنا حق نہ سمجھیں، تو جو دیں اسے راضی ہو کر قبول کریں، لیکن نبی اکرم ﷺ نے فرق نہیں کیا، سب کی باری برابر رکھی۔ سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بخش دی تھی۔ جتنی قسمیں بیان کر دیں ان سے زیادہ حلال نہیں اور جو ہیں ان کو بدلنا حلال نہیں یہ ضرور رہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ کا مال یعنی مملوکہ دو حرم مشہور ہیں یا تین: ایک ماریہ رضی اللہ عنہا جن کے شکم سے آپ ﷺ کے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ ہوئے، ایک ریحانہ یا شمعونہ رضی اللہ عنہا یا دونوں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ یہ ممانعت آخر کو موقوف کر دی گئی اور سب عورتیں حلال ہو گئیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ وہ ان عورتوں کو عار دلایا کرتی تھیں جنھوں نے اپنی جانیں رسول اللہ ﷺ کو بخشیں۔ کہتی تھیں: کیا عورت اس سے نہیں شرماتی کہ اپنی جان بغیر مہر کے پیش کرے، اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ ... الآية ﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں دیکھتی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش کے لیے جلدی کرتا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اسامہ عن ہشام بن عروہ سے روایت کیا ہے،[1] چنانچہ یہ اس پر دال ہے کہ ﴿ تُرْجِيْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اپنی جان بخشنے والی عورتوں میں سے تو جس کو چاہے پیچھے رکھ دے اور جس کو چاہے اپنے پاس جگہ دے، یعنی جس عورت کو چاہے قبول کر لے اور جس کو چاہے رد کر دے، اور جس کو تو نے رد کیا ہے اس میں بھی تجھ کو اختیار ہے کہ اس کے بعد اگر تو چاہے تو اس میں عود کر اور اس کو اپنے پاس جگہ دے دے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے:

﴿ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ﴾

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١٠) مسند أحمد (٦/ ١٥٨)

امام عامر شعبی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ کچھ عورتیں تھیں، جنھوں نے اپنی جانیں نبی کریم ﷺ کو بخشی تھیں۔ آپ ﷺ نے بعض سے دخول کیا اور بعض کو پیچھے رکھ دیا تو انھوں نے آپ ﷺ کے بعد نکاح نہیں کیا، ان میں سے اُم شریک ہیں۔[1] دوسروں نے کہا: بلکہ ﴿تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ... الآیۃ﴾ سے یہ مراد ہے کہ تو اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہے پیچھے رکھ دے۔ تجھ پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تو بیبیوں کے درمیان باری کی تقسیم کو ترک کر دے اور جس کو چاہے مقدم کر دے اور جس کو چاہے موخر کر دے۔ جس سے چاہے جماع کرے اور جس کو چاہے ترک کر دے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، حسن، قتادہ، ابی رزین اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ وغیرہم سے اسی طرح مروی ہے۔[2] اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ ان کے درمیان باری برابر تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ اسی لیے شافعیہ وغیرہم کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ باری کو تقسیم کرنا آپ ﷺ پر واجب نہ تھا اور اس آیتِ کریمہ سے حجت پکڑی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے عن معاذہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں سے کسی عورت کے دن کے بارے میں اذن مانگتے تھے، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ﴿تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ... الآیۃ﴾ معاذہ رحمہا اللہ کہتی ہیں: میں نے کہا ہے کہ تم کیا کہتی تھیں؟ تو فرمایا: میں یہ کہتی تھی کہ اگر یہ میری طرف ہے تو یقیناً میں نہیں چاہتی یا رسول اللہ! کہ آپ پر کسی کو اختیار کروں۔[3] چنانچہ ان کی یہ حدیث اس پر دال ہے کہ اس سے باری تقسیم کرنے کا واجب نہ ہونا مراد ہے اور ان سے مروی پہلی حدیث اس کی مقتضی ہے کہ یہ آیت واہبات کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یعنی وہ عورتیں جنھوں نے اپنی جانیں نبی اکرم ﷺ کو بخشی تھیں۔

اس جگہ سے امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ بات اختیار کی ہے کہ آیت عام ہے واہبات کے حق میں اور ان بیبیوں کے حق میں جو آپ ﷺ کے پاس تھیں کہ آپ کو اختیار دیا گیا کہ اگر چاہیں تو ان میں باری مقرر کریں چاہیں نہ کریں۔[4] یہ بات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کی، حسن اور جید اور قوی ہے اور اس میں حدیثوں کے درمیان جمع ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ... الآیۃ﴾ یعنی جب وہ اس بات کو جان لیں گی کہ اللہ تعالیٰ نے واقعی قسمت (باری مقرر کرنے) میں حرج کو تجھ سے دور کر دیا ہے۔ اس لیے اگر تو چاہے تو قسمت کرے، چاہے نہ کرے، تجھے کسی طرح کا حرج نہیں ہے، پھر اس کے باوجود تو اُن کے لیے برابر کی باری مقرر کرے گا، اپنی طرف سے اختیار کر کے نہ کہ بطور وجوب کے تو ان کو اس سے سرور اور خوشی ہو گی اور اس میں تیرا احسان اٹھائیں گی اور تیری اس بھلائی کا اعتراف کریں گی کہ تو نے ان کی باری مقرر کی اور سب کے حق میں برابری اور عدل و انصاف کا برتاؤ کیا۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٥) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٩١)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١١) [4] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٤٩)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ یعنی تمھارے دلوں میں جو بعض عورتوں کی طرف میلان ہے، بعض کی طرف نہیں ہے۔ یہ امر اس وادی سے ہے جس کو دور کرنا ممکن نہیں ہے، اللہ پاک اس کو جانتا ہے۔ چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیبیوں کی باری تقسیم کرتے تو فرماتے: الٰہی! یہ میرا فعل ہے اس امر کا جس کا میں مالک ہوں، پس تو مجھ کو اس بات میں ملامت مت کر جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں۔[1] (ورواه أهل السنن الأربعة من حديث حماد بن سلمة وزاد أبو داود بعد قوله: فلا تلمني فيما تملك ولا أملك يعني القلب وإسناده صحيح ورجاله كلهم ثقات) اور اسی لیے اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴾ یعنی بے شک اللہ ضمائر و سرائر کو خوب جانتا ہے اور حلم کرتا ہے اور بخشتا ہے۔

ازواجِ مطہرات کے لیے نبی اکرم ﷺ کی صحبت اختیار کرنے کا بدلہ:

علماء میں سے کئی ایک اہلِ علم نے ذکر کیا ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک، قتادہ، ابن زید اور ابن جریر وغیرہم کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ﴾ نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو جزا دینے کے لیے نازل ہوئی اور اُن سے اس بات پر خوش ہونے کے لیے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو اختیار دیا تو انھوں نے اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو اختیار کیا، جیسا کہ آیت میں گزر چکا ہے۔ پھر جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اختیار کیا تو ان کی جزا یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صرف انہیں پر مقصور کیا اور ان کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرنا یا ان کے بدلے میں اور عورتیں لانا آپ ﷺ پر حرام فرمایا، گو آپ ﷺ کو ان کا حسن پسند آئے۔ مگر اماء وسراری (لونڈیاں اور قیدی) کہ ان میں آپ ﷺ پر کسی طرح کا حرج نہیں ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس بارے میں نبی اکرم ﷺ سے حرج دور کر دیا اور اس آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا اور آپ ﷺ کے لیے نکاح کرنا جائز کر دیا، لیکن اس کے بعد آپ ﷺ سے تزوج واقع نہیں ہوا، یعنی آپ ﷺ نے نکاح نہیں کیا، تاکہ ان پر آپ ﷺ کا احسان ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ نے عن عطاء عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے، "قَالَتْ: مَا مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى أَحَلَّ اللّٰهُ لَهُ النِّسَاءَ" ورواه أيضا من حديث ابن جريج عن عطاء عن عبيد بن عمير عن عائشة[2] (ورواه الترمذي والنسائي في سننيهما) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انتقال نہیں فرمایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے

[1] مسند أحمد (٦/ ١٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٤٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٤٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٧١) اس روایت کا مرسل ہونا صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (إرواء الغليل: ٧/ ٨١) البتہ نبی کریم ﷺ کا اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم میں عدل کرنا کئی ایک صحیح احادیث میں مروی ہے۔

[2] مسند أحمد (٦/ ٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢١٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٣٠٤)

آپ ﷺ کے لیے یہ بات حلال کر دی کہ جس عورت سے چاہیں نکاح کر لیں، سوائے ذاتِ محرم عورتوں کے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ ... الآية ﴾[1]

چنانچہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کو اُس آیت کا ناسخ ٹھہرایا جو تلاوت میں اس کے بعد ہے، جیسے: سورۃ البقرہ میں وفات کی عدت کے بارے میں دو آیتیں ہیں، جن میں سے پہلی آیت بعد والی آیت کی ناسخ ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم۔ دوسروں نے کہا: بلکہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ تیرے لیے اس کے بعد اور عورتیں حلال نہیں ہیں، یعنی ہم نے تیرے لیے ان عورتوں کی جو صفت بیان کی ہے، جن کو ہم نے تیرے لیے حلال کیا ہے، یعنی تیری عورتوں میں سے جن کے مہر تو دے چکا ہے اور وہ جس کا تیرا داہنا ہاتھ مالک ہوا ہے اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھیوں اور ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیاں اور وہ جنھوں نے اپنا نفس تجھے بخش دیا۔ اس کے علاوہ اور قسم کی عورتیں تیرے لیے حلال نہیں ہیں۔ یہ قول سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے اور امام عکرمہ اور ضحاک رحمہما اللہ سے اور امام ابو رزین رحمہ اللہ سے اور امام ابو صالح، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ سے اور امام سدی رحمہ اللہ وغیرہم سے مختلف روایات میں مروی ہے۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک انصاری زیاد نامی سے روایت کیا ہے کہ میں نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا: تم مجھے بتاؤ کہ اگر نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات وفات پا گئیں تو کیا آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ اور نکاح کریں؟ تو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بولے: آپ کو اس سے کون سی شے مانع ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ کا قول کہ ﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ﴾ تو سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ نے جو ان کے لیے حلال کی ہیں، وہ عورتوں کی ایک قسم میں سے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ ﴾ پھر آپ ﷺ سے یہ کہا گیا: ﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ﴾[3]

(ورواه عبدالله بن أحمد عن طرق عن داود به)

امام ترمذی رحمہ اللہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں کی اصناف سے منع کیے گئے سوائے مومنات مہاجرات کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ﴾ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حلال کیں تمھاری فتیات مومنات اور مومن عورت اگر اپنی جان نبی کو بخش دے اور حرام کر دی ہر دین والی سوائے اسلام کے۔ پھر کہا: ﴿ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ﴾ [المائدة: ٥] ''منکرینِ ایمان کے اعمال ضائع اور اکارت ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٧) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٩٨) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٥٧)

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٩٧_ ٢٩٨) مسند أحمد (٥/ ١٣٢)

نے فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ١٘ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ اور حرام کر دیں اس کے سوا عورتوں کی قسمیں۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ﴾ یعنی اس کے بعد کہ جس کا تیرے لیے نام لیا گیا، یعنی مسلمہ نہ کہ یہودیہ اور نہ نصرانیہ اور نہ کافرہ۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ﴾ اور نہیں حکم کیے گئے اس کا کہ نکاح کریں کسی اعرابیہ سے یا غریبہ سے اور نکاح کریں اس کے بعد تہامہ کی عورتوں سے اور اگر چاہیں تو چچا اور پھوپھیوں اور ماموؤں و خالہ کی بیٹیوں سے تین سو۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ﴾ یعنی بعد اس کے جس کا نام لیا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ بات اختیار کی ہے کہ آیت عام ہے ان اصنافِ نساء میں جن کا ذکر کیا گیا اور اُن بیبیوں میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت میں تھیں، وہ نو تھیں۔[2] یہ بات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی یہ عمدہ ہے اور سلف میں سے بہت سے لوگوں کی۔ یہی مراد ہے جن سے ہم نے حکایت کی ہے، کیوں کہ اُن میں سے بہت سوں سے یہ قول اور یہ قول مروی ہے اور کچھ تضاد نہیں ہے، واللہ أعلم۔ پھر خود امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنے اوپر یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ یہ بات مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی۔ پھر ان سے رجوع کیا اور سودہ رضی اللہ عنہا کو علاحدہ کرنے کا عزم کیا یہاں تک کہ انھوں نے اپنا دن عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا، پھر خود ہی اس کا یہ جواب دیا کہ یہ اس آیت کے نزول سے پہلے تھا: ﴿ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ ... الآیۃ ﴾۔[3] اور یہ بات جو کہی کہ اس آیت کے قبل تھا صحیح ہے، لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے، آیت تو اس پر دال ہے کہ جو عورتیں آپ کی عصمت میں ہیں، ان کے سوا سے نکاح نہ کریں اور ان سے اُن کے غیر کو نہ بدلیں، اس پر دال نہیں کہ ان میں سے کسی کو استبدال کے بغیر طلاق نہ دیں۔ (واللہ أعلم)

چنانچہ سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کا قضیہ صحیح میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور وہی اس آیتِ کریمہ کا سببِ نزول ہے۔

﴿ وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا١ؕ وَ الصُّلْحُ خَیْرٌ١ؕ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ١ؕ وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴾ [النساء: ١٢٨]

''اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی بد دماغی اور بے پروائی کا خوف ہو تو دونوں آپس میں جو صلح کر لیں اس میں کسی پر کوئی گناہ نہیں۔ صلح بہت بہتر چیز ہے، طمع ہر ہر نفس میں شامل کر دی گئی ہے۔ اگر تم اچھا سلوک کرو اور پرہیز گاری کرو تو تم

[1] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٢١٥) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: (التلخیص الحبیر: ٣/ ١٢٣)

[2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٢٩٨۔ ٢٩٩) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٥٧) [3] تفسیر الطبري (٢٠/ ٣٠٣)

جو کر رہے ہو اس پر اللہ تعالیٰ پوری طرح خبر دار ہے۔‘‘

رہا حفصہ رضی اللہ عنہا کا قضیہ سو عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی پھر ان سے رجوع فرمایا۔[1] (رواه أبو داود و النسائي و ابن ماجه و ابن حبان في صحيحه من طرق وهذا إسناد قوي) حافظ ابو یعلیٰ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حفصہ رضی اللہ عنہا پر داخل ہوئے اور وہ رو رہی تھیں تو فرمایا: تجھے کون سی چیز رلاتی ہے؟ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے طلاق دے دی۔ بے شک انھوں نے ایک بار تجھے طلاق دی۔ پھر میری خاطر تجھ سے رجوع فرمایا۔ واللہ! البتہ اگر وہ دوسری بار تجھے طلاق دیں گے تو میں کبھی تجھ سے بات نہ کروں گا۔[2] اس روایت کے رجال صحیحین کی شرط پر ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَآ اَنۡ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنۡ اَزۡوٰجٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكَ حُسۡنُهُنَّ ﴾ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمایا ہے کہ ان پر زیادہ کریں، یا ان میں سے کسی کو طلاق دیں اور اس کی جگہ اور کو بدل لیں ”اِلَّا مَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُهٗ“۔ حافظ ابو بکر بزار رحمہ اللہ نے عن عطاء بن یسار عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ جاہلیت میں بدل اس طرح سے تھا کہ ایک مرد دوسرے سے کہے کہ تو اپنی عورت کا مجھ سے مبادلہ کر اور میں اپنی عورت کا تجھ سے مبادلہ کروں، یعنی تو میرے لیے اپنی عورت سے اترے اور میں تیرے لیے اپنی عورت سے اتروں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَآ اَنۡ تَبَدَّلَ بِهِنَّ ... الآية ﴾۔

کہا: پھر عیینہ بن حصن فزاری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر داخل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں تو وہ بغیر اجازت داخل ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر کہاں ہے اذن مانگنا؟ تو وہ بولا: یا رسول اللہ! میں نے مضر کے کسی مرد پر اذن نہیں مانگا، جب سے میں بالغ ہوا ہوں۔ پھر کہا: آپ کے پہلو میں یہ حمیرا کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ عائشہ ام المومنین ہے۔ عرض کی: پھر کیا میں آپ کے واسطے حسین تر خلق سے نہ اتروں؟ فرمایا: اے عیینہ! بے شک اللہ نے واقعی اس کو حرام کر دیا ہے۔ پھر جب وہ نکل گیا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یہ کون ہے؟ فرمایا: « أَحۡمَقُ مُطَاعٌ، وَإِنَّهُ عَلىٰ مَا تَرَيۡنَ لَسَيِّدُ قَوۡمِهِ » یعنی ایک احمق بے وقوف ہے، لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں اور بے شک وہ اس حماقت کے باوجود جس کو تو دیکھتی ہے، البتہ اپنی قوم کا سردار ہے۔[3] پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسحاق بن عبداللہ، یعنی جو راوی ہیں عن زید بن اسلم عن عطاء ”لين الحديث جداً“ ہے اور ہم نے جو اس حدیث کو ذکر کیا تو صرف اس لیے کہ ہم نے اس کو حفظ نہیں کیا ہے، مگر اس وجہ سے اور اس میں جو علت تھی وہ بیان کر دی۔[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٨٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠١٦) صحيح ابن حبان (١٠/ ١٠٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٠٧)

[2] مسند أبي يعلىٰ (١/ ١٥٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٠٧)

[3] مسند البزار (١٥/ ٢٧٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”فيه إسحاق بن عبد الله بن أبي فروة وهو متروك“ (مجمع الزوائد: ٧/ ٢١٠)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٥٦۔ ٦٥٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ تُرْجِیْ ﴾ کو مہموز اور غیر مہموز دونوں طرح پڑھا ہے، یہ دونوں دو لغت ہیں۔ "إرجاء" بہ معنی تاخیر ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَرْجَأْتُ الْأَمْرَ وَأَرْجَيْتُهُ" جبکہ تو اس امر کو موخر کردے۔ "آوَاهُ إِلَيْهِ" بالمد کے یہ معنی ہیں کہ فلاں نے فلاں کو اپنی طرف ملا لیا اس کو اپنے پاس جگہ دی۔ "أَوَى إِلَيْهِ" بالقصر کے یہ معنی ہیں کہ فلاں فلاں کی طرف مل گیا، اس کے پاس ٹھکانا پکڑا۔ ﴿ تُؤْوِیْٓ اِلَیْكَ ﴾ کے معنی ہیں: "تَضُمُّ إِلَيْكَ" یعنی اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ پر وسعت فرمائی اور ان عورتوں میں ان کو مختار ٹھہرایا۔ چنانچہ ان میں سے جس کو چاہیں موخر کریں اور اس کی باری کو موخر کریں اور اسے چھوڑ دیں، اس کے پاس نہ آئیں بغیر طلاق کے اور ان میں سے جس کو چاہیں اپنی طرف ملا لیں، اپنے پاس جگہ دیں اور اس کو اپنے پاس لٹائیں، سلائیں اور اس کے پاس رات بسر کریں۔

پہلے باریوں کی تقسیم کرنا آپ ﷺ پر واجب تھا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو وجوب اُٹھ گیا اور آپ ﷺ کو اختیار دے دیا گیا۔ جن بیویوں کو آپ ﷺ نے اپنے پاس جگہ دی ان میں سے یہ ہیں: سیدہ عائشہ، حفصہ، اُم سلمہ، زینب رضی اللہ عنہن اور جن کے امر کو موخر کیا، ان میں سے یہ ہیں: سیدہ سودہ، جویریہ، اُم حبیبہ، میمونہ اور صفیہ رضی اللہ عنہن۔ جن کو اپنے پاس جگہ دی تھی ان کی باری کی تقسیم میں آپ برابری فرماتے تھے اور جن کے امر کو موخر کیا تھا، ان کے لیے جس طرح چاہتے باری تقسیم کرتے۔ اس آیت کے معنی میں یہ جمہور مفسرین کا قول ہے اور یہی مناسب ہے، جیسے ذکر ہوا اور صحیح وغیرہ میں اسی پر دلائل ثابتہ ہیں:

1. امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا: یہ جو صحیح میں ثابت ہوا، یہی اس لائق ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے، لیکن آپ ﷺ اپنی طرف سے باری تقسیم فرماتے تھے، اس کے بغیر کہ آپ ﷺ پر یہ فرض ہو، تاکہ ان کے جی خوش ہو جائیں اور وہ اس قسم کی غیرت کی باتوں سے محفوظ ہو جائیں جو ایسے امر کی طرف لے جاتی ہیں جو مناسب نہیں ہوتا۔
2. کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت ان کے حق میں ہے جنھوں نے اپنی جان آپ کو بخشی نہ کہ ان کے علاوہ بیویوں کے حق میں ہے، یہ قول امام شعبی رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔[1]
3. کسی نے کہا: آیت کے معنی طلاق میں ہیں، یعنی طلاق دے تو ان میں سے جس کو چاہے اور روک رکھے جس کو چاہے۔
4. حسن رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اپنی امت کی عورتوں میں سے جس سے چاہے اس کے ساتھ نکاح کرے اور

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢١٣۔ ٢١٤)

ان میں سے جس کو چاہے اسے چھوڑ دے۔[1] کہا گیا ہے کہ یہ آیت ناسخ ہے اس آیت کی ﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ﴾۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ تُرْجِيْ ﴾ کی تفسیر "تُؤَخِّرُ" مروی ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے: "مَنْ شِئْتَ خَلَّيْتَ سَبِيْلَهَا مِنْهُنَّ وَمَنْ أَحْبَبْتَ أَمْسَكْتَ مِنْهُنَّ" ان میں سے جس کو چاہیں فارغ کر دیں اور جسے چاہیں اپنے پاس رکھیں۔ امام ابو رزین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصد فرمایا کہ اپنی بیویوں میں سے کسی کو طلاق دیں۔ جب انھوں نے یہ دیکھا تو آپ کے پاس آئیں۔ پھر عرض کی: آپ ہماری راہ مت چھوڑیں، یعنی ہم کو طلاق مت دیں اور آپ حِل میں ہیں، یعنی معافی میں اس بارے میں جو ہمارے اور آپ کے درمیان میں ہے، آپ ہمارے لیے اپنی جان اور مال میں سے جو چاہیں مقرر کر دیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ ﴾۔

فرماتا ہے: "تَعْزِلُ مَنْ تَشَاءُ" یعنی کنارے کر تو جس کو چاہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے کئی عورتوں کو کنارے کیا اور کئی کو جگہ دی۔ "من أرجى" (جن کو کنارے کیا) میں سے یہ تھیں: سیدہ میمونہ، جویریہ، اُم حبیبہ، صفیہ اور سودہ رضی اللہ عنہن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان اپنے جان و مال سے جس طرح چاہتے تقسیم کرتے۔ اور "من أوى" (جن کو جگہ دی) میں سے یہ تھیں: سیدہ عائشہ، حفصہ، اُم سلمہ اور زینب رضی اللہ عنہن۔ ان کے درمیان اپنی جان و مال میں سے برابر کی تقسیم تھی۔[2] "ابتغاء" کے معنی طلب اور عزل کے ہیں۔ ازالہ یعنی اگر تو چاہے کہ ان عورتوں میں سے جن کو تو علاحدہ کر چکا ہے، کسی کو اپنے ساتھ ملا لے اور اس کو اپنے پاس جگہ دے تو اس میں تجھ پر کچھ حرج نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس معاملے کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا، یعنی اپنی بیویوں میں جو چاہیں کریں۔ تقدیم وتاخیر، عزل و امساک، ضم من ارجی وارجاء من ضم إليه اور ان کے کام میں جو کچھ چاہیں کریں۔ اللہ پاک نے یہ حکم ان پر فراخی کرنے کے لیے اور ان سے حرج دور کرنے کے لیے دیا۔ ﴿ جُنَاحَ ﴾ کی اصل میلان ہے، جس وقت کشتی ادھر اُدھر مائل ہو جاتی ہے تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "جَنَحَتِ السَّفِيْنَةُ" معنی یہ ہیں کہ جو کچھ تو نے کیا اس میں کسی طرح کی ملامت یا عتاب نہیں ہے، یعنی اس کام میں کوئی ملامت یا عتاب تیری طرف مائل نہ ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ ... الآية ﴾ اس کی خبر ہے، یعنی تیری مشیت کے سپرد کر دینا ان کی رضا کے زیادہ قریب ہے اور ان کے دلوں کو زیادہ خوش کرنے والا ہے، کیوں کہ وہ ہماری طرف سے ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی صحبت کے بارے میں تجھے اختیار دینا ان کی رضا کے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ جب وہ یہ بات جان لیں گی کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے ہے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور ان کے

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٨٦)
[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٢٩١۔ ٢٩٢) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٥)

دل کو چین ملے گا اور آپس کی غیرت دور ہو جائے گی اور رضا حاصل ہو گی۔[1] جمہور نے ﴿ تَقَرَّ ﴾ بہ صیغۂ فعل مضارع معروف پڑھا ہے ﴿ اَعْيُنُهُنَّ ﴾ کی طرف مسند ہے۔ ابن محیصن نے "تُقِرُّ" بہ ضمِ فوقیہ اقرار باب افعال سے پڑھا ہے۔ اس کا فاعل ضمیر مخاطب ہے اور ﴿ اَعْيُنُهُنَّ ﴾ اس کا مفعول منصوب۔ اور کسی نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔[2] "قرة العین" کے معنی سورت مریم میں گزر چکے ہیں۔ ﴿ وَلَا يَحْزَنَّ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کو کسی طرح رنج و غم حاصل نہ ہو گا اس سبب سے کہ بعض کو تو اختیار کرے گا اور بعض کو نہ کرے گا۔

﴿ وَ يَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ﴾ یعنی ان کو جو کچھ تو عطا کرے گا، یعنی کسی کو قریب کرے گا، کسی کو موخر اور علاحدہ، کسی کو اپنے پاس جگہ دے گا، ان سب کاموں سے وہ سب خوش رہیں گی، کسی طرح کا شکوہ و شکایت نہ کریں گی، کیوں کہ یہ حکم تو اللہ پاک کی طرف سے ہے۔[3] جمہور نے ﴿ كُلُّهُنَّ ﴾ بہ رفع پڑھا ہے ﴿ يَرْضَيْنَ ﴾ کے فاعل کی تاکید کے لیے۔ امام ابو ایاس رحمہ اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے ﴿ اٰتَيْتَهُنَّ ﴾ کی ضمیر مفعول کی تاکید کے لیے۔[4]

نبی کریم ﷺ اپنی وفات تک ان کے درمیان باری تقسیم فرمایا کرتے تھے اور جو کچھ آپ ﷺ کے لیے مباح کیا گیا تھا، اس میں سے آپ ﷺ نے کسی شے کا برتاؤ نہیں فرمایا، اپنے نفسِ مقدس پر ضبط کرتے ہوئے اور افضل اور بہتر امر کو لینے کے لیے۔ سوائے سودہ رضی اللہ عنہا کے کسی کو دور نہیں رکھا اور انھوں نے بھی اپنی رات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی۔

﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہر وہ چیز جانتا ہے جس کو تم چھپاتے ہو، اس میں سے امورِ نساء ہیں اور بعض کی طرف مائل ہونا جن کو تم اپنے دلوں میں چھپاتے ہو۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴾ یعنی اللہ پاک ہر شے کا جاننے والا ہے، وہ اس چیز کو بھی جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے، اس پر کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ چیز بھی چھپی نہیں رہتی۔ وہ بڑا حلم کرنے والا ہے، وہ گناہ گاروں کو سزا دینے کی جلدی نہیں کرتا۔ لہٰذا چاہیے کہ اس کے محارم سے پرہیز کیا جائے، کیوں کہ حلیم کا انتقام اور غضب بہت بڑا ہوتا ہے۔

﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ﴾ جمہور نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے، اس لیے کہ فعل اور فاعل مونث کے درمیان فصل واقع ہو گئی ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے، یعنی تیرے لیے عورتیں حلال نہیں ہیں ان نو بیویوں کے بعد، جنھوں نے تجھے اختیار کر لیا ہے اور تیری عصمت میں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ وہ نو ہیں جن کو چھوڑ کر آپ ﷺ نے وفات فرمائی، یعنی سیدہ عائشہ بنت صدیق اکبر، حفصہ دختر عمر فاروق اعظم، اُم حبیبہ بنت ابو سفیان، سودہ بنت زمعہ، ام سلمہ بنت ابی امیہ، صفیہ بنت حی بن اخطب خیبریہ، میمونہ بنت حارث ہلالیہ، زینب بنت جحش اسدیہ اور جویریہ بنت حارث مصطلقیہ رضی اللہ عنہن۔[5] (قاله أبو السعود)

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢١٥) [2] فتح القدير (٤/ ٣٨٧) [3] رقم الآية (٢٦)

[4] روح المعاني (٢٢/ ٦٣) [5] تفسير أبي السعود (٧/ ١١١)

اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں اہلِ علم نے کئی قول پر اختلاف کیا ہے۔ اول یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور رسول اللہ ﷺ پر حرام کیا گیا ہے کہ اپنی بیویوں پر اور نکاح کریں ان کے اس فعل کے بدلے میں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول ﷺ کو اور دارِ آخرت کو اختیار کیا، جب رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے ان کو اس کا اختیار دیا۔ یہ قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، ضحاک، قتادہ، حسن، ابن سیرین، ابو بکر بن عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام، ابن زید اور ابن جریر رحمہ اللہ کا ہے۔ ابو امامہ بن سہل بن حنیف نے کہا ہے: جب کہ اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کی بیویوں پر یہ حرام کیا کہ آپ ﷺ کے بعد نکاح کریں تو آپ ﷺ پر یہ حرام کیا کہ آپ ان کے سوا اور عورتوں سے نکاح کریں۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، امام عکرمہ اور ابو رزین رحمہما اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تیرے لیے ان اصناف کے علاوہ عورتیں حلال نہیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا اور یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تیرے لیے یہودی اور نصرانی عورتیں حلال نہیں ہیں، کیوں کہ ان کا اُمہات المومنین کہلانا صحیح نہیں ہے۔ اس قول میں بُعد ہے، کیوں کہ تقدیرِ عبارت یہ ہو گی: حلال نہیں ہیں تیرے لیے عورتیں مسلمات کے بعد، حالاں کہ مسلمات کا ذکر نہیں گزرا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت سنت سے منسوخ ہے، یعنی حدیث شریف سے اور اس آیت سے: ﴿ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ ... الآية ﴾۔ سیدہ ام سلمہ، عائشہ، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اور علی بن الحسین رحمہ اللہ وغیرہم اسی قول کے قائل ہیں۔ راجح قول یہی ہے ان قولوں کے دلائل پہلے گزر چکے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ ﴾۔ ﴿ تَبَدَّلَ ﴾ کی اصل "تَتَبَدَّلُ" ہے ایک حرف تاء حذف کر دیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ تیرے لیے جائز نہیں ہے کہ تو ان میں سے ایک کو یا زیادہ کو طلاق دے اور ان میں سے جس عورت کو طلاق دی ہے اس کے عوض اور عورت سے نکاح کر لے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ معنی ہیں کہ اور نہ یہ حلال ہے کہ تو مسلمان عورتوں کے بدلے میں دوسری کتابی عورتوں کو لے آئے، کیوں کہ ام المومنین یہودی عورت نہیں ہوسکتی اور نہ ہی نصرانی عورت ہوسکتی ہے۔

﴿ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ﴾ یعنی کتابی عورتوں میں سے ملکِ یمن کے سوا، چنانچہ تو ان میں سے لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ زیادہ ہے جو نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس تحریم میں تمام ازواج شامل ہیں۔ غرض یہ ہے کہ تبدل سے مراد یا تو طلاق کے ذریعے سے تبدل ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] یا دو شخص باہم اپنی بیویوں کا تبادلہ کریں، جیسا کہ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک ایسی شے ہے جس کو عرب کے لوگ کیا کرتے تھے کہ تو میری بیوی لے لے اور مجھے اپنی بیوی دے دے۔ امام ابن جریر اور نحاس رحمہما اللہ نے ابن زید رحمہ اللہ کے قول کا انکار کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب نے یہ کام کبھی نہیں کیا،[2] لیکن اس انکار کو وہ روایتیں

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٣١٢) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٠١۔ ٣٠٢) تفسير القرطبي (١٤/ ٢٢٠)

ختم کرتی ہیں جو مبادلے کے بارے میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں،[1] چنانچہ پہلے ان کا ذکر ہو چکا ہے۔

جملہ ﴿ وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ تَبَدَّلَ ﴾ کے فاعل سے۔ معنی یہ ہیں کہ یہ حلال نہیں ہے کہ تو اپنی بیویوں کے عوض تبدل کرے، اگرچہ تجھے ان دوسری عورتوں کا حسن خوش کرے جن میں سے تو نے تبدل کا ارادہ کیا ہے۔ یہ قول اس قول کی طرح ہے کہ "أَعْطُوا السَّائِلَ وَلَوْ عَلٰى فَرَسٍ"، یعنی سائل کو ہر حال میں دو، گو وہ اس حالت میں ہو جو دینے کے منافی ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے زمخشری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ﴿ وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ ﴾ فاعل سے حال کے معنی میں ہے، وہ فاعل ضمیرِ مخاطب ہے۔ ﴿ تَبَدَّلَ ﴾ میں مفعول سے حال نہیں ہے، یعنی ﴿ مِنْ اَزْوَاجٍ ﴾ سے، اس لیے کہ یہ تنکیر میں متوغل ہے، یعنی حرفِ "مِنْ" کو استغراقِ جنس کے لیے زیادہ کر کے اس کی تنکیر میں غلو کیا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "مَفْرُوْضًا إِعْجَابُكَ بِهِنَّ" یعنی حلال نہیں ہے کہ ان کے بدلے کوئی اور عورتیں کرے اس حال میں کہ تیرا اعجاب ان کے ساتھ فرض کیا گیا ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا من جملہ "من أعجبه حسنهن" ہیں۔

چنانچہ امام خازن رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ مراد اسماء بنت عمیس خثعمیہ رضی اللہ عنہا ہیں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوی، جبکہ وہ شہید ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ ان سے نکاح کا پیام کریں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے نہی فرمائی گئی۔[2] یہ تبدل بھی قولِ راجح کی بنا پر ان چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ پاک نے اپنے رسول کے حق میں منسوخ فرمایا ہے اور اس کا نسخ یا تو سنت کے ساتھ ہے یا اس آیتِ کریمہ کے ساتھ ﴿ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ ﴾ نزول کی ترتیب پر مصحف کی ترتیب پر نہیں ہے۔[3] (كذا قال النسفي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ﴾۔ استثناء ہے نساء سے، کیوں کہ کلمہ نساء آزاد عورتوں اور لونڈیوں کو شامل ہے۔ کسی نے کہا: منقطع ہے، معنی یہ ہیں: "لیکن حلال ہیں تیرے لیے لونڈیاں۔" امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: اس میں دو وجوہات ہیں: ایک یہ ہے کہ نساء سے مستثنیٰ ہے تو اب اس میں دو وجہیں ہیں: ایک تو نصب بنا بر استثناء، دوسرے رفع بنا بر بدل، مختار یہی وجہ ہے۔ دوسری وجہ ازواج سے استثناء ہے۔ یہ قول امام ابو البقاء رحمہ اللہ کا ہے،[4] اب اس میں جائز ہے کہ موضع نصب میں ہو بنا بر اصل استثناء۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ موضع جر میں ازواج سے بدل ہو بنا بر لفظ اور یہ بھی کہ موضع نصب میں ہو بدل ازواج سے بنا بر محل۔ علماء رحمہم اللہ نے کافر لونڈی کے حلال ہونے میں اختلاف کیا ہے دو قول پر:

پہلا قول یہ ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس آیت کی عمومیت کے سبب سے حلال ہے۔ امام مجاہد، سعید

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ② تفسير الخازن (٥/ ٢٧١)

③ تفسير النسفي (٣/ ٣١٢) ④ التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٥٩)

بن جبیر، عطاء اور حسن رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے لیے حلال نہیں ہیں، کیوں کہ ایک کافرہ کی مباشرت نبی کریم ﷺ کی قدر شریف اور آپ ﷺ کی تنزیہ کی وجہ سے مناسب نہیں ہے۔ پہلے قول کی ترجیح اس آیت کے عام ہونے سے ہو سکتی ہے۔ رہی ممانعت کی وجہ جو تنزیہ کے ساتھ کی ہے تو وہ ضعیف ہے۔ جس شے کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اس سے کچھ تنزہ نہیں ہے وہ تو طیب ہے خبیث نہیں ہے، اس شے کے اعتبار سے جو امورِ نکاح سے متعلق ہے نہ کہ اس کے علاوہ اور اعتبار سے، کیوں کہ نصِ قرآنی سے مشرکین نجس ہیں۔ قولِ ثانی کی ترجیح اس آیت سے ہو سکتی ہے: ﴿ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ [الممتحنة: ١٠] ''اور کافر عورتوں کی ناموس اپنے قبضہ میں نہ رکھو۔'' کیوں کہ یہ نہی عام ہے۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴾ یعنی اللہ ہر شے پر مراقب ومحافظ ومہیمن، یعنی نگہبان اور امیٖن ہے، کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے اور نہ کوئی شے اس سے فوت ہوتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ ازواجِ مطہرات کے بعد ماریہ قبطیہ کے مالک ہوئے۔ ماہ ذی الحجہ ۸ ہجری میں ابراہیم رضی اللہ عنہ ان کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ستر دن کی عمر اور کسی نے کہا: ایک سال دس مہینے کی عمر میں نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں وفات پائی۔ ایک روایت میں ہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے بہ نفسِ نفیس ان پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تو انھوں نے نماز پڑھی۔ (قاله ابن حجر في شرح الهمزية على ما نقله سليمان الجمل) یہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا وہ ہیں جن کو مقوقس ملکِ قبط نے نبی کریم ﷺ کی خدمت شریف میں ہدیتاً بھیجا تھا۔ قبط اہلِ مصر وسکندریہ ہیں، یہ مقوقس صاحبِ اسکندریہ تھا۔ ابن ماکولا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا نام جریج بدو جیم اول مضموم ہے۔ مسلمان نہیں ہوا نصرانی رہا۔ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے عہدِ سعادت مہد میں مسلمانوں نے اس سے مصر کو فتح کیا۔ امام ابن منذر اور ابونعیم رحمہ اللہ نے مقوقس کا ذکر کیا ہے، حالاں کہ اس کے ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ مسلمان نہیں ہوا۔ ہدیہ بھیجنے کا باعث یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی معرفت اسلام کا نامۂ ہدایت شمامہ اس کے پاس بھیجا وہ خط یہ ہے:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ إِلَى الْمَقَوْقَسِ عَظِيْمِ الْقِبْطِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّيْ أَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ وَأَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ إِثْمُ الْقِبْطِ وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ»

''محمد بن عبداللہ سے مقوقس امیر قبط کی طرف۔ سلامتی ہو اس شخص پر جس نے ہدایت کا اتباع کیا۔ اما بعد! پس بے شک میں تجھ کو ایک کلمے کی طرف بلاتا ہوں جو اسلام کی طرف بلانے والا ہے، تو مسلمان ہو جا

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٢١)

سلامت رہے گا، یعنی تیرا مال و جان۔ اور اسلام لے آئے گا تو تجھ کو اللہ تیرا اجر دوبارہ دے گا، اگر تو نے اعراض کیا تو سوا اس کے نہیں کہ تجھ پر قبطیوں کا گناہ ہے، یعنی اس لیے کہ تو ان کا امیر ہے، اگر مسلمان ہو گا تو وہ بھی مسلمان ہوں گے، تو مسلمان نہ ہو گا تو وہ بھی نہ ہوں گے تو ان کے اسلام نہ لانے کا گناہ بھی تجھ پر ہو گا اور اے کتاب والو! آؤ ایک کلمے کی طرف جو برابر ہے ہمارے اور تمھارے درمیان، وہ یہ ہے کہ نہ پوجیں ہم مگر اللہ کو... آخر آیت تک۔"

(خط میں الفاظ کی تشریح: عظیم بہ معنی امیر ہے۔ اور "دعایة" بہ کسرِ دالِ مہملہ بہ معنی دعوت ہے۔ داعیہ بھی مروی ہے۔ داعیہ مصدر ہے، جیسے: عافیت و عاقبہ ہیں۔ حرف با بہ معنی "إلیٰ" ہے۔ دعایتِ اسلام سے مراد کلمۂ شہادت ہے کہ جس کی طرف کافر لوگ بلائے جاتے ہیں)۔ پھر جب حاطب رضی اللہ عنہ اس مبارک خط کو مقوقس کی طرف لے گئے تو اس کو اسکندریہ میں پایا اور وہ خط اس کو دے دیا تو اس نے اس کو پڑھا۔ پھر اس کو ہاتھی دانت کے ڈبے میں رکھا اور اس پر مہر لگائی اور اس کو لونڈی کے حوالے کیا، پھر اس کا یہ جواب لکھا:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لِمُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ مِنَ الْمَقُوْقَسِ عَظِيْمِ الْقِبْطِ سَلَامٌ عَلَيْكَ أَمَّا بَعْدُ! فَقَده قَرَأْتُ كِتَابَكَ وَفَهِمْتُ مَا ذَكَرْتَ فِيْهِ وَمَا تَدْعُوْ إِلَيْهِ وَعَلِمْتُ أَنَّ نَبِيًّا قَدْ بَقِيَ وَمَا كُنْتُ أَظُنُّ أَنَّهُ يَخْرُجُ إِلَّا بِالشَّامِ وَقَدْ أَكْرَمْتُ رَسُوْلَكَ أَيْ: فَإِنَّهُ قَدْ دَفَعَ لَهُ مِائَةَ دِيْنَارٍ وَّخَمْسَةَ أَثْوَابٍ وَبَعَثْتُ لَكَ بِجَارِيَتَيْنِ لَهُمَا مَكَانٌ فِي الْقِبْطِ عَظِيْمٌ، أَيْ: وَهُمَا مَارِيَةُ وَسِيْرِيْنُ وَثِيَابٌ، أَيْ: عِشْرِيْنَ ثَوْبًا مِنْ قَبَاطِيِّ مِصْر -قَالَ بَعْضُهُمْ: وَأَرْسَلَ لَهُ عَمَائِمَ وَقَبَاطِيَّ وَطِيْبًا وَّعُوْدًا وَنداً وَمِسْكًا مَعَ أَلْفِ مِثْقَالٍ مِنَ الذَّهَبِ وَمَعَ قَدَحٍ مِنْ قَوَارِيْرَ وَبَغْلَةٍ لِلرُّكُوْبِ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ"

یعنی محمد بن عبداللہ کی طرف مقوقس عظیم قبط کی جانب سے، سلام ہو تجھ پر اما بعد! مقرر میں نے تیرے خط کو پڑھا اور سمجھا اس شے کو جو تو نے اس میں ذکر کی ہے اور اس شے کو جس کی طرف تو بلاتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ یقیناً ایک نبی باقی رہا ہے، میں نہیں گمان کرتا تھا کہ وہ نکلے گا، مگر شام میں اور میں نے تیرے قاصد کا اکرام کیا، یعنی اس طرح کہ اس کو سو اشرفیاں دیں اور پانچ کپڑے اور میں نے تیرے لیے ایسی دو لونڈیاں بھیجی ہیں جن کے لیے قبط میں ایک رتبۂ عظیم ہے، یعنی وہ ماریہ اور سیرین ہیں اور کپڑے، یعنی بیس عدد قباطی مصر سے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس نے آپ کے لیے عمامے بھیجے اور قباطی اور خوشبو اور عود اور ند و مشک ایک ہزار مثقال سونے اور ایک کانچ کی پیالی کے ساتھ اور ایک خچر سواری کے لیے اور سلام ہو تجھ پر۔

اس نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا اور اسلام نہیں لایا اور دو لونڈیوں کے علاوہ ایک اور لونڈی بھیجی اور ایک

خصی یعنی خواجہ سرا، اس کو مابور کہتے تھے اور بغلہ کا نام دلدل تھا، اس کا رنگ شہبا (سفید اور سیاہ) اور ایک گھوڑا جس کا نام لزاز تھا، کیوں کہ اس نے حاطب رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ تیرا صاحب گھوڑوں میں سے کون سا گھوڑا پسند کرتا ہے؟ تو حاطب رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اشقر۔ اور میں ابھی ان کے پاس ایک گھوڑا چھوڑ کر آیا ہوں جس کو مرتجز کہتے ہیں تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مصر کے خیل موصوفہ سے ایک گھوڑا منتخب کیا، پھر اس پر زین اور لگام لگائی، یہ گھوڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرس میمون ہے اور بنہا (مصر کا ایک دیہات) کے شہد سے آپ کی طرف شہد ہدیہ بھیجا۔[1] (كذا في سيرة الحلبي)

غرض یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے حقوق جن کی رعایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب ہے، جب اللہ پاک ان کا بیان کر چکا تو ان کے وہ حقوق جن کی رعایت لوگوں پر واجب ہے ان کا بیان شروع کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ
يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا
دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ
اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا
يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ
حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ
تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا
اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۝ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ
تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ لَا جُنَاحَ
عَلَيْهِنَّ فِيْۤ اٰبَآىِٕهِنَّ وَلَاۤ اَبْنَآىِٕهِنَّ وَلَاۤ اِخْوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبْنَآءِ
اِخْوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآىِٕهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُنَّ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
شَهِيْدًا ۝

اے ایمان والو! تم نبی کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، الا یہ کہ تمھیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے، نہ یہ کہ (وہاں جا کر) کھانا پکنے کا انتظار کرتے رہو اور لیکن جب تمھیں دعوت دی

[1] السيرة الحلبية (٣/ ٢٩٥۔ ٢٩٨) [2] فتح البيان (١١/ ١١٨۔ ١٢٥)

جائے تب تم داخل ہو جاؤ، پھر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور (وہیں) باتوں میں نہ لگے رہو، بلاشبہ تمھاری یہ روش نبی (ﷺ) کو تکلیف دیتی ہے، چناں چہ وہ تم سے شرماتے ہیں اور اللہ حق بات سے نہیں شرماتا اور جب تم ان (ازواجِ نبی) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو، یہ بات تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے، اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا دو اور نہ یہ (جائز ہے) کہ تم اس (کی وفات) کے بعد کبھی اس کی بیویوں سے نکاح کرو، بے شک تمھارا یہ فعل اللہ کے نزدیک بہت بڑا (گناہ) ہے ﴿53﴾ اگر تم کوئی چیز ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ تو بلاشبہ اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿54﴾ عورتوں پر اپنے باپوں اور اپنے بیٹوں اور اپنے بھائیوں اور اپنے بھتیجوں اور اپنے بھانجوں اور اپنی عورتوں اور جن (لونڈیوں) کے مالک ہوئے ہیں ان کے دائیں ہاتھ (ان کے سامنے آنے میں) کوئی گناہ نہیں، اور (اے عورتو!) تم اللہ سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ﴿55﴾

کاشانۂ نبوی میں داخلے کے آداب اور احکامِ حجاب:

یہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ادب سکھائے ہیں، وہ کبھی کھانے کے لیے نبی اکرم ﷺ کے گھر میں جمع ہوتے، کھانے کے بعد باتیں کرنے لگ جاتے، نبی اکرم ﷺ کے آرام کا گھر وہی تھا۔ شرم سے نہ فرماتے کہ اُٹھ جاؤ۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس آیت میں پردے کا حکم ہوا کہ مرد نبی اکرم ﷺ کی ازواج کے سامنے نہ جائیں، سب مسلمانوں کی عورتوں پر یہ حکم واجب نہیں، اگر عورت کسی مرد کے سامنے ہو اور سب بدن کپڑوں میں ڈھکا ہوا ہو تو گناہ نہیں اور اگر وہ سامنے نہ آئیں تو بہتر ہے۔ اپنی عورتوں اور ہاتھ کی ملکیت کا ذکر سورۃ النور میں ہو چکا۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت آیتِ حجاب ہے، اس میں شرعی احکام و آداب ہیں۔ یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جن کا نزول سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ہوا ہے۔ چنانچہ صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے رب عزوجل کا تین باتوں میں موافق ہوا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر آپ مقامِ ابراہیم کو مصلیٰ ٹھہرائیں، یعنی نماز پڑھنے کی جگہ۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ [البقرۃ: ۱۲۵] ''اور (حکم دیا کہ) تم مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بناؤ۔'' نیز میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک آپ کی بیویوں پر نیک اور بد داخل ہوتے ہیں، کاش! آپ ان کا پردہ کر دیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ حجاب نازل فرمائی اور میں نے نبی اکرم ﷺ کی بیویوں سے کہا، جب کہ انھوں نے ان پر غیرت میں ایک

دوسرے کی مساعدت و معاونت کی: شاید رب اس کا اگر وہ تم کو طلاق دے دے تو بدل دے اس کو تم سے بہتر بیویاں۔اسی طرح آیت نازل ہوئی۔[1] صحیح مسلم کی ایک روایت میں بدر کے قیدیوں کا ذکر ہے،[2] یہ چوتھا قضیہ ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ پر ہر قسم کا آدمی یعنی نیک اور بد داخل ہوتا ہے، کاش! آپ اُمہات المومنین کو پردے کا حکم دیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ حجاب نازل فرمائی۔[3] جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح زینب رضی اللہ عنہا سے ہوا، اس کی صبح میں اس آیت کا نزول ہوا ہے۔ یہ زینب بنت جحش وہ ہیں جن کا نکاح کرنے کا خود اللہ تعالیٰ متولی ہوا۔ یہ نکاح بقول امام قتادہ اور واقدی رحمہما اللہ وغیرہما ماہِ ذی القعدہ سنہ ۵/ ہجری میں ہوا۔ امام ابو عبیدہ، معمر بن مثنی اور خلیفہ بن خیاط کا یہ زعم ہے کہ ۳/ ہجری میں ہوا تھا۔ فاللّٰہ تعالیٰ أعلم.

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو قوم کو بلایا، چنانچہ انھوں نے کھانا کھایا، پھر بیٹھے باتیں کرنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہونے کا تہیہ کرنے لگے تو بھی لوگ کھڑے نہ ہوئے۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُٹھنے کا تہیہ فرمایا، اس پر بھی لوگ نہ اُٹھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تو جو کوئی کھڑا ہو گیا ہو گیا اور تین آدمی بیٹھے رہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے کہ داخل ہوں تو دیکھا کہ وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، پھر وہ کھڑے ہوئے تو چل دیے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں آیا اور میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ وہ لوگ چل دیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے یہاں تک کہ داخل ہوئے۔ پھر میں چلا کہ داخل ہو جاؤں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَدۡخُلُواْ... الآية ﴾[4] (وقد رواه أيضا في موضع آخر ومسلم والنسائي من طرق عن معتمد بن سليمان به ثم رواه البخاري منفرداً به من حديث أيوب عن أبي قلابة عن أنس رضي الله عنه بنحوه)

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ بنا کیا نان اور گوشت کے ساتھ، یعنی اپنے ولیمے میں گوشت اور روٹی کھلائی۔ میں کھانے پر بلانے والا بھیجا گیا تو ایک قوم آتی جو کھاتی اور چلے جاتے تھے، پھر ایک قوم آتی اور کھاتی اور چلی جاتی، پھر میں نے یہاں تک لوگوں کو بلایا کہ مجھے کوئی اور نہیں ملا جس کو بلاؤں۔ فرمایا: اٹھاؤ اپنا کھانا اور تین رہط رہ گئے ("رهط" کا لفظ دس سے کم پر بولا جاتا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٣٥)

ہے، یا چالیس تک، یہاں مراد۔ واللہ أعلم۔ تین گروہ ہیں یا تین آدمی) جو گھر میں بات کرتے تھے تو نبی اکرم ﷺ نکلے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف چلے گئے۔ فرمایا: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ» سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: "وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" آپ نے اپنے اہل کو کیسا پایا؟ اللہ آپ کے واسطے برکت دے! پھر آپ ﷺ نے ایک کے بعد ایک اپنی ساری بیویوں کے حجروں کا استقرا کیا، یعنی دورہ کیا۔ آپ ﷺ ان سے وہی فرماتے تھے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا اور وہ بھی آپ سے وہی کہتی تھیں جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔ پھر نبی اکرم ﷺ واپس آئے، دیکھا کہ وہ تین شخص گھر میں باتیں کر رہے تھے اور آپ نہایت سخت حیا والے تھے تو آپ ﷺ نکلے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف جانے لگے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ میں نے آپ ﷺ کو خبر دی یا کسی اور نے کہ وہ لوگ جو گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے نکل گئے ہیں تو آپ ﷺ لوٹے، یہاں تک کہ جس وقت آپ ﷺ نے اپنا پاؤں دروازے کی دہلیز پر رکھا اس حال میں ایک پاؤں اندر تھا اور دوسرا پاؤں باہر تو آپ ﷺ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا دیا اور پردے کی آیت نازل کی گئی۔[1] (انفرد به البخاري من بين أصحاب الكتب الستة سوى النسائي في اليوم و الليلة من حديث عبد الوارث، ثم رواه عن إسحاق هو ابن منصور عن عبد الله بن بكر السهمي عن حميد عن أنس بنحو ذلك، و قال: "رجلان" انفرد به من هذا الوجه و قد تقدم في أفراد مسلم من حديث سليمان بن المغيرة عن ثابت عن أنس)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعض بیویوں سے شادی کی تو اُم سلیم نے حیس (ایک کھانا جو کھجور، پنیر اور گھی سے بنایا جاتا ہے) بنایا۔ پھر اس کو ایک تور میں رکھا (پیتل کا یا پتھر کا ایک برتن جس سے پانی پیتے ہیں اور کبھی وضو کرتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔[2] كذا في مجمع البحار) پھر کہا تو اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف لے جا اور میری طرف سے ان کو سلام عرض کرنا اور کہنا کہ یہ ہماری طرف سے ان کے لیے ایک تھوڑی سی شے ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس وقت لوگ تکلیف میں تھے۔ پھر میں اس کو لے کر آیا اور عرض کی یا رسول اللہ! یہ اُم سلیم رضی اللہ عنہا نے آپ کی طرف بھیجا ہے اور وہ آپ کو سلام عرض کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ ہماری طرف سے آپ کے لیے ایک قلیل شے ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی طرف نظر فرمائی۔ پھر فرمایا اس کو رکھ دے تو میں نے اس کو گھر کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ پھر فرمایا: جا تو فلاں فلاں کو میرے لیے بلا لا۔ آپ ﷺ نے بہت سے آدمیوں کا نام لیا اور فرمایا کہ مسلمانوں میں سے جس کسی کو تو ملے اس کو بلا لے۔ پھر میں ان کو بلا لایا جن کا آپ ﷺ نے فرمایا تھا اور ان لوگوں کو جو بھی مسلمانوں میں سے مجھے ملے۔ پھر میں آیا اور حالت یہ تھی کہ گھر اور صفہ اور حجرہ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ (صفہ مسجد میں ایک سایہ دار جگہ تھی جس میں فقراء صحابہ رہتے تھے)۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٧٥) [2] مجمع بحار الأنوار (١/ ٢٧٥)

جعفر راوی نے کہا کہ میں نے جعد ابو عثمان یشکری سے کہا جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اے ابوعثمان! وہ لوگ کتنے تھے؟ تو کہا کہ تین سو کے لگ بھگ تھے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: تو اس کو لے آ۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک اس پر رکھا اور دعا فرمائی اور کہا جو کچھ اللہ نے چاہا، پھر فرمایا: چاہیے کہ دس دس آدمیوں کے حلقے ہو جائیں اور چاہیے کہ بسم اللہ کہیں اور چاہیے کہ ہر آدمی اپنے آگے سے کھائے۔ پھر انھوں نے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کیا، یہاں تک کہ سب کے سب کھا چکے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ اس کو اٹھا لو۔ چنانچہ میں آیا تو میں نے تور لے لیا اور اس میں نظر کی تو میں نہیں جانتا کہ وہ جب میں نے اس کو رکھا تھا، اس وقت زیادہ تھا یا جس وقت میں نے لیا، یعنی اتنے لوگوں نے کھا لیا اور کھانا ویسے ہی رہا، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کچھ لوگ پیچھے رہ گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں باتیں کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دخول کیا تھا، وہ ان کے ساتھ تھیں، اپنا منہ دیوار کی طرف پھیرے ہوئے۔ پھر ان لوگوں نے بات کو طول دیا، یعنی دیر تک باتیں کرتے رہے تو یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ حیادار تھے اور اگر ان لوگوں کو اس کی خبر دی جاتی تو ان پر شاق ہوتا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجروں پر اور اپنی بیبیوں پر سلام کیا، پھر جب ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آ گئے تو گمان کیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر گراں ہوئی، وہ لوگ دروازے کی طرف جھپٹے اور نکل گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ لٹکا دیا اور گھر میں داخل ہو گئے اور میں حجرے میں تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں ذرا دیر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور اس آیت کو پڑھتے تھے: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ... الآية ﴾ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: "فَقَرَأَهُنَّ عَلَيَّ قَبْلَ النَّاسِ، فَأَنَا أَحْدَثُ النَّاسَ بِهِنَّ عَهْدًا"[1] "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور لوگوں سے پہلے مجھے یہ آیاتِ کریمہ پڑھ کر سنائیں، چنانچہ میں لوگوں میں سے سب سے پہلے ان آیاتِ کریمات کا سننے والا ہوں۔" (وقد رواه مسلم و الترمذي والنسائي جميعا عن قتيبة عن جعفر بن سليمان به، وقال الترمذي: حسن صحيح وعلقه البخاري في كتاب النكاح، فقال: وقال إبراهيم بن طهمان عن الجعد أبي عثمان عن أنس رضي الله عنه فذكر نحوه ورواه مسلم أيضا عن محمد بن رافع عن عبد الرزاق عن معمر عن الجعد به وقد روى هذا الحديث عبد الله بن المبارك عن شريك عن بيان بن بشر عن أنس رضي الله عنه بنحوه ورواه البخاري والترمذي من طريقين آخرين عن بيان بن بشر أبي بشر الأحمسي الكوفي عن أنس رضي الله عنه بنحوه ورواه ابن أبي حاتم أيضا من حديث أبي نضرة العبدي عن أنس بن مالك رضي الله عنه بنحو ذلك ولم يخرجوه ورواه ابن جرير من حديث عمرو بن سعيد ومن حديث الزهري عن أنس رضي الله عنه بنحو ذلك)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢١٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٨٧) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٩)

امام احمد رحمہ اللہ نے عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: جب زینب رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہو چکی تو رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تو جا اور اس کو مجھ پر ذکر کر۔ پس زید رضی اللہ عنہ چلے، یہاں تک کہ زینب رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، کہا کہ وہ اپنے آٹے کو خمیر کر رہی تھیں۔ پھر جب میں نے ان کو دیکھا تو وہ میرے سینے میں عظیم ہو گئیں اور پوری حدیث ذکر کی، جس طرح کہ قولہ: ﴿ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا ... الآية ﴾ کی تفسیر میں ہم اس کو ذکر کر آئے ہیں۔ (وزاد في آخره من بعد قوله ووعظ القوم بما وعظوا به، قال هاشم في حديث: ﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ ... الآية ﴾[1] وقد أخرجه مسلم والنسائي من حديث جعفر بن سليمان به)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن الزہری عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی بیویاں رات کو نکلا کرتی تھیں، جبکہ براز کو جاتیں مناصع کی طرف (مدینہ منورہ کے باہر ایک وسیع جگہ) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کرتے تھے کہ آپ اپنی بیویوں کو پردہ کرائیں، مگر آپ ﷺ یہ نہیں کرتے تھے۔ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی بیوی حسبِ معمول نکلیں، یہ ایک دراز قد عورت تھیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بلند آواز سے ان کو پکارا کہ اے سودہ! ہم نے تم کو پہچان لیا، اس سے ان کی غرض یہ حرص تھی کہ پردے کا حکم نازل ہو جائے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: پھر اللہ نے پردے کا حکم نازل کیا۔[2]

اس روایت میں اسی طرح واقع ہوا ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ قصہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد ہوا، جیسا کہ امام احمد، بخاری اور مسلم نے از حدیث ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے کہ سودہ رضی اللہ عنہا پردہ مقرر کیے جانے کے بعد اپنی حاجت کے لیے نکلیں اور یہ ایک جسیم عورت تھیں، جو کوئی ان کو جانتا تھا اس پر مخفی نہیں رہتی تھیں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھا تو کہا: اے سودہ! خبردار! واللہ! تو ہم پر مخفی نہیں رہتی، لہٰذا تو دیکھ کیسے نکلتی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: پھر وہ ویسے ہی واپس لوٹ آئیں اور رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تھے اور بے شک آپ البتہ شام کا کھانا کھا رہے تھے اور آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں ہڈی تھی۔ چنانچہ بی بی سودہ رضی اللہ عنہا اندر آئیں اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں اپنی کسی حاجت کے لیے نکلی اور مجھ سے عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا ایسا کہا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف وحی بھیجی، پھر وہ وحی کی حالت آپ ﷺ سے دور ہوئی اور وہ ہڈی آپ ﷺ کے دستِ مبارک ہی میں تھی، آپ ﷺ نے اس کو رکھا نہ تھا۔

پھر فرمایا: بے شک واقعی تمھارے لیے اس بات کا اذن دیا گیا کہ تم اپنی حاجت کے لیے نکلو۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔[3] اللہ تعالیٰ کا قول کہ ﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ ﴾ مومنوں کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٨) مسند أحمد (٣/ ١٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٠) تفسير الطبري (٢٠/ ٣١٤_ ٣١٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٠) مسند أحمد (٦/ ٥٦)

کے گھروں میں بغیر اذن کے داخل ہوں، جس طرح کہ اس سے قبل زمانۂ جاہلیت میں اور اسلام کے ابتدائی زمانے میں کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ پاک نے اس امت کے لیے غیرت کی تو ان کو اس کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بات اس اُمت کی عزت وتکریم کے لیے ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « إِيَّاكُمْ وَالدُّخُولَ عَلَى النِّسَاءِ » [1] (الحدیث) یعنی تم عورتوں پر داخل ہونے سے بچو۔ پھر اللہ پاک نے اس سے استثناء کیا تو یوں فرمایا: ﴿ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ﴾

امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا: "أَيْ: غَيْرَ مُتَحَيِّنِيْنَ نَضْجَهُ وَاسْتِوَاءَهُ" [2] یعنی مگر یہ کہ تم کو اذن دیا جائے اس حال میں کہ تم وقت تاکنے والے ہو اس کے پکنے اور تیار ہونے کا، یعنی کھانے کا انتظار مت کرو، جبکہ وہ پکایا جائے، یہاں تک کہ جب وہ پکنے کے قریب ہو تو تم داخل ہونے کے لیے تعرض کرو، کیوں کہ یہ بات اس قسم سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے اور اس کی مذمت فرماتا ہے۔ یہ تطفیل کی تحریم پر دلیل ہے، یہ وہ شے ہے جس کا نام عرب لوگ ضیفن رکھتے ہیں۔ (تطفیل سے طفیلی ہے۔ طفیلی وہ ہے جو اِذن والے کے ساتھ بغیر اِذن کے کھانا کھائے، مثلاً: کھانا پک رہا ہے تو اِدھر اُدھر ٹہل رہے ہیں، اس کے پکنے کا انتظار کر رہے ہیں، جب تیار ہو گیا اور لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو آپ بھی بلا تکلف آستین چڑھا کر ہاتھ دھو کر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے)۔ امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے طفیلیوں کی مذمت میں ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے، اس میں ان کے قصے اور لطیفے ذکر کیے ہیں، اس جگہ ان کے بیان کرنے میں ایک بے فائدہ طوالت ہے، ان کا محل کتبِ لطائف وظرائف ہیں۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا ﴾۔ صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو دعوت دے تو اسے چاہیے کہ وہ قبول کرے، عرس ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور۔ [3] یعنی شادی بیاہ ہو یا کسی قسم کی دعوت جو خلافِ شرع نہ ہو۔ اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے۔ نیز صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ اگر میں بلایا جاؤں ذراع کی طرف، یعنی بکری کی دستی کی طرف تو البتہ میں قبول کروں اور اگر میری طرف کراع کا ہدیہ بھیجا جائے، یعنی گائے کے پائے تو البتہ میں قبول کروں۔ [4]

غرض یہ کہ پھر جب تم فارغ ہو چکو کھانے سے جس کی طرف تم بلائے گئے ہو تو گھر والوں پر تخفیف کرو اور پھیل جاؤ، یعنی کھانا کھا کر، جہاں جس کو جانا ہے چلا جائے، یہاں تک کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ پر شاق گزری، جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ﴾۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٢) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٠٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٩) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٢٩)

تمھارا اس کے گھر میں بغیر اذن کے داخل ہونا اس پر شاق ہوتا تھا اور وہ اس سے ایذا پاتا تھا، لیکن شدتِ حیا کے مارے یہ مکروہ جانتا تھا کہ اس سے ان کو منع کرے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس بات کی ممانعت نازل کی۔

اسی لیے اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ﴾ یعنی اسی لیے تم کو اس سے منع کیا اور ڈانٹا۔

پھر اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾ یعنی جس طرح میں نے تم کو ان پر داخل ہونے سے منع کیا ہے، اسی طرح تم ان کی طرف بالکل نظر مت کرو اور اگر تم میں سے کسی کو کوئی حاجت ہو جس کو ان سے لینا چاہتا ہے تو ان کی طرف نظر نہ کرے اور نہ ان سے کوئی حاجت کی شے مانگے مگر پردے کے پیچھے سے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن مجاہد عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک قعب (لکڑی کا پیالہ) میں حیس کھا رہی تھی کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو بلا لیا، انھوں نے بھی کھایا، پھر ان کی انگلی میری انگلی کو لگ گئی تو کہا: ''حِسّ'' (یہ کلمہ اس وقت کہتے ہیں، جب کوئی ناخوش شے لگتی ہے، مثلاً اچانک انگارا ہاتھ پر گر پڑے یا کوئی چوٹ لگ جائے) یا کہا: اوہ، اگر وہ تمھارے بارے میں اطاعت کرتے تو تم کو کوئی آنکھ نہ دیکھتی (یعنی جو میں نبی اکرم ﷺ سے پردے کے بارے میں عرض کیا کرتا ہوں، اگر وہ میرا کہا مان لیں تو تم کو کوئی نہ دیکھے)۔ اس پر پردے کا حکم نازل ہوا۔[1] ﴿ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ﴾ یعنی یہ پردہ جس کا میں نے تم کو حکم دیا ہے اور اس کو مشروع ٹھہرایا ہے تمھارے لیے اطیب و اطہر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانے کی ممانعت کا بیان:

قولہ سبحانہ: ﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ... الآية ﴾ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ یہ آیت ایک شخص کے حق میں نازل ہوئی ہے، اس نے قصد کیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی بعض بیویوں سے آپ کے بعد نکاح کرے۔ ایک شخص نے سفیان سے کہا: کیا وہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں؟ کہا: مقرر اس کو ذکر کیا ہے اور اسی طرح امام مقاتل بن حیان اور عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ نے کہا ہے اور بہ سندِ خود امام سُدی رحمہ اللہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے یہ عزم کیا تھا، وہ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ ہیں، یہاں تک کہ اس کی تحریم کا حکم نازل ہوا۔[2] اور اسی لیے سب کے سب علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جن بیویوں کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ نے وفات فرمائی، آپ ﷺ کے بعد کسی اَور کو اُن سے نکاح کرنا حرام ہے، کیوں کہ وہ آپ ﷺ کی بیویاں دنیا اور آخرت میں ہیں اور مومنوں کی مائیں ہیں، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس بیوی کے بارے میں اختلاف ہے جس سے آپ ﷺ نے

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٣٥) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٤٨) امام البانی رحمہ اللہ نے ''السلسلة الصحيحة'' (رقم الحديث: ٣١٤٨) میں مفصل بحث کرتے ہوئے اس حدیث کا ذکر کیا اور اس کی سند کو 'جید' کہا ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٠)

دخول کیا، پھر اسے طلاق دے دی اپنی زندگی میں کہ آیا غیر کو اس سے نکاح کرنا حلال ہے یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں: ماخذ دونوں کا یہ ہے کہ آیا وہ عورت قولہ تعالیٰ ﴿ مِنۢ بَعۡدِهٖۤ ﴾ کے عموم میں داخل ہے یا نہیں؟ پھر وہ عورت جس سے آپ ﷺ نے نکاح کیا، پھر قبل از دخول اسے طلاق دے دی تو ہم کسی اور کے لیے اس کے حلال ہونے میں کوئی تنازعہ نہیں جانتے، حالاں کہ حالت یہ ہے۔ واللہ أعلم.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عامر شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی وفات شریف ہو گئی اور آپ ﷺ قیلہ بنت اشعث بن قیس کے مالک ہو چکے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ نے اس سے نکاح کر لیا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر یہ امر بہت شاق گزرا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے عرض کی: اے خلیفۂ رسول اللہ! وہ تو آپ ﷺ کی بیویوں سے نہیں ہیں، اس کو تو رسول اللہ ﷺ نے اختیار نہیں دیا اور نہ اس کو پردہ کرایا اور یقیناً اللہ نے اس کو آپ ﷺ سے اس وجہ سے بَری کر دیا کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ مرتد ہو گئی۔ کہا: پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ مطمئن اور ساکن ہو گئے۔[1] مقرر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس امر کو ایک گناہِ عظیم ٹھہرایا اور اس میں سختی فرمائی اور اس قول سے وعید سنائی: ﴿ اِنَّ ذٰلِكُمۡ كَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمًا ﴾۔

پھر فرمایا: ﴿ اِنۡ تُبۡدُوۡا شَيۡـــًٔا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴾ یعنی جس شے کو تمھارے ضمائر چھپاتے ہیں اور جس پر تمھارے دل منطوی ہیں، یعنی اسے چھپائے ہوئے ہیں، بے شک اللہ پاک اس کو جانتا ہے، کیوں کہ اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں، خواہ وہ کتنی ہی مخفی ہو۔ وہ تو آنکھ کی خیانت کو اور اس چیز کو جانتا ہے جسے سینے چھپاتے ہیں۔

عورت کے وہ قریبی رشتے دار جن سے پردہ نہیں ہے:

جب اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اجنبی مردوں سے پردہ کرنے کا حکم دیا تو ان رشتے داروں کا بیان فرمایا جن سے پردہ واجب نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيۡهِنَّ فِىۡۤ اٰبَآئِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآئِهِنَّ وَلَاۤ اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اِخۡوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ ﴾۔ جس طرح کہ سورۃ النور میں اس آیت میں ان کا استثناء کیا ہے: ﴿ وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اٰبَآئِهِنَّ اَوۡ اٰبَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآئِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِىۡۤ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِىۡۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوۡ نِسَآئِهِنَّ اَوۡ مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيۡنَ غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يَظۡهَرُوۡا عَلٰى عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ ﴾ [النور: ۳۱] ''اور اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ کریں، مگر اپنے خاوندوں پر، یا اپنے باپ دادا پر، یا اپنے خاوندوں کے باپ دادا پر، یا اپنے بیٹوں پر، یا اپنے شوہروں کے بیٹوں (سوتیلے بیٹوں) پر، یا اپنے بھائیوں پر، یا اپنے بھتیجوں پر، یا اپنے بھانجوں پر، یا اپنی (مسلمان) عورتوں پر، یا اپنے دائیں ہاتھ کی ملکیت (کنیزوں) پر، یا عورتوں سے

[1] تفسير الطبري (۲۰/ ۳۱٦)

رغبت نہ رکھنے والے نوکر چاکر مردوں پر، یا ان لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں (کی چیزوں) سے واقف نہ ہوں۔'' اس میں اس آیت سے اضافی بیان ہے۔ وہاں اس کی تفسیر اور گفتگو اس طرح گزر چکی ہے کہ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

بعض سلف نے سوال کیا کہ ان دونوں آیتوں میں عم اور خال کا ذکر کیوں نہ کیا؟ تو امام عکرمہ اور شعبی رحمہما اللہ نے اس کا یہ جواب دیا: اس لیے کہ یہ دونوں کبھی اپنے بیٹوں سے اس کی صفت بیان کرتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے داود سے روایت کیا ہے کہ داود نے شعبی اور عکرمہ رحمہما اللہ سے کہا: اس آیت میں چچا اور ماموں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ تو کہا: اس لیے کہ وہ دونوں اپنے بیٹوں سے اس کا بیان کرتے ہیں اور ان دونوں نے اس بات کو مکروہ کہا ہے کہ وہ اپنے ماموں اور چچا کے پاس اپنی اُوڑھنی اُتارے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ﴾ اس سے مراد مومن عورتوں سے پردہ نہ کرنا ہے۔ ﴿ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ﴾ اس سے مراد ان کے لونڈی اور غلام ہیں، مرد اور عورت، اس پر تنبیہ گزر چکی ہے اور اسی طرح وہ حدیث بھی بیان ہو چکی ہے جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہے۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے جو مراد ہیں وہ فقط لونڈیاں ہیں۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴾ یعنی تم خلوت اور علانیہ میں اللہ سے ڈرتے رہو، کیوں کہ وہ ہر شے پر شہید (حاضر) ہے، کوئی پوشیدہ شے اس پر مخفی نہیں، چنانچہ تم رقیب اور نگہبان کا مراقبہ کرو، یعنی اس کی یاد میں گم رہو، اس کا پاس اور لحاظ رکھو۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ ﴾ ہر مومن کے لیے نہی عام ہے اس بات سے کہ نبی اکرم ﷺ کے بیوت میں آپ ﷺ کے اذن کے بغیر داخل ہو۔ اس کا سببِ نزول وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پہلے بیان شدہ روایات کے علاوہ ایک روایت یہ ہے کہ ابن سعد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: "قَالَ: نَزَلَ الْحِجَابُ مُبْتَنَى رَسُوْلِ اللّٰهِ بِزَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ، وَذٰلِكَ سَنَةَ خَمْسٍ مِنَ الْهِجْرَةِ وَحَجَبَ نِسَاءَهُ مِنْ يَوْمِئِذٍ وَأَنَا ابْنُ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً"[4] یعنی پردہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کی شادی کے وقت نازل ہوا جو آپ ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا سے کی۔ یہ قصہ ۵/ ہجری میں ہوا۔ اس دن سے آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کو پردہ کرایا اور میں پندرہ برس کی عمر کا تھا۔

اسی طرح ابن سعد رحمہ اللہ نے صالح بن کیسان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ آپ کی بیویوں پر پردہ کا حکم ۵/ ہجری ماہ ذی القعدہ میں نازل ہوا۔[5] یہی قول امام قتادہ اور واقدی رحمہما اللہ کا ہے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے اور ۳/ ہجری

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٣١٨۔ ٣١٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٥٧٧)
[3] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٥٨۔ ٦٦٣) [4] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٨/ ١٧٤) [5] الطبقات الكبرىٰ (٨/ ١٧٥)

کا قول بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ ﴿ بُيُوْتَ النَّبِيِّ ﴾ میں اس بات کی دلیل ہے کہ گھر مرد کا ہوتا ہے اور اسی کے لیے اس کا حکم کیا جاتا ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے بیت کی اضافت آپ ﷺ کی طرف ملکیت کی اضافت کی ہے۔ رہی ازواج کی طرف بیوت کی اضافت جو اس آیت میں ہے: ﴿ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾ [الأحزاب: ٣٤] سو یہ اضافت محل کی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بیوت میں اذن کو نبی اکرم ﷺ کی طرف ٹھہرایا ہے اور اذن مالک ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

علماء نے نبی اکرم ﷺ کے بیوت میں اختلاف کیا ہے، جن میں آپ کی بیویوں رہتی بستی تھیں کہ آپ ﷺ کی وفات شریف کے بعد وہ بیوت بیویوں کی ملکیت ہیں یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں: ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ ان کی ملک تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بیویاں اپنی وفات تک ان میں رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے اپنی حیات شریف میں وہ گھر ان کو ہبہ فرما دیے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کا رہنا ایک طرح کا بسا دینا تھا جس طرح کہ مرد اپنی بیوی کو بساتا ہے۔ یہ ہبہ نہ تھا اور ان کی سکونت ان میں ممتد (دراز) ہوئی۔

صحیح یہی قول ہے اس کو ابو عمر بن عبد البر و ابن العربی وغیرہما نے پسند کیا ہے، اس لیے کہ ان کا گھروں میں بسانا، من جملہ اس مؤنت (معاش کی ضروری چیزیں) کے تھا جس کا رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے استثناء فرمایا تھا، جس طرح کہ ان کے نفقوں کا ان کے لیے استثناء کیا۔ جب کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے وارث دینار اور درہم کو تقسیم نہ کریں گے اور جو کچھ میں نے چھوڑا وہ میرے اہل کے نفقے اور میرے عامل کے مؤنت کے بعد صدقہ ہے۔[1] اہلِ علم نے اسی طرح کہا ہے۔ کہا: اور اس پر یہ بات دال ہے کہ بیویوں کے وارث اُن کی طرف سے ان کے گھروں کے وارث نہیں ہوئے۔ کہا: اور اُن کے وارثوں نے جو اُن کے گھروں کو چھوڑا اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان کی ملک نہ تھے، صرف ان کے لیے اپنی زندگی بھر کی سکونت تھی۔

پھر جب وہ وفات پا چکیں تو ان کے گھر مسجدِ حرام میں زیادہ کر دیے گئے جس کا فائدہ مسلمانوں کو عام ہوتا ہے (جمل میں اسی طرح ہے، لیکن مناسب مسجدِ نبوی ہے، کیوں کہ مسجد حرام تو مسجد مکہ کا نام ہے، لیکن چونکہ اس کی حرمت بھی مسجد الحرام کی طرح ہے، شاید اس لیے کہہ دیا ہو۔ واللہ أعلم) جس طرح کہ ان کے نفقات جو اُن کے لیے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کے ترکے میں کر دیے گئے، جبکہ انھوں نے وفات پائی تو وہ اصل مال میں بڑھا دیے گئے، پھر منافع مسلمین کے لیے خرچ کیے گئے، من جملہ ان چیزوں کے جن کا نفع سب کو عام ہوتا ہے۔[2] واللہ الموفق کذا قاله القرطبي علی ما نقله الجمل.

جاننا چاہیے کہ قالون نے ﴿ اَلنَّبِيّ ﴾ کو مہموز پڑھا ہے، جہاں کہیں واقع ہوا ہے، مگر اس سورت میں دو جگہ: ایک تو یہ آیت، دوسری ﴿ اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ ﴾۔ ہمزہ کو حرفِ یاء سے بدلا ہے وصل میں اور وقف میں مہموز

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٠) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٢٤۔ ٢٢٥)

پڑھا ہے، جس طرح کہ امام شاطبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے اور اس ہمزے کی تسہیل نہیں کی، جس طرح کہ اس کے غیر کی تسہیل کی ہے، اس لیے کہ اس جگہ ابدال کو قیاس پر جاری دیکھا۔ (فرجحه لموافقته لغيره ولأنه أفصح من التسهيل ولذلك أنكر على من قال يا نبئ الله بالهمز وهذا مما لا غبار عليه فللّٰه در التنزيل وما فيه من دقائق التأويل)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ ﴾ استثناء مفرغ ہے عام حالات سے، یعنی تم کسی حال میں ان گھروں میں مت داخل ہو، سوائے اس حال میں کہ تم کو اذن دیا گیا ہو۔ یہ موضعِ نصب میں ہے بنا بر حال "أَيْ: إِلَّا مَصْحُوبِينَ بِالْإِذْنِ" یا بہ نزعِ خافض "أَيْ: إِلَّا بِأَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ" یا منصوب ہے بنا بر ظرفیت "أَيْ: إِلَّا وَقْتَ أَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ"۔ قولہ: ﴿ اِلٰى طَعَامٍ ﴾ ﴿ یُؤْذَنَ ﴾ سے متعلق ہے اس بنا پر کہ ﴿ یُؤْذَنَ ﴾ میں دعوت دینا شامل کیا ہے۔ "أَيْ: إِلَّا أَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ مَدْعُوِّيْنَ إِلٰى طَعَامٍ". قولہ تعالیٰ: ﴿ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ ﴾ منصوب ہے بنا بر حال، عامل اس میں ﴿ یُؤْذَنَ ﴾ ہے، یا مقدر ہے۔ "أَيْ: اُدْخُلُوْا غَيْرَ نَاظِرِيْنَ". ﴿ نٰظِرِیْنَ ﴾ کے معنی "مُنْتَظِرِيْنَ" ہیں۔ ﴿ اِنٰىهُ ﴾ کے معنی ہیں: "نَضْجَهُ وَإِدْرَاكَهُ"۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَنَى يَأْنِيْ إِنَاءً إِذَا حَانَ وَأَدْرَكَ"۔ جمہور نے غیر کو بہ نصب پڑھا ہے اور امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے بہ جر پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ طعام کی صفت ہے۔[1] نحویوں نے اس قراءت کو ضعیف کہا ہے بہ سبب عدمِ بروزِ ضمیر کے، کیوں کہ جاری ہوتی ہے غیر من هو له پر۔ چنانچہ اس کا حق یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: "غَيْرَ نَاظِرِيْنَ إِنَاهُ أَنْتُمْ"۔

امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یا تو اس میں تقدیم و تاخیر ہے، تقدیر اس کی یہ ہے: "وَلَا تَدْخُلُوْا إِلٰى طَعَامٍ إِلَّا أَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ" یعنی کھانے کی طرف داخل مت ہو، سوائے اس کے کہ تم کو اذن دیا جائے۔ چنانچہ کھانے کے وقت کے علاوہ بغیر اذن داخل ہونے کی ممانعت نہ ہوگی۔ یا اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے تو اِذن مشروط ہوگا اس کے ساتھ کہ کھانے کی طرف ہو، پھر اگر کھانے کی طرف اِذن نہ دیا جائے گا تو دخول جائز نہ ہوگا۔ پھر اگر کسی کو دخول کی اجازت دی جائے، کسی بات کے سننے کے لیے نہ کہ کھانے کے لیے تو جائز نہ ہو۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ مراد دوسرا قول ہے، تاکہ داخل ہونے کی ممانعت عام ہو۔

رہی یہ بات کہ کھانے کے لیے سوائے اذن کے دخول جائز نہیں ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ آیت کے نزول کے سبب میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو کھانے کا وقت تاکتے رہتے اور بغیر اذن کے داخل ہوتے تھے، چنانچہ ان لوگوں کو اپنے وقت میں بغیر اِذن کے داخل ہونے سے منع کیا گیا۔[2] امام ابن عادل رحمہ اللہ نے کہا کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ یوں کہا جائے کہ مراد ثانی ہی ہے، اس لیے کہ تقدیم اور تاخیر اصل کے خلاف ہے اور قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلٰى طَعَامٍ ﴾ تخصیص بالذکر کے باب سے ہے، چنانچہ یہ اپنے ماسوا کی نفی پر دال نہیں ہے۔ خاص کر جبکہ یہ معلوم

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٢٥) [2] تفسير الرازي (٢٥/ ١٩٣)

ہے کہ غیر اس کا مثل اس کے ہے، کیوں کہ جس شخص کے گھر میں اس کے کھانے کی طرف اس کے اذن سے داخل ہونا جائز ہے تو اس کے گھر میں اس کے اذن سے کھانے کے علاوہ داخل ہونا بھی جائز ہے۔[1] انتهٰى.

امام ابن عادل رحمہ اللہ نے جس معنی کا ارادہ کیا ہے اس کے ادا کرنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ یوں کہیں کہ اس بات کی دلیلیں موجود ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے گھروں میں آپ ﷺ کے اذن سے کھانے کے علاوہ کسی کام کے لیے داخل ہونا جائز ہے۔ یہ امر معلوم ہے، اس میں کسی طرح کا شک نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے اِذن مانگتے طعام کے علاوہ تو آپ ﷺ ان کو اذن دیتے تھے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جس بارے میں آیت کا نزول ہوا ہے، اسی پر قصر کیا جائے اور سببِ نزول وہ لوگ ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے طعام کا وقت تاکتے رہتے تھے، پھر داخل ہوتے اور اس کے پکنے کا بیٹھے ہوئے انتظار کرتے رہتے تھے اور ان کے مثل اَور لوگ۔ چنانچہ یہ آیت اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ ﷺ کے گھروں میں کھانے کے علاوہ کسی اور کام کے لیے اجازت لے کر بھی داخل نہیں ہو سکتے، ورنہ یہ کسی کے لیے جائز نہ ہو کہ آپ کے گھروں میں اجازت لے کر کھانے کے سوا کسی اور کام کے لیے داخل ہو، حالاں کہ یہ لازم باطل ہے تو ملزوم بھی اسی طرح باطل ہے۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: قوم کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کے لیے ولیمے کا یا اَور کسی دعوت کا کھانا ہوتا تو جو لوگ چاہتے وہ صبح سویرے ہی دعوت کی طرف آ جاتے، کھانے کے پکنے اور تیار ہونے کا انتظار کرتے رہتے تھے اور اسی طرح جب کھانے سے فارغ ہو جاتے تو ویسے ہی بیٹھے رہتے تو نبی کریم ﷺ کے گھر میں اس طرح جمع ہونے سے اللہ پاک نے منع فرمایا اور باقی مومنین اس ممانعت میں داخل ہو گئے۔ اللہ پاک نے ان کو منع کیا ہے داخل ہونے سے مگر اذن کے ساتھ کھانے کے وقت نہ کہ کھانے سے پہلے کھانا پکنے کا انتظار کرنے کے لیے۔[2] اللہ پاک نے اس بارے میں جو لوگوں کو ادب سکھایا تو انھوں نے اس پر پوری طرح عمل کیا۔

پھر اللہ پاک نے وہ بات بیان فرمائی جو اس بارے میں خاص طور پر ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا ﴾ یعنی لیکن جس وقت تم کو بلایا جائے اور تم کو اذن دیا جائے تو داخل ہو جاؤ۔ اس میں منع کی تاکید بلیغ ہے اور اس وقت کا بیان ہے کہ جس میں دخول ہو وہ وقت ہے اذن کا۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا: تقدیرِ کلام یہ ہے: "وَلٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ وَأُذِنَ لَكُمْ فَادْخُلُوا" ورنہ صرف دعوت داخل ہونے کا اذن نہیں ہوتی۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اس میں اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اذن الی الطعام سے مراد دعوت الی الطعام ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس میں ایک لطیفہ ہے، وہ یہ ہے کہ جس شخص کو کسی گھر میں بغیر اذن داخل ہونے کی عادت ہے، اس سے جب یوں کہیں کہ تو اس میں بغیر اذن کے داخل مت ہونا تو اسے تکلیف ہوتی ہے اور وہ آنا چھوڑ دیتا ہے، اس طرح سے کہ

[1] اللباب في علوم الكتاب لابن عادل (١٥/ ٥٨٢) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٢٤) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٢٥)

اس میں کبھی داخل نہیں ہوتا، وہ بلانے سے بھی نہیں آتا۔ چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا کہ تم ایسا مت کرو، جیسے متکبر لوگ توہین محسوس کرتے ہیں، بلکہ تم تو مطیع اور فرماں بردار ہو جاؤ، جس وقت تم سے کہیں مت داخل ہو تو مت داخل ہو اور جب تم سے کہیں اندر آ جاؤ تو اندر چلے جاؤ۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ ﴾ سے جواز ظاہر ہوتا ہے اور قولہ: ﴿ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا ﴾ سے وجوب ظاہر ہوتا ہے تو یہ پہلے کی تاکید نہیں ہے، بلکہ ایک فائدۂ جدیدہ ہے۔ پھر اللہ پاک نے کھانا کھانے کے بعد منتشر ہونے کا امر فرمایا: "فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا"۔ محاورے میں بولتے ہیں: "طَعِمَ بِكَسْرِ الْعَيْنِ، يَطْعَمُ بِفَتْحِهَا، طَعْمًا كَفَهْمٍ وَطُعْمًا كَقُفْلٍ"۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا: یعنی پھر جس وقت تم کھا پی چکو تو فی الحال جہاں چاہو چلے جاؤ، کھانے پینے کے بعد مت ٹھہرو، مراد اس سے مکان سے نکلنا لازم کرنا ہے، جس میں دعوت واقع ہوئی ہے، جبکہ کھانے پینے سے جو مقصود ہے وہ پورا ہو جائے۔

﴿ وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ﴾ جب کسی کا دل کسی سے ساکن ہو، چین پکڑے نفرت نہ کرے تو اس وقت محاورۂ عرب میں یوں بولتے ہیں: "أَنِسْتُ بِهِ أُنْسًا" باب "عَلِمَ" سے اور ایک لغت میں بابِ ضرب سے اور "أنس" اسم مصدر ہے۔ "وَاسْتَأْنَسْتُ بِهِ وَتَأَنَّسْتُ بِهِ" یہ جملہ معطوف ہے غیر پر "أَيْ: لَا تَدْخُلُوْهَا غَيْرَ نَاظِرِيْنَ وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ"۔ کسی نے کہا: معطوف ہے حالِ مقدر پر "أَيْ: لَا تَدْخُلُوْهَا هَاجِمِيْنَ وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ" یا مجرور و معطوف ہے ناظرین پر "أَيْ: غَيْرَ نَاظِرِيْنَ وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ" اور حرفِ لام یا تو علت کا ہے۔ "أَيْ: مُسْتَأْنِسِيْنَ لِأَجْلِ أَنْ يُّحَدِّثَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا" یا تقویتِ عامل کے لیے ہے، اس لیے کہ اسم فاعل عمل میں فرع ہے فعل کی۔ "أَيْ: وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ حَدِيْثَ أَهْلِ الْبَيْتِ أَوْ غَيْرِهِمْ"۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کو اس سے نہی فرمائی ہے کہ کھانے کے بعد بیٹھیں اور باتوں میں جی لگائے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کیے جائیں۔

﴿ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ﴾ یعنی بے شک یہ انتظار کرنا اور ٹھہرنا اور باتوں میں جی لگانا اللہ کے علم میں نبی کو ایذا دیتا تھا، وہ تم سے شرماتا ہے، یعنی تم سے یوں کہے کہ کھڑے ہو جاؤ یا نکل جاؤ۔ وہ لوگ آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے اہل پر گھر کو تنگ کرتے تھے اور وہ باتیں کرتے جو آپ ﷺ نہیں چاہتے تھے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ان کے زیادہ دیر تک بیٹھنے کو برداشت فرماتے تو ایذا پر صبر کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے حاضرین کو ادب سکھایا تو وہ ان کے لیے اور ان کے بعد والوں کے لیے ادب ہو گیا۔[2]

﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ اسم اشارہ واحد ہے اور مشار الیہ دو، چنانچہ ان کی تاویل لفظ مذکور کے ساتھ کریں گے جس طرح کہ ﴿ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ﴾ [البقرة: ٦٨] میں ہے، یعنی "ذٰلِكَ الْمَذْكُوْرُ مِنَ الْاَمْرَيْنِ"۔ ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ

---

[1] تفسير الرازي (٢٥/ ١٩٤) [2] معاني القرآن (٤/ ٢٣٥)

﴿ الْحَقِّ ﴾ یعنی اللہ اس بات کو نہیں چھوڑتا کہ تمھارے لیے وہ شے بیان کرے جو حق ہے اور اس کے بیان اور اظہار سے باز نہیں رہتا۔ رہا یہ امر کہ اس مضمون کو جو پیرایۂ عدمِ استحیاء میں ادا فرمایا ہے تو یہ مشاکلت (مشابہت) کے لیے ہے۔ مشاکلت بلاغت کی ایک قسم ہے۔ قرآن شریف میں بہت مقامات پر اس کا استعمال کیا ہے۔ غرضیکہ یہ ایک ادب ہے، اللہ سبحانہ نے ثقلاء (پکے مسلمانوں کو) کو اس کی تعلیم فرمائی ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: کافی ہے تجھ کو ثقلاء کے حق میں یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی برداشت نہ کی[1] اور فرمایا: ﴿ فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا ﴾۔ جمہور نے ﴿ فَيَسْتَحْيٖ ﴾ کو دو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ سے ایک یاء کے ساتھ مروی ہے۔ یہ تمیم کا لغت ہے، وہ بولتے ہیں: "اِسْتَحٰى يَسْتَحِيْ" جیسے: "اِسْتَقٰى يَسْتَقِيْ"[2]

پھر اللہ سبحانہ نے ایک اور ادب ذکر کیا جو نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے متعلق ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾ متاع سے مراد وہ شے ہے جس سے نفع لیا جاتا ہے، ماعون وغیرہ، یعنی برتن، چھلنی وغیرہ، رات دن کے برتاؤ کی چیزیں۔ متاع کا اطلاق ہر اس شے پر ہوتا ہے جس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لہٰذا جس کسی نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد عاریت ہے یا فتویٰ یا مصحف تو اس کا قول بے وجہ ہے، یعنی جس وقت تم نبی اکرم ﷺ کی بیویوں سے کوئی برتنے کی چیز مانگو تو اس کو ان سے پردے کے پیچھے سے مانگو جو تمھارے اور ان کے درمیان ہو۔ چنانچہ آیتِ حجاب کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ ﷺ کی بیویوں میں سے کسی کی طرف نظر کرے، خواہ وہ نقاب ڈالے ہوئے ہوں یا نہ ہوں۔

﴿ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ﴾ مبتدا و خبر ہیں۔ ﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ کا اشارہ ہے پردے کے پیچھے سے متاع کا سوال کرنے کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اشارہ ان سب امور کی طرف ہے جو اس سے پہلے مذکور ہوئے ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ قریب وہی ہے، یعنی پردے کے پیچھے سے متاع کا سوال کرنا تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کے لیے پاک تر ہے شک اور تہمت اور برے خیالات سے جو مردوں کو عورتوں کے معاملے میں اور عورتوں کو مردوں کے معاملے میں پیش آیا کرتے ہیں اور تہمت کے لیے بہت بعید ہے اور حمایت اور بچاؤ میں قوی تر ہے۔ اس میں ہر مومن کے لیے ادب ہے اور اس بات سے اس کو ڈرانا ہے کہ وہ اس عورت کے ساتھ خلوت کرنے میں اپنے نفس پر بھروسا کرے جو اس پر حرام ہے، کیوں کہ ان سب سے کنارہ کرنا اس کے لیے بہت اچھا ہے اور اس کے نفس کو بہت محفوظ رکھنے والا ہے اور اس کی عصمت کو کامل کرنے والا ہے۔

﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﴾ یعنی تمھارے لیے یہ درست اور صحیح نہیں ہے کہ تم اللہ کے رسول ﷺ کو کسی بھی قسم کی شے سے ایذا دو۔ ان چیزوں میں ان کے گھروں میں بغیر اذن داخل ہونا ہے اور ان میں ٹھہرنا

---

[1] روح المعاني (٢٢/ ٧١) [2] فتح القدير (٤/ ٣٩٣)

ہے اس کے علاوہ جو اُن کا مقصد ہو اور اُن کی بیویوں سے بغیر پردہ کے باتیں کرنا شامل ہے۔ ﴿ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ﴾ یعنی اور نہ ہی یہ صحیح اور درست ہے تمھارے لیے کہ تم اس کی وفات کے بعد اس کی بیویوں سے نکاح کرو، یا اس کے چھوڑ دینے کے بعد کبھی بھی، کیوں کہ وہ تو مومنوں کی مائیں ہیں اور اولاد کے لیے ماؤں سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔

﴿ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴾ یعنی بے شک یہ بات یعنی اس کے بعد اس کی بیویوں سے نکاح کرنا اللہ کے نزدیک ایک بڑا گناہ ہے اور ایک بہت ہی سخت ہولناک امر ہے۔ یہ بات جو اللہ پاک نے فرمائی اس سے یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اس کے نزدیک بڑی تعظیم اور تکریم ہے اور ان کی عزت وحرمت زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی واجب ہے اور اس امر کا خود ان کو علم کر دینا اس قسم سے ہے کہ ان کے جی کو خوش اور ان کے دل کو مسرور کرے اور ان کے شکر کا استفراغ (حد درجہ کوشش کرنا) کرے، کیوں کہ لوگوں میں سے ایسا شخص ہوتا ہے، جس کو غیرت بہت زیادہ ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس بات کی تمنا کرتا ہے کہ اس کی عورت اس سے پہلے مر جائے، تاکہ وہ اس کے بعد کسی سے نکاح نہ کرے۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے:

1. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت اس شخص کے حق میں نازل ہوئی ہے جس نے ارادہ کیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی کسی بیوی سے آپ کی وفات کے بعد نکاح کرے۔ سفیان نے ذکر کیا ہے کہ بعض نساء سے مراد عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔
2. امام سدی رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا: ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ طلحہ بن عبیداللہ نے کہا کہ کیا پردہ کرائیں گے ہم کو محمد ﷺ ہمارے چچا کی بیٹیوں سے اور نکاح کریں گے بعد ہمارے ہماری عورتوں سے، اللہ کی قسم اگر حادثہ ہو ان پر کوئی حادثہ تو البتہ ہم نکاح کریں گے ان کے بعد ان کی بیویوں سے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]
3. امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ طلحہ بن عبیداللہ نے کہا: اگر نبی مکرم ﷺ مقبوض ہوں گے تو البتہ میں نکاح کروں گا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]
4. امام ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ طلحہ کے بارے میں نازل ہوئی، کیوں کہ اس نے کہا تھا کہ جس وقت نبی کریم ﷺ وفات پا جائیں گے تو میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کروں گا۔[3] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک طلحہ پر یہ قول صحیح نہیں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمارے شیخ امام ابوالعباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ قول بعض فاضل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیان کیا گیا ہے، حالاں کہ وہ ایسی بات سے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٠) [2] الدر المنثور (٦/ ٦٤٤) [3] الطبقات الكبرىٰ (٨/ ٢٠١)

پاک وصاف ہیں، جھوٹ جو ہے تو اس کے نقل کرنے میں ہے۔ ایسا قول تو صرف منافقین جہال کو لائق ہے۔[1]

5 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اصحابِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کہا تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو جائیں گے تو میں سیدہ عائشہ یا ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کروں گا۔[2]

6 ان کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک شخص بعض ازواجِ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور ان سے باتیں کیں۔ یہ شخص ان بی بی کے چچا کا بیٹا تھا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس دن کے بعد اس مقام پر ہرگز کھڑا نہ رہنا تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ تو میرے چچا کی بیٹی ہے۔ واللہ! میں نے اس سے کوئی بری بات نہیں کی اور نہ اس نے مجھ سے کہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مقرر میں نے جان لیا، بے شک اللہ تعالیٰ سے زیادہ غیرت والا کوئی نہیں ہے اور بے شک کوئی مجھ سے زیادہ غیرت والا نہیں ہے۔ چنانچہ وہ شخص چلا۔ پھر کہا: مجھے منع کرتا ہے اپنے چچا کی بیٹی سے بات کرنے سے، البتہ میں اس سے اس کے بعد نکاح کروں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو اس شخص نے ایک بردہ آزاد کیا اور دس اونٹوں پر اللہ کی راہ میں سوار کرایا اور پیادہ پاحج کیا، اس کلمے سے توبہ کرنے کے لیے۔

7 سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مجھ سے نکاح کا پیام کیا۔ پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ خبر پہنچی تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کی کہ اسماء رضی اللہ عنہا علی رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنے والی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اس کو لائق نہ تھا کہ وہ اللہ کو اور اس کے رسول کو ایذا دے۔[3] علامہ رملی ''شرح منہاج'' میں جس بات پر چلے ہیں وہ یہ ہے کہ جس عورت پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد کیا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر پر حرام ہے، خواہ اس عورت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دخول کیا ہو یا نہیں۔ رہیں آپ کی لونڈیاں تو ان میں سے جس لونڈی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دخول فرمایا تو وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر پر حرام ہے، ورنہ نہیں۔

﴿ اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴾ یعنی اگر تم ظاہر کرو کسی شے کو اپنی زبانوں پر یا اس کو اپنے سینوں میں چھپاؤ تو بے شک اللہ ہر شے کو جانتا ہے۔ اس جملے سے مراد وہ شے ہے جس کو تم ازواجِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ظاہر کرتے ہو اور وہ شے جس کو تم اپنے سینوں میں چھپاتے ہو۔ اس قول میں سخت وعید ہے، اس لیے کہ اللہ پاک کا معلومات کو احاطہ کر لینا ان کے خیر اور شر پر جزا دینا لازمی ہو جاتا ہے۔ ابو امامہ بن سہل رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر تم اپنے منہ سے یہ کہو کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں بی بی سے نکاح کریں گے، یا تم اس کو چھپاؤ اور اپنی زبان سے نکالو، اللہ تو اس کو جانتا ہے۔[4]

---

[1] تفسير القرطبي (١/ ٢٢٨) [2] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٦٩)

[3] الدر المنثور (٦/ ٦٤٤) [4] الطبقات الكبرىٰ (٨/ ٢٠١)

پھر اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کا بیان کیا جن سے پردہ لازم نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ ﴾ پس یہ وہ لوگ ہیں جن سے نہ نبی اکرم ﷺ کی بیویوں پر پردہ واجب ہے، نہ ان کے سوا اور عورتوں پر، نہ دیکھنے میں اور نہ بات کرنے میں۔ چچا اور ماموں کا ذکر نہیں فرمایا، اس لیے کہ یہ دونوں تو والدین کے قائم مقام ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عم اور خال کبھی اپنے بیٹوں سے اپنی بھتیجی اور بھانجی کا وصف بیان کرتے ہیں، اس لیے کہ عورت اپنے چچا اور ماموں کے بیٹوں کے لیے حلال ہے، اس لیے ان دونوں کے لیے دیکھنا مکروہ رکھا ہے۔[1] یہ قول نہایت ضعیف ہے، کیوں کہ جن لوگوں کو عورت کی طرف نظر کرنا جائز ہے سوائے چچا اور ماموں کے ان سے بھی اس شخص کے سامنے جس کے لیے وہ عورت حلال ہے عورت کی صفت ہو سکتی ہے، خصوصاً بھائیوں بہنوں کے بیٹے، حالاں کہ لازم باطل ہے تو ملزوم بھی اس کی مثل ہے۔

اسی طرح قولِ مذکور سے یہ بات لازم ہوتی ہے کہ اجنبی عورتوں کو اس کی طرف نظر کرنا جائز نہ ہو، کیوں کہ وہ اس کا بیان کریں گی، حالاں کہ لازم باطل ہے تو ملزوم بھی اسی کی طرح باطل ہے اور اسی طرح امام شعبی اور عکرمہ رحمہما اللہ کا یہ قول بے وجہ ہے کہ عورت کو اپنے چچا اور ماموں کے پاس اُوڑھنی اتار رکھنا مکروہ ہے۔[2] زیادہ صحیح یہ ہے کہ یوں کہیں کہ اللہ پاک نے سورۃ النور میں جن محارم کا ذکر کیا ہے، اس جگہ ان میں سے بعض پر اقتصار فرمایا ہے، ما قبل میں جو ذکر کیا ہے اس پر اکتفا کیا ہے۔ (قولہ سورۃ النور میں الخ۔ فتح البیان میں اسی طرح ہے، لیکن سورۃ النور میں عم اور خال کا ذکر نہیں ہے، چنانچہ صحیح سورۃ النور کی جگہ سورۃ النساء ہے۔ از مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا نِسَآئِهِنَّ ﴾ کی اضافت اس کی مقتضی ہے کہ نساء سے مراد مسلمان عورتیں ہوں، کیوں کہ کافر عورتیں ستر کی چیزوں پر مامون (بے ضرر) نہیں ہیں اور عورتیں کل کی کل عورت ہیں، یعنی جس طرح شرم گاہ چھپانا ضروری ہے، اسی طرح عورت ساری قابلِ ستر ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی بیویوں پر کافر عورتوں سے پردہ واجب ہے، یعنی سوائے اس شے کے جو کام کاج کے وقت کھل جاتی ہے، چنانچہ اس شے کا چھپانا مسلمان عورتوں پر واجب نہیں کہ کافر عورتوں سے اس کو چھپائیں، اسی لیے کہا ہے کہ یہ خاص ہے، یعنی کتابی عورتوں کو رسول اللہ ﷺ کی ازواج پر داخل ہونا جائز نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عام ہے مسلمات و کتابیات میں۔ ﴿ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ﴾ سے مراد غلام و لونڈیاں ہیں، یعنی ان کو جائز ہے کہ اپنی مالک بیبیوں کو دیکھیں اور ان سے بغیر پردے کے بات کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد خاص لونڈیاں ہیں اور نابالغ غلام۔ اس بارے میں اختلاف مشہور ہے۔ سورۃ النور میں گزر چکا ہے۔[3]

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم کیا جو سارے کام کا ملاک اور اصل اصول ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ﴾ اور کلام کو صیغۂ غائب سے صیغۂ خطاب کی طرف منتقل کیا، اس منتقل کرنے میں بہت سختی ہے، گویا

---

[1] معاني القرآن (٤/ ٢٣٦) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣١٨_ ٣١٩) [3] رقم الآية (٣١)

یوں کہا گیا: اور سارے کاموں میں اللہ سے ڈرو، جن میں سے پردہ کرنا ہے، جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یعنی تم اس سے ڈرتے بچتے رہو کہ سوا ان لوگوں کے تم کو کوئی دیکھے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا﴾ یعنی اس واسطے کہ بے شک اللہ اپنے بندوں کے اعمال میں سے ہر شے پر شہید ہے، یعنی حاضر ہے کوئی شے اس سے غائب نہیں ہے، وہ کوئی سی شے ہو۔ چنانچہ وہ بدلا دینے والا ہے نیک کو اس کی نیکی کا اور بد کو اس کی بدی کا۔ شہید وہ ہے جو دلوں کے خطرات (خیالات) کو جانتا ہے جس طرح کہ اعضاء کی حرکات کو جانتا ہے۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿لَا جُنَاحَ عَلَیْهِنَّ ... الْآيَة﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ یہ آیت خاص طور پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے حق میں نازل کی گئی ہے۔ وقولہ: ﴿نِسَآىِٕهِنَّ﴾ یعنی نسائے مسلمات اور ﴿مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ﴾ یعنی ممالک واماء (غلام اور لونڈیاں) ان کے لیے رخصت دی ہے اس بات کی کہ ان کو دیکھیں اس کے بعد کہ ان پر پردہ مقرر کیا گیا۔[1]

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝۵۶ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا
مُّهِیْنًا ۝۵۷ وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا
اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ۝۵۸

بلاشبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت و درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو اور خوب خوب سلام بھیجو (56) بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، اللہ نے ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار کیا ہے (57) اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا پہنچائیں جب کہ انھوں نے کوئی جرم نہ کیا ہو تو یقیناً ان لوگوں نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اُٹھایا (58)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا حکم:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا حکم نماز میں ادا ہوتا ہے۔ نماز میں "اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ أَیُّهَا النَّبِیُّ" اور "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ... الخ" سے اپنے پیغمبر پر رحمت مانگنا اور ان کے ساتھ ان کے سارے گھرانے کے

[1] الدر المنثور (٦/ ٦٤٥) فتح البیان (١١/ ١٢٥۔ ١٣٣)

لیے بھی رحمت مانگنا؛ بڑی قبولیت رکھتا ہے، ان پر ان کے لائق رحمت اترتی ہے اور مانگنے والے پر دس رحمتیں اترتی ہیں، جتنا چاہے اتنا حاصل کرے۔ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں پر تہمت لگا کر ایذا دینے والے منافقین تھے۔ پیٹھ پیچھے بدگوئی کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ پر طوفان لگایا۔ سورۃ النور میں ان کے کلام ذکر ہو چکے ہیں۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صلاۃ فرشتوں کے پاس نبی اکرم ﷺ پر اللہ سبحانہ کی ثناء ہے اور فرشتوں کی صلاۃ دعا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ يُصَلُّوْنَ ﴾ کے معنی "يُبَرِّكُونَ" ہیں۔[1] (هكذا علقه البخاري عنهما وقد رواه أبو جعفر الرازي عن الربيع بن أنس عن أبي العالية كذلك وروى مثله عن الربيع أيضاً وروى علي بن أبي طلحة عن ابن عباس رضي الله عنهما كما قاله سواء رواهما ابن أبي حاتم) امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے سفیان ثوری رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم سے روایت کیا ہے کہ رب کی صلاۃ تو رحمت ہے اور فرشتوں کی صلاۃ استغفار ہے۔[2] پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عطاء بن ابی رباح سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک و مقدس کی صلاۃ "سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ غَضَبِيْ" "میری رحمت میرے غضب پر غالب آ گئی ہے۔" ہے۔[3]

اس آیتِ کریمہ سے مقصود یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنے بندوں کو خبر دی اس قدر و منزلت اور رتبے کی جو اس کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کا ملائے اعلیٰ میں ہے کہ مقرب فرشتوں کے نزدیک ان پر ثنا کی جاتی ہے اور فرشتے ان پر درود بھیجتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے سفلی عالم والوں کو اُن پر درود و سلام بھیجنے کا حکم دیا، تاکہ علوی و سفلی دونوں عالم والوں کی طرف سے آپ پر ثنا جمع ہو جائے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ کیا تیرا رب نماز پڑھتا ہے؟ تو اُن کے رب عزوجل نے ان کو ندا کی کہ اے موسیٰ! تجھ سے انھوں نے سوال کیا ہے کیا تیرا رب نماز پڑھتا ہے؟ تو تو کہہ دے: ہاں! "أَنَا أُصَلِّيْ وَمَلَائِكَتِيْ عَلٰى أَنْبِيَائِيْ وَرُسُلِيْ" یعنی میں اور میرے فرشتے میرے نبیوں اور رسولوں پر درود بھیجتے ہیں۔

پھر اللہ عزوجل نے اپنے نبی پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾[4] نیز اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ خبر دے چکا ہے کہ وہ اپنے مومن بندوں پر درود بھیجتا ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ٤١۔ ٤٣] "مسلمانو! اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت زیادہ کرو اور صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔ وہی ہے جو تم پر اپنی رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے (تمھارے لیے دعائے رحمت کرتے

---

[1] صحيح البخاري (٤/ ١٨٠١) تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣١٥١) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٢٠) [2] سنن الترمذي (٢/ ٣٥٥)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥١) [4] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥١)

ہیں)''۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ... الآية ﴾ [البقرة: ۱۵۵۔ ۱۵۷] ''اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دیجیے جنھیں جب کبھی کوئی مصیبت آتی ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

حدیث شریف میں مروی ہے کہ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے امام کی داہنی طرف کی صفوں پر درود بھیجتے ہیں۔[1] اور دوسری حدیث شریف میں ہے: « اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ أَبِي أَوْفٰى »[2] یعنی اے اللہ! آلِ ابی اوفیٰ پر رحمت بھیج۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی بیوی کے لیے فرمایا اور اس کی بیوی نے آپ ﷺ سے یہ درخواست کی تھی کہ اس پر اور اس کے خاوند پر درود بھیجیں: « صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكِ وَعَلٰى زَوْجِكِ »[3] یعنی ان کی درخواست آپ ﷺ نے قبول کی اور فرمایا: اللہ تجھ پر اور تیرے خاوند پر درود بھیجے۔

رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے کے حکم اور درود کے مختلف الفاظ پر مشتمل احادیث:

رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں متواتر حدیثیں وارد ہوئی ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے اوپر درود بھیجنے کا حکم فرمایا ہے۔ آپ ﷺ پر کس طرح درود بھیجیں، ہم ان میں سے وہ حدیثیں بیان کریں گے جو میسر ہوئی ہیں۔ إن شاء اللہ تعالیٰ، واللہ المستعان:

1. امام بخاری رحمہ اللہ نے کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، عرض کی: یا رسول اللہ! آپ پر سلام بھیجنا تو یقیناً ہم اس کو پہچان چکے، پھر صلاۃ کیسے بھیجیں؟ فرمایا: کہو: ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ. اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ''[4]

2. امام احمد رحمہ اللہ نے ابن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے کہ مجھے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ ملے تو فرمایا کہ میں تجھے کوئی ہدیہ نہ دوں، ہم پر رسول اللہ ﷺ نکلے تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! مقرر ہم نے جان لیا یا پہچان لیا کہ آپ کا سلام کس طرح ہے، پھر صلاۃ کس طرح ہے؟ تو فرمایا: کہو: ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٠٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت پر مفصل بحث کرتے ہوئے ان الفاظ کو ضعیف کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ١/ ٢٣٢) البتہ "عَلٰى مَيَامِنِ الصُّفُوْفِ" کے الفاظ کے بجائے "عَلَى الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ الصُّفُوْفَ" کے الفاظ کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ٢٢٣٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١١٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (فضل الصلاة على النبي ﷺ: ١/ ٦٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٦)

كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ. اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ"[1] (وهذا الحديث قد أخرجه الجماعة في كتبهم من طرق متعددة عن الحكم و هو ابن عتيبة، زاد البخاري وعبدالله بن عيسىٰ كلاهما عن عبد الرحمن بن أبي ليلىٰ فذكرهم)

③ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ عن کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا کہ جب ﴿إِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ... الآية﴾ نازل ہوئی تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ پر سلام بھیجنا تو ہم نے اچھی طرح جان لیا ہے، پھر آپ پر درود بھیجنا کس طرح ہے؟ فرمایا: کہو: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ. اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ" وَكَانَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ أَبِي لَيْلٰى يَقُوْلُ: وَعَلَيْنَا مَعَهُمْ.[2] (ورواه الترمذي بهذه الزيادة و معنى قولهم: أما السلام عليك فقد عرفناه هو الذي في التشهد الذي كان يعلمهم إياه كما كان يعلمهم السورة من القرآن وفيه السلام عليك أيها النبي و رحمة الله وبركاته)

④ حدیثِ دیگر: امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! "هٰذَا السَّلَامُ عَلَيْكَ فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ؟" یعنی یہ سلام آپ پر تو یہ ہم جان چکے، پھر آپ پر درود کیسے پڑھیں؟ فرمایا: کہو: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ»[3] بخاری کی دوسری روایت عن یزید بن الہاد عن عبد اللہ بن خباب عن ابی سعید رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں: "كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ"[4] (وأخرجه النسائي و ابن ماجه من حديث ابن الهاد به)

⑤ حدیثِ دیگر: امام احمد نے ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم آپ پر درود کس طرح بھیجیں؟ فرمایا کہو: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّأَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّاتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّأَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّاتِهٖ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ»[5]
(وقد أخرجه بقية الجماعة سوى الترمذي من حديث مالك به)

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٦) مسند أحمد (٤/ ٢٤١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٨٣) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٨٩) سنن ابن ماجه (٩٠٤)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٨٣) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥١_ ٣١٥٢) ③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢٠)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٩٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٠٣)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٧) مسند أحمد (٥/ ٤٢٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٧٩) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٠٥)

6 حدیثِ دیگر: امام مسلم رحمہ اللہ نے ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہم سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں تھے تو بشر بن سعد رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کی کہ اللہ نے ہم کو حکم فرمایا ہے کہ ہم آپ پر درود بھیجیں، کیسے بھیجیں؟ کہا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، یہاں تک کہ ہم نے یہ تمنا کی کہ بشر آپ سے سوال نہ کرتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو: «اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ، وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ فِي الْعَالَمِیْنَ إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ» اور سلام ویسا ہے جو تم جان چکے ہو۔[1] (وقد رواه أبو داود والنسائي من حديث مالك به، وقال الترمذي: حسن صحيح)

7 امام احمد، ابو داود، نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ کے الفاظ اپنی مستدرک میں ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ انھوں نے، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! جہاں تک سلام کا تعلق ہے اس کو تو ہم یقیناً پہچان چکے ہیں، پھر ہم آپ پر درود کس طرح بھیجیں، جب ہم اپنی نماز میں درود بھیجیں؟ تو فرمایا کہ کہو: «اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ»[2] (وذكره ورواه الشافعي رحمه الله في مسنده عن أبي هريرة بمثله)

اسی جگہ سے امام شافعی رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ نماز پڑھنے والے پر واجب ہے کہ آخری تشہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، اگر وہ اس کو چھوڑ دے گا تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ مالکیہ وغیرہم سے بعض متاخرین نے امام شافعی کو اس بات پر برا بھلا کہنا شروع کیا کہ انھوں نے نماز میں اس کو شرط کیا ہے اور یہ زعم کیا ہے کہ اس مسئلے میں وہ اکیلے ہیں۔ امام ابو جعفر طبری، طحاوی اور خطابی رحمہم اللہ وغیرہم نے اس کے خلاف اجماع بیان کیا ہے۔ (فيما نقله القاضي عياض عنهم) حالاں کہ امام شافعی پر رد کرنے والے نے اس رد میں تعسف کیا ہے (بے راہ ہوا ہے) اور اس بارے میں جو اس نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اس میں تکلف کیا ہے، کیوں کہ ہم کو تو اس کے وجوب کی روایت کی گئی ہے اور نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا تفسیری بیان کیا گیا ہے، جس طرح کہ یہ ظاہر آیت ہے۔

یہ تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے جن میں ابن مسعود، ابو مسعود بدری، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم ہیں اور تابعین میں سے شعبی، ابو جعفر باقر اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ ہیں اور اسی طرف امام شافعی گئے ہیں۔ اس بارے میں ان سے کوئی خلاف مروی نہیں ہے اور نہ ان کے اصحاب کے درمیان کسی طرح کا اختلاف ہے اور اسی طرف امام احمد گئے ہیں۔ (فيما حكاه عنه أبو زرعة الدمشقي به)۔ اور اسی کے اسحاق بن راہویہ اور فقیہ امام محمد بن ابراہیم معروف

---

1 صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٨٥)

2 مسند أحمد (٤/ ١١٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٨١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٨٥) صحيح ابن خزيمة (٣٥١/١) صحيح ابن حبان (٢٨٩/٥) مستدرك الحاكم (٤٠١/١) مسند الشافعي (٤٢/١)

یا بن المواز مالکی رحمہ اللہ قائل ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ائمہ حنابلہ نے آپ پر درود بھیجنے میں یہ واجب کیا ہے کہ ویسا کہا جائے جیسا آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کہنا تعلیم فرمایا ہے، جبکہ انھوں نے آپ سے سوال کیا تھا اور یہاں تک کہ ہمارے بعض اصحاب نے آپ کی آل کرام پر درود بھیجنا واجب کیا۔ جن لوگوں نے اس بات کو بیان کیا ہے ان میں سے بندیجی وسلیم رازی اور سلیم کے صاحب نصر بن ابراہیم مقدسی ہیں اور امام الحرمین اور ان کے صاحب غزالی نے اس کو امام شافعی سے ایک قول نقل کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ ایک وجہ ہے۔ باوجود اس سب کے جمہور اس کے خلاف پر ہیں اور اس کے خلاف پر اجماع نقل کیا ہے، حالاں کہ اس کے وجوب کا قائل ہونا حدیث شریف کے لیے ظہور ہے۔ واللّٰہ أعلم۔ اس بیان سے غرض یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ جو نماز میں صلاۃ علی النبی ﷺ کے قائل ہیں تو ان کے قول کے واسطے اور ذرائع سلف اور خلف ہیں، جس طرح کہ گزر چکا ہے۔ وللّٰہ الحمد والمنۃ۔ چنانچہ اس مسئلے میں ان کے خلاف پر کوئی اجماع نہیں ہے نہ قدیم اور نہ جدید۔[1] واللّٰہ أعلم.

اس قول کی تائید جن باتوں سے ہوتی ہے ان میں سے ایک اَور حدیث ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ اپنی نماز میں دعا مانگتا ہے، اس نے نہ اللہ کی تمجید کی اور نہ نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے جلدی کی، پھر اس کو بلایا اور اس سے فرمایا یا کسی اور سے کہ جس وقت تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو چاہیے کہ اللہ عزوجل کی تمجید کے ساتھ شروع کرے اور اس پر ثنا کرے، پھر چاہیے کہ درود بھیجے نبی پر، پھر چاہیے کہ اس کے بعد دعا مانگے جو چاہے۔[2] (وأخرجه أبو داود و الترمذي و صححه و النسائي و ابن خزيمة و ابن حبان في صحيحيهما بأسانيدهم) اور اسی طرح وہ حدیث تائید کرتی ہے جس کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے عبد المہیمن بن عباس بن سہیل بن سعد ساعدی عن ابیہ رضی اللہ عنہ عن جدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں ہے جس کا وضو نہیں ہے اور اس شخص کا وضو نہیں ہے جس نے اس پر اللہ کا نام ذکر نہیں کیا اور اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے نبی کریم ﷺ پر درود نہ بھیجا اور اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے انصار کو دوست نہ رکھا۔ لیکن یہ عبد المہیمن متروک راوی ہے۔[3] (وقد رواه الطبراني من رواية أخيه أبي بن عباس ولكن في ذلك نظر و إنما يعرف من رواية عبد المهيمن. واللّٰه أعلم)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٦٥)

[2] مسند أحمد (٦/ ١٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٧٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٨٤) صحيح ابن خزيمة (١/ ٣٥١) صحيح ابن حبان (٥/ ٢٩٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (فضل الصلاة على النبي: ٨٦/١)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠) المعجم الكبير (٦/ ١٢١) اس کی سند میں "عبد المہیمن" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٨٠٦)

8 حدیثِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم نے اچھی طرح جان لیا ہے کہ آپ پر سلام کس طرح بھیجیں۔ پھر آپ پر درود کس طرح بھیجیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ وَبَرَكَاتِكَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا جَعَلْتَهَا عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ»[1] ابو داود اعمیٰ جو بریدہ رضی اللہ عنہ سے راوی ہے، اس کا نام نفیع بن حارث ہے، یہ شخص متروک ہے۔

9 حدیثِ دیگر: موقوف ہے کہ ہم کو اس کی روایت کی گئی ہے سعید بن منصور، یزید بن ہارون اور زید بن الحباب کے طریق سے، یہ تینوں نوح بن قیس سے روایت کرتے ہیں۔ نوح کہتے ہیں کہ ہم کو حدیث بیان کی سلامہ کندی نے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو یہ دعا تعلیم فرماتے تھے: "اَللّٰهُمَّ دَاحِيَ الْمَدْحُوَّاتِ وَبَارِئَ الْمَسْمُوْكَاتِ وَجَبَّارَ الْقُلُوْبِ عَلٰى فِطْرَتِهَا شَقِيِّهَا وَسَعِيْدِهَا، اِجْعَلْ شَرَائِفَ صَلَوَاتِكَ، وَنَوَامِيَ بَرَكَاتِكَ وَرَافَةَ تَحَنُّنِكَ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ الْفَاتِحِ لِمَا أُغْلِقَ وَالْخَاتِمِ لِمَا سَبَقَ، وَالْمُعْلِنِ الْحَقَّ بِالْحَقِّ، وَالدَّامِغِ لِجَيْشَاتِ الْأَبَاطِيْلِ كَمَا حُمِّلَ فَاضْطَلَعَ بِأَمْرِكَ لِطَاعَتِكَ مُسْتَوْفِزًا فِيْ مَرْضَاتِكَ غَيْرَ نِكْلٍ فِيْ قَدَمٍ وَلَا وَهْنٍ فِيْ عَزْمٍ وَاعِيًا لِوَحْيِكَ حَافِظًا لِعَهْدِكَ مَاضِيًا عَلٰى نَفَاذِ أَمْرِكَ حَتّٰى أَوْرٰى قَبَسًا لِقَابِسٍ آلَاءُ اللّٰهِ تَصِلُ بِأَهْلِهٖ أَسْبَابُهٗ بِهٖ هُدِيَتِ الْقُلُوْبُ بَعْدَ خَوْضَاتِ الْفِتَنِ وَالْإِثْمِ وَأَبْهَجَ مُوضِحَاتِ الْأَعْلَامِ وَنَائِرَاتِ الْأَحْكَامِ وَمُنِيْرَاتِ الْإِسْلَامِ فَهُوَ أَمِيْنُكَ الْمَامُوْنُ وَخَازِنُ عِلْمِكَ الْمَخْزُوْنِ وَشَهِيْدُكَ يَوْمَ الدِّيْنِ وَبَعِيْثُكَ نِعْمَةً وَرَسُوْلُكَ بِالْحَقِّ رَحْمَةً، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَهٗ فِيْ عَدْنِكَ وَاجْزِهٖ مُضَاعَفَاتِ الْخَيْرِ مِنْ فَضْلِكَ مُهَنَّاتٍ لَهٗ غَيْرَ مُكَدَّرَاتٍ مِنْ فَوْزِ ثَوَابِكَ الْمَحْلُوْلِ وَجَزِيْلِ عَطَاءِكَ الْمَعْلُوْلِ، اَللّٰهُمَّ أَعْلِ عَلٰى بِنَاءِ الْبَانِيْنَ بُنْيَانَهٗ وَأَكْرِمْ مَثْوَاه لَدَيْكَ وَنُزُلَهٗ وَأَتْمِمْ لَهٗ نُوْرَهٗ، وَاجْزِهٖ مِنِ ابْتِعَاثِكَ لَهٗ مَقْبُوْلَ الشَّهَادَةِ مَرْضِيَّ الْمَقَالَةِ ذَا مَنْطِقٍ عَدْلٍ وَخُطَّةٍ فَصْلٍ وَحُجَّةٍ وَّبُرْهَانٍ عَظِيْمٍ"۔

(اس دعا کے مشکل الفاظ کی تشریح: "داحي": و روی المدحیات الدحو: البسط و المدحوات الأرضون دحا یدحو ویدحی أي بسط و وسع۔ "المسموکات" السماوات السبع و السامك: العالي المرتفع و سمکه رفعه. "جبار القلوب" من جبر العظم المکسورة کأنه أقام القلوب وأثبتها علی ما فطرها علیه من معرفته والإقرار به. "غیر نکل": أي غیر جبن و إحجام في الأقدام. "أوریٰ": أي أظهر نورا من الحق لطالبه والقابس: طالب النار بعد خوضات الفتن

[1] مسند أحمد (٥/ ٣٥٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فیه أبو داود الأعمی وهو ضعیف" (مجمع الزوائد: ٢/ ٣٤٠)

والإثم أي: بعد اقتحام القلوب غمرات الفتن و وقوعها في مهاوي الآثام. "فوز:" حزب اعظم میں یوں ہے: "من وفور ثوابك المضنون و جزيل عطائك المخزون. قوله المضنون: من الضن و هو ما تحضنه وتضن به أي: نفيس تبخل به و المراد هنا لازمه وهو الاختصاص والوفور: الكثرة والمخزون: المحفوظ، وبناء الناس كذا في الدلائل و في الحزب الأعظم بدله على بناء البانين وأكرم من الأكرام والمثوى: المسكن والمنزل والمقالة: القول وكذا المنطق، والخطة بالضم والتشديد الطاء المهملة بمعنى الأمر، والقصة أو الطريق، والفصل بمعني الفاصل كذا في حواشي الحزب. "المحلول": بالحاء المهملة كذا في ابن كثير و معناه كما في مجمع البحار: الهزيل.[1] وكذا بالخاء المعجمة وهذا المعنى لا يستقيم ههنا وبقي الاحتمال الثالث وهو أن يكون بالجيم مأخوذا من الجلل وهو من الأضداد أو يكون للحقير والعظيم فلعله بمعنى العظيم ويكون معناه على هذا من ثوابك العظيم والله أعلم والفوز: بالفاء والزاء المعجمة كذا في ابن كثير و معناه رستن و پیروزی یافتن بہ نیکی. والله أعلم)۔

یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کلام سے مشہور ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے مشکل الحدیث میں اس پر کلام کیا ہے اور اسی طرح ابو الحسین احمد بن فارس لغوی نے ایک جز میں کلام کیا ہے، جس کو فضل الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع کیا ہے، مگر اس کی اسناد میں نظر ہے۔ ہمارے شیخ حافظ ابو الحجاج مزی نے فرمایا ہے کہ یہ سلامہ کندی معروف نہیں ہے اور نہ اس نے علی رضی اللہ عنہ کو پایا ہے۔ (كذا قال وقد روى الحافظ أبو القاسم الطبراني هذا الأثر عن محمد بن علي الصائغ عن سعيد ابن منصور حدثنا نوح بن قيس عن سلامة الكندي، قال: كان علي رضي الله عنه يعلمنا الصلاة على النبي صلی اللہ علیہ وسلم فيقول: اللهم داحي المدحوات وذكره موقوف)[2]

(10) حدیث دیگر: امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس وقت تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو تو اُن پر اچھی طرح درود بھیجو، کیوں کہ تم کیا جانو شاید وہ آپ پر پیش کیا جائے۔ اسود بن یزید کہتے ہیں: اس پر لوگوں نے ان سے عرض کی کہ آپ ہم کو تعلیم کریں۔ فرمایا: یوں کہو: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَرَحْمَتِكَ وَبَرَكَاتِكَ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَإِمَامِ الْمُتَّقِيْنَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ إِمَامِ الْخَيْرِ وَقَائِدِ الْخَيْرِ وَرَسُوْلِ الرَّحْمَةِ. اَللّٰهُمَّ ابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُوْدًا يَغْبِطُهُ بِهِ الْأَوَّلُوْنَ وَالْآخِرُوْنَ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ. اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا

[1] مجمع بحار الأنوار (١/ ٥٦٧)
[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٦٦)

بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ".[1] "وَهٰذَا مَوْقُوفٌ وَقَدْ رَوَى إِسْمَاعِيلُ الْقَاضِي عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَوْ عُمَرَ عَلَى الشَّكِّ مِنَ الرَّاوِي قَرِيبًا مِنْ هٰذَا"

(11) حدیثِ دیگر: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو اسرائیل سے روایت کیا ہے کہ یونس بن خباب نے فارس میں ہم کو خطبہ سنایا تو کہا: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴾ پھر کہا: مجھے اس شخص نے خبر دی جس نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو کہتے ہوئے سنا کہ یہ قول اسی طرح نازل کیا گیا تو ہم نے کہا، یا لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم نے آپ پر سلام بھیجنا جان لیا، پھر آپ پر درود بھیجنا کس طرح ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ. اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ»[2] جو شخص اس طرف گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ترحم جائز ہے، وہ اسی حدیث شریف سے استدلال کرتا ہے، جس طرح کہ یہ جمہور کا قول ہے اور اس قول کو اعرابی سے مروی حدیث تقویت دیتی ہے، جس نے یوں کہا تھا: "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي وَمُحَمَّدًا وَلَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: «لَقَدْ حَجَّرْتَ وَاسِعًا»[3] یعنی بے شک تو نے ایک فراخ شے کو تنگ کر دیا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے جمہور مالکیہ سے ترحم کی ممانعت بیان کی ہے، کہا: اور ابو محمد بن ابی زید رحمہ اللہ نے اس کو جائز کہا ہے۔

(12) حدیثِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے: جو شخص مجھ پر کوئی درود بھیجے تو فرشتے اس پر درود بھیجتے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ مجھ پر درود بھیجتا ہے، لہٰذا چاہے بندہ اس سے کم کرے یا بہت کرے۔[4] (و رواه ابن ماجه من حديث شعبة به) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی بلاغت سے کثرتِ درود کا حکم فرمایا ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ تم کثرت سے مجھ پر درود بھیجا کرو، بلکہ پہلے اس کی فضیلت بیان فرمائی کہ جب تک درود بھیجنے والے مجھ پر درود بھیجتے ہیں تو فرشتے ان پر درود بھیجتے رہتے ہیں۔ پھر درود کم پڑھنے اور زیادہ پڑھنے کو صیغۂ امر کے ساتھ اس کے اختیار میں رکھا۔ ایک طالبِ راغب اس کے بعد ہرگز کثرتِ درود شریف میں کمی نہیں کرے گا، جہاں تک ممکن ہوگا اس دولتِ پائیدار کے حاصل کرنے میں مشغول رہے گا۔ اللهم وفقنا توفيقا لا مزيد عليه، وصل وسلم وبارك عليه وآله وذريته وصحبه عدد معلوماتك إلى يوم الدين وما تلذذ المتلذذون بوصال الحور العين في الغرفات آمنين وما تقر عيون المخلصين بالنظر إلى وجه رب العلمين آمين يا أرحم الراحمين.

---

(1) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٠٦) (2) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٢١)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٤) (4) مسند أحمد (٣/ ٤٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٠٧)

(13) حدیثِ دیگر: ابوعیسیٰ ترمذی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «أَوْلَى النَّاسِ بِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُ عَلَيَّ صَلَاةً»[1] (تفرد بروايته الترمذي ثم قال: هذا حديث حسن غريب) یعنی قیامت کے دن لوگوں میں سے میرے سب سے قریب وہ شخص ہوگا جو مجھ پر کثرت سے درود بھیجنے والا ہے۔

(14) حدیثِ دیگر: امام اسماعیل قاضی رحمہ اللہ نے کہا: ہم کو حدیث کی علی بن عبداللہ نے، کہا: ہم کو حدیث کی سفیان نے یعقوب بن زید بن طلحہ سے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے پاس آیا میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا، پھر اس نے مجھ سے کہا کہ جو بندہ تجھ پر درود بھیجتا ہے، اللہ اس پر اس کے عوض دس بار درود بھیجتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص آپ ﷺ کی طرف کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! کیا میں نہ کروں اپنی آدھی دعا آپ کے لیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تو چاہے۔ عرض کی: کیا نہ کروں میں اپنی دو تہائی دعا آپ کے لیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تو چاہے۔ عرض کی: کیا نہ کروں میں اپنی ساری دعا آپ کے لیے؟ فرمایا: «إِذًا يَكْفِيكَ اللّٰهُ هَمَّ الدُّنْيَا وَهَمَّ الْآخِرَةِ»[2]۔ یعنی اب تو اللہ تیری دنیا اور آخرت کی فکر کو کفایت کر دے گا۔ غرض یہ ہے کہ جب تو نے اپنی ساری دعا درود ٹھہرا دی تو اس کی برکت سے اللہ تیرے دنیا اور آخرت کے کام بنا دے گا۔ مکہ میں ایک شیخ تھا، اس کو منیع کہتے تھے، اس نے سفیان سے کہا کہ اس حدیث کو یعقوب سے کس نے مسند کیا ہے؟ تو سفیان بولے: میں نہیں جانتا۔

(15) حدیثِ دیگر: اسماعیل قاضی نے بہ سندِ خود عن طفیل ابن ابی بن کعب عن ابیہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جوف اللیل، یعنی آدھی رات میں نکلتے تھے تو فرماتے «جَاءَتِ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيهِ» سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! بے شک میں نماز پڑھتا ہوں رات کو تو کیا اپنی تہائی صلاۃ آپ کے لیے ٹھہراؤں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شطر، یعنی آدھی۔ عرض کی: پھر کیا میں ٹھہراؤں آپ کے لیے اپنی آدھی صلاۃ؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو تہائی۔ عرض کی: پھر کیا میں آپ کے لیے اپنی کل صلاۃ ٹھہراؤں؟ فرمایا: «إِذَنْ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ ذَنْبَكَ كُلَّهُ»[3] یعنی اب تو اللہ تیرے لیے تیرے سارے گناہ بخش دے گا۔

صلاۃ سے اس جگہ دعا اور وِرد مراد ہے، یعنی رات کو میرا ایک وقت ہے کہ میں اس میں اپنے آپ کے لیے دعا کیا کرتا ہوں، چنانچہ اس وقت میں سے آپ کے لیے دعا کرنے میں کتنا وقت صَرف کروں؟ یہ جو کہا کہ میں اپنی کل صلاۃ آپ کے لیے کروں تو اس سے یہ مراد ہے کہ میں جو اپنے نفس کے لیے دعا کرتا ہوں، اس کے بدلے میں آپ پر درود بھیجوں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنے نفس کے لیے دعا کرنے سے نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجنا

---

(1) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٨٤) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٣٦)

(2) فضل الصلاة على النبي (١/ ٣٠) یہ روایت مرسل ہے۔ (3) فضل الصلاة على النبي (١/ ٢١۔ ٣٢)

افضل ہے، کیوں کہ اس میں اللہ کا ذکر ہے اور نبی اکرم ﷺ کی تعظیم ہے اور جس شخص کو اللہ کا ذکر مشغول کرے، اس کے سوال اور دعا سے تو اس کو بہتر سے بہتر ملے گا۔ اور جو شے اس کو دارین میں فکر میں ڈالتی ہے، اس کی کفایت اس میں داخل ہے۔[1] (كذا في المجمع)

ترمذی نے حدیثِ مذکور کو روایت کیا ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: جس وقت دو تہائی رات چلی جاتی تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوتے۔ پھر فرماتے: اے لوگو! یاد کرو اللہ کو، یاد کرو اللہ کو، آیا راجفہ جس کے پیچھے ہے رادفہ، آئی موت اس کے ساتھ جو اس میں ہے (اس کلمے کو دو بار فرمایا)۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک میں کثرت سے آپ پر درود بھیجتا ہوں تو کتنا ٹھہراؤں آپ کے لیے اپنی صلاۃ سے؟ فرمایا: جو تو چاہے۔ میں نے عرض کی کہ چوتھائی؟ فرمایا: جو تو چاہے، پھر اگر تو زیادہ کرے گا تو وہ تیرے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کی: تو نصف؟ فرمایا: جو تو چاہے، پھر اگر تو زیادہ کرے گا تو وہ تیرے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کی: تو دو تہائی؟ فرمایا: جو تو چاہے، پھر اگر تو زیادہ کرے گا تو وہ تیرے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کی: میں آپ کے لیے اپنی کل صلاۃ ٹھہراؤں گا۔ فرمایا: اب تو کفایت کیا جائے گا تو اپنے ھم (غم) کی اور بخشا جائے گا تیرے لیے تیرا گناہ۔[2]

پھر امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے خبر دیں اگر میں ٹھہراؤں اپنی کل صلاۃ آپ پر؟ فرمایا: « إِذَنْ يَكْفِيكَ اللّٰهُ مَا أَهَمَّكَ مِنْ دُنْيَاكَ وَآخِرَتِكَ ».[3] یعنی اب کفایت کرے گا تجھ کو اللہ اس شے سے جو تجھے غم اور فکر میں ڈالتی ہے تیری دنیا اور آخرت سے۔

(16) حدیثِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نکلے تو میں آپ ﷺ کے پیچھے ہو لیا، یہاں تک کہ آپ کھجوروں میں داخل ہوئے، چنانچہ آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو دراز سجدہ کیا۔ یہاں تک کہ میں اس سے ڈرا کہ اللہ نے آپ ﷺ کو وفات دی ہو۔ کہا: پھر میں آیا کہ دیکھوں تو آپ ﷺ نے اپنا سر اٹھا لیا۔ پھر فرمایا: کیا ہے تجھے اے عبدالرحمن؟! کہا: پھر میں نے آپ ﷺ سے وہ بات ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جبرائیل علیہ السلام نے مجھ سے کہا: کیا میں تجھے خوش خبری نہ دوں، بے شک اللہ عزوجل کہتا ہے کہ جو شخص درود بھیجے تجھ پر تو میں درود بھیجوں اس پر اور جو کوئی سلام بھیجے تجھ پر تو میں سلام بھیجوں اس پر۔[4]

طریقِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے

(1) مجمع بحار الأنوار (٣/ ٣٤٥) (2) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٥٧) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٣٧)
(3) مسند أحمد (٥/ ١٣٦) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٣٧)
(4) مسند أحمد (١/ ١٩١) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٣٤)

تو متوجہ ہوئے اپنے صدقہ کی طرف، پھر داخل ہوئے اور منہ قبلے کی طرف کیا اور سجدے میں گر پڑے اور سجدہ بہت لمبا کیا، یہاں تک کہ میں نے یہ گمان کیا کہ تحقیق اللہ نے آپ ﷺ کی جان قبض کر لی، پھر میں آپ ﷺ کے قریب ہوا، پھر میں بیٹھا تو آپ ﷺ نے اپنا سر اٹھایا۔ پھر فرمایا: یہ کون ہے؟ میں نے عرض کی: عبدالرحمٰن، فرمایا: تیرا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ نے ایسا سجدہ کیا کہ میں اس سے ڈرا کہ اللہ نے اس میں آپ کی روح قبض کر لی۔ فرمایا کہ بے شک جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور مجھے یہ خوش خبری دی کہ اللہ عزوجل آپ سے فرماتا ہے کہ جو کوئی درود بھیجے آپ پر تو میں درود بھیجوں اس پر اور جو کوئی سلام بھیجے تجھ پر تو میں سلام بھیجوں اس پر، پھر میں نے سجدہ کیا اللہ عزوجل کے شکر کے لیے۔[1] (ورواه إسماعيل بن إسحاق القاضي في كتابه عن يحيىٰ بن عبد الحميد عن الدراوردي عن عمرو بن عبد الواحد عن أبيه عن عبد الرحمن بن عوف به و رواه من وجه آخر عن عبد الرحمن)

(17) حدیث دیگر: امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کسی حاجت کے لیے نکلے تو آپ ﷺ نے کسی کو نہ پایا کہ آپ ﷺ کے پیچھے جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ گھبرائے اور آپ ﷺ کے پاس مِطہرہ لے کر آپ ﷺ کے پیچھے سے آئے (مِطہرہ ایک برتن ہے طہارت کرنے کا اور میم کا فتح اجود ہے، یعنی عمدہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر وہ برتن جس سے طہارت کی جاتی ہے۔ کسرہ میم کا زیادہ مشہور ہے)۔ تو نبی کریم ﷺ کو مشربہ میں سجدہ کرتے ہوئے پایا (مشربہ: تفسیر ابن کثیر میں میم کے ساتھ ہے۔ مشربہ بہ فتح راء وہ جگہ ہے جس سے پانی پیا جاتا ہے اور شربہ بہ فتح راء ایک حوض ہوتا ہے کھجور کی جڑ میں، اس کے گرد پانی بھرا جاتا ہے، تاکہ کھجور پیے۔ مجمع البحار میں اسی طرح ہے۔ مناسب مقام یہی معلوم ہوتا ہے۔ واللّٰه أعلم) تو وہ آپ ﷺ کے پیچھے سے علاحدہ ہو گئے، یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا تو فرمایا: تو نے اچھا کیا اے عمر! جب تو نے مجھے سجدہ کرتے ہوئے پایا تو مجھ سے علاحدہ ہو گیا۔ بے شک جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہا ہے کہ جو کوئی تیری اُمت میں سے تجھ پر ایک بار درود بھیجے اللہ اس پر دس بار درود بھیجے اور اس کے دس درجے بلند کرے۔[2] (وقد اختار هذا الحديث الحافظ الضياء المقدسي في كتابه المستخرج على الصحيحين وقد رواه إسماعيل القاضي عن القعنبي عن سلمة بن وردان عن أنس عن عمر بنحوه ورواه أيضا عن يعقوب بن حميد عن أنس بن عياض عن سلمة بن وردان عن مالك بن أوس بن الحدثان عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بنحوه)

(18) حدیث دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عن عبد اللہ بن ابی طلحہ عن ابیہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ایک دن میں اور حالت یہ تھی کہ آپ کے چہرۂ مبارک سے سرور دکھائی دیتا تھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک ہم البتہ دیکھتے ہیں آپ کے چہرے میں سرور تو فرمایا: بے شک میرے پاس ایک فرشتہ آیا اور کہا:

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٩١) [2] المعجم الصغير (٢/ ١٩٤) الأحاديث المختارة (٩٣) فضل الصلاة على النبي ﷺ (١/ ٢٦)

اے محمد! کیا تجھے یہ بات راضی نہیں کرتی کہ تیرا رب فرماتا ہے کہ بے شک تیری امت میں سے جو کوئی تجھ پر درود بھیجے تو میں اس پر دس دفعہ درود بھیجوں اور تیری امت میں سے جو بھی تجھ پر سلام بھیجے تو میں اس پر دس بار سلام بھیجوں؟ فرمایا: ہاں، یعنی میں راضی ہوں۔ ① (ورواه النسائي من حديث حماد بن سلمة به وقد رواه إسماعيل القاضي عن إسماعيل بن أبي أويس عن أخيه عن سليمان بن بلال عن عبيد الله بن عمر عن ثابت عن أنس عن أبي طلحة بنحوه)

طریقِ دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن صبح کو اٹھے اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل خوش تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک میں خوشی دکھائی دیتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! آج آپ نے اس حال میں صبح کی کہ آپ کا جی خوش ہے اور خوشی آپ کے چہرۂ مبارک میں دکھائی دیتی ہے؟ فرمایا: ہاں! میرے پاس رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا تو اس نے کہا کہ تیری امت میں سے جو کوئی تجھ پر ایک درود بھیجے تو اللہ اس کے لیے اس کے عوض دس نیکیاں لکھے اور اس سے دس بدیاں مٹا دے اور اس کے دس درجے بلند کرے اور رد کرے اس پر اس کے مثل، یعنی اللہ پاک اس پر ویسا ہی درود بھیجے۔ ② (وهذا أيضا إسناد جيد ولم يخرجوه)

⑲ حدیث دیگر: امام مسلم، ابو داود، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی مجھ پر ایک بار درود بھیجے؛ اللہ اس کے عوض اس پر دس بار درود بھیجے۔ ③ (قال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح وفي الباب عن عبد الرحمن بن عوف و عامر بن ربيعة وعمار و أبي طلحة وأنس وأبي بن كعب رضي الله عنهم)

امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھ پر درود بھیجو، بے شک وہ زکات ہے، یعنی پاک کنندہ ہے تمھارے لیے، اور اللہ سے میرے لیے وسیلہ طلب کرو، بے شک وہ جنت میں ایک اعلیٰ درجہ ہے جس کو صرف ایک ہی مرد حاصل کرے گا اور میں امید کرتا ہوں کہ میں ہی وہ شخص ہوں۔ ④ (تفرد به أحمد)

امام بزار رحمہ اللہ نے بطریقِ مجاہد بخوہ اس کو یوں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مجھ پر درود بھیجو، پس بے شک وہ تمھارے لیے زکات ہے اور میرے لیے اللہ سے وسیلہ کا سوال کرو جو جنت کا ایک درجہ ہے۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی تو فرمایا کہ وہ جنت میں ایک اعلیٰ درجہ ہے اور وہ صرف ایک شخص کے لیے ہے اور میں اُمید رکھتا ہوں اس کی کہ میں ہی وہ مرد ہوں۔ ⑤ (في إسناده بعض من تكلم فيه)

---

① مسند أحمد (٤/ ٣٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٨٣) فضل الصلاة على النبي (١/ ٢٤) السلسلة الصحيحة (٨٢٩)

② مسند أحمد (٤/ ٢٩) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٣٥)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٩٦)

④ مسند أحمد (٢/ ٣٦٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٦٨) ⑤ مسند البزار (١٦/ ٢١٨)

لغت میں زکات کے معنی طہارت و نماء و برکت و مدح کے ہیں۔ اصل میں وسیلہ وہ شے ہے جس سے کسی شے کی طرف وسیلہ و تقرب کیا جاتا ہے۔ یہاں وسیلہ سے مراد اللہ تعالیٰ سے قرب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد قیامت کے دن شفاعت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جنت کی منازل میں سے ایک منزل ہے، کیوں کہ اس کی طرف پہنچنے والا اللہ تعالیٰ سے قریب ہوگا۔ آپ ﷺ نے جو اپنی امت سے اپنے لیے دعا طلب فرمائی، وہ یا تو اس لیے ہے کہ کسرِ نفسی کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف اپنا افتقار (فقر) ظاہر کیا، یا اس لیے کہ اس دعا سے اُمت فائدہ حاصل کرے اور اس پر امت کو ثواب ملے اور «أَرْجُو» کا لفظ جو فرمایا تو یہ فرمانا اس سے قبل تھا کہ آپ ﷺ کو اس بات کا علم ہو کہ صاحبِ مقامِ محمود آپ ہی ہیں اور باوجود اس کے اللہ پاک امت کی دعا کے سبب سے آپ ﷺ کو زیادہ رفعت دے گا جس طرح آپ ﷺ پر درود بھیجنے کی وجہ سے اُمت کو زیادہ رفعت فرمائے گا۔[1] (كذا في المجمع)

(20) حدیث دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جو کوئی رسول اللہ ﷺ پر ایک درود بھیجے تو اس کے عوض اللہ اور اس کے فرشتے اس پر ستر درود بھیجے، پھر چاہے بندہ اس سے کم کرے یا زیادہ کرے۔ ابو قیس مولیٰ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اور میں نے سنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو، وہ کہتے تھے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہم پر ایسے نکلے جیسے کوئی رخصت کرنے والا ہو اور فرمایا: ''میں محمد النبی الامی ہوں''، اس کلمے کو تین بار کہا۔ پھر فرمایا: نہیں ہے کوئی نبی میرے بعد، میں دیا گیا فواتحِ کلام اور اس کے خواتم اور جوامع اور میں نے جانا کہ دوزخ کے خزانچی کتنے ہیں اور عرش کو اٹھانے والے کتنے ہیں۔ "وَتُجُوِّزَ بِي، وَعُوفِيتُ، وَعُوفِيَتْ أُمَّتِي"، ''مجھ سے درگزر کیا گیا، مجھے عافیت دی گئی اور میری امت کو عافیت بخشی گئی۔'' پس تم سنو اور اطاعت کرو جب تک کہ میں تم میں ہوں، پھر جب مجھے لے جائیں تو لازم پکڑو تم اللہ کی کتاب کو، حلال جانو اس کے حلال کو اور حرام جانو اس کے حرام کو۔[2] (لفظ "تجوز" اصل میں مشکوک ہے۔ مسند امام احمد میں دیکھا جائے)۔

(21) حدیث دیگر: امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس میرا ذکر کیا جائے، یعنی نام لیا جائے تو چاہیے کہ مجھ پر درود بھیجے اور جو کوئی مجھ پر ایک بار درود بھیجے: اللہ اس پر دس بار درود بھیجے۔[3] (ورواه النسائي في اليوم والليلة من حديث أبو داود الطيالسي عن أبي سلمة وهو المغيرة بن سلمة الخراساني عن أبي إسحاق عمرو بن عبيد الله السبيعي عن أنس به)

(22) حدیث دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھ

---

(1) مجمع بحار الأنوار (٥/ ٥٣)

(2) مسند أحمد (٢/ ١٧٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه ابن لهيعة وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١/ ٤١١)

(3) عمل اليوم والليلة (١/ ١٦٥) مسند الطيالسي (١/ ٢٨٣) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٣٤)

پر ایک درود بھیجے تو اللہ اس پر دس درود بھیجے، اس سے دس خطائیں معاف کر دے۔[1]

23 حدیث دیگر: امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن علی بن الحسین رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، عبداللہ اپنے والدِ ماجد امام زین العابدین رحمہ اللہ سے راوی ہیں، وہ اپنے پدر عالی گوہر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « اَلْبَخِيْلُ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ ثُمَّ لَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ » وَقَالَ أَبُوْ سَعِيْدٍ: فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ. (امام احمد رحمہ اللہ کے اس حدیث میں دو استاد ہیں ایک تو عبد الملک بن عمرو دوسرے ابو سعید)۔ یعنی بڑا بخیل وہ شخص ہے کہ جس کے پاس میرا نام ذکر کیا گیا، پھر اس نے مجھ پر درود نہ بھیجا۔[2] (ورواه الترمذي من حديث سليمان ابن بلال ثم قال: هذا حديث حسن غريب صحيح، ومن الرواة من جعله من مسند الحسين بن علي رضي الله عنه ومنهم من جعله من مسند علي نفسه)

24 حدیث دیگر: اسماعیل قاضی نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک لوگوں میں سے سب سے بڑا بخیل وہ شخص ہے جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود نہ بھیجا۔[3]

25 حدیث دیگر مرسل: اسماعیل نے جریر بن حازم سے روایت کیا ہے کہ میں نے حسن رحمہ اللہ کو سنا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الْبُخْلِ أَنْ أُذْكَرَ عِنْدَهُ فَلَا يُصَلِّيْ عَلَيَّ »[4] یعنی آدمی کے بخل کے لیے یہ کافی ہے کہ میں اس کے نزدیک ذکر کیا جاؤں اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

26 حدیث دیگر: امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس شخص کی ناک خاک آلودہ ہو، جس کے نزدیک میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود نہ بھیجا اور خاک آلودہ ہو ناک اس شخص کا کہ جس پر رمضان کا مہینا داخل ہوا، پھر نکل گیا اس سے پہلے کہ اس کے لیے بخشش کی جائے۔ اور خاک آلودہ ہو ناک اس کا جس کے ماں باپ نے بڑھاپے کو پایا پس انھوں نے اس کو جنت میں داخل نہ کیا۔ پھر ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (وقد رواه البخاري فی الأدب عن محمد بن عبيد الله حدثنا ابن أبي حازم عن كثير بن زيد عن الوليد بن رباح عن أبي هريرة رضي الله عنه مرفوعاً بنحوه ورويناه من حديث محمد بن عمرو عن أبي سلمة عن أبي هريرة رضي الله عنه به قال الترمذي وفي الباب عن جابر وأنس قلت: وابن عباس و كعب بن عجرة قد ذكرت طرقه في أول كتاب الصيام عند قوله: ﴿ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣])
(یہ عبارت محلِ تامل ہے، کتاب الصیام سے اس آیت کو کیا تعلق!)

---

[1] مسند أحمد (٣/ ١٠٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٣٤)

[2] مسند أحمد (١/ ٢٠١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٤٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٧٨)

[3] فضل الصلاة على النبي (١/ ٤٥)

[4] فضل الصلاة على النبي صلی اللہ علیہ وسلم (١/ ٤٥)

درود کے احکام و مسائل:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:[1] یہ حدیث اور اس سے پہلے والی حدیث دونوں اس بات کی دلیل ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا واجب ہے، ہر بار جب آپ ﷺ کا ذکر ہو اور یہ علماء کے ایک گروہ کا مذہب ہے؛ ان میں سے طحاوی اور حلیمی ہیں۔ یہ قول ایک اور حدیث سے بھی قوت حاصل کرتا ہے جس کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھ پر درود بھیجنا بھول گیا تو وہ جنت کی راہ سے چوک گیا۔[2] جبارہ شیخ ابن ماجہ ضعیف ہیں، لیکن اسماعیل قاضی نے من غیر وجہ ابوجعفر محمد بن علی الباقر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھ پر درود بھیجنا بھول گیا تو وہ جنت کی راہ کو چوک گیا۔[3] یہ حدیث مرسل ہے پہلی حدیث سے قوت پذیر ہوتی ہے۔ واللہ أعلم.

دوسرے لوگ اس طرف گئے ہیں کہ مجلس میں ایک بار آپ پر درود بھیجنا واجب ہے، پھر بقیہ مجلس میں واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔ ترمذی نے بعض سے اس کو نقل کیا ہے۔ یہ قول اس حدیث سے تائید پذیر ہوتا ہے جس کو ترمذی نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ نہیں بیٹھی کوئی قوم کسی مجلس میں جس میں نہ اللہ کا ذکر کیا اور نہ اپنے نبی مکرم ﷺ پر درود بھیجا، مگر وہ مجلس ان پر قیامت کے دن ترہ ہوگی، پھر اگر چاہے ان کو عذاب کرے اور اگر چاہے تو ان کے لیے بخشش کرے۔[4] ("إلا کان علیهم ترة" یعنی نقصاً یا تبعتاً، حرفِ ہاء واؤ کے عوض ہے، جیسے: عدۃ۔ اس کا رفع ونصب دونوں جائز ہیں، اس بنا پر کہ "کان" کی خبر ہے اور اس کا اسم۔ "تِرَةً" سے مراد نقصان ہے یا تبعتاً، یعنی مواخذہ۔ یا بہ معنی حسرت ہے۔ "کان" کا کلمہ دونوں جگہ بتانیث و تذکیر مروی ہے، پس اس بنا پر کہ "کانت" ہو اور "ترة" مرفوع ہو تو ضمیر مجلس کی طرف راجع ہوگی اور "ترة" مبتدا اور خبر اس کی "علیه" اور جملہ محل کو خبر "کان" کی ہو اور اگر "ترة" منصوب ہو تو ضمیر "کان" کی مجلس کی طرف راجع ہوگی اور "ترة" اس کی خبر اور "علیه" متعلق ہوگا "ترة" سے۔ کذا في المجمع)۔ (تفرد به الترمذي من هذا الوجه ورواه الإمام أحمد عن حجاج ويزيد بن هارون الترمذي هذا حديث حسن وقد روي عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ من غير وجه وقد رواه إسمعيل القاضي من حديث شعبة عن سليمان عن ذكوان عن أبي سعيد)۔ کہا: نہیں ہے کوئی قوم کہ بیٹھے پھر کھڑے ہوں اور درود نہ بھیجیں نبی کریم ﷺ پر، مگر ہوگا وہ بیٹھنا ان پر قیامت کے دن حسرت، گو وہ جنت میں داخل ہو جائیں، اس ثواب کے سبب سے جس کو وہ دیکھیں گے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٤٥) الأدب المفرد (١/ ٢٢٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٥١٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٧٠)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٠٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٣٧)

[3] فضل الصلاة على النبي (١/ ٤٧)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٨٠) مسند أحمد (٢/ ...) فضل الصلاة على النبي (١/ ٥٤) السلسلة الصحيحة (٧٤)

بعض سے یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ آیتِ کریمہ کے حکم کی بجا آوری کے لیے نبی مکرم ﷺ پر عمر بھر میں ایک دفعہ درود بھیجنا واجب ہے۔ پھر درود شریف ہر حال میں مستحب ہے۔ یہ وہی قول ہے جس کی قاضی عیاض نے نصرت کی ہے اس کے بعد کہ وجوبِ صلاۃ علی النبی ﷺ پر اجماع کی حکایت کی ہے۔ فی الجملہ کہا: اور طبری نے حکایت کیا ہے کہ آیت کو ندب پر محمول کیا گیا ہے اور اس میں اجماع کا دعویٰ کیا ہے، کہا: اور شاید یہ اس میں ہے جو ایک بار سے زیادہ ہو اور واجب اس میں ایک بار ہے، جس طرح کہ آپ ﷺ کے لیے نبوت کی گواہی دینا ہے اور جو اس سے زیادہ ہے تو وہ مندوب ہے اور اس پر ترغیب دلائی گئی ہے، من جملہ شعائرِ اہلِ اسلام اور سننِ اسلام ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول غریب ہے، کیوں کہ آپ پر درود بھیجنے کا حکم تو اوقاتِ کثیرہ میں وارد ہوا ہے، پھر بعض اس میں سے واجب ہے اور بعض مستحب، چنانچہ ہم اس کا بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اس میں سے نماز کی اذان کے بعد ہے، اس حدیث کے سبب سے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ فرماتے تھے: جس وقت تم موذن کو سنو تو تم بھی اس کے مثل کہو جو وہ کہتا ہے، پھر مجھ پر درود بھیجو، بے شک جو کوئی مجھ پر درود بھیجے تو اس کے عوض اللہ اس پر دس بار درود بھیجے، پھر تم میرے لیے وسیلے کا سوال کرو، بے شک وہ جنت میں ایک مقام ہے، جو صرف ایک بندے کے لائق ہے اللہ کے بندوں میں سے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہوں۔ لہٰذا جو کوئی میرے لیے وسیلے کا سوال کرے گا۔ « حَلَّتْ عَلَيْهِ الشَّفَاعَةُ » ("حلت له" قيل: "هي بمعنى غشيته و نزلت به"[1] كذا في مجمع البحار)۔ یعنی اس پر شفاعت نازل ہوگی۔[2] (وأخرجه مسلم وأبو داود والترمذي و النسائي من حديث كعب بن علقمة)

طریقِ دیگر: اسماعیل قاضی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ حَقَّتْ عَلَيْهِ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ »[3] یعنی جو کوئی اللہ سے میرے لیے وسیلے کا سوال کرے گا تو قیامت کے دن اس پر میری شفاعت واجب و لازم ہوگی۔

حدیثِ دیگر: اسماعیل قاضی نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر درود بھیجو، بے شک تمھارا مجھ پر درود بھیجنا تمھارے واسطے زکات ہے اور اللہ سے میرے لیے وسیلہ کا سوال کرو، پھر یا آپ ﷺ نے ہم کو حدیث بیان کی یا ہم نے آپ ﷺ سے سوال کیا تو فرمایا کہ وسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ درجہ ہے، اس درجے تک صرف ایک شخص پہنچے گا اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ وہ شخص مَیں ہوں۔[4] (ثم رواه عن محمد بن أبي بكر عن معتمر عن ليث و هو ابن أبي سليم به)

---

[1] مجمع بحار الأنوار (١/ ٥٦٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤) مسند أحمد (٢/ ١٦٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦١٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٧٨)

[3] فضل الصلاة على النبي (١/ ٥١) [4] فضل الصلاة على النبي (١/ ٤٨۔ ٤٩)

اسی طرح ایک اور حدیث ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے رویفع بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور کہے: «اَللّٰهُمَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو۔[1] (وهذا إسناد لا بأس به ولم يخرجوه)۔ ایک اور اثر حسن ہے جس کو اسماعیل قاضی نے طاؤس سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سنا کہ فرماتے تھے: «اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ شِفَاعَةَ مُحَمَّدِنِ الْكُبْرٰى وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ الْعُلْيَا وَأَعْطِهِ سُؤْلَهُ فِي الْآخِرَةِ وَالْأُولٰى كَمَا آتَيْتَ إِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى»[2] (إسناد جيد قوي) ''اے اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شفاعتِ کبریٰ قبول فرما، ان کے درجۂ علیا کو بلند فرما، دنیا و آخرت میں انھیں ان کی مطلوب چیز عطا کر جس طرح تو نے ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کو عطا کی۔''

درود پڑھنے کے متعدد مواقع:

اس میں سے درود بھیجنا ہے مسجد میں داخل ہونے کے وقت اور اس سے نکلنے کے وقت اس حدیث کے سبب سے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، عبداللہ رحمہ اللہ راوی ہیں اپنی والدہ ماجدہ فاطمہ بنت الحسین سے، وہ راوی ہیں اپنی دادی فاطمہ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مسجد میں داخل ہوتے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور سلام بھیجتے۔ پھر فرماتے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ» اور جس وقت مسجد سے نکلتے تو درود و سلام بھیجتے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور پھر فرماتے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ»[3] اسماعیل قاضی نے علی بن حسین رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس وقت تم مسجدوں پر گزرو تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو۔[4]

رہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں درود پڑھنا تو وہ آخری تشہد میں ہے اور ہم اس پر کلام کر آئے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ساتھ علماء میں سے جو لوگ اس طرف گئے ہیں، ان کا ذکر بھی پہلے کر چکے ہیں اور ایک قول ہے کہ پہلے تشہد میں پڑھنا واجب نہیں ہے۔ پھر کیا مستحب ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے میں امام شافعی کے دو قول ہیں۔ اور اس میں سے نمازِ جنازہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا ہے، کیوں کہ سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں فاتحۃ الکتاب پڑھے اور دوسری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور تیسری میں میت کے لیے دعا کرے اور چوتھی میں یہ کہے: «اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُ» یعنی الٰہی! محروم نہ کر ہم کو اس کے اجر سے اور فتنے میں مت ڈال ہم کو اس کے بعد۔

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٠٨) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف اور ''وفاء حضرمی'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥١٤٢)

[2] فضل الصلاة على النبي (١/ ٥٢)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٧١) مسند أحمد (٦/ ٢٨٢) صحيح الجامع (٤٧١٤)

[4] فضل الصلاة على النبي (١/ ٧٢)

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم کو حدیث بیان کی مطرف بن مازن نے معمر سے، معمر راوی ہیں زہری سے، زہری نے کہا کہ ہم کو خبر دی ابو امامہ بن سہل بن حنیف نے، ابو امامہ کو خبر دی اصحابِ نبی ﷺ میں سے ایک شخص نے اس بات کی کہ جنازے کی نماز میں سنت یہ ہے کہ امام تکبیر کہے، پھر پہلی تکبیر کے بعد سراً اپنے دل میں فاتحۃ الکتاب پڑھے، پھر نبی مکرم ﷺ پر درود بھیجے اور میت کے لیے اخلاص سے دعا کرے، تکبیروں میں ان میں سے کسی میں قراءت نہ کرے، پھر سراً اپنے جی میں سلام پھیرے (اصل کے الفاظ یہ ہیں: "ویخلص الدعاء للجنازة وفي التکبیرات لا یقرأ في شيء منها")[1] (ورواه النسائي عن أبي أمامة نفسه أنه قال: من السنة، فذكره وهذا من الصحابي (لیکن یہ ابو امامہ صحابی نہیں ہیں علی الصحیح، مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس طرزِ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ابو امامہ صحابی ہیں۔ واللہ أعلم) في حكم المرفوع على الصحيح و رواه إسماعيل القاضي عن محمد بن المثنى عن عبد الأعلى عن معمر عن الزهري عن أبي أمامة بن سهل عن سعيد بن المسيب أنه قال: من السنة في الصلاة على الجنازة فذكره و هكذا روى عن أبي هريرة و ابن عمر و الشعبي)

اور ان میں سے عید کی نماز میں درود بھیجنا ہے۔ اسماعیل قاضی نے علقمہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود، ابوموسیٰ، حذیفہ رضی اللہ عنہم پر ولید بن عقبہ نکلا کہ ایک دن عید کی نماز پڑھے تو ان سے کہا کہ یہ عید تو آ پہنچی اب اس میں تکبیر کس طرح ہے؟ تو عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو ابتدا کرے تو ایک تکبیر کہے جس سے تو نماز کو شروع کرے اور اپنے رب کی حمد کرے اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے، پھر دعا کرے اور تکبیر کہے اور اسی طرح کرے، پھر تکبیر کہے اور اسی طرح کہے، پھر تکبیر کہے اور اسی طرح کرے، پھر تکبیر کہے اور اسی طرح کرے، پھر قراءت پڑھے، پھر تکبیر کہے اور رکوع کرے، پھر کھڑا ہو تو قراءت پڑھے اور اپنے رب کی حمد کرے اور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجے۔ پھر دعا کرے اور تکبیر کہے اور اسی طرح کرے، پھر رکوع کرے۔ پس حذیفہ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ابوعبد الرحمٰن نے سچ کہا۔[2] یہ اسناد صحیح ہے۔ اور اس میں سے یہ ہے کہ دعا کو درود شریف کے ساتھ ختم کرنا مستحب ہے۔ ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ دعا آسمان و زمین کے درمیان ٹھہرائی جاتی ہے، اس میں سے کوئی شے اوپر نہیں چڑھتی، یہاں تک کہ تو نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجے۔[3] (وهكذا رواه أيوب بن موسىٰ عن سعيد بن المسيب عن عمر ابن الخطاب قوله و رواه معاذ بن الحارث عن أبي قرة عن سعيد بن المسيب عن عمر رضي الله عنه مرفوعا كذا رواه رزين بن

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (۱۹۸۹) مسند الشافعي (۱/ ۳۵۹) فضل الصلاة على النبي (۱/ ۸۰۔ ۸۱) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (تلخيص أحكام الجنائز: ۱/ ۵۳)

[2] سنن البيهقي الكبرىٰ (۳/ ۲۹۱) فضل الصلاة على النبي (۱/ ۷۷)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (۴۸۶) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۰۳۵)

معاوية في كتابه مرفوعاً "عن النبيﷺ قال: الدعاء موقوف بين السماء والأرض لا يصعد حتى يصلى علي فلا تجعلوني كغمر الراكب صلوا علي أول الدعاء وآخره و أوسطه"[1] (الغمر: بضم الغين المعجمة و فتح الميم قدح صغير أراد أن الراكب يحمل رحله و أزواده و يترك قعبه إلى آخر رحاله ثم يعلقه على رحله كالعلاوة فليس عندهم بمهم فنهاهم أن يجعلوا الصلاة عليه كالغمر الذي لا يقدم في المهام و يجعل تبعاً وحثهم على الصلاة أولا ووسطا وآخراً"[2] كذا في المجمع)۔ یعنی دعا آسمان وزمین کے درمیان موقوف ہوتی ہے چڑھتی نہیں ہے، یہاں تک کہ مجھ پر درود بھیجا جائے، پس تم مت کرو مجھ کو سوار کے چھوٹے پیالے کی طرح، یعنی وہ اس کا کچھ اہتمام نہیں کرتا اپنی سواری کے آخر میں اس کو لٹکا لیتا ہے، درود بھیجو تم مجھ پر دعا کے شروع میں اور اس کے آخر میں اور اس کے درمیان میں۔

یہ زیادتی صرف بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما مسند امام عبد بن حمید کشی رحمہ اللہ میں مروی ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا: «لَا تَجْعَلُوْنِي كَقَدَحِ الرَّاكِبِ إِذَا عَلَّقَ تَعَالِيْقَهُ أَخَذَ قَدَحَهُ فَمَلَأَهُ مِنَ الْمَاءِ فَإِنْ كَانَ لَهُ حَاجَةٌ فِي الْوُضُوْءِ تَوَضَّأَ وَإِنْ كَانَ لَهُ حَاجَةٌ فِي الشُّرْبِ شَرِبَ وَإِلَّا أَهْرَقَ مَا فِيْهِ، اِجْعَلُوْنِي فِي أَوَّلِ الدُّعَاءِ وَفِي وَسَطِ الدُّعَاءِ وَفِي آخِرِ الدُّعَاءِ»[3] (وهذا حديث غريب و موسىٰ بن عبيدة ضعيف الحديث) (موسیٰ بن عبیدہ، یعنی عبد بن حمید کے استاد جعفر بن عون کا استاد) یعنی مت ٹھہراؤ تم مجھ کو سوار کے پیالے کی طرح کہ جب وہ اپنے لٹکانے کی چیزوں کو لٹکا چکتا ہے تو اپنے پیالے کو لیتا ہے، پھر اس کو پانی سے بھرتا ہے، پھر اس کو وضو کی حاجت ہے تو وضو کر لیتا ہے اور اگر پینے کی حاجت ہے تو پی لیتا ہے ورنہ جو کچھ اس میں ہے اس کو گرا دیتا ہے تم تو مجھے ٹھہراؤ دعا کے شروع میں اور دعا کے درمیان میں اور دعا کے آخر میں۔

اس میں سے مؤکد تر دعائے قنوت ہے۔ امام احمد، اہلِ سنن، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ نے من حدیث ابی الحوراء امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو کئی کلمے سکھائے کہ میں ان کو وتر میں کہوں: «اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي فِيْمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِي فِيْمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِي فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِي فِيْمَا أَعْطَيْتَ، وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضىٰ عَلَيْكَ، إِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ، وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ»۔[4] ''اے اللہ! جن لوگوں کو تو نے ہدایت دی ہے مجھے بھی ان کے ساتھ ہدایت دے۔ اور جن کو تو نے عافیت دی ہے مجھے بھی ان کے ساتھ عافیت دے (یعنی ہر قسم کی برائیوں اور پریشانیوں وغیرہ سے) او جن کا تو والی (دوست اور محافظ) بنا ہے ان کے ساتھ میرا بھی والی بن۔ اور جو نعمتیں تو نے

---

[1] جامع الأصول لابن الأثير (٤/ ١٥٥) [2] مجمع بحار الأنوار (٤/ ٦٢)

[3] شعب الإيمان (٢/ ٢١٥) مسند عبد بن حميد (١/ ٣٤٠) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔

[4] مسند أحمد (١/ ١٩٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٦٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٧٨) صحيح ابن خزيمة (٢/ ١٥١) صحيح ابن حبان (٣/ ٢٢٥) مستدرك الحاكم (٣/ ١٨٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ٥/ ١٦٨)

عنایت فرمائی ہیں ان میں مجھے برکت دے۔ اور جو فیصلے تو نے فرمائے ہیں ان کے شر سے مجھے محفوظ رکھ۔ بلاشبہ فیصلے تو ہی کرتا ہے، تیرے مقابلے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ اور جس کا تو والی اور محافظ ہو وہ کہیں ذلیل نہیں ہو سکتا، بڑی برکتوں (اور عظمتوں) والا ہے تو اے ہمارے رب! اور بہت بلند وبالا ہے۔'' امام نسائی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اس کے بعد اتنا زیادہ کیا ہے: ''وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ''۔[1] اور ان میں سے یہ ہے کہ جمعہ کے دن اور جمعہ کی شب نبی کریم ﷺ پر بہ کثرت درود شریف بھیجنا مستحب ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے اوس بن اوس ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمھارے بہترین دنوں میں سے جمعے کا دن ہے اس میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اسی میں قبض کیے گئے اور اسی میں نفخہ ہے اور اس میں صعقہ ہے، پس تم اس میں مجھ پر درود کی کثرت کرو، بے شک تمھارا درود مجھ پر پیش کیا گیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! آپ پر ہمارا درود کس طرح پیش کیا جاتا ہے: ''وَقَدْ أَرِمْتَ وَقَدْ بَلَيْتَ'' یعنی آپ تو بوسیدہ ہوں گے۔ فرمایا: بے شک اللہ نے زمین پر حرام کیا ہے کہ نبیوں کے جسموں کو کھائے۔[2] (ورواه أبو داود والنسائي وابن ماجه من حديث حسين بن علي الجعفي وقد صحح هذا الحديث ابن خزيمة وابن حبان والدارقطني والنووي في الأذكار)

حدیث دیگر: ابن ماجہ نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم جمعے کے دن مجھ پر درود کی کثرت کرو، بے شک وہ حاضر کیا گیا ہے، فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں اور بے شک کوئی درود نہیں بھیجتا ہے مجھ پر مگر اس کا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو۔ امام ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کی: اور موت کے بعد بھی؟ فرمایا: بے شک اللہ نے زمین پر حرام کیا ہے کہ نبیوں کے جسموں کو کھائے، پس اللہ کا نبی زندہ ہے رزق دیا جاتا ہے۔[3] یہ حدیث شریف غریب ہے اس وجہ سے اور اس میں عبادہ بن نسی کے اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے، کیوں کہ عبادہ نے ان کو نہیں پایا۔ واللّٰه أعلم.

امام بیہقی رحمہ اللہ نے ابو امامہ اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات کو کثرت سے درود بھیجنے کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے۔[4] لیکن دونوں کی اسناد میں ضعف ہے۔ واللّٰه أعلم۔ اسماعیل قاضی نے حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین اس شخص کے جسم کو نہیں کھاتی جس سے روح القدس نے کلام کیا ہے۔[5] یہ حدیث شریف مرسل حسن ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے صفوان بن سلیم رحمہ اللہ

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٤٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبداللہ بن علی رحمہ اللہ کی ملاقات سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ دیکھیں: (إرواء الغليل: ٢/ ١٧٦)

[2] مسند أحمد (٤/ ٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣١) سنن النسائي، رقم الحديث

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٣٧) اس کی سند میں انقطاع ہے، جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ (ضعيف الجامع: ١١١٦)

[4] سنن البيهقي الكبرىٰ (٣/ ٢٤٩) ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت امام بیہقی رحمہ اللہ کے بجائے امام حاکم رحمہ اللہ سے ملی ہے۔ (مستدرك الحاكم: ٢/ ٤٥٧)

[5] فضل الصلاة على النبي (١/ ٣٨) یہ روایت مرسل ہے۔

سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب جمعہ کا دن اور جمعہ کی رات ہو تو مجھ پر درود کی کثرت کیا کرو، [1] یہ حدیث شریف مرسل ہے۔

اسی طرح خطیب پر واجب ہے کہ جمعہ کے دن منبر پر دونوں خطبوں میں نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجے اور وہ خطبے درست نہیں ہوتے مگر درود کے ساتھ، کیوں کہ وہ ایک عبادت ہے اور ذکر اللہ اس میں شرط ہے تو رسول اللہ ﷺ کا ذکر اس میں واجب ہوا مثل اذان و نماز کے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ نیز ان میں سے یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی قبرِ اطہر و انور و اقدس و اطیب کی زیارت کے وقت آپ پر درود سلام بھیجنا مستحب ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: نہیں ہے کوئی کہ مجھ پر سلام کرے مگر اللہ مجھ پر میری روح پھیر لاتا ہے، یہاں تک کہ میں اس پر سلام لوٹاتا ہوں، یعنی اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ [2] (تفرد به أبو داود وصححه النووي في الأذكار)

پھر ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مت ٹھہراؤ تم اپنے گھروں کو قبریں اور مت ٹھہراؤ تم میری قبر کو عید اور درود بھیجو مجھ پر، بے شک تمھارا درود مجھے پہنچتا ہے جہاں کہیں تم ہو۔ [3] (﴿لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ عِيْدًا﴾) کے یہ معنی ہیں کہ مت ٹھہراؤ میری قبر کی زیارت کو عید یا مظہرِ عید، یعنی اس کی زیارت کے لیے جمع ہو جاؤ جیسے تم عید کے لیے جمع ہوتے ہو، کیوں کہ عید تو لہو و سرور کا دن ہوتا ہے اور زیارت کا حال اس کے برخلاف ہے۔ یہ اہلِ کتاب کی عادت تھی، چنانچہ اس نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا اور یہ بت پرستوں کی عادت ہے، یہاں تک کہ انھوں نے مردوں کو پوجا۔ یا عید اسم ہے اعتیاد سے۔ اعتیاد کہتے ہیں خوگر ہونے کو۔ زیارت کا خوگر ہونے میں سوئے ادبی کا خوف ہے اور لحاظ اور پاسِ ادب کا ڈر ہے۔ ﴿فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ﴾ اس معنی کی تایید کرتا ہے، یعنی میری طرف عود کرنے کا تکلف مت کرو، کیوں کہ اس سے تم کو غنا حاصل ہے، تمھارا درود مجھ کو پہنچتا ہے تم کہیں بھی ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اپنی امت سے مشقت دور کرنے کے لیے نہی فرمائی، آپ ﷺ کو اس کا بہت خیال رہا کرتا تھا۔ یا اس کراہت سے منع فرمایا کہ کہیں قبر شریف کی تعظیم کرنے میں حد سے بڑھ جائیں تو فتنے میں پڑ جائیں۔ پھر کبھی حد سے بڑھ کر تعظیم کفر کی طرف لے جائے تو اسلام ہی ہاتھ سے چلا جائے۔ نعوذ باللّٰہ منہ) (تفرد به أبو داود أيضا وقد رواه الإمام أحمد عن شريح عن عبد الله بن نافع وهو الصائغ به وصححه النووي أيضاً، وقد روى من وجه آخر عن علي رضي الله عنه)

---

[1] مسند الشافعي (١/ ٧٠) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤١) الأذكار (١/ ٤٤٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٦٦)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) مسند أحمد (٢/ ٣٦٧) الأذكار (١/ ٢٦٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٢٦)

قاضی اسماعیل بن اسحاق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "فضل الصلاة على النبي ﷺ" میں کہا ہے کہ حدیث کی ہم کو اسماعیل بن ابو اویس نے، کہا حدیث کی ہم کو جعفر بن ابراہیم بن محمد بن علی بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب رحمہ اللہ نے ایک اور شخص سے من جملہ اپنے اہلِ بیت کے، وہ شخص راوی ہے علی بن الحسین بن علی رحمہ اللہ سے کہ ایک شخص ہر صبح کو آیا کرتا تھا اور زیارت کرتا تھا نبی اکرم ﷺ کی قبر کی اور درود بھیجتا آپ ﷺ پر اور اس کام کو وہ اتنا کرتا تھا کہ وہ علی بن الحسین رحمہ اللہ پر مشتہر ہو گیا تو علی بن الحسین رحمہ اللہ نے اس سے فرمایا کہ تجھے کون سی چیز اس کام کا باعث ہوتی ہے؟ اس نے عرض کی: میں نبی اکرم ﷺ پر سلام کرنے کو دوست رکھتا ہوں تو انھوں نے اس سے فرمایا: کیا تو اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ میں تجھے اپنے والد سے ایک حدیث بیان کروں؟ اس نے کہا: ہاں، تو علی بن الحسین رحمہ اللہ نے اس سے فرمایا کہ خبر دی مجھ کو میرے والد نے میرے دادا سے کہ میرے دادا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مت ٹھہراؤ میری قبر کو عید اور مت ٹھہراؤ تم اپنے گھروں کو قبریں اور مجھ پر درود وسلام بھیجو جہاں کہیں تم ہو، چنانچہ مجھ کو تمھارا درود اور سلام پہنچتا ہے۔[1] اس کی اسناد میں ایک مبہم شخص ہے اس کا نام نہیں لیا گیا، یہ حدیث ایک اور وجہ سے مرسلاً مروی ہے۔

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اپنی مصنف میں عن الثوری عن ابن عجلان عن رجل يقال له سهيل عن الحسن بن الحسن بن علی رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔ سہیل نے کہا کہ حسن بن الحسن نے ایک قوم کو قبر شریف کے نزدیک دیکھا تو ان کو منع کیا اور کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: تم میری قبر کو عید مت ٹھہراؤ اور اپنے گھروں کو قبریں نہ ٹھہراؤ اور مجھ پر درود بھیجو تم جہاں کہیں ہو، بے شک تمھارا درود مجھ کو پہنچتا ہے۔[2] شاید حسن رحمہ اللہ نے ان کو بے ادبی کرتے ہوئے دیکھا ہو، اس طرح سے کہ اپنی آوازیں ضرورت سے زیادہ بلند کرتے ہوں، اس لیے ان کو منع کیا۔ یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ قبر شریف کے پاس آمد ورفت رکھتا تھا تو فرمایا: اے شخص! تو اور وہ شخص جو اندلس میں ہے نہیں ہو تم ان سے مگر برابر، یعنی سب کے درود وسلام ان کو ہمیشہ پہنچتے رہتے ہیں قیامت کے دن تک۔

طبرانی رحمہ اللہ نے اپنی معجم کبیر میں حسن بن حسن بن علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ عن ابیہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم مجھ پر درود بھیجو، جہاں کہیں تم ہو، بے شک تمھارا درود مجھے پہنچتا ہے۔[3] پھر طبرانی نے اُم انیس بنت الحسن بن علی عن ابیہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «أَرَأَيْتَ قَوْلَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ فَقَالَ: إِنَّ هٰذَا مِنَ الْمَكْتُوْمِ وَلَوْ لَا أَنَّكُمْ سَأَلْتُمُوْنِي عَنْهُ مَا أَخْبَرْتُكُمْ». ("أرأيت": تفسیر ابن کثیر میں اسی طرح ہے۔ سیاق یوں چاہتا ہے کہ حسن رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے ان کو جواب دیا، ورنہ عبارت درست نہیں ہوتی ہے۔ واللّٰه أعلم) یعنی خبر دو مجھے اللہ

[1] فضل الصلاة على النبي (١/ ٣٦) [2] مصنف عبد الرزاق (٣/ ٥٧٧) [3] المعجم الكبير (٣/ ٨٢)

کے اس قول کی کہ اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر تو فرمایا کہ بے شک یہ بات علم مستور سے ہے اور اگر تم مجھ سے اس کا سوال نہ کرتے تو میں تم کو نہ بتاتا، بے شک اللہ نے دو فرشتے مجھ پر متعین کیے ہیں، جب بھی کسی بندۂ مسلم کے پاس میرا ذکر کیا جاتا ہے، پھر وہ مجھ پر درود بھیجے تو یہ دونوں فرشتے کہتے ہیں: ''غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ'' یعنی اللہ تیری مغفرت کرے اور اللہ اور اس کے فرشتے ان دونوں فرشتوں کو جواب دیتے ہیں: آمین! اور نہیں بھیجتا مجھ پر درود کوئی شخص مگر یہ دونوں فرشتے کہتے ہیں: ''لَا غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ''۔ اور اللہ اور اس کے فرشتے ان دونوں فرشتوں کو جواب دیتے ہیں۔ آمین![1] (غريب جدا و إسناده به ضعيف شديد)۔ امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ کے فرشتے ہیں زمین میں سیاحت کرنے والے، وہ مجھ کو میری امت کی طرف سے سلام پہنچاتے ہیں۔[2] (وهكذا رواه النسائي من حديث سفيان الثوري وسليمان بن مهران الأعمش كلاهما عن عبد الله بن السائب)

اب رہی یہ دوسری حدیث کہ جو کوئی میری قبر کے پاس مجھ پر درود بھیجے تو میں اس کو سنتا ہوں اور جو کوئی دور سے مجھ پر درود بھیجے تو میں اس کو پہنچایا جاتا ہوں[3] تو اس کی اسناد میں نظر ہے۔ (تفرد به محمد بن مروان السدي الصغير وهو متروك عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة رضي الله عنه مرفوعا) ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ محرم جس وقت لبیک کہے اور اپنے لبیک کہنے سے فارغ ہو تو اس کے لیے مستحب ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی و دارقطنی رحمہم اللہ نے بروایت صالح بن محمد بن زائدہ قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق سے روایت کیا ہے کہ آدمی حکم کیا جاتا تھا، جبکہ اپنے تلبیہ سے فارغ ہو، اس بات کا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہر حال درود بھیجے۔[4]

اسماعیل قاضی نے وہب بن اجدع سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم آؤ تو بیت اللہ کا سات بار طواف کرو اور مقامِ ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز پڑھو، پھر صفا پر آؤ تو اس پر ایسی جگہ پر کھڑے ہو کہ بیت اللہ کو دیکھو، پھر سات بار تکبیر کہو، اس کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو، اپنی جان کے لیے دعا مانگو اور اسی طرح مروہ پر کرو۔[5] (إسناده جيد حسن) اور کہا یعنی اصحاب نے کہ ذبح کے وقت مع اللہ کے ذکر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا مستحب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ [الإنشراح: ٤] ''اور ہم نے تیرا ذکر بلند کیا'' سے اس بات کا استیناس

---

① المعجم الكبير (٣/ ٨٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه الحكم بن عبد الله بن خطاف وهو كذاب'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٢١١)

② مسند أحمد (١/ ٤٥٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٨٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٥٣)

③ شعب الإيمان (٢/ ٢١٥) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٠٣) ④ الأم للشافعي (٢/ ٢٣٤) سنن الدارقطني (٢/ ٢٣٨)

⑤ فضل الصلاة على النبي (١/ ٧٣)

کیا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہیں ذکر کیا جاؤں میں، مگر تو ذکر کیا جائے ساتھ میرے۔ جمہور نے اس بارے میں ان کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ ایک ایسی جگہ ہے کہ اس میں تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، جس طرح کہ کھانے کے وقت اور دخول اور وقاع کے وقت اور ان کے سوا اور امور ایسے ہیں جن میں درود پڑھنے کی حدیث وارد نہیں ہوئی ہے۔

حدیثِ دیگر: قاضی اسماعیل نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ درود بھیجو اللہ کے نبیوں پر اور اس کے رسولوں پر، بے شک اللہ نے ان کو بھیجا ہے، جیسا کہ مجھے بھیجا ہے۔[1] اس کی اسناد میں دو شخص ضعیف ہیں: ایک تو عمرو بن ہارون اور دوسرے ان کے شیخ موسیٰ بن عبیدہ (واللّٰہ أعلم)۔ (وقد رواہ عبدالرزاق عن الثوري عن موسیٰ بن عبیدۃ الزبیدي بہ)۔ اور اس میں سے یہ ہے کہ وقت طنین اذن کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا مستحب ہے، اگر وہ حدیث صحیح ہو جائے جو اس بارے میں وارد ہوئی ہے۔ (''طنین'' سخت شے کی آواز کو کہتے ہیں۔ صراح میں کہا ہے: ''طنین بالفتح آواز مگس و بانگ طشت و بزگان و بط و مانند آن'' یہاں مراد کان کا آواز کرنا ہے جس کو کان بولنا کہتے ہیں)۔

امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «إِذَا طَنَّتْ أُذُنُ أَحَدِكُمْ فَلْيَذْكُرْنِي وَلْيُصَلِّ عَلَيَّ وَلْيَقُلْ ذَكَرَ اللّٰهُ مَنْ ذَكَرَنِي بِخَيْرٍ»[2] (إسنادہ غریب وفي ثبوتہ نظر، واللہ أعلم)۔ یعنی جس وقت تم میں سے کسی کا کان آواز کرے تو چاہیے کہ مجھے یاد کرلے اور چاہیے کہ مجھ پر درود بھیجے اور چاہیے کہ کہے: ذکر کرے اللہ اس شخص کا جس نے میرا ذکر کیا خیر کے ساتھ۔ اس کی اسناد غریب ہے اور اس کے ثبوت میں نظر ہے۔

مسئلہ:

کتابت والوں نے مستحب رکھا ہے اس بات کو کہ کاتب جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ مبارک لکھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی تکرار کرے، یعنی ہر بار درود لکھے۔ حدیث میں من طریق کادح بن رحمۃ عن نہشل عن الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «مَنْ صَلَّى عَلَيَّ فِي كِتَابٍ لَمْ تَزَلِ الصَّلَاةُ جَارِيَةً لَهُ مَا دَامَ اسْمِي فِي ذٰلِكَ الْكِتَابِ»[3] یعنی جو کوئی درود بھیجے مجھ پر کسی کتاب میں تو وہ درود

---

[1] فضل الصلاۃ علی النبي (۱/ ۴۸) مصنف عبد الرزاق (۲/ ۲۱۶) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] المعجم الکبیر (۱۸۷/۱) اس کی سند میں ''محمد بن عبیداللہ بن ابی رافع اور حبان بن علی'' ضعیف راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: (السلسلۃ الضعیفۃ، رقم الحدیث: ۲۶۳۱)

[3] اللآلي المصنوعۃ (۱۸۷/۱) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہِ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلۃ الضعیفۃ، رقم الحدیث: ۳۳۱۶)

ہمیشہ کے لیے جاری رہے گا اس کے لیے جب تک کہ میرا نام اس کتاب میں ہوگا۔ یہ حدیث وجوہ کثیرہ سے صحیح نہیں ہے، اور حدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابو عبد اللہ ذہبی رحمہ اللہ نے کہا: میں اس حدیث کو موضوع خیال کرتا ہوں۔ (وقد روي نحوه عن أبي بكر رضی اللہ عنہ وابن عباس رضی اللہ عنہما ولا يصح من ذلك شيء والله أعلم)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الجامع لآداب الراوي والسامع" میں ذکر کیا ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے خط سے دیکھا ہے کہ بہت جگہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک لکھتے ہیں، بغیر اس کے کہ کتابتاً آپ پر درود کا ذکر کریں، کہا: اور مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ لفظاً آپ پر درود پڑھتے تھے۔[1]

کیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، دیگر انبیاء اور غیرِ انبیاء کے لیے لفظ "صلاۃ" کا استعمال جائز ہے:

رہا یہ مسئلہ کہ غیر انبیاء پر صلاۃ کا لفظ ذکر کرنا جائز ہے یا نہیں، سو اگر یہ بطور تبعیت کے ہے، جس طرح کہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے۔ «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّاتِهِ»۔[2] تو بالا جماع جائز ہے۔ نزاع جو واقع ہوا ہے تو اس صورت میں ہے کہ غیر انبیاء پر تنہا لفظ صلاۃ ذکر کیا جائے یا نہیں؟ تو ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ یہ جائز ہے۔ ان کی دلیلیں یہ ہیں:

1. قولہ تعالیٰ: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓىِٕكَتُهٗ ﴾ [الأحزاب: ٤٣] "وہی ہے جو تم پر اپنی رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے (تمھارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں)۔"

2. قولہ تعالیٰ: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ﴾ [البقرة: ١٥٧] "ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں۔"

3. قولہ تعالیٰ: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١٠٣] "آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجیے، جس کے ذریعے سے آپ ان کو پاک صاف کر دیں اور ان کے لیے دعا کیجیے، بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لیے موجب اطمینان ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سنتا ہے اور خوب جانتا ہے۔"

4. حدیث: عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جس وقت کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ» پس میرا باپ اپنا صدقہ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو فرمایا: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ أَبِيْ أَوْفٰى»[3] (أخرجاه في الصحيحين)

5. سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ ان کی بی بی نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھ پر اور میرے خاوند

---

[1] الجامع لأخلاق الراوي و آداب السامع (٢٧١/١) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

پر درود بھیجیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: «صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكِ وَعَلٰى زَوْجِكِ» [1]

علماء میں سے جمہور کا قول یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی پر لفظ صلاۃ کا ذکر کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ صلاۃ انبیاء کا شعار ہو گیا ہے، جب ان کا ذکر کیا جائے تو ان کا غیر اُن کے ساتھ نہ ملایا جائے، چنانچہ یوں نہ کہیں کہ "قال أبوبكر صلى الله عليه" یا "قال علي صلى الله عليه" گو معنی صحیح ہیں، جس طرح کہ یوں نہیں بولتے: قال محمد صلى الله عليه وسلم عزوجل گو آپ عزیز اور جلیل ہیں، اس لیے کہ یہ اللہ عزوجل کے ذکر کا شعار ہے اور قرآن و حدیث جو اس بارے میں وارد ہوا ہے اس کو دعا پر محمول کیا ہے اور اسی لیے آلِ ابی اوفیٰ کے لیے صلاۃ کا شعار ثابت نہیں ہوا اور نہ ہی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے لیے اور نہ ان کی بی بی کے لیے ثابت ہوا ہے۔ یہ اچھا مسلک ہے۔ دوسروں نے کہا: یہ اس لیے جائز نہیں ہے کہ غیر انبیاء علیہم السلام پر صلاۃ اہلِ اھواء کے شعار سے ہو گیا ہے، وہ جن لوگوں کے حق میں اعتقاد رکھتے ہیں ان پر صلاۃ کا لفظ ذکر کرتے ہیں تو اس بارے میں ان کی پیروی نہ کی جائے۔ واللہ أعلم.

پھر جو لوگ اس کی ممانعت کرتے ہیں انھوں نے اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ تحریم کے باب سے ہے، یا کراہتِ تنزیہی سے ہے، یا خلاف الاولیٰ سے۔ یہ تین قول ہوئے۔ شیخ ابو زکریا نووی رحمہ اللہ نے "کتاب الأذکار" میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ صحیح قول، جس پر اکثر ہیں، یہ ہے کہ مکروہ بکراہتِ تنزیہی ہے، اس لیے کہ یہ اہلِ بدع کا شعار ہے اور ہم ان کے شعار سے منع کیے گئے ہیں اور مکروہ ہے جس میں نہی مقصود وارد ہوئی ہو۔ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ اس بارے میں معتمد قول یہ ہے کہ صلاۃ کا لفظ زبانِ سلف میں مخصوص ہو گیا ہے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، جس طرح کہ ہمارا قول "عزوجل" اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، جس طرح کہ محمد صلى الله عليه وسلم عزوجلِ نہیں کہتے گو آپ عزیز اور جلیل ہیں، اسی طرح ابوبکر یا علی صلی اللہ علیہ نہیں بولتے۔ (هذا لفظه بحروفه) کہا: اور رہا سلام تو ہمارے اصحاب میں سے شیخ ابو محمد جوینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صلاۃ کے معنی میں ہے، چنانچہ غائب میں اس کا استعمال نہ کیا جائے اور نہ غیر انبیاء پر۔ اس کا ذکر کیا جائے تو یوں نہ کہیں کہ "علی علیہ السلام" اس میں زندہ اور مردہ برابر ہیں۔

رہا حاضر تو وہ اس کے ساتھ خطاب کیا جائے، چنانچہ یوں کہیں: "سَلَامٌ عَلَيْكَ وَسَلَامٌ عَلَيْكُمْ" یا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ" یا "عَلَيْكُمْ"۔ یہ امر مجمع علیہ ہے۔[2] انتهىٰ ما ذكره۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: بہت سے ناسخینِ کتب کی عبارت میں یہ بات غالب ہوئی ہے کہ تنہا علی رضی اللہ عنہ کے نام پر "عَلَيْهِ السَّلَام" کہتے ہیں یا "كرم الله وجهه" سوائے باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے، اگرچہ اس کے معنی صحیح ہیں، لیکن چاہیے یہ کہ اس بارے میں صحابہ کے درمیان برابری کی جائے، کیوں کہ یہ تعظیم اور تکریم کے باب سے ہے تو شیخین یعنی امیر المومنین ابوبکر صدیق، امیر المومنین عمر بن الخطاب

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] الأذكار (١/ ٢٧٤)

اور امیر المومنین عثمان بن عفان اس خطاب کے زیادہ حق دار ہیں۔ رضي الله عنهم أجمعين.[1]

قاضی اسماعیل نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ صلاۃ صلاحیت نہیں رکھتی مگر نبی کریم ﷺ پر، لیکن مسلمین ومسلمات کے لیے مغفرت کی دعا کی جائے۔ نیز جعفر بن برقان سے روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے لکھا: "أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ نَاسًا مِنَ النَّاسِ قَدِ الْتَمَسُوا الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْآخِرَةِ وَإِنَّ نَاسًا مِنَ الْقُصَّاصِ قَدْ أَحْدَثُوا فِي الصَّلَاةِ عَلٰى خُلَفَائِهِمْ وَأُمَرَائِهِمْ عَدْلَ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَإِذَا جَاءَكَ كِتَابِي هٰذَا فَمُرْهُمْ أَنْ تَكُوْنَ صَلَاتُهُمْ عَلَى النَّبِيِّيْنَ وَدُعَاؤُهُمْ لِلْمُسْلِمِيْنَ عَامَّةً وَّيَدْعُوْا مَا سِوَا ذٰلِكَ"[2] (أثر حسن)۔ یعنی بے شک کچھ لوگوں میں سے بعض نے عملِ آخرت کے عوض دنیا طلب کی اور بے شک واعظوں میں سے کچھ لوگوں نے نئی بات نکال لی ہے کہ اپنے خلفاء اور امراء پر اس طرح سے دعا کرتے ہیں جیسے نبی اکرم ﷺ پر صلاۃ کی جاتی ہے، لہٰذا جب تیرے پاس میرا یہ خط آئے تو تو ان کو حکم کر کہ ان کی صلاۃ تو انبیاء پر ہو اور ان کی دعا عام مسلمانوں کے لیے ہو اور اس کے سوا جو کچھ ہے اسے ترک کر دیں۔ یہ اثر حسن ہے۔

قاضی اسماعیل نے نبیہ بن وہب سے روایت کیا ہے کہ کعب رحمہ اللہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر داخل ہوئے تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا۔ کعب رحمہ اللہ نے کہا کہ نہیں ہے کوئی فجر کہ طلوع ہو مگر نازل ہوتے ہیں ستر ہزار فرشتے، یہاں تک کہ قبر شریف کو گھیر لیتے ہیں، اپنے پَر مارتے ہیں اور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ ستر ہزار فرشتے رات کو اور ستر ہزار دن کو یہاں تک کہ جس وقت آپ سے زمین شق ہوگی تو آپ ﷺ ستر ہزار فرشتوں میں نکلیں گے، وہ آپ ﷺ کو جلد لے جائیں گے[3] (اصل کے الفاظ "يزفونه" ہے، اگر "زَفَّ يَزِفُّ" بالکسر ہے تو "زف في مشيته إذا أسرع" سے ماخوذ ہوگا اور اگر بالضم ہے تو ماخوذ ہوگا "زففت العروس إلى زوجها إذا هديتها إليه" سے۔ والله أعلم۔) امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجے تو چاہیے کہ ان پر صلاۃ اور تسلیم دونوں اکٹھے کرے، ایک پر اکتفا نہ کرے۔ چنانچہ نہ فقط "صلى الله عليه" کہے اور نہ صرف "عليه السلام" کہے۔ یہ بات جو انھوں نے کہی، اس آیتِ کریمہ سے منتزع (کھینچ کر نکالی گئی) ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾۔ پس زیادہ مناسب یہ ہے کہ "صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا" کہیں۔[4]

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ایذا پہنچانے والے دنیا و آخرت میں ملعون ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴾۔ جن لوگوں نے اللہ پاک کے احکامات کی مخالفت کی اور اس کی زواجر یعنی ممنوعہ چیزوں کا ارتکاب کیا اور

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٧٧)
[2] فضل الصلاة على النبي (١/ ٦٩۔ ٧٠)
[3] فضل الصلاة على النبي (١/ ٨٥)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٧٧)

اس پر قائم رہے اور اس کے رسول کو ایذا دی کوئی عیب لگا کر یا گھٹا کر۔ عیاذا باللہ تعالیٰ من ذلك۔ اللہ تعالیٰ ان کو تہدید اور وعید سناتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مصوروں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[1] صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ ابن آدم مجھ کو ایذا دیتا ہے، وہ دہر کو گالی دیتا ہے اور میں دہر ہوں، اس کے دن اور رات کو لوٹتا پوٹتا ہوں،[2] معنی اس کے یہ ہیں کہ جاہلیت والے کہا کرتے تھے: "يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ فَعَلَ بِنَا كَذَا كَذَا" یعنی زمانے کا برا ہو کہ اس نے ہمارے ساتھ ایسا ایسا کیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے افعال کو زمانے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس کو برا کہتے تھے، حالاں کہ اس کا فاعل تو اللہ عزوجل ہی ہے، لہٰذا اس سے منع فرمایا۔ امام شافعی اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ وغیرہما نے اسی طرح تقریر کی ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کے حق میں نازل ہوئی جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ بنت حیی بن اخطب سے نکاح کیا۔[3] ظاہر یہ ہے کہ آیت عام ہے، ہر اس شخص کے لیے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ بھی ایذا دی اور جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دی تو یقیناً اس نے اللہ کو ایذا دی، جس طرح یہ ہے کہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تو واقعی اس نے اللہ کی اطاعت کی، جیسا کہ امام احمد نے عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ أَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِيْ فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ أَبْغَضَهُمْ وَمَنْ أَذَاهُمْ فَقَدْ أَذَانِيْ وَمَنْ أَذَانِيْ فَقَدْ أَذَى اللّٰهَ وَمَنْ أَذَى اللّٰهَ يُوْشِكُ أَنْ يَّأْخُذَهُ»[4] یعنی اللہ سے میرے اصحاب کے حق میں ڈرو، میرے بعد ان کو نشانہ مت ٹھہراؤ، جس نے ان کو دوست رکھا تو میری محبت کے سبب سے ان کو دوست رکھا اور جس نے ان کو مبغوض رکھا تو میرے بغض کے سبب سے ان کو مبغوض رکھا اور جس نے ان کو ایذا دی تو یقیناً اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی تو یقیناً اس نے اللہ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو قریب ہے اللہ اس کو پکڑے۔ (وقد رواه الترمذي من حديث عبيدة بن أبي رائطة عن عبد الرحمن بن زياد عن عبد الله بن المغفل به، ثم قال: هذا حديث غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه)

قولہ تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ یعنی جو لوگ مومنین اور مومنات کی طرف وہ شے منسوب کرتے ہیں جس سے وہ بری ہیں، انھوں نے اس کو

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٢٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٦)

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٢٢۔ ٣٢٣)

[4] مسند أحمد (٥/ ٥٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٦٢) اس کی سند میں "عبدالرحمٰن بن زیاد" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٩٠١)

نہیں کیا ہے تو یقیناً انھوں نے اٹھایا بہتان اور بڑا گناہ، یہ وہی کھلا بہتان ہے کہ جو کام انھوں نے نہیں کیا، وہ عیب کے طور پر ان سے حکایت کرے یا نقل کرے اور ان کی قدر و منزلت گھٹانا چاہے۔ اکثر لوگ جو اس وعید میں داخل ہوتے ہیں ان میں سے اللہ اور اس کے رسول کے منکر لوگ ہیں۔

پھر رافضی لوگ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گھٹاتے ہیں اور جس بات سے اللہ نے ان کو بری کیا ہے اس کا ان کو عیب لگاتے ہیں اور جس بات کی اللہ پاک نے ان کے بارے میں خبر دی ہے، اس کے نقیض (توڑنا) کے ساتھ ان کا وصف کرتے ہیں، کیوں کہ اللہ عزوجل نے تو یہ خبر دی ہے کہ وہ بے شک راضی ہوا مہاجرین اور انصار سے اور ان کی تعریف کی اور یہ جاہل اور کم عقل ان کو گالیاں دیتے ہیں اور ان کو گھٹاتے ہیں اور ان کی طرف سے وہ بات ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے کبھی نہیں کی، حقیقت میں ان لوگوں کے دل اوندھے کر دیے گئے ہیں کہ جن لوگوں کی مدح کی گئی ہے ان کی تو مذمت کرتے ہیں اور جن لوگوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی مدح کرتے ہیں۔

امام ابو داود رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کسی نے عرض کی: یا رسول اللہ! غیبت کیا ہے؟ فرمایا کہ تیرا اپنے بھائی کو اس شے کے ساتھ ذکر کرنا جو اُسے بری لگتی ہے۔ عرض کی گئی: پھر آپ بتائیں کہ اگر میرے بھائی میں وہ شے موجود ہو جو مَیں کہتا ہوں؟ فرمایا کہ اگر اس میں وہ شے ہے جو تو کہتا ہے تو یقیناً تو نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ نہیں ہے جو تو کہتا ہے تو یقیناً تو نے اس کو بہتان لگایا۔[1] (وهكذا رواه الترمذي عن قتيبة عن الدراوردي به ثم قال: حسن صحيح) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کون سا ربا (بڑھنا) اللہ کے نزدیک زیادہ ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: اللہ کے نزدیک «أَرْبَى الرِّبَا» مسلمان مرد کی آبرو کو حلال جاننا ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ... الآية﴾۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جمہور نے ﴿مَلٰٓىِٕكَتَهٗ﴾ بہ نصب پڑھا ہے اس بنا پر کہ معطوف ہے اسم ﴿اِنَّ﴾ پر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے برفع "مَلَائِكَتُهُ" پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ معطوف ہے اسم ﴿اِنَّ﴾ کے محل پر۔[3] اور ﴿يُصَلُّوْنَ﴾ کی ضمیر اللہ پاک اور ملائکہ کی طرف راجع ہے۔ اس میں ایک شرف عظیم ہے، اس لحاظ سے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٣٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٥٣) شعب الإيمان (٥/٢٩٨) اس کی سند میں "عمران بن انس" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب (٢/ ١٢٢)

[3] فتح القدير (٤/ ٣٩٦)

کہ ان کے لیے اور اللہ پاک کے لیے ایک ضمیر لائی گئی ہے، اب وہ اعتراض وارد نہ ہوگا جو ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ جس وقت آپ نے خطیب کو یوں کہتے سنا: "مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَقَدْ غَوٰى" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو قوم کا برا خطیب ہے۔ یوں کہو: ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾[1] [الجن: ۲۳] وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ پاک کے ذکر کو اس کے غیر کے ساتھ ایک ضمیر میں جمع کرے۔

یہ حدیث شریف صحیح میں ثابت ہے اور نیز صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن ایک منادی کو امر فرمایا کہ یوں ندا کرے: «إِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يَنْهَيَانِكُمْ عَنْ لُّحُوْمِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ»[2] یعنی بے شک اللہ اور اس کا رسول تم کو منع کرتے ہیں خانگی گدھوں کا گوشت کھانے سے۔ ان دونوں حدیثوں کے جمع کرنے میں اہلِ علم کے درمیان بحثیں ہیں، یہ جگہ ان کے ذکر کی نہیں ہے۔ یہ آیتِ کریمہ جواز کی تائید کرتی ہے، اس لیے کہ اس میں اللہ پاک کی اور فرشتوں کی ایک ضمیر لائی گئی ہے اور اس کی جو یہ علت بیان کی ہے کہ فرشتوں کے شرف کے لیے اس طرح فرمایا ہے تو یہی علت رسول اللہ ﷺ کی شان کی عظمت میں بھی بیان کی جائے گی۔

رہا آپ ﷺ کا اس خطیب کی مذمت کرنا جس نے دو ضمیروں کو جمع کیا تھا تو وہ اس پر محمول ہوگا کہ آپ ﷺ نے اس سے یہ سمجھا کہ خطیب نے اللہ پاک اور اس کے رسول کے درمیان برابری کا ارادہ کیا ہے، لہٰذا وہ ممانعت ایسے موقع کے ساتھ خاص ہوگی۔ جمع بین الحدیثین میں جو اقوال ہیں، ان سب میں سے بہتر قول یہی ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إِنَّ اللّٰهَ يُصَلِّيْ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ" اس قول کی بنا پر اب آیت اس قبیل سے نہ ہوگی کہ جس میں اللہ کا ذکر اور اس کے غیر کا ذکر ایک ضمیر میں جمع کیا گیا ہو اور وہ اعتراض بھی وارد نہ ہوگا جو کہا ہے کہ اللہ پاک کی طرف سے تو صلاۃ رحمت ہوتی ہے اور اس کے فرشتوں کی طرف سے دعا ہوتی ہے تو پھر ﴿ يُصَلُّوْنَ ﴾ کے لفظ میں یہ دو مختلف معنی کس طرح جمع کیے جائیں گے۔

رہا قولِ اول تو اس کی بنیاد پر یوں کہیں گے کہ ﴿ يُصَلُّوْنَ ﴾ سے ایسے مجازی معنی مراد ہیں، جو دونوں معنوں کو شامل اور عام ہیں، وہ یہ معنی ہیں کہ ﴿ يُصَلُّوْنَ ﴾ سے مراد " يَهْتَمُّوْنَ بِإِظْهَارِ شَرَفِهٖ أَوْ يُعَظِّمُوْنَ شَأْنَهٗ" اور "يَعْتَنُوْنَ بِأَمْرِهٖ" یعنی اللہ اور اس کے فرشتے آپ کے اظہارِ شرف کا اہتمام کرتے ہیں، یا آپ کی شان کی تعظیم کرتے ہیں، یا آپ کے امر و حال کا اعتناء کرتے ہیں (اہتمام کرتے ہیں)۔ چنانچہ اللہ پاک تو رحمت سے کرتا ہے اور فرشتے دعا سے کرتے ہیں۔ امام ابو العالیہ، سفیان ثوری اور عطاء ﷭ وغیرہم کے اقوال صلاۃ کے بارے پہلے گزر چکے ہیں۔

امامِ واحدی ﷫ نے امام مقاتل ﷫ سے حکایت کیا ہے کہ رب کی صلاۃ تو مغفرت ہے اور فرشتوں کی صلاۃ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٦٣)

استغفار ہے۔[1] اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ سے اپنے رسول ﷺ کو ان کی زندگی میں اور موت میں شرف بخشا اور ان کا بلند پایہ اور مرتبہ جو اس کے نزدیک ہے، اس کا اظہار فرمایا اور اپنے بندوں کو ان کے بلند مرتبہ کی خبر دی کہ وہ اپنے فرشتوں کے پاس ان پر ثنا کرتا ہے اور فرشتے ان پر درود بھیجتے ہیں۔

پھر اپنے بندوں کو حکم دیا کہ وہ ان کا اقتدا کریں اور ان پر درود بھیجیں۔ چنانچہ فرمایا: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اس پر درود بھیجو، یعنی اس کے لیے رحمت کی دعا کرو اور کہو: "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ" یا "صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی مُحَمَّدٍ" کیوں کہ تم یہ کہنے کے زیادہ مستحق ہو۔ ﴿ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ یعنی اور تحیت کرو اس کے ساتھ سلام کی تحیت اور کہو: "اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ"۔ کسی نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں کہ فرماں بردار اور مطیع ہو جاؤ اس کے حکم کے پوری طرح فرماں بردار ہونا، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے اس آیت کو یوں پڑھا ہے: "صَلُّوْا عَلَيْهِ كَمَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا"[2] اور اس کی تفسیر میں ان سے یہ مروی ہے کہ اللہ کی نبی پر صلاۃ مغفرت ہے۔ بے شک اللہ صلاۃ نہیں کرتا ہے، لیکن وہ بخشتا ہے۔

رہی لوگوں کی نبی پر صلاۃ تو وہ ان کے لیے استغفار ہے، یعنی بخشش طلب کرنا۔ پھر اگر کوئی کہے کہ جب اللہ پاک اور اس کے فرشتے آپ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں تو پھر آپ ﷺ کو ہماری صلاۃ کی کیا حاجت ہے تو کہیں گے کہ آپ ﷺ پر درود بھیجنا کچھ اس لیے نہیں ہے کہ آپ ﷺ کو اس کی حاجت ہے، ورنہ آپ ﷺ کو تو فرشتوں کی صلاۃ کی بھی کچھ حاجت نہیں۔ صلاۃ سے مقصود صرف آپ کی تعظیم ہے اور اس سے ہمیں ثواب کا ملنا ہے اور آپ ﷺ کا قرب حاصل ہونا ہے۔ چنانچہ حدیثوں میں اس کی خوب تصریح ہے۔

﴿ تَسْلِيْمًا ﴾ مصدر موکد ہے۔ امام نے کہا ہے کہ صلاۃ کی تاکید نہیں کی گئی، اس لیے کہ وہ تو ﴿ اِنَّ اللّٰهَ ... الآیة ﴾ سے مؤکد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ احتباک کے باب سے ہے۔ چنانچہ ایک جملے سے تو کلمہ ﴿ عَلَيْهِ ﴾ حذف کیا گیا۔اور دوسرے جملے سے مصدر۔ بعض فضلاء نے کہا ہے کہ کسی نے ان سے خواب میں پوچھا کہ سلام کو مومنین کے ساتھ کیوں خاص کیا اور اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے ساتھ اس کا ذکر نہ کیا؟ صرف اتنا کہا اور اس کا کوئی جواب ذکر نہیں کیا۔ امام شہاب خفاجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک نکتہ اس میں ظاہر ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ سلام سے مراد ان کو اس شے سے سالم رکھنا ہے جو ان کو ایذا دے۔ پھر جب یہ آیت اس بات کا ذکر کرنے کے بعد آئی جو نبی ﷺ کو اذیت دیتی ہے اور اذیت جو ہوتی ہے تو بشر ہی سے ہوتی ہے تو سلام کی تخصیص اور اس کی تاکید بشر کے ساتھ مناسب ہوئی اور اس کی طرف اس شے کے ساتھ اشارہ ہے جو اس کے بعد مذکور ہوئی ہے۔[3]

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٩٧) [2] الدر المنثور (٦/ ٦٤٦) [3] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٨٣)

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر صلاۃ وسلام مطلقاً واجب ہے، یعنی تکرار کو واجب کیے بغیر۔[1] امام قسطلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے مسالک الحنفاء میں دو قول پر صلاۃ علی النبی ﷺ کی مشروعیت میں اختلاف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مستحب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ واجب ہے قولِ ثانی کی بنا پر۔ کسی نے کہا ہے کہ نماز کے آخری تشہد میں واجب ہے اور اس پر امام شافعی رحمہ اللہ ہیں اور یہی قول امام احمد رحمہ اللہ کی روایات میں سے ایک ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نماز میں واجب ہے، اس کے بغیر کہ نماز میں اس کے لیے کوئی مقام مقرر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ نماز کے باہر واجب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس وقت واجب ہے جب آپ ﷺ کا ذکر کیا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر مجلس میں ایک بار واجب ہے، گو اس میں بار بار آپ ﷺ کا ذکرِ خیر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ عمر بھر میں ایک بار واجب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فی الجملہ واجب ہے بغیر حصر کے۔ کسی نے کہا ہے کہ کوئی عدد مقرر کیے بغیر کثرت سے صلاۃ کرنا واجب ہے۔ انتھٰی.

غرضیکہ صلاۃ میں اہلِ علم کا، ان کے اس بات پر اتفاق کے بعد کہ عمر بھر میں ایک بار فرض ہے، اختلاف ہے کہ واجب ہے یا مستحب۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس اجماع کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ اہلِ علم کی ایک قوم نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے ذکر شریف کے وقت واجب اور ایک قوم نے کہا ہے کہ ہر مجلس میں ایک بار واجب ہے۔[2] حدیثوں میں اس شخص کی مذمت کی تصریح آئی ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کا ذکر سنا، پھر اس نے آپ ﷺ پر درود نہ پڑھا۔

علماء نے صلاۃ علی النبی ﷺ میں اختلاف کیا ہے کہ فرض نماز کے تشہد میں واجب ہے یا نہیں۔ چنانچہ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ اس میں سنتِ مؤکدہ ہے، واجب نہیں ہے۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے کہا: مستحب یہ ہے کہ کوئی سی نماز ہو، مگر اس میں رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے، پھر اگر کسی تارک نے اس کو ترک کیا تو نماز اس کی مجزی ہے۔ یہ امام مالک، اہلِ مدینہ، سفیان ثوری اور اہلِ کوفہ کے اہل رائے وغیرہم کا مذہب ہے اور یہ قول جمہور اہلِ علم کا بھی ہے۔ اور امام شافعی علاحدہ ہوئے تو انھوں نے اس کے تارک پر نماز کا دہرانا واجب کیا مع تعمد اس کے ترک کے بدون نسیان، یعنی اگر قصداً جان بوجھ کر ترک کیا ہے تو نماز کا دہرانا واجب ہے اور اگر بھول کر ترک کیا ہے تو کچھ نہیں۔

اس قول کو امام شافعی رحمہ اللہ سے صرف حرملہ بن یحییٰ نے روایت کیا ہے۔ اسی کی روایت سے یہ قول ان سے پایا جاتا ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ علم میں سے سوائے امام شافعی رحمہ اللہ کے کوئی اس کا قائل نہیں ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا اور یہ شافعیہ میں سے ہیں کہ صلاۃ نماز میں واجب نہیں ہے۔ کہا: اور یہ قول ہے فقہاء کی جماعت کا سوائے امام شافعی رحمہ اللہ کے اور میں اُن کے لیے اس باب میں کوئی پیشوا نہیں جانتا ہوں۔ انتھٰی

امام خطابی رحمہ اللہ تو یہ فرماتے ہیں اور حال یہ ہے کہ اہلِ علم کی ایک جماعت امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کی قائل

---

[1] تفسیر أبي السعود (٧/ ١١٤) [2] تفسیر القرطبي (١٤/ ٢٣١۔ ٢٣٢)

ہے، ان میں سے شعبی ہیں اور امام باقر اور امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ اور اخیر کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی اس طرف گئے ہیں، چنانچہ امام ابو زرعہ دمشقی رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے اور امام ابن راہویہ بھی اس کے قائل ہیں اور ابن المواز مالکیہ میں سے۔[1]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اس مسئلے میں ایک مستقل رسالہ جمع کیا ہے۔ اس میں وجوب والوں کے دلائل اور جمہور کے جواب ذکر کیے ہیں اور "نيل الأوطار شرح منتقى الأخبار" میں بھی "ما يكفي و يشفي" اس پر بحث کی ہے۔ سیدنا ابو الوفاء الصدیق رحمہ اللہ نے "هداية السائل" میں اس مسئلے کو خوب تفصیل سے تحریر فرمایا ہے۔ انتہا درجے کی دلیل جس سے صلاۃ کے وجوب پر استدلال کرتے ہیں وہ یہ حدیث شریف ہے جو ان الفاظ کے ساتھ ثابت ہے: «إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَنَا أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ فَكَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ فِيْ صَلَاتِنَا؟ قَالَ: قُوْلُوْا»[2] (الحديث) کیوں کہ یہ امر اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس سے وجوب پر استدلال کیا جائے۔ رہا اس کے ترک کر دینے سے نماز کا باطل ہو جانا اور اس کے دہرانے کا واجب ہونا تو اس پر اس حدیث سے استدلال نہیں ہو سکتا ہے، اس لیے کہ واجبات کا عدم اس کے عدم کو لازم قرار نہیں دیتا، جس طرح کہ شروط اور ارکان اس کی مستلزم ہوتی ہیں۔ جاننا چاہیے کہ درود شریف کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، اگر وہ جمع کی جائیں تو ایک مستقل کتاب میں آئیں۔ اگر ان میں سے نہ ہوں مگر یہی حدیثیں جو صحیح میں ثابت ہیں، مثلاً: «مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا»[3] تو صرف یہی فضیلتِ جلیل و مکرمتِ نبیل کافی، وافی اور شافی ہے۔

رہی صفت صلاۃ کی تو اس میں بہت سی صفات وارد ہوئی ہیں، ان کی حدیثیں صحیحین وغیرہما میں ثابت ہیں، ان میں سے بعض وہ ہیں جو نماز میں صفتِ صلاۃ کو مقید ہیں اور بعض مطلق ہیں، یہ سب صیغے درود شریف کے کتبِ حدیث میں معروف ہیں۔ درود و سلام کا مطلق امر جو آیتِ کریمہ میں ہے اس کا امتثال جس درود شریف سے حاصل ہوتا ہے، وہ صرف اسی قدر ہے کہ کہنے والا یوں کہے: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى رَسُوْلِكَ" یا "عَلٰى مُحَمَّدٍ" یا "عَلَى النَّبِيِّ أَيْ: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّسَلِّمْ" اور اگر کوئی یہ چاہے کہ جن صیغوں کی تعلیم وارد ہوئی ہے اور نبی اکرم ﷺ نے ان کا ارشاد فرمایا ہے، ان میں سے کسی صفت اور صیغے کے ساتھ آپ پر درود و سلام بھیجے تو یہ اکمل اور افضل ہے۔ یہ صفات بہت سے ہیں، کتبِ سنتِ مطہرہ ان پر مشتمل ہیں، چنانچہ کچھ پہلے گزر چکے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ اس آیتِ کریمہ میں جو صلاۃ و تسلیم کا امر فرمایا ہے تو اس کا ظاہر یہ ہے کہ قائل اس طرح کہے: "صَلَّيْتُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ" یا "اَلصَّلَاةُ عَلَيْهِ وَعَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالتَّسْلِيْمُ" کیوں کہ اللہ پاک نے

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٣٤۔ ٢٣٥) فتح القدير (٤/ ٣٩٧)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

ہم کو ان پر ایقاعِ صلاۃ کا امر فرمایا ہے ہم سے۔ چنانچہ اس امر کی اطاعت اس طرح ہو گی جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جو ان پر درود و سلام بھیجنے کا امر کیا ہے کہ ہم ان پر درود و سلام بھیجیں تو اس کے مقابلے میں اس امر کی اطاعت اس طرح کیسے ہو گی کہ ہم اس طرح کہیں کہ "اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ"؟ اس شبہے کا یوں جواب دیا ہے کہ یہ صلاۃ و تسلیم، چوں کہ نبی اکرم ﷺ کے لیے ایک شعارِ عظیم تھا اور ایک تشریفِ کریم تو ہم نے اس کو اللہ عزوجل کے سپرد کیا اور اسی کی طرف اس کو راجع کیا۔

یہ جواب نہایت ضعیف ہے، بہترین جواب یہ ہے کہ یوں کہیں کہ صلاۃ و تسلیم جن کا اس آیت میں امر کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں کہ ہم یوں کہیں: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ وَسَلِّمْ" یا اس جیسے اور لفظ جو اس کے معنی ادا کر سکیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ یہ بیان جو بہت سی حدیثوں میں ہے، اس بات کا مقتضا ہے کہ صلاۃِ شرعی یہی ہے۔ جاننا چاہیے کہ یہ صلاۃ اللہ کی طرف سے اپنے رسول پر ہے، گو اس کے معنی رحمت کے ہیں۔ چنانچہ یہ البتہ آپ ﷺ کے واسطے ایک شعار ہو گئی، آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہو گئی، آپ ﷺ کے غیر کے علاوہ، اس لیے ہم کو جائز نہیں کہ آپ ﷺ کی امت میں سے کسی اور پر درود بھیجیں، جس طرح کہ ہم کو جائز ہے کہ ہم اس طرح کہیں: "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ فُلَانًا" یا "رَحِمَ اللّٰهُ فُلَانًا"۔ علماء میں سے جمہور اسی کے قائل ہیں، باوجود ان کے اختلاف کے کہ آپ ﷺ کے غیر پر درود بھیجنا حرام ہے، یا مکروہ بکراہتِ شدید یا مکروہ بکراہتِ تنزیہی۔ اس بارے میں یہ تین قول ہیں: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے امام ابن ابی شیبہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے شعب میں روایت کیا ہے کہ صلاۃ صلاحیت نہیں رکھتی ہے کسی پر مگر نبی کریم ﷺ پر، لیکن مسلمین اور مسلمات کے لیے استغفار کے ساتھ دعا کی جائے۔[1] مواہب میں کہا ہے کہ یہ بات منقول نہیں ہوئی کہ اگلی امتوں پر یہ واجب تھا کہ اپنے نبیوں پر درود بھیجیں۔[2] انتہیٰ۔

انموذج میں کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے خواص میں سے یہ ہے کہ قرآن میں اور غیر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کے غیر پر کوئی صلاۃ نہیں۔ چنانچہ صلاۃ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اللہ پاک نے اس کے ساتھ صرف نبی اکرم ﷺ کو باقی انبیاء کے سوا اس کے ساتھ مختص فرمایا ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ جائز ہے، اس قوم کے دلائل پہلے گزر چکے ہیں۔ جمہور کی طرف سے ان کا جواب یہ ہے کہ یہ شعار جو رسول اللہ ﷺ کے لیے ثابت ہے، آپ ﷺ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ آپ ﷺ اس کے ساتھ جس کو چاہیں خاص فرمائیں۔ ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور پر اس کا اطلاق کریں۔

رہا اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ٤٣] "وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی (رحمت کی دعا کرتے

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٦٥٦) [2] المواهب اللدنية (٢/ ٣٤٤)

ہیں) تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے اور اللہ مومنوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔'' نیز یہ فرمان: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۗ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۱۵۷] ''یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کی طرف سے بخشش اور رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔'' تو اس میں صرف یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں میں سے کئی گروہ پر درود بھیجتا ہے جس طرح کہ دس درود بھیجتا ہے اس شخص پر جو اس کے رسول پر ایک بار درود بھیجتا ہے، اس میں ہم کو امر نہیں کیا اور نہ ہی اس کو ہمارے لیے مشروع فرمایا ہے، بلکہ ہمارے لیے جو مشروع کیا ہے وہ اپنے رسول پر صلاۃ وتسلیم ہے۔ اور جس طرح صلاۃ کا لفظ رسول اللہ ﷺ کے لیے شعار ہے، اسی طرح سلام کا لفظ ہے۔

اس امتِ مرحومہ کے جمہور وسوادِ اعظم کے سلف وخلف سے اس بات پر عادت جاری ہوئی ہے کہ صحابہ کے لیے -رضي الله عنهم- کہتے ہیں اور ان کے بعد کے لوگوں پر رحمت بھیجتے ہیں "رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ" یا "رَحِمَهُمُ اللّٰهُ" بولتے ہیں اور اللہ پاک کی مغفرت وعفو کی ان کے لیے دعا مانگتے ہیں جس طرح کہ اپنے اس قول سے ہم کو اس کی راہ بتائی ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الحشر: ۱۰] ''اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئیں جو کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ایمان داروں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (اور دشمنی) نہ ڈال۔ اے ہمارے رب! بے شک تو شفقت ومہربانی کرنے والا ہے۔'' اور جو تعلیمات نبی اکرم ﷺ سے آپ ﷺ پر درود بھیجنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، وہ سب آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کی آل پر درود بھیجنے پر مشتمل ہیں، مگر نادر ویسیر حدیثیں۔ چنانچہ آپ ﷺ پر درود بھیجنے والے کو چاہیے کہ آپ ﷺ کی آل کو درود میں آپ ﷺ کے ساتھ ملا لے۔ ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ امام الحرمین اور امام غزالی رحمہ اللہ نے اس کو امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک قول نقل کیا ہے۔

(كما رواه عنهما الحافظ ابن كثير في تفسيره كما تقدم)

ایسی بات میں کسی قائل کے قول کو پکڑنے کی کوئی حاجت نہیں ہے، باوجود اس کے کہ صحیح حدیثیں اس کی تصریح کر رہی ہیں۔ جس شخص نے یہ کہا کہ یہ تعلیمات جو نبی اکرم ﷺ سے وارد ہوئی ہیں، صفتِ صلاۃ میں مقید ہیں، اس درود کے ساتھ جو نماز میں ہے تو یہ قول بے وجہ ہے، کیوں کہ جو حدیثیں مطلق ہیں ان کو ان حدیثوں پر محمول کریں گے جو اُن میں سے اس قید کے ساتھ مقید ہیں، اس لیے کہ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی حدیث میں ہے کہ وہ سوال رسول اللہ ﷺ سے آیت کے نزول کے وقت تھا۔[1] پھر جب اللہ پاک نے اس تعظیم کا ذکر کیا جو اس کے

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے لیے واجب ہے تو جو لوگ ان کو ایذا دیتے ہیں، ان کے لیے وعید شدید ذکر فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ ... الآیة ﴾

کہا ہے کہ اس جگہ ایذا سے مراد معاصی کا کرنا ہے جس کو اللہ اور رسول اللہ ﷺ ناپسند کرتے ہیں، تاکہ یہ قدر عام ہو جائے رسول اللہ ﷺ کے حق میں حقیقی ایذا کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے حق میں مجازی ایذا کے لیے، اس لیے کہ اللہ پاک کو حقیقی ایذا دینا ممکن نہیں ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: مفسرین نے کہا ہے کہ یہ لوگ مشرکین اور یہود و نصاریٰ ہیں۔ اللہ پاک کے لیے اولاد بتائی، کہا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے اور مسیح علیہ السلام اللہ کے فرزند ہیں اور فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اللہ کے رسول کی تکذیب کی، ان کے چہرۂ مبارک کو زخمی کیا، ان کے دانت توڑے اور کہا کہ مجنون، شاعر، کذاب اور ساحر ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: اور اسی کے قائل جمہور علماء ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ پاک کو ایذا دینا ہے تصویر کے ساتھ اور اس شے کے تعرض کرنے کے ساتھ کہ جس کو صرف اللہ ہی کرتا ہے، مثلاً: صورتیں تراشنا۔[2] ایک جماعت نے کہا ہے کہ آیت محمول ہے حذفِ مضاف پر۔ تقدیر یہ ہے: "اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ" یعنی جو اللہ کے دوستوں کو ایذا دیتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اذیت کے معنی اللہ پاک کے اسما و صفات میں الحاد ہے۔ رہی اس کے رسول ﷺ کی اذیت تو وہ اقوال و افعال میں سے ہر وہ شے ہے جو ان کو ایذا دیتی ہے۔

لعنت کے معنی ہیں اللہ پاک کی رحمت سے ان کو ہنکا لے جانا اور دور کرنا۔ اس لعنت کو دنیا اور آخرت سے ٹھہرایا، تاکہ ان کو لعنت دونوں جہان میں اس طرح پر شامل ہو کہ ان کے جینے اور مرنے کے اوقات میں سے کوئی ایسا وقت باقی نہ رہے، جس میں ان پر لعنت واقع نہ ہو، یعنی لعنت ان کے ساتھ لگی رہے اور باوجود ایسی لعنت کے ان کے لیے عذابِ مہین تیار کر رکھا ہے کہ جس کے سبب سے دارِ آخرت میں وہ ذلت اور اہانت میں ہو جائیں گے، اس لیے کہ اعداد کے معنی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ عذاب دارِ آخرت میں ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یہ مروی ہے کہ یہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت لگائی تھی۔[3]

پھر جب اللہ پاک ان لوگوں کی مذمت سے فارغ ہوا جنھوں نے اللہ کو اور اس کے رسول کو ایذا دی تو عبادِ صالحین کو ایذا دینے والوں کا ذکر کیا، چنانچہ فرمایا: اور وہ لوگ جو مومنین اور مومنات کو کسی وجہ سے ایذا دیتے ہیں قول سے یا فعل سے بغیر کسی سبب کے جو انھوں نے کیا ہو اور ان پر اذیت کو واجب کریں اور اس کی وجہ سے اس کے مستحق ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ یُؤْذُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کی غیبت کرتے ہیں اور بغیر جرم کے ان کو تہمت لگاتے ہیں۔

رہا مومن اور مومنہ کو اس فعل کے سبب سے ایذا دینا جو انھوں نے کیا ہے، ایسا قول جو ان پر حد یا تعزیر یا اس

---

[1] فتح القدير (٤/ ٣٩٩) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٣٦۔ ٢٣٧) [3] الدر المنثور (٦/ ٦٥٦)

قسم کی سزا کو واجب کرتا ہے تو یہ ایک ایسا حق ہے جس کو شرع نے ثابت کیا ہے اور ایک امر ہے جس کا اللہ نے ہم کو حکم کیا ہے اور اس کی طرف بلایا ہے۔ اسی طرح جب مومنین و مومنات سے ابتدا واقع ہو، کسی مومن یا مومنہ کو گالی دینے کی یا مارنے کی تو فاعل سے قصاص لینا وہ اذیت نہیں، جو حرام کی گئی ہے، کسی بھی وجہ پر ہو، جب تک کہ اس شے سے تجاوز نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے مشروع فرمائی ہے۔

پھر جو ان ایذا دینے والوں کے لیے معصیت و گناہ ہے، اللہ پاک نے اس کی خبر دی۔ فرمایا: یقیناً انھوں نے ایسا بہتان اور واضح و ظاہر گناہ اٹھایا جس کے بہتان اور اثم ہونے میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے۔ بہتان اور اثم کی حقیقت کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لوگ ان کو ایذا دیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں اتری ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ زانیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ مدینہ منورہ کے راستوں میں چلتے عورتوں کے پیچھے پڑتے اور وہ ناخوش ہوتی تھیں۔ فضیل رحمہ اللہ سے مروی ہے: تجھے حلال نہیں کہ تو بغیر حق کے کسی کتے کو ایذا دے یا کسی سور کو، پھر مومنوں اور مومنات کو ستانا کیسے حلال ہوگا![1] جب اللہ پاک نے مومنین اور مومنات کو ایذا دینے والوں کا حال بیان کیا اور ایذا دینے پر ان کو زجر و توبیخ کی تو اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ایذا پانے والی عورتوں کو اس بات کا حکم دیں جو فی الجملہ ان کی ایذا کو دور کرے۔ ایذا کے مواقع سے تستر و تمیز اس قدر اختیار کریں کہ ایذا دینے والے لوگ ان کو ایذا دینے سے باز رہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں، یہ (بات اس کے) زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انھیں ایذا

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٣١٥) [2] فتح البيان (١١/ ١٣٤۔ ١٤٢)

نہ پہنچائی جائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (59) اگر منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے اور مدینے میں جھوٹی افواہیں اُڑانے والے باز نہ آئے تو ہم ضرور آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے، پھر وہ آپ کے پاس اس (مدینے) میں تھوڑی مدت ہی رہ سکیں گے (60) وہ ملعون و مردود ہیں، جہاں بھی وہ پائے جائیں پکڑ لیے جائیں گے اور بُری طرح قتل کر دیے جائیں گے (61) ان لوگوں میں بھی جو پہلے گزر چکے ہیں اللہ کا یہی طریقہ رہا ہے، اور آپ اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے (62)

پردے کا حکم:

شناخت ہو جایا کرے گی، یعنی پہچانی جائیں گی کہ لونڈی نہیں بی بی ہیں۔ صاحبِ ناموس ہیں یا بد ذات نہیں، نیک بخت ہے تو بدنیت لوگ اس سے نہ اُلجھیں، گھونگھٹ اس کا نشان رکھا، یہ حکم بہتری کا ہے۔ آگے فرمایا: اللہ بخشنے والا مہربان ہے، جو لوگ بدنیت تھے، مدینے میں عورتوں کو چھیڑتے ٹوکتے اور جھوٹی خبریں اڑاتے، مخالفوں کے غلبے کی اور مسلمانوں کے مغلوب ہونے کی، ان کو یہ فرمایا کہ تورات میں یہی تقید ہے کہ مفسدوں کو اپنے اندر سے باہر کر دو۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کو حکم فرماتا ہے کہ وہ مومن عورتوں کو خاص کر اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو اس بات کا حکم کریں کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کو تھوڑا سا لٹکا لیں، تاکہ جاہلیت کی عورتوں اور لونڈیوں کی علامت سے جدا ہو جائیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام عبیدہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، عطاء خراسانی اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے: "اَلْجِلْبَابُ هُوَ الرِّدَاءُ فَوْقَ الْخِمَارِ"[1] یعنی جلباب سے مراد اوڑھنی کے اوپر کی چادر ہے اور وہ اس وقت بہ منزلہ ازار کے ہے، ("جلباب": بالکسر چادر و ازار و مئزر شلوار و مانند آں مثل لحاف و ملحف "يذكر و يؤنث إزارة كذلك" و ملحفہ بالکسر چادر۔ التحاف جامہ در خود پیچیدن۔ كذا في الصراح) امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جلباب ملحفہ ہے۔ قبیلۂ ہذیل کی ایک عورت نے اپنے کسی مقتول کے مرثیہ میں کہا ہے:

تَمْشِي النُّسُوْرُ إِلَيْهِ وَهِيَ لَاهِيَةٌ مَشْيَ الْعَذَارِيْ عَلَيْهِنَّ الْجَلَابِيْبُ[2]

یعنی چلتی ہیں گدھ اس مقتول کی طرف اس حال میں کہ وہ کھیل رہی ہیں چلنا کنواری عورتوں کا جن پر چادریں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ گدھ آہستہ آہستہ اس کی طرف ایسے آ رہی ہیں جیسے کنواری عورتیں چادریں اوڑھے آ رہی ہیں۔

علی بن ابی طلحہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی عورتوں کو حکم فرمایا ہے کہ جب وہ اپنے گھروں سے نکلیں کسی حاجت میں تو اپنے چہروں کو اپنے سروں کے اوپر سے چادروں کے ساتھ ڈھانک لیں اور

---

(1) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٧٩) (2) الصحاح للجوهري (٢/ ١١٥)

ایک آنکھ کھول دیں۔ محمد بن سیرین رئیس المعبرین فرماتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سلمانی سے آیتِ مذکور کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اپنا چہرہ اور سر ڈھانک لیا اور اپنی بائیں آنکھ ظاہر کر دی۔[1]

امام عکرمہ نے کہا ہے کہ ”تُغَطِّي ثُغْرَةَ نَحْرِهَا بِجِلْبَابِهَا تُدْنِيهِ عَلَيْهَا“ یعنی اپنی ہنسلی کی ہڈی کو ڈھانک لے اپنی چادر سے، چادر کو اس پر نیچے لٹکا لے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جس وقت یہ آیت اتری تو انصار کی عورتیں نکلیں اس حال میں کہ گویا ان کے سروں پر کوے ہیں سکینہ سے اور ان پر کالی کملیاں تھیں، جن کو وہ پہنے ہوئے تھیں۔ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: ”كان على رؤسهن الغربان من السكينة و عليهن أكسية سود يلبسنها“ غرض اس سے یہ ہے کہ کالی کملیوں کی اوڑھنیاں اوڑھے ہوئے تھیں تو ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے ان کے سروں پر کوے بیٹھے ہوئے ہیں اور آہستہ آہستہ سکینہ اور وقار سے چلتی تھیں، گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں کہ اڑ نہ جائیں، پس اس میں دو امر کی تشبیہ ہے)۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یونس بن یزید سے روایت کیا ہے کہ ہم نے زہری سے پوچھا کہ آیا لونڈی پر اوڑھنی ہے بیاہی ہوئی ہو یا بیاہی ہوئی نہ ہو؟ تو کہا کہ اس پر اوڑھنی ہے اگر وہ بیاہی ہو اور جلباب سے منع کی جائے، کیوں کہ لونڈیاں کے لیے یہ مکروہ ہے کہ آزاد بیاہی ہوئی عورتوں کے مشابہ بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوٰجِكَ ...الآية ﴾[2] امام سفیان ثوری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اہلِ ذمہ کی عورتوں کی زینت کی طرف نظر کرنے کا کچھ ڈر نہیں ہے، اس سے جو نہی کی گئی ہے تو بہ سبب خوف فتنہ کے، نہ بسبب ان کی حرمت کے۔ قولہ تعالیٰ ﴿ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ سے اس پر استدلال کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جب وہ یہ کریں گی تو پہچانی جائیں گی کہ وہ آزاد بیبیاں ہیں، لونڈیاں نہیں ہیں اور نہ زانی بدکار عورتیں ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوٰجِكَ ...الآية ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اہلِ مدینہ کے فاسقوں میں سے کچھ لوگ تھے، رات کو نکلتے جب کہ خوب تاریکی ہو جاتی، وہ راہِ مدینہ کی طرف جاتے تو عورتوں کو چھیڑتے تھے۔ مدینے والوں کے گھر تنگ تھے، جب رات ہوتی تو عورتیں راہوں کی طرف نکلتیں کہ اپنی قضائے حاجت کریں تو وہ فاسق لوگ ان سے وہ چاہتے، پھر جب وہ دیکھتے عورت کو کہ اس پر چادر ہے تو کہتے کہ یہ آزاد ہے، پھر اس سے باز رہتے اور جب عورت کو دیکھتے کہ اس پر چادر نہیں ہے تو کہتے یہ لونڈی ہے، پھر اس پر دوڑ پڑتے۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: چادر اوڑھیں تو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ آزاد عورتیں ہیں، پھر کوئی فاسق ایذا اور تہمت کے ساتھ ان سے تعرض نہ کرے، یعنی سامنے نہ آئے۔[4] قولہ تعالیٰ:

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٢٤_ ٣٢٥)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٤)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٥)
[4] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٢٥)

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو کچھ گزر چکا ہے اللہ پاک اس کا بخشنے والا ہے، کیوں کہ اس وقت ان کے پاس اس کا کچھ علم نہ تھا۔

شر پسند منافقوں کی سرزنش:

پھر اللہ پاک نے منافقوں کو وعید سنائی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان کو ظاہر کرتے ہیں اور کفر کو چھپاتے ہیں۔ اور ان کو جن کے دلوں روگ ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: یہ لوگ اس جگہ زانی ہیں۔[1] ﴿ وَالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ ﴾ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ دشمن آ گئے اور لڑائیاں آ گئیں، حالاں کہ یہ بات جھوٹی اور افتراء ہوتی ہے۔ ایسی جھوٹی خبریں اڑانے سے ان کی غرض صرف مسلمانوں کو خوفناک کرنا ہے۔ وہ وعید یہ ہے کہ اگر وہ اس سے باز نہ رہیں گے اور حق کی طرف رجوع نہ کریں گے تو: ﴿ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ﴾ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "أَيْ: لَنُسَلِّطَنَّكَ عَلَيْهِمْ" یعنی ہم تجھ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "لَنُحَرِّشَنَّكَ بِهِمْ"[2] یعنی تجھ کو ان پر بھڑکائیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "لَنُعْلِمَنَّكَ بِهِمْ"[3] ﴿ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴾ یعنی پھر وہ نہ رہنے پائیں گے تیرے ساتھ مدینے میں مگر ایک تھوڑی مدت اور اس حال میں کہ جتنی دیر مدینہ میں رہیں گے تو راندے ہوئے اور دور کیے ہوئے رہیں گے، یعنی دور کیے گئے اور پھٹکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے مارے گئے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ﴾ یعنی یہ اللہ سبحانہ کا منافقوں کے بارے میں طریقہ پہلے بھی رہا ہے کہ جس وقت انھوں نے اپنے نفاق اور کفر پر تمرد کیا اور اس حال سے باز نہ آئے جس میں وہ ہیں تو ایمان والے ان پر مسلط کیے جاتے ہیں اور ان کو مغلوب و مقہور کرتے ہیں۔ ﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ یعنی اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے طریقے میں تبدیلی نہیں کی جاتی۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع وضاحت کے یہ ہے کہ "جَلَابِيْبُ"، جمع ہے "جِلْبَابٌ" بالکسر کی۔ جلباب ایک کپڑا ہے خمار سے، یعنی اوڑھنی سے بڑا، یعنی "مُلَاءَةٌ"، (مجمع البحار میں کہا ہے کہ مَلاءۃ ازار اور چادر کو کہتے ہیں اور قناع بڑا ہوتا ہے مقنعہ سے۔ صراح میں ہے کہ ملاءہ بالضم چادر و مقنع و مقنعہ بالکسر بر سر افگندگی زنان و قناع پردہ و پوشش کہ بر بالائے مقنعہ باشد تقنیع مقنع بر افگندن و تقنع لازم منہ) جس کو عورت اوڑھتی ہے کرتے اور اوڑھنی کے اوپر۔ امام شہاب

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٢٦۔ ٣٢٧)
[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٢٨)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٦)
[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٧٨۔ ٦٨٠)

نے کہا: ایک ازار واسع ہے جس کو اوڑھتی ہیں۔ کسی نے کہا: قناع ہے۔ کسی نے کہا: ہر وہ کپڑا ہے جو عورت کے سارے بدن کو چھپا لیتا ہے، کساء وغیرہ، یعنی چادر ہو[1] یا کملی یا اور کوئی کپڑا، جس طرح کہ صحیح میں اُم عطیہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہوا ہے کہ انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم میں سے کسی کے پاس جلباب نہیں ہوتی تو فرمایا کہ چاہیے کہ اس کو اس کی بہن اپنی جلباب میں سے پہنا لے۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ جلباب ایک ایسا فراخ کپڑا ہے کہ عورت کے سارے بدن کو چھپا لیتا ہے اور اس میں اتنی گنجایش ہوتی ہے کہ دوسری عورت کو بھی اس میں چھپا سکتی ہے۔

امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین کہتے ہیں کہ ڈھانک لیں اپنے چہروں کو اور سروں کو مگر ایک آنکھ، تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ آزاد عورتیں ہیں، پھر ان کو کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہ ہو۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: اپنے آدھے چہرے کو ڈھانک لے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "تَلْوِيْهِ فَوْقَ الْجَبِيْنِ وَتَشُدُّهُ ثُمَّ تَعْطِفُهُ عَلَى الْأَنْفِ وَإِنْ ظَهَرَتْ عَيْنَاهَا لٰكِنَّهُ يَسْتُرُ الصَّدْرَ وَمُعْظَمَ الْوَجْهِ"[3] یعنی موڑ لے چادر کو جبین کے اوپر اور اس کو مضبوط کسے، پھر اس کو ناک پر موڑے، گو اس کی دونوں آنکھیں کھل جائیں، لیکن وہ چھپا لے سینے کو اور چہرے کے بڑے حصے کو۔ (جبین پیشانی کی ایک جانب کو کہتے ہیں۔ پیشانی کی دائیں بائیں جانب کو جبین کہتے ہیں: پیشانی میں دو جبین ہیں۔ جبین کنپٹی کے اوپر ہوتی ہے)۔ مُبرّد نے کہا: "يُرْخِيْنَهَا عَلَيْهِنَّ وَيُغَطِّيْنَ بِهَا وُجُوْهَهُنَّ وَأَعْطَافَهُنَّ"[4] یعنی لٹکا لیں چادروں کو اپنے اوپر اور ان سے اپنے چہرے ڈھانک لیں اور اپنی جانبین کو ڈھانک لیں۔

کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کے لیے ہے، یعنی اپنی چادر کا کچھ حصہ لٹکا لے اور اس کا فضل، یعنی پلو اپنے چہرے پر مقنع ڈال لے، یعنی گھونگھٹ کر لے، تاکہ لونڈی سے متمیز، یعنی علاحدہ ہو جائے۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ادنائے جلابیب کی طرف ہے اور مبتدا ہے، ﴿ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ ﴾ اس کی خبر ہے، یعنی یہ چادروں کا لٹکانا اس بات کے قریب تر ہے کہ وہ پہچانی جائیں تو لونڈیوں سے متمیز ہو جائیں اور لوگوں پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ وہ آزاد عورتیں ہیں۔ ﴿ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ تو شک و تہمت والوں کی طرف سے ایذا نہ دی جائیں اس طرح کہ ان کا اور ان کے گھر والوں کا پاس اور لحاظ کر کے ان سے تعرض نہ کریں اور ان کو نہ چھیڑیں۔

﴿ يُعْرَفْنَ ﴾ سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان میں سے عورت پہچانی جائے کہ فلاں عورت ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ پہچانی جائیں کہ آزاد عورتیں ہیں لونڈیاں نہیں ہیں، کیوں کہ انھوں نے وہ پہناوا پہنا ہے جو آزاد بیبیوں کے ساتھ

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٠)

[3] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٤٢) فتح القدير (٤/ ٤٠٢) [4] تفسير النسفي (٣/ ٣١٥)

خاص ہے۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ یعنی اس حکم سے پہلے جو چادروں کا نہ لٹکانا ان سے گزر چکا ہے تو اللہ پاک اس کو بخشنے والا ہے اور ان پر مہربان ہے (اس طور پر کہ ان کو آدابِ مکارم کی تعلیم کرتا ہے اور اُن کے مصالح کی مراعات فرماتا ہے، یہاں تک کہ ان میں سے جز ئیات کی بھی رعایت کرتا ہے۔[1] كذا قال النسفي وغيره) یا یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک گناہ گاروں کے گناہوں کا بخشنے والا ہے اور ان پر مہربان ہے، چنانچہ یہ عورتیں اس میں بدخولِ اولیٰ داخل ہوں گی۔

بخاری و مسلم وغیرہما نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا ہے کہ پردہ مقرر ہونے کے بعد سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا اپنی حاجت کے لیے نکلیں اور یہ جسیم بی بی تھیں، جو کوئی ان کو پہچانتا تھا اس پر مخفی نہیں ہوتی تھیں۔ ان کو عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا اور کہا: سودہ خبردار! واللہ! تم ہم پر مخفی نہیں رہتی ہو، لہٰذا تم نظر کرو کہ کیسے نکلتی ہو۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر وہ ویسے ہی لوٹ آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے اور بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت شام کا کھانا تناول فرما رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں ہڈی تھی تو وہ اندر آئیں اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں تو اپنی بعض حاجت کے لیے نکلی تھی تو عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے ایسا ایسا کہا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک حالت یہ ہے کہ بتحقیق تمھیں اس بات کی اجازت دی گئی کہ تم اپنی کسی حاجت کے لیے نکل سکتی ہو۔[2]

ابو مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اپنی حاجت کے لیے رات کو نکلا کرتی تھیں اور منافقوں میں سے کچھ لوگ ان سے تعرض کرتے تھے تو وہ ایذا دی جاتی تھیں۔ منافقوں سے اس کا پوچھا گیا تو وہ بولے کہ ہم تو یہ لونڈیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ... الآية ﴾[3] امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ منافقوں میں سے ایک شخص مومنین کی بیویوں سے تعرض کیا کرتا تھا اور ان کو ایذا دیا کرتا تھا، پھر جب اس سے کہا جاتا تو کہتا کہ میں تو اس عورت کو لونڈی سمجھتا تھا۔ اس پر اللہ پاک نے ان کو حکم دیا کہ لونڈیوں کے پہناوے کی مخالفت کریں اور اپنے اوپر اپنی چادروں کو لٹکا لیں اور اپنے چہرے کو ڈھانک لیں، مگر ایک آنکھ کی جگہ کھلی رکھیں۔ ﴿ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ فرماتا ہے کہ یہ لائق تر ہے اس کے کہ پہچانی جائیں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ذکر کی۔

کلمۂ "مِنَ السَّكِيْنَةِ" کے بارے میں کہا ہے کہ روایت میں اسی طرح "مِنَ السَّكِيْنَةِ" کے الفاظ ہیں اور اس کے کچھ معنی نہیں ہیں، اس لیے کہ مراد تو تشبیہ ہے سیاہ کملیوں کی کووں کے ساتھ۔ اس سے سکینت کے ساتھ ان کا وصف کرنا نہیں جس طرح کہتے ہیں، گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں۔ فتح البیان میں فتح القدیر کی طرح ایسے ہی ہے،[5] لیکن کاتب الحروف ۔عفا الله عنه۔ عرض کرتا ہے کہ علامہ شوکانی رحمہ اللہ گو ہمارے شیوخ کے شیخ ہیں اور یہ

---

[1] تفسير النسفي (٣/ ٣١٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٠)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٤) [4] الطبقات لابن سعد (٨/ ١٧٦) [5] فتح البيان (١١/ ١٤٥) فتح القدير (٤/ ٤٠٥)

بات جو انھوں نے فرمائی بظاہر اسی طرح ہے، مگر چوں کہ لفظ روایت کا ہے اس کو بے معنی کہہ دینا سوئے ادبی سے خالی نہیں ہے، اس لیے جہاں تک ہو سکے محلِ حسن پر اس کا اتارنا زیادہ مناسب ہے۔ سنیے بے معنی نہیں ہے، بلکہ اعلیٰ درجے کی بلاغت میں واقع ہوا ہے۔

اس سے کون مانع ہے کہ ان کا وصف بہ سکینہ و وقار مراد نہ ہو، بلکہ مسجد کی طرف تو سکون و وقار کے ساتھ آنے کا حکم کیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم لازم پکڑو سکینہ اور وقار کو۔ جب مردوں کو یہ حکم ہے تو عورتیں تو اس کی زیادہ مستحق ہیں۔ پس اُم المومنین اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا مقصد دو امر کو بیان کرنا ہے، ایک تو انصار کی عورتوں کا سکون و وقار کے ساتھ آنا، دوسرا امر یہ ہے کہ کالی کملیاں ان کے سروں پر ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے کوے بیٹھے ہیں۔ کلمۂ غربان اس جگہ نہایت حسین موقع میں واقع ہوا ہے، کیوں کہ اس میں دونوں باتیں موجود ہیں: ایک تو پرندے، دوسرے سیاہ رنگ مثل سیاہ کمبل کے۔ اب ذرا غور سے دیکھو، ان کو دونوں امر کا ادا کرنا مقصود ہے، سکون اور وقار کو تو ''مِنَ السَّکِیْنَۃِ'' کہہ کر ادا کیا، کیوں کہ اگر صرف سیاہی کی تشبیہ مقصود ہوتی تو فقط ''کَاَنَّ عَلٰی رُؤُوْسِهِنَّ الْغِرْبَانَ'' فرما کر سکوت فرماتیں، یعنی ایسے سکون اور وقار کے ساتھ آ رہی تھیں، جیسے ان کے سروں پر کوے بیٹھے ہیں کہ کہیں اڑ نہ جائیں، جس طرح کہ عرب لوگ سکون و وقار کے ادا کرنے میں ''کَاَنَّ عَلٰی رُؤُوْسِهِمُ الطَّیْرَ'' بولتے ہیں۔

اب ''مِنَ السَّکِیْنَۃِ'' کہنے سے دوسری غرض، یعنی سیاہی کی تشبیہ فوت ہوگئی، حالاں کہ اس کا بیان کرنا بھی مقصود ہے، سو اس غرض کے اظہار کے لیے ''وَعَلَیْهِنَّ اَکْسِیَةٌ سُوْدٌ یَلْبَسْنَهَا'' فرما دیا، ورنہ غربان اور سکینہ کے ذکر کے بعد اس کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ضرورت یہی تھی کہ اس تشبیہ سے مراد دونوں امر کا ادا کرنا تھا۔ معنی یہ ہوئے کہ سکون اور وقار کی خاطر ایسی آہستہ آہستہ آ رہی تھیں، جیسے ان کے سروں پر پرندے ہیں کہ کہیں اڑ نہ جائیں اور کالی کملیاں جو انھوں نے ایک خاص طریقے سے اپنے سروں پر ڈالی تھیں، وہ ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے ان پر کوے بیٹھے ہیں۔ اب ذرا انصاف کیجیے کہ ام المومنین نے سکینہ کا لفظ کیسا با معنی فرمایا ہے اور غربان کا کلمہ کیسی تجددِ امثال کی بہار دکھا رہا ہے اور دو مضمون دو تشبیہ کے پیرائے میں باوجود اختصار کے کس بلاغت و دلکشی کو خوبی سے ادا ہو رہے ہیں۔ رضي الله تعالىٰ عنها وأرضاها و نفعنا بها. آمین.

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ انصار کی عورتوں پر رحم کرے، جب آیت کریمہ: ﴿يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ ... الآية﴾ نازل ہوئی تو انھوں نے اپنی صوف کی کملیاں پھاڑیں، پھر ان کے معجر بنا کے اپنے سروں پر ڈالے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، گویا ان کے سروں پر کوے ہیں۔[1] دیکھو اس جگہ مراد صرف ان کی کالی کملیوں کی تشبیہ ہے کووں کے ساتھ اس لیے صرف ''کَاَنَّ عَلٰی رُؤُوْسِهِمُ الْغِرْبَانَ'' کہہ کر سکوت فرمایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

[1] الدر المنثور (٦/ ٦٦٠)

آزاد عورت لونڈی کا لباس پہنا کرتی تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کو یہ حکم دیا کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کو لٹکا لیں۔ ادنائے جلباب یہ ہے کہ مقنع ڈال لے اور اس کو کس کر اپنی جبین پر باندھے۔[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس سے ایک لونڈی نقاب ڈالے ہوئے گزری تو آپ درہ لے کر اس پر چڑھے اور فرمایا: اے لکاع! کیا تو آزاد عورتوں کے مشابہ بنتی ہے۔ قناع کو ڈال دے۔ لکاع ایک کلمہ ہے، جس کو اس شخص کے لیے بولتے ہیں جس سے حقارت کی جاتی ہے، جیسے: غلام لونڈی اور خامل وگمنام و قلیل العقل۔ تو اس کے لیے اس کو بولتے ہیں جس طرح کہ تو کہتا ہے یا خسیس! یعنی اے فرومایہ اور کمینے۔ یہ قول امام خازن رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔[2]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اس آیت کے دو معنی ذکر کیے ہیں، ایک معنی تو بعینہ وہی ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں، دوسرے یہ ہیں، کہا: یا مراد یہ ہے کہ ان کی چادریں جو ہیں، ان میں سے بعض کو اوڑھ لیں اور یہ ہیں کہ عورت ایک کرتے اور ایک اوڑھنی میں لونڈی کی طرح متبذل (ذلیل) نہ ہو، حالاں کہ اس کے گھر میں دو اور دو سے زیادہ چادریں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آزاد عورت لونڈی کی طرح ایک کرتے اور ایک اوڑھنی میں ترکِ زینت کیے ہوئے ستر کا لحاظ کیے بغیر گھر سے نہ نکلے، حالاں کہ گھر میں چادریں رکھی ہیں، مگر اوڑھتی نہیں ہے، ایسا نہ کرے، بلکہ اپنے کپڑوں پر چوڑی چکلی چادر اوڑھے، اس سے اپنے سارے بدن کو ڈھانک لے۔ بھاری بھرکم بھلی مانس ہو کر نکلے کہ بدنیت اور اوباش قسم کے لوگوں پر ہیبت پڑے اور وہ سمجھ لیں کہ کوئی عزت دار پارسا بی بی ہے اور ان کو روک ٹوک کی جرأت نہ ہو۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدا میں عورتیں اپنی جاہلیت کے زمانے کی عادت کے مطابق متبذلات تھیں، عورت ایک کرتے اور ایک اوڑھنی میں باہر نکلتی تھی۔ آزاد عورت اور لونڈی کے درمیان کسی طرح کا فرق اور تمیز نہیں تھی اور جوان لوگ یعنی بدنیت بدمعاش اوباش لونڈیوں سے تعرض کرتے اور ان کو چھیڑتے، جب وہ رات کو قضائے حاجت کے لیے کھجوروں اور گنجان درختوں کی طرف نکلتیں۔ بعض اوقات آزاد عورت کو بھی لونڈی سمجھ کر چھیڑتے، اس لیے مومن بیبیوں کو یہ حکم ہوا کہ ملاحف (کاف بروزن کتاب وملحفہ وملحف بہ کسرِ ہر دو وہ لباس ہے جو سارے لباس کے اوپر ہوتا ہے جس سے سارا جسم چھپ جاتا ہے، یعنی چادر وغیرہ۔ جمع لُحُف و ملاحف ہے۔) پہن کر اور اپنے سر اور چہرے چھپا کر اپنا پہناوا لونڈیوں کے پہناوے سے مختلف رکھیں، تاکہ کوئی بدنیت طمع کرنے والا شخص ان میں طمع نہ کرے۔[3]

علامہ سبکی رحمہ اللہ نے ''طبقاتِ کبریٰ'' میں فرمایا ہے کہ ائمۂ شافعیہ میں سے احمد بن عیسیٰ شارح تنبیہ نے اس آیتِ کریمہ سے استنباط کیا ہے کہ اس وقت کے علماء جو اپنے لباس میں آستینوں اور عمامہ کی وسعت کرتے ہیں اور طیلسان پہنتے ہیں یہ فعل اچھا ہے گو اس کو سلف نے نہیں کیا، اس لیے کہ اس میں ان کے لیے ایک خاص نشانی ہے اور

[1] تفسیر الطبري (۲۰/ ۳۲۵) [2] تفسیر الخازن (۵/ ۲۷۷) [3] تفسیر النسفي (۳/ ۳۱۵)

اس میں وہ پہچانے جاتے ہیں تو ان کے فتووں اور اقوال کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔[1] انتہی۔ (طیلسان ایک مشہور لباس ہے۔ "مجمع البحار" میں بہ فتحِ لام ہے اور کہا ہے کہ اس کے لام میں تینوں حرکات بیان کی گئی ہیں۔ صراح میں کسرِ لام کو لغتِ عامہ کہا ہے)۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اشراف کا کسی علامت کے ساتھ متمیز ہونا ایک مشروع امر ہے۔ جنابِ توفیق سیدنا ابو الوفاء الصدیق رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ کیا بارد استنباط ہے اور اس کا کیا کم فائدہ ہے، خاص کر سنتِ مطہرہ میں لباس میں اسراف اور اطالت کرنے کی ممانعت وارد ہو چکی ہے اور اس اُمتِ مرحومہ کے سلف اور ائمہ اس سے منع کر چکے ہیں۔ "فَأَيْنَ هَذَا مِنْ ذَاكَ"، یعنی پھر استنباط کو اس آیت سے کیا واسطہ۔ یہ کہاں وہ کہاں؟!

شتان بین مشرق و مغرب

یہ تو ایک بدعت ہے جس کو علمائے سوء و مشائخ دنیا نے نکالا ہے اور اسی لیے علی قاری رحمہ اللہ نے ان کی مذمت میں کیا خوب فرمایا ہے: "لَهُمْ عَمَائِمُ كَالْأَبْرَاجِ وَكَمَائِمُ كَالْأَخْرَاجِ"۔ یعنی ان کے عمامے برجوں کی طرح ہیں اور آستینیں ہیں، جیسے خُرجیاں۔ اور ان پر اس کا بہت سخت انکار کیا اور وہ جو ذکر کیا کہ علماء و اشراف کا پہناوا ایک سنت ہے۔ چنانچہ ابن الحاج نے مدخل میں اس کو یوں رد کیا ہے کہ یہ اس پہناوے کے خلاف ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ سعادت عہد میں تھا اور خلفائے راشدین اور ان کے بعد خیر القرون میں تھا۔ پھر اگر کوئی کہے کہ وہ تو اس لباس سے پہچانے جاتے ہیں تو کہیں گے کہ اگر وہ زی اول، یعنی پہلے لباس پر رہتے تو اس سے پہچانے جاتے، کیوں کہ وہ اس لباس سے مختلف ہے جس پر اب ان کے غیر ہیں اور ان کے قول کے انکار میں سیدنا المرحوم (نواب صدیق حسن رحمہ اللہ) نے خوب طویل کلام کیا ہے۔ ان کی تصنیف "حجج الكرامة في آثار القيامة" میں اس پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ طالبِ صادق کو چاہیے کہ اس کا مطالعہ فرمائے۔

پھر اللہ پاک نے اہلِ نفاق و ارجاف و مریض القلب لوگوں کو وعید سنائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: البتہ اگر منافق نفاق سے باز نہ رہیں جس پر وہ قائم ہیں اور وہ لوگ جن کے دلوں میں شک و شبہہ ہے، اس اضطراب سے باز نہ آئیں گے جس پر وہ ہیں اور مدینے میں جھوٹی خبریں اڑانے والے باز نہ آئیں گے، وہ ایسی جھوٹی خبریں اڑاتے ہیں، جن میں مسلمین کی توہین ہوتی ہے اور مشرکین کے غلبے کا ذکر ہوتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ تفسیر اس پر ہیں کہ یہ تینوں وصف ایک ہی شے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ منافقوں میں یہ ساری خصلتیں ہیں، یعنی نفاق، دلوں کی بیماری اور مسلمانوں پر جھوٹی خبریں اڑانا۔ اس قول کی بنا پر آیت اس باب سے ہوگی۔

إِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَابْنِ الْهُمَامِ وَلَيْثِ الْكَتِيبَةِ فِي الْمُزْدَحَمِ

("قرم" سردارِ قوم کو کہتے ہیں اور "همام" بالضم مرد بزرگ ہمت ہے۔ "ليث الكتيبة"، یعنی شیرِ لشکر

---

[1] طبقات الشافعية الكبرىٰ للسبكي (٨/ ٢٥)

مزدحم: جائے انبوہ، یعنی گھمسان، مراد لڑائی ہے، یہ تینوں وصف ملک کے ہیں)۔ اور حرفِ واؤ زائد ہے، یعنی "إِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ ابْنِ الْهُمَامِ لَيْثِ الْكَتِيبَةِ" کسی نے کہا کہ موصوف: متغایر و متعدد ہے۔ چنانچہ منافقوں میں سے ایک قوم تو جھوٹی خبریں اڑاتی تھی اور ایک قوم عورتوں کے پیچھے پڑتی تھی تہمت لگانے کے لیے۔ امام عکرمہ اور شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ زانی لوگ ہیں۔[1] مرض سے مراد زنا ہے، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ ﴾ [الأحزاب: ٣٢] "کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال کرے۔"

ارجاف لغت میں کذب و باطل کو شائع کرنے کو کہتے ہیں، جبکہ کوئی شخص کسی شخص کو ایسی خبر دے جس کی حقیقت کچھ نہ ہو تو محاورے میں کہیں گے کہ "فُلَانٌ أَرْجَفَ بِكَذَا"۔ بے اصل خبر کو ارجاف اس لیے کہتے ہیں کہ وہ متزلزل غیر ثابت ہوتی ہے۔ یہ ماخوذ ہے "رجفة" سے۔ کہتے ہیں۔ "رجفة" "زلزلة" کو کہتے ہیں کہ جس وقت زمین حرکت کرتی ہے متزلزل ہوتی ہے، کانپتی ہے تو اس وقت بولتے ہیں: "رَجَفَتِ الْأَرْضُ"۔ رجفان اضطراب شدید کو کہتے ہیں۔ دریا کو اس کے مضطرب ہونے کے سبب سے "رَجَّاف" بولتے ہیں۔ "أرجاف" واحد ہے "أراجيف" کا۔ "أَرْجَفُوْا فِي الشَّيْءِ" کے یہ معنی ہیں کہ لوگوں نے اس شے میں غور کیا۔ چوں کہ یہ مرجفین مسلمین کی جنگوں کے بارے میں کبھی تو یہ خبر دیتے تھے کہ ان کو شکست ہوئی، کبھی یہ کہ مارے گئے اور کبھی یہ کہ مغلوب ہوئے، اس جیسی اور خبریں جن سے مسلمانوں کے دل ٹوٹ جاتے تھے۔ اس لیے اللہ پاک نے ان کو یہ وعید سنائی: ﴿ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ﴾ یعنی البتہ ہم تجھ کو ان کے پیچھے لگا دیں گے اور تجھ کو ان پر مسلط کر دیں گے، پس تو ان کو جڑ سے اکھاڑ ڈالے گا، اس طرح کہ ان کو قتل کرے گا اور ہمارے حکم دینے سے ان کو بھگا دے گا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ اس کے بعد اس آیت میں ﴿ مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ... الآية ﴾ ان کے قتل کرنے اور پکڑنے کے حکم کے معنی ہیں۔ یعنی ان کا یہ حکم ہے جب وہ نفاق اور ارجاف پر قائم رہیں گے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ قول اس سب میں سے بہتر ہے۔ فتح القدیر اور فتح البیان میں ہے کہ یہ قول نہ حسن ہے نہ احسن ہے، اس لیے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ... الآية ﴾ صرف ان پر بد دعا کرنے کے لیے ہے، یہ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے قتال کا حکم نہیں ہے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان پر مسلط کرنا ہے اور یوں کہا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد وہ لوگ ارجاف سے باز رہے تو اللہ پاک نے آپ کو ان کے پیچھے نہیں لگایا۔[2]

اور جملہ ﴿ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ﴾ قسم کا جواب ہے اور جملہ ﴿ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ ... الآية ﴾ معطوف ہے جملۂ جوابِ قسم پر۔ کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ کے ساتھ صرف اس لیے عطف کیا ہے کہ جو کچھ ان کو مصیبت پہنچی، اس

(1) تفسير القرطبي (١٤/ ٢٤٤) (2) فتح القدير (٤/ ٤٠٣) فتح البيان (١١/ ١٤٦۔ ١٤٧)

سب سے زیادہ سخت ان کی جلا وطنی تھی تو اس کا حال معطوف علیہ کے حال سے ہی متراخی ہوا، یعنی موخر ہوا۔ مراد یہ ہے کہ ﴿ ثُمَّ ﴾ رتبے کے تفاوت کے لیے ہے اور یہ بات بتانے کے لیے کہ اس کے بعد جو ان کو سزا ملنے والی ہے، وہ ان کے نزدیک اس سے پہلے کی حالت سے زیادہ بری اور زیادہ عظیم اور سخت ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ مدینے میں تیرے ساتھ بہت تھوڑا عرصہ رہ سکیں گے، یہاں تک کہ وہ وہاں سے نکال دیے جائیں گے یا ہلاک کر دیے جائیں گے۔

﴿ مَلْعُوْنِيْنَ ۛ اَيْنَمَا ... الآية ﴾ منصوب ہے بنا بر حال، جیسا کہ امام مبرد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے، یعنی وہ تھوڑے دنوں تک بسیں گے اس حال میں کہ مطرود ہوں گے، یعنی راندے ہوئے ہوں گے، جہاں کہیں پائے جائیں، پکڑے جائیں اور جان سے مارے جائیں۔ یہ ان پر پکڑے جانے کی اور قتل کی بد دعا ہے۔ ﴿ قُتِّلُوْا ﴾ کی تشدید تکثیر کے لیے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے بارے میں حکم ہے بد دعا نہیں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

﴿ مَلْعُوْنِيْنَ ﴾ کے حال ہونے میں کئی قول ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقدر سے حال ہے: "أَيْ: ثُمَّ يُخْرَجُوْنَ مَلْعُوْنِيْنَ"[1] امام ابن عطیہ، زمخشری اور ابو البقاء رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "يُجَاوِرُوْنَكَ" کے فاعل سے حال ہے۔[2] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس لیے کہ "يَنْتَفُوْنَ مِنْهَا مَلْعُوْنِيْنَ" کے معنی میں ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرفِ استثناء حال اور ظرف دونوں پر معاً داخل ہوا ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ﴾ [الأحزاب: ٥٣] "جب تک تمھیں اجازت نہ دی جائے تم نبی کے گھروں میں نہ جایا کرو کھانے کے لیے ایسے وقت میں کہ اس کے پکنے کا انتظار کرتے رہو۔" میں گزر چکا ہے اور امام زمخشری رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ منصوب ہو بنا بر ذم اور امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ ﴿ قَلِيْلًا ﴾ سے بدل ہو بنا بر حال، جس طرح کہ اس کی تقریر گزر چکی ہے۔[3]

یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مَلْعُوْنِيْنَ ﴾ صفت ہو ﴿ قَلِيْلًا ﴾ کی اس بنا پر کہ منصوب ہو بنا پر استثناء ﴿ يُجَاوِرُوْنَكَ ﴾ کے واؤ سے جس طرح کہ اس کی تقریر گزر چکی ہے، یعنی "لَا يُجَاوِرُوْنَكَ مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلَّا قَلِيْلًا مَلْعُوْنًا" اور یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اُخِذُوْا ﴾ سے منصوب ہو، جو شرط کا جواب ہے۔ یہ امام کسائی اور فراء رحمہما اللہ کے نزدیک ہے، کیوں کہ یہ دونوں تقدیم معمول جواب کی اداۃِ شرط پر جائز رکھتے ہیں، مثل "خَيْرًا إِنْ تَأْتِنِيْ تُصِبْ" (کذا قال السمین) بالجملہ اس آیت میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ بد دعا ہے، اخذ و قتل کا حکم نہیں ہے۔

فتح البیان اور فتح القدیر میں اس کو زیادہ صحیح کہا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ ان کے بارے میں حکم ہے بطور امر کے، یعنی ان کو جہاں کہیں پاؤ پکڑو اور قتل کرو جبکہ وہ نفاق اور ارجاف پر قائم رہیں۔ آیت خبر ہے بہ معنی امر کے۔ اس قول کو امام نحاس رحمہ اللہ نے احسن کہا ہے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے اور امام محلی اور خازن رحمہما اللہ نے اس کو اختیار کیا

[1] تفسير الجلالين (١/ ٥٦٠) [2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ١٠٦٠) [3] المحرر الوجيز (٤/ ٤٦٣) الكشاف (٣/ ٥٧٠)

ہے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حاصل یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ نفاق پر قائم رہیں گے تو ان کے لیے مدینے میں کوئی جگہ نہیں، مگر اس حال میں کہ وہ ذلیل وخوار اور ملعون ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ یہ کیا، کیوں کہ جس وقت سورت براءت نازل ہوئی تو ان کو جمع کیا گیا، پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے فلاں! کھڑا ہو، نکل بے شک تو منافق ہے اور اے فلاں تو کھڑا ہو۔ پھر مسلمانوں میں سے ان کے بھائی کھڑے ہوئے اور مسجد سے ان کو نکالنے کے ذمے دار ہوئے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ یہ منصوب ہے بنا بر مصدر ”أي: سَنَّ اللّٰهُ ذٰلِكَ فِي الْأُمَمِ الْمَاضِيَةِ“ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دستور مقرر کیا ہے اگلی امتوں میں اور وہ یہی منافقوں کو لعنت کرنا، ان کا پکڑنا اور مار ڈالنا ہے اور اسی طرح مرجفین کا حکم ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان لوگوں میں جو نفاق کرتے ہیں انبیاء سے اور ان کی جھوٹی خبریں اڑاتے ہیں، یہ طریقہ نکالا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی پائے جائیں مار ڈالے جائیں[3] اور تو اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تغیر وتبدل نہیں پائے گا، یعنی وہ ایسے لوگوں کے سلف وخلف میں ثابت اور دائم ہے۔ ایک ہی مجرا (جاری کرنے کا وقت) میں اللہ اس کو ساری امتوں میں جاری کرتا ہے، اس لیے کہ وہ حکمت کی بنیاد پر مبنی ہے۔ کون سی حکمت جس پر تشریع کا چرخ چکر کھاتا ہے۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سنت اس حکم کی طرح نہیں ہے جو تبدیل اور منسوخ ہوتا ہے، کیوں کہ منسوخی تو اقوال میں ہوتی ہے۔ رہے افعال، جبکہ وہ واقع ہوں، اور اخبار تو وہ منسوخ نہیں ہوتے ہیں۔[4]

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿63﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿64﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿65﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿66﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاۗءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿67﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿68﴾

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٥٦٠) تفسير الخازن (٥/ ٢٧٧) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٤٦)
[3] معاني القرآن (٤/ ٢٣٦۔ ٢٣٧) [4] فتح البيان (١١/ ١٤٣۔ ١٤٧)

ہے، آپ کو کیا خبر، شاید قیامت قریب ہی ہو 63 بلاشبہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے خوب بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے 64 وہ اس میں ہمیشہ ابد تک رہیں گے، وہ (اپنا) کوئی دوست اور کوئی مددگار نہ پائیں گے 65 جس دن آگ میں ان کے چہرے الٹ پلٹ کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: اے کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی 66 اور وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تو انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا 67 اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بڑی سخت (اور زیادہ) لعنت کر 68

قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے:

قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، شاید یہ بھی منافقوں نے ہتھکنڈا پکڑا ہوگا کہ جس چیز کا جواب نہیں وہ ہی سوال کریں بار بار۔ اس پر یہاں ذکر کر دیا۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ان کو قیامت کا علم نہیں ہے، اگرچہ لوگ ان سے اس کے متعلق سوال کریں اور ان کو یہ ارشاد کیا کہ اس کا علم اللہ عزوجل کے سپرد کریں، جیسا کہ سورۃ الاعراف میں اللہ پاک نے فرمایا ہے۔[1] وہ سورت مکی ہے اور یہ مدنی ہے، چنانچہ جو ذات پاک اس کو قائم کرے گا، اس کی طرف قیامت کا علم رد کرنے کا ہمیشہ دستور رہا، لیکن اللہ پاک نے آپ کو یہ خبر دی کہ وہ قریب ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ﴾ چنانچہ فرمایا ہے: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ [القمر: ۱] ''قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ﴾ [الأنبياء: ۱] ''لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا، پھر بھی وہ بے خبری میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [النحل: ۱] ''اللہ تعالیٰ کا حکم آ پہنچا، اب اس کی جلدی نہ مچاؤ۔''

کفار پر لعنت، دائمی جہنم اور ان کی حسرت کا بیان:

پھر فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴾ یعنی بے شک اللہ نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور کیا اور ان کے لیے آخرت میں ان کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے، وہ اس میں ہمیشہ استمرار اً رہیں گے، پھر ان کو اس سے نکلنا نہ ہوگا اور نہ ہی ان کو اس سے

---

[1] رقم الآية (۱۸۷)

کسی طرح کا زوال نصیب ہوگا اور نہ اُن کے لیے کوئی فریاد رس ہوگا نہ کوئی معین اور مددگار ہوگا کہ ان کو اس حال سے چھڑائے جس میں وہ ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ... الآية ﴾ یعنی جس دن آگ میں اپنے منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے اور ان کے منہ جہنم پر لوٹ پوٹ جائیں گے تو وہ تمنا کر کے یہ کہیں گے کہ کاش وہ دارِ دنیا میں ان لوگوں میں ہوتے جنھوں نے اللہ کا کہا مانا اور رسول کا کہا مانا جس طرح کہ اللہ پاک نے ان کی طرف سے ان کے حالِ عرصات کے بارے میں خبر دی ہے: ﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴾ [الفرقان: ٢٧۔ ٢٩] ”اور اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا ہائے کاش کہ میں نے رسول (ﷺ) کی راہ اختیار کی ہوتی، ہائے افسوس کاش کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا، اس نے تو مجھے اس کے بعد گمراہ کر دیا کہ نصیحت میرے پاس آ پہنچی تھی اور شیطان تو انسان کو (وقت پر) دغا دینے والا ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ [الحجر: ٢] ”وہ بھی وقت ہوگا کہ کافر اپنے مسلمان ہونے کی آرزو کریں گے۔“

اور اسی طرح ان کی طرف سے ان کے اس حال کی خبر دی ہے کہ وہ اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش وہ اللہ کا کہا مانتے اور دنیا میں رسول کا کہا مانتے اور کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴾ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَادَتَنَا ﴾ سے مراد اشراف ہیں اور ﴿ كُبَرَآءَنَا ﴾ سے مراد علماء۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے، یعنی ہم نے پیروی کی ”سادة“ کی، یعنی امراء کی اور مشائخ میں سے کبراء کی اور ہم نے رسولوں کی مخالفت کی اور یہ اعتقاد کیا کہ ان کے پاس، یعنی سادہ اور کبراء کے پاس کوئی شے ہے اور وہ کسی شے پر ہیں، جب کہ حقیقتاً وہ کسی شے پر نہ تھے۔

﴿ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ یعنی اے ہمارے رب ان کو دے دُگنی مار ان کے کفر کے سبب سے اور ہم کو بہکانے کے سبب سے ﴿ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴾۔ بعض قراء نے بائے موحدہ پڑھا ہے اور دوسروں نے ثائے مثلثہ پڑھا ہے۔ دونوں کے معنی قریب قریب ہیں، جس طرح کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی مروی حدیث میں ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے کوئی دعا سکھائیں کہ میں اس کو اپنی نماز میں مانگا کروں۔ فرمایا: کہو: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيراً وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْلِي مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدَكَ وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ»[1] (أخرجاه في الصحيحين)

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٥)

"کثیرا و کبیرا" دونوں طرح مروی ہے اور دونوں کے معنی صحیح ہیں۔ بعض نے یہ مستحب رکھا ہے کہ دعا کرنے والا اپنی دعا میں دونوں لفظوں کو جمع کرے۔ اس قول میں نظر ہے، بلکہ اولیٰ یوں ہے کہ کبھی یہ کہے اور کبھی یہ جس طرح کہ قاری کو دونوں قراءتوں کے درمیان اختیار دیا گیا کہ ان میں سے جونسی چاہے پڑھے، اچھا ہے اور دونوں قراءتوں کو جمع کرنا ممکن نہیں ہے۔ واللہ أعلم۔ امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے ابو رافع سے تسمیہ "من شهد مع علي رضی اللہ عنہ" سے روایت کیا ہے کہ حجاج بن عمرو ابن غزیہ، یہ وہ شخص ہے جو دشمن سے ملاقات کے وقت کہا کرتا تھا: اے گروہ انصار کے! کیا تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ ہمارے رب سے کہو، جس وقت ہم اس سے ملیں گے: ﴿رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا﴾ [1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ لوگ تجھ سے قیامت کے حصول و وجود و قیام کا وقت پوچھتے ہیں۔ کہا ہے کہ قیامت کے متعلق سوال کرنے والے وہی منافقین اور مرجفین ہیں، جبکہ ان کو عذاب کی وعید سنائی تو بطور استبعاد و تکذیب اس کا سوال کیا۔ امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہود نے امتحان کے طور پر اس کے متعلق پوچھا تھا، اس لیے کہ اللہ پاک نے تورات میں اس کے علم کو مخفی رکھا ہے۔[2] تفسیر ابو السعود میں ہے کہ مشرکوں نے اس کا سوال کیا تھا استعجال کے لیے (جلدی طلب کرنے کے لیے) بطور استہزاء کے اور یہود نے اس کا پوچھا تھا امتحان کے طور پر، اس لیے کہ اللہ پاک نے تورات میں اور دوسری تمام کتب میں اس کے وقت کو مبہم رکھا ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: تو کہہ دے کہ اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، یعنی اس کے علم کے ساتھ اللہ پاک مستاثر ہے، اس کے بارے میں نہ کسی نبی مرسل کو مطلع فرمایا ہے نہ ہی کسی مقرب فرشتے کو،[3] اور اے محمد! کون سی چیز تجھے معلوم کراتی ہے اور خبر دیتی ہے شاید قیامت زمانہ قریب میں ہو۔ ﴿قَرِيْبًا﴾ کا نصب بنا بر ظرفیت ہے اور تذکیر اس لیے ہے کہ ﴿يَوْمَ﴾ کے معنی میں ہے، یا وقت کے معنی میں، باوجود اس کے کہ تانیث حقیقی نہیں ہے (تانیث حقیقی جب نہ ہو اور فاعل ظاہر ہو تو تذکیر و تانیث دونوں جائز ہیں اور جب فاعل ضمیر مؤنث غیر حقیقی ہو تو فعل یا صفت کو مونث ہونا چاہیے، البتہ اس جگہ اور بہت توجیہات ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [الأعراف: ٥٦] میں مفصلاً تفسیر وغیرہ میں مذکور ہیں۔ مصحح سلمه)

رسول اللہ ﷺ کو اس لیے خطاب کیا ہے کہ مقصود اس بات کا بیان کرنا ہے کہ جب وہ آپ ﷺ سے محجوب و مستور یعنی پوشیدہ ہے اور آپ ﷺ اس کا وقت نہیں جانتے، حالاں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو لوگوں میں سے کوئی

---

[1] المعجم الكبير (٣/ ٢٢٣) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٨٠۔ ٦٨١) [2] تفسير الخازن (٥/ ٢٧٧)

[3] تفسير أبي السعود (٧/ ١١٦)

اس کو کیسے جانے گا! جو لوگ اس کے آنے کی جلدی چاہتے ہیں ان کے لیے اس میں ایک عظیم دھمکی ہے اور دھمکی ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو امتحان کرتے ہیں اور مشرکوں کے لیے اور اس کے لیے بھی جو انبیاء، اولیاء اور صلحاء وغیرہم کے لیے غیب ثابت کرتا ہے۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ أَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک نے منکروں کو اپنی رحمت سے مطرود اور دور کیا ہے اور دنیا کی لعنت کے باوجود آخرت میں ان کے لیے نہایت سخت دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا ﴾ میں ضمیر سعیر کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ سعیر مؤنث ہے، یا اس لیے کہ جہنم کے معنی میں ہے۔ ﴿ أَبَدًا ﴾ کے معنی ہیں بلا انقطاع اور ﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ سے جو معنی نکلتے ہیں ﴿ أَبَدًا ﴾ اس کی تاکید کے لیے ہے۔ غرض یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے ان کا رہنا کبھی منقطع نہ ہوگا۔ نہ کسی ولی کو پائیں گے کہ ان سے موالات کرے اور وہ اس کے عذاب سے ان کو محفوظ رکھے اور نہ کوئی مددگار کہ ان کی مدد کرے اور اس سے ان کو چھڑائے۔

کلمہ ﴿ يَوْمَ ﴾ ﴿ لَا يَجِدُوْنَ ﴾ سے یا ﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ سے یا ﴿ نَصِيْرًا ﴾ سے یا ''اُذْكُرْ'' محذوف سے متعلق ہے۔ جمہور نے ﴿ تُقَلَّبُ ﴾ بہ ضم تائے فوقیہ و فتح لام بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور عیسیٰ ہمدانی اور ابو اسحاق نے بہ نون و کسرِ لام بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ فاعل اللہ پاک ہے اور عیسیٰ نے بھی بہ ضم تائے فوقیہ و کسرِ لام بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ اس معنی میں کہ ''تُقَلِّبُ السَّعِيْرُ وُجُوْهَهُمْ''۔ امام ابو حیوہ، ابو جعفر اور شیبہ رحمہ اللہ نے بہ فتحِ تائے فوقیہ و لام ''تتقلب'' کے معنی میں پڑھا ہے۔[1] یہ ﴿ تُقَلَّبُ ﴾ جو اس آیت میں مذکور ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ کبھی تو ان کے منہ کو ایک طرف سے قلب کریں گے اور کبھی دوسری طرف سے، پشت کو شکم اور شکم کو پشت اسی طرح ان کو لوٹ پوٹ کریں گے یا اس ﴿ تُقَلَّبُ ﴾ سے مراد آگ کے جلانے کی وجہ سے ان کے رنگوں کو بدلنا ہے، چنانچہ کبھی تو اُن کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے اور کبھی سبز۔ یا مراد ان کی کھالوں کا دوسری کھالوں سے بدلنا ہے۔

''وجوہ'' کا ذکر خاص کر اس لیے کیا ہے کہ انسان کے جسم میں چہرہ سب سے بڑھ کر عزت کی جگہ ہے، یا چہرے سے مراد سارا بدن ہے، غرضیکہ جس وقت ان کی یہ حالت ہوگی تو اس وقت کہیں گے: ﴿ يٰلَيْتَنَآ أَطَعْنَا اللّٰهَ وَ أَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے، سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ پھر ان کا کیا حال ہوگا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ وہ حسرت و افسوس کرتے ہوئے یوں کہیں گے۔ اس شے پر افسوس کرتے ہوئے جو اُن سے فوت ہوگئی۔ یا حال ہے ﴿ وُجُوْهُهُمْ ﴾ کی ضمیر سے، یا نفسِ وجوہ سے۔ غرض یہ ہے کہ اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش! وہ اللہ کا کہا مانتے اور رسول کا کہا مانتے اور جو شے وہ لے کر آیا اس پر ایمان لاتے تو جس عذاب میں مبتلا ہیں

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٤٨)، فتح القدير (٤/ ٤٠٤)

اس سے نجات پاتے، جس طرح کہ مومنین نے نجات پائی۔ ''رَسُوْلَا'' اور ''سَبِيْلَا'' میں یہ الف وہ الف ہے جو فاصلوں میں واقع ہوتا ہے۔ نحوی لوگ اس کو الفِ اطلاق بولتے ہیں شعر کے قافیوں کی طرح، اطلاقِ آواز کے سبب سے۔ اس کا فائدہ وقف ہے اور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ کلام منقطع ہو گیا اور اس کے بعد کلام مستانف ہے، اس کا بیان اسی سورت کے شروع میں گزر چکا ہے۔

جملہ ﴿ وَقَالُوْا رَبَّنَآ ... الآیة ﴾ جملہ اول پر معطوف ہے مضارع سے ماضی کی طرف، اس لیے عدول کیا کہ منظور اس بات پر آگاہی بخشنا ہے کہ ان کا یہ قول کچھ استمراراً نہیں ہے، جس طرح کہ ان کا پہلا قول تھا، بلکہ یہ تو ایک قسم کا اعتذار (عذر) ہے۔ انھوں نے اس سے ایک طرح کی تشفی چاہی ہے، یہ بات کہہ کر کہ جن لوگوں نے ان کو اس ورطۂ ہلاکت میں ڈالا، ان کا عذاب دُگنا ہو۔ ''سادۃ'' اور ''کبراء'' سے مراد سردار اور پیشوا ہیں، جن کے حکم کی دنیا میں پیروی اور بجا آوری کرتے تھے اور ان کے مقتدی اور پیروکار ہوتے تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ غزوۂ بدر میں مطعمون ہیں (''مطعمون'' ماخوذ ہے ''طعم'' بہ فتح وضم طاء سے، ''طعم'' مزے کو کہتے ہیں، جس شے میں کچھ مزہ نہیں ہوتا تو وہ بے فائدہ ہوتی ہے۔ مراد بڑے معتبر، بہادر عزت وشرف والے ہیں، جو بدر کی لڑائی میں آئے تھے)۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، کسی معین گروہ کے ساتھ تخصیص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[1] رہی یہ بات کہ یہاں جو سیادت اور کبر سے ان کی تعبیر کی، تو اس سے غرض اپنے عذر کو مضبوط کرنا ہے، ورنہ اب تو وہ حقارت اور ذلت کے مقام میں ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں سخت ڈانٹ ہے باطل کی تقلید کرنے پر۔ کتابِ عزیز میں بہت جگہ پر اس کے متعلق آگاہ کیا ہے اور اس سے خوف اور نفرت وارد ہوئی ہے، لیکن یہ اس کے لیے ہے جو شخص کتاب اللہ کے معنی فہمِ سلیم کے ساتھ سمجھتا ہے اور اس کا اقتدا کرتا ہے اور اپنی جان سے انصاف کرتا ہے۔ نہ اس کے واسطے جو سوئے فہم و مزیدِ بلادت اور شدتِ تعصب میں جانوروں کی جنس سے ہے۔ اللهم غفرا و وفقنا لما تحب و ترضى، وارزقنا حلاوة رضوانك الأسنى، و اتباع سنة نبيك الأهنى، وجنبنا الابتداع فإنه أسوء ماجنى، وأردأ ما اجتنى. آمین. امام حسن اور ابن عامر رحمہما اللہ نے ''سادتنا'' بکسرِ تائے فوقیہ جمع ''سادۃ'' پڑھا ہے، چنانچہ یہ جمع الجمع ہے[2] اور ''سادۃ'' علی غیر القیاس جمع ہے، برابر ہے کہ سید کی جمع ٹھہرائی جائے یا سائد کی۔

﴿ فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴾ سبیل سے مراد توحید ہے، یعنی انھوں نے اللہ و رسول کا انکار ہم کو اچھا کر دکھایا، اس کے ذریعے ہم کو توحید کی راہ سے بہکا دیا۔ پھر اس موقف میں ان پر یہ بد دعا کی: ﴿ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ یعنی تو ہمارے عذاب کی طرح کا عذاب ان کو دوبارہ کر بہ سبب گمراہ ہونے کے اور گمراہ کرنے کے۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٤٠٤) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٤٨) فتح القدير (٤/ ٤٠٤)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذاب دنیا اور آخرت کا۔ کسی نے کہا ہے کہ عذاب کفر کا اور اضلال (گمراہ کرنے) کا۔ ﴿ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ﴾ اور لعنت کر ان کو ایسی لعنت جو فی نفسہ بڑی ہو اور ان پر بہت سخت اور بھاری ہو۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب اور یحییٰ بن وثاب و عاصم کی قراءت ببائے موحدہ ہے۔ جمہور نے بثائے مثلثہ پڑھا ہے، یعنی ایسی لعنت جو کثیر العدد اور عظیم القدر اور شدید الموقع ہو۔ امام ابوعبید، ابو حاتم اور نحاس رحمہم اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔[1]

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِينَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿٦٩﴾

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے موسیٰ کو ایذا دی تھی، پھر اللہ نے اسے اس (جھوٹی بات) سے بَری کر دیا جو انھوں نے کہی تھی اور وہ اللہ کے نزدیک بڑے رتبے والا تھا (69)

یہود کی موسیٰ علیہ السلام پر افتراء پردازی اور اللہ تعالیٰ کا ان کو بری کرنا:

بعض مفسد موسیٰ علیہ السلام کو تہمت لگانے لگے کہ ہارون علیہ السلام کو جنگل میں لے جا کر مار آئے، تاکہ وہ ریاست میں شریک نہ رہیں، پھر ان کا جنازہ آسمان سے نظر آیا اور اُن کی آواز آئی کہ میں اپنی موت سے مرا ہوں۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ یہ جو چھپ کر نہاتے ہیں، ان کے بدن میں کچھ عیب ہے بدن کی سفیدی ہے یا خصیہ پھولا ہوا ہے۔ ایک روز موسیٰ علیہ السلام اکیلے نہانے کے لیے گئے کپڑے ایک پتھر پر رکھے، وہ پتھر کپڑے لے کر بھاگا۔ موسیٰ علیہ السلام عصا لے کر اس کے پیچھے دوڑے، جہاں سب لوگ دیکھتے تھے وہ پتھر کھڑا ہو گیا، سب نے ننگے بے عیب دیکھ لیا، پھر اس پتھر کو کئی عصا مارے اس میں نشان پڑ گیا۔ انتہٰی.

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک حیادار شخص تھے۔ وذلک قولہ تعالیٰ: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا... الآية ﴾[2] (هكذا أورد هذا الحديث ههنا مختصراً جدًا)

امام بخاری رحمہ اللہ نے احادیثِ انبیاء علیہم السلام میں بعینہٖ اس سند کے ساتھ: عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک حیادار اور زیادہ پردہ کرنے والے شخص تھے، ان کی جلد سے کوئی شے دکھائی نہیں دیتی تھی، ان کے حیا کرنے کی وجہ سے۔ چنانچہ ان کو ایذا دی جس کسی نے بھی ایذا دی بنی اسرائیل میں سے۔ لہٰذا کہا کہ یہ کسی عیب کی وجہ سے ہی زیادہ پردہ کرتے ہیں، ان کی جلد میں یا تو برص ہے یا خصیہ پھولا ہوا ہے یا کوئی اور آفت

[1] تفسير القرطبي (٤/ ٢٤٩) فتح البيان (١١/ ١٤٨۔ ١٥٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢١)

ہے۔ بے شک اللہ عزوجل نے چاہا کہ ان کو اس بات سے بَری کرے جو اُن کے بارے میں لوگوں نے کہی، چنانچہ وہ ایک دن اکیلے تنہا ہوئے، اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھے، پھر غسل کیا، جب فارغ ہوئے تو اپنے کپڑوں کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان کو لیں اور وہ پتھر اُن کے کپڑے لے کر دوڑا۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا لیا اور پتھر کو بلایا، پھر کہنے لگے: « ثَوْبِي حَجَرُ ثَوْبِي حَجَرُ » یعنی اے پتھر! تو میرے کپڑے دے، اے پتھر! تو میرے کپڑے دے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے پاس پہنچے تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو برہنہ دیکھ لیا، اللہ تعالیٰ نے جو شے پیدا کی اس سے زیادہ خوبصورت اور وہ ان باتوں سے بالکل بَری تھے جو وہ کہتے تھے اور پتھر کھڑا ہو گیا تو انھوں نے اپنا کپڑا لے لیا اور اس کو پہن لیا، پھر پتھر کو اپنے عصا سے مارنا شروع کیا۔ قسم ہے اللہ کی کہ بے شک البتہ پتھر میں ان کے مارنے سے نشان پڑ گئے تین یا چار یا پانچ نشان۔ قال فذلك قوله تعالیٰ: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... الآية ﴾[1] (وهذا سياق حسن مطول و هذا الحديث من أفراد البخاري دون مسلم)

امام احمد رحمہ اللہ نے عن الحسن عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن خلاس ومحمد عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک باحیا اور باستر مرد تھے، وہ حیا کے مارے اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں کھولتے تھے کہ کہیں ان کی جلد میں سے کوئی شے نظر نہ آ جائے۔[2] (ثم ساق الحديث كما رواه البخاري مطولًا ورواه عبد في تفسيره عن روح عن عوف به، ورواه ابن جرير من حديث الثوري عن جابر الجعفي عن عامر الشعبي عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم بنحو هذا وهكذا رواه من حديث سليمان بن مهران الأعمش عن المنهال بن عمرو وعن سعيد بن جبير وعبد الله بن الحارث عن ابن عباس رضي الله عنهما في قوله: ﴿ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى ﴾)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا کہ تو آدر ہے، یعنی تیرے خصیے پھولے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک دن غسل کرنے کے لیے نکلے اور اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھ دیے، وہ پتھر ان کے کپڑے لے کر نکلا اور دوڑنے لگا اور وہ اس کے پیچھے نکلے برہنہ حالت میں جانے لگے، یہاں تک کہ وہ ان کو بنی اسرائیل کی مجالس میں لے پہنچا۔ کہا: پھر لوگوں نے ان کو دیکھ لیا کہ وہ آدر نہ تھے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ﴾[3] (هكذا رواه العوفي عن ابن عباس رضي الله عنهما سواء)

حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک حیا دار مرد تھے اور بے شک وہ آئے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں گمان کرتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی پر، تاکہ غسل کریں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٢٣) مسند أحمد (٢/ ٥١٤) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٣٢_ ٣٣٣)

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٣٢_ ٣٣٣)

انھوں نے اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیے اور وہ اس بات کے قریب نہیں ہوتے تھے کہ ان کی شرم گاہ کھلے۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام آدر ہیں یا ان میں کوئی آفت ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنے کپڑے نہیں اتارتے۔ پھر وہ پتھر ان کے کپڑے اٹھا لے گیا، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی مجالس کے مقابل، یعنی سامنے جا پہنچا تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف نظر کی اور انھیں بہت حسین مردوں کی طرح پایا یا جیسا فرمایا، فذلك قوله: ﴿ فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا ﴾[1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پہاڑ پر چڑھے، پھر ہارون علیہ السلام فوت ہو گئے تو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو نے اس کو مار ڈالا، وہ ہمارے لیے تم سے زیادہ نرم تھا اور زیادہ حیا دار تھا، چنانچہ انھوں نے اس بات سے موسیٰ علیہ السلام کو ایذا دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا تو انھوں نے ہارون علیہ السلام کو اٹھا لیا، پھر ان کو لے کر بنی اسرائیل کی مجالس پر سے گزرے، پھر ان کی موت کی بات کی، چنانچہ ان کی قبر کی جگہ کو نہیں پہچانا، مگر رخم نے (رخم پرندوں کی ایک قسم "رخمة" کی جمع ہے، یہ پرندہ غدر اور حماقت کے ساتھ موصوف ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ قذر کے ساتھ موصوف ہے یعنی گندگی۔ روافض کے بارے میں آیا ہے کہ اگر وہ پرندے ہوتے تو رخم ہوتے۔[2] (كذا في مجمع البحار) صراح میں "رخمة" کا ترجمہ مردار خور مرغ کیا ہے)۔ اور اللہ نے اس کو بہرا گونگا کر دیا۔[3] (وهكذا رواه ابن جرير عن علي ابن موسىٰ الطوسي عن عباد بن العوام به) پھر کہا جائز ہے کہ "أذى" سے مراد یہی ہو اور جائز ہے کہ مراد پہلا قول ہو، پس اللہ عزوجل کے قول سے کوئی قول اولیٰ نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: احتمال ہے کل مراد ہوں اور یہ بھی مراد ہے کہ اس کے ساتھ اس کا غیر مراد ہو۔[4] والله أعلم.

امام احمد رحمہ اللہ نے عن شقیق عن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن کچھ بانٹا تو انصار میں سے ایک شخص بولا کہ بے شک یہ البتہ ایک تقسیم ہے کہ اس سے اللہ کی ذات کا ارادہ نہیں کیا گیا، کہا: میں نے کہا: اے اللہ کے دشمن! خبردار البتہ میں ضرور رسول اللہ ﷺ کو یہ بات بتاؤں گا جو تو نے کہی، پھر میں نے نبی اکرم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ پھر فرمایا: موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی رحمت ہو، انھیں اس سے زیادہ ایذا دی گئی اور انھوں نے صبر کیا۔[5] (أخرجاه في الصحيحين من حديث سليمان بن مهران الأعمش به)

---

[1] مسند البزار (١٤/ ٢٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٧٥)

[2] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٣١٠_ ٣١١)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٧) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٣٤_ ٣٣٥)

[4] تفسير ابن كثير (٦/ ٤٢٩)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٢) مسند أحمد (١/ ٣٨٠)

طریقِ دیگر:

عن زید بن زائد عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: نہ پہنچائے مجھ کو میرے اصحاب میں سے کسی کی طرف سے کوئی شے، بے شک میں چاہتا ہوں کہ میں تمھارے پاس آؤں اور میرا سینہ صاف ہو۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس مال آیا تو آپ ﷺ نے اس کو بانٹا۔ کہا: پھر میں نے دو آدمیوں پر گزر کیا، اس حال میں کہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا: واللہ! نہیں ارادہ کیا محمد ﷺ نے اپنی تقسیم سے اللہ کی ذات کا، نہ دارِ آخرت کا۔ کہا: میں ٹھہر گیا، یہاں تک کہ جو انھوں نے کہا وہ میں نے سنا۔ پھر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ نے تو ہم سے یہ فرمایا تھا کہ کوئی مجھے میرے اصحاب کی طرف سے کوئی شے نہ پہنچائے اور میں نے فلاں اور فلاں پر گزر کیا اور وہ ایسے ایسے کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا اور یہ بات آپ پر شاق گزری۔

پھر فرمایا: « دَعْنَا مِنْكَ » یعنی تو چھوڑ ہم کو اپنی بات سے، البتہ یقیناً ایذا دیے گئے موسیٰ علیہ السلام اس سے بھی زیادہ تو انھوں نے صبر کیا۔ (وقد رواه أبو داود في الأدب عن محمد بن يحيىٰ الذهلي عن محمد بن يوسف الفريابي عن إسرائيل عن الوليد بن أبي هشام به مختصراً) کہ نہ پہنچائے مجھ کو کوئی کسی کی طرف سے کچھ، میں چاہتا ہوں کہ نکلوں میں تمھاری طرف اور میں سلیم الصدر ہوں۔[1] (وكذا رواه الترمذي في المناقب عن الذهلي سواء إلا أنه قال: قال زيد بن زائدة. ورواه أيضا عن محمد بن إسماعيل عن عبد الله بن محمد عن عبيد الله بن موسىٰ وحسين بن محمد كلاهما عن إسرائيل عن السدي عن الوليد بن أبي هشام به مختصراً أيضا فزاد في إسناده السدي ثم قال: غريب من هذا الوجه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴾ یعنی اللہ کے نزدیک ان کی عزت اور جاہ تھی، اپنے رب عزوجل کے پاس وجاہت والے تھے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک مستجاب الدعوات تھے۔[2] ان کے سوا سلف میں سے اَور لوگوں نے کہا ہے کہ سوال نہیں کیا اللہ سے کسی شے کا، مگر وہ ان کو دی، مگر رؤیت سے منع کیے گئے، بہ سبب اس شے کے جس کو اللہ عزوجل جانتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ کے نزدیک ان کی وجاہتِ عظیم سے یہ ہے کہ اپنے بھائی ہارون کے حق میں شفاعت کی کہ ان کو ان کے ساتھ بھیجے تو اللہ پاک نے ان کے سوال کو قبول کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴾ [مریم: ٥٣] ''اور اپنی خاص مہربانی سے اس کے بھائی کو نبی بنا کر عطا فرمایا۔''[3]

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٩٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٦٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٩٦) اس کی سند میں ''ولید بن ابی ہشام'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٣٢٢)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٨) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٨١۔ ٦٨٣)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں مومنوں کو ان باتوں پر ڈانٹ ڈپٹ کی گئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیتی ہیں، ان میں سے کسی امر میں داخل نہ ہوں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو نصیحت کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو ایذا نہ دیں۔[1] اس ایذا کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور کچھ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ایذا سے مراد زانیہ کے بارے میں وہ حدیث ہے جس زانیہ کو قارون نے چاہا تھا کہ اپنے نفس کے ساتھ ان کو تہمت لگائے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ میں ہارون کو وفات دینے والا ہوں لہٰذا تو اس کو فلاں فلاں پہاڑ پر لے جا، پھر وہ دونوں اس پہاڑ کی طرف چلے تو ناگاہ ان کو ایک درخت ملا اور ایک گھر، اس میں ایک تخت، اس پر فرش، یعنی بچھونا اور نہایت اچھی خوشبو تھی۔

پھر جب ہارون علیہ السلام نے اس پہاڑ اور گھر کی طرف نظر کی اور جو شے اس میں تھی اس کو دیکھا تو وہ ان کو پسند آیا، کہا: اے موسیٰ! میں چاہتا ہوں کہ اس تخت پر سوؤں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تو اس پر سو جا۔ ہارون علیہ السلام نے کہا کہ تو میرے ساتھ سو۔ پھر جب وہ دونوں سوئے تو ہارون علیہ السلام کو موت نے پکڑا، پھر جب ان کی روح قبض کر لی گئی تو وہ گھر اٹھایا گیا اور درخت بھی گیا اور وہ تخت آسمان کی طرف اٹھایا گیا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف لوٹے تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام نے مار ڈالا اور بنی اسرائیل کی ان سے محبت کا حسد کیا۔ (اصل کے الفاظ یوں ہیں: "وحسده حب بني إسرائيل" مترجم مدظلہ نے "حب بنی اسرائیل" کو فاعل ڈالا ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "حسده" کی ضمیر فاعل راجع ہو موسیٰ علیہ السلام کی طرف اور ضمیر مفعول کی ہارون علیہ السلام کی طرف راجع ہو اور "حب" منصوب بنزعِ خافض ہو۔ "أي لحب بني إسرائيل إياه والله تعالىٰ أعلم بالصواب" مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)۔

ہارون علیہ السلام ان سے زیادہ تر اُلفت اور نرمی کرتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کچھ سختی کرتے تھے۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات پہنچی تو کہا: تمھاری خرابی ہو! وہ تو میرا بھائی تھا، کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں اسے قتل کروں گا؟! پھر جب بنی اسرائیل نے یہ بات بہت زیادہ کہنا شروع کر دی تو موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر اللہ سے دعا کی تو اللہ پاک نے وہ تخت اتارا، یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے اسے زمین و آسمان کے درمیان دیکھا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی۔[2] (أخرجه الحاكم و صححه عن ابن مسعود رضي الله عنه و ناس من الصحابة)

قولہ تعالیٰ: ﴿فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا﴾ میں کلمہ "ما" یا تو موصولہ ہے یا مصدریہ، یعنی پاک کیا اللہ نے ان کو اور ان کے لیے براءت ظاہر کی ان کی اس بات سے جو انھوں نے کہی۔ غرضیکہ کلمہ "ما" کوئی سا ہو، مراد اس مضمون

---

[1] فتح القدير (٤/ ٤٠٦)
[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٦٣٢)

اور قول کے ادا کرنے سے ان کی براءت ہے اور وہ یہی عیب لگانے والی بات ہے، یعنی اللہ پاک نے عیب لگانے والی بات سے ان کو بری کیا، وہ کوئی سی بات ہو۔ ﴿ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ اللہ کے نزدیک عظیم صاحبِ وجاہت تھے۔ وجیہ کے معنی عظیم القدر اور بلند مرتبہ ہیں۔ کسی نے وجاہت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ پاک نے ان سے باتیں کیں۔ جمہور نے ﴿ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ بالنون پڑھا ہے بنا بر ظرفیت مجازی، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، امام اعمش اور ابو حیوہ رحمہ اللہ نے "عَبْدَ اللّٰهِ" بیائے موحدہ پڑھا ہے عبودیت سے۔[1]

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت حسن ہے۔ اب رہی یہ بات کہ جس شے سے نبی ﷺ کو ایذا دی، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو اس میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ان کا ایذا دینا ان کا یہ قول ہے کہ زید بن محمد ﷺ۔ امام ابو وائل رحمہ اللہ نے وہی مال کی تقسیم کا ذکر کیا ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ زید بن حارثہ اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے حق میں نازل ہوئی ہے اور جو آپ ﷺ نے ان کے حق میں لوگوں کی گفتگو سنی۔[3]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿70﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿71﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کہا کرو ⑦⓪ وہ تمھارے عمل درست کر دے گا اور تمھارے لیے تمھارے گناہ بخش دے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو یقیناً اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ⑦①

مومنوں کو تقوے اور صدقِ مقال کا حکم اور ان کے فوائد:

اللہ پاک اپنے مومن بندوں کو اپنے تقویٰ کا حکم کرتا ہے اور اس بات کا کہ اس کو اس شخص کی طرح پوجیں، گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اس بات کا کہ سیدھی بات کہیں، جس میں کسی طرح کی کجی نہ ہو اور نہ کوئی انحراف و میلان ہو اور ان سے وعدہ کیا کہ جب وہ ایسا کریں گے تو اس پر ان کو اس طرح سے ثواب دے گا کہ ان کے کام بنا دے گا، یعنی اعمالِ صالح کی ان کو توفیق دے گا اور اُن کے اگلے گناہ بخشے گا اور وہ گناہ جو مستقبل میں ان سے کبھی واقع ہو جائیں گے، ان سے توبہ کرنے کا ان کو الہام کرے گا۔ پھر فرمایا کہ جو اللہ کے اور اس کے رسول کے کہے پر چلے گا تو اس نے بڑی مراد پائی، وہ یہ ہے کہ دوزخ کی آگ سے پناہ دیا جائے گا اور نعیم مقیم کی طرف جائے گا۔

[1] فتح القدير (٤/ ٤٠٦) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٤٩) [3] فتح البيان (١١/ ١٥٠_ ١٥٢)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی، پھر جب فارغ ہوئے تو اپنے دستِ مبارک سے ہماری طرف اشارہ کیا تو ہم بیٹھ گئے۔ پھر فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اس بات کا حکم دوں کہ تم اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کرو۔ پھر آپ ﷺ عورتوں کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے امر فرمایا ہے کہ میں تم کو حکم دوں اس بات کا کہ تم اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو۔[1]

امام ابن ابی الدنیا نے کتاب التقویٰ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بھی منبر پر کھڑے ہوئے تو میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا... الآية﴾[2] (غريب جدا)

عبدالرحیم بن زید العمی نے عن ابیہ عن محمد بن کعب عن ابن عباس موقوفاً روایت کیا ہے کہ جس شخص کو یہ بات اچھی لگے کہ وہ اکرم مردم (بہت عزت والا آدمی) ہو تو چاہیے کہ اللہ سے ڈرے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولِ سدید "لا إله إلا الله" ہے۔[3] امام عکرمہ رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا ہے کہ سدید صدق ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سداد ہے[4] (یعنی قول وفعل کی درستی اور راستی)۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا ہے کہ صواب ہے (راست، خطا کی ضد۔ سچائی) اور تمام قول صحیح ہیں۔[5] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو ہر کام میں اور صحیح اور حق بات کہو۔ امام قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ زید اور زینب رضی اللہ عنہما کی شان میں سیدھی بات کہو اور نبی اکرم ﷺ کو اس شے کی طرف منسوب نہ کرو جو حلال نہیں۔[6] کسی نے کہا: قولِ سدید یہ ہے کہ اس کا ظاہر اس کے باطن کے مطابق ہو۔ کسی نے کہا: وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات ارادہ کی گئی نہ اس کے غیر کی۔ کسی نے کہا کہ اصلاح بین الناس ہے۔ "سدید" ماخوذ ہے تسدیدِ سہم سے، یعنی تیر کو سیدھا کرنا، تاکہ اس سے ٹھیک نشانے پر لگایا جائے۔

آیت سے یہ ظاہر ہے کہ اللہ پاک نے ان کو یہ امر فرمایا ہے کہ جس شے کو کرتے ہیں اور جس کو چھوڑتے ہیں، اس سب میں قولِ سدید کہیں۔ چنانچہ یہ کسی ایک نوع کے ساتھ خاص نہیں ہے، اگرچہ لفظ میں وہ شے نہیں جو عموم

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١١/ ٣١٥٨) مسند أحمد (٤/ ٤١٣) اس کی سند میں "لیث بن ابی سلیم" ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٨٣) اس کی سند میں "عبدالعزیز بن عمران زہری" ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١١/ ٣١٥٨)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (١١/ ٣١٥٨)
[5] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٨٣)
[6] تفسیر القرطبي (١٤/ ٢٥٢)

کی مقتضی ہو، لیکن مقام ایسا ہے کہ اس سے یہ معنی لیے جاتے ہیں، کیوں کہ اللہ پاک نے اپنے بندوں کو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ایسی بات کہیں جو اُن لوگوں کے قول کے خلاف ہو جو اذیت دینے والے ہیں۔ پھر یہ لوگ جنھوں نے تقویٰ اور قولِ سدید کے بارے میں حکم کا اتباع کیا، ان کے لیے جو اجر وثواب ہے اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا۔

چنانچہ ارشاد فرمایا کہ سنوار دے تم کو تمھارے کام، یعنی تمھارے کاموں کو درست کر دے گا نہ کہ خراب، اس شے کے سبب سے جس کی طرف تم کو ہدایت کرے گا اور اس میں تم کو توفیق دے گا۔ یا یہ معنی ہیں کہ تمھارے کاموں کو قبول کر لے گا اور بخش دے گا تم کو تمھارے گناہ، یعنی ان کو مکفر ومغفور کر دے گا اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اس کام میں جو طاعت ہے اور اس کام سے بچنے میں جو معصیت ہے تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اچھی طرح، اور اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی حاصل ہو گئی۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو پہلے مضمون کا مقرر ہے، یعنی اس کی تائید کرتا ہے۔ پھر جب اللہ پاک اس خیر وخوبی کے بیان سے جو اہلِ طاعت کے لیے ہے، فارغ ہوا اس عذاب کے بیان کے بعد جو اہلِ معصیت کے لیے ہے تو تکالیفِ شرعیہ کی عظمتِ شان اور ان کے امر کی صعوبت وشدت بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝٧٢ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝٧٣﴾

بلاشبہ ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اسے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے اور وہ (امانت) انسان نے اُٹھا لی، یقیناً وہ بڑا ظالم اور بہت جاہل ہے ﴿72﴾ (ہم نے یہ امانت اس لیے اُٹھوائی) کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں پر رحم فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿73﴾

آسمانوں وزمین اور پہاڑوں کا بارِ امانت اٹھانے سے معذرت اور انسان کا اس کو اٹھانا:

انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے، یعنی اپنی جان پر ترس نہ کھایا۔ امانت کیا ہے؟ پرائی چیز کو رکھنا اپنی خواہش روک کر۔

---

[1] فتح البیان (۱۱/ ۱۵۲۔ ۱۵۳)

آسمان و زمین میں اپنی خواہش نہیں ہے، یا اگر ہے تو وہی ہے جس پر قائم ہیں۔ آسمان کی خواہش پھرنا، زمین کی خواہش ٹھہرنا۔ انسان میں خواہش اور ہے اور اس کے خلاف اگر حکم ہو اور پرائی چیز کو اپنے جی کے خلاف تھامنا بڑا زور چاہتا ہے۔ اس کا انجام یہ کہ منکروں کو قصور پر پکڑنا اور ماننے والوں کا قصور معاف کرنا، اب بھی یہی حکم ہے۔ کسی کی امانت کوئی جان کر ضائع کرے تو بدلہ ہے اور بے اختیار ضائع ہو تو بدلہ نہیں۔ انتھی۔

1 امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ امانت سے مراد طاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ان پر پیش کیا، اس سے پہلے کہ اس کو آدم علیہ السلام پر پیش کرے، چنانچہ انھوں نے اس کی طاقت نہ رکھی تو آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ میں نے امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے اس کی طاقت نہ رکھی۔ پھر کیا تو لینے والا ہے اس کے ساتھ جو اس میں ہے؟ عرض کی: اس میں کیا ہے؟ فرمایا: اگر تو اچھا کرے گا تو جزا دیا جائے گا اور اگر برا کرے گا تو عذاب کیا جائے گا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے اس کو لے لیا، پھر اسے اٹھا لیا۔ فذلک قولہ تعالیٰ: ﴿وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ [1]

2 علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ امانت فرائض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا کہ اگر وہ ان کو ادا کریں گے تو ان کو ثواب دے گا اور اگر ان کو ضائع کریں گے تو ان کو عذاب دے گا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو مشکل سمجھا اور اللہ کے دین کی عظمت کے خیال سے نہ کہ نافرمانی کرتے ہوئے، وہ اس بات سے ڈرے کہ وہ ان کے ساتھ قائم نہ رہ سکیں گے۔ پھر اللہ نے ان کو آدم علیہ السلام پر پیش کیا تو آدم علیہ السلام نے ان کو ان باتوں کے ساتھ قبول کیا جو ان میں ہیں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ یعنی "غِرًّا بِأَمْرِ اللهِ" [2] ("غر" بالکسر کے معنی ہیں کارنا آزمودہ، ناتجربہ کار)۔

3 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے کہ آدم علیہ السلام پر امانت پیش کی گئی تو فرمایا: لے اس کو اس کے ساتھ جو اس میں ہے، پھر اگر تو اطاعت کرے گا تو تیری مغفرت کروں گا اور اگر نافرمانی کرے گا تو تجھے عذاب کروں گا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ میں نے قبول کیا، پھر اس دن میں اتنا وقت نہیں گزرا تھا، جتنا کہ عصر اور رات کے درمیان ہے کہ آپ علیہ السلام سے خطا سرزد ہو گئی۔

4 امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے قریب روایت کیا ہے اور اس کی سند میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمہ اللہ کے درمیان نظر اور انقطاع ہے۔ والله أعلم.

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ٣٣٧۔ ٣٣٨) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٥٩)

5 امام مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک، حسن بصری اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ امانت فرائض ہیں۔ اَور لوگوں نے کہا ہے کہ امانت اطاعت ہے۔[1]

6 امام اعمش رحمہ اللہ نے عن ابی الضحیٰ عن مسروق روایت کیا ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: امانت سے یہ ہے کہ عورت اپنی شرم گاہ پر امین بنائی گئی ہے۔

7 امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امانت دین وفرائض وحدود ہیں۔[2]

8 بعض نے کہا ہے کہ امانت جنابت سے غسل کرنا ہے۔

9 امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ امانت تین کام ہیں: نماز، روزہ اور نہانا جنابت سے۔

ان سب اقوال کے درمیان کسی طرح کا تضاد نہیں ہے، بلکہ متفق ہیں اور اس بات کی طرف راجع ہیں کہ امانت تکلیف ہے اور اوامر ونواہی کا ان کی شرط کے ساتھ قبول کرنا ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ اگر ان کے ساتھ قیام کیا تو ثواب دیا جائے گا اور اگر ان کو ترک کیا تو عذاب کیا جائے گا۔ چنانچہ انسان نے ان کو قبول کیا اپنے جہل وظلم وضعف کے باوجود (تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ میں اسی طرح ہے) مگر وہ شخص جس کو اللہ پاک توفیق دے۔ وباللہ المستعان.

10 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: امانت کو پیش کیا، "سبع طبائق طرائق" پر، یعنی ساتوں آسمانوں پر جو تاروں سے زینت دیے گئے ہیں اور حاملینِ عرشِ عظیم پر۔ پھر آسمانوں سے کہا گیا: کیا تم امانت کو اٹھاؤ گے اور جو کچھ اس میں ہے؟ عرض کی: اس میں کیا ہے؟ راوی نے کہا ہے کہ ان سے کہا گیا: اگر تم اچھا کرو گے تو جزا دیے جاؤ گے اور اگر برا کرو گے تو عذاب کیے جاؤ گے۔ عرض کی: نہیں۔ پھر اس کو پیش کیا۔ "أرضین سبع شداد" پر جو میخوں کے ساتھ، یعنی پہاڑوں کے ساتھ جکڑی گئی ہیں "وَذُلِّلَتْ بِالْمِهَادِ" یعنی اور پست کی گئی ہیں بچھونے کے ساتھ، یعنی ان کو پست اور نرم کر کے بچھونے کی طرح بنا دیا ہے کہ ان پر قرار پکڑیں۔ راوی نے کہا: پھر ان سے کہا گیا: کیا تم اٹھاتے ہو امانت کو اور جو کچھ اس میں ہے؟ عرض کی: اس میں کیا ہے؟ راوی نے کہا: پھر ان سے کہا گیا: اگر تم اچھا کرو گے تو جزا دیے جاؤ گے اور اگر برا کرو گے تو سزا کیے جاؤ گے۔ عرض کی: نہیں۔ پھر اس کو پیش کیا: "جبال شم شوامخ صعاب صلاب" پر، یعنی اونچے دشوار گزار سخت پہاڑوں پر۔ راوی نے کہا: ان سے کہا گیا: کیا تم اٹھاؤ گے امانت کو اور جو کچھ اس میں ہے؟ عرض کی: اس میں کیا ہے؟ راوی نے کہا: ان سے کہا گیا: اگر تم اچھا کرو گے تو جزا دیے جاؤ گے اور اگر برا کرو گے تو سزا دیے جاؤ گے۔ عرض کی: نہیں۔

---

[1] تفسیر الطبري (۲۰/ ۳۳۷) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۶۸۳۔ ۶۸٤) [2] تفسیر الطبري (۲۰/ ۳۳۹)

11 امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے جب اپنی خلق کو پیدا کیا تو انس وجن اور آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو اکٹھا کیا، پھر آسمانوں سے ابتداء کی اور امانت کو ان پر پیش کیا اور وہ طاعت ہے۔ پھر ان سے فرمایا: کیا تم اس امانت کو اٹھاؤ گے اور لیکن مجھ پر فضل وکرامت وثواب ہے جنت میں؟ تو آسمانوں نے عرض کی: اے رب! ہم تو اس امر کی طاقت نہیں رکھتے اور ہم کو قوت نہیں ہے، لیکن ہم تیرے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ پھر امانت کو زمینوں پر پیش کیا تو اُن سے فرمایا: کیا تم اٹھاتے ہو اس امانت کو اور قبول کرتے ہو اس کو مجھ سے اور میں تم کو فضل وکرامت عطا کروں گا؟ چنانچہ انھوں نے عرض کی: یا رب! ہم کو اس پر کسی طرح کا صبر نہیں ہے اور نہ ہم طاقت رکھتے ہیں، لیکن ہم تیرے حکم کے سننے والے اور ماننے والے ہیں جس شے کا تو نے ہم کو امر فرمایا ہے، اس میں تیری نافرمانی نہیں کریں گے۔ پھر آدم علیہ السلام کو قریب بلایا تو اُن سے فرمایا: کیا تو اٹھائے گا اس امانت کو اور اس کی رعایت کرے گا، جیسا کہ اس کی رعایت کا حق ہے؟ اس وقت آدم علیہ السلام نے عرض کی: تیرے نزدیک میرے لیے کیا ہے؟ فرمایا: اے آدم! اگر تو اچھا کرے گا اور اطاعت کرے گا اور امانت کی رعایت کرے گا تو تیرے لیے میرے پاس کرامت وفضل اور جنت میں حسنِ ثواب ہے اور اگر تو نافرمانی کرے گا اور اس کی رعایت نہ کرے گا جیسا کہ اس کی رعایت کا حق ہے اور برا کرے گا تو بے شک میں تجھ کو عذاب کرنے والا ہوں اور سزا دینے والا ہوں اور میں تجھ کو نار میں اتاروں گا۔ عرض کی: یا رب! میں راضی ہوا اور اس کو اٹھا لیا۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے اس وقت فرمایا: ”قَدْ حَمَّلْتُكَهَا“ یعنی تحقیق میں نے اس کو تجھ پر لاد دیا۔ فذلک قولہ تعالیٰ: ﴿ وَحَمَلَهَا الْاِنْسٰنُ ﴾ (رواه ابن أبي حاتم)

12 امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اس کو آسمانوں پر پیش کیا تو وہ بولے: یا رب! تو نے ہم پر تاروں کو اور آسمان کے بسنے والوں کو اور ”مَا ذُكِرَ“ کو لادا ہے اور میں کوئی اور ثواب نہیں چاہتا، کوئی فریضہ نہ اٹھاتا ہوں۔ کہا: اور پیش کیا اس کو زمین پر تو وہ بولی: یا رب! تو نے مجھ میں درخت لگائے اور مجھ میں نہریں جاری کیں اور زمین پر بسنے والے بسائے اور ”مَا ذُكِرَ“ اور میں کوئی اور ثواب نہیں چاہتی اور نہ کوئی فریضہ اٹھاتی ہوں۔ پہاڑوں نے بھی اسی طرح کہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَحَمَلَهَا الْاِنْسٰنُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ یعنی اپنے انجام کام میں نادان ہے اور اسی طرح امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[1]

13 ابن اشوع سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے امانت کا اٹھانا ان پر پیش کیا تو انھوں نے تین دن تین رات اللہ تعالیٰ کی طرف شور وغل کیا اور عرض کی: اے ہمارے رب! ہم کو عمل کی کسی طرح کی طاقت نہیں ہے اور ہم ثواب نہیں چاہتے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٦٨٤۔ ٦٨٥)

14 پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ انسان نے کہا کہ میرے دونوں کانوں اور دونوں کندھوں کے درمیان۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: بے شک میں تیری اعانت کرنے والا ہوں اس پر اور بے شک میں تیری اعانت کرنے والا ہوں تیری دونوں آنکھوں پر دوطبقوں (تہوں) سے۔ پھر جب وہ تجھ سے اس شے کی طرف جھگڑا کریں، جس کو میں مکروہ رکھتا ہوں تو تو بند کر اور میں تیری مدد کرنے والا ہوں تیری زبان پر دوطبقوں سے، پھر جس وقت وہ تجھ سے اس شَے کی طرف جھگڑا کریں جس کو میں مکروہ رکھتا ہوں تو تو بند کر، اور میں تیری شرم گاہ پر لباس سے تیری مدد کرنے والا ہوں، پھر تو اس کو اس شے کی طرف مت کھول جس کو میں مکروہ رکھتا ہوں۔[1] (ثم روى عن أبي حازم نحو هذا)

15 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن زید رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر امانت پیش کی یہ کہ فرض کرے، ان پر دین اور ٹھہرا دے ان کے لیے ثواب اور عِقاب اور امین بنائے ان کو دین پر۔ وہ بولے کہ ہم تو تیرے حکم کے مسخر ہیں، ہم نہیں چاہتے کوئی ثواب اور کوئی عتاب۔ کہا: اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو آدم علیہ السلام پر پیش کیا تو آدم علیہ السلام نے کہا: میرے دونوں کانوں اور کندھوں کے درمیان۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: جب کہ تو نے اس کو اٹھالیا تو اب میں تیری اعانت کروں گا، تیری آنکھ کے لیے ایک پردہ بناؤں گا، پھر جب تو اس سے ڈرے کہ نظر کرے اس شَے کی طرف جو تجھے حلال نہیں ہے تو تُو اس پر اس کا پردہ چھوڑ دینا اور تیری زبان کے لیے ایک دروازہ اور ایک غلق بناؤں گا (غلق بالتحریک صراح میں بہ معنی کلید لکھا ہے، ظاہر یہ ہے کہ اس سے وہ شے مراد ہے جس سے دروازہ بند کرتے ہیں)۔ پھر جب تو ڈرے تو بند کر لینا۔ اور تیری شرم گاہ کے لیے ایک لباس بناؤں گا، چنانچہ تو اس کو مت کھولنا، مگر اس شے پر جس کو میں نے تیرے واسطے حلال کیا۔[2]

16 امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حکم بن عمیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، یہ شخص اصحاب صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ امانت اور وفا ابن آدم پر نبیوں کے ساتھ نازل ہوئی، چنانچہ وہ اس کے ساتھ بھیجے گئے۔ چنانچہ ان میں سے رسول ہے اور ان میں سے نبی رسول ہے اور قرآن نازل ہوا اور وہ اللہ کا کلام ہے اور عجمیت وعربیت نازل کی گئی تو اپنی اپنی زبان کے ساتھ قرآن اور سنن کو جانا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے امر سے کوئی شے نہیں چھوڑی، ان چیزوں میں سے جن کو کریں اور جن کو نہ کریں اور ان سے بچیں اور وہ ان پر اللہ کی حجتیں ہیں، مگر اس کو ان کے واسطے بیان کر دیا، چنانچہ نہیں ہے کوئی زبان والی، مگر حال یہ ہیں کہ وہ اچھی اور بری چیز کو پہچانتی ہیں۔ پھر امانت وہ پہلی چیز ہے جو اٹھائی جائے گی اور اور اس کا اثر باقی رہے گا لوگوں کے دلوں کی جڑوں میں۔ پھر وفا اور عہد اور ذمے اٹھائے جائیں گے اور کتابیں باقی رہ جائیں گی۔ چنانچہ عالم عمل کرے گا اور جاہل ان کو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٦٠)
[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٣٩)

نہ پہچانے گا اور ان کا انکار کرے گا اور ان کو اٹھائے گا نہیں، یہاں تک کہ میری طرف اور میری امت کی طرف پہنچے اور ہلاک نہ ہو گا اللہ پر، مگر ہلاک ہونے والا (ہلاک ہونے والا، یعنی جو کوئی اس رحمتِ واسعہ سے محروم ہوا، یا اس کے سیئات غالب ہوئے باوجود وسعتِ مغفرت کے اور کثرتِ افرادِ حسنہ کے تو وہ ہلاک ہونے والا ہے۔ "أي حتم هلاكه و سددت عليه مسالك الهدى"[1] یعنی اس کی ہلاکت قطعی ہوئی اور ہدایت کی راہیں اس پر بند کی گئیں۔ كذا في المجمع) اور غفلت نہ کرے گا اس سے مگر تارک۔

"فالحذر أيها الناس و إياكم والوسواس الخناس وإنما يبلوكم أيكم أحسن عملا."[2] هذا حديث غريب جدا و له شواهد من وجوه آخر.

17 پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: پانچ چیزیں ہیں کہ جو کوئی ان کو قیامت کے دن لے کر آئے گا ایمان کے ساتھ تو وہ جنت میں داخل ہو گا، جو کوئی محافظت کرے پانچوں نمازوں کی ان کے وضو اور ان کے رکوع اور سجود پر اور ان کے وقتوں پر اور اپنے مال سے خوشی کے ساتھ زکات ادا کرے۔ اور کہا کرتے تھے کہ اللہ کی قسم! اس کو صرف مومن ہی کرے گا اور رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے اگر اس کی استطاعت رکھے اور امانت کو ادا کرے۔ لوگوں نے کہا: اے ابو الدرداء! امانت ادا کرنا کیا ہے؟ فرمایا: جنابت سے نہانا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے امین نہیں کیا ہے ابن آدم کو کسی شے پر اس کے دین سے اس کے سوا۔[3] (وهكذا رواه أبو داود عن محمد بن عبد الرحمن العنبري عن أبي علي عبيد الله بن عبد المجيد الحنفي عن أبي العوام عمران بن داوٗد القطان به)

18 نیز امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل سارے گناہوں کا کفارہ کرتا ہے، یا فرمایا: ہر شے کا کفارہ کرتا ہے مگر امانت کا۔ صاحبِ امانت لایا جائے گا، پھر اس سے کہا جائے گا: ادا کر تو اپنی امانت کو تو وہ عرض کرے گا: کہاں سے اے رب! اور دنیا بھی ختم ہو چکی ہے؟ پھر اس سے کہا جائے گا کہ ادا کر اپنی امانت تو پھر وہ یہی کہے گا۔ پھر اللہ فرمائے گا: لے جاؤ اس کو اس کی ماں ہاویہ کی طرف۔ پھر اسے ہاویہ کی طرف لے جائیں گے تو وہ اس میں گرے گا، یہاں تک کہ اس کی تہہ تک پہنچے گا، پھر اس امانت کو اس کی ہیئت کی طرح وہاں پائے گا۔ چنانچہ اسے اٹھائے گا، پھر اس کو اپنے کندھے پر رکھے گا، پھر اس کو جہنم کے کنارے کی طرف لے کر چڑھے گا، یہاں تک کہ جب وہ یہ خیال کرے گا کہ تحقیق نکل آیا تو اس کا قدم پھسل جائے گا۔ پھر وہ اس کی تہہ میں گر جائے گا۔ ابد الابدین، یعنی

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٥/ ١٦٥) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٣٨۔ ٣٣٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔

[3] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٣٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٩) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٨٨)

ہمیشہ اسی طرح ہوا کرے گا۔ کہا: امانت نماز میں ہے اور امانت روزے میں ہے اور امانت وضو میں ہے اور امانت حدیث میں ہے اور ان سب سے سخت ودائع ہیں، یعنی ودیعتیں۔ زاذان کہتے ہیں: پھر میں سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے ملا اور میں نے کہا تم سنتے نہیں ہو جو تمھارے بھائی عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں تو سیدنا براء رضی اللہ عنہ بولے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے سچ کہا۔[1] (وقال شريك يعني الراوي عن الأعمش وحدثنا عياش العامري عن زاذان عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبي ﷺ بنحوه ولم يذكر الأمانة في الصلاة وفي كل شيء إسناده جيد و لم يخرجوه)

19 من جملہ ان حدیثوں کے جو امانت سے متعلق ہیں، وہ حدیث ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے دو حدیثیں بیان فرمائیں، ان میں سے ایک تو میں نے دیکھ لی اور دوسری کا میں انتظار کر رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے ہم کو حدیث بیان کی کہ امانت نازل ہوئی مردوں کے دلوں کی جڑ میں۔ پھر قرآن نازل ہوا تو قرآن سے جانا اور سنت سے جانا۔ پھر آپ ﷺ نے ہم کو حدیث بیان کی امانت کے رفع ہونے کی تو فرمایا کہ سوئے گا مرد ایک نیند تو اس کے دل سے امانت قبض کی جائے گی تو اس کا اثر آبلے کی طرح ہو جائے گا، جیسے کہ انگارا لڑھکائے تو اس کو اپنے پاؤں پر دیکھے تو اس کو ابھرا ہوا پائے، حالاں کہ اس میں کوئی شے نہیں ہے۔ کہا: پھر کنکریاں لیں اور ان کو اپنے پاؤں پر لڑھکایا۔ کہا: پھر صبح کریں گے لوگ خرید و فروخت کریں گے قریب نہ ہوگا کوئی اس کے کہ امانت ادا کرے، یہاں تک کہ کہا جائے گا کہ بنی فلاں میں ایک شخص ہے جو امانت دار ہے، یہاں تک کہ اس شخص کے لیے کہا جائے گا کہ وہ کیا قوی ہے اور کیا ظریف ہے اور کیا عاقل ہے؟ حالاں کہ اس کے دل میں ایک رائی کے دانے کے برابر ایمان نہ ہوگا اور البتہ تحقیق مجھ پر ایک زمانہ آیا اور میں پروا نہیں کرتا کہ تم میں سے جس کسی سے خرید و فروخت کروں اگر وہ مسلمان ہے تو البتہ رد کرے گا اس کو مجھ پر اس کا دین اور اگر وہ نصرانی ہے یا یہودی تو البتہ رد کرے گا اس کو مجھ پر اس کا ساعی، یعنی اس کا والی اور حاکم۔ لیکن آج کے دن میں نہیں ہوں کہ خرید و فروخت کروں مگر فلاں اور فلاں سے۔[2]

(وأخرجاه في الصحيحين من حديث الأعمش به)

20 امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: چار خصلتیں ہیں کہ جس وقت وہ تجھ میں ہوں تو تجھ پر کوئی ضرر نہیں ہے اس شے کا جو دنیا سے تجھ سے فوت ہوئی: حفظِ امانت، صدقِ حدیث، حسنِ خلیقہ اور عفتِ طعمہ۔[3] (هكذا رواه الإمام أحمد في مسند عبدالله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ)

---

(1) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٤٠) اس کی سند میں "شریک بن عبداللہ" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٠٧١)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٣) مسند أحمد (٥/ ٣٨٣)

(3) مسند أحمد (٢/ ١٧٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٣٣)

21 امام طبرانی رحمہ اللہ نے مسند عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ میں عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «أَرْبَعٌ إِذَا كُنَّ فِيكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا: حِفْظُ أَمَانَةٍ وَّصِدْقُ حَدِيثٍ وَّحُسْنُ خَلِيقَةٍ وَّعِفَّةُ طُعْمَةٍ»[1] پس اس میں دو باتیں ہیں ایک تو اس کی اسناد میں ابن حجیرہ کو حارث بن یزید اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان زیادہ کیا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ اس کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مسند سے ٹھہرایا ہے۔

امانت کے ساتھ قسم کھانے سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کتاب الزہد میں خناس بن سحیم یا جبلہ بن سحیم سے روایت کیا ہے، کہا: میں زیاد بن حُدیر کے ہمراہ جابیہ سے آیا تو میں نے اپنے کلام میں کہا: ”لَا وَالْأَمَانَةِ“ تو زیاد نے رونا شروع کیا کہ روتے تھے اور روتے تھے، یعنی خوب روئے۔ چنانچہ میں نے گمان کیا کہ میں نے کوئی امرِ عظیم کیا تو میں نے اس سے کہا: کیا یہ مکروہ ہے؟ کہا: ہاں! عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ امانت کے ساتھ قسم کھانے سے سختی سے منع کرتے تھے۔[2] اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی وارد ہوئی ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے امانت کے ساتھ قسم کھائی تو وہ ہم سے نہیں ہے۔[3] (تفرد به أبو داود)

بارِ امانت اٹھانے کا نتیجہ:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ ﴾ یعنی ابن آدم نے جو امانت کو اٹھایا اور وہ تکالیفِ شرعیہ ہیں تو اس لیے کہ اللہ ان میں سے منافق مردوں اور عورتوں کو عذاب کرے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اہلِ ایمان سے ڈر کر ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور اہلِ کفر کی متابعت کے لیے کفر کو چھپاتے ہیں۔ اور عذاب کرے مشرک مردوں اور عورتوں کو، یہ وہ لوگ ہیں جن کا ظاہر و باطن اللہ کے ساتھ شرک پر ہے اور رسولوں کی مخالفت پر ہے۔ ﴿ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾ کا یہ مطلب ہے: تاکہ رحم کرے اللہ ان لوگوں پر جو کہ خلق میں سے اللہ پر اور اس کے ملائکہ اور رسولوں پر اور کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی اطاعت کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ آسمان و زمین اور پہاڑ امانت سے ڈرے کہ اس کو ادا نہ کریں تو ان کو سزا

---

[1] شعب الإيمان (٤/ ٢٠٥) امام طبرانی رحمہ اللہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ نیز امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ہی روایت کیا ہے۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ”تفسیر“ (٣/ ٦٨٦) میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

[2] الزهد لابن المبارك (١/ ٧٠۔ ٧١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٤)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٨٣۔ ٦٨٧)

ملے یا امانت میں خیانت کرنے سے ڈرے۔ یہ امانت جو یہاں مذکور ہے اس میں اختلاف ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: سارے مفسروں کے قول میں امانت کے معنی طاعت و فرائض ہیں، جن کے پورا کرنے سے ثواب اور ضائع کرنے سے عذاب کا تعلق ہوتا ہے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: امانت عام ہے، دین کے تمام وظائف اس میں شامل ہیں۔ صحیح قول کی بنا پر جمہور کا قول یہی ہے۔ بعض کی تفاصیل میں اختلاف ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ امانت اموال کی امانت میں سے ہے، جیسے: ودیعتیں وغیرہ، ان سے دوسرا قول یہ مروی ہے کہ کل فرائض میں امانت ہے اور ان میں سے سب سے زیادہ سخت مالوں کی امانت ہے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول پہلے گزر چکا ہے اور اسی طرح ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا قول بھی گزر چکا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ انسان کی سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا کی وہ اس کی شرم گاہ ہے اور فرمایا: یہ امانت ہے، میں نے اس کو تیرے پاس ودیعت رکھا ہے، چنانچہ تو اس کو متلبس مت کرنا مگر حق کے ساتھ۔ چنانچہ اگر تو نے اس کو محفوظ رکھا تو میں تجھے محفوظ رکھوں گا۔ چنانچہ فرج امانت ہے اور کان امانت ہے اور آنکھ امانت ہے اور زبان امانت ہے اور پیٹ امانت ہے اور ہاتھ امانت ہے اور پاؤں امانت ہے اور اس شخص کا ایمان نہیں ہے جس کی امانت نہیں ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ امانت آدم علیہ السلام کا اپنے فرزند قابیل کو اپنے فرزند ہابیل پر امین بنانا ہے اور خیانت قابیل کا ہابیل کو قتل کرنا ہے۔[2] یہ کیا بعید قول ہے۔ کاش! میں اس شے کو جان سکتا جو امام سدی رحمہ اللہ کو یہ بات کہنے کا باعث ہوئی کہ اس نے اس آیت کی یہ تفسیر کی۔ پھر اگر یہ کسی دلیل کی وجہ سے ہے، جس نے اس پر دلالت کی، تو وہ کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی عباد ماضین (گزرے ہوئے لوگ) کی حکایت ہے، یہاں تک کہ اس کے واسطے اس میں کوئی متمسک ہو۔

یہ بعید سے بعید تر اور مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ اور اگر اس کی یہ تفسیر اس بنا پر ہے کہ جس بات کی مقتضی عربی لغت ہے، اس پر عمل کر کے یہ بات کی ہے تو لغتِ عرب میں وہ شے نہیں ہے جو اس کی مقتضی ہو اور اس بات کی موجب ہو کہ اس امانتِ مطلق کو ایک ایسی شے پر محمول کریں جو اس عالم کے شروع میں ہوئی ہے۔ اور اگر اس کی یہ تفسیر رائے محض سے ہے تو کتابِ عزیز اس لائق نہیں ہے کہ آرائے رجال کے تلاعب کے لیے نشانہ بنائی جائے، اسی لیے اس شخص پر وعید وارد ہوئی ہے جس نے قرآن شریف کی تفسیر اپنی رائے سے کی۔ چنانچہ حق کے طالب کو چاہیے کہ ایسی تفسیروں کو قبول کرنے سے بچے اور کتاب اللہ کی تفسیر میں اس شے کو اپنے ہاتھوں سے خوب مضبوط پکڑے جس کا تقاضا عربی لغت کرتی ہے، کیوں کہ کتاب اللہ قرآنِ عربی ہے جس طرح کہ اللہ پاک نے اس کا وصف فرمایا ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/ ٤٠٧) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٥٢_ ٢٥٣)

پھر اگر رسول اللہ ﷺ سے تیرے پاس تفسیر آئے تو تُو اس کو لے اور اس کے غیر کی طرف توجہ مت کر۔ کما قیل: "إِذَا جَاءَ نَهرُ اللهِ بَطَلَ نَهرُ مَعْقَلٍ" اور اسی طرح وہ تفسیر ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آئے، اس لیے کہ یہ من جملہ عرب و اہلِ لغت میں ہیں، ان لوگوں سے ہیں جنھوں نے لغتِ عربی کے ساتھ اصطلاحاتِ شرعی کے علم کو جمع کیا ہے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس شے کے ساتھ لفظ قرآنی کی تفسیر کی ہے جبکہ لغت عرب میں اس لفظ کے معنی ان کی تفسیر سے زیادہ وسیع ہوں تو تجھ پر لازم ہے کہ جو تفسیر اس صحابی نے ذکر کی ہے اس کے ساتھ وہ معنی ضم کرے کہ لغتِ عرب اور اس کے اسرار جس کے مقتضی ہیں تو اس قاعدۂ کلیہ کو اخذ کر، اس سے تو نفع پائے گا۔ اس تفسیر کے خطبے میں ہم وہ بات ذکر کر آئے جو تجھے اس امر کی طرف اشارہ کرے گی۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی گئی تو وہ بولے کہ اس میں کیا ہے؟ چنانچہ ان سے فرمایا: "إِنْ أَحْسَنْتِ آجَرْتُكِ وَإِنْ أَسَأْتِ عَذَّبْتُكِ"۔ یعنی اگر تم اچھا کرو گے تو تم کو اجر دوں گا اور اگر برا کرو گے تو تم کو عذاب کروں گا تو وہ بولے: نہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: پھر جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو اس کو ان پر پیش کیا اور اُن سے یہ کہا گیا تو وہ بولے کہ تحقیق میں نے اس کو اٹھا لیا۔ اس کے مثل غیر امام حسن اور مجاہد رحمہما اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ وہی قول ہے جس پر اہلِ تفسیر ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ یہ امانت وہ دلیلیں ہیں اللہ پاک کی ربوبیت پر جن کو اس نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑ اور باقی مخلوقات میں ودیعت رکھا ہے کہ ان کو ظاہر کریں، ان سب نے تو ان کو ظاہر کیا، مگر انسان کہ اس نے ان کو چھپایا اور ان کا جحد و انکار کیا۔ بعض متکلمین جنھوں نے قرآن شریف کی تفسیر اپنی رائے زائف و ناسرہ سے کی ہے اسی طرح کہا ہے۔ چنانچہ اس قول کی بنا پر ﴿عَرَضْنَا﴾ کے معنی "أَظْهَرْنَا" ٹھہریں گے۔

علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: یہ بات معلوم ہے کہ جماد نہ سمجھتا ہے نہ ہی جواب دیتا ہے تو تقدیر حیات کی اس میں ضرور ہے اور یہ عرض (پیش کرنا) جو اس آیت میں ہے عرضِ تخییر ہے عرضِ الزام نہیں۔ اگر اللہ پاک ان کے لیے امانت کو اٹھانا لازمی کرتا تو وہ اس کے اٹھانے سے باز نہ رہتے اور سارے جمادات اللہ عزوجل کے روبرو خاضع و ذلیل و پست ہیں اور اس کے حکم و امر کے مطیع اور فرماں بردار ہیں اور اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عرض سے مراد امانت کا اہلِ سماوات پر پیش کرنا ہے جو فرشتے ہیں خود آسمانوں پر عرض کرنا مراد نہیں ہے۔ قفال وغیرہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں عرض کرنا ایک مثال کا بیان کرنا ہے، یعنی آسمان و زمین اور پہاڑ باوجود بڑے ہونے کے ان کے جسموں کے، اگر وہ ایسے ہوتے کہ ان کا مکلف کرنا جائز ہوتا تو شریعتوں کی پابندی، یعنی احکامِ شرعی کا اتباع کرنا ان پر ثقیل وگراں اور دشوار ہوتا، اس لیے کہ ان میں ثواب وعقاب ہے۔

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٥٤)

مطلب یہ ہے کہ تکلیف ایک ایسا امرِ عظیم ہے جس کا حق یہ ہے کہ آسمان و زمین اور پہاڑ اس سے عاجز ہوتے ہیں اور اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے حالانکہ مقرر انسان اس کا مکلّف کیا گیا اور وہ ظلوم وجہول ہے، اگر وہ عقل رکھتا سمجھتا بوجھتا۔ یہ آیت اس طرح کی ہے: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۚ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾[1] [الحشر: ۲۱] ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تو دیکھتا کہ خوفِ الٰہی سے وہ پست ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہم ان مثالوں کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ غور وفکر کریں۔'' کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَرَضْنَا ﴾ بہ معنی ''عَارَضْنَا'' ہے، یعنی ہم نے امانت کا معارضہ کیا آسمانوں کے ساتھ اور زمین اور پہاڑوں کے ساتھ، چنانچہ یہ چیزیں امانت سے ضعیف ہو گئیں اور امانت اپنے بوجھ اور گرانی کے ساتھ ان پر راجح ہو گئی۔ کسی نے کہا ہے کہ امانت کا عرض جو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر ہوا تھا تو یہ آدم علیہ السلام کی طرف سے ہوا تھا۔ اللہ پاک نے ان کو اس بات کا حکم دیا تھا کہ اس امانت کو ان پر پیش کریں۔ یہ قول بھی تحریف ہے، تفسیر نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ امانت سے مراد عقل ہے۔ راجح قول وہی ہے جو ہم نے پہلے جمہور سے نقل کیا ہے، اس کے سوا دوسرا کوئی قول ضعف سے خالی نہیں، کیوں کہ ان کا ورود نہ تو عربی معنی پر ہے اور نہ ہی وہ اس پر منطبق ہیں جس شے کی مقتضی شرع ہے اور نہ اس کے مطابق ہے جو ﴿ اَلْاَمَانَةَ ﴾ کی تعریف تقاضا کرتی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پہلے گزر چکے ہیں۔ ایک روایت میں ان سے یہ مروی ہے کہ امانت سے مراد لوگوں کی امانتیں ہیں اور عہد کا وفا کرنا ہے، پس ہر مومن کا فرض ہے کہ کسی مومن کو دھوکا نہ دے اور نہ اس کی خیانت کرے اور نہ ہی کسی ذمی اور اس شخص کی خیانت کرے جس کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو، نہ کسی چھوٹی چیز میں خیانت کرے اور دھوکا دے اور نہ بڑی چیز میں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو اعیانِ سماوات والارض و جبال پر پیش کیا۔ یہ تابعین کی ایک جماعت کا اور اکثر سلف کا قول ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا ﴾ میں ضمیر مونث کی ضمیر کی طرح آئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر عاقل کی جمع تکسیر میں اس قسم کی ضمیر لانا جائز ہے، گو وہ مذکر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات اس لیے ذکر کر دی گئی کہ کہیں یہ وہم نہ ہو کہ مذکر پر مونث کو غالب کیا گیا، یعنی جبال پر سماوات کو۔ (كذا قال الكرخي) یہ تو مانا کہ اس قسم کی ضمیر لانا جائز ہے، لیکن اس کی تو کوئی وجہ چاہیے کہ ''فَأَبَتْ أَنْ تَحْمِلَهَا'' نہ فرمایا۔ واللّٰه أعلم۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سماوات، ارض اور جبال سے چوں کہ معاملہ عقلاء کا کیا گیا اور سوال و جواب ان سے عقلاء کی طرح ہوا، اس لیے ان کے لیے ضمیر بھی عقلاء کی ذکر فرمائی۔ اب یہ بات جاننی چاہیے کہ سماوات وغیرہ کا انکار ابلیس کے انکار کی طرح نہ تھا جس کا

[1] فتح القدير (٤/ ٤٠٨)
[2] تفسير البغوي (٦/ ٣٨٠)

ذکر اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ اَبٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴾ [الحجر: ۳۱] ''اس نے سجدہ کرنے والوں میں شمولیت کرنے سے (صاف) انکار کر دیا۔'' کیوں کہ وہاں سجود فرض تھا اور یہاں امانت عرض تھی (پیش کی گئی تھی)، وہاں انکار از راہِ تکبر تھا اور یہاں برائے استصغار، یعنی امانت کا بارِ گراں اٹھانے سے خود کو صغیر اور حقیر سمجھا، اس لیے کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا ﴾ یعنی وہ امانت سے ڈرے کہ اس کو ادا نہ کریں گے تو عذاب ہوگا۔ چنانچہ دونوں قسم کے انکار میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ﴾ معطوف ہے مقدر پر "أَيْ: فَعَرَضْنَاهَا عَلَى الْإِنْسَانِ وَحَمَلَهَا" یعنی پھر ہم نے اس کو انسان پر پیش کیا اور اس نے اس کو اٹھا لیا۔ مراد آدم علیہ السلام ہیں، یعنی اس پر امانت پیش کرنے کے بعد اس نے اس کے حق کا التزام کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ جس شے کے اٹھانے کی انسان کو تکلیف دی گئی وہ اپنی عظمت و بزرگی و ثقلِ محمل (بوجھ اٹھانے کی ہمت) سے اس درجے کو پہنچا ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے جو اجسام عظیم تر اور قوی تر اور شدید تر ہیں، وہ امانت ان پر پیش کی گئی کہ اسے اٹھائیں اور اس کے ساتھ مشغول ہوں تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اپنے ضعف اور ضعفِ قوت کے باوجود اس کو اٹھا لیا۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ حَمَلَهَا ﴾ کے معنی ہیں: "خَانَ فِيهَا" یعنی انسان نے اس میں خیانت کی اور آیت کو کفار و فساق و عصاۃ کے بارے میں ٹھہرایا۔[1] کسی نے کہا ﴿ حَمَلَهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس کی تکلیف دیا گیا اور اس کا الزام کیا گیا، یا فطرت کی یعنی پیدائش کی، اس کے لیے مستعد اور لائق ہو گیا۔ یا یہ معنی ہیں کہ اس کو اس وقت اٹھایا جب آدم علیہ السلام کی ذریت کو اس کی پشت سے نکالا اور امانت ان پر پیش کی گئی اور ان سے عہد و پیمان لیا گیا۔

﴿ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ یعنی بے شک وہ اس شے کے اٹھانے میں اپنے نفس کے لیے ظلوم ہے اور اس شے کے لیے جہول ہے جو اس کو لازم ہے۔ یا اس شے کی قدر کے لیے جس میں داخل ہوا۔ جیسا کہ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ یا جہول ہے "بِأَمْرِ رَبِّهِ" یعنی اپنے رب کے امر سے۔ جیسا کہ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ظلوم ہے جب کہ اپنے رب کی نافرمانی کی اور جہول ہے، یعنی یہ جانتا نہیں کہ ترکِ امانت میں کیا عذاب ہے۔ کسی نے کہا ہے ظلوم جہول ہے اس لحاظ سے کہ امانت کو اٹھایا اور اس کو وفا نہ کیا اور اس کا ضامن ہوا اور اس کی ضمانت پوری نہ کی، اس کے مثل زبانِ عرب میں اور بہت کلام ہے اور قرآن صرف اسلوبِ عرب ہی پر آیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ حَمَلَهَا ﴾ سے متعلق ہے، یعنی اٹھایا انسان نے امانت کو، تاکہ عذاب کرے اللہ عاصی کو اور ثواب دے مطیع کو اس بنا پر ﴿ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ کا جملہ معترضہ ہوگا جملہ اور اس کی غایت کے درمیان۔ جملہ معترضہ لانے کا یہ فائدہ ہے کہ

[1] فتح القدير (٤/ ٤٠٨) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٥٦)

یہ بتانا مقصود ہے کہ جس بات کا وہ متحمل ہوا تھا اسے وفا نہ کیا۔ امام مقاتل بن سلیمان اور مقاتل بن حیان رحمہما اللہ نے کہا ہے: تاکہ ان کو اس سبب سے عذاب کرے کہ انھوں نے امانت میں خیانت کی اور رسولوں کی تکذیب کی اور وہ میثاق توڑا جس کا اقرار انھوں نے اس وقت کیا تھا جب پشتِ آدم علیہ السلام سے نکالے گئے تھے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ معذب لوگ وہ ہیں جنھوں نے امانت میں خیانت کی اور وہ لوگ جن پر اللہ رجوع فرمائے گا وہ ہیں جنھوں نے امانت کو ادا کیا۔[1]

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: انسان نے امانت کو اٹھایا، تاکہ اللہ اس کے بعض افراد کو عذاب کرے کہ جنھوں نے اس کی رعایت نہ کی، اس بنا پر کہ حرف لام عاقبت، یعنی انجام کے لیے ہے، کیوں کہ اگرچہ عذابِ دنیا امانت کو اٹھانے کی وجہ سے نہیں، لیکن جب امانت کے اٹھانے پر عذاب کا ہونا اس طرح سے مترتب ہوا جیسے افعالِ معلل بالاغراض پر اغراض مرتب ہوتے ہیں، اس لیے وہ معرضِ غرض میں ظاہر کی گئی، یعنی انسان کے امانت اٹھانے کا یہ انجام ہوا کہ اللہ انسانوں میں سے ان لوگوں کو عذاب کرے جنھوں نے اس امانت کو قائم نہیں کیا اور ثواب دے ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ قائم ہوئے۔ پہلے اللہ پاک نے ﴿ عَرَضۡنَا ﴾ فرمایا اور یہاں ﴿ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ ﴾ کہا، متکلم سے اسمِ جلیل کی طرف التفات کیا تو اس سے مقصد امر کی ہولناکی کو ظاہر کرنا اور ہیبت اور خوف کا پیدا کرنا ہے۔

نیز آیت: ﴿ وَيَتُوۡبَ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ﴾ میں دوبارہ جو اسم شریف کو ذکر کیا اور اضمار کی جگہ میں اظہار فرمایا تو اس امر سے مومنین کا مزید اعتناء اور اہتمام ظاہر کرنا منظور ہے، تاکہ مقامِ وعید و وعد سے ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دیا جائے گا۔[2] واللہ أعلم۔ انتہیٰ. معنی یہ ہیں کہ ہدایت کرے اللہ مومنین اور مومنات کو اور ان پر رحم فرمائے اس سبب سے کہ انھوں نے امانت ادا کی۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی پیش کی ہم نے امانت، تاکہ منافق کا نفاق ظاہر ہو جائے اور مشرک کا شرک ظاہر ہو جائے تو اللہ ان کو عذاب کرے اور مومن کا ایمان ظاہر ہو جائے تو اللہ اس پر مغفرت اور رحمت کے ساتھ رجوع کرے، اگر اس سے بعض طاعات میں کوئی کمی ہو گئی ہے۔[3] اسی لیے لفظ توبہ ذکر کیا ہے، چنانچہ یہ اس پر دال ہے کہ مومن عاصی عذاب سے نکلنے والا ہے۔

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴾ یعنی بندوں میں سے جو لوگ مومنین تائبین ہیں اللہ پاک ان کے لیے کثیر المغفرت ہے، جبکہ اس کی امانت وغیرہ کے امور میں سے جو اُن پر واجب تھے، انھوں نے قصور کیا ہو اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت اس طرح سے ہو کہ ان کی کمی اور پھسلاہٹ سے درگزر فرمائے۔ وہ ان پر کثیر الرحمت ہے، اس طرح سے کہ ان کو معاف فرما کر ان کی اطاعت پر ان کو ثواب دیا اور طرح طرح کی نعمتوں اور فضل و کرم سے ان کا اکرام فرمایا۔[4] اللهم عفوا وغفرا.

---

[1] فتح القدير (٤/ ٤٠٨) [2] تفسير أبي السعود (٧/ ١١٨۔ ١١٩)
[3] تفسير البغوي (٦/ ٣٨٢) [4] فتح البيان (١١/ ١٥٣۔ ١٥٧)

الحمد لله والمنة کہ سورۃ الاحزاب کی تفسیر چار بجے شب بروز جمعہ ۲۹ صفر المظفر ۱۳۱۲ ہجری کو محلّہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور اپنے وجہ کریم کے لیے ٹھہرائے اور ہم سب کو اعمالِ صالحہ کی توفیق دے اور خاتمہ بالخیر نصیب کرے اور آیندہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور مکروہاتِ دارین سے بچائے۔ ظاہری اور باطنی دشمنوں سے محفوظ رکھے۔ آمین آمین آمین و صلی اللّٰہ و سلم و بارك علی سیدنا و مولانا محمد وعلی آله و صحبه ملء ما علم و زنة ما علم و عدد ما علم إلی یوم الدین و أنا العبد الراجي رحمة ربه الباري ذوالفقار أحمد النقوي السارنفوري البوفالي عفا اللّٰہ عنه و عن والدیه و أقاربه و أحبابه و أشیاعه و أشیاخه و من أحسن إلیه و أحبه وأبغضه آمین. و الحمد لله أولا وآخراً و ظاهراً وباطناً۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُوۡرَةُ سَبَاٍ

اس سورۂ مبارکہ کی چوّن (۵۴) آیتیں ہیں اور یہ مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ سب کے قول میں مگر ایک آیت کے بارے میں اختلاف ہے، وہ یہ ہے: قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ ایک فرقے نے کہا ہے کہ یہ مکی ہے اور ایک فرقے نے کہا: مدنی ہے۔[1] إن شاء الله تعالیٰ۔ اس آیت کے معنی میں اور جس کے حق میں یہ نازل ہوئی ہے، اختلاف کا ذکر کیا جائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورت سبا مکہ میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه ابن الضريس و النحاس و ابن مردويه والبيهقي في الدلائل)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ
وَلَهُ الۡحَمۡدُ فِي الۡاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ ۝۱ يَعۡلَمُ مَا
يَلِجُ فِي الۡاَرۡضِ وَمَا يَخۡرُجُ مِنۡهَا وَمَا يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا
يَعۡرُجُ فِيۡهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِيۡمُ الۡغَفُوۡرُ ۝۲

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور آخرت میں بھی حمد اسی کے لیے ہے اور وہ نہایت حکمت والا، خوب باخبر ہے① وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اور وہ نہایت رحم کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے②

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے:

دنیا میں ظاہراً ورکسی کی بھی تعریف ہوتی ہے کہ وہ پردہ ہے اللہ تعالیٰ کے فعل کا آخرت میں پردہ نہیں جو کچھ

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٥٨) [2] الدر المنثور (٦/ ٦٧٣)

ہے اسی کی طرف سے۔ زمین میں جاتے ہیں جانور، کیڑے مکوڑے اور بارش اور نکلتا ہے اس سے سبزہ۔ آسمان میں سے اترنے والی چیزیں مینہ، قرآن، تقدیر اور چڑھنے والی چیزیں اعمال ہیں اور مردے کی روح اور سب اس کی رحمت سے بستے ہیں۔ انتہی۔

اللہ پاک اپنے نفسِ کریم کی خبر دیتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں حمد مطلق اسی کے لیے ہے، کیوں کہ دنیا اور آخرت والوں پر انعام کرنے والا اور فضل و کرم کرنے والا اور ان سب کا مالک اور حاکم وہی ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

﴿ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [القصص: ٧٠]

''وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں، دنیا اور آخرت میں اسی کی تعریف ہے، اسی کے لیے فرماں روائی ہے اور اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے۔'' نیز اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ... الآیۃ ﴾ یعنی سارے اس کی ملک ہیں اور اس کے غلام ہیں اور اس کے زیرِ تصرف و قہر ہیں، جس طرح کہ فرمایا: ﴿ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴾ [اللیل: ١٣] ''اور ہمارے ہی ہاتھ میں آخرت اور دنیا ہے۔''

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ پس ہمیشہ معبود وہی ہے اور علی طول المدی ومر الدهور محمود وہی ہے۔ ﴿ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ یعنی اپنے اقوال و افعال و شرع و قدر میں بڑی حکمت والا ہے، بڑا خبردار واقف کار ہے کہ جس پر کوئی مخفی شے پوشیدہ نہیں رہتی اور نہ کوئی چیز اس سے غائب ہوتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے زہری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ "خَبِيْرٌ بِخَلْقِهِ حَكِيْمٌ بِأَمْرِهِ" یعنی اپنی خلق کی خوب خبر رکھتا ہے، اپنے کام میں بڑا حکیم ہے۔

اسی لیے اللہ عزوجل نے یہ فرمایا: ﴿ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا ﴾ یعنی اس کے علم کی یہ شان ہے کہ جو پانی کے قطرے زمین کے اجزاء میں نازل ہونے والے ہیں اور جو دانے زمین میں بوئے ہوئے ہیں اور چھپے ہوئے ہیں ان سب کی گنتی کو جانتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اس کی گنتی اور کیفیت اور صفات کو بھی جانتا ہے۔ ﴿ وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ﴾ یعنی اور جو قطرے اور رزق اور روزی آسمان سے اترتی ہے اور جو اعمالِ صالح وغیرہ اس میں چڑھتے ہیں اس سب کو خوب جانتا ہے۔ ﴿ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ﴾ یعنی اور وہی بڑا مہربان ہے۔ تو اپنے بندوں میں سے نافرمانوں پر جلدی سے عقوبت نہیں ڈالتا اور جو بندے توبہ کرکے اس کی طرف رجوع ہونے والے اور اس پر بھروسا کرنے والے ہیں ان کے گناہوں سے بڑا درگزر کرنے والا ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ کے الف اور لام میں دو احتمال ہیں: یا تو عہدِ خارجی کا احتمال ہے، چنانچہ یہ معنی ہوں گے

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٨٧۔ ٦٨٨)

کہ وہ حمد جس کے ساتھ اس نے اپنے نفسِ مقدس کی حمد کی ہے، اس کے ساتھ محمود ہے۔ یا استغراقی ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ اللہ پاک سارے افرادِ حمد کا مستحق ہے، یعنی حمد کے جتنے بھی طریقے ہو سکتے ہیں ان سب کا مستحق ہے، چنانچہ اس کی تحقیق فاتحۃ الکتاب میں مذکور ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہر نعمت اللہ کی طرف سے ہے تو وہی اس کے لائق ہے کہ اس کی حمد اور ثنا کی جائے۔ حرفِ لام میں دو احتمال ہیں: یا تو تملیک کا ہے، یعنی ساری حمد وہ کسی بھی تعریف کرنے والے سے ہو، اللہ کی ملکیت ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ اصل میں ناطقِ حمد، یعنی حمد کو ادا کرنے والے کا خالق و مالک وہی ہے تو ناطقِ حمد کے مالک ہونے کے سبب سے حمد کا مالک اور مستحق وہی ہوا۔ یا لام تخصیص کا ہے، معنی دونوں کے ایک دوسرے کے قریب ہیں، یعنی تمام خوبیوں کے ساتھ اختصاص اسی کو ہے۔

﴿ اَلَّذِیْ ﴾ محلِ جر میں ہے اس بنا پر کہ اسمِ جلیل کی صفت ہے یا بدل۔ یا محلِ نصب میں ہے بنا بر اختصاص۔ یا موضعِ رفع میں ہے بنابر تقدیر مبتدا "أَيْ: هُوَ الَّذِيْ" ﴿ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے اور اس کے قبضہ و تصرف میں ہے، جو چاہتا ہے اس کے ساتھ کرتا ہے اور اس میں جو چاہتا ہے حکم جاری کرتا ہے۔ چنانچہ ہر نعمت جو بندے کو حاصل ہونے والی ہے وہ ان چیزوں میں سے ہے، جن کو اس کے لیے پیدا کیا ہے اور ان کا اس پر احسان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس کی حمد "فِیْ السَّمٰوٰتِ الْاَرْض" پر وہ حمد ہے اس کی نعمتوں پر جن کا اس نے اپنی مخلوق پر انعام کیا ہے، ان چیزوں میں سے جو اس کے لیے پیدا کی ہیں۔

پھر جب یہ بات بیان کی کہ دنیا میں اس کے حامد بندوں کی حمد خاص اسی کے لیے ہے تو یہ بیان کیا کہ آخرت کی حمد بھی اسی طرح اس کے لیے خاص ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی اسی کے واسطے آخرت میں حمد ہے جس طرح دنیا میں اسی کے لیے ہے، اس لیے کہ دونوں جہان میں ساری نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں۔ کلمہ ﴿ لَهٗ ﴾ نفسِ حمد سے متعلق ہے، یا جس سے ﴿ اَلْحَمْدُ ﴾ کی خبر، یعنی ﴿ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ متعلق ہے اسی سے یہ بھی متعلق ہے، کیوں کہ وہ خبر یا متعلق عام سے متعلق ہے، یعنی استقرار یا اس کے مثل۔

کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کے بندے آخرت میں جس وقت جنت میں داخل ہوں گے اس وقت وہ جو حمد کریں گے خاص کر یہ حمد اسی کے لیے ہے، جس طرح کہ ان آیتوں میں ہے: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ ﴾ [الزمر: ٧٤] "یہ کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا۔" نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ﴾ [الأعراف: ٤٣] "اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا۔" نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ﴾ [الفاطر: ٣٤] "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔" نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [الفاطر: ٣٥]

''(اللہ کا شکر ہے) جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں اتارا۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
﴿ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [یونس: ١٠] ''اور ان کی آخر بات یہ ہوگی تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہان کا رب ہے۔''

چنانچہ اللہ پاک ہی آخرت میں محمود ہے جس طرح کہ دنیا میں وہی محمود ہے اور وہی آخرت کا مالک ہے جس طرح کہ دنیا کا وہی مالک ہے، مگر اتنی بات ہے کہ دنیا میں حمد واجب ہے، کیوں کہ دنیا خانۂ تکلیف ہے اور وہاں حمد واجب نہیں بہ سبب عدمِ تکلیف کے اور اہلِ جنت جو اللہ کی تعریف کریں گے تو ان کا یہ حمد کرنا جنت کی نعمتوں سے مسرور ہو کر ہوگا اور ان کو جو اجرِ عظیم ملا ہے اس سے لذت لینے کے لیے ہوگا، چنانچہ وارد ہوا ہے کہ « يُلْهَمُوْنَ التَّسْبِيْحَ وَالْحَمْدَ كَمَا يُلْهَمُوْنَ النَّفَسَ » یعنی اہلِ جنت کو تسبیح وحمدِ الٰہی کا الہام کیا جائے گا جس طرح کہ ان کو سانس لینے کا الہام کیا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح سانس لینے میں کوئی تکلیف اور تھکن نہیں ہوتی اسی طرح تسبیح اور حمد کرنے میں ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ان کے لیے یہ کام سانس لینے کی طرح لازمی ہو جائے گا۔ کسی نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ دونوں حمدوں کے درمیان یہ فرق ہے کہ دنیا میں تو حمد ایک عبادت ہے اور آخرت میں تلذذ و ابتہاج ہو گا (ایسی لذت جس میں خوشی ہو) کیوں کہ اس سے تکلیف منقطع ہو چکی ہے۔ ﴿ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ یعنی وہ ایسا حکیم ہے کہ دارین کے کام کو اس نے اِحکام اور مضبوطی بخشی ہے۔ خبیر ہے اپنی خلق کے کام کا دونوں میں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکیم ہے ''ما في السماء والأرض'' کی تدبیر میں، خبیر ہے اس شخص کی ضمیر کا جو اس کی حمد کرتا ہے روزِ جزا وعرض کے واسطے۔[1]

پھر اللہ پاک نے زمین اور آسمان کے ان بعض امور کا ذکر کیا جن کو اس کا علمِ تام احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کون سے زمین و آسمان؟ جن سے بندوں کے دینی اور دنیوی امور متعلق ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی وہ جانتا ہے اس شے کو جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور زمین میں رکھی جاتی ہے وہ بارش ہو یا خزانہ، دفینے ہوں یا مردے۔ ﴿ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا ﴾ اور اس شے کو جو اس سے نکلتی ہے، یعنی کھیتی اور روئیدگی اور حیوان و درخت اور چشمے اور کانیں اور مردے جس وقت کہ مبعوث ہوں گے۔ ﴿ وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ ﴾ اور اس شے کو جو اترتی ہے آسمان سے، یعنی بارش کے قطرے اور برف اور اَولے اور صاعقے اور طرح طرح اور قسم قسم کے برکات ان میں سے یہ ہے کہ اللہ کے فرشتے اور کتابیں آسمان سے اس کے انبیاء کی طرف نازل ہوتے ہیں۔

[1] تفسير النسفي (٣/ ٣١٩)

جمہور نے ﴿يَنْزِلُ﴾ بہ فتحِ یائے تحتیہ وتخفیفِ زائے معجمہ پڑھا ہے، اس کی ضمیر کلمۂ ﴿مَا﴾ کی طرف راجع ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور سلمی نے بہ ضمِ تحتیہ وتشدیدِ زاء پڑھا ہے، ضمیر اللہ پاک کی طرف راجع ہے۔[1] ﴿وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا﴾ اور جانتا ہے اس شے کو جو آسمانوں میں چڑھتی ہے، یعنی فرشتے اور بندوں کے اعمال اور دعائیں۔ چوں کہ عروج میں استقرار کے معنی شامل کیے گئے ہیں، اس لیے اس کو بہ کلمۂ ''في'' متعدی کیا ہے نہ کہ بہ کلمۂ ''إلى''۔ اور ''سَمَاء'' صرف بلندی کی جہت ہے۔[2] (قال الشهاب) ﴿وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ﴾ یعنی وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے اور ان سے جو گناہ ہوئے ہیں اور اس کی نعمتوں کا شکر، جو اُن پر واجب ہے، اس کے ادا کرنے میں ان سے جو کوتاہی اور کمی ہوئی ہے، اس سب کا بخشنے والا ہے۔[3] (كذا في فتح البيان)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ
لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ
فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ
وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿3﴾ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿4﴾
وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ
مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿5﴾ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ
الْحَمِيْدِ ﴿6﴾

اور کافروں نے کہا: ہم پر قیامت نہیں آئے گی، کہہ دیجیے: کیوں نہیں! میرے عالم الغیب رب کی قسم! بلاشبہہ وہ تم پر ضرور آئے گی، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، ذرہ برابر کوئی چیز بھی اس سے چھپی نہیں رہ سکتی اور اس (ذرے) سے کوئی چھوٹی اور بڑی چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) نہ ہو③ تاکہ اللہ ان لوگوں کو بدلہ دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، وہی لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے④ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں (ہمیں) عاجز کرنے کی کوشش کی، انھی لوگوں کے لیے سخت ترین،

---

[1] فتح القدير (٤/ ٤١٢) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٨٨) [3] فتح البيان (١١/ ١٦١-١٦٢)

دردناک عذاب ہے⑤ اور جن لوگوں کو علم دیا گیا وہ دیکھتے (یقین رکھتے) ہیں کہ جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ برحق ہے اور وہ (اللہ) غالب، تعریف والے کے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے⑥

قیامت کے دن ہر ایک کو اپنے عمل کا بدلہ ملے گا:

تین آیتیں ایسی ہیں جن میں اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو امر فرمایا ہے کہ قیامت کے قائم ہونے پر اپنے رب عظیم کی قسم کھائیں، جبکہ اہل کفر وعناد میں سے لوگوں نے اس کا انکار کیا جس نے انکار کیا۔ ان میں سے ایک تو سورت یونس میں ہے، وہ یہ ہے: قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِىْ وَرَبِّىْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴾ [یونس: ۵۳] ''اور وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی سچ ہے؟ آپ فرما دیجیے کہ ہاں قسم ہے میرے رب کی وہ واقعی سچ ہے اور تم کسی طرح اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔'' اور دوسری یہ ہے یعنی آیت باب: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ...الآية ﴾ اور تیسری وہ آیت ہے جو سورۃ التغابن میں ہے: ﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ [التغابن: ۷] ''ان کافروں نے خیال کیا ہے کہ وہ دوبارہ زندہ نہ کیے جائیں گے۔ آپ کہہ دیجیے کہ کیوں نہیں اللہ کی قسم! تم ضرور دوبارہ اٹھائے جاؤ گے پھر جو تم نے کیا ہے اس کی خبر دیے جاؤ گے اور اللہ پر یہ بالکل ہی آسان ہے۔''

چنانچہ اول تو اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ﴾ پھر رب کا اس شے کے ساتھ وصف کیا جو قیامت کے آنے کی تقریر و تاکید کرتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ عٰلِمِ الْغَيْبِ ... الآية ﴾۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ ﴾ ''لَا يَغِيبُ عَنْهُ''[1] یعنی ساری اشیاء اس کے علم کے تحت مندرج ہیں کوئی شے اس پر مخفی نہیں تو ہڈیاں گو متلاشی و متفرق و متمزق و ریزہ ریزہ ہو گئیں، لیکن وہ اس کا عالم ہے کہ وہ کہاں کہاں گئیں اور کہاں کہاں بکھر گئیں، پھر ان کا اعادہ کرے گا جس طرح کہ پہلی بار ان کو پیدا کیا تھا، کیوں کہ بے شک وہ ہر شے کو خوب جانتا ہے۔ پھر جو جسموں کو دوبارہ پیدا کرنے اور قیامت کے قائم کرنے میں اس کی حکمت ہے، اس کو اپنے اس قول سے بیان فرمایا ہے: ﴿ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... الآية ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْۤ اٰيٰتِنَا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ سے روکنے کے لیے دوڑے اور اس کے رسولوں کو جھٹلانے کے لیے سعی کی ان کو بلا کی دکھ دینے والی مار ہے، یعنی تا کہ مومنوں کے نیک بخت لوگوں کو عیش و آرام عطا کرے اور کافروں کے بدبخت لوگوں کو عذاب کرے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ لَا

[1] تفسیر الطبري (۲۰/ ۳۵۰)

يَسْتَوِيٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴾ [الحشر: ٢٠] ''اہلِ نار اور اہلِ جنت (باہم) برابر نہیں، جو اہلِ جنت ہیں وہی کامیاب ہیں (اور جو اہلِ نار ہیں وہ ناکام ہیں)۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴾ [صٓ: ٢٨] ''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے برابر کر دیں گے جو (ہمیشہ) زمین میں فساد مچاتے رہے، یا پرہیز گاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ... الآية ﴾ ایک اور حکمت ہے جو ماقبل کی حکمت پر معطوف ہے، وہ حکمت یہ ہے کہ جو شے رسولوں پر نازل کی گئی ہے، اس پر ایمان والے لوگ جس وقت قیامت کے قائم ہونے کا اور نیکوں اور بدوں کی جزا اور سزا کا مشاہدہ اس شے کے ساتھ کریں گے، جس کو وہ دنیا میں اللہ کی کتابوں سے جان چکے تھے تو اس وقت وہ اس کو عین الیقین دیکھ لیں گے اور اس دن یہ بھی کہیں گے: ﴿ لَقَدْ جَاۗءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ﴾ [الأعراف: ٤٣] یعنی البتہ تحقیق ہمارے رب کے رسول حق لائے اور یہ بھی کہا جائے گا: ﴿ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٥٢] ''یہی ہے جس کا وعدہ رحمان نے کیا تھا اور رسولوں نے سچ سچ کہہ دیا تھا۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَھٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الروم: ٥٦] ''تم تو جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے یومِ قیامت تک ٹھہرے رہے۔ آج کا یہ دن قیامت ہی کا دن ہے لیکن تم تو یقین ہی نہیں مانتے تھے۔'' ﴿ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک منیع الجناب ہے جس پر نہ کوئی غالب ہوسکتا ہے نہ کوئی اس کی ممانعت کر سکتا ہے، بلکہ اسی نے ہر شے کو مقہور کیا ہے اور اس پر غالب ہوا ہے اور اپنے اقوال و افعال میں حمید ہے اور وہی اس سب میں محمود ہے۔ جل وعلا سبحانہ و تعالیٰ۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ان لوگوں سے علی الاطلاق کفار کی جنس مراد ہیں، یا خاص کر کفارِ مکہ مراد ہیں۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے، کیوں کہ کسی خاص قسم پر خاص کرنے سے بہتر ہے اور کفارِ مکہ بدخولِ اولیٰ اس میں داخل ہیں۔ ﴿ لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ کسی حال میں بھی قیامت نہ آئے گی۔ منکرینِ قیامت نے جو یہ بات کہی تو بالکل قیامت کے وجود کا انکار کرنے کے لیے کہی ہے، ان کی یہ غرض نہیں ہے کہ صرف بات کرنے کی حد تک اس کے آنے کے منکر ہوں، یا صرف اپنی زندگی کی حالت میں اس کے آنے کے منکر ہوں اس کے ساتھ کہ بعد میں اس کے وجود کی حقیقت ثابت ہو۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٨٨۔ ٦٨٩)

رہی یہ بات کہ انھوں نے جو اس کے وجود کے قطعی انکار کو اس عبارت میں ادا کیا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ ان کو اس کے آنے کا وعدہ دیا جاتا تھا تو اس کے مطابق انھوں نے یہ کہہ دیا کہ وہ ہم کو نہ آئے گی۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کی بات کو اُن پر رد کر دیا، جس کی انھوں نے نفی کی تھی، اس کا اثبات کر دیا اور اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے کہہ دیں: ﴿ بَلٰى ﴾ اس معنی میں کہ امر نہیں ہے مگر اس کا آنا ہے۔ اور یہ قسم جو قولہ تعالیٰ: ﴿ وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ﴾ میں ہے یہ اس کے آنے کی تاکید کے لیے ہے، اس کی مکمل وجوہ کے ساتھ، کیوں کہ اول تو قسم تاکید کے لیے ہوتی ہے دوسرے لام تاکید کا اور تیسرے نون تاکید کا۔

غرض یہ کہ انھوں نے تو قیامت کے آنے کی نفی کی تھی اور اللہ پاک نے اس کے آنے کو تین تاکیدوں سے ثابت کیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ضرور ہی آنے والی ہے بغیر آئے نہ رہے گی، منکر لوگ بے شک انکار کرتے رہیں، ان کے انکار سے کیا ہوتا ہے، اگر ہوتا ہے تو خود اُن ہی کا برا ہوتا ہے۔ جمہور نے بتائے فوقیہ پڑھا ہے، ضمیر مونث کی ﴿ اَلسَّاعَةُ ﴾ طرف راجع ہے۔ طلق معلم نے بیائے تحتیہ اس معنی میں پڑھا ہے کہ ﴿ اَلسَّاعَةُ ﴾ کی یوم یا وقت سے تاویل کی ہے۔ طلق کہتے ہیں میں نے اپنے اشیاخ کو سنا کہ وہ بیائے تحتیہ پڑھتے تھے اس معنی میں گویا یوں کہا: ''لَا يَاتِيَنَّكُمُ الْبَعْثُ أَوْ أَمْرُهُ''۔ [1] کما قال تعالیٰ: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ﴾ [النحل: ٣٣]
''کیا یہ اسی بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آ جائیں یا تیرے رب کا حکم آ جائے؟''

قولہ تعالیٰ: ﴿ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ ﴾ تقویت ہے تاکید کے لیے، کیوں کہ بعد میں جس کی قسم کھائی گئی، اس کی جلالت اور صفات کا ذکر کرنا اس شے کی بڑائی اور اس کے صحیح اور ثابت ہونے کی خبر دیتا ہے جس پر قسم کھائی گئی، اس لیے کہ یہ امر پر شہادت لانے کے برابر ہے۔ امام نافع اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''عٰلِمُ الْغَيْبِ'' کو برفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ﴿ لَا يَعْزُبُ ﴾ ہے، یا اس بنا پر کہ خبر ہے مبتدائے مقدر کی۔ امام عاصم اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے جر کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ رَبِّيْ ﴾ کی صفت ہے۔ امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے ''عَلَّامِ'' بجر و صیغۂ مبالغہ پڑھا ہے۔ [2] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تینوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔

﴿ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ ﴾ جمہور نے بہ ضم زاء اور یحییٰ بن وثاب نے بکسر زاء پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسرہ مجھ کو زیادہ محبوب ہے اور یہ دونوں دو لغت ہیں۔ جب کوئی شخص دور اور غائب اور پوشیدہ ہو جاتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: ''عَزَبَ'' ''يَعْزُبُ'' بالضم اور ''يَعْزِبُ'' بالکسر۔ ﴿ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ ﴾ کے معنی ہیں: چھوٹی سے چھوٹی چیونٹی کی مقدار اور ایک ذرے کا وزن۔ ﴿ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ ﴾ جمہور نے دونوں کو برفع پڑھا ہے بنا بر ابتدا اور خبر ہے ﴿ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾۔ یا اس بنا پر کہ معطوف ہے ﴿ مِثْقَالُ ﴾ پر۔ امام قتادہ

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٦٠) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٦٠)

اور اعمش رحمہ اللہ نے ہر دو کو بہ نصب پڑھا ہے۔ ﴿ ذَرَّةٍ ﴾ پر عطف کیا ہے، یا اس بنیاد پر کہ ﴿ لَا ﴾ نفی جنس کا ہے۔ [1] معنی یہ ہیں: قسم ہے میرے پالنے والے کی! البتہ قیامت آئے گی تم پر، میرا ایسا پالنے والا جو جاننے والا ہے پوشیدہ کو، جس سے غائب نہیں ہوتا اور نہ اس پر چھپتا ہے اور نہ ہی اس سے دور ہوتا ہے ذرہ بھر آسمانوں میں اور نہ زمین میں، اور ذرہ بھر سے چھوٹا اور اس سے بڑا نہیں ہے مگر کھلی کتاب میں ہے، یعنی وہ لوحِ محفوظ میں ثبت کیا ہوا ہے جو اللہ پاک کی معلومات پر مشتمل ہے اور اس میں لکھا ہوا ہے۔ پس یہ جملہ نفیِ عزوب کی تاکید کرنے والا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ ﴾ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ﴿ مِثْقَالُ ﴾ کا لفظ کچھ حد بیان کرنے کے لیے مذکور نہیں ہوا، کیوں کہ اس سے تو مثقال ذرہ سے بھی چھوٹا غائب نہیں ہوتا اور اگر اصغر پر اکتفا کیا جاتا تو کوئی وہم کرنے والا یہ وہم کرتا کہ صغائر تو ثبت کیے جاتے ہیں، اس لیے کہ وہ نسیان کے محل ہیں۔ رہا اکبر تو اس کا نسیان نہیں ہوتا تو اس کے اثبات کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ چنانچہ اس وہم کو دور کرنے کے لیے ﴿ وَلَآ اَكْبَرُ ﴾ فرما دیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ﴾ کی تعلیل کے لیے ہے، یعنی قیامت کے آنے کا فائدہ مومنوں کو ثواب کے ساتھ جزا دینا اور کافروں کو عذاب کے ساتھ بدلہ دینا ہے۔ ﴿ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور بھلے کام کیے، ان کے لیے ان کے گناہوں کی بخشش ہے اور رزقِ حسن ہے، یعنی جنت بہ سبب ان کے ایمان و عمل صالح کے، اور اس کے ساتھ ان پر اللہ پاک کی طرف سے فضل و کرم اور مہربانی ہے۔

پھر کافروں کے فریق کا ذکر کیا جن کو قیامت کے آنے پر عذاب کیا جائے گا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیتوں کو جو رسولوں پر نازل کی گئی تھیں ان کے باطل کرنے میں سعی کی اور ان میں قدح کیا، یعنی عیب جوئی کی اور لوگوں کو ان سے روکا اور ان کے رد میں سعی اور کوشش کی اس طرح سے کہ ان میں طعن کیا اور ان کو شعر اور سحر کے ساتھ منسوب کیا، اس لیے کہ آیاتِ بینات کی تکذیب کرنے والا اخفا کرنے والا ہے تو وہ اپنے کذب کو رائج کرنے کے لیے عظیم سعی اور بلیغ جدوجہد کا محتاج ہوگا اس اُمید پر کہ شاید وہ قرآن پاک کے ساتھ تمسک کرنے والے شخص کو عاجز کر دے۔ جمہور نے ﴿ مُعٰجِزِيْنَ ﴾ پڑھا ہے۔

معاجزت سے مراد مسابقت ہے، کیوں کہ دو تسابق کرنے والوں میں ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کو اپنے ساتھ ملنے سے عاجز کر دے۔ معنی یہ ہیں کہ جنھوں نے ہماری آیتوں کے باطل کرنے میں سعی کی، اس حال میں کہ وہ ہم سے مسابقت کرنے والے ہیں، خیال کرتے ہیں کہ وہ ہم سے فوت ہو جائیں گے اور پائے نہ جائیں گے اور ان کا

[1] فتح القدير (٤/ ٤١٣)

یہ خیال اس وجہ سے ہے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مبعوث نہ ہوں گے۔ اللہ پاک کے ساتھ مسابقت اگرچہ اس قسم سے ہے جس کا تصور نہیں ہو سکتا، مگر جب آیاتِ الٰہی کے جھٹلانے والوں نے اپنے دل میں یہ امر ٹھہرایا اور یہ طمع کی کہ ان کا اسلام کے ساتھ مکر وفریب ان کے لیے پورا ہو جائے گا تو ان کی تشبیہ اس شخص کے ساتھ کی گئی جو اپنے زعم میں اللہ سے مسابقت کرتا ہے۔ (کما قال زادہ)

ابن کثیر، ابن محیصن، حمید، مجاہد اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے "مُعْجِزِيْنَ" پڑھا ہے۔[1] محاورے میں بولتے ہیں: "عَاجَزَهُ وَأَعْجَزَهُ إِذَا غَالَبَهُ وَسَبَقَهُ" اس سے معلوم ہوا کہ اس قراءت کے معنی بھی مثل اول کے ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: مُقَدِّرِيْنَ عَجْزَنَا"[2] یعنی ہمارے عجز کا اعتقاد کرنے والے ہیں۔ امام بیضاوی نے کہا: "أَيْ: مُثَبِّطِيْنَ عَنِ الْإِيْمَانِ مَنْ أَرَادَهُ"۔[3] یعنی اس شخص کو جو اس کا ارادہ کرتا ہے اسے ایمان سے مشغول کرنے والے ہیں اور لوگوں کو آیتوں پر ایمان لانے سے باز رکھتے ہیں۔

﴿ رِجْزٍ ﴾ بہ معنی عذاب ہے تو حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رِجْزٍ ﴾ بدتر وسخت تر عذاب کو کہتے ہیں۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اسی بات سے یہ آیت ہے: ﴿ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴾ [البقرة: ٥٩] "ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل کیا۔" "أَيْ: عَذَابًا" اور ﴿ اَلِيْمٌ ﴾ بہ معنی "شديد الألم" ہے۔ جمہور نے ﴿ اَلِيْمٌ ﴾ کو بالجر پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ رِجْزٍ ﴾ کی صفت ہے۔ امام ابن کثیر اور حفص رحمہما اللہ نے عاصم رحمہ اللہ سے برفع پڑھا ہے صفت ہے عذاب کی، یعنی "عَذَابٌ أَلِيْمٌ مِنْ سَيِّئِ الْعَذَابِ"۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رِجْزٍ ﴾ بہ معنی "سُوْءِ الْعَذَابِ" ہے۔

جب اللہ پاک نے ان لوگوں کا ذکر کیا جنھوں نے آیاتِ الٰہی کے باطل کرنے میں سعی کی تو ان کا ذکر کیا جو ان پر ایمان لاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ﴾. ﴿ اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ ﴿ يَرَى ﴾ کا فاعل ہے۔ مراد ان سے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ یہ امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنینِ اہلِ کتاب ہیں۔[5] کسی نے کہا ہے کہ سارے مسلمان ہیں۔ ﴿ اَلَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ ﴿ يَرَى ﴾ کا مفعولِ اول ہے اور ﴿ اَلْحَقَّ ﴾ مفعولِ ثانی ہے اور کلمہ ﴿ هُوَ ﴾ ضمیرِ فصل ہے۔ جمہور نے ﴿ اَلْحَقَّ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے اور امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ضمیر ﴿ هُوَ ﴾ کی خبر ہے اور جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر مفعولِ ثانی۔ یہ بنی تمیم کی لغت ہے، کیوں کہ یہ لوگ ما بعد ضمیر فصل کو رفع دیتے

① تفسير القرطبي (١٤/ ٢٦١) ② تفسير الجلالين (١/ ٥٦٢) ③ تفسير البيضاوي (٤/ ٣٩١)
④ تفسير الطبري (٢٠/ ٣٥٢) ⑤ تفسير القرطبي (١٤/ ٢٦١)

ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ کا یہ زعم ہے کہ رفع مختار ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ کے علاوہ لوگوں نے ان کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ نصب اکثر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَيَرَى ﴾ ﴿ لِيَجْزِيَ ﴾ پر معطوف ہے۔ امام زجاج اور فراء رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] ان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ﴿ لِيَجْزِيَ ﴾ "لَتَأْتِيَنَّكُمُ السَّاعَةُ" سے متعلق ہے۔ پس یہ معنی ہوں گے: "لَتَأْتِيَنَّكُمُ السَّاعَةُ لِيَرَى الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ حَقٌّ" حالانکہ یوں نہیں کہا جاتا ہے۔

زیادہ مناسب یہ ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ... الآية ﴾ کلامِ مستانف ہے جو "الَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْ الْآيَاتِ" کے قول کو دور کرنے کے لیے لایا گیا ہے، یعنی ان کی یہ سعی و کوشش ان کی جہالت پر دال ہے اس لیے کہ یہ لوگ اس بات کے مخالف ہیں جس کو اہلِ علم اس کتاب کے حق میں جانتے ہیں جو تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے، کیوں کہ اہلِ علم اس کو حق اور سچا جانتے ہیں، یعنی بے شک تحقیق وہ اللہ کے پاس سے ہے۔ ﴿ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴾ یہ جملہ ﴿ الْحَقَّ ﴾ پر معطوف ہے۔ فعل کا عطف ہے اسم پر، کیوں کہ اسم کی تاویل میں ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ﴾ [الملك: ١٩] "پر کھولے ہوئے اور (کبھی کبھی) سمیٹے ہوئے۔" "أَيْ: وَقَابِضَاتٍ" گویا یوں کہا گیا: "وَهَادِيًا"۔

کسی نے کہا ہے کہ جملہ مستانفہ ہے، ضمیر اس کا فاعل ہے ﴿ اُنْزِلَ ﴾ کے فاعل کی طرف راجع ہے، یعنی قرآن۔ معنی یہ ہیں کہ قرآن راہِ عزیز کی طرف ہدایت کرتا ہے، یعنی اس ذات کی راہ بتاتا ہے جو اپنے ملک میں غالب ہے اور اپنی خلق کے نزدیک محمود ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کے دین کی طرف ہدایت کرتا ہے، جو اسلام اور توحید ہے۔ پھر اللہ سبحانہٗ نے منکرینِ بعث کے کلام میں سے ایک اور نوع ذکر کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ﴿۷﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ﴿۸﴾ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۹﴾

اور کافروں نے کہا: کیا ہم تمھیں ایک ایسا شخص بتائیں جو تمھیں یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل

[1] فتح القدير (٤/ ٤١٣) [2] فتح البيان (١١/ ١٦٣۔ ١٦٥)

ہی پارہ پارہ کر دیے جاؤ گے تو بے شک تم البتہ از سرِ نو پیدا کیے جاؤ گے؟⑦ کیا اس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے یا اسے جنون (لاحق) ہے؟ (قطعاً نہیں!) بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (وہ) عذاب اور دور کی گمراہی میں پڑے ہیں⑧ کیا پھر انھوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین کی طرف نہیں دیکھا؟ اگر ہم چاہیں تو انھیں زمین میں دھنسا دیں یا ہم ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں، بلاشبہ اس میں ہر رجوع کرنے والے بندے کے لیے ضرور ایک نشانی ہے⑨

کفار کا حیات بعد الممات کا انکار اور ان کی تردید:

اللہ عزوجل کافروں اور ملحدوں کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ وہ قیامت کے قائم ہونے کو بعید سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ جو خبر دیتے ہیں، اس میں ان سے ٹھٹھا کرتے ہیں، یعنی منکر کہنے لگے کہ ہم تم کو ایک ایسے شخص کے بارے میں بتائیں، جو تم کو خبر دیتا ہے کہ جب تمھارے جسم زمین میں متفرق ہو گئے اور ہر طرف بکھر گئے اور پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو اس حال کے بعد تم پھر زندگی کی طرف لوٹو گے اور اس کے بعد رزق دیے جاؤ گے، حالاں کہ یہ خبر دینے میں اس شخص کا حال دو قسم سے خالی نہیں: یا تو اس نے اللہ تعالیٰ پر قصداً یہ افترا کیا ہے کہ اس نے اس کی طرف یہ وحی کی ہے۔ یا اس نے قصد تو نہیں کیا، لیکن اس پر شبہہ پڑ گیا ہے، جیسا کہ مجنون اور دیوانے پر شبہہ پڑ جایا کرتا ہے، اسی لیے انھوں نے یوں کہا: ﴿ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ﴾

اللہ عزوجل نے اس بات کا ان پر رد فرمایا: ﴿ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی بات ویسی نہیں ہے جیسی انھوں نے خیال کی ہے اور جس کی طرف وہ گئے ہیں، بلکہ سچے اور بار (نیک) اور راشد (ہدایت یافتہ) محمد ﷺ ہی ہیں جو حق لے کر آئے ہیں اور وہ لوگ جھوٹے اور جاہل اور غبی (کند ذہن) ہیں۔ ﴿ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ کفر میں ہیں جو ان کو عذابِ الٰہی کی طرف پہنچانے والا ہے اور دنیا میں حق سے انتہا درجے کی دوری اور گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے ان کو اپنی قدرت سے آگاہ فرمایا جو آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی پھر کیا دیکھتے نہیں جو کچھ ان کے آگے ہے اور پیچھے ہے آسمان اور زمین کہ جہاں کہیں متوجہ ہوتے ہیں اور جاتے ہیں تو آسمان ان پر سایہ کرنے والا ہے اور زمین ان کے نیچے ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴾ [الذاريات: ٤٧۔ ٤٨] ”آسمان کو ہم نے (اپنے) ہاتھوں سے بنایا ہے اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں اور زمین کو ہم نے فرش بنا دیا ہے، پس ہم بہت ہی اچھے بچھانے والے ہیں۔“ امام

عبد بن حمید رحمہ اللہ نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ بے شک اگر تو دیکھے اپنی دائیں طرف یا بائیں طرف یا اپنے آگے یا پیچھے تو تو دیکھے آسمان و زمین کو۔[1] (قال عبد بن حميد أخبرنا عبد الرزاق عن معمر عن قتادة... الخ. ان کا نام ابو محمد عبد الحمید بن حمید بن نصر کشی ہے۔ یزید بن ہارون و عبد الرزاق و محمد بن بشیر سے حدیث شریف کا سماع کیا۔ مسلم و بخاری ان سے راوی ہیں۔ ۲۴۳ ہجری میں وفات پائی۔ ان کا حال بستان المحدثین وغیرہ میں خوب لکھا ہے)۔

قولہ سبحانہ: ﴿ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ یعنی اگر ہم چاہیں تو دھنسا دیں ان کو زمین میں یا گرا دیں ان پر ٹکڑا آسمان سے ان کے ظلم کے سبب سے اور ان پر ہماری قدرت کے سبب سے، لیکن ہم اپنے حلم اور درگزر کی وجہ سے اس کی تاخیر کرتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴾۔ امام معمر رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ منیب تائب ہے۔ امام سفیان رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ منیب اللہ کی طرف متوجہ ہونے والا ہے،[2] یعنی بے شک آسمان و زمین کی پیدائش میں نظر کرنے میں البتہ ہر ذہین اور عقل مند اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اور جسموں کے مرنے کے بعد زندہ ہونے پر اور قیامت کے واقع اور قائم ہونے پر دلیل ہے۔

یعنی جو بندہ زیرک، ہوشیار، دانش مند اور اللہ کی طرف انتہا درجے کا رجوع کرنے والا ہے آسمان و زمین کو دیکھتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ اللہ پاک دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے، کیوں کہ جو ذات پاک ان آسمانوں کو باوجود ان کی اونچائی اور وسعت کے پیدا کرنے پر قادر ہوا اور زمینوں کو باوجود ان کی پستی اور طول و عرض کے پیدا کرنے پر قادر ہوا، بے شک وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ جسموں کو دوبارہ پیدا کرے اور کھوکھلی اور بوسیدہ ہڈیوں کو اکٹھا فرمائے اور اٹھائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴾ [یٰس: ۸۱] ''جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کیا وہ ان جیسوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں؟ بے شک قادر ہے اور وہی تو پیدا کرنے والا ہے دانا (بینا) ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المؤمن: ۵۷] ''آسمان و زمین کی پیدائش یقیناً انسان کی پیدائش سے بہت بڑا کام ہے، لیکن (یہ اور بات ہے کہ) اکثر لوگ بے علم ہیں۔''[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ رَجُلٍ ﴾ سے مراد محمد ﷺ ہیں، باوجود اس کے کہ آپ ان کے نزدیک معرفت کی چیزوں کو سب سے زیادہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/ ۳۱۶۱۔ ۳۱۶۲) [2] تفسیر الطبري (۲۰/ ۳۵۶) تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/ ۳۱۶۱۔ ۳۱۶۲)

[3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۶۸۹)

جاننے پہچاننے والے تھے، لیکن انھوں نے پیرایۂ نکرہ میں آپ ﷺ کا ذکر کیا۔ چنانچہ شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تجاہلِ عارفانہ کے باب سے ہے۔ گویا انھوں نے آپ ﷺ سے کسی شے کو نہ پہچانا، مگر یہ کہ آپ ﷺ ایک مرد ہیں، حالاں کہ آپ ﷺ ان کے نزدیک آفتاب سے بھی زیادہ مشہور تھے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ قریش میں مشہور و اعلم تھے اور آپ ﷺ کا بعث کی خبر دینا ان کے نزدیک بہت مشہور تھا۔ پھر اس کے کیا معنی کہ آپ کا اور بعث کا اس طریقے سے ذکر کیا جیسے کوئی غیر معروف آدمی کو کسی مجہول امر میں بتاتا ہو، تو اس کی یہ وجہ ہے کہ اس سے ان کا مقصد تمسخر اڑانا ہے۔ تجاہل کر کے اس کو ایسے پیرایہ میں ادا کیا، جیسے بعض قصے کہانیاں ہنسی اور دل لگی کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔[2]

عامل کلمۂ ﴿ إِذَا ﴾ میں مقدر ہے: "أَيْ: تُبْعَثُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ وَقْتَ تَمْزِيقِكُمْ"، قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴾ اس مقدر پر دال ہے۔ کلمۂ ﴿ يُنَبِّئُكُمْ ﴾ عامل نہیں ہوسکتا ہے، اس لیے کہ خبر دینا اس وقت میں واقع نہیں ہوا ہے۔ (كذا قال النحاس) اسی طرح ﴿ مُزِّقْتُمْ ﴾ بھی عامل نہیں ہوسکتا، کیوں کہ وہ ﴿ إِذَا ﴾ کا مضاف الیہ ہے اور مضاف الیہ مضاف میں عمل نہیں کرتا۔[3] (كذا قال المهدوي)۔ ایسا ہی خلقِ جدید کا حال ہے اس لیے کہ "إِنَّ" کا مابعد اس کے ماقبل میں عامل نہیں ہوتا ہے۔ ہاں جس نے ظرف میں وسعت کی ہے تو اس نے اس کو جائز رکھا ہے۔ یہ جب ہے کہ ہم ﴿ إِذَا ﴾ کو ظرفِ محض ٹھہرائیں۔ پھر اگر ہم اس کو شرط قرار دیں تو اس کا جواب مقدر ہوگیا، یعنی "تُبْعَثُوْنَ"۔ جمہور کے نزدیک ﴿ إِذَا ﴾ میں عامل یہی ہے۔ شیخ نے کہا کہ جملہ شرطیہ میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ يُنَبِّئُكُمْ ﴾ کا معمول ہو، کیوں کہ اس معنی میں ہے: "يَقُوْلُ لَكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ تُبْعَثُوْنَ" یعنی وہ کہتا ہے جس وقت تم ٹکڑے ٹکڑے کیے جاؤ گے تو اٹھائے جاؤ گے، پھر ﴿ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴾ سے اس کی تاکید کی۔ دوسرا یہ ہے کہ ﴿ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴾ معلق ہے ﴿ يُنَبِّئُكُمْ ﴾ کا، قائم مقام دو مفعول کے ہے اور اگر لام نہ ہوتا تو "إِنَّ" مفتوح ہوتا۔ اس بنیاد پر جملہ شرطیہ معترضہ ہوگا۔ ایک قوم نے "أعلم" میں اور اس کے باب میں تعلیق کو منع کیا ہے اور صحیح اس کا جواز ہے۔ (كذا في السمين)

"مزق" کی اصل خرقِ اشیاء ہے، یعنی اشیاء کے پھاڑنے کو خرق کہتے ہیں۔ پھٹے ہوئے کپڑے کو "ثَوْبٌ مَزِيْقٌ وَمُمَزَّقٌ وَمُتَمَزِّقٌ وَمَمْزُوْقٌ" بولتے ہیں۔ "مُمَزَّقٌ" بہ معنی "تَمْزِيْقٌ" ہے۔ "مُمَزَّقٌ" اسم مصدر ہے۔ ہر فعل جو تین حرفوں سے زیادہ ہے تو اس کا مصدر و ظرفِ زمان و مکان اس کے اسمِ مفعول کے وزن پر آتا ہے۔ یہ امر قیاسی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ "مُمَزَّقٌ" ظرفِ مکان ہو۔[4] (قاله الزمخشري) "أَيْ: كُلَّ مَكَانِ تَمْزِيقٍ مِنَ

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٧/ ١٨٩)
[2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٦٢۔ ٢٦٣)
[3] فتح القدير (٤/ ٤١٤)
[4] الكشاف (٣٣/ ٥٧٩)

اَلْقُبُوْرِ وَبُطُوْنِ الْوَحْشِ وَالطَّيْرِ" یعنی جبکہ تم پھاڑے جاؤ ہر پھاڑنے کی جگہ میں، مراد قبریں ہیں اور وحشی جانوروں اور پرندوں کے پیٹ ہیں۔ جدید بصریوں کے نزدیک فاعل کے معنی میں ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "جَدَّ الشَّيْءُ فَهُوَ جَادٌّ وَجَدِيْدٌ" اور کوفیوں کے نزدیک مفعول کے معنی میں ہے۔ ماخوذ "جَدَدْتُهُ" بہ معنی "قَطَعْتُهُ" سے۔

معنی یہ ہیں کہ منکرینِ بعث میں سے بعض نے بعض سے کہا: کیا بتائیں ہم تم کو ایک مرد جو تم کو ایک عجیب امر اور عجیب وغریب قصے کی خبر دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ جس وقت تم متفرق کیے جاؤ گے، ہر طرح کا متفرق کیا جانا اور ٹکڑے ٹکڑے کیے جاؤ گے، ہر طرح کا ٹکڑے کیا جانا اور اپنی موت کے بعد تم جب ریزہ ریزہ اور مٹی ہو جاؤ گے تو بے شک تم پیدا کیے جاؤ گے اور اٹھائے جاؤ گے ایک نیا پیدا کیا جانا اور اپنی قبروں سے زندہ ہو کر مبعوث ہو گے اور عود کرو گے، یعنی لوٹو گے ان صورتوں کی طرف جن پر تم تھے، اس کے بعد کہ تمھارے جسم ہر طرح سے پھٹ پھٹا گئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ بات مشرکینِ قریش نے کہی کہ جس وقت تم کو زمین کھا لے گی اور تم ریزہ ریزہ اور ہڈیاں ہو جاؤ گے اور درندے پرندے تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے تو تم زندہ اور مبعوث ہو گے۔[1] یہ بات انھوں نے آپ ﷺ کو جھٹلانے کے لیے کہی۔

پھر اللہ پاک نے ان کافروں سے یہ بات نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو ان کو بعث کا وعدہ دیا تھا، انھوں نے آپ ﷺ کے وعدے کے درمیان دو امر کی تردید کی: چنانچہ یوں کہا کہ یا تو وہ اس بات میں جھوٹا ہے جو اس نے کہی، یا اس کو جنون ہے اس طرح سے کہ جو کچھ کہتا ہے اس کو سمجھتا نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یا تو یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے اللہ تعالیٰ پر، یا یہ ہے کہ مجنون ہے۔[2] ہمزہ ﴿ اَفْتَرٰی ﴾ میں ہمزۂ استفہام ہے اور اس کی وجہ سے ہمزۂ وصل حذف کیا گیا ہے۔ چنانچہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ ﴾ [مریم: ۷۸] میں گزر چکا ہے۔

پھر جو بات انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حق میں کہی تھی، اللہ پاک نے اسے یوں رد فرمایا: ﴿ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ﴾ یعنی امر ویسا نہیں ہے جیسا انھوں نے خیال کیا، بلکہ وہی لوگ فہم وادراکِ حقائق سے گمراہ ہوئے تو آخرت کا انکار کیا اور جس کو وہ لے کر آئے تھے، اس پر ایمان نہ لائے تو اس کے سبب سے آخرت میں ہمیشہ کے عذاب میں ہو گئے اور وہ اس وقت حق سے انتہا درجے کی دور کی گمراہی میں ہیں۔

پھر کفار نے جو تکذیب پر جرأت کی تھی، اللہ پاک نے اس کی وجہ سے ان کو یہ بات بیان کر کے ڈانٹ ڈپٹ کی کہ یہ امر اُن سے صرف اس وجہ سے صادر ہوا کہ انھوں نے آسمانوں اور زمین کی پیدایش میں کبھی غور وفکر اور تدبر نہیں کیا اور اس بات کو نہیں سوچا کہ جو ذات پاک اس عظیم خلق پر قادر ہو، اس کو یہ بات عاجز نہ کرے گی کہ اس کی مخلوقات میں سے جو اس سے کم درجے کی ہے اس کو مبعوث کرے اور جس ذات اور صفات پر وہ تھے، اس کی طرف

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٥٣) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٥٤)

اس مخلوق کو اعادہ کرے۔ ﴿ اَفَلَمْ يَرَوْا ﴾ میں ''فاء'' عطف کے لیے ہے مقدر پر جس کا مقام مقتضی ہے۔ ''أَيْ: أَعْمَوْا فَلَمْ يَرَوْا'' یعنی کیا وہ اندھے ہو گئے تو نہ دیکھا اس شے کی طرف جو اُن کے آگے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے، یعنی آسمان و زمین۔

یہ بات معلوم ہے کہ جو شے انسان کے سامنے ہے، وہ ہر وہ شے ہے جس پر اس کی نظر پڑتی ہے، بغیر اس کے کہ اپنا منہ اس کی طرف پھیرے اور اس کا خلف (پیچھے) ہر وہ شے ہے جس پر اس کی نظر نہیں پڑتی، یہاں تک کہ اپنی نظر اس کی طرف پھیرے۔ چنانچہ یہ آسمان تمام اطراف کو عام و شامل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ نظر کریں تو آسمان کو اپنے آگے پیچھے دیکھیں گے، اسی طرح جب زمین کی طرف نظر کریں تو اس کو اپنے آگے پیچھے دیکھیں۔ چنانچہ آسمان اور زمین ان کو گھیرے ہوئے ہیں تو اللہ پاک اس پر قادر ہے کہ ان کے کفر اور تکذیبِ رسول ﷺ کی وجہ سے اور بعث کے انکار کی وجہ سے ان پر جو عذاب چاہے نازل کر دے۔

چنانچہ یہ آیتِ کریمہ دو امر پر مشتمل ہے: ایک امر یہ ہے کہ آسمان و زمین کی یہ پیدایش جس کو اللہ نے پیدا کیا ہے، یہ اس کی قدرت کے کمال پر دلالت کرتی ہے، دوبارہ زندہ کرنا جو اس سے کم درجے کا کام ہے، اس پر اس کو پوری قدرت حاصل ہے، جیسا کہ اس کے قول میں ہے: ﴿ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴾ [يٰسٓ: ٨١] ''کیا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسے (انسان) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہی تو (سب کچھ) پیدا کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔''

دوسرا امر ان کو دھمکی دینا ہے اس طرح کہ جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے، اس ہیئت پر کہ ان میں جو مخلوقات ہے ان سب کا احاطہ کر لیا ہے، وہ اس پر قادر ہے کہ ان پر جلد عذاب لے آئے، جس طرح کہ یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ یعنی اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں جس طرح کہ ان سے پہلے لوگوں کو دھنسا دیا، جیسے: قارون۔ یا گرا دیں اُن پر آسمان سے ٹکڑے، جیسے: اصحابِ ایکہ پر گرا دیے، پھر کیوں کر اس سے بے خوف رہتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اگر وہ چاہے کہ اپنے آسمان سے عذاب کرے تو کرے۔ پھر اگر یہ چاہے کہ اپنی زمین سے عذاب کرے تو کرے اور کل مخلوق اس کے لیے اس کا لشکر ہے۔[1]

جمہور نے تینوں فعلوں کو بہ نونِ عظمت پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے تینوں کو بیائے تحتیہ پڑھا ہے۔ صرف کسائی رحمہ اللہ نے ﴿ نَخْسِفْ بِهِمُ ﴾ میں حرفِ فاء کا حرفِ با میں ادغام کیا ہے۔ امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے کہا: یہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ حرفِ فاء کا مخرج باطن شفتِ سفلی (نچلے ہونٹ کا اندر کا حصہ) اور اطرافِ ثنایائے علیا سے ہے بخلاف حرفِ باء کے۔ جمہور نے ''كِسْفًا'' بہ سکونِ سین پڑھا ہے اور حفص و سلمی نے بہ فتحِ سین۔[2] ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٦١_ ٣١٦٢) [2] فتح القدير (٤/ ٤١٥)

﴿ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ آسمان و زمین کی یہ خلق جو دکھائی دیتی ہے اور جس کا ذکر ہوا اس طرح کہ تمام اطراف سے ناظرین کو احاطہ کیے ہوئے ہے، اس میں البتہ ہر عبدِ منیب کے لیے واضح نشانی اور بیّن دلالت ہے، یعنی اس بندے کے لیے جو توبہ اور اخلاص کے ساتھ اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ ﴿ مُّنِيْبٍ ﴾ کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ غور وفکر سے فائدہ حاصل کرنے والا وہی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُّنِيْبٍ ﴾ سے مراد وہ شخص ہے جو توبہ کرنے والا اور اللہ کی طرف متوجہ ہونے والا ہے۔[1]

نکتہ:

یہاں ﴿ لَاٰيَةً ﴾ بہ صیغۂ واحد فرمایا اور اس کے بعد ﴿ لَاٰيٰتٍ ﴾ بہ جمع فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ اشارہ ہے احیائے موتی کی طرف، اس لیے یہاں توحید (واحد) مناسب ہے اور ما بعد میں سبا کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ایک قبیلہ تھا جو شہروں میں متفرق ہو گیا تو وہ فرقے فرقے ہو گئے، اس لیے یہاں جمع مناسب ہوا۔ پھر جو بندے اللہ پاک کی طرف رجوع ہونے والے ہیں، ان میں سے داود اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر کیا۔ چنانچہ داود علیہ السلام کے حق میں فرمایا: ﴿ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴾ [صٓ: ٢٤] ''پھر وہ اپنے رب سے استغفار کرنے لگا اور عاجزی کرتے ہوئے گر پڑا اور (پوری طرح) رجوع کیا۔'' اور سلیمان علیہ السلام کی شان میں ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰي كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴾ [صٓ: ٣٤] ''اور ہم نے ان کے تخت پر ایک جسم ڈال دیا پھر اس نے رجوع کیا۔'' پھر فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

اور یقیناً ہم نے داود کو اپنی طرف سے فضیلت عطا کی، (ہم نے حکم دیا:) اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح دہراؤ، اور (اے) پرندو! (تم بھی) اور ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کر دیا ⑩ کہ تو کامل کشادہ (زرہیں) بنا اور کڑیاں جوڑنے میں (مناسب) اندازہ رکھ اور تم (سب) نیک عمل کرو، تم جو کرتے ہو بلاشبہہ اسے میں خوب دیکھنے والا ہوں ⑪

داود علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا بیان:

داود علیہ السلام چوتھے دن جنگل میں نکلتے، اپنے گناہ پر روتے اور خوش الحانی سے زبور پڑھتے۔ اس کے اثر سے پہاڑ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٦٢)

بھی ساتھ پڑھتے اور روتے تھے اور جانور پاس آ کر بیٹھ جاتے، اسی طرح آواز کرتے۔ اس مجلس میں لوگوں کے بہت جنازے نکلتے۔ کڑیوں کی زرہ پہلے پہل ان ہی سے نکلی کہ کشادہ رہے۔ انتہیٰ.

اللہ پاک اپنے اس انعام کی خبر دیتا ہے جو اس نے اپنے بندے اور رسول داود علیہ السلام پر کیا کہ ان کو فضلِ مبین دیا۔ نبوت و بادشاہت ان کے لیے جمع کیں یا قدرتِ سلطنت ان کو دی، ساز و سامان والے بہت سے لشکر دیے اور ایسی عظیم اور اچھی آواز عطا کی کہ جس وقت وہ تسبیح کرتے تو بلند بلند جمے ہوئے سخت پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے اور صبح و شام کے چگنے والے پرندے ان کے لیے ٹھہر جاتے اور طرح طرح کی زبانوں سے ان کا ساتھ دیتے تھے۔ صحیح میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی آواز سنی، وہ رات کو پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ ٹھہر گئے، پھر ان کی قراءت سنی۔ پھر فرمایا: «لَقَدْ أُوتِيَ هٰذَا مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوٗدَ»[1] یعنی البتہ تحقیق یہ آلِ داود کی مزامیر سے مزمار دیا گیا۔ «مِزْمَارٌ» بالکسرہ وہ آلہ ہے جس کو بجاتے ہیں، یعنی بانسلی۔ آپ ﷺ نے ان کی اچھی آواز اور حلاوتِ نغمہ کو تشبیہ دی صوتِ مزمار سے، گویا ان کے حلق میں مزامیر ہیں کہ ان سے آواز کر رہے ہیں۔ « آل » کا کلمہ زائد ہے، خود داود علیہ السلام مراد ہیں۔ قراءت کی اچھی آواز میں وہ ضرب المثل ہیں۔ امام ابوعثمان نہدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی آواز سے زیادہ اچھی آواز کسی جھانج کی نہیں سنی، نہ ہی کسی بربط کی اور نہ کسی تانت کی۔ (اصل روایت کے الفاظ "صنج" ہے جس کا ترجمہ چنگ ہے اور "بربط" عود کو کہتے ہیں، یہ معرب ہے بربط کا جس کے ترکیبی معنی سینہ بط ہیں، کیوں کہ اس کی شکل سینہ بط کے مشابہ ہوتی ہے، اس لیے اس کا یہ نام رکھا ہے۔ كذا في الصراح)

﴿ اَوِّبِیْ ﴾ کے معنی "سَبِّحِيْ" ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے، یعنی اللہ پاک نے پہاڑوں سے فرمایا کہ تم اس کے ساتھ تسبیح کرو۔ امام ابومیسرہ رحمہ اللہ کا یہ زعم ہے کہ ﴿ اَوِّبِیْ ﴾ بہ معنی "سَبِّحِيْ" زبانِ حبشہ میں ہے،[2] لیکن اس قول میں نظر ہے، کیوں کہ لغت میں تاویب کا معنی ترجیع ہے، چنانچہ پہاڑوں اور پرندوں کو یہ حکم ہوا کہ اپنی آوازوں سے ان کے ساتھ ترجیع کریں۔ (ترجیع حلق میں تردید صوت کو کہتے ہیں، مثل قراءتِ اہل الحان اور تکرارِ کلام جہراً بعد خفاً[3] (كذا في المجمع)۔ صراح میں ہے: "آواز گردانیدن در حلق")۔

ابو القاسم عبد الرحمٰن بن اسحاق زجاجی نے اپنی کتاب جمل کے بابِ ندا میں کہا ہے: "أَيْ: سِيْرِيْ مَعَهُ بِالنَّهَارِ كُلِّهٖ، وَالتَّادِيْبُ سَيْرُ النَّهَارِ كُلِّهٖ، وَالْإِسَادُ سَيْرُ اللَّيْلِ كُلِّهٖ وَهٰذَا لَفْظُهٗ"۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَهُوَ غَرِيْبٌ جِدًّا لَمْ أَرَهُ لِغَيْرِهٖ" یعنی یہ قول نہایت غریب ہے۔ امام ابو القاسم رحمہ اللہ کے سوا اور کسی کو میں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٣)

[2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٥٧) [3] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٢٩١)

نے نہیں دیکھا کہ اس کا ذکر کیا ہو، اگرچہ لفظ کی حیثیت سے۔ لغت میں اس کے لیے مساعدت ہے، لیکن اس جگہ آیت کے معنی میں بعید ہے۔ درست یہ ہے کہ ﴿ اَوِّبِيْ مَعَهٗ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ "رَجِّعِي مُسَبِّحَةً مَعَهُ" چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ والله أعلم۔[1]

﴿ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴾ امام حسن بصری، قتادہ اور اعمش رحمہ اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ ان کو اس کی حاجت نہیں ہوتی تھی کہ لوہے کو آگ میں داخل کریں اور نہ اس کی کہ ہتھوڑے سے اس کو پیٹیں، بلکہ وہ تو اس کو دھاگوں کی طرح اپنے ہاتھ سے بٹتے تھے، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ ﴾۔ ﴿ سٰبِغٰتٍ ﴾ سے مراد زرہیں ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے پہل کڑیوں سے زرہیں انھوں نے ہی بنائی ہیں، ان سے پہلے جو تھے وہ صفائح تھے، یعنی لوہے کے چوڑے چوڑے پترے جن کو بدن پر لگا لیا کرتے تھے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن شوذب سے روایت کیا ہے: "كَانَ دَاوُدُ عَلَیْہِ السَّلَامُ يَرْفَعُ فِي كُلِّ يَوْمٍ دِرْعًا" یعنی داود علیہ السلام ہر دن ایک زرہ بنا کر اٹھا لیتے تھے، پھر اسے چھ ہزار درہم میں بیچتے تھے۔ دو ہزار تو اُن کے اور ان کے گھر والوں کے لیے اور چار ہزار درہم سے بنی اسرائیل کو میدے کی روٹی کھلاتے تھے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ﴾ اس قول میں اللہ پاک نے اپنے نبی داود علیہ السلام کو زرہیں بنانے کی تعلیم فرمائی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ باریک میخ مت بنا کہ وہ کڑے میں مضطرب ہو اور نہ اس کو موٹا بنا کہ وہ کڑے کو توڑ ڈالے تو تُو اس کو ایک اندازے سے بنا۔ امام حکم بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو موٹا مت بنا کہ توڑ ڈالے اور باریک مت کر کہ مضطرب ہو۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم سے مروی ہے۔[3] علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ "سرد" لوہے کے حلقے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جب زرہ مسمورۃ الحلق ہو، یعنی جس زرہ کی کڑیوں میں میخیں لگی ہوتی ہیں، اس کو درہ مسرودہ کہتے ہیں۔ شاعر کے قول سے اس پر استشہاد کیا ہے۔

وَعَلَيْهِمَا مَسْرُوْدَتَانِ مَضَاهُمَا ‏ ‏ ‏ ‏ دَاوُدُ أَوْ صَنَعَ السَّوَابِغَ تُبَّعُ

(تفسیر ابن کثیر میں یہ شعر اسی طرح ہے۔ فتح القدیر میں اس کو ابو ذویب ہذلی کی طرف منسوب کیا ہے اور شعر یوں لکھا ہے:

وَعَلَيْهِمَا مَسْرُوْدَتَانِ قَضَاهُمَا ‏ ‏ ‏ ‏ دَاوُدُ أَوْ صَنَعَ السَّوَابِغَ تُبَّعُ[4])

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمۂ داود علیہ السلام میں اسحاق بن بشر کے طریق سے ذکر کیا ہے اور اس میں کلام ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٩٠)
[2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٣٥٩) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٩٠)
[3] تفسیر الطبري (٢٠/ ٣٦١۔ ٣٦٢)
[4] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٩٠) فتح القدیر (٤/ ٤١٧)

"عن أبي إلياس عن وهب بن منبه"۔ مضمون اس کا یہ ہے کہ داود علیہ السلام صورت بدل کر نکلا کرتے تھے تو اپنا اور اپنے چال چلن کا حال قافلے والوں سے پوچھتے تو جس کسی سے پوچھتے، وہ ان کی عبادت، سیرت اور عدل میں ان کی اچھی تعریف ہی کرتا۔ امام وہب رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہاں تک کہ اللہ نے ایک فرشتہ آدمی کی صورت میں بھیجا تو وہ داود علیہ السلام سے ملا، چنانچہ جس طرح وہ اور لوگوں سے پوچھا کرتے تھے، اسی طرح اس سے بھی پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اپنے لیے اور اپنی اُمت کے لیے بہترین مرد ہیں، مگر اس میں ایک خصلت ہے، اگر وہ اس میں نہ ہوتی تو وہ کامل تھا۔ پوچھا: وہ کیا ہے؟ کہا: وہ خود بھی کھاتا ہے اور اپنے عیال کو بھی مسلمین کے مال سے، یعنی بیت المال سے کھلاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت داود علیہ السلام اپنے رب عزوجل کے سامنے یہ دعا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے کہ ان کو کوئی ایسا ہنر سکھائے جس کو وہ کریں تو مستغنی ہو جائیں اور اپنے عیال کو غنی کریں، اس پر اللہ عزوجل نے ان کے لیے لوہا نرم کر دیا اور ان کو زرہیں بنانا سکھایا تو انھوں نے زرہ بنائی، پہلے پہل انھوں نے ہی اس کو بنایا۔

چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ﴾ یعنی اندازے سے بنا کڑیوں کی میخیں۔ کہا: وہ زرہ بنایا کرتے تھے، پھر جب ان کے بنانے سے ایک زرہ تیار ہو جاتی تو اس کو بیچتے، اس کا تہائی حصہ خیرات کرتے اور تہائی میں وہ شے خریدتے جو اُن کو اور ان کے عیال کو کفایت کرتی اور تہائی رکھ چھوڑتے کہ اس کو خیرات کریں دن میں بعوض دن کے، یہاں تک کہ اس کے سوا اور زرہ بنائیں (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: « یوماً بیوم إلى أن یعمل غیرها »۔ شاید معنی یہ ہیں کہ اس باقی ماندہ ثلث کو تھوڑا تھوڑا اس انداز سے خیرات فرماتے کہ دوسری زرہ بن چکتی، نکتہ اس میں یہ ہے کہ کوئی دن خیرات سے خالی نہ رہ جائے۔ واللّٰه تعالیٰ أعلم مصحح سلمه اللّٰه) اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کو ایک ایسی شے عطا کی تھی کہ ان کے سوا کسی کو عطا نہیں کی۔ وہ اچھی آواز تھی۔ بے شک جس وقت وہ زبور پڑھتے تھے تو وحشی جانور ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کی گردنیں پکڑ لی جاتی تھیں اور وہ غصہ نہیں کرتے تھے اور شیاطین نے جو مزامیر و بربط و صنج بنائی ہیں، وہ انہیں کی اصنافِ آواز پر بنائی ہیں اور وہ شدید الاجتہاد تھے، یعنی عبادت میں بہت سعی کرتے تھے اور جس وقت زبور کو قراءت سے شروع کرتے تو ایسا لگتا گویا مزامیر میں پھونک رہے ہیں، ان کے حلق میں ستر مزامیر ان کو عطا کی گئی تھیں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں تم کو عطا کی ہیں ان میں بھلے کام کرو، بے شک میں تمھارا مراقبہ کرنے والا ہوں، یعنی نگہبانی کرنے والا ہوں، تمھارے اعمال و اقوال کو دیکھتا ہوں، ان میں سے کوئی شے مجھ پر مخفی نہیں ہے۔[2] (کذا في ابن کثیر)

[1] تاریخ دمشق (۱۷/ ۹۱۔ ۹۲) [2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۶۹۰۔ ۶۹۱)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ہم نے داود علیہ السلام کو اس کی ہماری طرف انابت کی وجہ سے باقی نبیوں پر فضیلت دی ہے۔ اس فضیلت میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ چنانچہ کسی نے کہا ہے کہ نبوت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ علم۔ کسی نے کہا ہے کہ قوت۔ جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ﴾ [صٓ: ١٧] ''اور ہمارے بندے داود کو یاد کریں، جو بڑی قوت والا تھا۔'' کسی نے کہا ہے کہ پہاڑوں کی تسخیر، جس طرح کہ ﴿ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ ﴾ میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ توبہ۔ کسی نے کہا ہے کہ حکم بالعدل، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾ [صٓ: ٢٦] ''اے داود! ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنا دیا، تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو۔'' کسی نے کہا ہے کہ لوہے کا نرم کرنا ہے، جیسا کہ ﴿ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴾ میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اچھی آواز ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ فضیلتِ مذکور وہی ہے جس کا اللہ پاک نے بعد میں اس قول میں ذکر فرمایا ہے: ﴿ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴾ یعنی ہم نے کہا: اے پہاڑو! اس کے ساتھ مل کر تسبیح کرو، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ ﴾ [صٓ: ١٨] ''ہم نے پہاڑوں کو اس کے تابع کر رکھا تھا کہ اس کے ساتھ تسبیح خوانی کریں۔''

تاویب بہ معنی تسبیح ہے۔ داود علیہ السلام جب تسبیح کرتے تو پہاڑ اُن کے ساتھ تسبیح کرتے۔ پہاڑوں کی تسبیح کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس پر قادر کر دیتا تھا۔ یا داود علیہ السلام کے معجزے کے لیے ان میں تسبیح پیدا کر دیتا تھا۔ جمہور نے ﴿ اَوِّبِيْ ﴾ بہ فتحِ ہمزہ وتشدیدِ واؤ بہ صیغۂ امر پڑھا ہے تاویب سے جس کے معنی ترجیع کے ہیں، یا تسبیح کے، یا سیر کل نہار کے، یا نَوح کے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن، قتادہ اور ابن ابی اسحاق رحمہم اللہ نے ''اُوْبِيْ'' پڑھا ہے بہ ضمِ ہمزہ بہ صیغۂ امر ''آبَ يَؤُبُ، إِذَا رَجَعَ'' سے، یعنی تم اس کے ساتھ رجوع کرو۔ جمہور نے ﴿ وَالطَّيْرَ ﴾ کو منصوب پڑھا ہے ﴿ فَضْلًا ﴾ پر عطف کیا ہے اس معنی میں: ''وَسَخَّرْنَا لَهُ الطَّيْرَ''۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا داود علیہ السلام کو طیور دینا ان کے واسطے طیور کی تسخیر ہے۔ یا معطوف ہے ﴿ يٰجِبَالُ ﴾ کے محل پر، کیوں کہ وہ تقدیراً منصوب ہے اس لیے کہ معنی یہ ہیں: ''نَادَيْنَا الْجِبَالَ وَالطَّيْرَ''

امام سیبویہ اور ابو عمرو بن العلاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا نصب فعلِ مضمر سے ہے، اس معنی میں: ''وَسَخَّرْنَا لَهُ الطَّيْرَ''۔ امام زجاج اور نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ مفعول ﴿ مَعَهٗ ﴾ ہو، جیسے: یہ مثال ہے: ''اِسْتَوَى الْمَاءُ وَالْخَشَبَةَ''۔ یعنی برابر ہوا پانی ساتھ لکڑی کے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَضْلًا ﴾ پر معطوف ہے، لیکن بر تقدیرِ مضاف محذوف، یعنی ''آتَيْنَاهُ فَضْلًا وَّ تَسْبِيْحَ الطَّيْرِ''۔ امام سلمی، اعرج، یعقوب، ابو نوفل اور ابن ابی اسحاق رحمہم اللہ

نے اور نصر نے عاصم سے اور ابن ہرمز و مسلمہ بن عبد الملک نے بہ رفع پڑھا ہے لفظِ جبال پر عطف کیا ہے، یا ﴿ اَوِّبِيْ ﴾ کی ضمیر مستتر پر، اس لیے کہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فصل واقع ہوگئی ہے۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس نظم میں جو عظمت ہے وہ مخفی نہیں ہے اس جہت سے کہ جبال کو بہ منزلہ عقلاء ٹھہرایا ہے کہ جب ان کو اطاعت کا حکم کرے تو اطاعت کریں اور جس وقت ان کو پکارے تو جواب دیں۔ اس سے منظور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ جو حیوان اور جماد ہے وہ اللہ پاک ہی کی مشیت کا فرماں بردار اور مطیع ہے۔ اگر یوں فرماتا کہ "آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا تَأْوِيبَ الْجِبَالَ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ"، تو اس میں یہ عظمت نہ ہوتی۔[2]

﴿ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴾ معطوف ہے ﴿ اٰتَيْنَا ﴾ پر، یعنی اور نرم کر دیا ہم نے ان کے لیے لوہا، تا کہ جو چاہیں اس سے بنائیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: موم کی طرح کر دیا، اس کو بغیر آگ کے بناتے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے ہاتھ میں لوہا گیلی مٹی، موم اور آٹے کی طرح تھا، بغیر آگ کے استعمال کرتے اور بغیر ہتھوڑا مارنے کے اس کو جس طرح چاہتے موڑ لیتے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3] دن کے بعض میں، یعنی ایک حصے میں زرہ بنانے سے فارغ ہو جاتے تھے۔ ﴿ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ ﴾ کلمۂ ﴿ اَنِ ﴾ یا تو مصدریہ ہے بنا بر حذفِ حرفِ جر "أَيْ: بِأَنِ اعْمَلْ"۔ یا مفسرہ ہے ﴿ اَلَنَّا ﴾ کے لیے۔ (قاله الحوفي)

اس میں نظر ہے، کیوں کہ "أَنْ" تفسیر کا نہیں ہوتا مگر قول کے بعد۔ یا قول کے معنی کے بعد۔ بعض نے اس میں ایک فعل مقدر نکالا ہے جس میں قول کے معنی ہیں۔ کہا: تقدیر یہ ہے: "أَمَرْنَاهُ أَنِ اعْمَلْ" حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ﴿ سٰبِغٰتٍ ﴾ موصوف مقدر کی صفت ہے، یعنی "دِرْعًا سَابِغَاتٍ"۔ "سوابغ" بہ معنی کوامل و واسعات ہے۔ "سَبَغَ الدِّرْعَ وَالثَّوْبَ وَغَيْرَهُمَا" اس وقت بولتے ہیں کہ زرہ اور کپڑا وغیرہ، ہر اس شے کو ڈھانک لے جو آدمی پر ہے اور اس سے کچھ فضلہ بچ رہے۔ ﴿ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ﴾ "سَرْدٌ" زرہوں کے بننے کو کہتے ہیں اور اس کو "سَرْدٌ وَزَرْدٌ" بولتے ہیں، جس طرح کے "سَرَّادٌ" اور "زَرَّادٌ" زرہ کے بنانے والے کو کہتے ہیں۔ "سرد" بہ معنی "خرز" بھی آتا ہے۔ "خرز" کہتے ہیں موزے کی درز سینے کو۔ محاورے میں بولتے ہیں: "سَرَدَ يَسْرُدُ إِذَا خَرَزَ" اسی باب سے "سَرَدَ الْكَلَامُ" ہے۔ "إِذَا جَاءَ بِهِ مُتَوَالِيًا"، یعنی جس وقت کوئی شخص اس طرح سے باتیں کرتا ہے کہ ایک کو دوسرے کے بعد توالی و تتابع لاتا ہے تو اس وقت کہتے ہیں: "سَرَدَ الْكَلَامَ"۔

اسی معنی سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ حدیث ہے کہ « لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ يَسْرُدُ الْحَدِيْثَ كَسَرْدِكُمْ »[4] یعنی رسول اللہ ﷺ سرد نہیں کرتے تھے، تمھارے سرد کرنے کی طرح اس طور پر کہ بعض بات کو بعض کے

---

[1] فتح القدير (٤/ ٤١٦۔ ٤١٧) [2] تفسير النسفي (/ ٣٢١۔ ٣٢٢) [3] فتح القدير (٤/ ٤١٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٣)

بعد بتوالی وتتابع ذکر کریں کہ بات متلبس ہو جائے اور سننے والے کو شبہہ پڑ جائے، بلکہ آپ ﷺ فصل فرماتے تھے، جدا جدا باتیں کرتے تھے، اس طرح کہ اگر سننے والا ان کو گننا چاہے تو گن سکتا۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی معنی سے "سرید" بہ معنی جری ہے۔ "سَرَدَ وَدَرَعَ" کے معنی ہیں، ان کا محکم اور مضبوط بنانا اور یہ کہ ان کی کڑیاں پے در پے ہوں مختلف نہ ہوں۔ ان کا پرونا یکے بعد دیگرے ہو۔ اسی باب سے لبید کا یہ قول ہے:

سَرَدَ الدُّرُوْعَ مُضَاعِفًا أَسْرَادَهُ لِيَنَالَ طُوْلَ الْعَيْشِ غَيْرَ مَرُوْمِ

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام سے قبل زرہیں بھاری ہوتی تھیں، اس لیے خود ان کو اس شے میں تقدیر کا حکم کیا گیا جو ہلکی بھی ہو اور مضبوط بھی ہو، یعنی اس شے کا اندازہ کر کہ اس میں یہ دونوں خصوصیتیں پائی جائیں۔ چنانچہ صرف مضبوطی ہی کا قصد مت کر کہ وہ اس کو بھاری کر دے اور نہ ہی خِفّت کا قصد کر کہ وہ بچاؤ اور روک کو زائل کر دے۔ غرض یہ کہ ایسے انداز سے بنا کہ مضبوط بھی ہو اور ہلکی بھی کہ اس کو پہننے والا خوب کروفر کر سکے اور تلوار کی ضرب اور تیر کی مار سے بچ سکے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ جس تقدیر کا ان کو حکم ہوا وہ کڑی کے اندازے میں ہے۔ یعنی کڑی کو چھوٹی مت بنا کہ کمزور ہو اور زرہ مدافعت کرنے کے لیے مضبوط نہ ہو اور نہ اس کو بڑا بنا کہ پہننے والے پر بھاری ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ تقدیر میخ میں ہے، یعنی زرہ کی میخ کو باریک مت کر کہ مضطرب ہو اور نہ موٹی کہ کڑیوں کو توڑ ڈالے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اندازہ کرنا لوہے کی کڑیوں میں ہے۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ تو میخوں کو باریک نہ کر اور کڑیوں کو وسیع کر، تاکہ وہ نرم اور ڈھیلی ہوں اور میخوں کو موٹا نہ کر کہ وہ تنگ کڑیوں کو توڑ ڈالیں اور اس کو ایک اندازے سے بنا،[1] یعنی میخیں نہ ایسی موٹی بنا کہ کڑیوں کو توڑ ڈالیں اور نہ ایسی باریک کہ کڑیوں میں حرکت کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر کڑی کو دوسری کڑی کے برابر بنا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال رکھ کہ وہ تنگ ہو، تاکہ تیر اس میں سے نہ گزر سکے اور وہ کڑی اپنی موٹائی میں ایسی ہونی چاہیے کہ نہ تو تلوار اس کو کاٹ سکے اور نہ زرہ پہننے والے پر بھاری ہو کہ اس کو ہلنے جلنے اور تیزی سے حرکت کرنے سے روکے ہر مواقع میں، یعنی کروفر میں اور طعن وضرب میں، خشکی وتری میں اور سردی وگرمی میں۔

ظاہر یہ ہے جیسا کہ بقاعی نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام کی زرہوں کی کڑیوں میں میخیں نہ تھیں، کیوں کہ لوہے کے نرم ہو جانے کی وجہ سے میخوں کی کچھ ضرورت نہ تھی، ورنہ ان کی تیار کی ہوئی زرہوں میں اور دوسری زرہوں میں کچھ فرق نہ ہوتا اور نہ لوہے کو نرم کرنے کا کوئی بڑا فائدہ ہوتا۔ بعض لوگ جنھوں نے اس زرہ کو دیکھا ہے جو داود علیہ السلام کی طرف منسوب ہے تو انھوں نے یہ خبر دی کہ وہ بغیر میخوں کے تھی۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ تم کو اس کا امر ایجابی نہیں کیا گیا، یہ تو صرف اکتساب ہے، یعنی علم کا سیکھنا ہے اور کسب بہ قدرِ حاجت ہوتا ہے اور باقی دن

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٦٧)

اور راتیں عبادت کے لیے ہیں، لہٰذا تو اس کام میں اندازہ کر اور اپنے سارے اوقات میں کسب کے ساتھ مشغول نہ ہو، بلکہ اس میں روزی حاصل کر لے اور بس۔ (كذا ذكر الخطيب)[1]

پھر اللہ پاک نے داود علیہ السلام کو اور اُن کے گھر والوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: ﴿ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ﴾ یعنی اور عملِ صالح کرو۔ جس طرح کے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ﴾ [سبا: ۱۳] ''اے آلِ داود! اس کے شکریے میں نیک عمل کرو۔'' پھر اس امر کی وجہ یہ ذکر فرمائی: ﴿ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ یعنی تمھارے کام سے کوئی شے مجھ پر مخفی نہیں ہے تو میں تم کو اس کا بدلہ دوں گا۔[2]

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ
وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ
يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۱۲ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ
وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ
دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝۱۳

اور ہوا کو سلیمان کے (تابع کیا)، اس کا صبح کا چلنا ایک ماہ (کی مسافت) تھا اور اس کا شام کا چلنا بھی ایک ماہ (کی مسافت) تھا، اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور بعض جن (اس کے تابع کر دیے) جو اس کے سامنے اس کے رب کے حکم سے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرکشی کرتا تو ہم اسے خوب بھڑکتی آگ کا عذاب چکھاتے ⑫ جو وہ (سلیمان) چاہتا وہ (جن) اس کے لیے وہی بنا دیتے، عالی شان عمارتیں اور مجسمے اور حوضوں جیسے (بڑے بڑے) لگن اور ایک ہی جگہ (چولھوں پر) جمی ہوئی دیگیں، اے آلِ داود! شکرانے کے طور پر (نیک) عمل کرو اور میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہی ہیں ⑬

سلیمان علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا بیان:

سلیمان علیہ السلام کا تخت جس پر تمام لشکر چلتا تھا ہوا اس کو لے چلتی تھی، شام سے یمن اور یمن سے شام اسی دن میں لے جاتی۔ یمن کی طرف اللہ تعالیٰ نے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ نکال دیا، جن اس کو سانچوں میں ڈھال کر

[1] تفسير الرازي (۲۵/ ۲۱۳) [2] فتح البيان (۱۱/ ۱۶۸۔ ۱۷۰)

بڑے بڑے برتن بناتے اور ان میں پورے لشکر کا کھانا پکتا تھا اور اس کھانے کو بانٹتے تھے۔ انتہیٰ۔

اللہ پاک نے داود علیہ السلام پر جو انعام کیا تھا، جب اس کا ذکر کر چکا تو اب اس انعام کا ذکر کیا جو اُن کے فرزند سلیمان علیہ السلام پر کیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ ہوا ان کے حکم کے تابع کر دی، وہ ان کی بساط (بچھونے) کو لا دیتی، اس کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ اور شام کی منزل ایک مہینے کی راہ تھی۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ صبح کو اپنی بساط پر دمشق سے چلتے تو اصطخر میں اترتے۔ اس میں صبح کا کھانا کھاتے اور شام کو اصطخر سے چلتے تو کابل میں رات بسر کرتے۔ دمشق اور اصطخر کے درمیان تیز چلنے والے کے لیے پورے ایک مہینے کی راہ ہے اور اصطخر اور کابل کے درمیان بھی تیز چلنے والے کے لیے پورے ایک ماہ کی راہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، عطاء خراسانی، قتادہ، سدی، مالک عن زید بن اسلم، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ قطر نحاس ہے، یعنی تانبے کو قطر کہتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ تانبے کا چشمہ یمن میں تھا، چنانچہ ہر وہ شے جو لوگ بناتے ہیں، وہ اس شے سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لیے نکالا تھا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صرف تین دن ان کے لیے بہایا گیا تھا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے اس کے لیے جن مسخر کر دیے تھے، وہ اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے، یعنی دیگیں بناتے تھے اور مکان وغیرہ جس طرح وہ چاہتے ان کے لیے بناتے تھے۔ اللہ پاک نے اپنی مشیت سے جنوں کو ان کا فرماں بردار کر دیا تھا۔ ﴿وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو کوئی جنوں میں سے اطاعت سے باہر ہو اور نافرمانی کرے تو ہم اس کو سعیر کے عذاب سے چکھائیں۔ سعیر بہ معنی حریق، یعنی جلن کا عذاب۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے ایک غریب حدیث ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن تین قسموں کے ہیں: ایک قسم کے تو پَر ہیں، وہ ہوا میں اڑتے ہیں اور ایک قسم کے سانپ اور کتے ہیں اور ایک صنف نزول کرتے ہیں اور کوچ کرتے ہیں۔[2] اس حدیث کا مرفوع ہونا نہایت غریب ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی ابن انعم سے روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جن کے تین صنف ہیں: ایک صنف کو ثواب اور عذاب ملتا ہے اور ایک صنف آسمان و زمین کے درمیان اڑنے والی ہے اور ایک صنف سانپ اور کتے ہیں۔

بکر بن مضر راوی نے کہا اور میں نہیں جانتا ہوں مگر یہ کہ محمد بن بجیر نے کہا کہ ابن انعم نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی کہ انسانوں کی تین قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جن کو اللہ قیامت کے دن اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٦٩١) [2] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٩٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١١٤)

اور ایک قسم چوپایوں کی طرح ہے، بلکہ وہ زیادہ گمراہ ہیں از روئے راہ کے اور ایک قسم شیطانوں کے دلوں پر آدمیوں کی صورت میں ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی تیسری روایت حسن رحمہ اللہ سے یہ ہے کہ جنّ ابلیس کی اولاد ہیں اور انس آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور جنّوں میں سے مومن ہیں اور انسانوں میں سے مومن ہیں اور وہ ثواب اور عذاب میں ان کے شریک ہیں اور جو کوئی اُن میں سے اور ان میں سے مومن ہے تو وہ اللہ کا ولی ہے اور جو کوئی ان میں سے اور ان میں سے کافر ہے تو وہ شیطان ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ ﴾۔ ﴿ مَحَارِيْبَ ﴾ تو بنائے حسن ہے مکان میں، یعنی عمارت میں۔ جو جگہ شریف تر اور بڑی ہوتی ہے اس کو محراب کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ مَحَارِيْبَ ﴾ وہ عمارتیں ہیں جو قصور (محلات) سے چھوٹی ہوتی ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مساجد ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قصور و مساجد ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مساکن ہیں۔ رہی ﴿ تَمَاثِيْلَ ﴾ تو امام عطیہ عوفی، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ صور ہیں، یعنی صورتیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ تانبے کی صورتیں تھیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مٹی کی اور شیشے کی صورتیں تھیں۔[2] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ﴾۔ "جَوَابٌ"، "جَابِيَةٌ" کی جمع ہے۔ "جَابِيَةٌ" وہ حوض ہے جس میں پانی جمع کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اعشی میمون بن قیس نے کہا ہے:

تَرُوْحُ عَلٰى آلِ الْمُحَلَّقِ جَفْنَةٌ كَجَابِيَةِ الشَّيْخِ الْعِرَاقِيِّ تَفْهَقُ

آلِ محلق کی مدح کرتا ہے کہ شام کو ان پر ایسا بڑا پیالہ بھرا ہوا آتا ہے، جیسا کہ شیخ عراقی کا حوض کہ مارے پُر ہونے کے پانی اس سے جھلک رہا ہے۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ "كَالْجَوْبَةِ مِنَ الْأَرْضِ" (جو بہ کشادگی ابر وکوہ۔ صراح)۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے ان سے یہ روایت کیا ہے کہ "كَالْحِيَاضِ" ہے۔ اسی طرح امام مجاہد، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے۔ ﴿ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ﴾ سے مراد بڑی بڑی دیگیں ہیں کہ اپنے بڑے ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ میں جمی ہوئی ہیں، وہاں سے ہلتی جلتی نہیں ہیں۔ امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ وغیرہما نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ "أَثَافِيُّهَا مِنْهَا"، یعنی ان دیگوں کا چولہا انہیں میں سے ہے۔ غرض یہ ہے کہ چولہے سمیت بنائی گئی ہیں۔ ان کے اٹھانے اور رکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ﴾ یعنی ہم نے داود کے گھر والوں سے کہا ہے کہ حق مان کر کام کرو، یعنی

---

(1) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٩١۔ ٦٩٢)
(2) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٦٥۔ ٣٦٦) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٩٢)
(3) تفسير الطبري (٢٠/ ٣٦٦۔ ٣٦٨)

اس نعمت کا شکر ادا کرو جس کا تم پر انعام کیا ہے دین و دنیا میں۔ ﴿شُكْرًا﴾ مصدر ہے غیر فعل سے، یا مفعول لہ ہے، بنا بر دونوں تقدیروں کے اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ شکر فعل کے ساتھ ہوتا ہے جس طرح کہ قول و نیت کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أَفَادَتْكُمُ النَّعْمَاءُ مِنِّي ثَلَاثَةً يَدِيْ وَلِسَانِيْ وَالضَّمِيْرَ الْمُحَجَّبَا

یعنی تم نے جو مجھے نعمت دی، پس تمھاری نعمت نے میری طرف سے تم کو تین چیزوں کا فائدہ دیا: میرا ہاتھ اور میری زبان اور میرا دل جو مستور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تینوں چیزیں نعمت کے شکر میں مصروف ہیں۔ ہاتھ کا شکر منعم کی خدمت کرنا۔ زبان کا شکر اس کی مدح و تعریف و نعمت کا ذکر کرنا۔ دل کا شکر یہ ہے کہ دل میں اس کی نعمت کو ماننا دل اور زبان سے اس کو دعا دینا۔ ابوعبدالرحمٰن حبلی نے کہا ہے کہ نماز شکر ہے، روزہ شکر ہے اور ہر خیر جس کو تو اللہ عزوجل کے لیے کرتا ہے شکر ہے اور افضل شکر حمد ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے۔ امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ شکر اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ہے اور عملِ صالح ہے[1] اور یہ اس شخص کے لیے کہا جاتا ہے جو متلبس بہ فعل ہے۔ داود علیہ السلام کے گھر والے اسی طرح کے تھے کہ قولاً و فعلاً اللہ پاک کے شکر کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ثابت بنانی سے روایت کیا ہے کہ داود علیہ السلام نے اپنے اہل و اولاد اور بیبیوں پر نماز تقسیم کر دی تھی۔ سو رات اور دن میں سے کوئی گھڑی ان پر نہیں آتی تھی، مگر حال یہ ہے کہ ان کے گھر والوں میں سے آدمی کھڑا ہو کر نماز پڑھ رہا ہوتا تھا۔ چنانچہ اس آیت نے ان کو ڈھانک لیا تھا۔[2]

صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کو سب سے محبوب نماز داود علیہ السلام کی نماز ہے، وہ آدھی رات سوتے تھے اور تہائی رات نماز پڑھتے تھے اور رات کا چھٹا حصہ سوتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ داود علیہ السلام کا روزہ تھا، وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے اور بھاگتے نہ تھے جب کہ دشمن سے ملاقات کرتے۔[3] ابوعبداللہ ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سلیمان بن داود علیہما السلام کی والدہ نے ان سے کہا: میرے بیٹے! تو رات کو بہت مت سویا کر، پس بے شک رات کی نیند کی کثرت مرد کو قیامت کے دن فقیر چھوڑ دے گی۔[4]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے داود علیہ السلام سے اس جگہ ایک نہایت غریب اور طویل اثر ذکر کیا ہے اور نیز فضیل رحمہ اللہ

---

① تفسير الطبري (٢٠/ ٣٦٨۔ ٣٦٩) ② تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٦٣)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

④ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣٢) اس کی سند میں "یوسف بن محمد اور سنید بن داود" سخت ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٤٠٧٠)

سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ داود علیہ السلام نے عرض کی: اے رب! میں کیسے تیرا شکر ادا کروں، حالاں کہ شکر تو تیری طرف سے ایک نعمت ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تو نے میرا شکر ادا کیا، جبکہ تو نے یہ جان لیا کہ نعمت میری طرف سے ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴾۔ یہ حقیقتِ حال کی خبر ہے، یعنی حقیقت میں اسی طرح ہے کہ حق ماننے والے بندے کم ہیں۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جمہور نے ﴿ اَلرِّيْحَ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے اس تقدیر کے ساتھ: "وَسَخَّرْنَا لِسُلَيْمَانَ الرِّيْحَ"۔ جیسا کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی ہم نے سلیمان کے واسطے ہوا مسخر کر دی۔ ابوبکر کی روایت میں عاصم سے بہ رفع بنا بر ابتداء وخبر بایں تقدیر: "وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيْحَ ثَابِتَةٌ أَوْ مُسَخَّرَةٌ"، یعنی ہوا سلیمان علیہ السلام کے لیے ثابت ہے یا مسخر ہے۔ جمہور نے ﴿ اَلرِّيْحَ ﴾ واحد پڑھا ہے اور حسن، ابوحیوہ اور خالد بن الیاس نے "اَلرِّيَاحَ" جمع پڑھا ہے۔[2]

﴿ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ﴾ یعنی اس کا صباح سے زوال تک چلنا ہے، یعنی اس کا اول دن سے زوال تک چلنا ایک ماہ کی راہ ہے اور اس کا زوال سے غروب تک چلنا ایک ماہ کی راہ ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اس سے منظور یہ بیان کرنا ہے کہ ہوا مسخر کی ہوئی ہے، یا جملہ حالیہ ہے ریح سے، معنی یہ ہیں کہ ایک دن میں دو ماہ کی راہ چلتی تھی۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صبح کو دمشق سے چلتے تو اصطخر میں قیلولہ کرتے۔ ان دونوں کے درمیان ایک تیز چلنے والے کے لیے ایک ماہ کی راہ ہے۔ پھر زوال کے بعد چلتے اصطخر سے تو رات بسر کرتے کابل میں یا بابل میں۔ ان دونوں کے درمیان ایک ماہ کی راہ ہے۔[3] کسی نے کہا کہ رَی میں صبح کا کھانا کھاتے اور شام کا کھانا سمرقند میں کھاتے۔

﴿ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ﴾ یعنی ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسروں نے کہا ہے کہ ان کے لیے عین الصفر، یعنی صفر کا چشمہ تین دن اور رات بہتے پانی کی طرح بہایا گیا اور وہ زمینِ یمن میں تھا (صفر بالضم والکسر کہتے ہیں: روی کو، یعنی پیتل اور نحاس۔ بالضم مس ہے، یعنی تانبا۔ پس کہیں تو صفر ہے اور کہیں نحاس۔ واللہ أعلم)۔ آج کے دن جو لوگ بناتے ہیں تو وہ اسی سے ہے جو سلیمان علیہ السلام کو عطا ہوا تھا اور اگر وہ نہ ہوتا تو تانبا ہرگز نرم نہ ہوتا، کیوں کہ سلیمان علیہ السلام سے پہلے وہ ہرگز نرم نہیں ہوتا تھا، نہ آگ سے نہ کسی اور چیز سے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا جس طرح کہ ہم نے داود علیہ السلام کے لیے لوہا نرم

[1] تفسیر ابن كثير (٣/ ٦٩١۔ ٦٩٣) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٦٨۔ ٢٦٩) فتح القدير (٤/ ٤١٧۔ ٤١٨)

[3] تفسير الصنعاني (٣/١٢٧)

کر دیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا، تاکہ جس شے میں چاہے اس کا استعمال کرے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قطر، نحاس ہے۔ سلیمان علیہ السلام کے بعد اس پر کوئی قادر نہیں ہوا اور لوگ جو ان کے بعد عمل کرتے ہیں تو وہ اسی میں ہے جو سلیمان علیہ السلام کو عطا کیا گیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قطر صفر ہے۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نبوت پر دلالت کے لیے نحاس کو اس کے معدن میں پانی کے چشموں کی طرح ایک بہتا ہوا چشمہ کر دیا۔[3] تفسیر بیضاوی میں ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے معدن سے بہایا، وہ اس میں سے ایسے ابلتا ہے جیسے چشمے سے پانی اُبلتا ہے۔ اسی لیے اس کا نام چشمہ رکھا اور وہ یمن میں تھا۔[4] تفسیر ابوالسعود رحمہ اللہ میں ہے: کسی نے کہا ہے کہ تین دن ایک بار بہایا گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر مہینے میں تین دن بہا کرتا تھا۔[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عین القطر سے مراد معدنِ نحاس ہے۔ پس قطر نحاس ہے اور وہ صفر ہے، یعنی پیتل، لیکن اس کو بہا دیا۔ مہینے میں تین دن بہا کرتا تھا جس طرح کہ پانی بہتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام سے پہلے وہ پگھلتا نہ تھا اور اس کا نام باسم مآل الیہ کے عین القطر رکھا۔[6]

﴿ وَمِنَ الْجِنِّ ﴾ خبر مقدم ہے اور ﴿ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ مبتداء موخر ہے۔ یا ﴿ مَنْ يَّعْمَلُ ﴾ محلِ نصب میں ہے، فعل مقدر کا مفعول بہ ہے۔ "أَيْ: وَسَخَّرْنَا لَهُ مَنْ يَّعْمَلُ" اور ﴿ مِنَ الْجِنِّ ﴾ اسی مقدر سے متعلق ہے، یا حال و بیان ہے۔ ﴿ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ﴾ "إِذْنٌ" مصدر مضاف ہے فاعل کی طرف اور جار و مجرور مل کر محلِ نصب میں ہے بنا بر حال "أَيْ: مُسَخَّرًا أَوْ مُيَسَّرًا بِأَمْرِ رَبِّهٖ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جنوں میں سے جو کوئی ہمارے حکم کی نافرمانی کرے جس کا ہم نے اس کو حکم کیا ہے تو ہم اس کو عذابِ سعیر چکھائیں۔ وہ حکم یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کریں۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عذاب آخرت میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا میں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے جنوں پر ایک فرشتہ متعین کیا تھا، اس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا تھا، چنانچہ جس نے سلیمان علیہ السلام کی حکم عدولی کی تو اس نے اس کو اس کوڑے سے ایسی ضرب لگائی کہ اس کو جلا ڈالا۔[7] پھر جن چیزوں کو وہ سلیمان علیہ السلام کے لیے بناتے تھے، اللہ پاک نے ان کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ ﴾

حرف ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہے اور ﴿ مَحَارِيْبَ ﴾ لغت میں ہر اونچی جگہ ہے۔ ﴿ مَحَارِيْبَ ﴾ سے مراد اونچی

---

① فتح القدير (٤/٤١٨) ② الدر المنثور (٦/٦٧٨) ③ تفسير القرطبي (١٤/٢٧٠)

④ تفسير البيضاوي (٤/٣٩٤) ⑤ تفسير أبي السعود (٧/١٢٥) ⑥ تفسير النسفي (٣/٣٢٢) ⑦ تفسير القرطبي (١٤/٢٧١)

عمارتیں اور بلند محلات اور باعزت بیٹھنے کی جگہیں جو محفوظ اور مامون ہیں اور رہایش کی جگہیں اور مکانات۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محراب وہ ہوتے ہیں جن کی طرف زینہ لگا کر چڑھا جائے، اسی معنی سے وہ جگہ ہے جس میں نماز پڑھی جائے، اس کو محراب کہتے ہیں، کیوں کہ وہ بلند اور معظم کی جاتی ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محراب سب سے زیادہ باعزت گھر ہوتا ہے۔[1] امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: اس جگہ محراب سے مراد مساجد ہیں[2] اور وہ جو اُن کے لیے بنائی گئی تھیں، ان میں سے بیت المقدس ہے۔ ﴿ تَمَاثِيْلَ ﴾ جمع "تِمْثَالٌ" کی ہے۔ "تِمْثَالٌ" ہر وہ شے ہے جس کو تو کسی دوسری شے کی مانند کرے، یعنی تو اس کی شکل بنائے تانبے سے یا شیشے سے یا نرم پتھر یا کسی اور شے سے۔ کہا ہے کہ یہ تماثیل انبیاء، ملائکہ اور علماء و صلحاء کی صورتیں تھیں، مسجدوں میں ان کی صورتیں بنایا کرتے تھے، تاکہ لوگ ان کو دیکھیں تو عبادت اور اجتہاد زیادہ کریں۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس وقت ان میں کوئی مردِ صالح مر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں اس کی صورت بناتے،[3] تاکہ لوگ اس کی عبادت کو یاد کریں تو اپنی عبادت میں زیادہ جدوجہد اور کوشش کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ تماثیل ان چیزوں کی تھیں جو جانداروں سے نہیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ درندوں اور پرندوں کی صورتیں تھیں۔ اس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں تصویر بنانا جائز تھا اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں وہ منسوخ ہوگئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے تانبے کی تماثیل بنائیں۔ پھر عرض کی: اے رب! تو اُن میں روح پھونک دے، کیوں کہ وہ خدمت کرنے کے لیے بہت مضبوط ہیں تو اللہ پاک نے ان میں روح پھونک دی، چنانچہ وہ ان کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ اسفندیار ان کے بقایا میں سے تھا۔ اس پر داود اور سلیمان علیہما السلام سے یہ کہا گیا: ﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾۔[4]

﴿ وَجِفَانٍ ﴾ "جَفْنَةٌ" کی جمع ہے۔ "جَفْنَةٌ" قصعہ کبیرہ، یعنی بڑے پیالے کو کہتے ہیں۔ "جَوَابٌ" "جَابِيَةٌ" کی جمع ہے، "جَابِيَةٌ" حوض کی طرح ایک چھوٹا سا گڑھا ہے۔ کسی نے کہا: بڑا حوض ہے جو پانی کو جمع کرتا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے: یعنی پیالے جو بڑائی میں اونٹوں کے حوضوں کی طرح تھے، ایک پیالے پر ہزار مرد جمع ہوتے تھے اور اس سے کھاتے تھے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ مناسب "كَالْجَوَابِيْ" میں حرفِ یاء کا اثبات ہے اور جس نے "یاء" کو حذف کیا تو اس نے کہا ہے کہ الف و لام کا طریقہ یہ ہے کہ نکرہ پر داخل ہوتا ہے تو اس کو اس کے حال سے متغیر نہیں کرتا ہے۔ پھر جب "جَوَابٌ" کہا جاتا تھا اور الف و لام اس پر داخل ہوا تو اپنے حال پر برقرار رکھا گیا تو اس شخص نے "یاء" کو حذف کیا ہے۔ امام کسائی نے کہا

[1] فتح القدير (٤/٤١٨) [2] تفسير الطبري (٢٠/٣٦٥)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٨) [4] الدر المنثور (٦/٦٧٩)

ہے کہ محاورے میں بولتے ہیں: "جَبَيْتُ الْمَاءَ وَجَبَوْتُهُ فِي الْحَوْضِ" یعنی میں نے حوض میں پانی جمع کیا۔ "جَابِيَةٌ" وہ حوض ہے جس میں اونٹوں کے لیے پانی جمع کیا جاتا ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "جَابِيَةٌ" بڑی دیگ ہے اور حوضِ عظیم و کبیر ہے جس میں شے جمع کی جاتی ہے، اس معنی سے "جَبَيْتُ الْخَرَاجَ" ہے، یعنی میں نے خراج جمع کیا۔ "وَجَبَيْتُ الْجَرَادَ فِي الْكِسَاءِ" یعنی میں نے چادر یا کملی میں ٹڈیاں جمع کیں۔ ﴿ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تانبے کی دیگیں ہیں جو فارس میں ہوتی ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ دیگیں ہیں جو سخت پہاڑوں سے تراشی جاتی ہیں، شیاطین نے ان کے واسطے بنائی تھیں۔[1] ﴿ رّٰسِيٰتٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جمی ہوئی ہیں، نہ اٹھائی جاتی ہیں اور نہ حرکت کرتی ہیں۔ وہ اتنی بڑی ہے کہ سیڑھیاں لگا کر اُن کی طرف چڑھا جاتا ہے اور وہ یمن میں تھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ اب تک وہاں باقی ہیں۔

پھر اللہ پاک نے سلیمان علیہ السلام کو اور اُن کے گھر والوں کو علی العموم عملِ صالح کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ﴾ یعنی ہم نے ان سے کہا: اے آلِ داود! اللہ کی اطاعت کے عمل کرو، اس کا شکر کرنے کے لیے اس نعمت پر جو تم کو عطا کی۔ یا ﴿ شُكْرًا ﴾ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ "أَيْ: اِعْمَلُوْا عَمَلًا شُكْرًا" یا مفعول لہ ہے: "أَيْ: اِعْمَلُوْا لِلشُّكْرِ" یا حال ہے: "أَيْ: شَاكِرِيْنَ" یا مفعول بہ ہے۔ طاعت کا نام شکر اس لیے رکھا کہ طاعت شکر کی قسموں میں سے ہے۔ یا منصوب ہے بنا بر مصدریت، فعل اس کی جنس سے مقدر ہے: "أَيْ: اُشْكُرُوْا شُكْرًا".

پھر جب ان کو شکر کا امر کر چکا تو اس کے بعد یہ بیان کیا کہ اس کے بندوں میں سے اس کا شکر کرنے والے بہت نہیں ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ یعنی میری اطاعت کے ساتھ عمل کرنے والے اور میری نعمت کا شکر کرنے والے کم ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ میرے موحد بندوں سے ان کی توحید قلیل ہے۔[2] شکور وہ ہے جو توفر (وافر کرنا) کرنے والا ہے شکر ادا کرنے پر، صرف کرنا والا ہے اپنی طاقت کو اس میں جس نے از روی اعتقاد و اعتراف و اقرار و کدح وسعی کے اپنے دل و زبان و اعضا کو اس میں مشغول کر رکھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ شکور وہ ہے جو اپنے سارے احوال پر شکر کرتا ہے[3] اور وہ ہے جو شکر سے اپنا عجز دیکھتا ہے۔ ﴿ مِّنْ عِبَادِيَ ﴾ صفت ہے ﴿ قَلِيْلٌ ﴾ کی۔ صفت و موصوف مل کر خبر مقدم ہے اور ﴿ الشَّكُوْرُ ﴾ مبتداء موخر۔[4]

---

[1] فتح القدير (٤/ ٤١٨- ٤١٩) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٦٩) [3] روح المعاني (٢٢/ ١٢٠) [4] فتح البيان (١١/ ١٧١- ١٧٤)

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿١٤﴾

پھر جب ہم نے سلیمان پر موت کا فیصلہ (نافذ) کیا تو ان (جنوں) کو زمین کے کیڑے (دیمک) کے سوا کسی چیز نے بھی سلیمان کی موت کی اطلاع نہ دی، وہ اس کی لاٹھی کو کھاتا رہا، پھر جب وہ گر پڑا تو جنوں نے جان لیا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو وہ اس رسوا کن عذاب (مشقت) میں مبتلا نہ رہتے ⑭

سلیمان علیہ السلام کی وفات اور جنوں کے متعلق علم غیب کی نفی:

سلیمان علیہ السلام جنوں کے ہاتھ سے مسجد بیت المقدس بنواتے تھے، جب معلوم کیا کہ میری موت آ پہنچی تو جنات کو مسجد کا نقشہ بتا کر آپ شیشے کے مکان میں دروازہ بند کر کے بندگی میں مشغول ہوئے۔ ان کی وفات سے تقریباً ایک سال بعد تک جن تعمیر کرتے رہے، جب مسجد پوری بن گئی تو جس عصا پر ٹیک لگا کر کھڑے تھے گھن کے کھانے کی وجہ سے وہ عصا گرا تو آپ بھی گر گئے تب سب کو آپ کی وفات کا علم ہوا اور جن جو آدمیوں کے پاس علم غیب کا دعویٰ کرتے تھے، وہ بھی قائل ہوئے۔ انتہیٰ۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک سلیمان علیہ السلام کی موت کی کیفیت بیان فرماتا ہے کہ کس طرح ان کی موت کو جنوں سے پوشیدہ اور مبہم رکھا۔ کون سے جن جو محنت اور مشقت کے کاموں میں ان کے لیے مسخر کیے گئے تھے، کیوں کہ وہ اپنے عصا پر تکیہ لگائے ہوئے ٹھہرے رہے۔ ﴿مِنسَأَتَهُ﴾ سے مراد ان کا عصا ہے جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما مجاہد، حسن، قتادہ رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ نے کہا ہے کہ ایک مدت دراز سال بھر کے قریب اسی عصا پر ٹیک لگائے کھڑے رہے۔ پھر جب ﴿دَابَّةُ الْأَرْضِ﴾ اس عصا کو کھا چکا اور وہ ارضہ ہے، یعنی گھن کا کیڑا ہے، وہ ضعیف ہو گیا، زمین پر گر پڑا اور معلوم ہوا کہ وہ تو اس سے ایک مدت دراز پہلے مر چکے تھے۔ جنوں نے اور آدمیوں نے بھی یہ بات جان لی کہ جن علم غیب نہیں جانتے جس طرح کہ وہ وہم کرتے تھے اور لوگوں کو اس کا وہم ڈالتے تھے۔ یہ بات ایک مرفوع غریب حدیث میں وارد ہوئی ہے اور اس کی صحت میں نظر ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام جس وقت نماز پڑھتے تو اپنے سامنے ایک درخت اُگا ہوا دیکھتے تھے، پھر اس سے کہتے تیرا نام کیا ہے؟ تو وہ کہتا کہ فلاں۔ پھر کہتے تو کس شے کے واسطے ہے؟ پھر اگر وہ غرس کیا جاتا تھا تو غرس کیا جاتا اور اگر کسی دوا کے لیے ہوتا تو لکھ لیا جاتا

(اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: "فإن كانت تغرس غرست و إن كانت لدواء كتبت"۔ ظاہر یہ ہے کہ یوں ہو: "فإن كانت لغرس غرست و إن كانت لدواء انبتت" یعنی اگر وہ لگانے کا ہوتا تو لگا دیتے اور اگر دوا کا ہوتا تو اُگایا جاتا۔ والله أعلم۔ اس معنی سے بھی اطمینانِ قلبی حاصل نہیں ہوتا۔ مصحح سلمه ربه)۔ چنانچہ ایک دن آپ علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے کہ اس اثنا میں آپ نے ایک درخت اپنے آگے دیکھا تو اس سے کہا: تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: "خروب"۔ کہا تو کس شے کے واسطے ہے؟ وہ بولا: اس گھر کے اجاڑنے کے لیے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا: اے اللہ! تو جنوں پر میری موت کو مبہم کر دے، یہاں تک کہ انسانوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ جن غیب کو نہیں جانتے ہیں۔

پھر اس درخت کا عصا تراشا، پھر اس پر تکیہ لگایا، سال بھر تک مردہ ہو کر بھی اسی عصا پر تکیہ لگائے رہے اور جن کام کرتے رہے۔ پھر اس عصا کو گھن نے کھا لیا تو آدمیوں نے یہ بات معلوم کر لی کہ اگر جن غیب کو جانتے ہوتے تو سال بھر ذلت کی تکلیف میں مبتلا نہ رہتے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کو اسی طرح پڑھتے تھے: "مَا لَبِثُوا حَوْلًا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ" کہا: پھر جنوں نے گھن کے کیڑے کا شکر ادا کیا تو اس کو پانی لا دیا کرتے تھے۔[1] (وهكذا رواه ابن أبي حاتم من حديث إبراهيم (الراوي عن عطاء عن سعيد بن جبير عن ابن عباس) بن طهمان به، وفي رفعه غرابة ونكارة، والأقرب أن يكون موقوفا وعطاء بن مسلم الخراساني (عطاء بن أبي مسلم مولى المهلب بن أبي صفرة أبو أيوب الخراساني نزيل الشام أحد الأعلام عن أبي الدرداء وغيره مرسلًا وكان يحيي الليل، وثقه ابن معين وأبو حاتم مات ١٣٥ بعمر ٨٥ سال. قول ميسور) له غرابات وفي بعض حديثه نكارة)

سلیمان علیہ السلام بیت المقدس میں تحنث کیا کرتے تھے، یعنی چلہ کشی کرتے تھے، سال اور دو سال کے لیے اور ماہ دو ماہ کے لیے اور اس سے کم اور زیادہ عرصہ کے لیے۔ چنانچہ وہ اس میں داخل ہوتے اور اُن کے ساتھ ان کا کھانا پینا ہوتا تھا، چنانچہ انھوں نے اس کو داخل کیا اس باری میں جس میں اُن کو وفات دی گئی، چنانچہ اس کی ابتدائیہ تھی کہ کوئی ایسا دن نہیں ہوتا تھا جس میں وہ صبح کریں، مگر اللہ تعالیٰ بیت المقدس میں ایک درخت اُگا دیتا تھا تو وہ اس کے پاس آتے اور اس سے پوچھتے: تیرا نام کیا ہے؟ وہ درخت کہتا: میرا فلاں فلاں نام ہے، پھر اگر وہ نصب کرنے والا ہوتا تو اسے نصب کر دیتے اور اگر وہ کسی دوا کی روئیدگی ہوتا تو کہتا کہ فلاں فلاں دوا کی روئیدگی ہے، پھر وہ اس کو اسی طرح کرتے، یہاں تک کہ ایک درخت اُگا جس کو خروبہ کہتے ہیں، اس سے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ کہا: میں خروبہ ہوں۔ پھر اس سے پوچھا کہ تو کس شے کی روئیدگی ہے؟ وہ بولا اس مسجد کے اُجڑنے کے لیے ایک روئیدگی ہے۔

سلیمان علیہ السلام نے کہا: اللہ ایسا نہیں ہے کہ اسے خراب کرے اس حالت میں کہ میں موجود رہوں۔ تو ہی وہ ہے

[1] تفسير الطبري (٣٧٢/٢٠) اس کی سند میں "عطاء بن سائب" متکلم فیہ راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٥٣)

کہ تیرے منہ پر میری ہلاکت اور بیت المقدس کی بربادی ہے۔ پھر اس کو اُکھاڑا اور اپنے کسی باغ میں لگا دیا۔ پھر محراب میں داخل ہوئے تو کھڑے ہوئے اور اپنے عصا پر ٹیک لگا کر نماز پڑھنے لگے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ شیاطین کو اس کا علم نہ ہوا اور وہ اُن کے لیے بیت المقدس میں کام کرتے رہے، وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ وہ ان پر برآمد ہو جائیں اور اُن کو عذاب کریں اور شیاطین محراب کے گرد جمع ہوتے تھے۔ محراب کا ایک طاق تھا ان کے آگے اور پیچھے، چنانچہ وہ شیطان جو طاعت سے نکلنے کا ارادہ کرتا تو کہتا: کیا میں اتنا قوی نہیں ہوں کہ محراب میں داخل ہو کر اس جانب سے نکل جاؤں۔ چنانچہ وہ داخل ہوتا، یہاں تک کہ دوسری جانب سے نکل جاتا، پھر ان میں سے ایک شیطان داخل ہوا اور گزر گیا۔ کوئی شیطان اگر سلیمان علیہ السلام کی طرف نظر کرتا محراب میں تو وہ جل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ شیطان گزر گیا اور اس نے ان کی آواز نہیں سنی، پھر لوٹا تو نہ سنی، پھر لوٹا تو گھر میں گر پڑا اور جلا نہیں اور سلیمان علیہ السلام کی طرف نظر کی تو وہ مر کر گر پڑے تھے۔

پھر وہ نکلا تو اس نے جا کر لوگوں کو یہ خبر دی کہ سلیمان علیہ السلام تو مر چکے۔ چنانچہ لوگوں نے ان پر سے دروازہ کھولا اور ان کو نکالا اور ان کی ''منسأۃ'' (عصا) کو پایا کہ گھن کے کیڑے نے اس کو کھا لیا تھا۔ حبشی زبان میں عصا کو ''منسأۃ'' بولتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ کب سے مرے ہیں تو اس کیڑے کو عصا پر رکھا تو اس نے ایک دن اور رات میں اس سے کھایا، پھر اس طریق پر حساب کیا تو یہ معلوم کیا کہ وہ سال بھر سے مرے ہوئے ہیں۔ یہ کلمہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: ''فَمَكَثُوا يَدِينُونَ لَهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ حَوْلًا كَامِلًا''۔ یعنی پھر وہ رہے کہ ان کی فرمانبرداری کرتے تھے ان کے مرنے کے پورے ایک سال بعد تک۔ چنانچہ اس وقت لوگوں نے یہ یقین کر لیا کہ جن ان سے جھوٹ کہتے تھے اور اگر انھیں غیب کا علم ہوتا تو سلیمان علیہ السلام کی موت کو جان لیتے اور سال بھر تک عذاب میں مبتلا نہ رہتے کہ ان کے لیے کام کرتے۔ وہ اللہ عزوجل کا یہ قول ہے: ﴿مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ﴾ فرماتا ہے کہ لوگوں پر اُن کا حال کھل گیا کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔

پھر شیاطین نے گھن کے کیڑے سے کہا: اگر تو کھانا کھاتا ہوتا تو ہم تیرے پاس اچھے سے اچھا کھانا لاتے اور اگر تو پیتا ہوتا تو ہم تجھے اچھی سے اچھی پینے والی شے پلاتے، لیکن ہم تیری طرف پانی اور مٹی اٹھا لائیں گے، چنانچہ وہ اس کو اس کی طرف اٹھا لاتے ہیں جہاں کہیں وہ ہے۔ کہا: کیا تو نے اس مٹی کی طرف نہیں دیکھا جو لکڑی کے اندر ہوتی ہے، چنانچہ یہ وہی ہے جس کو شیاطین لاتے ہیں اس کیڑے کا شکر ادا کرنے کے لیے۔[1] (قاله السدي في حديث ذكره عن أبي مالك عن أبي صالح عن ابن عباس رضي الله عنهما و عن مرة الهمداني عن ابن مسعود رضي الله عنه و عن ناس من أصحاب رسول الله ﷺ وهذا الأثر، والله أعلم، إنما هو مما تلقى من علماء أهل الكتاب وهي وقف لا يصدق منه إلا ما وافق الحق ولا يكذب منها إلا ما خالف الحق والباقي لا يصدق ولا يكذب)

[1] تفسير الطبري (٢٠/٣٧٢۔ ٣٧٣)

امام ابن وہب اور اصبغ بن الفرج نے عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا کہ جس وقت تجھے میری روح کے قبض کرنے کا حکم دیا جائے تو تو مجھے خبر کر دینا، پھر وہ ان کے پاس آئے اور کہا: اے سلیمان! تحقیق مجھے تیرے لیے امر کیا گیا ہے۔ تیرے لیے تو ایک سویعہ، یعنی ایک ذرا سی ساعت باقی رہ گئی ہے۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے شیاطین کو بلایا تو انھوں نے ان پر ایک شیشے کا محل بنا دیا اور اس کا کوئی دروازہ نہیں تھا، پھر وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے اور اپنے عصا پر ٹیک لگا لیا، پھر ملک الموت ان پر داخل ہوئے اور ان کی روح اس حال میں قبض کر لی کہ وہ اپنے عصا پر ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ یہ کام انھوں نے کچھ ملک الموت سے بھاگنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ کہا کہ جن ان کے سامنے کام کرتے تھے اور اُن کی طرف دیکھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ وہ زندہ ہیں۔

کہا: پھر اللہ عزوجل نے ﴿ دَآبَّةُ الْاَرْضِ ﴾ کو بھیجا اور وہ دابہ لکڑیوں کو کھاتا ہے، اس کو قادح کہتے ہیں۔ کہا: پھر وہ عصا میں گھس گیا اور اس کو کھاتا رہا، یہاں تک کہ جب عصا کے جوف کو کھا چکا، یعنی وہ اس کو اندر سے کھا چکا تو وہ کمزور ہو گیا اور سلیمان علیہ السلام کا اس پر بوجھ پڑا تو وہ مرے ہوئے گر پڑے۔ پھر جب جنوں نے یہ دیکھا تو متفرق ہو گئے اور چل دیے۔ کہا: چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ ﴾[1] اصبغ نے کہا ہے کہ غیر عبدالرحمان سے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ کیڑا سال بھر قائم رہا اور عصا کو کھاتا رہا، اس سے پہلے کہ سلیمان علیہ السلام گریں۔ کئی ایک اہلِ علم نے سلف سے اس کے مثل ذکر کیا ہے۔[2] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ "حَكَمْنَا عَلٰى سُلَيْمَانَ بِهِ وَأَلْزَمْنَاهُ إِيَّاهُ" یعنی جب ہم نے سلیمان علیہ السلام پر موت کا حکم کیا اور اس کو اس پر لازم کیا۔ ﴿ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ ﴾ تو آگاہ نہ کیا جنوں کو اس کی موت پر مگر ﴿ دَآبَّةُ الْاَرْضِ ﴾ نے، یعنی یہاں تک کہ ارضہ نے ان کے عصا کو کھا لیا تو وہ مرے ہوئے گر پڑے۔ ﴿ دَآبَّةُ الْاَرْضِ ﴾ ایک ذرا سا کیڑا ہے، جس کو سرفہ کہتے ہیں۔ کسی نے ﴿ دَآبَّةُ الْاَرْضِ ﴾ میں ﴿ الْاَرْضِ ﴾ کو بہ فتحِ راء پڑھا ہے۔ "أَرَض" کہتے ہیں "أَكَل" کو جب کہ لکڑی کھانے والا کیڑا لکڑی کو کھالے تو محاورۂ عرب میں یوں بولتے ہیں کہ "أَرَضَتِ الْخَشَبَةَ أَرْضًا" غرض یہ ہے کہ کیڑے کے کھانے کو "أَرَض" کہتے ہیں۔

﴿ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ کیڑا ان کے عصا کو کھاتا رہا جس پر وہ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ "مِنْسَأَة" حبشی زبان میں عصا کے معنی میں ہے۔ یا عربی لفظ ہے اور "نَسَأْتُ الْغَنَمَ" سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت بولتے ہیں کہ تو بکریوں کو ہنکا لے۔ پس منساۃ ہنکا لینے کا آلہ ہوا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "مِنْسَأَة" وہ ہے جس

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٣٧٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/٦٩٣۔ ٦٩٤)

کے ساتھ ہنکایا جاتا ہے۔[1] جمہور نے بہ ہمزۂ مفتوحہ پڑھا ہے اور ابن ذکوان نے بہ ہمزۂ ساکنہ پڑھا ہے اور امام نافع اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے بالفِ محضہ پڑھا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: بعض عرب اس کے ہمزے سے الف کو بدلتے ہیں اور اس کی سند میں یہ شعر پڑھا ہے:

وَإِذَا دَبَبْتَ عَلَى الْمِنْسَأَةِ مِنْ كِبَرٍ　　　فَقَدْ تَبَاعَدَ عَنْكَ اللَّهْوُ وَالْغَزَلُ

یعنی جس وقت تو بڑھاپے کے مارے لاٹھی پر ٹیک لگا کر چیونٹی کی چال چلا تو لہو ولعب کرنا اور عورتوں کی خوبیوں کو بیان کرنا تجھ سے دور ہو گیا۔

جمہور کی قراءت کا شاہد یہ شعر ہے:

ضَرَبْنَا بِمِنْسَأَةٍ وَجْهَهُ　　　فَصَارَ بِذَاكَ مَهِينًا ذَلِيلًا

یعنی ہم نے اس کے منہ کو لاٹھی سے مارا تو وہ اس سبب سے ذلیل وخوار ہو گیا۔

مِنْ أَجْلِ حَبْلٍ لَا أَبَاكَ ضَرَبْتَهُ　　　بِمِنْسَأَةٍ قَدْ جَرَّ حَبْلُكَ أَحْبُلًا

یعنی کیا ایک رسی کے واسطے تو نے اس کو لاٹھی سے مارا تیرا باپ نہ ہو! تیری رسی نے تو کئی رسیوں کو کھینچا۔

امام ابن ذکوان کی قراءت پر طرفہ کا قول دال ہے:

أَمُونٍ كَأَلْوَاحِ الْإِرَانِ نَسَأْتُهَا　　　عَلَى لَاحِبٍ كَأَنَّهُ ظَهْرُ بُرْجُدِ[2]

(امون وہ اونٹنی ہے جس کے اعضاء کی ہمواری کے سبب سے لغزش کا خوف نہ ہو۔ "ألواح" جمع "لوح" بہ معنی تختہ۔ "إران" بالکسر تابوت مردہ۔ "نساء" بمعنی طرد۔ "لاحب" راہ واضح وکشادہ۔ "کأنہ" کی ضمیر راجع ہے، "لاحب" کی طرف۔ "ظھر" بہ معنی پشت "برجد" بہ معنی خط دار سفت چادر، یعنی وہ ایسی اونٹنی ہے کہ اس کے اعضاء کی ہمواری کی وجہ سے اس کے چلنے میں ٹھوکر کھانے کا خوف نہیں ہے اور ہمواری اور سختی میں تابوت کے تختوں کی طرح ہے۔ ایسی اونٹنی کو میں نے ہنکایا اور جھڑکا واضح اور کشادہ راہ پر۔ کون سی راہ؟ جیسے خط دار چادر۔ کبھی راہ میں چلنے کی وجہ سے خط سے بنے ہوتے ہیں، اس لیے راہ کی تشبیہ ویسی چادر سے دی)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ پھر جب سلیمان علیہ السلام گر پڑے تو جنوں کو یہ بات ظاہر اور منکشف ہو گئی، یعنی انھوں نے یہ بات جان لی کہ اگر وہ غیب کو جانتے ہوتے تو عذابِ مہین میں نہ رہتے۔ یعنی وہ جو یہ زعم کرتے ہیں کہ وہ غیب کو جانتے ہیں اگر یہ بات ٹھیک ہوتی تو سلیمان علیہ السلام کی موت کو جان لیتے اور ایک مدت دراز عذابِ مہین میں ٹھہرے نہ رہتے۔ اس عذاب سے وہ کام مراد ہے جس کا سلیمان علیہ السلام نے ان کو حکم دیا تھا اور وہ ان کے مرے ہونے کی حالت میں ان کے مطیع ہو کر اسے کرتے تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا:

---

[1] معاني القرآن (٤/٢٤٧)　[2] تفسير القرطبي (١٤/٢٧٩، ٢٨٠)

عذابِ مہین عمل میں مشقت اور محنت ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے وقت میں لوگ کہتے تھے کہ جن غیب جانتے ہیں۔

پھر جب سلیمان علیہ السلام اپنے عصا پر سال بھر تک مردہ حالت میں کھڑے ہوئے ٹھہرے رہے اور جن محنت اور مشقت کا کام اسی طرح کرتے رہے جیسے ان کی نزدیکی میں کرتے تھے۔ ان کے مرنے کی ان کو خبر نہ ہوئی، یہاں تک کہ "أَرضَة" نے ان کے عصا کو کھا لیا اور وہ مردہ گر پڑے۔ تب جنوں کو اُن کے مرنے کا علم ہوا اور لوگوں نے یہ بات جان لی کہ جن غیب نہیں جانتے۔[1] غرضیکہ ﴿ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ ﴾ یا تو "تبیّنتِ الشّيءُ" سے ماخوذ ہے جب تو شے کو جان لے، یعنی جنوں نے یہ بات جان لی کہ ﴿ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا ﴾ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس سے ماخوذ نہ ہو اور "تبيّنَ الشّيءُ" بہ معنی "ظَهَرَ وَتَجلّٰی" سے ماخوذ ہو اور ﴿ اَنْ ﴾ اور جو کچھ اس کے تحت میں ہے وہ سب بدلِ اشتمال ہو مع تقدیر مضاف کے "أَيْ: ظَهَرَ أَمْرُ الجِنِّ لِلنَّاسِ أَنَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ... الآية" یعنی لوگوں کو جنوں کا حال ظاہر ہو گیا یہ کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو عذابِ مہین میں نہ رہتے۔ یا یہ معنی ہیں کہ "ظَهَرَ أَنَّ الجِنَّ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ... الآية"

جمہور نے ﴿ تَبَيَّنَتِ ﴾ کو بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مسند ہے طرف جن کے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور یعقوب نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ دونوں قراءتوں کے معنی ما تقدم سے معلوم ہوتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ سلیمان علیہ السلام فوت ہو جانے کے بعد اپنے عصا پر ایک سال ٹھہرے رہے۔ پھر جب سال ختم ہوا تو نئے سال کے شروع میں گر پڑے تو جنوں نے ان کے عصا کی طرح کا عصا لیا اور ان کے کیڑے کی طرح کا ایک کیڑا لے کر اس عصا پر چھوڑا تو اس کیڑے نے اس کو سال بھر میں کھایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے: "فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْإِنْسُ"

سفیان رحمہ اللہ نے کہا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں اس طرح ہے: "وَهُمْ يَدْأَبُوْنَ لَهُ حَوْلًا"۔[2]

امام دیلمی رحمہ اللہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے اپنے بندوں پر فضل و کرم کیا تین چیزوں کے ساتھ۔ میں نے دانے پر کیڑا ڈالا، اگر یہ نہ ہوتا تو البتہ بادشاہ اس کا خزانہ رکھتے جس طرح کہ سونے اور چاندی کا خزانہ رکھتے۔ میں نے جسم پر بدبو ڈالی، اگر یہ نہ ہوتا تو دوست اپنے دوست کو دفن نہ کرتا اور چھین لیا میں نے حزن کو اگر یہ نہ ہوتا تو البتہ نسل جاتی رہتی۔[3]

تاریخ والوں نے ذکر کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام تیرہ برس کی عمر میں بادشاہ ہوئے اور چالیس برس بادشاہ رہے، ان کی بادشاہت کے چار برس گزرنے کے بعد بیت المقدس کا بنانا شروع کیا اور ترپن برس کی عمر میں وفات پائی۔ کسی

[1] فتح القدير (٤/٤٢٠) [2] الدر المنثور (٦/٦٨٣) [3] الدر المنثور (٦/٦٨٤)

نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام نے موضع فسطاطِ (خیمہ) موسیٰ علیہ السلام میں بیت المقدس کی عمارت کی بنیاد رکھی، پھر اس کو مکمل کرنے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ سلیمان علیہ السلام کو اس کی وصیت کی تھی، چنانچہ انھوں نے شیاطین کو اس کے تمام کرنے کا حکم دیا، پھر جب ان کی عمر سے ایک سال باقی رہ گیا تو اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ ان کی موت کو شیاطین پر مبہم کر دے، یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائیں اور تاکہ غیب پر ان کا دعویٰ باطل ہو جائے۔

مروی ہے کہ افریدون آیا تاکہ ان کی کرسی پر چڑھے، پھر جب وہ قریب آیا تو دو شیروں نے اس کی پنڈلی کو مارا اور اس کو توڑ ڈالا، پھر اس کے بعد کسی نے جرأت نہ کی کہ اس کے قریب ہو۔ جب اللہ پاک نے بعض شاکرین کا ذکر کیا جو اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں تو اس کے بعد بعض جاحدین (منکرین) کا ذکر کیا جو اس کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اس قصے کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی قوم سے اس کا ذکر کریں۔ شاید وہ نصیحت پذیر ہوں اور ان کو اعتبار ہو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝۱۵ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ۝۱۶ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝۱۷

سبا (قوم) کے لیے ان کی بستی میں یقیناً ایک عظیم نشانی تھی، دائیں اور بائیں طرف دو باغ تھے، (ہم نے کہا:) تم اپنے رب کے رزق سے کھاؤ، اور اس کا شکر ادا کرو، (یہ) پاکیزہ شہر ہے اور رب بڑا بخشنے والا ہے (15) پھر انھوں نے (جب ہدایت سے) منہ موڑا تو ہم نے ان پر بند (ڈیم) کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دونوں باغوں کے بدلے میں ہم نے انھیں دو ایسے باغ دیے جو بدمزہ پھل، (بکثرت) جھاؤ اور کچھ بیریوں والے تھے (16) یہ ہم نے انھیں ان کی ناشکری کی سزا دی اور ہم ناشکروں ہی کو سزا دیتے ہیں (17)

قوم سبا کا کفرانِ نعمت اور اس کی سزا کا بیان:

بلقیس جو ملکۂ سبا تھی ملکِ یمن میں اپنے دیس کو خوب بسا گئی تھی۔ جھیلوں کا سب پانی سمیٹ کر ایک جگہ روکا،

[1] فتح البیان (۱۱/۱۷۴۔۱۷۶)

اوپر نیچے تین کھڑکیاں رکھیں، اونچی اور نیچی زمینوں کے لیے سارا برس بارش کا پانی موجود ہوتا، جتنا چاہتے خرچ کرتے، خوب سرسبز اور آباد ملک تھا۔ جب اللہ نے چاہا کہ عذاب بھیجے تو پانی کے بند میں گھونس پیدا ہوئی اس کی جڑ کرید ڈالی، ایک بار پانی نے زور کیا بند کو توڑ دیا، وہ پانی عذاب کا تھا۔ سرخ رنگ جس زمین پر پھر گیا وہ کام سے جاتی رہی، بعد میں وہ قوم ویران ہو کر جدا جدا ہوگئی اور کچھ جو رہ گئے ان کو باغوں کے بدلے بدمزہ میوے والے اور جھاؤ کے درخت اور کچھ بیری کے درخت ملے۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سَبَا یمن کے ملوک اور اس کے اہل تھے۔ تبابعہ بھی انہیں میں سے ہیں اور بلقیس صاحبۂ سلیمان علیہ السلام انہیں میں سے تھی۔ یہ لوگ اپنے شہروں میں بڑے ناز و نعمت اور عیش و آرام اور سرور و راحت میں تھے، رزق اور روزی کی فراخی تھی، کھیتیاں اور میوے بہت کچھ تھے، بہت اچھی طرح گزر ہوتی تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجے کہ ان کو اس بات کا حکم دیں کہ اللہ کے رزق سے کھائیں اور اس کی توحید اور عبادت کر کے اس کا شکر ادا کریں۔ چنانچہ وہ اسی طرح کے تھے، جب تک اللہ نے چاہا۔ پھر جس بات کا ان کو حکم ہوا تھا اس سے انھوں نے منہ موڑا تو ان کو اس طرح سے عذاب کیا گیا کہ ان پر سیل (سیلاب) بھیجا گیا اور وہ شہروں میں متفرق کر دیے گئے۔ چنانچہ اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آیندہ عن قریب آئے گی:

1 امام احمد رحمہ اللہ نے عبد الرحمٰن بن وعلہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، میں نے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سنا، وہ فرماتے تھے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سبا کا پوچھا کہ وہ کیا ہے، کوئی مرد ہے، یا کوئی عورت ہے، یا کوئی زمین ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ایک مرد ہے، اس کے دس لڑکے پیدا ہوئے، ان میں سے چھے تو یمن میں بسے اور چار شام میں سکونت پذیر ہوئے۔ چنانچہ یمن والے تو ''مذحج، کندہ، ازد، اشعری، انمار اور حمیر'' ہیں۔ رہے شام والے تو وہ ''لخم، جذام، عاملہ اور غسان'' ہیں۔[1] (ورواه عبد عن الحسن بن موسىٰ عن ابن لهيعة به، وهذا إسناد حسن ولم يخرجوه، وقد رواه الحافظ أبو عمر بن عبدالبر في كتاب القصد والأمم بمعرفة أصول أنساب العرب والعجم من حديث ابن لهيعة عن علقمة بن وعلة عن ابن عباس رضي الله عنهما فذكره نحوه وقد روى نحوه من وجه آخر)

2 نیز امام احمد اور عبد بن حمید رحمہما اللہ نے فروہ بن مسیک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں اپنی قوم کے مقبل کو لے کر ان کے مدبر سے لڑوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تو اُن سے مت لڑ، یہاں تک کہ تو اُن کو اسلام کی طرف دعوت دے۔ پھر میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے سبا کی خبر دیں، کیا وہ کوئی وادی ہے، یا کوئی پہاڑ ہے، یا وہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ وہ ایک مرد ہے عرب کا، اس کے دس لڑکے پیدا ہوئے، چھے تو یمن میں بسے اور چار شام میں۔ یمن میں جو بسے وہ

---

[1] مسند أحمد (٣١٦/١) مستدرك الحاكم (٤٥٩/٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

یہ تھے: ازد، اشعری، حمیر، کندہ، مذحج، انمار جن کو بجیلہ اور خثعم کہتے ہیں اور شام میں جو بسے وہ یہ ہیں: لخم، جذام، عاملہ اور غسان۔[1] (وهذا أيضا إسناد حسن وإنه كان فيه أبو جناب الكلبي وقد تكلموا فيه)

لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے باسنادِ دیگر اس کو یوں روایت کیا ہے کہ فروہ بن مسیک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، پھر حدیثِ مذکور کو ذکر کیا۔[2] اس حدیث کا ایک اور طریق ہے: امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے توبہ بن نمیر سے روایت کیا ہے، توبہ عبدالعزیز بن یحییٰ سے راوی ہیں کہ عبدالعزیز نے توبہ کو یہ خبر دی کہ ہم افریقہ میں عبیدہ بن عبدالرحمان کے پاس تھے، چنانچہ عبیدہ نے ایک دن کہا کہ میں کسی قوم کو کسی زمین میں گمان نہیں کرتا مگر حال یہ ہے کہ وہ اس کے اہل سے ہیں۔ اس پر علی بن رباح نے کہا کہ ہرگز نہیں، مجھے تو فلاں نے یہ حدیث کی ہے کہ فروہ بن مسیک غطیفی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک سبا ایک قوم ہے جن کے لیے جاہلیت میں ایک عزت تھی اور میں ڈرتا ہوں کہ وہ اسلام سے پھر جائیں، کیا میں ان سے لڑوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اب تک ان کے بارے میں کوئی امر نہیں کیا گیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ﴾

ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! سبا کیا ہے؟ پھر ویسی حدیث بیان کی جو اس سے قبل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سبا کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہے، کوئی شہر ہے، یا کوئی مرد ہے، یا کوئی عورت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ ایک مرد ہے، اس کے دس لڑکے پیدا ہوئے، ان میں سے چھے یمن میں بسے اور چار شام میں، یمن والے تو ''مذحج، کندہ، ازد، اشعری، انمار اور حمیر غير ما حلها'' ہیں (قولہ: ''غير ما حلها'' یہ الفاظ کسی نسخۂ قلمی میں دیکھنا چاہیے۔ مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔ اور شام والے لخم، جذام، غسان اور عاملہ ہیں۔[3] اس میں غرابت ہے اس لحاظ سے کہ اس آیت کے نزول کا ذکر مدینہ میں ہے، حالاں کہ ساری سورت مکی ہے۔ والله سبحانهٗ و تعالیٰ أعلم.

طریقِ دیگر:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے فروہ بن مسیک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے خبر دیں کہ سبا کیا ہے؟ کوئی زمین ہے، یا کوئی عورت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ کوئی زمین ہے نہ کوئی عورت، لیکن وہ ایک مرد ہے، اس کے دس لڑکے پیدا ہوئے، ان میں سے چھے تو یمن میں بسے اور چار شام میں۔ جو

---

[1] مسند أحمد (٣٩/٥٢٨، ٥٢٩۔ ط: الرسالة) اس کی سند میں ''ابو جناب کلبی'' متکلم فیہ راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٢٠/٣٧٥۔ ٣٧٦)

[3] تفسیر ابن کثیر (٣/٦٩٧، ٦٩٨) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

شام میں بسے وہ لخم، جذام، عاملہ اور غسان ہیں اور جو یمن میں بسے وہ کندہ، اشعری، ازد، مذحج، حمیر اور انمار ہیں۔ پھر ایک شخص نے عرض کی: انمار کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ہیں جن میں سے خثعم و بجیلہ ہیں۔ [1] (و رواه الترمذي في جامعه عن أبي كريب و عبد بن حميد، قال: حدثنا أبو أسامة فذكره أبسط من هذا ثم قال: هذا حديث حسن غريب)

ابوعمر بن عبدالبر نے تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، پھر آپ ﷺ سے سبا کا پوچھا، پھر حدیث مذکور کے مثل ذکر کیا۔ امام ابوعمر نے اس حدیث کو قوت دی ہے اور اس کی تحسین کی ہے۔

علمائے نسب نے، ان میں سے محمد بن اسحاق ہیں، کہا ہے کہ سبا کا نام عبدشمس بن یشجب بن یعرب بن قحطان ہے، یہ نام اس کا صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ پہلے پہل عرب میں سبی اسی نے کی ہے، یعنی لڑائی میں دشمن کے اہل و عیال کو قید کر لینا۔ اس کو رایش کہتے تھے، اس لیے کہ اسی نے پہلے غزوے میں غنیمت کی، پھر اپنی قوم کو دی، اس لیے اس کا نام رایش رکھا گیا۔ عرب لوگ مال کو ریش و ریاش کہتے ہیں۔ ذکر کیا ہے کہ سبا نے اپنے زمانۂ متقدم میں رسول اللہ ﷺ کی بشارت دی ہے اور اس بارے میں شعر کہے ہیں:

سَیَمْلِكُ بَعْدَنَا مُلْكًا عَظِیْمًا ... نَبِيٌّ لَا یُرَخِّصُ فِيْ الْحَرَامِ
وَیَمْلِكُ بَعْدَهٗ مِنْهُمْ مُلُوْكٌ ... یَدِیْنُوْهُ الْعِبَادَ بِغَیْرِ ذَامِ
وَیَمْلِكُ بَعْدَهُمْ مِنَّا مُلُوْكٌ ... یَصِیْرُ الْمُلْكُ فِیْنَا بِاقْتِسَامِ
وَیَمْلِكُ بَعْدَ قَحْطَانَ نَبِيٌّ ... تَقِيٌّ مُخْبِتٌ خَیْرُ الْأَنَامِ
یُسَمّٰی ﷺ أَحْمَدَ یَالَیْتَ أَنِّيْ ... أُعَمَّرُ بَعْدَ مَبْعَثِهٖ بِعَامِ
فَأَعْضُدُهٗ وَأَحْبُوْهُ بِنَصْرِيْ ... بِكُلِّ مُدَجَّجٍ وَبِكُلِّ رَامِ
مَتٰی یَظْهَرْ فَكُوْنُوْا نَاصِرِیْهِ ... وَمَنْ یَّلْقَاهُ یُبْلِغْهُ سَلَامِيْ

(یَدِیْنُوْهُ: "دانه أطاعه وانقاد له" والقیاد: بالکسر رسن کہ بدان ستور راکشند"۔ "تقی": پرہیز گار۔ "مخبت" متواضع"۔ مدجج بصیغۂ اسم فاعل مرد سلاح بند و "رامي" تیر انداز) ہمدانی رحمہ اللہ نے کتاب الاکلیل میں اس کا ذکر کیا ہے۔ قحطان میں تین قول پر اختلاف کیا ہے: ایک قول یہ ہے کہ وہ سلالہ ارم بن سام بن نوح سے ہے۔ ارم کے ساتھ اس کے نسب کے متصل ہونے کی کیفیت میں تین طریق پر اختلاف کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ سلالۂ عابر سے ہے۔ عابر ہود علیہ السلام ہیں، اس نسب کے اتصال کی کیفیت میں بھی تین طریق پر اختلاف کیا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ سلالۂ اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام سے ہے، اس نسب کی کیفیتِ اتصال میں بھی تین طریق پر اختلاف کیا ہے۔ امام حافظ ابوعمر بن عبدالبر نمری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الإنباه علی ذکر أصول القبائل الرواه" میں پوری طرح پر اس کا ذکر کیا ہے۔ [2]

---

[1] تفسير الطبري (٣٧٥/٢٠)، سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٢٢). [2] تفسير ابن كثير (٦٩٦/٣، ٦٩٧)

نبی اکرم ﷺ نے جو فرمایا ہے کہ « کَانَ رَجُلًا مِنَ الْعَرَبِ »۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ عربِ عاربہ سے تھا جو خلیل جلیل علیہ السلام سے قبل تھے۔ سلالہ سام بن نوح علیہ السلام سے اور تیسرے قول کی بنا پر وہ سلالہ خلیل علیہ السلام سے تھے۔ یہ قول ان کے نزدیک مشہور نہیں ہے۔ واللہ أعلم۔ لیکن صحیح بخاری میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ قبیلہ اسلم کے ایک گروہ پر سے گزرے، وہ لوگ تیر اندازی کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیر پھینکو اے اولادِ اسماعیل! بے شک تمھارا باپ تیر انداز تھا۔[1] چنانچہ اسلم انصار کا ایک قبیلہ ہے اور انصار کے دونوں قبیلے اوس وخزرج غسان عرب یمن کے ہیں، وہ سبا سے یثرب میں اترے، جبکہ سبا شہروں میں متفرق ہوئے جس وقت اللہ عزوجل نے ان پر سیلِ عرم بھیجی اور ان میں سے ایک گروہ شام میں اترا۔ غسان ان کو صرف اس لیے کہا گیا کہ وہ ایک پانی پر اترے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ یمن میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مشلل کے قریب ہے، جیسا کہ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

أَمَّا سَأَلْتَ فَإِنَّا مَعْشَرٌ نُجُبٌ   الْأَزْدُ نِسْبَتُنَا وَالْمَاءُ غَسَّانُ

یعنی تو نے جو پوچھا ہے تو بے شک ہم ایک شریف نجیب گروہ ہیں، ازد تو ہمارا نسب ہے اور پانی غسان ہے۔

اور یہ جو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس کے دس لڑکے عرب میں پیدا ہوئے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی نسل سے یہ دس تھے جن کی طرف عربِ یمن کے اصولِ قبائل رجوع ہوتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کی صلب سے پیدا ہوئے ہیں، بلکہ ان میں سے وہ ہے جس کے اور اس کے درمیان دو باپ ہیں اور تین اور کم و زیادہ۔ چنانچہ نسب کی کتابوں میں یہ بات اپنی جگہ مقرر و مبین ہے اور یہ جو آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ان میں سے چھے یمن میں بسے اور چار شام میں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر سیلِ عرم بھیجی، اس کے بعد ان میں سے وہ لوگ ہیں جو اپنے بلاد میں مقیم رہے اور بعض ان میں سے دوسرے شہروں کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

وادیِ مآرب میں شدید سیلاب:

"سد" یعنی بند کا قصہ یہ ہے کہ دو پہاڑوں سے ان کو پانی آتا تھا اور بارش اور وادیوں کی سیلیں (پانی کا بہاؤ) بھی اس کی طرف جمع ہوتی تھیں، چنانچہ ان کے قدیم بادشاہوں نے ارادہ کیا اور دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک عظیم اور مضبوط بند بنایا، یہاں تک کہ پانی بلند ہو گیا، پھر ان دونوں پہاڑوں پر درخت لگوائے اور میوؤں کی پیدوار حاصل کی، یہ درخت اور میوے انتہائی خوبصورت اور کثیر تعداد میں تھے، جیسا کہ سلف کے بہت لوگوں نے ذکر کیا ہے، ان میں سے قتادہ رحمہ اللہ ہیں، کہ عورت درختوں کے نیچے چلتی تھی اور اس کے سر پر مکتل یا زنبیل ہوتی، یہ وہ برتن ہے جس میں میوے توڑ کر ڈالے جاتے ہیں، تو درختوں سے اس میں اتنے میوے گر پڑتے کہ اس کو بغیر کسی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۷۴۳)

تکلیف کے بھر دیتے۔ پھل زیادہ اور پکے ہوئے ہونے کی وجہ سے بغیر توڑے ہوئے خود بہ خود گرتے اور بے تکلف زنبیل پُر ہو جاتی۔ یہ بند مارب میں تھا، یہ اس کے اور صنعاء کے درمیان ایک شہر ہے تین منزل کے فاصلے پر اور سدِ مارب کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ دوسروں نے ذکر کیا ہے کہ ان کے شہر میں نہ مکھیاں نہ مچھر اور نہ ہی پسو تھے اور نہ حشرات الارض اور کیڑے مکوڑے تھے۔ یہ سب آب و ہوا کے اعتدال، مزاج کی صحت اور اللہ پاک کی عنایت سے تھا کہ اس کی توحید اور عبادت کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ﴾

پھر اپنے قول سے اس کی یہ تفسیر فرمائی: ﴿ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ﴾ یعنی دو باغ دو پہاڑوں کے دونوں کناروں سے اور ان کے درمیان شہر۔ ﴿ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴾ یعنی کھاؤ اپنے رب کی روزی سے اور اس کا حق مانو، پاکیزہ شہر اور بخشنے والا رب ہے، اگر تم توحید پر قائم رہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَعْرَضُوْا ﴾ یعنی پھر انھوں نے اللہ کی توحید اور عبادت سے منہ موڑا اور ان پر جو انعام کیا تھا، اس پر شکر کرنے سے منہ موڑا اور اللہ پاک کو چھوڑ کر سورج پوجنے کی طرف جھکے، جیسا کہ ہدہد نے سلیمان علیہ السلام سے آ کر کہا: ﴿ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿22﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿23﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ [النمل: ٢٢۔ ٢٤] ''میں سبا کی ایک سچی خبر تیرے پاس لایا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ان کی بادشاہت ایک عورت کر رہی ہے، جسے ہر قسم کی چیز سے کچھ نہ کچھ دیا گیا ہے اور اس کا تخت بھی بڑی عظمت والا ہے۔ میں نے اسے اور اس کی قوم کو، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہوئے پایا، شیطان نے ان کے کام انھیں بھلے کر کے دکھلا کر صحیح راہ سے روک دیا ہے، چنانچہ وہ ہدایت پر نہیں آتے۔'' امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف تیرہ نبی بھیجے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ عزوجل نے ان کی طرف بارہ ہزار نبی بھیجے۔ واللّٰه أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ عرم سے مراد میاہ ہیں، یعنی آب ہا، بہت سا پانی۔ کسی نے کہا ہے کہ وادی۔ کسی نے کہا ہے کہ جرذ، یعنی گھونس چوہا یا کیڑا۔ کسی نے کہا ہے کہ ماءِ غزیر، یعنی بہت زیادہ پانی، اس صورت میں اسم کی اضافت اپنی صفت کی طرف ہو گی، جیسے مسجد الجامع وسعید کرز (اس مثال کو بابِ اضافتِ موصوف الی صفتہ میں داخل کرنا غور کے قابل ہے، بلکہ یہ تو بابِ اضافتِ اسم الی مثلہ فی العموم والخصوص سے ہے)۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے۔ کئی ایک اہلِ علم نے ذکر کیا ہے جن میں سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام وہب بن منبہ، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ ہیں کہ جب اللہ عزوجل نے چاہا کہ ان پر عذاب بھیجے، یعنی سیلِ عرم تو اس

---

1 تفسير الطبري (٢٠/٣٧٨)

بند پر زمین کا ایک جانور بھیجا، جس کو جرذ کہتے ہیں، اس نے سوراخ کر دیا۔

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے تھے کہ اس بند کی خرابی کا سبب جرذ ہی ہے تو وہ ایک زمانۂ دراز سے بند کے پاس پلے تاک میں رکھا کرتے تھے، پھر جب تقدیر آئی تو چوہے بلوں پر غالب ہوئے اور بند کی طرف گھس گئے، پھر اس کو جگہ جگہ سے سوراخ دار کر دیا، چنانچہ وہ بند اُن پر گر پڑا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ جُرذ خُلد ہے (چمگاڈر)۔ اس نے بند کے نیچے کی جانب سوراخ کر دیا، یعنی جگہ جگہ سوراخ کر دیے، یہاں تک کہ جب وہ بند کمزور پڑ گئے اور سیلاب کے دن آئے تو پانی نے بند کی بنیاد کو توڑ دیا تو وہ گر پڑا، پھر پانی وادی کے نیچے سے بہہ نکلا اور اس کے سامنے جو درخت اور مکانات تھے ان کو خراب کر دیا اور جو درخت دونوں پہاڑوں میں دائیں بائیں اُگے تھے، ان سے پانی خشک ہو گیا تو وہ بھی خشک ہو گئے اور ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ گئے۔ اور وہ میوہ دار اور خوش نما ترو تازہ درخت متبدل ہو گئے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ﴾۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ، عطاء خراسانی، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: "هُوَ الْأَرَاكُ وَأُكُلَةُ الْبَرْبَرِ" (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن صراح میں کہا ہے: "بریرہ: میوۂ درخت اراک" واللہ أعلم)۔ ﴿وَّاَثْلٍ﴾ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ طرفاء ہے[1] یعنی جھاؤ۔ کسی اور نے کہا ہے کہ وہ جھاؤ کے مشابہ ایک درخت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سمر ہے، یعنی ببول۔ واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ﴾ یہ درخت جو بدلے میں ملے، چوں کہ ان میں سے بہتر بیر کا درخت تھا، اس لیے یوں فرمایا: ﴿وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ﴾، چنانچہ وہ دو باغ جن کے میوے پکے ہوئے، دیکھنے میں خوش نما، گھنا سایہ، نہریں بہتی ہوئی ان کی یہ گت ہوئی کہ ان کے بدلے میں یہ دو باغ ملے جن کے درخت جھاؤ اور پیلو اور کچھ بیر جن کے کانٹے زیادہ اور پھل تھوڑا، یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ کا کفر کیا، اس کے ساتھ شرک کیا، حق کو جھٹلایا، اس سے پھر کر باطل کی طرف گئے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یہ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ﴾ یعنی ہم نے ان کو عذاب کیا ان کے کفر کے سبب سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عقاب نہیں کیا جاتا مگر کفور کو۔[2] امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا: مناقشہ نہیں کیا جاتا ہے مگر کفور۔[3] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو خیرہ سے روایت کیا، یہ شخص سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب سے ہے، کہ معصیت کی جزاء عبادت میں سستی اور معیشت میں تنگی اور

---

① تفسیر الطبري (۲۰/۳۸۲۔۳۸۴) تفسیر ابن کثیر (۳/۶۹۸) ② تفسیر الطبري (۲۰/۳۸۵)

③ تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۱٦۷)

لذت میں تعسر ہے۔ کسی نے پوچھا کہ لذت میں تعسر کیا ہے؟ تو کہا کہ کسی حال میں بھی لذت نہیں پاتا، مگر اس کے پاس وہ شخص آتا ہے جو اس لذت کو اس پر منغّص کر دیتا ہے، یعنی دھندلا اور مکدر کر دیتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع وضاحت کے یہ ہے کہ سبا سے مراد وہ قبیلہ ہے جو سبا کی اولاد سے ہے، اس کا نسب یہ ہے: سبا بن یشجب (بہ ضمِ جیم) بن یعرب بن قحطان بن ہود علیہ السلام۔ جمہور نے "لِسبإٍ" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اسم ہے حی (قبیلہ) کا، یعنی وہ حی جو سبا کی اولاد سے ہے۔ امام ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے "لِسبأَ" پڑھا ہے۔ بہ منع صرف بتاویلِ قبیلہ۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس قراءت کو پسند کیا ہے۔ شعرائے عرب کے اشعار میں کلمۂ "سبا" منصرف وغیر منصرف دونوں طرح آیا ہے۔ قُنبُل، ابو حیوہ اور جحدری رحمہم اللہ نے "لِسبأْ" بہ سکونِ ہمزہ اور کسی نے ہمزہ کو الف سے قلب کر کے "لِسبَا" پڑھا ہے۔ پہلی قراءت کو تقویت دینے والا اللہ تعالیٰ کا قول ﴿ فِيْ مَسْكَنِهِمْ ﴾ ہے، کیوں کہ اگر سبا تاویلِ قبیلہ کی بنا پر ہوتا تو "مَسکَنِها" فرمایا جاتا۔ جمہور نے "مَسَاكِنِهِمْ" بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے۔ امام ابو عبیدہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔

اختیار کی وجہ یہ ہے کہ ان کے منازل و مکانات بہت سے تھے، اس لیے جمع کا لفظ اس کے لیے مناسب ہے۔ امام حمزہ اور حفص رحمہما اللہ نے بہ صیغۂ واحد فتحِ کاف کے ساتھ پڑھا ہے اور امام کسائی رحمہ اللہ نے بہ صیغۂ واحد مع کسرِ کاف پڑھا ہے اور اسی طرح امام یحییٰ بن وثاب اور اعمش رحمہما اللہ نے بہ صیغۂ واحد کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مسکن مصدر میمی ہے، قلیل و کثیر کو شامل ہے۔ یا اسمِ مکان ہے اور اس سے مراد جمع ہے۔[2] یہ جو اُن کے مکانات تھے، اب ان کو مآرب کہتے ہیں۔ اس کے اور صنعا کے درمیان تین رات کی مسافت ہے یہ شہر سب شہروں سے بڑھ کر ترو تازہ اور ارزانی والا تھا۔ ﴿ اٰيَةٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ قومِ سبا کو ان کی بستی میں اس کی اگلی حالت میں ملاحظہ کر کے ایک نشانی ہے جو اللہ پاک کی کمال قدرت اور کاری گری پر دلالت کرتی ہے۔ وہ حالت یہ ہے کہ تُرو تازہ اور خوش نما تھی، ہر طرح کی ارزانی تھی، میوے کثرت سے تھے، بعد کی حالت یہ ہوئی کہ بالکل بدل گئی، نہ پھل رہے نہ خوش نمائی۔

پھر اللہ پاک نے خود اس آیت کا بیان فرمایا: ﴿ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ﴾۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ جَنَّتٰنِ ﴾ کا رفع بنا بر بدل ہے ﴿ اٰيَةٌ ﴾ سے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿ جَنَّتٰنِ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ﴾ اس کی خبر ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، لیکن اس میں اتنی بات ہے کہ بغیر مسوغ کے نکرہ کے ساتھ ابتداء کرنا جائز نہیں ہے۔ امام ابن ابی عبلہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/٦٩٥-٦٩٨)
[2] تفسیر القرطبي (١٤/٢٨٣)

نے ''جَنَّتَیْنِ'' بہ نصب پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿كَانَ﴾ کی خبر ہے اور ﴿اٰيَةٌ﴾ اس کا اسم ہے۔[1] بالجملہ ﴿جَنَّتٰنِ﴾ سے مراد دو جماعتیں ہیں، یعنی یہ باغ ان کی وادی کے دائیں بائیں جانب تھے، انھوں نے اس کو دونوں طرف سے گھیر لیا تھا اور ان کے مکانات وادی میں تھے۔

مطلب یہ ہے کہ باغوں کا ایک ٹکڑا دائیں طرف تھا اور ایک بائیں طرف۔ ان میں سے ہر ٹکڑا باہم ایک دوسرے کے قریب ہونے اور گنجان ہونے میں ایک دوسرے کے ساتھ ملنے جلنے میں گویا ایک باغ تھا۔ کسی نے کہا کہ ﴿يَمِيْنٍ وَّشِمَالٍ﴾ سے مراد وہ شخص ہے جو اُن باغوں میں آتا تو باغوں کا ایک ٹکڑا اس کی داہنی طرف ہوتا اور ایک بائیں طرف۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے قشیری سے نقل کیا ہے کہ مراد دو باغ نہیں ہیں، بلکہ دو جہتیں دائیں اور بائیں مراد ہیں، ہر جہت میں بہت سے باغ اور درخت اور میوے ہیں کہ لوگوں کو اپنے سائے میں چھپا لیتے ہیں۔[2]

ان کے مسکن میں آیت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ دونوں باغ ایسی کثرت سے پھل دار ہیں کہ عورت خالی ٹوکرا سر پر رکھ کر ان کے درمیان میں چلتی تو وہ ٹوکرا انواع و اقسام کے پھلوں سے جو پک پک کر خود بہ خود گرتے تھے، ان سے بھر جاتا تھا، اس کو ہاتھ لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ سبا کے مساکن میں جو نشانی تھی وہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے گھروں میں نہ مچھر دیکھا، نہ مکھی، نہ پسو، نہ جوں، نہ بچھو، نہ سانپ، نہ ان کے سوا اور کیڑے مکوڑے۔ جس وقت ان کے پاس کوئی رکب آتا (قافلہ جس میں دس یا اس سے زیادہ شتر سوار ہوں) اور ان کے کپڑوں میں جوئیں ہوتیں تو ان کے گھروں کو دیکھتے ہی مر جاتیں۔[3] غرضیکہ جن کو ایسی اچھی آب و ہوا اور رہنے بسنے کی جگہ اور کھانے کے لیے میوے دیے گئے، ان سے یوں کہا گیا کہ ﴿كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ﴾۔ یہ حکم اجازت دینے اور رزق حلال کرنے کے لیے ہے۔ کسی نے کہا: وہاں کوئی امر نہ تھا، لیکن مراد ان کو ان نعمتوں سے نفع لینے پر قادر کر دینا ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے یہ بات فرشتوں نے کہی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے نبی کی زبان پر ان کو اس کا خطاب کیا گیا تھا۔ رزق سے مراد دونوں باغوں کے پھل ہیں، یعنی اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اُن نعمتوں پر جو اس نے تم کو عطا کی ہیں، اس کا شکر ادا کرو اور اس کے مطیع ہو کر عمل کرو اور اس کی نافرمانیوں سے بچو۔

جملہ ﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ﴾ مستانفہ ہے، اس سے مقصد وہ بات بیان کرنا ہے جو شکر کا موجب ہے۔ یعنی یہ شہر پاک ہے، اس کے درخت کثرت سے ہیں، اس کے میوے پکے ہوئے اور عمدہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ طیب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی زمین شور نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں کیڑے مکوڑے نہیں ہیں، یعنی اس کی آب و ہوا کے پاکیزہ ہونے کی وجہ سے اس میں موذی حشرات الارض نہیں ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شہر صنعاء

---

[1] فتح القدير (٤/٤٢٢) [2] تفسير القرطبي (١٤/٢٨٤) [3] تفسير الطبري (٢٠/٣٧٦، ٣٧٧)

ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ صنعاء سے تین فرسخ پر ہے۔ مصباح میں کہا ہے: "بلد وبلدة" کا اطلاق زمین کی ہر جگہ پر ہوتا ہے، وہ آباد ہو یا خالی ہو۔[2]

﴿ وَرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان پر انعام کرنے والا ایسا رب ہے کہ ان کے گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کے لیے یہ دونوں امر جمع کر دیے: ایک تو گناہوں کی بخشش، دوسرے شہر کی پاکیزگی اور عمدگی۔ جب کہ اس نے اپنی تمام مخلوق کے لیے یہ دو امر جمع نہیں کیے تو ان پر واجب ہے کہ اس خاص انعام کا شکر ادا کریں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تمھارا رب اگر تم نے اس کی دی ہوئی روزی میں شکر کیا تو وہ رب گناہوں کو بخشنے والا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ان کے لیے جو یہ دو باتیں جمع کیں، یعنی پاک شہر اور بخشش تو اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ رزق میں کبھی کچھ حرام ہوتا ہے۔ ورش نے "بلدةً" اور "ربًّا" بہ نصب پڑھا ہے بنا بر مدح یا بہ تقدیر: "أُسْكُنُوْا بَلْدَةً وَّاشْكُرُوْا رَبًّا"[4] یعنی رہو پاکیزہ شہر میں اور شکر کرو ربِ غفور کا۔

اللہ پاک نے وہ بات ذکر کی جو اس نعمتِ عظیم کے بعد ان سے صادر ہوئی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَاَعْرَضُوْا ﴾ یعنی چاہیے تو یوں تھا کہ اس عظیم الشان اور لمبی اور وسیع النطاق نعمت کا شکر ادا کرتے، اپنے منعم اللہ پاک کو پوجتے، مگر یوں تو نہ کیا، بلکہ شکر سے منہ موڑا، اللہ کے منکر ہوئے، اپنے نبیوں کی تکذیب کی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ سبا کی طرف تیرہ نبی بھیجے اور انھوں نے ان کو جھٹلایا۔ (امام سدی رحمہ اللہ کا یہ قول قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور سدی کا دوسرا قول حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، اس میں بارہ ہزار نبی ہیں، پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ ان میں سے زیادہ صحیح کون سا قول ہے)۔ اسی طرح امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے اور اس قدر زیادہ کیا ہے اور کہا کہ ہم اللہ کے واسطے اپنے اوپر کوئی نعمت پہچانتے نہیں ہیں، لہٰذا تم اپنے رب سے کہو کہ وہ اس نعمت کو ہم سے روک رکھے، اگر اسے طاقت ہو۔ چنانچہ ان کا اعراض یہ ہے۔

تفسیر قرطبی میں یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر سے اور اس کے رسولوں کی پیروی سے مسلمان ہو جانے کے بعد اعراض کیا۔ پھر امام سدی رحمہ اللہ کا قولِ مذکور ذکر کیا ہے۔ پھر امام قشیری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک سردار ملقب بہ حمار تھا، یہ لوگ زمانۂ فترت میں تھے، جو عیسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس حمار کا ایک لڑکا تھا، پھر وہ مر گیا تو حمار نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، پھر تھوکا اور کافر ہو گیا۔ چنانچہ یوں بولتے ہیں: "أَكْفَرُ مِنْ حِمَارٍ" یعنی یہ ایک مثال ہے کہ جب کسی کے کفر میں مبالغہ منظور ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں حمار سے بھی بڑھ کر کافر ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولِ عرب کا: "أَكْفَرُ مِنْ حِمَارٍ" یہ قومِ عاد سے ایک شخص تھا، اس کی اولاد مر گئی تھی، وہ کفرِ عظیم سے کافر ہوا تھا، چنانچہ جو کوئی اس کی زمین میں گزرتا تو اس کو کفر کی طرف بلاتا، پھر

[1] تفسیر القرطبي (٢٨٤/١٤) [2] المصباح المنير (٣٦/١) [3] تفسير البغوى (٣٩٣/٦) [4] فتح القدير (٤٢٣/٤)

اگر اس نے اس کا کہا مان لیا فبہا ورنہ اس کو مار ڈالتا تھا۔[1]

غرضیکہ کچھ بھی ہو، پھر جب ان سے اعراض واقع ہوا، یعنی شکرِ نعمت سے منہ پھیرا تو اللہ پاک نے ان پر سزا اور عذاب بھیجا جس کی وجہ سے جو انعام ان پر کیا تھا وہ چھین لیا جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ ﴾۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ سبا کی زمین میں یمن کی وادیوں سے پانی آیا کرتا تھا، چنانچہ انھوں نے دو پہاڑوں کے درمیان ایک بند بنایا اور پانی کو روکا اور اس بند میں اوپر نیچے تین دروازے بنائے تھے۔ وہ اوپر کے دروازے سے پانی دیتے تھے، پھر دوسرے سے، پھر تیسرے سے، اس طرح سے ان کو خوب ارزانی ہوئی۔ زمین ہر وقت سیراب رہتی، کھیتیاں اور درخت خوب تر و تازہ رہتے، پھل کثرت سے ہوتا، ان کے مال کی بہت کثرت ہوئی، اچھی طرح عیش و آرام سے اور بافراغت گزر ہوتی تھی۔ پھر جب انھوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تو اللہ پاک نے ان پر گھونسیں (چوہے کی طرح کا جانور) بھیجیں، انھوں نے اس بند میں شگاف ڈال دیے، یہاں تک کہ وہ ٹوٹ گیا تو پانی ان کے باغوں میں گھس گیا اور ان کو ڈبو دیا اور سیلاب نے ان کے گھروں کو دفن کر دیا۔ وہ سیلِ عرم یہی ہے۔

"عرم" جمع ہے "عرمة" کی۔ "عرمة" بند کو کہتے ہیں جو پانی کو روکتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عرم" اس بند کا نام ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان پر سدِ عرم کے سیلاب کو بھیجا۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عرم" وادی کا نام ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عرم" اس گھونس کا نام ہے، جس نے اس بند کو سوراخ دار کر دیا۔ یہ جرذ وہی ہے، جس کو خلد کہتے ہیں۔ چوں کہ سیلاب کے جاری ہونے کا سبب وہی ہے، اس لیے سیل کی نسبت اس کی طرف کی گئی۔ امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عرم" چوہوں کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ امام مجاہد اور ابن ابی نجیح رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "عرم" ایک سرخ پانی ہے جس کو اللہ پاک نے اس بند میں بھیجا تھا تو اس نے اس کو پھاڑ ڈالا اور گرا دیا۔ کسی نے کہا کہ "عرم" شدید بارش کا نام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سخت سیلاب کو کہتے ہیں۔ "عرامة" اصل میں شدت و شراست اور صعوبت کو کہتے ہیں، یعنی درشتی، سختی اور تندی۔ جب کوئی شخص تشدد، تصعب، درشتی، تندی اور بدخوئی کرتا ہے تو محاورے میں کہتے ہیں: "عَرَمَ فُلَانٌ"، امام ابن اعرابی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ "عرم" وہ سیلاب ہے جس کی طاقت نہیں رکھی جاتی، یعنی سخت تند اور درشت سیلاب۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عرم" دو چیزوں کے درمیان رکاوٹ ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دو قول مروی ہیں: ایک تو "عرم" بہ معنی شدید، دوسرا یہ کہ ایک وادی تھی یمن میں، جو مکے کی طرف بہتی تھی۔[3]

﴿ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ﴾ یعنی ہم نے ان کے دونوں باغوں کو ہلاک کیا جو بہت اچھے میووں اور

[1] تفسير القرطبي (١٤/٢٨٥) [2] تفسير القرطبي (١٤/٢٨٥، ٢٨٦) فتح القدير (٤/٤٢٣) [3] تفسير الطبري (٢٠/٣٨٠)

طرح طرح کی خوبصورت چیزوں پر مشتمل تھے اور ان کے بدلے ہم نے ان کو دو باغ دیے جن میں نہ کوئی خیر و خوبی تھی اور نہ ہی ان کی پیداوار میں ان کا کچھ فائدہ تھا، ان کا نام جو ﴿ جَنَّتَيْنِ ﴾ رکھا تو اس کا مقصد اُن سے مذاق کرنا تھا مشاکلت کے طور پر۔ (جمل میں بھی اسی طرح ہے، لیکن یہ عبارت اس کی مقتضی ہے کہ ﴿ جَنَّتَيْنِ ﴾ کہنے کی یہ ایک وجہ ہے، حالاں کہ حقیقت میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ تمسخر اور مذاق کے لیے کہا۔ دوسرے یہ ہے کہ بطور مشاکلت، یعنی مشابہت کے طور پر کہا۔ چنانچہ فتح القدیر میں اسی طرح ہے)۔[1]

پھر ان کی یہ صفت بیان فرمائی: ﴿ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ ﴾ یہ تثنیہ ہے ذوات مفرد کا بنا بر اصل کے، کیوں کہ ذوات کی اصل "ذوية" ہے، پس واؤ تو عین کلمہ ہے اور یا اس کا لام کلمہ ہے، کیوں کہ یہ کلمۂ "ذو" کا مونث ہے اور "ذو" کی اصل "ذوي" ہے۔ پس یاء متحرک ہوئی اور ما قبل اس کا مفتوح تو وہ الف سے بدلی گئی تو "ذوات" ہو گیا، پھر واؤ تخفیف کے لیے حذف کیا گیا تو ذات رہ گیا۔ اب اس کے تثنیہ میں دو وجہیں ہیں: کبھی تو نظر کرتے ہیں اس کے لفظ کی طرف جو اب ہے تو "ذاتان" کہتے ہیں اور کبھی حذفِ واؤ سے قبل اس کی طرف نظر کرتے ہیں تو "ذواتان" بولتے ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ذوات" کے تثنیہ میں دو لغت ہیں: ایک تو اصل کی طرف رد ہے، کیوں کہ اصل اس کی "ذوية" ہے۔ چنانچہ عین کلمہ واؤ ہے اور لام کلمہ یا ہے، اس لیے کہ وہ "ذو" کا مونث ہے۔ دوسرا لغت اس کا تثنیہ ہے لفظ پر تو "ذاتان" کہتے ہیں۔

جمہور نے بہ تنوینِ ﴿ أُكُلٍ ﴾ پڑھا ہے اور ﴿ خَمْطٍ ﴾ کی طرف اس کی اضافت نہیں کی ہے اور ابو عمرو نے اضافت کی ہے لیکن پہلا زیادہ صحیح ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ ﴿ خَمْطٍ ﴾ اراک کی ایک قسم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے۔[2] اور بہت سے مفسرین اسی کے قائل ہیں، یعنی ﴿ خَمْطٍ ﴾ پیلو کو کہتے ہیں۔ مختار میں کہا ہے کہ ﴿ خَمْطٍ ﴾ پیلو کی ایک قسم ہے اس کے پھل ہوتے ہیں اس کو کھاتے ہیں۔ اسی طرح جوہری نے کہا ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ خَمْطٍ ﴾ ہر کڑوا کانٹے والا درخت ہے۔ زجاج نے کہا ہر روئیدگی جس میں تلخی ہو اور اس کا کھانا ممکن نہ ہو وہ خمط ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ خَمْطٍ ﴾ ایک درخت کا پھل ہے جس کو "فَسْوَةُ الضَّبُعِ" کہتے ہیں۔ خشخاش کی صورت پر ہوتا ہے۔ "يُتَفَرَّكُ وَلَا يُنْتَفَعُ" یعنی اس کو کھرچتے ہیں اور اس سے کوئی فائدہ نہیں لیا جاتا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ﴿ خَمْطٍ ﴾ ہر وہ شے ہے جو اس کیفیت کی طرف تبدیل کی جائے جس کو جی نہ چاہے۔ اس معنی سے جس وقت دودھ بگڑ جاتا ہے تو بولتے ہیں: "خَمَطَ اللَّبَنُ"۔ جمل میں کہا ہے کہ ہر شے جو کڑوی اور ترش ہو اس کا نام ﴿ خَمْطٍ ﴾ ہے۔

جمہور کی قراءت، یعنی بغیر اضافت کے، زیادہ بہتر ہے ابو عمرو کی قراءت سے اور ﴿ خَمْطٍ ﴾ صفت ہوگی ﴿ أُكُلٍ ﴾ کی، یا اس سے بدل، کیوں کہ ﴿ أُكُلٍ ﴾ بعینہٖ وہ ﴿ خَمْطٍ ﴾ ہی ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اضافت

[1] فتح القدير (٤/٤٢٣) [2] تفسير الطبري (٢٠/٣٨٢)

کلامِ عرب میں احسن ہے، جیسے کہتے ہیں: ''ثُوبُ خَزٍّ وَدَارُ آجرٍ'' یعنی ریشم کا کپڑا اور اینٹوں کا گھر۔[1]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اضافت کی بنا پر ﴿خَمْطٍ﴾ صفت ہوگی ﴿اُكُلٍ﴾ کی اور کاف میں دو وجہ: سکون اور ضمہ۔ چنانچہ تین قراءتیں ہوئیں اور تینوں سبعیہ ہیں۔ فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿خَمْطٍ﴾ کی زیادہ عمدہ تفسیر اس معنی کے ساتھ ہے جو خلیل نے اور اس کے ساتھ والوں نے ذکر کیے ہیں، وہ تفسیر یہی تھی کہ ﴿خَمْطٍ﴾ پیلو ہے۔[2] (یہ اولویت فتح البیان میں صریحاً مذکور نہیں ہے۔ مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ) ﴿اَثْلٍ﴾ معطوف ہے ﴿اُكُلٍ﴾ پر، یعنی ''وَذَوَاتَيْ أَثْلٍ''۔ یہ ایک درخت ہے طرفاء کے مشابہ۔ امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے، مگر طول میں طرفاء سے بڑا ہوتا ہے اور اس کے پتے جھاؤ کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا منبر شریف اسی درخت سے بنایا گیا تھا، اس کا واحد ''أثلة'' اور جمع ''أثلات'' ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اثل خشب ہے، یعنی لکڑی۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شجر نظار ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ درخت ''أثل'' کا پھل نہیں ہوتا۔

﴿وَشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ﴾۔ ﴿سِدْرٍ﴾ ایک معروف درخت ہے، یعنی درختِ کنار۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سمر ہے، یعنی درخت طلح، جیسے: ببول وغیرہ خاردار درخت۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سدر درختوں میں سے دو سدر ہیں: ایک تو جنگلی، اس سے نفع نہیں لیا جاتا اور نہ وہ غسول (آبِ غسل) کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اس کا پھل تند مزہ ہوتا ہے، کھایا نہیں جاتا۔ یہ وہ ہے جس کو ضال کہتے ہیں، یعنی بیر جھاڑی۔ دوسرے وہ سدر ہیں جو پانی پر اُگتے ہیں، اس کا پھل نبق ہے، اس کے پتے غسول ہیں درختِ عناب کے مشابہ۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿سِدْرٍ﴾ کا وصف قلت کے ساتھ اس لیے کیا کہ اس میں سے ایک قسم ہے جس کا کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے، یہ وہی قسم ہے جس کا ذکر امام ازہری رحمہ اللہ نے کیا ہے اور اسی لیے اس کو باغوں میں لگاتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس اثنا میں کہ ان کے درخت بہترین درخت تھے کہ اللہ پاک نے ان کو بدترین درختوں سے بدل دیا ان کے اعمال کی وجہ سے، چنانچہ اس نے ان کے پھل دار درخت ہلاک کر دیے، یعنی برباد کر دیے اور ان کے بدلے میں پیلو اور طرفاء اور بیری کے درخت اُگائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ قلیل کا کلمہ ﴿خَمْطٍ﴾، ﴿اَثْلٍ﴾ اور ﴿سِدْرٍ﴾ سب کی طرف راجع ہو۔

﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا﴾ یعنی تبدیلی یا یہ جزا ہم نے ان کو ان کے کفرانِ نعمت کا بدلہ دیا۔ کفرانِ نعمت اس طرح سے تھا کہ انھوں نے اللہ کے شکر سے منہ موڑا۔ جمہور نے ''وَهَلْ يُجَازَىٰ إِلَّا الْكَفُوْرُ'' پڑھا ہے، بہ ضم تحتیہ و فتح زای معجمہ بہ صیغۂ مجہول۔ جب کہ امام حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص رحمہم اللہ نے بہ ضمِ نون و کسرِ زاء بہ صیغۂ معروف (نُجَازِيْ) پڑھا ہے، اس بنا پر کہ فاعل اللہ پاک ہے۔ پہلی قراءت کی بنا پر ''اَلْكَفُوْرُ'' مرفوع ہوگا اور دوسری قراءت

[1] تفسير القرطبي (١٤/٢٨٦، ٢٨٧) فتح القدير (٤/٤٢٣) [2] فتح القدير (٤/٤٢٣) فتح البيان (١١/١٨١)

کی بنا پر منصوب، یعنی بدلہ نہ دیا جائے گا یہ بدلہ، یعنی نعمت سلب کر کے اور اس پر سزا اور عذاب نازل ہو کر، مگر وہی شخص جو شدید الکفر ہے اور اس میں خوب مبالغہ کرنے والا ہے۔ یا ہم جزا نہ دیں گے مگر کفور کو۔

امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے دوسری قراءت کو اختیار کیا ہے،[1] کہا: اس لیے کہ اس سے پہلے ﴿ جَزَيْنٰهُمْ ﴾ ہے۔ ظاہر آیت یہ ہے کہ جزا نہ دیا جائے گا مگر کفور، مع اس کے کہ اہلِ معاصی جزا دیے جائیں گے۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ بدلہ نہ دیا جائے گا یہ بدلہ، یعنی اصطلام اور ہلاکت کا، مگر وہی جس نے کفر کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومن کی سیئات کا تو اس کی طرف سے کفارہ کیا جائے گا اور کافر کو ہر عمل کا جو اس نے کیا بدلہ دیا جائے گا۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مناقشہ ہے (حساب میں باریکی کرنا) حساب میں۔ رہا مومن تو اس سے مناقشہ نہیں کیا جائے گا۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: معنی یہ ہیں کہ کافر پوری پوری جزا دیا جائے گا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس جواب کو راجح کہا ہے۔[2]

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿18﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿19﴾

اور ہم نے ان (اہلِ سبا) کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھی تھی، کئی بستیاں باہم متصل (سرِ راہ آباد) رکھی تھیں اور ان میں ہم نے چلنے (آنے جانے) کی منزلیں مقرر کر دی تھیں، (ہم نے کہا:) تم ان میں راتوں اور دنوں کو امن سے سفر کرو (18) پھر انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمارے سفروں میں دوری پیدا کر دے اور انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، چناں چہ ہم نے انھیں افسانے بنا ڈالا اور انھیں مکمل طور پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، بلاشبہ اس میں ہر صابر و شاکر کے لیے عظیم نشانیاں ہیں (19)

سبا کی خوش حالی اور کفران کی وجہ سے اس کا خاتمہ:

برکت دے رکھی تھی، یعنی وہ برکت والی بستیاں تھیں، یعنی ملکِ شام۔ ان کے ملک سے شام تک کے راستے

[1] تفسير القرطبي (١٤/٢٨٧، ٢٨٨) فتح القدير (٤/٤٢٣، ٤٢٤) [2] تفسير القرطبي (١٤/٢٨٨) فتح البيان (١١/١٧٧-١٨٢)

میں امن و امان والی بستیاں تھیں، پاس پاس سفر تھا، جیسے سیر کرنا ہو۔ آرام میں مستی آئی اور تکلیف مانگنے لگے، جیسے اور ملکوں کی خبر سنتے ہیں کہ سفروں میں پانی نہیں ملتا، آبادی نہیں ملتی، ویسا ہم کو بھی ہو، یہ بڑی ناشکری ہوئی۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، یعنی متفرق ہو گئے، کوئی کسی ملک میں اور کوئی کسی ملک میں۔ انتھی۔

اللہ پاک اس نعمت و خوشحالی، عیش و آرام، فراخی اور پسندیدہ اور پر امن شہروں اور مکانات کا ذکر فرماتا ہے، جن میں وہ نہایت راحت اور آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے، گویا دن عید اور رات شب براءت تھی۔ بستیاں قریب، قریب ایک دوسری سے ملی جلی تھیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کے درخت، کھیتیاں اور پھل کثرت سے تھے، یہاں تک کہ ان کے مسافر کو کھانا پانی اور سفر کا سامان لادنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی، بلکہ جہاں کا ارادہ کیا بلا تکلف چل پڑا، جس جگہ اترا، وہاں پانی اور میوہ پایا۔ ایک گاؤں میں قیلولہ کرتا اور دوسرے گاؤں میں رات گزارتا، اتنا راستہ چلتا جتنا چلنے کی حاجت ہوتی۔ اسی لیے اللہ سبحانہٗ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾۔

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بستیاں صنعاء میں تھیں۔ ابو مالک نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام مجاہد، حسن اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ نے اور امام مالک نے، زید بن اسلم، قتادہ، ضحاک، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے: یعنی شام کی بستیاں۔ ان کی مراد یہ ہے کہ وہ لوگ یمن سے شام تک جاتے تھے اور راستے میں جو بستیاں نظر آتیں وہ ایک دوسرے سے متصل تھیں۔ امام عوفی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ ﴿ اَلْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾ بیت المقدس ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے ان سے دوسری روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ یہ بستیاں غربی بستیاں ہیں مدینہ اور شام کے درمیان۔[1]

﴿ قُرًى ظٰهِرَةً ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ بستیاں ظاہر اور واضح تھیں، مسافر لوگ ان کو جانتے پہچانتے تھے، ایک میں قیلولہ کرتے، دوسری میں رات بسر کرتے تھے۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ﴾ یعنی ہم نے ان بستیوں کو اس مسافت کے مطابق ٹھہرایا کہ جس کی طرف مسافر لوگ حاجت مند ہوتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان کو اپنے رات دن کے سفر میں امن حاصل تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ﴾ اور لوگوں نے "بَعِّدْ" باب تفعیل سے پڑھا ہے: "وَذٰلِكَ أَنَّهُمْ بَطَرُوْا هٰذِهِ النِّعْمَةَ"[2] (كما قاله ابن عباس و مجاهد والحسن و غير واحد)۔ یعنی یہ بات اس لیے کہی کہ وہ کثرت نعمت اور راحت کی وجہ سے اِترا گئے، اس کی قدر دانی نہ کی، بجائے شکر کے کفرانِ نعمت کیا، مستی سوجھی تو کہنے لگے: اے ہمارے رب! سفر میں دوری کر دے۔ ایسے جنگل اور بیابان کو پسند کیا جو دور ہوں اور جہاں ان کے ہاتھ نہ پہنچ سکیں، جن کے قطع کرنے میں کھانے پینے اور زادِ راہ اور سواری کی حاجت ہو اور گرم ہوا اور لو

[1] تفسير الطبري (٢٠/٣٨٦، ٣٨٧) تفسير ابن كثير (٣/٦٩٩) [2] تفسير الطبري (٢٠/٣٨٩)

اور خوفناک جگہوں میں چلنے کی ضرورت پڑے، جس طرح کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی: ﴿ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىِٕهَا وَ فُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ﴾ [البقرة: ٦١] ''وہ (اللہ) ہمیں زمین کی پیداوار ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز دے۔'' باجود اس کے کہ نہایت راحت سے بغیر کسی تکلیف کے سیر ہوتی تھی، من وسلویٰ کھانے کو ملتا تھا۔ اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے اس کا یہ جواب دیا: ﴿ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٦١] ''بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز کیوں طلب کرتے ہو؟ اچھا شہر میں جاؤ، وہاں تمھاری چاہت کی یہ سب چیزیں ملیں گی۔ ان پر ذلت اور مسکینی ڈالی دی گئی اور اللہ کا غضب لے کر وہ لوٹے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ﴾ [القصص: ٥٨] ''اور ہم نے بہت سی وہ بستیاں تباہ کر دیں جو اپنی عیش وعشرت میں اترانے لگی تھیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴾ [النحل: ١١٢] ''اللہ تعالیٰ اس بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو پورے امن واطمینان سے تھی اس کی روزی اس کے پاس بافراغت ہر جگہ سے چلی آ رہی تھی، پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک اور ڈر کا مزہ چکھایا جو بدلہ تھا ان کے کرتوتوں کا۔'' اور ان لوگوں کے حق میں فرمایا کہ انھوں نے کہا: اے رب! دوری کر ہمارے سفر میں اور انھوں نے اپنی جانوں کا اپنے کفر کے سبب سے برا کیا۔

﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ﴾ یعنی ہم نے ان کو لوگوں کے لیے قصہ و کہانی بنا دیا کہ وہ آپس میں ان کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ان کے مکر کی کیسی جزا دی اور ان کی جماعت کو متفرق کر ڈالا، اس کے بعد کہ ایک جگہ اکٹھے تھے، باہم پیار اور اتحاد رکھتے تھے، بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتے تھے، پھر یہاں وہاں شہر شہر میں متفرق ہو گئے اور بکھر گئے۔ اس لیے جب قوم متفرق ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں عرب لوگ کہتے ہیں: "تفرَّقوا أَيْدِيْ سَبَأٌ وَأَيَادِيْ سَبَأٌ وَتفرَّقوا شَذَرَ مَذَرَ" (یہ دو اسم ہیں ایک کر دیے گئے ہیں) غرض یہ ہے کہ متفرق و پریشان ہونے کو ان دو مثالوں کے پیرائے میں ادا کرتے ہیں۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام عکرمہ رحمہ اللہ سے اہلِ سبا کے قصے میں روایت کیا ہے کہ ان میں کاہن لوگ تھے اور شیاطین استراقِ سمع کیا کرتے تھے، یعنی چوری چھپے سنتے تھے، چنانچہ انھوں نے کچھ آسمان کی خبریں کاہنوں کو دی تھیں۔ ان میں ایک شخص کاہن شریف بہت مال والا تھا، اس کو یہ خبر مل گئی تھی کہ ان کے زوال کا وقت قریب آ گیا ہے اور عذاب ان پر سایہ فگن ہو چکا ہے، چنانچہ اس نے یہ نہ جانا کہ کیا کرے، کیوں کہ اراضی سے اس کا بہت مال تھا، لہٰذا اس نے اپنے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو کہا اور یہ بیٹا اپنے ماموؤں کو سب سے زیادہ عزیز تھا: اے میرے

بیٹے! جب کل کا دن ہو اور میں تجھے کسی کام کا حکم دوں تو تُو اس کو مت کرنا، پھر جب میں تجھ کو جھڑکوں تو تُو مجھ کو جھڑکنا، پھر جب میں تجھے طمانچہ ماروں تو تُو مجھے طمانچہ مارنا۔ وہ بولا: اے میرے باپ! تو یہ کام مت کر، یہ تو ایک بہت بڑا امر اور ایک سخت کام ہے۔ باپ نے کہا: بیٹا! ایک امر حادث ہو چکا ہے، وہ ضرور ہی ہونے والا ہے۔ پھر باپ اس کے پیچھے پڑا رہا، یہاں تک کہ اس نے اس بات پر باپ کی موافقت کی۔ پھر جب صبح ہوئی اور لوگ جمع ہوئے تو باپ نے کہا: بیٹا ایسا ایسا کر تو اس نے انکار کیا، پھر اس کے باپ نے اسے جھڑکا تو اس نے اس کو جواب دیا، پھر ان کے آپس میں اسی طرح ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس کے باپ نے اسے پکڑا اور اس کو طمانچہ مارا تو وہ اپنے باپ پر دوڑا اور اس کو طمانچہ مارا تو باپ بولا کہ میرا بیٹا مجھے طمانچہ مارے۔ لاؤ چھری، لوگ بولے: تو چھری سے کیا کرے گا؟ کہا: میں اس کو ذبح کروں گا، لوگ بولے: تو اپنے بیٹے کو ذبح کرتا ہے، تو اس کو طمانچہ مار لے، یا اور جو تجھے ظاہر ہو وہ کر لے۔ راوی نے کہا: پھر اس نے نہ مانا۔ کہا: پھر اس کے ماموؤں کی طرف آدمی بھیجا اور اُن کو اس کی خبر کی۔ پھر اس کے ماموں آئے تو وہ بولے کہ تو ہم سے لے لے جو تجھے ظاہر ہو، اس نے نہ مانا، مگر یہی کہ اس کو ذبح کرے گا۔

وہ بولے: پھر تو ضرور مرے گا، اس سے پہلے کہ تو اسے ذبح کرے، کہا: پھر جب بات یوں ہے تو میں اس شہر میں ذرا بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا، جس میں میرے اور میرے بیٹے کے درمیان حیلولت (حیلہ بازی) کی جائے۔ تم مجھ سے میرے گھر خرید لو، میری زمین خرید لو، پھر وہ یہ کہتا رہا، یہاں تک کہ اس نے اپنا گھر اور زمین بیچ ڈالی۔ جب قیمت اس کے ہاتھ میں آ گئی اور اپنے قبضے میں کر لی تو کہا: اے قوم! عذاب نے تم پر سایہ کر لیا ہے اور تمھارے کام کا زوال قریب آ گیا ہے، لہٰذا جو کوئی تم میں سے ارادہ کرے دارِ جدید وحملِ شدید وسفرِ بعید کا تو چاہیے کہ وہ عمان میں چلا جائے اور جو کوئی تم میں سے خمر وخمیر وعصیر (انگور کا شیرہ) کو چاہتا ہے، امام ابو سعید راوی کہتے ہیں کہ ابراہیم نے ایک کلمہ اور کہا جو مجھے یاد نہیں رہا، تو چاہیے کہ بصرے میں چلا جائے اور جو کوئی "راسخات في الوحل، المطعمات في المحل، المقيمات في الضحل" کو چاہتا ہے تو چاہیے کہ یثرب ذاتِ نخل میں چلا جائے۔ کہا: پھر اس کی قوم نے اس کی اطاعت کی، چنانچہ عمان والے تو امان میں چلے گئے اور غسّان بصرے کی طرف چلے گئے اور اوس، خزرج اور بنو عثمان یثرب ذاتِ نخل کی طرف نکل آئے۔ پھر وہ بطنِ مَر پر آئے تو بنو عثمان بولے کہ مکان اچھا ہے، ہم اس کا بدل نہیں چاہتے، چنانچہ وہ اس میں مقیم ہوئے، اس وجہ سے ان کا نام خزاعہ رکھا گیا، یعنی یاروں سے تخلف کرنے والے، کیوں کہ وہ اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے اور اوس وخزرج مستقیم رہے، یہاں تک کہ مدینے میں اترے اور اہلِ عمان، عمان کی طرف متوجہ ہوئے اور غسان بصرے کی طرف گئے۔ یہ اثر عجیب وغریب ہے اور یہ کاہن عمرو بن عامر ہے، یہ رؤسائے یمن سے ایک شخص ہے اور سبا کے سرداروں اور کاہنوں میں سے ہے۔[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/۶۹۹۔ ۷۰۰)

محمد بن اسحاق بن یسار نے عمرو بن عامر کے قصے کو اول سیرت میں ذکر کیا ہے۔ پہلے یہی شخص بلادِ یمن سے نکلا اس وجہ سے کہ اسے سیلِ عرم کے بھیجنے کا شعور ہو گیا تھا۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو زید انصاری نے مجھ سے جو حدیث بیان کی، اس میں ہے کہ عمرو بن عامر کے یمن سے نکلنے کا یہ سبب ہوا کہ اس نے ایک گھونس دیکھی کہ وہ سدِ مآرب کو کھود رہی ہے جو ان سے پانی کو روکتی تھی، وہ اپنی زمین میں جہاں چاہتے، اسے پھیر لے جاتے تھے۔ چنانچہ اس نے جان لیا کہ سدّ اب باقی رہنے والی نہیں ہے، لہٰذا اس نے یمن سے نقل مکانی کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی قوم سے فریب کیا۔ اپنے لڑکوں میں سے جو چھوٹا تھا، اسے حکم دیا کہ جس وقت وہ اس سے تلخ کلامی کرے اور اس کو طمانچہ مارے تو وہ اس کی طرف کھڑا ہو پھر اسے طمانچہ مارے۔ لہٰذا جو باپ نے بیٹے سے کہا تھا، وہ بیٹے نے کیا تو عمرو بولا: میں اس شہر میں نہیں ٹھہروں گا جس میں میرا چھوٹا بیٹا میرے منہ پر طمانچہ مارے اور اپنے اموال پیش کیے، یعنی فروخت کرنے کے لیے تو یمن کے اشراف میں سے کئی شریف بولے کہ عمرو کے غصے کو غنیمت جانو، پھر اس سے اس کے مال خرید لیے اور وہ اپنے بیٹوں پوتوں میں نقل کر گیا۔ قبیلہ ازد والے بولے کہ ہم تو عمرو بن عامر سے پیچھے نہ رہیں گے، چنانچہ انھوں نے اپنے مال بیچ ڈالے اور اس کے ہمراہ نکلے، پھر چلے یہاں تک کہ گزرتے ہوئے بلادِ عک میں اترے، شہروں کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ چنانچہ عک نے ان سے لڑائی کی اور ان کی لڑائی سجال ہوئی، یعنی ایک بار وہ غالب ہوئے اور ایک بار وہ۔ عباس بن مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ اسی باب میں فرماتے ہیں:

وَعَكُّ بْنُ عَدْنَانَ الَّذِيْنَ تَغَلَّبُوْا ... بِغَسَّانَ حَتّٰى طَرَدُوْا كُلَّ مُطْرَدِ

یہ بیت ان کے ایک قصیدے میں سے ہے۔ کہا: پھر انھوں نے عک سے کوچ کیا تو شہروں میں متفرق ہو گئے۔ پھر آلِ جفنہ بن عمرو بن عامر تو شام میں متفرق ہوئے اور اوس اور خزرج یثرب میں اترے اور خزاعہ مَر میں نازل ہوئے اور ازد السراۃ سراۃ میں اور ازدِ عمان عمان میں۔ پھر اللہ پاک نے سد پر سیل بھیجی تو اس نے اس کو گرا دیا اور اللہ عزوجل نے اس بارے میں یہ آیتیں نازل فرمائیں۔[1] (وقد ذكر السدي قصة عمرو بن عامر بنحو مما ذكر محمد بن إسحاق إلا أنه قال: فأمر ابن أخيه مكان ابنه إلى قوله فباع ماله و ارتحل بأهله فتفرقوا رواه ابن أبي حاتم)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے محمد بن اسحاق رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ زعم کرتے ہیں کہ عمرو بن عامر اور یہ قوم کا چچا ہے، ایک کاہن آدمی تھا، چنانچہ اس نے اپنی کہانت میں یہ دیکھا کہ اس کی قوم عن قریب چیر ڈالی جائے گی اور اُن کے درمیان سفر کی ذوری کر دی جائے گی تو اُن سے کہا کہ تحقیق میں نے جان لیا ہے کہ تم عن قریب چیر ڈالے جاؤ گے۔ ”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ ذَا هَمٍّ بَعِيْدٍ، وَجَمَلٍ شَدِيْدٍ، وَمَزَادٍ جَدِيْدٍ، فَلْيَلْحَقْ بِكَأْسٍ أَوْ كَرُوْدٍ، قَالَ: فَكَانَتْ وَادِعَةُ بْنُ عَمْرٍو، وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ ذَا هَمٍّ مُدْنٍ وَأَمْرٍ دَعِنٍ فَلْيَلْحَقْ بِأَرْضِ شَنَّ فَكَانَتْ عَوْفُ ابْنُ عَمْرٍو وَهُمُ الَّذِيْنَ يُقَالُ لَهُمْ بَارِقٌ وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُرِيْدُ عَيْشًا آنِيًا وَحَرَمًا فَلْيَلْحَقْ

[1] السيرة النبوية لابن هشام (١٢١/١)

بِيَثْرِبَ فَكَانَتْ خُزَاعَةُ، وَمَنْ كَانَ مِنكُمْ يُرِيدُ الرَّاسِيَاتِ فِي الْوَحَلِ، اَلْمُطْعِمَاتِ فِي الْمَحِلِّ فَلْيَلْحَقْ بِيَثْرِبَ ذَاتِ النَّخْلِ وَكَانَتِ الْأَوْسُ وَالْخَزْرَجُ، وَهُمَا هٰذَانِ الْحَيَّانِ مِنَ الْأَنْصَارِ وَمَنْ كَانَ مِنكُمْ يُرِيدُ خَمْرًا وَّخَمِيرًا وَّذَهَبًا وَّحَرِيْرًا وَّمُلْكًا وَّتَأْمِيرًا فَلْيَلْحَقْ بِكُوثٰى وَبُصْرٰى فَكَانَتْ غَسَّانُ بَنُو جَفْنَةَ مُلُوكُ الشَّامِ وَمَنْ كَانَ مِنْهُمْ بِالْعِرَاقِ» (مشکل الفاظ کی تشریح: "مزاد" جمع "مزادہ" بہ معنی توشہ دان وآبدست دان۔ "دعن" کلکف بدخو وبد غذا۔ "شن:" عبدالقیس کا ایک قبیلہ)۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: میں نے بعض اہلِ علم سے سنا، وہ کہتے تھے کہ یہ بات جو کہی تو یہ طریفہ عمرو بن عامر کی بیوی نے کہی، وہ کاہنہ تھی، چنانچہ اس نے اپنی کہانت میں یہ دیکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوا۔ سعید نے عن قتادہ عن الشعبی روایت کیا ہے کہ غسان تو عمان میں لاحق ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے شام میں ان کو چیر کر ٹکڑے کر ڈالا۔ رہے انصار تو وہ یثرب میں لاحق ہوئے اور خزاعہ تہامہ میں جا ملے اور ازد عمان میں لاحق ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو چیر کر ٹکڑے کر ڈالا۔[1] (رواہ ابن جرير وابن أبي حاتم)۔ پھر محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: مجھے ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے حدیث کی، کہا کہ اعشیٰ نے کہا ہے، یعنی اعشیٰ بن قیس بن ثعلبہ نے، اس کا نام میمون بن قیس ہے:

وَفِي ذَاكَ لِلْمُوْتَسِي أُسْوَةٌ ... وَمَآرِبُ عَفَّى عَلَيْهَا الْعَرِمُ

رُخَامٌ بَنَتْهُ لَهُمْ حِمْيَرٌ ... إِذَا جَاءَ مَاؤُهُمْ لَمْ يَرِمِ

فَأَرْوَى الزُّرُوْعَ وَأَعْنَابَهَا ... عَلٰى سَعَةٍ مَاؤُهُمْ إِذْ قُسِمَ

فَصَارُوا أَيَادِيَ مَا يَقْدِرُوْ ... نَ مِنْهُ عَلٰى شُرْبِ طِفْلٍ فَطِمِ[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴾ یعنی یہ نقمت و عذاب اور بدل دینا نعمت کا اور عافیت کا عقوبت کر دینا جو اُن لوگوں پر نازل ہوا، یہ سب ان کے کفر اور گناہوں کے سبب سے ہوا جن کا انھوں نے ارتکاب کیا۔ بے شک اس سب میں البتہ مصیبتوں پر ہر صبر کرنے والے اور نعمتوں کا بہت شکر کرنے والے کے لیے البتہ عبرت اور دلالت ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی مومن کے لیے قضا پر تعجب کیا ہے، اگر اسے کوئی خیر پہنچتی ہے تو اپنے رب کی حمد کرتا ہے اور شکر کرتا ہے اور اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اپنے رب کی حمد کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ مومن ہر شے میں اجر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے لقمے میں بھی اجر ہے جس کو وہ اپنی بیوی کے منہ کی طرف اٹھاتا ہے۔[3] (وقد رواه النسائي في اليوم و الليلة من حديث أبي إسحاق السبيعي به وهو حديث عزيز من رواية عمر بن سعد عن أبيه) لیکن

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٣٩٠۔ ٣٩١) [2] السيرة النبوية لابن هشام (١/ ١٢١)

[3] مسند أحمد (١/ ١٧٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٦٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد بأسانيد ورجالها كلها رجال الصحيح" مجمع الزوائد (٧/ ٤٥٦)

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس کا ایک شاہد ہے: «عَجَبًا لِّلْمُؤْمِنِ لَا يَقْضِي اللّٰهُ تَعَالٰى لَهُ قَضَاءً إِلَّا كَانَ خَيْرًا لَّهُ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَّهُ، وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ»[1] عبد نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ مطرف کہا کرتے تھے کہ اچھا بندہ صبار شکور ہے، جب دیا گیا تو شکر کیا اور جب مبتلا ہوا تو صبر کیا۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ ... الآية﴾ معطوف ہے ﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ ... الآية﴾ پر، یعنی قصۂ سبا سے یہ بات تھی کہ سیلاب بھیجنے سے قبل ہم نے ان کے مساکن کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی ہم نے پانی اور درخت کر دیے تھے، یعنی شام کی بستیاں۔ ﴿قُرًى ظٰهِرَةً﴾ یعنی دیہات ایک دوسرے سے متصل آباد و سرسبز و شاداب۔ ان کی زمین مآرب سے لے کر شام تک ان کی تجارت گاہ تھی، وہاں سے شام تک تجارت کے لیے جایا کرتے تھے، نہایت سکون و چین سے سفر ہوتا تھا۔ ایک گاؤں میں رات بسر کرتے تھے، دوسرے میں قیلولہ کرتے، یہاں تک کہ واپس آ جاتے۔ اپنی زمین سے شام تک ان کو کوئی زادِ راہ لانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ہر منزل میں کھانا دانہ تیار ملتا تھا۔ چنانچہ اللہ پاک نے جو اپنے انعامات بیان فرمائے، ان میں سے یہ بات بھی ہے۔

حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ ﴿قُرًى ظٰهِرَةً﴾ یمن اور شام کے درمیان بستیاں تھیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ سبا سے شام تک چار ہزار سات سو گاؤں ایک دوسرے سے متصل تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ مدینہ اور شام کے درمیان میں تھے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ظٰهِرَةً﴾ سے مراد معروفہ ہیں، ان کو جو ظاہرہ کہا تو وہ صرف ان کے ظہور کی وجہ سے کہا کہ جس وقت تو اس گاؤں سے نکلا تو دوسرا تجھے ظاہر ہو گیا، چنانچہ وہ دیہات ظاہرہ تھے، یعنی معروف۔ محاورے میں بولتے ہیں کہ یہ امر ظاہر ہے یعنی معروف ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ناظرین کی آنکھوں کے لیے ظاہر تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ مسافروں کے لیے ان کی راہوں سے دور نہ تھے کہ ان پر مخفی ہوں۔

﴿وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک اور ایک منزل سے دوسری منزل تک چلنے کی ایک مقدار معین ہم نے ٹھہرا دی تھی، یعنی صبح و شام میں آدھا دن، پھر جب وہ آدھا دن چل چکتے تو ایک گاؤں تک پہنچ جاتے جس میں پانی اور درخت ہوتے۔ چنانچہ یمن اور شام کے درمیان اسی طرح تھا، جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ہم نے ہر دو گاؤں میں آدھے دن کا راستہ ٹھہرا دیا، یہاں تک کہ قیلولہ ایک گاؤں میں ہوا اور شب باشی دوسرے گاؤں میں، یہاں تک کہ مسافر شام تک پہنچ جائے۔ آدمی چلنے میں

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٩) [2] تفسير الطبري (٣٩١/٢٠) تفسير ابن كثير (٦٩٨/٣۔٧٠١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٦٧/١٠) [4] تفسير القرطبي (٢٨٩/١٤)

جلدی کرتا ہے اور زیادہ کرتا ہے تو اس لیے کہ راستے میں آب و دانہ نہیں ملتا اور خوف ہوتا ہے۔ پھر جب وہ راستے میں توشہ اور امن پاتا ہے تو اپنے نفس کو مشقت میں نہیں ڈالتا، بلکہ جہاں چاہتا ہے اتر پڑتا ہے۔[1]

حاصل یہ ہے کہ پہلے تو اللہ پاک نے ان پر اپنی نعمتوں کا شمار کیا، پھر ان پر جو سزا اور عذاب نازل ہوا، اس کا ذکر فرمایا، پھر باقی ماندہ انعامات کے شمار کرنے کی طرف عود کیا، یہ وہ انعام ہے جو اُن کے شہر سے باہر تھا، ان کے اور اس جگہ کے درمیان جس کی طرف سفر کا ارادہ کرتے تھے، قریب قریب گاؤں کر دیے تھے، تاکہ سفر راحت اور آرام کے ساتھ ہو، پھر اس کے بعد یہ ذکر کیا کہ ان کو بدل کر بیابان اور جنگل کر دیے، چنانچہ آگے اس کا ذکر آتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ سِيْرُوْا فِيْهَا ﴾ میں قول مقدر ہے، یعنی ہم نے کہا ان سے کہ چلو پاس پاس بستیوں میں۔ یہ امر تمکین کا ہے، یعنی ہم نے ان کو قدرت دی ان میں چلنے کی جب چاہیں۔ لفظ "في" میں یہ بات بتائی ہے کہ وہ گاؤں ایک دوسرے کے انتہائی قریب تھے، یہاں تک کہ گویا وہ قریٰ سے نکلے ہی نہیں ہیں، بلکہ ان ہی میں چل رہے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے، یعنی جبکہ وہ اپنی منازل سے زمینِ مقدس شام کی طرف کوچ کریں۔[2] ﴿ لَيَالِيَ وَاَيَّامًا ﴾ کا نصب ظرفیت کی بنا پر ہے اور ﴿ اٰمِنِيْنَ ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے، یعنی ان بستیوں میں راتوں اور دنوں کو چلو اور کسی چیز کا خوف نہ کرو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بے خوف ہو کر اور سیر و سیراب ہو کر امن کے ساتھ چار مہینے کا راستہ چلتے تھے، ایک دوسرے کو حرکت نہیں دیتا تھا اور اگر آدمی اپنے باپ کے قاتل سے ملتا تو اس کو حرکت نہیں دیتا تھا۔[3] مطلب یہ ہے کہ پورا پورا امن تھا، کوئی کسی سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ لَيَالِيَ وَاَيَّامًا ﴾ کو نکرہ ذکر کیا ہے؟ اس کی یہ وجہ ہے کہ مطلب یہ بتانا ہے کہ ان کے سفر قصیر تھے، یعنی چھوٹے تھے، وہ لمبے سفر کے محتاج نہیں تھے، اس وجہ سے کہ ان کی حاجت کی چیزیں قریب ہی موجود ہوتی تھیں۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات ذکر فرمائی کہ انھوں نے اس نعمت کا شکر نہ کیا، بلکہ تعب، کد، محنت اور مشقت طلب کی اور بولے: اے ہمارے رب! ہمارے سفر میں دوری کر دے۔ یہ بات ان سے بطور سرکشی کے صادر ہوئی، جبکہ وہ نعمتوں سے اُکتا گئے اور عافیت پر صبر نہ کیا تو اپنے سفروں کے طول اور شہروں کے درمیان لمبے فاصلے کی تمنا کرنے لگے۔ اللہ پاک سے سوال کیا کہ یہ جو گاؤں پاس پاس ہیں اور ان میں پانی اور درخت کثرت سے ہیں اور امن و بے خوفی ہے، ہمارے اور شام کے درمیان بے آب و گیاہ جنگل اور آبادی دور دور کر دے، یعنی بجائے آبادی کے دور دور تک جنگل ہو جائیں، تاکہ سفر کا کچھ مزہ آئے۔

اللہ پاک نے ان کی درخواست قبول فرمائی۔ ان بستیوں کو جو پاس پاس تھیں اجاڑ کر دیا اور ان میں جو خیر و برکت اور پانی اور درخت تھے، ان کو دور کر دیا۔ چنانچہ ان کی یہ دعا بنی اسرائیل کی دعا کی طرح تھی، جب کہ انھوں نے

[1] فتح القدير (٤/ ٤٢٤، ٤٢٥) [2] الدر المنثور (٦/ ٦٩٣) [3] تفسير القرطبي (١٤/ ٢٩٠)

کہا تھا: ﴿ اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ ... الآیۃ ﴾ اور جس طرح کہ نضر بن حارث نے کہا تھا: ﴿ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ''اے اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دے۔'' جمہور نے ﴿ رَبَّنَا ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ منادیٰ مضاف ہے اور نیز ﴿ بٰعِدْ ﴾ بہ صیغۂ امر باب مفاعلہ سے ہے۔ امام ابن کثیر، ابوعمرو، ابن محیصن اور ہشام رحمہ اللہ نے ابن عامر سے ''بَعِّدْ'' بہ تشدیدِ عین اور ابن سمیفع نے بہ ضمِ عین بہ صیغۂ فعل ماضی پڑھا ہے۔

اس قراءت کی بنیاد پر معنی یہ ہوں گے کہ انھوں نے سفروں کی دوری کا شکوہ کیا۔ امام ابو صالح، محمد بن حنفیہ، ابو العالیہ، نصر بن عاصم اور یعقوب رحمہم اللہ نے ﴿ رَبَّنَا ﴾ کو بہ رفع اور ﴿ بٰعِدْ ﴾ کو بہ فتحِ عین بہ صیغۂ ماضی بنا بر ابتداء وخبر پڑھا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہمارے رب نے ہمارے اسفار کے درمیان دوری کر دی۔ یہ قراءت بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اور امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس کو پسند کیا ہے اور کہا: اس لیے کہ انھوں نے دور کرنا طلب نہیں کیا۔ انھوں نے تو یہ طلب کیا کہ جو قرب اُن کے اور شام کے درمیان ایک دوسرے سے متصل بستیوں کی وجہ سے تھا، یہ قرب اس سے بھی زیادہ ہو اور ان کا یہ مطالبہ تکبر، شرارت اور کفرانِ نعمت کے طور پر تھا۔

یحییٰ بن یعمر اور عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے ﴿ رَبَّنَا ﴾ کو بہ رفع اور ﴿ بٰعِدْ ﴾ کو بہ فتحِ عین مشدد پڑھا، اس کی بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ انھوں نے یہ شکوہ کیا ہے کہ اُن کے رب نے اُن کے اسفار کے درمیان دوری کر دی، باوجود اس کے کہ ان کے سفر بستیوں اور پانی اور درختوں سے متصل تھے۔ چنانچہ یہ شکوہ ان کے تکبر سے ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کے بھائی نے مثل قراءت ابن سمیفع رحمہ اللہ سابق کے پڑھا ہے۔ مع رفع ''بین'' کے اس بنا پر کہ فاعل ہے جس طرح کہ ''لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ'' میں کہا گیا ہے۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے ایک قراءت اس قراءت کی طرح روایت کی ہے، لیکن نصب ''بین'' کے ساتھ اس بنا پر کہ ظرف ہے بایں تقدیر کہ ''بَعُدَ سَيْرُنَا بَيْنَ أَسْفَارِنَا''

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ قراءتیں جبکہ ان کے معانی مختلف ہوں تو جائز نہیں ہے کہ اس طرح کہیں کہ ان میں سے ایک قراءت دوسری سے بہتر ہے جس طرح کہ اخبارِ آحاد میں یہ نہیں کہتے، جبکہ ان کے معانی مختلف ہوں، لیکن ان کی طرف سے یہ خبر دی ہے کہ انھوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ ان کے اسفار کے درمیان دوری کر دے، پھر جب اس نے یہ کر دیا تو انھیں تکلیف ہوئی، پھر شکوہ کیا۔[1] اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾ یعنی انھوں نے اپنی جانوں کا برا کیا، اس انداز سے کہ اللہ کے ساتھ کفر کیا اور طغیان اور سرکشی کی اور اس کی نعمت پر ناز کیا اور اس کی سزا اور عذاب کا نشانہ بنے۔

---

1 تفسیر القرطبي (١٤/٢٩٠۔ ٢٩١) فتح القدیر (٤/٤٢٥۔ ٤٢٦)

﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ﴾ پھر ہم نے ان کو کہانیاں کر دیا کہ لوگ ان کی خبریں بیان کرتے ہیں اور ان کو عبرت ٹھہرایا ان لوگوں کے لیے جو اُن کے بعد ہیں۔ ﴿ اَحَادِيْثَ ﴾ جمع "حدیث" بہ معنی خبر ہے جس طرح کہ قاموس میں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو اصحابِ احادیث کر دیا کہ ان کے بعد کے لوگ ان کے فعل و حال سے تعجب کر کے اور اُن کے حال اور انجام سے عبرت لے کر اُن کی خبریں بیان کرتے ہیں۔

﴿ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ﴾ یعنی ہم نے ان کو بلاد کی ہر طرف پوری طرح سے ایسا متفرق کر دیا کہ اس کے بعد ان کے دوبارہ اکٹھے اور متصل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ جملہ ان کی احادیث کرنے کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح ہوا کہ جب اللہ پاک نے ان کے مکانوں کو غرق کر دیا اور ان کے باغوں کو فنا کر دیا تو وہ شہروں میں متفرق ہو گئے۔ چنانچہ عرب لوگ ان کی مثالیں بیان کرنے لگے کہ "تفرَّقُوا أَيدِيَ سَبأَ وَذَهبُوا أَيادِيَ سَبأ"۔ اس جگہ "أيدي" سے مراد اولاد ہے، کیوں کہ لوگ اولاد سے قوی ہوتے ہیں۔ مفصل میں ہے کہ "أيدي" سے مراد انفس ہیں۔ یہ کنایہ ہے یا مجاز۔ کشف میں کہا ہے کہ یہ قول احسن ہے۔ امام شعبی نے کہا ہے کہ پس انصار، یعنی اوس و خزرج یثرب میں جا ملے اور غسان شام میں اور ازد عمان میں اور خزاعہ تہامہ میں اور اُن میں سے جو شخص مدینے میں آیا، وہ عمرو بن عامر تھا، یہ انصار کا جد ہے اور آلِ خزیمہ عراق میں جا ملے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴾ یعنی ان کا قصہ جو مذکور ہوا اور جو کچھ اللہ پاک نے ان کے ساتھ کیا، بے شک اس میں البتہ کھلی نشانیاں اور ظاہر عبرتیں اور واضح دلیلیں ہیں، ہر اس شخص کے لیے کہ جو معاصی سے کثیر الصبر، یعنی گناہوں سے بچنے والا اور اللہ پاک کی نعمتوں پر کثیر الشکر ہے۔ صبار اور شکور کو خاص کر اس لیے ذکر کیا کہ نصیحتوں اور آیات سے فائدہ یہی لوگ حاصل کرتے ہیں۔[2] (كذا في فتح البيان)

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿20﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿21﴾

اور ابلیس نے ان پر اپنا خیال یقیناً سچ کر دکھایا، چناں چہ سوائے مومنوں کی ایک جماعت کے سب نے اسی کی اتباع کی ⑳ اور اس (ابلیس) کا ان پر کوئی زور نہ تھا، مگر اس لیے کہ ہم جان

[1] تفسير البغوي (٦/٣٩٦) [2] فتح البيان (١١/١٨٢ـ١٨٥)

لیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس سے (الگ ہو کر) جو آخرت کے متعلق شک میں ہے؟ اور آپ کا رب ہر چیز پر خوب نگہبان ہے ﴿21﴾

کفار کے بارے ابلیس نے اپنا گمان سچ کر لیا:

پہلے دن ابلیس نے کہا تھا: ﴿ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٢] ''میں اس کی اولاد کو بجز بہت تھوڑے لوگوں کے، اپنے بس میں کرلوں گا۔'' اس نے ویسا ہی کر دکھایا۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ پاک نے سبا کا قصہ ذکر کیا اور خواہشِ نفس اور شیطان کی پیروی کرنے میں ان کا جو حال ہوا، وہ بیان کیا تو ان کی طرف سے اور اُن جیسے اور لوگوں کی طرف سے، جنھوں نے خواہشات اور ابلیس کا اتباع کیا تھا اور رُشد و ہدایت کی مخالفت کی تھی، ان کا حال بیان کیا: ﴿ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت اس آیت کی مثل ہے، جس میں ابلیس کی طرف سے یہ کلمات کہے گئے، جب وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے باز رہا: ﴿ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [1] [بني إسرائيل: ٦٢] ''اچھا دیکھ لے اسے تو نے مجھ پر بزرگی تو دی ہے، لیکن اگر مجھے بھی قیامت تک تو نے ڈھیل دی تو میں اس کی اولاد کو بجز بہت تھوڑے لوگوں کے، اپنے بس میں کرلوں گا۔'' نیز کہا: ﴿ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۤىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٧] ''پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور ان کی بائیں جانب سے بھی اور آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔'' اس بارے میں آیتیں بہت ہیں۔

حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارا اور اُن کے ساتھ حواء علیہا السلام کو تو ابلیس اس بات سے خوش ہوتا ہوا اترا جس کو اس نے ان دونوں سے حاصل کیا اور کہا: جبکہ میں نے ماں باپ میں اس بات کو حاصل کر لیا جس کو حاصل کر لیا تو اولاد تو اور زیادہ ضعیف اور زیادہ کمزور ہوتی ہے، یہ ابلیس کی طرف سے ایک ظن تھا۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل کی: ﴿ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ ﴾ تو ابلیس نے اس وقت کہا ہے کہ میں ابن آدم سے اس وقت تک علاحدہ نہیں ہوں گا، جب تک اس میں روح ہے، میں اس کو وعدے دوں گا اور آرزوئیں دلاؤں گا اور اس کو فریب میں مبتلا کروں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قسم ہے میری عزت کی! میں اس سے توبہ کو نہ روکوں گا، جب تک کہ موت کے ساتھ غرغرہ نہ کرے، یعنی جب تک اس کی جان حلق تک نہ پہنچے

[1] الدر المنثور (٦/٦٩٥)

اور وہ مجھے جب بھی پکارے گا، میں اس کو جواب دوں گا اور وہ مجھ سے جب بھی سوال کرے گا، میں اس کو دوں گا اور وہ جب بھی مجھ سے مغفرت مانگے گا تو میں اس کو بخشوں گا۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سلطان سے مراد حجت ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: واللہ! اس نے ان کو لاٹھی سے نہیں مارا، نہ ہی کسی شے پر ان سے زبردستی کی، اس کی طرف سے جو کچھ تھا وہ دھوکا اور آرزوئیں تھیں، اس نے ان کو ان کی طرف بلایا، چنانچہ انھوں نے اس کا کہا مانا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی ہم نے اس کو ان پر اس لیے مسلط کیا تاکہ اس شخص کا حال ظاہر ہو جائے جو آخرت کا اور اس کے قائم ہونے کا اور اس میں حساب و جزا ہونے کا ایمان رکھتا ہے۔ تو اپنے رب عزوجل کی اچھی طرح دنیا میں عبادت کر اس شخص کی نسبت جو آخرت کے بارے میں شک و شبہہ میں ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴾ یعنی اللہ پاک کی حفاظت کے ساتھ ہے۔ جو کوئی گمراہ ہوا وہ ابلیس کی اتباع سے گمراہ ہوا اور جو کوئی سالم رہا، وہ اسی کے حفظ اور نگہبانی سے اور رسولوں کی اتباع سے۔[2] علیهم الصلاة والتسليم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ جمہور نے "صَدَقَ" کو بہ تخفیف اور "إِبْلِيْسُ" کو مرفوع اور "ظَنَّهٗ" کو منصوب پڑھا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصب بنا بر مصدریت ہے: "أَيْ: صَدَقَ، وَظَنَّ ظَنَّهٗ، أَوْ صَدَقَ فِيْ ظَنِّهٖ" یا بنا بر ظرفیت۔ (كذا في فتح البيان. اور فتح القدیر میں یوں ہے: "أي: صدق عليهم ظنا ظنه"[3] شیخ زادہ نے حاشیۂ بیضاوی میں کہا ہے: "مفعول مطلق لفعل مقدر من لفظه أي: صدق إبليس يظن ظنا و الجملة حالية من فاعل ﴿ صَدَّقَ ﴾ كقولك فعلته جهدك أي فعلته تجهد جهدك وتتعب نفسك")۔ معنی یہ ہیں کہ ابلیس نے ان کے ساتھ یہ گمان کیا کہ جس وقت وہ ان کو بہکائے گا تو وہ اس کی پیروی کریں گے، چنانچہ اس نے ان کو ایسا ہی پایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ منصوب ہو بنا بر مفعولیت، یا باسقاطِ خافض۔ امام حمزہ، کسائی، یحییٰ بن وثاب، اعمش اور عاصم رحمہم اللہ نے بہ تشدید ﴿ صَدَّقَ ﴾ اور بہ نصب ﴿ ظَنَّهٗ ﴾ بنا بر مفعولیت پڑھا ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا: یعنی تصدیق کی اس نے اس ظن کی جس کا اس نے ظن کیا تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نے ایک ظن کیا تھا تو اپنے ظن کی تصدیق کی، چنانچہ ویسا ہوا جو اس نے گمان کیا تھا۔ امام ابو جعفر، ابو الہیاج، زہری اور زید بن علی نے "صَدَقَ" بہ تخفیف اور "إِبْلِيْسَ" بہ نصب اور "ظَنُّهٗ" بہ رفع پڑھا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قراءت کی میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس کو جائز کہا ہے اور امام زجاج رحمہ اللہ نے

---

[1] الدر المنثور (٦/ ٦٩٥) [2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٧٠١، ٧٠٢) [3] فتح البيان (١١/ ١٨٦) فتح القدير (٤/ ٤٢٦)

اس کا ذکر کیا اور "ظَنُّهُ"، کو "صَدَقَ" کا فاعل اور "إِبْلِيسَ" کو اس کا مفعول ٹھہرایا۔ معنی یہ ہیں کہ زینت دی واسطے ابلیس کے اس کے ظن نے ایک شے کی ان میں، پھر سچا ہوا اس کا ظن، گویا یوں کہا کہ ان پر ابلیس کا ظن سچ ہوا۔" امام ابوعمرو رحمہ اللہ سے دونوں کا رفع مروی ہے، "صَدَقَ" کی تخفیف کے ساتھ اس بنا پر کہ "ظَنُّهُ" ﴿ اِبْلِيْسُ ﴾ سے بدلِ اشتمال ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ سبا کے ساتھ خاص ہے، معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس شے پر ایمان لانے کے بعد جس کو ان کے رسول لائے تھے تغیر و تبدیل کی۔ کسی نے کہا ہے کہ عام ہے، یعنی تصدیق کی ابلیس نے سارے لوگوں پر اپنے گمان کی، مگر وہ جس نے اللہ کی اطاعت کی۔ (قاله مجاهد والحسن)

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابلیس نے یہ ظن کیا کہ اگر وہ ان کو اغوا کرے گا تو وہ اس کا کہا مانیں گے اور اگر ان کو گمراہ کرے گا تو اس کی اطاعت کریں گے، چنانچہ اس نے اپنے گمان کی تصدیق کی، لہٰذا انھوں نے اس کا اتباع کیا۔ حسن نے فرمایا کہ اس نے ان کو نہ کوڑے سے مارا نہ لاٹھی سے اور اس نے تو صرف ایک ظن کیا تھا، چنانچہ ویسا ہوا جیسا کہ اس نے اپنے وسوسے کے سبب سے ظن کیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، ابلیس نے کہا: "إِنَّ آدَمَ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ وَّطِيْنٍ وَّمِنْ حَمَأٍ مَّسْنُوْنٍ خَلْقًا ضَعِيفًا وَإِنِّي خُلِقْتُ مِنْ نَارٍ، وَالنَّارُ تُحْرِقُ كُلَّ شَيْءٍ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيْلًا، قَالَ: فَصَدَّقَ ظَنَّهُ عَلَيْهِمْ"[2] یعنی آدم تو بنایا گیا ہے خاک سے اور گیلی مٹی سے اور سنے ہوئے گارے سے ایک کمزور خلق اور میں بنایا گیا ہوں آگ سے اور آگ ہر شے کو جلا ڈالتی ہے، البتہ میں ضرور اس کی اولاد پر استیلاء پاؤں گا، یعنی ان کو اپنے بس میں کرلوں گا مگر تھوڑے۔ کہا: پھر اس نے ان پر اپنے گمان کی تصدیق کی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ نصب اس کا استثناء کی بنا پر ہے، اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد بعض مومنین ہیں، کیوں کہ بہت سے مومنین تو گناہ کرتے ہیں اور بعض معصیت کے کاموں میں ابلیس کے فرمانبردار ہو جاتے ہیں، اس سے صرف ایک فریق ہی بچ رہا اور سالم رہا، یہ وہ ہیں جن کے حق میں اللہ تعالیٰ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٥] "میرے سچے بندوں پر تیرا کوئی قابو اور بس نہیں۔" کسی نے کہا: ﴿ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ سے کل مومنین مراد ہیں، کیوں کہ اصل دین میں انھوں نے اس کا اتباع نہیں کیا، اس بنا پر کہ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ کل مومنین ہیں۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ﴾ یعنی اس کا ان پر کچھ تسلط نہیں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے ان کو کفر پر مجبور اور مقہور نہیں کیا، اس کی طرف سے تو صرف بلانا، وسوسہ ڈالنا اور اچھا کر دکھانا تھا۔ کسی نے کہا

---

[1] تفسير القرطبي (٢٩٢/١٤) فتح القدير (٤٢٦/٤) [2] تفسير القرطبي (٢٩٢/١٤، ٢٩٣) [3] تفسير القرطبي (٢٩٣/١٤)

ہے کہ ﴿سُلْطٰنٍ﴾ بہ معنی قوت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی حجت ہے۔ ﴿عَلَيْهِمْ﴾ کی ضمیر "من صدق علیھم ظن إبلیس" کی طرف راجع ہے اور فریق مومنین کی طرف، جیسا کہ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ﴾ میں استثناء منقطع ہے، معنی یہ ہیں کہ اس کا ان پر کچھ تسلط نہیں ہے، لیکن ہم نے ان کو آزمایا ہے اس کے وسوسے سے، تا کہ اس شخص کو جان لیں جو آخرت پر ایمان لاتا ہے اس شخص سے جو آخرت کے بارے میں شک میں ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: تا کہ ہم اس کو جان لیں جو تمھارے نزدیک ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تا کہ تم جان لو۔ کسی نے کہا ہے: تا کہ ہمارے اولیاء اور فرشتے جان لیں۔ کسی نے کہا ہے کہ استثناء متصل ومفرع ہے، یعنی ان پر اس کا کچھ تسلط کسی حال میں بھی نہیں تھا اور نہ علتوں میں سے کسی علت کے لیے تھا، مگر اس لیے کہ اس کی پہچان اور تمیز ہو جائے کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں لاتا، کیوں کہ اللہ پاک نے تو اپنے ازلی علم کی بدولت اس کو جان لیا ہے۔ اس جگہ علم کو تمیز اور اظہار پر محمول کیا ہے، یہ اولیٰ ہے۔ چنانچہ مذکور ہو چکا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: تا کہ ہم جان لیں موجود اس شے کو جس کو معدوم ہم جان چکے ہیں اور تغیر معلوم شے پر ہوتا ہے علم پر نہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ نے "لِيُعْلَمَ" بہ صیغہ مجہول پڑھا ہے۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک ہر شے پر محافظ ہے، چنانچہ حفاظت کے مفہوم میں علم اور قدرت داخل ہے، کیوں کہ جاہل اور عاجز سے اس کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نے ہر شے کو ایمان اور شک سے جان لیا ہے۔[1]

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾

(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: انھیں پکارو جنھیں تم نے اللہ کے سوا (معبود) خیال کیا تھا، وہ آسمانوں میں اور زمینوں میں ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس (اللہ) کا مددگار ہی ہے (22) اور اس کے ہاں صرف اس شخص کی

[1] تفسیر القرطبي (۲۹٤/۱٤) [2] فتح القدير (٤٢٧/٤) فتح البيان (١٨٦/١١، ١٨٧)

سفارش نفع دے گی جسے اللہ اجازت دے گا، حتی کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے تو (باہم) کہتے ہیں: تمھارے رب نے کیا کہا ہے؟ وہ کہتے ہیں: حق (سچ کہا) اور وہ بہت بلند، بہت بڑا ہے ﴿23﴾

معبودانِ باطلہ کی عاجزی کا ذکر:

یعنی اللہ کے ہاں سفارش عوام چاہتے ہیں اولیاء سے وہ انبیاء سے وہ فرشتوں سے اور فرشتوں کا یہ حال ہے جو فرمایا کہ جب اوپر سے اللہ کا حکم اترتا ہے تو ایسی آواز آتی ہے جیسے پتھر پر زنجیر کی آواز ہوتی ہے، فرشتے ڈر سے پھڑ پھڑاتے ہیں، جب سکون آیا اور کلام اُتر چکا تو ایک دوسرے سے فرشتے پوچھتے ہیں: کیا حکم ہوا؟ اوپر والے نیچے والے فرشتوں کو بتاتے ہیں کہ وہ حکم اترا ہے جو اللہ کی حکمت کے مطابق ہے اور پہلے سے قاعدہ معلوم ہے، وہی حکم ہوا۔ انتہیٰ.

اللہ تبارک وتعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ بے شک وہ الٰہ واحد، اَحد، فرد اور صمد ہے، یعنی ایک معبود اکیلا ہے جس کا نہ کوئی نظیر ومثیل ہے نہ کوئی اس کا شریک اور برابر ہے، بلکہ وہی اکیلا مستقل بالامر ہے، بغیر کسی شریک و مقابل و منازع کے۔ چنانچہ فرمایا: تو کہہ کہ پکارو ان کو جن کو تم اللہ کے سوا گمان کرتے ہو، یعنی وہ معبود جو اللہ کو چھوڑ کر پوجے گئے ہیں آسمانوں اور زمین میں، ذرہ بھر کے مالک نہیں ہیں، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشار فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴾ [الفاطر: ١٣] ''جنھیں تم اس کے سوا پکار رہے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ آسمان و زمین میں کسی شے کے مالک نہیں ہیں، نہ مستقل حیثیت سے، نہ ہی بطریقِ شراکت۔ ﴿ وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان انداد میں سے جن کو اللہ پاک کا ہمسر ٹھہرایا ہے، کوئی اس کا مددگار نہیں کہ وہ کاموں میں اس سے مدد لے، بلکہ ساری مخلوق اس کی محتاج اور نیاز مند ہے، اس کے نزدیک غلام اور مطیع ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ ان میں سے اس کا کوئی عون،[1] یعنی معین اور مددگار نہیں ہے کہ کسی شے کے ساتھ اس کی اعانت کرے۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ یعنی اس کی عظمت وجلال و کبریائی کے مارے کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اس کے نزدیک کسی شے کے بارے میں سفارش کرے، مگر اس کے بعد کہ وہ سفارش کرنے کی اسے اجازت دے، جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَمْ

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٣٩٤۔ ٣٩٥)

مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ [النجم: ٢٦] ''اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی، مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور اپنی مشیت سے جس کے لیے چاہے اجازت دے دے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٨] ''وہ کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے بجز ان کے جن سے اللہ خوش ہو، وہ تو خود ہیبتِ الٰہی سے لرزاں و ترساں ہیں۔''

نیز اسی لیے بہت طرح سے صحیحین میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے، اور آپ اولادِ آدم علیہ السلام کے سردار ہیں اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بزرگ شفیع ہیں، کہ جس وقت آپ مقامِ محمود میں کھڑے ہوں گے، تاکہ ساری مخلوق کے بارے میں شفاعت کریں تو ان کا رب فصلِ قضا، یعنی فیصلہ کرنے کے لیے آئے گا، چنانچہ میں اللہ کے لیے سجدہ کروں گا تو وہ مجھے سجدہ میں رہنے دے گا جب تک یا جس قدر چاہے گا اور مجھ پر حمد کے وہ کلمات کھول دے گا جن کو میں اب نہیں جانتا ہوں۔ پھر کہا جائے گا: اے محمد! اپنا سر اٹھا، بات کر تیری بات سنی جائے گی، مانگ تجھ کو ملے گا اور شفاعت کر تیری شفاعت قبول ہوگی۔[1] (الحديث بتمامه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ﴾ یہ بھی عظمت میں ایک مقامِ رفیع ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس وقت وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے، پھر آسمانوں والے اس کے کلام کو سنتے ہیں تو مارے ہیبت کے کانپ اٹھتے ہیں، یہاں تک کہ ان کو غشی کی طرح کی حالت لاحق ہو جاتی ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور مسروق وغیرہما کا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ یعنی یہاں تک کہ جب گھبراہٹ ان کے دلوں سے دور ہو جاتی ہے۔ سیدنا ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ عنہم ابو عبدالرحمن سلمی، شعبی، ابراہیم نخعی، ضحاک، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: ''جُلِّيَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ''[2] بعض سلف نے ''إِذَا فُرِّغَ'' پڑھا ہے بغینِ معجمہ اور مرفوعاً آیا ہے۔ یہ قول راجع ہے پہلے قول کی طرف۔

پھر جب ایسا ہوتا ہے، یعنی ان کے دل سے خوف دور ہوتا ہے تو ان میں سے کوئی دوسرے سے پوچھتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا فرمایا؟ تو حاملانِ عرش اس کی خبر دیتے ہیں ان فرشتوں کو جو اُن سے متصل ہیں، پھر وہ جو اُن سے متصل ہیں، ان کو جو اُن سے نیچے ہیں، یہاں تک کہ وہ خبر سمائے دنیا تک پہنچتی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ قَالُوا الْحَقَّ ﴾ یعنی اس بات کی خبر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی، اس میں کسی طرح کی کمی بیشی کیے بغیر۔ ﴿ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾

اور لوگوں نے کہا: بلکہ مراد مشرکین ہیں ان کی موت کے حاضر ہونے کے وقت اور قیامت کے دن جب وہ اس

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣) [2] تفسير الطبري (٢٠/٣٩٥، ٣٩٦)

غفلت سے بیدار ہوں گے جس میں وہ دنیا میں تھے اور قیامت کے دن ان کی عقلیں ان کی طرف لوٹ آئیں گی، کہیں گے: کیا کہا تمھارے رب نے؟ تو ان سے کہا جائے گا کہ حق۔ نیز اُن کو اس بات کی خبر دی جائے گی جس سے وہ دنیا میں بے پروا اور غافل تھے۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ''كُشِفَ عَنْهَا الْغِطَاءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''[1] یعنی یہاں تک کہ جس وقت قیامت کے دن اُن کے دلوں سے پردہ کھولا جائے گا۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ''مَا فِيْهَا مِنَ الشَّكِّ وَالتَّكْذِيْبِ'' یعنی جس وقت وہ شک اور تکذیب دور کیا جائے گا جو اُن کے دلوں میں تھا۔

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جس وقت وہ شک دور کیا جائے گا جو ان کے دلوں میں تھا۔ کہا کہ دور کیا جائے گا شیطان ان کے دلوں سے اور ان کے مآرب و امانی (آرزوئں) سے اور جو کچھ وہ ان کو گمراہ کیا کرتا تھا تو کہیں گے کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ کہیں گے: اس نے حق کہا اور وہ علی کبیر ہے۔ کہا: اور یہ بنی آدم کے حق میں ہے، جب اس کی موت کا وقت آجائے گا، وہ اس وقت اقرار کریں گے جس وقت کے اقرار کا کچھ فائدہ نہیں۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے کہ ضمیر ملائکہ کی طرف راجع ہے۔[3] حق یہی قول ہے جس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں صحیح احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں، ہم ان میں سے کچھ یہاں ذکر کرتے ہیں جو اس پر دال ہیں (اصل کے الفاظ اس طرح ہیں: ''ولنذكر منها طرفا يدل على غيره'' مصحح سلمه الله)۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں زیرِ تفسیر آیت کریمہ ہذا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی معاملے کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے اللہ تعالیٰ کے فرمان کے سامنے جھکاؤ کے لیے عاجزی کے طور پر اپنے پروں کو اس طرح مارتے ہیں، گویا صاف پتھر پر لوہے کی زنجیر کھینچی جا رہی ہو۔ پھر جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں: تمھارے رب نے کیا فرمایا؟ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہوتا ہے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ بالکل برحق ہے اور وہی سب سے بلند و برتر ہے، تو سنی ہوئی بات چوری کرنے والے شیاطین بھی اسے سن لیتے ہیں اور چوری کرنے والے شیاطین اسی طرح ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوتے ہیں۔ سفیان نے اپنی ہتھیلی سے اس کی کیفیت بیان فرمائی: ہتھیلی کو ایک طرف کیا اور انگلیوں کے درمیان فرق کیا۔ بہر حال وہ اُس کلمۂ حق کو سن کر اپنے نیچے والے تک پہنچاتا ہے اور وہ دوسرا اپنے نیچے والے تک پہنچاتا ہے، یہاں تک کہ کسی جادوگر یا نجومی کے کان میں ڈالتا ہے، پھر وہ ساحر یا نجومی اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا لیتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: کیا فلاں دن اس نے ہمیں اس اس طرح نہیں کہا تھا؟ تو وہ کلمہ جو آسمان سے سنا گیا تھا، اس کی وجہ سے اس کے جھوٹ کو بھی سچا سمجھا جاتا ہے۔''[4] (انفرد بإخراجه البخاري دون مسلم من هذا الوجه، وقد رواه أبو داود والترمذي وابن ماجه من حديث سفيان بن عيينة به والله أعلم)

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/٣٩٥، ٣٩٦) [2] الدر المنثور (٦/٧٠١) [3] تفسير الطبري (٢٠/٣٩٩، ٤٠٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٨٩) سنن الترمذي (٣٢٢٣) سنن ابن ماجه (١٩٤)

"خُضُعَانٌ"، مصدر ہے "خَضَعَ" کا مثل غفران کے اور بالکسر بھی مروی ہے "خَاضِعٌ" کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور "خُضَّعًا" بھی مروی ہے، یہ "خَاضِعٌ" کی جمع ہے۔ جمع کی بنا پر تو حال ہوگا اور مصدر کی بنا پر مفعول مطلق، اس لیے کہ ضربِ اجنحہ میں خضوع کے معنی ہیں، یا مفعول لہ ہے، کیوں کہ پرندے کو جب کچھ خوف معلوم ہوتا ہے تو اپنے دونوں بازو کانپتا ہوا لٹکا دیتا ہے۔ "کأنہ" کی ضمیر قول کی طرف راجع ہے اور وہ اس سے حال ہے۔ صفوان چکنے پتھر کو کہتے ہیں۔ "لِلَّذِيْ قَالَ الْحَق" کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک نے جو بات بیان فرمائی فرشتے اس کو کہتے ہیں کہ اس نے حق کہا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کے قول کی تعبیر لفظ حق کے ساتھ کرتے ہیں۔ جواب دینے والے ملائکہ مقربین ہیں، جیسے جبریل علیہ السلام۔ کلمۂ ﴿ اَلْحَقَّ ﴾ بہ نصب ہے، یعنی "قَالَ جِبْرِيْلُ: قَالَ اللّٰهُ الْحَقَّ لَا الْبَاطِلَ" یا بہ رفع ہے، یعنی "قَوْلُهُ الْحَقُّ" قول سے مراد کلمۂ "کُنْ" ہے، یعنی روزانہ کے حوادث، مثلاً: گناہوں کی بخشش، تکلیف کو دور کرنا، کسی قوم کو سربلندی عطا کرنا اور کسی کو ذلیل کرنا، بیمار کو شفا دینا اور تندرست کو بیماری دینا۔ یا قول سے مراد وہ ہے جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، حق بہ معنی ثابت ہے۔

رہی یہ بات کہ ملائکۂ مقربین نے مجمل جواب دیا جن امور کا حکم جاری کیا گیا ان کی تصریح نہ کی؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غرض ان کے خوف کا دور کرنا ہے، یعنی تم مت گھبراؤ، کیوں کہ یہ قول وہی ہے جو تم کو ہر دن معلوم ہے کہ قضائے شیون ہوتا ہے (یعنی روز مرہ کے کام جاری ہوتے ہیں) یہ وہ نہیں ہے جس کا تم گمان کرتے ہو، یعنی قیامت کا قائم ہونا۔ معنی یہ ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ آسمان میں حکم جاری کرتا ہے تو فرشتے اپنی عاجزی سے اپنے پر مارتے ہیں، گویا وہ قول چکنے پتھر پر ایک زنجیر کے چلنے کی آواز ہے۔

پھر جب ان کے دلوں سے خوف دور کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں: تمھارے رب نے کیا کہا؟ مقربینِ ملائکہ کہتے ہیں کہ اس نے حق کہا اور وہ علی کبیر ہے، چنانچہ مسترق السمع اس بات کو سن لیتے ہیں اور مسترق السمع اس طرح ہیں، بعض ان کے بعض پر۔ سفیان رحمہ اللہ نے اپنے ہاتھ سے وصف کیا، پھر اس کو محرف کیا اور اپنی انگلیوں کے درمیان فرق کیا۔ چنانچہ مسترق السمع (چوری چھپے سننے والا) اس کلمے کو سنتا ہے، پھر اس کو اس کی طرف ڈالتا ہے جو اُس کے نیچے ہے، پھر دوسرا اس کلمے کو اس کی طرف القا کرتا ہے جو اس کے نیچے ہے، یہاں تک کہ وہ اس کا القا ساحر یا کاہن کی زبان پر کرتا ہے۔ پھر کبھی اس کو شہاب پا لیتا ہے اس سے قبل کہ وہ اس کا القا کرے اور کبھی وہ اس کا القا کرتا ہے اس سے پہلے کہ کوئی شہاب اس کو پائے، پھر وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا لیتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کیا اس نے ہم سے فلاں فلاں دن ایسا ایسا نہیں کہا تھا، لہٰذا اس کی تصدیق کی جاتی ہے اس کلمے کے سبب سے جو آسمان سے سنا گیا۔ (یعنی جس شخص نے کاہن کی تصدیق کی، وہ اس سے کہتا ہے جس نے اس کو اس پر ملامت کی تھی)۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے ایک

گروہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عبدالرزاق نے کہا ہے کہ انصار رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ کے پاس (عبدالرزاق امام احمد کے استاد ہیں)۔ چنانچہ ایک تارا مارا گیا، پھر وہ روشن ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کیا کہتے تھے جب کہ جاہلیت میں ایسا ہوتا تھا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بولے: ہم کہتے تھے کہ کوئی بڑا آدمی پیدا کیا جائے گا، یا کوئی بڑا مرے گا۔ امام زہری رحمہ اللہ کے شاگرد معمر نے زہری سے پوچھا: کیا جاہلیت میں تارے مارے جاتے تھے؟ کہا: ہاں، لیکن سخت کیے گئے جب کہ نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے (مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد زیادہ تر شیاطین کا بندوبست کیا گیا)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ کسی کی موت کے لیے نہیں مارے جاتے اور نہ ہی کسی کی حیات کے لیے، لیکن جب ہمارا رب تبارک و تعالیٰ کوئی امر جاری کرتا ہے تو حاملانِ عرش تسبیح کرتے ہیں، پھر اس آسمان والے تسبیح کرتے ہیں جو اُن میں متصل ہیں، یہاں تک کہ دنیا کے آسمان میں تسبیح پہنچتی ہے، پھر حاملانِ عرش سے متصل آسمان والے حاملانِ عرش سے خبر پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟ تو وہ ان کو خبر دیتے ہیں اور ہر اہلِ آسمان وہ خبر دوسرے آسمان والوں کو دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ خبر اس آسمان تک پہنچتی ہے اور جن اس خبر کو جھپٹ لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کو مارا جاتا ہے۔ لہٰذا جس بات کو وہ اصل حالت میں لاتے ہیں وہ حق ہے، لیکن وہ اس میں فرق کر دیتے ہیں اور اس میں اضافہ کر دیتے ہیں۔[1] (هكذا رواه الإمام أحمد وقد أخرجه مسلم في صحيحه بسنده عن ابن عباس رضي الله عنهما وكذا رواه النسائي في التفسير و الترمذي)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے امر کی وحی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وحی کے ساتھ تکلم فرماتا ہے۔ پھر جب وہ تکلم فرماتا ہے تو اس سے آسمانوں کو رجفہ یا رعدۂ شدیدہ پکڑتا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے سخت کانپ جاتے ہیں۔ پھر جب اس کو اہلِ سماوات سنتے ہیں تو بے ہوش ہو جاتے ہیں اور گر پڑتے ہیں اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہوئے۔ چنانچہ سب سے پہلے جو اپنا سر اٹھاتا ہے وہ جبریل علیہ السلام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی اس وحی سے کلام کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ پھر جبریل علیہ السلام اس کو لے کر چلتے ہیں، ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک سارے فرشتوں کے پاس جاتے ہیں، ان سے فرشتے پوچھتے ہیں: اے جبریل! ہمارے رب نے کیا فرمایا؟ وہ کہتے ہیں کہ اس نے حق کہا۔ اور وہ علی! اور کبیر ہے۔ چنانچہ وہ سب ویسے ہی کہتے ہیں جیسا کہ جبریل علیہ السلام نے کہا۔ پھر جبریل علیہ السلام وحی لے کر اس جگہ کی طرف پہنچتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کو امر فرمایا آسمان و زمین سے۔[2] (وكذا رواه ابن جرير وابن خزيمة)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا: میں نے اپنے باپ کو سنا، وہ کہتے تھے: یہ حدیث ولید بن مسلم رحمہ اللہ سے تام

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٢٩) مسند أحمد (٢١٨/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٢٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٣٧٤/٦)

[2] تفسير الطبري (٣٩٧/٢٠ ـ ٣٩٨) التوحيد لابن خزيمة (٣٤٨/١ ـ ٣٤٩)

نہیں ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ حدیث عوفی ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ یہ ابتدائے وحی میں ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس زمانۂ فترت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی، جو زمانہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بے شک یہ اس آیت میں جو بیان ہے اس کی سب سے مناسب تشریح ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

﴿ قُلِ ادْعُوا ﴾ کو بہ کسرِ لام پڑھا ہے اس قاعدے کی بنا پر کہ التقائے ساکنین سے بچنے کے لیے ساکن کو کسرہ دیتے ہیں اور عین کا اتباع کر کے بہ ضم بھی پڑھا گیا ہے، حرفِ دال سکون کے سبب سے ان کے درمیان حاجز غیر حصین ہے۔ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ ﴿ زَعَمْتُمْ ﴾ کے دونوں مفعول محذوف ہیں، اس لیے کہ سیاق ان پر دال ہے، یعنی ''زَعَمْتُمُوْهُمْ آلِهَةً'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، یعنی تو کفارِ مکہ یا علی العموم کفار سے کہہ دے کہ تم پکارو اُن کو جن کو تم نے سوا اللہ کے معبود گمان کیا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: پکارو ان کو، تاکہ تم سے اس ضرر کو دور کریں، جو تم پر سالہائے قحط کی صورت میں نازل ہوا ہے۔[2] چوں کہ یہ امر ان کو جھڑکنے اور ملامت کرنے کے لیے ہے، اس لیے خود اللہ پاک نے ان کی طرف سے یہ جواب دیا کہ وہ ذرہ بھر کے آسمانوں میں مالک نہیں ہیں اور نہ ہی زمین میں کسی کے مالک ہیں، یعنی ان کو خیر و شر پر کسی طرح کی قدرت نہیں ہے اور نہ کسی کو کچھ نفع دینے کی اور نہ کسی سے ضرر کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، کیوں کہ وہ تو محض جمادات ہیں۔ سماوات اور ارض کا ذکر اس لیے کیا کہ مقصود تعمیم ہے، کیونکہ وہ موجوداتِ خارجیہ کے ظرف ہیں۔

﴿ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان معبودوں کو آسمان و زمین میں کسی طرح کی مشارکت نہیں ہے، نہ تو خلق میں نہ ملک میں اور نہ تصرف میں۔ ﴿ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ ﴾ یعنی نہ ان معبودوں میں سے اللہ پاک کے لیے کوئی معین و مددگار ہے کہ اس کی اعانت کرے کسی شے پر ''سمٰوٰت وأرض ومن فیهما'' کے امور میں سے، بلکہ ان کو ایجاد کرنے والا صرف وہی اکیلا ہے، چنانچہ وہی پوجا جاتا ہے اور اس کے غیر کی عبادت محال ہے، پھر وہ جو بتوں کے حق میں کہا کرتے تھے کہ یہ اللہ کے نزدیک ہمارے سفارشی ہیں، اللہ پاک نے ان کے اس قول کی یہ تکذیب فرمائی۔

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ ﴾ استثنائے مفرغ ہے اعم احوال سے، یعنی شفاعت کسی حال میں نفع نہ دے گی، سوائے اس شفاعت کے جو اس شخص کے لیے ہونے والی ہے جس کے لیے وہ ملائکہ اور انبیاء وغیرہم

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/۷۰۲۔۷۰٤)
[2] فتح القدير (٤/٤٢٨)

اہلِ علم وعمل میں سے ان کو اذن دے اور یہ بات معلوم ہے کہ یہ لوگ اسی کے لیے شفاعت کریں گے جو شفاعت کا مستحق ہے نہ کہ کافروں کے لیے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ معنی ہوں کہ ان شفاعت کرنے والوں کی شفاعت جو شفاعت کرنے کے قابل ہیں، کسی حال میں بھی فائدہ نہ دے گی، مگر وہ شفاعت جو اس شخص کے لیے ہو گی جس کے لیے اور جس کے واسطے اللہ پاک اذن دے نہ کہ ان کے علاوہ کسی ایسے شخص کے لیے شفاعت ہو جو شفاعت کے مستحق ہی نہیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ شفاعت اصلاً نہ پائی جائے گی مگر اس کے لیے جس کے لیے وہ اذن دے۔ اور نفی کو جو شفاعت کے فائدے کے ساتھ معلق کیا ہے اور اس کے واقع ہونے کے ساتھ بیان نہیں کیا تو اس سے اس شے کی نفی کی صراحت منظور ہے جو شفاعت کا مقصد ہے۔ ﴿ لِمَنْ ﴾ میں حرفِ لام نفسِ شفاعت سے متعلق ہو سکتا ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس طرح تو کہتا ہے: "شَفَعْتُ لَهُ" یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ تَنْفَعُ ﴾ سے متعلق ہو۔[1] زیادہ مناسب ہے کہ محذوف سے متعلق ہو، یعنی "كَائِنَةً لِمَنْ أَذِنَ لَهُ"۔

جمہور نے ﴿ اَذِنَ ﴾ بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے، یعنی "أَذِنَ لَهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ" اس لیے کہ اللہ پاک کا اسم مبارک اس سے قبل مذکور ہے۔ ابو عمرو وحمزہ وکسائی نے بہ ضمِ ہمزہ بصیغۂ مجہول اور اذن، یعنی اذن دینے والا وہ اللہ پاک ہی ہے۔ پھر اللہ پاک نے ان شفعاء اور ان کے خوف کی خبر دی جن کی شفاعت کی جاتی ہے۔ فرمایا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ جمہور نے ﴿ فُزِّعَ ﴾ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے فاعل اللہ پاک ہے اور جار و مجرور فاعل کے قائم مقام ہے۔ ابن عامر نے "فَزَّعَ" بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے، اس کا فاعل اللہ پاک کی طرف ضمیر راجع ہے۔ دونوں قراءتیں بہ تشدیدِ زائے معجمہ ہیں، "فَعَّلَ" بہ تشدید کے معنی سلب ہیں۔ "تفزیع" فزع وخوف کے دور کرنے کو کہتے ہیں۔

حسن رحمہ اللہ نے بہ تخفیفِ زائے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ نے "فرغ" بہ رائے مہملہ وغینِ معجمہ فراغ سے پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو فارغ کر دیا، مطلب یہ ہے کہ خوف کو ان سے دور کر دیا اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "افرنقع افرنقاع" سے بہ معنی "تفرق" پڑھا ہے۔ قطرب نے کہا: "فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ" کے یہ معنی ہیں کہ فزع اور خوف جو ان کے دلوں میں تھا وہ نکال دیا گیا۔[2] معنی یہ ہیں کہ ملائکہ وانبیاء واصنام جو اللہ پاک کے سوا پوجے گئے ہیں ان میں سے کسی سے شفاعت نہ ہو گی، وہ کوئی ہو۔ مگر یہ کہ اللہ پاک ملائکہ اور انبیاء اور ان جیسے اور لوگوں کو شفاعت کرنے کا اذن دے گا، اس شخص کے حق میں جو شفاعت کا مستحق ہو گا اور شفاعت کرنے والے انتہا درجے کے ڈر اور خوف میں ہوں گے اللہ تعالیٰ سے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٨] "وہ تو خود ہیبتِ الٰہی سے لرزاں وترساں ہیں۔"

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (١٠٦٨/٢) [2] فتح القدير (٤٢٨/٤، ٤٢٩)

پھر جب اللہ پاک ان کو شفاعت کا اذن دے گا تو وہ اس ہولناک امر اور اس حالت کے ساتھ متعلق خوفِ شدید سے گھبرا جائیں گے کہ کہیں ان سے اس بات سے کوئی قصور واقع نہ ہو جائے جس شے میں اللہ پاک نے ان کو اذن دیا ہے۔ یا اقدارِ الٰہی سے کوئی شے واقع ہو جائے۔ پھر جب اُن سے گھبراہٹ دور ہو جائے گی تو فرشتوں سے کہیں گے جو اُن کے اوپر ہیں اور اُن پر اذن کی وحی وارد کرتے ہیں کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ یعنی اللہ نے کس شے کا امر کیا؟ تو وہ اُن سے کہیں گے کہ اللہ نے قولِ حق کہا اور وہ یہ ہے کہ شفاعت کے مستحق لوگوں کے حق میں تمھاری شفاعت قبول ہے اور نہ کہ اُن لوگوں کے حق میں جو شفاعت کے مستحق نہیں ہیں۔

﴿ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴾ چنانچہ اس کو لائق ہے کہ اپنے بندوں میں جو چاہے حکم کرے اور وہ کام کرے جس کا ارادہ فرمائے۔ کسی فرشتے کو اور کسی نبی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس دن کلام کرے، مگر اس کے اذن سے، اور یہ کہ شفاعت کرے، مگر اس کے لیے جس کو وہ پسند کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ فزع فرشتوں کو ہر بات میں ہوتا ہے جس کا رب سبحانہٗ امر فرماتا ہے، معنی یہ ہیں کہ شفاعت نفع نہ دے گی، مگر فرشتوں سے جو آج فزع اور خوف کرنے والے ہیں، اللہ پاک کے مطیع اور فرماں بردار ہیں نہ کہ جمادات اور شیاطین۔ کسی نے کہا کہ جو لوگ ﴿ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ﴾ کہیں گے، وہ "مشفوع لهم" ہیں، یعنی ان کی سفارش کی جائے گی اور جنھوں نے ان کو جواب دیا وہ فرشتوں اور انبیاء میں سے ان کی شفاعت کرنے والے ہیں۔[1] (كذا في فتح البيان)۔ غرضیکہ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو امر کیا کہ مشرکین کو ڈانٹ ڈپٹ کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ
وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲۴ قُلْ
لَّا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔـلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۲۵ قُلْ
يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ الْفَتَّاحُ
الْعَلِيْمُ ۝۲۶ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ كَلَّا ۭ بَلْ
هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۷

کہہ دیجیے: تمھیں آسمانوں اور زمین سے کون رزق دیتا ہے؟ کہہ دیجیے: اللہ (ہی)، اور بلاشبہ ہم یا تم البتہ ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں (24) کہہ دیجیے: جو ہم نے جرم کیا تم سے اس کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا اور نہ ہم سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا جو تم عمل کرتے ہو (25)

[1] فتح البیان (۱۱/۱۸۷-۱۸۹)

کہہ دیجیے: ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا، پھر وہ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا، خوب جاننے والا ہے (26) کہہ دیجیے: تم مجھے وہ (معبود) دکھاؤ، جنھیں تم نے شریک ٹھہرا کر اس (اللہ) کے ساتھ ملا دیا ہے، (ایسا) ہرگز نہیں! بلکہ وہی اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے (27)

اللہ تعالیٰ کسی بھی قسم کے شرک سے پاک ہے:

یا ہم یا تم ہدایت پر ہیں یا گمراہی پر، یعنی دونوں فرقے تو سچے نہیں ہو سکتے، یقیناً ایک سچا ہے اور ایک جھوٹا ہے تو لازمی ہے کہ سوچو اور سچی بات کو پکڑو۔ اس زمانے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ دونوں فرقے ہمیشہ سے چلے ہیں تو کیا آپس میں جھگڑنا ضروری ہے۔ انتہیٰ۔

اللہ پاک یہ بات ثابت فرماتا ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ وہی متفرد ہے اور الٰہیت کے ساتھ بھی وہی منفرد ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کا تو اقرار کرتے تھے کہ اللہ ہی ان کو آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے، یعنی اس پانی کے سبب سے جس کو وہ آسمان سے اتارتا ہے اور زمین سے کھیتی اُگاتا ہے، لہٰذا اسی طرح اس بات کو جان لیں کہ اس کے سوا معبود بھی کوئی نہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ لف ونشر کے باب سے ہے، یعنی دونوں فریق میں سے ایک فریق حق پر ہے اور دوسرا باطل پر ہے۔ اس طرف کوئی امکان نہیں ہے کہ تم بھی اور ہم بھی ہدایت پر ہوں یا ضلالت پر، بلکہ ہم میں سے ایک صحیح راستے پر ہے۔ ہم توحید پر دلیل قائم کر چکے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ جس شرک باللہ پر تم جمے ہوئے ہو وہ باطل ہے اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے مشرکوں سے یہ بات کہی تھی: واللہ! ہم اور تم ایک امر پر نہیں ہیں۔ بے شک ہم دونوں فریق میں سے ایک البتہ ہدایت پر ہے۔ امام عکرمہ اور زیاد بن ابی مریم رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بے شک البتہ ہم ہدایت پر ہیں اور یقیناً البتہ تم کھلی گمراہی میں ہو۔[1]

ہر کوئی اپنے ہی اعمال کا جواب دہ ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ کے معنی ان سے بری و بے زار ہونا ہے، یعنی نہ تم ہمارے نہ ہم تمھارے۔ بلکہ ہم تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی توحید کی طرف بلاتے ہیں کہ صرف تنہا اسی کو پوجو، اگر تم اس دعوت کو قبول کرو تو تم ہمارے اور ہم تمھارے اور اگر تم نے جھٹلایا تو ہم تم سے بری اور

(1) تفسير الطبري (٢٠/٤٠١)

تم ہم سے بری، جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقُلْ لِّىۡ عَمَلِىۡ وَلَـكُمۡ عَمَلُكُمۡ‌ۚ اَنۡـتُمۡ بَرِيۡٓـئُوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [یونس: ٤١] ''اور اگر آپ کو جھٹلاتے رہیں تو یہ کہہ دیجیے کہ میرے لیے میرا عمل اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم میرے عمل سے بری ہو اور میں تمھارے عمل سے بری ہوں۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ ۝ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۝ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۝ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۝ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۝ لَـكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ ﴾ [الکافرون: ١-٦] ''آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! نہ میں عبادت کرتا ہوں اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں عبادت کروں گا اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کر رہا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلۡ يَجۡمَعُ بَيۡنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفۡتَحُ بَيۡنَنَا بِالۡحَـقِّ وَهُوَ الۡفَتَّاحُ الۡعَلِيۡمُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک قیامت کے دن تمام خلائق کو ایک جگہ میں جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرے گا، پھر ہر عامل کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا، اگر اچھا عمل ہے تو اچھا بدلہ اور اگر برا عمل ہے تو برا بدلہ اور اس دن تم ضرور جان لوگے کہ عزت، نصرت اور سعادتِ ابدی کس کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يَوۡمَـئِذٍ يَّتَفَرَّقُوۡنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمۡ فِىۡ رَوۡضَةٍ يُّحۡبَرُوۡنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الۡاٰخِرَةِ فَاُولٰٓـئِكَ فِى الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ ﴾ [الروم: ١٤-١٦] ''اور جس دن قیامت قائم ہو گی اس دن (جماعتیں) الگ الگ ہو جائیں گی۔ جو ایمان لا کر نیک اعمال کرتے رہے وہ تو جنت میں خوش وخرم کر دیے جائیں گے اور جنھوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھوٹا ٹھہرایا تھا، وہ سب عذاب میں پکڑ کر حاضر رکھے جائیں گے۔'' نیز اسی لیے اللہ عزوجل نے یہ فرمایا ہے: ﴿ وَهُوَ الۡفَتَّاحُ الۡعَلِيۡمُ ﴾ یعنی وہ حاکم عادل حقائق الامور کا جاننے والا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلۡ اَرُوۡنِىَ الَّذِيۡنَ اَلۡحَقۡتُمۡ بِهٖ شُرَكَآءَ‌ كَلَّا‌ ﴾ یعنی تم مجھے دکھاؤ یہ معبود جن کو تم نے اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے اور ان کو اس کے برابر کیا ہے۔ ہرگز نہیں اس کا نہ کوئی نظیر ہے نہ شریک نہ اس جیسا، نہ کوئی نِد ہے نہ اس کی برابری کرنے والا اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ بَلۡ هُوَ اللّٰهُ ﴾ یعنی بلکہ وہ اللہ واحد احد ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ﴿ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴾ یعنی وہ ایسی عزت والا ہے کہ جس سے اس نے ہر شے کو مقہور کیا ہے اور ہر شے پر غالب ہوا ہے۔ وہ اپنے افعال واقوال اور شریعت اور تقدیر میں حکمت والا ہے۔ تبارك و تعالیٰ و تقدس عما يقولون علوا كبيرا والله أعلم.[1] كذا في ابن كثير.

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٧٠٥،٧٠٤/٣)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ تو کہہ کہ تم پر ان رزقوں کا انعام کون کرتا ہے جن سے تم فائدہ اٹھا رہے ہو، کیوں کہ تمھارے معبود تو ذرا بھر کے مالک نہیں ہیں؟ آسمان کا رزق تو پانی ہے اور سورج چاند ستارے جن سے فائدہ لیا جاتا ہے اور زمین کا رزق معدنیات و نباتات اور روئے زمین پر ان جیسی اَور چیزیں ہیں۔ چوں کہ کفار اس سوال کے جواب کی قدرت نہیں رکھتے تھے اور نہ ان کی عقلیں اس بات کو قبول کرتی تھیں کہ اس رزق کی نسبت اپنے معبودوں کی طرف کریں اور بسا اوقات اللہ پاک کی طرف اس کی نسبت کرنے میں توقف کرتے تھے، اس خوف سے کہ ان پر حجت قائم ہو جائے، اسی لیے اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ اس کا یہ جواب دیں: ﴿ قُلِ اللّٰهُ ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ وہ اللہ ہی ہے جو آسمان و زمین سے تم کو رزق دیتا ہے۔

پھر آپ ﷺ کو یہ امر فرمایا کہ ان کو اس بات کی خبر دیں کہ وہ گمراہی پر ہیں، لیکن بر طریق انصاف کے حجت میں اس کے بعد کہ جو شخص ہدایت پر ہے اور جو کوئی گمراہی پر ہے، اس کی تقریر سابق ہو چکی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی جو لوگ اللہ خالق و رازق کی توحید کرتے ہیں اور عبادت کے ساتھ اسی کو خاص ٹھہراتے ہیں اور وہ لوگ جو جمادات کو پوجتے ہیں، کون سے جمادات جو نہ پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، نہ رزق دینے کی اور نہ نفع اور نقصان پہنچانے کی۔ ان میں سے دونوں فرقوں میں سے ایک فرقہ یا ہدایت پر ہے یا گمراہی پر اور یہ بات ہر عاقل کو معلوم ہے کہ جو شخص اس ذات پاک کو پوجتا ہے جو پیدا کرتا ہے، روزی دیتا ہے اور نفع اور نقصان دینے والا ہے تو وہی شخص ہدایت پر ہے اور جو کوئی اس کو پوجتا ہے جو نہ پیدا کرنے پر قادر ہے نہ رزق دینے پر اور نہ ہی نفع اور نقصان دے سکتا ہے، وہی گمراہی پر ہے۔

چنانچہ اس تقریر میں دونوں فریق کے متعلق بیان شامل ہے، یعنی ہدایت یافتہ فریق جو مسلمین ہیں اور ضلالت والا فریق جو مشرکین ہیں، اس وجہ پر جو صراحت کے ساتھ نہایت موثر طریقے پر بیان ہوئی ہے اور یہ تقریر ایسا انصاف والا کلام ہے کہ جو کوئی اس کو سنے وہ خواہ موافق ہو یا مخالف تو وہ اس سے یہ کہہ اٹھے گا جس کو خطاب کیا گیا ہے کہ "قَدْ أَنْصَفَكَ صَاحِبُكَ" یعنی تیرے صاحب نے تجھ سے انصاف کی بات کہی۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کلام کے معنی متبصر کے قول، یعنی ایک ایسے شخص کے قول کے معنی ہیں، جو حجت کو جاننے کی بصیرت رکھتا ہو، وہ اپنے صاحب سے اس طرح کہے کہ ہم میں سے ایک جھوٹا ہے، حالاں کہ وہ جان چکا ہے کہ سچا اور صحیح وہی ہے اور اس کا صاحب جھوٹا اور خطا کار ہے۔ انتھی۔

نکتہ

ہدیٰ اور ضلال پر جو دو حرفِ جر داخل ہوئے ان میں مخالفت کی گئی۔ ﴿ هُدًى ﴾ پر "عَلٰی" آیا اور ﴿ ضَلٰلٍ ﴾

پر ﴿ فِيْ ﴾۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحبِ ہدایت تو گویا ایک عمدہ رہوار (گھوڑے) پر سوار ہے، جہاں چاہتا ہے اس کو دوڑاتا ہے اور صاحبِ ضلالت گویا تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے، دیکھتا ہی نہیں کہ کہاں متوجہ ہو۔ مبرد نے کہا کہ کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ بصریوں کے نزدیک اپنے باب پر ہے اور شک کے لیے نہیں ہے، لیکن وہ اس معنی کی بنا پر ہے جس کو عرب لوگ ایسے مقام میں استعمال کرتے ہیں جبکہ مخبر اس بات کا ارادہ نہ کرے کہ بیان کرے اور وہ عالم بہ معنی ہو۔ ابوعبیدہ اور فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ "أو" بہ معنی واو ہے، تقدیر یہ ہے: "وَإِنَّا عَلٰى هُدًى وَإِيَّاكُمْ لَفِي ضَلَالٍ مُبِيْنٍ"[1] یعنی یقیناً ہم ہدایت پر ہیں اور تم البتہ کھلی گمراہی میں ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَوْ اِيَّاكُمْ ﴾ معطوف ہے اسم "إِنَّ" پر اور خبر اس کی وہی مذکور ہے اور ثانی کی خبر حذف کی گئی ہے، اس لیے کہ مذکور اس پر دال ہے: "أَيْ: إِنَّا لَعَلٰى هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُبِيْنٍ أَوْ إِنَّكُمْ لَعَلٰى هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُبِيْنٍ" اور اس کا عکس بھی جائز ہے، یعنی مذکور خبر ہو ثانی کی اور اول کی خبر محذوف ہو، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ﴾ "اللہ اور اس کا رسول رضامند کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔" [التوبة: ٦٢]

پھر اللہ پاک نے اس کلامِ منصف کے بعد ایک اور کلام ذکر کیا جو انصاف میں اس سے بھی زیادہ موثر اور داخل ہے اور جدل و مشاغبہ، یعنی لڑائی اور فتنہ و تباہی سے زیادہ دور ہے۔ فرمایا: ﴿ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی میں تم کو اس شے کی طرف بلاتا ہوں جس میں تمھارے لیے خیر اور نفع ہے اور تمھارے کفر کرنے سے اور میری بات قبول نہ کرنے سے مجھ کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ یہ مثل اس آیت کے ہے: ﴿ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴾۔ جرم کا اسناد تو مسلمانوں کی طرف کیا اور صرف عمل کی نسبت مخاطبین کی طرف کی باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے عمل خالص نیکی سے ہیں اور صرف طاعت سے ہیں اور کفار کے عمل کھلی معصیت اور واضح گناہ سے ہیں۔ ایسا کرنے میں وہ انصاف ہے جس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ مقصود مہاونت و متارکت ہے، یعنی مصالحت۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اور اس جیسی اور آیتیں آیتِ سیف سے منسوخ ہیں۔

پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو عذابِ آخرت کے ساتھ تہدید کریں، لیکن ایسی وجہ پر جس میں تصریح نہ ہو۔ فرمایا: ﴿ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴾ یعنی تو کہہ کہ ہمارے درمیان ہمارا رب قیامت کے دن جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا اور مطیع کو ثواب دے گا اور عاصی کو سزا دے گا اور وہ صحیح اور درست فیصلہ کرنے والا ہے، جو مصلحتیں اس کے فیصلوں کے ساتھ متعلق ہیں، ان کو خوب جانتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت بھی آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ پھر اللہ پاک نے آپ کو حکم دیا کہ ان پر ایک اور حجت وارد کریں، تاکہ اس سے وہ خطا ظاہر ہو جائے جس پر وہ جمے ہوئے ہیں۔

---

[1] فتح القدير (٤/٤٣٠)

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلۡ اَرُوۡنِیَ الَّذِیۡنَ اَلۡحَقۡتُمۡ بِہٖ شُرَکَآءَ ﴾ یعنی تو کہہ کہ تم مجھے وہ لوگ دکھاؤ جن کو تم نے اللہ کے شریک بنا کر اس کے ساتھ ملایا ہے، یہ رویتِ قلبی ہے تو ﴿ شُرَکَآءَ ﴾ تیسرا مفعول ہوگا، کیوں کہ ہمزے کی وجہ سے فعل تین مفعول کی طرف متعدی ہوا ہے: پہلا حرفِ یاء ہے، دوسرا موصول اور تیسرا شرکاء اور عاید موصول کی محذوف ہے، یعنی "أَلْحَقْتُمُوْهُمْ"۔ یہ بھی جائز ہے کہ رویتِ بصری ہو اور فعل بہ سبب ہمزے کے دو مفعول کی طرف متعدی ٹھہرے، پہلا حرفِ یاء، دوسرا موصول اور شرکاء منصوب ہو بنا بر حال۔

رہی یہ بات کہ ان کے بت تو نبی اکرم ﷺ کے روبرو تھے، پھر ان کو بتوں کے دکھانے کا حکم کرنا کیسا ہے۔ چنانچہ اس سے مراد ان کی خطا کو ظاہر کرنا ہے، ان کی رائے کے باطل ہونے پر ان کو مطلع کرنا ہے، یعنی تم مجھے ان کو دکھاؤ، تاکہ میں دیکھوں کہ ان میں کون سی ایسی صفت ہے جو اس کی مقتضی ہوئی کہ عبادت کے مستحق ہونے میں ان کو اللہ کے ساتھ ملحق کیا ہے، اس میں ان کے لیے مزید ڈانٹ ڈپٹ ہے اور تعجیز، یعنی ان کو عاجز کرنا ہے اس کے بعد کہ ان پر حجت قائم کی۔ پھر جن شرکاء کا وہ دعویٰ کرتے تھے، اس کا ان پر رد کیا اور اس کو باطل کیا۔ فرمایا: ﴿ کَلَّا ؕ بَلۡ ہُوَ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴾ یعنی ہرگز نہیں تم مشارکت کے دعویٰ سے باز رہو، بلکہ الٰہیت کے ساتھ وہ اللہ ہی منفرد ہے جو عزیز ہے قہر اور غلبے کے ساتھ اور حکیم ہے حکمتِ باہرہ کے ساتھ۔[1]

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا وَّلٰکِنَّ
اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ
کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۹﴾ قُلۡ لَّکُمۡ مِّیۡعَادُ یَوۡمٍ لَّا تَسۡتَاۡخِرُوۡنَ
عَنۡہُ سَاعَۃً وَّلَا تَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۰﴾

اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿28﴾ اور وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟ ﴿29﴾ کہہ دیجیے: تمھارے لیے ایک ایسے دن کا وعدہ ہے کہ نہ تم اس سے ایک گھڑی پیچھے رہ سکو گے اور نہ تم آگے بڑھ سکو گے ﴿30﴾

رسول اللہ ﷺ کی عالمگیر بعثت کا ذکر:

اللہ پاک اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ سے فرماتا ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ﴾ یعنی نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر ساری خلائق کی طرف جو مکلفین سے ہیں، جیسے اللہ تبارک و تعالیٰ کا قول

[1] فتح البیان (۱۱/۱۹۱۔۱۹۳)

ہے: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ”آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں۔“ اور جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ [الفرقان: ١] ”بہت بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا، تاکہ وہ تمام لوگوں کے لیے آگاہ کرنے والا بن جائے۔“ مطلب یہ ہے کہ جو کوئی تیری اطاعت کرے اس کو تو جنت کی خوش خبری سنا اور جو کوئی تیری نافرمانی کرے اس کو دوزخ سے ڈرا۔

﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ اللہ عزوجل کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [يوسف: ١٠٣] ”گو آپ لاکھ چاہیں لیکن اکثر لوگ ایمان دار نہ ہوں گے۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ١١٦] ”اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں۔“ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ﴾ سے مراد ”عَامَّةً إِلَى النَّاسِ“ ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو عرب و عجم کی طرف بھیجا، چنانچہ ان میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ عزت اور تکریم والا وہ ہے جو اللہ عزوجل کا زیادہ فرماں بردار ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو آسمان والوں پر اور انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی، لوگوں نے عرض کی: اے ابن عباس! کس سبب سے اللہ نے آپ ﷺ کو انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی؟ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ﴾ [إبراهيم: ٤] ”ہم نے ہر ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے، تاکہ ان کے سامنے وضاحت سے بیان کر دے۔“ اور نبی اکرم ﷺ کے متعلق یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ﴾۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنوں اور انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم)۔ یہ جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں مرفوعاً ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں پانچ چیزیں دیا گیا جن کو مجھ سے پہلے کوئی اور نبی نہیں دیا گیا: میں ایک ماہ کی راہ پر رعب کے ساتھ مدد دیا گیا ہوں، میرے لیے زمین مسجد اور طہور کر دی گئی، چنانچہ میری اُمت میں سے جس کو نماز کا وقت آجائے تو چاہیے کہ وہ نماز پڑھ لے جہاں پر بھی ہو۔ اور حلال کی گئیں میرے لیے غنیمتیں اور مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کی گئیں اور میں شفاعت دیا گیا ہوں اور نبی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں مبعوث ہوا ہوں عام لوگوں کی طرف۔[4] نیز صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں بھیجا گیا ہوں ہر کالے اور لال کی طرف۔[5] مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد جن و انس ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا کہ مراد عرب و عجم ہیں، یہ تمام قول صحیح ہیں۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٦٧/١٠) [2] تفسير الطبري (٤٠٥/٢٠) [3] مستدرك الحاكم (٣٨١/٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١). [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

کفار کا قیامت کے بارے میں سوال اور اس کا جواب:

پھر جو کفار قیامت قائم ہونے کو بعید سمجھتے تھے، اللہ پاک نے اس کی خبر دی۔ فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۗ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ [الشوریٰ: ۱۸] ''اس کی جلدی انھیں پڑی ہے جو اُسے نہیں مانتے اور جو اس پر یقین رکھتے ہیں وہ تو اس سے ڈرتے ہیں انھیں اس کے حق ہونے کا پورا علم ہے۔ یاد رکھو! جو لوگ قیامت کے معاملے میں لڑ جھگڑ رہے ہیں، وہ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔''

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴾ یعنی تمھارے واسطے ایک میعادِ مؤجل معدود اور تحریر شدہ ہے نہ زیادہ ہوگی نہ کم، پھر جب وہ آجائے گی تو نہ گھڑی بھر پیچھے ہوگی نہ آگے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ﴾ [نوح: ٤] ''یقیناً اللہ کا وعدہ جب آجاتا ہے تو موخر نہیں ہوتا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴾ [هود: ۱۰٤۔ ۱۰۵] ''اسے ہم جو ملتوی کرتے ہیں وہ صرف ایک مدتِ معین تک ہے جس دن وہ آجائے گی مجال نہ ہوگی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات بھی کر لے، سو ان میں کوئی بد بخت ہوگا اور کوئی نیک بخت۔''[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ كَآفَّةً ﴾ کے نصب میں کئی وجہیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ منصوب ہے بنا بر حال ﴿ اَرْسَلْنٰكَ ﴾ کے کاف سے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں، نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر جامع واسطے لوگوں کے انذار و ابلاغ کے ساتھ۔[2] ﴿ كَآفَّةً ﴾ بہ معنی جامع ہے اور حرفِ ہاء اس میں مبالغے کے لیے ہے مثل عَلَّامَة۔ علامہ ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغت اس قول کی تائید نہیں کرتا ہے،[3] کیوں کہ کف کے معنی جمع کے نہیں ہیں، بلکہ اس کے معنی منع ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "كَفَّ يَكُفُّ أَيْ: مَنَعَ يَمْنَعُ" اس معنی سے ہتھیلی کو کف کہتے ہیں، کیوں کہ جو شے اس میں ہوتی ہے اس کو نکلنے سے منع کرتی ہے، اس بنا پر معنی یہ ہیں: "إِلَّا مَانِعًا لَّهُمْ مِنَ الْكُفْرِ". کسی نے کہا ہے کہ منصوب ہے بنا بر مصدریت اور حرفِ ہاء مبالغے کے لیے ہے، جیسے: عاقبہ و عافیہ، مراد یہ ہے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: إِلَّا رِسَالَةً كَافَّةً" کسی نے کہا ہے کہ "الناس" سے حال ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا لِلنَّاسِ كَافَّةً"

---

[1] تفسير ابن كثير (۷۰٦،۷۰۵/۳)
[2] معاني القرآن (۲٥٤/٤)
[3] البحر المحيط (۲٦۹/۷)

اس قول کو یوں رد کیا ہے کہ مجرور سے جو حال ہوتا ہے وہ اس پر مقدم نہیں ہوتا، چنانچہ علم اعراب میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے، اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ابوعلی فارسی، ابن کیسان، ابن برہان اور ابن ملکون نے اس کو جائز رکھا ہے۔ جن لوگوں نے اس کے مجرور سے حال ہونے کو ترجیح دی ہے، ان میں سے امام ابن عطیہ رحمہ اللہ ہیں۔ کہا ہے کہ اہتمام و تقویٰ کے لیے مقدم کیا گیا ہے، تقدیم حالِ مجرور پر شاہد شاعر کا یہ قول ہے:

إِذَا الْمَرْءُ أَعْيَتْهُ السِّيَادَةُ نَاشِئًا ... فَمَطْلَبُهَا كَهْلًا عَلَيْهِ عَسِيرُ

کسی نے کہا ہے:

تَسَلَّيْتُ طُرًّا عَنْكُمُ بَعْدَ بَيْنِكُمْ ... بِذِكْرَاكُمُ حَتّٰى كَأَنَّكُمُ عِنْدِيْ

کسی نے کہا ہے:

غَافِلًا تَعْرِضُ الْمَنِيَّةُ لِلْمَرْءِ ... فَيُدْعَى وَلَاتَ حِيْنَ إِبَاءِ [1]

(کما قال تعالیٰ: ﴿لَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ﴾۔ لا اور لات حرفِ نفی ہے، حرفِ تاء زیادہ کر دیا ہے)۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے تقدیمِ حال کو مجرور پر رد کیا ہے اور کہا: یہ خطا ہے۔[2] لیکن جمل نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ یہ خطا نہیں ہے، بلکہ مختلف فیہ ہے، چنانچہ جمہور کے نزدیک ناجائز اور ابوعلی وغیرہ کے نزدیک جائز اور صحیح جواز ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: "إِلَّا ذَا كَافَّةٍ أَيْ: ذَا مَنْعٍ" مضاف کو حذف کر دیا ہے۔ ﴿لِلنَّاسِ﴾ میں حرفِ لام بہ معنی "إلى" ہے، یعنی نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو لوگوں کی طرف مگر ان سب کی طرف ان کو ڈرانے اور اللہ کے احکام پہنچانے کے لیے اور ان کو کفر اور معاصی سے روکنے والا بنا کر۔

﴿بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ کا نصب بنا بر حال ہے، یعنی اس حال میں کہ تو خوشی سنانے والا ہے ان کو جنت کی۔ یا فضل کی اس شخص کو جس نے اقرار کیا اور ڈرانے والا ہے ان کو نار سے، یا انصاف کی اس شخص کو جو معصیت پر جما رہا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں اس چیز کو جو اللہ کے پاس ہے اور اس نفع کو جو اُن کے واسطے رسولوں کے بھیجنے میں ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے تیری مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کب ہوگا یہ واقعہ جس کا تم ہم کو وعدہ دیتے ہو، یعنی قیامت کے قائم ہونے کا؟ اگر تم سچے ہو تو ہم کو اس کی خبر دو۔ یہ بات انھوں نے استہزاء کے طور پر کہی، یعنی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے ساتھیوں سے ٹھٹھا کیا۔

چنانچہ اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان کی طرف سے یہ جواب دیں: ﴿لَكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ﴾ یعنی تمھارے لیے ایک دن، یعنی یومِ بعث کی میعاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ موت حاضر ہونے کا وقت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ روزِ بدر مراد ہے، کیوں کہ وہ دنیا میں ان کے عذاب کا دن تھا۔ ہر تقدیر پر ﴿مِيْعَادُ﴾ کی اضافت

---

[1] فتح القدير (٤/٤٣٢) [2] الكشاف (٣/٥٩٢)

﴿ يَوْمٍ ﴾ کی طرف بیانی ہے۔ ﴿ مِيعَادُ ﴾ مصدر ہے بہ معنی وعد، یا اسمِ زمان۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وعد و وعید و میعاد کے ایک معنی ہیں۔ ابن ابی عبلہ نے بہ تنوین و رفع "مِيعَادٌ" ونصبِ "يَوْمًا" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "مِيعَادٌ" مبتداء اور "يَوْمًا" ظرف اور ﴿ لَكُمْ ﴾ خبر ہے۔ اور امام عیسی بن عمرو نے بہ رفع "مِيعَادٌ" مع تنوین اور بہ نصب "يَوْمَ" مضاف طرف جملۂ مابعد کے پڑھا ہے۔[1] اور نحویوں نے "مِيعَادٌ" و "يَوْمٌ" دونوں کو بہ رفع وتنوین اس بنیاد پر جائز رکھا ہے کہ "مِيعَادٌ" مبتداء اور "يَوْمٌ" اس سے بدل ہو اور جملۂ ﴿ لَا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً ﴾ "مِيعَادٌ" کی صفت ٹھہرے۔ یعنی یہ میعاد جو تمھارے لیے مقرر کی گئی ہے، تم مہلت مانگ کر نہ تو اس کی تاخیر چاہو گے اور نہ اس کو جلدی مانگ کر اس کو جلدی کرا دو گے، بلکہ وہ ضرور واقع ہوگی اور اس وقت میں ہوگی، جس وقت کو اللہ نے اس کا واقع ہونا مقدر کر دیا ہے۔ یہ تہدیدی جواب اس عیب جوئی اور سرکشی کے مطابق ہے، جس کا انھوں نے اپنے سوال سے ارادہ کیا تھا۔ پھر اللہ پاک نے کافروں کی قباحتوں کی ایک قسم اور ان کفر کی قسموں میں سے ایک اور قسم کے کفر کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن نُّؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي
بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِندَ رَبِّهِمْ
يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا
لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ۝٣١ قَالَ الَّذِينَ
اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ
بَعْدَ إِذْ جَاءَكُم ۖ بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ ۝٣٢ وَقَالَ الَّذِينَ
اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۚ وَأَسَرُّوا
النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۚ وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ
الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝٣٣

اور جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے کہا: ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ان (کتابوں) پر جو اس سے پہلے آئیں، اور (اے نبی!) کاش آپ دیکھیں! جب ظالم لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، جبکہ ان کا بعض بعض کی بات رد کر رہا ہوگا تو جو لوگ

---

[1] فتح القدير (٤/٤٣٢، ٤٣٣) [2] فتح البيان (١١/١٩٣-١٩٥)

(دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے، وہ ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: اگر تم نہ ہوتے تو یقیناً ہم مومن ہوتے (31) وہ لوگ جو تکبر کرتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو کمزور سمجھے جاتے تھے: کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا جب وہ تمھارے پاس آ گئی تھی؟ بلکہ تم (خود ہی) مجرم تھے (32) اور وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: (نہیں!) بلکہ (تمھاری) رات اور دن کی چالوں ہی نے (ہمیں روکا تھا) جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں اور وہ (سب دل میں) ندامت چھپائیں گے جب عذاب دیکھیں گے، اور ہم ان لوگوں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا، انھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے (33)

انکارِ حق پر کفار کا اکٹھ اور روزِ قیامت باہم جھگڑا:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ کافر لوگ اپنے طغیان، سرکشی، عناد اور دشمنی میں بہت دور تک جا چکے ہیں اور قرآن پر ایمان نہ لانے پر مُصر ہیں اور قرآن نے جو قیامت کے بارے میں خبر دی ہے، اس کے نہ ماننے پر جمے ہوئے ہیں، اسی لیے یہ فرمایا کہ منکر کہنے لگے کہ ہم ہرگز اس قرآن کو اور اس سے اگلی کتابوں کو نہیں مانیں گے۔ اللہ عزوجل نے ان کو تہدید و وعید سنائی اور اپنے لڑنے جھگڑنے کی حالت میں ان کی ذلت اور رسوائی کے ٹھہرنے کی جو جگہیں ہوں گی، ان کی خبر دی کہ ایک کافر دوسرے پر بات ڈالے گا۔ ان میں سے تابع لوگ اپنے سرداروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان دار ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہم کو نہ روکتے تو ہم رسولوں کی پیروی کرتے اور جو وہ لے کر آئے تھے اس پر ایمان لے آتے۔ سرداروں نے یہ جواب دیا کہ ہم نے تمھارے ساتھ اس سے زیادہ نہیں کیا کہ ہم نے تم کو بلایا تو تم بغیر دلیل اور برہان کے ہمارے پیرو ہو گئے اور رسول جو دلائل اور براہین لے کر آئے تم نے اپنی خواہش و اختیار سے ان کی مخالفت کی۔ اسی لیے کہا ہے کہ کوئی اور نہیں بلکہ تمھیں گناہ گار تھے۔ تابع لوگوں نے سرداروں سے کہا: نہیں، بلکہ رات دن تم ہمارے ساتھ مکر کرتے تھے اور ہمیں کفر پر ابھارتے تھے اور ہمیں آرزوئیں دلاتے تھے اور ہم کو خبر دیتے تھے کہ ہم کسی شے پر ہیں، اچانک یہ سب کچھ باطل و جھوٹ اور فریب نکلا۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ "مَكْرُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ"۔[1] اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، یعنی تمھارے رات دن کا مکر یہ تھا کہ تم ہم کو حکم کرتے تھے کہ ہم اللہ کو نہ مانیں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں، یعنی اس کی مثل دوسرے معبود بنائیں اور تم ہمارے لیے شکوک و شبہات قائم

[1] تفسير الصنعاني (٣/١٣٢) تفسير الطبري (٢٠/٢٠٨)

کرتے تھے اور محال چیزیں جن کے ساتھ تم ہم کو گمراہ کرتے تھے۔

﴿ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ﴾ یعنی سردار اور ان کے اتباع سب کے سب چپکے چپکے پچھتانے لگے، جبکہ انھوں نے عذاب دیکھ لیا، ہر ایک اس پر نادم ہوا جو کچھ اس سے گزر چکا ہے۔ اغلال سے مراد وہ زنجیریں ہیں جو اُن کے ہاتھوں کو گردنوں کے ساتھ جمع کر دیں گی۔ ﴿ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی ہم تم کو تمھارے اعمال کا بدلہ دیں گے۔ سرداروں کو ان کے اعمال کے مطابق عذاب ہوگا اور اتباع کو ان کے اعمال کے مطابق عذاب ہوگا۔ فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴾[الأعراف: ۳۸] ''سب ہی کا دوگنا ہے، لیکن تم کو خبر نہیں۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک جب جہنم والے اس کے سامنے ہانکے جائیں گے تو اُن کے سامنے اس کی لپٹ، یعنی آگ کی لپک آئے گی۔ ''ثُمَّ لَفَحَتْهُمْ لَفْحَةً''، یعنی پھر ان کو ذرا سا جلائے گی تو اُن کا سارا گوشت گر پڑے گا، ذرا سا بھی باقی نہ رہے گا۔ وہ گوشت ان کی کھونچوں پر گر پڑے گا۔[1] (رواہ أبي حاتم) نیز حسن بن یحییٰ خشنی سے روایت کیا ہے، کہا: نہیں ہے جہنم میں کوئی گھر اور نہ کوئی غار اور نہ کوئی طوق اور نہ کوئی بیڑی اور نہ کوئی زنجیر، مگر اس کے صاحب کا نام اس پر لکھا ہوا ہے۔ کہا: پھر میں نے یہ حدیث ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ سے بیان کی تو وہ روئے۔ پھر فرمایا: خرابی ہو تیری، پس کیسا حال ہوگا اس کا اگر یہ سب اس پر جمع کیا جائے۔ بیڑی تو اس کے پاؤں میں ڈالی جائے گی اور طوق اس کے ہاتھوں میں اور زنجیر اس کی گردن میں، پھر آگ میں داخل کیا جائے اور غار میں داخل کیا جائے۔ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ، آمین۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ سے مراد مشرکینِ عرب ہیں۔ ﴿ بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ سے مراد کتبِ الٰہیہ ہیں جو قرآن شریف سے پہلے نازل کی گئی ہیں، جیسے: تورات و انجیل۔ یا مراد قیامت ہے یا جنت و دوزخ۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکوں نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ قرآن شریف اللہ پاک کی طرف سے ہو اور اس بات کا کہ وہ جو جزاء کے لیے دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل ہے اس کی کوئی حقیقت ہو۔ پھر جو آخرت میں مشرکوں کا حال ہوگا، اللہ پاک نے اس کی خبر دی، فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ﴾ یہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، یا ہر اس شخص کو جو خطاب کی صلاحیت رکھتا ہے اور ﴿ لَوْ ﴾ کا جواب محذوف ہے، یعنی اگر تو دیکھے کہ جب ظالم لوگ حساب کے لیے کھڑے ہونے کی جگہ میں روکے گئے ہوں گے تو البتہ تو ان کا عجیب و غریب اور برا حال دیکھے گا کہ وہ ایک دوسرے پر ذمہ ڈالتے ہوں گے اور ایک دوسرے کو

---

[1] المعجم الأوسط (۹۲/۱) اس کی سند میں ''محمد بن سلیمان اصبہانی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۵۳۰۲)

[2] تفسير ابن كثير (۷۰۶/۳، ۷۰۷)

ملامت اور لعن طعن کرتے ہوں گے، اس کے بعد کہ دنیا میں ایک دوسرے کے ناصر و مددگار و دوست تھے۔

پھر اللہ پاک نے ان کے باہم گفتگو کرنے کی کیفیت کا یہ بیان کیا، فرمایا: ﴿ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا ﴾ یعنی تابعدار لوگ ان رؤسا سے کہیں گے جن کی پیروی کرتے تھے کہ اگر تم ہم کو اللہ پر ایمان لانے اور اس کے رسول کی پیروی کرنے سے نہ روکتے تو البتہ ہم اللہ پر ایمان لانے والے اور اس کے رسول اور کتاب کو ماننے والے ہوتے۔ رؤسا نے ان کی بات کا انکار کر کے یہ جواب دیا کہ کیا ہم نے تم کو اس وقت ایمان لانے سے منع کیا، جب تمھارے پاس ہدایت آچکی۔ مطلب یہ ہے کہ تابعداروں نے جو ایمان سے روکنے کا دعویٰ سرداروں پر کیا اور ایمان سے روکنے کی نسبت ان کی طرف کی، چنانچہ انھوں نے اس کا انکار کیا، پھر ان سے یہ بیان کیا کہ اپنی جانوں کو روکنے والے اور ہدایت آنے کے بعد اس سے باز رہنے والے خود وہی ہیں۔ چنانچہ کہا: بلکہ تم خود ہی مجرم تھے، یعنی کفر پر اصرار کرنے والے، بڑے بڑے گناہ اور کثرت سے جرم کرنے والے۔

پھر تابعداروں نے سرداروں کی بات کا رد کیا اور اُن کے اضراب (منہ پھیر لینا) کو اپنے اضراب سے اس طرح دور کیا: ﴿ بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾ گویا یوں کہا کہ ہمیں رات اور دن تمھارے مکر وفریب کا سامنا تھا۔ کلامِ عرب میں "مَکْرٌ" کی اصل خدیعت وحیلہ ہے، یعنی دھوکا اور حیلہ سازی۔ جب کوئی شخص کسی سے فریب کاری کرے، اس سے حیلہ گری کرے تو اس وقت محاورے میں کہتے ہیں کہ "مَکَرَ بِهٖ"۔ معنی یہ ہیں: "بَلْ مَكْرُكُمْ بِنَا بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ"، یعنی تمھارا مکر رات دن ہمارے ساتھ رہا۔ مضاف الیہ کو محذوف اور ظرف کو اتساعاً اس کے قائم مقام کر دیا۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: اس تقدیر پر ہے: "هٰذَا مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ". امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: "واللہ أعلم"۔ معنی یہ ہیں کہ بلکہ رات اور دن میں تمھارے مکر نے اور ہم کو کفر کی طرف بلانے نے ہم کو اس پر آمادہ کیا۔ اس پر سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا: بلکہ رات اور دن میں تمھارا عمل۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ رات اور دن مکر کرنے والے ٹھہرائے جائیں بطور اسناد مجازی کے جس طرح کہ علمِ معانی میں ثابت ہو چکا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: جیسا کہ عرب لوگ بولتے ہیں: "نَهَارُهٗ صَائِمٌ وَلَيْلُهٗ قَائِمٌ"[1]

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکر کی اضافت لیل ونہار کی طرف یا تو بطور اسناد مجازی کے ہے مثل ان کے قول کے: "لَيْلٌ مَاكِرٌ"، تو اس صورت میں مصدر مضاف ہوگا اپنے مرفوع کی طرف، یا بطور اتساع کے ہو گی ظرف میں تو مثل مفعول بہ کے ٹھہرایا جائے گا۔ پس مضاف ہوگا اپنے منصوب کی طرف۔ یہ دونوں قول بہتر ہیں اس شخص کے قول سے جس نے کہا ہے کہ اضافت بہ معنی "في" ہے: "أَيْ: فِي اللَّيْلِ"، اس لیے کہ یہ بات غیر متنازعہ طور پر ثابت نہیں ہوئی۔ امام قتادہ اور یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ نے بہ رفع "مَكْرٌ"، منون ونصب "لَيْلًا" پڑھا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "بَلْ مَكْرٌ

[1] تفسیر القرطبي (۳۰۲/۱٤۔ ۳۰۳)

كَائِنٌ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ“ امام سعید بن جبیر اور ابو رزین رحمہ اللہ نے بہ فتحِ کاف وتشدیدِ راء مضاف بہ سوئے لیل پڑھا ہے: ”مَكَرٌّ“ بہ معنی ”كُرُوْرٌ“ ہے ماخوذ ”كَرَّ يَكُرُّ إِذَا جَاءَ وَذَهَبَ“ سے اس قراءت کی بنا پر ”مکر“ مبتداء ہوگا اور خبر محذوف: ”أَيْ: مَكَرُّ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ صَدَّنَا“ یعنی رات اور دن کے آنے جانے نے ہم کو روکا۔ یا اس بنیاد پر مرفوع ہوگا کہ مبتداء محذوف کی خبر ٹھہرے گا، جیسا کہ امام اخفش رحمہ اللہ کا قول مذکور ہے اور طلحہ بن راشد نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی قراءت کے مثل پڑھا ہے، لیکن ”مکر“ کو نصب دیا ہے بنابر مصدریت: ”أَيْ: بَلْ يَكُرُّوْنَ الْإِغْوَاءَ مَكَرًّا دَائِمًا لَا يَفْتَرُوْنَ عَنْهُ“ کسی نے کہا ہے کہ مکر دنیا میں طولِ سلامتی اور اس میں طولِ امل ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ ”مکر“ کا ظرف ہے، یعنی تمھارا مکر یہ تھا کہ جب تم ہم کو حکم کرتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں، یعنی اس کے مشابہ اور امثال ٹھہرائیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: ”نِدُّ فُلَانٍ فُلَانٌ“ کہتے ہیں،[1] یعنی فلاں فلاں کا مثل ہے۔ سردار اپنے اتباع سے کہتے تھے کہ ہمارا دین حق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کذاب اور ساحر ہیں۔ اس میں کفار کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ وہ جو دنیا میں ایک دوسرے کی اطاعت کرتے ہیں، چنانچہ یہ اطاعت آخرت میں ان کی عداوت کا سبب بن جائے گی۔

﴿ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ ﴾ میں ضمیر دونوں فریق کی طرف راجع ہے، یعنی انھوں نے جو کفر کیا اس پر ندامت کو اپنے دلوں میں پوشیدہ رکھیں گے اور اپنے غیر سے اس کو چھپائیں گے، یا ان میں سے ہر ایک دوسرے سے اس کی شماتت (دشمن کی بدحالی پر خوش ہونا) کے خوف سے چھپائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَسَرُّوْا ﴾ بہ معنی ”أَظْهَرُوْا“ ہے، اس لیے کہ اسرار اضداد سے ہے، کبھی تو اس کا معنی اخفا، یعنی چھپانا ہوتا ہے اور کبھی بہ معنی اظہار کے ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کی ندامت ظاہر ہوگی ”أَسِرَّةُ وُجُوْهِ“ میں، یعنی چہرے کے خدوخال میں اور جملہ مستانفہ ہے، یا حال ہے ”اَلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا وَالَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا“ سے۔ اغلال جمع ہے غل کی۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”فِيْ رَقَبَتِهِ غِلٌّ مِنْ حَدِيْدٍ“ یعنی اس کی گردن میں لوہے کی طوق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آگ کے اندر اُن کی گردن میں لوہے کے طوق ڈالے جائیں گے۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ سے مراد وہی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ رہا اظہار مقامِ اضمار میں تو یہ مزید مذمت کے لیے ہے، یا مراد کفار علی العموم ہیں تو وہ لوگ ان میں بدخولِ اولیٰ داخل ہوں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ ”أَيْ: جَزَاءُ مَا كَانُوْا“ یعنی جزا نہیں دیے جائیں مگر اللہ کے ساتھ شرک اور کفر کی اور اُن معصیت کے کاموں کی جن کو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ یا مراد ہے ”بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ“ بنا بر حذفِ خافض۔ جب اللہ پاک نے عرب کے کفار کا حال بیان کیا تو اس کے بعد وہ بات ذکر کی جس میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے اور بیان فرمایا کہ اگلی اُمتوں کا کفر اپنے اپنے رسول کے ساتھ برابر چلا آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

---

[1] فتح القدير (٤/٤٣٤) [2] فتح البيان (١٠/١٩٦_١٩٨)

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ
اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا
وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿٣٥﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَمَآ
اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي
الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ
اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ
شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٣٩﴾

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا (رسول) بھیجا تو اس کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا: بلاشبہ جس چیز کے ساتھ تمھیں بھیجا گیا ہے ہم اس کا انکار کرتے ہیں (34) اور انھوں نے کہا: ہم (تم سے) مال اور اولاد میں زیادہ ہیں اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا (35) آپ کہہ دیجیے: بلاشبہ میرا رب جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہے) تنگ کرتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (36) اور تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایسے نہیں جو تمھیں درجے میں ہمارے قریب کر دیں، مگر (مقرب وہ ہے) جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے اعمال کا دُگنا بدلہ ہے اور وہ بالا خانوں میں امن سے رہیں گے (37) اور جو لوگ ہمیں عاجز کرنے کے لیے ہماری آیتوں (کو جھٹلانے) میں کوشش کرتے ہیں، وہی لوگ عذاب میں حاضر کیے جائیں گے (38) کہہ دیجیے: بے شک میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے (چاہے)، اور تم کوئی چیز بھی خرچ کرتے ہو تو وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے (39)

ہر نبی کی امت کے خوشحال لوگوں کی اس کے خلاف محاذ آرائی:

اللہ پاک اپنے نبی اکرم ﷺ کو تسلی دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ اگلے رسولوں کا اقتداء کریں اور خبر دیتا ہے کہ

کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا گیا، مگر اس کے آسودہ حال لوگوں نے اس کو جھٹلایا اور اس کے کمزور لوگوں نے اس کی پیروی کی، جس طرح کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا: ﴿ اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ١١١] ''کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں؟ تیری تابعداری تو رذیل لوگوں نے کی ہے۔'' نیز کہا: ﴿ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ﴾ [هود: ٢٧] ''تیرے تابعداروں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح طور پر سوائے نیچ لوگوں کے اور کوئی نہیں، جو بے سوچے سمجھے (تمھاری پیروی کر رہے ہیں)۔''

صالح علیہ السلام کی قوم کے بڑے لوگوں نے ضعیف لوگوں سے، جو ایمان لے آئے تھا، یہ کہا: ﴿ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٧٥۔ ٧٦] ''کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بے شک ہم تو اس پر پورا یقین رکھتے ہیں جو اُن کو دے کر بھیجا گیا ہے۔ وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس بات پر یقین لائے ہوئے ہو، ہم تو اس کے منکر ہیں۔'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٥٣] ''اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے تاکہ یہ لوگ کہا کریں کیا یہ لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے ان پر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا ہے۔ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شکرگزاروں کو خوب جانتا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ﴾ [الأنعام: ١٢٣] ''اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں ہی کو جرائم کا مرتکب بنایا تاکہ وہ لوگ وہاں فریب کریں۔'' نیز اللہ تعالیٰ جل وعلا نے فرمایا: ﴿ وَاِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٦] ''اور جب ہم کسی کی ہلاکت کا ارادہ کر لیتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو (کچھ) حکم دیتے ہیں اور وہ اس بستی میں کھلی نافرمانی کرنے لگتے ہیں تو ان پر (عذاب کی) بات ثابت ہو جاتی ہے پھر ہم اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں'' اور اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ ﴾

﴿ نَّذِيْرٍ ﴾ سے مراد نبی یا رسول ہے۔ ''مترفین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو نعمت، جاہ و جلال، دولت اور حکومت والے لوگ ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے جابر قسم کے لوگ اور قائدین اور سردار ہیں، جو شر میں سب کے سردار ہیں۔[1] ﴿ كٰفِرُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس کو نہیں مانتے نہ ہی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابورزین سے روایت کیا ہے، کہا: دو شخص شریک تھے، ان میں سے ایک تو ساحل کی طرف گیا

[1] تفسير الطبري (٢٠/٤٠٩)

اور دوسرا باقی رہا۔ پھر جب نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو اس نے اپنے دوست کو لکھا اور پوچھا کہ اس نے کیا کیا؟ یعنی نبی کریم ﷺ کا کیا حال ہے؟ تو اس نے اس کو جواب میں لکھا کہ قریش میں سے کسی نے اس کی پیروی نہیں کی، اس کی پیروی تو رذیل لوگوں اور مسکینوں نے کی ہے۔ راوی نے کہا کہ اس ساحل والے نے اپنی تجارت چھوڑی، پھر وہ اپنے دوست کے پاس آیا اور کہا کہ تو مجھے وہ شخص بتا۔ راوی نے کہا ہے کہ یہ شخص کتب یا کوئی کتاب پڑھتا تھا، یعنی سابقہ انبیاء کی کتابیں جن میں نبی کریم ﷺ کی صفت لکھی ہے۔ پھر وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: آپ کس طرف بلاتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس اس طرف بلاتا ہوں۔ اس نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا عَلَّمَكَ بِذٰلِكَ؟» یعنی تجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ تو اس نے کہا کہ نہیں بھیجا گیا کوئی نبی مگر اس کی پیروی لوگوں میں سے رذیل اور مسکین لوگوں نے کی۔ راوی نے کہا: چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ کہا: نبی کریم ﷺ نے اس کو کہلا بھیجا کہ اللہ عزوجل نے واقعی اس بات کی تصدیق نازل کی جو تو نے کہی۔[1] اسی طرح ہرقل نے ابوسفیان سے جب ان مسائل کا سوال کیا، ان میں کہا اور میں نے تجھ سے پوچھا کہ اس کی پیروی ضعیف لوگوں نے کی یا ان کے اشراف نے؟ تو تو نے کہا کہ ان کے ضعفاء نے کی اور یہی لوگ رسولوں کے اتباع ہوتے ہیں۔[2]

﴿ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ "مُتْرَفِيْنَ" "مُكَذِّبِيْنَ" نے مال واولاد کی کثرت کی وجہ سے فخر کیا اور اعتقاد کر لیا کہ یہ اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت ہے اور ان کے حال پر اس کی عنایت ہے اور اس بات کا اعتقاد کر لیا کہ وہ اللہ ایسا نہیں ہے کہ دنیا میں ان کو عطا فرمائے، پھر آخرت میں ان کو عذاب کرے۔ "وَهَيْهَاتَ لَهُمْ ذٰلِكَ" یعنی ان کا یہ خیال باطل ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٥٥۔ ٥٦] ''کیا یہ (یوں) سمجھ بیٹھے ہیں؟ کہ ہم جو بھی ان کے مال و اولاد بڑھا رہے ہیں، وہ ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں نہیں) بلکہ یہ سمجھتے ہی نہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ٥٥] ''پس آپ کو ان کے مال واولاد تعجب میں نہ ڈال دیں۔ اللہ کی چاہت یہی ہے کہ اس سے انھیں دنیا کی زندگی میں ہی سزا دے اور ان کے کفر ہی کی حالت میں ان کی جانیں نکل جائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝ كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۷۰۸/۳) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۷۳)

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ [المدثر: ۱۱۔ ۱۷] ''مجھے اور اسے چھوڑ دے جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ہے اور اسے بہت سا مال دے رکھا ہے اور حاضر باش فرزند بھی اور میں نے اسے بہت کچھ کشادگی دے رکھی ہے پھر بھی اس کی چاہت ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ نہیں نہیں، وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔ عن قریب میں اسے ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔''

اللہ پاک نے ان دو باغوں کے مالک کی طرف سے خبر دی ہے کہ وہ مال اور پھل اور اولاد والا تھا، پھر اس سب نے اس کو کچھ نفع نہ دیا، بلکہ اللہ پاک نے آخرت سے پہلے دنیا ہی میں سب کچھ اس سے چھین لیا، اسی لیے اللہ عزوجل نے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ﴾ یعنی وہ مال عطا کرتا ہے جس کو دوست رکھتا ہے اور اس کو بھی جسے دوست نہیں رکھتا۔ پس فقیر کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور آسودہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ حکمتِ تامہ و بالغہ اور حجتِ قاطعہ دامغہ اسی کے لیے ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

پھر فرمایا: ﴿وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى﴾ یعنی تمھارے یہ مال اور اولاد اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ ہم کو تم سے محبت ہے اور ہم کو تمھارے حال پر عنایت ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کی طرف نظر نہیں کرتا، لیکن وہ جو نظر کرتا ہے تو تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال کی طرف کرتا ہے۔[1] (أخرجه الإمام أحمد و رواه مسلم وابن ماجه من حديث كثير بن هشام عن جعفر بن برقان به) اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ یعنی جو شے ہمارے پاس تمھارا درجہ نزدیک کرے گی، وہ ایمان اور عملِ صالح ہے، چنانچہ ان کے لیے نیکی دس گناہ سے سات سو گنا تک بڑھائی جائے گی اور وہ جنت کی بلند منزلوں میں ہر قسم کے خوف اور ایذا سے امن میں ہوں گے اور ہر شے سے جس کا خوف ہوتا ہے، بے خوف ہوں گے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک جنت میں البتہ جھروکے ہیں، ان کا ظاہر ان کے اندر سے دکھائی دیتا ہے اور ان کا اندر ان کے ظاہر سے دکھائی دیتا ہے۔ ایک اعرابی نے کہا کہ وہ کس کے لیے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لِمَنْ طَيَّبَ الْكَلَامَ وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ وَأَدَامَ الصِّيَامَ وَصَلّٰى بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ»[2] یعنی وہ اس کے لیے ہیں، جس نے میٹھی میٹھی باتیں کیں اور کھانا کھلایا اور ہمیشہ روزہ رکھا اور رات کو نماز پڑھی، جبکہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ﴾ یعنی جو لوگ اس بات

---

(1) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵٦٤) مسند أحمد (۵۳۹/۲) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤١٤٣)

(2) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۹۸٤) اس کی سند میں ''عبدالرحمن بن اسحاق'' ضعیف راوی ہے، البتہ یہ روایت دیگر کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ دیکھیں: (صحيح الترغيب والترهيب: ۱۵۰/۱)

میں سعی اور کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکیں اور اس کے رسولوں کی پیروی سے باز رکھیں اور اس کی آیتوں کی تصدیق سے منع کریں تو وہ سب کے سب اپنے اعمال کے مطابق عذاب میں جزا دیے جائیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ﴾ یعنی اس فراخی اور تنگی میں اللہ پاک کی حکمت ہے، اس کے مطابق اس شخص پر مال کی بہت فراخی کرتا ہے اور اس پر تنگی کرتا ہے اور اس پر انتہائی درجے کی تنگی کرتا ہے۔ اس میں اس کی حکمت ہے جس کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢١] ''دیکھ لے کہ ان میں کے ایک کو ایک پر ہم نے کس طرح فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت تو درجوں میں اور بھی بڑھ کر ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔'' یعنی جس طرح وہ دنیا میں متفاوت ہیں کہ یہ شخص تو انتہا درجے کا فقیر ہے اور یہ غنی ہے جس پر فراخی کی گئی ہے، چنانچہ اسی طرح وہ لوگ آخرت میں ہوں گے، یہ تو غرفوں میں اعلیٰ درجوں میں ہے اور یہ سب سے نچلے طبقے میں گہری آگ میں ہے اور یہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش حال تھا، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ فلاح پائی اس شخص نے جو اسلام لایا اور رزق دیا گیا کفاف، یعنی اتنا جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہے اور اللہ نے اس کو اس شے میں قناعت دی جو اس کو دی۔[1] (رواہ مسلم من حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ﴾ یعنی جو کچھ اس شے میں سے خرچ کرو گے جس کا تم کو حکم کیا گیا ہے اور تمھارے لیے اس کو جائز کیا ہے تو وہ تم کو اس کا عوض دنیا اور آخرت میں دے گا، دنیا میں اس کے بدلے مال کے ساتھ اور آخرت میں جزا اور ثواب کے ساتھ، جس طرح کہ حدیث شریف میں ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «أَنْفِقْ أُنْفِقْ عَلَيْكَ»[2] یعنی تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا اور حدیث شریف میں ہے کہ دو فرشتے صبح کرتے ہیں، ان میں سے ہر روز ایک کہتا ہے: «اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا» یعنی الٰہی! تو بخیل کو تلف عطا کر، یعنی اس کے مال کو ہلاک کر دے اور دوسرا کہتا ہے: «اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا»[3] یعنی الٰہی! تو خرچ کرنے والے کو بدل عطا کر اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «أَنْفِقْ بِلَالُ! وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا»۔[4] ''بلال! خرچ کرو اور صاحبِ عرش سے فقر کا خوف نہ کرو۔'' سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «أَلَا إِنَّ بَعْدَ زَمَانِكُمْ هٰذَا زَمَانٌ عَضُوْضٌ يَعَضُّ الْمُؤْسِرُ عَلٰى مَا فِي يَدِهِ حَذَارَ الْإِنْفَاقِ» یعنی خبردار! تمھارے اس زمانے کے بعد زمانۂ عضوض ہے، مالدار اس شے کو جو اس کے ہاتھ میں ہے خرچ کرنے کے خوف سے دانتوں

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٥٤) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٠٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٩٣)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣٧٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠١٠)

[4] المعجم الکبیر (٣٤٠/١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٦٦١)

سے پکڑے گا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴾ [1] (رواہ ابن أبي حاتم وکذا عبدالرزاق)

حدیث شریف میں ہے کہ لوگوں میں سے بدترین لوگ ہر مضطر (مجبور) سے مبایعت (خرید وفروخت) کرتے ہیں، خبردار! مضطرین کی بیع حرام ہے، خبردار! مضطرین کی بیع حرام ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ ہی اس کو بغیر مدد کے چھوڑے، اگر تیرے پاس کوئی معروف ہے، یعنی احسان کرنے کی کوئی چیز تو تو اس کو اپنے بھائی کی طرف رجوع کر، ورنہ پس زیادہ نہ کر اس کی ہلاکت میں، [2] یہ حدیث ابن وجہ سے غریب ہے اور اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم میں سے کوئی اس آیت کی تاویل نہ کرے: ﴿ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴾ جبکہ تم میں سے کسی کے پاس وہ شے ہو جو اس کو قائم کرے، پس چاہیے کہ اس میں میانہ روی کرے، کیوں کہ رزق مقسوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس مال ہو تو اس میں درمیانی چال اختیار کرے، اِسراف نہ کرے۔ [3] (کذا في ابن کثیر)

فتح البیان کا بیان:

﴿ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ﴾ کا جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ قَرْیَةٍ ﴾ سے، اگرچہ نکرہ ہے، لیکن نفی کے تحت میں واقع ہوا ہے۔ ''مُتْرَفِیْنَ'' سے مراد متنعمین، روؤسا، امراء، جابر لوگ اور شر کے قائدین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بستیوں میں سے کسی بستی میں ہم نے کوئی ڈرانے والا نہ بھیجا کہ ان کو ڈرائے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف دلائے، مگر حال یہ ہے کہ اس کے آسودہ حال اور سردار لوگوں نے اپنے رسولوں سے یہی کہا کہ جس ایمان وتوحید کو دے کر تم بھیجے گئے ہو، ہم اس کے منکر ہیں، پھر جو انھوں نے مال اور اولاد کے ساتھ فخر کیا اور اپنی دنیا کی حالت پر دارِ آخرت میں اپنی چال کا قیاس کیا بر تقدیر صحت اس شے کے جس کے ساتھ رسولوں نے ان کو ڈرایا تو اللہ پاک نے ان کے قول کا ذکر فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مال و اولاد کے ساتھ ہم کو تم پر فضیلت دی ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس دین پر ہم ہیں اس کو اللہ نے پسند کیا ہے اور اب جبکہ اس نے دنیا میں ہم پر احسان کیا ہے اور ہم سے راضی ہوا ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک بہت محترم ہیں اور ان کے دنیا کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۷۰۹/۳) الدر المنثور (۷۰۷/۶) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ مکحول رحمہ اللہ کا سماع سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے، نیز سند میں ''کوثر بن حکیم'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (۷۰۹/۳) اس کی سند میں بھی وہی انقطاع ہے اور ضعف ہے جو گذشتہ روایت کی سند میں ہے۔

[3] تفسیر ابن کثیر (۷۰۷/۳۔۷۱۰)

احوال کے پیشِ نظر وہ ان کو عذاب نہیں کرے گا اور یہ خیال کیا کہ اللہ کے نزدیک ان کی عزت و قدر نہ ہوتی تو وہ اُن کو رزق نہ دیتا اور اگر مومن اس کے نزدیک بے قدر نہ ہوتے تو ان کو محروم نہ رکھتا۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کے خیال کو باطل کیا اور اپنے نبی کو حکم فرمایا کہ ان کو جواب دیں جس سے ان کا خیال رد ہو جائے اور اُن کے طمع کا مادہ کٹ جائے اور حق بات ثابت ہو جائے، جس پر اللہ کا امرِ تکوینی چل رہا ہے، چنانچہ فرمایا کہ تو کہہ دے: ﴿ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾ یعنی میرا رب جس شخص کے لیے رزق فراخ کرنا چاہتا ہے اس کے لیے فراخی کرتا ہے اور جس پر رزق تنگ کرنا چاہتا ہے، اس پر تنگی کر دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ پاک کبھی کافر اور نافرمان کو استدراج کے لیے رزق دیتا ہے اور کبھی مومن مطیع کی روزی کو تنگ کر کے اس کا امتحان کرتا ہے، تاکہ اس کا اجر زیادہ ہو۔ صرف روزی کا فراخ کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جس کے لیے روزی فراخ کی گئی ہے اللہ اس سے راضی ہے اور اس کے عمل کو پسند کرتا ہے، نہ ہی روزی کا تنگ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ جس پر تنگی کی گئی ہے، اللہ اس سے راضی نہیں ہے اور نہ اس کے عمل کو پسند کرتا ہے۔ بلکہ یہ سب اس کے مطابق ہے جو اس کی مشیت کا تقاضا ہے، کون سی مشیت جو حکمِ بالغہ پر مبنی ہے، چنانچہ ایسے معاملے میں دارِ آخرت کا دارِ دنیا پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے، لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے، انہیں اکثر لوگوں میں سے وہ شخص ہے جس نے امرِ آخرت کا دنیا پر قیاس کیا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس جواب کی مزید تائید اور تاکید کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَآ أَمْوَٰلُكُمْ وَلَآ أَوْلَٰدُكُم بِٱلَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰٓ ﴾ یعنی اول تو رزق کی فراخی اور تنگی اللہ کی خوشی اور ناخوشی کا باعث نہیں ہے، دوسرے تمھارے مال اور اولاد جن کا تم فخر کرتے ہو، وہ ایسے نہیں ہیں کہ ہمارے نزدیک تمھارا درجہ زیادہ کر دیں۔ لہٰذا تمھارا یہ خیال کہ رزق کی فراخی کا دار و مدار شرف و بزرگی اور عزت ہے اور رزق کی تنگی کا دار و مدار ذلت و خواری ہے، بالکل باطل ہے، بلکہ اکثر پہلی چیز، یعنی رزق کی فراخی استدراج کے لیے ہوتی ہے (یعنی آہستہ آہستہ پکڑ میں لینا) اور دوسری چیز، یعنی رزق کی تنگی آزمائش اور درجات کی بلندی کے لیے ہوتی ہے۔ یہ جملہ مستانفہ اللہ پاک کی طرف سے ہے، لوگوں کو بطریقِ تلوین و التفات اس کے ساتھ خطاب کیا ہے، یعنی پہلے تو سب ضمیریں غائب کی ہیں، یہاں غائب سے خطاب کی طرف التفات کیا، کلام کے انداز کو بدل دیا۔ اس سے منظور حق کو واضح کرنا اور جو کچھ پہلے بیان ہو چکا اس کو ثابت کرنا ہے۔

رہی یہ بات کہ یہاں دو چیزیں، یعنی اموال اور اولاد مذکور ہیں، ان کی صفت مفرد، یعنی "التي" کیسے ہو گی؟ تو اس کی یہ وجہ ہے کہ "التي" کا موصوف خصلت ہے، یعنی تمھارے مال اور اولاد وہ خصلت نہیں ہے کہ ہمارے نزدیک تمھارا درجہ قریب کر دے۔ یا اس کا موصوف جماعت ہے، یعنی تمھارے مال و اولاد کی جماعت وہ جماعت نہیں ہے کہ ہمارے پاس تمھارا مرتبہ نزدیک کر دے، کیوں کہ جمع تکسیر عاقل و غیر عاقل کے ساتھ مونث واحد کا معاملہ برتا

جاتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "التي" اموال و اولاد کی معاً صفت ہے۔ صحیح قول یہی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: "وَمَا أَمْوَالُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰى وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰى"، چوں کہ ثانی کی خبر اول پر دال تھی، اس لیے اول کی خبر کو حذف کر دیا جس طرح کہ اس شعر میں ہے:

نَحْنُ بِمَا عِنْدَنَا وَأَنْتَ بِمَا عِنْدَكَ رَاضٍ وَالرَّأْيُ مُخْتَلِفٌ

یعنی "نَحْنُ بِمَا عِنْدَنَا رَاضُوْنَ"۔ کسی نے "بِالَّذِيْ" پڑھا ہے: "أَيْ: بِالشَّيْءِ الَّذِيْ يُقَرِّبُكُمْ" اور غیر قرآن شریف میں "بِاللَّتَيْنِ وَبِاللَّاتِيْ وَبِاللَّوَاتِيْ وَبِالَّذِيْ" جائز ہے خاص طور پر اولاد کے لیے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ زُلْفٰى ﴾ بہ معنی "قُرْبٰى" ہے اور "زُلْفَةٌ" بہ معنی "قُرْبَةٌ"۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ زُلْفٰى ﴾ اسم مصدر ہے۔ گویا یوں کہا: "بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا تَقْرِيْبًا"۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ زُلْفٰى ﴾ مصدر ہے، یعنی مفعول مطلق عامل کے معنی سے۔ تقدیر یہ ہے: "تُقَرِّبُكُمْ قُرْبٰى"۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے "زُلَفٌ" بہ فتحِ لام وتنوین پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "زُلْفَةٌ" کی جمع ہے، جیسے "قُرْبَةٌ" کی جمع "قُرَبٌ" ہے۔ جمع مصدر کی بہ سبب اختلافِ انواع کے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا ﴾ یا تو استثنائے منقطع ہے تو محلِ نصب میں ہو گا، یعنی "لٰكِنْ مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا"۔ انقطاع کی وجہ یہ ہے کہ خطاب کفار کو ہے، مومنین اس میں داخل نہیں ہیں۔ یا محلِ جر میں ہے بنا بر بدل ﴿ اَمْوٰلُكُمْ ﴾ کی ضمیر سے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو غلط کہا ہے، اس لیے کہ کاف و میم مخاطب کے لیے ہے۔ چنانچہ بدل جائز نہیں اور اگر یہ جائز ہوتا تو "رَأَيْتُكَ زَيْدًا" بھی جائز ہوتا۔ اس کا یوں جواب دیا ہے کہ امام اخفش اور کوفیوں نے اس کو جائز رکھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے بھی مثلِ قولِ زجاج رحمہ اللہ کے کہا ہے اور امام فراء رحمہ اللہ نے یہ بھی جائز رکھا ہے کہ محلِ رفع میں ہو ان معنوں میں کہ "مَا هُوَ إِلَّا مَنْ آمَنَ" بنا بر ابتداء اور خبر "فَأُولٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ"۔[2] کسی نے کہا ہے کہ استثناء متصل ہے، اس بنا پر کہ خطاب کافرین اور مومنین کو عام ٹھہرایا جائے۔ یا اس بنیاد پر کہ ابتدائے کلام ہے، ان کے لیے نہیں کہا گیا ہے، معنی یہ ہیں: نہیں ہیں اموال و اولاد کہ قریب کریں کسی کو مگر مومن صالح، جس نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور اولاد کو خیر کی تعلیم دی اور ان کی تربیت صحیح طریقے سے کی۔

﴿ فَاُولٰٓئِكَ ﴾ کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ جمع اس کے معنی کے اعتبار سے ہے، جس طرح کہ ﴿ اٰمَنَ وَعَمِلَ ﴾ میں اس کے لفظ کا اعتبار کر کے مفرد کہا ہے، یہ مبتداء ہے۔ ﴿ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ ﴾ مبتداء اور خبر مل کر اس کی خبر ہے، یعنی جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے تو وہی ہیں جن کے واسطے جزائے زیادت ہے۔

[1] تفسير القرطبي (١٤/٣٠٥) [2] فتح القدير (٤/٤٣٦)

زیادت سے مراد وہ ہے جس کا ذکر اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [الأنعام: ١٦٠] ''جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس گنا ملیں گے۔'' ضعف کی طرف جزاء کی اضافت مفعول کی طرف مصدر کی اضافت ہے، یعنی تضعیف کی جزاء حسنات کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضعف کی جزا دے گا۔ یا موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے، یعنی ان کے لیے جزائے مضاعف ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ ان کے لیے جزائے اضعاف ہے، اس لیے کہ ضعف جمع کے معنی میں ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ تضعیف حسنہ کی۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: جبکہ مرد غنی تقی ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کا اجر دو بار دے گا اور یہ آیت پڑھی: ﴿فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ﴾ تک اور کہا کہ تضعیف حسنہ ہے۔[1] ﴿بِمَا عَمِلُوْا﴾ میں حرفِ با سببیہ ہے، یعنی ان کو جو جزائے ضعف ملے گی تو ان کے اعمالِ صالحہ کے سبب سے ہوگی جو انھوں نے کیے۔

﴿وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ﴾ اور وہ جنت کے جھروکوں میں ہر اس شے سے امن میں ہوں گے جو ہول میں ڈالنے والی ہے اور مشغول کرنے والی ہے اور مکروہ ہے۔ جمہور نے ﴿جَزَآءُ الضِّعْفِ﴾ کو باضافت پڑھا ہے اور زہری، یعقوب، نصر بن عاصم اور قتادہ رحمہم اللہ نے دونوں کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ ضعف بدل ہے ﴿جَزَآءُ﴾ سے۔ اور یعقوب سے ''جَزَآءً''، منصوب و تنوین کے ساتھ اور ''الضِّعْفُ'' بہ رفع مروی ہے، بایں تقدیر ''فَأُولٰئِكَ لَهُمُ الضِّعْفُ جَزَاءً'' یعنی ''حَالَ كَوْنِ الضِّعْفِ جَزَاءً''۔ جمہور نے ''غُرُفَات'' کو بہ جمع پڑھا ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، اس لیے کہ قرآن شریف میں دوسری جگہ اس طرح آیا ہے: ﴿لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا﴾ [العنکبوت: ٥٨] ''انھیں ہم یقیناً جنت کے بالا خانوں میں جگہ دیں گے۔''

امام اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور خلف رحمہم اللہ نے ''فِي الْغُرْفَةِ'' واحد کے صیغے سے پڑھا ہے، اس لیے کہ دوسری جگہ: ﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ﴾[2] [الفرقان: ٧٥] ''یہی وہ لوگ ہیں جنھیں جنت کے بلند بالا خانے دیے جائیں گے۔'' آیا ہے۔ اور واحد کو جمع کے معنی میں لیا ہے۔ الف ولام کو جنس پر محمول کیا ہے۔ یہ قراءتِ سبعیہ ہے۔

پھر جب اللہ پاک مومنوں کا حال بیان کر چکا تو کافروں کا حال ذکر کیا، ارشاد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ﴾ یعنی جو لوگ ہماری آیتوں کے رد کرنے میں سعی کرتے ہیں اور ان کے باطل کرنے میں اور اُن میں طعن کرنے میں کوشش کرتے ہیں، اس حال میں کہ ہم سے مسابقت کرنے والے ہیں اور اس بات کا زعم کرنے والے ہیں کہ وہ اپنی جانوں کو لے کر ہم سے فوت ہو جائیں گے، ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے، یا دشمنی کرنے والے ہیں ہم سے اپنے کفر کے ساتھ، وہی لوگ جہنم کی آگ میں حاضر کیے جائیں گے۔ زبانیہ فرشتے ان کو دوزخ کے پاس لے جا کر حاضر کریں گے، وہ اس سے کوئی بھاگنے کی جگہ نہ پائیں گے۔

[1] الدر المنثور (٧٠٥/٦) [2] تفسير القرطبي (٣٠٦/١٤) فتح القدير (٤٣٦/٤)

رزق کی فراخی اور تنگی کا ذکر جو پہلے ہو چکا ہے۔ پھر اللہ پاک نے حجت کی تاکید کے لیے اور کفار کے قول کو رد کرنے کے لیے اس کا دوبارہ ذکر کیا۔ فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ﴾ یعنی جس کے لیے چاہتا ہے فراخی کرتا ہے اور جس پر چاہتا ہے تنگی کرتا ہے۔ اس میں نیک بختی اور بدبختی پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ قاری نے کہا: یہ آیت ایک شخص کے حق میں ہے باعتبار دو وقت کے، یا مومن کے بارے میں ہے، اور پچھلی آیت دو آدمیوں کے حق میں ہے یا کافر کے بارے میں، اس معنی کے اعتبار سے کچھ تکرار نہیں ہے۔ اسی کے مثل تفسیر بیضاوی میں بھی ہے۔[1] امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلکہ اس میں تقریر ہے، کیوں کہ توسیع وتقتیر (تنگی) نہ تو کرامت کے لیے ہیں نہ ذلت کے لیے، اس لیے کہ اگر بات اس طرح نہ ہوتی تو ان دونوں کے ساتھ ایک شخص متصف نہ ہوتا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ خرچ کرتے ہو اپنی جانوں پر یا اپنے عیال پر یا جو خیرات کرتے ہو، چنانچہ اللہ خلیفہ کرتا ہے اس کا تم پر، یعنی اس کا عوض دیتا ہے، جبکہ وہ خرچ فضول خرچی میں نہ کیا گیا ہو۔ جب کوئی شخص کسی کو اس کا عوض و بدل دیتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "أَخْلَفَ لَهٗ وَعَلَيْهِ"۔ اللہ پاک کا عوض دینا یا تو دنیا میں ہے یا آخرت میں یا دونوں میں معاً، یا جلدی دیتا ہے مال عطا کر کے، یا قناعت عطا فرماتا ہے، کون سی قناعت وہ جو ایسا خزانہ ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یا دیر کرتا ہے، آخرت میں ایسا ثواب دے گا کہ اس کے مقابلے میں ہر بدلہ ہیچ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بدلہ دنیا و آخرت میں ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں کم کیا صدقے نے مال سے اور نہیں زیادہ کیا اللہ نے کسی بندے کو بہ سبب عفو کے مگر عزت میں اور نہیں عاجزی کی کسی نے اللہ کے لیے مگر اللہ نے اس کو بلند کیا۔[3] (أخرجه مسلم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے، یعنی "فِيْ غَيْرِ إِسْرَافٍ وَّلَا تَقْتِيْرٍ"۔ امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[4] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ہر شے جو بندے نے خرچ کی نفقہ سے، پس اللہ پر ہے اس کا خلف یعنی عوض، درآں حالیکہ وہ ضامن ہے، مگر نفقہ بنیان میں، یا کسی معصیت میں۔[5] (أخرجه الدارقطني والبيهقي وأخرج نحوه ابن عدي في الكامل و البيهقي من وجه آخر عنه مرفوعاً باطول منه) مطلب یہ ہے کہ حاجت سے زیادہ مکان بنانے میں اور گناہ میں خرچ کرنے کا عوض اللہ پاک نہیں دیتا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے کہ بے شک ہر دن کے لیے ایک نحوست ہے، چنانچہ تم اس دن کی نحوست کو صدقے کے ساتھ دور کرو۔ پھر فرمایا: تم پڑھو مواضع خلف کو۔ بے شک

---

① تفسير البيضاوي (٤٠٤/٤) ② حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٢٠٧/٧)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٨) ④ شعب الإيمان (٢٥١/٥)

⑤ شعب الإيمان (٣٩٢/٧) الدر المنثور (٧٠٦/٦، ٧٠٧)

میں نے سنا ہے رسول اللہ ﷺ کو کہ فرماتے تھے: «وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ» جبکہ وہ خرچ نہ کریں گے تو خلف کیوں کر دے گا؟! (أخرجه ابن مردویه) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «إِنَّ الْمَعُوْنَةَ تَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ عَلٰى قَدْرِ الْمُؤْنَةِ»[1] (أخرجه الحكيم الترمذي في نوادر الأصول) یعنی بقدر خرچ کے آسمان سے مدد نازل ہوتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ یعنی اللہ پاک بہتر روزی دینے والا ہے، کیوں کہ بندے جو ایک دوسرے کو روزی دیتے ہیں تو یہ اللہ ہی کی تیسیر و تقدیر سے ہے، حقیقت میں وہ رازق نہیں ہیں، بلکہ بطور مجاز جس طرح کہ مرد کے حق میں کہتے ہیں کہ وہ اپنے عیال کو رزق دیتا ہے اور امیر کے بارے میں بولتے ہیں کہ وہ اپنے لشکر کو روزی دیتا ہے، حالاں کہ رازق امیر و مامور و کبیر و صغیر کا وہی ہے، جو اُن سب کا خالق ہے اور بندوں میں سے جس کسی نے اپنے غیر کو کوئی شے نکال کر دے دی تو یہ اسی میں سے ہے جو اللہ نے اس کو رزق دیا ہے اور اس کے ہاتھ پر جاری کیا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَوْجَدَنِي، وَجَعَلَنِي مِمَّا يَشْتَهِي فَكَمْ مِنْ مُشْتَهٍ لَا يَجِدُ وَكَمْ مِنْ وَّاجِدٍ لَا يَشْتَهِي" یعنی حمد ہے اس اللہ کو جس نے مجھے آسودہ کیا اور ان لوگوں میں سے ٹھہرایا جو اس کی نعمتوں سے لذت لیتے ہیں اور ان کی خواہش رکھتے ہیں۔ پس کتنے ہیں کہ خواہش رکھتے ہیں اور خواہش کی شے نہیں پاتے اور کتنے ہیں کہ سب شے میسر ہے مگر خواہش نہیں رکھتے۔[2]

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝

اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر وہ فرشتوں سے کہے گا: کیا یہی لوگ تمھاری عبادت کیا کرتے تھے؟ (40) وہ کہیں گے: تو پاک ہے، تو ہی ان کے ماسوا ہمارا کارساز ہے، بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے، ان کے اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے (41) چناں چہ (کہا جائے گا:) آج تمھارا کوئی بھی کسی کے لیے کسی نفع و نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا، اور ہم ان ظالموں (مشرکوں) سے کہیں گے: اس آگ کا عذاب چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے (42)

---

[1] الدر المنثور (٦/٧٠٧) [2] فتح البیان (١١/١٩٩-٢٠٣)

روزِ قیامت فرشتوں کا اپنے عبادت گزاروں سے اعلانِ براءت:

اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ قیامت کے دن ساری مخلوق کے روبرو مشرکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرے گا۔ فرشتوں سے پوچھے گا، وہ فرشتے جن کے بارے میں مشرک یہ زعم کیا کرتے تھے کہ وہ انداد (شریکوں) کو پوجتے ہیں جو فرشتوں کی صورتوں پر ہیں، تاکہ وہ اللہ کے پاس ان کا درجہ نزدیک کر دیں۔ چنانچہ فرشتوں سے فرمائے گا: کیا یہ لوگ تم کو پوجتے تھے، یعنی تم نے ان کو اپنی عبادت کا حکم کیا تھا؟ جس طرح کہ اللہ پاک نے سورۃ الفرقان میں فرمایا ہے: ﴿ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِیْلَ ﴾ [الفرقان: ١٧] ”کیا میرے ان بندوں کو تم نے گمراہ کیا یا یہ خود ہی راہ سے گم ہوگئے ہیں۔“ نیز جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا: ﴿ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ ﴾ [المائدۃ: ١١٦] ”کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی اللہ کے علاوہ معبود قرار دے لو! عیسیٰ عرض کریں گے کہ میں تو تجھ کو منزہ سمجھتا ہوں، مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں۔“

اسی طرح فرشتے کہیں گے: ﴿ سُبْحٰنَكَ ﴾ یعنی تو اس سے برتر و پاک ہے کہ تیرے ساتھ کوئی معبود ہو۔ ﴿ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ﴾ یعنی ہم تو تیرے بندے ہیں، ہم بری ہوتے ہیں تیری طرف ان لوگوں سے: ﴿ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ﴾ جن سے مراد شیاطین ہیں، کیوں کہ انھوں نے بتوں کی عبادت انھیں اچھی کر دکھائی اور ان کو گمراہ کیا۔ ﴿ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ اکثر اُن کے انہیں پر یقین لانے والے ہیں، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا وَ اِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا ۝ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ﴾ [النساء: ١١٧۔ ١١٨] ”یہ تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر صرف عورتوں کو پکارتے ہیں اور دراصل یہ صرف سرکش شیطان کو پوجتے ہیں جسے اللہ نے لعنت کی ہے۔“

اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ﴾ یعنی آج کے دن تمھارے لیے کوئی نفع واقع نہ ہوگا ان انداد (شریکوں) اور اوثان (بتوں، آستانوں) سے جن سے تم نفع کی اُمید رکھا کرتے تھے اور ان کی عبادت کو تم نے اپنی سختیوں اور تکلیفوں کے لیے ذخیرہ رکھ چھوڑا تھا، آج وہ تمھارے لیے نہ بھلے کے مالک ہیں نہ بُرے کے۔ ﴿ وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ﴾ یعنی مشرکوں سے لعنت ملامت کے لیے یہ کہا جائے گا: ﴿ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴾[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴾ متصل ہے

[1] تفسیر ابن کثیر (٧١٠/٣)

﴿ وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ ﴾ [السبا: ۳۱] سے، یا کلمہ ﴿ یَوْمَ ﴾ ظرف ہے "اُذْکُرْ" محذوف کا، یعنی بنا بر قولِ اول۔ نیز کبھی تو دیکھے ان کو جس دن اللہ تعالیٰ حساب کے لیے ان سب کو جمع کرے گا، یعنی عابد و معبود کو اور مستکبر و مستضعف کو اور مشرکین اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں کو۔ اُن کی ڈانٹ ڈپٹ کے لیے فرشتوں سے فرمائے گا: کیا یہ لوگ تم کو پوجتے تھے، جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا۔ خاص کر فرشتوں کا ذکر کیا باوجود اس کے کہ بعض نے ان کے سوا شیاطین اور بتوں کو پوجا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے مشرکین کے معبودوں میں سے اشرف ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ فرشتے جب ان کو جھٹلائیں گے تو اس جھٹلانے میں مشرکوں کے لیے تبکیت (سرزنش، حجت میں غالب آنا) اور کافروں کے لیے تقریع (سرزنش) ہوگی،[1] جس طرح کہ اس مثال میں ہے: "إِيَّاكِ أَعْنِي فَاسْمَعِي يَا جَارَةُ"، یعنی میں جو دوسرے پر ڈھال کر کہہ رہا ہوں اس سے میری مراد تو ہی ہے تو تُو سن اے پڑوسن!

جملہ ﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ﴾ مستانفہ ہے، جواب ہے سوالِ مقدر کا۔ مثلاً کسی نے کہا کہ فرشتوں نے کیا جواب دیا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ انھوں نے یوں کہا کہ تو پاک ذات ہے، ہم تو تجھی کو دوست رکھتے ہیں اور تیرے ہی مطیع ہیں اور تجھی کو پوجتے ہیں، ہم تیری ہی طرف ہیں نہ ان کی طرف، ہم نے ان کو اپنا عابد نہیں ٹھہرایا، نہ ہم نے ان سے دوستی رکھی اور نہ تیرے سوا ہمارا کوئی ولی اور دوست ہے۔ پھر مشرکین جس کو پوجتے تھے، اس کی تصریح کی۔ چنانچہ کہا: بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے، مراد شیاطین ہیں، یعنی ابلیس اور اس کے لشکر اور گمان کرتے تھے کہ وہ ان کو دیکھتے ہیں اور وہ فرشتے ہیں اور وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ کسی نے کہا کہ شیاطین بتوں کے جوف (پیٹ) میں گھس جاتے اور اس میں سے ان کے ساتھ بات چیت کیا کرتے تھے۔

﴿ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اکثر مشرکین جنوں پر یقین لاتے اور جو کچھ وہ ان سے کہتے، اس میں ان کی تصدیق کیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا کہ "أَكْثَرُ" کل کے معنی میں ہے۔ ﴿ بَعْضُكُمْ ﴾ سے مراد معبودین اور ﴿ لِبَعْضٍ ﴾ سے مراد عابدین ہیں۔ نفع سے مراد شفاعت اور نجات ہے اور ضر سے مراد عذاب اور ہلاکت ہے۔ یہ بات جو اُن سے کہی کہ آج کے دن معبود لوگ عابدوں کے لیے کسی بھلے برے کے مالک نہیں ہیں تو اس کا مقصد اُن کے عجز و مقصود کا ظاہر کرنا اور ان کے عابدوں کے لیے سرزنش اور ناراضی کا اظہار ہے۔ ﴿ وَلَا ضَرًّا ﴾ میں مضاف محذوف ہے: "أَيْ: لَا يَمْلِكُونَ لَهُمْ دَفْعَ ضَرٍّ"۔ ﴿ فَالْیَوْمَ ﴾ میں حرفِ فاء اس لیے نہیں ہے کہ اس کے بعد کا حکم ملائکہ کے جواب پر ترتیب دیا گیا ہے، کیوں کہ وہ تو حق بات ہے وہ یہ جواب دیں یا نہ دیں، بلکہ اس کے مابعد کی ترتیب اس پر اخبار کے لیے ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبي (۳۰۹/۱۴)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴾ معطوف ہے ﴿ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ ﴾ پر، یعنی اللہ پاک فرشتوں سے تو قولِ مذکور فرمائے گا اور جن لوگوں نے غیر اللہ کو پوج کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، ان سے اس طرح کہے گا کہ چکھو عذاب آگ کا جس کی تم دنیا میں تکذیب کیا کرتے تھے۔ (كذا في فتح البيان)[1] پھر اللہ پاک نے کفار کے انواعِ کفر سے ایک اور نوع ذکر کی، چنانچہ فرمایا:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ وَقَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ مُّفْتَرًى وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٣﴾ وَمَا آتَيْنَاهُم مِّن كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِن نَّذِيرٍ ﴿٤٤﴾ وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥﴾

اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں (تو) وہ کہتے ہیں: یہ ایک ایسا آدمی ہی تو ہے جو چاہتا ہے کہ تمھیں ان (معبودوں) سے روک دے جن کی تمھارے باپ دادا عبادت کیا کرتے تھے اور وہ کہتے ہیں: یہ (قرآن) ایک گھڑا ہوا جھوٹ ہی تو ہے اور جب ان کافر لوگوں کے پاس حق آیا تو انھوں نے اس کے بارے میں کہا: یہ تو کھلا جادو ہے (43) اور ہم نے ان (مشرکینِ عرب) کو کوئی کتابیں نہیں دی تھیں کہ وہ انھیں پڑھتے ہوں اور ہم نے آپ سے پہلے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا (بھی) نہیں بھیجا (44) اور ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی (حق کو) جھٹلایا تھا، جبکہ یہ تو اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچتے جو ہم نے ان کو دیا تھا، پس انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو کیسا ہوا ان پر میرا (عبرت ناک) عذاب؟ (45)

کفار کی انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں غلط بیانیاں اور ان کا جواب:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ کفار اس کی طرف سے سزا اور دردناک عذاب کے مستحق ہیں، اس لیے کہ جب ان کے پاس اس کی کھلی آیات پڑھی جائیں، اور وہ اس کے رسول ﷺ کی تر و تازہ زبان سے سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

[1] فتح البیان (١١/٢٠٣۔٢٠٤)

نہیں ہے یہ مگر ایک مرد جو چاہتا ہے کہ تم کو اس سے روکے جس کو تمھارے باپ دادا پوجتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ دینِ حق ان کے باپ دادوں ہی کا دین ہے اور جو کچھ رسول ان کے پاس لے کر آیا ہے وہ باطل ہے۔ علیھم و علی آباء ھم لعائن اللّٰہ تعالی۔ اور کہا کہ نہیں ہے یہ قرآن مگر جھوٹ باندھ لیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ ...الآیة ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب عرب پر نازل کی، نہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے ان کی طرف کوئی نبی بھیجا اور وہ اس کو محبوب رکھتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ اگر کوئی نذیر ہمارے پاس آتا یا کوئی کتاب ہم پر اتاری جاتی تو ہم زیادہ تر راہ یاب ہوتے اپنے غیر کی نسبت۔ پھر جب اللہ پاک نے ان پر اس کا احسان کیا تو اس کو جھٹلایا اور اس کے منکر ہوئے، اس سے عناد کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ ﴾ سے مراد دنیا کی قوت ہے۔ اسی طرح امام قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے،[1] جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ٢٦] ''اور بالیقین ہم نے (قومِ عاد) کو وہ مقدور دیے تھے جو تمھیں تو دیے بھی نہیں اور ہم نے انھیں کان آنکھیں اور دل بھی دے رکھے تھے۔ لیکن ان کے کانوں اور آنکھوں اور دلوں نے انھیں کچھ بھی نفع نہ پہنچایا، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرنے لگے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی ان پر الٹ پڑی۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً ﴾ [المؤمن: ٨٢] ''کیا انھوں نے زمین میں چل پھر کر اپنے سے پہلوں کا انجام نہیں دیکھا؟ جو ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں سخت۔'' یعنی ان سب چیزوں نے ان سے اللہ کے عذاب کو دور نہیں کیا بلکہ: ﴿ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ [محمد: ١٠] ''اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔'' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو ملیا میٹ کر دیا، جس طرح کہ انھوں نے اس کے رسولوں کی تکذیب کی۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ یعنی پھر میرا اعقاب اور نکال (سزا) کیسا رہا، اور میرے رسولوں کے لیے مدد کیسی رہی!![2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جب ان پر ہماری آیتیں یعنی آیاتِ قرآنی پڑھی جائیں، اس حال میں کہ ان کی دلالتیں واضح ہیں اور ان کے معانی ظاہر ہیں اور توحید کو بیان کرتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ان کو پڑھنے والا، یعنی نبی کریم ﷺ صرف ایک مرد ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان بتوں سے روکے جن کو تمھارے آباء و اجداد پوجا کرتے تھے۔ دوسری دفعہ

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٤١٦۔ ٤١٧) [2] تفسير ابن كثير (٣/ ٧١٠۔ ٧١١)

یوں کہا: نہیں ہے یہ یعنی قرآنِ کریم مگر ﴿ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ﴾۔ ﴿ اِفْكٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ فی نفسہٖ جھوٹ، یعنی واقع کے مطابق نہیں۔ ﴿ مُّفْتَرًى ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پر باندھ لیا گیا ہے، اس طرح کہ اللہ کی طرف اس کی نسبت کر دی ہے۔ اس معنی کی بنا پر ﴿ مُّفْتَرًى ﴾ ﴿ اِفْكٌ ﴾ کی تاسیس ہے، (یعنی اس نے جدید معنی کا فائدہ دیا ہے) افک کی تاکید نہیں ہے۔ اور ان لوگوں نے جو کافر ہوئے حق کے بارے میں کہا تیسری بار جب وہ ان کے پاس آیا۔ حق سے مراد امرِ دین ہے جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے کہ نہیں ہے یہ، مگر کھلا جادو۔ یہاں فعل کی تکرار کی، یعنی ﴿ قَالُوْا ﴾ کو دوبار ذکر کیا اور تیسری بار پھر ﴿ قَالَ ﴾ کہا اور ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ اس کے فاعل کی تصریح فرمائی۔ چنانچہ اس میں فعل کا انکارِ عظیم ہے اور موثر طریقے سے تعجب کا اظہار ہے اور کفار کی طرف سے خاص توحید کا انکار ہے۔

رہا قرآن اور معجزے کا انکار تو وہ اہلِ کتاب اور مشرکین کے درمیان ایک متفق علیہ بات تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ کفار کا جو قول ﴿ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ﴾ ہے، اس سے مراد قرآن کے معنی ہیں اور ﴿ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ سے مراد اس کی نظمِ معجز ہے، یعنی اس کی اعلیٰ ترتیب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان میں سے کسی گروہ نے تو کہا ہے کہ قرآن افک ہے اور کسی گروہ نے کہا ہے کہ ﴿ سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سب نے کبھی تو افک کہا اور کبھی سحر۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ نہیں اتاریں ہم نے عرب پر آسمانی کتابیں جو اُن کے شرک کے صحیح ہونے کی دلیل ہوں، وہ ان میں درس کرتے ہوں اور اُن کو پڑھتے ہوں اور ہم نے ان میں کوئی نذیر نہیں بھیجا کہ ان کو شرک کی طرف بلائے یا حق کی طرف بلائے اور اُن کو عذاب کے ساتھ ڈرائے۔ جب یہ نہیں ہے تو وہ جو قرآن کی اور رسول کی تکذیب کرتے ہیں ان کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ کوئی شبہہ ہے جس سے وہ تمسک کریں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: انھوں نے کہاں سے تیری تکذیب کی، حالاں کہ ان کے پاس نہ کوئی کتاب آئی نہ کوئی نذیر آیا اس فعل کو لے کر جو انھوں نے کیا،[1] یعنی بتوں کا پوجنا۔

پھر اللہ پاک نے ان کو ڈرایا اور ان کے انجام کی اور ان سے پہلے لوگوں کے انجام کی خبر دی۔ فرمایا: ﴿ وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ یعنی ان سے پہلے کافروں نے گزرے ہوئے زمانوں میں تکذیب کی اور یہ مکے والے مشرکینِ قریش وغیرہ جو عرب ہیں، وہ اس قوت اور نعمت اور مال و اولاد کی کثرت اور طویل عمر کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے، جو ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی تھیں۔ پھر اللہ پاک نے ان کو ہلاک کر ڈالا، جیسے: عاد اور ثمود اور ان جیسے اور کفار تھے، ان کی قوت ان سے ہلاکت کو دور

---

[1] فتح القدير (٤/٤٣٩)

کرنے کے لیے کچھ کام نہ آئی، جب انھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا، تو یہ لوگ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ اپنے رسول ﷺ کی تکذیب کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہو۔

﴿ مِعْشَارَ ﴾ "عُشْرٌ" میں ایک لغت ہے، یعنی دونوں کے معنی دسویں حصے کے ہیں۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مِعْشَارُ شَيْءٍ" "عُشْرُ شَيْءٍ" ہے۔[1] بحر میں کہا ہے کہ معشار مفعال کا وزن ہے عشر سے الفاظ عدد میں سے سوائے معشار و مرباع کے۔ اس وزن پر اور لفظ نہیں بنایا گیا، ان کے معنی عشر و ربع ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ معشار کے معنی "عشر العشر" ہیں، یعنی دسویں حصے کا دسواں حصہ۔ قولِ اول زیادہ بہتر ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان سے اگلے ان بینات و ہدی کے دسوے حصے کو بھی نہیں پہنچے، جو ہم نے ان کو عطا کی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے پہلے لوگ شکر کے دسویں حصے کو بھی اس شے سے نہیں پہنچے، جو ہم نے ان کو عطا کی۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اللہ نے ان سے پہلوں کو اس علم، بیان، حجت اور برہان کا دسواں حصہ بھی عطا نہیں کیا، جو اُن کو عطا کیا ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "معشار" "عشر عشیر" ہے اور "عشیر" "عشر العشر" کو کہتے ہیں تو معشار ہزار جزء سے ایک جزء ہوگا۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول زیادہ ظاہر ہے، اس لیے کہ "معشار" سے مراد قلت میں مبالغہ ہے۔[2]

فتح البیان میں کہا ہے کہ قلت میں مبالغے کی رعایت کرنے کی وجہ سے عربی کے معنی سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ﴾ معطوف ہے ﴿ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ﴾ پر بطور تفسیر کے جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ﴾ [القمر: ۹] "ان سے پہلے قومِ نوح نے بھی ہمارے بندے کو جھٹلایا تھا اور دیوانہ بنا کر جھڑک دیا گیا تھا۔" اولیٰ یہ ہے کہ عطفِ خاص علی العام کے باب سے ہو، کیوں کہ جب اول تکذیب سے متعلق تکذیب کا حذف کر دیا گیا تو اس نے عموم کا فائدہ دیا، چنانچہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تکذیب کی انھوں نے اتاری ہوئی کتابوں کی اور بھیجے ہوئے رسولوں کی اور واضح اور ظاہر معجزوں کی۔ رسولوں کی تکذیب اس سے خاص تر ہے اگرچہ اس کو مستلزم ہے۔

چنانچہ یہاں دلالتِ لفظی کی رعایت کی گئی، دلالتِ التزامی کی رعایت نہیں فرمائی گئی۔ جملہ ﴿ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ﴾ حال ہے یا معترضہ ہے معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: تکرار نہیں ہے، اس لیے کہ اول تکثیر کے لیے ہے اور ثانی تکذیب کے لیے۔ اسی طرح کشاف میں ہے۔[3] اور ایسا ہی امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ﴿ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴾ پھر کیسا ہوا میرا انکار ان کے واسطے عذاب اور عقوبت کے ساتھ، لہٰذا چاہیے کہ یہ لوگ ایسی بات سے حذر کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں عبادت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے:

[1] تفسير القرطبي (١٤/٣١٠) [2] تفسير القرطبي (١٤/٣١٠) [3] تفسير البيضاوي (٤/٤٠٥) الكشاف (٣/٥٩٨)

"فَأَهْلَكْنَاهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِيْ" یعنی پھر ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا تو کیسا رہا میرا انکار۔ ﴿ نَكِيْرِ ﴾ اسم ہے بہ معنی انکار۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو امر کیا کہ ان پر ایک ایسی حجت قائم کریں کہ اس کے مقابلے میں ان سے کچھ نہ بنے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿٤٦﴾

کہہ دیجیے: بس میں تو تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک (ہو کر) کھڑے ہو جاؤ، پھر تم غور و فکر کرو، تمھارے ساتھی (نبی) میں کوئی دیوانگی (کی بات) نہیں، وہ تو صرف تمھیں ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے (46)

رسول اللہ ﷺ پر جنون کا الزام اور اس کا فیصلہ کن جواب:

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد! ان کافروں سے کہہ دے جو یہ زعم کرتے ہیں کہ تو مجنون ہے: میں تم کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، یعنی میں تم کو ایک بات کا امر کرتا ہوں کہ تم بغیر کسی خواہش و عصبیت کے خالص اللہ عزوجل کے لیے کھڑے ہو جاؤ، پھر تم میں سے کوئی دوسرے سے پوچھے کہ آیا محمد ﷺ میں کوئی جنون ہے؟ پھر تمھارا بعض دوسرے کو نصیحت کرے، یعنی ایک دوسرے کی خیر خواہی کرے اور سیدھی صاف بات کہہ دے۔ ﴿ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ﴾ پھر اپنی خاطر محمد ﷺ کے بارے میں غور و فکر کرے اور اپنے غیر سے اس کا حال پوچھے اگر کوئی دقت ہو، پھر اس میں فکر کرے، اس لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ﴾ یہ معنی ہیں اس کے جو امام مجاہد، محمد بن کعب، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے ذکر کیا ہے اور یہی آیت سے مراد ہے۔

رہی وہ حدیث جس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ مجھے تین چیزیں ایسی دی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں اور کچھ فخر نہیں: حلال کی گئیں میرے لیے غنیمتیں اور حلال نہیں ہوئیں ان لوگوں کے لیے جو مجھ سے پہلے تھے۔ مجھ سے پہلے کے لوگ غنیمتوں کو جمع کرتے تھے، پھر ان کو آگ جلا دیتی تھی۔ اور بھیجا گیا میں ہر سرخ و سیاہ کی طرف اور ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میرے لیے زمین مسجد اور طہور کی گئی، میں مٹی کی ساتھ تیمّم کرتا ہوں اور نماز پڑھ لیتا ہوں، اس زمین پر جہاں مجھ کو

[1] فتح البیان (۱۱/۲۰۵۔۲۰۷)

نماز پالے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ﴾۔ اور مدد دیا گیا میں رعب کے ساتھ ایک مہینے کی راہ سے اپنے آگے۔① یہ حدیث ضعیف الاسناد ہے۔ تفسیر آیت کے ساتھ نماز کے قیام کے لیے جماعت کے ساتھ یا اکیلے جو یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ بعید ہے، شاید بعض راویوں کی طرف سے اسے ٹھونس دیا گیا ہے، کیوں کہ صحاح وغیرہ میں اس کی اصل ثابت ہے۔② واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴾۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھے، پھر فرمایا: «یَا صَبَاحَاهُ» تو قریش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جمع ہوگئے اور کہا کہ تجھے کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم مجھے بتاؤ اگر میں تم کو اس بات کی خبر دیتا کہ دشمن تمھارے پاس صبح کو آئے گا یا شام کو تو کیا تم میری تصدیق نہ کرتے؟ کہا: ہاں، یعنی کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو بے شک میں تمھیں سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں جو تمھارے آگے ہے۔ ابو لہب بولا: ,,تَبًّا لَكَ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟،، یعنی تجھے ہلاکی ہو، کیا اسی واسطے تو نے ہم کو جمع کیا؟ اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾③ [تبت: ۱] ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا۔'' یہ حدیث شریف اس آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] ''اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا دے۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف نکلے اور تین بار ندا کی۔ پھر فرمایا: لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ میری مثل اور تمھاری مثل کیا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثل اور تمھاری مثل اس قوم کی مثل ہے کہ وہ کسی دشمن کے آنے سے ڈرے، چنانچہ انھوں نے ایک شخص کو بھیجا کہ وہ ان کے واسطے دیکھے، چنانچہ اس دوران میں کہ وہ شخص دشمن کی تاک میں لگا ہوا تھا کہ اس نے دشمن کو دیکھ لیا تو وہ متوجہ ہوا، تاکہ قوم کو ڈرائے اور اس نے خوف کیا کہ کہیں اس کے ڈرانے سے پہلے ہی دشمن قوم کے پاس نہ پہنچ جائے اور حملہ کر دے۔ "فَأَهْوَى بِثَوْبِهِ أَيُّهَا النَّاسُ أُوتِيتُمْ أَيُّهَا النَّاسُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ،، یعنی اس نے اپنے کپڑے سے اشارہ کیا کہ اے لوگو! دشمن تمھارے پاس آگیا اس کلمے کو تین بار کہا،④ اسی اسناد سے یہ حدیث شریف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «بُعِثْتُ أَنَا

① تفسیر ابن کثیر (۷۱۱/۳) اس کی سند میں ایک سے زیادہ ضعیف راوی ہیں۔

② صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۲۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۲۱)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۵۲۳)

④ مسند أحمد (۳۴۸/۵) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" مجمع الزوائد (۴۱۴/۲)

وَالسَّاعَةُ جَمِيْعًا إِنْ كَادَتْ لَتَسْبِقُنِيْ ﴾ (تفرد به الإمام أحمد) یعنی بھیجا گیا میں اور قیامت ایک ساتھ بے شک وہ قریب تھی کہ مجھ سے سابق ہو جائے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ "وَاحِدَة" سے مراد خصلتِ واحدہ ہے اور ﴿ أَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرٰدٰى ﴾ تفسیر ہے خصلتِ واحدہ کی، یا اس سے بدل ہے۔ ﴿ مَثْنٰى وَفُرٰدٰى ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے، یعنی میں تو تم کو خوف دلاتا ہوں اور ڈراتا ہوں اس کام کے برے انجام سے جس میں تم غرق ہو رہے ہو اور ایک خصلت کی تم کو وصیت کرتا ہوں، وہ خصلت تمھارا کھڑا ہونا اور مستعد و چست ہونا ہے، سچی فکر کے ساتھ حق کے طلب کرنے میں، اس حال میں کہ تم متفرق ہو دو دو اور ایک ایک، کیوں کہ مجتمع ہونا فکر کو مشوّش (پریشان) کرتا ہے اور بصر کو اندھا بناتا ہے اور دیکھنے سے مانع ہوتا ہے اور اس میں انصافِ قلیل اور ظلم و اعتساف (ظلم، زیادتی) بہت ہوتا ہے، تعصب اور حمیت کا غبار اٹھتا ہے، آدمی اپنے مذہب کی نصرت کے سوا اور کچھ نہیں سنتا۔

اس جگہ قیام سے مراد دونوں پاؤں پر کھڑا ہونا نہیں ہے، بلکہ مراد حق کی طلب کے ساتھ قائم ہونا ہے اور تدبر و تفکر کا اہتمام کرنا اور اس میں مشغول ہونا ہے اور اس میں سچی فکر کرنا ہے، جس طرح کہ محاورے میں بولتے ہیں: "قَامَ فُلَانٌ بِأَمْرِ كَذَا" یعنی فلاں نے فلاں کام کا اہتمام کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ "واحدة" سے مراد کلمۂ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے۔ امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ مراد قرآن شریف ہے۔ اس لیے کہ وہ سارے مواعظ کا جامع ہے۔ جبکہ وہ قول زیادہ بہتر ہے جسے ہم نے سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ أَنْ ﴾ موضع نصب میں ہے بایں معنی "لِأَنْ تَقُوْمُوْا"۔[3]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَثْنٰى وَفُرٰدٰى ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اپنی رائے کے ساتھ منفرد و تنہا ہو کر اپنے غیر سے مشورہ لے کر۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے اقرباء کے ساتھ مناظرہ کر کے اور اپنے جی میں سوچ سمجھ کر۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَثْنٰى ﴾ دن کا عمل ہے اور ﴿ فُرٰدٰى ﴾ رات کا عمل۔ یہ امام ماوردی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4] یہ قول نہایت درجہ بارد ہے اور نہایت کم فائدہ۔ ﴿ مَثْنٰى ﴾ کو ﴿ فُرٰدٰى ﴾ سے پہلے اس لیے رکھا ہے کہ دو آدمیوں کا مل کر حقائق کو طلب کرنا، جب کہ غور و فکر اور نظر کرنے میں وہ ایک دوسرے کے مدد و معاون ہوں زیادہ فائدہ مند ہے ایک کے فکر سے۔ پھر اگر دو کے درمیان حق ظاہر ہو جائے تو اس کے بعد اُن میں سے ہر ایک فکر کرے، سوچے سمجھے، پھر

---

[1] مسند أحمد (٣٤٨/٥) تفسیر ابن کثیر (٧١١/٣، ٧١٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٥٦٠/١٠)

[2] تفسیر القرطبي (٣١١/١٤) [3] معاني القرآن (٢٥٧/٤) [4] فتح القدير (٤٤٠/٤)

اس سے اس کی بصیرت اور بینائی اور زیادہ ہو گی۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

إِذَا اجْتَمَعُوْا جَاءُوْا بِكُلِّ غَرِيْبَةٍ　　　يَزْدَادُ بَعْضُ الْقَوْمِ مِنْ بَعْضِهِمْ عِلْمًا

کسی قوم کی مدح کرتا ہے کہ وہ جس وقت جمع ہو جاتے ہیں تو ہر نادر بات لاتے ہیں، اس لیے کہ ایک دوسرے سے علم کو زیادہ کرتا ہے۔ ﴿ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ﴾ یعنی پھر تم نبی کے حال میں فکر کرو اور اس کتاب کے بارے میں جس کو وہ لے کر آیا ہے۔ تو اس وقت بیشک تم جان لو گے کہ تمھارے صاحب کو کچھ جنون نہیں ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ مشرکین یوں کہا کرتے تھے کہ محمد ﷺ مجنون ہیں۔ اس پر اللہ پاک نے فرمایا کہ تو اُن سے کہہ کہ تم میرے حال کا اعتبار کرو، اس کو ایک بات کے ساتھ جانچو، وہ یہ ہے کہ تم اللہ کی خاطر جمع ہو کر قائم ہو جاؤ۔ پھر آدمی اپنے ساتھی سے کہے کہ آؤ ہم سچے طور پر غور کریں کہ آیا ہم نے اس شخص میں کچھ جنون دیکھا ہے اور اس پر کسی جھوٹ کا تجربہ کیا ہے۔ پھر ہر ایک اپنے ساتھی سے علاحدہ ہو کر غور کرے اور سوچے تو بے شک اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ اللہ کے پاس سے رسول ہیں اور بے شک وہ کاذب نہیں ہیں اور نہ ساحر ہیں اور نہ مجنون ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ﴾ جملہ مستانفہ ہے اللہ پاک کی طرف سے، اس کا مقصد تحقیق اور غور کرنے کا طریقہ بتانا ہے اس طور پر کہ یہ ایسا عظیم امر اور بڑا دعویٰ ہے کہ اس کے لیے سوائے مجنون کے کوئی اپنے آپ کو پیش نہیں کرتا۔ کیسا مجنون؟ ایسا مجنون جو اس بات کی پروا نہیں کرتا، جو اس کے بارے میں کہی جاتی ہے اور اس جھوٹ کی بھی پروا نہیں کرتا جو اس کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ حالاں کہ وہ لوگ اس بات کو جان چکے تھے کہ نبی اکرم ﷺ عقل میں سب لوگوں سے بڑھ کر ہیں اور ذہن میں سب سے زیادہ تیز ہیں، ان کی رائے ایسی ہوتی ہے جو سب سے اچھی ہو، بات میں ان سب سے سچے ہیں، نفس میں اُن سے بڑھ کر پاک وصاف ہیں اور جن باتوں پر ان کے مردوں کی سب سے زیادہ تعریف کی جاتی ہے، ان میں اُن سب سے زیادہ جامع ہیں۔ جب وہ ان باتوں کو خوب جانتے ہیں تو واجب ہوا کہ اُن کے دعوے میں ان کی تصدیق کریں خاص کر جب ان امور و کمالات کے ساتھ معجزات بھی شامل ہو جائیں۔ اور وہ سب کے سب اس بات پر متفق ہوں کہ وہ، یعنی محمد ﷺ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو جھوٹ بناتے ہیں اور نہ انھوں نے اپنی زندگی میں اور نہ اُن کی زندگی میں اُن سے کسی جھوٹ کو ظاہر یا سرزد ہوتے دیکھا یا سنا ہے۔ اس سب کے باوجود، یعنی یہ سب کچھ ہوتے ہوئے اب انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ایک آدمی دوسرے آدمی کے ہمراہ قائم ہو کر یا تنہا ہو کر غور وفکر کرے کہ کیا اس کے صاحب کو کوئی جنون ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ مجنون نہیں ہیں۔[1] کسی نے کہا: جائز ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہو، یعنی جنون کے آثار میں سے اس میں کون سی شے ہے۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ کے معنی شاید اسی پر مبنی ہیں۔ امام

---

[1] الدر المنثور (٧١٠/٦) فتح القدير (٤٤١/٤)

ابو حاتم اور ابن انباری رحمہ اللہ نے ﴿ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ﴾ پر وقف اختیار کیا ہے۔[1] اس بنیاد پر جملہ ﴿ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ﴾ مستانفہ ٹھہرے گا، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا: وقف نہیں ہے، اس لیے کہ معنی یہ ہیں، پھر تم غور کرو کہ کیا تم نے اس پر کسی جھوٹ کا تجربہ کیا ہے، یا اس سے کوئی جنون دیکھا ہے، یا اس کی حالت میں کوئی فساد نظر آیا ہے۔

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴾ یعنی وہ تو تم کو قیامت سے پہلے پہلے ڈرانے والا ہے۔ ﴿ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴾ سے مراد عذابِ آخرت ہے، یہ آیت ایسی ہے جیسی کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ»[2] پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو یہ خبر دیں کہ مجھے دنیا میں کسی طرح کی غرض اور رغبت نہیں ہے، تاکہ ان کے شکوک وشبہات دور ہو جائیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[3]

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ قُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ۝ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰي نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ۝

آپ کہہ دیجیے: میں نے تم سے جو کوئی صلہ مانگا ہو تو وہ تمھارے ہی لیے ہے، میرا صلہ تو اللہ کے ذمے ہے اور وہ ہر شے پر شاہد ہے (47) کہہ دیجیے: بلاشبہہ میرا رب ہی (پیغمبر پر) حق بات ڈالتا ہے، (وہ) چھپی باتیں خوب جانتا ہے (48) آپ کہہ دیجیے: حق آ گیا اور باطل نہ پہلی بار اُبھرا نہ دوبارہ اُبھرے گا (49) کہہ دیجیے: اگر میں بہکا ہوا ہوں تو بلاشبہہ میرے بہکنے کا وبال مجھی پر ہوگا اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس وحی کی وجہ سے ہے جو میرا رب میری طرف کرتا ہے، بے شک وہ خوب سننے والا، نہایت قریب ہے (50)

میں تم سے تبلیغ کی کوئی اجرت نہیں مانگتا:

سچی وحی نازل فرماتا ہے، یعنی اوپر سے اتارتا ہے۔ انتہی. اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کو فرماتا ہے کہ مشرکین سے یوں کہیں کہ میں جو اللہ عزوجل کی رسالت تم کو پہنچاتا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں اور اللہ کی عبادت کا تم کو

[1] تفسير القرطبي (١٤/٣١١) [2] مسند أحمد (١/١٣٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٣١)

[3] فتح البيان (١١/٢٠٧_٢٠٩)

حکم کرتا ہوں اس پر نہ تو میں تم سے کچھ مزدوری چاہتا ہوں اور نہ کچھ عطاء و اکرام و انعام۔ میں جو اس کا ثواب طلب کرتا ہوں، وہ اللہ کے پاس سے طلب کرتا ہوں اور وہ سارے امور کا عالم ہے۔ میں جس حال پر قائم ہوں اور تم کو یہ خبر دیتا ہوں کہ اس نے مجھے تمھاری طرف بھیجا ہے اور جس حالت پر تم جمے ہوئے ہو، اس سب کو وہ خوب جانتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾ [المؤمن: ١٥] ''اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی نازل فرماتا ہے۔'' یعنی وہ اپنے بندوں میں سے جس کی طرف چاہتا ہے، فرشتے کو بھیجتا ہے اور وہ چھپی چیزوں کا جاننے والا ہے، اس پر نہ کوئی آسمانوں کی پوشیدہ چیز چھپی ہوئی ہے اور نہ زمین کی۔

قولہ تبارک وتعالیٰ: ﴿ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴾ یعنی اللہ پاک کی طرف سے حق آیا اور عظیم شریعت آئی اور باطل گیا اور نیست و نابود ہوا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٨] ''بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتا ہے، پھر یکایک وہ (باطل) ملیامیٹ ہو جاتا ہے اور تمھارے لیے ان باتوں کی وجہ سے ہلاکت ہے جو تم (اللہ کے بارے میں) بیان کرتے ہو۔'' اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ جس وقت فتح مکہ کے دن مسجد الحرام میں داخل ہوئے اور آپ نے کعبہ کے گرد نصب کیے ہوئے وہ بت پائے تو آپ ﷺ نے شروع کیا کہ اپنی کمان کے کنارے سے ان بتوں کو چوکا مارتے تھے اور یہ آیت پڑھتے تھے: ﴿ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨١] ''اور اعلان کر دے کہ حق آچکا اور ناحق نابود ہوگیا۔ یقیناً باطل تھا ہی نابود ہونے والا۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴾ [1] (رواه البخاري ومسلم والنسائي والترمذي وحده عند هذه الآية كلهم من حديث الثوري عن ابن أبي نجيح عن مجاهد عن أبي معمر عبد الله بن سخبرة عن ابن مسعود) یعنی باطل فنا ہوا اس کا نہ کوئی قول باقی رہا نہ کسی طرح کی ریاست اور نہ کوئی کلمہ۔ امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ کا یہ زعم ہے کہ اس جگہ باطل سے مراد ابلیس ہے،[2] یعنی وہ نہ کسی کو پیدا کرتا ہے نہ اس کا اعادہ کرتا ہے اور نہ ہی اس پر قادر ہوتا ہے۔ یہ بات اگرچہ حق ہے، لیکن اس جگہ وہ مراد نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ... الآية ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ کل خیر اللہ کے پاس سے ہے اور اس وحی اور حق مبین میں ہے جس کو اللہ عزوجل نے نازل فرمایا ہے، اس لیے ہدایت، بیان اور رشد اسی کے سبب سے ہے اور جو کوئی بہکا وہ اپنی ہی طرف سے بہکتا ہے، جس طرح کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جبکہ اس مسئلے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٣٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٣٨)

[2] تفسير الطبري (٢٠/٤٢٠)

کے مفوضہ کے بارے میں پوچھا تو یوں فرمایا کہ میں اس میں اپنی رائے سے کہتا ہوں؛ اگر وہ صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر خطا ہے تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ اور اس کے رسول اس سے بری ہیں ﷺ[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴾ یعنی اللہ پاک اپنے بندوں کی باتوں کو سننے والا ہے، وہ قریب ہے، ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے جب وہ اس کو پکارے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے اس جگہ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے جو صحیحین میں ہے کہ تم نہیں پکارتے ہو بہرے کو اور نہ غائب کو تم تو سمیع قریب اور مجیب کو پکارتے ہو۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ تم سے میں نے اگر کچھ مزدوری طلب کی کہ اس کو میری رسالت کے لیے مقرر کرو تو وہ تمھارے واسطے ہے، اگر میں نے تم سے اس کا سوال کیا۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے اسلام پر تم سے کچھ مزدوری نہیں مانگی، مراد سوال کی نفی ہے، بالکل ایسے جس طرح کوئی کہنے والا کہتا ہے کہ جس شے کا میں مالک ہوں تو واقعی وہ میں نے تجھے ہبہ کر دی۔ اس قول سے اس کی غرض یہ ہے کہ اصلاً اس میں اس کی ملکیت نہیں ہے۔ اس آیت کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ [الشورىٰ: ۲۳] ''آپ کہہ دیجیے کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتے داری کی۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ [الفرقان: ۵۷] ''میں قرآن کے پہنچانے پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر جو شخص اپنے رب کی طرف راہ پکڑنا چاہے۔''

پھر ان سے صاف صاف فرما دیا کہ میرا اُجر تو اللہ ہی پر ہے نہ کہ اس کے غیر پر اور وہ ہر شے پر مطلع ہے اس سے کوئی شے غائب نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ میں جو تم کو نصیحت کرتا ہوں اور اس کی طرف تم کو بلاتا ہوں اس پر صرف اسی سے اجر طلب کرتا ہوں۔ ''قذف'' اصل میں رمی بسہم، حصی اور کلام ہے، یعنی تیر، کنکریوں اور بات سے مارنے کو ''قذف'' کہتے ہیں۔ امام کلبی نے کہا ہے کہ ''يَرْمِيْ'' کے معنی ''يَأْتِيْ بِهٖ'' ہیں، یعنی میرا رب حق کو لاتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق کے ساتھ تکلم کرتا ہے۔ حق سے مراد قرآن شریف اور وحی ہے، یعنی اس کو اپنے نبیوں کی طرف ڈالتا ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''بِالْحَقِّ أَيْ: بِالْوَحْيِ''[4] معنی یہ ہیں

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٣٩٨/٤) تفسير ابن كثير (٧١٢/٣)

[3] فتح القدير (٤٤١/٤) [4] تفسير الطبري (٤٢٠/٢٠)

کہ اللہ پاک حجت کو بیان فرماتا ہے اور اس کو اپنے رسولوں کی زبانوں پر لوگوں کے لیے ظاہر کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ باطل کو حق کے ساتھ پھینکتا ہے تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے۔

جمہور نے ﴿ عَلّٰمُ الْغُيُوْبِ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ ان کی خبر ثانی ہے، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یا بدل ہے ﴿ يَقْذِفُ ﴾ کی ضمیر سے، یا معطوف ہے اسمِ ﴿ اِنَّ ﴾ کے محل پر۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع دو وجہ سے ہے موضع پر: اس لیے کہ موضع رفع کا موضع ہے، یا بنا بر بدل۔ زید بن علی، عیسی بن عمر اور ابن ابی اسحاق رحمہم اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ اسمِ ﴿ اِنَّ ﴾ کی نعت ہے، یا اس سے بدل، یا نصب بنا بر مدح۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع ایسے محل میں اکثر ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴾ [صٓ: ٦٤] ''یقین جانو کہ دوزخیوں کا یہ جھگڑا ضرور ہی ہوگا'' ''غیوب'' کو بہ حرکاتِ ثلاثۂ غین پڑھا ہے۔ غیب کی جمع ہے۔ غیب وہ امر ہے جو غائب ہو اور بالکل چھپا ہوا ہو۔

﴿ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ ﴾ میں حق سے مراد اسلام اور توحید ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیر صاحب الحق ہے، یعنی صاحب اس کتاب کا جس میں براہین حجتیں ہیں۔[1] صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقدیرِ مضاف کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیوں کہ قرآن آیا ہے جس طرح کہ اس کے صاحب آئے ہیں۔[2] ﴿ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ باطل ایسا جانا گیا کہ اس کے لیے نہ اقبال باقی رہا نہ ادبار اور نہ ابداء و اعادہ، یعنی بالکل جاتا رہا، اس کا کچھ بھی اَتا پتا باقی نہ رہا۔ جو شے بالکل ہلاک اور فنا ہو جائے اس کے بارے میں یہ قول مثل ٹھہرایا گیا ہے۔ ابداء ابتداءً کسی شے کے کرنے کو کہتے ہیں اور اعادہ اس شے کو دوبارہ کرنا ہے۔ چوں کہ انسان جب تک زندہ ہے، ان دو امر سے خالی نہیں رہتا: کسی شے میں ابتدا کرتا ہے اور کسی کو دہراتا ہے۔ اس لیے اس قول سے اس کی زندگی کا کنایہ کرتے ہیں اور اس کی نفی سے اس کی ہلاکت اور فنا کا اشارہ کرتے ہیں۔

پھر یہ قول مشہور ہوا ہر اس شے کے بارے میں جو جاتی رہی اور اس کا کچھ اثر باقی رہا، اگرچہ وہ ذی روح نہ ہو، چنانچہ یہ قول کنایہ بھی ہے یا مجاز متفرع کنایہ پر۔ مطلب یہ ہے کہ اصل میں یہ کلام زندہ کی ہلاکت کے لیے استعمال ہوتا تھا، پھر اصل سے لے لیا گیا اور باطل کے جانے میں استعمال کیا گیا۔ ایسا جانا کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہا۔ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ ﴿ يُعِيْدُ ﴾ اور ﴿ يُبْدِئُ ﴾ کا کوئی مفعول نہیں ہے، کیوں کہ مراد یہ ہے کہ ان دونوں فعلوں کا وقوع نہیں ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کا مفعول محذوف ہے، یعنی باطل اپنے اہل کے واسطے نہ کسی خیر کی ابتداء کرتا ہے نہ اس کا اعادہ کرتا ہے۔ کسی نے کہا: جائز ہے کہ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہو، یعنی کون سی شے ابداء کرے

---

[1] فتح القدير (٤٤١/٤) [2] فتح البيان (٢١٠/١١)

گی. باطل کا اور کون اس کا اعادہ کرے گی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل فنا ہو گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ باطل سے مراد اصنام ہیں۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

چوں کہ کفار نے نبی اکرم ﷺ سے کہا تھا کہ تو نے اپنے باپ دادوں کا دین چھوڑ دیا، لہٰذا تو گمراہ ہو گیا، اس لیے اللہ پاک نے آپ کو حکم دیا کہ ان سے یوں کہیں کہ ﴿ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ ... الآیۃ ﴾ یعنی اگر میں حق اور واضح راہ سے بہک گیا تو میرے بہکنے کا گناہ میری ہی جان پر ہوگا۔ عمر بن سعد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میری جنایت (گناہ، قصور) کی پکڑ مجھ سے ہوگی۔[1] اور اگر راہ پر لگا تو اس حکمت، موعظت اور قرآن کے سبب سے ہے، جس کی وحی میرا رب میری طرف کرتا ہے، کیوں کہ وہ سننے والا ہے، مجھ سے اور تم سے قریب ہے، ہدایت اور ضلالت کو جانتا ہے، گو ان کے چھپانے میں مبالغہ کیا جائے۔ یہ آیت ہر مکلّف کے لیے حکم عام ہے۔ اللہ پاک نے جو اپنے رسول ﷺ کو یہ فرمایا کہ اس کی نسبت اپنے نفس کی طرف کریں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب رسول اپنی جلالتِ رتبہ اور سدادِ طریقے (طریقہ کی صحت) کے باوجود اس کے تحت میں داخل ہوئے تو دوسرے تو زیادہ تر اس کے لائق ہیں۔

جمہور نے ﴿ ضَلَلْتُ ﴾ کو بہ فتحِ لامِ اولیٰ پڑھا ہے، یہ نجد کی لغت ہے اور فصیح ہے۔ امام حسن اور یحییٰ بن وثاب رحمہ اللہ نے بہ کسرِ لام پڑھا ہے، یہ لغت اہلِ عالیہ کی ہے۔[2] ﴿ فَبِمَا ﴾ میں کلمۂ "ما" مصدریہ ہے یا موصولہ اور اس جگہ تقابل معنی کے لحاظ سے ہے نہ کہ لفظ کی وجہ سے، کیوں کہ لفظ کے اعتبار سے تقابل یوں ہوتا کہ اس طرح کہا جاتا: "وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَإِنَّمَا أَهْتَدِيْ عَلٰى نَفْسِيْ" یا "إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ بِنَفْسِيْ... الخ"۔ چنانچہ یہاں مقابلہ معنی کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ ﴿ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ ﴾ قوت میں "فَإِنَّمَا أَضِلُّ بِنَفْسِيْ" کے ہے۔[3] بالجملہ پھر اللہ پاک نے احوالِ کفار میں سے ایک اور حال کا ذکر کیا اور ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۝٥١ وَّقَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝٥٢ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۝٥٣ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۝٥٤ ﴾

اور کاش! آپ دیکھیں جب وہ گھبرائے ہوئے ہوں گے، تو وہ (بھاگ کر) بچ نہ سکیں گے اور وہ قریب ہی کی جگہ سے پکڑ لیے جائیں گے (51) اور وہ کہیں گے: ہم (اب) اس پر ایمان لائے

---

(1) فتح القدير (٤/٤٤١) (2) تفسير القرطبي (١٤/٣١٣، ٣١٤) (3) فتح البيان (١١/٢٠٩-٢١١)

ہیں اور ان کے لیے (اتنی) دور کی جگہ سے (ایمان کا) حصول کہاں (ممکن) ہوگا!52 حالاں کہ انھوں نے اس سے پہلے (دنیا میں) اس کا انکار کیا تھا اور وہ دور کی جگہ سے بن دیکھے ہی (اٹکل کے تیر) پھینکتے رہے53 اور ان کے اور ان چیزوں کے درمیان جنھیں وہ چاہتے ہیں، آڑ حائل کر دی جائے گی، جیسے اس سے پہلے ان جیسوں کے ساتھ کیا گیا تھا، بلاشبہہ وہ ایسے شک میں مبتلا تھے جو تردد میں ڈالنے والا ہے54

روزِ قیامت کفار کی ایمان لانے کی لا حاصل خواہش:

اللہ پاک فرماتا ہے کہ اے محمد! کبھی تو اُن قیامت کے جھٹلانے والوں کو دیکھے کہ یہ گھبرائے ہوئے ہوں گے، ان کے لیے نہ کوئی بھاگنے کی جگہ ہوگی نہ کوئی جائے پناہ اور وہ نزدیک جگہ سے پکڑے جائیں گے، یعنی ان کو یہ قدرت نہ ملے گی کہ بھاگ کر بچ جائیں، بلکہ پہلے ہی سے پکڑے جائیں گے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس وقت وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے تو پکڑے جائیں گے۔ امام مجاہد، عوفی اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اپنے قدموں کے نیچے سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دنیا میں ان کا عذاب ہے۔ عبدالرحمن بن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد بدر کے دن ان کا قتل ہونا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد روزِ قیامت ہے۔ قیامت کا دن ایک بڑی آفت ہے جو ہر شے کو توڑ پھوڑ ڈالے گی، اگرچہ جس کا ذکر کیا گیا، وہ اس سے متصل ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض سے حکایت کیا ہے کہ اس سے مراد وہ لشکر ہے جو ایامِ بنی عباس میں مکہ اور مدینہ کے درمیان دھنسا دیا جائے گا۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ اس بارے میں ایک بالکل موضوع (من گھڑت) حدیث لائے ہیں[1] اور اس سے آگاہ نہیں کیا، ان سے ایسی بات عجیب وغریب ہے، یعنی ان کی عادت تو یہ ہے کہ حدیث میں کچھ بھی خلل ہوتا ہے تو اس سے آگاہ کر دیتے ہیں، حالاں کہ یہ حدیث بالکل موضوع بیان کی ہے اور اس پر آگاہ نہ کیا، یہ واقعی بڑے تعجب کی بات ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن وہ کہیں گے کہ ہم اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴾ [السجدة: ١٢] ”کاش کہ آپ دیکھتے جب کہ گناہ گار لوگ اپنے رب تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے، کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا، اب تو ہمیں واپس لوٹا دے، ہم نیک اعمال کریں گے، ہم یقین کرنے والے ہیں۔“ نیز اسی لیے اللہ پاک نے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ یعنی اب

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٤٢١ـ٤٢٤)

ایمان کے لینے کو ان کا ہاتھ کیسے پہنچ سکتا ہے، حالاں کہ وہ اس کے قبول ہونے کی جگہ سے دور جا پڑے ہیں اور دارِ آخرت میں پہنچ گئے اور وہ جزا کا گھر ہے نہ کہ ابتلا کا گھر۔ اگر وہ دنیا میں ایمان لاتے تو البتہ وہ ان کو نفع مند ہوتا، لیکن ان کے آخرت میں پہنچ جانے کے بعد اب ان کے لیے ایمان کے قبول ہونے کی کوئی سبیل نہیں جس طرح کہ اس شخص کے لیے کسی شے کو حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہیں ہے جو اس شے کو دور سے لینا چاہتا ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''اَلتَّنَاوُلُ لِذٰلِكَ'' یعنی ان کے لیے ایمان کا لینا کہاں ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''تَنَاوُش'' ان کا ایمان کو لینا ہے اس حال میں کہ وہ آخرت میں ہیں اور دنیا ان سے منقطع ہو چکی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: اس سبب سے کہ انھوں نے امر کو طلب کیا، یعنی ایمان کو ایسی جگہ سے کہ ان کو نہ ملے، یعنی ایمان کو دور جگہ سے لیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ انھوں نے دنیا کی طرف لوٹ جانا طلب کیا اور اس شے سے توبہ کی جس میں وہ تھے، حالاں کہ وہ نہ ہی لوٹ جانے کا وقت ہے اور نہ ہی توبہ کا۔ اسی طرح محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ آخرت میں ان کو ایمان کیسے حاصل ہو گا، حالاں کہ دنیا میں وہ حق کے منکر ہو چکے اور رسولوں کی تکذیب کر چکے۔ ﴿ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴾ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ بِالْغَيْبِ ﴾ سے مراد ''بِالظَّنِّ'' ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں ہے کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ﴾ [الکھف: ۲۲] ''غیب کی باتوں میں اٹکل (کے تیر تکے) چلاتے ہیں۔'' چنانچہ کبھی کہتے ہیں کہ شاعر ہے، کبھی کاہن، کبھی ساحر، کبھی مجنون اور کبھی اس کے سوا اَور باطل بکتے رہے اور دوبارہ زندہ ہونے اور اللہ کے سامنے پیش ہونے اور قیامت کو جھٹلاتے تھے اَور کہتے تھے: ﴿ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴾[1] [الجاثیۃ: ۳۲] ''ہمیں کچھ یوں ہی سا خیال ہو جاتا ہے لیکن ہمیں یقین نہیں ہے۔''

امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا: ''يَرْجُمُوْنَ بِالظَّنِّ لَا بَعْثَ وَلَا جَنَّةَ وَلَا نَارَ'' یعنی اپنی اٹکل سے بن دیکھے نشانے پر تیر پھینکتے رہے کہ نہ بعث ہے، نہ جنت ہے، نہ دوزخ ہے۔ امام حسن بصری اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہما نے کہا کہ ﴿ مَا يَشْتَهُوْنَ ﴾ سے مراد ایمان ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ توبہ ہے۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام مجاہد نے کہا ہے کہ ﴿ مَا يَشْتَهُوْنَ ﴾ سے مراد اس دنیا کا مال، زینت، تازگی اور گھر والے ہیں۔ اسی کے مثل سیدنا عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور ربیع بن انس رحمہ اللہ سے مروی ہے اور یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا اور ایک جماعت کا قول ہے۔ صحیح یہ ہے کہ دونوں قولوں کے درمیان کچھ تضاد نہیں ہے؛ اس لیے کہ بے شک دنیا میں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۷۱۳/۳)

ان کے اور اُن کی خواہشوں کے درمیان اٹکاؤ پڑ گیا اور اس شے میں جس کو انھوں نے دنیا میں طلب کیا۔ چنانچہ وہ اس سے روک دیے گئے۔[1]

امام ابن ابی حاتم نے اس جگہ ایک عجیب وغریب اثر ذکر کیا ہے، ہم اس کو مکمل ذکر کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ بہ سندِ خود عن عکرمہ عن ابن عباس روایت کیا: ﴿ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص فاتح تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مال کی فتوح کی تھی، پھر وہ مر گیا تو اس مال کا وارث اس کا ایک فاسد بیٹا ہوا، وہ اللہ کے مال میں اللہ عزوجل کے معاصی کے ساتھ عمل کرتا رہا، جب اس کے باپ کے بھائیوں نے یہ دیکھا تو وہ اس جوان کے پاس آئے، اسے ملامت کی، چنانچہ وہ جوان گھبرایا اور تنگ دل ہوا تو اس نے اپنی زمین اور املاک صامت کے عوض بیچ ڈالے، یعنی اس کے نقد روپے کر لیے، پھر ایک نہایت جاری چشمے پر آیا اور اپنے مال کو اس میں گاڑ دیا اور ایک محل بنایا، چنانچہ اس اثنا میں کہ ایک دن وہ بیٹھا ہوا تھا، اس وقت ہوا ایک عورت کو اس کے پاس اٹھا لائی، وہ سب لوگوں سے زیادہ خوبصورت اور خوشبودار تھی۔ پھر اس نے کہا: اے اللہ کے بندے! تو کون ہے؟ کہا: میں بنی اسرائیل کا ایک مرد ہوں، اس نے کہا کہ یہ محل اور یہ مال تیرا ہے؟ جوان نے کہا: ہاں۔ عورت نے کہا: پھر کیا تیری کوئی بی بی ہے؟ کہا: نہیں، عورت نے کہا: پھر تجھے عیش کیسے نصیب ہوتی، حالاں کہ تیری کوئی بی بی نہیں ہے۔ جوان نے کہا: "قَدْ كَانَ ذَاكَ" یعنی واقعی یہ بات تو ہے، پھر کہا: تیرا کوئی خاوند ہے؟ عورت بولی: نہیں۔ جوان نے کہا: پھر کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں تجھ سے شادی کر لوں؟ کہا: میں ایک عورت ہوں تجھ سے ایک میل کے فاصلے پر، لہٰذا جب اگلا دن ہو تو تُو دن بھر کا زادِ راہ لے کر میرے پاس آجا اور اگر تو اپنے راستے میں کوئی ہولناک چیز دیکھے تو ہرگز نہ ڈرنا۔

پھر جب کل ہوا تو اس نے دن بھر کا توشہ لیا اور چلا، چنانچہ ایک محل کی طرف پہنچا، اس کا دروازہ کھٹکھٹایا، اس میں سے ایک بہت خوبصورت اور خوشبو والا جوان نکلا اور اس سے کہا: اے اللہ کے بندے! تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں اسرائیلی ہوں۔ اس نے کہا: تیری کیا حاجت ہے؟ اس نے کہا کہ اس محل والی عورت نے مجھے بلایا ہے اپنے نفس کی طرف۔ وہ بولا کہ تو نے سچ کہا۔ اس نے کہا: کیا راستے میں تم نے کوئی ہولناک شے دیکھی؟ کہا: ہاں اور اگر اس عورت نے مجھے یہ نہ بتایا ہوتا کہ مجھ پر کچھ خوف نہیں ہے تو وہ شے مجھے ہول میں ڈالتی جو میں نے دیکھی۔ جوان خوبرو نے کہا کہ تو نے کیا دیکھا؟ کہا: میں متوجہ ہوا، یہاں تک کہ جس وقت راہ مجھ پر کشادہ ہوئی تو اچانک ایک کتیا اپنا منہ کھولے ہوئے ملی، میں گھبرا گیا، پھر میں نے جست کی تو میں اس کے پیچھے تھا اور ناگاہ اس کے پلّے اس کے پیٹ میں بھونک رہے تھے۔ جوان خوبرو بولا کہ تو اس کو نہ پائے گا یہ تو آخر زمانے میں ہوگا، بوڑھے لوگ غلام کو اپنی مجلس میں بٹھائیں گے اور ان کو اس کی بات چیت خوش کرے گی۔

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٤٢٩ـ ٤٣٠) تفسیر ابن کثیر (٣/٧١٣)

کہا: پھر میں متوجہ ہوا، یہاں تک کہ جس وقت راہ مجھ پر کشادہ ہوئی تو ناگاہ سو بکریاں نظر آئیں، ان کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے اور اُن میں ایک بکری کا بچہ ہے جو اُن کو چوستا ہے، پھر جب وہ ان سب پر آچکا اور یہ خیال کیا کہ اس نے کچھ بھی نہ چھوڑا تو اس نے اپنا منہ کھولا اور زیادہ مانگنے لگا۔ جوان خوبرو نے کہا کہ تو اس کو نہ پائے گا، یہ تو آخر زمانے میں ایک بادشاہ ہوگا، سارے لوگوں کا صامت مال، یعنی سونا چاندی روپیہ اشرفی جمع کرے گا، یہاں تک کہ جب یہ خیال کرے گا کہ اس نے کچھ نہ چھوڑا تو اپنا منہ کھولے گا اور زیادہ چاہے گا۔

کہا: پھر میں متوجہ ہوا یہاں تک کہ جب مجھ پر راہ کشادہ ہوئی تو ناگاہ مجھے درخت ملے، مجھے ان میں سے کسی درخت کی ایک ٹہنی تر و تازہ اچھی لگی تو میں نے اس کو کاٹنا چاہا تو ایک درخت نے پکارا کہ اے اللہ کے بندے! تو مجھ سے لے، یہاں تک کہ سارے درختوں نے مجھے پکارا کہ اے اللہ کے بندے! تو مجھ سے لے۔ اس پر جوان خوبرو نے کہا کہ تو اس کو نہ پائے گا، یہ تو آخر زمانے میں ہوگا، مردوں کی قلت اور عورتوں کی کثرت ہوگی، یہاں تک کہ مرد ایک عورت کو نکاح کا پیام کرے گا تو دس بیس عورتیں اس کو اپنی جانوں کی طرف بلائیں گی۔ کہا: پھر میں متوجہ ہوا یہاں تک کہ جس وقت راہ مجھ پر کشادہ ہوئی تو اچانک میں ایک مرد کے پاس تھا جو ایک چشمے پر آنے والے ہر آدمی کے لیے پانی بھر رہا ہے، پھر جب لوگ اس سے علاحدہ ہوگئے تو اس نے اپنے گھڑے میں پانی ڈالا، اس کے گھڑے کو پانی سے کچھ نہ لگا۔ جوان خوبرو نے کہا کہ تو اس کو نہ پائے گا، یہ تو آخر زمانے میں ہوگا، واعظ لوگوں کو علم سکھائے گا، پھر ان کی مخالفت کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی معاصی میں گرفتار ہوگا۔

کہا: پھر میں متوجہ ہوا یہاں تک کہ جس وقت راہ مجھ پر کشادہ ہوا تو اچانک میں ایک بکری کے پاس ہوں اور ایک قوم نے اس کے پاؤں پکڑے ہوئے ہیں اور ایک شخص نے اس کے دونوں سینگ پکڑے ہیں اور ایک نے اس کی دُم پکڑی ہے اور اچانک ایک سوار اس پر سوار ہو گیا ہے اور ایک مرد اسے دوھ رہا ہے۔ اس پر جوان خوبرو نے کہا کہ بکری تو دنیا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے پاؤں پکڑے ہیں، وہ اس کی عیش سے باہم گرتے جاتے ہیں اور جس نے اس کے سینگ پکڑے وہ اس کی عیش سے تنگی اُٹھا رہا ہے اور جس نے اس کی دُم پکڑی ہے تحقیق اس نے اس سے منہ پھیر لیا ہے اور جو شخص اس پر سوار ہو لیا ہے تو بے شک اس نے اس کو چھوڑ دیا ہے اور جو اس کو دوھ رہا ہے تو واہ واہ وہ اس کو لے گیا ہے۔

کہا: پھر میں متوجہ ہوا، یہاں تک کہ جب مجھ پر راستہ کشادہ ہوا تو ناگاہ مجھے ایک آدمی ملا جو کنویں پر کھڑا پانی بھر رہا ہے، ہر بار جو اپنا ڈول نکالتا ہے تو اس کو حوض میں ڈالتا ہے، پھر وہ پانی لوٹ کر اسی کنویں کی طرف بہہ جاتا ہے۔ جوان خوبرو نے کہا: یہ وہ مرد ہے کہ اللہ نے اس کے صالح عمل کو اس پر رد کر دیا، اسے قبول نہ کیا۔ کہا: پھر میں متوجہ ہوا، یہاں تک کہ جب مجھ پر راستہ کشادہ ہوا تو مجھے ایک مرد ملا جو بیج بو رہا ہے، پھر وہ اسے کاٹتا ہے تو وہ عمدہ قسم

کے گیہوں ہیں۔ جوان خوبرو نے کہا: یہ وہ مرد ہے کہ اللہ نے اس کا صالح عمل قبول کیا اور اس کو اس کے لیے بڑھایا۔

کہا: پھر میں متوجہ ہوا یہاں تک کہ جب مجھ پر راستہ کشادہ ہوا تو مجھے ایک مرد ملا جو اپنی گدی کے بل لیٹا ہوا ہے، کہا: اے اللہ کے بندے! تو مجھ سے قریب ہو اور میرا ہاتھ پکڑ اور مجھے بٹھا دے، قسم ہے اللہ کی! جب سے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کیا ہے، میں نہیں بیٹھا ہوں، پھر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ کھڑا ہو گیا، دوڑتا رہا، یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس پر خوبرو جوان نے کہا کہ یہ عمر ابعد کی ہے، یعنی ہر خیر سے دور پڑے ہوئے کی۔ مراد وہ اسرائیلی ہے، وہ عمر پوری ہو چکی اور میں ملک الموت ہوں اور میں ہی وہ عورت ہوں جو تیرے پاس آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم کیا کہ ابعد کی روح اس جگہ پر قبض کروں، پھر اس کو نارِ جہنم کی طرف پہنچا دوں۔ چنانچہ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ ﴾ یہ اثر غریب ہے اور اس کی صحت میں نظر ہے۔ آیت کا اس پر اور اس کے بارے میں اتارنا اس معنی میں ہے کہ سارے کفار وفات دیے جاتے ہیں، اس حال میں کہ ان کی روحیں حیاتِ دنیا سے متعلق ہوتی ہیں، جیسا کہ اس مغرور اور مفتون شخص کے ساتھ ہوا، وہ چلا اپنی مراد کو طلب کرتا ہوا تو اچانک اس کے پاس ملک الموت آ گیا اور وہ اس کے اور اس کے درمیان جس کو وہ چاہتا تھا حائل ہو گیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ﴾ یعنی جیسا کہ گذشتہ اُمتوں کے لیے گزرا، جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی، جب ان کے پاس اللہ کا عذاب آیا تو یہ تمنا کی: کاش! وہ ایمان لاتے، چنانچہ وہ اس سے مقبول نہ ہوا۔ ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٨٤۔ ٨٥] ''ہمارا عذاب دیکھتے ہی کہنے لگے کہ اللہ واحد پر ہم ایمان لائے اور جن جن کو ہم اس کا شریک بنا رہے تھے ہم نے ان سب سے انکار کیا، لیکن ہمارے عذاب کو دیکھ لینے کے بعد ان کے ایمان نے انھیں نفع نہ دیا۔ اللہ نے اپنا معمول یہی مقرر کر رکھا ہے جو اس کے بندوں میں برابر چلا آ رہا ہے اور اس جگہ کافر خراب و خستہ ہوئے۔''

قوله تبارك وتعالىٰ: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴾ یعنی وہ دنیا میں شک و شبہہ میں تھے، چنانچہ اسی لیے عذاب کے دیکھ لینے کے وقت کا ایمان ان سے قبول نہیں کیا گیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: تم شک و شبہہ سے بچو، چنانچہ بے شک جو کوئی شک پر مرا تو وہ اسی پر مبعوث ہو گا اور جو کوئی یقین پر، یعنی ایمان پر مرا تو وہ اسی پر مبعوث ہو گا۔ آخر تفسیر سورت سبا واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ الموفق للصواب۔[1] كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان مع اتقان یہ ہے کہ ﴿ وَلَوْ تَرٰٓى ﴾ کا خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے، یا ہر اس شخص کو ہے جو

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٦٩/١٠) تفسير ابن كثير (٤١٥/٣)

خطاب کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِذْ فُزِّعُوْا ﴾ سے مراد ان کا اپنی موت کے نزول کے وقت، یا اللہ تعالیٰ کے کسی اور عذاب کے آنے کے وقت گھبرانا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا قبروں میں صیحہ سے گھبرانا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ان کا یہ گھبرانا اس وقت ہے جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدر کے دن گھبرانا ہے، جب کہ فرشتوں کی تلواروں سے ان کی گردنیں ماری گئیں تو نہ بھاگ سکے اور نہ توبہ کی طرف رجوع کر سکے۔ امام ابن مغفل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب قیامت کے دن اللہ کے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ "فزع" (گھبرانا) وہ "خسف" (زمین میں دھنسایا جانا) ہے جو بیداء میں ہوگا، پھر ان میں سے ایک آدمی باقی رہ جائے گا جو لوگوں کو اپنے ساتھیوں کے حال کی خبر دے گا، چنانچہ وہ گھبرائیں گے۔ ﴿ لَوْ ﴾ کا جواب محذوف ہے: "أَيْ: لَرَأَيْتَ أَمْرًا عَظِيمًا وَحَالًا هَائِلَةً" یعنی اگر تو دیکھے جبکہ وہ گھبرائیں گے تو البتہ تو دیکھے ایک بڑے امر کو اور ایک ہولناک حالت کو۔ ﴿ فَلَا فَوْتَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پھر فوت نہ ہوگا مجھ سے ان میں سے کوئی اور نہ ان میں سے کوئی نجات پائے گا نجات پانے والا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "فَلَا مَهْرَبَ"، یعنی پھر کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پھر کسی طرح کی نجات نہیں ہے۔[1]

﴿ مَكَانٍ قَرِيبٍ ﴾ سے مراد پشتِ زمین ہے، یا قبریں جو دنیا میں ان کے رہنے بسنے کی جگہوں کے قریب ہیں، جیسا کہ امام ابوحیان رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] یا یہ کہ وہ مکان یا جگہ جو قیامت میں حساب کے لیے کھڑے ہونے کی جگہ سے قریب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی روحیں ان کی جگہوں میں قبض کی جائیں گی۔ پھر ان کے لیے موت سے بھاگنا ممکن نہ ہوگا۔ یہ معنی اس شخص کے قول پر مبنی ہیں جو کہتا ہے کہ یہ گھبراہٹ نزع کے، یعنی جان کنی کے وقت ہوگی۔ کسی نے کہا ہے کہ جہنم سے پکڑے جائیں گے۔ پھر اس میں ڈال دیے جائیں گے۔ کسی نے کہا: اس جگہ سے جہاں وہ تھے، چنانچہ وہ اللہ سے قریب ہیں، اس سے دور نہیں ہیں اور نہ اس سے فوت ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان کے قدموں کے نیچے سے پکڑے جائیں گے۔[3] یہ قول اور لوگوں کا بھی ہے، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔

ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت اسّی ۸۰ ہزار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو آخر زمانے میں کعبہ پر چڑھائی کریں گے، تاکہ اس کو برباد کریں، پھر جب وہ بیداء میں داخل ہوں گے تو وہ دھنسا دیے جائیں گے، چنانچہ یہ ہے ان کا مکانِ قریب سے پکڑا جانا۔[4] (ذکرہ القرطبي)۔ سیدہ حفصہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی صحیح حدیث سے ثابت ہوا ہے کہ بیداء میں ایک لشکر دھنسا دیا جائے گا اور صحیح کے علاوہ دوسری کتابوں میں ام سلمہ، صفیہ، ابوہریرہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم

---

[1] تفسیر القرطبي (۳۱۴/۱٤) [2] البحر المحيط (۲۷۹/۷) [3] الدر المنثور (۷۱۲/٦) [4] تفسیر القرطبي (۳۱٤/۱٤)

سے مروی حدیث سے بھی ثابت ہوا ہے۔[1] ان میں سے کسی حدیث میں یہ بات نہیں کہ یہ اس آیت کا سببِ نزول ہے، لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے دھنسائے جانے کا یہ قصہ مرفوعاً روایت کیا ہے اور اس کے آخر میں یوں کہا ہے: "فَذٰلِكَ قَوْلُهُ عَزَّوَ جَلَّ فِيْ سُوْرَةِ سَبَأ ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ ﴾ الآیة"[2] کسی نے کہا: جائز ہے کہ یہ فزع وہ فزع ہو جو اجابت کے معنی میں ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "فَزِعَ الرَّجُلُ" یعنی اس مرد نے جواب دیا، جب وہ اس چلانے والے کو جواب دے جو اس سے فریاد رسی چاہتا ہے۔ جس طرح کہ اہلِ مکہ نے بدر کی لڑائی کے دن فزع کیا تھا۔

﴿ وَقَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ فزع کے وقت کہیں گے اور یہ وہ وقت ہے جب موت کے نزدیک ان پر عذاب نازل ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ﴾ [المؤمن: ٨٤] "ہمارا عذاب دیکھتے ہی کہنے لگے کہ اللہ واحد پر ہم ایمان لائے۔" یا دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے جانے کے وقت، کیوں کہ اس وقت سارے کفار ایمان لائیں گے۔ غرضیکہ وہ یوں کہیں گے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ یا قرآن پر۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اللہ عزوجل پر۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: بعث پر۔[3]

پھر اللہ پاک نے ان کو ایمان کے نفع دینے کی نفی کی، فرمایا: ﴿ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ ﴾ یعنی یہ چیز ان کے لیے کہاں سے اور کیسے ممکن ہوگی کہ وہ ایمان کو دور جگہ سے لیں، یعنی آخرت میں، حالاں کہ دنیا میں انھوں نے اس کو ترک کیا۔ ﴿ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ یہ خلاصی طلب کرنے کے لیے ان کی حالت کی تمثیل ہے، محال ہونے میں اس کے بعد کہ ان سے خلاصی فوت ہو چکی اس شخص کی حالت کے ساتھ جو یہ چاہتا ہے کہ کسی شے کو ایک غلوہ سے، یعنی ایک تیر کے پھینکے جاتے کی جگہ کے فاصلے سے، اس کے ایک ہاتھ سے لینے کی طرح۔ تناوش نوش سے تفاعل کا وزن ہے، نوش تناول کو کہتے ہیں۔ صراح میں کہا ہے: تناوش وانتیاش دست ناویدن وگرفتن چیزے را۔

غرض یہ ہے کہ ہاتھ کو خم دے کر بڑھا کر کسی شے کو لینا "تناوش" ہے، لہٰذا جو شے ہاتھ بھر کے فاصلے پر ہے، اس کو ہاتھ بڑھا کر لے سکتا ہے اور جو شے مثلاً ایک تیر کے فاصلے پر ہے یا اس سے زیادہ پر اس کو ہاتھ بڑھا کر کیسے لے سکتا ہے! امام ابن سکیت رحمہ اللہ نے کہا: "يُقَالُ لِلرَّجُلِ إِذَا تَنَاوَلَ رَجُلًا لِيَأْخُذَ بِرَأْسِهِ أَوْ بِلِحْيَتِهِ: نَاشَهُ يَنُوْشُهُ نَوْشًا، وَمِنْهُ الْمُنَاوَشَةُ فِي الْقِتَالِ، وَذٰلِكَ إِذَا تَدَانَى الْفَرِيْقَانِ"۔ کسی نے کہا ہے کہ تناوش سے مراد رجعت ہے، یعنی کہاں ہے ان کے لیے رجوع ہونا دنیا کی طرف، تاکہ وہ ایمان لائیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٨٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٨٧٧)

[2] تفسير الطبري (٤٢٢/٢٠) اس کی سند میں "رواد بن الجراح عن سفیان الثوری" سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير القرطبي (٣١٥/١٤)

نے فرمایا کہ وہ دنیا کی طرف لوٹائے جانے کا سوال کریں گے اور وہ لوٹائے جانے کا وقت نہیں ہے اور فرمایا کہ "تناوش" تناولِ شے ہے اور وہ اس کا وقت نہیں ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد توبہ ہے، یعنی انھوں نے توبہ طلب کی حالانکہ وہ بعید ہوگئے، کیوں کہ وہ تو دنیا میں قبول ہوتی ہے۔ امام ابوعمرو، حمزہ، کسائی اور اعمش رحمہم اللہ نے "تناؤش" کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے واو کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام ابوعبید اور نحاس رحمہما اللہ نے پہلی قراءت کو بعید کہا ہے، حالاں کہ بعید کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ عرب کی لغت و اشعار میں وہ ثابت ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمزہ اور ہمزہ کے بغیر دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔[1]

﴿ وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی حال یہ ہے کہ اس وقت سے پہلے وہ اس شے کے منکر ہو چکے جس پر اب ایمان لائے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جس وقت وہ دنیا میں تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ منکر ہوئے قرآن شریف کے یا نبی کریم ﷺ کے اس سے قبل کہ عذاب اور قیامت کی ہولنا کیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ﴿ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ یعنی پھینکتے ہیں گمان اور رسول اللہ ﷺ مین وہ وہ طعنیں کرتے ہیں جو ان کو ظاہر نہیں ہوئیں، یا عذاب میں طعن کرتے ہیں کہ اس کے نہ ہونے پر یقین کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ نہ بعث ہے نہ نشور ہے، نہ جنت ہے نہ نار ہے۔

﴿ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ دور جہت سے جس میں ان کے لیے اپنے ظنِ باطل کے سوا کوئی سند نہیں ہے۔ یہ وہ شبہے ہیں جو انھوں نے آخرت کے معاملے کے بارے میں تکلف کر کے بنائے ہیں، چنانچہ پہلے ان کی حکایت کی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف کے حق میں باطل بکتے ہیں کہ وہ سحر ہے، شعر ہے اور اساطیر الاولین ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی شان میں کہتے ہیں کہ ساحر، کاہن و مجنون ہیں۔ اس میں ان کی حالت کو ایسے شخص کی حالت سے تشبیہ دی ہے جو کسی شے کو کسی دور کی جگہ سے مارتا ہے اور وہ چیز اسے نظر نہیں آتی کہ وہم سے کسی طرح اس شے تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ استعارہ تمثیلیہ ہے اور جملہ یا تو ﴿ وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ ﴾ پر معطوف ہے، اس بنیاد پر کہ وہ حالِ ماضی کی حکایت ہے اور اس کی صورت کا استحضار ہے، یا ان کے حال کی تمثیل بیان کرنے کے لیے جملہ مستانفہ ہے۔ امام مجاہد، ابوحیوہ اور محبوب رحمہم اللہ نے ابوعمرو رحمہ اللہ سے "يُقْذَفُوْنَ" بصیغۂ مجہول پڑھا ہے،[2] یعنی ان کے اعمال کی جزا کے طور پر وہ ایسی شے سے مارے جائیں گے جو اُن کو بری لگے گی اور ایسی جگہ سے مارے جائیں گے جس کا ان کو خیال بھی نہ ہوگا۔

﴿ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ ﴾ فعل مجہول ہے اور جب معروف بنائیں گے تو حال کہیں گے۔ یہ ایک فعل ہے کہ متعدی نہیں ہوتا۔ نائب فاعل اس کا ضمیر مصدر ہے جو فعل سے سمجھا جاتا ہے۔ گویا یوں کہا گیا: "وَحِيْلَ هُوَ، أَيْ: اَلْحَوْلُ" بعض نے ظرف کو یعنی ﴿ بَيْنَهُمْ ﴾ کو نائب فاعل ٹھہرایا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس وقت چاہیے تھا کہ

---

[1] تفسير القرطبي (٣١٦/١٤) [2] فتح القدير (٤٤٣/٤)

مرفوع ہوتا، معنی یہ ہیں کہ ان کے اور اس شے کے درمیان جس کو وہ چاہتے ہیں، یعنی عذاب سے نجات، اٹکاؤ پڑ گیا، حالاں کہ وہ اس سے روک دیے گئے، یا ان کے اموال و اہل جن کو وہ دنیا میں چاہتے تھے، یا دنیا کی طرف پھر آنا۔

﴿ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ ﴾ یعنی جیسا کہ گزری ہوئی اُمتوں کے ان جیسے لوگوں یعنی کفار کے ساتھ کیا گیا، جو دنیا میں ان سے پہلے اور ان سے زمانے کے لحاظ سے پہلے تھے۔ "أشیاع" جمع ہے "شیع" کی اور "شیع" جمع ہے "شیعة" کی، آدمی کے تابعین اور انصار کو اس کے شیعہ کہتے ہیں اور ہر قوم جن کا معاملہ ایک ہو، بعض بعض کی رائے پر چلتے ہوں تو وہ "شیع" ہیں، پس "أشیاع"، جمع الجمع ہے۔

جملہ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے۔ ان کی امثال، یعنی ان جیسوں کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا، اس کی علت یہ ہے کہ بے شک وہ ﴿ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴾ میں تھے، یعنی ایسے شک میں جو وسوسے میں ڈالنے والا تھا، یا ﴿ مُرِيْبٍ ﴾ بہ معنی ذی ریبت ہے، یعنی رسل، بعث، جنت اور نار کے معاملے میں وہ شک میں تھے۔ یا توحید میں اور اس دین میں جس کو رسول لے کر آئے۔ "يُقَالُ: أَرَابَ الرَّجُلُ إِذَا صَارَ ذَا رِيبَةٍ فَهُوَ مُرِيبٌ"۔ کسی نے کہا کہ ﴿ مُرِيْبٍ ﴾ ریب سے ماخوذ ہے جس کے معنی شک وشبہہ اور تہمت کے ہیں تو ﴿ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴾ ایسا ہوا جیسے یوں بولتے ہیں: "عَجَبٌ عَجِيبٌ" اور "شِعْرٌ شَاعِرٌ"۔ مطلب یہ ہے کہ مراد شک میں مبالغہ ہے، یعنی انتہا درجے کے شک میں تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس شخص کا رد ہے جو یہ زعم کرتا ہے کہ اللہ پاک شک پر عذاب نہیں کرتا ہے۔[1] واللّٰه أعلم بالصواب وإليه المرجع و المآب.

الحمد لله والمنة کہ یہ تفسیر وقت دو ساعت شب بستم ماہ رجب ۱۳۱۲ ہجری محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ لا حول ولا قوة إلا به سبحانه۔ بندہ ہیچ ہے اور اسی کے فضل، حول اور قوت سے سب کام ہوتا ہے۔ اوسط ربیع الاول میں شروع ہوئی اور اوسط رجب میں تمام ہوئی، اتنے مہینے مرض وضعف میں گزرے، الٰہی سیدی مولائی! اس کام کو سہل و آسان کر اور عافیتِ دارین عطا فرما، توبہ و انابت پوری دے، حسنِ عاقبت عطا فرما، عملِ صالح کی توفیق دے آمین۔ اللهم صل وسلم وبارك على سيدنا ومولانا محمد النبي الأمي وعلى آله وصحبه عدد ما علمت وزنة ما علمت وملء ما علمت آمين إلى يوم الدين. اللهم اغفر وارحم عبدك المذنب ذوالفقار أحمد ووالديه ووصاحب الترجمان وجميع المؤمنين والمؤمنات الأحياء منهم والأموات. آمين. والحمد لله أولا وآخراً وظاهراً و باطناً.

---

[1] فتح البيان (۱۱/۲۱۱۔ ۲۱٤)

یادداشت

ہماری دیگر مطبوعات

سلسلۂ مطبوعات (28)

مجموعہ فتاویٰ

استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ

(1260-1337ھ)

تحقیق: حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 760

سلسلۂ مطبوعات (29)

مجموعہ فتاویٰ

محدث العصر علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ

تحقیق: حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 672

سلسلۂ مطبوعات (30-40)

عقائد و عبادات کے متعلق گیارہ نایاب رسائل کا مجموعہ

مجموعہ رسائل

استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ

(1260-1337ھ)

تحقیق: حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 708

سلسلۂ مطبوعات (41-46)

مجموعہ رسائل

سیرت سید المرسلین | فضائل سید المرسلین | برہان الحق | [illegible] | قدامت اہل حدیث | مقالات و مضامین

استاذ المناظرین

مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ

(۱۹۰۰ء — ۱۹۷۳ء)

تحقیق

حافظ عبداللہ سلیم

عمدہ طباعت • مجلد (صفحات: 696)

سلسلۂ مطبوعات (47)

تذکرہ محدث العصر

علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ

تالیف

عبدالرشید عراقی

مجلد // صفحات: 312

سلسلۂ مطبوعات (48)

اضافہ شدہ جدید اِڈیشن

استاذ المناظرین

مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ

تالیف: مولانا محمد اسحاق بھٹی

مجلد // صفحات: 360

سلسلۂ مطبوعات (55)

شیخ الکل سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ

کے تلامذہ کرام کا تذکارِ جمیل

دبستانِ نذیریہ

تالیف: محمد تنزیل الصدیقي الحسیني

3 جلدیں // معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (56)

تحریکِ اہلِ حدیث کی دینی و ملی تگ و تاز

اور اکابر کا دلنشیں تذکرہ

ہمارے اسلاف

تالیف

مولانا محمد یوسف انور حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 408

سلسلۂ مطبوعات (57)

اردو تحریر وانشا میں سرزد ہونے والی اغلاط کی اصلاح

زبانِ خامہ کی خامیاں

تالیف: علیم ناصری رحمہ اللہ — اضافہ: محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

پیش لفظ: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ — نظرثانی: محسن فارانی

مجلد // صفحات: 224

سلسلۂ مطبوعات (58)

سلفیانِ برصغیر کے پہلے تنظیمی سربراہ اور دبستانِ نذیریہ کے ممتاز رکن

استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ کے احوال وآثار اور دینی خدمات کا تذکرہ

یادگارِ سلف

حافظ شاہد رفیق

فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 592

سلسلۂ مطبوعات (59)

دلچسپ واقعات اور سبق آموز حکایات پر مبنی طلبائے علم کے لیے ایک راہنما تحریر

دینی تعلیم و تربیت کے اصول و آداب

تالیف: مولانا عبدالرؤف خان رحمانی جھنڈانگری رحمہ اللہ

کارڈ کور // صفحات: 118

سلسلۂ مطبوعات (60)

سوئے منزل

تالیف: مولانا عبدالخالق مدنی

کارڈ کور // صفحات: 304

سلسلۂ مطبوعات (61)

زیورِ علم
اور
مثالی طالب کے اخلاق و اوصاف

تالیف: علامہ بکر بن عبداللہ ابوزید رحمہ اللہ

ترجمہ: فضیلۃ الشیخ عبداللہ کوثر حفظہ اللہ

کارڈ کور // صفحات: 108

سلسلۂ مطبوعات (62)

فتاویٰ
نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

ترجمہ و تخریج: حافظ عبداللہ سلیم

تنقیح و نظر ثانی: ڈاکٹر لیث محمد مکی

5 جلدیں // معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (63)

مقالات
فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس حفظہ اللہ

مرتب: حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 612

سلسلۂ مطبوعات (64)

مقالات
مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ

مرتب: حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 536

سلسلۂ مطبوعات (65)

فتاویٰ
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

اختصار و تقدیم: فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس حفظہ اللہ

ترجمہ: پروفیسر حافظ عبدالجبار حفظہ اللہ

5 جلدیں // معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (88-66)

مجموعہ رسائل
استاذ الاساتذہ حافظ عبدالمنان نورپوری رحمہ اللہ

جمع و ترتیب: حافظ شاہد رفیق، حافظ عبداللہ سلیم

3 مجلد // معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (89)

جائزة الأحوذي

في التعليقات على

سنن الترمذي

تالیف العلامة المحدث أبي النصر ثناء الله بن عيسى خان المدني

4 جلدیں // معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (90)

الوصائل

في

شرح الشمائل

تالیف: العلامة المحدث أبي النصر ثناء الله بن عيسى خان المدني

مجلد // صفحات: 672

سلسلۂ مطبوعات (91)

خطبہ غدیر خم

اور

اہل بیت کے حقوق

تالیف: مولانا ارشاد الحق اثری

مجلد // صفحات: 144

سلسلۂ مطبوعات (92)

مقام صحابہ رضی اللہ عنہم

تالیف

مولانا ارشاد الحق اثری

مجلد // صفحات: 264

سلسلۂ مطبوعات (93)

فضائل صحابہ و اہل بیت

اور

مسائل محرم الحرام

علمائے پاک و ہند کی تقریظات کے ساتھ مسند ایڈیشن

تالیف: فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

مجلد // صفحات: 320

سلسلۂ مطبوعات (94)

برصغیر میں

اصحاب الحدیث

ایک مطالعہ

تالیف

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

مجلد // صفحات: 464

سلسلۂ مطبوعات (95)

حضرت مولانا صمصام رحمہ اللہ کے منظوم رسائل اور نعتیہ قصائد کا مکمل مجموعہ

دیوانِ صمصام

شاعرِ توحید وسنت

حضرت مولانا علی محمد صمصام رحمہ اللہ

❁ مجلد // ❁ صفحات: 662

سلسلۂ مطبوعات (96)

نماز کے مختلف اذکار اور دعائیں

تالیف: فضیلۃ الشیخ طارق بن محمد القطان حفظہ اللہ

ترجمہ: حافظ عبد اللہ سلیم حفظہ اللہ

❁ کارڈ کور // ❁ صفحات: 96

سلسلۂ مطبوعات (97)

ایمان افروز وصیتیں

تالیف

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

ترجمہ

شیخ الحدیث مولانا عمر فاروق سعیدی رحمہ اللہ

❁ مجلد // ❁ صفحات: 336

سلسلۂ مطبوعات (98)

وحدتِ ادیان کا باطل نظریہ

تالیف: فضیلۃ الشیخ بکر بن عبد اللہ ابو زید رحمہ اللہ

ترجمہ: مولانا عبد اللہ کوثر حفظہ اللہ

❁ کارڈ کور // ❁ صفحات: 96

سلسلۂ مطبوعات (99)

فتاویٰ محمدیہ

استاذ الاساتذہ مفتی عبید اللہ عفیف حفظہ اللہ

❁ 2 جلدیں // ❁ معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (100)

تلخيص

الجامع الكامل في الحديث الصحيح الشامل

المرتب على أبواب الفقه

تأليف

أ. د. محمد عبد الرحمن الأعظمي المعروف بالضياء

أستاذ الحديث وعميد كلية الحديث سابقاً

بالجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة والمدرس بالمسجد النبوي

❁ 6 جلدیں // ❁ معیاری طباعت

سلسلۂ مطبوعات (116)

عقیدہ سلف کا ترجمان اور اسلامی عقائد وافکار کا مستند ماخذ

صریح السنہ

تالیف: امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ

ترجمہ: حافظ محمد اسحاق طاہر حفظہ اللہ

کارڈ کور // صفحات: 80

سلسلۂ مطبوعات (117)

تذکرہ مولانا عبدالحق محدث ملتانی رحمہ اللہ اور ان کا خانوادۂ علمی

تالیف: حافظ ریاض احمد عاقب اثری حفظہ اللہ

تقدیم: محدث العصر مولانا محمد رفیق اثری حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 592

سلسلۂ مطبوعات (118)

قرآن مجید کا مستند ترجمہ اور مختصر تفسیر

قرآن کریم مترجم ومحشی

ترجمہ وحواشی

مولانا فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ — حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

نظر ثانی

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر رحمہ اللہ — حافظ عبدالحمید ازہر رحمہ اللہ

مجلد // صفحات: 735

سلسلۂ مطبوعات (119)

سوانح حیات حضرت الامام السید محمد نذیر حسین صاحب مرحوم محدث دہلوی

الحیاۃ بعد المماۃ

تالیف: مولانا فضل حسین بہاری رحمہ اللہ

تدوین وحواشی: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

مجلد // صفحات: 512

سلسلۂ مطبوعات (120)

نفل نمازیں

تالیف

فضیلۃ الشیخ راشد حسن مبارکپوری

(استاذ جامعہ اسلامیہ، فیض عام، مئو)

مجلد // صفحات: 424

سلسلۂ مطبوعات (121)

الحاد

وسائل، خطرات اور علاج

تالیف

ڈاکٹر صالح بن عبدالعزیز سندی

(استاذ عقیدہ، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ)

ترجمہ و تعلیق

شعبان بیدار صفاوی

(استاذ جامعہ محمدیہ، مالیگاؤں، انڈیا)

کارڈ کور // صفحات: 112

سلسلۂ مطبوعات (122)

تحریکِ اہلِ حدیث

تعارف اور اشکالات کا ازالہ

تالیف

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

مُرتب

حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

مجلد // صفحات: 592